وَإِنْ مِّنْ شَيْءٍ إِلَّا عِنْدَنَا خَزَآئِنُهٗ وَمَا نُنَزِّلُهٗٓ إِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ (الحجر:۲۲)

تفسیرِ کبیر

مُصنّفہ

حضرت مرزا بشیر الدّین محمود احمد

خلیفۃ المسیح الثّانی المصلح الموعود

رضی اللہ عنہ

جلد ششم

مشتمل بر

سُورۃ الحج۔ سُورۃ المومنون۔ سُورۃ النّور۔ سُورۃ الفرقان

+++

نظارت نشر و اشاعت قادیان

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ نَحْمَدُهٗ وَنُصَلِّيْ عَلٰى رَسُوْلِهِ الْكَرِيْمِ

تعارف (بارِ اوّل)

تفسیر کبیر کی یہ جلد سُورۃ الحج، سُورۃ المومنون اور سُورۃ النور کی تفسیر پر مشتمل ہے*۔ اِس جلد میں حج اور قربانی کے فلسفہ اور انکے فوائد، کامیابی اور فلاح حاصل کرنے کے ذرائع اور بعض نہایت اہم تمدنی مسائل پر تفصیل سے بحث پائی جاتی ہے اور خاص طور پر عیسائیت اور یورپ کے تمدنی نظریات کا اِسلامی نظریات سے مقابلہ کرکے اِسلامی تعلیم کی فوقیت اور برتری ثابت کی گئی ہے۔ سُورۃ نور کی آیات متعلقہ قذف اور اِفک و بہتان اور آیت اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اور آیتِ اِستخلاف کی ایسی محققانہ اور پُراز معارف تفسیر کی گئی ہے جس کی نظیر پہلی تفسیروں میں تلاش کرنا بے سُود ہے۔

تفسیر کبیر کی اہمیّت

حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی اوائل دعویٰ سے یہ خواہش تھی کہ قرآن مجید کی نئی تفسیر لکھی جائے چنانچہ حضور علیہ السلام ازالۂ اوہام میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"اِس زمانہ میں بلاشبہ کتابِ الٰہی کے لئے ضروری ہے کہ اس کی ایک نئی اور صحیح تفسیر کی جائے کیونکہ حال میں جن تفسیروں کی تعلیم دی جاتی ہے وہ نہ اَخلاقی حالت کو درست کرسکتی ہیں اور نہ ایمانی حالت پر نیک اثر ڈال سکتی ہیں بلکہ فطرتی سعادت اور نیک روشنی کی مزاحم ہو رہی ہیں۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ وہ دراصل اپنے اکثر زوائد کی وجہ سے قرآن کریم کی تعلیم نہیں ہے قرآنی تعلیم لوگوں کے دلوں سے ایسے مٹ گئی کہ گویا قرآن آسمان پر اُٹھایا گیا۔ وہ ایمان جو قرآن نے سکھلایا تھا اس سے لوگ بے خبر ہیں۔ وہ عرفان جو قرآن نے بخشا تھا اُس سے لوگ غافل ہوگئے ہیں۔ ہاں یہ سچ ہے کہ قرآن پڑھتے ہیں مگر قرآن اُن کے حلق سے نیچے نہیں اُترتا۔ انہی معنوں میں کہا گیا ہے کہ آخری زمانہ میں قرآن آسمان پر اُٹھایا جائے گا پھر انہی حدیثوں میں لکھا ہے کہ پھر دوبارہ قرآن کو زمین پر لانے والا ایک مَرد فارسی الاصل ہوگا۔" اور فرماتے ہیں کہ قرآن مجید کی ایسی تفسیر تیار کرنا "یہ میرا کام ہے دوسرے سے ہرگز ایسا نہیں ہوگا جیسا مجھ سے یا اُس سے جو میری شاخ ہے اور مجھ ہی میں داخل ہے۔"

پس یہ تفسیر جو حضرت مصلح موعود ایدہ اللہ الودود حُسن و احسان میں حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے نظیر تالیف فرما رہے ہیں حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی مندرجہ بالا خواہش کو پُورا کر رہی ہے اِس لئے قارئینِ کرام کو چاہیئے کہ وہ اس کے مؤلف حضرت امیر المؤمنین خلیفۃ المسیح الثانی ایدہ اللہ بنصرہ العزیز کے لئے بالالتزام دُعا کرتے رہیں کہ اللہ تعالیٰ حضور کو بصحت و عافیت اِس عظیم الشان تفسیر کو مکمل کرنے کی توفیق عطا فرماوے اور اِس تفسیر کو تاقیامت لوگوں کی ہدایت کا موجب بنائے۔ آمین اَللّٰھُمَّ اجْعَلْ اَفْئِدَةَ النَّاسِ تَھْوِیْ اِلَیْہِ۔

خاکسار **جلال الدین شمس** ۲۰ دسمبر ۱۹۵۷ء

* موجودہ ایڈیشن کی اِس جلد میں سُورۃ الفرقان بھی شامل کر دی گئی ہے۔ سیّد عبدالحی

الفہرست

سُوْرَةُ الْحَجِّ مَدَنِيَّةٌ

سورۃ حج - یہ سورۃ مدنی ہے۔

وَهِيَ مَعَ الْبَسْمَلَةِ تِسْعٌ وَّسَبْعُوْنَ اٰيَةً وَّعَشْرَةُ رُكُوْعَاتٍ

اور بسم اللہ سمیت اس کی ۷۹ آیات ہیں - اور دس رکوع ہیں - ؎۱

؎۱ یہ سورۃ علماء تاریخ قرآن کے نزدیک مکی اور مدنی ہے یعنی کچھ حصہ مکی اور کچھ مدنی۔ ابن عباسؓ اور مجاہد کے نزدیک آیت نمبر ۲۰، ۲۱ و ۲۲ یعنی تین آیتیں مدنی ہیں۔ ابن عباسؓ سے ایک اور روایت بھی ہے کہ تیئیسویں آیت بھی مدنی ہے گویا ان کے نزدیک چار آیتیں مدنی ہیں۔ ضحاک کا خیال ہے کہ ساری سورۃ ہی مدنی ہے۔

ترتیب قریب کی ترتیب کے لحاظ سے سورۂ انبیاء کے مضمون سے اس کا سلسلہ ملتا ہے۔ اُس سورۃ میں اصل مضمون ہی یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے لوگوں کی نافرمانیوں کی وجہ سے دنیا میں عذاب آتا رہتا ہے جو اس بات کی دلیل ہے کہ اگر انسان صحیح راستہ اختیار کرے تو وہ نجات پا سکتا ہے۔ پھر بتایا تھا کہ تیری قوم پر بھی عذاب آئیگا۔ چنانچہ سورۂ انبیاء کی آخری آیت ہی یہ تھی کہ قٰلَ رَبِّ احْكُمْ بِالْحَقِّ وَرَبُّنَا الرَّحْمٰنُ الْمُسْتَعَانُ عَلٰى مَا تَصِفُوْنَ یعنی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اے میرے رب! تُو حق کے مطابق فیصلہ کر دے اور ہمارا رب تو رحمٰن ہے اور (اے کافرو) جو تم باتیں کرتے ہو اُن کے خلاف اس سے مدد مانگی جاتی ہے۔ گویا اس آیت میں منکرین کے لئے عذاب کی دُعا سکھائی گئی تھی۔

اب سورۃ الحج میں اس دُعا کا جواب دیا۔ اور پہلی آیت ہی یہ رکھی کہ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمْ اِنَّ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ شَيْءٌ عَظِيْمٌ۔ یعنی اے لوگو! تم اپنے رب کا تقویٰ کرو۔ کیونکہ فیصلہ والا زلزلہ بہت بڑی چیز ہے۔ یعنی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے حکم سے اب دُعا میں مشغول ہو گئے ہیں۔ اگر بچنا چاہتے ہو تو اپنے نفس کی اصلاح کر کے اس عذاب سے بچنے کی دُعا میں لگ جاؤ۔

سورتوں کی لمبی ترتیب کے لحاظ سے اس سورۃ میں مریم۔ طٰہٰ اور انبیاء کے مضمون کو تکمیل تک پہنچایا گیا ہے۔ سورۃ مریم میں اصول مسیحیت بتا کر اُن کا ردّ کیا گیا تھا۔ کیونکہ مسیحیت کی تردید کئے بغیر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت ثابت نہیں ہو سکتی تھی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دعویٰ اوّل شریعت جدید کے لانے کا اور دوم ساری دنیا کی طرف آنے کا تھا۔ اگر مسیحیت اپنی اصلی شکل میں قائم تھی تو ایک سچا اور قابلِ عمل دین دنیا میں موجود تھا اُس کے ہوتے ہوئے کسی ایسی شریعت کا آنا جائز نہ تھا جو سب قوموں کیلئے ہو۔ کیونکہ جب مسیحیت ایک زندہ مذہب تھا تو مسیحیوں کو اسلام کی کیا ضرورت تھی؟ پس سورۃ مریم میں مسیحیت کے اصول کا ردّ کیا اور مسیحؑ کی پیدائش اور اس کے دعویٰ کے حالات بیان کئے اور اُسے دوسرے نبیوں جیسا ثابت کیا۔ سورۃ طٰہٰ میں مسیحیت کے اس دعویٰ کو تفصیل سے ردّ کیا کہ شریعت لعنت ہے۔ سورۃ انبیاء میں اس مضمون کی دوسرے رنگ میں وضاحت کی

کہ اگر ورثہ کے گناہ سے انسان پاک نہیں ہوسکتا تو ایک لمبا سلسلہ انبیاء کا کس لئے آیا اور اُن کے دشمنوں کو سزا کیوں ملی؟ کیونکہ ورثہ کے گناہ کی وجہ سے تو انسان مجبور ہے اور مجبور کو سزا نہیں دی جا سکتی۔

اَب اِس سورۃ میں بتاتا ہے کہ اگر مسیح آخری نقطہ روحانیت کا تھا تو اُن کے بعد کوئی نبی اور کوئی شریعت نہیں آنی چاہیئے تھی کیونکہ مسیح کامل ترین تھا۔ اور شریعت متروک ہو چکی تھی لیکن محمد رسول اللہ کا وجود اِس دعویٰ کو باطل کر دیتا ہے۔ اُس کے سچا ہونے کی **پہلی دلیل** یہ ہے کہ سابق انبیاء کی طرح اُس کے دشمن ہلاک ہونگے۔ **دوسری دلیل** یہ ہے کہ اس کی تعلیم ضروری اور پُر حکمت باتوں پر مشتمل ہے۔ **تیسری دلیل** یہ ہے کہ اس کے ماننے والے روحانی اور مادی طور پر ترقی کر جائیں گے۔ **چوتھی دلیل** یہ ہے کہ محمد رسول اللہ کو غیر معمولی برکات آسمان سے ملیں گی۔ اور **پانچویں دلیل** یہ ہے کہ تمام مذاہب کے لوگ بشمولیت مسیحیت اس سے شکست کھا جائیں گے۔

خلاصۂ سورۃ

اِس سورۃ کے شروع میں عذابِ الٰہی سے ڈرایا گیا ہے جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دشمنوں کو پہنچے گا (یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّکُمْ سے عَذَابَ اللّٰہِ شَدِیْدٌ تک۔ آیت ۲ و ۳)

پھر بتایا گیا ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ دلائل ہیں۔ اور دلائل کا مقابلہ زبانی دعوے نہیں کر سکتے۔ (وَمِنَ النَّاسِ مَنْ یُّجَادِلُ فِی اللّٰہِ بِغَیْرِ عِلْمٍ سے لَبِئْسَ الْمَوْلٰی وَلَبِئْسَ الْعَشِیْرُ تک۔ آیت نمبر ۴ تا ۱۴)

اِس کے بعد بتایا کہ محمد رسول اللہ کے ساتھ تائیداتِ سماوی ہیں۔ اِن کے ہوتے ہوئے ان کے دشمن خواہ کسی جماعت سے تعلق رکھتے ہوں کس طرح جیتنے کی اُمید رکھ سکتے ہیں۔ (اِنَّ اللّٰہَ یُدْخِلُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ سے اَنَّ اللّٰہَ یَھْدِیْ مَنْ یُّرِیْدُ تک۔ آیت ۱۵ تا ۱۷)

پھر اس کی تعلیم ایسی پُر امن اور با برکت ہے اور اس کے مخالفوں کی تعلیم ایسی تکلیف دہ ہے کہ ایک دوسرے کے مقابلہ میں ٹھہر ہی نہیں سکتی۔ (اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِیْنَ ھَادُوْا سے وَمَنْ یُّرِدْ فِیْہِ بِاِلْحَادٍۭ بِظُلْمٍ نُّذِقْہُ مِنْ عَذَابٍ اَلِیْمٍ تک آیت ۱۸ تا ۲۶)

یہ ابراہیمی دُعا کے دوسرے حصّہ کا مصداق ہے پھر یہ کیونکر ناکام رہ سکتا ہے۔ اِس کی ناکامی ابراہیم کی بھی ناکامی ہے (وَاِذْ بَوَّاْنَا لِاِبْرٰھِیْمَ مَکَانَ الْبَیْتِ سے اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ کُلَّ خَوَّانٍ کَفُوْرٍ تک آیت ۲۷ تا ۳۹)

بے شک محمد رسول اللہ کی سخت مخالفت ہے اور بے شک اُس نے ایک لمبے عرصے تک صبر کیا ہے مگر خدا تعالےٰ اسے دفاع کی اجازت دے گا اور اپنی مدد سے اسے فتح دے گا (مسیحیت دفاع کو بھی ناجائز قرار دیتی ہے۔ یہ تعلیمی مقابلہ بھی ہے) اور اس کا انجام تمام گذشتہ اولوالعزم رسولوں کی طرح ہوگا۔ (اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّھُمْ ظُلِمُوْا سے وَالَّذِیْنَ سَعَوْا فِیْٓ اٰیٰتِنَا مُعٰجِزِیْنَ اُولٰٓئِکَ اَصْحٰبُ الْجَحِیْمِ تک۔ آیت ۴۰ تا ۵۲۔)

پھر فرمایا کہ سب نبیوں کی مخالفت ضروری ہوتی ہے شیطان ان کی کامیابی کے راستہ میں روڑے اٹکاتا ہے۔ لیکن خدا تعالیٰ ہمیشہ ان روکوں کو دُور کر کے انبیاء کو فتح دیتا ہے۔ ایسا ہی اب بھی کریگا۔ اور سب ادیان پر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غالب آئیں گے اور مختلف موقعوں پر ثابت ہو جائے گا کہ وہ سچے مذہب پر قائم ہیں (وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِکَ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ①

(میں) اللہ (تعالیٰ) کا نام لے کر جو بے حد کرم کرنے والا (اور) بار بار رحم کرنیوالا ہے (پڑھتا ہوں)

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمْ ۚ اِنَّ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ شَيْءٌ

اے لوگو! تم اپنے رب کا تقویٰ کرو - کیونکہ فیصلہ والا زلزلہ بہت بڑی

عَظِيْمٌ ② يَوْمَ تَرَوْنَهَا تَذْهَلُ كُلُّ مُرْضِعَةٍ عَمَّآ

چیز ہے - جس دن تم اس کو دیکھو گے ہر دودھ پلانے والی عورت جس کو دودھ پلا رہی

مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ سے وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا فَاُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ تک۔ آیت ۵۲ تا ۵۸)

دفاعی مقابلے کی نسبت بتایا کہ یہ جائز ہوتا ہے بلکہ جو لوگ دین کے لئے دفاعی جنگ کرتے ہیں خدا تعالیٰ اُن کی مدد کرتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو دنیا میں ہدایت ناکام ہو جائے۔ (وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ قُتِلُوْٓا سے وَاَنَّ مَا يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ هُوَ الْبَاطِلُ وَاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيْرُ تک آیت ۵۹ تا ۶۳)

پھر بتایا کہ ہدایت آتی ہی کامیاب ہونے کے لئے ہے جس طرح بارش دنیا کو تازگی دینے کے لئے ہوتی ہے - یہ ایک دَور ہوتا ہے جو چلتا رہتا ہے - جب ہدایت ایک دَور ختم کر لیتی ہے تو وہ دوسرے دَور کے لئے بیکار ہو جاتی ہے اور نئے دَور کی تعلیم کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ (اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً سے اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ" تک۔ آیت ۶۴ تا ۷۱)

فرماتا ہے کہ اس کا بڑا نشان یہ ہوتا ہے کہ پہلے دَور کی ہدایت (انسانی خیالات سے مخلوط ہو جانے

اور نئے زمانہ کی ضرورتوں کو پورا نہ کر سکنے کی وجہ سے) خدائی تائید سے محروم ہو جاتی ہے۔ اگر وہ اب تک خدا تعالیٰ کی پسندیدہ ہدایت ہوتی تو جو نصرت اُسے پہلے ملتی تھی اب کیوں نہ ملتی۔ یہی وجہ ہے کہ سابق ہدایت کے مدعی خدا تعالیٰ کی جگہ اپنے ہاتھ میں سزا لینا چاہتے ہیں مگر خدا تعالیٰ کی نصرت سے محرومی کی وجہ سے ناکام ہو جاتے ہیں۔ (وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا سے وَعَدَهَا اللّٰهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ تک آیت ۷۲ تا ۷۳)

پھر بتایا کہ خدا تعالیٰ کی نصرت کے مقابلہ میں ہر ایک سابق کا منصور مذہب بالکل بے کار ہو کر رہ جاتا ہے اور خدائی آواز جس نئے وجود کے حق میں اُٹھتی ہے وہی جیتتا ہے۔ (يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ ضُرِبَ مَثَلٌ سے وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ تک۔ آیت ۷۴ تا ۷۷)

اس وقت چونکہ محمد رسول اللہ وہ موعود وجود ہیں۔ اس لئے خدا تعالیٰ کی مدد ان کو حاصل ہوگی پس ان کے پیروؤں کو ان کی پوری اطاعت کرنی چاہیئے تاکہ وہ کامیاب ہوں۔ انہیں یاد رکھنا چاہیئے کہ

اَرْضَعَتْ وَتَضَعُ كُلُّ ذَاتِ حَمْلٍ حَمْلَهَا وَتَرَى

ہوگی اُس کو بھول جائیگی۔ اور ہر حاملہ عورت اپنے حمل کو گرا دے گی۔ اور تو لوگوں کو

النَّاسَ سُكٰرٰى وَمَا هُمْ بِسُكٰرٰى وَلٰكِنَّ عَذَابَ

دیکھیگا کہ وہ بدمستوں کی طرح ہیں حالانکہ وہ بدمست نہیں ہونگے لیکن اللہ کا عذاب

اللّٰهِ شَدِيْدٌ ﴿۲﴾ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ فِى اللّٰهِ

بڑا سخت ہے ۵ اور لوگوں میں سے بعض ایسے بھی ہوتے ہیں جو اللہ (تعالیٰ) کے بارہ میں

سابق پیشگوئیاں بھی ان کے حق میں ہیں۔ اور اُن کا رسول ہی موعود نہیں بلکہ ان کی قوم بھی موعود ہے اور خدا تعالیٰ کی مدد سے وہ کامیاب ہونگے۔ (يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ارْكَعُوْا وَاسْجُدُوْا سے نِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِيْرُ تک۔ آیت ۷۸ تا ۷۹)

اَلسَّاعَةُ

۵ حل لغات

اِتَّقُوْا

:- اِتَّقُوْا۔ وَقٰى سے باب افتعال اِتَّقٰى بنتا ہے۔ اور اِتَّقُوْا اسی باب سے امر کا جمع مذکر کا صیغہ ہے۔ وَقَاهُ کے معنے ہیں سَتَرَهٗ عَنِ الْاَذٰى وَصَانَهٗ وَحَفِظَهٗ: اُس کو تکلیف سے بچایا اور محفوظ رکھا (اقرب)۔ مفردات میں ہے۔ اَلْوِقَايَةُ: حِفْظُ الشَّيْءِ مِمَّا يُؤْذِيْهِ وَيَضُرُّهٗ یعنی وِقَايَة (جو وَقٰى کا مصدر ہے) کے معنے ہیں کسی چیز کو اس امر سے بچانا جو اس کو نقصان پہنچائے یا تکلیف دے۔ اور اَلتَّقْوٰى کے معنے ہیں جَعْلُ النَّفْسِ فِىْ وِقَايَةٍ مِمَّا يُخَافُ۔ خطرے والی چیزوں سے نفس کو حفاظت میں رکھنا (مفردات) اسی طرح اَلْوِقَايَةُ کے معنے ہیں وہ چیز جس کے ذریعہ سے دوسری چیز بچائی جاتی ہے (اقرب)۔ جیسے درخت کی چھال یا کتاب کی جلد۔ پس اِتَّقُوْا کے معنے ہونگے۔ اللہ تعالیٰ کو آفات سے بچنے کے لئے ڈھال بناؤ۔

تَذْهَلُ

اَلسَّاعَةُ: جُزْءٌ مِنْ اَجْزَاءِ الزَّمَانِ۔ زمانہ کے حصوں میں سے ایک حصہ جسے ہم گھڑی یا کچھ وقت سے تعبیر کرتے ہیں۔ وَيُعَبَّرُ بِهٖ عَنِ الْقِيَامَةِ اور ساعۃ کے لفظ سے کبھی قیامت بھی مراد لی جاتی ہے۔ وَقِيْلَ اَلسَّاعَاتُ الَّتِىْ هِىَ الْقِيَامَةُ ثَلَاثَةٌ اَلسَّاعَةُ الْكُبْرٰى وَهِىَ بَعْثُ النَّاسِ لِلْمُحَاسَبَةِ۔ علماء نے بیان کیا ہے کہ وہ ساعات جن کو قیامت کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے تین ہیں (۱) اَلسَّاعَةُ الْكُبْرٰى جبکہ لوگوں کو محاسبہ کے لئے قبروں سے اٹھایا جائیگا (۲) اَلسَّاعَةُ الْوُسْطٰى وَهِىَ مَوْتُ اَهْلِ الْقَرْنِ ساعت وسطیٰ۔ اور یہ ایک زمانہ کے لوگوں کا مرنا اور ختم ہونا ہے۔ (۳) وَالسَّاعَةُ الصُّغْرٰى وَهِىَ مَوْتُ الْاِنْسَانِ فَسَاعَةُ كُلِّ اِنْسَانٍ مَوْتُهٗ۔ اور ساعت صغریٰ انسانی موت کا نام ہے۔ پس ہر انسان کی ساعت اُس کی موت ہے (مفردات) پس اَلسَّاعَةُ کے معنے ہونگے۔ ہلاکت کی گھڑی۔ یا وہ خاص گھڑی جس کا انتظار کیا جا رہا ہے۔

تَذْهَلُ: ذَهَلَ سے مضارع واحد مؤنث کا صیغہ ہے اور ذَهَلَهٗ کے معنے ہیں نَسِيَهٗ بِشُغْلٍ کسی کام کی وجہ سے جس میں وہ مشغول تھا اسے بھول گیا

(اقرب) پس تَذْهَلُ کے معنے ہونگے وہ بھول جائیگی۔
سُکٰرٰی: سَکْرَان کی جمع ہے جو سَکِرَ سے
صفت مشبّہ کا صیغہ ہے۔ اور سَکِرَ مِنَ الشَّرَابِ
کے معنے ہیں شراب کے نشے سے مدہوش ہوگیا (اقرب)
پس سُکَارٰی کے معنے مدہوش کے ہیں۔

تفسیر:۔ اس آیت کے متعلق یہ امر یاد رکھنا چاہیئے کہ ضروری نہیں کہ اس آیت کا مفہوم آخرت پر ہی چسپاں کیا جائے۔ بلکہ شدید جنگوں یا زلزلوں میں بھی یہ حالت پیش آتی رہتی ہے جب ضلع کانگڑہ میں ۱۹۰۵ء کا زلزلہ آیا جس سے تیس ہزار کے قریب آدمی مر گئے تھے اور جو زخمی ہوئے اُن کی تعداد اس سے بہت زیادہ تھی اور گاؤں کے گاؤں اس طرح مٹ گئے کہ ان کا نام و نشان نہ رہا اور تمام پنجاب ایک سرے سے دوسرے سرے تک ہل گیا تو اُس وقت لوگوں کا بالکل یہی حال ہوا تھا۔ اسی طرح ۱۹۳۵ء میں جب کوئٹہ میں زلزلہ آیا اور مجروح اور زلزلہ سے بچے ہوئے لوگ سپیشل ٹرینوں کے ذریعہ واپس آتے تو لوگ دیوانہ وار روتے ہوئے سٹیشنوں پر اِدھر اُدھر اپنے رشتہ داروں کی تلاش میں دوڑے پھرتے۔ اور جب انہیں اپنا کوئی رشتہ دار نظر نہ آتا تو ان کے نالہ و بکا سے ماتم برپا ہو جاتا۔ ایک اخبار کے نامہ نگار نے لکھا کہ میں نے ایک عورت کو دیکھا وہ اس طرح اسٹیشن پر پھر رہی تھی جس طرح ایک شرابی نشہ میں مدہوش ہو کر لڑھکتا پھرتا ہے۔ وہ کبھی دائیں گرتی کبھی بائیں اور روتے ہوئے کہتی کہ سارے ہی مر گئے کوئی بھی نہیں بچا۔ بعض لوگوں نے بیان کیا کہ جب مصیبت زدہ لوگوں سے پوچھا جاتا تو وہ جواب دینے کی بجائے چیخیں مار کر رو پڑتے پھر کئی آدمی اس صدمہ کی وجہ سے پاگل ہو گئے۔ ان دنوں اخبارات میں چھپا تھا کہ کوئٹہ سے ملتان کو گاڑی آ رہی تھی کہ رستہ میں دو عورتیں شدتِ غم کی وجہ سے پاگل ہو گئیں۔ ایک اَور شخص بھی دیوانہ ہو گیا اور اُس نے چلتی گاڑی سے چھلانگ لگا دی۔ غرض یہ ایک ایسا دردناک نظارہ تھا کہ اس نظارہ کو دیکھنے والے تو کیا پڑھنے والے بھی ششدر رہ جاتے تھے اور اُن کے دل کرب و اضطراب سے بھر جاتے تھے۔

سُکَارٰی

اسی طرح ۱۵ رجنوری ۱۹۳۴ء کو جب بہار میں ایک قیامت نما زلزلہ آیا جس کے متعلق لارڈ ریڈنگ سابق وائسرائے ہند نے لنڈن میں ایک تقریر کرتے ہوئے چشم پُر آب ہو کر کہا تھا کہ

"یہ زلزلہ ایسا ہیبت ناک ہے کہ ہندوستان کی تاریخ میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔"

(اخبار سول ۱۰ رفروری ۱۹۳۴ء)

تو اُس وقت بھی لوگوں کی یہی کیفیت ہوئی تھی۔ اخبار "حقیقت" لکھنؤ نے لکھا کہ

"انسان تو انسان حیوان بھی اس قہرِ خدا سے حواس باختہ ہو گئے تھے۔ اور درندے نہایت بدحواسی سے آدمیوں کے پاس بھاگتے ہوئے جا رہے تھے۔"

("حقیقت" ۱۸ رجنوری ۱۹۳۴ء)

"امرت بازار پترکا" کے نامہ نگار نے لکھا کہ

"میں نے کئی آدمیوں کو کھڑکیوں سے چھلانگیں لگاتے دیکھا۔ مگر اُن کے نیچے آنے سے پہلے دیواریں گر جاتی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انسانی سروں۔ ہاتھوں اور بازوؤں کی بارش ہو رہی ہے۔"

(پرتاپ لاہور ۲۶ رجنوری ۱۹۳۴ء)

مونگھیر کی تباہی کے متعلق ایک شخص نے اپنا چشم دید ماجرا بیان کرتے ہوئے لکھا کہ اُس وقت

"زمین میں دائیں اور بائیں دو حرکتیں ہوئیں بعد ازاں ایسا معلوم ہوا کہ کسی نے زمین کو چرخی پر رکھ کر گھما دیا ہے۔ میرے ہوش و حواس زائل ہو گئے۔ آدھ گھنٹہ کے بعد سنبھلا تو ایک عجیب منظر میرے سامنے تھا۔ جہاں تک نظر جاتی تھی کھنڈر ہی کھنڈر دکھائی دیتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میں مونگھیر میں نہیں۔ شہر کی حالت اتنی تبدیل ہو گئی تھی کہ میں اپنا گھر بھی نہ پہچان سکا۔" (انقلاب یکم فروری ۱۹۳۴ء)

اخبار "ملاپ" کے ایڈیٹر نے لکھا کہ

"باپ بچوں کی تلاش میں سرگردان ہیں۔ بچے اپنے ماتا پتا کو تلاش کر رہے ہیں۔ گرے ہوئے مکانات میں جو بچے بچ رہے ہیں وہ ایک ایک اینٹ اُٹھا کر دیکھ رہے ہیں کہ اُن کے ماتا پتا نیچے سے نظر آ سکیں اور انہیں پیار سے بلا سکیں لیکن بھونچال نے کس کو زندہ رہنے دیا ہے جب مکان کھودتے کھودتے لاش نکلتی ہے تو پھر چیخ و پکار کا کیا ٹھکانہ۔ پتھر سے پتھر دل بھی روتا ہے۔"

("ملاپ" ۲۵ر جنوری ۱۹۳۴ء)

یہی حال جنگ میں بھی ہوتا ہے۔ چنانچہ ایک حدیث میں آتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ جنگ میں ایک عورت کو دیکھا جو دیوانہ وار دوڑی پھرتی تھی۔ اُس کا بچہ کہیں گُم ہو گیا تھا۔ وہ کبھی ایک بچّہ کو اُٹھاتی اور کبھی دوسرے کو اور پھر پاگلوں کی طرح اپنے بچّہ کی تلاش میں نکل کھڑی ہوتی۔ یہاں تک کہ اُسے اپنا بچّہ نظر آ گیا۔ اُس نے لپک کر اُسے گود میں اُٹھا لیا۔ اُس سے پیار کرنے لگی۔ اور پھر آرام اور سکون سے بیٹھ کر اُسے دودھ پلانے لگ گئی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ نظارہ دیکھا تو فرمایا کہ تم نے جو اس عورت کی گھبراہٹ کا نظارہ دیکھا ہے اِس سے کہیں زیادہ گھبراہٹ اللہ تعالیٰ کو اپنے گنہگار بندے کے پانے کی ہوتی ہے۔ (مسلم کتاب التوبہ)

یہ جو کہا گیا ہے کہ تُو اُن لوگوں کو شراب سے متوالے دیکھیگا حالانکہ وہ شراب سے متوالے نہیں ہونگے اِس کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح متوالے کی حرکات اس کے قبضے میں نہیں ہوتیں اسی طرح ڈر کی وجہ سے اِن لوگوں کی حرکات بھی اُن کے قبضہ میں نہیں ہونگی خطرناک جنگ میں بھی لوگوں کا یہی حال ہوتا ہے۔ چنانچہ اگر اس آیت کو جنگ پر ہی چسپاں کیا جائے تو میرے نزدیک اس کو فتح مکّہ پر چسپاں کرنا چاہیئے۔ اِس سورۃ کا نام بھی سورۃ الحج رکھا گیا ہے جس میں اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ ایک عظیم الشان جنگ کے نتیجہ میں مسلمانوں کے لئے حج ممکن ہو جائیگا۔ یہ امر یاد رکھنا چاہیئے کہ اکثر سورتوں کے نام رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے خود رکھے ہیں اور اس سورۃ کے تیسرے رکوع میں حج کا ذکر بھی آتا ہے۔ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کا بھی ذکر ہے جن کے ذریعہ حج بیت اللہ قائم ہوا۔ پس یہ آیتیں ایک عظیم لڑائی پر دلالت کرتی ہیں جس کے بعد مسلمانوں کے لئے حج کا راستہ کھل جانا مقدّر تھا۔

بیشک اس آیت میں زَلْزَلَةُ السَّاعَةِ کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں جن سے بادیُ النظر میں یہ شبہ پیدا ہو سکتا ہے کہ شاید اس میں عالم آخرت کے اُس عذاب کا ذکر کیا گیا ہے جو کفار کے لئے مقدّر ہے لیکن یہ درست نہیں۔ قرآن کریم کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں ساعۃ کا لفظ صرف اُخروی قیامت

کے لئے استعمال نہیں کیا گیا بلکہ انبیاء کی جماعتوں کی ترقی اور اُن کے دشمنوں کی تباہی کے لئے بھی ساعت کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ مثلاً سورۃ بقرہ میں ہی اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔
زُيِّنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَيَسْخَرُوْنَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ اتَّقَوْا فَوْقَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَاللّٰهُ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ.
(بقرۃ ع ۲۶) یعنی جن لوگوں نے کفر اختیار کیا ہے انہیں دنیوی زندگی خوبصورت کرکے دکھائی گئی ہے۔ اور وہ اُن لوگوں سے جو ایمان لائے ہیں ہنسی اور تمسخر کرتے ہیں حالانکہ جن لوگوں نے تقویٰ اختیار کیا ہے وہ اِن کفار پر قیامت کے دن غالب ہونگے۔ اور اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے بے حساب رزق دیتا ہے۔ اِس آیت میں بتایا گیا ہے کہ کفار اس دُنیا کی زندگی کو ہی اپنا منتہیٰ قرار دیتے ہیں اور انہیں اپنی طاقت پر بڑا گھمنڈ ہے۔ حالانکہ اصل چیز انجام ہے اور انجام مسلمانوں کا اچھا ہوگا اور وہ قیامت کے دن اِن کفار پر غالب آجائیں گے۔ اب اگر اِس کے یہ معنے کئے جائیں کہ مرنے کے بعد اگلی زندگی میں مسلمانوں کو کفار پر غلبہ میسّر آجائیگا تو یہ معنے کفار کے لئے اسلام کی صداقت کا کوئی ثبوت نہیں رہتے۔ وہ تو کہیں گے کہ یہ تمہاری اپنی خوابیں ہیں۔ ہمیں تو نہ مرنے کے بعد کی زندگی پر یقین ہے اور نہ ہم یہ مان سکتے ہیں کہ تمہیں اُس زندگی میں ہم پر کوئی غلبہ میسّر آئیگا۔ یہ محض زبانی دعوے ہیں جن میں کوئی حقیقت نہیں۔ پھر یہ بھی قابلِ غور بات ہے کہ جب مرنے کے بعد ایمان لانا کسی انسان کو کوئی نفع نہیں پہنچا سکتا تو کفار کے سامنے مسلمانوں کے اِس غلبہ کو پیش کرنے کا فائدہ کیا ہوگا۔ پس یہ آیت اگر عالمِ آخرت پر چسپاں کی جائے تو اس کے کوئی معنے ہی نہیں بنتے۔ اور نہ یہ اسلام کی صداقت کا کوئی ثبوت قرار پا سکتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اسجگہ یوم القیامۃ سے مُراد فتح مکّہ وغیرہ کی قسم کے واقعات ہیں جن میں مسلمانوں کو ایسا بیّن غلبہ میسّر آیا کہ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کفار سے پُوچھا کہ بتاؤ اب تمہارے ساتھ کیا سلوک کیا جائے۔ تو انہوں نے کہا۔ آپ ہم سے وہی سلوک کریں جو یوسف نے اپنے بھائیوں کے ساتھ کیا تھا۔ گویا انہوں نے اقرار کرلیا کہ جس طرح یوسف ایک دن اپنے بھائیوں پر غالب آگیا تھا اسی طرح تجھے بھی خدا نے ہم پر غلبہ عطا کر دیا ہے۔ پس ہم تجھ سے اس سلوک کی امید رکھتے ہیں جو یوسف نے اپنے بھائیوں کے ساتھ کیا تھا۔ چنانچہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی فرمادیا کہ لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ يَغْفِرُ اللّٰهُ لَكُمْ وَهُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ اِذْهَبُوْا فَاَنْتُمُ الطُّلَقَاءُ (سیرۃ الحلبیہ جلد ۳ صفحہ ۱۱۳) یعنی آج تم پر کوئی گرفت نہیں اللہ تعالیٰ تمہارے قصوروں کو معاف فرمائے کہ وہ سب رحم کرنے والوں سے زیادہ رحم کرنے والا ہے۔ جاؤ تم سب کے سب آزاد ہو۔ قرآن کریم کی یہ آیت بتاتی ہے کہ قیامۃ کے لفظ کا استعمال اسلامی فتوحات کے لئے بھی کیا گیا ہے۔ اِسی طرح يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمْ اِنَّ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ شَيْءٌ عَظِيْمٌ. يَوْمَ تَرَوْنَهَا تَذْهَلُ كُلُّ مُرْضِعَةٍ عَمَّآ اَرْضَعَتْ وَتَضَعُ كُلُّ ذَاتِ حَمْلٍ حَمْلَهَا وَتَرَى النَّاسَ سُكٰرٰى وَمَا هُمْ بِسُكٰرٰى وَلٰكِنَّ عَذَابَ اللّٰهِ شَدِيْدٌ میں فتح مکّہ کی پیشگوئی کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ کفار پر ایک قیامت نما زلزلہ آنے والا ہے۔ جس کو دیکھ کر وہ ایسے سراسیمہ اور حیران ہوجائیں گے کہ انہیں اپنے بچاؤ کی کوئی صورت نظر نہیں آئے گی اور وہ بدمستوں کی طرح لڑھک رہے ہونگے۔ چنانچہ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ صلح حدیبیہ کے بعد جب معاہدہ کی

خلاف ورزی کرتے ہوئے قریش مکہ نے بنوبکر کے ساتھ مل کر مسلمانوں کے معاہد قبیلہ بنوخزاعہ پر حملہ کر دیا اور اُن کے کئی آدمی مار ڈالے تو بنوخزاعہ نے فوراً چالیس آدمی تیز اونٹوں پر بٹھا کر مدینہ میں اس بدعہدی کی اطلاع دینے کے لئے روانہ کر دیئے اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مطالبہ کیا کہ باہمی معاہدہ کے مطابق اب آپ ہمارا بدلہ لیں اور مکہ پر چڑھائی کریں۔ یہ وفد ابھی مدینہ نہیں پہنچا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے کشفی رنگ میں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو مکہ والوں کی اس بدعہدی کی اطلاع دے دی۔ چنانچہ حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ایک رات جبکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی میرے ہاں باری تھی آپ رات کے وقت تہجد کیلئے اُٹھے۔ جب آپ وضو کر رہے تھے تو مَیں نے سُنا کہ آپ نے بلند آواز سے فرمایا۔ لَبَّیْکَ۔ لَبَّیْکَ۔ لَبَّیْکَ! اور پھر آپ نے تین دفعہ فرمایا نُصِرْتَ۔ نُصِرْتَ۔ نُصِرْتَ۔ حضرت میمونہؓ کہتی ہیں۔ مَیں نے کہا۔ یا رسول اللہ! آپ نے یہ کیا فقرات فرمائے ہیں۔ یہ تو ایسے الفاظ ہیں۔ جیسے آپ کسی سے گفتگو فرما رہے تھے۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ مَیں نے ابھی دیکھا ہے کہ خزاعہ کا ایک وفد میرے پاس آیا ہے اور وہ لوگ کہہ رہے ہیں کہ قریش نے بنوبکر کے ساتھ مل کر اُن پر حملہ کر دیا ہے اور اُن کے کئی آدمی مار ڈالے ہیں۔ اب آپ معاہدہ کے مطابق ہماری مدد کریں اور مکہ والوں پر چڑھائی کریں۔ اور مَیں نے انہیں کہا ہے کہ مَیں تمہاری مدد کے لئے بالکل تیار ہوں۔ اب اِدھر تو خزاعہ والوں نے اپنا وفد مدینہ بھجوا دیا۔ اور اُدھر مکہ والوں کو فکر ہوئی کہ اگر ہماری معاہدہ شکنی کی خبر مدینہ پہنچی تو مسلمان ہمارا مقابلہ کریں گے۔ چنانچہ انہوں نے ابوسفیان کو مدینہ بھجوایا اور اُسے کہا کہ جس طرح بھی ہوسکے۔ تم اس معاہدہ میں ردّ و بدل کروا دو تاکہ ہم پر معاہدہ شکنی کا کوئی الزام نہ آئے۔ وہ مدینہ پہنچا اور اُس نے یہ زور دینا شروع کیا کہ چونکہ صلح حدیبیہ کے وقت میں موجود نہیں تھا اور مَیں مکہ کا بڑا رئیس ہوں اس لئے میرے دستخطوں کے بغیر وہ معاہدہ کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ اب مَیں چاہتا ہوں کہ نئے سِرے سے معاہدہ کیا جائے۔ وہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بھی حاضر ہوا اور حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ سے بھی ملا مگر کسی نے اس کی طرف توجہ نہ کی۔ آخر جب ہر طرف سے مایوس ہو گیا تو خود ہی مسجد میں کھڑے ہو کر اُس نے اعلان کر دیا کہ چونکہ مَیں اس معاہدہ میں شامل نہیں تھا اور مَیں مکہ کا رئیس ہوں اس لئے وہ معاہدہ کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ اَب مَیں نئے سِرے سے معاہدہ کرتا ہوں۔ مسلمان اُس کی اِس بے وقوفی پر ہنس پڑے اور وہ سخت ذلیل اور شرمندہ ہوا اور ناکام مکہ کو واپس چلا گیا۔ اسی دوران میں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے مکہ پر حملہ کرنے کے لئے دس ہزار کا لشکر تیار کر لیا اور آپ منزلوں پر منزلیں طے کرتے ہوئے رات کے وقت مکہ کے قریب جا پہنچے اور آپ نے حکم دے دیا کہ ہر خیمہ کے آگے آگ روشن کی جائے۔ ایک جنگل میں رات کے وقت دس ہزار آدمیوں کے خیموں کے سامنے بھڑکتی ہوئی آگ ایک ہیبتناک منظر پیش کر رہی تھی۔ مگر چونکہ آپ نے یہ تیاری نہایت مخفی رکھی تھی۔ اِس لئے مکہ والوں کو اِس بات کا کوئی علم نہ تھا کہ اسلامی لشکر اُن کے سامنے ڈیرہ ڈالے پڑا ہے۔ لیکن اندر ہی اندر وہ سخت خوف زدہ تھے۔ اور ابوسفیان کی ناکامی انہیں اور زیادہ پریشان کر رہی تھی۔ آخر انہوں نے دوبارہ ابوسفیان سے کہا کہ تم پھر مدینہ جاؤ اور مسلمانوں کے ارادوں کی خبر لو۔ ابوسفیان اپنے ساتھیوں کے ساتھ جب مکہ سے باہر نکلا تو اُس نے سارے جنگل کو آگ سے

روشن پایا - وہ حیران ہوا کہ یہ کون لوگ ہیں۔ چنانچہ ابوسفیان نے اپنے ساتھیوں سے پُوچھا کہ یہ کیا ہے۔ کیا آسمان سے کوئی لشکر اُتر آیا ہے - انہوں نے مختلف قبائل کے نام لئے مگر ابوسفیان ہر نام پر کہتا کہ اس قبیلہ کے لوگ تو بہت تھوڑے ہیں اور اِن کی تعداد بہت زیادہ ہے - ابھی وہ یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ اندھیرے میں آواز آئی - ابوحنظلہ ! یہ ابوسفیان کی کُنیت تھی - ابوسفیان نے آواز پہچان لی - اور کہا - عباس ! تم کہاں ؟ اُس نے کہا - سامنے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا لشکر پڑا ہے - اگر تم اپنی جان کی خیر چاہتے ہو تو فوراً میرے پیچھے سواری پر بیٹھ جاؤ - ورنہ عمرؓ میرے پیچھے آ رہا ہے اور وہ تیری خبر لیگا - چنانچہ حضرت عباسؓ نے جو ابوسفیان کے گہرے دوست تھے اس کا ہاتھ پکڑا اور کھینچ کر اپنے پیچھے بٹھالیا - اور سواری کو دوڑاتے ہوئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جا پہنچے - وہاں جاتے ہی ابوسفیان کو انہوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں میں دھکا دیکر گرا دیا - اور عرض کیا یا رسول اللہ ابوسفیان بیعت کرنے کے لئے حاضر ہوا ہے - ابوسفیان اِس نظارہ کو دیکھکر اسقدر مبہوت ہو چکا تھا کہ اس کے مُنہ سے بات تک نہ نکلی - رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اُسے دیکھا تو فرمایا - عباس ! ابوسفیان کو اپنے ساتھ لے جاؤ اور رات کو اپنے پاس رکھو - صبح اسے میرے پاس لانا - جب صبح اُسے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس لایا گیا تو اُس وقت فجر کی نماز کا وقت تھا - جب اُس نے دیکھا کہ ہزاروں مسلمان محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتداء میں کبھی کھڑے ہو جاتے ہیں - کبھی رکوع میں چلے جاتے ہیں - کبھی سجدہ میں گر جاتے ہیں اور کبھی تشہد میں بیٹھ جاتے ہیں تو اُس نے اپنی بیوقوفی سے سمجھا کہ شاید یہ میرے لئے کوئی نئی قسم کا عذاب تجویز ہو رہا ہے اور میرے قتل کی تدبیریں ہو رہی ہیں - چنانچہ اُس نے حضرت عباسؓ سے کہا کہ عباس ! یہ لوگ صبح صبح کیا کر رہے ہیں - مَیں دیکھتا ہوں کہ محمد رسول اللہ کھڑے ہوئے تو دس ہزار آدمی اُنکی اقتداء میں کھڑے ہو گئے - وہ رکوع میں گئے تو دس ہزار آدمی رکوع میں چلے گئے - وہ سجدہ میں گرے تو دس ہزار آدمی سجدہ میں گر گئے - وہ تشہد میں بیٹھے تو دس ہزار آدمی تشہد میں بیٹھ گئے - حضرت عباسؓ نے کہا - یہ لوگ نماز پڑھ رہے ہیں - وہ حیران ہو کر کہنے لگا - مَیں نے قیصر کا دربار بھی دیکھا ہے اور کسریٰ کا بھی - مگر مَیں نے تو ان بڑے بڑے بادشاہوں کی بھی اسطرح اطاعت نہیں دیکھی جس طرح یہ لوگ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کر رہے ہیں - حضرت عباسؓ نے کہا - ابوسفیان تم تو یہ کہتے ہو - اِن لوگوں کی تو یہ کیفیت ہے کہ اگر محمد رسول اللہ انہیں کہیں کہ کھانا پینا چھوڑ دو تو یہ کھانا پینا بھی چھوڑ دیں - نماز کے بعد حضرت عباسؓ ابوسفیان کو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لے گئے - آپ نے ابوسفیان کو دیکھا اور فرمایا کہ ابوسفیان کیا ابھی تم پر وہ حقیقت روشن نہیں ہوئی کہ خدا کے سوا کوئی معبود نہیں - ابوسفیان نے کہا - میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں - مَیں یہ بات اچھی طرح سمجھ چکا ہوں کہ اگر خدا کے سوا کوئی اور بھی معبود ہوتا تو ہماری کچھ تو مدد کرتا - اِس کے بعد رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا - ابوسفیان ! کیا ابھی وقت نہیں آیا کہ تم سمجھ لو کہ مَیں اللہ کا رسول ہوں - ابوسفیان نے تردّد کا اظہار کیا - مگر حضرت عباسؓ کے زور دینے کی وجہ سے اور کچھ اِس وجہ سے کہ اُس کے دونوں ساتھیوں نے بھی بیعت کر لی تھی اُس نے بھی اسلام قبول کر لیا - پھر اُس نے کہا - یا رسول اللہ ! اگر مکہ کے لوگ تلوار

بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّيَتَّبِعُ كُلَّ شَيْطٰنٍ مَّرِيْدٍ ④ كُتِبَ عَلَيْهِ اَنَّهٗ

بغیر علم کے بحث کرتے ہیں (اور ہر حق سے) دُور اور سرکش کی اتباع کرتے ہیں (حالانکہ) اِن (سرکشوں اور حق سے دُور

مَنْ تَوَلَّاهُ فَاَنَّهٗ يُضِلُّهٗ وَيَهْدِيْهِ اِلٰى عَذَابِ السَّعِيْرِ ⑤

لوگوں) کے متعلق فیصلہ کیا جاچکا ہے کہ جو شخص بھی ایسے آدمیوں میں سے کسی کے ساتھ دوستی کریگا وہ (سرکش اور حق سے دُور شخص) اُسکو بھی گمراہ کردیگا اور
اُسے دوزخ کے عذاب کی طرف لے جائیگا

نہ اُٹھائیں تو کیا وہ امن میں ہونگے؟ آپ نے فرمایا۔ ہاں! ہر شخص جو اپنے گھر کا دروازہ بند کرلیگا اور مقابلہ نہیں کریگا اُسے اَمن دیا جائیگا۔ حضرت عباسؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! ابوسفیان کو اپنے اعزاز کا زیادہ خیال رہتا ہے اس کی عزت کا بھی کوئی سامان کیا جائے۔ آپ نے فرمایا اچھا جو شخص ابوسفیان کے گھر میں داخل ہوجائیگا اُسے بھی امن دیا جائیگا۔ اُس نے کہا۔ یا رسول اللہ! مکہ کی آبادی کو مدنظر رکھتے ہوئے ابوسفیان کا گھر بہت چھوٹا ہے۔ آپ نے فرمایا۔ جو شخص حکیم بن حزام کے گھر میں داخل ہوجائیگا اُسے بھی امن دیا جائیگا۔ اور جو شخص اپنے ہتھیار پھینک دیگا اُسے بھی امن دیا جائیگا۔ اور جو کوئی خانہ کعبہ میں چلا جائیگا اُس کو بھی امن دیا جائیگا۔ اُس نے کہا۔ یا رسول اللہ! یہ جگہیں بھی مکہ کی آبادی کے لحاظ سے کافی نہیں۔ آپ نے فرمایا۔ اچھا میرے پاس کچھ کپڑا لاؤ۔ جب کپڑا لایا گیا تو آپ نے اُس کا ایک جھنڈا بنایا اور پھر وہ جھنڈا آپ نے ایک صحابیؓ ابو رویحہؓ کو دیا جو حضرت بلالؓ کے بھائی بنے ہوئے تھے۔ اور فرمایا کہ یہ بلالؓ کا جھنڈا ہے جو کوئی اِس کے نیچے آکر کھڑا ہوجائیگا اُس کو بھی معاف کردیا جائیگا۔

یہ تاریخی واقعہ بتاتا ہے کہ جب ابوسفیان نے مکہ میں جاکر اعلان کیا ہوگا۔ تو کس طرح لوگ پاگلوں کی طرح اپنے اپنے گھروں کی طرف۔ خانہ کعبہ کی طرف۔ بلالؓ کے جھنڈے کی طرف اور ابوسفیان اور حکیم بن حزام کے گھر کی طرف دوڑ پڑے ہونگے۔ اور کس طرح اُن کے دل اُس وقت لرز رہے اور ٹانگیں لڑکھڑا رہی ہونگی۔ اور اُن کے حواس باختہ ہو رہے ہوں گے؟

اِس موقعہ پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو بلالؓ کا جھنڈا بنایا یہ ایک لطیف طریقہ مکہ والوں کو ذلیل کرنے اور بلالؓ کا دل خوش کرنے کا تھا۔ مکہ والے سالہا سال تک بلالؓ کو اُس کے اسلام لانے کی وجہ سے مارا کرتے تھے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں خیال آیا کہ بلالؓ دل میں کہیگا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی قوم کو تو معاف کردیا مگر میرے سینہ اور چھاتی پر لگے ہوئے زخموں کا کوئی بدلہ نہ لیا۔ پس آپ نے اُن کا جھنڈا بناکر اُن کے ایک مُنہ بولے بھائی کے ہاتھ میں دے دیا اور فرمایا کہ جو کوئی بلالؓ کے جھنڈے کے نیچے آکر کھڑا ہوگا اُسے بھی معاف کیا جائیگا۔ (سیرۃ الحلبیہ جلد ۳ صفحہ ۹۳) اور اِس طرح ایک ہی وقت میں آپ نے اپنی رحملی کا ثبوت بھی دے دیا اور بلالؓ کے زخموں پر پھایا بھی لگا دیا اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِ مُحَمَّدٍ وَّبَارِكْ وَسَلِّمْ۔

۳ حل لغات

۱۔ مَرِيْدٌ: اَلْخَبِيْثُ اَلْمُتَمَرِّدُ الشِّرِّيْرُ۔ مَرِيْد کے معنے ہیں شریر اور سرکش۔

اَلسَّعِيْرُ کے معنے ہیں اَلنَّارُ۔ آگ (اقرب)

تفسیر:۔ فرماتا ہے کہ بغیر واضح دلیل کے

مَرِيْد

يَاۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ فَاِنَّا

اے لوگو! اگر تم دوبارہ اٹھائے جانے کے متعلق شبہ میں ہو تو (یاد رکھو) ہم نے

خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ

تم کو پہلے مٹی سے پیدا کیا تھا - پھر نطفہ سے پھر ترقی دیکر ایک ایسی حالت سے جو کہ چمٹ جانیکی خاصیت

ثُمَّ مِنْ مُّضْغَةٍ مُّخَلَّقَةٍ وَّغَيْرِ مُخَلَّقَةٍ لِّنُبَيِّنَ لَكُمْ

رکھتی تھی پھر ایسی حالت سے کہ وہ ایک بوٹی کے مشابہ تھی کچھ عرصہ تک تو وہ ایک کامل بوٹی کی شکل رہی اور کچھ عرصہ تک ناقص

وَنُقِرُّ فِي الْاَرْحَامِ مَا نَشَآءُ اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى

بوٹی کی شکل رہی تاکہ ہم تم پر (حقیقت حال) ظاہر کر دیں - اور ہم جس چیز کو چاہتے ہیں رحموں میں ایک مدت تک قائم کر دیتے

ثُمَّ نُخْرِجُكُمْ طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُغُوْۤا اَشُدَّكُمْ وَ

ہیں - پھر ہم تم کو ایک بچہ کی شکل میں نکالتے ہیں - (پھر بڑھاتے جاتے ہیں) جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ تم اپنی مضبوطی (کی عمر) کو

مِنْكُمْ مَّنْ يُّتَوَفّٰى وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرَدُّ اِلٰۤى

پہنچ جاتے ہو اور تم میں سے بعض ایسے ہوتے ہیں جو اپنی طبعی عمر کو پہنچنے کے فوت ہو جاتے ہیں اور بعض تم میں سے ایسے ہوتے ہیں جو اپنی انتہائی

تو کسی معاملہ میں بھی نہیں جھگڑنا چاہیئے - پھر یہ کتنا ظلم ہے کہ کوئی شخص خدا تعالیٰ کے متعلق کج بحثی شروع کر دے اور کسی سرکش شیطان کے پیچھے لگ جائے - حالانکہ یہ الٰہی تقدیر ہے کہ جو شخص سرکش شیطان کے پیچھے لگ جائے اور اس کا دوست بن جائے - وہ اُسے گمراہ ہی کرتا ہے اور اُسے عذاب ہی کا رستہ دکھاتا ہے - اِس آیت سے ظاہر ہے کہ جب کوئی شخص بار بار شیطان کی بات ماننے لگتا ہے تو ان دونوں کا آپس میں دوستانہ تعلق ہو جاتا ہے اور یہ تعلق آخر اُسے جہنم تک پہنچا کر رہتا ہے - ایک دوسرے مقام پر بھی خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ وَمَنْ يَّكُنِ الشَّيْطٰنُ لَهٗ قَرِيْنًا فَسَآءَ قَرِيْنًا ۔ (نساء ع ۶) کہ شیطان جس کا ساتھی بن جاتا ہے اُسے یاد رکھنا چاہیئے کہ وہ بہت ہی بُرا ساتھی ہے - اگر اس حالت میں بھی انسان اپنی اصلاح کی طرف توجہ نہ کرے تو پھر بدیوں میں بڑھتے بڑھتے آخر وہ اس مقام پر پہنچ جاتا ہے کہ شیطان اس کا دوست نہیں رہتا بلکہ آقا بن جاتا ہے - اور وہ اُس کی غلامی میں پورے طور پر جکڑا جاتا ہے - گویا مومن تو ہدایت پر سوار ہوتے ہیں مگر یہ شخص اتنا گر جاتا ہے کہ شیطان اُس کی پیٹھ پر سوار ہو جاتا ہے اور وہ جدھر چاہتا ہے اُسے ہانک کرلے جاتا ہے - ایسے ہی لوگوں کے متعلق قرآن کریم نے کہا ہے

أَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَيْلَا يَعْلَمَ مِنْ بَعْدِ عِلْمٍ شَيْئًا ۚ

بڑھاپے کی عمر کو پہنچ جاتے ہیں تاکہ بہت کچھ علم حاصل کرنے کے بعد بالکل علم سے کورے ہو جائیں -

وَتَرَى الْأَرْضَ هَامِدَةً فَإِذَا أَنْزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَاءَ

اور تُو زمین کو دیکھتا ہے کہ وہ (کبھی کبھی) اپنی سب طاقت کھو بیٹھتی ہے پھر جب ہم اُس کے اوپر پانی نازل کرتے

اهْتَزَّتْ وَرَبَتْ وَأَنْبَتَتْ مِنْ كُلِّ زَوْجٍ بَهِيجٍ ﴿٦﴾

ہیں تو وہ جوش میں آجاتی ہے اور بڑھنے لگتی ہے اور ہر قسم کی خوبصورت کھیتیاں اُگانے لگتی ہے -

ذَٰلِكَ بِأَنَّ اللَّهَ هُوَ الْحَقُّ وَأَنَّهُ يُحْيِي الْمَوْتَىٰ وَ

یہ اس لئے ہوتا ہے کہ (ظاہر کیا جائے کہ) اللہ (تعالیٰ) ہی قائم رہنے والی اور قائم رکھنے والی ہستی ہے اور وہ مُردوں کو زندہ

أَنَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿٧﴾ وَأَنَّ السَّاعَةَ آتِيَةٌ لَا

کرتا ہے اور ہر چیز پر قادر ہے - اور ہر چیز کے لئے جو وقت مقرر ہے وہ ضرور آکر رہیگا - اِس میں

رَيْبَ فِيهَا وَأَنَّ اللَّهَ يَبْعَثُ مَنْ فِي الْقُبُورِ ﴿٨﴾ وَ

کوئی شبہ نہیں - اور اللہ (تعالیٰ) یقیناً اُن کو جو قبروں میں ہیں دوبارہ اُٹھائیگا - اور

کہ بعض انسانوں کو ہم نے ایسا بنایا ہے کہ وہ شیطان کی پرستش کرنے لگ گئے ہیں (مائدہ ع ۹) گویا یہ ذلّت کا انتہائی مقام ہے کہ وہ انسان جسے خدا نے اپنا عبد بننے کے لئے پیدا کیا تھا وہ اپنی بدکرداریوں سے شیطان کی فرمانبرداری کرنے لگ جاتا ہے -

اسجگہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ شیطان کے بارے میں بھی کچھ روشنی ڈال دی جائے کہ وہ کیا چیز ہے - شیطان کے معنے عربی زبان کے لحاظ سے حق سے دُور ہونے والے وجود کے ہیں یا بدی میں ترقی کر جانے والے کے - اور ابلیس ایسے وجود کو کہتے ہیں جو مایوس ہو جائے - میری تحقیق کے مطابق شیطان اور ابلیس ایک ایسے وجود کا بھی نام ہے جسے خدا تعالیٰ نے انسانوں کے امتحان کے لیے ملائکہ کے مقابل میں رکھا ہے - اِس شیطان کے لئے اُس وقت تک کہ اس کا کام پُورا ہو موت نہیں جس طرح کہ ملائکہ کے لئے اُس وقت تک کہ اُن کا کام پُورا ہو موت نہیں -

حضرت آدم علیہ السلام کے بالمقابل جو وجود کھڑا ہؤا تھا وہ یہ شیطان بھی تھا اور اس کے اظلال بھی تھے لیکن قصّۂ آدم میں جو تفصیلات بیان کی گئی ہیں اُن کے دو حصّے ہیں - ایک حصّہ بدی کے محرک کی طرف اشارہ کرتا ہے اور ایک حصّہ اُس کے اظلال کی طرف اشارہ کرتا ہے - پس حضرت آدم علیہ السلام

مِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ فِي اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّلَا

لوگوں میں سے بعض ایسے بھی ہوتے ہیں جو اللہ (تعالیٰ) کے متعلق بغیر علم، بغیر ہدایت اور بغیر

هُدًى وَّلَا كِتٰبٍ مُّنِيْرٍ ۝۹ ثَانِيَ عِطْفِهٖ لِيُضِلَّ عَنْ

کسی روشن کتاب کے اِس حالت میں بحث کرتے ہیں کہ اپنے پہلو موڑے ہوئے ہوتے ہیں (یعنی اظہارِ تکبر کرتے ہیں)

سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ لَهٗ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ وَّنُذِيْقُهٗ يَوْمَ

تاکہ اللہ کے راستہ سے لوگوں کو گمراہ کریں۔ ایسے لوگوں کے لئے دنیا میں بھی رسوائی ہوگی اور قیامت کے دن بھی

الْقِيٰمَةِ عَذَابَ الْحَرِيْقِ ۝۱۰ ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ يَدٰكَ

ہم اُنکو جلنے والا عذاب پہنچائیں گے۔ تمہارے ہاتھوں نے جو کچھ پہلے کیا تھا اُس کے نتیجہ میں یہ بات ظاہر ہوگی

وَاَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ۝۱۱ ع وَمِنَ النَّاسِ مَنْ

ادر (اس سے معلوم ہوگا کہ) اللہ (تعالیٰ) اپنے بندوں پر ہرگز کسی قسم کا ظلم نہیں کرتا۔ اور لوگوں میں سے (بعض) ایسے بھی

يَّعْبُدُ اللّٰهَ عَلٰى حَرْفٍ ۚ فَاِنْ اَصَابَهٗ خَيْرُ ۨ اطْمَاَنَّ بِهٖ ۚ

ہوتے ہیں جو اللہ (تعالیٰ) کی عبادت صرف بددلی سے کرتے ہیں پس اگر اُنکو کوئی فائدہ پہنچ جائے تو وہ اس (عبادت) پر خوش ہو جاتے ہیں

ع ۸

کے وقت کا شیطان زندہ بھی ہے اور مر بھی چکا ہے۔ وہ زندہ ہے اِن معنوں میں کہ محرک بدی انسانی نسل کے اِس دنیا میں موجود رہنے تک قائم رکھا جائیگا۔ اور وہ مُردہ ہے اِن معنوں میں کہ اُس کے وہ اظلال جن کا قصۂ آدمؑ میں ذکر آتا ہے وہ اُسی زمانہ میں فوت ہو چکے ہیں۔ وہ شیطان جو محرکِ بدی ہے اُس کے متعلق تو کسی ثواب اور عذاب کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کیونکہ ایک آدمی کو قتل کرنیوالا آدمی پھانسی پاتا ہے۔ لیکن بیسیوں آدمیوں کو جلا دینے والی بجلی تو کسی سزا کی مستحق نہیں ہوتی۔ زلزلہ کا مادہ علاقوں کو اجاڑ دیتا ہے۔ اولوں کی بارش زمینداروں کو تباہ کر دیتی

ہے۔ آندھیاں شہروں کو ویران کر دیتی ہیں۔ یہ دُکھ دینے والی چیزیں ہیں لیکن کسی شرعی الزام کے نیچے نہیں آتیں۔ بے شک شیطان اور ابلیس کا ٹھکانہ جہنم ہے جس طرح فرشتوں کا ٹھکانہ جنت ہے لیکن نہ فرشتے جنت سے متلذذ ہو سکتے ہیں اور نہ شیطان جہنم سے متألم۔ شیطان ایک ناری وجود ہے۔ کیا آگ کا انگارہ بھی بھٹی میں دُکھ پا سکتا ہے؟ اُس کا تو مقام ہی وہی ہے۔ پس شیطان کے دوزخ میں جانے کے یہ معنے نہیں کہ اُس کو سزا دی جائے گی۔ بلکہ وہ جس جگہ کی چیز ہے وہیں چلی جائیگی۔ ملائکہ اگر جنت میں جائیں گے تو وہ کسی انعام کے بدلہ میں نہیں جائیں گے۔ اِسی طرح

وَاِنْ اَصَابَتْهُ فِتْنَةُ ۨ انْقَلَبَ عَلٰی وَجْهِهٖ ۚ خَسِرَ

اور اگر انہیں کوئی تکلیف پہنچ جائے تو اپنے منہ کی سیدھ لوٹ جاتے ہیں ۔ وہ دنیا میں بھی گھاٹے

الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةَ ۭ ذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِيْنُ ⑫ يَدْعُوْا

میں پڑ جاتے ہیں اور آخرت میں بھی ۔ اور یہی کھلا کھلا گھاٹا ہے ۔ وہ اللہ کے سوا

مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَضُرُّهٗ وَمَا لَا يَنْفَعُهٗ ۭ ذٰلِكَ

اُس چیز کو بلاتے ہیں جو نہ اُن کو نقصان پہنچاتی ہے اور نہ نفع دیتی ہے ۔ اور یہی

هُوَ الضَّلٰلُ الْبَعِيْدُ ⑬ يَدْعُوْا لَمَنْ ضَرُّهٗٓ اَقْرَبُ

انتہائی درجہ کی گمراہی ہے ۔ وہ اس (شخص) کو بلاتے ہیں جس کا ضرر اُس کے نفع سے زیادہ

مِنْ نَّفْعِهٖ ۭ لَبِئْسَ الْمَوْلٰى وَلَبِئْسَ الْعَشِيْرُ ⑭

قریب ہے ۔ ایسا آقا بھی بہت بُرا ہے اور ایسے ساتھی بھی بہت بُرے ہیں ۔

اِنَّ اللّٰهَ يُدْخِلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ

اللہ (تعالیٰ) یقیناً مومنوں کو جو مناسب حال عمل بھی کرتے ہیں ایسے باغات میں

شیطان بھی دوزخ میں کسی سزا کی وجہ سے نہیں جائیگا ۔ ہاں جو اس کے اظلال ہیں وہ اپنے اپنے مراتب کے مطابق سزا پائیں گے ۔ اس لئے کہ وہ ایسے کام کرتے ہیں جن کے لئے اُنکو پیدا نہیں کیا گیا ۔ سزا ہمیشہ اُن کاموں کی ملتی ہے جو خلاف قانونِ طبعی ہوتے ہیں ۔ انسان کو چونکہ خلقتاً نیکی کے لئے پیدا کیا گیا ہے جیسے فرمایا وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ۔ اس لئے جو شخص عبودیت کو ترک کرتا اور عبادت کو بھلا دیتا ہے وہ سزا کا مستحق ہوتا ہے، مگر محرکِ بدی تو پیدا ہی امتحان کے لئے کیا گیا ہے اُس کو تو سزا تبھی مل سکتی ہے جب وہ تحریکِ بدی میں سستی کرے ۔ ہاں یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ پھر اسکو بُرا کیوں کہا جاتا ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ کسی چیز کا بُرا ہونا اَور شے ہے اور سزا کا مستحق ہونا اَور شے ۔ پاخانہ کو گھر سے اٹھا کر اس لئے نہیں پھینکتے کہ اُسکو سزا دیتے ہیں ۔ بلکہ اس لئے کہ اُس کا رہنا ہماری صحت کے لئے مضر ہوتا ہے ۔ یہی حال محرک بدی شیطان کا ہے ۔ وہ بیماری اور گناہ کا نمائندہ ہے ۔ اس لئے لازمی طور پر اُسے بُرا کہا جائیگا لیکن باوجود اس کے وہ سزا کا مستحق نہیں ۔ ہاں اس کے ماتحت کچھ اظلال ہیں جو انسانوں میں سے بھی ہیں اور جنوں میں سے بھی ۔ ایسی بد ارواح جن کا مقصدِ پیدائش بدی نہیں

جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ یَفْعَلُ

داخل کرے گا جن (کے سایہ) میں نہریں بہتی ہیں۔ اللہ (تعالیٰ) جو چاہے

مَا یُرِیْدُ ﴿۱۵﴾ مَنْ کَانَ یَظُنُّ اَنْ لَّنْ یَّنْصُرَهُ اللّٰهُ

کرتا ہے۔ جو شخص یہ یقین رکھتا ہے کہ اللہ (تعالیٰ) اس کی (یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی) مدد کبھی

فِی الدُّنْیَا وَ الْاٰخِرَةِ فَلْیَمْدُدْ بِسَبَبٍ اِلَی السَّمَآءِ

نہیں کریگا نہ دُنیا میں نہ آخرت میں۔ تو اُسے چاہیئے کہ وہ ایک رسّی آسمان تک لے جائے (اور اُس پر چڑھ جائے)

ثُمَّ لْیَقْطَعْ فَلْیَنْظُرْ هَلْ یُذْهِبَنَّ کَیْدُهٗ مَا یَغِیْظُ ﴿۱۶﴾

پھر اُسے کاٹ ڈالے پھر وہ دیکھے کہ کیا اُس کی تدبیر اس بات کو دُور کر دیتی ہے جو اُسے غصہ دلا رہی ہے (یعنی نبی کریم

وَکَذٰلِکَ اَنْزَلْنٰهُ اٰیٰتٍۭ بَیِّنٰتٍ ۙ وَّ اَنَّ اللّٰهَ

صلی اللہ علیہ وسلم کی آسمانی امدادیں اور فتوحات) اور ہم نے اِسی طرح اِس (یعنی قرآن) کو کھلے کھلے نشانات بنا کر نازل

یَهْدِیْ مَنْ یُّرِیْدُ ﴿۱۷﴾

کیا ہے۔ اور اللہ (تعالیٰ) یقیناً جس کے متعلق ارادہ کرتا ہے اسے صحیح راستہ دکھا دیتا ہے۔[۲]

لیکن بدی کو پسند کرکے وہ بدی کی محرّک ہو جاتی ہیں۔ یا ایسے انسان جو بدی کے لئے نہیں پیدا کئے گئے لیکن وہ بدی کو پسند کرکے بدی کے محرّک بن جاتے ہیں۔ یہ لوگ بھی اپنے اپنے درجہ کے مطابق شیطان اور ابلیس ہیں۔ اور سزا کے مستحق ہیں۔

[۲] حل لغات۔ مُضْغَةٌ کے معنے ہیں قِطْعَةُ لَحْمٍ گوشت کا ٹکڑا۔

مُخَلَّقَةٌ کے معنے ہیں تَامَّةُ الْخَلْقِ۔ پوری پیدائش والا۔

هَامِدَةٌ: هَمَدَتِ الْاَرْضُ کا فقرہ جب بولتے ہیں تو مراد ہوتی ہے اِذَا لَمْ یَکُنْ بِهَا حَیَاةٌ وَلَا عُوْدٌ وَلَا نَبْتٌ وَلَا مَطَرٌ۔ جب زمین میں زندگی کے آثار نہ ہوں۔ یعنی نباتات وغیرہ نہ ہو۔ الاساس میں ہے۔ اَرْضٌ هَامِدَةٌ قَدْ یَبِسَ نَبَاتُهَا وَتَحَطَّمَ کہ جب اَرْضٌ هَامِدَةٌ کا فقرہ بولیں تو اس سے مُراد یہ ہوتی ہے کہ وہ زمین جس کی نباتات خشک ہو چکی ہو۔ اور خشک ہو کر ٹوٹ پھوٹ چکی ہو۔

اِهْتَزَّتْ: اِهْتَزَّ سے مؤنث کا صیغہ ہے۔ اور اِهْتَزَّتِ الْاَرْضُ کے معنے ہیں اَنْبَتَتْ۔ زمین نے اُگایا۔

بَهِیْجٌ: بَهِجَ سے صفت مشبّہ کا صیغہ ہے۔

مُضْغَةٌ

مُخَلَّقَةٌ

هَامِدَةٌ

بَهِیْجٌ

اوربَهِجَ بِهٖ کے معنے ہیں فَرِحَ بِهٖ وَسُرَّ۔ اس کو دیکھ کرخوش ہُوا۔ پس بَهِيْجٌ کے معنے ہونگے ۔خوش کرنے والا۔

عِطْفٌ عِطْفٌ کے معنے ہیں جانب۔ پہلو (اقرب)

حَرْفٍ حَرْفٍ: اَلْحَرْفُ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ طَرْفُهٗ وَشَفِيْرُهٗ وَحَدُّهٗ۔ حَرْفٌ کے معنے ہیں ہر چیز کا کنارہ اور اُس کی حد۔

اَلْعَشِيْرُ اَلْعَشِيْرُ کے معنے ہیں اَلصَّدِيْقُ دوست۔ (اقرب)

تفسیر:- فرماتا ہے۔ اے لوگو! تم کو مرنے کے بعد کی زندگی کے متعلق کیوں شبہات ہیں۔ کیا تم دیکھتے نہیں کہ تمہاری پہلی پیدائش کس طرح بے جان چیزوں سے ہوئی ہے مٹی سے سبزہ نکلتا ہے۔ پھر اس سبزہ کو کھاکر نطفہ بنتا ہے۔ پھر نطفہ خون کے لوتھڑے کی شکل اختیار کرتا ہے پھر وہ گوشت کی شکل اختیار کرلیتا ہے جسکا کچھ حصہ تو انسانی جسم کی شکل اختیار کرچکا ہوتا ہے۔ اور کچھ حصہ ابھی ایسی شکل اختیار نہیں کرچکا ہوتا۔ پیدائش کی یہ ترتیب اس لئے رکھی گئی ہے تاکہ ہم اس سے تمہاری روحانی پیدائش کا اندازہ بھی تمہیں بتا سکیں۔ اور جب ہم جنین کو ایک حد تک پیدا کرلیتے ہیں تو ہم اس کو ایک عرصہ تک رحم میں رکھتے ہیں۔ پھر اُسے ایک بچہ کی شکل میں باہر نکالتے ہیں تاکہ آہستہ آہستہ تم اپنی جوانی کو پہنچو۔ اور تم میں سے کسی کی رُوح تو پہلے ہی یعنی دنیا میں کام کرنے سے پہلے قبض کر لی جاتی ہے۔ اور تم میں سے بعض کو بڑھاپے کی کمزور عمر تک لے جایا جاتا ہے تاکہ ایک خاص مقدار تک علم حاصل کرکے وہ بالکل جاہل ہو جائے۔ اور تم زمین کو بھی دیکھتے ہو کہ وہ بالکل بے قدر پڑی ہوئی ہوتی ہے لیکن جب ہم اُس پر پانی برساتے ہیں تو وہ لہلہانے لگتی ہے اور اس کی سبزی اُگنے لگتی ہے اور ہر قسم کے خوبصورت نباتی جوڑے اُگانے لگتی ہے یہ اس لئے ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ہر بات پوری ہوکر رہتی ہے۔ اور وہ مُردوں کو زندہ کرتا ہے۔ اور وہ ہر اس چیز پر قادر ہے جو اس کے منشاء کے مطابق ہوتی ہے ہم نے یہ ترجمہ اس لئے کیا ہے کہ یہاں یہ نہیں آیا کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے بلکہ یہ فرمایا ہے کہ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ یعنی خدا تعالیٰ کی قدرت کا اظہار پسندیدہ چیزوں میں ہوتا ہے۔ ناپسندیدہ چیزوں میں نہیں۔ پس یہ نہیں کہہ سکتے کہ کیا خدا جھوٹ بول سکتا ہے؟ یا کیا خدا چوری کرسکتا ہے؟ یا کیا خدا خودکشی کرسکتا ہے کیونکہ یہ سب چیزیں ناپسندیدہ ہیں۔ اور قدرت کے اظہار کے خلاف ہیں۔ قرآن شریف یہی کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ پسندیدہ چیزوں کا اندازہ کرنے والا ہے جو قَدِيْرٌ کے معنے ہیں۔ یعنی ایسے امور کو ظاہر کرنے والا ہے جو اس کے منشاء کو پورا کرتے ہوں۔ غرض اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ان تمام باتوں کو دیکھ کر تمہیں سمجھ لینا چاہیئے کہ جس طرح جسم کی پیدائش تدریجاً ہوتی ہے اِسی طرح رُوح کی پیدائش بھی تدریج سے ہوتی ہے۔ پس رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دعویٰ کرتے ہی مسلمانوں کی ترقی اور اپنی تباہی کی امید نہیں لگا بیٹھنی چاہیئے۔ جس طرح جسم آہستہ آہستہ پیدا ہوتا ہے اِسی طرح اسلام اور مسلمان بھی آہستہ آہستہ کمال حاصل کریں گے۔ اور جس طرح جسم پر ایک عرصہ کے بعد تنزل وارد ہوتا ہے اور وہ بالکل بے کار ہو جاتا ہے اِسی طرح مسلمانوں کے مقابلہ میں تم بھی کچھ عرصہ کے بعد تنزل کا شکار ہوجاؤگے اور تباہ ہو جاؤگے پس جلدی نہ کرو۔ نہ خدا کی طرف سے آنے والی زندگی فوراً اثر ظاہر کرتی ہے اور نہ قوموں پر آنے والی موت فوراً نتیجہ خیز ہوتی ہے۔ ہاں خدا کی باتیں

ضرور پوری ہو کر رہتی ہیں۔ اور جس کے لئے زندگی مقدر ہو اُسکو زندگی مل جاتی ہے۔ اور جس کے لئے تباہی مقدر ہو اُس پر تباہی آجاتی ہے۔ اور جن کیلئے زندگی مقدر ہے خواہ وہ قبروں میں پڑے ہوئے نظر آتے ہوں پھر بھی وہ زندہ ہو کر رہیں گے اور جن کے لئے موت مقدر ہے وہ اللہ تعالےٰ کے متعلق کج بحثی کرتے چلے جائیں گے اور تکبّر سے کام لیں گے اور چاہیں گے کہ دوسروں کو بھی گمراہی میں ڈالیں لیکن آخر وہ دنیا میں بھی ذلیل ہونگے اور قیامت کے دن بھی عذاب پائیں گے لیکن خدا کی طرف سے آنے والا عذاب بلاوجہ نہیں ہوتا وہ انسان کی اپنی کرتوتوں کی وجہ سے ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کو یہی پسند ہے کہ انسان اُس کی طرف پوری طرح متوجہ ہو۔ بے دلی سے اُس کی عبادت مقبول نہیں ہوتی۔ خوشی اور رنج دونوں میں اُس کا ساتھ نہیں چھوڑنا چاہیئے۔ ورنہ ایسے ایمان کا کوئی فائدہ نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ ایمان جو انسان کو خدا تعالےٰ کے انعامات کا وارث کرتا اور اس کو مقرب اور نعماءِ الٰہیہ کا جاذب بناتا ہے وہ وہی ایمان ہوتا ہے جو ہر قسم کے شکوک و شبہات سے پاک اور ماسوی اللہ کی محبت سے خالی ہو۔ ہمارے ملک میں بھی لوگ کہا کرتے ہیں۔ کہ دو کشتیوں میں پاؤں رکھنے والا انسان کبھی بچ نہیں سکتا اگر دونوں کشتیاں کچھ وقت تک اکٹھی بھی چلی جائیں تب بھی پانی کی ندا ایک نہ ایک وقت ان کو ضرور علیحدہ کر دیگی اور ان کشتیوں میں پاؤں رکھنے والا انسان غرق ہو کر رہیگا اِسی طرح خدا تعالےٰ بھی ان لوگوں سے کوئی تعلق نہیں رکھتا جو مُنہ سے تو اُس کے ساتھ اپنی محبت کا دعویٰ کرتے ہوں اور عملی طور پر رات دن وہ دنیا پر گرے رہتے ہوں اور خدائی احکام کو پس پشت ڈال رہے ہوں۔ جب ترکوں نے بغداد پر حملہ کیا تو اٹھارہ لاکھ آدمی انہوں نے قتل کر دیا تھا۔ ایسی تباہی اور بربادی کے وقت کچھ لوگ ایک بزرگ کے پاس گئے اور کہنے لگے کہ آپ دُعا کریں کہ اللہ تعالےٰ مسلمانوں کو اس تباہی سے بچالے۔ انہوں نے کہا۔ میں کیا دُعا کروں۔ میں تو جب بھی ہاتھ اٹھاتا ہوں۔ مجھے آسمان سے ملائکہ کی یہ آواز سُنائی دیتی ہے کہ اَیُّھَا الْکُفَّارُ اقْتُلُوا الْفُجَّارَ یعنی اے کافرو! ان فاجر مسلمانوں کو خوب مارو۔ حالانکہ بظاہر اُن میں سے ایک فریق جو مارا جا رہا تھا خدا اور اس کے رسولؐ پر ایمان رکھتا تھا اور دوسرا فریق دین سے کوئی تعلق نہیں رکھتا تھا مگر چونکہ مسلمان کہلانے والوں نے مذہب کو صرف نام کے طور پر قبول کیا تھا اپنے قلوب میں انہوں نے کوئی تغیّر پیدا نہیں کیا تھا۔ اس لئے ان پر عذاب آگیا۔ پس انسان کو چاہیئے کہ وہ ہمیشہ اپنے ایمان کا جائزہ لیتا رہے اور دیکھتا رہے کہ اس کا خدا تعالےٰ کے ساتھ کیسا تعلق ہے۔ اور آیا عُسر اور یُسر دونوں حالتوں میں وہ وفاداری کے ساتھ اپنے عہد پر قائم ہے یا نہیں۔ اگر انعام کے وقت وہ خدا تعالےٰ کی تعریف کرتا اور مصیبت کے وقت یہ کہنا شروع کر دیتا ہے کہ خدا نے پہلے مجھ پر کونسا احسان کیا تھا جو یہ مصیبت بھی بھیج دی تو صاف پتہ لگ جاتا ہے کہ اُس کا ایمان محض دھوکا تھا۔ کامل الایمان وہی شخص کہلا سکتا ہے جو ہر ابتلاء اور مصیبت میں ثابت قدم رہتا ہے۔ بلکہ مصائب کے آنے پر وہ اللہ تعالےٰ کے حضور اور زیادہ جھک جاتا اور اپنے اندر پہلے سے بھی زیادہ عجز اور انکساری پیدا کرتا ہے۔ یہی بات اسجگہ بیان کی گئی ہے اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ تمہیں ہر حالت میں خدا تعالیٰ سے اپنا تعلق مضبوط رکھنا چاہیئے۔ اور کسی مصیبت میں بھی اس سے اپنا تعلّق قطع نہیں کرنا چاہیئے۔ حدیثوں میں آتا ہے۔ ایک دفعہ ایک بدوی نے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی بیعت کی اور اسلام میں داخل ہو گیا۔ مگر چند دنوں کے بعد ہی

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالصّٰبِـِٔيْنَ

یقیناً جو لوگ (محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر) ایمان لائے اور وہ لوگ جو یہودی بن گئے اور صابی۔

وَالنَّصٰرٰى وَالْمَجُوْسَ وَالَّذِيْنَ اَشْرَكُوْٓا ۖ اِنَّ اللّٰهَ

اور نصرانی اور مجوسی اور وہ لوگ بھی جنہوں نے شرک کیا۔ اللہ تعالیٰ یقیناً

يَفْصِلُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰي كُلِّ

ان کے درمیان قیامت کے دن فیصلہ کر دے گا۔ اللہ تعالیٰ یقیناً ہر ایک چیز کا

اُسے بخار ہو گیا۔ اِس پر وہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور کہنے لگا کہ میں اپنی بیعت واپس لیتا ہوں کیونکہ مجھے تپ آنے لگا ہے (بخاری جلد ۴ ص۱۶۷ مطبوعہ عثمانیہ مصریہ) مگر اس کے مقابلہ میں ایسے بھی لوگ تھے جنہوں نے اپنی جانیں قربان کر دیں مگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جو عہد انہوں نے کیا تھا اس میں کوئی رخنہ واقع نہ ہونے دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ سچے تعلق اور اخلاص کا پتہ ہی اسی وقت لگتا ہے جب انسان پر کوئی ابتلاء آتا ہے۔ ورنہ آرام اور آسائش کی حالت میں تو کمزور ایمان والے بھی بڑی عقیدت اور تعلق کا اظہار کرتے ہیں۔ قرآن کریم کے شروع میں ہی اللہ تعالےٰ نے منافقوں کی یہ کیفیت بیان فرمائی ہے کہ كُلَّمَآ اَضَاۗءَ لَهُمْ مَّشَوْا فِيْهِ ڐ وَاِذَآ اَظْلَمَ عَلَيْهِمْ قَامُوْا (بقرۃ ع۲) کہ جب کبھی بجلی اُن کے لئے روشنی پیدا کر دیتی ہے تو وہ اُس میں چلنے لگتے ہیں اور جب اندھیرا کر دیتی ہے تو کھڑے ہو جاتے ہیں۔ یعنی امن کے دن ہوں تو منافق مسلمانوں کے ساتھ شامل ہو جاتے ہیں۔ لیکن مشکلات کا وقت آئے تو الگ ہو جاتے ہیں۔ ایسا ایمان انسان کو کوئی نفع نہیں پہنچا سکتا۔ اِس آیت میں یہی بتایا گیا ہے کہ

جس شخص کا تعلق خدا تعالےٰ سے ایسا کمزور ہو وہ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ اور پھر یہ تو اور بھی حماقت ہے کہ انسان خدا کی عبادت کو چھوڑ کر بتوں کی عبادت اختیار کرے جو نہ نقصان دیتے ہیں نہ نفع۔ بلکہ اُن کی عبادت سے نقصان کا احتمال تو ہے نفع کا نہیں۔ اِن لوگوں کے مقابلہ میں وہ لوگ جو ایک خدا کی پرستش کرتے ہیں وہ اگلے جہان میں بھی سُکھ پائیں گے اور اس دُنیا میں بھی سُکھ پائیں گے۔ چنانچہ جو لوگ ایسا گمان کرتے ہیں کہ اللہ تعالےٰ اپنے کامل موحد بندے یعنی محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی کبھی مدد نہیں کریگا۔ نہ دنیا میں اور نہ آخرت میں انہیں چاہیئے کہ وہ آسمان تک ایک رسّی لے جائیں اور اُس پر چڑھ کر رسّی کو کاٹ ڈالیں۔ اور زمین پر گر کر مر جائیں کیونکہ اُن کی یہ اُمید کبھی بر نہیں آئے گی۔ وہ اِسی طرح تمنّائیں کرتے کرتے ہلاک ہو جائیں گے مگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ترقی اور آپ کے عروج کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکیں گے۔ پس اپنی ناکامی اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کامیابی دیکھنے سے انہیں اُن کی موت ہی بچا سکتی ہے اِس کے سوا اور کوئی ذریعہ باقی نہیں۔ آسمان پر خدا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کی کامیابی اور

شَيْءٍ شَهِيْدٌ ﴿۱۸﴾ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يَسْجُدُ لَهٗ مَنْ فِي

نگران ہے ۵ ۔ (اے اسلام کے مخالف!) کیا تو نہیں دیکھتا کہ جو کوئی بھی آسمان میں ہے وہ اللہ (تعالیٰ)

السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ

کی فرمانبرداری کرتا ہے اور اسی طرح جو کوئی زمین میں ہے اور سورج بھی اور چاند بھی

وَالنُّجُوْمُ وَالْجِبَالُ وَالشَّجَرُ وَالدَّوَآبُّ وَكَثِيْرٌ

اور ستارے بھی اور پہاڑ بھی اور درخت بھی اور چارپائے بھی اور لوگوں میں

مِّنَ النَّاسِ ؕ وَكَثِيْرٌ حَقَّ عَلَيْهِ الْعَذَابُ ؕ وَمَنْ يُّهِنِ

سے بھی بہت سے ۔ لیکن لوگوں میں سے ایک گروہ کثیر ایسا ہی جس کے متعلق عذاب کا فیصلہ ہو چکا ہے اور جس کو خدا ذلیل

آپ کو غیر معمولی فتوحات کا فیصلہ کر چکا ہے ۔ اور دشمنوں کے مقابلہ میں اُس کی تلوار کھنچ چکی ہے ۔ اب مخالف بے شک جتنی چاہیں تدبیریں کریں اور بیشک حسد کی آگ انہیں رات دن جلاتی رہے انہیں یاد رکھنا چاہیئے کہ جس بات پر انہیں غصہ آرہا ہے اُسکے متعلق اُن کی تدبیریں ہمیشہ ناکامی و نامرادی کا مُنہ دیکھیں گی اور وہ ایک دن ایڑیاں رگڑ رگڑ کر حسد کی موت مرینگے لیکن اسلام ترقی کرے گا اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم دنیا میں پھیل کر رہے گی ۔

۵ تفسیر:۔ فرماتا ہے ۔ جو لوگ توحید پر چلتے ہیں اُن کے بھی مختلف مدارج ہیں ۔ ایک درجۂ توحید تو مسلمانوں کا ہے اور ایک درجہ یہودیوں کا اور ایک صابیوں کا اور ایک عیسائیوں کا (عیسائی شروع میں موحد ہوتے تھے) اور ایک مجوس کا اور ایک مشرکوں کا (مشرک قوم میں بھی بعض لوگ ایسے تھے ۔ جو توحید کے قائل تھے ۔ چنانچہ مکہ کا ایک شخص زید تھا ۔ جو خدا تعالیٰ کی وحدانیت کا قائل تھا ۔)

پھر فرماتا ہے ۔ کہ ان سب مدعیانِ ایمان کا اللہ تعالیٰ آخری فیصلہ کے دن کامل فیصلہ کر دے گا یعنی جو اُن میں سے اپنے دعوٰی میں سچے ہونگے وہ غالب آجائیں گے اور جو اپنے دعوٰی میں جھوٹے ہونگے وہ اپنے اپنے جھوٹ کے مطابق مغلوب ہو جائینگے چنانچہ فیصلہ کے دن مسلمان غالب آگئے اور مشرک جن میں سے بہت کم لوگ موحد تھے بالکل تباہ ہو گئے اور یہود اور صابی اور نصارٰی اور مجوسی اپنی اپنی کمزوری کی حد تک سزا پا گئے ۔ جس سے ثابت ہو گیا کہ اسلام سچا مذہب ہے ۔

اس آیت سے بعض لوگ یہ غلط نتیجہ نکالتے ہیں کہ یہودی اور عیسائی اور صابی سارے کے سارے دینوں کو اسلام سچا قرار دیتا ہے حالانکہ اس کے اصل معنوں کی رو سے اسجگہ ایک معیارِ صداقت بتایا گیا ہے کہ جو اس معیارِ صداقت پر پورا اُترے گا ۔ وہ سچا ہو گا ۔ یہ نہیں کہا گیا کہ یہ قومیں سچی ہیں ۔

اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ مُّكْرِمٍ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ ؕ ﴿۱۹﴾ السجدۃ

کرے۔ اُسے کوئی عزت دینے والا نہیں۔ اللہ (تعالیٰ) جو کچھ چاہتا ہے کرتا ہے۔ ۶

هٰذٰنِ خَصْمٰنِ اخْتَصَمُوْا فِيْ رَبِّهِمْ ؗ فَالَّذِيْنَ

یہ دو باہم مخالفت کرنے والے گروہ ایسے ہیں جو اپنے رب کے بارہ میں جھگڑ رہے ہیں۔ پس جو اللہ (تعالیٰ) کی

كَفَرُوْا قُطِّعَتْ لَهُمْ ثِيَابٌ مِّنْ نَّارٍ ؕ يُصَبُّ مِنْ

مذکورہ بالا صفات کے کافر ہوئے اُن کے لئے آگ کے کپڑے بنائے جائیں گے۔ اور اُن کے سروں پر

۶ **تفسیر**:۔ فرماتا ہے۔ آسمان اور زمین میں ایک ایسا قانون جاری ہے کہ جس کی فرمانبرداری سے کوئی شخص اپنے آپ کو آزاد نہیں کر سکتا۔ مثلاً دیکھو خدا تعالےٰ نے زبان بنائی ہے۔ اب ایک طرف تو انسان کو اتنی آزادی حاصل ہے کہ وہ اس زبان سے اگر چاہے تو خدا تعالیٰ کو بھی گالیاں دے لے لیکن دوسری طرف اگر اس زبان کے سامنے دنیا کے تمام بادشاہ، وزراء، علماء اور فقہاء ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہو جائیں کہ میٹھے کو کھٹا چکھ یا کھٹے کو کڑوا چکھ تو وہ ایسا کبھی نہیں کرے گی۔ وہ میٹھے کو میٹھا ہی چکھے گی۔ اور کھٹے کو کھٹا ہی چکھیگی۔ گویا ایک طرف تو اللہ تعالیٰ نے انسان کو اتنی آزادی دی ہے کہ اگر وہ چاہے تو خدا تعالیٰ کو بھی بُرا بھلا کہہ لے۔ اور دوسری طرف اس میں اتنی طاقت بھی نہیں رکھی کہ وہ میٹھے کو کڑوا چکھے۔ یا کڑوے کو میٹھا چکھے۔ اور اگر کسی جگہ اس میں تبدیلی بھی نظر آتی ہے تو وہ بھی خدا تعالیٰ کے قانون کے ماتحت ہی ہوتی ہے۔ مثلاً اگر کسی کا جگر خراب ہے تو اُسے میٹھی چیز کڑوی لگتی ہے یا بعض خرابیوں کی وجہ سے نمک تیز محسوس ہونے لگتا ہے یا میٹھی چیز میں مٹھاس کم معلوم ہوتی ہے۔ یا پھیکی چیز کڑوی معلوم ہوتی ہے مگر یہ تبدیلی بھی خدا تعالیٰ کے مقرر کردہ قانون کے ماتحت ہی ہوتی ہے ورنہ جن چیزوں پر انسان کو اختیار حاصل نہیں اُن میں اُس کی کوئی کوشش کامیاب نہیں ہو سکتی۔ مثلاً تمہاری انگلی ہے۔ اگر تم اُسے کسی سوئی کے ناکہ میں ڈالنے کی کوشش کرو تو اس کو ناکہ میں نہیں ڈال سکتے خواہ کوئی جرنیل ہو۔ نواب ہو۔ بادشاہ ہو۔ دُنیا کی بڑی سے بڑی حکومت اس کے پاس ہو۔ وہ اپنی انگلی سوئی کے ناکہ میں نہیں ڈال سکتا۔ یا مثلاً آواز ہے اگر تمہیں کسی عزیز کی آواز آ رہی ہو۔ تو تم اگر چاہو بھی تو اُسے کسی دوسرے شخص کی آواز نہیں بنا سکتے۔ کسی کے ہاں بدصورت لڑکا پیدا ہو تو اگر وہ چاہے کہ وہ خوبصورت ہو جائے تو وہ اُسے خوبصورت نہیں بنا سکتا۔ کسی کے لڑکے کا قد چھوٹا ہو تو اس کے پاس کوئی ایسا ذریعہ نہیں کہ وہ اس کے قد کو لمبا کر دے۔ یا مثلاً خدا تعالےٰ نے آنکھ دیکھنے کے لئے بنائی ہے۔ تو آنکھ ہمیشہ سُرخ کو سُرخ اور زرد کو زرد دیکھے گی یہ کبھی نہیں ہوگا کہ وہ سُرخ کو زرد دیکھنا چاہے تو وہ زرد دیکھنے لگ جائے اور زرد کو سُرخ دیکھنا چاہے تو سُرخ دیکھنے لگ جائے۔ گویا ایک قانون ہے

فَوْقِ رُءُوْسِهِمُ الْحَمِيْمُ ﴿۲۰﴾ يُصْهَرُ بِهٖ مَا فِيْ بُطُوْنِهِمْ

سر گرم پانی ڈالا جائیگا - (حتیٰ کہ) اس گرم پانی کی وجہ سے جو کچھ اُن کے پیٹ میں ہے وہ بھی گل جائیگا اور اُنکے

وَالْجُلُوْدُ ﴿۲۱﴾ وَلَهُمْ مَّقَامِعُ مِنْ حَدِيْدٍ ﴿۲۲﴾ كُلَّمَآ

چمڑے بھی (گل جائینگے) اور اُن کے لئے لوہے کے ہتھوڑے (تیار کئے جائیں گے -) جب وہ غم اور فکر

اَرَادُوْٓا اَنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَا مِنْ غَمٍّ اُعِيْدُوْا فِيْهَا ۗ

کی وجہ سے اُس عذاب سے نکلنے کی کوشش کریں گے تو پھر اسی کی طرف لوٹا دیئے جائیں گے (اور کہا جائیگا)

وَذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ ﴿۲۳﴾ اِنَّ اللّٰهَ يُدْخِلُ الَّذِيْنَ

ع ۲ ۹

جلانے والا عذاب بھگتتے چلے جاؤ - ۵ اللہ (تعالیٰ) یقیناً مومنوں کو

جس کی اطاعت سے کوئی شخص باہر نہیں نکل سکتا - اسی طرح سورج کیا اور چاند کیا اور ستارے کیا اور پہاڑ کیا اور درخت کیا اور چوپائے کیا سب ایک خاص نظام کے ماتحت کام کر رہے ہیں - اور ہر ایک اپنی اپنی ڈیوٹی ادا کر رہا ہے - پھر تم ان چیزوں کو خدا کس طرح قرار دیتے ہو - یہ چیزیں تو خود تمہارے سامنے ایک خدمتگار کے طور پر کھڑی ہیں مگر تم ایسے احمق ہو کہ انہی کے آگے ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہو جاتے ہو اور اس طرح اپنے آپ کو ذلیل کرتے ہو - اس نظام کائنات کی طرف اس آیت میں اشارہ کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ کائنات پر غور کرنے سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ تمام کائنات قانون قدرت کے تابع ہے یعنی اللہ تعالیٰ کی فرمانبردار ہے - اور اکثر انسان بھی قانونِ قدرت کے تابع ہیں اس آیت میں یہ نہیں کہا گیا کہ بعض انسان قانونِ قدرت سے آزاد ہیں بلکہ یہ کہا گیا ہے کہ بعض انسان قانونِ قدرت کو توڑنے کی بھی کوشش کرتے رہتے ہیں - جیسے بد پرہیزی کے ذریعہ - اور ان لوگوں میں سے اکثر پر عذاب آ جاتا ہے - جو قانون قدرت کے اٹل ہونے پر دلالت کرتا ہے - اور ثابت ہو جاتا ہے کہ خدا تعالیٰ کے قانون کو توڑنے سے کوئی شخص عزت نہیں پا سکتا اور اُسی کی مشیئت آخر دنیا میں غالب آتی ہے -

يُصْهَرُ

۵ **حل لغات** :- يُصْهَرُ صَهَرَ سے مضارع مجہول کا صیغہ ہے اور صَهَرَ الشَّيْءَ کے معنے ہیں اَذَابَهٗ - اُس کو پگھلایا - پس يُصْهَرُ کے معنے ہیں اُس کو پگھلایا جائیگا -

مَقَامِعُ

مَقَامِعُ : اَلْمِقْمَعَةُ کی جمع ہے - اور اَلْمِقْمَعَةُ کے معنے ہیں اَلْعَمُوْدُ مِنْ حَدِيْدٍ لوہے کی گرز - وَقِيْلَ كَالْمِحْجَنِ يُضْرَبُ بِهٖ رَاْسُ الْفِيْلِ بعض علماء لُغت یہ کہتے ہیں کہ مِقْمَعَةٌ کے معنے ایسی چھڑی کے ہیں جس کے ذریعہ سے ہاتھی کے سر پر ضرب لگائی جاتی ہے - اسی طرح مِقْمَعَةٌ کے معنے ہیں خَشَبَةٌ يُضْرَبُ بِهَا الْاِنْسَانُ عَلٰى رَاْسِهٖ لِيُذَلَّ وَيُهَانَ - وہ لکڑی جس کے ذریعہ انسان کے سر پر اس لئے مارا جاتا ہے تاکہ وہ ذلیل اور رسوا ہو (اقرب)

اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا

جو مناسب حال عمل بھی کرتے ہیں ایسے باغات میں رکھے گا جن کے سایہ میں نہریں بہ رہی

الْاَنْهٰرُ یُحَلَّوْنَ فِیْهَا مِنْ اَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ وَّ

ہوں گی۔ اُن کو اس میں سونے اور موتیوں کے جڑاؤ والے کنگن پہنائے

لُؤْلُؤًا ؕ وَلِبَاسُهُمْ فِیْهَا حَرِیْرٌ ﴿۲۴﴾ وَهُدُوْۤا اِلَى الطَّیِّبِ

جائیں گے۔ اور اُن کا لباس اُس میں ریشم کا ہوگا ۵۵ اور اُن کی پاک باتوں کی طرف راہنمائی

تفسیر:۔ فرماتا ہے۔ یہ دو گروہ یعنی قانونِ قدرت کی اتباع کرنے والے اور اُس سے آزادی چاہنے والے اپنے رب کے بارے میں جھگڑتے رہتے ہیں لیکن نتیجہ ثابت کر دیتا ہے کہ ان میں سے حق پر کون ہے اور باطل پر کون۔ چنانچہ قانونِ قدرت کا مقابلہ کرنیوالے ہمیشہ ناکامی اور نامرادی کا منہ دیکھتے رہتے ہیں اور ایک روحانی آگ میں پڑے رہتے ہیں۔ اُن کے سروں پر بھی گرم پانی پڑتا رہتا ہے ایسا گرم پانی جو اُن کے پیٹوں تک کی چیزوں کو جلا دیتا ہے۔ یعنی اُن کے دماغوں میں ایسے وحشیانہ خیالات آتے رہتے ہیں جو اُن کو سیاہ باطن ثابت کرتے رہتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو سخت سزا دی جائیگی۔ جو صرف اندرونی ہی نہیں بلکہ بیرونی بھی ہوگی۔ یعنی پہلی سزا تو یہ ہوگی کہ اُن کے دلوں میں پریشان خیالات اٹھیں گے جن سے اُن کا باطنی امن برباد ہو جائیگا۔ اور پھر بیرونی سزائیں بھی ملیں گی۔ یعنی خارجی امن بھی برباد ہو جائیگا۔ اور جتنی کوشش بھی وہ عذاب سے بچنے کی کرینگے اتنا ہی وہ اُس میں اور پھنستے چلے جائیں گے۔ کیونکہ اُن کے عذاب کی بنیاد اُن کے دماغی خیالات پر ہوگی۔ اور دماغی خیالات پر قابو پانا اُن کے بس کی بات نہیں۔ پس اندرونی سزا بھی اور بیرونی سزا بھی جاری رہے گی۔ کیونکہ اندرونی سزا بیرونی سزا کو کھینچتی ہے۔

اِس آیت میں روحانی اور جسمانی دونوں عذابوں کا ذکر ہے۔ اور بتایا گیا ہے کہ اُن کے جسم تو آگ میں جلتے ہی ہونگے۔ اُن کے دلوں میں بھی آگ لگی ہوئی ہوگی جس سے بچنے کا انہیں کوئی راستہ نظر نہیں آئیگا۔

۵۵ تفسیر:۔ اِس سے یہ مراد نہیں کہ مادی سونے کے کنگن اُن کو پہنائے جائیں گے۔ مادی سونا تو وہ حقیر چیز ہے جس کو اس دنیا میں بھی مومن پھینک دیتا ہے۔ اگلے جہان میں اُس کو کیا مزہ آئیگا۔ پس یہ ایک تمثیلی زبان ہے۔ اور کنگن سے مراد زینت کا سامان ہے۔ اور سونے سے مراد یہ ہے کہ وہ سامان تباہ ہونے والا نہیں ہوگا۔ کیونکہ سونے کو زنگ نہیں لگتا اور موتی سے بھی یہی مراد ہے کہ وہ سامان انسان کی طبیعت میں ایک چمک اور ملائمت پیدا کریں گے۔ جیسا کہ موتی ہوتا ہے۔

وَلِبَاسُهُمْ فِیْهَا حَرِیْرٌ میں بتایا کہ اگلے جہان میں انہیں ایسا تقویٰ ملے گا جس کے اختیار کرنے میں انہیں کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ

مِنَ الْقَوْلِ ۚ وَهُدُوْٓا اِلٰى صِرَاطِ الْحَمِيْدِ ﴿۲۵﴾ اِنَّ

کی جائے گی ۔ اور قابل تعریف طریق کار کی ہدایت کی جائے گی ۔ ۹ (لیکن)

الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالْمَسْجِدِ

وہ لوگ جو کافر ہیں اور اللہ کے راستہ سے اور بیت اللہ کی طرف جانے سے جس کو

الْحَرَامِ الَّذِيْ جَعَلْنٰهُ لِلنَّاسِ سَوَآءَ ۨ الْعَاكِفُ فِيْهِ وَالْبَادِ ۭ

ہم نے تمام انسانوں کے فائدہ کیلئے بنایا ہے، روکتے ہیں (حالانکہ وہ بیت اللہ ایسا ہے جسکو ہم نے تمام انسانوں کیلئے بنایا ہے) ان کیلئے بھی جو

وَمَنْ يُّرِدْ فِيْهِ بِاِلْحَادٍۢ بِظُلْمٍ نُّذِقْهُ مِنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴿۲۶﴾ ع

اس میں بیٹھ کر خدا کی عبادت کرتے ہیں اور اُن کیلئے بھی جو جنگلوں میں رہتے ہیں ۔ اور جو کوئی شخص اس (دنیا) میں ظلم کی راہ سے کوئی ؟

فرماتا ہے کہ تقوٰی بھی لباس سے مشابہت رکھتا ہے ۔ جیساکہ آتا ہے وَلِبَاسُ التَّقْوٰى ذٰلِكَ خَيْرٌ (اعراف ع۳) مگر فرماتا ہے کہ اس دنیا میں تو تقوٰی کا لباس پہننے کے لئے بڑی جدوجہد کرنی پڑتی ہے اور تکلیف اٹھانی پڑتی ہے لیکن اگلے جہان میں تقوٰی کا لباس ریشم کے مشابہ ہوگا ۔ یعنی اس کو اختیار کرنے کے لئے تکلیف نہیں اٹھانی پڑے گی بلکہ وہ نہایت آرام دہ ہوگا اور طبیعت خود بخود ہی تقوٰی کی طرف مائل ہوگی اُسے مجبور نہیں کرنا پڑے گا ۔

۹ تفسیر: ۔ پھر فرماتا ہے کہ صرف لباس ہی نہیں اُن کی زبان بھی بڑی اچھی ہوگی اور طور طریقہ بھی اچھا ہوگا ۔ یہاں تک کہ اُن کے ہمسائے اور اللہ تعالیٰ بھی اُن کے طور طریقے کی تعریف کرے گا اِس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ جنّت صرف بیکار بیٹھنے کی جگہ نہیں بلکہ عمل کا مقام ہے ۔ صرف اتنا فرق ہے کہ اِس جہان میں انسان سے گناہ بھی صادر ہو جاتا ہے ۔ مگر وہاں کوئی بُرا فعل سرزد نہیں ہوگا ۔ اور انسان ہر قسم کے رُوحانی تنزل سے محفوظ رہے گا ۔

۱۰ حل لغات: ۔ يَصُدُّوْنَ صَدَّ سے (يَصُدُّوْنَ) مضارع جمع مذکر غائب کا صیغہ ہے اور صَدَّ عَنْهُ کے معنے ہیں اَعْرَضَ عَنْهُ وَمَالَ ۔ اس سے اعراض کیا اور ہٹ گیا ۔ اور صَدَّ فُلَانًا عَنْ كَذَا کے معنے ہیں مَنَعَهٗ وَدَفَعَهٗ وَصَرَفَهٗ عَنْهُ ۔ کسی کو کسی بات سے روکا اور دُور رکھا اور ہٹائے رکھا ۔ (اقرب) پس يَصُدُّوْنَ کے معنے ہونگے (۱) وہ رُکتے ہیں (۲) وہ دوسروں کو روکتے ہیں ۔

(اَلْعَاكِفُ) اَلْعَاكِفُ کے معنے ہیں اَلْمُقِيْمُ ۔ رہنے والا ۔

(اَلْبَادُ) اَلْبَادُ کے معنے ہیں اَلْمُقِيْمُ فِي الْبَادِيَةِ ۔ یعنی صحرا اور جنگل میں رہنے والا (مفردات)

(اِلْحَادٌ) اِلْحَادٌ ۔ اَلْحَدَ کا مصدر ہے اور اَلْحَدَ عَنْ دِيْنِ اللّٰهِ کے معنے ہیں مَالَ وَحَادَ وَعَدَلَ ۔ خدا تعالیٰ کے دین سے ہٹ گیا ۔ اور مَنْ يُّرِدْ فِيْهِ بِاِلْحَادٍ بِظُلْمٍ کے معنے ہیں اَیْ يُّرِدْ عُدُوْلًا عَنِ الْحَقِّ

کہ جو حق سے دُور ہونے اور ہٹنے کا ارادہ کرے گا۔

تفسیر:۔ فرماتا ہے۔ جو لوگ کعبۃ اللہ کے ساتھ تعلق چھوڑ دیں گے اور اس کی طرف جانے میں روک پیدا کریں گے وہ دنیا میں مساوات قائم کرنے سے محروم رہیں گے۔ اور آخرت میں بھی عذاب پائیں گے۔

سَوَآءَ نِ الْعَاكِفُ فِيْهِ وَالْبَادِ میں اس مساوات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو اسلام نے بیت اللہ کے قیام میں مدنظر رکھی ہے اور بتایا ہے کہ یہ مسجد کسی خاص فرد کے لئے نہیں بلکہ تمام بنی نوع انسان کے لئے بنائی گئی ہے۔ اس میں غریب اور امیر اور مشرقی اور مغربی کا کوئی امتیاز نہیں۔ اس کا دروازہ ہر ایک کے لئے کھلا ہے۔ اس کے لئے بھی جو اس میں بیٹھ کر خدا کی عبادت کرتا ہے اور اس کیلئے بھی جو جنگلوں میں رہتا ہے۔ تاریخوں میں آتا ہے کہ ایک دفعہ ایک عیسائی قبیلہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مذہبی تبادلہ خیالات کرنے کے لئے آیا جس میں اُن کے بڑے بڑے پادری بھی شامل تھے مسجد میں گفتگو شروع ہوئی اور گفتگو لمبی ہوگئی۔ معلوم ہوتا ہے وہ اتوار کا دن تھا جو عیسائیوں میں عبادت کا دن ہے۔ جب اُن کی نماز کا وقت آگیا تو اس قافلہ کے ایک پادری نے کہا کہ اب ہماری عبادت کا وقت ہے آپ ہمیں اجازت دیں کہ ہم باہر جاکر نماز ادا کر آئیں۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ آپ لوگوں کو باہر جانے کی کیا ضرورت ہے ہماری مسجد میں ہی عبادت کرلیں۔ آخر ہماری مسجد بھی خدا تعالیٰ کے ذکر کے لئے ہی بنائی گئی ہے۔ چنانچہ ان لوگوں نے اپنے طریق کے مطابق مسجد نبوی میں ہی عبادت کی۔ (تفسیر جامع البیان لابن جریر الطبری الجزء الثالث ص ۱۱ مطبوعہ المیمنہ مصر) یہ تاریخی واقعہ اس بات کا ثبوت ہے کہ اسلام کے نزدیک مسجد کا دروازہ ہر مذہب و ملت کے شرفاء کے لئے کھلا ہے اور وہ اپنے اپنے طریق کے مطابق اس میں عبادت بجا لاسکتے ہیں۔

پھر عبادات میں مساوات قائم کرنے کیلئے اسلام نے امامت کیلئے بھی کسی خاندان یا کسی خاص قوم کی خصوصیت نہیں رکھی۔ عیسائیوں میں مقررہ پادری کے سوا کوئی دوسرا آدمی نماز نہیں پڑھا سکتا۔ سکھوں میں گرنتھی کے سوا دوسرا شخص گرنتھ صاحب کا پاٹھ نہیں کرسکتا لیکن اسلام پادریوں اور پنڈتوں کا قائل نہیں۔ وہ ہر نیک انسان کو خدا تعالیٰ کا نمائندہ سمجھتا ہے اور ہر نیک انسان کو نماز میں راہنمائی کا حق دیتا ہے۔ پھر غریب اور امیر مسجد میں ایک صف میں کھڑے ہوتے ہیں۔ ایک جج اور ایک ملزم اور ایک جرنیل اور ایک سپاہی پہلو بہ پہلو کھڑے ہوتے ہیں۔ اور کوئی شخص کسی دوسرے کو اُس کی جگہ سے پیچھے نہیں ہٹا سکتا۔ انگریزوں کے گرجوں میں مختلف سیٹوں پر لکھا ہوا ہوتا ہے کہ یہ جگہ فلاں لاٹ صاحب کے لئے ہے۔ اور یہ فلاں خاندان کیلئے مخصوص ہے لیکن مسلمانوں میں اِس قسم کا کوئی امتیاز روا نہیں رکھا جاتا کیونکہ مسجد میں اسلام نے ہر ایک کو برابر کا حق دیا ہے۔

مَیں جب عرب ممالک میں گیا تو اس وقت مَیں نے دیکھا کہ ایک مسجد کی ایک جہت میں ایک حجرہ بنا ہُوا تھا۔ اور اس کے اردگرد کٹہرا لگا ہُوا تھا۔ مَیں نے بعض لوگوں سے اس کے متعلق دریافت کیا تو معلوم ہُوا کہ پُرانے زمانہ میں جب بادشاہ آتے تھے تو وہ اِس حجرہ میں نماز پڑھا کرتے تھے۔ اور اس کی وجہ انہوں نے یہ بتائی کہ ایک دفعہ کوئی بادشاہ آیا۔ اور اُس کے ساتھ ہی ایک جھاڑو دینے والا بیٹھ گیا۔ اُس کے نوکروں نے اُسے ہٹانا چاہا تو سب مسلمان اور قاضی پیچھے پڑ گئے اور انہوں نے کہا۔ یہ خدا کی مسجد ہے۔ یہاں چھوٹے اور بڑے کا کوئی سوال نہیں۔ مسجد میں اگر کوئی بڑے سے بڑا آدمی بھی بیٹھا ہو تو اُس کے ساتھ اُس دن کا نو مسلم جو خاکروبوں یا سانسیوں میں سے آیا ہو کھڑے ہو کر نماز پڑھ سکتا ہے

وَ اِذْ بَوَّاْنَا لِاِبْرٰهِيْمَ مَكَانَ الْبَيْتِ اَنْ لَّا تُشْرِكْ

اور (یاد کر) جب ہم نے ابراہیمؑ کو بیت اللہ کی جگہ پر رہائش کا موقعہ دیا (اور کہا) کہ کسی چیز کو ہمارا شریک

بِيْ شَيْـًٔا وَّ طَهِّرْ بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَ الْقَآئِمِيْنَ وَ الرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ﴿۲۷﴾

نہ بناؤ۔ اور میرے گھر کو طواف کرنیوالوں کیلئے اور کھڑے ہو کر عبادت کرنیوالوں کیلئے اور رکوع کرنیوالوں کیلئے اور سجدہ کرنیوالوں

چاہے وہ بڑا آدمی بادشاہ ہی کیوں نہ ہو۔ چنانچہ اس کو نہ اٹھایا گیا۔ مگر بادشاہ پر اس کا ایسا اثر ہوا کہ اُس نے جگہ بدل کر پیچھے کی طرف اپنے لئے حجرہ بنوا لیا۔ میں نے جب یہ واقعہ سُنا تو اپنے دل میں کہا کہ اسلام کے ایک حکم کی بے حرمتی کی وجہ سے خدا تعالیٰ نے آئندہ اس سے مسجد میں نماز پڑھنے کی توفیق ہی چھین لی۔ کیونکہ جس جگہ حجرہ بنایا گیا تھا وہ مسجد کا حصہ نہیں تھا۔ بہرحال اسلام نے مساجد میں بڑے اور چھوٹے کا کوئی امتیاز نہیں رکھا۔ اور اس طرح بنی نوع انسان میں اُس نے ایک بے نظیر مساوات قائم کر دی ہے۔

۱۱ حل لغات:- بَوَّاْنَا: بَوَّاَ سے جمع متکلم کا صیغہ ہے۔ اور بَوَّاَ لَهٗ مَنْزِلًا کے معنے ہوتے ہیں هَيَّاَهٗ وَ مَكَّنَ لَهٗ فِيْهِ اُس کے لئے مکان تیار کروایا اور اُس میں اس کو جگہ دی (اقرب) پس بَوَّاْنَا لِاِبْرٰهِيْمَ مَكَانَ الْبَيْتِ کے معنے ہیں۔ ہم نے ابراہیمؑ کو خانہ کعبہ کے مقام پر جگہ دی۔

تفسیر:- فرماتا ہے کہ یاد رکھو کہ ہم نے اس گھر کی تعمیر ابراہیمؑ کے زمانہ سے شروع کی ہے۔ اور اس تعلیم سے شروع کی ہے کہ اس کے ساتھ تعلق رکھنے والے لوگ شرک نہ کریں اور مسافروں اور اس گھر کے پاس رہنے والوں اور رکوع کرنے والوں اور سجدہ کرنے والوں کے لئے اِس گھر کو پاک رکھیں۔ اِن آیات سے ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے جس قربانی کا مطالبہ کیا تھا۔ اور جس کے ماتحت وہ اپنے بیٹے حضرت اسمٰعیلؑ کو ایک بے آب و گیاہ وادی میں چھوڑ کر چلے گئے اس کی اصل غرض یہ تھی کہ وہ بڑے ہو کر بیت اللہ کی حفاظت اور دینِ ابراہیمی کی خدمت کریں۔ اور ان کے ذریعہ وہ اولاد پیدا ہو جس کے ہاتھوں خدا تعالیٰ اپنے دین کا آخری دَور قائم کرنا چاہتا تھا۔ پس درحقیقت حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کو جس دن بیت اللہ کے پاس چھوڑا گیا اُس دن رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد کا اعلان کیا گیا۔ کیونکہ بیت اللہ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ہی اللہ تعالیٰ کے ذکر کا آخری گھر ہونا تھا۔ اور اُس کی تیاری حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے زمانہ ہی سے شروع کر دی گئی۔ دُنیا میں جب بھی کوئی بڑا کام ہونے لگتا ہے تو پہلے سے اس کی تیاری شروع کر دی جاتی ہے۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا چونکہ مکہ میں ظہور مقدّر تھا اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس کے متعلق دو ہزار سال پہلے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے ذریعہ سے تیاری شروع کر دی۔ یہ کتنا اہم مقام ہے جو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو حاصل ہے کہ دو ہزار سال پہلے اللہ تعالیٰ حضرت ابراہیم اور حضرت اسمٰعیل علیہما السلام کو حکم دیتا ہے کہ میرے اس گھر کو صاف کرو۔ کیونکہ یہاں میرا وہ نبی آنے والا ہے جس کے نور سے ساری دنیا منور ہو گی۔ چنانچہ فرمایا۔ طَهِّرْ بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ

بَوَّاْنَا

وَالْقَآئِمِیْنَ وَالرُّکَّعِ السُّجُوْدِ تم میرے اس گھر
کو اُن لوگوں کے لئے تیار کرو جو طواف کرنے کے لئے
یہاں آئیں گے۔ جو قیام کرنے کے لئے یہاں آئیں گے۔
اور جو یہاں آکر رکوع اور سجدہ کریں گے۔ مگر حضرت
اسمٰعیل علیہ السلام کے زمانہ میں اور اس کے بعد کتنے لوگ
تھے جو اس نیّت کے ساتھ وہاں آیا کرتے تھے۔ طواف
تو لوگ کرتے ہی تھے مگر کتنے لوگ تھے جو وہاں جاکر
اپنی عمریں خدا تعالیٰ کے دین کی خدمت کے لئے وقف
کر دیتے تھے۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ سے
پہلے سینکڑوں سال کی تاریخ محفوظ ہے۔ مگر وہ تاریخ
یہی بتاتی ہے کہ اس وقت وہاں بُت پرستی ہی بُت پرستی
تھی۔ نہ خدا کے لئے کوئی اعتکاف بیٹھنے والا تھا۔ نہ
خدا کے لئے کوئی قیام کرنے والا تھا۔ نہ خدا کے لئے
وہاں رکوع ہوتا تھا۔ اور نہ خدا کے لئے وہاں سجدہ ہوتا
تھا۔ بلکہ جو لوگ خدا تعالیٰ کے نام کو بلند کرتے انہیں
مارا اور پیٹا جاتا تھا۔ پس یہ باتیں جو بیان کی گئی ہیں کہ
میرے اس گھر کو تیار کرو تاکہ طواف کرنے والے قیام
کرنے والے اور کامل رکوع اور کامل سجدہ کرنے والے
یہاں آئیں۔ یہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ
میں ہی ہونے والی تھیں۔ اور حضرت اسمٰعیل علیہ السلام
کو اسی تیاری کے لئے مقرر کیا گیا تھا۔ باقی رہا یہ
سوال کہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام نے پھر کیا کام کیا؟
اس کا جواب یہ ہے کہ انہوں نے ظاہری رنگ میں
کعبہ کی تعمیر کی۔ اسی طرح انہی کے ذریعہ اللہ تعالیٰ
نے زمزم نکلوایا۔ بعد میں جو خرابیاں نظر آتی ہیں اُن کی
وجہ سے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام پر اعتراض نہیں
ہو سکتا۔ اصل غور کرنے والی بات یہ ہے کہ گو
حضرت اسمٰعیل علیہ السلام نے جن لوگوں کو اپنے بعد
چھوڑا اُن میں سے بہت سے مشرک اور بُت پرست
ہو گئے۔ مگر کیا دنیا کا کوئی شخص اس امر سے انکار کر
سکتا ہے کہ دین کو پھیلانے کی قابلیت انہی لوگوں
کے اندر تھی۔ اہل مکہ نے بے شک اسلام کی مخالفت
کی۔ قریش نے بے شک رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی
مخالفت کی اور شدید مخالفت کی۔ بلکہ ابوجہل کو پیش
کر کے کوئی شخص کہہ سکتا ہے کہ جس قوم میں ابوجہل جیسے
لوگ پیدا ہونے والے تھے کیا اس کے متعلق یہ پیشگوئی
کی گئی تھی کہ طَھِّرْ بَیْتِیَ لِلطَّآئِفِیْنَ وَالْقَآئِمِیْنَ
وَالرُّکَّعِ السُّجُوْدِ کہ میرے اس گھر کو کامل طواف
کرنیوالوں اور کامل قیام کرنے والوں اور کامل رکوع
اور سجود کرنے والوں کے لئے تیار کرو! میں اُسے کہونگا
کہ اے نادان! تجھے ابوجہل تو نظر آگیا جس کا کام ختم
ہو گیا۔ مگر تجھے ابوبکرؓ نظر نہ آیا جس کا کام آج تک
جاری ہے۔ تجھے عتبہ اور شیبہ تو نظر آگئے جو پیدا
ہو کر فنا ہو گئے۔ مگر تجھے عمرؓ۔ عثمانؓ اور علیؓ نظر
نہ آئے جن کو دائمی حیات بخشی گئی ہے اور جن کے
کارنامے قیامت تک دنیا سے محو نہیں ہو سکتے۔ پس
بے شک وہ لوگ خراب ہو گئے تھے۔ مگر اُن کی یہ خرابی
ایسی ہی تھی جیسے کوٹ پر مٹی پڑ جائے۔ یا وہ ہیرا تو
تھے مگر تراشا ہوا ہیرا نہیں تھے۔ جب محمد رسول اللہ
صلے اللہ علیہ وسلم کی توجہ اور آپ کی قوتِ قدسیہ کی
برکت سے وہ تراشے گئے تو وہی ہیرے دنیا کی بہترین
متاع شمار ہونے لگے۔ چنانچہ ابوجہل عکرمہؓ کی
صورت میں۔ عاصی اور وائل عمروؓ کی صورت میں۔ ولید
خالدؓ کی صورت میں اور ابوسفیان۔ معاویہ اور یزید
ابن ابوسفیان کی صورت میں ظاہر ہوا۔ جب تک سونے
کے ذرّات مٹی میں ملے ہوئے ہوتے ہیں اُن کی کوئی قدر
وقیمت نہیں ہوتی۔ مگر جب کسی ماہر کی نگاہ اُن پر پڑتی
ہے تو وہ اُن ذرّات کو مٹی سے علیحدہ کر لیتا ہے اور

پھر وہی ذرّات بہت بڑی قیمت پر فروخت ہوتے ہیں۔ اسی طرح ہیرا جب تک پتھر میں رہتا ہے اُس کی قدر قیمت کا کسی کو احساس نہیں ہوتا مگر جب کوئی ماہر اُسے کاٹ کر ہیرے کو اپنی اصل شکل میں دنیا کے سامنے پیش کرتا ہے تو اس کی قیمت لاکھوں بلکہ کروڑوں روپیہ تک پہنچ جاتی ہے۔

پس اِس میں کوئی شبہ نہیں کہ اُن میں خرابیاں پیدا ہوئیں مگر جب محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اُن میں صفائی پیدا کی۔ تو انہی میں ابوبکرؓ۔ عمرؓ۔ عثمانؓ اور علیؓ پیدا ہوئے۔ بلکہ اور ہزاروں لوگ پیدا ہوئے اُن میں طلحہؓ جیسے لوگ پیدا ہوئے۔ اُن میں زبیرؓ جیسے لوگ پیدا ہوئے۔ اُن میں عبدالرحمٰنؓ بن عوف جیسے لوگ پیدا ہوئے۔ اُن میں ابوعبیدہؓ جیسے لوگ پیدا ہوئے۔ اُن میں سعدؓ اور سعیدؓ جیسے لوگ پیدا ہوئے۔ اُن میں عثمانؓ بن مظعون جیسے لوگ پیدا ہوئے۔ یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے اللہ تعالیٰ کے نام کو روشن کرنے کے لئے اپنے جذبات کی انتہائی قربانی کی۔ یہاں تک کہ اُن میں سے ہر شخص زندہ ابراہیمؑ بن گیا۔ اِس میں کوئی شبہ نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں سے تھے۔ مگر اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ آپ ابوابراہیمؑ بھی تھے۔ اور رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی قوتِ قدسیہ سے آپ کی روحانی اولاد میں ہزاروں ابراہیم پیدا ہوئے جنہوں نے دنیا کے سامنے پھر وہی نظارہ پیش کر دیا جو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے پیش کیا تھا۔

غرض اللہ تعالیٰ نے جب حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کو مکّہ میں بھیجا تو درحقیقت یہ تیاری تھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد کی۔ خدا تعالیٰ نے انہیں کہا کہ تم ہمارا گھر تیار کرو۔ کیونکہ ہمارا محبوب اور ہمارا آخری شرعی رسول دنیا میں نازل ہونے والا ہے۔ تم آج سے ہی ہمارے محبوب کی آمد کی تیاری میں مشغول ہو جاؤ اور آج سے ہی ایسی اولاد پیدا کرو جو میرے محبوب کو ابوبکرؓ دے۔ جو میرے محبوب کو عمرؓ دے۔ جو میرے محبوب کو عثمانؓ دے۔ جو میرے محبوب کو علیؓ دے۔ جو میرے محبوب کو طلحہؓ۔ زبیرؓ۔ حمزہؓ اور عباسؓ دے۔ اور اسی طرح کے اور سینکڑوں صحابہؓ اُس کے حضور بطور نذر پیش کرے۔ یہی مفہوم تھا طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّائِفِينَ وَالْقَائِمِينَ وَالرُّكَّعِ السُّجُودِ کا۔ ورنہ ظاہری معنوں میں تو مکّہ والوں نے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے بعد دین کا کوئی اچھا نمونہ نہیں دکھایا ہاں چونکہ اس پیشگوئی کا ظہور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے سے شروع ہونا تھا اس لئے خدا تعالیٰ نے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کو مکّہ میں لا کے رکھا تاکہ وہ ایسی اولاد تیار کریں جو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے دین کی خدمت کرے اور اپنے آپ کو خدا تعالےٰ کے جلال کے اظہار کے لئے وقف کر دے۔ مگر اس کے علاوہ چونکہ دنیا کی تمام مساجد بھی بیت اللہ ہیں۔ کیونکہ وہ بھی خدا تعالیٰ کے ذکر کے لئے مخصوص ہوتی ہیں اور بیت اللہ کے ظل کے طور پر ہی اللہ تعالےٰ نے انہیں قائم فرمایا ہے اس لئے یہ احکام صرف بیت اللہ کے لئے ہی مخصوص نہیں بلکہ ہر مسجد پر بھی ظلّی طور پر چسپاں ہوتے ہیں۔

اِس نقطۂ نگاہ سے اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس آیت میں مساجد کی تین اہم اغراض بیان کی گئی ہیں۔

اوّل۔ مساجد اس لئے بنائی جاتی ہیں کہ مسافر اُن سے فائدہ اٹھائیں۔

دوم۔ مساجد اس لئے بنائی جاتی ہیں کہ

وَاَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَاْتُوْكَ رِجَالًا وَّعَلٰى كُلِّ

اور تمام لوگوں میں اعلان کر دے کہ وہ حج کی نیت سے تیرے پاس آیا کریں۔ پیدل بھی اور ہر ایسی سواری پر بھی جو

ضَامِرٍ يَّاْتِيْنَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيْقٍ ﴿۲۸﴾ لِّيَشْهَدُوْا

لمبے سفر کی وجہ سے دُبلی ہو گئی ہو (ایسی سواریاں) دُور دُور سے گہرے راستوں سے ہوتی ہوئی آئینگی۔ تاکہ وہ (یعنی آنیوالے) اُن منافع کو

شہر میں رہنے والے اُن سے فائدہ اُٹھائیں۔

سوم مساجد اس لئے بنائی جاتی ہیں کہ رکوع و سجود کرنے والے یعنی اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے اپنی زندگی وقف کرنے والے اور توحید کامل پر قائم لوگ اُن سے فائدہ اٹھائیں۔

مسافر تو مسجد سے اس رنگ میں فائدہ اٹھا سکتا ہے کہ اگر اُسے کوئی اور ٹھکانہ نہ ملے تو وہ اُس میں چند روز قیام کر کے رہائش کی دقّتوں سے بچ سکتا ہے۔ اور مقیم اِس رنگ میں فائدہ اُٹھا سکتا ہے کہ مسجد شور و شغب سے محفوظ مقام ہوتا ہے۔ وہ اُس میں بیٹھ کر اطمینان اور سکون سے دُعائیں کر سکتا اور اپنے رب سے مناجات کر سکتا ہے۔ اور وہ لوگ جو اپنے آپ کو خدا تعالیٰ کے دین کے لئے وقف کر دیتے ہیں اُن کا اصل ٹھکانہ تو مسجد ہی ہوتا ہے۔ کیونکہ مسجد مومنوں کے اجتماع کا مقام ہوتی ہے اور دُعاؤں اور ذکرِ الٰہی کی جگہ ہوتی ہے۔ ایسے مقام سے کوئی سچا عشق اور تعلّق رکھنے والا انسان جُدا ہی نہیں ہو سکتا۔ مگر یہ امر بھی مدّنظر رکھنا چاہیئے کہ ذکرِ الٰہی کا قائم مقام وہ تمام کام بھی ہیں جو قومی فائدہ کے ہوں۔ خواہ وہ قضاء کے متعلق ہوں یا جھگڑوں اور فسادات کے متعلق ہوں یا تعلیم کے متعلق ہوں یا کسی اور رنگ میں مسلمانوں کی ترقی اور اُن کے تنزل کے ساتھ تعلق رکھتے ہوں۔ چنانچہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کو اگر دیکھا جائے تو لڑائیوں کے فیصلے بھی مسجد میں ہوتے تھے۔ قضاء بھی وہیں ہوتی تھی تعلیم بھی وہیں ہوتی تھی جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مساجد صرف اللہ اللہ کرنے کیلئے ہی نہیں بلکہ بعض دوسرے کام بھی جو قومی ضرورتوں سے تعلق رکھتے ہیں مساجد میں کئے جا سکتے ہیں۔ کیونکہ اسلام میں ذکرِ الٰہی صرف اس بات کا نام نہیں کہ انسان سُبحان اللہ سُبحان اللہ کہتا رہے بلکہ اگر کوئی بیوہ کی خدمت کرتا ہے۔ تو وہ بھی دین ہے۔ اگر کوئی یتیم کی پرورش کرتا ہے تو وہ بھی دین ہے۔ اگر کوئی شخص قوم کی خدمت کرتا ہے تو وہ بھی دین ہے۔ اگر کوئی شخص لوگوں کے جھگڑے دُور کرتا اور اُن میں صلح کراتا ہے تو یہ بھی دین ہے۔ پس وہ تمام کام جن سے قوم کو فائدہ پہنچے اور جو قوم کے اخلاق اور اسکی دنیوی حالت کو اونچا کریں ذکرِ الٰہی میں شامل ہیں اور اُنکا مساجد میں کرنا جائز ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں اگر کوئی مہمان آجاتا تو آپ مسجد میں ہی صحابہؓ کو مخاطب کر کے فرماتے کہ فلاں مہمان آیا ہے تم میں سے کون اِسے ساتھ لے جائیگا۔ اب بظاہر یہ روٹی کا سوال تھا۔ لیکن درحقیقت دین تھا۔ اِس لئے کہ اِس سے ایک دینی ضرورت پُوری ہوتی تھی۔ لوگوں نے غلطی سے دین کے معنوں کو بہت محدود کر دیا ہے۔ حالانکہ دین اس لئے نازل ہُوا ہے کہ انسان کا خدا تعالیٰ سے تعلق پیدا کرے اور خدا تعالیٰ بغیر کسی خدمت کے بندہ سے نہیں ملتا۔ بلکہ وہ یتیم کی پرورش کرنے سے ملتا ہے۔ وہ بیوہ کی خدمت کرنے سے ملتا ہے۔ وہ کافر کو تبلیغ کرنے سے

مَنَافِعَ لَهُمْ وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ

دیکھیں جو اُن کے لئے (مقرر کئے گئے) ہیں۔ اور کچھ مقرر دنوں میں اللہ (تعالیٰ) کو اُن نعمتوں کی وجہ سے یاد کریں جو

عَلٰى مَا رَزَقَهُمْ مِّنْۢ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ ۚ فَكُلُوْا مِنْهَا

ہم نے انکو دی ہیں (یعنی) بڑے جانوروں کی قسم سے (جیسے گائے اونٹ وغیرہ) پس چاہیئے کہ وہ اُن کے گوشت کھائیں

وَاَطْعِمُوا الْبَآئِسَ الْفَقِيْرَ ﴿۲۹﴾ ثُمَّ لْيَقْضُوْا تَفَثَهُمْ

اور تکلیف میں پڑے ہوئے اور نادار کو کھلائیں۔ پھر اپنی میل دُور کریں اور

وَلْيُوْفُوْا نُذُوْرَهُمْ وَلْيَطَّوَّفُوْا بِالْبَيْتِ الْعَتِيْقِ ﴿۳۰﴾

اپنی نذریں پوری کریں اور پُرانے گھر (یعنی خانہ کعبہ) کا طواف کریں۔ ۱۲

ملتا ہے۔ وہ مومن کو مصیبت سے نجات دلانے سے ملتا ہے، پس اِن باتوں کا اگر مسجد میں ذکر کیا جاتا ہے تو یہ دنیا نہیں بلکہ دین کا ہی حصّہ ہوگا۔ ہاں مساجد میں خالص ذاتی کاموں کے متعلق باتیں کرنا منع ہے۔ مثلاً اگر تم کسی سے پوچھتے ہو کہ تمہاری بیٹی کی شادی کا کیا فیصلہ ہوا یا کہتے ہو کہ میری ترقی کا جھگڑا ہے افسر نہیں مانتے تو یہ باتیں مسجد میں جائز نہیں ہونگی۔ سوائے امام کے کہ اُس پر تمام قوم کی ذمہ واری ہوتی ہے اور اس کا حق ہے کہ وہ ضرورت محسوس ہونے پر اِن اُمور کے متعلق بھی لوگوں سے باتیں کرلے۔ بہرحال مسجد میں خالص ذاتی کاموں کے متعلق باتیں کرنا منع ہے۔ مثلاً رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اگر کسی کی کوئی چیز گم ہوجائے تو وہ اس کے متعلق مسجد میں اعلان نہ کرے (صحیح مسلم مع شرح النووی جلد اوّل صفحہ ۲۱۰ مطبوعہ اصح المطابع دہلی) پس مساجد صرف ذکر الٰہی کے لئے ہیں لیکن ذکر الٰہی اِن تمام باتوں پر مشتمل ہے جو انسان کی ملّی، سیاسی، علمی اور قومی برتری اور ترقی کے لئے ہوں۔ لیکن وہ تمام باتیں جو لڑائی دنگہ فساد یا قانون شکنی سے تعلق رکھتی ہوں خواہ اُن کا نام ملّی رکھ لو یا سیاسی۔ قومی رکھ لو یا دینی اُنکا مساجد میں کرنا ناجائز ہے۔ اِسی طرح مساجد میں ذاتی امور کے متعلق باتیں کرنا بھی منع ہے۔ کیونکہ اسلام مسجد کو بیت اللہ قرار دیتا اور اُسے اللہ تعالےٰ کے ذکر کے لئے مخصوص قرار دیتا ہے۔

۱۲ حل لغات:۔ رِجَالًا: رِجَالًا: رَجُلٌ کی جمع ہے اور اَلرَّاجِلُ کے معنے ہیں وہ آدمی جس کے پاس کوئی سواری نہ ہو۔ یعنی پیادہ۔

ضَامِرٌ: اَلْقَلِيْلُ اللَّحْمِ الدَّقِيْقُ۔ تھوڑے گوشت والا۔ يُقَالُ جَمَلٌ ضَامِرٌ وَ نَاقَةٌ ضَامِرَةٌ یہ لفظ اونٹ اور اونٹنی دونوں کے لئے جبکہ وہ لاغر ہوں اور اُن کا گوشت تھوڑا ہو بولا جاتا ہے۔

اَلْفَجُّ کے معنے ہیں اَلطَّرِيْقُ الْوَاسِعُ الْوَاضِحُ بَيْنَ جَبَلَيْنِ۔ وہ کھلا راستہ جو دو پہاڑوں کے درمیان ہوتا ہے۔

تَفَثٌ کے معنے ہیں اَلْوَسَخُ۔ میل (اقرب)

رِجَالًا ضَامِرٌ اَلْفَجُّ تَفَثٌ

تفسیر:- فرماتا ہے۔ ہم نے ابراہیمؑ کو یہ بھی کہہ دیا تھا کہ یہ حکم صرف تیرے لئے نہیں بلکہ تمام بنی نوع انسان کے لئے ہے کہ لوگ دُور دُور سے سفر کی وجہ سے دُبلی ہونے والی سواریوں پر چڑھ کر جو رستوں میں بھی کثرتِ سفر کی وجہ سے گڑھے ڈال دینگی اور تیز دوڑنے والی ہونگی تیرے پاس آئیں تاکہ دنیوی نفع بھی اُن کو پہنچے اور مقررہ دنوں میں اللہ تعالیٰ کا ذکر بھی وہ خوب کریں اور اس طرح ساری دنیا میں ایک دین قائم ہو جائے۔ اور چاہیئے کہ تم میں سے مالدار لوگ قربانیوں کے گوشت میں سے خود بھی کھائیں اور باقی غریبوں کو بھی کھلائیں۔ اور جب قربانیاں کر چکیں تو نہائیں۔ اور اپنی میل دُور کریں یعنی جسمانی لحاظ سے بھی اپنی صفائی کریں اور روحانی لحاظ سے بھی اپنے دلوں کے گند دُور کریں۔ اور انہوں نے خدا تعالیٰ سے جو عہد باندھے تھے اُن کو پورا کریں اور اس پُرانے عبادت خانہ کا طواف کریں۔ اِس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ ایک بے جان چیز کو خدا تعالیٰ کا مرتبہ دیا گیا ہے۔ بلکہ طواف کرنا ایک پُرانی رسم تھی جو قربانی دینے کی علامت تھی۔ لوگ بیماروں کے گرد طواف کرتے تھے جس کے معنے یہ ہوتے تھے کہ ہم قربان ہو جائیں اور یہ بچ جائیں۔ اِس آیت میں اِسی طرف اشارہ ہے کہ ایسے لوگ دنیا میں پیدا ہوتے رہیں جو اس گھر کی عظمت اور خدا تعالیٰ کی عبادت کو قائم رکھنے کے لئے اپنی جانیں قربان کرتے رہیں۔ ورنہ طوافِ ظاہری تو اپنی ذات میں کوئی بڑی بات نہیں۔

اِن آیات میں اللہ تعالےٰ نے حج بیت اللہ کا ذکر فرمایا ہے جو ایک اہم اسلامی عبادت ہے اور جس کے مطابق ہر سال لاکھوں آدمی جن میں سے کوئی کسی قوم کا ہوتا ہے اور کوئی کسی ملک کا ایک دوسرے کے رسم و رواج ایک دوسرے کی زبان اور ایک دوسرے کی عادات وغیرہ سے ناواقف ہوتے ہوئے مکہ مکرمہ میں جمع ہوتے ہیں۔ اور اپنے عمل سے اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ اسلامی توحید نے مسلمانوں کے دلوں کو ایسا متحد کر دیا ہے کہ باوجود اختلافِ زبان۔ اختلافِ عقائد۔ اختلافِ رنگ و نسل اختلافِ خیالات اور اختلافِ آب و ہوا کے ہم اللہ تعالیٰ کی آواز پر لبیک کہہ کر ایک جگہ پر جمع ہونے کے لئے تیار ہیں۔ اِسی طرح مسلمانوں نے اپنے عمل سے ظاہری حج کے علاوہ یہ بھی ثابت کر دیا ہے کہ وہ خانہ کعبہ کی حفاظت کے لئے اپنی جانیں قربان کرنے کے لئے تیار رہتے ہیں اور جب تک مسلمانوں میں یہ رُوح قائم رہیگی کسی دشمن کی یہ طاقت نہیں ہوگی کہ وہ خانہ کعبہ کی طرف مُنہ کرے یا مسلمانو کی یکجہتی کو توڑ سکے۔ کیونکہ جب تک خانہ کعبہ رہیگا مسلمانوں کی یکجہتی بھی قائم رہے گی۔ اُن کی آنکھوں کے سامنے نہ صرف یہ نظارہ ہوتا ہے کہ دنیا کے کن کن کونوں میں خدا تعالیٰ نے اسلام کو پھیلا دیا بلکہ وہ یہ بھی دیکھتے ہیں کہ ایک بے آب و گیاہ جنگل سے بلند ہونیوالی وہ آواز جس کو غیر تو الگ رہے اپنے بھی نہیں سُنتے تھے اور آواز دینے والے کو ہر قسم کے مظالم کا تختۂ مشق بناتے تھے آج دنیا کے کونوں کونوں تک پہنچ کر لاکھوں انسانوں کے اجتماع کا باعث بن رہی ہے۔ وہ اللہ تعالےٰ کے اس عظیم الشان نشان کو دیکھتے اور اپنے ایمانوں میں ایک تازگی اور لطافت محسوس کرتے ہیں کہ کہاں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پیدا ہوئے جنہوں نے ایک ایسی آواز بلند کی جو گونجی اور گونجتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ وہ دُور دراز ملکوں میں پہنچی اور لاکھوں لوگوں کو یہاں کھینچ لائی۔ اور وہ مکہ جہاں رہنے والوں کی اذیتوں اور تکلیفوں کی وجہ سے مسلمانوں کو اپنا وطن چھوڑنا پڑا اور جنہیں اِس سرزمین میں لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کہنے کی اجازت تک نہیں تھی آج اُسی مکہ مکرمہ میں

ہر ایک کی زبان پر اَللّٰہُ اَکْبَرُ۔ اَللّٰہُ اَکْبَرُ۔ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ۔ اَللّٰہُ اَکْبَرُ وَلِلّٰہِ الْحَمْدُ جاری ہے اور وہ لَبَّیْکَ اَللّٰھُمَّ لَبَّیْکَ لَبَّیْکَ لَا شَرِیْکَ لَکَ لَبَّیْکَ کہتے جا رہے ہیں۔ گویا اس وقت خدا تعالےٰ اُن کے سامنے کھڑا ہوتا ہے اور وہ اُس سے یہ کہہ رہے ہوتے ہیں کہ اے ہمارے رب ہم حاضر ہیں ہم اقرار کرتے ہیں کہ تیرا کوئی شریک نہیں صرف تُو ہی اِس امر کا مستحق ہے کہ بندوں کو آواز دے۔ اور اے خدا تیرے بلانے پر ہم تیرے حضور حاضر ہیں۔ پس مکّۂ مکرّمہ وہ مقام ہے جہاں ہر سال لاکھوں مسلمان صرف اِسلئے جمع ہوتے ہیں کہ وہ خدا تعالیٰ کی عبادت کریں۔ اور دنیا کے سامنے اس بات کی شہادت پیش کریں کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا لایا ہُوا دین آج بھی زندہ ہے۔ اور آپ کے خادم آج بھی آپ کی آواز کو بلند کرنے کے لئے دنیا میں موجود ہیں۔ گویا حج دنیا کو یہ پیغام پہنچاتا ہے کہ اسلام کی رگوں میں اَب بھی زندگی کا خون دوڑ رہا ہے۔ اَب بھی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عشق رکھنے والے لوگ اسلام کے مرکز مکّۂ مکرّمہ میں جمع ہیں اور انہوں نے اپنے اس تعلق کا اعلان کیا ہے جو انہیں اسلام اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے ہے۔ انہوں نے اس بات کی شہادت دی ہے کہ چاہے کمزور ہی سہی لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نام لیوا اب بھی دنیا میں موجود ہیں اور اب بھی مسلمانوں کی قومی زندگی کی رگ پھڑک رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے جس طرح نماز اور روزہ اور زکوٰۃ کو ضروری قرار دیا ہے اسی طرح اُس نے حج کو بھی ایک ضروری فریضہ قرار دیا ہے۔ بے شک حج کی اصل غرض روحانی طور پر یہ ہے کہ انسان ہر قسم کے تعلقات کو توڑ کر دل سے خدا کا ہو جائے۔ مگر اس غرض کو پورا کرنے کیلئے خدا تعالیٰ نے ایک ظاہری حج بھی رکھ دیا اور صاحبِ استطاعت لوگوں پر یہ فرض قرار دے دیا کہ وہ گھربار چھوڑ کر مکّۂ مکرّمہ میں جائیں۔ اور اس طرح اپنے وطن اور عزیز و اقربا کی قربانی کا سبق سیکھیں۔ کیونکہ اسلام جسم اور رُوح دونوں کی اہمیّت کو تسلیم کرتا ہے جس طرح دنیا میں ہر ایک انسان کا ایک مادی جسم ہوتا ہے اور اُس جسم میں رُوح ہوتی ہے۔ اِسی طرح مذہب اور روحانیت کے بھی جسم ہوتے ہیں جن کو قائم رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ مثلاً اسلام نے نماز کی ادائیگی کے لئے بعض خاص حرکات مقرر کی ہوئی ہیں۔ اب اصل غرض تو نماز کی یہ ہے کہ انسان کے دل میں خدا تعالیٰ کی محبت پیدا ہو۔ اُس کی صفات کو وہ اپنے ذہن میں لائے اور اُن کے مطابق اپنے آپ کو بنانے کی کوشش کرے۔ اِن باتوں کا بظاہر ہاتھ باندھنے یا سیدھا کھڑا ہونے یا زمین پر جُھک جانے سے کوئی تعلق نظر نہیں آتا مگر چونکہ کوئی رُوح جسم کے بغیر قائم نہیں رہ سکتی اس لئے خدا تعالےٰ نے جہاں نماز کا حکم دیا وہاں بعض خاص قسم کی حرکات کا بھی حکم دیدیا۔ جن مذاہب نے اِس حقیقت کو نہیں سمجھا اور انہوں نے اپنے پیروؤں کے لئے عبادت کرتے وقت جسم کی حرکات کو ضروری قرار نہیں دیا وہ رفتہ رفتہ عبادت سے ہی غافل ہو گئے ہیں۔ اور اگر اُن میں کوئی نماز ہوتی بھی ہے تو ایک تمسخر سے زیادہ اس کی کوئی حقیقت نہیں ہوتی۔ اِسی طرح گو حقیقی حج یہی ہے کہ انسان ہر قسم کے تعلقات کو منقطع کر کے خدا کا ہو جائے۔ چنانچہ اسی لئے خواب میں اگر کوئی شخص اپنے متعلق دیکھے کہ اُس نے حج کیا ہے تو اُس کی تعبیر یہ ہوتی ہے کہ اس کا مقصد پورا ہو جائیگا۔ اور یہ ظاہر ہے کہ انسان کی زندگی کا سب سے بڑا مقصد خدا تعالیٰ

کی عبادت اور اُس کا قُرب حاصل کرنا ہے۔ جیسے وہ فرماتا ہے کہ مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ۔ کہ مَیں نے بنی نوع انسان کو صرف اپنا مقرب بنانے کے لئے پیدا کیا ہے۔ پس حج اس بات کی علامت ہے کہ جس غرض کے لئے انسان کو پیدا کیا گیا تھا وہ اُس نے پوری کر لی۔ یا دوسرے لفظوں میں یوں کہہ لو کہ حج کیا ہے؟ خدا تعالیٰ کی رویت اور اُس کا دیدار۔ مگر اس کے لئے خدا تعالیٰ نے ایک ظاہری جسم بھی رکھ دیا تاکہ جسم کے ذریعہ رُوح کی بھی حفاظت ہوتی رہے۔ پھر حج اُس سچے اخلاص کے واقعہ کو بھی تازہ کرتا ہے جس کا نمونہ آج سے چار ہزار سال پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دکھایا اور جس کے نتائج آج تک دنیا کو نظر آ رہے ہیں۔ اُور کی سرزمین میں آج سے چار ہزار سال پہلے ایک مشرک گھرانے میں ایک بچہ پیدا ہوا (دیکھو پیدائش باب ۱۱ آیت ۲۸) اُس نے ایسے لوگوں میں تربیت پائی جن کا رات دن مشغلہ خدا کا شریک بنانا۔ اور بُتوں کی پرستش کرنا تھا۔ مگر وہ بچہ ایک نورانی دل لے کر پیدا ہوا تھا۔ اور وہ بچپن سے ہی بُتوں کو حقارت کی نگاہ سے دیکھا کرتا تھا۔ جب دنیا کی بڑھتی ہوئی گمراہی اور اُس کے طوفانِ ضلالت کو دیکھ کر خدا تعالیٰ نے چاہا کہ بنی نوع انسان میں سے کسی کو اپنا بنائے۔ تو اُس کی جوہر شناس نگاہ نے کسدیوں کی بستی میں سے ابراہیم کو چُنا (پیدائش باب ۱۱ آیت ۳۱) اور اُسے اپنے فضل سے ممسوح کیا۔ اور اُسے کہا کہ اے ابراہیم جا اور اپنے بیٹے کو قربان کر تاکہ لوگوں سے الگ میری خاص حفاظت اور نگرانی میں ایک نیری لگائی جائے۔ نیکی اور تقویٰ کی نیری۔ ایک چشمہ پھوڑا جائے۔ پاکیزگی اور طہارت کا چشمہ۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا۔ بہت اچھا۔ مَیں تیار ہوں۔ چنانچہ انہوں نے اپنے اس بیٹے کو جو بڑھاپے میں نصیب ہوا تھا۔ اس وادیٔ غیر ذی زرع میں لا کر چھوڑ دیا جس کے متعلق قرآن کہتا ہے کہ اُس میں کھانے اور پینے کا کوئی سامان نہیں تھا۔ ایسی پُرخطر اور بھیانک وادی میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے صرف اس لئے اپنے بیٹے اور اُس کی والدہ کو چھوڑا تاکہ خدا کا ذکر بلند ہو اور اُس کی کھوئی ہوئی عظمت دُنیا میں پھر قائم ہو۔ صرف ایک مشکیزہ پانی اور ایک تھیلی کھجور اُس ماں اور بچے کو دے گئے جن کے متعلق یہ الٰہی فیصلہ تھا کہ اب انہوں نے اِسی جنگل میں ہمیشہ کے لئے اپنی زندگی بسر کرنی ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے سوچا کہ ایک مشکیزہ پانی اور ایک تھیلی کھجور کتنے دن کام دے سکتی ہے۔ پھر سوائے ریت کے ذرّوں اور آفتاب کی چمک کے اور کوئی چیز میری بیوی اور بچے کیلئے نہیں ہوگی۔ یہ سوچتے ہی اُن پر رقت طاری ہوگئی۔ اور آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ حضرت ہاجرہؓ ان کی آنکھوں کی نمی اور ہونٹوں کی پھڑپھڑاہٹ سے سمجھ گئیں کہ بات کچھ زیادہ ہے۔ وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پیچھے چلیں اور کہنے لگیں۔ ابراہیمؑ! تم ہمیں کہاں چھوڑ چلے ہو یہاں تو پینے کے لئے پانی تک نہیں اور کھانے کے لئے کوئی غذا نہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جواب دینا چاہا مگر رقت کی وجہ سے آواز نہ نکل سکی۔ تب حضرت ہاجرہؓ نے کہا کہ کیا آپ خدا کے حکم سے ایسا کر رہے ہیں یا اپنی مرضی سے۔ اِس پر انہوں نے آسمان کی طرف اپنے دونوں ہاتھ اُٹھا دیئے جس کے معنے یہ تھے کہ مَیں خدا کے حکم کے ماتحت ایسا کر رہا ہوں۔ اِس جواب کو سُنکر یقین اور ایمان سے پُر ہاجرہؓ جو اپنی جوانی کی عمر میں تھی اور جس کا ایک ہی بیٹا تھا جو اُس وقت موت کی نذر ہو رہا تھا فوراً رُک گئی۔ اور کہنے لگی۔ اگر یہ بات ہے تو پھر خدا ہمیں کبھی ضائع نہیں کریگا۔

آخر پانی ختم ہوا۔ غذا ختم ہوئی۔ اور باوجود اس کے کہ اِس علاقہ میں کوئی چیز نظر نہ آتی تھی حضرت ہاجرہؓ اپنے بچے کی تکلیف کو نہ دیکھ کر جو پیاس سے تڑپ رہا تھا ایک ٹیلے پر چڑھ گئیں کہ شاید کوئی آدمی نظر آئے اور اُس سے پانی مانگ لیں یا شاید کوئی آبادی دکھائی دے۔ انہوں نے جس حد تک انسانی نظر کام کر سکتی تھی دیکھا مگر انہیں کہیں پانی کا نشان نظر نہ آیا۔ تب وہ اِسی گھبراہٹ میں اُتریں اور دوڑتی ہوئی دوسرے ٹیلے پر چڑھ گئیں۔ وہاں سے بھی دیکھا مگر پانی کے کوئی آثار نظر نہ آئے۔ اِسی کرب و اضطراب کی حالت میں حضرت ہاجرہؓ سات دفعہ دوڑیں۔ اور آخر اُن کا دل بیٹھنے لگا کہ اَب کیا ہوگا۔ اِس پر معاً خدا تعالیٰ کا الہام نازل ہوا کہ اے ہاجرہؓ! خدا نے تیرے بچے کے لئے سامان پیدا کر دیا ہے۔ جا اور اپنے بچے کو دیکھ۔ حضرت ہاجرہؓ واپس آئیں تو انہوں نے دیکھا کہ جہاں بچہ پیاس سے تڑپ رہا تھا وہاں پانی کا ایک چشمہ اُبل رہا ہے یہی وہ چشمہ ہے جس کو چاہِ زمزم کہتے ہیں۔ زمزم درحقیقت اُس گیت کو کہتے ہیں جو خوشی میں گایا جاتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے حضرت ہاجرہؓ نے اُس چشمہ کا نام خود زمزم رکھا تھا کیونکہ اس چشمہ کے ذریعہ سے اپنے بچہ کی نجات کی خوشی میں اُن کے لئے شکر یہ میں گانے کا موقعہ پیدا ہوا تھا۔ پانی کا تو اللہ تعالیٰ نے اِس طرح انتظام کر دیا اب غذا کی فکر تھی۔ اتفاقاً ایک قافلہ راستہ بھول گیا اور وہ اُسی جگہ آ پہنچا جہاں حضرت ہاجرہؓ بیٹھی تھیں۔ قافلہ والوں کو پانی کی سخت ضرورت تھی انہوں نے جب وہاں چشمہ دیکھا۔ تو حضرت ہاجرہؓ سے کہا کہ ہم آپ کی رعایا بن کر یہاں رہیں گے۔ آپ ہمیں اس جگہ بسنے کی اجازت دے دیں۔ حضرت ہاجرہؓ نے انہیں اجازت دیدی۔ اور وہ وہاں حضرت ہاجرہؓ اور اسمٰعیلؑ کی رعایا بن کر رہنے لگے۔ اور بعد میں اس کے کہ اسمٰعیلؑ جوان ہوتا خدا نے اُسے بادشاہ بنا دیا (بخاری کتاب بدء الخلق)

آج تک حج کے ایام میں حضرت ہاجرہؓ کے اِس واقعہ کی یادگار کے طور پر ہی صفا اور مروہ پر ہر حاجی کو سات دفعہ دوڑنا پڑتا ہے۔ یہ دوڑنا حضرت ہاجرہؓ کے نقشِ قدم پر چلنے کا ایک اقرار ہوتا ہے۔ یہ دوڑنا اِس بات کا اعلان ہوتا ہے کہ اگر ہمیں بھی خدا کے لئے کسی وقت اپنے عزیزوں کو چھوڑنا پڑا تو ہم انہیں چھوڑنے میں کوئی دریغ نہیں کریں گے۔

پس حج ایک اہم عبادت ہے جو اسلام نے مقرر کی ہے۔ جب کوئی شخص مکہ مکرمہ میں جاتا ہے اور مناسکِ حج کو پوری طرح بجا لاتا ہے تو اس کی آنکھوں کے سامنے یہ نقشہ آجاتا ہے کہ کس طرح خدا تعالیٰ کے لئے قربانی کرنے والے ہمیشہ کے لئے زندہ رکھے جاتے ہیں۔

پھر حج سے مسلمانوں کے اندر مرکزیت کی رُوح بھی پیدا ہوتی ہے اور انہیں اپنی اور باقی دنیا کی ضرورتوں کے متعلق غور و فکر کرنے کا موقعہ مل جاتا ہے۔ اِسی طرح ایک دوسرے کی خوبیوں کو دیکھنے اور اُن کو اخذ کرنے کا انہیں موقع ملتا ہے اور باہمی اخوت اور محبت میں ترقی ہوتی ہے۔ غرض حج ارکانِ اسلام میں سے ایک اہم رُکن ہے جس کی طرف اسلام نے لوگوں کو توجہ دلائی ہے۔ وہ لوگ جنہیں اللہ تعالیٰ نے مالی وسعت عطا فرمائی ہو اور جن کی صحت سفر کے بوجھ کو برداشت کر سکتی ہو اُن کا فرض ہے کہ وہ اس حکم پر عمل کریں اور حج بیت اللہ کی برکات سے مستفیض ہوں۔ میں سمجھتا ہوں آجکل کے امراء کے لئے سب سے بڑی نیکی حج ہی ہے کیونکہ باوجود مال و دولت کے وہ کبھی حج کیلئے نہیں جاتے اور

جو لوگ حج پر جاتے ہیں اُن میں سے اکثر ایسے ہوتے ہیں جن پر حج واجب نہیں ہوتا۔ مَیں جب حج کیلئے گیا تو ایک حاجی میرے پاس آیا اور اُس نے مجھ سے کچھ مانگا۔ حضرت نانا جان صاحبؓ مرحوم میرے ساتھ تھے۔ انہوں نے اُسے کہا کہ اگر تمہارے پاس کچھ نہیں تھا تو تم حج کیلئے آئے کیوں؟ وہ کہنے لگا میرے پاس بہت روپے تھے مگر سب خرچ ہو گئے۔ حضرت نانا جان مرحوم نے پوچھا کہ کتنے روپے تھے وہ کہنے لگا جب مَیں بمبئی پہنچا تھا تو میرے پاس پینتیس ۳۵ روپے تھے اور مَیں نے ضروری سمجھا کہ حج کر آؤں۔ تو وہ پینتیس ۳۵ روپوں کو ہی بہت سمجھتا تھا مگر مسلمانوں میں ایسے لوگ بھی ہیں جو ۳۵ ہزار بلکہ ۳۵-۳۵ لاکھ روپے رکھتے ہیں اور پھر بھی وہ حج کے لئے نہیں جاتے لیکن غرباء میں بہت حاجی نظر آتے ہیں۔ ایک شخص ساری عمر تھوڑا تھوڑا روپیہ جمع کرتا رہتا ہے اور جب چند سو روپیہ اس کے پاس اکٹھا ہو جاتا ہے تو وہ تمام عمر کا اندوختہ لے کر حج کے لئے چل پڑتا ہے۔ حالانکہ اُسی روپیہ پر اُس کے بیوی بچوں کی آئندہ زندگی کا مدار ہوتا ہے۔ وہ اگر اس روپے سے اچھے بیل خرید لے یا کچھ ایکڑ زمین لے لے تو اس کے بیوی بچوں کے لئے سہولت پیدا ہو سکتی ہے لیکن وہ اس بات کی کوئی پرواہ نہیں کرتا اور روپیہ اٹھاتا اور حج کے لئے چل پڑتا ہے۔ تو امراء کے لئے سب سے بڑی نیکی حج ہے۔ کیونکہ وہ حج میں سب سے زیادہ کوتاہی کرتے ہیں۔

اسی طرح کئی ملازم ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ پنشن لے کر حج کو جائیں گے۔ لیکن یہ خیال نہیں کرتے کہ پنشن پانے کے بعد زندگی بھی پائیں گے یا نہیں۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ بعض لوگ پنشن لینے کے بعد ایسے بیمار پڑتے ہیں کہ اس قابل ہی نہیں رہتے کہ حج کو جا سکیں۔ پنشن تو گورنمنٹ دیتی ہی اُسی وقت ہے جب اچھی طرح نچوڑ لیتی ہے۔ اور سمجھتی ہے کہ اب یہ ہمارے کام کا نہیں رہا۔ پھر بعض لوگ کاروبار کی وجہ سے یہ سمجھتے ہیں کہ اگلے سال جائینگے پھر اُس سے اگلے سال کا ارادہ کر لیتے ہیں۔ حالانکہ دُنیا کے کام تو ختم ہوتے ہی نہیں۔ اگر خدا تعالیٰ نے توفیق دی ہو تو جلدی حج کر لینا چاہیئے۔

مَیں جب تعلیم کے لئے مصر گیا تو ارادہ تھا کہ حج بھی کرتا آؤنگا۔ مگر یہ پختہ ارادہ نہ تھا کہ اُسی سال حج کرونگا۔ یہ بھی خیال آتا تھا کہ واپسی پر حج کرونگا جب مَیں بمبئی پہنچا تو وہاں نانا جان صاحبؓ مرحوم بھی آملے۔ وہ براہِ راست حج کو جا رہے تھے۔ اسپر میرا بھی ارادہ پختہ ہو گیا کہ اسی سال ان کے ساتھ حج کر لوں جب پورٹ سعید پہنچے تو مَیں نے رؤیا میں دیکھا کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام تشریف لائے ہیں اور فرماتے ہیں کہ اگر حج کی نیت ہے تو کل ہی جہاز میں سوار ہو جاؤ کیونکہ یہ آخری جہاز ہے گو حج میں ابھی دس پندرہ روز کا وقفہ تھا مگر فاصلہ بھی وہاں سے قریب ہے۔ اس لئے خیال کیا جاتا تھا کہ ابھی اَور کئی جہاز حاجیوں کے مصر سے جدّہ جائیں گے۔ میرے ساتھ عبدالحی صاحب عرب بھی تھے وہ اس بات پر زور دیتے تھے کہ اگلے جہاز پر چلے جائیں گے۔ مگر مجھے چونکہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے فرمایا تھا کہ اگر نیت ہے تو اسی جہاز سے جاؤ ورنہ جہازوں میں روک پیدا ہو جائے گی۔

اِس لئے مَیں نے چلنے کا پختہ ارادہ کر لیا۔ وہاں جو ایک دو اصحاب واقف ہوئے تھے وہ بھی کہنے لگے کہ ابھی تو کئی جہاز جائیں گے۔ قاہرہ اور اسکندریہ وغیرہ دیکھتے جائیں۔ اتنی دُور آ کر ان کو دیکھے بغیر چلے جانا مناسب نہیں مگر مَیں نے کہا کہ مجھے چونکہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے فرمایا ہے کہ کل نہ جانے سے حج رہ جانے کا خطرہ ہے اِس لئے مَیں تو ضرور جاؤنگا۔ چنانچہ اُس جہاز راں کمپنی سے گورنمنٹ کا کوئی جھگڑا تھا اس جھگڑے نے ایسی صورت اختیار کر لی کہ وہ جہاز آخری ثابت ہوا اور کمپنی والے

اس سال حاجیوں کے لئے کوئی اَور جہاز نہ لے گئے۔

غرض کئی لوگ حج کی خواہش تو رکھتے ہیں مگر وقت پر اُسے پُورا نہیں کرتے اور اس طرح وہ ایک بہت بڑی نیکی سے محروم رہ جاتے ہیں۔ پس جن لوگوں کو اللہ تعالےٰ نے استطاعت عطا فرمائی ہو۔ وہ حج بیت اللہ سے مشرف ہونے کی کوشش کریں۔ مگر حج میں بھی جب تک تقویٰ اور خشیۃ اللہ کو مدّنظر نہ رکھا جائے کوئی فائدہ نہیں ہو سکتا۔ مَیں جب حج کرنے کے لئے گیا تو سورت کے علاقہ کے ایک نوجوان تاجر کو مَیں نے دیکھا کہ جب وہ منیٰ کی طرف جا رہا تھا تو بجائے ذکرِ الٰہی کرنے کے اُردو کے نہایت ہی گندے عشقیہ اشعار پڑھتا جا رہا تھا اتفاق کی بات ہے کہ جب مَیں واپس آیا تو جس جہاز میں مَیں سفر کر رہا تھا اُسی جہاز میں وہ بھی واپس آ رہا تھا ایک دن مَیں نے موقعہ پا کر اُس سے پوچھا کہ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ آپ حج کے لئے کیوں آئے تھے۔ مَیں نے تو دیکھا ہے کہ آپ منیٰ کو جاتے ہوئے بھی ذکرِ الٰہی نہیں کر رہے تھے۔ اُس نے کہا۔ اصل بات یہ ہے کہ ہمارے ہاں حاجی کی دوکان سے لوگ سودا زیادہ خریدا کرتے ہیں جہاں ہماری دوکان ہے اُس کے بالمقابل ایک اور شخص کی دوکان بھی ہے۔ وہ حج کر کے گیا اور اُس نے اپنی دوکان پر حاجی کا بورڈ لگا لیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارے گاہک بھی اُدھر جانے لگ گئے۔ یہ دیکھ کر میرے باپ نے مجھے کہا کہ تُو بھی حج کر آ تاکہ واپس آ کر تُو بھی حاجی کا بورڈ اپنی دوکان پر لگا سکے۔ اب بتاؤ کہ کیا اُس کا حج اس کے لئے ثواب کا موجب ہُوا ہو گا۔ ثواب کا تو کیا سوال ہے اُس کا حج اُس کے لئے یقیناً گناہ کا موجب ہُوا ہو گا۔ پس انسان کو اپنے تمام کاموں میں ہمیشہ یہ امر ملحوظ رکھنا چاہیئے کہ اچھے سے اچھا کام کرنے میں بھی خدا تعالیٰ کی رضا کو مدّنظر رکھے۔ ورنہ وہی نیکی اس کے لئے ہلاکت اور عذاب کا باعث بن جائیگی بے شک حج ایک بڑی نیکی ہے لیکن اگر کوئی شخص محض اِس لئے حج پر جاتا ہے کہ اس کا لوگوں میں اعزاز بڑھ جائے یا رسم و رواج کے ماتحت جاتا ہے یا اس لئے جاتا ہے کہ لوگ اُسے حاجی کہیں تو وہ اپنا پہلا ایمان بھی مٹا کر آئیگا۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام سُنایا کرتے تھے کہ ایک دفعہ سردی کا موسم تھا۔ کسی ریل کے سٹیشن پر کوئی اندھی بڑھیا گاڑی کے انتظار میں بیٹھی تھی۔ اس کے پاس کوئی کپڑا بھی نہ تھا سوائے ایک چادر کے جو اُس نے پاس رکھی ہوئی تھی۔ تا کہ جب گاڑی میں بیٹھنے کے بعد تیز ہوا کی وجہ سے سردی محسوس ہو تو اوڑھ لے۔ اُس نے وہ چادر پاس رکھی ہوئی تھی اور تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد وہ اُسے ٹٹول لیتی تھی۔ ایک شخص اس کے پاس سے گذرا اور اُس نے سوچا کہ یہ تو اندھی ہے اور پھر اندھیرا بھی ہو چکا ہے۔ اس لئے اگر مَیں یہ چادر اٹھا لوں تو نہ اِس کو پتہ لگیگا اور نہ پاس کے لوگوں کو پتہ لگیگا۔ چنانچہ اُس نے چپکے سے وہ چادر کھسکا لی۔ بڑھیا چونکہ بار بار اُسے ٹٹولتی تھی اُسے پتہ لگ گیا کہ کسی نے چادر اٹھا لی ہے۔ اُس نے جھٹ آوازیں دینی شروع کر دیں کہ اے بھائی حاجی میری چادر دے دو۔ مَیں اندھی غریب ہوں۔ اور میرے پاس اَور کوئی کپڑا نہیں۔ وہ شخص فوراً واپس مڑا اور اُس نے چادر تو آہستہ سے اُس کے ہاتھ میں پکڑا دی مگر کہنے لگا۔ مائی یہ تو بتاؤ۔ تمہیں کس طرح پتہ لگا کہ مَیں حاجی ہوں۔ وہ بڑھیا کہنے لگی۔ بیٹا! ایسے کام سوائے حاجیوں کے اَور کوئی نہیں کر سکتا۔ مَیں اندھی کمزور اور غریب ہوں۔ سردی کا موسم ہے اور مَیں بالکل اکیلی ہوں۔ ایسی حالت میں میرا ایک ہی کپڑا چُرانے کی کوئی عادی چور بھی جرأت نہیں کر سکتا۔ یہ

ایسا کام ہے جسے حاجی ہی کرسکتا ہے۔

غرض حج کا اسی صورت میں فائدہ ہوسکتا ہے۔ جب انسان اپنے دل میں خدا تعالیٰ کا خوف رکھے اور اخلاص اور محبت کے ساتھ اس فریضہ کو ادا کرے۔ اگر وہ اخلاص کے ساتھ حج کے لئے جاتا ہے تو وہ ایمانوں کے ڈھیر لے کر واپس آتا ہے اور اگر وہ اخلاص کے بغیر جاتا ہے تو وہ اپنے پہلے ایمان سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔

یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے بیت اللہ کو اَلْبَیْتُ الْعَتِیْق قرار دیکر اس طرف اشارہ کیا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بیت اللہ نہیں بنایا بلکہ وہ پہلے سے بنا ہوا تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت اسمٰعیلؑ کے ساتھ مل کر صرف پہلے نشانوں پر اس کی دوبارہ تعمیر کی تھی۔ چنانچہ حضرت ہاجرہؓ اور حضرت اسمٰعیلؑ کو چھوڑتے وقت انہوں نے اللہ تعالیٰ کے حضور جو دعا کی اس میں بھی یہ الفاظ آتے ہیں کہ رَبَّنَآ اِنِّیْٓ اَسْکَنْتُ مِنْ ذُرِّیَّتِیْ بِوَادٍ غَیْرِ ذِیْ زَرْعٍ عِنْدَ بَیْتِکَ الْمُحَرَّمِ (ابراہیم ع ۶) کہ اے میرے رب میں اپنی اولاد کو تیرے مقدس گھر کے قریب اس وادی میں چھوڑ چلا ہوں جہاں نہ کھانے کے لئے کوئی دانہ ہے اور نہ پینے کے لئے کوئی چشمہ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بیت اللہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ سے بھی پہلے تعمیر ہو چکا تھا۔ اسی مضمون کی طرف اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں بھی اشارہ فرمایا ہے کہ اِنَّ اَوَّلَ بَیْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیْ بِبَکَّۃَ مُبٰرَکًا وَّ ھُدًی لِّلْعٰلَمِیْنَ (آل عمران ع ۱۰) یعنی سب سے پہلا گھر جو لوگوں کے روحانی فائدہ اور ان کی ایمانی حفاظت کے لئے بنایا گیا تھا وہ وہی ہے جو مکہ میں ہے۔ اس میں ہر قسم کی برکتیں جمع کر دی گئی ہیں اور تمام دنیا کے لوگوں کے لئے اس میں فضل اور رحمت کے سامان اکٹھے کر دیئے گئے ہیں۔ اس آیت میں وُضِعَ لِلنَّاسِ کے الفاظ اس پیشگوئی کے بھی حامل تھے کہ اس گھر کے ذریعہ وہ لوگ جو متفرق ہو چکے ہونگے پھر اکٹھے کر دیئے جائیں گے یعنی عالمگیر مذہب کا اس کے ساتھ تعلق ہوگا۔ اور ساری دنیا کو جمع کرنے کا یہ گھر ایک ذریعہ ہوگا۔ چنانچہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے مختلف اقوامِ عالم کو ایک ہاتھ پر جمع کر دیا اور اس طرح کعبہ تمام متفرق لوگوں کو اکٹھا کرنے کا ذریعہ بن گیا۔ یسعیاہ نبی نے بھی اس کی پیشگوئی کرتے ہوئے فرمایا تھا:۔

"رب الافواج فرماتا ہے میں نے اس کو صداقت میں برپا کیا ہے۔ اور میں اس کی تمام راہوں کو ہموار کرونگا۔ وہ میرا شہر بنائیگا۔ اور میرے اسیروں کو بغیر قیمت اور عوض لئے آزاد کر دیگا۔ خداوند یوں فرماتا ہے کہ مصر کی دولت اور کوش کی تجارت اور سبا کے قدآور لوگ تیرے پاس آئینگے اور تیرے ہونگے۔ وہ تیری پیروی کرینگے وہ بیڑیاں پہنے ہوئے اپنا ملک چھوڑ کر آئیں گے اور تیرے حضور سجدہ کریں گے وہ تیری منت کرینگے اور کہیں گے۔ یقیناً خدا تجھ میں ہے اور کوئی دوسرا نہیں اور اس کے سوا کوئی خدا نہیں۔"

(یسعیاہ باب ۴۵ آیت ۱۳ و ۱۴)

اس پیشگوئی میں پہلی بات تو یہ بتائی گئی تھی کہ ایک خدا کا شہر بنایا جائیگا۔ چنانچہ ساری دنیا میں صرف بلد اللہ الحرام ہی ایک ایسا شہر ہے جو خدا کا شہر کہلاتا ہے۔ پھر بتایا گیا تھا کہ اس کو بنانیوالا یعنی اس کی عظمت کو قائم کرنے والا اسیر اسیروں کو

بلا اُجرت لے چھڑائیگا۔ چنانچہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ کو فتح کر کے بلا کسی تاوان لینے کے لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ کی آواز بلند کر کے قیدیوں کو چھوڑ دیا۔ اِسی طرح آپ روحانی قیدیوں سے بھی یہی کہتے رہے کہ لَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا (انعام ع) یعنی مَیں تم سے کوئی اجرت نہیں مانگتا پھر محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس ہی مصر کی دولت اور کوش کا منافع اور سبا کے قدآور لوگ آئے۔

گذشتہ انبیاء میں سے صرف حضرت مسیح کے متعلق عیسائی دعویٰ کرتے ہیں کہ شاید وہ اس پیشگوئی کے مصداق ہوں لیکن ان میں ایک بات بھی اِن باتوں میں سے نہیں پائی جاتی۔ بیشک مصر پر رومیوں کا ایک عرصہ تک قبضہ رہا لیکن کوش کا منافع اُن کو نہیں ملا۔ گو مسیحی مؤرخوں نے زور دیکر ایتھوپیا کو کوش ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ مگر تازہ تحقیق سے ثابت ہوا ہے کہ کوش جس کا یسعیاہ میں ذکر آتا ہے وہ علاقہ ہے جو ایلام اور میڈیا کے درمیان میں واقع ہے۔ ایلام کا علاقہ خلیج فارس کے کنارے کا دجلہ تک کا علاقہ ہے اور میڈیا کیسپین لیک کے جنوب کا علاقہ ہے۔ اس علاقہ کا منافع عیسائیوں کو کبھی نہیں ملا۔ یعنی یہاں کے لوگوں نے مسیحیت کو قبول نہیں کیا۔ اِسی طرح سبا کے قدآور آدمی بھی مسیحی مقامات پر سجدہ کرنے کیلئے نہیں گئے۔ اور اگر جائیں بھی تو وہ تثلیث کی تائید کرنے والے ہونگے حالانکہ یسعیاہ بتاتا ہے کہ اِس پیشگوئی کے مصداق ایک خدا کی پرستش کے لئے اس شہر میں جمع ہونگے اور وہاں یہ آوازیں دیتے ہوئے آئیں گے کہ اُس کے سوا کوئی خدا نہیں۔ لیکن اسلام کو یہ سب باتیں حاصل ہیں۔ کعبہ کو خدا کا گھر ماننے والے مصر میں بھی ہیں۔ یمن میں بھی ہیں جس میں سبا واقع ہے اور کوش میں بھی ہیں اور یہاں سے ہزاروں لوگ ہر سال اس شہر کو جاتے ہیں جو خدا کا گھر کہلاتا ہے اور وہاں جاکر اس گھر میں جو خدا کا گھر کہلاتا ہے یہ کہتے ہوئے داخل ہوتے ہیں کہ لَبَّيْكَ۔ لَبَّيْكَ۔ اَللّٰهُمَّ لَبَّيْكَ لَا شَرِيْكَ لَكَ لَبَّيْكَ یعنی مَیں حاضر ہوں۔ مَیں حاضر ہوں اے میرے اللہ مَیں حاضر ہوں۔ تیرے سوا کوئی معبود نہیں۔ مَیں حاضر ہوں۔ پس اِس پیشگوئی میں بھی مکہ مکرمہ کی طرف رجوعِ خلائق کا اشارہ پایا جاتا تھا۔ جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ پوری ہوئی۔ اور اسی تعلق کے قیام کے لئے نماز میں بیت اللہ کی طرف مُنہ کرنے کا حکم دیا گیا۔

بہرحال بیت اللہ ایک نہایت ہی پرانا مقام ہے اور تاریخ بھی اس کے قدیم ہونے کی شہادت دیتی ہے۔ چنانچہ سر ولیم میور "لائف آف محمدؐ" میں لکھتے ہیں کہ مکہ کے مذہب کے بڑے اصولوں کو ایک نہایت ہی قدیم زمانے کی طرف منسوب کرنا پڑتا ہے گو ہیروڈوٹس مشہور یونانی جغرافیہ نویس نے نام لیکر کعبہ کا ذکر نہیں کیا مگر وہ عربوں کے بڑے دیوتاؤں میں سے ایک دیوتا اِلالات کا ذکر کرتا ہے (یعنی خداؤں کا خدا) اور یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ مکہ میں ایک ایسی ہستی کی پرستش کی جاتی تھی جسے بڑے بڑے بتوں کا بھی خدا مانا جاتا تھا (ص ۱۰۲)

پھر لکھا ہے کہ مؤرخ ڈایوڈورس سکولس جو مسیحی سنہ سے پچاس سال پہلے گذرا ہے وہ بھی لکھتا ہے کہ عرب کا وہ حصہ جو بحیرۂ احمر کے کنارے پر ہے اس میں ایک معبد ہے جس کی عرب بڑی عزت کرتے ہیں۔

(دیباچہ لائف آف محمدؐ ص ۱۰۳)

پھر لکھتا ہے کہ قدیم تاریخوں سے پتہ نہیں چلتا کہ یہ بنا کب ہے۔ یعنی یہ اتنا پُرانا ہے کہ اس کے وجود

ذٰلِكَ ۗ وَمَنْ يُّعَظِّمْ حُرُمٰتِ اللّٰهِ فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ

بات یہ ہے کہ جو شخص اللہ (تعالیٰ) کی مقرر کردہ عزت والی جگہوں کی تعظیم کرتا ہے تو یہ اس کے رب کے نزدیک اُس کیلئے

عِنْدَ رَبِّهٖ ؕ وَاُحِلَّتْ لَكُمُ الْاَنْعَامُ اِلَّا مَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ

اچھا ہوتا ہے اور اے مومنو! تمہارے لئے (سب) چوپائے حلال کئے گئے ہیں سوائے اُن کے جن کی حُرمت قرآن میں بیان ہو چکی ہے

کا تو ذکر آتا ہے مگر اس کی بناء کا پتہ نہیں چلتا۔ یہ بالکل اَلْبَيْتُ الْعَتِيْق کا ہی مفہوم ہے جو دوسرے الفاظ میں ادا کیا گیا ہے۔

پھر لکھتا ہے کہ بعض تاریخوں سے پتہ چلتا ہے کہ عمالقہ نے اسے دوبارہ بنایا تھا۔ اور کچھ عرصہ تک اُن کے پاس رہا اور تورات سے پتہ چلتا ہے کہ عمالقہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں تباہ ہوئے تھے (خروج باب ۱۷ آیت ۸ تا ۱۶ و گنتی باب ۲۴ آیت ۲۰) گویا حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ سے بھی بہت پہلے عمالقہ اس پر قابض رہ چکے تھے اور وہ بھی اس کے بانی نہ تھے بلکہ یہ گھر اُن سے بھی پہلے کا بنا ہوا تھا اور انہوں نے اُس کے تقدس پر ایمان لاتے ہوئے اسے دوبارہ تعمیر کیا تھا۔ پس تاریخی شواہد کی رو سے بھی بیت اللہ کا بیت عتیق ہونا ایک ثابت شدہ حقیقت ہے۔

اِس موقعہ پر حضرت محی الدین صاحبؒ ابن عربی کے ایک کشف کا ذکر کر دینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے جو انہوں نے اپنی کتاب فتوحاتِ مکیہ کی جلد ۳ میں بیان فرمایا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ مَیں نے ایک دفعہ کشفی حالت میں دیکھا کہ مَیں بیت اللہ کا طواف کر رہا ہوں۔ اور میرے ساتھ کچھ اور لوگ بھی ہیں جو بیت اللہ کا طواف کر رہے ہیں۔ مگر وہ کچھ اجنبی قسم کے لوگ ہیں جن کو میں پہچانتا نہیں۔ پھر انہوں نے دو شعر پڑھے جن میں سے ایک تو مجھے بھول گیا۔ مگر دوسرا یاد رہا۔ وہ شعر جو مجھے یاد رہا وہ یہ تھا کہ ؎

لَقَدْ طُفْنَا كَمَا طُفْتُمْ سِنِيْنَا
بِهٰذَا الْبَيْتِ طُرًّا اَجْمَعِيْنَا

یعنی ہم بھی اس مقدس گھر کا سالہا سال اِسی طرح طواف کرتے رہے ہیں جس طرح آج تم اس کا طواف کر رہے ہو۔ وہ فرماتے ہیں کہ مجھے اس پر بڑا تعجب ہوا پھر اُن میں سے ایک شخص نے مجھے اپنا نام بتایا مگر وہ نام بھی ایسا تھا جو میرے لئے بالکل غیر معروف تھا۔ اِس کے بعد وہ شخص مجھ سے کہنے لگا کہ مَیں تمہارے باپ دادوں میں سے ہوں۔ مَیں نے پوچھا کہ آپ کو وفات پائے کتنا عرصہ گذر چکا ہے۔ اُس نے کہا کہ چالیس ہزار سال سے زیادہ عرصہ گذر رہا ہے۔ مَیں نے کہا۔ زمانۂ آدم پر تو اتنا عرصہ نہیں گذرا۔ اُس نے کہا کہ تم کس آدم کا ذکر کرتے ہو کیا اُس آدم کا جو تمہارے قریب ترین زمانہ میں ہوا ہے۔ یا کسی اور آدم کا۔ وہ کہتے ہیں۔ اِس پر معاً مجھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث یاد آگئی کہ اللہ تعالیٰ نے ایک لاکھ آدم پیدا کئے ہیں۔ اور مَیں نے سمجھا کہ میرے یہ جدِّ اکبر بھی انہیں میں سے کسی ایک آدم سے تعلق رکھنے والے ہونگے۔ (فتوحاتِ مکیہ جلد ۳ باب ۳۹۰ صفحہ ۵۴۹)

حضرت محی الدین صاحبؒ ابن عربی کا یہ کشف بھی بتا رہا ہے کہ بیت اللہ نہایت قدیم زمانہ سے دنیا کا مرکز اور لوگوں کی ہدایت کا ایک ذریعہ بنا رہا ہے اور اسی طرح یہ دنیا بھی لاکھوں سال سے چلی آرہی ہے۔

فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ وَاجْتَنِبُوْا قَوْلَ

پس چاہیئے کہ تم بُت پرستی کے شرک سے بچو اور (اِسی طرح) اپنی عبادت اور فرمانبرداری صرف

الزُّوْرِ ﴿۲۲﴾ حُنَفَآءَ لِلّٰهِ غَيْرَ مُشْرِكِيْنَ بِهٖ ؕ وَمَنْ

اللہ کے لئے مخصوص کرتے ہوئے جھوٹ بولنے سے بچو اور تم خدا کا شریک کسی کو نہ بناؤ ۱۳ؔ اور جو

چنانچہ آج سے ہزارہا سال قبل بھی لوگ اِس مقدس گھر کا اِسی طرح طواف کرتے رہے ہیں جس طرح آج ہم بیت اللہ کا طواف کرتے ہیں۔ یہی حقیقت قرآن کریم نے بیان فرمائی ہے کہ یہ البیت العتیق ہے جو زمانۂ قدیم سے خدا تعالیٰ کے انوار و برکات کا تجلّی گاہ رہا ہے اور قیامت تک دنیا کو ایک مرکز پر متحد رکھنے کا ذریعہ بنا رہیگا۔

۱۳ؔ **حلِ لغات** ۱۔ اَلرِّجْسُ کے معنے ہیں اَلْقَذَرُ گندگی۔ اَلْمَاْثَمُ: گناہ۔ اَلْعَمَلُ الْمُؤَدِّی اِلَی الْعَذَابِ: عذاب تک لے جانے والا عمل۔ اَلْعِقَابُ سزا۔ اَلْغَضَبُ: غضب۔ ناراضگی۔

اَلْاَوْثَانُ: اَلْوَثَنُ کی جمع ہے اور اَلْوَثَنُ کے معنے ہیں اَلصَّنَمُ۔ بُت۔

اَلزُّوْرُ کے معنے ہیں اَلْکِذْبُ: جھوٹ۔ اَلشِّرْکُ بِاللّٰہِ۔ اللہ کے ساتھ شرک کرنا۔ اَلْبَاطِلُ۔ باطل (اقرب)

تفسیر:۔ فرماتا ہے۔ جو بھی اللہ تعالیٰ کے احکام کی عزت کرتا ہے۔ اُس کو اُس کے ربّ کے پاس درجے ملتے ہیں۔ یعنی خدا کے حضور میں عزت حاصل کرنے کا اصل طریق یہ ہے کہ خدا جس زمانہ میں جن چیزوں کی عزت کرنے کے لئے کہے اُن کی عزت کی جائے۔

پھر فرماتا ہے کہ چوپاؤں میں سے کچھ تم پر حلال کئے گئے ہیں۔ مگر وہ چوپائے جو بتوں پر چڑھائے جاتے ہیں وہ تم پر حرام کئے گئے ہیں۔ ان سے بچو۔ اور جھوٹ بھی مت بولو۔ یعنی چوپایوں کا اس طرح مشرکانہ طور پر قربان کرنا یہ ایک جھوٹ ہے۔ اور شرک بھی مت کرو۔ کیونکہ خانہ کعبہ کی بنیاد دنیا کی سب قوموں کے جمع کرنے کے لئے اور ایک مذہب قائم کرنے کے لئے رکھی گئی تھی۔ اور سب قومیں صرف توحید پر ہی جمع ہو سکتی ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ توحید کو قبول کئے بغیر انسانی ذہن کبھی بھی اُلجھنوں اور پریشانیوں سے نجات نہیں پا سکتا چنانچہ واقعات بتاتے ہیں کہ جن لوگوں نے خدا تعالیٰ کی ہستی کو تسلیم کرنے سے انکار کیا وہ ہمیشہ اُلجھنوں اور پریشانیوں کے چکر میں ہی پھنسے رہے اور کبھی بھی حقیقی امن اور سکون اُن کو نصیب نہیں ہؤا۔ انسان جب اِس دنیا کے پردہ پر پہلی مرتبہ ظاہر ہؤا تو اس وقت سورج اُسے ایک سنہری تھال نظر آتا تھا۔ چاند اُسے ایک چمکدار ٹکیہ کی مانند دکھائی دیتا تھا۔ اور ستاروں میں سے کوئی اُسے دانوں کے برابر۔ کوئی بیروں کے برابر اور کوئی اخروٹوں اور سیبوں کے برابر نظر آتا تھا۔ اور زمین کی جھاڑیاں اور درخت اُسے سورج، چاند اور ستاروں سے بھی بڑے معلوم ہوتے تھے۔ اس کے لئے یہ بات حیرت انگیز تھی کہ سینکڑوں میل دُور جہاں تک اس کا ہاتھ نہیں پہنچ سکتا جہاں وہ پہاڑوں پر چڑھ کر بھی نہیں پہنچ سکتا ایک چھوٹی سی ٹکیہ نمودار ہو کر ساری دنیا کو روشن کر دیتی ہے۔ اور رات کے وقت ایک چھوٹی سی سفید تھالی ظاہر ہو کر سارے عالم کو چاندنی سے بھر دیتی ہے۔ ہزاروں ہزار ٹمٹمانے والے

اَلرِّجْسُ

اَلْاَوْثَانُ

اَلزُّوْرُ

ستارے جَوّ میں پھیل جاتے ہیں اور چمک چمک کر اُس کی آنکھوں کو خیرہ کرتے ہیں اور اس کی نظر کے لئے ایک دلفریب نظارہ پیدا کرتے ہیں - اور جب دن آتا ہے تو غائب ہو جاتے ہیں - یہ چیزیں اُسے ورطۂ حیرت میں ڈالنے والی تھیں اور یقیناً اُسے ہمیشہ حیرت میں مبتلا رکھتیں اگر خدا تعالیٰ کا ہاتھ ابتداء میں ہی اُسے پکڑ کر سیدھا راستہ نہ دکھا دیتا۔ ہم دیکھتے ہیں گھر میں کوئی معمولی سا کھٹکا بھی ہوتا ہے تو گھر والے اُٹھ کر تجسس شروع کر دیتے ہیں۔ کوئی کہتا ہے چھپکلی ہوگی۔ کوئی کہتا ہے چوہا ہوگا۔ کوئی کہتا ہے چور ہوگا۔ گویا ایک معمولی سا کھٹکا چھپکلی اور چوہے سے لیکر چور تک پہنچا دیا جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ حضرت مسیحؑ نے بھی انجیل میں پیشگوئی کی ہے کہ آنیوالا مسیح چوروں کی طرح آئیگا۔ چنانچہ انہوں نے اپنے حواریوں سے کہا کہ " جاگتے رہو کیونکہ تم نہیں جانتے کہ تمہارا خداوند کس دن آئیگا۔ لیکن یہ جان رکھو کہ اگر گھر کے مالک کو معلوم ہوتا کہ چور رات کے کونسے پہر آئیگا تو جاگتا رہتا اور اپنے گھر میں نقب نہ لگانے دیتا۔ اسلئے تم بھی تیار رہو۔ کیونکہ جس گھڑی تم کو گمان بھی نہ ہوگا۔ ابن آدم آجائے گا۔" (متی باب ۲۴ آیت ۴۲ و ۴۴) اِس پیشگوئی میں اِس طرف اشارہ کیا گیا تھا کہ اُس کے آنے سے ایک کھٹکا پیدا ہوگا جسکی وجہ سے لوگ اُسے چور بنائیں گے لیکن ہوگا وہ خدا کا راستباز نبی - غرض ایک معمولی سا کھٹکا بھی جب انسان کو پریشان کر دیتا ہے تو ظاہر ہے کہ ایسے نظارے اُسے کس قدر حیران کر سکتے ہیں مگر جونہی کہ انسانیت سنِ شعور کو پہنچی اللہ تعالیٰ نے اُسکے کان میں یہ آواز ڈال دی کہ میں تیرا اللہ ہوں اور جو کچھ تجھے نظر آتا ہے یہ سب میری مخلوق ہے جس طرح کہ تو مخلوق ہے - اور تو ایک دن مر کر میرے سامنے آنے والا ہے - اور یہ سب چیزیں جو تجھے نظر آتی ہیں خواہ قریب ہوں یا بعید میں نے تیرے فائدہ اور تیری خدمت کے لئے پیدا کی ہیں - اور سب تجھے نفع پہنچانے کے کاموں پر لگی ہوئی ہیں - اس آواز نے اسے کتنی پریشانیوں سے بچا لیا - اگر پہلا انسان یعنی آدم اپنے سنِ شعور کو پہنچنے کے بعد اس آواز کو نہ سُنتا تو اُس کے لئے کسقدر مصیبت ہوتی اور وہ کتنی پریشانیوں میں مبتلا ہو جاتا - دن چڑھتا تو اُس کیلئے ایک تکلیف کا آغاز ہو جاتا کہ سورج کی کُنہہ معلوم کرے - اور رات ہوتی تو ایک اور پریشانی کا دروازہ کھل جاتا کہ چاند کی حقیقت معلوم کرے - اور پھر یہ پتہ لگائے کہ اِن چیزوں کا اس سے کیا تعلق ہے اور یہ اُسے نفع یا نقصان پہنچا سکتی ہیں یا نہیں ؟ اور اس سے خوش ہو سکتی ہیں یا نہیں ؟ ہم دیکھتے ہیں کہ جنہوں نے اِس آواز سے فائدہ نہیں اٹھایا وہ اب تک انہیں جکڑوں میں پڑے ہوئے ہیں - چنانچہ تمام بُت پرست قومیں انہی اُلجھنوں میں مبتلا ہیں - کوئی کہتی ہے کہ چاند اور سورج پر ارواح چھا جاتی ہیں - اور وہ ناراض یا خوش ہوتی ہیں اگر کسی شخص نے کوئی ایسا کام کیا جس کا نتیجہ خراب نکل آیا تو اُس نے خیال کر لیا کہ چاند پر چھائی ہوئی ارواح کو یہ بات پسند نہیں آئی - اور اگر کسی نے کوئی کام کیا اور اُس کا اچھا نتیجہ نکل آیا تو اُس نے یہ سمجھ لیا کہ سورج کی روح کے نزدیک یہ کام اچھا ہے - مگر آدم کیسا مطمئن تھا اور کس بشاشتِ قلب سے بیٹھا تھا - کیونکہ اُسے خدا تعالیٰ نے بتا دیا تھا کہ یہ سب چیزیں خدا نے اس کے لئے مسخر کر دی ہیں - اور اس کی خدمت پر لگی ہوئی ہیں - اسی لئے اُسے سورج اور چاند کی ناراضگی یا خوشنودی کے سامانوں کی تلاش میں پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہ تھی - موحد اور خدا رسیدہ آدم ان سب پریشانیوں سے محفوظ تھا - اور خدا تعالیٰ کی عبادت میں مصروف رہتا تھا - اگر تجسس صرف اس حد تک ہو کہ سورج ایک مادی چیز ہے اُس کی شعاعوں میں اللہ تعالےٰ نے کیا کیا

فائدے رکھے ہیں تو یہ ایک سائنس کی تحقیقات ہوگی ۔ اس میں گھبراہٹ کی کوئی وجہ نہیں ۔لیکن اگر وہ ان چیزوں کو ہی خدا کا مرتبہ دے دیتا ہے اور سمجھتا ہے کہ ان کا تعلق اس کی زندگی اور موت سے ہے اور یہ اُس کے اور اُس کے بیوی بچوں کے آرام و راحت پر بھی اثر انداز ہوتی ہیں تو اُسے دن رات ایک خلش رہیگی ۔ کہ معلوم نہیں یہ چیزیں مجھے کیا نقصان پہنچائیں ۔ اور اگر نقصان پہنچا دیں تو معلوم نہیں میں اُس کا کس طرح ازالہ کروں ۔ غرض مشرک کی ساری زندگی ایک ذہنی پریشانی اور گھبراہٹ کی تصویر ہوتی ہے ۔اور وہ حیران ہوتا ہے کہ میں اپنے مصائب کا کیا علاج کروں! وہ کبھی ایک بُت کے آگے جھکتا ہے اور کبھی دوسرے کے آگے ۔کبھی اس کی ناراضگی کا اُسے خوف آتا ہے اور کبھی اُس کی خفگی کا ۔کبھی ستاروں سے ڈرتا ہے اور کبھی سورج اور چاند سے لرزتا ہے اور کبھی پتھر کے بے جان بتوں سے اُس کا خون خشک ہوتا ہے ۔غرض زندگی کے کسی مرحلے میں بھی اُسے اطمینان نصیب نہیں ہوتا ۔ اِسی لئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ دیکھو فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ ۔ اگر تم ذہنی کشمکش اور پریشانیوں سے نجات حاصل کرنا چاہتے ہو تو بُت پرستی کے شرک سے بچو اور کامل موحد بن جاؤ پھر تمہیں کوئی پریشانی نہیں ہوگی ۔ اور تمہیں دکھائی دیگا کہ ساری دُنیا تمہاری خدمت میں لگی ہوئی ہے ۔

پھر فرماتا ہے کہ ہم تمہیں دوسری نصیحت یہ کرتے ہیں کہ تم جھوٹ سے بچو ۔کیونکہ یہ بھی روحانیت کو تباہ کر دینے والا مرض ہے ۔ اور پھر شرک اپنی ذات میں سب سے بڑا جھوٹ ہے ۔کیونکہ جو طاقتیں خدا تعالیٰ نے کسی کو نہیں دیں اُن کے متعلق ایک مشرک کہتا ہے کہ فلاں فلاں چیز میں ہیں ۔ اور اِس طرح جھوٹ کی نجاست پر مُنہ مارتا ہے حقیقت یہ ہے کہ انبیاء کی جماعتوں کی علامتوں میں سے ایک بڑی بھاری علامت راستبازی کی ہوتی ہے ۔اور یہ علامت ایسی ہے جو اپنی ذات میں بہت بڑی اہمیت رکھتی ہے ۔مگر افسوس ہے کہ دنیا میں بہت سے لوگ راستبازی کی قدر و قیمت کو نہیں سمجھتے خصوصیت کے ساتھ اِس زمانہ میں یہ مرض زیادہ پایا جاتا ہے کیونکہ یہ زمانہ مداہنت اور نفاق کا زمانہ ہے اور تہذیب کے معنے آجکل یہ سمجھے جاتے ہیں کہ بات کرنیوالا دوسرے کے خیالات کا اس حد تک خیال رکھے کہ اگر اُسے سچائی بھی چھپانی پڑے تو اس سے دریغ نہ کرے ۔مگر زمانہ کی رَو کے باوجود ہر شخص کا فرض ہے کہ وہ اس بدی کا پورے زور سے مقابلہ کرے ۔ اور اُسے کچلنے کے لئے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کرے ۔کیونکہ جھوٹ بولنے والا دوسروں کو دھوکا دینے کی کوشش کرتا ہے ۔ اور دھوکا ایک ایسی چیز ہے جس سے لوگوں کو نقصان پہنچتا ہے پس جھوٹ بولنے والا صرف اخلاقی مجرم ہی نہیں بلکہ بنی نوع انسان کا دشمن اور انہیں تباہ کرنے والا بھی ہے اور اس عیب کو مٹانا ہر سچے اور مخلص مسلمان کا فرض ہے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے منافق کی علامات کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ اس کی ایک علامت یہ ہے کہ جب وہ بولتا ہے تو جھوٹ بولتا ہے اور منافق کے متعلق قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اُسے دوزخ کے سخت ترین مقام میں رکھا جائیگا ۔گویا خدا تعالیٰ منافقوں کے ساتھ کفار سے بھی سخت معاملہ کرے گا ۔ اس لئے کہ کافر کی وجہ سے تو کافر کو ہی نقصان پہنچتا ہے مگر منافق کی وجہ سے مسلمانوں کو بھی نقصان پہنچتا ہے ۔جو قوم اپنے افراد میں سے جھوٹ نہیں مٹا سکتی اور اس کے باوجود وہ یہ سمجھتی ہے کہ اُسے ترقی اور عزت حاصل ہو جائیگی ۔اُس کا یہ خیال ایسا ہی خام ہے جیسے

يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَكَاَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَآءِ فَتَخْطَفُهُ

اللہ کا شریک کسی کو بناتا ہے وہ آسمان سے گِر جاتا ہے - اور پرندے اُس کو اُچک کر

ایک بچّہ کا یہ خیال کہ وہ چاند کے پاس پہنچ جائیگا یا ستاروں کے پاس پہنچ جائیگا - جس طرح ایک بچّہ کی چاند یا ستاروں تک پہنچنے کی خواہش ناکام رہتی ہے اِسی طرح وہ قوم جس کے اندر جھوٹ پایا جاتا ہو کبھی کامیاب نہیں ہو سکتی - رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت اور راستبازی کا یہ حال تھا کہ آپ کا دشمن بھی اقرار کرتا تھا کہ آپ سچائی کے اعلیٰ مقام پر ہیں - چنانچہ جب آپ پر یہ وحی نازل ہوئی کہ لوگوں کو ہدایت کی طرف بلاؤ تو آپ نے صفا پر چڑھ کر مکّہ کے لوگوں کو بُلانا شروع کیا - جب سب لوگ جمع ہو گئے تو آپ نے فرمایا - اگر میں تمہیں کہوں کہ اس پہاڑ کے پیچھے ایک بہت بڑا دشمن تم پر حملہ کرنے کے لئے جمع ہے تو کیا تم میری بات مان لو گے؟ اب بظاہر یہ ناممکن تھا کہ اتنی بڑی فوج وہاں جمع ہو اور مکّہ والوں کو اس کا علم تک نہ ہو - مگر انہوں نے کہا کہ ہاں ہم مان لیں گے کیونکہ ہمیں یقین ہے کہ آپ کبھی جھوٹ نہیں بولتے (تفسیر روح المعانی زیر آیت تَبَّتْ يَدَآ اَبِيْ لَهَبٍ وَّتَبَّ) اِسی طرح جب قیصر روما نے ابوسفیان کو اپنے دربار میں بلا کر اس سے پُوچھا کہ کیا محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور اس کے ساتھیوں نے تمہارے ساتھ کبھی جھوٹا معاہدہ کیا ہے تو ابوسفیان نے کہا کہ پچھلے افعال کے متعلق تو میں کوئی گرفت نہیں کرتا - لیکن اب انہوں نے ایک نیا معاہدہ کیا ہے - دیکھیں وہ عہد شکنی کرتے ہیں یا نہیں - اِس پر قیصر نے کہا کہ آئندہ کا ذکر جانے دو - جب اُس نے پیچھے تمہارے ساتھ کوئی عہد شکنی نہیں کی تو یہی اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ آئندہ بھی نہیں کرے گا - تو شدید سے شدید

دشمن کو بھی جو آپ سے لڑائی کر رہا تھا یہ جرأت نہیں تھی کہ وہ آپ کے متعلق یہ کہے کہ آپ نے کبھی جھوٹ بولا ہے یا کوئی معاہدہ شکنی کی ہے - یہی وہ چیز تھی جس کی وجہ سے مسلمان جب کسی ملک میں جاتے تو وہاں کے باشندے اُن کے اعلیٰ اخلاق کو دیکھ کر اُن کے اِسقدر گرویدہ ہو جاتے کہ وہ اپنے ہم قوم اور اپنے ہم مذہب افراد سے بھی اُن کی زیادہ عزت کرتے اور اُن کی سلامتی کی دُعائیں کرتے - چنانچہ تاریخ میں لکھا ہے کہ مسلمانوں نے جب حمص پر قبضہ کر لیا جو رومیوں کے علاقہ میں تھا - تو کچھ عرصہ کے بعد مسلمانوں کو دوبارہ دشمن کے حملہ کا خطرہ پیدا ہو گیا - اور انہوں نے مناسب سمجھا کہ اس وقت حمص کو خالی کر دیا جائے - اس فیصلہ کے بعد مسلمانوں نے وہاں کے عیسائیوں کو بُلایا اور اُن سے کہا کہ ہم تم سے جزیہ وصول کر چکے ہیں مگر یہ جزیہ اس شرط کے ماتحت لیا گیا تھا کہ ہم تمہارے جان و مال کی حفاظت کریں گے - اَب چونکہ خود ہمارے لئے ایک نازک صورتِ حالات پیدا ہو گئی ہے اور ہم تمہاری حفاظت نہیں کر سکتے اسلئے ہم جزیہ کی رقم تمہیں واپس کرتے ہیں - چنانچہ کئی لاکھ روپیہ جو عیسائیوں سے جزیہ کے طور پر لیا گیا تھا انہیں واپس کر دیا گیا - اس اعلیٰ درجہ کے نمونہ کا اُن عیسائیوں پر اتنا اثر ہُوا کہ جب اسلامی لشکر روانہ ہُوا تو وہ ساتھ ساتھ روتے جاتے تھے اور یہ کہتے جاتے تھے کہ خدا تم کو دوبارہ ہم میں واپس لائے - اور یہودی بھی بڑے جوش سے یہ کہتے جاتے تھے کہ تورات کی قسم جب تک ہم زندہ ہیں قیصر حمص پر قبضہ نہیں کر سکتا - (فتوح البلدان بلاذری ص۱۳۷) غرض سچائی ایسی چیز ہے

الطَّيْرُ اَوْ تَهْوِيْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ مَكَانٍ سَحِيْقٍ ﴿۳۲﴾

لے جاتے ہیں۔ اور ہوا اُس کو کسی دور کی جگہ پر پھینک دیتی ہے۔ ۱۴ع

کہ اس کے بغیر کسی قوم کا رعب قائم نہیں ہو سکتا۔ جو لوگ سچائی اور دیانت کا نمونہ دکھاتے ہیں وہ اپنی قوم کو چار چاند لگا دیتے ہیں۔ اور جو لوگ یہ نمونہ نہیں دکھاتے وہ اپنی قوم کا گلا کاٹنے والے ہوتے ہیں۔

۱۴۵ حل لغات :- اَلسَّحِيْقُ: اَلْمَكَانُ الْبَعِيْدُ۔ دُور کی جگہ (اقرب)

تفسیر :- فرماتا ہے۔ توحید کے مقابلہ میں شرک کرنا ایسا ہی ہے جیسا کہ کوئی شخص بلندی سے گر جائے اور ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے اور ہوا اس کے ٹکڑوں کو دُور دُور پھینک دے۔ کیونکہ مشرک اپنے کئی آقا تجویز کرتا ہے اور ہر آقا کو اس کے گوشت پر حق ہے۔

اس جگہ یاد رکھنا چاہیئے کہ شرک کا مسئلہ ایسا سیدھا سادہ نہیں جیسا کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے۔ بلکہ نہایت باریک مسئلہ ہے اور یہی وجہ ہے کہ اکثر قومیں جو بظاہر شرک کی مخالف ہیں عملاً شرک میں مبتلا پائی جاتی ہیں۔ اور اس کا سبب یہی ہے کہ وہ شرک کی حقیقت سمجھنے سے قاصر رہی ہیں اصل بات یہ ہے کہ شرک کی کوئی ایک تعریف نہیں ہے بلکہ مختلف نقطہ ہائے نگاہ سے اِس مرض کی حقیقت کو سمجھا جا سکتا ہے۔ جب تک اُسے ایک تعریف کے اندر لانے کی کوشش کی جائے اُس وقت تک یہ مسئلہ ایک عقدۂ لاینحل ہی رہتا ہے۔ میرے نزدیک شرک مندرجہ ذیل اقسام میں منقسم ہے:-

اوّل - یہ خیال کرنا کہ ایک سے زیادہ ہستیاں ہیں جو یکساں طاقتیں رکھتی ہیں اور سب کی سب دنیا کی حاکم اور سردار ہیں۔ یہ شرک فی الذات ہے۔

دوسرے - یہ خیال کرنا کہ دنیا کی مدبّر ہستیاں ایک سے زیادہ ہیں جن میں کمالات تقسیم ہیں کسی میں کوئی کمال ہے اور کسی میں کوئی۔ یہ شرک بھی شرک فی الذات میں ہی داخل ہے۔

تیسرے - وہ اعمال جو مختلف قوموں میں عاجزی اور انکساری کے لئے اختیار کئے گئے ہیں۔ اُن میں سے جو حد درجہ کے انتہائی عاجزی کے اعمال ہیں اُن کو خدا کے سوا کسی اور کے لئے اختیار کرنا۔ مثلاً سجدہ انتہائی ادب اور تذلّل کے اظہار کا ذریعہ ہے۔ پس یہ عمل صرف خدا کے لئے جائز ہے کسی اور کے لئے نہیں۔ لیکن سجدہ کے علاوہ بھی مختلف اقوام میں مختلف حرکاتِ بدن انتہائی تذلّل کے لئے قرار دے دی گئی ہیں۔ جیسے ہاتھ باندھ کر کھڑا ہونا۔ یا رکوع وغیرہ کرنا۔ ان سب امور کو خدا تعالیٰ نے عبادتِ الٰہی کا حصہ بنا دیا ہے۔ پس اب یہ عمل کسی اور کیلئے جائز نہیں۔

چہارم - شرک کی چوتھی قسم یہ ہے کہ انسان اسباب ظاہری کے متعلق یہ سمجھے کہ ان سے میری سب ضروریات پوری ہو جائیں گی اور اللہ تعالیٰ کے تصرف کا خیال دل سے ہٹا دے اور یہ خیال کرے کہ صرف مادی اسباب ہی ضرورت کو پورا کرنے والے ہیں۔ یہ بھی شرک ہے۔ ہاں اگر یہ خیال کرے کہ ان سامانوں میں خدا تعالیٰ نے فلاں طاقت رکھی ہے اور اُس کے ارادہ کے ماتحت ان کے نتائج پیدا ہوں گے تو یہ شرک نہیں ہوگا۔

پنجم:- شرک کی پانچویں قسم یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کی وہ مخصوص صفات جو اُس نے بندوں کو نہیں دیں جیسے مردہ کو زندہ کرنا یا کوئی چیز پیدا کرنا یا خدا تعالیٰ کا ازلی اور غیر فانی ہونا ایسے امور میں خدا تعالیٰ کی خصوصیت کو مٹا دیا جائے۔ اور ان صفات میں کسی غیر کو شریک کر لیا جائے۔ خواہ اس عقیدہ کی بنا پر ہی شریک کیا جائے کہ خدا نے اپنی مرضی اور اپنے اذن کے ساتھ یہ صفات یا ان کا کچھ حصہ کسی خاص شخص کو دیدیا ہے۔ یہ بھی شرک ہی ہوگا۔

ششم:- شرک کی چھٹی قسم یہ ہے کہ انسان خدا تعالیٰ کے بنائے ہوئے اسباب کو بالکل نظر انداز کر دے اور یہ سمجھے کہ کسی شخص یا کسی چیز نے بلا ان اسباب کے استعمال کرنے کے جو خدا تعالیٰ نے کسی خاص کام کے لئے مقرر کئے ہیں اپنی خاص طاقت کے ذریعہ سے اس کام کو پورا کر دیا ہے۔ مثلاً خدا تعالیٰ نے آگ کو جلانے کے لئے پیدا کیا ہے۔ اب اگر کوئی شخص یہ خیال کرے کہ کسی شخص نے اپنی ذاتی طاقت سے بلا دوسرے ذرائع استعمال کرنے کے جو قانونِ قدرت میں رکھے گئے ہیں آگ لگا دی تو یہ شرک ہوگا۔ لیکن اس میں مسمریزم وغیرہ شامل نہیں۔ کیونکہ یہ طاقتیں خود قانونِ قدرت کے اندر شامل ہیں۔ کسی شخص کے ذاتی کمالات نہیں۔

ہفتم:- شرک کی ساتویں قسم یہ ہے۔ کہ یہ خیال کیا جائے کہ خدا کو کسی بندہ سے ایسی محبت ہے کہ وہ اس کی ہر ایک بات مان لیتا ہے۔ کیونکہ اس کے معنے یہ بنتے ہیں کہ وہ بندہ خدائی طاقتیں رکھتا ہے۔

ہشتم:- شرک کی آٹھویں قسم یہ ہے کہ کسی ایسی چیز کے متعلق جسے خدا تعالیٰ کے قانونِ قدرت نے کسی کام کے کرنے کی کوئی طاقت نہیں دی۔ اس کے متعلق یہ خیال کر لیا جائے کہ وہ فلاں کام کر دے گی۔ مثلاً خدا تعالیٰ نے قرآن کریم میں اپنے آپ کو اَلسَّمِیْعُ قرار دیا ہے۔ جس کے معنے یہ ہیں کہ وہ کامل طور پر لوگوں کی دُعاؤں کو سُنتا اور اُن کی حاجات کو پورا فرماتا ہے۔ یعنی فاصلہ اور وقت کا اُس پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اب اگر کوئی شخص خدا تعالیٰ سے دُعا کرنے کی بجائے مُردوں کی قبروں پر جاتا اور اُن سے اپنی مرادیں مانگتا ہے تو وہ شرک کا ارتکاب کرتا ہے کیونکہ اس نے خدا تعالیٰ کے اَلسَّمِیْعُ ہونے میں مُردوں کو بھی شریک کر لیا۔ حالانکہ قرآن کریم اس کی صراحتاً تردید کرتا ہے۔ اور فرماتا ہے کہ وَالَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَا یَخْلُقُوْنَ شَیْئًا وَّ ھُمْ یُخْلَقُوْنَ۔ اَمْوَاتٌ غَیْرُ اَحْیَآءٍ وَ مَا یَشْعُرُوْنَ اَیَّانَ یُبْعَثُوْنَ (النحل ع ۲) یعنی اللہ تعالیٰ کے سوا جن معبودانِ باطلہ کو لوگ اپنی مدد کیلئے پکارتے ہیں وہ کچھ بھی پیدا نہیں کر سکتے بلکہ اس سے بڑھ کر یہ بات ہے کہ وہ خود پیدا کئے جاتے ہیں اور وہ سب کے سب مُردہ ہیں نہ کہ زندہ۔ اور وہ یہ بھی نہیں جانتے کہ وہ کب دوبارہ اٹھائے جائیں گے۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے مشرکوں کے اس خیال کی تردید فرمائی ہے کہ ہمارے معبود بھی دلوں کے بھید جانتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ تمہارا یہ دعوےٰ بالکل غلط ہے۔ جو خالق ہو وہی اپنی مخلوق کی اندرونی طاقتوں اور اُس کی ضروریات سے آگاہ ہو سکتا ہے مگر جن کو تم پکارتے ہو وہ تو خود سب کے سب مخلوق ہیں انہوں نے تمہارے حالات کو کیا جاننا ہے۔ اور پھر وہ مُردہ ہیں زندہ نہیں۔ انہوں نے تمہاری مدد کیا کرنی ہے۔ انہیں تو یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ کب اُٹھائے جائیں گے۔ گویا اُن کا انجام بھی دوسروں کے ہاتھ میں ہے۔

ذٰلِكَ ۗ وَمَنْ يُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ

حقیقت یہ ہے کہ جو شخص اللہ (تعالیٰ) کی مقرر کردہ نشانیوں کی عزت کریگا اُس (کے اِس فعل) کو دِلوں

تَقْوَى الْقُلُوْبِ ۝ لَكُمْ فِيْهَا مَنَافِعُ اِلٰٓى اَجَلٍ

کا تقوٰی قرار دیا جائے گا۔ (یاد رکھو کہ) اِن قربانیوں سے ایک مدت تک تم کو نفع حاصل کرنا

ایسی صورت میں اگر کوئی شخص کسی قبر پر جاتا اور مُردہ کو کسی تصرف کے لئے کہتا ہے تو وہ شرک کا ارتکاب کرتا ہے۔ اِسی طرح بتوں۔ دریاؤں۔ سمندروں اور سورج اور چاند وغیرہ سے مُرادیں مانگنا اور دُعائیں کرنا بھی شرک میں ہی شامل ہے۔

نہم:۔ شرک کی نویں قسم یہ ہے کہ ایسے اعمال جو مشرکانہ رسوم کا نشان ہیں گو اب شرک کی مشابہت نہیں رکھتے ان کا بلا ضرورتِ طبعی ارتکاب کیا جائے۔ مثلاً کوئی شخص کسی قبر پر دیا جلا کر رکھ آئے تو خواہ وہ صاحبِ قبر سے دُعا کرے یا نہ کرے یا صاحبِ قبر کو خدا سمجھے یا نہ سمجھے یہ فعل بھی شرک کے اندر آجائیگا۔ کیونکہ یہ عمل پہلے زمانہ کے مشرکانہ اعمال کا بقیہ ہے۔ وہ لوگ خیال کرتے تھے کہ مُردے قبروں پر واپس آتے ہیں اور جن لوگوں کی نسبت معلوم کرتے ہیں کہ انہوں نے اُن کی قبروں کا احترام کیا ہے اُن کی مدد کرتے اور اُن کے کاموں کو تکمیل تک پہنچا دیتے ہیں۔ اِسی لئے لوگ قبروں پر دیئے یا پھول وغیرہ رکھ آتے تھے۔ ان یادگاروں کو تازہ رکھنا بھی چونکہ شرک کی مدد کرتا ہے۔ اس لئے یہ بھی شرک میں ہی داخل ہے اِسی طرح درختوں پر رسیاں وغیرہ باندھنی۔ یا قبروں پر چڑھاوے چڑھانے اور ٹونے کرنے سب اِسی قسم میں شامل ہیں۔

مَیں نے جو یہ کہا ہے کہ بلا ضرورتِ طبعی ایسے کام کرنے منع ہیں اس سے مراد یہ ہے کہ اگر کوئی شخص کہیں جا رہا ہو اور راستہ میں رات آجائے اور مجبوراً کسی مقبرہ میں ٹھہرنا پڑے تو یہ ضروری نہیں کہ وہاں انسان اندھیرے میں ہی بیٹھا رہے بلکہ اگر دیا جلا کر روشنی کا انتظام کر لے تو یہ جائز ہوگا۔

دھم:۔ شرک کی دسویں قسم یہ ہے کہ خواہ عمل نہ ہو مگر دل میں محبت، ادب، خوف اور اُمید کے جذبات اَور لوگوں کے متعلق خدا تعالےٰ سے زیادہ یا اُس کے برابر رکھے جائیں۔

کامل موحد وہی ہے جو شرک کی ان تمام اقسام سے بچے۔ اور اللہ تعالےٰ کی احدیت پر سچّے دل سے ایمان لائے۔ حق یہ ہے کہ شرک انسان کا نقطۂ نگاہ بہت ہی محدود کر دیتا ہے اور اس کی ہمت کو گرا دیتا ہے۔ اور اُس کے مقصد کو ادنیٰ کر دیتا ہے۔ مشرک انسان یہ خیال کرتا ہے کہ وہ براہِ راست خدا تک نہیں پہنچ سکتا اور اُسے کسی واسطہ کی ضرورت ہے۔ حالانکہ اللہ تعالےٰ نے اپنے اور انسانوں کے درمیان کوئی واسطہ نہیں رکھا۔ اور سب انسانوں کے لئے اُس نے اپنے قرب کے دروازے کھلے رکھے ہیں جو چاہے اُن میں داخل ہو جائے۔ بے شک ایک دنیوی بادشاہ کے لئے سب رعایا سے تعلق رکھنا ممکن نہیں ہوتا۔ مگر خدا تعالیٰ کی طاقتیں محدود نہیں ہیں۔

ع ۴ / ۱۱

مُّسَمًّى ثُمَّ مَحِلُّهَآ اِلَى الْبَيْتِ الْعَتِيْقِ ﴿۳۴﴾ وَلِكُلِّ

جائز ہے۔ پھر خدا کے پُرانے گھر تک اس کو پہنچانا ضروری ہے۔ ۵۵ اور ہر ایک قوم کے

اُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا لِّيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلٰى مَا

لئے ہم نے قربانی کا ایک طریق مقرر کیا ہے تاکہ وہ اُن چارپایوں پر جو اللہ (تعالیٰ) نے انکو بخشے ہیں اللہ

رَزَقَهُمْ مِّنْۢ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ ؕ فَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ

(تعالیٰ) کا نام لیں۔ (پس یاد رکھو کہ) تمہارا خدا ایک خدا ہے۔

فَلَهٗٓ اَسْلِمُوْا ؕ وَبَشِّرِ الْمُخْبِتِيْنَ ﴿۳۵﴾ الَّذِيْنَ اِذَا

پس تم اُسی کی فرمانبرداری کرو۔ اور جو (خدا کے سامنے) عاجزی کرنیوالے ہیں انکو خوشخبری دیدے ایسے لوگوں کو کہ جب

ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَالصّٰبِرِيْنَ عَلٰى مَآ

اللہ کا نام اُن کے سامنے لیا جائے تو اُن کے دل کانپ جاتے ہیں اور ان لوگوں کو بھی (خوشخبری دیدے) جو اپنے پر نازل

اُسکی طاقت اور قدرت میں یہ بات داخل ہے کہ وہ سب سے براہِ راست تعلق رکھے اور انہیں اپنے قرب میں جگہ دے۔

اَلْعَتِيْقُ

۵۵ حل لغات:۔ اَلْعَتِيْقُ کے معنے ہیں اَلْقَدِيْمُ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ۔ تمام چیزوں میں سے پُرانی چیز۔ اَلْكَرِيْمُ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ وَالْخِيَارُ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ۔ معزز اور بہترین چیز۔ (اقرب)

تفسیر:۔ فرماتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے احکام پر چلنا اُس کے شعائر کی عظمت بجالانا۔ اس کی مقرر کردہ عزت والی جگہوں کی تعظیم کرنا اور اس کے نشانات کی حرمت کو قائم رکھنا خدا تعالیٰ کو کوئی فائدہ نہیں پہنچاتا۔ بلکہ اس سے خود انسان کے اپنے دل میں نیکی پیدا ہوتی ہے اور تقویٰ میں وہ ترقی کرنے لگتا ہے۔

چنانچہ قربانیوں کو ہی دیکھ لو۔ یہ پہلے کچھ مدت تک تم لوگوں کو فائدہ پہنچاتی ہیں۔ اور پھر خانہ کعبہ پر پہنچتی ہیں تو ذبح کی جاتی ہیں۔ لیکن پھر بھی اُن کا گوشت تم لوگوں کے فائدے کیلئے ہی تقسیم ہوتا ہے خدا کو نہیں پہنچتا خدا تعالیٰ کو تو وہی اخلاص پہنچتا ہے جس کے ماتحت تم نے قربانیاں کی ہوتی ہیں۔ پس اصل چیز دل کا اخلاص اور وہ ایمان ہے جو انسان کے اندر پایا جائے۔ اور یہی چیز اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں قدر و قیمت رکھتی ہے اس جگہ وَمَنْ يُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ کہہ کر اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے کہ تعظیم شعائر اللہ تقوی القلوب میں داخل ہے یعنی متقی ہونے کے لئے اللہ تعالیٰ کے نشانات کی عزت و توقیر کرنا ضروری ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ خدا تعالیٰ کی ہستی پر دلالت کرتے ہیں۔ درحقیقت اسلام نے یہ کلیۃً پیش کیا ہے کہ انسان کے ظاہری اعمال کا اس کے باطن پر اور اس کے باطن کا ظاہر پر اثر پڑتا ہے۔ پس جو شخص اُن مقامات کا

اَصَابَهُمْ وَالْمُقِيْمِي الصَّلٰوةِ ۙ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ﴿۳۶﴾

ہونیوالی مصیبتوں پر صبر کرتے ہیں اور نماز کو قائم کرتے ہیں اور جو کچھ ہم نے انکو دیا ہے (ہماری خوشنودی کیلئے) اُمیں سے خرچ کرتے

وَالْبُدْنَ جَعَلْنٰهَا لَكُمْ مِّنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ لَكُمْ فِيْهَا خَيْرٌ ۖ

رہتے ہیں۔ اور ہم نے قربانی کے اونٹوں کو بھی قابلِ عزّت بنایا ہے۔ اُن میں تمہارے لئے بہت بھلائی ہے۔ پس

فَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهَا صَوَآفَّ ۚ فَاِذَا وَجَبَتْ

انہیں صفوں میں کھڑا کر کے اُن پر خدا کا نام لو۔ اور جب اُن کے پہلو زمین پر

جُنُوْبُهَا فَكُلُوْا مِنْهَا وَاَطْعِمُوا الْقَانِعَ وَالْمُعْتَرَّ ۚ كَذٰلِكَ

لگ جائیں تو اُن (کے گوشت) میں سے خود بھی کھاؤ اور انکو بھی کھلاؤ جو اپنی غربت سے پریشان ہیں۔ اِسی طرح ہم نے

سَخَّرْنٰهَا لَكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۳۷﴾ لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ

اُن جانوروں کو تمہارے فائدے کیلئے بنایا ہے تاکہ تم شکر گذار بنو ؎۱۶ (یاد رکھو کہ) ان قربانیوں کے

ادب کرتا ہے جہاں اللہ تعالیٰ کے جلال کا اظہار ہُوا ہو یا اُن ہستیوں کا ادب کرتا ہے جن پر اللہ تعالیٰ کا کلام اُترا ہو یا اُس کے نشانات کی حامل ہوں تو چونکہ یہ ادب اُس کے دل کے تقویٰ اور خشیّت الٰہی کی وجہ سے ہوگا۔ اس لئے طبعی طور پر اُس کی دلی پاکیزگی کا اس کے ظاہر پر بھی اثر پڑے گا۔ اور اس طرح وہ ظاہری اور باطنی دونوں طور پر نیکیوں سے آراستہ ہو جائیگا۔

یہ آیت گو بہت چھوٹی سی ہے لیکن انسان کے فرائض اور اس کی ذمہ داریوں کو اس میں ایسے کھلے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے کہ اگر کوئی شخص سمجھ اور عقل سے کام لینے والا ہو تو وہ اِسی کے ذریعہ اپنے تمام اعمال کو درست کر سکتا ہے۔ انسان کی تمام تر سعادت اِسی میں ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے شعائر کا ادب کرے اور ان کی عظمت کو ہمیشہ ملحوظ رکھے۔ ورنہ اُس کا ایمان سلامت نہیں رہ سکتا۔

؎۱۶ حلِ لغات: - اَلْبُدْنُ: اَلْبَدَنَةُ کی جمع ہے۔ اور اَلْبَدَنَةُ کے معنے ہیں نَاقَةٌ اَوْ بَقَرَةٌ تُنْحَرُ بِمَكَّةَ سُمِّيَتْ بِذٰلِكَ لِاَنَّهُمْ كَانُوْا يُسَمِّنُوْنَهَا۔ یعنی بَدَنَة اُس اونٹنی یا گائے کو کہتے ہیں جو مکّہ میں حج کے موقع پر ذبح کی جاتی ہے۔ اور بَدَنَةٌ بَدَنَ سے ہے جس کے معنے بدن کے بڑے ہو جانے کے ہیں۔ اور قربانی کو اس لئے بَدَنَةٌ کہتے ہیں کہ لوگ اس کو کھلا پلا کر خوب موٹا کرتے ہیں۔ (۱ اَلْبُدْنُ)

شَعَآئِرُ: شَعِيْرَةٌ کی جمع ہے اور اَلشَّعِيْرَةُ کے معنے ہیں اَلْعَلَامَةُ۔ علامت۔ (۲ شَعَآئِرُ)

صَوَآفَّ: اَلصَّآفَّةُ کی جمع ہے اور اَلصَّآفَّةُ (۳ صَوَآفَّ)

مِنَ الْاِبِلِ کے معنے ہیں اَلْوَاقِفَةُ قَوَائِمُهَا صَفًّا جن کو ایک قطار میں کھڑا کیا جائے۔

وَجَبَتْ وَجَبَتْ: وَجَبَ کے معنے ہوتے ہیں سَقَطَ وَ مَاتَ۔ وہ گر گیا اور مر گیا۔ پس وَجَبَتْ جُنُوْبُهَا کے معنے ہونگے۔ جب وہ اونٹ پہلوؤں پر گر جائیں اور اُن کی جان نکل جائے۔

اَلْقَانِعُ اَلْقَانِعُ: قَنَعَ سے اسم فاعل ہے۔ اور قَنَعَ الرَّجُلُ کے معنے ہیں سَأَلَ وَتَذَلَّلَ۔ اُس آدمی نے سوال کیا اور سوال کرنے میں عاجزی اختیار کی۔ پس اَلْقَانِعُ کے معنے ہونگے سوال کرنیوالا۔

اَلْمُعْتَرَّ اَلْمُعْتَرَّ: کے معنے ہیں۔ اَلْفَقِیْرُ۔ اَلْمُعْتَرِضُ لِلْمَعْرُوْفِ مِنْ غَیْرِ اَنْ یَّسْاَلَ۔ اپنی حالت کو پیش کرکے بغیر سوال کرنے کے مانگنے والا۔ (اقرب) یعنی ایسا شخص جو مُنہ سے سوال نہیں کرتا بلکہ اپنی حالت سے سوال کرتا ہے۔

تفسیر:- فرماتا ہے۔ قربانی کا طریق ہم نے ہر قوم میں جاری کیا ہے۔ تاکہ وہ اُن چوپایوں پر جو اللہ تعالےٰ نے اُن کو عطا فرمائے ہیں اُس کا نام لیا کریں۔ اور اِس طرح اس کے اس عظیم الشان احسان کا کہ اُس نے اُن کے لئے خوراک اور سواریاں پیدا کی ہیں کم سے کم زبانی شکریہ ادا کریں۔ حقیقی شکریہ تو یہ ہے کہ جس طرح اُس نے اُن کی قربانی کیلئے جانور پیدا کئے ہیں وہ اپنے نفس کی قربانیاں اُس کے لئے اور اُس کے دین کے لئے کریں۔ پس تم بھی ایک خدا کے لئے قربانی کرو۔ اور اس کے فرمانبردار ہو جاؤ۔ تاکہ دنیا میں ایک خدا کی بادشاہت قائم ہو جائے۔ اور اے رسول جو بھی ہمارے حضور میں عجز و انکسار سے رہنا چاہیں اور ہمارا نام آتے ہی اُن کے دل لرز جائیں اور مصیبتوں پر وہ صبر کریں اور باجماعت نمازیں ادا کیا کریں اور اپنے اموال غریبوں پر خرچ کرتے رہیں اُن کو بتا دے کہ یہ ایسا راستہ ہے جس سے وہ اِس دنیا میں بھی اور اگلے جہان میں بھی عزت حاصل کرینگے۔

وَلِكُلِّ اُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا لِّيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلٰى مَا رَزَقَهُمْ مِّنْ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ میں اللہ تعالیٰ نے دو امور کی طرف توجہ دلائی ہے۔ ایک تو اِس میں یہ بتایا گیا ہے کہ سب مذاہب میں قربانی کا وجود پایا جاتا ہے۔ اور دوسرے یہ بتایا گیا ہے کہ خدا تعالیٰ کی طرف سے الٰہی رضاء کے لئے ہمیشہ جانوروں کی قربانی کا حکم دیا گیا ہے۔ پس جن قوموں میں انسانی قربانی کا رواج رہا ہے وہ درحقیقت مذہب کے بگاڑ کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔ ورنہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے انہیں جانوروں کی قربانی کا ہی حکم دیا گیا تھا۔ بائبل کے مطالعہ سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ قدیم زمانوں میں انسانی قربانی کا رواج ہُوا کرتا تھا جو بنی اسرائیل میں بھی اُن کے بگاڑ کے زمانہ میں جاری ہو گیا اور انہوں نے بُتوں پر اپنے بیٹوں اور بیٹیوں کو قربان کرنا شروع کر دیا۔ چنانچہ ۲ سلاطین باب ۱۶ میں آخز بادشاہ کے متعلق لکھا ہے کہ

"اُس نے وہ کام نہ کیا جو خداوند اُس کے خدا کی نظر میں بھلا ہے۔ جیسا اُس کے باپ داؤد نے کیا تھا۔ بلکہ وہ اسرائیل کے بادشاہوں کی راہ پر چلا اور اُس نے ان قوموں کے نفرتی دستور کے مطابق جن کو خداوند نے بنی اسرائیل کے سامنے سے خارج کر دیا تھا اپنے بیٹے کو بھی آگ میں چلوایا۔"

(باب ۱۶ آیت ۲ و ۳)

۲ تواریخ باب ۲۸ آیت ۳ میں صرف ایک

بیٹے کا ذکر نہیں کیا گیا بلکہ لکھا ہے کہ آخز نے "اپنے ہی بیٹوں کو آگ میں جھونکا۔" گویا صرف ایک بیٹے کی نہیں بلکہ کئی بیٹوں کی اُس نے قربانی کی۔

اِسی طرح بنی اسرائیل کے متعلق لکھا ہے کہ انہوں نے ہوسیع بادشاہ کے عہد میں "بعل کو پُوجا اور انہوں نے اپنے بیٹوں اور بیٹیوں کو آگ میں چلوایا اور فال گیری اور جادوگری سے کام لیا۔" (۲۔ سلاطین باب ۱۷ آیت ۱۷)

حزقیاہ کے بیٹے منسّی کے متعلق بھی لکھا ہے کہ اُس نے "خداوند کی ہیکل کے دونوں صحنوں میں مذبح بنائے اور اُس نے اپنے بیٹے کو آگ میں چلایا۔"

(۲۔ سلاطین باب ۲۱۔ آیت ۶)

اِس بارہ میں بھی تواریخ کا بیان سلاطین سے کسی قدر مختلف ہے یعنی سلاطین میں تو صرف ایک بیٹے کی قربانی کا ذکر کیا گیا ہے مگر تواریخ میں لکھا ہے کہ

"اُس نے بن ہنوم کی وادی میں اپنے فرزندوں کو بھی آگ میں چلوایا۔"

(۲۔ تواریخ باب ۳۳ آیت ۶)

حضرت داؤد علیہ السلام بھی اِس بُرائی کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ

"انہوں نے اپنے بیٹوں بیٹیوں کو شیاطین کے لئے قربان کیا اور معصوموں کا یعنی اپنے بیٹے بیٹیوں کا خون بہایا (جو کہ ایک بُرا فعل تھا اور شرک پر دلالت کرتا تھا) جن کو انہوں نے کنعان کے بتوں کیلئے قربان کر دیا اور ملک خون سے ناپاک ہو گیا۔"

(زبور باب ۱۰۶ آیت ۳۷، ۳۸)

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں بھی انسانی قربانی کا رواج تھا جس سے شریعت موسویہ میں بڑی سختی کے ساتھ روکا گیا۔ چنانچہ استثناء میں لکھا ہے:۔

"جب تُو اس ملک میں جو خداوند تیرا خدا تجھ کو دیتا ہے پہنچ جائے تو وہاں کی قوموں کی طرح مکروہ کام کرنے نہ سیکھنا۔ تجھ میں ہرگز کوئی ایسا نہ ہو جو اپنے بیٹے یا بیٹی کو آگ میں چلوائے یا فال گیر یا شگون نکالنے والا یا افسون گر یا جادوگر یا منتری یا جنّات کا آشنا یا رمّال یا ساحر ہو۔ کیونکہ وہ سب جو ایسے کام کرتے ہیں خداوند کے نزدیک مکروہ ہیں۔" (استثناء باب ۱۸ آیت ۹ تا ۱۲)

احبار میں بھی لکھا ہے کہ

"تُو اپنی اولاد میں سے کسی کو مولک (یہ کنعانیوں کا ایک بُت تھا) کی خاطر آگ میں سے گذرنے کے لئے نہ دینا۔ اور نہ اپنے خدا کے نام کو ناپاک ٹھیرانا۔"

(احبار باب ۱۸ آیت ۲۱)

اِسی طرح لکھا ہے:۔

"خداوند نے موسیٰ سے کہا تُو بنی اسرائیل سے یہ بھی کہہ دے کہ بنی اسرائیل میں سے یا اُن پردیسیوں میں سے جو اسرائیلیوں کے درمیان بود و باش کرتے ہیں جو کوئی شخص اپنی اولاد میں سے کسی کو مولک کی نذر کرے وہ ضرور جان سے مارا جائے۔ اہلِ ملک اُسے سنگسار کریں۔ اور میں بھی اُس شخص کا مخالف ہونگا اور اُسے اُس کے لوگوں میں سے کاٹ ڈالوں گا۔ اِس لئے کہ اُس نے اپنی اولاد کو مولک کی نذر کر کے میرے مقدس اور میرے پاک نام کو ناپاک ٹھہرایا اور اگر اُس وقت جب وہ اپنی اولاد میں سے کسی کو مولک کی نذر کرے اہلِ ملک

اس شخص کی طرف سے چشم پوشی کرکے اُسے جان سے نہ ماریں تو میں خود اُس شخص کا اور اُس کے گھرانے کا مخالف ہو کر اُس کو اور اُن سبھوں کو جو اُس کی پیروی میں زنا کار بنیں اور مولک کے ساتھ زنا کریں اُن کی قوم میں سے کاٹ ڈالونگا۔"

(احبار باب ۲۰ آیت ۱ تا ۶)

لیکن باوجود اس کے کہ بائیبل انسانی قربانی کو بُرا قرار دیتی ہے پھر بھی بائیبل بتاتی ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے یہی حکم دیا تھا کہ وہ اپنے بیٹے کو چھری سے ذبح کریں۔ چنانچہ پیدائش میں لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حکم دیا کہ

"تو اپنے بیٹے اضحاق کو جو تیرا اکلوتا ہے اور جسے تو پیار کرتا ہے ساتھ لے کر موریاہ کے ملک میں جا اور وہاں اُسے پہاڑوں میں سے ایک پہاڑ پر جو میں تجھے بتاؤنگا سوختنی قربانی کے طور پر چڑھا۔ تب ابرہام نے صبح سویرے اُٹھ کر اپنے گدھے پر چارجامہ کسا اور اپنے ساتھ دو جوانوں اور اپنے بیٹے اضحاق کو لیا اور سوختنی قربانی کیلئے لکڑیاں چیریں اور اُٹھ کر اُس جگہ کو جو خدا نے اُسے بتائی تھی روانہ ہوا۔"

(پیدائش باب ۲۲ آیت ۱ تا ۳)

پھر لکھا ہے:-

"وہاں ابرہام نے قربان گاہ بنائی۔ اور اُس پر لکڑیاں چنیں اور اپنے بیٹے اضحاق کو باندھا اور اُسے قربان گاہ پر لکڑیوں کے اوپر رکھا اور ابرہام نے ہاتھ بڑھا کر چھری لی کہ اپنے بیٹے کو ذبح کرے۔ تب خداوند کے فرشتے نے اُسے آسمان سے پکارا کہ اے ابرہام۔ اے ابرہام! اُس نے کہا میں حاضر ہوں۔ پھر اُس نے کہا کہ تو اپنا ہاتھ لڑکے پر نہ چلا اور نہ اس سے کچھ کر کیونکہ میں اب جان گیا کہ تو خدا سے ڈرتا ہے۔ اس لئے کہ تو نے اپنے بیٹے کو بھی جو تیرا اکلوتا ہے مجھ سے دریغ نہ کیا۔ اور ابرہام نے نگاہ کی اور اپنے پیچھے ایک مینڈھا دیکھا جس کے سینگ جھاڑی میں اٹکے تھے۔ تب ابرہام نے جا کر اُس مینڈھے کو پکڑا اور اپنے بیٹے کے بدلے سوختنی قربانی کے طور پر چڑھایا۔"

(پیدائش باب ۲۲ آیت ۹ تا ۱۳)

اب اگر اسی طرح واقعہ ہوا ہو کہ خدا تعالیٰ نے پہلے الہاماً حضرت ابراہیم علیہ السلام کو یہ کہا ہو کہ جاؤ۔ اور اپنے بیٹے کو چھری سے قربان کر دو۔ اور پھر جب وہ قربان کرنے لگے تو اللہ تعالیٰ نے انہیں روک دیا تو پہلا حکم بالکل بے فائدہ قرار پاتا ہے۔ کیونکہ جب اللہ تعالیٰ کا یہ منشاء ہی نہیں تھا کہ وہ اپنے بیٹے کو اس طرح قربان کریں۔ تو انہیں قربان کرنے کا حکم کیوں دیا گیا اور کیوں بعد میں اُن سے صرف مینڈھے کی قربانی کو قبول کر لیا گیا۔ پس بائیبل جو کچھ بتاتی ہے وہ عقلی طور پر ایک قابلِ اعتراض صورت ہے جس میں خدا تعالیٰ کے ایک حکم کو بے کار قرار دینا پڑتا ہے۔

لیکن قرآن کریم یہ بتاتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ رؤیا دیکھا تھا کہ وہ اپنے بیٹے کو ذبح کر رہے ہیں جس کی تعبیر میں انہوں نے حضرت اسماعیل علیہ السلام کو ایک وادیٔ غیر ذی زرع میں جا کر چھوڑ دیا اور اس طرح عملی رنگ میں اپنے ہاتھوں انہیں ذبح کر دیا۔ گویا

بائبل حضرت ابراہیم علیہ السلام کے واقعہ میں انسانی قربانی کو بطور اصل پیش کرتی ہے۔ اور جانور کی قربانی کو اس کا قائم مقام قرار دیتی ہے۔ لیکن اسلام صرف جانور کی قربانی کو ہی اصل قربانی قرار دیتا ہے۔ اور بتاتا ہے کہ ہر مذہب میں خدا تعالیٰ کی طرف سے جانوروں کی قربانی ہی اصل قربانی مقرر کی گئی تھی۔ انسانی قربانی کا جو اُن میں رواج پیدا ہوا وہ منشاء الٰہی کے خلاف اور مذہب کے بگاڑ کا نتیجہ تھا۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر انسانی قربانی کا رواج منشاء الٰہی کے خلاف تھا تو پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام کو رؤیا میں یہ کیوں دکھایا گیا کہ وہ اپنے بیٹے کو ذبح کر رہے ہیں؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ رؤیا دراصل اپنے اندر تعبیری رنگ رکھتی تھی جسے بعد میں رونما ہونے والے واقعات نے ظاہر کر دیا۔ اور وہ تعبیر یہ تھی کہ ایک دن حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے بیٹے اسمٰعیل کو خدا تعالیٰ کے حکم کے ماتحت ایک ایسی جگہ اور ایسے حالات میں چھوڑ کر آئیں گے کہ جہاں ظاہری حالات کے مطابق اُن کی موت یقینی ہو گی۔ لیکن اللہ تعالیٰ اُن کی اس قربانی کو قبول فرما کر اُن کی زندگی کے سامان پیدا کر دیگا اور اُن کے ذریعہ سے اس قدیم معبد کو جسے اللہ تعالیٰ دنیا کا آخری معبد بھی بنانا چاہتا تھا آباد کرائے گا تاکہ جس طرح اللہ اوّل اور آخر ہے اسی طرح اس کا گھر یعنی مکہ مکرمہ بھی اوّل گھر اور آخر گھر بن جائے۔ چنانچہ مسلمانوں میں عیدالاضحیٰ کی یادگار کسی ایسے بکرے کی قربانی کے بدلے میں نہیں جو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ذبح کیا ہو بلکہ خود حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی قربانی کی یادگار میں ہے۔ جو بیت اللہ کو آباد رکھنے کے لئے کی گئی۔ اور اس میں کیا شبہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اپنے بیٹے کو ایک بے آب وگیاہ وادی میں چھوڑ آنا اپنے ہاتھوں قتل کرنے کے مترادف تھا۔ بلکہ حقیقتاً اُس سے بھی زیادہ۔ کیونکہ قتل کرنے سے ایک منٹ میں جان نکل جاتی ہے۔ اور اس طرح اگر خدا تعالیٰ کا فضل نہ ہوتا تو انہوں نے سسک سسک کر جان دینی تھی۔

پس حضرت ابراہیم علیہ السلام کا یہ رؤیا انسانی قربانی کی ترویج کے لئے نہیں تھا بلکہ اس ذریعہ سے اللہ تعالیٰ دُنیا کو یہ سبق دینا چاہتا تھا کہ اصل قربانی یہ ہے کہ انسان اس غرض سے تکلیف اُٹھائے کہ اس کا فائدہ دنیا کو پہنچے۔ پس وہی قربانی اس کی نظر میں مقبول ہو سکتی ہے جو بنی نوع انسان کی زندگی کا موجب ہو۔

اس جگہ یہ امر بھی مدّنظر رکھنا ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ نے وَلِكُلِّ أُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا فرما کر قربانی کی حقیقت اور اس کے فلسفہ پر بھی نہایت لطیف رنگ میں روشنی ڈالی ہے اور بتایا ہے کہ محض قربانی کوئی چیز نہیں بلکہ خدا تعالیٰ کی نگاہ میں وہ جذبۂ اخلاص قدر و قیمت رکھتا ہے جو اس قربانی کے پس پشت ہوتا ہے۔ اگر کوئی شخص اعلیٰ درجہ کا دُنبہ تو ذبح کر دیتا ہے لیکن وہ قربانی میں اللہ تعالیٰ کی رضا اور اس کی خوشنودی کو مدّنظر نہیں رکھتا تو اسکی یہ قربانی خدا تعالیٰ کے حضور ایک پرکاہ کے برابر بھی حیثیت نہیں رکھ سکتی۔ یہ لطیف اشارہ اللہ تعالیٰ نے مَنْسَكًا کا لفظ استعمال فرما کر کیا ہے جس کے معنے عربی زبان میں شِرْعَةُ النُّسُكِ۔ نَفْسُ النُّسُكِ اور مَوْضِعٌ تُذْبَحُ فِيْهِ النَّسِيْكَةُ کے ہوتے ہیں۔ یعنی مَنْسَكٌ قربانی کے طریق کو بھی کہتے ہیں۔ نفسِ قربانی کو بھی کہتے ہیں اور اُس جگہ کو بھی کہتے ہیں جہاں قربانی کی جاتی ہے اور نَسِيْكَة کا لفظ جو عربی زبان میں قربانی کے لئے استعمال کیا جاتا ہے نَسَكَ سے نکلا ہے اور نَسَكَ لِلّٰهِ کے معنے ہوتے ہیں تَطَوَّعَ بِقُرْبَةٍ وَ ذَبَحَ بِوَجْهِهٖ (اقرب) یعنی کسی نیک کام کو بغیر اس کے کہ اُس کے کرنے کا حکم دیا گیا ہو یا بغیر اس کے کہ اُس کی ذمہ داری کسی پر ڈالی گئی ہو

اپنی خوشی اور رضا سے کسی شخص نے سرانجام دیا۔ اور
اس نیت سے کام کیا کہ خدا تعالیٰ کی خوشنودی اُسے
حاصل ہو جائے۔ گویا نَسِیْکَۃٌ کے لئے یہ شرط ہے کہ
وہ جبر کے ماتحت نہ ہو بلکہ طبعی رغبت اور ارادہ اور
خواہش سے ہو اور پھر خالِصَۃً لِلّٰہ ہو۔ اور اسی طرح نَسَکَ
الثَّوْبَ کے معنے ہوتے ہیں غَسَلَہٗ بِالْمَاءِ فَطَھَّرَہٗ۔ اُس نے
اُس کپڑے کو پانی سے دھویا اور اُس میں سے ہر قسم کی مَیل نکال
دی۔ پس اس آیت میں مَنْسَکًا کا لفظ استعمال فرما کر اس
امر کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ تم ہمیشہ اپنی خوشی اور
بشاشتِ قلبی کے ساتھ قربانیوں میں حصہ لو۔ یہ نہ ہو کہ
تمہیں کسی کا جبر قربانی پر آمادہ کر رہا ہو۔ کیونکہ خدا تعالیٰ
کے حضور وہی قربانی مقبول ہوتی ہے جو بشاشتِ قلب
کے ساتھ کی جائے۔ دوم۔ صرف بشاشتِ قلب کا
مدنظر رکھنا ہی تمہارے لئے ضروری نہیں بلکہ اس سے
اگلا قدم یہ ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کی رضا اور اُسکی خوشنودی
کو ملحوظ رکھتے ہوئے قربانیاں کرو۔ اور تیسری بات
یہ ہے کہ قربانی کرتے وقت اپنے دل کے تمام گوشوں
کو ٹٹولو اور دیکھو کہ کیا کسی دنیوی غرض کی ملونی تو اس میں
نہیں۔ کیونکہ اگر ایسا ہو تو تمہاری قربانی خدا تعالےٰ کی
بارگاہ میں قبولیت کا شرف حاصل نہیں کر سکتی۔ یہ
نہایت لطیف اور قیمتی اسباق اللہ تعالےٰ نے محض
ایک چھوٹے سے لفظ میں بیان کر دئے ہیں جن سے فائدہ
اٹھا کر انسان اپنی قربانیوں کے اعلیٰ نتائج حاصل کر سکتا ہے۔

وَبَشِّرِ الْمُخْبِتِيْنَ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ
وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَالصّٰبِرِيْنَ عَلٰى مَآ اَصَابَهُمْ
وَالْمُقِيْمِي الصَّلٰوةِ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ
میں خدا تعالیٰ کے حضور عاجزی کرنے والوں کی چار علامات
بتائی گئی ہیں۔

اوّل یہ کہ اللہ تعالیٰ کا نام آنے پر اُن کے دل
کانپ اُٹھتے ہیں۔

دوم۔ خدا تعالیٰ کی راہ میں مصائب اور مشکلات
کے آنے پر وہ اُن کو بخندہ پیشانی برداشت کرتے ہیں۔

سوم۔ باجماعت نمازیں ادا کرتے ہیں۔

چہارم۔ اُن کو خدا تعالےٰ کی طرف سے جو کچھ
بھی ملتا ہے اس کا ایک حصہ وہ اس کی راہ میں خرچ
کرتے رہتے ہیں۔

اس جگہ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ میں صرف روپیہ ہی
شامل نہیں کہ انسان کچھ روپے خدا تعالیٰ کی راہ میں دے
کر اپنے فرض کو ادا کرنے والا سمجھا جا سکے بلکہ مِمَّا
رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ میں اُس کی آنکھیں بھی شامل ہیں۔ اس
کا دماغ بھی شامل ہے۔ اُس کے کان بھی شامل ہیں۔ اس
کی ناک بھی شامل ہے۔ اُس کے ہاتھ اور پاؤں بھی شامل
ہیں۔ اُس کا دھڑ بھی شامل ہے۔ پھر مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ
يُنْفِقُوْنَ میں اس کا مکان بھی شامل ہے۔ وہ گندم بھی
شامل ہے جو وہ استعمال کرتا ہے بلکہ وہ مولیاں اور
گاجریں اور گُڑ بھی شامل ہیں جو زمیندار پیدا کرتا ہے۔
اس میں کوئی شبہ نہیں کہ روپیہ خرچ کر کے ایک شخص
مالی قربانی کرنے والا قرار پا سکتا ہے۔ لیکن شریعت صرف
مالی قربانی کا حکم نہیں دیتی بلکہ شریعت یہ کہتی ہے کہ ہم
نے تمہیں جو کچھ دیا ہے اس کا ایک حصہ تم خدا تعالیٰ کی
راہ میں خرچ کرو۔ پس اگر کوئی شخص اپنی ساری جائداد
بھی چندہ میں دے دیتا ہے لیکن اس کی آنکھیں خدا تعالےٰ
کے بندوں کی خدمت میں حصہ نہیں لیتیں، اُس کے ہاتھ
پاؤں خدا تعالےٰ کے بندوں کی خدمت میں حصہ نہیں لیتے
تو وہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ مَیں نے اپنی ساری جائداد
دے کر اپنے فرض کو ادا کر دیا ہے۔ یہ چیز منطق تو
کہلائیگی لیکن دین نہیں کہلائیگا۔ دین کا تقاضا پورا کرنے
کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ اپنے سارے جسم کو خدا تعالےٰ

کے بندوں کی خدمت کے لئے استعمال کرے۔ احادیث میں آتا ہے کہ قیامت کے دن جب تمام انسان خدا تعالیٰ کے سامنے پیش ہونگے تو وہ بعض لوگوں سے کہے گا کہ اے میرے بندو! میں بھوکا تھا۔ تم نے مجھے کھانا کھلایا میں پیاسا تھا تم نے مجھے پانی پلایا۔ میں ننگا تھا تم نے مجھے کپڑے پہنائے۔ میں بیمار ہوا تم نے میری تیمارداری کی۔ اس لئے جاؤ اور میری جنت میں داخل ہو جاؤ۔ وہ بندے کہیں گے۔ توبہ توبہ بھلا ہماری کیا طاقت تھی کہ ہم تجھے کھانا کھلاتے یا پانی پلاتے یا کپڑے پہناتے یا بیماری پر تیری عیادت کرتے تُو تو ان تمام باتوں سے پاک ہے۔ وہ فرمائے گا۔ یہ درست ہے۔ لیکن جب میرا ایک ادنیٰ سے ادنیٰ بندہ تمہارے پاس آیا اور وہ بھوکا تھا تو تم نے اُسے کھانا کھلایا تو گویا مجھے ہی کھانا کھلایا۔ اور اسی طرح جب میرا ایک ادنیٰ سے ادنیٰ بندہ تمہارے پاس آیا اور وہ پیاسا تھا۔ اور تم نے اُسے پانی پلایا تو گویا تم نے مجھے ہی پانی پلایا۔ اسی طرح جب تم نے ایک ننگے کو کپڑا پہنایا یا ایک بیمار کی تیمارداری کی تو تم نے ایک بندے کو کپڑا نہیں پہنایا یا ایک بندے کی تیمارداری نہیں کی بلکہ درحقیقت تم نے مجھے کپڑا پہنایا۔ اور تم نے میری تیمارداری کی۔ اسلئے جاؤ اور میری جنت میں داخل ہو جاؤ

غرض مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ میں اس امر کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ ایک مومن کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے جس قدر طاقتیں اور توفیق ملی ہوئی ہیں اُس پر فرض ہے کہ وہ اپنی ہر طاقت کو بنی نوع انسان کی بھلائی کیلئے صرف کرے۔ اور صرف اس امر پر خوش نہ ہو جائے کہ اُس نے روپیہ دیدیا تھا یا نماز پڑھ لی تھی یا روزہ رکھ لیا تھا۔

دیکھو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ مالی قربانی کی تحریک کی۔ تو ایک صحابی جن کے پاس اَور کچھ نہیں تھا وہ جَو کی دو مٹھیاں لائے اور انہوں نے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کر دیں منافقوں نے اس بات کو دیکھا تو وہ ہنسے اور کہنے لگے۔ لو اب دین جَو کی ان دو مٹھیوں سے فتح ہوگی۔ حالانکہ اگر اُن کی آنکھ کھلی ہوتی تو وہ سمجھتے کہ یہ جَو کی دو مٹھیاں نہیں تھیں بلکہ اسلام کی محبت میں بیتاب ہونے والے ایک دل کے خون کے دو قطرے تھے جو اُس نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کئے۔ اور دنیا دل کے خون کے قطروں سے ہی فتح ہُوا کرتی ہے دنیاوی سامانوں سے نہیں۔ پس ایمانِ کامل کی علامت یہ ہے کہ جو کچھ تم گھروں میں کھاتے ہو۔ اور جو کچھ کماتے ہو اور جو کچھ پہنتے ہو اور جو کچھ خرچ کرتے ہو۔ اُس کا ایک حصہ خدا تعالیٰ کی راہ میں بھی دو اور اپنی ہر طاقت بنی نوع انسان کی بھلائی اور اُن کی بہبودی کے لئے صرف کرو۔

پھر فرماتا ہے۔ وَالْبُدْنَ جَعَلْنٰهَا لَكُمْ مِّنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ۔ اور تُو ان کو بتا دے کہ قربانیوں کو ہم نے شعائر اللہ قرار دیا ہے۔ یعنی وہ انسان کو خدا تک پہنچاتی ہیں اور اُن کے ذریعہ سے دینی اور دنیوی بھلائی ملتی ہے پس قربانی کے دنوں میں قربانیوں کو صف در صف کھڑا کر کے اُن پر اللہ تعالیٰ کا نام لیا کرو۔ تاکہ وہ اللہ تعالیٰ کے بندوں کے کام آئیں۔ چنانچہ جب وہ ذبح ہو کر اپنے پہلوؤں پر گر جائیں۔ تو خود بھی اُن کا گوشت کھاؤ اور صابر غریب اور مضطر غریب کو بھی کھلاؤ۔ یہ سب مال ہم نے تم کو دیا ہے تاکہ اس کو غریبوں پر خرچ کر کے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو۔

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے ان قربانیوں کی اہمیت کی طرف توجہ دلائی ہے جو حج بیت اللہ کے موقعہ پر کی جاتی ہیں اور بتایا ہے کہ یہ قربانیاں شعائر اللہ میں داخل ہیں اور تمہارے لئے ان قربانیوں میں اللہ تعالیٰ

کی طرف سے بڑی برکت رکھی گئی ہے۔ وہ لوگ جو حقائق سے ناآشنا ہیں وہ بھی اور مسلمانوں میں سے بھی بعض نادان یہ اعتراض کر دیا کرتے ہیں کہ اسلام نے یہ قربانی بغیر کسی حکمت کے رکھی ہے۔ کیوں نہ اس روپیہ کے بدلہ میں کالج جاری کئے جائیں اور اس طرح قومی ترقی کے سامان کئے جائیں۔ فرض کرو حج کے موقعہ پر چالیس ہزار بکرا ذبح ہوتا ہے اور ایک بکرے کی اوسط قیمت پچیس روپے بھی فرض کی جائے تو اس کے معنے یہ ہیں کہ ایک کروڑ پچیس لاکھ روپے کا بکرا ذبح ہو جاتا ہے۔ پھر اونٹ وغیرہ بھی ہوتے ہیں ان سب کو ملا کر اندازاً دو کروڑ روپیہ ان قربانیوں پر خرچ ہو جاتا ہے۔ پس لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ بجائے اس کے کہ یہ روپیہ قربانیوں پر ضائع کیا جائے۔ کیوں نہ اس کے بدلہ میں غریبوں کی تربیت کا انتظام کیا جائے اور مکہ مکرمہ میں کالج اور سکول وغیرہ جاری کر دیئے جائیں۔ میں ہمیشہ ان کو یہ جواب دیا کرتا ہوں کہ بعض دفعہ قوم پر ایسے اوقات بھی آیا کرتے ہیں جب اُسے ایسی قربانیاں کرنی پڑتی ہیں جو بظاہر بے فائدہ نظر آتی ہیں۔ انہی قربانیوں کی ٹریننگ کے لئے اسلام نے یہ سلسلہ جاری کیا ہے تاکہ ایسے مواقع پر خواہ انہیں کوئی حکمت نظر آئے یا نہ آئے وہ قربانی کرتے چلے جائیں۔ مثلاً اگر کسی ملک میں کوئی اکیلا مسلمان ہو اور وہاں کی حکومت مذہب کے خلاف کوئی جابرانہ حکم دیدے جس سے وہ اسلام کو مٹانا چاہتی ہو۔ تو ایسی صورت میں اسلامی تعلیم کے مطابق وہ یہ نہیں کہیگا کہ جب قربانی کا کوئی فائدہ نہیں تو میں اپنے آپ کو کیوں قربان کروں بلکہ وہ فوراً قربانی کے لئے اپنے آپ کو پیش کر دے گا۔ کیونکہ جب تک وہ اپنے آپ کو قربان نہیں کرے گا دوسروں کے دلوں میں قربانی کی تحریک پیدا نہیں ہو گی۔ وہ اگر پھانسی پر چڑھ جائیگا۔ تو پھر کوئی دوسرا شخص بھی پھانسی کے تختے پر چڑھنے کے لئے نکل آئیگا۔ وہ دوسرا شخص پھانسی دیا جائیگا تو تیسرا شخص نکل آئیگا اور اس طرح قدم بقدم تمام قوم میں ایسا جوش پیدا ہو جائیگا کہ وہ اسلام کی حفاظت کے لئے دیوانہ وار کھڑے ہو جائینگے اور کفر کو شکست کھانے پر مجبور کر دیں گے۔

جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ مکرمہ میں دعویٰ فرمایا تو اس وقت جن صحابہؓ نے قربانیاں کیں۔ وہ بظاہر کیسی بے فائدہ اور کیسی بے نتیجہ نظر آتی تھیں۔ مگر پھر انہی قربانیوں کے نتیجہ میں مکہ فتح ہوا اور سارا عرب اسلامی جھنڈے کے نیچے آ گیا۔ جب صحابہؓ مکہ میں قربانیاں کر رہے تھے اُس وقت کوئی شخص یہ قیاس بھی نہیں کر سکتا تھا کہ ایک دن انہی قربانیوں کے نتیجہ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو عظیم الشان شوکت ملنے والی ہے۔ اُس وقت جن عورتوں کی شرمگاہوں میں نیزے مار مار کر انہیں مارا جاتا تھا جن مردوں کو اونٹوں کے ساتھ باندھ کر انکو ٹکڑے ٹکڑے کیا جاتا تھا اُن عورتوں اور مردوں کی قربانیوں کو دیکھ کر ہر شخص سمجھتا تھا کہ یہ لوگ بیکار اپنی عمریں ضائع کر رہے ہیں۔ ایسے ہی لوگوں میں سے ایک عثمانؓ بن مظعون بھی تھے۔ عرب کا ایک مشہور شاعر لبید ایک مجلس میں اپنے اشعار سُنا رہا تھا کہ اُس نے یہ مصرع پڑھا:-

اَلَا کُلُّ شَیْءٍ مَا خَلَا اللّٰہَ بَاطِلٗ

یعنی سُنو کہ خدا کے سوا ہر چیز تباہ ہونے والی ہے۔ عثمانؓ بن مظعون نے یہ مصرع سُنتے ہی بڑے زور سے کہا کہ بالکل ٹھیک ہے۔ خدا کے سوا ہر چیز واقع میں فنا ہونے والی ہے۔ عثمانؓ بن مظعون اُس وقت چھوٹی عمر کے بچے تھے۔ جب انہوں نے تعریف کی تو لبید ناراض ہو گیا۔ اور اُس نے لوگوں سے کہا کہ اس لڑکے نے

میری ہتک کی ہے۔ کیا مَیں اپنے اشعار میں ایک چھوکرے
کی تائید کا محتاج ہوں۔ بعض لوگ اُسے مارنے کے
لئے اُٹھے۔ لیکن بعض اَور نے دخل دے کر اس معاملہ
کو رفع دفع کرا دیا۔ اور اُسے کہدیا کہ اب تم نے کچھ
نہیں کہنا۔ اِس کے بعد لبیدؓ نے اس شعر کا دوسرا
مصرع پڑھا کہ ؏

وَ كُلُّ نَعِيْمٍ لَا مُحَالَةَ زَائِلٗ

یعنی ہر نعمت بہرحال ایک دن ختم ہونے والی ہے۔
اِس پر عثمانؓ بن مظعون سے برداشت نہ ہو سکا اور
انہوں نے کہا۔ جنّت کی نعمتیں کبھی ختم نہیں ہوں گی۔
لبیدؓ کو سخت غصّہ آیا۔ اور اُس نے کہا۔ مَیں اِس مجلس
میں اَب اپنے شعر سُنانے کیلئے تیار نہیں۔ اِس پر
لوگ کھڑے ہو گئے اور انہوں نے عثمانؓ بن مظعون کو
مارنا شروع کر دیا۔ اور ایک شخص نے اتنے زور سے
گھونسہ مارا کہ عثمانؓ بن مظعون کی ایک آنکھ کا ڈیلا
باہر نکل آیا۔ اُن کے والد کا ایک دوست بھی اُسی
مجلس میں بیٹھا ہؤا تھا اور پہلے وہ اُسی کی پناہ میں رہتے
تھے لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ دوسرے مسلمانوں کو
ماریں پڑ رہی ہیں اور وہ آرام سے مکّہ میں پھرتے ہیں۔
تو انہوں نے اس رئیس سے جا کر کہہ دیا کہ مَیں تمہاری
پناہ میں نہیں رہنا چاہتا۔ چنانچہ اُس نے اعلان کر دیا کہ
عثمانؓ اب میری پناہ میں نہیں۔ اُسے یہ جرأت تو
نہیں ہو سکتی تھی کہ وہ سب لوگوں کے سامنے اُن کی
مدد کرتا۔ لیکن جب اُن کی آنکھ نکل گئی۔ تو جسطرح کسی
غریب آدمی کے بچے کو کوئی امیر آدمی کا بچہ مارے پیٹے تو
غریب ماں اپنے بچہ کو ہی مارتی ہے اور اُس پر غصّہ
نکالتی ہے۔ اِسی طرح وہ ان مارنے والوں پر تو غصّہ
نہیں نکال سکتا تھا اُس نے عثمانؓ پر ہی غصّہ نکالا۔
اور کہا۔ مَیں نے تجھے نہیں کہا تھا کہ تُو میری پناہ سے
نہ نکل۔ اب دیکھا تُو نے کہ اُس کا کیا نتیجہ نکلا۔ حضرت
عثمانؓ بن مظعون نے جواب دیا کہ چچا تم تو مجھ پر
اِس لئے خفا ہو رہے ہو کہ میری ایک آنکھ کیوں نکلی
لیکن خدا کی قسم میری تو دوسری آنکھ بھی خدا تعالیٰ کی
راہ میں نکلنے کے لئے تڑپ رہی ہے۔ اب کیا کوئی عقلمند
اس وقت قیاس کر سکتا تھا کہ اُن کی ایک آنکھ کا نکلنا
دین کو کوئی فائدہ پہنچا سکتا ہے۔ واقعہ یہی ہے کہ اُس
وقت یہ تمام قربانیاں بالکل بے کار نظر آتی تھیں لیکن
اگر عثمانؓ بن مظعون کی ایک آنکھ خدا تعالیٰ کے راستہ
میں نہ نکلتی۔ اگر عثمانؓ بن مظعون کی دوسری آنکھ خدا تعالیٰ
کی راہ میں نکلنے کے لئے تڑپ نہ رہی ہوتی۔ اگر عورتوں
کی شرمگاہوں میں نیزے نہ مارے جاتے۔ اگر مکّہ کے
ابتدائی دور میں صحابہؓ اپنی جانیں قربان نہ کرتے تو مسلمان
وہ قربانیاں کبھی پیش نہ کر سکتے جو انہوں نے بدر اور
اُحد کے موقعہ پر پیش کیں۔ وہ قربانیاں کبھی پیش نہ
کر سکتے جو انہوں نے احزاب کے موقعہ پر پیش کیں۔
یہی قربانیاں تھیں جنہوں نے اُن کے اندر جوش پیدا کیا۔
اُن کے اندر اخلاص پیدا کیا اور انہیں قربانی کے نہایت
اعلیٰ مقام پر لاکر کھڑا کر دیا۔ اِسی طرح بے شک وہاں
ہزاروں بکرے ذبح ہوتے ہیں جن کا گوشت بظاہر
ضائع چلا جاتا ہے اور اُس کو کھانے والا بھی کوئی نہیں
ہوتا مگر اسلام پھر بھی قربانیوں کا حکم دیتا ہے اور
فرماتا ہے کہ لَكُمْ فِيْهَا خَيْرٌ تمہارے لئے اس میں
خیر اور برکت رکھی گئی ہے۔ تمہیں ان قربانیوں کے
تسلسل کو ہمیشہ جاری رکھنا چاہیئے۔ اور ان دُور رَس
نتائج پر نظر رکھنی چاہیئے جو ان قربانیوں کے نتیجہ میں
پیدا ہوتے ہیں۔ اُس احمق بادشاہ کی طرح نہیں بننا
چاہیئے جس نے فوج کے خرچ کو بے مصرف قرار دیکر
اُسے توڑ دیا تھا۔ اور سمجھ لیا تھا کہ وقت آنے پر

لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَآؤُهَا وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْؕ

گوشت اور خون ہرگز اللہ (تعالیٰ) تک نہیں پہنچتے لیکن تمہارے دل کا تقویٰ اللہ (تعالیٰ) تک پہنچتا ہے۔

كَذٰلِكَ سَخَّرَهَا لَكُمْ لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا

(درحقیقت) اِس طرح اللہ (تعالیٰ) نے اِن قربانیوں کو تمہاری خدمت میں لگا دیا ہے تاکہ تم اللہ (تعالیٰ) کی ہدایت کی وجہ

قصاب یہ کام کریں گے۔ مگر نتیجہ یہ ہوُا کہ سارا ملک اس کے ہاتھ سے جاتا رہا۔ خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں ہمیں ایک ایسا واقعہ نظر آتا ہے۔ جس میں مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ نے یہی سبق دیا تھا کہ بعض دفعہ ایسی قربانی بھی کی جاتی ہے جس کا بظاہر کوئی فائدہ نظر نہیں آتا۔ مگر پھر بھی قوم کو قربانی میں حصّہ لینا پڑتا ہے۔ صلح حدیبیہ کے موقعہ پر جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مشرکین مکّہ سے صلح کر لی تو صحابہؓ کے اندر اِس قدر بے چینی پیدا ہوئی کہ حضرت عمرؓ جیسا آدمی بھی گھبرا گیا۔ اور انہوں نے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ یا رسول اللہ! کیا اللہ تعالےٰ نے آپ سے یہ نہیں کہا تھا کہ ہم حج کریں گے۔ آپؐ نے فرمایا۔ ٹھیک ہے۔ مگر یہ کب کہا تھا کہ اِسی سال کریں گے۔ غرض صحابہؓ کے لئے یہ ایک بہت بڑا صدمہ تھا جس سے انہیں دوچار ہونا پڑا۔ اِسی لئے جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اپنی قربانیاں یہیں ذبح کر دو تو وہ حیران ہوئے کہ ہمیں یہ کیا حکم دیا گیا ہے۔ قربانی تو مکّہ میں ہونی تھی اور پھر عمرہ یا حج کے بعد ہونی تھی۔ مگر ہمیں یہیں قربانی کرنے کا حکم دیا جا رہا ہے۔ جب ہم مکّہ گئے نہیں۔ خانہ کعبہ کا ہم نے طواف نہیں کیا۔ عمرہ یا حج نہیں کیا۔ تو قربانی کیسی۔ جب صحابہؓ قربانیاں کرنے میں متأمل ہوئے۔ تو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم اپنے گھر تشریف لے گئے اور اپنی ایک بیوی سے فرمایا کہ آج تیری قوم کو مَیں نے یہ حکم دیا تھا مگر اُس نے میری اس بات کو نہیں مانا۔ انہوں نے کہا یا رسول اللہ انہوں نے محبت کی کمی کی وجہ سے ایسا نہیں کیا بلکہ اِس صدمہ کا اُن کی طبیعتوں پر اسقدر اثر ہے کہ وہ اپنے حواس میں نہیں رہے۔ آپ اپنی قربانی کو ذبح کرنا شروع کر دیجیئے اور صحابہؓ سے کچھ نہ کہیں۔ پھر دیکھیں کہ اس کا کیا اثر ہوتا ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ بہت اچھا۔ آپؐ نے نیزہ ہاتھ میں لیا اور سیدھے اپنی قربانی کی طرف گئے۔ آپؐ کا اپنے اونٹ کو نیزہ مارنا تھا کہ صحابہؓ دیوانہ وار اُٹھے اور اپنی قربانیاں ذبح کرنے لگ گئے۔ اب دیکھو۔ یہ قربانی بظاہر بے معنے تھی۔ صحابہؓ مکّہ میں داخل نہیں ہوئے تھے۔ انہوں نے خانہ کعبہ کا طواف نہیں کیا تھا۔ انہوں نے عمرہ یا حج نہیں کیا تھا مگر پھر بھی انہوں نے اپنی قربانیاں ذبح کر دیں۔ ایسا کیوں ہوُا! صرف اس لئے کہ اللہ تعالیٰ یہ بتانا چاہتا تھا کہ اگر لوگ تمہیں بیت اللہ تک نہیں جانے دیتے تو یہاں انہوں نے تمہیں روک دیا ہے، تم وہیں قربانی کر دو اور سمجھ لو کہ یہی مقام خدا تعالےٰ کا گھر ہے۔ غرض یہ بھی بظاہر ایک بے مصرف قربانی تھی مگر محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ کو اس قربانی کا حکم دیا اور اس طرح بتا دیا کہ خواہ کوئی قربانی تمہیں کتنی ہی بے مصرف

هَدٰىكُمْ ؕ وَبَشِّرِ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۳۸﴾ اِنَّ اللّٰهَ يُدٰفِعُ

اس کی بڑائی بیان کرو۔ اور تو اسلام کے احکام کو پُوری طرح ادا کرنے والوں کو بشارت دے [۱] اللہ تعالیٰ یقیناً

عَنِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ

ان لوگوں کی طرف سے جو کہ ایمان لائے ہیں دفاع کرتا رہیگا۔ اللہ تعالیٰ یقیناً ہر خیانت کرنے والے (دادر)

دکھلائی دیتی ہو تمہارا کام بحث کا اظہار کرنا نہیں۔ تمہارا کام قربانیوں کی آگ میں اپنے آپ کو جھونک دینا ہے۔ تمہیں خدا نے اپنے دین کا سپاہی بنایا ہے۔ تمہارے ہاتھوں پر کفر اور شیطنت کی شکست مقدر ہے تم کام کرنے کے لئے پیدا کئے گئے ہو۔ پس تمہارا جرنیل تمہیں جو کچھ کہتا ہے تم کرو۔ اور جس طرف تمہیں لے جانا چاہتا ہے اُس کے پیچھے جاؤ۔ یہی رُوح ہے جس کے نتیجے میں تمہیں خیر اور برکت حاصل ہوگی اور جس کے بعد دنیا کی کوئی قوم تمہارے مقابلہ میں کھڑی نہیں ہوسکیگی۔

[۱] تفسیر:۔ یعنی یاد رکھو قربانیوں میں یہ حکمت نہیں کہ اُن کا گوشت یا اُن کا خون خدا تعالیٰ کو پہنچتا ہے۔ بلکہ اُن میں حکمت یہ ہے کہ ان کی وجہ سے تقویٰ پیدا ہوتا ہے اور وہ تقویٰ خدا تعالیٰ کو پسند ہے۔ بعض لوگ اعتراض کیا کرتے ہیں کہ کیا خدا تعالیٰ نعوذ باللہ ہندوؤں کے دیوتاؤں کی طرح خون کا پیاسا اور گوشت کا بھوکا ہے کہ وہ جانوروں کی قربانی کرنیکا حکم دیتا ہے۔ اور اُن کی جان کی قربانی کو شوق سے قبول فرماتا ہے اور قربانی کرنے والوں کو بہشت کی بشارت دیتا ہے۔ اِس کا جواب اللہ تعالیٰ نے اِس آیت میں یہ دیا ہے۔ کہ قربانیوں میں یہ حکمت نہیں کہ اُن کا گوشت یا اُن کا خون خدا تعالیٰ کو پہنچتا ہے بلکہ اِس میں حکمت یہ ہے کہ ان کی وجہ سے انسانی قلب میں تقویٰ پیدا ہوتا ہے اور وہ تقویٰ خدا تعالیٰ کو پسند ہے

پس وہ لوگ جو بکرے یا اونٹ یا گائے کی قربانی کرکے سمجھ بیٹھے ہیں کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کو پالیا وہ غلطی کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ صاف طور پر فرماتا ہے کہ یہ کوئی چیز نہیں کہ خود ہی جانور ذبح کیا اور خود ہی کھالیا۔ اِس سے اللہ تعالیٰ کو کیا۔ یہ تو تصویری زبان میں ایک حقیقت کا اظہار ہے جس کے اندر بڑی گہری حکمت پوشیدہ ہے۔ جیسے مصوّر ہمیشہ تصویریں بناتے ہیں۔ مگر اُن کی غرض صرف تصویر بنانا نہیں ہوتی بلکہ اُن کے ذریعہ قوم کے سامنے بعض اہم مضامین رکھنے ہوتے ہیں۔ چنانچہ کبھی وہ زنجیر بناتے ہیں جس سے مراد قومی اتحاد ہوتا ہے اور کبھی وہ طلوعِ آفتاب کا نظارہ دکھاتے ہیں اور اُس کا مطلب قومی ترقی ہوتا ہے۔ اِسی طرح یہ ظاہری قربانی بھی ایک تصویری زبان ہے جس کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ جانور ذبح کرنے والا اپنے نفس کی قربانی پیش کرنے کے لئے تیار ہے۔ پس جو شخص قربانی کرتا ہے وہ گویا اس امر کا اظہار کرتا ہے کہ مَیں خدا تعالیٰ کی راہ میں سب کچھ قربان کردونگا۔ اِس کے بعد دوسرا قدم یہ ہوتا ہے کہ انسان جس امر کا تصویری زبان میں اقرار کرے عملاً بھی اُسے پُورا کرکے دکھا دے۔ کیونکہ محض نقل جس کے ساتھ حقیقت نہ ہو کسی عزت کا موجب نہیں ہوسکتی۔ آخر تھیئٹر والوں کو شرفاء کیوں ناپسند کرتے ہیں۔ اِسی لئے کہ تھیئٹر میں جو نقّال بادشاہ بنتے ہیں اُن کی کوئی حقیقت نہیں ہوتی۔ لیکن حقیقی بادشاہ کی سب لوگ عزت کرتے ہیں

تھیٹر میں بادشاہ بننے والا اگر عملی زندگی میں بھی اس کیلئے
جدوجہد کرے تو اُسے بُرا نہیں سمجھا جائیگا لیکن محض نقل
کسی عزت کا موجب نہیں ہوسکتی۔ اِسی طرح جو شخص
بکرے کی قربانی کے ساتھ اپنے نفس کی قربانی بھی کرتا
ہے وہ شرفاء کے نزدیک قابلِ احترام ہے۔ لیکن جو شخص
صرف بکرے کی قربانی پر اکتفاء کرتا ہے وہ نقال اور بھانڈ
ہے اور اس لئے کسی عزت کا مستحق نہیں۔

پھر اگر غور کرکے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ سوائے
اُن قصابوں کے جو جانوروں کو روزانہ ذبح کرنے کے
عادی ہو چکے ہوتے ہیں دوسرے لوگوں کی طبیعت پر
جانور کو ذبح ہوتے دیکھ کر ایک گہرا اثر پڑتا ہے اور
اُن کے خیالات میں ایک زبردست ہیجان پیدا ہو جاتا
ہے۔ حتّٰی کہ اِسی اثر کے ماتحت بعض قوموں نے قربانی کو
ظلم قرار دیدیا ہے۔ اُن کا یہ فعل تو کمزوری کی علامت
ہے۔ مگر اس میں کوئی شبہ نہیں کہ قربانی کا اثر طبیعت پر
ضرور پڑتا ہے۔ اور اسی اثر کو پیدا کرنے کے لئے قربانی
کو عبادت میں شامل کیا گیا ہے۔ گویا قربانی کے ذریعہ
سے ہر انسان اس امر کا اقرار کرتا ہے کہ جس طرح یہ
جانور جو مجھ سے ادنیٰ ہے میرے لئے قربان ہوا ہے
اِسی طرح میں بھی اقرار کرتا ہوں کہ اگر مجھ سے اعلیٰ
چیزوں کے لئے مجھے اپنی جان دینی پڑے گی تو میں بھی
خوشی سے اپنی جان دے دوں گا۔ اب غور کرو۔ جو
شخص قربانی کی اس حکمت کو سمجھ کر قربانی کرتا ہے اسکی
طبیعت پر اس کا کس قدر گہرا اثر پڑے گا اور کس طرح
وہ اپنے اس فرض کو یاد رکھیگا جو اُس کے پیدا کرنیوالے
کی طرف سے اُس پر عائد ہوتا ہے۔ اِس ذبح کی یاد
ہمیشہ اس کے دل میں تازہ رہے گی اور اس کا دل اُسے
کہتا رہیگا کہ دیکھ تُو نے اپنے ہاتھوں سے بکرے کو ذبح
کرکے اس امر کا اقرار کیا تھا کہ ادنےٰ چیز اعلیٰ کے لئے
قربان کی جاتی ہے۔ اب تجھے بھی اس قربانی کے لئے تیار
رہنا چاہیئے جو صداقتوں کے قیام کے لئے یا بنی نوع انسان
کی تکالیف کے دُور کرنے کیلئے تجھے کرنی پڑیں۔ یہی مضمون
اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں بیان فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ
کو نہ تمہاری قربانیوں کا گوشت پہنچتا ہے نہ خون۔
بلکہ اللہ تعالیٰ کو وہ ارادۂ نیک پہنچتا ہے جو خشیت اللہ
کو مدّنظر رکھ کر تم نے کیا تھا۔ یعنی اگر تم اس غرض کو
پُورا کروگے جس کے لئے تم نے قربانی کی ہے تو فائدہ ہوگا
ورنہ صرف گوشت کھانے اور خون بہانے کا کام تم
سے ہُوا ہے جس کا کوئی حقیقی فائدہ نہیں۔

اس آیت سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اسلامی
تعلیم کی رو سے کسی عمل کی ظاہری شکل نتیجہ پیدا نہیں
کرتی بلکہ قربانی کی وہ رُوح نتیجہ پیدا کرتی ہے جو اس
عمل کے پس پُشت کام کر رہی ہوتی ہے پس حالات
کے اختلاف کی وجہ سے بعض دفعہ عمل کی ظاہری
شکل میں جو اختلاف پیدا ہو جاتا ہے وہ کسی شخص کو
ترقی سے روکتا نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ نتیجہ کے وقت اس
کی قربانی کی رُوح کو مدّنظر رکھ کر اس کے مطابق فیصلہ
کرتا ہے۔ مثلاً ایک شخص کے پاس دس ہزار روپیہ ہو
اور وہ اس میں سے سو روپیہ غرباء میں تقسیم کردے۔
اور ایک شخص جس کے پاس صرف دس روپے ہوں وہ
اُن میں سے پانچ روپے دے دے تو نتیجہ پانچ اور
سَو کے مطابق نہیں نکلے گا۔ بلکہ یہ دیکھا جائے گا کہ
دونوں کو کتنی ضرورتیں تھیں اور اُن ضرورتوں میں انہوں نے
کس قدر قربانی کی یا دونوں کے لئے صدقہ کا محرّک
کونسی بات ہوئی اور اُن میں سے زیادہ بہتر کونسی ہے
اور جب بدلہ اِس اصل کے ماتحت ملے تو ظاہری
اختلاف کے باوجود کسی شخص کو کوئی نقصان نہیں
پہنچ سکتا جس طرح محض جانوروں کی قربانی کوئی فائدہ

نہیں پہنچاتی بلکہ خدا تعالیٰ کو وہ اخلاص پہنچتا ہے جس کے
ماتحت قربانی کی جاتی ہے۔ اور وہ محبتِ الٰہی پہنچتی ہے
جو اس قربانی کی محرک ہوتی ہے۔ جس کے پاس تقوٰی
ہو اُس کی اٹھنی بھی اُس شخص کے سو روپے سے
زیادہ قیمت رکھتی ہے جو تقوٰی سے خالی ہو۔ کیونکہ
قرآن کریم نے یہ اصول بیان کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ خون
اور گوشت کو نہیں دیکھتا بلکہ قربانی کرنے والے کی
نیّت کو دیکھتا ہے۔ ایک امیر آدمی آسانی کے ساتھ
سو اونٹ یا سو دُنبے خدا تعالیٰ کی راہ میں ذبح کر سکتا
ہے۔ لیکن ایک غریب آدمی جو سال بھر قربانی کے لئے
پیسے جمع کرتا رہتا ہے اور جس کا ایک ایک دن اس
حسرت میں گذرتا ہے کہ کاش میرے پاس اتنی رقم جمع
ہو جائے کہ مَیں ایک دفعہ عید کے موقع پر قربانی کر کے
اُس کا کچھ گوشت خدا کی راہ میں تقسیم کر دوں اور کچھ
گوشت اپنے دوستوں کو تحفۃً پیش کروں۔ وہ اگر سال
بھر کی محنت اور تگ و دو کے بعد ایک معمولی سی بکری
یا چھوٹی سی دُنبی قربان کرتا ہے تو کیا تم سمجھتے ہو کہ
خدا تعالیٰ اس کی معمولی سی بکری یا چھوٹی سی دُنبی کو
ردّ کر دے گا اور اس امیر کے موٹے تازے دُنبوں کو
قبول کرے گا۔ اگر خدا تعالیٰ انسانی عمل پر فیصلہ کرتا تو
یقیناً اُس امیر کے موٹے تازے دُنبے قبول کر لئے جاتے
اور اس غریب کی معمولی سی بکری یا چھوٹی سی دُنبی ردّ کر دی
جاتی۔ مگر اللہ تعالیٰ کا فیصلہ انسانی اعمال پر نہیں ہوگا۔
بلکہ وہ فرماتا ہے يَنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ۔ خدا تعالیٰ کے
حضور قربانی کا گوشت اور خون نہیں پہنچتا بلکہ تمہارے دلی
جذبات اُس تک پہنچتے ہیں یعنی اُن کے مطابق فیصلہ ہوتا
ہے۔ اگر اُس کے پاس گوشت اور خون پہنچا کرتا۔ تو وہ
اچھا گوشت پسند کر لیتا اور وہ اُن قربانیوں کو قبول
کر لیتا جن میں بہت زیادہ خون بہایا گیا ہو۔ مگر وہ فرماتا ہے
ہمارے پاس اِن چیزوں میں سے کوئی چیز نہیں پہنچتی۔ ہمارے
پاس تو قربانی کے پیچھے جو نیّت ہوتی ہے وہ پہنچا کرتی
ہے۔ اگر ایک چھوٹی سی دُنبی ذبح کرنے والے کی نیّت بہت
اعلیٰ تھی اور دو سو بڑے بڑے دُنبے ذبح کرنے والے
کی نیّت ایسی اعلیٰ نہیں تھی تو قیامت کے دن جس نے
دو سو دُنبے ذبح کئے ہونگے اگر اُس کے ساتھ اعلیٰ
اخلاص نہ ہوگا تو اُس کے ساتھ دو سو دُنبے نہیں ہونگے
بلکہ ایک مریل سی دُنبی ہوگی۔ اور جس نے ایک چھوٹی سی
دُنبی ذبح کی تھی اگر اُس نے اعلیٰ اخلاص اور محبت کے
ساتھ یہ قربانی کی تھی تو قیامت کے دن اس کے ساتھ
ایک چھوٹی سی دُنبی نہیں ہوگی بلکہ ہزارہا موٹے تازے
دُنبے ہونگے۔ کیونکہ اُس جہان میں سب کی سب چیزیں
نیّت کے تابع ہو جاتی ہیں۔

یہ تو روحانی نقطۂ نگاہ سے قربانیوں کی حقیقت
بیان کی گئی ہے۔ مادی لحاظ سے غور کرو تو تمہیں معلوم
ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے جسقدر اشیاء دنیا میں پیدا کی ہیں۔
اُن میں سے ہر ایک کا ایک چھلکا ہوتا ہے اور ایک مغز
ہوتا ہے۔ دنیا میں کوئی مغز ایسا نہیں جو بغیر چھلکے کے
ہو۔ اور کوئی چھلکا ایسا نہیں جس کے اندر مغز نہ ہو۔
یہی کیفیت روحانی اعمال کی بھی ہے مثلاً نماز میں قیام
اور قعود اور رکوع اور سجود ایک چھلکا ہیں۔ لیکن وہ رُوحانی
اثر جو اس قیام و قعود اور رکوع و سجود کے نتیجہ میں پیدا
ہوتا ہے وہ مغز ہے۔ قربانیوں میں بھی کسی جانور کو ذبح
کرنا ایک قشر ہے لیکن وہ اخلاص جو اس قربانی کے پیچھے
کام کر رہا ہوتا ہے وہ مغز ہوتا ہے۔ اِسی لئے خدا تعالیٰ
نے فرمایا ہے کہ تمہاری قربانیوں کے گوشت اور خون خدا
تک نہیں پہنچتے بلکہ تمہارا تقوٰی خدا تک پہنچتا ہے۔ ممکن
ہے کوئی شخص کہے کہ اگر تقوٰی ہی کی ضرورت تھی تو پھر
جانور کیوں قربان کروائے جاتے ہیں۔ اِسکا ایک جواب

ع ۵ ۱۲

خَوَّانٍ كَفُوْرٍ ﴿۳۹﴾ اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا ؕ

انکار کرنیوالے کو پسند نہیں کرتا ۸؎ وہ لوگ جن سے (بلا وجہ) جنگ کی جارہی ہے، انکو بھی (جنگ کرنیکی) اجازت دی جاتی ہے کیونکہ

وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰى نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرُ ﴿۴۰﴾ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ

اُن پر ظلم کیا گیا ہے اور اللہ (تعالیٰ) اُنکی مدد پر قادر ہے۔ (یہ وہ لوگ ہیں) جن کو ان کے گھروں سے صرف ان کے اتنا

دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ اِلَّاۤ اَنْ يَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ؕ وَلَوْلَا دَفْعُ

کہنے پر کہ اللہ ہمارا رب ہے بغیر کسی جائز وجہ کے نکالا گیا۔ اور اگر اللہ (تعالیٰ) اُن (یعنی کفار) میں سے

اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَّ

بعض کو بعض کے ذریعہ سے (شرارت سے) باز نہ رکھتا تو گرجے اور یہودیوں کی عبادتگاہیں اور مسجدیں جن میں

صَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا ؕ وَلَيَنْصُرَنَّ

اللہ (تعالیٰ) کا کثرت سے نام لیا جاتا ہے برباد کردیئے جاتے۔ اور اللہ (تعالیٰ) یقیناً اُس کی

اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيْزٌ ﴿۴۱﴾ اَلَّذِيْنَ اِنْ

مدد کریگا جو اُس (کے دین) کی مدد کریگا۔ اللہ (تعالیٰ) یقیناً بہت طاقتور (اور) غالب ہے۔ یہ (یعنی مہاجر مسلمان) وہ

مَّكَّنّٰهُمْ فِى الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا

لوگ ہیں کہ اگر ہم ان کو دنیا میں طاقت بخشیں تو وہ نمازوں کو قائم کرینگے اور زکوٰتیں دیں گے اور نیک باتوں کا حکم دینگے

تو یہی ہے کہ ہر مغز اپنے ساتھ قشر بھی رکھتا ہے اور دوسرا جواب یہ ہے کہ یہ قشر بے فائدہ چیز نہیں بلکہ غرباء کے کام آنے والی چیز ہے۔ چونکہ غرباء عام طور پر اس مقوی خوراک سے محروم رہتے ہیں اس لئے اللہ تعالیٰ نے ایک صدقہ اس قسم کا بھی جاری کر دیا جس میں جانوروں کی قربانی کی جاتی ہے۔ تاکہ غرباء کے دل بھی نہ ترستے رہیں اور وہ اس مقوی غذا سے اپنی مالی تنگی کی وجہ سے محروم نہ رہیں۔ چنانچہ فرماتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان قربانیوں پر تم کو اس لئے ملکیت بخشی ہے تاکہ تم خدا تعالیٰ کی ہدایت کے مطابق ان پر خدا تعالیٰ کا نام لیتے رہو اور غریبوں کی پرورش کرتے رہو اور یاد رکھو کہ جو خدا تعالیٰ کے احکام کی تعمیل کریں انکو بڑے بڑے انعام ملتے ہیں۔

۱۸؎ تفسیر:- فرماتا ہے مومنوں کو ڈرنا نہیں چاہیئے خدا تعالیٰ خود انکی طرف سے اُنکے دشمنوں سے لڑیگا اور انہیں اُن کی کوششوں میں ناکام کریگا۔ لیکن انہیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ جو لوگ خائن ہوتے ہیں اسی طرح وہ لوگ جو خدا تعالیٰ کی دی ہوئی نعمتوں کے باوجود ناشکرے ہوتے ہیں

بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ؕ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ ﴿۴۱﴾

اور بُری باتوں سے روکیں گے ۔ اور سب کاموں کا انجام خدا کے ہاتھ میں ہے ۔

وَاِنْ يُّكَذِّبُوْكَ فَقَدْ كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوْحٍ وَّ

اور اگر (یہ دشمن) تجھے جھٹلاتے ہیں تو اِن سے پہلے نوحؑ کی قوم نے بھی اور عاد

عَادٌ وَّثَمُوْدُ ۙ﴿۴۲﴾ وَقَوْمُ اِبْرٰهِيْمَ وَقَوْمُ لُوْطٍ ﴿۴۳﴾ وَّاَصْحٰبُ

اور ثمود نے بھی اور ابراہیمؑ کی قوم نے بھی اور لوطؑ کی قوم نے بھی اور مدین کے

مَدْيَنَ ۚ وَكُذِّبَ مُوْسٰى فَاَمْلَيْتُ لِلْكٰفِرِيْنَ ثُمَّ

اصحاب نے بھی (اپنے نبیوں کو) جھٹلایا تھا اور موسیٰؑ کی تکذیب بھی کی گئی تھی پس میں نے انکار کرنے والوں کو کچھ ڈھیل دی

اَخَذْتُهُمْ ۚ فَكَيْفَ كَانَ نَكِيْرِ ﴿۴۴﴾ فَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ

پھر انکو پکڑ لیا ۔ پس (سوچو کہ) میرا انکار کیسا خطرناک تھا ۔ اور کتنی ہی بستیاں ہیں جن کو ہم نے

اَهْلَكْنٰهَا وَهِيَ ظَالِمَةٌ فَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا وَ

اِس حالت میں ہلاک کیا تھا کہ وہ ظلم کر رہی تھیں وہ آج اپنی چھتوں پر گری پڑی ہیں ۔ اور کتنے

بِئْرٍ مُّعَطَّلَةٍ وَّقَصْرٍ مَّشِيْدٍ ﴿۴۵﴾ اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا

کنوئیں ہیں جو بالکل متروک ہیں اور کتنے اونچے اونچے قلعے ہیں جو بالکل تباہ ہو چکے ہیں ۔ کیا وہ زمین پر چل کر

فِي الْاَرْضِ فَتَكُوْنَ لَهُمْ قُلُوْبٌ يَّعْقِلُوْنَ بِهَا اَوْ

نہیں دیکھتے تاکہ اُن کو ایسے دل حاصل ہو جائیں جو (ان باتوں کو) سمجھنے والے ہوں یا

اٰذَانٌ يَّسْمَعُوْنَ بِهَا ۚ فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ

کان حاصل ہو جائیں جو (ان باتوں کو) سننے والے ہوں ۔ کیونکہ اصل بات یہ ہے کہ ظاہری آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں

یعنی اپنے اموال کو غریبوں پر خرچ نہیں کرتے ۔ اللہ تعالیٰ ان کو پسند نہیں کرتا بلکہ انہی کو پسند کرتا ہے جو خدا تعالیٰ کی دی ہوئی نعمتوں کو مختلف طریقوں سے بنی نوع انسان پر خرچ کرتے رہتے ہیں ۔ مثلاً قربانیوں کا گوشت

وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِيْ فِي الصُّدُوْرِ ﴿۴۷﴾ وَ

بلکہ دل جو سینوں میں ہیں اندھے ہوتے ہیں - ۱۹ یہ لوگ

کھلا کر یا کپڑے وغیرہ دے کر یا اور مختلف ذرائع کو۔

۱۹ حل لغات: اَلصَّوَامِعُ: اَلصَّوْمَعَةُ کی جمع ہے۔ مفردات میں ہے۔ اَلصَّوْمَعَةُ كُلُّ بِنَاءٍ مُتَصَمِّعِ الرَّأْسِ اَیْ مُتَلَاصِقَةٌ۔ ہر ایک عمارت جس کے اوپر گنبد بنا ہوا ہو۔ اقرب میں ہے کہ اَلصَّوْمَعَةُ کا لفظ راہب کے منارہ پر بولا جاتا ہے۔

بِيَعٌ : بِيْعَةٌ کی جمع ہے۔ اور اَلْبِيْعَةُ کے معنے ہیں مَعْبَدُ النَّصَارٰی۔ عیسائیوں کی عبادت گاہ۔

صَلَوٰتٌ : یہودیوں کے کنیسہ کو کہتے ہیں۔

مَكَّنَّا :- مَكَّنَ سے جمع متکلم کا صیغہ ہے۔ اور مَكَّنَهُ مِنَ الشَّيْءِ کے معنے ہیں۔ جَعَلَ لَهٗ عَلَيْهِ سُلْطَانًا وَقُدْرَةً۔ اُسے کسی چیز پر غلبہ اور قدرت دیدی۔ پس اِنْ مَكَّنَّا کے معنے ہونگے اگر ہم غلبہ دیدیں۔

نَكِيْرٌ نَكِيْرٌ کے معنے ہیں۔ اَیْ نَكَارٌ۔ انکار۔ اور نَكِيْرِیْ کے معنے ہیں۔ میرا انکار۔

مُعَطَّلَةٌ : عَطَّلَ الْبِئْرَ کے معنے ہیں تَرَكَ وِرْدَهَا کنوئیں پر جانا چھوڑ دیا۔ وَكُلُّ مَا تُرِكَ ضَائِعًا فَقَدْ عُطِّلَ۔ اور ہر وہ چیز جس کی نگرانی چھوڑ دی جائے اور وہ ضائع ہو جائے اس کیلئے عُطِّلَ کا لفظ بولتے ہیں (اقرب) پس بِئْرٌ مُعَطَّلَةٌ کے معنے ہونگے۔ ایسے کنوئیں جن پر کوئی نہ جاتا ہو۔

مَشِيْدٌ مَشِيْدٌ کے معنے ہیں هُوَ مَا طُلِيَ بِالشِّيْدِ وَقِيْلَ هُوَ الْمَرْفُوْعُ الْمُطَوَّلُ۔ وہ عمارت جو چونہ گچ ہو یا بلند و بالا ہو (اقرب)

تفسیر:- ان آیات میں وہ اصول بیان کئے گئے ہیں جن کے ماتحت مسلمانوں کو مخصوص حالات میں اللہ تعالیٰ نے دفاعی جنگ کی اجازت دی ہے اسلام عیسائیت کی طرح یہ نہیں کہتا کہ اگر کوئی شخص تمہارے ایک گال پر تھپڑ مارے تو اپنا دوسرا گال بھی اس کی طرف پھیر دو (متی باب ۵ آیت ۳۹) بلکہ وہ یہ کہتا ہے کہ اگر کوئی شخص تم پر ظالمانہ حملہ کرے۔ یعنی بغیر کسی گناہ کے تمہیں اپنے گھروں سے نکال دے صرف یہ کہنے کی وجہ سے کہ اللہ ہمارا رب ہے تو تم اس کا مقابلہ کرو۔ اور یہ نہ سمجھو کہ ہم تھوڑے ہیں۔ کیونکہ اگر تم مظلوم ہو تو خدا تعالیٰ تمہاری مدد کے لئے آئیگا اور وہ تمہاری مدد کرنے پر قادر ہے۔ اور یاد رکھو کہ یہ حکم دنیا میں امن قائم رکھنے کے لئے ہے۔ اگر ہم یہ حکم دے کر ایک قوم کو انصاف قائم کرنے کے لئے کھڑا نہ کر دیتے تو عیسائیوں کے گرجے اور یہودیوں کی عبادت گاہیں اور مسلمانوں کی مسجدیں جن میں اللہ تعالیٰ کا نام بڑی کثرت سے لیا جاتا ہے سب گرا دی جاتیں۔ پس جو مسلمان دین میں دخل اندازی کرنے والی جنگ کے مقابلہ کے لئے کھڑا ہو جاتا ہے وہ درحقیقت اپنی مدد نہیں کرتا بلکہ اُن کی مدد کرتا ہے کیونکہ وہ صرف اپنے مذہب کا دفاع نہیں کرتا بلکہ سب مذاہب کا دفاع کرتا ہے۔ پس لازماً اللہ تعالیٰ بھی اس کی مدد کرے گا۔ اور چونکہ اللہ تعالیٰ قوی اور غالب ہے ایسا مسلمان بھی قوی اور غالب ہو جائیگا۔ کیونکہ ایسا مسلمان اس ارادہ سے کھڑا ہوتا ہے کہ اگر اس کو طاقت ملیگی تو نماز باجماعت بھی قائم کریگا اور زکوٰۃ بھی دیگا۔ اور نیک باتوں کا حکم بھی دیگا اور بُری باتوں سے بھی روکیگا اور چونکہ یہ سب امور اللہ تعالیٰ کے منشاء کے مطابق ہیں اور ساری باتوں کا نتیجہ خدا تعالیٰ نکالتا ہے اس لئے جو شخص خدا تعالیٰ کے منشاء پر چلے گا وہی جیتے گا۔

يَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ وَلَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ وَعْدَهٗ

عذاب منگنے میں جلدی کرتے ہیں - اور اللہ (تعالےٰ) کبھی اپنا وعدہ جھوٹا نہیں کرتا۔

وَاِنَّ يَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَاَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ ﴿۴۸﴾

اور (کوئی کوئی) دن خدا کے نزدیک تمہاری گنتی کے ہزار سالوں کے برابر ہوتا ہے۔

وَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَمْلَيْتُ لَهَا وَهِيَ ظَالِمَةٌ ثُمَّ

اور کتنی ہی بستیاں ہیں جن کو (پہلے) تو میں نے مہلت دی حالانکہ وہ ظلم کر رہی تھیں۔ پھر

اور یہ نہیں ڈرنا چاہیئے کہ مخالفت سخت ہے۔ سچائی کی مخالفت نوحؑ اور عادؔ اور ابراہیم کے زمانے سے چلی آئی ہے۔ مگر ہمیشہ ہی سچائی جیتتی ہے۔ اور اس کے مخالفوں کی تباہی کے نشان اب تک دنیا میں موجود ہیں۔ پس ان نشانوں کو دیکھو اور فائدہ اٹھاؤ۔ کیونکہ اصل دیکھنا دل کا کام ہے آنکھوں کا کام نہیں۔

ان آیات سے جو مسلمانوں کو جنگ کی اجازت دینے کے لئے نازل ہوئی ہیں ظاہر ہے کہ اسلامی تعلیم کی رُو سے جنگ کی اجازت صرف اُسی صورت میں ہوتی ہے جب کوئی قوم دیر تک کسی دوسری قوم کے ظلموں کا تختۂ مشق بنی رہے اور ظالم قوم اُسے رَبُّنَا اللّٰهُ کہنے سے روکے۔ یعنی اُس کے دین میں دخل دے اور وہ جبراً اسلام سے لوگوں کو پھرائے یا اُس میں داخل ہونے سے جبراً باز رکھے اور اس میں داخل ہونے والوں کو صرف اسلام قبول کرنے کے جرم میں قتل کرے۔ اُس قوم کے سوا کسی دوسری قوم سے جہاد نہیں ہو سکتا۔ لیکن اگر جنگ ہوگی تو صرف سیاسی اور ملکی جنگ ہوگی۔ جو دو مسلمان قوموں میں بھی ہو سکتی ہے مگر اس کا نام جہاد نہیں رکھا جا سکتا اور اس جنگ میں شامل ہونا ہر مسلمان کا فرض نہیں ہوگا بلکہ صرف اُنہی مسلمانوں کا فرض ہوگا جو اُس لڑنے والی حکومت میں بس رہے ہوں۔ کیونکہ یہ جنگ حب الوطنی کی جنگ کہلائے گی۔ دینی جنگ نہیں کہلائے گی۔ اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ حُبُّ الْوَطَنِ مِنَ الْاِيْمَانِ یعنی وطن کی محبت بھی ایمان کا ایک حصہ ہے۔

پھر بتایا کہ ایسی مظلوم قوم کا فرض ہوتا ہے کہ جب اُسے طاقت ملے تو وہ تمام مذاہب کی حفاظت کرے۔ اور اُن کی مقدس جگہوں کے ادب اور احترام کا خیال رکھے اور اس غلبہ کو اپنی طاقت اور قوت کا ذریعہ نہ بنائے بلکہ غریبوں کی خبر گیری، ملک کی حالت کی درستی اور فتنہ و شرارت کے مٹانے میں اپنی قوتیں صرف کرے۔ کیونکہ اسلام دنیا میں بطور شاہد اور محافظ کے آیا ہے نہ کہ بطور جابر اور ظالم کے۔

وہ لوگ جو اسلامی جہاد پر اعتراض کیا کرتے ہیں۔ انہیں سوچنا چاہیئے کہ کیا اس قسم کی لڑائی مسلمانوں کے اختیار میں ہے کہ جب اُن کا جی چاہے شروع کر دیں اور کفار کو قیدی بنانا شروع کر دیں۔ اس قسم کی جنگ کی ابتداء تو دشمن کی طرف سے ہی ہو سکتی ہے اور جب اُس سے بچنا اُس کے اختیار میں ہے تو اس کے بعد بھی اگر وہ ایسی جنگ کرتا ہے اور جبراً دوسروں کا مذہب اُن سے بدلوانا چاہتا ہے۔ تو یا تو وہ پاگل ہے اور یا

ع ۱۴

أَخَذْتُهَا ۚ وَإِلَيَّ الْمَصِيرُ ﴿٤٩﴾ قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّمَا

میں نے اُن کو پکڑ لیا۔ اور میری ہی طرف سبؓ لوٹ کر آنا ہے۔ تو کہدے۔ اے لوگو! میں تمہاری طرف

أَنَا لَكُمْ نَذِيرٌ مُبِينٌ ﴿٥٠﴾ فَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا

صرف ایک ہوشیار کرنیوالے کی حیثیت سے آیا ہوں۔ پس جو ایمان لائیں گے اور (اس کے) مناسب حال

الصَّالِحَاتِ لَهُمْ مَغْفِرَةٌ وَرِزْقٌ كَرِيمٌ ﴿٥١﴾ وَالَّذِينَ

عمل کریں گے انہیں (خدا تعالیٰ کی) بخشش اور معزز رزق حاصل ہوگا۔ اور وہ لوگ

سَعَوْا فِي آيَاتِنَا مُعَاجِزِينَ أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ الْجَحِيمِ ﴿٥٢﴾

جنہوں نے ہمارے نشانوں کے متعلق (اس غرض سے) جد و جہد کی کہ وہ ہم کو) عاجز کردیں وہ لوگ جہنم میں پڑنے والے ہیں ۲۰؎

اس قابل ہے کہ اُسے سزا دی جائے کیونکہ اُسے اختیار تھا کہ وہ حملہ نہ کرتا۔ اسے اختیار تھا کہ وہ دوسروں پر ظلم نہ کرتا اُسے اختیار تھا کہ وہ دین کیلئے جنگ نہ کرتا اور اِس طرح اپنے آپکو ہلاکت اور بربادی سے بچالیتا۔

اِس جگہ یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ اِنَّ اللّٰہَ یُدَافِعُ عَنِ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کے بعد اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقَاتَلُوْنَ بِاَنَّھُمْ ظُلِمُوْا پر یہ اعتراض پڑتا تھا کہ جب بندے خود کفار سے لڑے تو خدا تعالیٰ نے کس طرح دفاع کیا؟ اِن آیات میں اِس کا یہ جواب دیا گیا ہے کہ گو بظاہر مومن لڑیں گے لیکن وہ بھی اور دوسرے لوگ بھی جانتے ہیں کہ وہ کمزور ہیں جیت نہیں سکتے۔ پس اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی نَصْرِھِمْ لَقَدِیْرٌ فرما کر بتایا کہ اصل لڑائی اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ہوگی۔ مومن تو اس کا صرف ایک ہتھیار ہونگے جن سے وہ کام لیگا۔ فتح دینا اُس کے اختیار میں ہوگا۔ اور وہ فتح دیگا اور یہ اس بات کا ثبوت ہوگا کہ یہ لڑائی خدا نے لڑی ہے۔ نہ کہ انسانوں نے۔

پھر اگلی آیات میں بھی فرما دیا کہ وَلَیَنْصُرَنَّ اللّٰہُ مَنْ یَّنْصُرُہٗ کہ جو لوگ خدا تعالیٰ کے دین کی تائید کے لئے کھڑے ہو جاتے ہیں اللہ تعالیٰ اُن کی مدد کیا کرتا ہے۔ گویا باوجود مومنوں کے لڑنے کے اصل دفاع اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہی رہا۔

اَمْلَیْتُ

۲۰؎ حل لغات۔ اَمْلَیْتُ۔ اَمْلٰی سے واحد متکلم کا صیغہ ہے۔ اور اَمْلٰی کے معنے ہوتے ہیں اَمْھَلَہٗ۔ اُس کو مہلت دی (اقرب) پس اَمْلَیْتُ کے معنے ہونگے۔ میں نے اُن کو مہلت دی۔

تفسیر:۔ فرماتا ہے۔ حق کے مخالف ہمیشہ عذاب کے متعلق جلد بازی کیا کرتے ہیں۔ مگر اُن کے اِس فریب میں نہیں آنا چاہیئے کیونکہ خدا کا ایک دن تو ہزار سال کے برابر ہے۔ وہ آہستہ آہستہ عذاب لاتا ہے۔ چنانچہ پہلے لوگوں کو بھی دیکھو کہ انہوں نے صداقتوں کا انکار کیا مگر فوراً تباہ نہ ہوئے پھر ایک دن خدا کا عذاب آگیا اور وہ تباہ ہوگئے۔ اِس آیت میں اِنَّ یَوْمًا عِنْدَ رَبِّکَ کَاَلْفِ

سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ فرما کر جہاں اللہ تعالیٰ نے عذاب کی شدت کا ذکر کیا ہے اور بتایا ہے کہ تم تو عذاب مانگ رہے ہو مگر جب وہ آیا تو تمہاری یہ حالت ہو گی کہ تمہیں عذاب کی ایک گھڑی ہزار برس کے برابر معلوم ہو گی۔ اور تمہیں اس سے چھٹکارے کی کوئی صورت نظر نہیں آئے گی۔ وہاں اللہ تعالیٰ نے ان الفاظ میں اس ہزار سالہ دَور کا بھی ذکر فرمایا ہے جس میں کفر کو پھر اپنا سر اٹھانے کا ایک موقع ملنا تھا اور فرمایا ہے کہ تم عذاب کے لئے جلدی نہ کرو۔ اللہ تعالیٰ ابھی تمہیں ایک ہزار سال تک اور ڈھیل دینا چاہتا ہے تاکہ وہ دیکھے کہ تم کیسے اعمال بجا لاتے ہو۔ جب یہ ہزار سالہ دَور گذر جائیگا تو تمہیں اپنی بداعمالیوں کی ایسی سزا ملیگی جو نہایت عبرت ناک ہو گی اور جس کے نتیجہ میں کفر کی صف ہمیشہ کے لئے لپیٹ دی جائیگی۔ سورۃ طٰہٰ میں بھی اللہ تعالیٰ کفر کی اس تباہی کا ذکر کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ يَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ وَنَحْشُرُ الْمُجْرِمِيْنَ يَوْمَئِذٍ زُرْقًا ۚ يَّتَخَافَتُوْنَ بَيْنَهُمْ اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا عَشْرًا (طٰہٰ ع ۵) یعنی جس دن کہ بگل بجایا جائیگا اُس دن ہم مجرموں کو اس حالت میں اٹھائیں گے کہ اُن کی آنکھیں نیلی ہونگی۔ اور وہ آپس میں آہستہ آہستہ باتیں کرتے ہوئے کہیں گے کہ تم تو صرف دس صدیاں اس دنیا میں رہے ہو۔

اس آیت میں مشرکوں کو نیلی آنکھوں کے ساتھ اٹھائے جانے سے اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ اُس زمانہ میں شرک زیادہ تر نیلی آنکھوں والی قوموں یعنی یورپین اور امریکن لوگوں میں ہو گا۔ اور یہ لوگ صرف دس سو سال تک دنیا میں حکومت کرنے کی طاقت پائیں گے۔ چنانچہ تیسری صدی سے ان لوگوں نے ترقی کرنی شروع کی اور چودھویں صدی میں آکر یعنی دس سو سال گذرنے کے بعد ان پر زوال آنا شروع ہو گیا۔ تاریخ سے ثابت ہے کہ ۲۷۱ھ میں عیسائیوں نے سر اٹھانا شروع کیا تھا۔ جس کی طرف سورۂ رعد کے ابتداء میں ہی الٓمّٓرٰ کے الفاظ میں اشارہ کیا گیا تھا۔ ۲۷۱ میں دس صدیاں شامل کی جائیں تو ۱۲۷۱ بن جاتا ہے۔ اب سن عیسوی نکالنے کے لئے ۱۲۷۱ میں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ سے پہلے کے ۶۲۱ سال شامل کئے جائیں تو ۱۸۹۲ بن جاتے ہیں۔ اور چونکہ سورۂ رعد مکی سورۃ ہے جو ہجرت سے دو تین سال پہلے نازل ہوئی تھی اس لئے ۱۸۹۲ سے اگر دو سال نکالے جائیں تو ۱۸۹۰ اور تین سال نکالے جائیں تو ۱۸۸۹ رہ جاتے ہیں اور ۱۸۸۹ء ہی وہ سال ہے جس میں حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے لوگوں سے بیعت لی اور عیسائیت کی تباہی کی بنیاد رکھ دی گئی۔ چنانچہ دیکھ لو عیسائی حکومتوں میں سے سب سے بڑی حکومت انگلینڈ کی تھی۔ لیکن جب وہ زمانہ ختم ہو گیا اور اُن کی تباہی کا زمانہ آگیا تو ہندوستان سے وہ اس طرح بھاگے کہ اب ہندوستان میں اُن کا نام و نشان بھی نظر نہیں آتا حالانکہ ہندوستان ہی سلطنت برطانیہ کے تاج کا ہیرا کہلاتا تھا۔

یہ لوگ پہلے تو اپنی طاقت کے گھمنڈ میں یہ خیال کرتے تھے کہ ہم کبھی تباہ نہیں ہو سکتے۔ جیسا کہ سورۂ کہف میں بتایا گیا تھا کہ وَمَآ اَظُنُّ السَّاعَةَ قَآئِمَةً (کہف ع ۵) یعنی اِن لوگوں کی رُوح رواں یہ کہے گی کہ میں اس امر کو کبھی تسلیم نہیں کر سکتی کہ ہم پر بھی تباہی کی گھڑی آنیوالی ہے۔ مگر جب اللہ تعالیٰ کا عذاب نازل ہو گا اور ان کی طاقتیں بالکل ٹوٹ جائیں گی تو اُس وقت ان پر بھی یہ حقیقت روشن ہو جائیگی کہ ان کی ترقی کا زمانہ صرف ایک ہزار سال تھا بلکہ اس کے بعد تباہی اور

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ

اور ہم نے تجھ سے پہلے نہ کوئی رسول بھیجا نہ نبی۔

اِلَّآ اِذَا تَمَنّٰٓى اَلْقَى الشَّيْطٰنُ فِيْٓ اُمْنِيَّتِهٖ ۚ فَيَنْسَخُ

مگر جب بھی اُس نے کوئی خواہش کی شیطان نے اُس کی خواہش کے رستہ میں مشکلات ڈال دیں۔ پھر اللہ (تعالیٰ) اُسکو

بربادی ہی اُن کے لئے مقدر تھی۔

پھر انہی دس صدیوں کو ایک یوم بھی قرار دیا گیا ہے۔ چنانچہ فرماتا ہے۔ نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا يَقُوْلُوْنَ اِذْ يَقُوْلُ اَمْثَلُهُمْ طَرِيْقَةً اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا يَوْمًا (طٰهٰ ع) یعنی اپنی تباہی کے موقعہ پر وہ جو کچھ کہیں گے ہم اُسے خوب جانتے ہیں جبکہ اُن میں سے سب سے زیادہ اُن کے مذہب پر چلنے والا کہیگا کہ اگر حقیقت پر غور کیا جائے تو تم صرف ایک مقررہ وقت تک رہے ہو۔ یعنی پیشگوئی کے مطابق دس صدیاں۔

سورۂ سبا میں بھی اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:- وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ۔ قُلْ لَّكُمْ مِّيْعَادُ يَوْمٍ لَّا تَسْتَاْخِرُوْنَ عَنْهُ سَاعَةً وَّلَا تَسْتَقْدِمُوْنَ (سبا ع) یعنی مخالف کہتے ہیں کہ اگر تم سچے ہو تو ساری دنیا میں اسلام کے پھیل جانے کا وعدہ کب پُورا ہوگا۔ تُو انہیں کہدے کہ تمہارے لئے ایک وقتِ معیّن کا اعلان کر دیا گیا ہے۔ تم نہ تو اُس سے ایک گھڑی پیچھے رہ سکوگے اور نہ آگے بڑھ سکوگے۔ یہاں بھی ایک یوم سے مراد ایک ہزار سالہ زمانہ ہے۔ جیساکہ سورۃ سجدہ میں اللہ تعالےٰ فرماتا ہے کہ يُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَى الْاَرْضِ ثُمَّ يَعْرُجُ اِلَيْهِ فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗٓ اَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ (سجدہ ع) یعنی اللہ تعالےٰ امرِ اسلامی کو آسمان سے اُتار کر زمین میں اپنی تدبیر کے ساتھ قائم کریگا۔ مگر پھر وہ اُس کی طرف ایک ایسے دن میں چڑھنا شروع کر دے گا جو تمہاری گنتی کے ہزار سالوں کے برابر ہوگا لیکن اس کے بعد پھر اللہ تعالیٰ اسلام کے غلبہ کے سامان پیدا فرمائیگا۔ اور کفر کو تباہ کر دیا جائے گا۔ چنانچہ اِس موعود عذاب کا سورۂ مریم میں اِن الفاظ میں ذکر فرمایا ہے کہ قُلْ مَنْ كَانَ فِي الضَّلٰلَةِ فَلْيَمْدُدْ لَهُ الرَّحْمٰنُ مَدًّا ۚ حَتّٰٓى اِذَا رَاَوْا مَا يُوْعَدُوْنَ اِمَّا الْعَذَابَ وَاِمَّا السَّاعَةَ ۭ فَسَيَعْلَمُوْنَ مَنْ هُوَ شَرٌّ مَّكَانًا وَّاَضْعَفُ جُنْدًا (مریم ع) یعنی تو انہیں کہدے کہ جو شخص گمراہی میں مبتلا ہو۔ خدائے رحمٰن اُسے ایک عرصہ تک ڈھیل دیتا چلا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ جب ایسے لوگوں کے سامنے وہ سب کچھ ظاہر ہو جائیگا جس کا ان سے وعدہ کیا گیا ہے یعنی یا تو دنیوی عذاب یا کامل قومی تباہی تو اس وقت وہ جان لیں گے کہ کون ہے جو مکان کے لحاظ سے بدتر اور مددگاروں کے لحاظ سے کمزور ہے۔ یعنی اُس وقت نہ تو اُن کا تمدن اُن کو محفوظ رکھ سکیگا جس پر اُن کو بڑا ناز ہوگا اور نہ اُن کے دوست اور ساتھی اور مددگار اُن کے کسی کام آئینگے اُن کی دولت بھی اُن سے چھن جائیگی اور اُن کے ساتھی بھی اُن سے الگ ہو جائیں گے۔ اور وہ ہلاکت اور بربادی کا شکار ہو جائیں گے۔

اللّٰہُ مَا یُلْقِی الشَّیْطٰنُ ثُمَّ یُحْکِمُ اللّٰہُ اٰیٰتِہٖ ؕ وَاللّٰہُ

جو شیطان ڈالتا ہے مٹا دیتا ہے - اور جو اس کے اپنے نشان ہوتے ہیں اُن کو مضبوط کر دیتا ہے - اور

عَلِیْمٌ حَکِیْمٌ ﴿۵۲﴾ لِّیَجْعَلَ مَا یُلْقِی الشَّیْطٰنُ فِتْنَۃً

اللہ (تعالیٰ) بہت جاننے والا حکمت والا ہے **اللہ** نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جو (مشکلات) شیطان ڈالتا ہے وہ اُن

لِّلَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِہِمْ مَّرَضٌ وَّالْقَاسِیَۃِ قُلُوْبُہُمْ ؕ

لوگوں کے لئے ٹھوکر کا موجب ہو جاتی ہیں جن کے دلوں میں بیماری ہوتی ہے اور جن کے دل سخت ہوتے ہیں

۵۲ حل لغات:- تَمَنّٰی: تَمَنَّی الشَّیْءَ کے معنے ہیں اَرَادَہٗ۔ کسی چیز کے کرنے کا ارادہ کیا - اور تَمَنَّی الْکِتَابَ کے معنے ہیں قَرَأَہٗ۔ کتاب کو پڑھا۔

اَلْاُمْنِیَّۃُ کے معنے ہیں اَلْبُغْیَۃُ - خواہش مَایَتَمَنّٰی وَیُقَدَّرُ جس کی خواہش کی جاتی ہے۔

یَنْسَخُ: نَسَخَ سے مضارع واحد مذکر غائب کا صیغہ ہے اور نَسَخَ الشَّیْءَ نَسْخًا کے معنے ہیں اَزَالَہٗ۔ کسی چیز کو دُور کر دیا۔ چنانچہ کہتے ہیں نَسَخْتُ حُکْمَہٗ بِحُکْمِ فُلَانٍ۔ میں نے فلاں کے حکم سے اُس کے حکم کو منسوخ کر دیا (اقرب) پس یَنْسَخُ کے معنے ہونگے۔ وہ زائل کر دیتا ہے۔ وہ ختم کر دیتا ہے۔

تفسیر:- یہ آیت قرآن کریم کی نہایت آسان آیت بھی ہے۔ اور اس کو مفسرین نے خطرناک آیت بھی بنا دیا ہے۔ اور وہ اس طرح کہ وہ اس آیت کو سورۂ نجم کی بعض آیات سے ملا دیتے ہیں اور پھر بعض خیالی دقتوں کے ذریعہ سے اس کو ایک نہایت ہی خطرناک حربہ اسلام کے خلاف بنا دیتے ہیں۔ حالانکہ سورۂ حج اور سورۂ نجم کا کوئی بھی جوڑ نہیں۔ سورۂ نجم کی جن آیتوں کو ان کے ساتھ ملا کر ایک ہوّا بنا دیا گیا ہے وہ یہ ہیں:-

اَفَرَءَیْتُمُ اللّٰتَ وَالْعُزّٰی وَمَنٰوۃَ الثَّالِثَۃَ الْاُخْرٰی۔ مفسرین کہتے ہیں کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم ایک دفعہ خانہ کعبہ کے صحن میں آئے اور سب کفار بھی وہاں جمع ہو گئے اور آپ نے یہ آیتیں پڑھنی شروع کیں کہ اَفَرَءَیْتُمُ اللّٰتَ وَالْعُزّٰی وَمَنٰوۃَ الثَّالِثَۃَ الْاُخْرٰی اور اس کے بعد آپ نے فرمایا وَتِلْکَ الْغَرَانِیْقُ الْعُلٰی وَاِنَّ شَفَاعَتَہُنَّ لَتُرْتَجٰی یعنی یہ تینوں اونچی گردنوں والے دیوتا ہیں اور ان کی شفاعت کی امید کی جاتی ہے۔ (نَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ تِلْکَ الْخُرَافَاتِ)

اس کے بعد جب سورۃ کے آخر تک پہنچے تو آخری آیت یہ تھی فَاسْجُدُوْا لِلّٰہِ وَاعْبُدُوْا اور تم اللہ کے حضور ہی سجدہ کرو اور اس کی فرمانبرداری کرو۔ چونکہ اس جگہ قرآن کریم میں سجدہ کرنیکا حکم ہے۔ آپ نے اس جگہ سجدہ کیا اور آپ کے ساتھ صحابہؓ نے بھی اور کفار نے بھی سجدہ کیا۔ بلکہ ولید بن مغیرہ جو ایک خطرناک دشمنِ اسلام تھا اس نے بھی زمین پر سے کنکر اٹھا کر اپنے ماتھے کو لگا لئے گویا سجدہ کر لیا۔ یہ واقعہ جب مکّہ میں مشہور ہوا تو ایک شور مچ گیا۔ لوگوں نے کہنا شروع کر دیا کہ سارا مکّہ مسلمان ہو گیا ہے کیونکہ سب کفار نے مسلمانوں کے ساتھ مل کر سجدہ کر لیا ہے۔

تَمَنّٰی

اَلْاُمْنِیَّۃُ

یَنْسَخُ

مسلمان مفسر کہتے ہیں کہ یہ آیتیں جو آپؐ نے پڑھیں کہ وَ تِلْكَ الْغَرَانِيْقُ الْعُلٰى وَاِنَّ شَفَاعَتَهُنَّ لَتُرْتَجٰى یہ قرآن کا حصہ نہیں تھیں۔ اِس لئے اللہ تعالیٰ نے بعد میں اِن کو منسوخ کر دیا۔ چنانچہ موجودہ قرآن میں یہ آیتیں نہیں ہیں۔ وہ اِس کہانی کی حقیقت یہ بیان کرتے ہیں کہ سورۂ حج میں یہ آیت آتی ہے کہ وَ مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ اِلَّآ اِذَا تَمَنّٰٓى اَلْقَى الشَّيْطٰنُ فِيْٓ اُمْنِيَّتِهٖ۔ یعنی ہم نے تجھ سے پہلے کوئی رسول اور نبی نہیں بھیجا مگر اُس کی یہ حالت تھی کہ جب کبھی وہ وحی پڑھتا تھا شیطان اُس کی وحی میں اپنی طرف سے کچھ ملا دیتا تھا۔ پھر بعد میں خدا تعالیٰ شیطانی وحی کو منسوخ کر دیتا تھا۔ اِسی طرح جب رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے سورۃ نجم کی آیتیں خانہ کعبہ میں پڑھیں تو شیطان نے (نعوذ باللہ من ذالک) آپؐ کی وحی میں یہ بات ملا دی کہ تِلْكَ الْغَرَانِيْقُ الْعُلٰى وَاِنَّ شَفَاعَتَهُنَّ لَتُرْتَجٰى۔ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے یہ الفاظ نکلے تو مکہ کے کفار نے سمجھا کہ آپؐ نے اپنے دین میں کچھ تبدیلی کر دی ہے اور آپؐ کے ساتھ سجدہ میں شامل ہو گئے۔ جب مکہ میں شور پڑ گیا کہ کفار مسلمان ہو گئے ہیں۔ تو کفار نے کہا کہ ہم نے تو صرف اس لئے سجدہ کیا تھا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی تلاوت میں یہ فرمایا تھا کہ تِلْكَ الْغَرَانِيْقُ الْعُلٰى وَاِنَّ شَفَاعَتَهُنَّ لَتُرْتَجٰى جس میں صاف طور پر ہمارے بتوں کو تسلیم کر لیا گیا تھا پس جب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے بتوں کو تسلیم کر لیا تو ہم نے بھی جواب میں اُن کے خدا کے آگے سجدہ کر دیا۔ جب کفار کا یہ قول مشہور ہوا تو مفسرین کہتے ہیں کہ چونکہ حدیثوں سے ثابت ہے کہ اُس وقت کوئی آواز آئی تھی جس میں یہ الفاظ سُنے گئے تھے کہ تِلْكَ الْغَرَانِيْقُ الْعُلٰى وَاِنَّ شَفَاعَتَهُنَّ لَتُرْتَجٰى اِس لئے معلوم ہوتا ہے کہ اِس آیت کے یہی معنے ہیں کہ ہر نبی کی زبان پر شیطان کبھی کبھی خدائی منشاء کے خلاف الفاظ جاری کر دیتا تھا۔ لیکن اِس آیت میں الفاظ جاری کرنے کا کوئی ذکر نہیں بلکہ آیت کے صرف اتنے معنے ہیں کہ جب کوئی نبی دنیا میں کوئی خواہش کرتا ہے اور نبی کی خواہش یہی ہوتی ہے کہ دنیا کی اصلاح ہو جائے۔ اُس وقت شیطان جو اس کی کامیابی کو ناپسند کرتا ہے اُس کے راستہ میں روکیں ڈال دیتا ہے۔ اَلْقٰى کے معنے ڈال دینے کے ہوتے ہیں۔ پس اَلْقَى الشَّيْطٰنُ فِيْٓ اُمْنِيَّتِهٖ کے یہی معنے ہیں کہ اُس کی خواہشوں کے راستہ میں کوئی چیز ڈال دیتا ہے اور ظاہر ہے کہ شیطان روک ہی ڈالیگا نبی کی مدد تو نہیں کریگا۔ پس اِن الفاظ سے یہ معنے لینا کہ شیطان اس کی زبان پر شرکیہ الفاظ بھی جاری کر دیتا ہے صریح ظلم ہے۔ مگر مشکل یہ ہے کہ اوپر کے بیان کردہ واقعہ کی روایت کو بڑے پایہ کے محدثین نے صحیح تسلیم کیا ہے۔ چنانچہ ابن حجرؒ جیسا محدث لکھتا ہے اِنَّ ثَلَاثَۃَ اَسَانِیْدَ مِنْھَا عَلٰی شَرْطِ الصَّحِیْحِ (فتح البیان) یعنی مختلف راویوں سے جو بڑے ثقہ تھے یہ روایت آتی ہے جن میں سے تین روائتیں اتنی معتبر ہیں جتنی بخاریؒ کی۔ اِسی طرح بزازؒ اور طبرانیؒ نے بھی اِسے درست تسلیم کیا ہے (ھمیان الزاد) جسکی وجہ سے ہم اس روایت کو کلّی طور پر ردّ نہیں کر سکتے۔

لیکن خدا تعالیٰ نے اپنے فضل سے مجھے اِس کا حل سمجھا دیا ہے جو یہ ہے کہ جب مسلمان ہجرت کر کے حبشہ چلے گئے تو مکہ والوں کو اُن کا حبشہ جانا بڑا بُرا لگا۔

اور انہوں نے اپنے بعض آدمی نجاشی شاہِ حبشہ کے پاس بھیجے کہ کسی طرح اُن کو سمجھا کر واپس مکّہ لے آئیں (سیرۃ الحلبیہ) اور تاریخوں میں یہ بھی لکھا ہے کہ جس وقت یہ سجدہ والا واقعہ ہوا - اُس وقت کچھ مہاجرین حبشہ سے لوٹ کر مکّہ آ گئے - اور جب اُن سے لوگوں نے پوچھا کہ تم لوگ واپس کیوں آ گئے ہو تو انہوں نے کہا ہمیں تو یہ اطلاع پہنچی تھی کہ مکّہ کے لوگ مسلمان ہو گئے ہیں (ابن خلدون) مکّہ کے جو لوگ اُن سے ملے تھے - انہوں نے کہا کہ مکّہ والے تو کوئی مسلمان نہیں ہوئے - بات یہ ہے کہ تمہارے رسول نے قرآن کی کچھ آیتیں ایسی پڑھی تھیں جن سے شرک کی تائید ہوتی تھی - اِس لئے تمہارے رسول کے ساتھ مل کر مکّہ والوں نے بھی سجدہ کر دیا مگر جبکہ بعد میں تمہارے رسول نے اُن آیتوں کو منسوخ قرار دے دیا تو مکّہ والے پھر اپنے دین کی طرف لوٹ آئے - یہ باتیں سُنکر وہ مہاجر پھر واپس حبشہ چلے گئے (سیرۃ الحلبیہ)

سورۂ نجم کی تلاوت کا واقعہ اور مسلمانوں کے حبشہ سے آنیکا واقعہ اتنا قریب قریب ہے کہ خود جغرافیہ اس کو ردّ کرتا ہے - مکّہ سے اس زمانہ کی بندرگاہ شعیبہ کا فاصلہ اکیلے سوار کے لئے کم از کم چار پانچ دن کا بنتا ہے - چنانچہ زرقانی میں لکھا ہے مسافتھا طویلۃ جدًّا کہ مکّہ سے شعیبہ کا فاصلہ بہت زیادہ ہے - اور وہاں سے حبشہ کی بندرگاہ کا فاصلہ بھی کوئی چار پانچ دن کا بنتا ہے - کیونکہ اس زمانہ میں لوگ صرف بادبانی کشتیوں میں سفر کرتے تھے اور وہ بھی ہر وقت نہیں چلتی تھیں کیونکہ کوئی جہاز رانی کی کمپنیاں نہیں ہوتی تھیں جب کسی ملّاح کو فرصت ہوتی تھی وہ اپنی کشتی اُدھر لے آتا تھا جس میں بعض دفعہ مہینوں کا فاصلہ ہو جاتا تھا - اور حبشہ کی بندرگاہ سے لے کر اُس زمانہ کے حبشہ کے دارالحکومت کا فاصلہ کوئی دو مہینہ کے سفر کا ہے - گویا اگر یہ خبر سورۂ نجم کی تلاوت کے بعد مکّہ سے جاتی اور پھر مسلمان وہاں سے روانہ ہوتے تو مختلف فاصلوں اور دربارِ حبشہ کی اجازت وغیرہ کے زمانہ کو ملا کر کوئی اڑہائی تین ماہ میں لوگ واپس آ سکتے تھے - مگر وہ سجدہ والے واقعہ کے بعد پندرہ بیس دن کے اندر اندر واپس آ گئے - کیونکہ مسلمان حبشہ جانے کے لئے رجب میں روانہ ہوئے تھے اور شعبان و رمضان حبشہ میں ٹھہرے اور شوال میں واپس پہنچ گئے (زرقانی) اور حبشہ ٹھہرنے اور واپس مکّہ پہنچنے کا کل عرصہ تین ماہ سے بھی کم بنتا ہے (سیرۃ الحلبیہ) اِس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ سورۂ نجم کی تلاوت والا واقعہ بنایا گیا ہے یعنی بعض مکّہ کے سرداروں نے پہلے سے یہ تدبیر سوچی اور کوئی سوار حبشہ دوڑا دیا کہ مسلمانوں میں جا کر مشہور کر دو کہ مکّہ کے لوگ مسلمان ہو گئے ہیں اور انہوں نے محمد رسول اللہ کے ساتھ مل کر سجدہ کیا ہے - لیکن جب انہوں نے اندازہ کیا کہ اب حبشہ والے آنے ہی والے ہونگے تو سوچا کہ اُن کے آنے پر ہم کیا جواب دیں گے کیونکہ اگر وہ دیکھیں گے کہ مکّہ والے تو ابھی تک کافر ہیں اس لئے یہ مشہور کر دیا کہ سجدہ کرنا (نعوذ باللہ) شرکیہ آیتوں کی وجہ سے تھا اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ان آیتوں کو منسوخ کرنا جو درحقیقت منسوخ کرنا نہ تھا بلکہ یہ اعلان کرنا تھا کہ ایسی کوئی آیتیں میں نے نہیں پڑھیں کفّار مکّہ کے واپس کفر پر آ جانے کی وجہ تھا -

اب یہ تدبیر تبھی کامیاب ہو سکتی تھی جبکہ کوئی شرکیہ آیتیں اس مجلس میں کہلائی جاتیں جس میں آپ نے

تلاوت کی تھی معلوم ہوتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم
نے نہیں بلکہ کسی خبیث کافر نے اپنے سرداروں کے مشورہ
سے پیچھے سے یہ فقرے پڑھ دیئے۔ اور بوجہ اس کے
کہ سینکڑوں آدمی موجود تھے اور مکہ کے سارے رؤساء
جمع تھے۔ شور میں پہچانا نہیں گیا کہ یہ آواز کس کی ہے۔
اور کفار نے مشہور کر دیا کہ چونکہ محمد رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم نے یہ فقرے کہے ہیں اس لئے ہم نے سجدہ
کر دیا تھا۔ جو لوگ مجلس کے کناروں پر بیٹھے تھے انہوں
نے بھی چونکہ یہ فقرے اس منافق شیطان کے مُنہ سے سُنے
تھے جس نے یہ فقرے آپ کی تلاوت کے وقت باآواز
بلند کہہ دیئے تھے۔ اس لئے اُن لوگوں نے بھی یہ
خیال کیا کہ شاید محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے
ہی یہ فقرے کہے ہوں۔ پس اس کہانی کا حل تو یہ ہے
کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تلاوت کے وقت کفار نے
پہلے سے سوچے سمجھے ہوئے منصوبہ کے مطابق کسی
خبیث سے یہ فقرے بلند آواز سے کہلا دیئے۔ اور
اُن کی سکیم کا ثبوت یہ ہے کہ مہاجرین حبشہ اُسوقت
سے پہلے مکہ پہنچ گئے جبکہ سورۃ نجم والے واقعہ کو
سُنکر وہ مکہ آ سکتے تھے۔ بلکہ اگر اُسوقت ہوائی جہاز
بھی ہوتے تو جتنے وقت میں وہ آ سکتے تھے۔ اُس
سے بھی پہلے پہنچ گئے۔ پس اُن کا وقت سے پہلے مکہ
آجانا بتاتا ہے کہ وقت سے پہلے اُن کو کہلا بھیجا گیا تھا
کہ مکہ والے مسلمان ہو گئے ہیں اور عین اُن دنوں میں
جبکہ وہ سکیم کے ماتحت آ سکتے تھے مکہ والوں نے یہ
اوپر کے الفاظ کسی خبیث کے مُنہ سے بلند آواز سے
کہلوا دیئے۔

پھر اگر اُن حدیثوں کو نظر انداز کر دیا جائے جو
صراحتاً قرآن کریم کے خلاف ہیں تو یہ سورۃ ہی اس
واقعہ کی تردید کرتی ہے کیونکہ ان آیتوں سے پہلے
جن میں کہا گیا ہے کہ شیطان نے شرکیہ مضمون ملا دیا
تھا یہ ذکر ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے
خدا کو دیکھا ہے بلکہ یہ بھی کہ دو دفعہ دیکھا ہے چنانچہ
پہلے فرمایا وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰى یعنی اُس نے
یقیناً اپنے خدا کو ایک دفعہ اور دیکھا ہے۔ اور پھر
فرمایا لَقَدْ رَاٰى مِنْ اٰيٰتِ رَبِّهِ الْكُبْرٰى محمد رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے رب کے بڑے بڑے نشانات
دیکھے ہیں اُس کے مقابلہ میں کافروں کو کہا گیا ہے کہ
اَفَرَءَيْتُمُ اللّٰتَ وَالْعُزّٰى یعنی بتاؤ تو سہی کہ
کیا تم نے بھی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرح
اپنے بُتوں کا کوئی نشان دیکھا ہے۔ یعنی تم نے نہیں دیکھا
مگر محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنے خدا کے
بڑے بڑے نشانات دیکھے ہیں۔ یہ تو شرکیہ آیات سے
پہلے کی آیتیں ہیں۔ اور ان شرکیہ آیات کے بعد کی
یہ آیت ہے کہ اِنْ هِيَ اِلَّآ اَسْمَآءٌ سَمَّيْتُمُوْهَآ
اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ
یعنی یہ بتوں کے نام تو تم نے خود رکھ لئے ہیں۔ خدا
تعالیٰ نے اس کے لئے کوئی دلیل نہیں اُتاری۔

اب بتاؤ کہ کیا یہ ممکن ہے کہ شرک کے اقرار سے
پہلے بھی شرک کی تردید کی آیتیں ہوں اور اُن کے بعد
بھی شرک کی تردید کی آیتیں ہوں۔ باوجود اس کے کوئی
شخص کہہ دے کہ ان دو تردیدوں کے درمیان محمد رسول اللہ
کی زبان پر شیطان نے شرک کے کلمات جاری کر دیئے
تھے۔ شیطان کو تو ہمارے مفسر عقلمند کہتے ہیں۔ یہاں تک
کہ سورۂ بقرۃ کی آیات میں شیطان کو فرشتوں کا اُستاد
قرار دیتے ہیں۔ اور شیطان اور خدا تعالیٰ کے مباحثے میں
خدا کو ہرایا گیا ہے مگر اس کہانی والا شیطان تو کوئی گدھا
معلوم ہوتا ہے کہ اُس کو شرکیہ کلمات کہنے کیلئے دو زبردست
توحیدی آیات کے درمیان ہی مقام ملا۔ اس شیطان کو تو

پاگل خانہ میں داخل کرنا چاہیئے۔ ایسا تُو خدا کے بندوں کو بہکانا کس طرح ہے؟

پھر یہ لطیفہ دیکھو کہ یہ سورۃ اس آیت پر ختم ہوئی ہے فَاسْجُدُوْا لِلّٰهِ وَاعْبُدُوْا کہ اے لوگو اللہ کے سامنے سجدہ کرو اور صرف اسی کی عبادت کرو۔ اس آیت کو سُن کر کون گدھا تھا جو یہ سمجھتا تھا کہ محمد رسول اللہ نے کوئی شرکیہ کلمات کہہ دیئے ہیں۔ غرض اس سورۃ کی آیت آیت ہی اِس کہانی کو ردّ کر رہی ہے۔ یہ اندرونی شہادت ہے اور بیرونی شہادت یہ ہے کہ مہاجرین حبشہ اس کہانی کو سُنکر اس وقت مکہ میں واپس نہیں آ سکتے تھے جس وقت وہ آئے۔ جیسا کہ مَیں پہلے ثابت کر چکا ہوں۔

اَب میں سورۂ حج کی زیرِ تفسیر آیت کو لیتا ہوں جس کی بناء پر اس واقعہ کو جائز قرار دیا گیا ہے اور بتاتا ہوں کہ اس آیت کا وہ مفہوم نہیں جو مفسّرین نے لیا ہے۔ اس آیت کے مفسّرین تو یہ معنے کرتے ہیں کہ تجھ سے پہلے جتنے نبی اور رسول گذرے ہیں۔ جب کبھی وہ اپنی وحی کی تلاوت کیا کرتے تھے شیطان اُن کی وحی میں کچھ ملا دیا کرتا تھا۔ پھر اللہ تعالےٰ شیطان کے ملائے ہوئے کو منسوخ کر دیتا تھا اور اپنی آیات کو مضبوط کر دیتا تھا۔ لیکن یہ معنے بالکل غلط ہیں۔ اوّل تو اِس لئے کہ تَمَنّٰی کے معنے صرف پڑھنے کے نہیں ہوتے بلکہ ارادہ کرنے کے بھی ہوتے ہیں اور اُمْنِیَۃ کے معنے صرف تلاوت کے ہی نہیں ہوتے بلکہ مطلوب و مقصود کے بھی ہوتے ہیں (اقرب) اِن دونوں لفظوں کے مذکورہ بالا معنے مدنظر رکھتے ہوئے آیت کے معنے یوں ہونگے کہ "ہم نے تجھ سے پہلے کوئی رسول اور نبی نہیں بھیجا مگر جب بھی وہ کوئی ارادہ کرتا تھا شیطان اُس کے ارادہ میں کچھ ڈال دیتا تھا۔ پھر اللہ تعالیٰ شیطان کے ڈالے ہوئے کو راستے سے ہٹا دیتا ہے اور اپنے نشانوں کو قائم کر دیتا ہے۔" اِن معنوں کو دیکھو تو پتہ لگ جائیگا کہ مفسّرین کے معنے یہاں چسپاں ہی نہیں ہو سکتے۔ اِن معنوں کی رُو سے اس آیت کے معنے صرف یہ بنتے ہیں کہ کوئی رسول اور نبی نہیں گذرا جس کے ارادوں یعنی شرک کے تباہ کرنے کے ارادوں کو ناکام رکھنے کے لئے شیطان کوئی روکیں نہ ڈالتا ہو۔ لیکن نبیوں کے مطلوب و مقصود کو ناکام کرنے کیلئے شیطان خواہ کتنی کوششیں کرے اور اُن کے راستہ میں کتنی مشکلات بھی ڈالے، اللہ تعالیٰ شیطان کی ڈالی ہوئی مشکلات کو اُن کے راستہ سے ہٹا دیتا ہے اور نبیوں کو کامیاب بنانے کے لیے جن نشانوں کی خبر دیتا ہے اُن کے پُورا ہونیکے سامان پیدا کر دیتا ہے۔ سو اس طرح نبی جیت جاتے ہیں اور شیطان ہار جاتا ہے۔ اَب جو تاریخی واقعات ہیں اُن سے بھی لوگ سمجھ سکتے ہیں کہ آیا جو مفسّرین نے معنے کئے ہیں۔ وہ واقعات کے مطابق ہیں یا جو ہم نے معنے کئے ہیں وہ واقعات کے مطابق ہیں۔ اُن تفسیری معنوں کے مطابق محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہارنا چاہیئے تھا۔ اور شرک کو غالب آ جانا چاہیئے تھا۔ لیکن ہُوا یہ کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خانہ کعبہ میں رکھے ہوئے بُتوں کو اپنے ہاتھ سے توڑا اور شرک ہمیشہ کے لئے مٹ گیا۔

پس آج تک کوئی بھی نبی اور رسول ایسا نہیں آیا جس کے ہر مقصد اور ہر مدعا اور ہر خواہش اور ہر تڑپ کے آگے شیطان نے روکیں نہ ڈالی ہوں۔ کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اگر نبی کامیاب ہوگیا۔ تو پھر میرا ٹھکانا کہیں نہیں۔ جس طرح مرتا ہُوا آدمی پُورا زور لگاتا ہے کہ وہ کسی طرح موت کے پنجے سے نکل جائے۔

وَاِنَّ الظّٰلِمِيْنَ لَفِيْ شِقَاقٍۭ بَعِيْدٍ ۝ وَّلِيَعْلَمَ الَّذِيْنَ

اور ظالم لوگ (ہر خدائی بات کی) شدید مخالفت کرنے پر تُلے رہتے ہیں۔ اور (یہ سب کچھ اسلئے ہوتا ہے) تاکہ

اُوْتُوا الْعِلْمَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَيُؤْمِنُوْا بِهٖ

وہ لوگ جو علم والے ہوتے ہیں جان لیں کہ وہ (یعنی قرآن) تیرے رب کی طرف سے مجسّم سچائی ہے اور اس پر ایمان لے آئیں۔

فَتُخْبِتَ لَهٗ قُلُوْبُهُمْ ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ لَهَادِ الَّذِيْنَ

اور اُن کے دل اُس کے آگے جُھک جائیں۔ اور اللہ (تعالےٰ) مومنوں کو ضرور

اِسی طرح شیطان اور اس کی ذریّت انبیاء اور اُنکی جماعتوں کے خلاف پُورا زور لگاتی ہے جنہوں نے مرنے والوں کو دیکھا ہے وہ جانتے ہیں کہ اس بے ہوشی میں بھی جس میں دنیا و مافیہا کی اُسے کوئی خبر نہیں ہوتی جبکہ ساری طاقت زائل ہو چکی ہوتی ہے اور تمام قوت خرچ ہو چکی ہوتی ہے مرنے سے چند منٹ پہلے مرنے والا اِس طرح زور لگاتا ہے کہ گویا وہ پھر اِس دنیا میں واپس آنا چاہتا ہے۔ اس کا سارا جسم ہِل جاتا ہے۔ گردن اُٹھ جاتی ہے اور وہ اپنی طاقت کا آخری ذرّہ تک اس لئے خرچ کر دیتا ہے کہ بچ جاؤں۔ یہ اس انسان کی حالت ہوتی ہے جو بے ہوشی میں ہوتا ہے جس کی طاقت خرچ ہو چکی ہوتی ہے۔ جو سُوکھ کر کانٹا ہو چکا ہوتا ہے۔ پھر اُس کی کیا حالت ہوگی جو بے ہوش نہ ہو اور جس کی طاقت خرچ نہ ہوئی ہو۔ ایک چھوٹے بچے کو ہی کنوئیں میں ڈراوے کے طور پر دھکیل کر دیکھو تو کس طرح وہ چمٹ جاتا ہے۔ اور عام طاقت سے آٹھ دس گنے زیادہ طاقت اُس میں پیدا ہو جائیگی۔ ایک ایسا آدمی جسے کشتی میں پہلوان ایک منٹ میں گرا سکتا ہے اُس کے متعلق پہلوان سے کہو کہ اُسے کنوئیں میں گرا کر دیکھے تو ایک منٹ چھوڑ ایک گھنٹے میں بھی نہیں گرا سکیگا۔ اسلئے کہ کشتی میں تو وہ سمجھتا ہے مقابلہ ہے اگر گر بھی گیا تو کیا ہُوا۔ مگر جب وہ یہ سمجھے کہ موت آنے لگی ہے تو اپنی ساری طاقت خرچ کریگا اور اتنا زور لگائے گا کہ اوّل تو زبردست کے برابر ہو جائے گا ورنہ اُس کے قریب قریب رہیگا۔

جب خدا تعالیٰ کی طرف سے دنیا میں کوئی سلسلہ قائم کیا جاتا ہے تو اُس وقت ایسی ارواح خبیثہ جو شیطان سے تعلق رکھتی ہیں یا بعض گناہوں کی وجہ سے شیطان نے اُن پر تصرف پا یا ہُوا ہوتا ہے جوش میں آجاتی ہیں اور سارا زور اس بات کے لئے صرف کرتی ہیں کہ کسی طرح سچائی دنیا میں نہ پھیلے۔ یہ لوگ جو الٰہی سلسلوں کے مقابلہ میں کھڑے ہوتے ہیں کبھی تو ایسے ہوتے ہیں جو ان سلسلوں میں نام کے لحاظ سے شامل ہوتے ہیں جیسے عبد اللہ بن ابی ابن سلول اور اُس کے ساتھ تعلق رکھنے والے۔ اور کبھی ایسے ہوتے ہیں جو نام کی طرف تو منسوب ہوتے ہیں لیکن نظام کی طرف منسوب نہیں ہوتے۔ جیسے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں خوارج تھے۔ اور کبھی ایسے لوگ ہوتے ہیں جو نہ نام کی طرف منسوب ہوتے ہیں اور نہ نظام کے لحاظ سے

اٰمَنُوْٓا اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۵۵﴾ وَلَا يَزَالُ الَّذِيْنَ

سیدھے راستہ کی طرف ہدایت بخشنے والا ہے۔ اور کافر اِس (قرآن) کے متعلق

كَفَرُوْا فِيْ مِرْيَةٍ مِّنْهُ حَتّٰى تَاْتِيَهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً

اُس وقت تک کہ (تباہی کی) گھڑی اچانک آ جائے یا اُن کے پاس

اَوْ يَاْتِيَهُمْ عَذَابُ يَوْمٍ عَقِيْمٍ ﴿۵۶﴾ اَلْمُلْكُ يَوْمَئِذٍ

اُس دن کا عذاب آ جائے جو اپنے پیچھے کچھ نہیں چھوڑ تا شبہ میں پڑے رہیں گے ۲۲ اُس دن سب بادشاہت

کوئی تعلق رکھتے ہیں۔ جیسے مکہ کے کفار اور یہود اور نصاریٰ یہ سب لوگ مل کر اُن مقاصد میں روک بننا چاہتے ہیں جن کو پورا کرنے کے لئے خدا تعالیٰ کے انبیاء دنیا میں مبعوث ہوتے ہیں۔ اور ہر قسم کی مشکلات اُن کے رستے میں کھڑی کر دیتے ہیں۔ مگر اللہ تعالیٰ اپنے نشانات کے ساتھ نبیوں کی تائید کرتا اور شیطان کو اس کے تمام منصوبوں میں ناکام کر دیتا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ جس طرح شکاری کُتّے کو اگر کسی چور کے کپڑے کی خوشبو سونگھا کر چھوڑ دیا جائے تو وہ دس بیس بلکہ سو میل تک بھی پیچھے جا کر اُسے پکڑ لیتا ہے۔ اِسی طرح شیطان کو بھی تقدس کی خوشبو سے دشمنی ہے اور جس میں سے اُسے یہ خوشبو آئے اُس پر وہ دیوانہ وار حملہ کرتا ہے اور کوشش کرتا ہے کہ جس سے تقدس کی خوشبو آتی ہے اُسے چیر ڈالے۔ جب آدمؑ نے خدا تعالیٰ سے تقدس کی خوشبو پائی تو وہ حضرت آدم علیہ السلام کے پیچھے دوڑا۔ پھر حضرت نوح علیہ السلام آئے اور انہوں نے خوشبو پائی تو وہ اُن کے پیچھے دوڑا۔ پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام آئے اور اُن کے ذریعہ سے یہ خوشبو پھیلی تو وہ اُن کے پیچھے دوڑ پڑا۔ پھر حضرت رامؑ۔ حضرت کرشنؑ۔ حضرت زرتشتؑ۔ حضرت عیسیٰؑ اور حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم آئے تو اُن کے پیچھے دوڑ پڑا۔ اگر ان سب میں ایک ہی قسم کی خوشبو نہ ہوتی تو ان پر شیطان کا حملہ بھی ایک رنگ میں نہ ہوتا۔ چونکہ ان کی خوشبو ایک ہی طرح کی تھی اور وہ توحید کی خوشبو تھی۔ اِس لئے شیطان نے اُن کے زمانوں میں حملہ بھی ایک ہی رنگ میں کیا۔ مگر فرماتا ہے فَيَنْسَخُ اللّٰهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطٰنُ ثُمَّ يُحْكِمُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ۔ اللہ تعالیٰ شیطان کی تمام روکوں کو مٹا دیتا ہے اور اس تعلیم کو قائم کر دیتا ہے جو اُس کی طرف سے آتی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ بڑا جاننے والا اور حکمت والا ہے۔

۲۲ حل لغات:۔ اَلْفِتْنَةُ کے معنے ہیں اَلْخِبْرَةُ وَالْاِبْتِلَاءُ۔ امتحان و آزمائش۔ اَلضَّلَالُ وَالْاِثْمُ وَالْكُفْرُ۔ گمراہی۔ گناہ اور کفر۔ اَلْفَضِيْحَةُ رسوائی۔ اَلْعَذَابُ۔ عذاب۔ اَلْعِبْرَةُ۔ عبرت۔

اَلْفِتْنَةُ

شِقَاقٍ: شَاقَّهٗ شِقَاقًا کے معنے ہیں خَالَفَهٗ وَعَادَاهُ۔ اُس کی مخالفت اور دشمنی کی۔ وَحَقِيْقَتُهٗ اَنْ يَّاْتِيَ كُلٌّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا فِيْ شِقٍّ غَيْرَ شِقِّ صَاحِبِهٖ۔ عربی زبان میں شِق کے معنے جانب کے ہوتے ہیں اور شَاقَّهٗ کے معنے ہوتے ہیں۔ دونوں نے

شِقَاقٍ

اپنا اپنا پہلو اختیار کیا اور ایک دوسرے کے ساتھ اتفاق نہ کیا (اقرب) پس شِقَاقٌ کے معنے ہونگے مخالفت کرنا۔

تُخْبِتُ تُخْبِتُ: اَخْبَتَ سے مضارع واحد مؤنث کا صیغہ ہے۔ اور اَلْاِخْبَاتُ (جو اَخْبَتَ کا مصدر ہے) کے معنے ہیں اَللِّیْنُ وَالتَّوَاضُعُ۔ نرمی اور عاجزی (مفردات) پس تُخْبِتُ کے معنے ہیں۔ عاجزی کریں اور تواضع اختیار کریں۔

مِرْیَۃٌ مِرْیَۃٌ: کے معنے ہیں اَلشَّکُّ۔ شک۔ اَلْجَدَلُ جھگڑا (اقرب)

یَوْمٌ عَقِیْمٌ یَوْمٌ عَقِیْمٌ کے معنے ہیں جس میں کوئی خیر و برکت نہ ہو (اقرب) مفردات میں ہے یَوْمٌ عَقِیْمٌ اَلاَّ فَرَحَ فِیْہِ۔ ایسا دن جس میں کوئی خوشی نہ ہو۔

تفسیر:- اب سوال پیدا ہوتا تھا کہ اللہ تعالیٰ شیطان کو نبیوں کے راستہ میں کیوں روکیں ڈالنے دیتا ہے۔ اس کا جواب دیتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم ایسا اس لئے کرتے ہیں تاکہ ان شیطانی فتنوں کے ذریعہ نبیوں کی جماعتیں ہر قسم کی منافقت اور بے ایمانی رکھنے والوں سے پاک ہو جائیں اور دشمنوں کی عداوت لوگوں پر ظاہر ہو جائے۔ جب شیطان روکیں پیدا کرتا ہے تو جن لوگوں کے دلوں میں بدی ہوتی ہے اور جن کے قلوب سخت ہوتے ہیں وہ اس کی بات مان لیتے ہیں اور بلا وجہ مومنوں پر ظلم کرنے لگ جاتے ہیں۔ پس کمزور ایمان والوں کی کمزوری اور دشمنوں کی دشمنی دونوں ظاہر ہو جاتی ہیں اور پتہ لگ جاتا ہے کہ اسلام کے دشمن عناد اور مخالفت میں کسقدر بڑھے ہوئے ہیں۔ اور یہ بھی پتہ لگ جاتا ہے کہ اسلام پر سچا ایمان لانے والے لوگ شریروں کی شرارتوں سے ڈرتے نہیں بلکہ ایمان میں اور بھی بڑھتے ہیں۔ اور اس طرح مومنوں کو اللہ تعالیٰ ہدایت میں بڑھاتا چلا جاتا ہے۔

اِس آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہ قانون بیان فرمایا ہے کہ جب بھی کوئی نبی آتا ہے اور وہ لوگوں کی اصلاح کی تجاویز کرتا ہے تو شیطان اس کے راستہ میں روکیں ڈالنی شروع کر دیتا ہے مگر اُس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ منافق اور کمزور ایمان لوگ الگ ہو جاتے ہیں۔ اور خدا تعالیٰ اپنے سلسلہ کی مضبوطی اور اس کی عظمت کو اور بھی بڑھا دیتا ہے۔ اب اِن معنوں پر غور کرو اور دیکھو کہ یہ معنے تمام نبیوں کو عموماً اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خصوصاً کس طرح شیطان کے تصرّف سے محفوظ رکھتے ہیں۔ بلکہ اُلٹا یہ بتلاتے ہیں کہ نبیوں پر شیطان کا تصرّف تو الگ رہا شیطان اُن سے ماریں کھاتا ہے۔ اور جب ہم قرآن کریم کی یہ آیت مدّ نظر رکھیں کہ اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَکَ عَلَیْھِمْ سُلْطَانٌ (سورۂ بنی اسرائیل ۶۶) کہ میرے بندوں پر تجھے کبھی غلبہ نصیب نہ ہوگا تو میرے کئے ہوئے معنے ہی ٹھیک ثابت ہوتے ہیں۔ اور مفسّرین کے کئے ہوئے معنے غلط ثابت ہوتے ہیں۔ کیونکہ کسی نبی کی زبان پر شیطان کا قبضہ خصوصاً وحی کی تلاوت کے وقت تو اتنا بڑا "سلطان" ہے کہ جس کی مثال دنیا میں نہیں پائی جاتی۔ ہم تو معمولی انسانوں کو دیکھتے ہیں کہ حکومتیں اُن پر کتنا ہی جبر کریں وہ اُن کے خلاف نعرے لگاتے جاتے ہیں۔ پھر یہ کہنا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو سب نبیوں کے بھی سردار تھے شیطان نے اُن کی زبان پر تصرّف کر لیا اور نعوذ باللہ اُن کے مُنہ سے شرکیہ کلمات نکلوا دیئے۔ یہ تو سورۂ بنی اسرائیل والی آیت کی صریح تردید ہے اور قرآن کریم کی کوئی آیت دوسری آیت کی تردید نہیں کر سکتی چنانچہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ وَلَوْ کَانَ مِنْ عِنْدِ غَیْرِ اللّٰہِ لَوَجَدُوْا فِیْہِ اخْتِلَافًا کَثِیْرًا (سورۃ النساء آیت ۸۳)

یعنی کیا وہ قرآن پر غور نہیں کرتے۔ اگر یہ خدا تعالیٰ کے سوا کسی اور کا کلام ہوتا تو اس میں عظیم الشان اختلاف پائے جاتے۔

بعض لوگ غلطی سے سمجھتے ہیں کہ اس آیت میں چونکہ کثیرًا کا لفظ ہے اس لئے اس کے معنے یہ ہیں کہ خدا تعالیٰ کے سوا دوسروں کے کلام میں بہت سے اختلاف پائے جاتے ہیں لیکن خدا کے کلام میں بہت سے اختلاف نہیں پائے جاتے۔ چونکہ یہاں کثیرًا کا لفظ ہے اسلئے یہ آیت ایک اختلاف کو ردّ نہیں کرتی۔ مگر کثیر کے معنے عربی زبان میں عظیم الشان کے بھی ہوتے ہیں۔ چنانچہ مفردات میں لکھا ہے وَلَيْسَتِ الْكَثْرَةُ إِشَارَةً إِلَى الْعَدَدِ فَقَطْ بَلْ إِلَى الْفَضْلِ (مفردات) یعنی قرآن شریف میں بعض جگہ جو کثیر کا لفظ استعمال ہوا ہے اس کے صرف یہ معنے نہیں کہ تعداد میں زیادہ بلکہ مطلب یہ ہے کہ شان میں بڑا۔ اور قرآن کریم میں یہ اختلاف ماننا کہ ایک طرف تو وہ یہ کہتا ہے کہ میرے نیک بندوں پر شیطان کو کبھی تصرف نہیں ہوگا۔ اور دوسری طرف وہ یہ بھی کہتا ہے کہ ہر نبی اور رسول پر شیطان کو تصرف دیا گیا تھا وہ اس کی وحی میں اپنی طرف سے کچھ ملا دیتا تھا یہ اتنا بڑا اختلاف ہے کہ جس سے بڑا اختلاف قیاس کرنا بھی مشکل ہے پس سورۂ نساء کی آیت کے مطابق اس کے ایسے معنے کرنے باطل اور غلط ہیں اور قرآن کریم کی تعلیم کے صریح خلاف ہیں۔

دوسری تشریح آیت لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا کی یہ ہے کہ منطق کے قضیہ حملیہ کی رو سے بالمقابل قضیہ نکالنا جسے مفہوم مخالف بھی کہتے ہیں جائز نہیں ہوتا۔ مثلاً اگر ہم یہ کہیں کہ فلاں شخص کا سر بڑا ہے تو اس فقرہ سے یہ نتیجہ نکالنا ہرگز جائز نہیں ہوگا کہ اُس کے پاؤں چھوٹے ہیں۔ اسی طرح قرآن کریم کا یہ دعویٰ کہ لَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا جو قضیہ شرطیہ پر مشتمل ہے قضیہ حملیہ کی صورت میں یہ معنے رکھتا ہے کہ غیر اللہ کے کلام میں بڑا اختلاف پایا جاتا ہے لیکن اس کے یہ معنے نہیں ہونگے کہ خدا کے کلام میں تھوڑا سا اختلاف ہوتا ہے کیونکہ یہ نتیجہ ایک ایسا مفہوم مخالف ہے جو منطق کی رُو سے جائز نہیں جیسا کہ ہم اوپر کی مثال سے ظاہر کر چکے ہیں۔

پھر فرماتا ہے۔ وَلَا يَزَالُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ مِرْيَةٍ مِّنْهُ حَتّٰى تَاْتِيَهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً اَوْ يَاْتِيَهُمْ عَذَابُ يَوْمٍ عَقِيْمٍ۔ کفار اُس وقت تک صداقت کے بارے میں شبہ میں ہی رہتے ہیں یہاں تک کہ اُنکی تباہی کی گھڑی اُن پر اچانک آجاتی ہے یا اُن پر عذاب کا وہ دن آجاتا ہے جو اپنے پیچھے کچھ بھی نہیں چھوڑتا۔ دیکھ لو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت کے زمانہ میں کون شخص تھا جو یہ یقین رکھتا تھا کہ مکہ میں رہنے والے چند غریب لوگ تھوڑے ہی عرصہ میں سارے عرب پر چھا جانے والے ہیں لیکن ہجرت کے معاً بعد یعنی دوسرے ہی سال مکہ کے وہ رؤساء جو اسلام کی ہستی کو مٹا دینے پر تُلے ہوئے تھے اور جو غریب مسلمانوں پر طرح طرح کے ظلم و ستم کرتے تھے بدر کے میدان میں اس طرح ذبح کر دیئے گئے جس طرح بلاد گرتے گاؤں کی گلیوں میں مردا دیئے جاتے ہیں حضرت نوح علیہ السلام کے زمانہ میں طوفان آیا مگر طوفان آنے سے قبل آخری وقت تک آپ کی قوم ہنستی رہی اور یہی کہتی رہی کہ ہاں ہم غرق ہو جائینگے اور تم بچ جاؤ گے۔ اگر ہم غرق ہوگئے تو وہ جگہ کہاں ہے جہاں تم بھاگ جاؤ گے۔ لیکن سالہا سال کی ہنسی کے بعد جسے بائبل نے شاعرانہ رنگ میں سینکڑوں سال کا زمانہ کہا ہے یکدم طوفان آیا اور وہ لوگ غرق ہوگئے جو آپ پر ہنسی کیا کرتے تھے اور آپ کی کشتی پہاڑ کی چوٹی پر جا ٹھہری۔ قرآن کریم اور بائبل دونوں سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام جب مصر سے بھاگے تو آخر وقت تک ان کی قوم کے لوگ بھی یہ نہیں سمجھتے تھے کہ ہماری نجات کا وقت آگیا ہے اور فرعون نے بھی کہا کہ یہ تھوڑے سے لوگ ہیں۔ فوراً فوجیں جمع کرو۔ یہ ہم سے بھاگ کر کہاں جا سکتے ہیں اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم کے لوگوں کو فرعون کا لشکر نظر آیا تو انہوں نے کہا اِنَّا لَمُدْرَكُوْنَ

لِلّٰهِ ؕ یَحۡکُمُ بَیۡنَہُمۡ ؕ فَالَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فِیۡ جَنّٰتِ

اللہ ہی کی ہوگی وہ اُن کے درمیان فیصلہ کرے گا۔ پس مومن جو ایمان کے مناسب حال عمل بھی کرتے ہونگے وہ نعمت والی

النَّعِیۡمِ ﴿۵۶﴾ وَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا وَ کَذَّبُوۡا بِاٰیٰتِنَا فَاُولٰٓئِکَ لَہُمۡ

جنتوں میں رہیں گے۔ اور کافر اور ہماری آیتوں کے منکر تو وہ ہیں جن کے لئے رسوائی

عَذَابٌ مُّہِیۡنٌ ﴿۵۷﴾ وَ الَّذِیۡنَ ہَاجَرُوۡا فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ

کا عذاب (مقدر) ہے ۲۳ؑ اور وہ لوگ جو اللہ کے راستہ میں ہجرت کرتے ہیں

ع ۷ / ۱۴

ہم مزدور پکڑے جائینگے لیکن وہی لوگ جو آدھ گھنٹہ پہلے یہ سمجھتے تھے کہ ہم اب فرعون کے ہاتھ سے بچ نہیں سکتے آدھ گھنٹہ بعد انہوں نے دیکھا کہ بادشاہ کے وہ وزراء اور فوجیں جن پر اس کی شوکت کا دارومدار تھا غوطے کھاتے ہوئے سمندر کی تہ میں جارہے ہیں۔ پھر اس عذاب کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ فرعون اُن بادشاہوں میں سے تھا جو اپنے مُنہ پر ہمیشہ نقاب اوڑھے رہتے تھے اور انہوں نے لوگوں میں یہ مشہور کر رکھا تھا کہ جو شخص بادشاہ کی شکل دیکھ لے وہ کوڑھی ہو جاتا ہے کیونکہ وہ اُس کی ہتک کرتا ہے۔ اِس لئے وہ ہمیشہ اپنے مُنہ پر نقاب رکھتے تھے یہ بتلانے کیلئے کہ ہم ایسے عالیشان انسان ہیں کہ ہماری شکل دیکھنا بھی ہر کس و ناکس کا کام نہیں اور اگر کسی شخص کے لئے بادشاہ اپنا نقاب اُٹھا دیتا تھا تو وہ بڑا مقرب سمجھا جاتا تھا اور وہ اپنی قوم کا سردار بن جاتا تھا مگر آج اُسکی لاش قاہرہ کے عجائب گھر میں پڑی ہوئی ہے جسے مَیں نے ۱۹۲۴ء میں خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ مگر دیکھنے والا کن جذبات کے ماتحت اُسے دیکھتا ہے۔ اچھے جذبات کے ماتحت نہیں بلکہ ہر دیکھنے والا اُس پر لعنت ڈالتا ہے اور کہتا ہے۔ خبیث تُو تھا موسیٰؑ کو دُکھ دینے والا۔ غرض اللہ تعالیٰ کی طرف سے جب عذاب آتا ہے تو وہ بعض دفعہ ایسا اچانک آتا ہے کہ انسان دیکھتے ہی دیکھتے اُس کی لپیٹ میں بھسم ہو کر رہ جاتا ہے۔ یہی بات اللہ تعالیٰ نے اِس آیت میں بیان فرمائی ہے کہ یہ لوگ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی صداقت میں اِسی طرح شکوک و شبہات میں ہی مبتلا رہیں گے یہاں تک کہ ایک دن اچانک انکی تباہی کی گھڑی آجائیگی اور وہ اُس سے بھاگنے کا کوئی راستہ نہیں پائیں گے۔ اور یا پھر اُن پر ایسا عذاب نازل ہوگا جو اُن کی شوکت کا کوئی نشان تک باقی نہیں رکھیگا۔ چنانچہ فتح مکہ بھی ایک ساعت تھی جو اچانک کفارِ مکہ پر آئی۔ اور جس نے اُن کے تمام بل اس طرح نکال کر رکھدیئے کہ وہ لوگ جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپکے ساتھیوں کو ابتدائے اسلام سے دُکھ دیتے چلے آرہے تھے اسقدر عاجز اور درماندہ ہوگئے کہ انہوں نے محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے یہ عاجزانہ التجا کی کہ آپ ہم پر رحم کریں اور ہم سے وہی سلوک کریں جو یوسفؑ نے اپنے بھائیوں کے ساتھ کیا تھا۔ اور اسقدر انقلاب اُن میں پیدا ہوا کہ وہی لوگ جو کل تک محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے خون کے پیاسے تھے آپکی حفاظت کیلئے اپنی جانیں قربان کرنے لگ گئے۔ اور عَذَابُ یَوۡمٍ عَقِیۡمٍ سے حضرت ابن عباسؓ، مجاہد اور قتادہ کے نزدیک بدر کا عذاب مراد ہے جس نے کفار کی جڑیں کاٹ کر رکھدیں اور اُن کے رعب اور دبدبہ کو خاک میں ملا دیا۔

۲۳ؑ حل لغات: جَنّٰتِ النَّعِیۡمِ: اَلنَّعِیۡمُ

کے معنے ہیں اَلْخَفْضُ وَالدَّعَةُ۔ آرام آسائش۔ اَلْمَالُ مال
(اقرب) اسی طرح اَلنَّعِیْمُ کے معنے ہیں اَلنِّعْمَةُ الْکَثِیْرَةُ
بہت سی نعمت (مفردات) پس جَنّٰتِ النَّعِیْمِ کے
معنے ہونگے (۱) ایسی جنّات جن میں آرام و آسائش حاصل
ہوگا۔ (۲) مال و دولت والی جنّات (۳) بہت سی نعمت والی جنّات

تفسیر:- فرماتا ہے جب یہ ساعۃ آ گئی۔
تو اُس دن خدائے واحد کی حکومت دنیا میں قائم ہو جائیگی
اور شرک اور کفر دنیا سے مٹ جائیگا۔ چنانچہ دیکھ لو
فتح مکّہ کے بعد خدا کا وہ گھر جسے حضرت ابراہیمؑ اور
آپ کے بیٹے حضرت اسمٰعیلؑ نے خدائے واحد کی
پرستش کے لئے بنایا تھا اور جسے بعد میں اُن کی گمراہ
اولاد نے تین سو ساٹھ بتوں سے بھر دیا تھا کس طرح
بتوں سے خالی کیا گیا۔ اور کس طرح ایک ایک بُت کو
ٹکڑے ٹکڑے کرکے بیت اللہ سے باہر پھینک دیا گیا
رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایک ایک بُت پر سونٹی
مارتے تھے اور یہ کہتے جاتے تھے کہ جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ
الْبَاطِلُ اِنَّ الْبَاطِلَ کَانَ زَهُوْقًا۔ یعنی حق آ گیا ہے
اور باطل بھاگ گیا ہے۔ اور باطل تو ہے ہی بھاگ
جانے والا۔ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سب
سے بڑے بُت ھبل پر اپنی چھڑی ماری اور وہ گر کر
ٹوٹ گیا۔ تو ایک صحابیؓ نے ابوسفیان کی طرف دیکھتے
ہوئے کہا۔ ابوسفیان! تمہیں یاد ہے اُحد کے دن
تم نے کتنے غرور میں یہ نعرہ لگایا تھا کہ اُعْلُ ھُبَلْ۔
اُعْلُ ھُبَلْ یعنی ہبل کی شان بلند ہو ہبل کی شان
بلند ہو۔ آج دیکھ لو تمہاری آنکھوں کے سامنے ہبل
کے ٹکڑے پڑے ہوئے ہیں۔ ابوسفیان کھسیانا ہو کر
بولا۔ بھائی یہ باتیں جانے بھی دو۔ اگر محمد رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم کے خدا کے سوا کوئی اور بھی خدا ہوتا
تو آج ہم جو کچھ دیکھ رہے ہیں یہ کبھی نہ ہوتا۔ اب
تو ہمیں یقین ہو گیا ہے کہ خدائے واحد کے سوا اور
کوئی خدا نہیں۔ غرض اَلْمُلْكُ یَوْمَئِذٍ لِّلّٰہِ کی پیشگوئی
اُس روز بڑی شان سے پوری ہوئی اور عرب کے ایک
سرے سے لیکر اُس کے دوسرے سرے تک لَآ اِلٰہَ اِلَّا
اللّٰہُ کی آوازیں گونجنے لگیں۔

پھر فَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ
فِیْ جَنّٰتِ النَّعِیْمِ۔ وَالَّذِیْنَ کَفَرُوْا وَکَذَّبُوْا
بِاٰیٰتِنَا فَاُولٰٓئِكَ لَھُمْ عَذَابٌ مُّهِیْنٌ میں یہ بتایا
کہ الٰہی سلسلوں کی ترقی میں شیطان خواہ کس قدر روڑے
اٹکائے اور کتنے ہی منصوبے کرے آخر میں خدا تعالیٰ
کے نبی ہی جیتتے ہیں۔ اور کفار کی سب تدبیریں ناکام
ہو کر رہتی ہیں۔ چنانچہ مومن تو ترقی کر جاتے ہیں لیکن
مخالفین خائب و خاسر ہو کر غم و غصّہ اور ناکامی و
ذلّت کی آگ میں جلتے رہتے ہیں اور یہ دنیا ہی اُن
کے لئے دوزخ ہو جاتی ہے۔

اَلْمُلْكُ یَوْمَئِذٍ لِّلّٰہِ میں ضمنی طور پر ایک
اعتراض کا جواب بھی پایا جاتا ہے۔ بعض لوگ
سورۂ فاتحہ کے الفاظ مٰلِكِ یَوْمِ الدِّیْنِ پر اعتراض
کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی نسبت یہ کیوں
کہا گیا ہے کہ وہ مَالِكٌ ہے یہ کیوں نہیں کہا گیا کہ وہ
مَلِكٌ ہے۔ حالانکہ مَلِكٌ یعنی بادشاہ کا تصرّف
مَالِكٌ یعنی قابض سے زیادہ ہوتا ہے۔ اس اعتراض
کا جواب اَلْمُلْكُ یَوْمَئِذٍ لِّلّٰہِ میں موجود ہے کیونکہ
اللہ تعالیٰ اس میں فرماتا ہے کہ اُس دن حکومت اللہ
ہی کی ہوگی اور وہ اُن کے درمیان فیصلہ کرے گا۔ گویا
اللہ تعالیٰ صرف مالک ہی نہیں بلکہ متصرّف کامل یعنی
بادشاہ بھی ہے۔ لیکن اس سے یہ مراد نہیں کہ وہ آجکل
کے بادشاہوں کی طرح کسی بالا قانون کا پابند ہے۔
کیونکہ وہ خود فرماتا ہے کہ بالا قانون کی پابندی تو

ثُمَّ قُتِلُوْٓا اَوْ مَاتُوْا لَيَرْزُقَنَّهُمُ اللّٰهُ رِزْقًا حَسَنًا ؕ وَاِنَّ

پھر مارے جاتے ہیں یا طبعی موت مر جاتے ہیں۔ اللہ (تعالیٰ) انکو نہایت اعلیٰ انعام بخشے گا۔ اور اللہ (تعالیٰ)

اللّٰهَ لَهُوَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ ﴿۵۹﴾ لَيُدْخِلَنَّهُمْ مُّدْخَلًا يَّرْضَوْنَهٗ ؕ

انعام بخشنے والوں میں سب سے اچھا ہے۔ وہ ضرور ان کو ایسی جگہ میں داخل کرے گا جسے وہ پسند کرینگے۔

وَاِنَّ اللّٰهَ لَعَلِيْمٌ حَلِيْمٌ ﴿۶۰﴾ ذٰلِكَ ۚ وَمَنْ عَاقَبَ

اور اللہ (تعالیٰ) بہت جاننے والا (اور) بہت سمجھ رکھنے والا ہے ۲۴؎ یہ بات اسی طرح ہے اور جو شخص اتنی ہی سزا دے

اس کے لئے ہوتی ہے جس کے فیصلہ میں ظلم اور استبداد پایا جائے۔ لیکن خدا رحمٰن ہے اُس کے فیصلہ میں استبداد نہیں پایا جاتا۔ اور ظلم نہیں پایا جاتا۔ بلکہ وہ سب کے ساتھ رحم اور بخشش کا سلوک کرتا ہے اور ایسا معاملہ کرتا ہے جس کے نتیجہ میں لوگوں کو فائدہ پہنچے۔ اسی طرح سورۂ فرقان میں فرماتا ہے اَلْمُلْكُ يَوْمَئِذِ ۣالْحَقُّ لِلرَّحْمٰنِ (فرقان ع۳) کہ اُس دن حکومت واقعی رحمٰن خدا ہی کی ہوگی۔ اسی طرح ایک اور جگہ فرماتا ہے ثُمَّ مَآ اَدْرٰىكَ مَا يَوْمُ الدِّيْنِ۔ يَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَيْـًٔا وَالْاَمْرُ يَوْمَئِذٍ لِّلّٰهِ (سورۃ الانفطار) کہ تجھے کس چیز نے بتایا ہے کہ جزا و سزا کا وقت کیا ہے؟ وہ وہ وقت ہوگا جس دن کوئی جان کسی جان کی کچھ بھی مالک نہیں ہوگی اور اُس دن اللہ ہی کا حکم ہوگا۔ ان آیات سے ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ کو بادشاہت بھی حاصل ہے۔ پس مالک کا لفظ جو سورۂ فاتحہ میں استعمال کیا گیا ہے وہ ان معنوں میں نہیں کہ خدا تعالیٰ صرف مالک ہے مَلِک یعنی بادشاہ نہیں۔ بلکہ ان معنوں میں ہے کہ وہ مالک بادشاہ ہے۔ اور یہ ظاہر بات ہے کہ مالک بادشاہ خالی بادشاہ سے بہتر ہوتا ہے۔ یعنی خالی بادشاہت کسی کو تمام افراد یا اشیاء پر پُورا تسلّط نہیں بخشتی۔ ایک بادشاہ کو یہ ہرگز اختیار حاصل نہیں کہ وہ رعایا اور ملک کی دولت سے جس طرح چاہے سلوک کرے۔ لیکن بادشاہ اُن اشیاء میں جو اس کی مملوکہ ہوں بالکل اَور قسم کا تصرف رکھتا ہے جو اُس تصرّف سے جو اُسے صرف بادشاہت کی وجہ سے حاصل ہوتا ہے زیادہ مکمل اور اعلیٰ ہوتا ہے۔ پس مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ کہہ کر خدا تعالیٰ کی ملکیت کی نفی نہیں کی گئی بلکہ خدا تعالیٰ کی ملکیت کی قسم بیان کی گئی ہے۔ یعنی یہ بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ خالی مَلِکْ نہیں بلکہ وہ مَلِک ہے جو ساتھ ہی سب مخلوق کا مالک بھی ہے اور جو مالک بادشاہ ہو اُسے تصرّف میں پوری آزادی حاصل ہوتی ہے۔

۲۴؎ تفسیر:- اسجگہ جو یہ کہا گیا ہے کہ جو لوگ اللہ کے راستے میں مارے جائیں گے یا مر جائینگے اللہ تعالےٰ اُنکو رزق دے گا۔ اس کے صرف یہی معنے نہیں ہیں کہ جنّت میں اُن کو رزق ملے گا کیونکہ دشمن کہہ سکتا ہے کہ نہ تو مَیں نے جنّت دیکھی ہے نہ مجھے اس کا پتہ ہے۔ بلکہ اس سے قوم کے افراد بھی مُراد ہیں۔ کیونکہ قوم کے ہم خیال لوگوں سے جو سلوک

بِمِثْلِ مَا عُوْقِبَ بِهٖ ثُمَّ بُغِيَ عَلَيْهِ لَيَنْصُرَنَّهُ اللّٰهُ

جتنی اُسے تکلیف دی گئی تھی مگر باوجود اس کے (اُس کا دشمن) اُلٹا اُسپر چڑھ آئے تو اللہ (تعالیٰ) ضرور اُسکی مدد کریگا

اِنَّ اللّٰهَ لَعَفُوٌّ غَفُوْرٌ ﴿۶۱﴾ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ يُوْلِجُ

اللہ (تعالیٰ) یقیناً بہت معاف کرنیوالا (اور) بہت بخشنے والا ہے ۲۵ یہ (سزا و جزا کا سلسلہ) اسلئے چلتا ہے کہ ثابت ہو کہ اللہ

الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَيُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ وَاَنَّ اللّٰهَ

(تعالیٰ) رات کو دن میں داخل کر دیتا ہے اور دن کو رات میں داخل کر دیتا ہے۔ اور اللہ (تعالیٰ) یقیناً

ہوتا ہے وہ ساری قوم سے سمجھا جاتا ہے۔ پس اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ مہاجرین میں سے بعض بے شک قتل کئے جائیں گے اور بعض مر جائیں گے لیکن بحیثیت مجموعی اللہ تعالیٰ اُن کو اور اُن کی قوم کو بہت سی دنیوی اور اخروی نعمتیں دے گا۔ یعنی زندہ رہنے والوں کو دنیاوی نعمتیں تو بادشاہت کی صورت میں ملیں گی اور اخروی نعمتیں ایمان کی زیادتی کی صورت میں ملیں گی۔

۲۵ حل لغات:۔ بُغِيَ عَلَيْهِ۔ بَغٰى عَلَيْهِ سے مجہول کا صیغہ ہے۔ اور بَغٰى عَلَيْهِ کے معنے ہیں۔ اِسْتَطَالَ عَلَيْهِ وَظَلَمَهٗ۔ اس پر ظلم کیا۔ اور دست درازی کی (اقرب) پس بُغِيَ عَلَيْهِ کے معنے ہونگے۔ اس پر ظلم کیا گیا۔

تفسیر:۔ یعنی یہ جو ہم نے تعلیم دی تھی کہ ظلم کو ہر دفعہ معاف کرنا ہی ضروری نہیں ہوتا بلکہ بعض دفعہ ظلم کا بدلہ لینا بھی جائز ہوتا ہے۔ اس کے متعلق اگر یہ خیال کرو کہ اگر ہم بدلہ لیں گے تو دشمن اور بھی شرارت میں بڑھ جائیگا اور اس طرح ہماری مصیبت زیادہ ہو جائیگی تو یاد رکھو کہ اگر تم مظلوم ہونے کے بعد حد کے اندر بدلہ لوگے اور پھر بھی دشمن تم پر مزید ظلم کرنے کے لئے تیار ہو جائیگا تو خدا تعالیٰ کی مدد تم کو حاصل ہوگی۔ اور تمہارے لئے ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں ہوگی۔

یہ آیت بظاہر اس جگہ بے تعلق نظر آتی ہے لیکن اگر اوپر کے رکوع کا مضمون دیکھا جائے تو اس میں یہ آیت نظر آئے گی کہ وَالَّذِيْنَ سَعَوْا فِيْٓ اٰيٰتِنَا مُعٰجِزِيْنَ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ اسی طرح اُس میں فرمایا گیا ہے کہ وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ اِلَّآ اِذَا تَمَنّٰٓى اَلْقَى الشَّيْطٰنُ فِيْٓ اُمْنِيَّتِهٖ پھر اس سے بھی اوپر چلیں تو یہ آیت نظر آئے گی کہ اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰى نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرٌ اور پھر اس سے بھی پہلے یہ آیت آتی ہے کہ اِنَّ اللّٰهَ يُدٰفِعُ عَنِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ خَوَّانٍ كَفُوْرٍ۔ ان تمام آیات سے ظاہر ہے کہ گذشتہ دو رکوعوں سے جنگ کا ذکر چلا آرہا ہے اور یہ بتایا جا رہا ہے کہ جنگ میں چاہے سچائی کی تائید کرنے والے لوگوں کی تعداد کتنی بھی کم ہو پھر بھی وہ جیتیں گے۔ پس جنگ کے اس پہلو کو بھی بیان کرنا ضروری تھا کہ کفار میں اگر اور جوش

بُغِيَ عَلَيْهِ

سَمِيْعٌۢ بَصِيْرٌ ﴿٦٢﴾ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ وَ اَنَّ مَا

بہت دعائیں سُننے والا (اور) بہت حالات دیکھنے والا ہے ۲۶؎ یہ (دعائیں سُننا اور حالات سے واقف رہنا) اسلئے ہے کہ اللہ (تعالیٰ) اپنی ذات

يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ هُوَ الْبَاطِلُ وَ اَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيْرُ ﴿٦٣﴾

میں قائم ہے اور دوسری چیزوں کو قائم رکھتا ہے اور اسلئے کہ جس چیز کو وہ خدا کے سوا پکارتے ہیں وہ تباہ ہونے والی ہے، اور اسلئے کہ اللہ ہی سب سے

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَتُصْبِحُ الْاَرْضُ

کیا تُو نے دیکھا نہیں کہ اللہ (تعالیٰ) نے آسمان سے پانی اُتارا ہے، جس سے زمین سرسبز ہو جاتی ہے۔

مُخْضَرَّةً ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَطِيْفٌ خَبِيْرٌ ﴿٦٤﴾

اللہ (تعالیٰ) یقیناً (اپنے بندوں سے) مہربانی کا سلوک کرنے والا اور (انکے حالات سے) بہت باخبر ہے ۲۷؎

پیدا ہو تو کیا بنیگا۔ پس یہ آیت بے تعلق نہیں بلکہ سابق مضمون کے تسلسل میں بیان کی گئی ہے۔

۲۶؎ حل لغات:۔ يُوْلِجُ: اَوْلَجَ سے مضارع کا صیغہ ہے اور اَوْلَجَ کے معنے ہیں اَدْخَلَهٗ اس کو داخل کیا (اقرب) پس يُوْلِجُ کے معنے ہونگے۔ وہ داخل کرتا ہے۔

تفسیر:۔ فرماتا ہے۔ اپنی مصیبتوں اور دشمن کی ترقی سے گھبرانا نہیں چاہیئے۔ کیونکہ دنیا کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ ترقی یافتہ قومیں ایک دن گرجاتی ہیں۔ اور گری ہوئی قومیں ایک دن بڑھ جاتی ہیں۔ پس اگر آج تمہارے دشمن کی باری ہے تو کل تمہاری باری ہوگی۔

دوسرے یہ بھی نہیں بھولنا چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ دُعائیں سُنتا ہے اور اپنے بندوں کے حالات دیکھ رہا ہے۔ اسجگہ نُور کے بعد ظلمت اور ظلمت کے بعد نور سے اچھی حالت کے بعد تکلیف کی حالت اور دُکھ کے بعد سُکھ کی حالت پیدا کرنا مراد ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے کہ وہ نظامِ عالم سے بیدخل نہیں بلکہ وہ مظلوم کا ساتھ دیتا اور اس کے لئے اپنی قدرت اور جلال کو ظاہر کرتا ہے

پس مسلمانوں کیلئے مایوسی کی کوئی وجہ نہیں۔ وہ ان کی ضرور مدد کریگا۔ اور ان کے لئے ترقی کے راستے کھول دیگا۔

۲۷؎ حل لغات:۔ اَلْبَاطِلُ۔ بَطَلَ سے اسم فاعل کا صیغہ ہے۔ اور بَطَلَ کے معنے ہوتے ہیں فَسَدَ خراب ہوگیا۔ اَوْ سَقَطَ حُكْمُهٗ۔ اُس کا حکم ختم ہوگیا وَ ذَهَبَ ضِيَاعًا وَ خُسْرًا۔ ضائع ہوگیا۔ اور گھاٹا کھا کر ختم ہوگیا۔ (اقرب) پس اَلْبَاطِلُ کے معنے ہونگے۔ ضائع ہو جانے والا اور گھاٹا کھا کر ختم ہونے والا۔

تفسیر:۔ اب بتاتا ہے کہ وہ نظامِ عالم میں دخل اس لئے دیتا ہے کہ اصل قائم رہنے والی ہستی وہی ہے اور باطل ہلاک ہونے والا ہے۔ اگر بندے باطل سے تعلق رکھیں گے تو وہ بھی ہلاک ہونگے اور اگر حق اور صداقت سے تعلق رکھیں گے تو وہ بھی قائم رہیں گے۔ پس تم جو واجب الوجود خدا کے ساتھ تعلق رکھتے ہو ان لوگوں کے مقابلہ میں کس طرح ہار سکتے ہو جو ہلاک ہونیوالی تعلیم کے ساتھ وابستہ ہیں۔ یہ تو اس کی ہتک ہے کہ اُس کی طرف سے قائم ہونیوالا سلسلہ تباہ ہو جائے۔ اس سے

لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۚ وَاِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ

جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے وہ سب اُس کا ہے ۔ اور اللہ (تعالیٰ) یقیناً اپنے سوا سب

الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ ﴿٦٥﴾

ع ۸ ۱۵

وجودوں کی مدد سے بے نیاز (اور) تمام تعریفوں کا مالک ہے ۲۸؎

اُس کے علیؔ اور کبیرؔ ہونے پر اعتراض آتا ہے تمہارا خدا یقیناً بڑا ہے ۔ اس لئے تم بھی بڑے ہوگے اور تمہارے دشمن کا بُت چھوٹا ہے ۔ اس لئے لازماً وہ ذلیل اور رسوا ہوگا ۔ مادی دُنیا کو بھی دیکھ لو جب مادی پانی نازل ہوتا ہے تو وہ شاداب ہوجاتی ہے اسی طرح روحانی پانی نازل ہوگا تو تم کیوں شاداب نہیں ہوگے ۔ خصوصاً جب خدا دلوں کے بھید بھی جانتا ہے اور خبردار ہے ۔

۲۸؎ تفسیر ۔ فرماتا ہے ۔ زمین اور آسمان میں جو کچھ ہے وہ خدا کا ہی ہے ۔ اور اس کو کسی اور چیز کی ضرورت نہیں ۔ پس ہر قربانی جو وہ تم سے چاہتا ہے صرف تمہارے فائدے کے لئے چاہتا ہے اپنے فائدے کے لئے نہیں ۔ چنانچہ اسلامی تعلیم پر غور کرکے دیکھ لو اُس نے جسقدر احکام دیئے ہیں محض بنی نوع انسان کے فائدہ کے لئے دیئے ہیں اس لئے نہیں دیئے کہ اُن سے اُس کی خدائی میں کوئی اضافہ ہوتا ہے ۔ اگر اُس نے نمازوں کا حکم دیا ہے یا روزوں کا حکم دیا ہے یا زکوٰۃ اور صدقہ و خیرات کا حکم دیا ہے یا حج کا حکم دیا ہے تو یہ تمام احکام ایسے ہیں جن کا بالذات فائدہ خود انسان کو ہی پہنچتا ہے ۔ خدا تعالیٰ کو نہیں ۔ مثلاً نماز کو ہی لے لو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ۔ اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ (عنکبوت ع ۵) نماز انسان کو بدیوں اور برائیوں سے روکتی ہے ۔ پس جو شخص صحیح معنوں میں نماز پڑھتا ہے اُسے دوسرے روحانی فوائد کے علاوہ ذاتی طور پر یہ فائدہ پہنچتا ہے کہ وہ برائیوں سے محفوظ ہوجاتا ہے ۔ اسی طرح نماز سے یہ فائدہ بھی ہوتا ہے کہ قومی شیرازہ کو متحد رکھنے کا خیال ہر وقت انسان کے ذہن میں جاگزیں رہتا ہے اور اسے یہ احساس رہتا ہے کہ ہمارا ہر وقت ایک واجب الاطاعت امام ہونا چاہیئے جسکی متابعت میں خدا تعالیٰ کے نام کو بلند کیا جا سکے ۔ پھر مسجد میں پانچوں وقت نماز کے لئے جانا ایسی چیز ہے جو بنی نوع انسان کو ذاتی فائدہ پہنچانے والی چیز ہے کیونکہ اس کے نتیجہ میں ایک دوسرے کے حالات سے واقفیت ہوتی رہتی ہے ۔ اور مسلمان تنظیمی رنگ میں اس سے بہت کچھ فائدہ اٹھا سکتے ہیں ۔

اسی طرح روزہ ایک اہم اسلامی عبادت ہے مگر اس کا فائدہ بھی خود انسان کو پہنچتا ہے خدا تعالیٰ کو نہیں ۔ روزہ کے ذریعہ افراد کے اندر مشقت برداشت کرنے کی عادت پیدا ہوتی ہے اور یہ ایسی چیز ہے جو مختلف اوقات میں اس کے بے حد کام آتی ہے ۔ اسی طرح روزہ کے ذریعہ غرباء کی حالت کا احساس پیدا ہوتا ہے ۔ اور اُن کو ابھارنے اور ترقی دینے کا جذبہ ترقی کرتا ہے جس سے بحیثیت مجموعی تمام قوم فائدہ اٹھاتی ہے اور ترقی کی منزلیں جلد جلد طے کرنے لگتی ہے ۔ یہی حال زکوٰۃ کا ہے ۔ وہ بھی

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِى الْاَرْضِ وَالْفُلْكَ

کیا تو نے دیکھا نہیں کہ اللہ (تعالیٰ) نے تمہارے کام پر جو کچھ بھی زمین میں ہے اُسے بغیر مزدوری کے لگا رکھا ہے۔ اور کشتیاں

تَجْرِىْ فِى الْبَحْرِ بِاَمْرِهٖ ۭ وَيُمْسِكُ السَّمَاۗءَ اَنْ تَقَعَ

بھی سمندر میں اُس کے حکم سے چلتی ہیں - اور اُس نے آسمان کو روک رکھا ہے کہ کہیں زمین پر

عَلَى الْاَرْضِ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ۭ اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴿۶۶﴾

سوائے اُس کے حکم کے گر نہ جائے - اللہ (تعالیٰ) یقیناً لوگوں سے بہت شفقت کرنیوالا (اور اُن پر) بار بار رحم کرنیوالا ہے ۲۹

قومی ترقی کا ایک زبردست ذریعہ ہے کیونکہ حکومت امراء سے اُن کے اموال کا ایک حصہ لے کر غرباء پر خرچ کرتی ہے اور اس طرح فقراء، مساکین، مؤلفۃ القلوب اور مصائب و آفات میں مبتلا انسان اس روپیہ سے اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کی طاقت حاصل کر لیتے ہیں - اور قوم اور ملک میں ضعف پیدا نہیں ہوتا۔

اِسی طرح حج بھی ارکان اسلام میں شامل ہے لیکن اگر غور کیا جائے تو اس کا فائدہ بھی خود مسلمانوں کو ہی پہنچتا ہے - کیونکہ اس سے ایک تو خدا تعالیٰ کی خاطر اپنا وطن چھوڑنے کی عادت پیدا ہوتی ہے - اور پھر مکہ مکرمہ میں جب دنیا کے تمام اطراف سے مسلمان جمع ہوتے ہیں تو عالمی اخوت کا احساس ترقی کرتا ہے اور باہمی اتحاد کی بنیادیں مضبوط ہوتی ہیں -

غرض اسلامی شریعت نے جس قدر احکام دیئے ہیں خود بنی نوع انسان کے فائدہ کے لئے دیئے ہیں - ورنہ خدا تعالیٰ اُن میں سے کسی چیز کا محتاج نہیں -

سَخَّرَ

۲۹ حل لغات:- سَخَّرَہٗ کے معنے ہیں كَلَّفَهٗ بِلَا اُجْرَةٍ - بغیر مزدوری اور اُجرت کے اُس کو کام میں لگایا (اقرب) پس سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِى الْاَرْضِ کے معنے ہونگے کہ زمین کی ہر چیز کو بغیر اس کے کہ تم کوئی معاوضہ ادا کرو تمہاری خدمت میں اُس نے لگا دیا ہے۔

تفسیر:- فرماتا ہے - اگر وہ تمہاری چھوٹی چھوٹی قربانیوں کا محتاج ہوتا تو زمین کی ہر چیز جو اُس کے قبضہ میں تھی وہ تمہاری خدمت میں کیوں لگا دیتا - اُس نے تو جو کچھ پیدا کیا ہے تمہارے فائدہ اور بھلائی کے لئے پیدا کیا ہے تاکہ تم اس کی اِن نعمتوں سے فائدہ اُٹھا کر ترقی کر سکو - ہم دیکھتے ہیں کہ موجودہ زمانہ کی سائنس قرآن کریم کی اس بیان کردہ صداقت کو زیادہ سے زیادہ نمایاں کرتی چلی جا رہی ہے - اور ہزاروں اشیاء جن کو پہلے بالکل بے کار سمجھا جاتا تھا اُن کے عجیب در عجیب خواص معلوم ہو رہے ہیں - سم الفار - بیش اور کچلہ نے ہزاروں انسانوں کو ہلاک کیا - مگر اب وہی سم الفار لہ بیش اور کچلہ کروڑوں انسانوں کی زندگی کا موجب بن رہے ہیں - اِسی طرح سانپ کے ڈسنے سے بیشک ہزاروں اموات ہوتی ہیں مگر اُسی سانپ کے زہر کو کئی قسم کے خطرناک امراض میں استعمال کر کے اس کے تریاقی فوائد حاصل کئے جا رہے ہیں - اور لاکھوں انسان اس سے نئی زندگی حاصل کر رہے ہیں - پاخانہ کتنی گندی اور بظاہر بیکار نظر آنے والی چیز ہے مگر یہی چیز کھاد بن کر بنی نوع انسان کو کتنا بڑا فائدہ پہنچاتی ہے

غرض کوئی چیز ایسی نہیں جو اپنے اندر افادیت کا پہلو نہ رکھتی ہو اور جس کی پیدائش بنی نوع انسان کو فائدہ پہنچانے کے لئے نہ کی گئی ہو۔ پہاڑوں کو ہی دیکھ لو۔ یہ بنی نوع انسان کو کتنا بڑا فائدہ پہنچا رہے ہیں جب موسم گرما کی تپش سے انسانی بدن جھلسنے لگتا ہے تو پہاڑوں کی بلندی پر پہنچ کر وہ نہایت آرام اور سکون کی زندگی بسر کرنے لگتا ہے اور آفتاب کی حدت سے امن میں آجاتا ہے۔ پھر انہی پہاڑوں سے سونا اور چاندی اور لوہا اور ابرق اور کروم اور دوسری کئی قسم کی قیمتی دھاتیں حاصل کی جاتی ہیں۔ نمک جس پر انسانی زندگی کا انحصار ہے انہی پہاڑوں میں پیدا ہوتا ہے۔ پھر کئی قسم کی جڑی بوٹیاں ہیں جو وہاں پائی جاتی ہیں اور جن سے انسان طبی رنگ میں بھی فائدہ اٹھاتا ہے اور تجارتی رنگ میں بھی۔ اسی طرح دریاؤں اور نہروں سے تمام ملک سیراب ہوتا ہے۔ ہر قسم کی فصلیں ترقی کرتی ہیں اور باغات سرسبز و شاداب ہوتے ہیں۔ درختوں کو لے لو تو وہ بنی نوع انسان کو فائدہ پہنچا رہے ہیں۔ اور ان کی عمارتی ضروریات کو بھی پورا کر رہے ہیں اور جلانے والی لکڑی اور کوئلہ کی صورت میں بھی ساری دنیا کے کام آ رہے ہیں۔ غرض دنیا کی کوئی چیز ایسی نہیں جو خدا تعالیٰ نے اپنے بندوں کے فائدہ کے لئے نہ پیدا کی ہو۔ اور اگر کسی چیز کا فائدہ ابھی تک لوگوں کو معلوم نہیں ہو سکا تو یہ صرف انسانی علم کی کوتاہی کا نتیجہ ہے۔ ورنہ اللہ تعالیٰ نے کرۂ ارض کی تمام اشیاء انسان کی خدمت کے لئے پیدا کی ہیں۔ اُس نے پہاڑوں اور اُن کی برفوں اور اُن کے درختوں اور اُن کے پھلوں اور اُن کی بوٹیوں اور اُن کے اندر چھپی ہوئی کوئلہ کی کانوں سیسہ کی کانوں تانبہ کی کانوں اور ہیرے اور جواہرات کی کانوں کو بھی انسانی فائدہ کے لئے پیدا کیا ہے اور اُس نے زمین کے صحراؤں میں رہنے والے جانوروں اور پانی کے پتال میں رہنے والی مچھلیوں اور ہوا کے پرندوں کو بھی انسانی فائدہ کے لئے پیدا کیا ہے۔ غرض ہر چیز خواہ وہ زمین کے اندر سے نکالی جانے والی ہو یا جنگل میں اُگنے والی ہو یا دریاؤں کے نیچے سے مہیا ہونے والی ہو یا پہاڑوں سے حاصل کی جانے والی ہو صرف انسان کی خدمت کیلئے پیدا کی گئی ہے۔ مگر افسوس کہ وہی انسان جس کی خدمت کے لئے اللہ تعالیٰ نے ان تمام اشیاء کو پیدا کیا تھا کبھی ایسا بیوقوف بن جاتا ہے کہ پتھر کے بے جان بتوں کے آگے اپنا سر جھکا دیتا ہے۔ کبھی ستاروں کو ہر قسم کی برکت اور نحوست کا اصل موجب قرار دے دیتا ہے اور کبھی سورج اور چاند کی پرستش کرنے لگتا ہے اور وہ خدا جس نے ان چیزوں کو ایک خدمتگار کے طور پر پیدا کیا تھا اُس سے غافل ہو جاتا ہے۔ حالانکہ جب وہ اُن کے سامنے اپنا ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہوتا ہے یا اُن سے منتیں کر رہا ہوتا ہے تو یہ ایسی ہی بات ہوتی ہے جیسے اپنے غلام کی منتیں کر رہا ہو یا افسر اپنے چپڑاسی سے ڈر رہا ہو۔ اگر دنیا میں کہیں ایسا نظارہ نظر آئے تو ہر شخص ایسے افسر کو پاگل قرار دیگا۔ مگر مذہبی دنیا میں ایسے ہزاروں پاگل پائے جاتے ہیں جو اشرف المخلوقات ہوتے ہوئے ان چیزوں کو خدائی طاقتوں سے متصف قرار دیتے ہیں اور اس طرح اپنی انسانیت کی شرمناک تذلیل کے مرتکب ہوتے ہیں۔

وَيُمْسِكُ السَّمَآءَ اَنْ تَقَعَ عَلَى الْاَرْضِ اِلَّا بِاِذْنِهٖ میں اللہ تعالیٰ نے یہ بتایا ہے کہ اُس نے عذاب کے لئے مختلف قسم کی قیود لگا دی ہیں۔ تاکہ بنی نوع انسان اُن سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنی اصلاح کی طرف توجہ کریں اور پیشتر اس کے کہ وہ کسی عذاب

کی پیروی میں آئیں خدا تعالیٰ سے اپنا تعلق مضبوط کرکے اُس کی رضا حاصل کریں۔ اور عذاب سے محفوظ ہو جائیں
یہ امر یاد رکھنا چاہیئے کہ عذاب ہمیشہ دو قسم کے ہُوا کرتے ہیں۔ ایک تو شرعی عذاب ہوتے ہیں اور ایک طبعی عذاب ہوتے ہیں۔ شرعی عذاب اسی وقت آتا ہے جب لوگ خدا تعالےٰ کے کسی رسول کی تکذیب کریں۔ مگر طبعی عذاب کے لئے یہ کوئی شرط نہیں بلکہ جو قوم بھی ترقی کے اُن اسباب سے غافل ہو جائیگی جو خدا تعالیٰ نے مادی عالم میں مقرر کئے ہوئے ہیں وہ اللہ تعالےٰ کے عام قانون کے ماتحت خود بخود ہلاک ہو جائیگی۔ جیسا کہ آج تک نقشۂ عالم پر ہزاروں قومیں اور حکومتیں اُبھریں اگر پھر ایک وقت ایسا آیا جبکہ وہ کمزوری اور انحطاط کا شکار ہوتے ہوتے مِٹ گئیں اور صفحۂ عالم پر اُن کا نشان تک باقی نہ رہا۔ اِن قوموں کی ہلاکت اور بربادی خدا تعالیٰ کی محبت کی کمی یا اُس کے رسولوں کے انکار کی وجہ سے نہیں ہوئی بلکہ اس لئے ہوئی کہ انہوں نے ترقی کے اُن قوانین کو نظر انداز کر دیا جو اللہ تعالےٰ نے اس دنیا میں جاری کئے ہوئے ہیں۔ اِن دونوں قسم کے عذابوں کا اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کی مختلف آیات میں ذکر فرمایا ہے۔ شرعی عذابوں کے متعلق تو فرماتا ہے۔ وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا (بنی اسرائیل ع۲) یعنی ہم کسی قوم پر عذاب نہیں بھیجتے جب تک اس کی طرف اپنا کوئی رسول نہ بھیج لیں۔ جب رسول کے آنے کے بعد اس قوم پر اتمام حجت ہو جاتی ہے اور وہ انکار اور تکذیب میں بڑھتی چلی جاتی ہے تو آخر اس قوم کی تباہی کا فیصلہ کر دیا جاتا ہے۔ اور وہ عذاب کا شکار ہو جاتی ہے۔ یہ شرعی عذاب ہے جو ماموروں کی تکذیب کے نتیجہ میں قوموں پر آتا ہے اس عذاب کی پہچان یہ ہوتی ہے کہ اِس کے متعلق پہلے سے پیشگوئیوں میں خبر دے دی جاتی ہے یا غیر معمولی طور پر دنیا میں ایسی بلاؤں اور آفات کا ظہور ہونے لگتا ہے جن کی نظیر پہلے زمانوں میں نہیں ملتی۔ مثلاً یکدفعہ زلزلوں پر زلزلے آنے شروع ہو جاتے ہیں یا بیماریاں۔ قحط۔ لڑائیاں اور دوسری قسم کے مصائب ایک ہی وقت میں اس طرح جمع ہو جاتے ہیں کہ لوگوں میں ایک شور مچ جاتا ہے۔ اور ہر شخص تسلیم کرتا ہے کہ یہ غیر معمولی حوادث ہیں۔
اِن شرعی عذابوں کے متعلق اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں یہ بھی بیان فرمایا ہے کہ یہ عذاب وقفہ وقفہ کے بعد آتے ہیں تاکہ جو لوگ عذاب کے اِن متواتر جھٹکوں سے بیدار ہو سکیں وہ بیدار ہو جائیں اور کلّی تباہی سے محفوظ رہیں۔ چنانچہ اللہ تعالےٰ اپنے اس قانون کا ذکر کرتے ہوئے فرماتا ہے وَاِذَآ اَذَقْنَا النَّاسَ رَحْمَةً مِّنْۢ بَعْدِ ضَرَّآءَ مَسَّتْهُمْ اِذَا لَهُمْ مَّكْرٌ فِيْٓ اٰيَاتِنَا قُلِ اللّٰهُ اَسْرَعُ مَكْرًا اِنَّ رُسُلَنَا يَكْتُبُوْنَ مَا تَمْكُرُوْنَ۔ (یونس ع۲) یعنی جب ہم لوگوں کو کسی دُکھ اور مصیبت کے بعد اپنی رحمت کا مزہ چکھاتے ہیں تو وہ جھٹ ہمارے نشانوں کے متعلق کوئی نہ کوئی مخالفانہ تدبیر شروع کر دیتے ہیں تو انہیں کہدے کہ اللہ کی تدبیر بہت ہی جلد کارگر ہُوا کرتی ہے اور تم جو تدبیریں کرتے ہو ہمارے فرستادے انہیں لکھتے رہتے ہیں۔ اِس آیت میں اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے کہ ہمارا عذاب کبھی یکدم نازل نہیں ہوتا بلکہ پہلے عذاب کا ایک جھٹکا آتا ہے جسے کچھ عرصہ کے بعد دُور کر دیا جاتا ہے تاکہ لوگ توبہ سے کام لیں اور اپنے مظالم اور گناہوں سے باز آجائیں۔ لیکن بدسرشت لوگ پھر بھی نصیحت حاصل نہیں کرتے وہ عذاب کے وقت تو کسی قدر ڈر جاتے ہیں مگر جب عذاب میں کمی واقع ہوتی ہے تو پھر ہمارے کلام اور احکام کے خلاف اپنی تدابیر شروع کر دیتے ہیں۔ فرماتا ہے۔

وَهُوَ الَّذِيٓ اَحْيَاكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ

اور وہی ہے جس نے تم کو زندہ کیا - پھر تم کو مارے گا - پھر تم کو زندہ کرے گا۔

اِنَّ الْاِنْسَانَ لَكَفُوْرٌ ﴿۶۷﴾

انسان یقیناً بڑا ناشکرا ہے ۳۰

اللہ تعالیٰ کی تدبیر تو بہت جلد نافذ ہو جاتی ہے مگر وہ خود ہی لوگوں پر احسان کرتے ہوئے اپنی تدبیر کو روکے رکھتا ہے۔ کیونکہ نہ تو اُسے لوگوں کے کام بھول سکتے ہیں کہ اُسے فوراً بدلہ لینے کی ضرورت ہو اور نہ سزا دینے میں اُسے کوئی مشکل پیش آ سکتی ہے کہ وہ سمجھے کہ اگر اس وقت میں نے سزا نہ دی تو بعد میں مشکل پیش آ جائے گی وہ ہر وقت سزا دے سکتا ہے اور کوئی بات بھی اس کی نظر سے پوشیدہ نہیں اس لئے مخالفین کو تکبر اور اعراض سے کام نہیں لینا چاہیئے۔ جب اُن کی کلّی تباہی کا فیصلہ کر دیا گیا تو پھر انکی کوئی تدبیر اُنکو بچا نہیں سکیگی۔

یہ تو شرعی عذابوں کا ذکر تھا طبعی عذابوں کا ذکر اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں فرمایا ہے اِنَّ اللّٰہَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ (رعد ع۲) یعنی اللہ تعالیٰ کبھی کسی قوم کی حالت کو نہیں بدلتا جب تک کہ وہ خود اپنی اندرونی حالت کو نہ بدل دے۔ جب وہ خود اپنے اعمال سے اُس مقام کو کھو بیٹھتی ہے - جو خدا تعالیٰ نے اُسے عطا کیا تھا تو خدا تعالیٰ کا سلوک بھی اس سے بدل جاتا ہے - اور وہ قوم ہلاکت کے گڑھے میں گر جاتی ہے گویا خدا تعالےٰ تو چاہتا ہے کہ لوگ اُس کے انعامات کے وارث ہوں مگر جب وہ خود اپنے ہاتھوں زہر کھانا شروع کر دیں تو خدائی قانون کے ماتحت وہ زہر اُن کا خاتمہ کر دیتی ہے -

یہی وہ قوانین ہیں جن کی طرف اِس آیت میں اشارہ کیا گیا ہے - اور بتایا گیا ہے کہ اُس نے اپنی رحمت کے ہاتھ سے تم سے عذاب کو روک رکھا ہے اور اُسے کئی قسم کی شرائط کے ساتھ مشروط کر دیا ہے اب یہ تمہارا کام ہے کہ تم خدا تعالیٰ کے اس قانون سے فائدہ اٹھاؤ - اور خدائی احکام کو قبول کر کے اس کے شرعی عذاب سے اور قوانین نیچر کی اتباع کر کے اس کے طبعی عذاب سے بچو - اور خدا تعالےٰ کی پیدا کردہ تمام نعماء سے صحیح رنگ میں فائدہ اُٹھاؤ۔

كَفُوْرٌ

۳۰ حل لغات: كَفُوْرٌ - كَفَرَ سے نکلا ہے اور كَفَرَ نِعْمَةَ اللّٰهِ کے معنے ہیں جَحَدَهَا وَسَتَرَهَا وَهُوَ ضِدُّ الشُّكْرِ - اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا انکار کیا اور ان کو چھپایا - اور کفر کا لفظ اِن معنوں میں شُکر کے مخالف معنے ادا کرنے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے -

کلیات ابو البقاء میں ہے۔ اَلْكُفْرُ تَغْطِيَةُ نِعَمِ الْمُنْعِمِ بِالْجُحُوْدِ - احسان کرنے والے کی نعمتوں کا انکار کر کے ان نعمتوں پر پردہ ڈالنا اور لوگوں سے چھپانا کفر کہلاتا ہے - پس كَفُوْرٌ کے معنے ہونگے ناشکری کرنیوالا خدا تعالیٰ کی نعمتوں کا انکار کرنے والا -

تفسیر: فرماتا ہے - خدا تعالیٰ انسان کو ہمیشہ ترقیات دیتا رہتا ہے اور ترقی کے بعد نافرمانی کی صورت میں تباہی بھی لاتا ہے تاکہ اس کا دل صاف ہو اور جب دل صاف ہو جاتا ہے تو پھر زندہ کر دیتا،

لِكُلِّ اُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا هُمْ نَاسِكُوْهُ فَلَا يُنَازِعُنَّكَ فِي

ہم نے ہر ایک اُمّت کیلئے ایک عبادت کا طریق مقرر کیا ہے جس کے مطابق وہ چلتی ہے پس اِس طریق (یعنی اسلام) کے متعلق وہ

الْاَمْرِ وَادْعُ اِلٰى رَبِّكَ ؕ اِنَّكَ لَعَلٰى هُدًى مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۶۸﴾

تجھ سے بحث نہ کریں (کیونکہ یہ خدا کا مقرر کردہ ہے) اور تُو (انہیں) اپنے رب کی طرف بلا کیونکہ تُو سیدھے راستہ پر ہے ۱۳۱ھ

مگر انسان خدا تعالیٰ کے سب احسان دیکھ کر بھی ناشکری میں لگا رہتا ہے۔

ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ سے ظاہر ہے کہ خدا تعالیٰ ایک ہی وقت میں مُمِیت بھی ہوتا ہے اور مُحْيِي بھی۔ وہ مارتا بھی ہے اور زندہ بھی کرتا ہے۔ اور ہر موت اپنے ساتھ ایک نئی حیات لاتی ہے۔ چنانچہ دیکھ لو کھانے پینے کی چیزیں مرتی ہیں تو وہ مر کر کھاد جیسی قیمتی چیز پیدا کر دیتی ہیں۔ تم روٹی سے ایک روٹی کا کام لے سکتے ہو۔ مگر روٹی کے فضلہ سے دس روٹیاں پیدا کی جاتی ہیں پس کوئی چیز دنیا میں ایسی نہیں جس پر موت آئے مگر وہ حیات پیدا نہ کرے۔ نابینا انسان دیکھتا ہے تو کہتا ہے۔ خدا مار رہا ہے۔ مگر آنکھوں والا جب دیکھتا ہے تو کہتا ہے خدا زندہ کر رہا ہے۔ اور درحقیقت یہ آنکھ خدا تعالیٰ کے انبیاء و مرسلین اور اُن کی جماعتوں کو ہی ملتی ہے۔ پس خدا تعالیٰ کی طرف سے صرف موت کبھی نہیں آتی۔ بلکہ اس کی طرف سے آنیوالی ہر موت زندگی کا پیغام اپنے ساتھ لاتی ہے۔ جنگ بدر میں بیشک مسلمانوں کے بھی کچھ آدمی مارے گئے۔ مگر کیا بدر کی جنگ ہی نہیں تھی جس نے عرب کو زندہ کر دیا اسی طرح جنگ اُحد میں کچھ مسلمان مارے گئے اور کچھ جنگ احزاب میں کام آئے مگر انہی جنگوں کے نتیجہ میں جب اہلِ عرب میں اصلاح پیدا ہو گئی۔ تو اُن میں سے ہر ایک شخص کو زندگی کی رُوح نظر آنے لگی۔ پھر فتح مکّہ کے وقت بھی بعض موتیں ہوئیں۔ لیکن اگر مکّہ فتح نہ ہوتا تو عرب کے لاکھوں لوگوں کی زندگی کس طرح ممکن تھی۔ ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ اِن موتوں میں ہی عرب کی زندگی مخفی تھی۔ پس موت بسا اوقات حیات کا موجب ہو جاتی ہے۔ بشرطیکہ لوگ خدا تعالیٰ کی طرف توجہ کریں اور اپنی عملی زندگی میں تغیّر پیدا کریں۔

۱۳۱ھ حل لغات: نَاسِكُوْهُ ۔ نَسَكَ سے اسم فاعل نَاسِكٌ ہوتا ہے اور نَاسِكُوْنَ نَاسِكٌ سے جمع ہے۔ نَاسِكُوْهُ میں ن گرا ہوا ہے۔ اور ہٗ ضمیر غائب ہے۔ نَسَكَ الرَّجُلُ نُسْكًا کے معنے ہیں تَزَهَّدَ وَتَعَبَّدَ وَتَقَشَّفَ اس نے خدا کی عبادت کی اور دُنیا سے بے رغبت ہو گیا اور زینت کے سامانوں کو اُس نے چھوڑ دیا۔ اور جب نَسَكَ لِلّٰهِ کا فقرہ بولیں تو معنے ہونگے۔ تَطَوَّعَ بِقُرْبَةٍ وَذَبَحَ لِوَجْهِهٖ۔ خدا کا قرب چاہنے کے لئے خوشدلی سے عبادت کی اور اُس کی ذات کے لئے قربانی کی (اقرب) پس نَاسِكٌ کے معنے ہونگے عبادت کرنیوالا۔ خدا تعالیٰ کیلئے قربانی کرنیوالا۔

مَنْسَكٌ کے معنے ہیں شِرْعَةُ النُّسْكِ عبادت کا طریقہ۔ قربانی کا طریقہ۔ (اقرب)

يُنَازِعُ، نَازَعَ سے مضارع کا صیغہ ہے اور نَازَعَهٗ مُنَازَعَةً کے معنے ہیں خَاصَمَهٗ۔ اُس سے جھگڑا کیا (اقرب) پس فَلَا يُنَازِعُنَّكَ کے معنے ہونگے وہ نہ جھگڑا کریں۔

نَاسِكُوْهُ

مَنْسَكٌ

يُنَازِعُ

تفسیر:- فرماتا ہے ۔ہر مذہب والوں کے لئے کوئی نہ کوئی دین چاہیئے ۔پس تیرے دین کے متعلق تیرے دشمنوں کے پاس جھگڑنے کی کوئی وجہ نہیں۔ اُن کو تو یہ دیکھنا چاہیئے کہ تیرا دین اپنے رب کی طرف بلاتا ہے یا نہیں اور لوگوں کو صراط مستقیم دکھاتا ہے یا نہیں؟ اگر وہ لوگوں کو خدا تعالیٰ کی طرف بلاتا ہے اور صاف طور پر کہتا ہے کہ فَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَلَهٗٓ اَسْلِمُوْا (حج ع۵) اے لوگو! تمہارا معبود ایک ہی ہے اُسی کی فرمانبرداری کرو۔ اور وہ انہیں صراطِ مستقیم پر چلنے کی ہدایت کرتا ہے۔ جیسا کہ ہر نماز میں بلکہ نماز کی ہر رکعت میں یہ دُعا سکھائی گئی ہے کہ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ اے خدا ہمیں سیدھا راستہ دکھا۔ تو پھر ان کی دشمنی محض ان کی کینہ توزی پر دلالت کرتی ہے ورنہ جو شخص خدائے واحد کی طرف بلائے اور لوگوں کو صراطِ مستقیم پر چلنے کی ہدایت کرے اُس سے جھگڑنے کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی ۔ اُس سے جھگڑا اُسی صورت میں کیا جا سکتا ہے جب خدا تعالیٰ کے وجود کا ہی انکار کیا جائے یا یہ ثابت کیا جائے کہ صراطِ مستقیم کے بغیر بھی انسان اپنے مقصود کو حاصل کر سکتا ہے لیکن جب خدا تعالیٰ کی ہستی تسلیم کئے بغیر کوئی دین دین ہی نہیں کہلا سکتا اور صراطِ مستقیم پر چلنے کے بغیر کسی کامیابی کا حصول ہی ممکن نہیں تو دشمنوں کی لڑائی یہ تو ثابت کر سکتی ہے کہ اُن کے دل بغض و حسد کی آگ سے جل رہے ہیں مگر یہ ثابت نہیں کر سکتی کہ وہ کسی معقولیت کی بناء پر لڑائی کر رہے ہیں۔

اِس آیت میں اِنَّكَ لَعَلٰى هُدًى مُّسْتَقِيْمٍ فرما کر اللہ تعالیٰ نے یہ پیشگوئی فرما دی ہے کہ دنیا خواہ کس قدر مخالفت کرے آخر وہی تعلیم دنیا میں غالب آئے گی جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پیش فرما رہے ہیں ۔ اور تمام مذاہب کے جھنڈے ایک دن اسلامی جھنڈے کے مقابل میں سرنگوں ہو جائیں گے ۔ چنانچہ دیکھ لو۔ جب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عقیدۂ توحید کو پیش کیا اُس وقت دنیا کی کیا کیفیت تھی۔ عیسائی تین خداؤں کے قائل تھے۔ زرتشتی نور اور ظلمت کے الگ الگ دیوتا قرار دیتے تھے۔ مجوسی آگ کی پرستش کرتے تھے۔ بتوں کے پجاری لات و منات کو اپنا خدا قرار دے رہے تھے اور تمام دنیا شرک سے بھری ہوئی تھی۔ مگر آج اسلام کی پیش کردہ توحید دُنیا پر اس قدر غالب آ چکی ہے کہ عیسائی بھی اپنے آپکو موحد کہتے ہیں اور بتوں کے پجاری بھی تسلیم کرتے ہیں کہ خدا تو ایک ہی ہے یہ بُت محض ایک واسطہ ہیں۔ جن کے ذریعہ الٰہی دربار تک پہنچا جاتا ہے ۔ حالانکہ جب اسلام نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ خدا ایک ہے تو اس وقت مکّہ کے لوگوں کو اس دعویٰ پر اسقدر حیرت ہوئی تھی کہ انہوں نے یہ کہنا شروع کر دیا تھا کہ اَجَعَلَ الْاٰلِهَةَ اِلٰهًا وَّاحِدًا۔ اِنَّ هٰذَا لَشَيْءٌ عُجَابٌ (ص ع۱) یعنی کیا اِس نے بہت سے معبودوں کو ایک معبود بنا دیا ہے۔ یہ تو بڑی عجیب بات ہے جو کبھی سُنی نہیں گئی ۔ گویا انہوں نے یہ سمجھا کہ معبود تو کئی ہیں مگر یہ شخص جو ایک خدا کہتا ہے تو شاید اس نے سب معبودوں کو کوٹ کاٹ کر ایک معبود بنا دیا۔ مگر اب ساری دنیا اسلامی توحید کو اپنا رہی ہے اور مشرک قومیں بھی شرک کرنے کے باوجود توحید کا انکار کرنے کی جرأت نہیں کر سکتیں ۔یہی حال دوسرے مسائل کا ہے ۔ یورپ ایک بڑی مدت تک اسلامی مسائل پر اعتراض کرتا رہا ۔ مگر اَب وہاں کے بعض اچھے تعلیم یافتہ اور اعلیٰ طبقہ کے لوگوں میں وہی باتیں جو پہلے اسلام کے خلاف سمجھی جاتی تھیں اب اُس کی

صداقت کا ثبوت سمجھی جانے لگی ہیں۔ میں جب اپنے علاج کے سلسلہ میں لنڈن گیا۔ تو میرے وہاں پہنچنے سے چند دن پہلے وہاں کا ایک مشہور میوزیشن جو لنڈن کے ایک بہت بڑے اوپیرا میں کام کرتا اور پیانو وغیرہ بجاتا ہے اس کے دل میں اسلام کی رغبت پیدا ہوئی۔ اور مجھے وہاں کے مبلغین نے بتایا کہ اس شخص کی اسلام کی طرف رغبت کی ایک عجیب وجہ ہے جو عام وجوہات سے بالکل اُلٹ ہے اور اس سے پتہ لگتا ہے کہ کس طرح اللہ تعالیٰ اِن لوگوں کے دماغوں میں تغیّر پیدا کر رہا ہے۔ کوئی زمانہ ایسا تھا کہ اسلام کے راستہ میں سب سے بڑی روک تعدّدِ ازدواج کا مسئلہ سمجھا جاتا تھا اور یورپ کے لوگ اصرار کرتے تھے کہ ایک سے زیادہ بیویاں کرنا سخت ظلم ہے مگر اب یہ حالت ہے کہ جب اس کے دل میں اسلام کی محبت پیدا ہوئی تو وہ پہلے بعض اور مسلمانوں کے پاس گیا اور اُس نے اُن سے پوچھا کہ اسلام کا تعدّدِ ازدواج کے متعلق کیا خیال ہے۔ انہوں نے کہا توبہ توبہ یہ بات تو دشمنوں کی طرف سے سخت بگاڑ کر پیش کی جاتی ہے اسلام میں کوئی ایسا حکم نہیں۔ یہ تو خاص خاص مجبوریوں اور شرطوں اور قیدوں کے ساتھ اجازت دی گئی ہے اُس نے بتایا کہ انہوں نے جب مجھے یہ جواب دیا تو میں جھٹ کھڑا ہو گیا اور میں نے کہا کہ مجھے تو اسلام میں یہی ایک خوبی نظر آئی ہے اور تم کہتے ہو کہ اس کے ساتھ کئی قسم کی قیدیں اور شرطیں ہیں۔ میں تو وہاں جانا چاہتا ہوں۔ جہاں مجھے سیدھی طرح بتایا جائے کہ اسلام اس کی اجازت دیتا ہے۔ چنانچہ اس کے بعد وہ ہمارے پاس آیا اور اُس نے پوچھا کہ اس بارہ میں اسلام کا کیا حکم ہے؟ ہمارے مبلغین نے بتایا کہ اسلام اِس کی اجازت دیتا ہے مگر اُس نے ساتھ ہی یہ بھی کہا ہے کہ تم انصاف سے کام لو اور ہر بیوی کا حق ادا کرو۔ وہ کہنے لگا یہ بات درست ہے اور میری عقل اسے تسلیم کرتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یورپ نے اس تعلیم کو چھوڑ کر بہت کچھ کھویا ہے اور ہم نے اپنے اخلاق بگاڑ لئے ہیں۔ اس لئے اب میں آپ کے پاس ہی آیا کرونگا۔ چنانچہ وہ خود بھی مجھے ملا اور اپنے بیوی بچوں کو بھی ہمارے گھر لایا۔

اسی طرح ایک جرمن عورت جو مسلمان ہو چکی تھی میرے پاس آئی۔ اُس نے باتوں باتوں میں ذکر کیا کہ جنرل نجیب نے مجھے سعودی عرب کے بادشاہ کے پاس بھیجا تھا اور اُس نے مجھ سے کہا تھا کہ میرے بیٹے کے ساتھ شادی کر لو۔ میں نے کہا۔ شکر کرو تم بچ گئیں کیونکہ اُن کی تو بہت سی بیویاں ہوتی ہیں۔ وہ کہنے لگی ساری بیویاں نہیں ہوتیں۔ اصلی بیوی ایک ہی ہوتی ہے۔ باقی سب داشتہ ہوتی ہیں۔ پھر کہنے لگی۔ جب اسلام نے مسلمانوں کو ایک سے زیادہ بیویاں کرنے کی اجازت دی ہے اور میں بھی مسلمان ہو گئی ہوں تو مجھے ایک سے زیادہ بیویوں پر کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ پھر وہ کہنے لگی میری کئی دفعہ پادریوں سے گفتگو ہوئی ہے ایک دفعہ ایک پادری نے تعدّدِ ازدواج کے خلاف تقریر کی تو میں نے کہا۔ تم بڑے بیوقوف ہو۔ عورت تو میں ہوں۔ سوکن مجھ پر آتی ہے یا تم پر آتی ہے۔ مجھے تو سوکن آنے پر کوئی اعتراض نہیں اور تم خواہ مخواہ چڑتے ہو۔ میں تو اسلام کے اس حکم کو غنیمت سمجھتی ہوں کیونکہ اسلام نے گو مرد کو ایک سے زیادہ بیویوں کی اجازت دی ہے مگر ساتھ ہی اُس نے یہ بھی کہا ہے کہ انہیں ایک جیسا کھانا کھلاؤ۔ ایک جیسے کپڑے دو۔ اور ایک جیسا مکان دو۔ جب یہ چیز موجود ہے تو عورتوں کو کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ ہم کورٹ شپ

کے بعد شادی کرتے ہیں مگر دو سال تک کورٹ شپ کرنے
کے باوجود پھر بھی لڑائی ہو جاتی ہے۔ اگر تعددِ ازدواج کی
صورت میں میرا خاوند مجھ سے لڑیگا تو اتنا تو ہوگا کہ
ایک مکان میرا ہوگا اور اُس کے ساتھ ہی دوسرا مکان
میری سوکن کا ہوگا اور اس کے ساتھ تیسرا مکان میری
تیسری سوکن کا ہوگا۔ مَیں شام کے وقت خاوند کا بازو
پکڑونگی اور اُسے دوسرے گھر میں دھکیل دونگی اور کہونگی
کہ سارا دن مَیں نے تیرا منحوس مُنہ دیکھا ہے اب دُوسری
بیوی تیرا مُنہ دیکھے۔ اگر یہ ہوتا کہ کورٹ شپ کی
وجہ سے ہماری کبھی لڑائی ہی نہ ہوتی تو پھر تو کوئی
بات بھی تھی لیکن جب ہماری بھی لڑائیاں ہوتی ہیں
تو پھر اسلام کی اس اجازت سے اتنا تو فائدہ ہو
سکتا ہے کہ جب خاوند کی عورت سے لڑائی ہو تو
وہ اُس کا بازو پکڑ کر اُسے دوسری بیوی کے گھر میں
دھکیل دے اور خود اُس کا غصّے والا چہرہ سارا دن
نہ دیکھتی رہے۔

مَیں نے یہی واقعہ اُس میوزیشن کو سنایا تو وہ
کہنے لگا۔ آپ وہاں کی بات کرتے ہیں۔ مَیں لنڈن میں
دس ہزار عورت ایسی دکھا سکتا ہوں جو اس بات کے
لئے تیار ہے کہ مرد اگر انصاف سے کام لیں تو بیشک
وہ کئی شادیاں کریں۔ مگر مشکل یہ ہے کہ ہمارے
ملک میں اخلاق اتنے بگڑ چکے ہیں کہ اچھے خاوند
میسّر نہیں آتے۔

اب دیکھو یہ کتنا بڑا تغیّر ہے جو اس میں پیدا ہو
رہا ہے۔ اسی طرح کئی لوگ مجھے ملے جنہوں نے کہا
کہ ہم نے بیس بیس تیس تیس سال سے شراب نہیں پی
کیونکہ ہم اسے بُرا سمجھتے ہیں۔ اسی طرح پہلے پردہ
پر اعتراض کیا جاتا تھا۔ مگر اب خود یورپ میں ایسے
لوگ پیدا ہو رہے ہیں جو پردہ کی ضرورت کو تسلیم
کرتے ہیں۔ بلکہ عجیب بات یہ ہے کہ جب مَیں یورپ
گیا تو وہی میوزیشن جس کا مَیں نے ابھی ذکر کیا ہے اُس نے
مجھ سے کہا کہ مَیں نے آپ کا دیباچہ تفسیر القرآن پڑھا
ہے جس سے میرے دل میں ایک شبہ پیدا ہوا ہے۔
مَیں نے کہا فرمایئے کیا شبہ پیدا ہوا ہے۔ کہنے لگا۔
اس کتاب میں آپ نے لکھا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ
علیہ وسلم ایک دفعہ مسجد میں عبادت کیلئے بیٹھے تھے کہ
آپ کی ایک بیوی آپ سے ملنے کے لئے آگئیں چونکہ
واپسی پر وقت رات ہو گئی تھی اس لئے آپ اپنی بیوی
کو گھر پہنچانے کے لئے ساتھ چل پڑے۔ راستہ میں
آپ کو ایک آدمی ملا۔ اُسے دیکھ کر آپ کو شبہ ہوا
کہ کہیں اسے ٹھوکر نہ لگ جائے اور یہ خیال نہ کرے
کہ مَیں کسی اَور کو ساتھ لئے جا رہا ہوں۔ چنانچہ آپ نے
اپنی بیوی کے مُنہ پر سے نقاب اٹھا دی اور اُسے
کہا کہ دیکھ لو یہ میری بیوی ہے (مسند احمد بن حنبل
جلد ۳ صفحہ ۱۵۶ و صفحہ ۲۸۵ و بخاری ابواب الاعتکاف)

وہ کہنے لگا جب مَیں نے یہ واقعہ پڑھا تو میرے دل
میں اعتراض پیدا ہوا کہ پردہ تو اسلام کے نہایت
اعلیٰ درجہ کے حکموں میں سے ایک حکم ہے۔ اور یہ
پاکیزگی کی جان ہے۔ اگر کوئی بدبخت شخص ایسا تھا
جس کے دل میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پچاس
ساٹھ سالہ زندگی کو دیکھ کر بھی شبہ پیدا ہوا تو
وہ بیشک جہنم میں جاتا۔ اس کی کیا حیثیت تھی کہ
محض اس کا ایمان بچانے کے لئے اپنی ایک بیوی
کے مُنہ پر سے پردہ اٹھا دیا جاتا جس شخص نے
اتنی مدت دراز تک رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی
خدمات کو دیکھا آپ کی قربانیوں کو دیکھا۔ آپ کے
ایمان کو دیکھا آپ کے اخلاص کو دیکھا آپ کی محبتِ
الٰہی کو دیکھا اور پھر بھی اس کے دل میں شبہ پیدا ہوا

وہ بدبخت اگر مرتا تھا تو بے شک مرتا۔ اس کے لئے
کیا ضرورت تھی کہ آپ اپنی کسی بیوی کے مُنہ پر سے
نقاب اُٹھا دیتے۔ مَیں نے اُسے کہا آخر آپ کو
یہی اعتراض ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے
ایک چھوٹی چیز کے لئے بڑی چیز کو کیوں قربان کر دیا۔
بیشک اُس کا ایمان بھی ایک قیمتی چیز تھی مگر بہرحال
وہ ایک کمزور انسان کا ایمان تھا۔ کیونکہ اُس نے
محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پاکیزگی پر شک کیا
اُس شخص کے ایمان کے بچانے کے لئے اپنی ایک
بیوی کا پردہ اُٹھا دینا ایک بڑی چیز کو چھوٹی چیز
کے لئے قربان کر دینا ہے۔ کہنے لگا ہاں میرے دل
میں یہی شبہ پیدا ہوا ہے۔ مَیں نے کہا۔ تو پھر
اِس کے معنے یہ ہیں کہ آپ تسلیم کرتے ہیں کہ چھوٹی چیز
کو بڑی چیز کے لئے قربان کر دینا چاہیئے۔ مگر اس
اصول کو مدّ نظر رکھتے ہوئے اگر اس مخصوص واقعہ کو
دیکھا جائے تو اِس میں اُس شخص کا ایمان بچانا بڑا
کام تھا اور بیوی کے مونہہ سے نقاب اُلٹ دینا
چھوٹی بات تھی۔ کہنے لگا کس طرح؟ مَیں نے کہا
یہ تو تم جانتے ہو کہ پردہ کا حکم پہلی شریعتوں میں
نہیں تھا۔ اور تم یہ بھی جانتے ہو کہ پردہ کا حکم
رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے آخری سالوں
میں نازل ہوا ہے۔ تیرہ سال تک رسول کریم صلی اللہ
علیہ وسلم مکہ میں رہے اور پردہ کا حکم نازل نہ ہوا
پھر مدینہ تشریف لائے تو وہاں بھی چار، پانچ سال
تک پردہ کا حکم نہیں اُترا۔ گویا رسول کریم صلی اللہ علیہ
وسلم کی دعوائے نبوت کے بعد جو تیئیس۲۳ سالہ زندگی
گذری ہے اُس میں سے سترہ اٹھارہ سال تک آپ کی
بیویوں نے پردہ نہیں کیا۔ اور جب پردہ کا حکم مدینہ
آنے کے بھی چار پانچ سال بعد نازل ہوا ہے تو
تمہیں یہ ماننا پڑیگا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
کی ہر بیوی کو قریبًا ہر صحابی نے دیکھا ہُوا تھا۔ اب
بتاؤ جس بیوی کو وہ سو دفعہ پہلے دیکھ چکا تھا اگر
ایک موقعہ پر اُس کا ایمان بچانے کے لئے آپ نے
اپنی اُس بیوی کا نقاب اُٹھا دیا تو اس میں کیا حرج
ہُوا۔ وہ آپ کی بیویوں کو جوانی کی حالت میں دیکھ
چکا تھا۔ اور اب تو وہ بڑی عمر کی ہو چکی تھیں۔ اِس
عمر میں اگر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی کسی
بیوی کے مونہہ سے نقاب اُلٹ دیا تو چاہے وہ کتنا
ہی کمزور ایمان والا شخص ہو اس کے ایمان کو بچانے
کے لئے آپ کا تھوڑی دیر کے لئے نقاب اُلٹ دینا
بالکل بے حقیقت بات تھی کیونکہ اُس بیوی کو اُس نے
جوانی کی حالت میں بھی دیکھا ہُوا تھا اور اب وہ بڑی
عمر کی ہو چکی تھیں۔ جوانی میں سو دفعہ دیکھنے والے شخص
کے سامنے اگر آپ نے بڑی عمر میں اپنی ایک بیوی کے
مونہہ سے اُس کا ایمان بچانے کے لئے تھوڑی دیر
کے لئے پردہ اٹھا دیا تو آپ نے بڑی چیز کو چھوٹی چیز
پر قربان نہیں کیا۔ بلکہ چھوٹی چیز کو بڑی چیز کے لئے
قربان کیا۔ اِس جواب سے وہ خوش ہو گیا۔ اور کہنے
لگا۔ اب میری سمجھ میں یہ بات آگئی ہے۔

اب غور کرو یہ کتنا بڑا تغیّر ہے کہ یا تو یہ
کہا جاتا تھا کہ چونکہ اسلام پردہ کا حکم دیتا ہے
اِس لئے جھوٹا ہے۔ اور یا یہ کہا جاتا ہے۔ کہ محمد
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رات کے وقت ایک
شخص کا ایمان بچانے کے لئے اپنی بیوی کے مونہہ پر
سے ایک منٹ کے لئے بھی نقاب کیوں اُتارا؟۔
ڈِتمنڈ شا انگلستان کے بہترین مصنفوں میں سے ہے
کم از کم وہ خود اپنے آپ کو ایچ۔ جی ویلز سے بھی
بڑا سمجھتا ہے۔ وہ مجھے ملا تو کہنے لگا کہ سب سے

وَاِنْ جٰدَلُوْكَ فَقُلِ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۶۹﴾

اور اگر وہ تجھ سے بحث کریں تو کہہ دے کہ اللہ (تعالیٰ) تمہارے اعمال سے خوب واقف ہے۔

اَللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كُنْتُمْ فِيْهِ

اللہ (تمہارے اور میرے درمیان) قیامت کے دن اُن اُمور میں فیصلہ کرے گا جن میں تم اختلاف

تَخْتَلِفُوْنَ ﴿۷۰﴾ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمَآءِ

رکھتے ہو۔ (اے محمد رسول اللہ!) کیا تجھے معلوم نہیں کہ اللہ (تعالیٰ) ہر چیز کو جو آسمان اور زمین میں ہے

وَالْاَرْضِ ۭ اِنَّ ذٰلِكَ فِيْ كِتٰبٍ ۭ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ ﴿۷۱﴾

جانتا ہے۔ یہ سب کچھ ایک کتاب میں لکھا ہُوا موجود ہے۔ اور اس طرح (کسی قانون کو محفوظ) کر دینا اللہ (تعالیٰ) کیلئے آسان ہے۔

بڑا ظلم یہ ہے کہ دنیا میں سب سے زیادہ امن پھیلانے والا جو نبی آیا اُس کو لڑائی کرنے والا نبی کہا جاتا ہے اور پادری اُس پر اعتراض کرتے ہیں۔ پھر وہ کہنے لگا شاید آپ مجھے پاگل قرار دینگے کہ عیسائی ہو کر میں ایسی باتیں کرتا ہوں۔ یہ ٹھیک ہے کہ میں عیسائی ہوں۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسیح ناصری سے بڑے تھے اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو اعلیٰ تعلیم دنیا میں لائے وہ مسیح ناصری نہیں لائے۔ آپ حیران ہوں گے کہ میں عیسائی ہو کر ایسی بات کر رہا ہوں لیکن میں سچی بات کا انکار کیسے کر سکتا ہوں۔ پھر جب میں اُسے رخصت کر کے اپنے کمرے کی طرف آیا۔ تو مجھے محسوس ہُوا کہ کوئی شخص میرے پیچھے پیچھے آرہا ہے۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو ڈسمنڈ شا آرہا تھا۔ کہنے لگا میرے دل میں ایک سوال پیدا ہُوا تھا۔ میں نے چاہا کہ آپ سے پُوچھ لوں۔ میں نے کہا۔ کیا سوال ہے۔ کہنے لگا جب میں یہ تقریر کرتا ہوں کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سب سے بڑے نبی تھے تو مجھے یوں معلوم ہوتا ہے کہ میری زبان سے خدا بول رہا ہے۔ مگر یہ عیسائی لوگ پھر بھی نہیں مانتے۔ میں نے کہا۔ مسٹر ڈسمنڈ شا: یہ لوگ صرف تمہاری آواز سُنتے ہیں۔ خدا تعالیٰ کی آواز نہیں سُنتے۔ لیکن جب یہ لوگ بھی خدا تعالیٰ کی آواز سُننے لگ گئے اور خدا تعالیٰ ان کے دلوں میں بھی بولا تو ان پر بھی اثر ہو جائیگا۔ اور یہ بھی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت کے قائل ہو جائیں گے۔ اس پر اُس کی تسلی ہوگئی۔

غرض اللہ تعالیٰ نے اِنَّكَ لَعَلٰى هُدًى مُّسْتَقِيْمٍ میں محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی صداقت کا یہ ثبوت پیش کیا ہے کہ دنیا ہزار انکار کرے وہ زمانکی ٹھوکریں کھانے کے بعد آخر اس تعلیم کی طرف آئیگی۔ جو تیری طرف سے پیش کی جا رہی ہے کیونکہ تو سیدھے راستہ پر قائم ہے اور لوگ ضلالت اور گمراہی کی تاریکیوں میں بھٹک رہے ہیں۔

وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ

اور وہ لوگ اللہ (تعالیٰ) کے سوا اُن چیزوں کی عبادت کرتے ہیں جن کے لیے اُس نے کوئی

بِهٖ سُلْطٰنًا وَّمَا لَيْسَ لَهُمْ بِهٖ عِلْمٌ ۭ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ

دلیل نہیں اتاری اور جن کے متعلق ان کو کسی قسم کا کوئی علم حاصل نہیں۔ اور ظالموں کا کوئی

مِنْ نَّصِيْرٍ ﴿۷۲﴾ وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ

مددگار نہیں ہوگا ۳۲ﮯ اور جب اُن کے سامنے ہماری کھلی کھلی آیات پڑھی جاتی ہیں

تَعْرِفُ فِيْ وُجُوْهِ الَّذِيْنَ كَفَرُوا الْمُنْكَرَ ۭ يَكَادُوْنَ

تو تو منکروں کے چہروں میں (صاف صاف) ناپسندیدگی (کے آثار) دیکھتا ہے۔ قریب ہوتا ہے کہ وہ

۳۲ﮯ حل لغات:۔ جَادَلُوْا۔ جَادَلَ سے جمع مذکر کا صیغہ ہے اور جَادَلَهٗ کے معنے ہیں خَاصَمَهٗ شَدِيْدًا۔ اُس کے ساتھ سختی سے لڑائی کی (اقرب)۔ پس جَادَلُوْكَ کے معنے ہونگے۔ اگر تیرے مخالف تیرے ساتھ سختی سے لڑائی اور جھگڑا کریں۔

جَادَلُوْا

يَسِيْرٌ: اَلْيَسِيْرُ کے معنے ہیں اَلْهَيِّنُ۔ آسان۔ اَلْقَلِيْلُ۔ تھوڑا (اقرب)

يَسِيْرٌ

تفسیر:۔ فرماتا ہے۔ اگر وہ کج بحثی سے کام لیں اور باوجود دلائل بیان کر دینے کے اور سیدھا راستہ دکھا دینے کے جھگڑیں۔ تو تو انہیں کہہ دے کہ اگر دین کی تعلیم سے تم ہدایت نہیں پاتے تو انجام کا انتظار کرو۔ اور دیکھو کہ عالم الغیب خدا کس کی مدد کرتا ہے۔

پھر مشرکین کے خلاف تین دلائل دیتا ہے۔

اوّل یہ کہ يَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا۔ وہ اللہ تعالیٰ کے سوا جن چیزوں کی پرستش کرتے ہیں اُن کی پرستش کے متعلق سابق الہامی کتابوں میں سے کوئی دلیل پیش نہیں کر سکتے محض اپنے باپ دادا کی اندھی تقلید میں اُنکی عبادت کرتے چلے جاتے ہیں۔

دوم۔ دوسرے یہ کہ وَمَا لَيْسَ لَهُمْ بِهٖ عِلْمٌ اُن معبودوں کے متعلق وہ اپنے ذاتی تجربہ اور مشاہدہ کی بناء پر بھی کوئی دلیل پیش کرنے سے عاجز ہیں۔ حالانکہ جب یہ معاملہ اُن کی اُخروی نجات کے ساتھ تعلق رکھتا تھا تو اُن کا فرض تھا کہ وہ محض دوسروں کی سُنی سُنائی باتوں کے پیچھے نہ چل پڑتے بلکہ اُن کے متعلق ذاتی تحقیق اور غور و فکر سے بھی کام لیتے۔ مگر انہوں نے سُنی سُنائی باتوں پر اکتفا کر لیا اور ذاتی بصیرت سے کام نہ لیا۔

سوم تیسرے یہ کہ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ نَّصِيْرٍ۔ مشرکین کا جب بھی موحدین سے مقابلہ ہو جائے۔ مشرک لوگ الٰہی مدد سے محروم رہتے ہیں اور اس طرح ثابت ہو جاتا ہے کہ وہ ایک غلط راستے پر جا رہے ہیں۔

يَسْطُوْنَ بِالَّذِيْنَ يَتْلُوْنَ عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا ؕ قُلْ

اُن لوگوں پر حملہ کر دیں جو اُن کو ہماری آیتیں پڑھ کر سُنا رہے ہوتے ہیں۔ تُو کہہ دے

اَفَاُنَبِّئُكُمْ بِشَرٍّ مِّنْ ذٰلِكُمْ ؕ اَلنَّارُ ؕ وَعَدَهَا اللّٰهُ

کیا میں تم کو اس حالت سے بھی ایک بُری حالت کی خبر دوں (اور وہ) جہنم (میں پڑنا) ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اُسکا وعدہ

۹ ع ۱۶

الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ؕ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿۷۲﴾ ع يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ ضُرِبَ مَثَلٌ

منکروں سے کیا ہے اور وہ بُرا ٹھکانہ ہے ۳۳ے اے لوگو! ایک بات تمہیں بتائی جاتی ہے

۳۳ے حل لغات:۔ اَلْمُنْكَرُ کے معنے ہیں مَالَيْسَ فِيْهِ رِضَى اللّٰهِ مِنْ قَوْلٍ اَوْ فِعْلٍ یعنی ہر وہ بات یا فعل جس میں خدا تعالیٰ کی رضا نہ ہو۔ اور اللہ تعالیٰ کو پسند نہ ہو اسے منکر کہتے ہیں (اقرب)

يَسْطُوْنَ۔ سَطَا سے مضارع جمع غائب کا صیغہ ہے۔ اور سَطَا عَلَيْهِ (يَسْطُوْ) کے معنے ہوتے ہیں صَالَ عَلَيْهِ وَوَثَبَ۔ اُس پر کود کر حملہ کیا۔ وَقِيْلَ قَهَرَهُ بِالْبَطْشِ اَوْ بَسَطَ عَلَيْهِ بِقَهْرِهٖ مِنْ فَوْقٍ۔ اور بعض علماء لغت کہتے ہیں کہ سَطَا کے معنوں کے اندر یہ مفہوم بھی پایا جاتا ہے کہ کسی پر سخت گرفت کر کے اُس کو دبانے کی کوشش کی یا اس پر دباؤ ڈالکر اُس کو کمزور کرنے کی کوشش کی۔ پس يَسْطُوْنَ کے معنے ہونگے (۱) وہ حملہ کرتے ہیں (۲) یا وہ ہر قسم کا دباؤ ڈال کر مومنوں کو تبلیغ سے روکنا چاہتے ہیں۔

اَلْمَصِيْرُ کے معنے ہیں۔ جانے کی جگہ (اقرب)

تفسیر:۔ فرماتا ہے۔ جو لوگ شرارتی ہوتے ہیں۔ حق بات سُن کر اُن کو غصہ آجاتا ہے۔ اور وہ مومنوں پر حملہ کرنے لگ جاتے ہیں اور ہر قسم کا دباؤ ڈال کر انہیں تبلیغ سے روکنا چاہتے ہیں۔ وہ یہ نہیں سمجھتے کہ حق بات کو ماننا خود اُن کے فائدہ کا موجب ہے۔ اور اگر وہ اسے نہیں مانیں گے تو دُکھ پائیں گے۔ وہ صرف جوش میں فتنہ و فساد پر آمادہ ہو جاتے ہیں اور مومنوں کو دُکھ دینا شروع کر دیتے ہیں۔

چنانچہ دیکھ لو۔ بانیٔ سلسلۂ احمدیہ نے جب یہ دعویٰ پیش کیا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام دوسرے تمام انبیاء کی طرح وفات پا چکے ہیں تو کس طرح سارے ہندوستان میں ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک ایک آگ لگ گئی اور مخالفت کا ایک طوفان اُمڈ آیا۔ علماء اپنے بستے کھول کر بیٹھ گئے اور لکھتے لکھتے اُن کی قلمیں گھِس گئیں۔ اور تقریریں کرتے کرتے اُن کی زبانوں پر آبلے پڑ گئے۔ انہوں نے بانیٔ سلسلہ احمدیہ کو کافر اور اکفر اور دجّال اور ضال اور مضل کہنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی اور عرب تک کے علماء سے آپ پر کفر کا فتویٰ لگوایا۔ مگر نتیجہ کیا ہوا۔ ہر دن جو نیا چڑھا اُس میں اُن کے چند ماننے والے اگر احمدی نہیں ہوئے تو حیاتِ مسیح کا انکار ضرور کرنے لگ گئے اور آج یہ کیفیت ہے کہ نئے تعلیمیافتہ آدمیوں میں سے ایک بھی حیاتِ مسیح کا قائل نظر نہیں آئے گا۔ بلکہ عام طور پر مسلمانوں سے اس مسئلہ پر گفتگو کی جائے تو وہ کہہ دیتے ہیں کہ

اَلْمُنْكَرُ
يَسْطُوْنَ
اَلْمَصِيْرُ

اِس مسئلہ میں رکھا ہی کیا ہے چلو اسے چھوڑو جس سے معلوم
ہوتا ہے کہ اُن کے دل اِس مسئلہ کی صداقت کو تسلیم
کرنے لگ گئے ہیں۔

اِسی طرح جب بانیٔ سلسلہ احمدیہ نے کہا۔ کہ
اللہ تعالیٰ نے ہر ملک میں اپنے انبیاء مبعوث فرمائے
ہیں تو ساری دنیا میں ایک آگ لگ گئی۔ اور لوگوں نے
کہا۔ دیکھو یہ رام اور کرشن کو بھی نبی قرار دے کر
کافروں کو خدا کا رسول قرار دیتا ہے لیکن آج شدید ترین
مخالف بھی اس مسئلہ کی صحت کو تسلیم کر چکے ہیں۔ اور
مخالف اخبارات میں اس بات پر کئی دفعہ مضامین شائع
ہوتے رہتے ہیں کہ اسلام پہلے انبیاء کی صداقت کا
بھی قائل ہے خواہ وہ یہودیوں کی طرف آئے ہوں یا
ہندوؤں اور زرتشتیوں وغیرہ کی طرف آئے ہوں۔

اِسی طرح بانیٔ سلسلہ احمدیہ نے جب قرآن کریم
کے کامل ہونیکا دعویٰ پیش کیا اور بتایا کہ قرآن کریم کی
کوئی آیت منسوخ نہیں تو علماء کہلانے والے اتنے
جوش میں آگئے کہ اُن کے مونہوں سے جھاگ اور اُنکی
آنکھوں سے شعلے نکلنے لگ گئے۔ مگر آج علماء یا
اُن عوام سے جو اسلام سے دلچسپی رکھتے ہیں پُوچھ
کر دیکھ لو۔ وہ قرآن مجید کی تمام آیتوں سے استدلال
کرینگے اور کسی آیت کے منسوخ ہونے کا نام بھی
نہیں لیں گے۔ یہی کیفیت ہر زمانہ میں رہی ہے جب
بھی خدا تعالیٰ کا کوئی نبی دنیا میں آیا۔ اور اُس نے
خدا تعالیٰ کا پیغام پہنچایا۔ لوگوں نے اُس کی مخالفت
شروع کر دی۔ اور اُسے سخت سے سخت اذیتیں
پہنچائیں۔ مگر آخر دنیا کو وہی تعلیم ماننی پڑی۔ جو
خدا تعالےٰ کے انبیاء کی طرف سے پیش کی گئی تھی اور
انہیں اپنی شکست تسلیم کرنی پڑی۔ مخالفین کے اِس
معاندانہ رویہ کا اللہ تعالےٰ اِس آیت میں ذکر کرتے
ہوئے بتاتا ہے کہ جب مخالفین کے سامنے ہماری کھلی
کھلی آیات پڑھی جاتی ہیں تو تُو منکروں کے چہروں میں
ناپسندیدگی کے آثار دیکھتا ہے اور قریب ہوتا ہے کہ
وہ اُن لوگوں پر حملہ کر دیں جو انہیں ہماری آیات سُناتے
ہیں۔ کیونکہ دلائل و براہین اور عقل و نقل کے میدان میں
اُن کا عجز ظاہر ہوتا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ہم ان لوگوں
پر دلیل کے ساتھ تو غالب نہیں آسکتے۔ ہمارے غلبہ کی
ایک ہی صورت ہے کہ ہم ڈنڈا اٹھائیں۔ اور ان لوگوں
کا سر پھوڑنا شروع کر دیں جو ہمیں اپنے عقائد سے
منحرف کرنا چاہتے ہیں۔ مگر مومن اُن کے مظالم پر صبر سے
کام لیتے ہیں۔ کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ اللہ تعالےٰ کی
یہی سنت ہے کہ وہ اپنے بندوں کو پہلے ابتلاؤں
کے دریاؤں میں سے گذارتا ہے اور پھر انہیں اپنے قرب
سے نوازتا ہے۔ آج تک دُنیا میں کوئی نبی بھی ایسا
نہیں آیا جس کی جماعت کو اللہ تعالیٰ نے سخت سے
سخت ابتلاؤں میں ڈال کر اس کا امتحان نہ لیا ہو۔
یا مصائب کی بھٹی میں ڈال کر اُسے صاف نہ کیا ہو۔
جب اللہ تعالیٰ کے بندوں نے اپنے خون سے یا اپنے
مال اور اپنے وطن اور اپنے عزیز و اقرباء کی قربانی
سے اپنے صدق پر مہر لگائی تب انہیں خدا تعالےٰ
کے حضور عزت بخشی گئی۔ اور وہ دُنیا میں بھی کامیاب
ہوئے اور آخرت میں بھی انہیں بلند درجات عطا
کئے گئے۔ پس مخالفین کی اذیتوں سے کبھی گھبرانا نہیں
چاہیئے۔ بلکہ صبر اور برداشت سے کام لیتے ہوئے
دعاؤں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی مدد حاصل کرنی چاہیئے
تمام دل اللہ تعالیٰ کے قبضہ و تصرف میں ہیں اور
وہ جب چاہے اُن کو ہدایت دے سکتا ہے۔ تاریخوں
میں لکھا ہے کہ غزوۂ حنین میں مکہ کا ایک مخالف
شخص جس کا نام شیبہ تھا مسلمانوں کی طرف سے

فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ

تم اُسے غور سے سُنو۔ تم جن کو اللہ (تعالےٰ) کے سوا پکارتے ہو

اللّٰهِ لَنْ يَّخْلُقُوْا ذُبَابًا وَّ لَوِ اجْتَمَعُوْا لَهٗ ؕ وَ

وہ ایک مکھی بھی پیدا نہیں کر سکیں گے خواہ سب کے سب جمع ہو جائیں۔ بلکہ

اس ارادہ کے ساتھ جنگ میں شامل ہو گیا کہ جب دونوں لشکر آپس میں ملیں گے تو میں موقعہ پاکر محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو قتل کر دونگا جب لڑائی تیز ہوئی اور دشمنوں کی تیر اندازی کی وجہ سے اسلامی لشکر میں بھاگڑ مچ گئی اور ایک وقت ایسا آیا جب رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے گرد صرف چند صحابہؓ رہ گئے تو شیبہ نے تلوار کھینچی اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب ہونا شروع کیا وہ خود کہتا ہے کہ جب میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف بڑھا تو مجھے یوں محسوس ہُوا کہ میرے اور آپ کے درمیان آگ کا ایک شعلہ بھڑک رہا ہے اور اگر میں اور قریب ہُوا تو وہ شعلہ مجھے بھسم کر کے رکھ دیگا اتنے میں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے مجھے دیکھ لیا۔ اور فرمایا شیبہ اِدھر آؤ۔ جب میں آپ کے قریب گیا تو آپ نے اپنا ہاتھ میرے سینہ پر پھیرا اور فرمایا۔ اے خدا! شیبہ کو ہر قسم کے شیطانی خیالات سے نجات عطا فرما۔ وہ کہتے ہیں۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ہاتھ پھیرنا تھا کہ خدا کی قسم میرے دل سے آپ کی ساری دشمنی اور عداوت جاتی رہی اور میرا دل آپ کی محبت سے بھر گیا۔ پھر آپ نے فرمایا شیبہ اب آگے بڑھو اور دشمن سے لڑو۔ تب میں آگے بڑھا اور میں نے دشمن سے لڑنا شروع کر دیا میرے دل میں اُسوقت سوائے اِس کے اور کوئی

خواہش نہیں تھی کہ میں اپنی جان قربان کر کے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بچاؤں اور خدا کی قسم اگر اُسوقت میرا باپ بھی زندہ ہوتا اور وہ میرے سامنے آجاتا تو میں اس کا سر اتارنے سے بھی دریغ نہ کرتا۔ پس مخالفتوں پر صبر اور دُعاؤں سے کام لینا چاہیئے۔ اور مایوسی کو کبھی اپنے قریب بھی پھٹکنے نہیں دینا چاہیئے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھو باوجود اِس کے کہ مکّہ والوں نے آپ کا مقابلہ کیا اور آپ کی تعلیم پر ہنسی اُڑائی پھر بھی آپ مایوس نہیں ہوئے۔ بلکہ آپ نے تبلیغ کے کام کو برابر جاری رکھا۔ آپ کا طریق تھا کہ جہاں بھی آپ کو کچھ آدمی اکٹھے بیٹھے نظر آتے آپ اُن کے پاس پہنچ جاتے اور فرماتے کہ اگر آپ لوگ اجازت دیں تو میں آپ کو کچھ خدا کی باتیں سُناؤں۔ چونکہ مکّہ والوں نے لوگوں میں یہ مشہور کر رکھا تھا کہ یہ شخص نعوذ باللہ پاگل ہو گیا ہے اِس لئے جب آپ اُن کے پاس جاتے تو وہ ایک دوسرے کو اشارہ کرتے ہوئے کہتے کہ یہ پاگل ہے اور آہستہ آہستہ وہاں سے کھسک جاتے۔ کئی لوگ آپ کے سر پر مٹی ڈال دیتے۔ کئی آپ سے تمسخر اور استہزاء سے پیش آتے۔ مگر آپ برابر رات اور دن اُن کو خدا تعالیٰ کا پیغام پہنچانے میں مصروف رہے اور آخر اُنہی میں سے ایسے لوگ پیدا ہو گئے جنہوں نے اسلام کے لئے اپنی جانیں تک قربان کر دیں۔ پس

إِنْ يَسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ شَيْئًا لَّا يَسْتَنْقِذُوْهُ مِنْهُ ط

اگر ایک مکھی اُن کے آگے سے کوئی چیز اُچک کر لے جائے تو وہ اُس چیز کو (بھی) چھڑا نہیں سکتے۔

ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوْبُ ﴿۷۴﴾

یہ دُعائیں مانگنے والا (بھی) اور جس سے دُعائیں مانگی جاتی ہیں (وہ بھی) کتنے کمزور ہیں! ۳۴؎

استقلال کے ساتھ تبلیغ میں مشغول رہنا اور دعاؤں کے ساتھ خدا تعالیٰ کی مدد اور اُس کی نصرت کو کھینچنا بھی کامیابی کا ذریعہ ہوتا ہے۔ جب تک کسی قوم میں اس قسم کی دیوانگی پیدا نہ ہو وہ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتی۔

۳۴؎ **حل لغات**:۔ اَلذُّبَابُ کے معنے مکھی کے ہیں۔ یہ لفظ شہد کی مکھی اور بھڑوں پر بھی بولا جاتا ہے۔ اِسی طرح اس کے معنے ہیں۔ اَلنُّحُوْمُ بِاَنْوَاعِهٖ۔ یعنی ہر قسم کا مچھر۔

تفسیر:۔ اِس جگہ اللہ تعالیٰ نے ایک نہایت زبردست دلیل شرک کے رد میں اور مشرکوں کی تباہی کی تائید میں پیش کرتا ہے۔ فرماتا ہے۔ کہ خدا کے سوا جو معبود ہیں انہوں نے تو کبھی ایک مکھی بھی پیدا نہیں کی۔ بلکہ اگر سب کے سب معبود جمع ہو جائیں تب بھی وہ ایک مکھی تک پیدا نہیں کر سکتے۔ اور اگر مکھی اُن کے کھانے میں سے کچھ اُٹھا کر لے جائے تو وہ واپس بھی نہیں لے سکتے۔ پس عبادت کرنے والا اور معبود دونوں ہی کتنے کمزور ہیں۔

اِس آیت کے ہوتے ہوئے مسلمانوں کا یہ کہنا نہایت تعجب انگیز ہے کہ حضرت مسیحؑ پرندے پیدا کیا کرتے تھے۔ قرآن کریم تو فرماتا ہے کہ سارے معبود مل کر ایک مکھی بھی نہیں بنا سکتے۔ اور ہمارے مفسر فرماتے ہیں کہ اکیلے مسیحؑ نے بہت سے پرندے پیدا کئے تھے۔

بانیٔ سلسلۂ احمدیہ نے ایک دفعہ ایک مولوی صاحب سے پُوچھا کہ آپ جو کہتے ہیں کہ حضرت مسیحؑ پرندے پیدا کیا کرتے تھے۔ تو جو پرندے ہمیں دنیا میں نظر آتے ہیں اُن میں سے کچھ خدا تعالیٰ کے پیدا کئے ہونگے اور کچھ مسیحؑ کے۔ کیا آپ ان دونوں میں کوئی امتیازی بات بتلا سکتے ہیں جس سے معلوم ہو سکے کہ کونسے خدا کے پیدا کردہ ہیں اور کون سے مسیحؑ کے۔ اِس پر وہ مولوی صاحب پنجابی میں بولے۔ " اے تے ہُن مشکل ہے۔ اوہ دونوں رَل مِل گئے نے۔ " یعنی یہ کام تو اب مشکل ہے۔ خدا تعالیٰ کے پیدا کردہ پرندے اور مسیحؑ کے پیدا کردہ پرندے آپس میں مل جُل گئے ہیں۔ اور اب ان دونوں میں امتیاز مشکل ہے۔

اَلذُّبَابُ

مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيْزٌ ﴿۷۵﴾

اِن لوگوں نے اللہ (تعالیٰ) کی صفات کا صحیح اندازہ نہیں لگایا۔ اللہ (تعالیٰ) تو یقیناً بڑی طاقت والا (اور) بڑا غالب ہے ۷۵

۷۵ حل لغات :- قَدَرَ اللّٰہَ کے معنے ہیں عَظَّمَہٗ ۔ اللہ تعالیٰ کی عظمت بیان کی (اقرب)

تفسیر :- فرماتا ہے۔ جو لوگ اللہ تعالےٰ کی توحید کا انکار کرتے ہیں۔ انہوں نے خدائی صفات کا کبھی پورا اندازہ نہیں کیا۔ اور یہی وجہ اُن کے ٹھوکر کھانے کی ہے۔ چنانچہ دیکھ لو جو لوگ خدا تعالےٰ کی توحید کے قائل نہیں یا وہ لوگ جو بعض اور ذرائع کو بیچ میں لانا چاہتے ہیں اُنکے اس عقیدہ کی بنیاد ہی اس امر پر ہے کہ ان کا دماغ یہ تسلیم کرنے کیلئے تیار نہیں ہوتا کہ ایک ایسی ہستی بھی ہے جو سب دنیا کو دیکھ رہی ہے اور سب لوگوں کی آوازوں کو سُن رہی ہے۔ وہ خیال کرتے ہیں کہ بعض ایسے درمیانی واسطوں کی ضرورت ہے جن میں خدائی طاقتیں تقسیم ہوں اور جو اپنی اپنی جگہ اُن طاقتوں کو استعمال کر رہے ہوں اِس دھوکا کی بڑی وجہ یہی ہے کہ انہوں نے خدا تعالیٰ کی طاقتوں کا اندازہ اپنی طاقتوں کے لحاظ سے کیا۔ اور خدائی طاقتوں کا انسانی طاقتوں پر قیاس کر لیا انہوں نے دیکھا کہ انسان جب ایک طرف نگاہ کرتے ہیں تو دوسری طرف کی چیزیں انہیں نظر نہیں آتیں۔ پس انہوں نے خیال کر لیا کہ خدا تعالیٰ کی نظر بھی محدود ہے۔ پھر جب انسانوں نے دیکھا کہ ہم ہر جگہ کی آواز ایک وقت میں نہیں سُن سکتے تو خیال کر لیا کہ خدا تعالیٰ بھی ہر جگہ کی آواز ایک وقت میں نہیں سُن سکتا۔ غرض انسانی طاقتوں پر خدائی طاقتوں کا جب انہوں نے قیاس کیا تو انہیں ضرورت محسوس ہوئی کہ خدا تعالےٰ کے بعض شریک مقرر کریں۔ اسی خیال کے نتیجے میں بعض فلسفیوں کا عقیدہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کو کلی علم ہے۔ جزئی نہیں۔ یعنی اُسے یہ تو پتہ ہے کہ انسان روٹی کھایا کرتا ہے۔ مگر اُسے یہ پتہ نہیں کہ زید اِس وقت روٹی کھا رہا ہے۔ اُسے یہ تو علم ہے کہ انسانوں کے گھروں میں بچے پیدا ہُوا کرتے ہیں مگر اُسے یہ علم نہیں کہ اس وقت زید یا بکر کے گھر میں بچہ پیدا ہو رہا ہے۔ اب اس خیال کی بنیاد اسی امر پر ہے کہ انسان اپنی محدود طاقتوں سے خدا تعالےٰ کی طاقتوں کا اندازہ لگاتا ہے۔ مگر آج دیکھو وہ کمزور انسان جو خدا تعالیٰ کی طاقتوں کو گرا رہے تھے انہیں خدا نے کہا کہ تم ہماری طاقتوں کا تو اندازہ ہی نہیں لگا سکتے آؤ میں تمہاری اپنی طاقتوں کو اُجاگر کرتا ہوں اور تمہیں بتاتا ہوں کہ تم اپنی آواز کو کہاں کہاں تک پہنچا سکتے ہو۔ اور تم کتنی دُور دُور کی آواز بخوبی سُن سکتے ہو۔ چنانچہ اُس نے وائرلیس ایجاد کروا کے بتا دیا کہ جب تمہاری جیسی ذلیل اور حقیر ہستی ساری دنیا کی آوازیں وائرلیس کے ذریعہ سُن سکتی اور ساری دنیا میں اپنی آواز پہنچا سکتی ہے تو کیا وہ خدا جو تم کو پیدا کرنے والا ہے وہ تمہاری آوازیں نہیں سُن سکتا؟ آج جب انگلستان کا ایک ڈوم یا میراثی یا ایک گانے والی کنچنی ساری دُنیا میں اپنی آواز پہنچا رہی ہوتی ہے تو فضا کی ہر حرکت اور آواز کی ہر جنبش یورپ کے فلسفیوں پر قہقہے لگا رہی ہوتی ہے اور کہتی ہے۔ کمبختو! اب بتاؤ۔ کیا خدا تعالیٰ ساری دُنیا کی آوازیں نہیں سُن سکتا؟ اِسی طرح اب بڑی بڑی دُوربینیں نکل چکی ہیں جن سے لاکھوں میل دُور کے

قَدَرَ اللّٰہَ

اَللّٰهُ يَصْطَفِيْ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا وَّمِنَ النَّاسِ

اللہ (تعالیٰ) فرشتوں میں سے اپنے رسول منتخب کرتا ہے اور (اسی طرح) انسانوں میں سے (بھی)

اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌۢ بَصِيْرٌ ﴿۷۶﴾

اللہ (تعالیٰ) بہت (دُعائیں) سُننے والا (اور حالات کو) بہت دیکھنے والا ہے ۵۳۶

ستاروں کی حرکات کا بھی اندازہ لگایا جا سکتا ہے اور اب تو وائرلیس نے ترقی کرتے کرتے یہ صورت اختیار کر لی ہے کہ شکلیں بھی دُور دُور تک دکھا دی جاتی ہیں غرض وہ جو واہمہ پیدا ہو گیا تھا کہ خدا کس طرح ساری دنیا کو دیکھ سکتا ہے اور کس طرح ساری دنیا کی آوازیں سُن سکتا ہے اِس ترقی نے اسے دُور کر دیا اور بتا دیا کہ جب معمولی انسان میں بھی اللہ تعالیٰ نے ایسی قابلیت رکھی ہے کہ وہ اپنی آواز تمام دنیا کو سُنا سکتا ہے اور دنیا کے دوسرے کنارے کے آدمی کی بات کو بآسانی سُن سکتا ہے اور نہ صرف آواز سُن سکتا ہے بلکہ اُس کی شکل بھی دیکھ سکتا ہے تو کیا خدائے ذوالجلال جس کے ہاتھ میں سب کچھ ہے وہ ہر چیز کو نہیں دیکھ سکتا اور ہر شخص کی آواز کو نہیں سُن سکتا؟ اور جب وہ ہر چیز کو دیکھتا اور ہر شخص کی آواز کو سُنتا ہے تو اُس کے لئے کسی اَور مددگار خدا کی کیا ضرورت رہی؟ وہ اکیلا ہی ساری دنیا پر حاوی ہے اور اکیلا ہی سب پر حکومت کر رہا ہے۔

غرض مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ میں اللہ تعالیٰ نے مشرکین کی اِس بنیادی غلطی کی طرف توجہ دلائی ہے کہ وہ انسانی طاقتوں پر قیاس کر کے خدائی طاقتوں کو نظر انداز کر دیتے ہیں اور اس طرح شرک جیسے گندے عقیدے میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

۵۳۶ **حل لغات**:- يَصْطَفِيْ۔ اِصْطَفٰى سے مضارع کا صیغہ ہے اور اِصْطَفَاهُ کے معنے ہیں اِخْتَارَهٗ۔ اُس کو چُن لیا۔ (اقرب) پس يَصْطَفِيْ کے معنے ہیں۔ چنتا ہے اور چنتا رہے گا۔

تفسیر:- فرماتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیشہ ہی ملائکہ کو اپنے پاک بندوں پر نازل کرتا رہے گا اور اسی طرح انسانوں میں سے بھی پاک لوگوں کو اپنا رسول بنا کر بھیجتا رہے گا۔ کیونکہ وہ دُعائیں سُنتا ہے اور انسانوں کے حالات کو دیکھتا ہے۔ جب کبھی کسی انسان کی روح آسمانی پانی کے لئے پکارے گی۔ اللہ تعالیٰ اُس پر آسمان سے پانی اُتارے گا اور جب کبھی وہ دیکھے گا کہ اس کے بندے ہدایت سے دُور جا رہے ہیں۔ وہ اُن کی ہدایت کے لئے اپنے پاک بندوں کو مامور کرتا رہے گا۔

اس آیت سے پہلے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مخاطبین کا ذکر ہے۔ آپ سے پہلے لوگوں کا ذکر نہیں۔ اور چونکہ اس میں صاف طور پر بیان کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ ملائکہ میں سے اور انسانوں میں سے اپنے رسول چنتا ہے۔ اور چنتا رہیگا جیسا کہ فعل مضارع سے ظاہر ہے جو اسجگہ استعمال کیا گیا ہے۔ اس لئے یہ آیت واضح طور پر اُمتِ محمدیہ میں اجرائے نبوت کے مسئلہ پر روشنی ڈالتی ہے اور اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُمتِ محمدیہ میں بھی بعض انسان خدا تعالیٰ کی طرف سے رسالت کے مقام پر کھڑے کئے جاتے رہیں گے۔

يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ ۚ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ

جو کچھ اُن کے سامنے ہے اُسے بھی وہ جانتا ہے اور جو کچھ وہ پیچھے کر آئے ہیں اُسے بھی جانتا ہے اور سب معاملے اُسی کی طرف

الْاُمُوْرُ ﴿۷۷﴾ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ارْكَعُوْا وَاسْجُدُوْا وَاعْبُدُوْا

لوٹائے جاتے ہیں ۳۷؎ اے مومنو! رکوع کرو اور سجدہ کرو اور اپنے رب کی عبادت

رَبَّكُمْ وَافْعَلُوا الْخَيْرَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۷۸﴾ السجدۃ

کرو اور نیک کام کرو تاکہ تم اپنے مقصود کو پا لو۔ ۳۸؎

۳۷؎ تفسیر:۔ یعنی اللہ تعالیٰ انسان کے اعمال کو بھی جانتا ہے۔ اور جو وہ نہیں کر سکا اُس کو بھی جانتا ہے اور سب امور اُسی کی طرف لوٹائے جاتے ہیں۔ پھر کس طرح ہو سکتا ہے کہ وہ ضرورت کے وقت ہدایت نہ دے۔ کیونکہ اس صورت میں جب بندے اس کے پاس پیش ہونگے اور اُن سے ان کے کئے ہوئے کاموں اور نہ کئے ہوئے کاموں کے متعلق سوال کیا جائیگا تو وہ یہ کہنے کے حقدار ہونگے کہ حضور نے موقع پر ہماری طرف ہدایت تو بھیجی نہیں ہمارا کیا قصور؟

يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ نبوت کا اِعطاء صرف ماضی پر نہیں بلکہ آئندہ کی قابلیتوں پر بھی ہوتا ہے۔ اسی لئے اس کا ذکر رسولوں کے انتخاب کے ساتھ ملا کر کیا گیا ہے۔

۳۸؎ حل لغات:۔ اِرْكَعُوْا امر مخاطب کا صیغہ ہے اور رَكَعَ الْمُصَلِّيْ رَكْعًا وَرُكُوْعًا کے معنے ہیں طَاْطَاَ رَاْسَهٗ۔ نمازی نے اپنا سر نیچے کیا۔ اور جب رَكَعَ اِلَى اللّٰهِ کہیں تو معنے ہونگے اِطْمَاَنَّ اِلَيْهِ۔ اُس نے اللہ تعالیٰ سے دل لگا کر تسلی پائی۔ نیز رَكَعَ الرَّجُلُ کے معنے ہیں اِنْحَطَّتْ حَالَتُهٗ وَافْتَقَرَ۔ اُس کی مالی حالت کمزور ہو گئی اور وہ محتاج ہو گیا (یہ مجازی معنے ہیں) اور رَكَعَ الْمُصَلِّيْ فِي الصَّلٰوةِ رُكُوْعًا کے معنے ہیں۔ خَفَضَ رَاْسَهٗ بَعْدَ قَوْمَةِ الْقِرَاءَةِ حَتّٰى تَنَالَ رَاحَتَاهُ رُكْبَتَيْهِ اَوْ حَتّٰى يَطْمَئِنَّ ظَهْرُهٗ نمازی نے قرأت کے بعد گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر کر جھکایا نیز لکھا ہے وَالرَّاكِعُ كُلُّ شَيْءٍ يَخْفِضُ رَاْسَهٗ۔ ہر وہ چیز جس کا سر نیچے کی طرف جھکا ہوا ہو اس کیلئے راکع کا لفظ استعمال کرتے ہیں (اقرب)، تاج العروس میں ہے۔ امام ثعلب کہتے ہیں اَلرُّكُوْعُ: اَلْخُضُوْعُ یعنی رکوع کے معنے عاجزی کرنے کے ہوتے ہیں۔ وَكَانَتِ الْعَرَبُ فِي الْجَاهِلِيَّةِ تُسَمِّي الْحَنِيْفَ رَاكِعًا اِذَا لَمْ يَعْبُدِ الْاَوْثَانَ وَيَقُوْلُوْنَ رَكَعَ اِلَى اللّٰهِ۔ اور عرب لوگ قبل اسلام موحدین کو راکع کہتے تھے کیونکہ وہ بتوں کی پوجا نہ کرتے تھے۔ اور اُن کے لئے راکع کا لفظ اسلئے استعمال کرتے تھے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی طرف توجہ کی تھی اور اس کے سامنے عاجزی اختیار کی تھی۔ الغرض رَكَعَ کے لفظ کے اندر عاجزی اور تذلل کے معنے پائے جاتے ہیں۔ پس رَاكِعٌ کے معنے ہونگے (۱) عاجزی کرنیوالا (۲) اللہ تعالیٰ کی خالص پرستش کرنے والا۔ اور اِرْكَعُوْا کے معنے ہونگے (۱) تم عاجزی کرو (۲) اللہ تعالیٰ کی خالص پرستش کرو اور توحید پر پوری طرح قائم ہو جاؤ۔

اِرْكَعُوْا

اُسْجُدُوْا

اُسْجُدُوْا۔ سَجَدَ کے معنے ہیں خَضَعَ وَانْحَنٰی اُس نے عاجزی اختیار کی اور اپنے عجز کا اظہار کرنے کے لئے جُھک گیا۔ اور سَجَدَ الْبَعِیْرُ کے معنے ہوتے ہیں خَفَضَ رَأْسَهٗ اونٹ نے اپنا سر نیچے کر لیا۔ اور سَجَدَتِ السَّفِیْنَةُ الرِّیَاحَ کے معنے ہوتے ہیں اَطَاعَتْهَا وَمَالَتْ بِمَیْلِهَا. کشتی نے ہوا کی پیروی کی اور اُسے جدھر ہوا لے گئی اُدھر چل پڑی۔ اِسی طرح اہلِ عرب کہتے ہیں کہ فُلَانٌ سَاجِدُ الْمَنْخَرِ اور مراد یہ ہوتی ہے کہ ذَلِیْلٌ خَاضِعٌ. فلاں شخص نہایت مطیع ہے۔ اور عجز وانکسار کا مادہ اپنے اندر رکھتا ہے (اقرب) پس اُسْجُدُوْا کے معنے یہ ہونگے کہ تم اللہ تعالیٰ کی کامل اطاعت اور فرمانبرداری کرو۔

تفسیر:- اِن آیات میں مومنوں کو ان فرائض کی طرف توجہ دلائی گئی ہے جو الٰہی جماعتوں کو کامیاب بنانے میں ممد ہوتے ہیں۔ اور جن کے بغیر غلبہ کا حصول ناممکن ہوتا ہے۔ یہ امر یاد رکھنا چاہیئے کہ دنیوی جماعتوں کا طریقِ کار بالکل علیحدہ ہوتا ہے اور اُن پر دینی جماعتوں کا قیاس نہیں کیا جا سکتا۔ دنیوی جماعتوں کے لئے ضروری نہیں ہوتا کہ وہ سچ سے کام لیں۔ وہ جھوٹ۔ فریب اور دغا بازی سے کام لیتی ہیں اور اِس طرح ہر ممکن ذریعہ سے کامیابی حاصل کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ مگر یہ ہتھیار جو عام طور پر دنیا میں کامیابی کا ذریعہ سمجھے جاتے ہیں دین میں اِن کو بالکل حرام قرار دیا گیا ہے۔ دنیوی امور میں لوگ جھوٹ سے کام لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جھوٹ کے بغیر گذارہ نہیں وہ فریب سے کام لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ فریب کے بغیر گذارہ نہیں۔ وہ منافقت سے کام لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ منافقت کے بغیر گذارہ نہیں۔ جب ایک قوم دوسری قوم کو نقصان پہنچانا چاہتی ہے۔ جب اس کی ساری قوتیں دوسری قوم پر حملہ کرنے کے لئے مجتمع ہو رہی ہوتی ہیں۔ جب اس کے سارے محکمے اپنے کیل کانٹے درست کر رہے ہوتے ہیں اُس وقت دنیا دار حکومتیں بڑے زور سے یہ اعلان کرتی سُنائی دیتی ہیں کہ ہمارے تعلقات اس حکومت سے بڑے اچھے ہیں اور جب وہ جنگ کا فیصلہ کر چکی ہوتی ہیں۔ اُن کے مدبّر بڑے زور شور سے یہ اعلان کر رہے ہوتے ہیں کہ ہم صلح کے لئے ہر ممکن تدابیر اختیار کریں گے۔ مگر اُن کی غرض اِن اعلانات سے یہ ہوتی ہے کہ اگر ہمارا دشمن بیوقوف بنایا جا سکے تو اُسے بیوقوف بنائیں۔ اس کے مقابلہ میں اُن کا دشمن بھی اِسی طرح کر رہا ہوتا ہے جس طرح وہ کر رہے ہوتے ہیں۔ وہ بھی دھوکا اور فریب اور جھوٹ استعمال کر رہا ہوتا ہے۔ مگر دین کے ساتھ تعلق رکھنے والی جماعتوں کو اس قسم کا طریق اختیار کرنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ انہیں اگر کہا جاتا ہے تو یہ کہ تمہیں اچانک حملہ کرنے کی اجازت نہیں اور اگر تمہارا کسی قوم کے ساتھ معاہدہ ہے اور تم دیکھتے ہو کہ دوسرا فریق اس معاہدہ کی خلاف ورزی کر رہا ہے تو ایک لمبا عرصہ قبل یہ اعلان کر دو کہ ہمارا تمہارا معاہدہ ختم ہے اس کے بعد اگر تم چاہو تو دوسری قوم سے لڑ سکتے ہو پس دینی قوموں کے لئے مشکلات بہت زیادہ ہوتی ہیں کیونکہ جن تدابیر کو دنیا اختیار کر سکتی ہے اُن کو وہ تدابیر اختیار کرنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ اِس لئے عقلی طور پر کوئی ایسا قائم مقام ہونا چاہیئے جو جھوٹ اور فریب اور دغا کے مقابلہ میں نیکوں کا سہارا ہو۔ اِس سہارے کا اللہ تعالیٰ نے اِن آیات میں ذکر کیا ہے۔

فرماتا ہے یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا ارْكَعُوْا. اے مومنو! تم رکوع کرو۔ رکوع سے مراد اِس جگہ نماز والا رکوع نہیں۔ بلکہ رکوع کے معنے نماز کے علاوہ

بھی ہوتے ہیں ۔ اور وہ معنے یہ ہیں کہ خدا تعالیٰ کی توحید
پر کامل ایمان رکھتے ہوئے اُس کی طرف جھک جانا۔
اور ماسوی اللہ کا خیال اپنے دل سے بکلّی نکال دینا
گویا کامل توحید کے خیالات دل میں پیدا کرلینا اور
ماسوی کی عبادت، اُس پر انحصار اور توکل اور امید کا
دل سے خیال نکال دینا۔ اس کا نام عربی زبان میں
رکوع ہے ۔ چنانچہ عربی زبان کا محاورہ ہے کہ فُلَانٌ
رَکَعَ اِلَی اللّٰہِ ۔ فلاں شخص ہر ایک دنیوی چیز کا خیال
دل سے نکال کر خدا تعالیٰ کی طرف جُھک گیا ۔ پس
اسجگہ رکوع سے مراد وہ رکوع نہیں جو نماز میں
کیا جاتا ہے ۔ کیونکہ وہ رکوع ہم علیحدہ نہیں کرتے بلکہ
نماز کا ایک حصّہ ہوتا ہے ۔ خالی رکوع اسلام میں کہیں
ثابت نہیں اور خالی سجدہ اسلام میں شکریہ یا تلاوت
قرآن کریم کے سوا عبادت کے طور پر ثابت نہیں۔ بلکہ
خالی سجدہ تو دُعا کے موقعہ پر کبھی لیا جاتا ہے خالی
رکوع کا رسمًا بھی اسلام میں کوئی ثبوت نہیں ملتا پس
رکوع سے مراد یہاں گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر جُھک جانا
نہیں بلکہ ماسوی اللہ کا خیال اپنے دل سے نکال کر
کامل توحید پر ایمان رکھتے ہوئے خدا تعالیٰ کی طرف توجہ
کرنے کا نام رکوع رکھا گیا ہے ۔ یہ گویا مومن کیلئے
ان چیزوں کا قائم مقام ہو جاتا ہے جن کو چھوڑنے
کا اُسے حکم ہے ۔

رکوع کا لفظ اصل میں اسی لئے استعمال کیا گیا
ہے کہ رکوع میں ایک چیز ٹیڑھی ہو جاتی ہے اور
سہارا ہمیشہ ٹیڑھا ہو کر لیا جاتا ہے ۔ جو شخص سیدھا
کھڑا ہوگا وہ سہارا نہیں لے سکتا اور اگر وہ سہارا
لینا چاہیگا تو اُسی وقت لے سکیگا جب وہ ٹیڑھا
ہو گا ۔ تو وَارْکَعُوْا کے معنے دراصل خدا تعالےٰ پر
سہارا لینا اور اُس کے اُوپر جُھک جانا ہے ۔ جھوٹ
فریب اور منافقت یہ دُنیا کے سہارے ہیں ۔ اللہ تعالیٰ
فرماتا ہے کہ یہ تو بڑے گندے سہارے ہیں ان کو
چھوڑو اور ان کے قریب بھی مت پھٹکو ۔ جب
دنیا کے سہارے ایک انسان سے لے لئے جائیں تو
لازمًا وہ کسی اور سہارے کا محتاج ہو گا ۔ کیونکہ انسان
سخت کمزور اور بے بس ہے ۔ ایک کمزور انسان جو بیمار
بھی ہو کروچز CRUTCHES پر چلتا ہے یا کھڑا ہوتا
ہے تو دیوار کی ٹیک لگا لیتا ہے ۔ یا دم لینے کے لئے
کُرسی پر جا بیٹھتا ہے ۔ یا اگر لیٹے لیٹے سر اٹھاتا ہے تو
کہنی کا سہارا لے لیتا ہے ۔ یا گاؤتکیہ اپنے پیچھے رکھ
لیتا ہے ۔ تو کمزوری اور بیماری کے وقت انسان کو
دوسری چیزوں کے سہارے کی ضرورت ہوتی ہے چونکہ
انسان عالم روحانی میں سخت کمزور ہے ۔ اور ہزاروں
خفیہ باتیں ایسی پیدا ہو جاتی ہیں جو اس کی ترقی کی راہ
میں روک بن کر حائل ہو جاتی ہیں ۔ اس لئے اس عالم
میں بھی وہ کسی نہ کسی سہارے کا محتاج ہوتا ہے ۔ دنیادار
شخص ایسے موقعہ پر دغا، فریب ، جھوٹ اور مکّاری کا
سہارا لیتا ہے مگر مومنوں کو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ تم
ان امور سے بچو ۔ تم نہ فریب سے کام لو، نہ جھوٹ
سے کام لو ، نہ دھوکا سے کام لو اور نہ کسی ناجائز
ہتھیار کو استعمال کرو ۔ اب جبکہ ایک کمزور انسان
کے تمام دنیوی سہارے شریعت نے لے لئے تو سوال
پیدا ہوتا ہے کہ وہ کیا کرے ۔ سہارا تو ایک کمزور انسان
کے لئے ضروری تھا اور اس سے سہارے کو لے لینا
ایسا ہی ہے جیسے ایک لُنجے کی سوٹیاں لے لی جائیں
یا بیمار کے نیچے سے گاؤتکیہ نکال لیا جائے ۔ یا ایک
کمزور انسان جب کرسی پر بیٹھنے لگے تو اُس کے نیچے
سے کرسی کھینچ لی جائے ۔ ایسی حالت میں اُسے لازمًا
کسی اور سہارے کی ضرورت پیش آئے گی اور وہ کہیگا

میں کس پر سہارا لوں، میں تو گر جاؤنگا - اللہ تعالیٰ نے
اِس آیت میں اس کا جواب دیا ہے۔ فرماتا ہے ارْكَعُوْا
تم ہمارے اوپر سہارا لے لو - اور ہم پر جُھک جاؤ - یہ
ایسی ہی بات ہے جیسے کوئی انسان دوسرے کمزور انسان
کی سونٹی توڑ دے مگر اپنا کندھا اُس کے سامنے پیش
کردے اور کہے کہ میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر چلو -
اِسی طرح جب ناجائز ہتھیاروں اور ناجائز سہاروں
سے اللہ تعالیٰ نے منع کر دیا تو فرمایا۔ چونکہ تمہیں کسی نہ کسی
سہارے کی ضرورت ہے۔ اِس لئے ہم تمہیں کہتے ہیں تم
ہم پر جُھک جاؤ - اور ہمارا سہارا لے لو - تو ارْكَعُوْا
کا لفظ توکّل علی اللہ پر دلالت کرتا ہے اور اس میں یہ
سبق سکھایا گیا ہے کہ مومن کو اللہ تعالیٰ کی ذات پر
توکّل کرنا چاہیئے اور سمجھ لینا چاہیئے کہ میرے کاموں
میں جو نقائص ہیں خدا تعالیٰ اُن کا خود ذمہ وار ہے -
کیونکہ جب کامیابی کے حصول کی ناجائز دنیوی تدبیروں
سے اُس نے منع کر دیا ہے تو اب وہ ہمارا خود ذمہ وار
ہے - اور وہ آپ ہمارے نقصوں اور ہماری خامیوں کو پُورا
کرے گا -

پھر فرماتا ہے۔ وَاسْجُدُوْا وَاعْبُدُوْا رَبَّكُمْ
یہاں وَاسْجُدُوْا میں جو سجدہ کا لفظ آیا ہے۔ اِس
سے مراد بھی نماز والا سجدہ نہیں اِس لئے کہ آگے وَاعْبُدُوْا
رَبَّكُمْ کے الفاظ آتے ہیں جن میں سجدہ بھی شامل ہے
پس اسجگہ سجدہ سے مراد بھی وہ سجدہ نہیں جو ہم
زمین پر کرتے ہیں۔ بلکہ وَاسْجُدُوْا کے معنے ہیں - اے
مومنو! تم کامل فرمانبرداری سے کام لو اور اللہ تعالیٰ
کے احکام کی پوری اتباع کرو اور جس طرح وہ حکم دیتا
ہے اُسی طرح کرو - چاہے وہ حکم تمہاری سمجھ میں آئے
یا نہ آئے - بسا اوقات انسان ایک چیز کے متعلق
جانتا ہے کہ وہ خدا تعالیٰ کی طرف سے پیش کی گئی ہے
مگر اپنی نادانی سے سمجھتا ہے کہ اس میں میری تباہی اور بربادی
ہے لیکن جب وہ خدا تعالیٰ کی رضا کے حصول کے لئے اس
چیز کو اختیار کر لیتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی خود حفاظت
کرتا ہے اور بجائے اس کے کہ وہ تباہ ہو اُس پر انعامات
کا نزول شروع ہو جاتا ہے - حدیثوں میں اس کی ایک
نہایت ہی لطیف مثال بیان کی گئی ہے کہ کس طرح وہ لوگ
جو خدا تعالیٰ کے لئے تکلیفیں اُٹھاتے اور بظاہر اپنے آپکو
ہلاکت کے گڑھوں میں گراتے چلے جاتے ہیں انجام کار اللہ
تعالیٰ کے فضلوں کے وارث بن جاتے ہیں - اور تباہی کے
سامانوں میں اُن کے لئے برکت کے سامان پیدا کر دیئے
جاتے ہیں -

حدیثوں میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن
اپنے ایک بندے سے کہیگا کہ دوزخ میں کود جا - بندہ
بے دھڑک دوزخ میں کود جائیگا اور کہیگا جب مجھے میرے
رب کا یہی حکم ہے کہ میں دوزخ میں کود جاؤں تو مجھے
دوزخ ہی منظور ہے - مگر جب وہ اُس میں کودے گا تو
دوزخ اُس کے لئے نہایت آرام دہ جنّت بن جائیگا اور
وہ آگ سے کھیلنے لگ جائیگا - اللہ تعالیٰ اِسپر کہے گا -
دیکھو میرا بندہ آگ سے کیسا خوش ہو رہا ہے - یہ مثال
درحقیقت اسی بات کی ہے کہ وہ لوگ جو خدا تعالیٰ کے
دین کے لئے قربانی کرکے بظاہر اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالتے
ہیں - اللہ تعالیٰ انہی ہلاکت کے سامانوں میں اُن کے لئے
ترقی کے سامان پیدا کر دیتا ہے - بظاہر دنیا سمجھتی ہے
کہ وہ آگ میں کود رہے ہیں مگر جب وہ اس آگ میں کود
جاتے ہیں تو وہی آگ اُن کے لئے جنّت بن جاتی ہے -

دیکھ لو جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات
ہوئی تو اُس وقت سارا عرب مرتد ہو گیا اور حضرت
عمرؓ اور حضرت علیؓ جیسے بہادر بھی اس فتنہ کو دیکھ کر
گھبرا گئے - وفات کے قریب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے

ایک لشکر رومی علاقہ پر حملہ کرنے کے لئے تیار کیا تھا اور اسامہؓ کو اُس کا افسر مقرر کیا تھا۔ مگر ابھی وہ لشکر روانہ نہیں ہؤا تھا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوگئی۔ آپ کی وفات پر جب قریباً سارا عرب مرتد ہوگیا تو صحابہؓ گھبرا گئے اور انہوں نے سوچا کہ اگر ایسی بغاوت کے وقت اسامہؓ کا لشکر بھی رومی علاقہ پر حملہ کرنے کے لئے بھیج دیا گیا تو پیچھے صرف بوڑھے مرد بچے اور عورتیں رہ جائیں گی اور مدینہ کی حفاظت کا کوئی سامان نہیں ہوگا۔ چنانچہ انہوں نے تجویز کی کہ اکابر صحابہؓ کا ایک وفد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں جائے اور ان سے درخواست کرے کہ وہ اس لشکر کو بغاوت کے فرو ہونے تک روک لیں۔ چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور اکابر صحابہؓ مل کر ایک وفد کی صورت میں حضرت ابوبکرؓ کے پاس گئے اور اُن سے عرض کیا کہ کچھ عرصہ کیلئے اس لشکر کو روک لیا جائے جب بغاوت فرو ہو جائے تو پھر بے شک اِسے بھجوا دیا جائے۔ جب حضرت ابوبکرؓ کے پاس یہ وفد پہنچا تو آپ نے نہایت غصہ سے اس وفد کو یہ جواب دیا کہ کیا تم یہ چاہتے ہو کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ابو قحافہ کا بیٹا سب سے پہلا کام یہ کرے کہ جس لشکر کو روانہ کرنیکا رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا تھا اُسے روک لے (ابو قحافہ حضرت ابوبکرؓ کے باپ کا نام تھا اور وہ مکہ کے بہت ہی معمولی آدمیوں میں سے سمجھے جاتے تھے) حضرت ابوبکرؓ کی عادت تھی کہ جب وہ اپنی تحقیر کرنا چاہتے تو اپنے باپ کا نام لیتے یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ میری کیا حیثیت ہے جو میں ایسا کروں۔ اِس موقعہ پر بھی آپؓ نے اپنے باپ کا نام لے کر کہا کہ کیا تم یہ چاہتے ہو کہ ابو قحافہ کا بیٹا سب سے پہلا کام یہ کرے کہ جس لشکر کو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے روانہ کرنے کے لئے تیار کیا تھا اُسے روک لے۔ پھر آپ نے فرمایا۔ اگر سارا عرب باغی ہوگیا ہے تو بے شک ہو جائے خدا کی قسم اگر دشمن کی فوج مدینہ میں گھس آئے اور ہمارے سامنے مسلمان عورتوں کی لاشیں کتے گھسیٹتے پھریں۔ تب بھی مَیں اس لشکر کو ضرور روانہ کرونگا جس کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے روانہ کرنے کے لئے تیار کیا تھا۔ اگر تم دشمن کی فوجوں سے ڈرتے ہو تو بے شک میرا ساتھ چھوڑ دو مَیں اکیلا تمام دشمنوں کا مقابلہ کرونگا۔ یہ جرأت اور دلیری حضرت ابوبکرؓ میں کہاں سے پیدا ہوئی! یہ وہی ارْكَعُوْا وَاسْجُدُوْا والے حکم کی تعمیل کا نتیجہ تھا۔ جس طرح بجلی کے ساتھ معمولی تار بھی مل جاتی ہے تو اس تار میں عظیم الشان طاقت پیدا ہو جاتی ہے۔ اِسی طرح جب کوئی شخص خدا تعالیٰ کا قرب حاصل کر لیتا ہے تو دنیا کی کوئی طاقت اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ بجلی سے علیحدہ کر لو تو تار کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔ مگر اُسی تار میں جب بجلی کی رَو آئی ہوئی ہو۔ اور تار کے اوپر سے ربڑ اُترا ہؤا ہو تو اگر ایک قوی سے قوی پہلوان بھی اُسے چھوئے گا تو مُردہ چوہے کی طرح گر جائیگا اور اس کی طاقت اسے کوئی نفع نہیں پہنچا سکے گی۔

غرض دنیوی عزتوں کے حصول کے لئے لوگ بڑی بڑی قربانیاں کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس موقعہ پر اس امر کا ذکر کرتا اور فرماتا ہے۔ اے مومنو! جب تم ہمارے پاس آئے ہو تو تمہیں یہ اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے کہ بغیر ارْكَعُوْا وَاسْجُدُوْا وَاعْبُدُوْا رَبَّكُمْ کے احکام پر عمل کرنے کے تمہیں کوئی کامیابی حاصل نہیں ہو سکتی۔ ہاں اگر تم اللہ تعالیٰ پر توکل کرو۔ ہمارے احکام کی فرمانبرداری کا عہد کرو اور ہماری عبادت میں لگ جاؤ تو ہم تمہیں کامیاب کر دیں گے۔

پھر فرماتا ہے وَافْعَلُوا الْخَيْرَ۔ جب تم

وَجَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ ؕ هُوَ اجْتَبٰىكُمْ

اور اللہ (تعالیٰ) کے راستہ میں ایسی کوشش کرو جو مکمل ہو۔کیونکہ اسی نے تم کو بزرگی بخشی ہے۔

وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ ؕ مِلَّةَ

اور دین (کی تعلیم) میں تم پر کوئی تنگی کا پہلو اختیار نہیں کیا۔ (اے مومنو!) اپنے

اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ ؕ هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ ۙ۬

باپ ابراہیمؑ کے دین کو (اختیار کرو کیونکہ) اللہ نے تمہارا نام مسلمان رکھا ہے۔

مِنْ قَبْلُ وَفِيْ هٰذَا لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا

اس کتاب میں بھی اور اس سے پہلی کتب میں بھی۔ تاکہ رسول تم پر گواہ ہو

عَلَيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ ۚۖ فَاَقِيْمُوا

اور تم باقی دنیا پر گواہ رہو۔ پس نماز کو

یہ باتیں کرلو۔ یعنی جب تم اللہ تعالیٰ پر توکل کرو جب تم اللہ تعالیٰ کی اطاعت کا جُوا اپنی گردنوں پر اٹھالو۔ جب تم اُس کی شب و روز عبادت کرو تو پھر چوتھا فرض تمہارا یہ ہے کہ وَافْعَلُوا الْخَيْرَ۔ تم بنی نوع انسان کی بھلائی کی کوشش کرو تم یتیموں کی خبر گیری کرو۔ تم بیواؤں کی نگہداشت کرو۔ تم مساکین سے شفقت اور رأفت کے ساتھ پیش آؤ تم ہمسائیوں سے نیک سلوک کرو۔ تم دین اسلام کو اُن لوگوں میں پھیلاؤ جو اسلامی تعلیم سے ناآشنا ہیں۔ غرض جس قدر اچھے کام ہیں وہ سب کرو لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ تاکہ تم کامیاب ہو جاؤ۔

وَافْعَلُوا الْخَيْرَ کو تو لوگ کسی حد تک مانتے ہیں۔ مگر باقی جس قدر احکام ہیں ان کو دُنیا عموماً اپنی تباہی کی علامت سمجھتی ہے۔ لوگ کہتے ہیں۔ جو توکل کرے گا اُس کا بیڑہ غرق نہیں ہوگا تو اَور کس کا ہوگا؟ پھر وہ کہتے ہیں۔ جو احکام مذہبی پر چلے گا اور دین کی ترقی کے لئے چندے دے گا۔ وہ غریب نہیں ہوگا تو اَور کون ہوگا؟ اسی طرح وہ کہتے ہیں۔ جو پانچ وقت نماز پڑھیگا وہ تین چار گھنٹے ضرور ضائع کر دے گا۔ اور جس نے اپنے اوقات کا اتنا بڑا حصہ اس طرح رائیگاں کھو دیا۔ وہ دنیا میں کامیاب کس طرح ہوگا؟ غرض دنیا ان تمام باتوں کو تباہی کا موجب سمجھتی ہے قرآن کریم کہتا ہے کہ وہی تم کرو کیونکہ دنیوی ترقی اور دینی ترقی میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ اس کے ذرائع اَور ہوتے ہیں اور اُس کے ذرائع اَور ہیں۔

الصَّلٰوةَ وَ اٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاعْتَصِمُوْا بِاللّٰهِ ؕ هُوَ

قائم کرو اور زکوٰۃ دو ۔ اور اللہ (تعالیٰ) کو مضبوطی سے پکڑ لو ۔ وہ

مَوْلٰىكُمْ ۚ فَنِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِيْرُ ﴿۷۹﴾ ع ۱۰ / ۱۷

تمہارا آقا ہے ۔ پس کیا ہی اچھا آقا ہے اور کیا ہی اچھا مددگار ہے ۳۹

۳۹ حل لغات :- جَاهِدُوْا : جَاهَدَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ مُجَاهَدَةً وَّجِهَادًا کے معنے ہیں بَذَلَ وُسْعَهٗ ۔ اللہ تعالیٰ کے راستہ میں اُس نے پوری کوشش صرف کی ۔ اور جب جَاهَدَ الْعَدُوَّ کہیں تو معنے ہونگے قَاتَلَهٗ ۔ دشمن سے لڑائی کی (اقرب) جَاهِدُوْا امر کا جمع کا صیغہ ہے ۔ اِس لئے اس کے معنے ہونگے ۔ اللہ کے دین کے لئے پوری کوشش صرف کرو ۔

مفردات میں ہے ۔ اَلْجِهَادُ وَالْمُجَاهَدَةُ اِسْتِفْرَاغُ الْوُسْعِ فِيْ مُدَافَعَةِ الْعَدُوِّ ۔ یعنی دشمن کے مقابلہ کے لئے اپنی ساری کوشش صرف کرنے کا نام جہاد اور مجاہدہ ہے ۔ وَالْجِهَادُ ثَلَاثَةُ اَضْرُبٍ اور جہاد کا لفظ اسلامی نقطۂ نگاہ سے تین معانی کیلئے استعمال ہوتا ہے (۱) مُجَاهَدَةُ الْعَدُوِّ الظَّاهِرِ ظاہر دشمن کا مقابلہ (۲) مُجَاهَدَةُ الشَّيْطَانِ ۔ شیطان کا مقابلہ (۳) وَمُجَاهَدَةُ النَّفْسِ نفس کو بدی سے روکنے اور نیکی پر لگانے کے لئے نفس کا مقابلہ ۔

امام راغبؒ لکھتے ہیں ۔ وَتَدْخُلُ ثَلَاثَتُهَا فِيْ قَوْلِهٖ تَعَالٰى وَجَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ کہ آیت وَجَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ میں مذکورہ بالا تینوں معانی مدنظر رکھے گئے ہیں (مفردات)

اِجْتَبٰىكُمْ : اِجْتَبَاهُ کے معنے ہیں اِخْتَارَهٗ وَاصْطَفَاهُ ۔ اُس کو چن لیا (اقرب) پس اِجْتَبٰىكُمْ کے معنے ہونگے ۔ اس نے تمہیں چن لیا ہے ۔

حَرَجٌ : مفردات میں ہے کہ قِيْلَ لِلضِّيْقِ حَرَجٌ وَلِلْاِثْمِ حَرَجٌ ۔ یعنی تنگی کو بھی حرج کہتے ہیں اور گناہ کو بھی ۔

اِعْتَصِمُوْا : اِعْتَصَمَ بِهٖ کے معنے ہیں ۔ اَمْسَكَهٗ بِيَدِهٖ ۔ اس کو ہاتھ سے پکڑ لیا ۔ اور اِعْتَصَمَ بِاللّٰهِ کے معنے ہیں ۔ اِمْتَنَعَ بِلُطْفِهٖ مِنَ الْمَعْصِيَةِ ۔ اللہ تعالیٰ کے فضل اور اُس کے کرم سے معصیت سے پناہ میں آگیا ۔ اور جب اِعْتَصَمَ فُلَانٌ مِنَ الشَّرِّ وَالْمَكْرُوْهِ کہیں تو معنے ہوں گے اِلْتَجَأَ وَامْتَنَعَ ۔ اُس نے مصیبت سے بچنے کیلئے پناہ چاہی (اقرب) پس اِعْتَصِمُوْا کے معنے ہونگے گناہ سے بچنے اور مصائب سے بچنے کے لئے اللہ تعالیٰ کی پناہ چاہو ۔

تفسیر :- فرماتا ہے ۔ صرف منہ کے ایمان پر کفایت نہ کرو بلکہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں پوری طرح عملاً کوشش کرتے رہو ۔ کیونکہ اُس نے تم کو اسوقت دین کے معاملہ میں باقی قوموں میں سے چن لیا ہے اور دین بھی تم کو وہ دیا ہے جس میں کوئی تنگی نہیں بلکہ وہ مراطِ مستقیم کے پانے میں مددگار ہے کوئی ناقابلِ برداشت بوجھ نہیں ۔ مفسرین نے وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ پر بحث کی ہے کہ اِس سے مراد کیا ہے کہ اُس نے دین کے بارے میں تم پر کوئی تنگی نازل نہیں کی اور انہوں نے کہا ہے کہ اِس سے مراد قصرِ صلوٰۃ ہے

جَاهِدُوْا
حَرَجٌ
اِعْتَصِمُوْا
اِجْتَبٰىكُمْ

یعنی اسلام اجازت دیتا ہے کہ سفر میں انسان نماز قصر کرلے
بعض کہتے ہیں کہ اس سے کثرت ازدواج اور مسافر کے
لئے روزہ کی رخصت کی طرف اشارہ ہے۔ بعض کہتے
ہیں اِس میں بیمار کے لئے بیٹھ کر نماز پڑھنے اور ناقابل
پر جہاد فرض نہ ہونے کی طرف اشارہ ہے۔ یہ سب
باتیں اپنی اپنی جگہ درست ہو سکتی ہیں۔ لیکن یاد رکھنا
چاہیئے کہ یہاں اللہ تعالیٰ نے مِنْ حَرَجٍ فرمایا ہے
یعنی اُس نے کسی قسم کی کوئی تنگی نہیں رکھی پس اِس
میں کسی ایک قسم کی تنگی کی طرف اشارہ نہیں کیا گیا
بلکہ ساری قسم کی تنگیوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

اور اصل مضمون جو اللہ تعالیٰ نے اِس آیت میں
بیان فرمایا ہے وہ یہ ہے کہ شریعت اسلئے نازل
نہیں ہوئی کہ وہ انسان پر بوجھ ڈالے بلکہ شریعت
لوگوں کے بوجھوں کو ہلکا کرنے کے لئے نازل ہوئی ہے
عیسائیوں نے غلطی سے یہ کہدیا کہ شریعت لعنت
ہے۔ حالانکہ شریعت تو ایک ہدایت نامہ کے طور پر
ہوتی ہے اور نبی ہادی اور راہنما ہوتا ہے۔ اب کوئی
احمق ہی ہوگا جو کسی ہدایت نامہ کو لعنت قرار دے
یا طب کی کتابوں میں لکھا ہوا ہوتا ہے کہ فلاں
چیز زہر ہے اور اگر فلاں زہر کوئی شخص کھالے تو
اُس کا یہ یہ تریاق ہے۔ اب کون شخص ہے جو ایسی
کتابوں کو لعنت قرار دے سکے۔ ایسی کتابیں ہمیشہ
سکھ اور آرام کا موجب ہوا کرتی ہیں نہ کہ تکلیف کا۔
اِسی طرح شریعت میں روحانی اور جسمانی آفات سے
بچنے کے طریق بتائے جاتے ہیں اور جو مصائب آ چکے
ہوں اُن کو دُور کرنے کی تدابیر سمجھائی جاتی ہیں۔ چنانچہ
قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔ يُرِيدُ اللَّهُ
لِيُبَيِّنَ لَكُمْ وَيَهْدِيَكُمْ سُنَنَ الَّذِينَ مِنْ
قَبْلِكُمْ وَيَتُوبَ عَلَيْكُمْ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ۔
وَاللَّهُ يُرِيدُ أَنْ يَتُوبَ عَلَيْكُمْ وَيُرِيدُ الَّذِينَ
يَتَّبِعُونَ الشَّهَوَاتِ أَنْ تَمِيلُوا مَيْلًا عَظِيمًا۔
(النساء ع ۴) یعنی اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ وہ تمہارے
تمام مسائل کو خوب کھول کھول کر بیان کردے۔ اور
تمہیں بتا دے کہ تم فلاں کام کروگے تو فائدہ اٹھاؤگے
اور فلاں کروگے تو نقصان اٹھاؤگے۔ پھر فرماتا ہے۔ تم
سے پہلے بھی کچھ قومیں گذری ہیں اُن میں سے بعض نے
اپنے اعمال کی وجہ سے سُکھ پایا تھا اور بعض نے دُکھ۔ خدا
چاہتا ہے کہ اُن کی باتیں بھی تمہیں کھول کھول کر سُنادے
اور ان لوگوں کا راستہ بھی بتا دے جو ہلاکتوں سے
بچ گئے تھے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ اُن کے حالات کو اچھی طرح
جاننے والا اور ہر کام کی حکمت کو سمجھنے والا ہے۔ اللہ
تعالیٰ چاہتا ہے کہ تم پر شریعت کے ذریعہ اپنی رحمت کو کامل
کرے مگر وہ لوگ جو اپنی خواہشات کی پیروی کرنیوالے
ہیں وہ چاہتے ہیں کہ تم ایک ہی طرف سارے کے سارے
جھک جاؤ۔ یعنی اعتدال اور میانہ روی کو ترک کردو
اور ایک ہی پہلو کو اختیار کرلو۔ پھر فرماتا ہے۔ يُرِيدُ
اللَّهُ أَنْ يُخَفِّفَ عَنْكُمْ وَخُلِقَ الْإِنْسَانُ ضَعِيفًا
اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ وہ تمہارے بوجھوں کو ہلکا
کردے کیونکہ انسان فطرتی طور پر سخت کمزور پیدا کیا
گیا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ جانتا تھا کہ اگر اسے کوئی ہدایت نامہ
نہ دیا گیا تو وہ سخت نقصان اٹھائیگا۔ پس شریعت
کی غرض انسان کے بوجھوں کو کم کرنا اور اُسے ہر قسم کے
خطرات اور مصائب سے بچانا ہے۔ اور یہی بات اللہ
تعالیٰ نے وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ
میں بیان فرمائی ہے کہ یہ دین جو تمہارے لئے نازل کیا
گیا ہے اِس میں کوئی بھی حکم ایسا نہیں جو تمہیں کسی مشکل
میں مبتلا کردے چھوٹے سے چھوٹے حکم سے لیکر بڑے
سے بڑے حکم تک کو دیکھ لو۔ ہر حکم انسان کے لئے

برکت اور رحمت کا باعث ہے۔

پھر فرماتا ہے۔ مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرَاهِيْمَ یہ تمہارے دادا ابراہیمؑ والا دین ہی ہے کوئی نیا دین نہیں کہ اس کا اختیار کرنا تم پر دوبھر ہو بلکہ اس سے بھی بڑھ کر یہ بات ہے کہ هُوَ سَمّٰكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ مِنْ قَبْلُ وَفِيْ هٰذَا. اللہ تعالیٰ نے اس زمانہ سے پہلے اور اس کتاب میں بھی تمہارا نام مسلم رکھا ہے۔ لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ تاکہ محمد رسول اللہ اپنے عمل سے تم پر گواہی دیں کہ وہ موعودِ ابراہیمؑ اور موعودِ انبیاءِ سابقین ہیں۔ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ اور تم بھی دوسری قوموں کے لئے ہمیشہ اس بات کے گواہ بنتے چلے جاؤ کہ تم ہی اس نئے نام کے مصداق ہو۔ جس کی صحفِ سابقہ میں خبر دی جا چکی ہے۔

اِس آیت میں هُوَ سَمّٰكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ مِنْ قَبْلُ کے الفاظ میں جس پیشگوئی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ وہ یسعیاہ نبی کی کتاب میں ان الفاظ میں پائی جاتی ہے کہ

"تُو ایک نئے نام سے کہلایا جائیگا
جو خداوند کا مُنہ تجھے رکھ دیگا۔"
(یسعیاہ باب ۶۲ آیت ۲)

اِسی طرح انہوں نے فرمایا تھا:-

"تم اپنا نام اپنے پیچھے چھوڑو گے
جو میرے برگزیدوں پر لعنت کا باعث ہوگا
کیونکہ خداوند یہوواہ تم کو قتل کرے گا اور
اپنے بندوں کو دوسرے نام سے بلائیگا۔"
(یسعیاہ باب ۶۵ آیت ۱۵)

یسعیاہ نبی کی اِس پیشگوئی کو بائیبل نویسوں نے کلیسیا پر چسپاں کرنے کی کوشش کی ہے۔ حالانکہ مسیحیوں کو کوئی نام خدا تعالیٰ کی طرف سے نہیں ملا۔ اِسی طرح مختلف مسیحی فرقوں نے جو اپنے اپنے نام رکھے ہوئے ہیں وہ بھی اُن کے اپنے تجویز کردہ ہیں۔ خدا تعالیٰ نے اُن کے یہ نام نہیں رکھے۔ ساری دنیا میں صرف ایک ہی قوم ہے جس کو خدا تعالیٰ کی طرف سے نام ملا اور وہ مسلمان ہیں۔ هُوَ سَمّٰكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ مِنْ قَبْلُ میں اِسی پیشگوئی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اور فِيْ هٰذَا میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اس قرآنی دُعا کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے اِن الفاظ میں کی کہ رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ (بقرۃ ع ۱۵) یعنی اے ہمارے رب مجھ ابراہیم کو اور میرے بیٹے اسمٰعیل کو اپنے حضور میں مسلم قرار دے۔ اِسی طرح ہماری اولاد میں سے بھی ایک بڑی جماعت پیدا کر جو تیرے حضور میں مسلم کہلائے۔ چنانچہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اِن پیشگوئیوں کے مطابق دنیا میں اعلان فرما دیا کہ خدا تعالیٰ نے میری امت کا نام مسلم اور میرے مذہب کا نام اسلام رکھا ہے۔

یہ نام اپنے اندر ایسی گہری حکمت اور فلسفہ رکھتا ہے کہ اگر غور سے کام لیا جائے تو اس نام میں ہی اسلام کی غرض و غایت پوری وضاحت سے بیان کر دی گئی ہے۔ عربی زبان کی خصوصیات میں سے یہ ایک عجیب خصوصیت ہے کہ اس میں صرف الفاظ کے معنے نہیں ہوتے بلکہ حروف کے بھی معنے ہوتے ہیں۔ اسی طرح اس زبان میں جو لفظ کسی خاص شے کے لئے وضع کیا گیا ہو وہ صرف اس چیز کے لئے بطور علامت نہیں ہوتا بلکہ وہ نام کسی خاص مناسبت کی وجہ سے رکھا جاتا ہے اور وہ نام ہمیں بتا دیتا ہے

کہ اُس چیز میں وہ کونسی خصوصیت ہے جسکی وجہ سے اُس کا فلاں نام رکھا گیا ہے۔ مثلاً اردو میں ایک لمبی چیز کو لمبی کہیں گے۔ ماں کو ماں کہیں گے۔ باپ کو باپ کہیں گے۔ مگر ان الفاظ سے یہ پتہ نہیں لگیگا کہ ان میں وہ کیا امتیازی بات ہے جس کی وجہ سے انہیں اس نام سے مخصوص کیا گیا ہے۔ اور اگر ہم ان لفظوں کی بجائے اور لفظ رکھ دیں تب بھی ہمارے مطلب اور مدعا میں کوئی نقص واقع نہیں ہوگا۔ مثلاً اگر چھوٹی چیز کو لمبی کہنے لگیں اور لمبی کو چھوٹی۔ اور یہی چیز رائج ہو جائے تو اس سے اردو زبان میں کوئی نقص واقع نہیں ہوگا۔ لیکن عربی زبان کا یہ حال نہیں۔ اس میں اگر طویل کو قصیر کہنے لگیں تو یہ کسی طرح جائز نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ ط و ل جن معنوں پر دلالت کرتے ہیں ق ص ر ان معنوں پر دلالت نہیں کرتے۔ غرض دوسری زبانوں میں تو چیزوں کے نام صرف علامت کے طور پر ہیں۔ اگر ان کو بدل کر اور لفظ بھی رکھ دیئے جائیں تو کوئی حرج واقع نہیں ہوتا لیکن عربی زبان میں ہر ایک نام نہ صرف علامت کے طور پر ہوتا ہے بلکہ اس چیز کے کسی خاص امتیاز پر بھی دلالت کرتا ہے اور اس وجہ سے ایک لفظ کی بجائے ہم دوسرا لفظ نہیں رکھ سکتے۔

خدا تعالیٰ نے اسلام کے لئے بھی ایسا ہی نام چُنا ہے جو اپنے اندر بڑی بھاری خوبیاں اور حکمتیں لئے ہوئے ہے۔ چنانچہ س ل م جو اسلام کے اصلی حروف یا روٹ ہیں عربی زبان میں جہاں بھی اکٹھے ہونگے وہاں ان کے معنوں میں حفاظت کے معنے ضرور پائے جائیں گے۔ اور پھر یہ حروف جس شکل میں بھی بدلتے چلے جائیں اُن سب صورتوں میں حفاظت کے معنے بدستور پائے جائینگے۔ مثلاً اسلام ہے۔ اس کے معنے فرمانبرداری کے ہیں۔ اور ان معنوں میں حفاظت لازمی طور پر پائی جاتی ہے۔ کیونکہ جب کوئی شخص کسی بڑے آدمی کی فرمانبرداری کرتا ہے اور اس کی بات مان لیتا ہے تو طبعی طور پر وہ اُن تکالیف سے محفوظ ہو جاتا ہے جو اس بڑے آدمی کی طرف سے پہنچ سکتی ہیں۔ اور پھر اُسی کے مال و جان کی حفاظت کی جاتی ہے جو مطیع و منقاد ہو۔ چنانچہ جو لوگ باغی ہوتے ہیں وہ گورنمنٹ کی حفاظت میں نہیں ہوتے۔ بلکہ گذشتہ زمانہ میں تو ایسے لوگ آؤٹ آف لاز کہلاتے تھے۔ اور اُن کو اگر کوئی قتل بھی کر دیتا تھا تب بھی گورنمنٹ کوئی گرفت نہیں کرتی تھی پھر سَلْمٌ ہے۔ جس کے معنے آفات اور مصائب سے بچنے کے ہیں۔ اسی طرح سَلَمَ الْجِلْدَ کے معنے ہیں سلم سے چمڑے کی دباغت کر دی۔ اور دباغت بھی چمڑے کو گلنے سے بچانے کے لئے کرتے ہیں پس اس میں بھی حفاظت کے معنے شامل ہیں۔ اسی طرح کہتے ہیں سَالَمَہٗ جس کے معنے ہوتے ہیں۔ اس سے مصالحت کی۔ اور صلح کرنے میں بھی حفاظت مدنظر ہوتی ہے۔ اسی طرح کہتے ہیں تَسَلَّمَ الشَّیْءَ فلاں چیز کو اُس نے پکڑ لیا۔ اور اُس پر قبضہ کر لیا۔ اور جب کوئی چیز قبضہ میں آجاتی ہے تو وہ بھی حفاظت میں ہو جاتی ہے۔ اسی طرح اِسْتَلَمَ الزَّرْعُ کا محاورہ ہے جس کے معنے ہیں۔ کھیتی نے استیلام کیا۔ یعنی کھیتی میں دانہ پڑ گیا۔ اس میں بھی حفاظت کے معنے ہیں کیونکہ جب تک کھیتی میں دانہ نہ پڑے اُسوقت تک کسان اُس پر مطمئن نہیں ہوتا۔ اور جب دانہ پڑ جائے۔ تو پھر ایک حد تک وہ اُسے محفوظ خیال کرتا ہے۔ پھر سَلَامٌ خدا کا نام ہے جو ہر قسم کے نقص اور عیب سے پاک ہے۔ پھر اشتقاق کے لحاظ سے آگے چلیں تو اشتقاق کبیر میں سَلْم کا لفظ سَمَلٌ بن جائیگا جس کے معنے صلح کرانے اور حوض سے گند نکال کر صاف کرنے کے ہیں۔ لَمْسٌ چھونے کو کہتے ہیں۔ اس میں بھی حفاظت کے

معنے شامل ہیں۔ کیونکہ وہ تمام باتیں جن کو انسان محفوظ کرتا ہے۔ اپنے حواس سے ہی کرتا ہے جن میں سے ایک لمس بھی ہے۔ پھر مَسَلَ السَّمَاءُ کے معنے ہوتے ہیں پانی بہ پڑا۔ جب پانی بہ کر کھیتی میں پہنچتا ہے تو کھیتی کی حفاظت کرتا ہے اور اُسے خشک ہونے سے بچاتا ہے۔ اِسی طرح لَسَمَ ہے۔ اِس کے معنے چُپ رہنے کے ہیں۔ اور یہ ضرب المثل مشہور ہے کہ "نکلی ہونٹوں چڑھی کوٹھوں"۔ حفاظت اور امن جو خاموشی میں نصیب ہوتا ہے اُس کو ہر ایک جانتا ہے۔ مَلْسٌ مداہنت کو کہتے ہیں اور مداہنت کی غرض ہمیشہ یہی ہوتی ہے کہ کسی شخص کے شر سے چکنی چپڑی باتیں کر کے انسان محفوظ ہو جائے۔ غرض س لام میم یہ تینوں حرف آگے پیچھے ہو کر جس طرح بھی آئیں عربی زبان میں ان کے معنے حفاظت کے ہی ہوتے ہیں۔ پس اسلام کے معنے یہ ہوئے کہ ایسے افعال بجا لانا جن سے انسان ہلاکت سے محفوظ ہو جائے۔ گویا اس نام میں ہی اللہ تعالیٰ نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی غرض بتا دی ہے جو یہ ہے کہ لوگ خدا تعالیٰ کے غضب سے محفوظ ہو جائیں اور آپس کے لڑائی جھگڑوں سے نجات پا جائیں۔ یعنی ایک طرف تو ان کا اللہ تعالیٰ سے مضبوط تعلق قائم ہو جائے اور دوسری طرف وہ بنی نوع انسان سے ایسا اچھا سلوک رکھیں کہ اُن میں باہم محبت اور یگانگت پیدا ہو جائے اور فتنہ و فساد دنیا سے مٹ جائے۔ اور ایک سچا مذہب انہی دو اغراض کا حامل ہوتا ہے۔ یعنی ایک طرف تو وہ تعلق باللہ کے پہلو کو مضبوط کرتا ہے اور دوسری طرف وہ شفقت علیٰ خلق اللہ کی طرف بنی نوع انسان کو توجہ دلاتا ہے۔ اور جب اس کی تعلیم کے نتیجہ میں لوگوں کا خدا تعالیٰ سے بھی تعلق ہو جائے اور بنی نوع انسان سے بھی وہ شفقت کرنے لگیں تو نہ خدا تعالیٰ کی طرف سے انہیں کسی ناراضگی کا ڈر ہو سکتا ہے اور نہ بنی نوع انسان کی طرف سے انہیں کوئی خطرہ لاحق ہو سکتا ہے۔ اور اِس طرح وہ روحانی اور جسمانی دونوں رنگ میں محفوظ ہو جاتے ہیں۔ غرض اس نام میں ہی اللہ تعالیٰ نے مذہب کی ساری حقیقت بیان کر دی ہے۔ اور بتایا ہے کہ اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جس میں خدا تعالیٰ کے حقوق بھی کامل طور پر ادا کئے گئے ہیں اور بنی نوع انسان کے حقوق کا بھی اس میں پورا لحاظ رکھا گیا ہے۔

ہر انسان کا پہلا تعلق اللہ تعالیٰ کی ذات سے ہوتا ہے۔ پس وہ شخص جو اللہ تعالیٰ کا فرمانبردار بن جاتا ہے وہ مسلم ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ خدا تعالیٰ کے احکام کے آگے اپنے آپ کو کلیۃً ڈال دیتا ہے اور یہی اسلام کی توضیح اور اس کی صحیح تشریح ہے دوسرا تعلق انسان کا اپنی ذات اور بنی نوع انسان سے ہوتا ہے۔ پس جو شخص اپنی ذات کو فتنوں میں پڑنے سے بچا لیتا ہے۔ شرارتوں میں پڑنے سے بچا لیتا ہے۔ بد دیانتیوں، خیانتوں اور ظلموں میں پڑنے سے بچا لیتا ہے۔ جھوٹ۔ فریب۔ دغا۔ بغض اور کینہ سے اپنے آپ کو بچا لیتا ہے۔ وہ بھی مسلم ہے۔ کیونکہ اُس نے اپنی جان کو سلامتی عطا کی۔ اِسی طرح جو شخص اپنی قوم کے لوگوں کو فائدہ پہنچاتا ہے وہ بھی مسلم ہے۔ جو شخص اپنے ہمسائیوں اور رشتہ داروں کو امن دیتا اور فساد اور خونریزی اُن کے لئے پیدا نہیں کرتا وہ بھی مسلم ہے۔ مگر جو شخص اس کے خلاف عمل کرتا ہے وہ غیر مسلم ہے۔ چاہے وہ رات دن اپنے آپ کو مسلم کہتا رہے کیونکہ نام کے ساتھ کوئی چیز بدل نہیں جاتی۔ ہم دیکھتے ہیں بچے بعض دفعہ

ایسی حالت میں جبکہ اُن کے ہاتھ میں کوئی چیز نہیں ہوتی کھیلتے ہوئے دوسرے بچے کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیتے ہیں اور کہتے ہیں لو مَیں تمہیں آم دیتا ہوں۔ تم کھا لو۔ یا پیسہ دیتا ہوں تم لے لو۔ حالانکہ ان کے ہاتھ میں کچھ نہیں ہوتا۔ اب بچوں کا ایسا فعل ایک مذاق کے طور پر تو کام آسکتا ہے۔ یہ فائدہ تو ہوسکتا ہے کہ ماں باپ یا بھائی وغیرہ ہنس پڑیں۔ یا جس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر ایسا کیا جاتا ہے وہ ہنس پڑے اور سمجھے کہ مجھ سے مذاق کیا گیا ہے۔ لیکن اس سے کوئی حقیقی فائدہ نہیں ہوسکتا۔ خیالی طور پر تم کسی کو دنیا کی بادشاہت بھی بخش دو تو اُس کے حالات میں کوئی تغیّر نہیں آئے گا۔ لیکن حقیقی طور پر اگر تم کسی کو ایک پیسہ بھی دے دو تو وہ اُس سے فائدہ اُٹھائے گا۔ یہی حال ایمان کا ہے۔ اگر کوئی شخص صرف اسلام کے نام سے کام لے تو وہ دنیا کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتا۔ لیکن اگر وہ اسلام کے مفہوم کے مطابق تھوڑا سا بھی عمل کرے تو بہت کچھ فائدہ حاصل کرسکتا اور دوسروں کو بھی حقیقی فائدہ پہنچا سکتا ہے۔

سُوْرَةُ الْمُؤْمِنُوْنَ مَكِّيَّةٌ

سورۃ مومنون - یہ سورۃ مکّی ہے۔

وَهِيَ مَعَ الْبَسْمَلَةِ مِائَةٌ وَّتِسْعَ عَشَرَةَ آيَةً وَّسِتَّةُ رُكُوْعَاتٍ

اور بسم اللہ سمیت اِس کی ایک سو اُنیس ۱۱۹ آیات اور چھ رکوع ہیں۔ ؎۱

؎۱ قرطبی کا قول ہے کہ یہ ساری سورۃ مکّی ہے اور اس میں کسی شخص نے اختلاف نہیں کیا (تفسیر قرطبی) اِس کی آیتیں بصریوں کے نزدیک ۱۱۹ اور کوفیوں کے نزدیک ۱۱۸ ہیں (ہمارے نزدیک بھی اس سورۃ کی آیتیں ۱۱۹ ہیں۔ لیکن اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم بسم اللہ کو بھی ہر سورۃ کا حصہ سمجھتے ہیں۔ دوسرے مفسرین بسم اللہ کو سورۃ کے اندر رکھنا تو ضروری سمجھتے ہیں لیکن اس کو سورۃ کا حصہ نہیں سمجھتے۔ ہمارے نزدیک اوپر کی دونوں وجوہ کی موجودگی میں اس کو سورۃ کا حصہ نہ سمجھنا مضحکہ خیز ہے۔ پس بسم اللہ کی بعد کی آیتوں کے متعلق تو ہمیں کوفیوں سے اتفاق ہے کہ ۱۱۸ ہیں لیکن بسم اللہ کو ملا کر ۱۱۹ آیتیں ہیں۔

اِس اختلاف کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ان لوگوں کے نزدیک کوئی آیت کم یا زیادہ ہے۔ بلکہ صرف اتنا مطلب ہے کہ ایک فریق نے ایک آیت کو دو آیتیں قرار دیا ہے اور دوسرے فریق نے ان آیات کو ایک آیت قرار دیا ہے۔ بصریوں کے نزدیک ثُمَّ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى وَاَخَاهُ هٰرُوْنَ بِاٰيٰتِنَا وَسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ (آیت ۴۶) پوری آیت ہے اور کوفیوں کے نزدیک یہ آیت پوری نہیں بلکہ اگلی آیت کا حصہ ہے۔ چونکہ انہوں نے اِسے اگلی آیت کا حصہ قرار دیا ہے اِس لئے انہوں نے ایک آیت کم شمار کی ہے۔

مسیحی پادری چونکہ ان باتوں سے واقف نہیں۔ ان میں سے بعض نے ایسے حوالہ جات سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ قرآن کریم کی حفاظت مشتبہ ہے۔ کیونکہ بعض لوگ اِس کی آیتیں زیادہ بتاتے ہیں اور بعض کم بتاتے ہیں۔ حالانکہ جیسا کہ اوپر کے حوالہ سے ثابت ہے یہ کمی بیشی حقیقی نہیں بلکہ آیتوں کی تعیین کی وجہ سے کمی بیشی ہو گئی ہے۔ بعض لوگوں نے مضمون کے لحاظ سے ایک عبارت کو پوری آیت قرار دے دیا ہے اور بعض نے اس کو آدھی آیت قرار دے کر دوسری کا حصہ سمجھ لیا ہے۔ اِس وجہ سے لازماً سورۃ کی آیتوں کے شمار میں فرق پڑ گیا ہے۔ ورنہ مضمون سارے کا سارا ایک ہے۔ ہر لفظ دونوں کے نزدیک مسلّم ہے ایک حرف کی بھی کمی بیشی سارے قرآن میں نہیں مگر اِس جہالت کو کیا کیا جائے کہ بغیر تحقیق کے بعض لوگ رائے زنی شروع کر دیتے ہیں۔

زمانۂ سورۃ یہ سورۃ اپنے مضمون کے لحاظ سے ہجرت سے پہلے کے آخری دور کی ہے۔ چنانچہ علامہ جلال الدین سیوطیؒ اس کو مکّی سورتوں میں سب سے آخری سورۃ کہتے ہیں۔ بعض لوگ اِس کو مدنی سورۃ بھی قرار دیتے ہیں۔ لیکن اُن کی رائے جمہور علماء کے نزدیک کچھ وقعت نہیں رکھتی۔

ریورنڈ وہیری نے اِس کو چھ اور سات سال بعد نبوت کے زمانہ کی قرار دیا ہے۔ لیکن زیادہ درست یہی،

کہ یہ سورۃ ہجرت کے قریب زمانہ میں مگر اس سے پہلے نازل ہوئی خواہ یہ آخری سورۃ نہ ہو جیسا کہ علامہ جلال الدین سیوطیؒ نے کہا ہے۔

اِس سورۃ میں اِس بات پر خاص زور دیا گیا ہے کہ مومن کامیاب ہونے والے ہیں اور اُن کی کامیابی کا زمانہ قریب آگیا ہے۔ دوسرے اِس میں زکوٰۃ پر بھی خاص زور دیا گیا ہے۔ تیسرے اِس میں باجماعت نماز پر بھی خاص طور پر زور ہے۔ یہ تین مضمون ایسے ہیں۔ جو مدنی زندگی کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں۔ پس اِن مضمونوں پر زور دینے سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے پورا ہونے کا زمانہ قریب آگیا تھا۔ وہیری کی رائے کہ چھٹے یا ساتویں سال بعد نبوت میں یہ نازل ہوئی ہمارے لئے بہت ہی مفید ہے کیونکہ اس رائے کو مان لینے سے پیشگوئی کی قدر اور بھی بڑھ جاتی ہے مگر اسلامی روایات اور سورۃ کے مضمون کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم یہ تو کہہ سکتے ہیں کہ یہ سورۃ ہجرت سے تھوڑا ہی عرصہ پہلے نازل ہوئی تھی لیکن ہم وہیری کی تصدیق کرنے کی جرأت نہیں کرتے کہ یہ چھٹے یا ساتویں سال بعد نبوت نازل ہوئی تھی۔

ترتیب مضامین

اِس سورۃ کا قریبی تعلق پہلی سورۃ سے یہ ہے کہ سورۃ حج کے آخر میں فرمایا تھا کہ اے مومنو! خدا تعالیٰ کی طرف جھکو اور اس کی اطاعت کرو تو تم کامیاب ہوگے۔ اِسی طرح جہاد بالسیف کے وقت میں جہاد بالسیف کرو اور جہاد بالدعوۃ کے موقعہ پر جہاد بالدعوۃ کرو۔ اور یہ متبادل حکم کہ کبھی جہاد بالسیف اور کبھی جہاد بالدعوۃ ہم نے اِس لئے دیا ہے کہ دین کے بارہ میں ہم نے کوئی تنگی نہیں رکھی۔ یعنی نہ غیر مومنوں پر جبر جائز رکھا ہے اور نہ مومنوں کو اُن کی ضمیر کے خلاف کوئی حکم دیا ہے۔ پھر بتایا گیا تھا کہ جہاد فی الدین کے نتیجہ میں تم کو نمازیں پڑھنی چاہئیں۔ زکوٰتیں دینی چاہئیں۔ اور خدا تعالیٰ کا دامن اس زور سے تھام لینا چاہیئے کہ وہ یاد یگانہ تم سے کبھی جُدا نہ ہو۔ اگر تم ایسا کروگے تو لازماً وہ تمہارا مددگار ہوگا۔ اور تمہارے کام پورے کریگا۔ ان آیات میں مشروط طور پر بتایا گیا تھا کہ اگر تم ایسا کروگے تو کامیاب ہو جاؤ گے اور خدا تعالیٰ کی مدد حاصل کروگے سورۃ المومنون میں بتایا گیا ہے کہ مسلمانوں میں ایسی جماعت پیدا ہوگی اور وہ جماعت ضرور کامیاب ہو جائیگی۔ گویا جو بات پہلے فرضی طور پر تسلیم کی گئی تھی اب اُس کے واقعہ ہو جانے کا دعویٰ کیا ہے۔ یہ سورۃ درحقیقت گریز ہے پہلی سورتوں کے مضمون سے۔ پہلی سورتوں میں مسیحیت کی تعلیم اور اُس کی غلطیوں اور اس کی اصلاح کا ذکر تھا۔ اِس سورۃ میں بھی مسیحیت کی تعلیم کا ہی رد ہے۔ لیکن ساتھ ہی اس امر کی طرف بھی زوردار اشارہ کیا گیا ہے کہ مسیحیت کی جگہ اب اسلام نے لے لی ہے۔ اور اس کی غلطیوں اور کمزوریوں کی اصلاح کر کے اب اسلام انسانوں کو کامیابی کی منزلیں طے کرائے گا جبکہ مسیحیت جادۂ توحید سے ہٹ جانے کی وجہ سے اب وہ ایمانی ثمرات نہیں کھلا سکے گی جو اس کے ذریعے سے انسان پہلے زمانہ میں کھایا کرتا تھا۔ کیونکہ خدا تعالیٰ انسانوں سے اُس ایمان کے مطابق سلوک کرتا ہے جو ان کے دل میں ہوتا ہے یا جس پر اُن کا عمل ہو۔ نہ اس کے مطابق جس کا وہ زبانی دعویٰ کرتے ہوں۔

خلاصہ مضمون

اِس سورۃ میں یہ بتایا گیا ہے کہ قرآن کریم پر ایمان لانے والے لوگوں کی کامیابی کا وقت قریب

آگیا ہے (آیت ۱ و ۲)

ان سچے مومنوں کی علامتیں یہ ہونگی کہ

(۱) وہ خدا تعالیٰ کی عبادت ظاہرداری سے نہیں کریں گے۔

(۲) وہ ایسے تمام کاموں سے بچیں گے جن سے اُن کی ذات یا قوم یا ملک کو کوئی فائدہ نہ پہنچتا ہو۔

(۳) وہ اپنے ملک کی ترقی کے لئے ہر قسم کی قربانیاں کرنے کے لئے تیار رہیں گے۔

(۴) وہ اپنے ان تمام راستوں کو بند کریں گے جن کے ذریعہ سے خرابیاں انسانی قلب میں داخل ہوتی ہیں۔ خصوصاً وہ اپنی عصمت کی حفاظت کریں گے۔ سوائے آزاد بیویوں یا مملوکہ بیویوں کے۔ ایسی صورت میں اُن پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔

(۵) جو ذمہ داریاں اُن کے سپرد کی جائیں گی اُن کو وہ پورا کریں گے۔ اور جو معاہدے وہ دوسری قوموں سے کریں گے اُن کو وہ توڑیں گے نہیں۔

(۶) وہ اجتماعی عبادتوں کی خاص طور پر حفاظت کرینگے یعنی ملت یا قومیت کا جذبہ اُبھاریں گے۔ اور انفرادیت کو ملت کے تابع کردینگے۔ ایسے لوگ اُن انعامات کے وارث ہونگے جن کا اللہ تعالیٰ نے وعدہ کیا ہے اور وہ اِسی دُنیا میں وہ جنتیں پائیں گے جن کی مومنوں کو خبر دی گئی ہے۔ اور ہمیشہ ہمیش کے لئے خدا تعالیٰ کے انعاموں کے وارث ہونگے

یہ روحانی تخلیق ہے جو بالکل جسمانی تخلیق کے متوازی ہے۔ انسان کی جسمانی تخلیق بھی اِسی طرح ہوئی ہے۔ انسان کو ہم نے مٹی سے نکلے ہوئے ایک خلاصہ سے پیدا کیا ہے (یعنی اُن خوراکوں سے جو زمین سے پیدا ہوتی ہیں) پھر ہم نے اس کو نطفہ کی شکل میں تبدیل کر دیا۔ اور وہ نطفہ ایک ایسی جگہ پڑ ٹکا جہاں اُس کے لئے نشوونما کا موقع تھا۔ پھر ہم نے اُس نطفہ کو ایک جمے ہوئے خون کی شکل میں بدل دیا۔ پھر اُس جمے ہوئے خون سے ہم نے گوشت کی بوٹی تیار کی۔ پھر ہم نے اس بوٹی کے ساتھ ہڈیاں بنائیں۔ پھر اُن ہڈیوں پر ہم نے گوشت چڑھایا۔ اس کے بعد وہ پیدائش ایک نئی چیز بن گئی۔ یعنی انسان کی شکل اختیار کر گئی۔ (آیت ۳ تا ۱۵)

پھر فرماتا ہے کہ جس طرح تم جسمانی پیدائش کے بعد مر جاتے ہو۔ اور پھر قیامت کے دن تم کو اٹھایا جائیگا اِسی طرح روحانی پیدائش میں بھی تم پر یہ بات آتی رہتی ہے کہ قومیں پیدا ہوتی ہیں اور مر جاتی ہیں۔ اور پھر اُن کی جگہ دوسری قومیں کھڑی ہو جاتی ہیں۔ (آیت ۱۶ - ۱۷)

پھر فرماتا ہے۔ کہ ہم نے تمہاری جسمانی اور روحانی ترقیات کو سات حصّوں میں تقسیم کیا ہے (چنانچہ پہلی آیات میں جسمانی پیدائش کو بھی سات حصّوں میں تقسیم کیا ہے اور روحانی پیدائش کو بھی سات حصّوں میں تقسیم کیا ہے) اور ہم مخلوق سے غافل نہیں ہیں۔ (آیت ۱۸)

اور ہم نے آسمان سے اندازے کے مطابق پانی اتارا ہے۔ پھر ہم اس کو زمین میں قائم رکھتے ہیں۔ (یعنی جسمانی پانی بھی اندازے کے مطابق اترتا ہے۔ اور روحانی پانی بھی اندازے کے مطابق اُترتا ہے) اور ہم اس کے ضائع کر دینے پر قادر ہیں۔ یعنی محض کسی تعلیم کا خدائی ہونا اِس بات کا ثبوت نہیں ہوتا کہ وہ کبھی خراب نہیں ہوگی (آیت ۱۹)

اور ہم نے تمہارے لئے باغات بنائے ہیں۔ کھجور کے بھی اور انگوروں کے بھی۔ اور اُن میں تمہارے لئے بہت سے پھل پیدا کئے ہیں جن کو تم کھاتے ہو اور

زیتون کا وہ درخت بھی ہم نے بنایا ہے جو طورِ سینا سے نکلتا ہے جس میں سے تیل بھی پیدا ہوتا ہے۔ اور کھانے والوں کے لئے سامان بھی تیار ہوتے ہیں (اس کا ذکر سورۂ نور کی آیت ۳۶ میں کیا گیا ہے) اور ہم نے تمہارے لئے چارپائے بنائے ہیں وہ بھی تمہارے لئے ایک نشان ہیں۔ اُن کے پیٹوں میں سے نکلی ہوئی چیز یعنی دودھ کو تم پیتے ہو۔ اس کے علاوہ بھی تمہارے لئے اُن میں بہت سے منافع ہیں۔ اور تم اُن کا گوشت بھی کھاتے ہو۔ اور تم اُن جانوروں پر بھی اور کشتیوں پر بھی سواریاں کرتے ہو یعنی اللہ تعالیٰ نے جسطرح انسانی زندگی کے لئے بہت سی آرام اور ترقی دینے والی اشیاء پیدا کی ہیں اسی طرح اُس نے روحانی زندگی کے لئے بھی مختلف قسم کی چیزیں پیدا کی ہیں۔ جو شخص جسمانی راحت دینے والی چیزوں کو اختیار کرتا ہے اور روحانی راحت دینے والی چیزوں کو اختیار نہیں کرتا اور اُن کو لعنت سمجھ کر چھوڑ دیتا ہے وہ عقلمند نہیں بیوقوف ہے (آیت ۲۰ تا ۲۳)

اِس کے آگے حضرت نوحؑ کی مثال بیان فرماتا ہے کہ وہ بھی اپنے زمانہ میں فلاح کا رستہ دکھانے کیلئے آئے تھے اور انہوں نے بھی یہی تعلیم دی تھی کہ خدا ایک ہے دو نہیں ہیں۔ لیکن اُن کی قوم نے انکار کیا اور محض اس لئے انکار کیا کہ وہ ایک انسان ہے اس سے زیادہ اس کی کوئی حیثیت نہیں (لیکن یہود نے تو اِس لئے نبیوں کا انکار کیا کہ کیوں ایک انسان اُن میں نازل ہُوا۔ اور مسیحؑ کے بعد لوگوں نے اس لئے ایک نبی کا انکار کیا کہ خدا کا بیٹا اُن میں آچکا ہے اس لئے انہیں کسی انسان کی ضرورت نہیں ہے۔ حالانکہ ماننے کے قابل وہی بات ہے جو خدا کی طرف سے آئے خواہ وہ خدا کے نقب سے آئے یا خدا کے بیٹے کے نقب سے آئے یا نبی کے نقب سے آئے۔ بھیڑیں تو اپنے گڈریے کی آواز کو پہچانتی ہیں۔ خواہ وہ گڈریا مشرق سے بولے یا مغرب سے بولے شمال سے بولے یا جنوب سے بولے ہمارا گڈریا ہمارا خدا ہے وہ جس وجود میں بھی ہم کو آواز دے ہمارا فرض ہے کہ ہم اُس کی سنیں) فرماتا ہے۔ مخالف کہتے ہیں کہ اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو وہ ہمارے اندر ملائکہ نازل کر دیتا۔ یعنی ہم انسان کی بات سُننے کے لئے تیار نہیں۔ انسان سے اوپر کوئی اَور وجود ہونا چاہیئے (اگر مسیحیوں کا دعویٰ سچا ہے تو پھر ان لوگوں کا اعتراض کیوں جھوٹا ہے؟) ہم نے تو اس قسم کا دعویٰ اپنے بڑوں سے کبھی سُنا نہیں تھا۔ (مسیحؑ سے پہلے لوگوں نے کہا کہ ہم نے اِس قسم کا دعوٰے پہلے کبھی نہیں سُنا کہ کوئی انسان دوسرے انسانوں سے بڑا بننا چاہے۔ اور مسیحؑ کے وقت لوگوں نے کہا کہ ہم نے کسی انسان سے نہیں سُنا کہ وہ خدا کا بیٹا ہونے کا دعویٰ کرے۔ اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں لوگوں نے کہا کہ ہم نے کسی سے نہیں سُنا کہ بنی اسرائیل سے باہر بھی کوئی نبی آسکتا ہے۔ افسوس ہمیشہ ہی انسان عقدِ لنگ تلاش کرتا رہا اور اُس نے کبھی بھی خدا کی آواز پر لبیک کہنے کی کوشش نہیں کی) اِس شخص کو تو کوئی جنون معلوم ہوتا ہے۔ کچھ دن ٹھہرو نتیجہ نکل آئیگا۔ تب نوحؑ نے اپنے خدا سے مدد مانگی۔ اور خدا نے اُسے کہا کہ تُو ہمارے حکم اور ہماری وحی کے مطابق ایک کشتی تیار کر (یعنی ایک کامل تعلیم جو اِس زمانہ کے لوگوں کے لئے نجات کا موجب ہو) پھر جب مخالفت بڑھتی جائے اور عذاب کا وقت آجائے تو ہر قسم کے لوگوں کو اس کشتی کے ذریعہ سے تو پناہ دے اور اپنے اہل کو بھی اُس کے ذریعہ سے بچا۔ سوائے اس کے جس کے لئے خدا کی طرف سے عذاب کا حکم ہو چکا ہو۔ جب تُو اُس کشتی میں سوار ہو جائے تو دُعا کیجیئو کہ خدایا! تیرا شکر ہے کہ تُو نے ہم کو ظالموں سے نجات دی

اَب تو ہمیں کسی اچھی جگہ پر اُتار۔ جہاں اِن ظالموں کے ظلم سے ہم محفوظ رہیں۔ اگر لوگ غور کریں تو نوحؑ کی زندگی میں ایک بڑا نشان ہے۔ (آیت ۲۴ تا ۳۱)

اِس کے بعد نسلِ انسانی چلتی چلی گئی۔ کچھ زمانہ تک تو لوگ ہدایت پر قائم رہے۔ پھر بگڑ گئے اور پھر ہم نے اُن میں سے ہی ایک رسول اُن میں بھجوایا (رسول کا اسی قوم میں سے آنا ضروری ہوتا ہے کیونکہ اگر وہ کسی غیر جنس میں سے ہو جیسا کہ مسیحیّت کا دعوٰی ہے تو وہ ہمارے لئے نمونہ نہیں بن سکتا۔ ایک انسان شیر والے کام نہیں کر سکتا۔ اور ایک شیر انسان والے کام نہیں کر سکتا۔ انسان کا بچّہ خدا کے بچّہ کی نقل نہیں کر سکتا۔ اور خدا کا بچّہ کہلانے والا یعنی مسیحؑ یا عزیرؑ انسان کے بچّہ کی مشکلات کو نہیں سمجھ سکتا) اُس رسول نے انکو حکم دیا کہ ایک خدا کے سوا کسی کی پرستش نہ کرو (نوحؑ کے بعد آنیوالے رسولوں نے بھی صرف ایک خدا کی خبر دی دوُ کی نہیں) اس کی قوم کے سرداروں نے جو کہ مابعد الموت زندگی کے منکر تھے اور دنیوی اموال پر خوش تھے اپنی قوم سے اس کے بارہ میں کہا۔ اے لوگو! یہ تو تمہارے جیسا ایک انسان ہے جو کچھ تم کھاتے ہو وہی کچھ یہ کھاتا ہے اور جو کچھ تم پیتے ہو وہی کچھ یہ پیتا ہے۔ اگر تم ایسے آدمی کی اطاعت کروگے تو نقصان اٹھاؤ گے۔ یہ تو کہتا ہے کہ تم مر کر پھر جی اٹھوگے۔ ہم تو اسی دنیا میں مریں گے اور جئیں گے مرنے کے بعد کوئی اور زندگی ہم کو نہیں ملے گی۔ یہ شخص جھوٹا ہے (یہی وہ خرابی ہے جو ہمیشہ ہی دنیا کے لوگوں کو تباہی کی طرف لے جاتی ہے اور نیکی سے پھرا دیتی ہے) تب نبی نے دُعا کی کہ اے میرے رب! انہوں نے تو میرا انکار کر دیا ہے اب تو ہی میری مدد کر۔ پس اللہ تعالےٰ نے فرمایا کہ یہ جلد ہی اپنے کئے پر شرمندہ ہونگے اور ان کو عذاب نے پکڑ لیا اور وہ تباہ ہو گئے (آیت ۳۲ تا ۴۲)

اِس کے بعد پھر کچھ لوگ گذرے۔ اور ہم نے پے در پے اُن کے اندر رسول بھیجنے شروع کر دیئے مگر جس قوم کے پاس بھی رسول آیا اُس نے انکار کیا اور ہم نے بھی قوم کے بعد قوم کو ہلاک کرنا شروع کر دیا۔ (آیت ۴۳ تا ۴۵)

اِن سب واقعات کے بعد موسٰی اور ان کے بھائی ہارون آئے اُن کے ساتھ بھی ہمارے نشان اور دلائل تھے۔ لیکن فرعون اور اس کے ساتھیوں نے تکبّر سے کام لیا اور پہلے لوگوں کی طرح یہی کہا کہ کیا ہم ان دو آدمیوں کو مان لیں جو ہمارے جیسے ہیں حالانکہ اِن کی قوم ہماری غلام ہے۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ وہ بھی ہلاک ہو گئے۔ اور موسٰی کو ہم نے ایک تفصیلی شریعت دی تاکہ لوگ اُس سے صحیح راستہ دیکھیں۔ اور پھر ہم نے مریم کے بیٹے اور اُس کی ماں کو ایک نشان بنا کے بھیجا۔ اور اُن دونوں کو ہم نے ایک ایسی بلند جگہ پر پناہ دی جو رہنے کے لئے بھی بڑی اچھی تھی اور اُس میں پانی بہتے تھے (یعنی کشمیر کا علاقہ) (آیت ۴۶ تا ۵۱)

اے رسولو! تم حلال میں سے طیّب چیزیں کھاؤ اور مناسب حال عمل کرو۔ اور میرا تقوٰی اختیار کرو کیونکہ خدا تمہارے اعمال سے واقف ہے۔ دیکھو یہ سارے نبی ایک ہی شکل کے ہیں۔ سب کے حالات ملتے جلتے ہیں۔ اور ان کے دعوے بھی ملتے جلتے ہیں پھر تم کیوں خدا کے بارہ میں اختلاف کرتے ہو۔ (آیت ۵۲، ۵۳)

لیکن انسانوں کی یہ حالت ہے کہ جب کبھی بھی اُن کے پاس نبی آئے انہوں نے بعد میں اُن کی تعلیم کو

کوئی اَور شکل دے دی - اور نئے نئے مذہب بن گئے
حالانکہ ابتداءً سب تعلیمیں ایک سی تھیں - اب تو انکو
اُنکی غفلت میں چھوڑ دے - کیونکہ تجھے اُن پر جبر کا
کوئی اختیار نہیں - اُن کا معاملہ خدا کے ساتھ ہے
وہ سمجھتے ہیں کہ انکو جو مال اور اولاد ملی ہے وہ اُن کی
عزت اور انکے درجے کی وجہ سے ملی ہے حالانکہ وہ
جانتے نہیں کہ یہی چیزیں انکو تباہی کی طرف لے
جانے والی ہیں - (آیت ۵۴ تا ۵۷)

مومن تو اپنے رب کے خوف سے ہمیشہ لرزاں اور
اُس کے نشانوں پر ایمان لانے کے لئے کوشاں رہتے
ہیں - اور خدا کا کسی کو شریک نہیں بناتے اور ہر قسم کی
نیکی کر کے بھی اپنے آپ کو قصوروار ہی سمجھتے ہیں اور
خدا تعالیٰ کے سامنے اپنے آپ کو جواب دہ قرار دیتے
ہیں - اور وہ نیکی میں ایک دوسرے کا مقابلہ کرتے ہیں اور
دوڑ کر نیکیوں کو حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن ہم
اتنی ہی کسی انسان سے امید کرتے ہیں جتنی کہ اُس میں طاقت
ہوتی ہے - اور جب ہم فیصلہ کرینگے تو ایسے امتیازی
طریقوں کے ساتھ فیصلہ کریں گے کہ جتنا جتنا کوئی شخص
حقدار ہوگا اُتنا اُس کو حق مل جائیگا اور کوئی وجہ
جو کسی کے غیر مجرم بنانے کی ہو نظر انداز نہیں کی جائیگی -
(آیت ۵۸ تا ۶۳)

لیکن ان لوگوں کے دل تو غفلت میں پڑے ہوئے
ہیں اور وہ کبھی بھی کوشش نہیں کرتے کہ نیکی کریں یا
نیکی میں آگے بڑھیں - یہاں تک کہ جب اُن کے دولتمندوں
پر عذاب کی گرفت آجاتی ہے تو پھر وہ گریہ وزاری
کرنے لگ جاتے ہیں - اُس دن ہم اُن سے کہتے ہیں -
آج گریہ وزاری کا کیا فائدہ ہے - آج ہم تمہاری مدد
کس طرح کر سکتے ہیں - تمہارے سامنے ہماری تعلیم سُنائی
جاتی تھی - لیکن تم ایڑیوں کے بل پھر جاتے تھے - اور
اس پر کبھی غور نہیں کرتے تھے اور اپنے آپ کو بڑا سمجھتے
تھے - اور راتوں کو بیٹھ بیٹھ کر ہماری تعلیم کو بُرا بھلا کہا
کرتے تھے (آیت ۶۴ تا ۶۸)

کیا انہوں نے کبھی ہماری باتوں پر غور نہ کیا یا
انہوں نے یہ نہ سوچا - جو کچھ اُن سے کہا گیا ہے وہی
اُن کے باپ دادوں سے بھی کہا گیا تھا - کیا انہوں نے
یہ نہ سوچا کہ جو شخص اُن سے مخاطب ہو رہا ہے اُس
کی تعلیم میں اُن کی ترقی کا راز مضمر ہے مگر باوجود اس کے
وہ انکار کر رہے ہیں - وہ کہتے ہیں اسے جنون ہے لیکن
یہ نہیں دیکھتے کہ اس مجنون کی باتیں وہ ہیں جو نظر آتی
ہیں کہ آخر ہو کر رہیں گی اور اصل بات تو یہ ہے کہ اُن
میں سے اکثر وہ ہیں جو اس نتیجہ سے ڈرتے ہیں جس نتیجہ
کی طرف یہ شخص توجہ دلا رہا ہے - اگر حقیقت ان لوگوں
کی خواہشات کے مطابق ہو جاتی تو زمین و آسمان میں
فساد پیدا ہو جاتا اور انسان تباہ ہو جاتے (آیت
۶۹ تا ۷۲)

تُو ان سے کچھ مانگتا تو نہیں - تیری مدد تو خدا
کرتا ہے - تُو تو ان کو صرف سیدھا راستہ دکھاتا ہے
اور یہ لوگ سیدھے رستہ پر چلنے سے کتراتے ہیں -
ہم تو ان کو بخش ہی دیتے لیکن ہم بخشیں تو یہ شرارتوں
میں اَور بھی بڑھ جاتے ہیں - اگر عذاب کے وقت یہ توجہ
کریں تو پھر بھی ہم کچھ رحم کر دیں - مگر یہ تو عام عذاب
کے وقت بھی اپنی شرارتوں سے باز نہیں آتے اور جب
آخری عذاب آجاتا ہے تو پھر بالکل ہی ناامید ہو کر
ہتھیار ڈال دیتے ہیں - (آیت ۷۳ تا ۷۸)

پھر فرماتا ہے - ذرا سوچو تو سہی کہ تمہاری یہ شنوائیاں
تمہاری بینائیاں اور تمہارے دل تمہارے کس کام کے
بدلہ میں تمہیں ملے ہوئے ہیں - کیا کبھی اس کا بھی شکر
کیا ہے؟ یہ رات اور دن کی تبدیلیاں اور یہ موت

اور حیات تمہارے لئے کیسے فوائد رکھتی ہے، کیا تم سمجھتے نہیں۔ بس ایک ہی رٹ لگی جاتی ہے کہ مرکر زندہ کس طرح ہونگے۔ یہی بات ہمیشہ سے سُنتے آئے ہیں مگر کبھی ثبوت نہیں ملا۔ (آیت ۷۹ تا ۸۴)

تُو اُن سے کہہ کہ آخر یہ سب کچھ کس کا ہے؟ خدا کا۔ کیا پھر بھی نصیحت نہیں آتی۔ پھر تُو پوچھ کہ آسمانوں اور عرش عظیم کا رب کون ہے۔ یہ لوگ یہی جواب دیں گے کہ اللہ۔ مگر پھر بھی نہیں سمجھتے۔ اور یہ تمام مخلوق کی بادشاہت اور دُعاؤں کا سُننا کس کے اختیار میں ہے؟ اللہ کے۔ پھر بھی تم غور نہیں کرتے (آیت ۸۵ تا ۹۱)

یاد رکھو۔ خدا کا کوئی بیٹا نہیں۔ اور اُس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو ضرور ایک دوسرے کے خلاف بغاوت ہو جاتی۔ وہ غیب اور شہادت کو جانتا ہے (حالانکہ مسیح غیب کے جاننے سے منکر ہے مرقس باب ۱۳ آیت ۲۲-۲۳) پس وہ تمہارے شرکوں سے بالا ہے (آیت ۹۲-۹۳)

تُو کہدے کہ اگر میری زندگی میں میری قوم پر عذاب آئے تو اے خدا تُو مجھے اُن سے علیحدہ رکھیو۔ پھر فرماتا ہے ہم اس بات پر قادر ہیں کہ تیری آنکھوں کے سامنے ان پر عذاب لے آئیں۔ لیکن تُو خود یہی طریق اختیار کر کہ بُری باتوں کا جواب اچھی باتوں سے دے۔ اور اگر ان کی گالیوں سے کبھی غصہ آجائے تو ہم سے دُعا مانگا کر کہ الٰہی شیطان کے وسوسوں سے مجھے محفوظ رکھ بلکہ ایسے مواقع سے ہی مجھے محفوظ رکھ کہ شریر لوگ میرے سامنے ایسی باتیں کریں جو ناقابلِ برداشت ہوں (آیت ۹۴ تا ۹۹)

یہ لوگ تو اسی طرح شرارتیں کرتے چلے جائینگے یہاں تک کہ موت آجائیگی۔ اور اُس وقت کہیں گے کہ خدایا اب تُو ہم کو واپس کر تاکہ ہم نیک عمل کریں مگر ایسا نہیں ہو سکیگا۔ اور جب انکو دوبارہ زندہ کیا جائے گا تو اُس وقت سب رشتے ٹوٹ جائیں گے اور صرف وہی لوگ کامیاب ہونگے جنہوں نے دنیا میں کچھ کام کیا ہوگا۔ جنہوں نے دنیا میں کوئی اچھا کام نہیں کیا ہوگا وہ ہمیشہ جہنم میں رہیں گے۔ آگ اُن کے مونہوں کو جلا کر سیاہ کر دے گی۔ اور انکو کہا جائیگا کہ تم ہمارے نشانوں کا انکار کیا کرتے تھے (آیت ۱۰۰ تا ۱۰۶)

اس پر وہ کہیں گے کہ اے ہمارے رب ہماری بدقسمتی سے ایسا ہوا۔ ہم گمراہ تھے۔ خدایا تو پھر ہم کو لوٹا دے۔ پھر ہم ایسا نہیں کریں گے۔ فرمائیگا۔ اب ان باتوں سے کیا فائدہ۔ میرے بندے صرف اتنا ہی کہتے تھے نا کہ اے ہمارے رب ہم ایمان لے آئے۔ تُو ہمیں معاف کر دے۔ تو بڑا رحم کرنے والا ہے۔ تمہاری جائیدادیں تو نہ چھینتے تھے۔ مگر تم اُن سے مذاق کرتے تھے۔ اتنا مذاق کہ دنیا میں کوئی اور چیز تمہیں یاد ہی نہ رہی تھی۔ اب میں اُن کی اس مظلومیت کا بدلہ دونگا (آیت ۱۰۷ تا ۱۱۲)

پھر خدا ظالموں سے پُوچھے گا۔ تم کتنی مدت دنیا میں رہے؟ وہ کہیں گے کچھ نہیں۔ کوئی ایک دن یا دن کا کچھ تھوڑا سا حصہ (آرام کی زندگی تکلیف کے وقت بالکل حقیر نظر آنے لگ جاتی ہے) اللہ تعالیٰ فرمائیگا۔ ٹھیک ہے تم تھوڑا ہی رہے مگر کاش! کہ تمہیں پہلے اس کا علم ہوتا کہ یہ زندگی جس کو تم لمبا سمجھ رہے ہو تھوڑی ہے۔ (آیت ۱۱۳ تا ۱۱۵)

اُس وقت اُن سے کہا جائیگا کہ کیا تم یہ سمجھتے تھے کہ ہم نے تم کو بغیر کسی غرض کے پیدا کیا ہے اور تم ہمارے سامنے جواب دہ نہیں ہو گے۔ اللہ تعالیٰ بڑی شان والا ہے۔ وہ سچا اور حقیقی بادشاہ ہے۔ اُس کے سوا کوئی معبود نہیں وہ ایک بزرگ عرش کا

الجزء ۱۸

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ①

(مَیں) اللہ (تعالیٰ) کا نام لے کر جو بے حد کرم کرنیوالا (اور) بار بار رحم کرنیوالا ہے (پڑھتا ہوں)

قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۙ② الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ

(کامل) مومن اپنی مراد کو پہنچ گئے۔ وہ (مومن) جو اپنی نمازوں میں

خٰشِعُوْنَ ۙ③ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ ۙ④ وَالَّذِيْنَ

عاجزانہ رویہ اختیار کرتے ہیں۔ اور جو لغو باتوں سے اعراض کرتے ہیں۔ اور جو

هُمْ لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُوْنَ ۙ⑤ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ

زکوٰة (باقاعدہ) دیتے ہیں۔ اور جو اپنی شرمگاہوں کی

حٰفِظُوْنَ ۙ⑥ اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ

حفاظت کرتے ہیں۔ سوائے اپنی بیویوں کے یا جن کے مالک اُن کے دائیں ہاتھ ہوئے ہیں

فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ۚ⑦ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ

پس ایسے لوگوں کو کسی قسم کی ملامت نہیں کی جائیگی۔ اور جو اِس کے سوا کسی اور بات کی خواہش کریں۔

فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ ۚ⑧ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ

تو وہ لوگ زیادتی کرنے والے ہونگے۔ اور وہ لوگ (یعنی کامل مومن) جو اپنی امانتوں

وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ ۙ⑨ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَوٰتِهِمْ

اور اپنے عہدوں کا خیال رکھتے ہیں۔ اور جو لوگ اپنی نمازوں کی

يُحَافِظُوْنَ ۘ⑩ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْوٰرِثُوْنَ ۙ⑪ الَّذِيْنَ

وقف لازم

حفاظت کرتے رہتے ہیں۔ یہی لوگ اصل وارث ہیں۔ جو

ملک ہے۔ جو شخص بے دلیل اسکے سوا کوئی معبود ٹھیراتا ہے اس کو خدا کے سامنے حساب دینا پڑے گا اور وہ کبھی کامیاب نہیں ہوگا۔ تو اِن لوگوں سے مُنہ پھیر لے اور اپنے خدا سے بخشش مانگ۔ اور

يَرِثُوْنَ الْفِرْدَوْسَ ۭ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ⑫

فردوس کے وارث ہونگے ۔ وہ اُس میں ہمیشہ رہتے چلے جائیں گے ۔ ۲؎

ہُس کا رحم طلب کر (آیت ۱۱۶ تا ۱۱۹)

۲؎ حل لغات ۔ اَفْلَحَ ۔ اَفْلَحَ الرَّجُلُ کے معنے ہیں فَازَ وَظَفِرَ بِمَا طَلَبَ انسان اپنے ارادے میں کامیاب ہوگیا اور اُس نے اپنے مقصد کو پالیا ۔ اور اَفْلَحَ زَیْدٌ کے معنے ہیں نَجَحَ فِیْ سَعْیِہٖ وَاَصَابَ فِیْ عَمَلِہٖ ۔ زید نے اپنی کوشش کے پھل کو پالیا اور اُس کی محنت بار آور ہوئی (اقرب)

اَلْفَلَاحُ : اَلظَّفَرُ وَ اِدْرَاکُ بُغْیَۃٍ ۔ یعنی فلاح کے معنے کسی کام میں کامیابی اور مقصود کو پالینے کے ہیں (مفردات) پس اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ کے معنے ہیں کہ کامل مومن اپنی مراد کو پہنچ گئے اور انہوں نے اپنے مقصد کو حاصل کر لیا ۔

اَللَّغْوُ : لغو کے معنے ہیں مَا لَا یُعْتَدُّ بِہٖ مِنْ کَلَامٍ وَغَیْرِہٖ ۔ ہر ایسا کلام یا فعل جو کسی توجہ کے قابل نہ ہو (اقرب) وَقَدْ یُسَمّٰی کُلُّ کَلَامٍ قَبِیْحٍ لَغْوًا ۔ اِسی طرح ہر بُری اور ناپسندیدہ بات کو بھی لغو کہتے ہیں (مفردات)

اَلْخَاشِعُوْنَ : خَاشِعُوْنَ خَاشِعٌ کی جمع ہے جو خَشَعَ سے اسم فاعل ہے ۔ اور خَشَعَ کے معنے ہیں ذَلَّ وَتَطَامَنَ ۔ فرمانبردار ہوگیا اور عاجزی کا اظہار کیا ۔ اور خَشَعَ بِبَصَرِہٖ کے معنے ہیں غَضَّہٗ آنکھ نیچے کرلی ۔ نہایہ میں لکھا ہے کہ اَلْخُشُوْعُ فِی الصَّوْتِ وَالْبَصَرِ کَالْخُضُوْعِ فِی الْبَدَنِ جس طرح بدن کا تعجز اور اُس کی کمزوری ظاہر کرنے کیلئے خضوع کا لفظ بولا جاتا ہے اسی طرح آواز کے کمزور ہونے اور آنکھ کے عجز کو ظاہر کرنے کے لئے خشوع کا لفظ استعمال ہوتا ہے (اقرب)

اَفْلَحَ

مفردات میں ہے ۔ اَلْخُشُوْعُ اَلضَّرَاعَۃُ ۔ خشوع کے معنے عاجزی کرنے کے ہوتے ہیں ۔ اور خشوع کا استعمال بالعموم اس عاجزی پر ہوتا ہے جو اعضاء سے ظاہر ہوتی ہے اور تضرع کا لفظ دل میں عاجزی پیدا ہوجانے کے متعلق بولا جاتا ہے (مفردات) پس خٰشِعُوْنَ کے معنے ہونگے ۔ عاجزی اور فروتنی اختیار کرنے والے ۔

الخٰشعون ۔ الزکٰوۃ

اَلزَّکٰوۃُ : زَکَا (یَزْکُوْا) تَزْکِیَۃً کا اسم ہے اور زَکَی الشَّیْءُ کے معنے ہیں نَمَا کوئی چیز زیادہ اور بکثرت ہوگئی ۔ کہتے ہیں زَکَا الرَّجُلُ : صَلَحَ وَتَنَعَّمَ وَکَانَ فِیْ خِصْبٍ ۔ کوئی شخص عمدہ حالت میں ہوگیا (کیونکہ زَکَتِ الْاَرْضُ اُس وقت بولتے ہیں جبکہ وہ سرسبز ہو جائے) اور جب زَکَّاہُ اللّٰہُ کہیں تو اس کے معنے ہونگے اَنْمَاہُ ۔ اللہ تعالیٰ نے اسکو بڑھا دیا ۔ طَھَّرَہٗ ۔ اُسے پاکیزہ کیا ۔ زَکّٰی فُلَانٌ مَالَہٗ کے معنے ہوتے ہیں اَدّٰی عَنْہُ زَکٰوۃً ۔ اُس نے اپنے مال کی زکوٰۃ ادا کی ۔ اور جب زَکّٰی نَفْسَہٗ کہیں تو معنے ہونگے مَدَحَھَا اپنے نفس کو اُس نے تعریف کے قابل بنایا ۔ پس الزکٰوۃ کے معنے ہیں (۱) صَفْوَۃُ الشَّیْءِ ۔ اعلیٰ درجہ کی چیز (۲) طَاعَۃُ اللّٰہِ اللہ کی اطاعت (۳) مَا اَخْرَجْتَہٗ مِنْ مَالِکَ لِتُطَھِّرَہٗ بِہٖ ۔ مال کا وہ حصہ جو بطور زکوٰۃ نکالا جاتا ہے تاکہ باقی مال پاک ہو جائے ۔ اور صدقہ کا نام اس لئے زکوٰۃ رکھا گیا ہے کہ زکوٰۃ مال میں برکت ڈالتی اور اُسے بڑھاتی ہے اور انسان کو آفات سے بچاتی ہے ۔ (اقرب)

اللَّغْو

الخٰشعون

اَلْفِرْدَوْسَ

اَلْفِرْدَوْسَ، فردوس کے معنے ہیں اَلْجَنَّةُ الَّتِیْ تُنْبِتُ ضُرُوْبًا مِنَ النَّبْتِ۔ وہ باغ جو کئی قسم کی نباتات اُگاتا ہے۔ اَلْبُسْتَانُ یَجْمَعُ کُلَّ مَا یَجْمَعُ فِی الْبَسَاتِیْنِ۔ وہ باغ جس میں تمام وہ اشیاء ہوں جو باغوں میں ہوسکتی ہیں۔ (اقرب)

تفسیر: اِن آیات میں یہ پیشگوئی کی گئی ہے کہ جن مسلمانوں میں یہ اوصاف پائے جائیں گے کہ وہ خدا تعالیٰ کی عبادت ظاہر داری سے نہیں کریں گے بلکہ دلی خشوع اور انتہائی عجز وانکسار اور پوری فروتنی کے ساتھ اُس کی یاد میں مشغول رہیں گے اور ایسے تمام کاموں سے بچیں گے جن سے اُن کی ذات یا قوم یا ملک کو کوئی فائدہ نہ پہنچتا ہو۔ اور اپنے ملک کی ترقی کے لئے ہر قسم کی قربانیاں کرنے کے لئے تیار رہیں گے اور اپنے اُن تمام راستوں کو بند کرینگے جن کے ذریعہ سے خرابیاں انسانی قلب میں داخل ہوتی ہیں۔ بالخصوص وہ اپنی عصمت کی حفاظت کرینگے۔ اور سوائے جائز ذرائع کے اور کسی طرح اپنی عفت پر حرف نہیں آنے دیں گے۔ اور جو اُن ذمہ داریوں کو پورا کرینگے جو اُن کے سپرد کی جائیں گی۔ اور جو معاہدے وہ دوسری قوموں سے کریں گے۔ اُن کو توڑیں گے نہیں۔ اور جو انفرادیت کو ملت کے تابع کر دیں گے اور قومیت کا جذبہ اُبھاریں گے وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائیں گے اور اللہ تعالیٰ کی تائید اُن کو حاصل ہوگی۔ یہ ایک زبردست صداقت ہے جس سے شیعیت کا ردّ ہوتا ہے۔ کیونکہ شیعہ کہتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں نعوذ باللہ صرف اڑھائی مومن تھے۔ ایک حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ۔ ایک اُن کا غلام اور آدھے مومن سلمان فارسیؓ تھے۔ لیکن اوّل تو یہ بات اس لحاظ سے غلط ہے۔ کہ ہر مذہب کی خوبی اس کے ثمرات سے ہی پہچانی جاتی ہے حضرت مسیح علیہ السلام اسی اصل کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:-

"ہر ایک اچھا درخت اچھا پھل لاتا ہے۔
اور بُرا درخت بُرا پھل لاتا ہے۔ اچھا درخت
بُرا پھل نہیں لاسکتا۔ نہ بُرا درخت اچھا
پھل لا سکتا ہے۔ جو درخت اچھا پھل
نہیں لاتا وہ کاٹا اور آگ میں ڈالا جاتا
ہے۔ پس اُن کے پھلوں سے تم انہیں پہچان
لوگے۔" (متی باب ۷ آیت ۱۷ تا ۱۹)

اب اگر ایک شخص دنیا کی اصلاح اور اُس کے درست کرنے کے لئے مامور ہونے کا دعویٰ کرتا ہے لیکن اس کی سب کوششیں اکارت چلی جاتی ہیں اور وہ ایک ایسی جماعت چھوڑ جاتا ہے جو بے دین اور منافق اور خدا سے دُور ہو۔ اور جس میں صرف اڑھائی مومن پائے جاتے ہوں تو یقیناً اس کا دعویٰ سچا نہیں سمجھا جا سکتا کیونکہ یہ ممکن ہی نہیں کہ ایک شخص کو اللہ تعالےٰ ایک کام کے لئے بھیجے اور پھر وہ اس کام میں ناکام ہو جائے۔ اُس کی کامیابی اُسی صورت میں سمجھی جاسکتی ہے جب اس کی تربیت یافتہ اور اس کی صحبت سے مستفیض ہونے والی جماعت کا بیشتر حصہ اُس کے اثر سے متأثر ہو۔ اور اس کی تعلیم کا حامل اور اُس پر پوری طرح عامل ہو۔ ورنہ اُس کی آمد بالکل فضول اور اُس کی بعثت بالکل عبث ہو جاتی ہے۔ اِسی طرح یہ بھی ممکن نہیں کہ کوئی نیک اور پاک جماعت تدریجی مراحل طے کئے بغیر اچانک شرارت اور فتنہ کا مجسم نمونہ بن جائے۔ پس جو مذہب یہ بتاتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ اور اُن کے بعد خدمتِ اسلام کرنے والے لوگ درحقیقت منافقوں کی ایک جماعت تھے۔ اور اسلام صرف رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم

کے دم تک تھا یا آپ کے بعد آپ کے چند رشتہ داروں
کے دنوں میں اس کا اثر محدود ہو کر رہ گیا وہ یا تو
قانونِ قدرت اور انبیاء کی شان سے بالکل ناواقف
ہے یا پھر وہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا درپردہ
مخالف ہے کہ آپ کو ناکام ثابت کرنا چاہتا ہے۔
اور اسلام کو ایک بے ثمر درخت اور اس کی تعلیم کو
ایک بے اثر تعلیم بتا کر دشمنوں کو خوش کرنا اور اسلام
کی وقعت کو گرانا چاہتا ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ
وسلم نے فرمایا ہے کہ بڑے گناہوں میں سے ایک یہ
بھی گناہ ہے کہ انسان اپنے ماں باپ کو گالی دے۔
لوگوں نے کہا یا رسول اللہ! کیا کوئی ایسا بدبخت بھی
ہو سکتا ہے جو اپنے ماں باپ کو گالیاں دے۔
آپ نے فرمایا ہاں جب وہ کسی کے ماں باپ کو
گالیاں دیتا ہے اور دوسرا اُس کے جواب میں اُسکے
ماں باپ کو گالیاں دیتا ہے تو درحقیقت یہی شخص
اپنے ماں باپ کو گالیاں دلوانے والا ہوتا ہے۔
اسی طرح جن لوگوں کو کوئی قوم اپنے روحانی ہادیوں
میں سے سمجھتی ہو۔ اُن کی عزت وہ اپنے ماں باپ سے
بھی زیادہ کرتی ہے پس اُن کی نسبت اگر کوئی قوم
یہ الفاظ استعمال کرتی ہے کہ وہ منافق اور بے ایمان
تھے تو درحقیقت وہ اپنے بزرگوں کو گالیاں دیتی ہے
اور یہ ایک خطرناک جرم ہے جس سے افتراق اور
اختلاف کی خلیج وسیع ہو جاتی ہے۔ پس اوّل تو یہ کہنا
کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے والوں میں
سے صرف اڑھائی مومن تھے باقی تمام لوگ نعوذ باللہ
منافق اور بے ایمان تھے خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم
کی قوتِ قدسیہ اور آپ کے اعلیٰ درجہ کے روحانی
کمالات پر اعتراض کرنا ہے۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم
تو اپنے آپ کو انبیاء کا سردار قرار دیتے ہیں اور
قرآن کریم سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے۔ لیکن ایسا کہنے
والے تو حضرت موسٰی اور حضرت عیسٰی علیہما السلام
سے بھی آپ کو ادنیٰ قرار دیتے ہیں۔ کیونکہ حضرت
عیسٰی علیہ السلام کے حواریوں کی خدا تعالیٰ قرآن کریم میں
تعریف کرتا ہے (سورۂ صف ع۲) اور حضرت موسٰی
علیہ السلام کے متعلق فرماتا ہے کہ اُن کی قوم کے گو
سارے نوجوان ایمان نہیں لائے تھے۔ مگر کچھ لوگ
ایمان لے آئے تھے (یونس ع۹) اور کچھ لوگوں سے
مراد اڑھائی مومن نہیں ہو سکتے۔ دوسرے قَدْ اَفْلَحَ
الْمُؤْمِنُوْنَ فرما کر اللہ تعالیٰ نے شیعیت کے
اس حملہ کا بھی ردّ کر دیا ہے اور بتا دیا ہے کہ اُنکا
یہ نظریہ محض غلط اور بے بنیاد ہے۔ مومنون کا
لفظ جو اس جگہ استعمال کیا گیا ہے جمع سالم ہے
جس سے پتہ لگتا ہے کہ ایسے مومن بہرحال تین یا
تین سے زیادہ ہونے چاہئیں۔ اور اگر ان سات
اقسام کو جو اگلی آیات میں بیان ہوئی ہیں مدّنظر رکھا
جائے تو ایسے مومن کم سے کم اکیس ضرور ہونے چاہئیں
حالانکہ شیعہ صرف اڑھائی آدمیوں کو مومن قرار دیتے ہیں
دوسرے اس آیت سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جو سچے
مومن ہیں وہ کامیاب ہونگے۔ اور واقعات سے ظاہر ہے
کہ کامیاب ابوبکرؓ ہوئے۔ عمرؓ ہوئے۔ عثمانؓ ہوئے
حضرت علیؓ تو ساری عمر ان لوگوں کے وظیفہ خوار
رہے۔ اور جب اُن کو حکومت ملی تو خود اپنے آدمیوں
نے اُن کی مخالفت کی اور اپنے آدمیوں کے ہاتھ سے
ہی مارے گئے۔ پس معلوم ہوا کہ اہل السنت والجماعت
کے افراد جو تمام صحابہؓ کو مومن قرار دیتے ہیں وہی
حق پر ہیں نہ کہ وہ جن کی نگاہ میں رسول کریم صلی اللہ
علیہ وسلم کو صرف اڑھائی مومن نصیب ہوئے صحابہؓ
کا مقام تو ایسا بلند تھا کہ خود قرآن کریم اُنکی

تعریف کرتا ہے۔ اور فرماتا ہے کہ انہوں نے اپنی نیکی اور تقویٰ اور اخلاص میں وہ مقام حاصل کر لیا تھا کہ خدا اُن سے راضی ہو گیا تھا۔ چنانچہ فرماتا ہے۔ وَالسَّابِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهَاجِرِيْنَ وَ الْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ وَاَعَدَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهَارُ خَالِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ۔ (توبہ ع ۱۳) یعنی جو لوگ مہاجرین اور انصار میں سے نیکیوں میں سبقت لے جانے والے ہیں۔ اور وہ لوگ بھی جو کامل اطاعت دکھاتے ہوئے اُن کے پیچھے چلے۔ اللہ تعالیٰ اُن سے راضی ہو گیا اور وہ اللہ سے راضی ہو گئے۔ اُس نے اُن کے لئے ایسی جنتیں تیار کی ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں وہ اُن میں ہمیشہ رہتے چلے جائیں گے اور یہ بہت بڑی کامیابی ہے۔ لیکن شیعہ عقیدہ کے مطابق تو معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نعوذ باللہ ایسا بھولا بھالا اور سادہ ہے کہ وہ منافقوں کے دھوکے میں بھی آجاتا ہے۔ اور اُن سے بھی راضی ہو جاتا ہے۔ اب بتاؤ جن مہاجرین اور انصار سے خدا راضی ہو گیا۔ اور جن کو اُس نے اپنی جنت میں داخل کر لیا۔ اور انہیں ہمیشہ کے لئے اپنی خوشنودی کا سرٹیفکیٹ عطا کر دیا اُن کو منافق قرار دینا کیا خود اپنے نفاق اور کمیٔ ایمان کی علامت نہیں۔

پھر صحابہؓ کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ کہ مِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ (احزاب ع ۳) یعنی اُن میں سے بعض تو ایسے ہیں کہ انہوں نے اسلام لاتے وقت جو وعدے کئے تھے اُن کو مکمل طور پر انہوں نے پورا کر کے دکھا دیا ہے۔ اور کفار سے لڑتے ہوئے شہید ہو گئے ہیں۔ اور بعض انتظار کر رہے ہیں اور ایسے لوگ جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے۔ اور کفار سے لڑتے ہوئے مارے گئے درجنوں سے زیادہ ہیں مگر شیعہ ایسے حساب دان ہیں کہ اُن کے نزدیک جو درجنوں کی جماعت ہے اُسے اڑھائی کو ہی کہنا چاہیئے۔

پھر شیعہ کہتے ہیں کہ خلافت کا اصل حق تو حضرت علیؓ کا تھا اور انہی کے متعلق رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے وصیت بھی فرمائی تھی مگر ابوبکرؓ اور عمرؓ جن کو خلافت کی خواہش تھی انہوں نے حضرت علیؓ کا حق غصب کر لیا اور خود خلیفہ بن گئے۔ یہ عقیدہ بھی اوّل تو اس لحاظ سے غلط ہے کہ حضرت علیؓ جیسے بہادر اور شجاع انسان کے متعلق یہ خیال کر لینا کہ وہ ایک امر کو حق سمجھتے ہوئے اور رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی وصیت کا حامل ہوتے ہوئے اس کے خلاف عمل کرنے والوں کے مقابلہ میں خاموش رہے۔ اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وصیت کو انہوں نے پس پشت ڈال دیا۔ اور عالمِ اسلام کو تباہی کے گڑھے میں گرتے دیکھ کر بھی کوئی قدم اٹھانا مناسب نہ سمجھا بالکل عقل کے خلاف ہے۔ پھر تاریخی طور پر یہ امر ثابت ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوبکرؓ کی بھی بیعت کی تھی اور پھر حضرت عمرؓ کی بھی بیعت کی تھی اور اِن دونوں خلفاء کے ساتھ مل کر وہ کام کرتے رہے بلکہ حضرت عمرؓ نے اپنے زمانۂ خلافت میں بعض سفروں کے پیش آنے پر حضرت علیؓ کو اپنی جگہ مدینہ کا امیر بھی مقرر فرمایا۔ چنانچہ طبری میں لکھا ہے کہ واقعۂ جسر کے موقعہ پر جبکہ مسلمانوں کو ایرانی فوجوں کے مقابلہ میں ایک قسم کی زک اٹھانی پڑی تھی حضرت

عمرؓ نے لوگوں کے مشورہ سے ارادہ کیا کہ آپ خود اِسلامی فوج کے ساتھ ایران کی سرحد پر تشریف لے جائیں۔ اور آپ نے اپنے پیچھے حضرت علیؓ کو مدینہ کا گورنر مقرر کیا۔ اِسی طرح جب مسلمانوں نے بیت المقدس کا محاصرہ کیا اور وہاں کے لوگوں نے اُس وقت تک ہتھیار ڈالنے سے انکار کر دیا جب تک کہ خود حضرت عمرؓ وہاں تشریف نہ لائیں۔ تو اُس وقت بھی حضرت عمرؓ نے حضرت علیؓ کو ہی اپنے بعد مدینہ کا گورنر مقرر کیا تھا۔ حالانکہ آپ کو کئی ماہ کا سفر درپیش تھا۔ اِس روایت سے ثابت ہے کہ حضرت علیؓ اپنا عندیہ اتنا چھپاتے تھے کہ حضرت عمرؓ اُن کو اپنے پیچھے گورنر مقرر کر دیتے تھے اور اس بات سے ذرا بھی نہیں ڈرتے تھے کہ پیچھے یہ بغاوت کر دینگے گویا حق چھپانے کی عادت حضرت علیؓ میں انتہا درجہ کی پائی جاتی تھی۔ اگر یہی بات کسی شیعہ عالم کے متعلق کہی جائے تو غالباً وہ گالیاں دینے لگ جائیگا لیکن ایسی گندی بات حضرت علیؓ کی طرف منسوب کرتے ہوئے وہ ذرا نہیں شرماتے۔ اور درحقیقت وہ اس طرح حضرت عمرؓ اور حضرت ابوبکرؓ کو گالیاں نہیں دیتے بلکہ خود حضرت علیؓ کو گالیاں دیتے ہیں بہرحال جو شخص ابوبکرؓ اور عمرؓ کی غلامی کا جُوا اپنی گردن پر رکھ لیتا ہے اور اُن کی بیعت میں شامل ہو جاتا ہے اور اُن کے ساتھ مل کر کام کرتا ہے۔ اُس کی نسبت یہ کہنا کہ وہ دل میں خلافت کو اپنا حق سمجھتا تھا اور حق بھی لیاقت کی وجہ سے نہیں بلکہ منشائے شریعت کے مطابق۔ اِس کے دوسرے لفظوں میں یہ معنے بنتے ہیں کہ حضرت علیؓ نعوذ باللہ ظاہر کچھ کرتے تھے اور دل میں کچھ رکھتے تھے اور یہ بات حضرت علیؓ کی نسبت امکانی طور پر بھی ذہن میں لانا گناہ ہے۔ کجا یہ کہ اس کے وقوع پر یقین کیا جائے۔ پس اوّل تو حضرت علیؓ کا طریقِ عمل خود اس خیال کو باطل کر رہا ہے۔ دوسرے قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ کی آیت بھی شیعوں کے اِس خیال کی تردید کرتی ہے۔ کیونکہ یہ آیت بتاتی ہے کہ جن مومنوں میں وہ صفات ہونگی جن کا اللہ تعالیٰ نے اگلی آیات میں ذکر فرمایا ہے وہ اپنے مقصدیں کامیاب ہو جائیں گے۔ کیونکہ اَفْلَحَ کے معنے اپنے مقصد اور مدعا کو حاصل کر لینے اور اُس میں کامیاب ہو جانے کے ہوتے ہیں۔ پس اگر حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کو شیعوں کے نظریہ کے مطابق خلافت کی خواہش تھی اور وہ خلیفہ بن بھی گئے تو صاف طور پر معلوم ہو گیا کہ وہ کامل مومن تھے جن کو اللہ تعالیٰ نے مذہبی اور سیاسی نظام کی باگ ڈور دے دی اور انہیں دُنیا کا راہنما بنا دیا۔ اور یا پھر یہ ماننا پڑیگا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وصیت کے باوجود حضرت علیؓ بھی چاہتے تھے کہ ابوبکرؓ خلیفہ ہو جائیں۔ پس تم نوں سو خدا نے اُن کی اس خواہش کو پُورا کر دیا اور حضرت ابوبکرؓ کامیاب ہو گئے۔ لیکن بعد میں حضرت علیؓ کے اتباع نے ہی اُن کو گالیاں دینی شروع کر دیں۔ پس قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ کی آیت نے شیعوں کے ان دونوں خیالات کا ردّ کر دیا۔ اِس خیال کا بھی کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے والوں کی اکثریت نعوذ باللہ منافق تھی اور صرف اڑھائی آدمی پکے مومن تھے۔ اور اِس خیال کا بھی کہ خلافت کے اصل مستحق حضرت علیؓ تھے حضرت ابوبکرؓ حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ نے اُنکا حق غصب کر لیا تھا۔

اِسجگہ یہ بھی مدنظر رکھنا ضروری ہے کہ قَدْ
اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ میں مومنوں کے متعلق فلاح
کے لفظ کا استعمال بتا رہا ہے کہ مومن کا اصل
مقام نجات حاصل کرنا نہیں بلکہ فلاح حاصل کرنا ہے
نجات جس کے اصل معنے تکلیفوں اور دُکھوں سے
بچ جانے کے ہیں بیشک ایک خوبی ہے مگر اس سے
بڑی خوبی یہ ہے کہ انسان اپنے مقصد کو حاصل کرلے
اِس کی ایسی ہی مثال ہے جیسے کسی جرنیل کی تعریف
کرتے ہوئے یہ کہا جائے کہ وہ دشمن سے بچ کر
نکل آیا۔ بیشک بعض مواقع پر اُس کا دشمن سے
بچ کر نکل آنا بھی قابلِ تعریف فعل ہوگا مگر حقیقی
تعریف کا وہ تبھی مستحق ہوگا۔ جب دشمن کو بھی
گرفتار کرلے۔ اِسی طرح اسلام صرف یہ تعلیم نہیں
دیتا کہ تم نجات حاصل کرو بلکہ وہ اس سے بھی
بلند تر مقصد مومنوں کے سامنے رکھتا ہے اور کہتا
ہے تم فلاح حاصل کرنے کی کوشش کرو۔ کیونکہ
جب انسان دشمن پر کامیابی حاصل کرے گا تو یہ
لازمی امر ہے کہ وہ اُس کے حملہ سے بھی بچ جائیگا
یا وہ شخص جسے بھوک نہیں بیشک وہ بھوک کی
تکلیف سے بچا ہُوا ہوگا۔ مگر وہ جس نے جسم کو
طاقت پہنچانے والا کھانا کھایا ہُوا ہو وہ بھوک
سے بھی بچا ہُوا ہوگا اور اُس کا جسم بھی تنومند
ہوگا۔ پس فلاح ایک ایسا مقام ہے جس میں
نجات بھی شامل ہے اور فلاح یہ ہے کہ انسان
اس مقصد کو حاصل کرے جس کے لئے وہ پیدا کیا
گیا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ انسان اس غرض کے لئے
پیدا کیا گیا ہے کہ وہ صفاتِ الٰہیہ کا مظہر بن
جائے اور خدا تعالیٰ سے ملنے کی جو تڑپ انسانی
فطرت میں رکھی گئی ہے اس کے مطابق وہ اپنے
محبوبِ حقیقی کا قرب حاصل کرے۔ یہی وہ مقصد
ہے جسے اللہ تعالیٰ نے وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَ
الْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ (سورۃ ذاریات ع ۳) میں
بیان فرمایا ہے۔ پس فلاح یہ ہے کہ انسانی پیدائش کا
مقصد حاصل ہو جائے۔ اور اللہ تعالیٰ کی رضا انسان
حاصل کرے۔ یہ مقام انسان کو کیسے حاصل ہو سکتا ہے
اور اس کے کیا کیا ذرائع ہیں۔ اِن امور کا تفصیلی ذکر
اس جگہ کیا گیا ہے۔

چنانچہ اس سورۃ میں اللہ تعالیٰ رُوحانی اور
جسمانی پیدائشوں کو بالمقابل بیان کرکے پہلے رُوحانی
پیدائش کا ذکر کرتا ہے اور فرماتا ہے کہ مومن کامیاب
ہو گئے جو اوّل اپنی نمازوں میں خشوع وخضوع اختیار
کرتے ہیں۔ اور پھر اس سے ترقی کرکے وہ اس مقام
تک پہنچ جاتے ہیں کہ ہر قسم کی فضول اور بے فائدہ
باتوں سے پرہیز کرنے لگ جاتے ہیں۔ یعنی وہ اُن تمام
کاموں سے اجتناب اختیار کرتے ہیں جن کا کوئی عقلی
فائدہ نظر نہ آتا ہو۔ مثال کے طور پر شطرنج ہے تاش ہے
یا اور اس قسم کی کئی کھیلیں ہیں جن سے وقت ضائع
ہوتا ہے۔ اسلام ہر مومن کو یہ ہدایت دیتا ہے کہ وہ
اس قسم کے لغو کاموں سے بچے اور شطرنج یا تاش
یا اس قسم کی دوسری کھیلوں میں حصہ لے کر اپنے وقت
کو ضائع نہ کرے۔ ہاں وہ ورزش سے نہیں روکتا۔
کیونکہ یہ انسان کے اندر جرأت اور بہادری اور طاقت
پیدا کرتی ہے۔ یا مثلاً مجالس میں بیٹھ کر گپّیں ہانکنا
ہے یہ بھی لغو ہے۔ یا مثلاً بیکار زندگی بسر کرنا ہے
یہ بھی لغو ہے۔ بعض لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ
وہ سارا دن بیکار بیٹھے دوستوں کی مجلس میں گپّیں
ہانکتے رہتے ہیں۔ اور اس بات کی ذرا بھی پرواہ نہیں
کرتے کہ وہ اپنے اوقات کا کس بے دردی کے ساتھ

خون کر رہے ہیں - ایک شخص کا باپ مرجاتا ہے اور وہ اپنے پیچھے بہت بڑی جائیداد چھوڑ جاتا ہے۔ اب لڑکے کا کام صرف یہی رہ جاتا ہے کہ وہ سارا دن اپنے دوستوں کی مجلس میں بیٹھا رہتا ہے۔ ایک آتا اور کہتا ہے۔ نواب صاحب آپ ایسے ہیں یا لالہ صاحب آپ ایسے ہیں۔ یا پنڈت صاحب آپ ایسے ہیں یا شاہ صاحب آپ ایسے ہیں۔ اور پھر دوسرا تعریف شروع کر دیتا ہے۔ وہ خاموش ہوتا ہے تو تیسرا اُس کی تعریف شروع کر دیتا ہے۔ اسی طرح سارا دن یہی شغل جاری رہتا ہے کہ دوست آتے ہیں اور گپیں ہانکتے ہیں اور اس کی تعریفیں کرتے رہتے ہیں۔ اس پر وہ بھی اُن کی خوب خاطر تواضع کرتا ہے۔ اگر تھوڑی توفیق ہوئی تو پان الائچی سے تواضع کر دیتا ہے اور اگر زیادہ توفیق ہوئی تو صبح شام ان کو کھانا اپنے دسترخوان پر کھلاتا ہے۔ مگر اس لئے نہیں کہ وہ غریب ہیں۔ اس لئے نہیں کہ وہ بھوکے ہیں۔ اس لئے نہیں کہ وہ ہمدردی کے قابل ہیں بلکہ اس لئے کہ وہ اس کے پاس آکر بیٹھ جاتے ہیں۔ اور مجلس میں خوشی کے ساتھ دن گذر جاتا ہے۔ اسلام اس قسم کے کاموں کی قطعاً اجازت نہیں دیتا۔ وہ فرماتا ہے مسلمان ہمیشہ لغو کاموں سے بچتے اور احتراز کرتے ہیں۔ وہ کوئی ایسا کام نہیں کرتے اور کوئی ایسا کام اُن کو نہیں کرنا چاہیئے جن کا کوئی عقلی فائدہ نہ ہو۔ اور جس سے زندگی بے کار ہو جاتی ہو۔ وہ شخص جو اپنے ماں باپ کی کمائی کھاتا ہے۔ اور خود کوئی کام نہیں کرتا۔ آخر اُسے سوچنا چاہیئے کہ اس کی زندگی کا اُسے کیا فائدہ ہو سکتا ہے۔ یا اُس کی قوم کو کیا فائدہ ہو سکتا ہے۔ یہ چیز تو ایسی ہے جس کا اُس کی ذات کو بھی کوئی فائدہ نہیں ہو سکتا۔ اُس کی قوم کو بھی کوئی فائدہ نہیں ہو سکتا۔ اور دنیا کو بھی کوئی فائدہ نہیں ہو سکتا۔ یہ زندگی کو محض بے کاری اور عیاشی میں ضائع کرنا ہے۔ اور اسلام اس قسم کی بیکار زندگی کی اجازت نہیں دیتا۔ اگر ایک شخص کو اپنے ماں باپ کے مرنے کے بعد دس کروڑ روپیہ بھی جائیداد میں ملتا ہے تو قرآن کریم کا حکم یہی ہے کہ وہ اتنی بڑی جائیداد کا مالک ہونے کے باوجود اپنے وقت کو ضائع نہ کرے بلکہ اسے قوم اور مذہب کے فائدہ کے لئے خرچ کرے۔ اگر اُسے اس قسم کی خدمات کی ضرورت نہیں جن کے نتیجہ میں اُسے روٹی میسر آئے تو وہ ایسی خدمات سرانجام دے سکتا ہے جو آنریری رنگ رکھتی ہوں۔ اس طرح وہ بغیر معاوضہ لئے اپنے ملک یا اپنی قوم یا اپنے مذہب کی خدمت کر کے اپنے وقت کو بھی ضائع ہونے سے محفوظ رکھ سکتا ہے اور اپنے اوقات کا صحیح استعمال کر کے اپنے آپ کو نافع الناس وجود بھی بنا سکتا ہے۔

اس ضمن میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ حکم دیا ہے کہ مرد زیور نہ پہنیں۔ وہ ریشم استعمال نہ کریں۔ اسی طرح سونے اور چاندی کے برتن استعمال کرنے سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے عورتوں کے لئے زیور حرام نہیں۔ مگر اُن کے لئے بھی عام حالات میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے زیورات کو ناپسند فرمایا ہے۔ گو اس وجہ سے کہ وہ مقام زینت میں زیورات کا استعمال اُن کے لئے جائز ہے مگر اسلام اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ زیورات پر اس قدر خرچ کیا جائے کہ ملک کی اقتصادی حالت کو نقصان پہنچ جائے یا نہیں اس قدر زیورات بنوا کر دیئے جائیں کہ اُن میں تفاخر کی رُوح پیدا ہو جائے یا اس کے نتیجہ میں لالچ اور حرص کا مادہ اُن میں بڑھ جائے۔ اُن

کے لئے زیورات کی اجازت ہے مگر ایک حد کے اندر۔ لیکن مردوں کے لئے زیورات کا استعمال قطعی طور پر حرام قرار دیا گیا ہے۔ اِسی طرح وہ برتن جو سونے چاندی کے ہوں اُن کا استعمال بھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ممنوع قرار دیا ہے۔

اس ضمن میں وہ اشیاء بھی آجاتی ہیں جو عام طور پر محض زینت یا تفاخر کے لئے امراء اپنے مکانوں میں رکھتے ہیں۔ مَیں نے دیکھا ہے بعض لوگ اپنی کوٹھیوں کی زینت کے لئے ایسی ایسی چیزیں خرید لیتے ہیں جن کا کوئی بھی فائدہ نہیں ہوتا۔ مثلاً بعض لوگ چینی کے پُرانے برتن خرید کر اپنے مکانوں میں رکھ لیتے ہیں۔ اور سمجھتے ہیں کہ ہم نے ایک بڑی قیمتی چیز خریدی ہے۔ یورپین لوگوں میں خصوصیت کے ساتھ یہ نقص ہے کہ وہ پانچ پانچ دس دس ہزار روپیہ اِس قسم کے برتن خریدنے پر صرف کر دیتے ہیں۔ اور کہتے ہیں۔ یہ وہ برتن ہیں جو آج سے اتنے ہزار سال پہلے کے ہیں۔ یا پُرانے قالین بڑی قیمت پر خرید کر اپنے مکانوں میں لٹکا لیتے ہیں۔ حالانکہ ویسے ہی قالین پچاس ساٹھ روپیہ میں آسانی سے مل جاتے ہیں لیکن محض اس لئے کہ وہ لوگوں کو یہ بتا سکیں کہ یہ قالین فلاں بادشاہ کا ہے۔ یا فلاں زمانہ کا ہے وہ بہت کچھ روپیہ اُس کے خریدنے پر برباد کر دیتے ہیں۔ اسلام کے نزدیک یہ سب لغو چیزیں ہیں۔ اور اِن میں کوئی حقیقی فائدہ نہیں۔ کیونکہ صرف دولت کے اظہار کے لئے لوگ اِن چیزوں کو خریدتے اور اپنے روپیہ کو برباد کرتے ہیں۔ مَیں تو سمجھتا ہوں کہ یورپین لوگوں کو اگر آج پتہ لگے کہ کسریٰ کا قالین اُن کو مل رہا ہے تو شائد اس کے لئے وہ ایک کروڑ روپیہ بھی دے دیں۔ لیکن مسلمانوں کے نزدیک اُس کی اتنی حیثیت تھی کہ ایک جنگ میں کسریٰ نے کہا کہ مسلمان افسر میرے پاس لائے جائیں۔ مَیں اُن کے ساتھ خود بات چیت کرنا چاہتا ہوں۔ اِس پر صحابہؓ کا ایک وفد اُس کے پاس گیا۔ اور اُن کے سردار اپنے بھدّے جوتوں کے ساتھ قالین پر اپنا نیزہ مارتے ہوئے اُس کے پاس پہنچے۔ بادشاہ اُن کی اس حرکت کو دیکھ کر حیران ہو گیا۔ اور کہنے لگا آپ لوگوں میں کوئی تمیز ہی نہیں۔ حالانکہ حقیقت یہ تھی کہ وہ بادشاہ ہو کر بھی قالین کی عزت کرتا تھا۔ اور مسلمان غریب ہو کر بھی صرف خدا کی عزت کرتا تھا۔ اور کسریٰ کے پاس ہونے کی وجہ سے قالین اُس کی نظروں میں کوئی عزت نہیں رکھتا تھا وہ صرف اُس چیز کی عزت کرتا تھا جس کی خدا عزت کرتا تھا۔ غرض رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اِن ساری باتوں کو عملاً ناجائز قرار دیا ہے اور فرمایا ہے کہ مومن کا یہ کام نہیں کہ اِن لغو کاموں میں اپنے وقت کو ضائع کرے اور اس قسم کی بیکار چیزوں پر اپنے روپیہ کو برباد کرے۔

آجکل کے لحاظ سے سنیما اور تھیئٹر وغیرہ بھی اِس حکم کے نیچے آجائیں گے۔ کیونکہ سنیما اور تھیئٹروں وغیرہ پر بھی ملک کی دولت کا ایک بہت بڑا حصّہ ضائع ہوتا ہے۔ یورپ کی آزاد حکومتیں جو اپنی اقتصادی ترقی کے لئے ہمیشہ کوشش کرتی رہتی ہیں۔ اُن کی تو یہ حالت ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ سنیما اور تھیئٹر بناتی ہیں تاکہ وہ لوگ جو سینماؤں کی کمی کی وجہ سے اِس تعیش سے محروم ہیں وہ بھی اس میں حصّہ لے سکیں اور اُن کی دولت اور اُن کا وقت بھی اس پر صرف ہو لیکن اسلام قطعی طور پر اُن تمام چیزوں کو جو بنی نوع انسان کے لئے مفید نہیں بند کرتا ہے اور کہتا ہے کہ ہم اِن کی اجازت نہیں دے سکتے۔ اگر اسلام کے اِن احکام پر پُوری طرح عمل کیا جائے تو امراء کی

ظاہری حالت بھی ایک حد تک مساوات کی طرف لوٹ آئے۔ کیونکہ ناجائز کمائی کا ایک بڑا محرک ناجائز اور بے فائدہ اخراجات ہی ہوتے ہیں۔ اِس طرح هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ میں اِس طرف بھی توجہ دلائی گئی ہے کہ حقیقی مومن صرف لغو کاموں سے ہی نہیں بچتے بلکہ لغو خیالات سے بھی بچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جن لوگوں کو لغو خیالات کی عادت ہوتی ہے اُنہی کے دلوں میں نماز پڑھتے وقت قسم قسم کے خیالات آتے رہتے ہیں جن کی وجہ سے اُن کی توجہ میں انتشار پیدا ہو جاتا ہے۔ اگر وہ لغو خیالات اپنے دل و دماغ میں پیدا ہی نہ کریں۔ اور اگر پیدا ہوں تو اُن کو روکنے کی کوشش کریں تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ اس میں کامیاب نہ ہوں۔ لیکن دیکھا گیا ہے کہ کئی لوگ محض شیخ چلی جیسے خیالات کے چکر میں پھنسے رہتے ہیں حالانکہ اُن کا کچھ بھی فائدہ نہیں ہوتا۔ ایسے خیالات جو محض وہمی اور قیاسی ہوں اُن میں مشغول ہونے کے لئے اپنے نفس کو ہرگز اجازت نہیں دینی چاہیئے۔ اِس سے ایک اور نقص بھی پیدا ہوتا ہے کہ جب کوئی شخص بیکار خیالات میں اپنے دماغ کو لگا دیتا ہے تو پھر وہ معقول باتوں کی طرف توجہ کرنے کے قابل ہی نہیں رہتا۔ پس لغو خیالات اور لغو افکار سے اپنے دل و دماغ کو صاف کرکے انہیں اعلیٰ اور مفید خیالات کی طرف متوجہ رکھنا چاہیئے تاکہ قوتِ فکر ترقی کرے اور دماغ جو اللہ تعالیٰ کی ایک بہت بڑی نعمت ہے وہ ماؤف نہ ہو۔

پھر بتایا کہ مومن اس سے بھی ترقی کرکے اس مقام پر پہنچ جاتے ہیں کہ اپنے اموال غرباء کی ترقی کے لئے ہمیشہ خرچ کرتے رہتے ہیں۔ درحقیقت اسلام اس نظریہ کا حامل ہے کہ دنیا میں جسقدر چیزیں پائی جاتی ہیں۔ وہ سب کی سب خدا تعالیٰ نے بنی نوع انسان کے مشترکہ فائدہ کے لئے پیدا کی ہیں۔ کسی ایک فرد کے لئے مخصوص نہیں کی گئیں۔ اور چونکہ ہر قسم کی دولت جو دنیا میں حاصل کی جاتی ہے دوسرے لوگوں کی مدد سے حاصل کی جاتی ہے۔ اور مزدور کی مزدوری ادا کرنے کے بعد بھی دولت مند کے مال میں اُن کا حق باقی رہ جاتا ہے اس لئے اسلام نے زکوٰۃ کا حکم دیا ہے تاکہ انسانی اموال دوسروں کے حقوق کی ملونی سے پاک ہو جائیں۔ مثلاً ایک کان کا مالک اگر ان تمام مزدوروں کو جو کان میں کام کرتے ہیں اُن کی پوری مزدوری بھی ادا کر دے تب بھی وہ جو کچھ ادا کرے گا وہ اُن کی اُجرت ہوگی۔ حالانکہ قرآنی تعلیم کے مطابق وہ لوگ بھی اُس کان میں حصہ دار تھے۔ پس مزدوری ادا کرنے کے بعد بھی وہ حقِ ملکیت جو مزدوروں کو حاصل تھا ادا نہیں ہوتا۔ اُس کی ادائیگی کی ایک صورت یہ ہو سکتی تھی کہ اُن مزدوروں کو کچھ زائد رقم دے دی جاتی۔ مگر اس طرح بھی اُن چند مزدوروں کا حق تو ادا ہو جاتا جو وہاں کام کر رہے ہیں لیکن باقی دنیا جو اس میں اُنہی کی طرح حصہ دار تھی اپنا حق حاصل کرنے سے محروم رہ جاتی۔ اِس لئے اسلام نے یہ حکم دے دیا کہ ہر شخص لازمًا اپنے اموال کا ایک حصہ زکوٰۃ کے طور پر ادا کرے۔ تاکہ حکومت اُسے تمام بنی نوع انسان کی بہبودی کے لئے مشترکہ طور پر خرچ کرے۔ اِسی طرح رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ ہر کان جو دریافت کی جائے اس کا $\frac{1}{5}$ حصہ حکومت کو ملے گا تاکہ اسے غرباء پر خرچ کیا جائے۔ اِس طرح بھی اسلام نے تمام بنی نوع انسان کا زمین میں جو حصہ ہے اُس کو محفوظ کر دیا ہے۔ اِسی طرح ایک زمیندار جو زمین میں سے اپنی روزی پیدا کرتا ہے گو اپنی محنت کا پھل

کھاتا ہے مگر درحقیقت وہ اُس زمین سے فائدہ اٹھاتا ہے جو تمام بنی نوع انسان کے لئے مشترکہ طور پر بنائی گئی تھی۔ پس اُس کی آمد میں سے بھی ایک حصّہ لازمی طور پر حکومت کو دلوایا جاتا ہے تاکہ تمام بنی نوع انسان کے فائدہ کے لئے اُسے خرچ کیا جائے۔ یہی حال تجارت کا ہے۔ تجارت کرنے والا بظاہر اپنے مال سے تجارت کرتا ہے لیکن اُس کی تجارت ملکی امن کے بغیر کبھی نہیں چل سکتی اور امن کے قیام میں ملک کا ہر شخص حصّہ دار ہوتا ہے۔ پس اس کا حق دلانے کے لئے تجارتی اموال پر بھی اسلام نے زکوٰۃ مقرر کر دی تاکہ ان اموال میں جو دوسرے لوگوں کے حق شامل ہیں وہ ادا ہو جائیں اور حکومت ایسے تمام روپیہ کو بنی نوع انسان سے تعلق رکھنے والے مشترکہ امور کی تکمیل اور اُن کی سرانجام دہی کے لئے خرچ کرے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو غرباء کی تکالیف کا اتنا احساس رہتا تھا کہ احادیث میں آتا ہے کہ جب رمضان کا مہینہ آتا تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اتنی کثرت کے ساتھ غرباء میں صدقات تقسیم فرماتے کہ اُسے اگر ایک تیز ہوا سے مشابہت دی جائے تو یہ بھی ایک ناقص مشابہت ہوگی۔ اسی طرح ایک دفعہ کچھ اموال آئے جن کو آپ نے غرباء میں تقسیم فرما دیا مگر ایک دینار کہیں غلطی سے رہ گیا اور وہ تقسیم نہ ہو سکا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھا رہے تھے کہ اچانک آپ کو وہ دینار یاد آ گیا۔ جب آپ نے نماز ختم کر لی تو بجائے اِس کے کہ آپ بیٹھ کر صحابہؓ سے گفتگو فرماتے آپ جلدی جلدی اندر تشریف لے گئے۔ صحابہؓ کہتے ہیں کہ اُس وقت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم میں ایسا اضطراب پایا جاتا تھا کہ آپ ہماری گردنوں پر سے کودتے ہوئے اندر تشریف لے گئے۔ جب واپس آئے تو آپ نے فرمایا کہ اموال تقسیم کرتے کرتے ایک دینار کہیں گر گیا تھا۔ مجھے نماز پڑھاتے ہوئے وہ یاد آیا تو میرا دل اس خیال سے بے چین ہو گیا کہ اگر میری موت آ گئی اور غرباء کا یہ مال میرے گھر میں ہی پڑا رہا تو میں خدا تعالیٰ کو کیا جواب دوں گا۔ اِس لئے میں فوراً اندر گیا اور اُسے بھی تقسیم کرنے کا حکم دے دیا۔
(بخاری کتاب الکسوف باب من احبّ تعجیل الصدقۃ من یومہا)

اسی طرح احادیث میں آتا ہے کہ ایک دفعہ آپ کے پاس صدقہ کی کچھ کھجوریں آئیں۔ حضرت امام حسنؓ جو اُس وقت چھوٹے بچے تھے اور اُن کی عمر اُس وقت دو اڑھائی سال کی تھی انہوں نے ایک کھجور اٹھا کر مُنہ میں ڈال لی۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا تو آپ نے فوراً اُن کے مُنہ میں انگلی ڈال کر وہ کھجور نکال کر باہر پھینک دی اور فرمایا یہ ہمارا حق نہیں۔ یہ خدا کے غریب بندوں کا حق ہے۔

ایک دفعہ آپ کو معلوم ہُوا کہ آپ کے ایک صحابی حضرت سعدؓ جو مالدار تھے وہ بعض دوسرے لوگوں پر اپنی فضیلت ظاہر کر رہے ہیں۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات سُنی تو فرمایا۔ کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ تمہیں یہ مال اپنے زور بازو سے ملا ہے؟ تمہاری طاقت اور دولت کا اصل ذریعہ غرباء ہی ہیں۔ اِس لئے فخر مت کرو اور غرباء کی تحقیر نہ کرو۔

غرض هُمْ لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُوْنَ میں اللہ تعالیٰ نے بتایا کہ وہی لوگ کامیابی حاصل کیا کرتے ہیں جو غرباء کی ترقی کے لئے اپنے اموال خرچ کرتے رہتے ہیں اور اُن کے حقوق کو نظر انداز نہیں کرتے۔ یورپ میں تو مزدوروں نے کمیٹیاں بنائی ہوئی ہیں وہ اپنے حقوق کے لئے جد و جہد کرتے رہتے ہیں لیکن ہمارے ہاں اوّل تو لوگ مزدور کو اس کے حق سے کم دیتے ہیں۔

اور پھر جو کچھ دیتے ہیں وہ بھی وقت پر نہیں دیتے حالانکہ ہمارے مزدوروں کی کمیٹی آسمان پر بنی ہوئی ہے اور وہ اُن کے حقوق کا تصفیہ کرتی ہے۔ مگر اس زمانہ میں اللہ تعالیٰ پر ایمان نہیں رہا جس کی وجہ سے لوگ آسمانی کمیٹیوں کے فیصلہ کی تعمیل نہیں کرتے۔ اگر خدا تعالیٰ چاہے تو احمدیت کے ذریعہ سے اس کی تعمیل ہونے لگ جائیگی مگر موجودہ زمانہ میں اس کا نتیجہ یہ نکل رہا ہے کہ نہ صرف مزدور طبقہ کی حق تلفی ہو رہی ہے بلکہ مالکوں کو بھی نقصان پہنچ رہا ہے۔ کیونکہ مالکوں کو مزدوروں سے ہی کام لینا پڑتا ہے اور جب ان کے حقوق ادا نہیں ہوتے تو وہ خوشدلی سے کام نہیں کرتے جس کا اثر اس کام پر بھی پڑتا ہے جو اُن کے سپرد کیا جاتا ہے۔ اور اس طرح مالک بھی مزدور کی حق تلفی کر کے اپنے آپ کو نقصان پہنچاتے ہیں۔ یورپ میں میں نے دیکھا ہے کہ کوئی شخص چلتا ہُوا نظر نہیں آتا۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ سب لوگ دوڑ رہے ہیں۔ ۱۹۲۴ء میں جب میں یورپ گیا تو ایک دفعہ میں نے حافظ روشن علی صاحبؓ سے پوچھا کہ کیا آپ نے لنڈن میں کسی کو چلتے بھی دیکھا ہے۔ انہوں نے کہا ہم نے تو کسی کو چلتے نہیں دیکھا جس کو بھی دیکھا ہے دوڑتے ہوئے دیکھا ہے۔ وہاں ہم نے ایک عمارت بنتی دیکھی تو حیرت آگئی کہ کس پھرتی کے ساتھ مزدور وہاں کام کر رہے ہیں۔ ہمارا مزدور جب اینٹ اُٹھانے لگتا ہے تو ہاتھوں میں اٹھا کر پہلے ایک آہ بھر کر ٹوکری میں ڈالتا ہے پھر دوسری اینٹ اٹھاتا اور یہ دکھانے کے لئے کہ وہ کام کر رہا ہے اس طرح پھونک مار مار کر اُس پر سے گرد ہٹاتا ہے کہ گویا اطلس یا کمخواب کا کوئی تھان اس کے سامنے پڑا ہُوا ہے۔ کبھی وہ اس کے ایک طرف پھونک ماریگا اور کبھی دوسری طرف اور بہانہ صرف یہ ہوگا کہ کچھ نہ کچھ دیر لگ جائے۔ پھر آرام سے اٹھتا ہے اور آہستہ آہستہ چلتے ہوئے اُسے معمار کے پاس لے جاتا ہے۔ اور جب اس انداز میں وہ دو تین ٹوکریاں اٹھا لیتا ہے تو اس کے بعد بیٹھ جاتا ہے اور کہتا ہے۔ میں حُقّہ کے دو گھونٹ تو پی لوں۔ مگر انگلینڈ میں یہ بات نہیں۔ وہاں ہر شخص دوڑتا ہُوا نظر آتا ہے اور پھر جس عمارت کا میں نے ذکر کیا ہے وہ جس طرح منٹوں میں میں نے اُٹھتی دیکھی اُس طرح گھنٹوں میں بھی ہمارے ملک میں کوئی عمارت کھڑی نہیں ہوتی۔ مگر افسوس کہ اس دفعہ جو میں علاج کے لئے یورپ گیا اور انگلینڈ بھی گیا۔ تو مجھے معلوم ہُوا کہ انگلینڈ کے لوگوں میں سستی پیدا ہو چکی ہے اور وہ اُس چستی سے کام نہیں کرتے جس چستی سے وہ پہلے کیا کرتے تھے ہاں کہنے والے کہتے ہیں کہ امریکہ میں ابھی کچھ چستی موجود ہے۔

پس غرباء کے حقوق نظر انداز کرنے کا نتیجہ دونوں کے حق میں بُرا نکل رہا ہے۔ غرباء میں سستی اور نکمے پن کی عادت پیدا ہو رہی ہے اور امراء اپنی تجارتوں اور صنعتوں اور کارخانوں اور زمینوں سے صحیح رنگ میں فائدہ اٹھانے سے محروم ہو رہے ہیں۔ پس قومی ترقی کا یہ ایک نہایت اہم اصل ہے کہ غرباء کے حقوق کا خیال رکھا جائے۔ اور امراء اُن کی ترقی اور فلاح و بہبود کے لئے اپنے اموال کا ایک حصہ خرچ کرتے رہیں۔ اس طرح دنیوی طور پر بھی وہ ترقی کرینگے اور روحانی رنگ میں بھی اللہ تعالیٰ کی برکات اور اس کے انعامات حاصل کرینگے۔

پھر مومن اس سے بھی آگے ترقی کرتے ہیں اور اُس مقام پر پہنچ جاتے ہیں کہ اپنے سب سوراخوں کی حفاظت کرتے ہیں یعنی کانوں۔ آنکھوں۔ مُنہ اور اپنی شرمگاہوں کی بھی۔ نہ غیبت سُنتے ہیں۔ نہ دوسروں کے اموال کو لالچ سے دیکھتے ہیں اور نہ بدکاری کرتے ہیں

ہاں اپنی بیویوں سے تعلق رکھنا جائز ہے۔ اسی طرح ایسی عورتوں سے جن کے اُنکے داہنے ہاتھ مالک ہوئے۔ ایسے لوگوں پر مذہبی لحاظ سے کوئی ملامت نہیں۔

"داہنے ہاتھ مالک ہوئے" کی تشریح کے بارہ میں یہ امر یاد رکھنا چاہیئے کہ بعض لوگ تو اس میں نوکرانیوں کو بھی شامل کر لیتے ہیں اور بعض اُن لونڈیوں کو بھی جو چھاپہ مار کر کسی کمزور قوم کے اندر سے زبردستی اغوا کر لی جاتی ہیں اور پھر فروخت کر دی جاتی ہیں اور بعض لوگ ان الفاظ کے یہ معنے لیتے ہیں کہ جو عورتیں جہاد میں حاصل ہوں وہ بغیر نکاح کے گھروں میں رکھنی جائز ہیں لیکن یہ سب معنے غلط ہیں۔ قرآن کریم میں اور احادیث میں نوکروں اور غلاموں کا الگ الگ ذکر ہے۔ اس لئے نوکر اس میں شامل نہیں۔ اور غلاموں کے متعلق قرآن کریم صاف طور پر فرماتا ہے کہ مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗٓ اَسْرٰى حَتّٰى يُثْخِنَ فِي الْاَرْضِ (انفال ع ۹) یعنی کسی نبی کے لئے جائز نہیں کہ وہ کسی پُرامن قوم میں سے مرد جنگی قیدی یا عورت جنگی قیدی زبردستی پکڑ لائے جب تک کہ اُس کے اور اسکے دشمنوں کے درمیان خونریز جنگ نہ ہوئے۔ یعنی یونہی کسی قوم میں سے جو جنگ نہ کر رہی ہو قیدی پکڑنے جائز نہیں جیسا کہ سینکڑوں سال سے حجاز کے لوگ حبشہ سے غلام پکڑ لاتے ہیں۔ یا جیسا کہ گذشتہ صدیوں میں عراق کے لوگ ایران سے یا روم سے یا یونان سے یا اٹلی کے جزیروں سے غلام پکڑ کر لے آتے تھے۔ ایسی غلامی اسلام میں جائز نہیں۔ صرف جنگی قیدی پکڑنے جائز ہیں اور جنگی قیدی پکڑنے بھی صرف اُس وقت جائز ہیں جبکہ دشمن سے باقاعدہ جنگ ہو جائے اور ایسے وقت میں بھی یہ حکم ہے کہ جنگی قیدی کا فدیہ لے کر اُسے چھوڑ دو۔ اور اگر اُس کے پاس فدیہ نہ ہو یا اُس کی قوم اس کا فدیہ دینے کو تیار نہ ہو تو پھر حکومتِ اسلامیہ اُسے احسان کے طور پر چھوڑ دے۔ (سورۂ محمدؐ ع ۱) اور اگر احسان کے طور پر چھوڑنا اس کے لئے مشکل ہو تو زکوٰۃ کے روپیہ میں سے اُس کا فدیہ دے کر اُسے چھوڑ دے (سورۂ توبہ ع ۸) اور اگر اس میں بھی مشکل ہو تو قیدی کو مکاتبت کا اختیار دیا جائے (سورۂ نور ع ۴) مکاتبت کے یہ معنے ہوتے ہیں کہ جنگی قیدی اپنے مالک سے یہ کہتا ہے کہ تم مجھے آزاد کر دو میں محنت اور کمائی کر کے اپنا فدیہ ادا کر دونگا۔ اور اُسوقت تک اپنی ذاتی تجارتوں وغیرہ میں آزاد سمجھا جاؤنگا۔ صرف اسلامی ملک میں رہنے کا وہ پابند ہوتا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ اگر کوئی عورت اوپر کے تمام طریقوں کے باوجود آزاد ہونا نہ چاہے گی۔ تو وہ عورت ایسی ہی ہوگی جو اپنے ملک میں جانا اپنے لئے خطرناک سمجھتی ہوگی اور مسلمان مرد کے پاس رہنے کا جو خطرہ تھا اس کے راستے کھلے ہونے کے باوجود اُن کو استعمال کرنا پسند نہ کرے گی۔ اور جو عورت باوجود ہر قسم کی سہولت کے مسلمان گھرانے سے نکلنا پسند نہ کرے گی اس عورت سے جبراً شادی کر لینے کے سوا مسلمان مرد کیلئے کوئی چارہ نہیں کیونکہ اگر وہ آزاد نہ ہوگی اور مسلمان مرد اس سے جبراً شادی نہ کرے گا تو وہ گھر میں اور علاقہ میں بدکاری پھیلائیگی اور اسلام اس کی اجازت نہیں دیتا۔ پس آزاد عورتوں اور جنگی عورتوں میں اتنا ہی فرق ہے کہ آزاد عورت کے لئے اپنی مرضی سے نکاح کرنا جائز ہوتا ہے۔ اور وہ عورت جو جنگی قیدی ہو وہ یا تو ان طریقوں سے اپنے آپ کو آزاد کرا لیتی ہے جو اسلام نے اس کے لئے کھلے رکھے ہیں یا پھر جس گھر میں وہ ہوتی ہے اُس کا کوئی مرد اُس سے شادی کر لیتا ہے تاکہ بدکاری نہ پھیلے اور اگر اس کے ہاں بچہ پیدا ہو جائے تو پھر وہ آزاد ہو جاتی ہے۔ پس داہنے ہاتھوں کی ملکیت کے الفاظ سے

کوئی شخص دھوکہ نہ کھائے۔ اِن الفاظ کے معنی غلامی کے نہیں۔ کیونکہ غلامی اسلام میں جائز نہیں قرآن کریم صاف الفاظ میں فرماتا ہے کہ جبتک کسی قوم کے ساتھ بھاری جنگ نہ ہو اُس میں سے قیدی پکڑنے جائز نہیں۔ اور پھر انہیں بھی مختلف طریقوں سے آزاد کرنے کا حکم ہے۔ یہ زیادہ تر اسلامی حکومت یا کفر کی حکومت یا قیدی کے رشتہ داروں یا خود قیدی کے اختیار میں ہیں۔ اور اگر کسی قیدی عورت کے چھڑانے کے لئے نہ تو اسلامی حکومت کوشش کرتی ہے جو کہ غیر جانب دار ہے۔ نہ کافر حکومت کوشش کرتی ہے جو کہ قیدی کی جانبدار ہے۔ نہ اس کے رشتہ دار کوشش کرتے ہیں جن کو سب سے زیادہ اُس کا درد ہے اور نہ وہ عورت خود کوشش کرتی ہے جس کو اپنی عزت کا خیال سب سے زیادہ ہو سکتا ہے اور پھر کوئی مسلمان اس عورت سے شادی کر لے۔ تو اس کے لئے یہ راستہ کھلا رکھا جاتا ہے کہ اولاد ہوتے ہی وہ آزاد ہو جائیگی اور باوجود جنگی قیدی ہونے کے اُسے بیچنا ناجائز نہ ہوگا۔ اب بتاؤ ایسی عورت آزاد ہوئی یا قید۔ پہلے تو اُس کا قید کرنا کئی طرح ناجائز قرار دیا گیا۔ پھر اسکی آزادی کے لئے اس کی شادی سے پہلے کئی راستے کھولے گئے۔ پھر شادی کے بعد اولاد ہونے پر اُس کو آزاد قرار دیا گیا اور ہمیشہ کیلئے یہ گارنٹی دی گئی کہ اُسے کسی صورت میں بھی فروخت نہیں کیا جا سکتا (محلّٰی ابن حزم جلد ۹ صفحہ ۲۱۷) اب بتاؤ کہ کیا دنیا میں کسی آزاد عورت کو اس سے زیادہ حق ہوتے ہیں۔

پانچواں درجہ رُوحانی ترقی کا یہ بتایا کہ مومن اپنی امانتوں اور اپنے عہدوں کا خیال رکھتے ہیں یعنی جو امانت اس کے پاس رکھوائی جائے اس کی حفاظت کرتے ہیں اور جو عہد کرتے ہیں خواہ وہ کسی کافر یا دشمن سے ہی کیوں نہ ہو اُسے پُورا کرتے ہیں۔

رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم امانت اور دیانت کے اصول پر اتنی سختی سے عمل کرتے تھے کہ تاریخوں میں لکھا ہے جن دنوں اسلامی افواج نے خیبر کا محاصرہ کیا ہُوا تھا ایک یہودی رئیس کا گلہ بان جو اُس کی بکریاں چرایا کرتا تھا مسلمان ہو گیا۔ اور اُس نے کہا یا رسول اللہ! مَیں اب ان لوگوں میں تو نہیں جا سکتا۔ لیکن میرے پاس اپنے یہودی آقا کی جو بکریاں ہیں اُن کے متعلق حضور کا کیا ارشاد ہے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ بکریوں کا مُنہ یہودی قلعہ کی طرف کر دو اور اُن کو اُدھر دھکیل دو۔ اللہ تعالےٰ خود انہیں اُن کے مالک کے پاس پہنچا دے گا۔ چنانچہ اُس نے ایسا ہی کیا اور بکریاں قلعہ کے پاس چلی گئیں۔ جہاں سے قلعہ والوں نے اُن کو اندر داخل کر لیا (سیرۃ الحلبیہ جلد ۳ صفحہ ۴۵)

اس واقعہ پر غور کرنے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم امانت کی ادائیگی کا کتنا احساس رکھتے تھے اور کس طرح جنگ کے دوران میں بھی دشمن قوم کے اموال پر بے جا قبضہ کرنا جائز نہیں سمجھتے تھے۔ موجودہ زمانہ انتہائی ترقی یافتہ دَور کہلاتا ہے۔ مگر آجکل بھی کبھی ایسا واقعہ نہیں ہُوا کہ جنگ کے دوران میں دشمن اقوام کے جانور ہاتھ آ گئے ہوں تو اُن کو دشمن کی فوج کی طرف واپس کر دیا گیا ہو۔ لڑنے والوں کے اموال آجکل جنگ میں حلال سمجھے جاتے ہیں اور لُوٹ گھسوٹ ایک روزمرہ کا کھیل سمجھا جاتا ہے مگر باوجود اس کے وہ بکریاں ایک ایسے شخص کی تھیں جو اسلامی افواج کے مقابلہ میں برسرِ پیکار تھا اور باوجود اس کے کہ اُن بکریوں کے قلعہ میں واپس چلے جانے کا یہ نتیجہ نکلتا تھا کہ مہینوں تک انہیں اپنی غذا کا سامان مہیّا ہو جاتا اور لڑائی لمبی ہو جاتی۔ پھر بھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ برداشت نہ کیا کہ امانت میں خیانت ہو۔ بلکہ آپ نے فرمایا: بکریوں کا مُنہ قلعہ کی طرف کر دو اور انہیں اس طرف کو ہانک دو تاکہ امانت میں خیانت واقع نہ ہو۔ اس طرح رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم

نے اُسے مسلمان ہوتے ہی پہلا سبق یہ دیا کہ جب کوئی امانت تمہارے پاس رکھ دی جائے تو تمہارا فرض ہے کہ انتہائی مشکلات میں بھی اُس کی حفاظت کرو اور جس کی چیز ہے اُسے واپس پہنچاؤ۔ صحابہؓ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ سبق سیکھا اور انہوں نے بھی اس پر ایسی سختی سے عمل کیا جس کی نظیر آج تہذیب و شائستگی کی دعویدار اقوام میں بھی کہیں نظر نہیں آ سکتی۔ یہ کتنا شاندار نمونہ ہے جو صحابہؓ نے دکھایا کہ حمص جو عیسائیوں کا ایک مرکزی شہر تھا اس پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا اور انہوں نے لاکھوں روپیہ عیسائیوں سے ٹیکس کے طور پر وصول کر لیا لیکن جب انہیں جنگی مصلحتوں کے ماتحت اس شہر کو خالی کرنا پڑا تو انہوں نے وہاں کے ذمہ دار افراد کو بلایا اور اُن کا سارا روپیہ اُن کو واپس کر دیا اور کہا ہم نے تم سے یہ ٹیکس اس لئے لیا تھا کہ ہم تمہارے جان و مال کی حفاظت کریں گے مگر اب چونکہ حالات مخدوش ہو رہے ہیں اور ہم اس شہر کو چھوڑ رہے ہیں اس لئے ہم دیانت و امانت کے اصول کے خلاف یہ بات سمجھتے ہیں کہ تمہارا روپیہ اپنے پاس رکھیں چنانچہ لاکھوں روپیہ ان کو واپس کر دیا گیا۔ تاریخ بتاتی ہے کہ اس واقعہ نے عیسائیوں کے قلوب پر ایسا گہرا اثر چھوڑا کہ جب مسلمانوں کا لشکر شہر سے نکلا تو وہ ساتھ ساتھ الوداع کہنے کے لئے چل پڑے۔ اُن کی آنکھوں سے آنسو بہتے جاتے تھے اور وہ کہتے جاتے تھے کہ خدا تمہیں پھر دوبارہ واپس لائے کہ ہم نے تمہارے جیسے نیک حاکم آج تک نہیں دیکھے۔ اسی طرح اسلام نے حکومت کو بھی امانت قرار دیا ہے اور حکم دیا ہے کہ جب یہ امانت تمہارے سپرد ہو تو تم اس میں کبھی خیانت نہ کرو اور ہمیشہ حکومت کی باگ ڈور ایسے لوگوں کے ہاتھ میں دو جو حکومتی ذمہ واریوں کو پوری دیانت کے ساتھ ادا کرنے والے ہوں اور تاریخ بتاتی ہے کہ مسلمانوں نے اس حکم پر بھی انتہائی سختی کے ساتھ عمل کیا ہے۔

گبن یورپ کا ایک مشہور عیسائی مؤرخ ہے اُس نے روم کے حالات کے متعلق ایک تاریخی کتاب لکھی ہے وہ اس کتاب میں ملک شاہ کے متعلق جو الپ ارسلان کا بیٹا تھا بیان کرتا ہے کہ ابھی چھوٹی عمر کا تھا کہ اُس کا والد فوت ہو گیا۔ اُس کے مرنے کے بعد ملک شاہ کے ایک چچا۔ ایک چچا زاد بھائی اور ایک سگے بھائی نے بالمقابل بادشاہت کا دعویٰ کر دیا اور آپس میں خانہ جنگی شروع ہو گئی۔ نظام الدین طوسی ملک شاہ کے وزیر اعظم تھے اور چونکہ وہ شیعہ تھے انہوں نے ملک شاہ سے درخواست کی کہ آپ میرے ساتھ امام موسیٰ رضا کے مزار پر دعا کے لئے تشریف لے چلیں تاکہ اللہ تعالیٰ اس جنگ میں آپ کو کامیاب فرمائے۔ ملک شاہ چل پڑا اور اُس نے وہاں دعا کی۔ جب دعا سے فارغ ہوئے تو ملک شاہ نے نظام الملک طوسی[1] سے پوچھا کہ بتائیے آپ نے کیا دعا کی ہے اُس نے کہا میں نے تو یہ دعا کی ہے کہ خدا تعالیٰ آپ کو فتح بخشے۔ ملک شاہ نے کہا۔ لیکن میں نے تو یہ دعا نہیں کی۔ میں نے تو یہ دعا کی ہے کہ اے میرے رب! اگر میرا بھائی مسلمانوں پر حکومت کرنے کا مجھ سے زیادہ اہل ہے تو تو اُسے کامیابی بخش۔ اور میری جان اور میرا تاج مجھ سے واپس لے لے۔ اگر میں اس امانت کو زیادہ عمدگی سے ادا کرنے کے قابل ہوں تو پھر تو مجھے کامیابی عطا فرما۔

گبن ایک نہایت ہی متعصب عیسائی مؤرخ ہے مگر اس واقعہ کے سلسلہ میں وہ بے اختیار لکھتا ہے کہ اس مسلمان نوجوان شہزادہ کے اس قول سے زیادہ پاکیزہ اور وسیع نظریہ تاریخ کے صفحات میں تلاش کرنا ناممکن ہے اور عیسائیت کے بوڑھے سے بوڑھے بادشاہ بھی ایسے اخلاق کا مظاہرہ نہیں کرتے۔ یہ روح جو مسلمانوں کے اندر پیدا ہوئی اسی بات کا نتیجہ تھی کہ اسلام نے ان کے دماغوں میں

[1] ابن خلقان جلد پنجم صہ ۲۸۵

بڑی سختی کے ساتھ یہ بات مرکوز کر دی تھی کہ حکومت بھی ایک امانت ہے اور تمہارا کام یہ ہے کہ تم کبھی کسی امانت میں خیانت نہ کرو۔

پھر ایفائے عہد کا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اسقدر خیال رہتا تھا کہ ابھی آپ نے دعوٰئے نبوت بھی نہیں فرمایا تھا کہ قبائلی لڑائیوں اور روزمرہ کے باہمی جھگڑوں اور فسادات کو دیکھ کر مکّہ کے چند نوجوانوں نے ایک انجمن بنائی جس کی غرض یہ تھی کہ وہ مظلوموں کی مدد کیا کریں گے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم بھی اس مجلس میں شامل ہوئے اور سب نے مل کر یہ قسمیں کھائیں کہ جب تک سمندر میں پانی کا ایک قطرہ تک بھی موجود ہے وہ ہمیشہ مظلوموں کی مدد کرینگے اور اُن کے حق انکو ظالم سے دلوانے کی کوشش کریں گے۔ اور اگر وہ ایسا نہیں کر سکیں گے تو اپنے پاس سے مظلوم کا حق ادا کرینگے۔ یہ انجمن جو مظلوموں کی دادرسی اور اُن کی اعانت کا بیڑہ لے کر اٹھی تھی اس نے کیا کام کیا اور کس طرح مظلوموں کی مدد کی؟ اس بارہ میں تاریخی طور پر کچھ زیادہ معلومات نہیں ملتیں۔ مگر دعوٰئے نبوت کے بعد جبکہ مکّہ کے لوگ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جانی دشمن بن گئے ایک شخص جس نے ابوجہل سے کچھ روپیہ لینا تھا مگر وہ دیتا نہیں تھا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور اُس نے عرض کیا کہ آپ حلف الفضول میں شامل رہ چکے ہیں اور آپ نے اِس کی قسم کھائی تھی کہ ہمیشہ مظلوموں کی مدد فرمائینگے میں آپ کو آپ کا عہد یاد دلاتے ہوئے درخواست کرتا ہوں کہ میرا کچھ روپیہ ابوجہل نے دینا ہے آپ اس کے پاس چلیں اور مجھے یہ روپیہ دلا دیں جب اُس نے یہ بات کہی تو باوجود اس کے کہ مکّہ میں کھلے بندوں پھرنا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے خطرہ کا موجب تھا اور پھر ابوجہل آپ کا شدید ترین دشمن تھا اور ہو سکتا تھا کہ وہ آپ کو کوئی نقصان پہنچائے۔ آپ فوراً اُٹھے۔ اور اُس کے ساتھ چل کر ابوجہل کے مکان پر جا پہنچے اور دروازہ کھٹکھٹایا۔ ابوجہل دستک کی آواز سُن کر باہر نکلا آپ نے فرمایا۔ اِس شخص کا تم نے کچھ روپیہ لیا ہوا ہے وہ فوراً اسے ادا کر دو۔ ابوجہل بلاچون وچرا اندر گیا اور روپیہ لاکر اُس نے اُس شخص کے حوالے کر دیا۔ ابوجہل کا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کہنے پر ایک شخص کو اس کا روپیہ دے دینا کوئی ایسی بات نہ تھی جو چھپی رہتی جنگل کی آگ کی طرح یہ بات مکّہ میں پھیل گئی اور لوگوں میں چہ میگوئیاں شروع ہو گئیں کہ ابوالحکم ہمیں تو کہتا ہے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بات نہ مانو۔ اور خود اُس سے اتنا ڈر گیا کہ ایک منٹ کے اندر اندر روپیہ دینے کے لئے تیار ہو گیا۔ جب اُس نے یہ باتیں سُنیں تو وہ کہنے لگا۔ خدا کی قسم اگر تم میری جگہ ہوتے تو تم بھی وہی کام کرتے جو مَیں نے کیا ہے۔ کیونکہ جب محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) آیا تو مجھے اُس کے دائیں اور بائیں دو مست اونٹ کھڑے دکھائی دیئے جن کو دیکھ کر میرا دل سخت خوف زدہ ہو گیا اور مَیں نے سمجھا کہ اگر مَیں نے اُس کی بات نہ مانی تو یہ دونوں اونٹ مجھے چیر کر کھا جائینگے اب یہ بات تو اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے کہ اُسے کوئی ایسا نظارہ نظر آیا تھا یا حق کا رعب اُس پر چھا گیا تھا مگر بہرحال جب رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم حلف الفضول کے معاہدہ کے احترام میں ایک مظلوم شخص کا حق دلانے کے لئے انتہائی خطرات کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اُس کے پاس گئے تو سچائی کے رُعب نے اُس کی شرارت کی رُوح کو کچل دیا اور وہ مظلوم کا حق دینے کیلئے تیار ہو گیا۔

پھر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو وفائے عہد کا اِس قدر پاس تھا کہ صلح حدیبیہ کے موقعہ پر جب یہ معاہدہ ہُوا کہ اگر مکّہ کے لوگوں میں سے کوئی نوجوان مسلمان ہو کر

تو اُسے اس کے رشتہ داروں کی طرف واپس کر دیا جائیگا لیکن جو مسلمان مکّہ والوں کی طرف واپس جائیگا اُسے مکّہ والے واپس کرنے پر مجبور نہیں ہونگے ۔ تو ابھی اس معاہدہ کی سیاہی بھی خشک نہیں ہوئی تھی کہ سُہیل جو مکّہ والوں کی طرف سے معاہدہ کر رہا تھا اُس کا اپنا بیٹا رسیّوں سے جکڑا ہُوا اور زخموں سے چُور رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے سامنے آکر گرا اور اُس نے کہا یا رسول اللہ! میں دل سے مسلمان ہوں مگر میرا باپ اسلام کی وجہ سے مجھے تکلیفیں دے رہا ہے آج میرا باپ یہاں آیا تو میں موقعہ پاکر نکل بھاگا اور یہاں آگیا ۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے ابھی اسے کوئی جواب نہیں دیا تھا کہ اُس کا باپ کہنے لگا معاہدہ ہو چکا ہے ۔ اب اِسے میرے ساتھ جانا پڑیگا ۔ ابوجندل کی حالت اُس وقت اتنی دردناک تھی کہ مسلمانوں کی آنکھوں سے خون کے آنسو بہتے تھے ۔ خود ابوجندل نے بھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! کیا آپ مجھے پھر مکّہ والوں کی طرف واپس کر دیں گے تاکہ یہ لوگ مجھے پہلے سے بھی زیادہ تکلیف دیں؟ مگر آپ نے فرمایا ۔ خدا کے رسول معاہدہ نہیں توڑا کرتے تمہیں بہرحال واپس جانا پڑیگا تم صبر سے کام لو اور خدا تعالیٰ پر توکل کرو ۔ چنانچہ وہ مکّہ میں واپس بھجوا دیا گیا ۔ پھر جب آپ مدینہ پہنچے تو مکّہ کا ایک اور نوجوان ابوبصیرؓ آپ کے پیچھے پیچھے دوڑتا ہُوا مدینہ پہنچا مگر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اُسے بھی معاہدہ کے مطابق مکّہ واپس جانے پر مجبور کیا ۔

اِسی طرح وفائے عہد کا آپ کو اس قدر خیال تھا کہ ایک دفعہ ایک حکومت کا ایلچی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کوئی پیغام لے کر آیا ۔ اور آپ کی صحبت میں کچھ دن رہ کر اسلام کی سچائی کا قائل ہوگیا ۔ اُس نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ یا رسول اللہ میں اپنے اسلام کا اظہار کرنا چاہتا ہوں ۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہ مناسب نہیں ۔ تم اپنی حکومت کی طرف سے ایک امتیازی عہدہ پر مامور ہو ۔ تم اسی حالت میں واپس جاؤ ۔ اور وہاں جاکر اگر تمہارے دل میں اسلام کی محبت پھر بھی قائم رہے تو دوبارہ آکر اسلام قبول کرو ۔
(ابوداود باب الوفاء بالعہد)

پھر مسلمانوں کو بھی وفائے عہد کا اسقدر خیال رہتا تھا کہ ایک دفعہ کفار نے عین جنگ کے دوران میں صعوکا سے ایک حبشی مسلمان سے معاہدہ کر لیا اور انہوں نے قلعہ کے دروازے کھولدیئے ۔ جب لشکر آگے بڑھا تاکہ قلعہ میں داخل ہو ۔ تو انہوں نے کہا ۔ ہمارا تو تم سے معاہدہ ہو چکا ہے ۔ کمانڈر نے کہا ۔ میرے ساتھ کوئی معاہدہ نہیں ہوا ۔ انہوں نے کہا ۔ ہم نے ایک حبشی سے معاہدہ کر لیا تھا ۔ اور اُس نے بعض شرائط پر ہمیں امن دیدیا تھا ۔ کمانڈر نے کہا اُسے معاہدہ کا کیا اختیار تھا معاہدہ تو میرے ساتھ ہونا تھا ۔ انہوں نے کہا ۔ ہم نہیں جانتے ہم آپ سے معاہدہ کر چکے ہیں ۔ جب یہ اختلاف بڑھا تو اسلامی فوج کے کمانڈر نے حضرت عمرؓ کو تمام واقعہ لکھدیا ۔ اور دریافت کیا کہ اب کیا کیا جائے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ اللہ تعالیٰ نے وفاءِ عہد کو بڑی عظمت و اہمیت دی ہے ۔ سو تم اس عہد کو پورا کرو اور اُس وقت تک اس عہد پر قائم رہو ۔ جب تک کہ فریق ثانی خود اس عہد کی خلاف ورزی نہ کرے (طبری جلد ۵ صفحہ ۲۵۶۸)

غرض اسلام امانت و دیانت اور معاہدات کی پابندی کو خاص اہمیت دیتا ہے ۔ اور فرماتا ہے کہ وہی مومن کامیاب ہو سکتے ہیں جو امانت اور وفائے عہد میں بھی بہترین نمونہ پیش کرنے والے ہوں ۔

پھر چھٹا درجہ یہ بتایا کہ وہ لوگ اپنی نمازوں کی حفاظت کرتے ہیں ۔ یہاں نماز کا لفظ جمع کی صورت میں

آیاہے۔ پس اِس سے ایک تو اس طرف اشارہ ہے کہ وہ ہر قسم کی نمازیں یعنی فرائض اور نوافل اچھی طرح ادا کرتے ہیں اور دوسرے اس میں یہ بتایا گیا ہے کہ وہ اپنی قوم میں سے ہر ایک کی جسمانی عبادت کی حفاظت کرتے ہیں یعنی یہ دیکھتے رہتے ہیں کہ اُن کی اولاد اُن کی بیویاں۔ اُن کے رشتہ دار اور اُن کے ہمسایہ اور اُن کی سب قوم نماز کی پابند ہے یا نہیں۔ کیونکہ جب تک سارے خاندان بلکہ ساری قوم کے اعمال درست نہ ہوں۔ اُس وقت تک انسان کا اپنا عمل بھی خطرہ سے باہر نہیں رہ سکتا۔ بہت دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ جب ایک شخص صبح اپنے بچے کو نماز کے لئے جگانے لگتا ہے تو اُس وقت فوراً جذباتِ محبت اُس کے سامنے آجاتے ہیں اور دل میں کہتا ہے سخت سردی ہے۔ مَیں اِسے کیوں جگاؤں۔ اگر نماز کے لئے جگایا تو اسے سردی لگ جائے گی۔ پھر وہ بیوی کو نماز کے لئے جگانے لگتا ہے تو اُس وقت بھی محبت کے جذبات اُس کے سامنے آجاتے ہیں اور وہ کہتا ہے۔ ساری رات یہ بچے کو اُٹھا کر پھرتی رہی ہے۔ اَب مَیں اِسے جگاؤں گا تو اِس کی نیند خراب ہو جائیگی بہتر ہے کہ یہ سوئی رہے۔ نماز پھر پڑھ لے گی۔ غرض کبھی سخت سردی اور کبھی سخت گرمی کا عذر اس کے سامنے آجاتا ہے چھ مہینے اس کے سامنے یہ سوال رہتا ہے کہ سخت سردی ہے اِن ایام میں بچہ کو نماز کے لئے کیوں جگاؤں اسے سردی لگ جائیگی اور چھ مہینے اُس کے سامنے یہ سوال رہتا ہے کہ نازک اور پھول سا بچہ ہے نماز پڑھنے گیا تو اسے گرمی لگ جائیگی۔ پھر کبھی بیوی کو جگاتے وقت یہ خیال آجاتا ہے کہ یہ ساری رات تو بچے کو اٹھائے پھرتی رہی ہے۔ اس لئے بہتر ہے کہ سوئی رہے۔ نماز پھر پڑھ لے گی۔ غرض قدم قدم پر جذبات اور احساسات اُس کے سامنے آجاتے ہیں۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نہ اُنکی اصلاح ہوتی ہے اور نہ اِس کی اپنی اصلاح مکمل ہوتی ہے۔ اِسی لئے اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں فرمایا ہے۔ قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَ اَهْلِيْكُمْ نَارًا۔ یعنی اے میرے بندو۔ نہ صرف اپنے آپ کو دوزخ کی آگ سے بچاؤ بلکہ اپنے اہل وعیال کو بھی آگ سے بچاؤ۔ تمہارا صرف اپنے آپ کو آگ سے بچالینا کافی نہیں بلکہ دوسروں کو بچانا بھی ضروری ہے کیونکہ اگر دوسرا نہیں بچیگا تو وہ تمہیں بھی لے ڈوبے گا۔ مگر یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ نماز کی پابندی کئی رنگ کی ہوتی ہے۔ سب سے پہلا درجہ جس سے اُتر کر اور کوئی درجہ نہیں یہ ہے کہ انسان بالالتزام پانچوں وقت کی نمازیں پڑھے۔ جو مسلمان پانچ وقت کی نمازیں پڑھتا ہے اور اُس میں کبھی ناغہ نہیں کرتا وہ ایمان کا سب سے چھوٹا درجہ حاصل کرتا ہے۔ **دوسرا درجہ** نماز کا یہ ہے کہ پانچوں نمازیں وقت پر ادا کی جائیں جب کوئی مسلمان پانچوں نمازیں وقت پر ادا کرتا ہے تو وہ ایمان کی دوسری سیڑھی پر قدم رکھ لیتا ہے۔ پھر **تیسرا درجہ** یہ ہے کہ نماز با جماعت ادا کی جائے۔ با جماعت نماز کی ادائیگی سے انسان ایمان کی تیسری سیڑھی پر چڑھ جاتا ہے پھر **چوتھا** درجہ یہ ہے کہ انسان نماز کے مطالب کو سمجھ کر ادا کرے۔ جو شخص ترجمہ نہیں جانتا وہ ترجمہ سیکھ کر نماز پڑھے اور جو ترجمہ جانتا ہو وہ ٹھہر ٹھہر کر نماز کو ادا کرے۔ یہاں تک کہ وہ سمجھ لے کہ مَیں نے نماز کو کما حقّہٗ ادا کیا ہے۔ پھر **پانچواں** درجہ نماز کا یہ ہے کہ انسان نماز میں پوری محوّیت حاصل کرے۔ اور جس طرح غوطہ زن سمندر میں غوطہ لگاتے ہیں۔ اِسی طرح وہ بھی نماز کے اندر غوطہ مارے۔ یہاں تک کہ وہ دوؤں میں سے ایک مقام حاصل کر لے۔ یا تو یہ کہ وہ خدا کو دیکھ رہا ہو اور یا یہ کہ وہ اِس یقین کے ساتھ نماز پڑھ رہا ہو کہ

خدا تعالیٰ اُسے دیکھ رہا ہے۔ اِس مؤخرالذکر حالت کی مثال ایسی ہی ہے۔ جیسے کوئی اندھا بچہ اپنی ماں کی گود میں بیٹھا ہو۔ اپنی ماں کی گود میں بیٹھے ہوئے اُس بیٹے کو بھی تسلی ہوتی ہے جو بینا ہو اور اپنی ماں کو دیکھ رہا ہو مگر ماں کی گود میں بیٹھے ہوئے اُس بیٹے کو بھی تسلی ہوتی ہے جو نابینا ہو۔ اِس خیال سے کہ گو وہ اپنی نابینائی کی وجہ سے ماں کو نہیں دیکھ رہا مگر اُس کی ماں اُسے دیکھ رہی ہے۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ نماز پڑھتے وقت بندے کو اِن دو میں سے ایک مقام ضرور حاصل ہونا چاہیئے۔ یا تو یہ کہ وہ خدا کو دیکھ رہا ہو۔ اور یا یہ کہ اس کا دل اس یقین سے لبریز ہو کہ خدا تعالیٰ اسے دیکھ رہا ہے۔ یہ ایمان کا پانچوں مقام ہے اور اِس مقام پر بندے کے فرائض پورے ہو جاتے ہیں۔ مگر جس بام رفعت پر اُسے پہنچنا چاہیئے اس پر ابھی نہیں پہنچا۔

اِس کے بعد چھٹا درجہ ایمان کا یہ ہے کہ نوافل پڑھے جائیں۔ یہ نوافل پڑھنے والا گویا خدا تعالیٰ کے حضور یہ ظاہر کرتا ہے کہ میں نے فرائض کو تو ادا کر دیا ہے مگر ان فرائض سے میری تسلی نہیں ہوئی اور وہ کہتا ہے۔ اے خدا میں یہ چاہتا ہوں کہ میں اِن فرائض کے اوقات کے علاوہ بھی تیرے دربار میں حاضر ہوا کروں جیسے کئی لوگ جب کسی بزرگ کی ملاقات کے لئے جاتے ہیں تو وہ مقررہ وقت گذر جانے پر کہتے ہیں کہ دو منٹ اور دیجیئے۔ اور وہ اِن مزید دو منٹوں میں لذّت محسوس کرتے ہیں۔ اسی طرح ایک مومن جب فرائض کی ادائیگی کے بعد نوافل پڑھتا ہے تو وہ خدا تعالےٰ سے کہتا ہے کہ اب میں اپنی طرف سے کچھ مزید وقت حاضر ہونا چاہتا ہوں۔

ساتواں درجہ ایمان کا یہ ہے کہ انسان نہ صرف پانچوں نمازیں اور نوافل ادا کرے بلکہ رات کو بھی تہجد کی نماز پڑھے۔ یہ وہ سات درجات ہیں جن سے نماز مکمل ہوتی ہے۔ اور اِن درجات کو حاصل کرنے والے وہ لوگ ہوتے ہیں جن کے متعلق حدیث میں آتا ہے کہ خدا تعالیٰ رات کے وقت عرش سے اترتا ہے۔ اور اُس کے فرشتے پکارتے ہیں کہ اے میرے بندو خدا تعالےٰ تمہیں ملنے کے لئے آیا ہے۔ اُٹھو اور اس سے مل لو۔

پس اِن سات درجوں کو پورا کرنا ہر شخص کے لئے ضروری ہے۔ ہر شخص کا فرض ہے کہ وہ نماز کا پابند ہو۔ ہر شخص کا فرض ہے کہ وہ نمازوں کو وقت پر ادا کیا کرے۔ ہر شخص کا فرض ہے کہ وہ نماز باجماعت ادا کیا کرے۔ ہر شخص کا فرض ہے کہ وہ نماز کو سوچ سمجھ کر اور ترجمہ سیکھ کر ادا کرے۔ ہر شخص کا فرض ہے کہ وہ علاوہ فرضی نمازوں کے رات اور دن کے اوقات میں نوافل بھی پڑھا کرے۔ ہر شخص کا فرض ہے کہ وہ نماز کے اندر محویت پیدا کرے اور اتنی محویت پیدا کرے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قول کے مطابق یا تو وہ خدا تعالےٰ کو دیکھ رہا ہو۔ یا وہ اپنے دل میں یہ یقین رکھتا ہو کہ خدا تعالےٰ اُسے دیکھ رہا ہے۔ پھر ہر شخص کو چاہیئے کہ وہ فرائض اور نوافل اس التزام اور باقاعدگی سے ادا کرے کہ اُس کی راتیں بھی دن بن جائیں۔ اِسی طرح تہجد کی مناجات سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کی کوشش کرے۔ جب تک کوئی شخص اپنی نمازوں کی اِس رنگ میں حفاظت نہیں کرتا اُس وقت تک اُس کا یہ اُمید کرنا کہ وہ اللہ تعالےٰ کو راضی کرے گا ایک وہم سے زیادہ کچھ حقیقت نہیں رکھتا۔

پھر فرماتا ہے انسان کی روحانی ترقی کا ساتواں درجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اُن کو ایسی جنّت کا وارث کر دیتا ہے جو سب جنّتوں کا مجموعہ ہے یعنی فردوس۔ فردوس کے معنے عربی زبان میں ایسے باغ کے ہوتے ہیں۔ جو

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ ﴿۱۳﴾ ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ ﴿۱۴﴾ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا ۗ ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ ۗ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ ﴿۱۵﴾ ثُمَّ اِنَّكُمْ بَعْدَ ذٰلِكَ لَمَيِّتُوْنَ ﴿۱۶﴾ ثُمَّ اِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ تُبْعَثُوْنَ ﴿۱۷﴾

اور ہم نے انسان کو گیلی مٹی کے خلاصہ سے بنایا۔ پھر اُس کو ایک ٹھہرنے والی جگہ میں نطفہ کے طور پر رکھا۔ پھر نطفہ کو ترقی دے کر ایسی شکل دی کہ وہ چمٹنے والا وجود بن گیا۔ پھر اُس چمٹنے والے وجود کو ایک بوٹی بنا دیا۔ پھر اُس بوٹی کو ہم نے ہڈیوں کی شکل میں تبدیل کر دیا۔ پھر اُن ہڈیوں پر ہم نے گوشت چڑھایا۔ پھر اس کو ایک اور شکل میں تبدیل کر دیا۔ پس بہت ہی برکت والا ہے وہ خدا جو سب سے اچھا پیدا کرنے والا ہے۔ پھر تم لوگ اس کے بعد مرنے والے ہو۔ پھر تم قیامت کے دن اٹھائے جانے والے ہو سے

ہر قسم کے باغوں کا مجموعہ ہو۔ پس فردوس کا لفظ استعمال کر کے اِس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ جس طرح یہ لوگ سب اعلیٰ درجہ کے رُوحانی خواص اپنے اندر جمع رکھتے ہیں اسی طرح ان کو مقام بھی وہ ملے گا جو تمام خوبیوں کا جامع ہوگا۔ اور هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ کہہ کر اس طرف اشارہ فرمایا کہ جس طرح یہ لوگ اللہ تعالیٰ کی عبادت کی حفاظت کیا کرتے تھے اِسی طرح اللہ تعالیٰ بھی اس بات کی نگرانی رکھے گا کہ وہ اِن انعامات کے ہمیشہ وارث رہیں اور کبھی ان پر تنزل کی گھڑی نہ آئے۔

سے حل لغات:- سُلَالَةٌ۔ اَلسُّلَالَةُ کے معنے ہیں مَا اسْتُلَّ مِنَ الشَّيْءِ وَ الْخُلَاصَةُ وَ اِنَّمَا تُسَلُّ مِنَ الْكَدَرِ۔ یعنی وہ چیز جو کسی دوسری چیز سے کھینچ کر نکال لی جائے۔ یا کسی چیز کا جوہر جو ہر قسم کی میل کچیل اور تلچھٹ سے پاک کر لیا جائے۔ اِسی طرح اَلسُّلَالَةُ کے ایک معنے اَلنَّسْلُ وَالْوَلَدُ کے بھی ہیں یعنی انسانی نسل اور اولاد (اقرب)

طِيْن

طِیْن: اَلطِّيْنُ: تُرَابٌ اَوْ رَمْلٌ وَ كِلْسٌ يُجْبَلُ بِالْمَاءِ وَيُطْلٰى بِهٖ یعنی طین اُس مٹی یا ریت اور چونا کو کہتے ہیں جس میں پانی ملایا گیا ہو اور اُس کے ساتھ لپائی کی جائے۔ (اقرب)

علقة

عَلَقَةٌ۔ علق کے معنے خون کے ہوتے ہیں۔ خصوصاً اُس خون کے جو گاڑھا اور جما ہُوا ہو۔ اور

عَلَقَةٌ کے معنے ہیں اَلْقِطْعَةُ مِنَ الْعَلَقِ لِلدَّمِ ۔ یعنی خون کا لوتھڑا (اقرب)

اَلْمُضْغَةُ

اَلْمُضْغَةُ : کے معنے ہیں قِطْعَةُ لَحْمٍ یعنی گوشت کی بوٹی (اقرب)

تفسیر: فرماتا ہے کہ جس طرح یہ سات رُوحانی پیدائش کے مدارج ہیں اسی طرح تمہاری جسمانی پیدائش کے بھی مختلف مدارج ہیں۔ سب سے پہلے ہم انسان کو مٹی کے خلاصہ سے پیدا کرتے ہیں یعنی اس غذا سے جو مٹی سے نکلتی ہے جیسے نباتات، حیوانات اور جمادات وغیرہ یہی حال عالمِ روحانیات کا بھی ہے۔ یعنی جس طرح نطفہ ان غذاؤں کے نتیجہ میں پیدا ہوتا ہے جو زمین سے حاصل ہوتی ہیں اسی طرح روحانیت کا بیج بھی اس وقت تک پیدا نہیں ہو سکتا جب تک انسان کے اندر خشوع خضوع اور فروتنی کی حالت پیدا نہ ہو اور کبر اور غرور کا مادہ اُس کے اندر سے نہ نکل جائے۔ پھر جب انسان اس غذا کو کھاتا ہے جو مٹی میں سے نکلتی ہے تو اللہ تعالیٰ اُسے نطفہ بنا کر ایک ٹھہرنے والی جگہ پر رکھ دیتا ہے جو جسمانی پیدائش کا دوسرا درجہ ہے۔ رُوحانی پیدائش میں اس کے مقابل پر وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ کو رکھا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ جس طرح نطفہ کی حفاظت کے لئے مختلف قسم کی احتیاطوں کی ضرورت ہوتی ہے ورنہ اُس کے ضائع ہونے کا خطرہ ہوتا ہے اِسی طرح روحانیت کا بیج بھی اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ انسان ہر قسم کے لغو کاموں سے بچے ورنہ انسان کی روحانی پیدائش تکمیل تک نہیں پہنچ سکتی پھر تیسرا درجہ یہ بتایا کہ ہم نطفہ کو علقہ بنا دیتے ہیں یعنی وہ ایک جمے ہوئے لہو کی طرح ہو جاتا ہے۔ رُوحانی درجات میں اس کے مقابل پر وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فَاعِلُوْنَ کو رکھا گیا ہے۔ یعنی جس طرح نطفہ علقہ بن جاتا ہے اور رحم سے چمٹ جاتا ہے اِسی طرح روحانی ترقی کرنے والا انسان ایسے مقام پر پہنچ جاتا ہے کہ بنی نوع انسان کی محبت اس کے دل میں پیدا ہو جاتی ہے اور وہ بنی نوع انسان کی ترقی کے لئے اپنے اموال خرچ کرنے لگ جاتا ہے۔ پھر چوتھا درجہ انسانی پیدائش کا یہ بیان فرمایا کہ جما ہوا لہو ایک بوٹی کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ یعنی خون کے لوتھڑے میں جو گندگی پائی جاتی ہے وہ اِس سے نکل جاتا ہے اِس کے مقابلہ میں وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ کو رکھا گیا ہے یعنی وہ اپنے تمام سوراخوں کی حفاظت کرنے لگ جاتا ہے اور اب اس کا وجود ایک مستقل وجود بن جاتا ہے جو گندگی سے اپنے آپ کو اپنے ارادہ سے محفوظ رکھتا ہے۔ پھر پانچواں درجہ یہ بتایا کہ بوٹی کے بعد ہڈی جسم میں بننی شروع ہو جاتی ہے۔ اِس کے مقابلہ میں رُوحانی درجہ یہ بتایا کہ وہ امانتوں اور عہدوں کی پابندی کرتے ہیں یعنی اُن میں ایسی روحانی سختی پیدا ہو جاتی ہے کہ خواہ اُنکے پاس کوئی دشمن امانت رکھوائے یا کوئی مخالف قوم اُنکے ساتھ معاہدہ کرے وہ اس کی پابندی کرتے ہیں کسی قسم کا لالچ یا کمزوری اُن میں پیدا نہیں ہوتی۔ گویا ہر شخص جانتا ہے کہ وہ موقع پر پھر نہیں جائیں گے بلکہ بات کے پکے رہیں گے۔ جسمانی پیدائش کا چھٹا درجہ یہ بتایا کہ ہڈیوں پر گوشت چڑھا دیا جاتا ہے۔ اِسکے مقابلہ میں روحانی درجہ یہ بیان کیا کہ وہ اپنی اور اپنی قوم کی نمازوں کی حفاظت کرتے رہتے ہیں یعنی جس طرح چمڑے کے چڑھ جانے کے بعد بچہ بہت حد تک ضائع ہو جانے سے محفوظ ہو جاتا ہے۔ اِسی طرح وہ لوگ جو اپنی قوم میں خدا تعالیٰ کی عبادت کو قائم رکھتے ہیں وہ نہ صرف ذاتی طور پر محفوظ ہو جاتے ہیں بلکہ

قومی طور پر بھی محفوظ ہو جاتے ہیں۔ اور بوجہ قوم کے نیک ہو جانے کے وہ بیرونی اثرات سے بھی اُسی طرح محفوظ ہو جاتے ہیں جیسے چمڑے والا انسان بیرونی اثرات سے محفوظ ہوتا ہے۔

جسمانی پیدائش میں ساتواں درجہ یہ بیان فرمایا کہ جب ہڈیوں پر گوشت اور چمڑہ مڑھ دیا جاتا ہے تو ہم اُن کو ایک دوسری پیدائش دے دیتے ہیں۔ اور وہ پیدا ہو کر بشر بن جاتے ہیں۔ اِس کے مقابلہ میں روحانی کمال کا یہ درجہ بیان فرمایا کہ وہ مرکر ایسے انعامات کے وارث ہوتے ہیں جو سب انعامات کا مجموعہ ہوتے ہیں یعنی جس طرح جسمانیات میں انسان تمام جانوروں کے کمالات کا مجموعہ ہے اسی طرح روحانی انسان مرکر تمام قسم کی نعمتوں کے مجموعہ کو حاصل کر لیتے ہیں۔ اور جس طرح مادی انسان اپنی اور اپنی قوم کی حفاظت پر قادر ہو جاتا ہے روحانی انسان کی روحانی حفاظت کا اللہ تعالیٰ خود ذمہ اٹھا لیتا ہے۔

جسمانی خلق کے آخر میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ فَتَبَارَكَ اللّٰهُ أَحْسَنُ الْخَالِقِيْنَ۔ کیا ہی برکت والا ہے وہ خدا جو سب سے بہتر طور پر مخلوق پیدا کرنیوالا ہے۔ یہی آیت روحانی پیدائش کے ساتھ بھی تعلق رکھتی ہے یعنی جب انسان روحانیت میں ترقی کرتے کرتے اس مقام کو حاصل کر لیتا ہے تو اُسے ایک نئی روحانی پیدائش عطا کی جاتی ہے جو تمام انسانوں کو ایک اچنبھا نظر آتی ہے۔ اور اُسے دیکھ کر ہر شخص خدا تعالیٰ کی حمد پر مجبور ہو جاتا ہے۔

اِس آیت کے ساتھ ایک تاریخی واقعہ بھی وابستہ ہے جس کا یہاں بیان کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک کاتب وحی تھا جسکا نام عبداللہ بن ابی سرح تھا۔ آپ پر جب کوئی وحی نازل ہوتی تو اُسے بلوا کر لکھوا دیتے۔ ایک دن آپ یہی آیتیں اُسے لکھوا رہے تھے۔ جب آپ ثُمَّ أَنْشَأْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ پر پہنچے تو اُس کے منہ سے بے اختیار نکل گیا کہ فَتَبَارَكَ اللّٰهُ أَحْسَنُ الْخَالِقِيْنَ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہی وحی ہے اسکو لکھ لو۔ اُس بدبخت کو یہ خیال نہ آیا۔ کہ پچھلی آیتوں کے نتیجہ میں یہ آیت طبعی طور پر آپ ہی بن جاتی ہے۔ اُس نے سمجھا کہ جس طرح میرے منہ سے یہ آیت نکلی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو وحی قرار دے دیا ہے اسی طرح آپ نعوذ باللہ خود سارا قرآن بنا رہے ہیں چنانچہ وہ مرتد ہو گیا۔ اور مکہ چلا گیا۔ فتح مکہ کے موقعہ پر جن لوگوں کو قتل کر دینے کا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا تھا اُن میں ایک عبداللہ بن ابی سرح بھی تھا۔ مگر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اسے پناہ دے دی اور وہ آپ کے گھر میں تین دن چھپا رہا۔ ایک دن جب کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم مکہ کے لوگوں سے بیعت لے رہے تھے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ عبداللہ بن ابی سرح کو بھی آپ کی خدمت میں لے گئے اور اُس کی بیعت قبول کرنے کی درخواست کی۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے تو کچھ دیر تامل فرمایا۔ مگر پھر آپ نے اُس کی بیعت لے لی۔ اور اس طرح دوبارہ اُس نے اسلام قبول کر لیا۔ (اصابہ جلد ۴ صفحہ)

أَحْسَنُ الْخَالِقِيْنَ کے متعلق یہ امر بھی یاد رکھنا ضروری ہے کہ اس کے یہ معنے نہیں کہ خدا تعالیٰ کے سوا کوئی اور بھی خالق ہے۔ بلکہ اس جگہ خالق کے معنے اندازہ کرنے والے کے ہیں۔ چنانچہ مفردات امام راغبؒ میں لکھا ہے۔ مَعْنَاهُ أَحْسَنُ الْمُقَدِّرِيْنَ أَوْ يَكُوْنُ عَلٰى تَقْدِيْرِ مَا كَانُوْا يَعْتَقِدُوْنَ وَ يَزْعُمُوْنَ أَنَّ غَيْرَ اللّٰهِ يُبْدِعُ فَكَأَنَّهٗ قِيْلَ

فاحسب اَنَّ ھٰھُنَا مُبْدِعِیْنَ وَمُوْجِدِیْنَ فَاللّٰہُ اَحْسَنُھُمْ اِیْجَادًا عَلٰی مَا یَعْتَقِدُوْنَ یعنی اسجگہ اَحْسَنُ الْخَالِقِیْنَ کے معنے اَحْسَنُ الْمُقَدِّرِیْنَ کے ہیں اور مراد یہ ہے کہ وہ تمام اندازہ کرنے والوں میں سے بہتر اندازہ کرنے والا ہے اور یا پھر اسجگہ دوسروں کے اعتقادات کو ملحوظ رکھتے ہوئے بات کہی گئی ہے کیونکہ بعض لوگ کہا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا دوسرے لوگ بھی ایجادیں کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ بیشک دنیا میں کئی موجد اور صنّاع پائے جاتے ہیں مگر اللہ تعالیٰ کی ایجاد اور صنعت کا انکی ایجادوں اور صنعتوں سے مقابلہ تو کرو۔ تمہیں ماننا پڑیگا کہ اُن کی ایجادات خدائی ایجادات کے مقابلہ میں کوئی حقیقت ہی نہیں رکھتیں۔

اِس کی ایسی ہی مثال ہے جیسے اللہ تعالیٰ سمیع اور بصیر ہے مگر پھر وہ انسان کے متعلق بھی فرماتا ہے کہ فَجَعَلْنٰہُ سَمِیْعًا بَصِیْرًا (سورۂ دہر ع) یعنی ہم نے اسے سمیع اور بصیر بنا دیا۔ اب اِس کے یہ معنے نہیں کہ انسان خدا تعالیٰ کی صفت سمیع اور بصیر میں شریک ہے بلکہ خدا تعالیٰ نے جب اسے سُننے اور دیکھنے کی قابلیت دی تو مجازی رنگ میں اُسے بھی سمیع اور بصیر کہہ دیا گیا پھر انسان کے لئے صرف سمیع اور بصیر کا لفظ آتا ہے مگر خدا تعالیٰ کے لئے اَلسَّمِیْعُ اور اَلْبَصِیْرُ کا لفظ آتا ہے یعنی سُننے اور دیکھنے کے جتنے کمالات ہیں وہ سب اُس میں پائے جاتے ہیں۔ ورنہ انسان کی سماعت اور بصارت تو اتنی ناقص ہے کہ وہ دُور کی بات سُن ہی نہیں سکتا۔ اور نہ اپنی پیٹھ کے پیچھے پڑی ہوئی چیز کو دیکھ سکتا ہے۔ اِسی طرح بیشک دُنیا میں اور بھی صنّاع اور موجد ہیں مگر اُن کی صنعتیں اور ایجادات بالکل بےحقیقت ہیں اور پھر جبکہ وہ خدا تعالیٰ کی دی ہوئی طاقتوں سے ہی ایجادات کا سلسلہ قائم رکھے ہوئے ہیں۔ تو اَحْسَنُ الْخَالِقِیْنَ بہرحال خدا تعالیٰ ہی ہوا۔ کوئی انسان نہ ہوا۔

آخر میں اس امر کا بیان کر دینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اِن آیات میں ثُمَّ اَنْشَاْنٰہُ خَلْقًا اٰخَرَ۔ فرما کر اللہ تعالیٰ نے جس روحانی مقام کا ذکر فرمایا ہے یہ وہ مقام ہے جو محنت اور قربانی اور جد و جہد اور متواتر عمل کے ساتھ وابستہ ہے اور جس کے لئے ایک لمبے عرصہ تک انسان کو اپنے نفس کی جلاء میں مشغول رہنا پڑتا ہے۔ لیکن بعض تغیرات ایسے بھی ہوتے ہیں جو انقلابی طور پر واقع ہوتے ہیں اور آنًا فانًا انسان کو زمین سے اٹھا کر عرش پر پہنچا دیتے ہیں۔ حضرت عمرؓ کے ایمان لانے کا واقعہ اس انقلاب کی ایک زندہ مثال ہے۔

حضرت عمرؓ کو اسلام سے شدید دشمنی تھی لیکن اُن میں رُوحانی قابلیت بھی موجود تھی۔ یعنی باوجود آپ میں شدید غصہ ہونے کے۔ باوجود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے صحابہؓ کو تکالیف پہنچانے کے اُن کے اندر جذبۂ رقت بھی موجود تھا۔ چنانچہ جب حبشہ کی طرف پہلی ہجرت ہوئی۔ تو مسلمانوں نے نماز فجر سے پہلے مکہ سے روانگی کی تیاری کی تاکہ مشرک انہیں روکیں نہیں۔ اور انہیں کوئی تکلیف نہ پہنچائیں۔ مکہ میں یہ رواج تھا کہ رات کو بعض رؤساء شہر کا دورہ کیا کرتے تھے تاکہ چوری وغیرہ نہ ہو۔ اِسی دستور کے مطابق حضرت عمرؓ بھی رات کو پھر رہے تھے کہ آپ نے دیکھا۔ ایک جگہ گھر کا سب سامان بندھا پڑا ہے۔ آپ آگے بڑھے۔ ایک صحابیہؓ سامان کے پاس کھڑی تھیں۔ اُس صحابیہؓ کے خاوند کے ساتھ شاید حضرت عمرؓ کے تعلقات تھے۔ اس لئے آپ نے اُس صحابیہؓ کو مخاطب کر کے کہا۔ بی بی یہ کیا بات ہے۔ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم کسی لمبے سفر پر جا رہی ہو۔ اُس صحابیہؓ کا خاوند وہاں نہیں تھا۔

اگر وہ وہاں ہوتا تو ہو سکتا تھا کہ مشرکین مکہ کی عداوتوں اور دشمنیوں کی وجہ سے حضرت عمرؓ کی یہ بات سُن کر وہ کوئی بہانہ بنا دیتا۔ لیکن عورت کو یہ حِس نہیں تھی۔ اُس صحابیہؓ نے کہا۔ عمرؓ! ہم تو مکہ چھوڑ رہے ہیں۔ انہوں نے کہا۔ تم مکہ چھوڑ رہی ہو۔ صحابیہؓ نے کہا۔ ہاں ہم مکہ چھوڑ رہے ہیں۔ حضرت عمرؓ نے پُوچھا۔ تم کیوں مکہ چھوڑ رہے ہو۔ صحابیہؓ نے جواب دیا۔ عمرؓ! ہم اس لئے مکہ چھوڑ رہے ہیں کہ تم اور تمہارے بھائی ہمارا یہاں رہنا پسند نہیں کرتے۔ اور ہمیں خدائے واحد کی عبادت کرنے میں یہاں آزادی میسّر نہیں۔ اس لئے ہم وطن چھوڑ کر کسی دوسرے ملک میں جا رہے ہیں۔ اَب باوجود اس کے کہ حضرت عمرؓ اسلام کے شدید دشمن تھے۔ باوجود اس کے کہ وہ خود مسلمانوں کو مارنے پر تیار رہتے تھے رات کے اندھیرے میں اُس صحابیہؓ سے یہ جواب سُن کر کہ ہم وطن چھوڑ رہے ہیں اس لئے کہ تم اور تمہارے بھائی ہمارا یہاں رہنا پسند نہیں کرتے اور ہمیں خدائے واحد کی عبادت آزادی سے نہیں کرنے دیتے۔ حضرت عمرؓ نے اپنا مُنہ دوسری طرف پھیر لیا۔ اور اُس صحابیہؓ کا نام لے کر کہا۔ اچھا جاؤ خدا تمہارا حافظ ہو۔ معلوم ہوتا ہے حضرت عمرؓ پر رِقت کا ایسا جذبہ آیا کہ آپ نے خیال کیا کہ اگر میں نے دوسری طرف مُنہ نہ کیا تو مجھے رونا آ جائے گا۔ اِتنے میں اُس صحابیہؓ کے خاوند بھی آ گئے۔ وہ سمجھتے تھے کہ عمرؓ اسلام کے شدید دشمن ہیں۔ انہوں نے جب آپ کو وہاں کھڑا دیکھا۔ تو خیال کیا یہ ہمارے سفر میں کوئی روک پیدا نہ کر دیں انہوں نے اپنی بیوی سے دریافت کیا کہ یہ یہاں کیسے آ گیا؟ اُس نے بتایا کہ وہ اِس اِس طرح آیا تھا۔ اور اُس نے سوال کیا تھا کہ تم کہاں جا رہے ہو؟ انہوں نے کہا کہ یہ کوئی شرارت نہ کر دے۔ اُس صحابیہؓ نے کہا۔ کہ اے میرے چچا کے بیٹے (عرب عورتیں عام طور پر اپنے خاوندوں کو چچا کا بیٹا کہا کرتی تھیں) تم تو یہ کہتے ہو کہ وہ کہیں کوئی شرارت نہ کر دے مگر مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اُس نے کسی دن مسلمان ہو جانا ہے کیونکہ جب میں نے کہا عمرؓ! ہم اس لئے مکہ چھوڑ رہے ہیں کہ تم اور تمہارے بھائی ہمیں خدائے واحد کی عبادت آزادی سے نہیں کرنے دیتے تو اُس نے مُنہ پھیر لیا اور کہا۔ اچھا جاؤ خدا تمہارا حافظ ہو۔ اُس کی آواز میں ارتعاش تھا اور میں سمجھتی ہوں کہ اُس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے اس لئے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ضرور کسی دن مسلمان ہو جائیگا۔

دن اسی طرح گذرتے چلے گئے اور حضرت عمرؓ اسلام کی برابر سختی سے مخالفت کرتے رہے۔ ایک دن اُن کے دل میں خیال پیدا ہُوا کہ کیوں نہ اس مذہب کے بانی کا ہی کام تمام کر دیا جائے۔ اور اس خیال کے آتے ہی انہوں نے تلوار ہاتھ میں لی۔ اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کے لئے گھر سے نکل کھڑے ہوئے۔ راستہ میں کسی نے پُوچھا۔ عمرؓ کہاں جا رہے ہو؟ انہوں نے جواب دیا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو مارنے کیلئے جا رہا ہوں۔ اُس شخص نے ہنس کر کہا۔ اپنے گھر کی تو پہلے خبر لو۔ تمہاری بہن اور بہنوئی تو اس پر ایمان لے آئے ہیں۔ حضرت عمرؓ نے کہا۔ یہ جھوٹ ہے۔ اُس شخص نے کہا۔ تم خود جا کر دیکھ لو۔ حضرت عمرؓ وہاں گئے۔ دروازہ بند تھا اور اندر ایک صحابیؓ قرآن کریم پڑھا رہے تھے۔ آپنے دستک دی۔ اندر سے آپ کے بہنوئی کی آواز آئی۔ کون ہے؟ عمرؓ نے جواب دیا۔ عمرؓ۔ انہوں نے جب دیکھا کہ حضرت عمرؓ آئے ہیں۔ اور وہ جانتے تھے کہ آپ اسلام کے شدید مخالف ہیں تو انہوں نے صحابیؓ کو جو قرآن کریم پڑھا رہے تھے کہیں چھپا دیا۔ اسی طرح قرآن کریم کے اوراق بھی کسی کونہ میں چھپا کر رکھ دیئے اور پھر دروازہ کھولا۔

حضرت عمرؓ چونکہ یہ سُن کر آئے تھے کہ وہ مسلمان ہو گئے ہیں اِس لئے انہوں نے آتے ہی دریافت کیا کہ دروازہ کھولنے میں دیر کیوں کی ہے۔ آپ کے بہنوئی نے جواب دیا۔ آخر دیر لگ ہی جاتی ہے۔ حضرت عمرؓ نے کہا۔ یہ بات نہیں کوئی خاص امر دروازہ کھولنے میں روک بنا ہے مجھے آواز آرہی تھی کہ تم اُس صابی کی باتیں سُن رہے تھے (مشرکین مکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو صابی کہا کرتے تھے) انہوں نے پردہ ڈالنے کی کوشش کی۔ لیکن حضرت عمرؓ کو غصہ آیا اور وہ اپنے بہنوئی کو مارنے کے لئے آگے بڑھے۔ آپ کی بہن اپنے خاوند کی محبت کی وجہ سے درمیان میں آگئیں۔ حضرت عمرؓ چونکہ ہاتھ اُٹھا چکے تھے اور اُن کی بہن اچانک درمیان میں آگئیں وہ اپنا ہاتھ روک نہ سکے اور اُن کا ہاتھ زور سے اُن کی ناک پر لگا۔ اور اُس سے خون بہنے لگا حضرت عمرؓ جذباتی آدمی تھے۔ یہ دیکھکر کہ انہوں نے عورت پر ہاتھ اُٹھایا ہے جو عرب کے طریق کے خلاف تھا۔ اور پھر بہن پر ہاتھ اٹھایا ہے حضرت عمرؓ نے بات ٹلانے کے لئے کہا۔ اچھا مجھے بتاؤ تم کیا پڑھ رہے تھے؟ بہن نے سمجھ لیا کہ عمرؓ کے اندر نرمی کے جذبات پیدا ہو گئے ہیں اُس نے کہا جاؤ۔ تمہارے جیسے انسان کے ہاتھ میں میں وہ پاک چیز دینے کے لئے تیار نہیں۔ حضرت عمرؓ نے کہا۔ پھر میں کیا کروں۔ بہن نے کہا۔ وہ سامنے پانی ہے نہا کر آؤ۔ تب وہ چیز تمہارے ہاتھ میں دی جا سکتی ہے۔ حضرت عمرؓ نہائے اور واپس آئے۔ بہن نے قرآن کریم کے اوراق جو وہ سُن رہے تھے آپ کے ہاتھ میں دیئے چونکہ حضرت عمرؓ کے اندر ایک تغیر پیدا ہو چکا تھا اِس لئے قرآنی آیات پڑھتے ہی اُن کے اندر رقت پیدا ہوئی اور جب وہ آیات ختم کر چکے تو بے اختیار انہوں نے کہا کہ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَ اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ یہ الفاظ سنکر وہ صحابیؓ بھی باہر نکل آئے جو حضرت عمرؓ سے ڈر کر چھپ گئے تھے۔ پھر حضرت عمرؓ نے دریافت کیا کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم آجکل کہاں مقیم ہیں؟ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اُن دنوں مخالفت کی وجہ سے گھر بدلتے رہتے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ آجکل آپ دارِ ارقم میں تشریف رکھتے ہیں۔ حضرت عمرؓ فوراً اسی حالت میں جب کہ ننگی تلوار انہوں نے لٹکائی ہوئی تھی اُس گھر کی طرف چل پڑے بہن کے دل میں شبہ پیدا ہُوا کہ شاید وہ بُری نیت سے نہ جا رہے ہوں۔ انہوں نے آگے بڑھ کر کہا۔ خدا کی قسم! مَیں تمہیں اُس وقت تک نہیں جانے دوں گی جب تک تم مجھے اطمینان نہ دلا دو کہ تم کوئی شرارت نہیں کروگے حضرت عمرؓ نے کہا۔ مَیں پکا وعدہ کرتا ہوں کہ مَیں کوئی فساد نہیں کرونگا۔ حضرت عمرؓ وہاں پہنچے اور دستک دی رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ اندر بیٹھے ہوئے تھے دینی درس ہو رہا تھا۔ کسی صحابیؓ نے پُوچھا کون؟ حضرت عمرؓ نے جواب دیا۔ عمرؓ! صحابہؓ نے کہا۔ یا رسول اللہؐ دروازہ نہیں کھولنا چاہیئے۔ ایسا نہ ہو کہ کوئی فساد کرے حضرت حمزہؓ نئے نئے ایمان لائے ہوئے تھے وہ سپاہیانہ طرز کے آدمی تھے۔ انہوں نے کہا۔ دروازہ کھول دو۔ مَیں دیکھوں گا وہ کیا کرتا ہے۔ چنانچہ ایک شخص نے دروازہ کھول دیا۔ حضرت عمرؓ آگے بڑھے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ عمرؓ! تم کب تک میری مخالفت میں بڑھتے چلے جاؤ گے۔ حضرت عمرؓ نے کہا۔ یا رسول اللہ! میں مخالفت کے لئے نہیں آیا۔ مَیں تو آپ کا غلام بننے کے لئے آیا ہوں۔ وہ عمرؓ جو ایک گھنٹہ پہلے اسلام کے شدید دشمن تھے اور رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو مارنے کے لئے گھر سے نکلے تھے ایک آن میں اعلیٰ درجہ کے مومن بن گئے۔ حضرت عمرؓ مکہ کے رئیسوں میں سے نہیں تھے لیکن بہادری کی وجہ سے نوجوانوں پر آپ کا اچھا اثر تھا۔ جب آپ مسلمان ہوئے تو صحابہؓ نے جوش میں آکر

ہوئے تکبیر بلند کی۔ اس کے بعد نماز کا وقت آیا۔ اور رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے نماز پڑھنی چاہی تو وہی عمرؓ جو دو گھنٹے قبل گھر سے اس لئے نکلا تھا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مارے۔ اس نے دوبارہ تلوار نکال لی۔ اور کہا۔ یا رسول اللہ! خدا تعالیٰ کا رسول اور اس کے ماننے والے تو چھپ کر نمازیں پڑھیں اور مشرکین مکہ باہر دندناتے پھریں یہ کس طرح ہو سکتا ہے۔ میں دیکھوں گا کہ ہمیں خانہ کعبہ میں نماز ادا کرنے سے کون روکتا ہے۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ یہ جذبہ تو بہت اچھا ہے لیکن ابھی حالات ایسے ہیں کہ ہمارا باہر نکلنا مناسب نہیں۔ یہ ایک غیر معمولی انقلاب تھا جو حضرت عمرؓ کے اندر پیدا ہوا اور آنا فانا آپ شدید دشمن سے اعلیٰ درجہ کے مومن بن گئے۔ مگر ایسے لوگ بہت کم ہوتے ہیں جن کی حالت انقلاب کے ذریعہ دوسری حالت میں بدلتی ہے۔ اور پھر انقلاب خود پیدا نہیں کیا جاتا بلکہ انقلاب باہر سے آیا کرتا ہے۔ اور جب آتا ہے تو لوگ حیران ہو جاتے ہیں۔ دوست دشمن بن جاتے ہیں اور دشمن دوست بن جاتے ہیں۔ لیکن استدراجی تغیر پیدا کیا جاتا ہے اور جو شخص استدراجی حالت پر ہو لیکن وہ انقلاب کی امید میں بیٹھا رہے وہ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا ہے۔ کہ مجھے ایک رات میں چالیس ہزار عربی کا مادہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے سکھایا گیا (انجام آتھم ص۲۳۴[۵]) اب یہ انقلاب تھا جو آپ کے اندر پیدا ہوا۔ لیکن اگر اس انقلاب کو دیکھتے ہوئے لڑکے سکول میں پڑھنا چھوڑ دیں اور اس انتظار میں بیٹھ جائیں کہ فرشتہ آئیگا اور ساٹھ ہزار عربی کا مادہ انہیں سکھا دیگا تو انہیں کون عقلمند سمجھے گا؟ انقلاب پیدا نہیں کئے جاتے بلکہ انقلاب خود بخود پیدا ہوتے ہیں۔ لیکن ارتقاء اور انتقال عن الحال الی الحال آہستہ آہستہ اور محنت کے ساتھ ہوتا ہے۔ انقلاب لاکھوں دنوں میں کسی ایک دن آتا ہے باقی سارے دن انتقال کے ہوتے ہیں۔ اور انسان ایک حالت سے دوسری حالت میں بتدریج کوشش اور محنت اور قربانی کے ساتھ پہنچتا ہے۔ یہ انتقال عن الحال الی الحال اور استدراجی تغیر ہمیشہ نوافل اور ذکرِ الٰہی اور کوشش اور جد و جہد کے ساتھ ہوتا ہے۔ انسان جب اپنے نفس کا مطالعہ کرے تو وہ سوچے گا کہ اگر دوسرا شخص مجھے گالی دے تو میں اپنے نفس کو کس طرح روکوں گا۔ وہ ظلم کرے تو میں اس کے ظلم کو کیسے برداشت کرونگا۔ وہ لغو گفتگو کرے تو میں اپنی زبان کو کس طرح بند رکھوں گا۔ اور جب وہ سوچیگا تو آہستہ آہستہ اس کا نفس کامل بنتا چلا جائیگا۔ اگر اس میں انقلاب آتا تو پہلے ہی دن وہ تہجد اور دوسرے نوافل پڑھنے لگ جاتا۔ وہ فوراً حرامخوری اور جھوٹ سے بچ جاتا۔ لیکن ایسا اس لئے نہیں ہوتا کہ اس کا تغیر استدراجی ہوتا ہے اور اسکی ترقی کوشش اور جد و جہد کے ساتھ وابستہ ہوتی ہے۔ مگر میں دیکھتا ہوں کہ عام طور پر اس کوشش اور جد و جہد کی طرف کوئی توجہ نہیں کی جاتی جس کی طرف اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں توجہ دلائی ہے اور انقلاب کے انتظار میں لوگ بیٹھے رہتے ہیں۔ حالانکہ ان کے اندر جو بھی تغیر پیدا ہوگا وہ استدراجی ہوگا اور اس کے لئے کوشش اور جد و جہد کی ضرورت ہوگی۔ اس غرض کے لئے بنیادی طور پر اس امر کی ضرورت ہے کہ اللہ تعالیٰ کی خلوص کے ساتھ عبادت کی جائے۔ اور اس پر دوام اختیار کیا جائے۔ اگر انسان عبادت پر دوام اختیار کرے تو دوسری نیکیاں آپ ہی آپ صادر ہونے لگتی ہیں۔ مگر اس کے یہ معنے نہیں کہ صرف فرض نمازیں پڑھی جائیں بلکہ جیسا کہ بتایا جا چکا ہے تہجد اور نوافل کی ادائیگی

[۵] "ایک رات" کیلئے دیکھئے روایت غلام نبی صاحب سیٹھی مندرجہ الحکم ۲۱/۲۸ اکتوبر ۱۹۳۵ء۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعَ طَرَآئِقَ ۖ وَمَا كُنَّا

اور ہم نے تمہارے اوپر (کے درجات کے لئے) سات (روحانی) راستے بنائے ہیں۔ اور ہم

عَنِ الْخَلْقِ غٰفِلِیْنَ ﴿۱۸﴾

(اپنی) مخلوق سے غافل نہیں رہے۔ ۳ھ

پر بھی زور دینا چاہیئے۔ اِسی طرح دیانت۔ امانت وفائے عہد۔ غرباء پروری اور عفت کا بھی خاص خیال رکھنا چاہیئے۔ اِن نیکیوں میں حصہ لینے سے انسان اتنا ترقی کر جاتا ہے کہ آخر اُسے ایک نئی روحانی پیدائش حاصل ہو جاتی ہے اور انسانیت اپنے معراجِ کمال کو پہنچ جاتی ہے۔

طرائق

۳ھ حل لغات۔ طَرَآئِق: طَرِیْقَةٌ کی جمع ہے اور طَرِیْقَةُ الرَّجُلِ کے معنے ہوتے ہیں مَذْهَبُهٗ یعنی وہ راستہ جسے وہ اختیار کرتا ہے۔ (اقرب)

تفسیر:۔ علامہ قرطبیؒ لکھتے ہیں کہ یہاں سَبْعَ طَرَآئِقَ سے سات آسمان مراد ہیں۔ اور اُن کو طَرَآئِق اِس لئے کہا گیا ہے کہ وہ ایک دوسرے کے اوپر تہہ بہ تہہ واقع ہیں۔ چنانچہ عربی زبان میں جب طَارَقْتُ الشَّیْءَ کہیں تو اس کے معنے یہ ہوتے ہیں کہ جَعَلْتُ بَعْضَهٗ فَوْقَ بَعْضٍ۔ میں نے ایک چیز کے مختلف حصوں کو ایک دوسرے کے اوپر رکھ دیا۔ وَالْعَرَبُ تُسَمِّی كُلَّ شَیْءٍ فَوْقَ شَیْءٍ طَرِیْقَةً اور عرب لوگ ہر اُس چیز کو جو دوسری چیز پر رکھی ہوئی ہو طریقہ کہتے ہیں (تفسیر قرطبی)

علامہ ابو حیانؒ بھی اپنی تفسیر بحرِ محیط میں خلیل فراء اور زجاج کے متعلق لکھتے ہیں کہ اُن کے نزدیک بھی آسمان کو طرائق اس لئے کہا گیا ہے کہ وہ ایک دوسرے کے اوپر ہیں۔ چنانچہ جب طَارَقَ النَّعْلَ کہیں تو اُس کے معنے یہ ہوتے ہیں کہ جَعَلَهٗ عَلٰی نَعْلٍ اُس نے ایک جوتی کو دوسری جوتی پر رکھ دیا۔ اور طَارَقَ بَیْنَ ثَوْبَیْنِ کے یہ معنے ہوتے ہیں کہ لَبِسَ اِحْدٰهُمَا عَلَی الْاٰخَرِ اُس نے ایک کپڑے پر دوسرا کپڑا پہن لیا (بحرِ محیط)

امام راغبؒ اپنی کتاب مفردات میں سورۂ جنّ کی آیت كُنَّا طَرَآئِقَ قِدَدًا کے متعلق لکھتے ہیں کہ:۔ اِشَارَةٌ اِلَی اخْتِلَافِهِمْ فِیْ دَرَجَاتِهِمْ یعنی اِس میں اُن کے درجات کے اختلاف کی طرف اشارہ ہے گویا طَرَآئِق کے معنے انہوں نے درجات کے کئے ہیں۔ اور سَبْعَ طَرَآئِقَ کے متعلق لکھتے ہیں کہ اِطْبَاقُ السَّمَاءِ یُقَالُ لَهَا طَرَآئِقُ یعنی طرائق کے معنے آسمانوں کا اوپر نیچے ہونا ہے۔

اِن معنوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے وَلَقَدْ خَلَقْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعَ طَرَآئِقَ کے یہ معنے ہونگے کہ ہم نے تمہارے اوپر یکے بعد دیگرے سات بلندیاں پیدا کی ہیں۔ یعنی جس طرح تمہاری جسمانی پیدائش کو ہم نے سات ترقیات کے ساتھ مکمل کیا ہے اِسی طرح تمہاری روحانی پیدائش کو بھی ہم نے سات درجات میں تقسیم کیا ہُوا ہے۔ یہ سات درجات کونسے ہیں؟ اِس کے متعلق جب ہم قرآن کریم کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ روحانیات میں انسان کا پہلا درجہ جمادات کے مشابہ ہوتا ہے۔ یعنی جس طرح جمادات کے اندر کوئی حِس نہیں ہوتی اِسی طرح ایسے لوگوں میں بھی بھلی بُری بات پہچاننے کی کوئی حِس نہیں ہوتی۔ نہ اُن کے سامنے

کوئی بلند مقصد ہوتا ہے۔ انہیں لاکھ وعظ کیا جائے اُن کے اندر نیکی اور خدا تعالیٰ کی خشیت کا کوئی احساس پیدا نہیں ہوتا۔ ایسے لوگوں کی طرف قرآن کریم کی اِس آیت میں اشارہ کیا گیا ہے کہ ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً (بقرہ ع ۹) یعنی اس کے بعد تمہارے دل سخت ہو گئے اور وہ پتھروں کی طرح ہو گئے بلکہ اپنی سختی میں پتھروں سے بھی آگے نکل گئے۔ گویا بعض لوگوں کے دل خدا تعالیٰ کی محبت سے ایسے سرد ہوتے ہیں کہ اُن میں خدا تعالیٰ کی خشیت کا کوئی احساس ہی نظر نہیں آتا۔ جب انہیں بھوک لگتی ہے۔ کھا لیتے ہیں۔ اور جب نیند آتی ہے تو سو رہتے ہیں۔ انہیں کبھی یہ خیال بھی نہیں آتا کہ خدا تعالیٰ نے اُن پر کیا ذمہ داریاں رکھی ہوئی ہیں۔ بلکہ اگر انہیں کوئی توجہ بھی دلائے تو وہ بے کار ثابت ہوتی ہے ایسے لوگ روحانیات میں جمادات سے مشابہت رکھتے ہیں۔

دوسرا درجہ جو اس سے اوپر ہے وہ نباتات کے مشابہ ہے۔ یعنی جب انسان ترقی کی طرف اپنا قدم بڑھاتا ہے اور جمادی حالت کو ترک کر دیتا ہے تو اس کے اندر نباتات کے مشابہ ایک نشوونما کی طاقت پیدا ہو جاتی ہے۔ چنانچہ لمبے تجربات کے بعد یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ نباتات کے اندر بھی رُوح ہوتی ہے گو وہ حیوانی رُوح سے بہت کم درجہ کی ہوتی ہے اس کے ثبوت کے لئے چھوئی موئی کی بوٹی کو جسے اردو میں لاجونتی کہتے ہیں پیش کیا جا سکتا ہے۔ اُس کے پتوں کو جب ہاتھ لگایا جائے تو وہ فوراً سکڑ جاتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ نباتات میں بھی حس ہوتی ہے۔ گو بعض میں زیادہ ہوتی ہے اور بعض میں کم مگر یہ حس اتنی کمزور ہوتی ہے کہ کسی صدمہ سے بچنے کی طاقت اُن میں نہیں ہوتی جیسے لاجونتی کے پتے ہاتھ لگانے سے سکڑ جاتے ہیں لیکن اُن میں یہ طاقت نہیں ہوتی کہ بھاگ کر اپنے آپکو بچا لیا کریں۔ اِسی طرح ایک انسان اس قسم کا ہوتا ہے کہ اس میں کسی قدر روحانی حس تو پائی جاتی ہے لیکن وہ کسی بیرونی حملہ سے اپنے آپ کو بچانے کی طاقت نہیں رکھتا۔ چنانچہ قرآن کریم میں ایسے لوگوں کی طرف اِس آیت میں اشارہ کیا گیا ہے کہ وَاِنْ تَدْعُوْهُمْ اِلَى الْهُدٰى لَا يَسْمَعُوْا وَتَرٰىهُمْ يَنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ وَهُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ (اعراف ع ۲۴) یعنی یہ لوگ ایسے ہیں کہ اگر تم انکو ہدایت کی طرف بلاؤ تو وہ سُن نہیں سکتے۔ اور تُو اُن کو دیکھ کر سمجھتا ہے کہ گویا وہ تجھے دیکھ رہے ہیں حالانکہ وہ تجھے نہیں دیکھ رہے۔ اِس جگہ اُن کی طرف دیکھنے کو منسوب کرنا اور پھر یہ کہنا کہ وہ نہیں دیکھتے بتاتا ہے کہ یہاں اُن لوگوں کا ذکر کیا جا رہا ہے جن میں ایک حد تک تو نیکی کا احساس پایا جاتا ہے مگر اُن پر کمزوری اس قدر غالب ہوتی ہے کہ وہ اپنی اِس حس سے پُورا فائدہ نہیں اُٹھا سکتے۔ اور دیکھنے کے باوجود وہ روحانی علوم سے فائدہ اٹھانے سے محروم رہتے ہیں۔

تیسرا درجہ حیوانی زندگی سے مشابہ ہوتا ہے یعنی جس طرح حیوان کو اگر آواز سناؤ تو وہ سُن لے گا مگر مطلب نہیں سمجھیگا اور اگر اُسے دُکھ دینے لگو تو وہ بھاگ جائیگا۔ مگر اپنے بچاؤ کے لئے ایسے ذرائع نہیں سوچ سکیگا جن کی وجہ سے وہ ہمیشہ کے لئے خطرات سے محفوظ ہو جائے۔ اِسی طرح روحانی عالم میں بھی بعض لوگ حیوانات کے مشابہ ہوتے ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کا ذکر کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ۔ (اعراف ع ۲۲) یعنی اُن کے دل تو ہیں مگر

اُن کے ذریعہ سے وہ سمجھتے نہیں - اور اُن کی آنکھیں تو ہیں
مگر اُن کے ذریعہ سے وہ دیکھتے نہیں - اور اُن کے کان تو
ہیں مگر اُن کے ذریعہ سے وہ سُنتے نہیں - یہ لوگ چارپایوں
کی طرح ہیں - بلکہ اُن سے بھی بدتر ہیں - اور اصل بات
تو یہ ہے کہ یہ بالکل غافل ہیں - اِن لوگوں کو بدتر اسلئے
کہا کہ چارپایوں میں جو نقص ہے وہ تو طبعی ہے - لیکن
اِن کے اندر اللہ تعالیٰ نے ہر قسم کی قابلیتیں پیدا کی ہیں
اور پھر بھی یہ چارپاؤں کے مشابہ بن گئے ہیں - ایسے
لوگ حیوانات کی طرح خوف کے وقت تو اپنے بچاؤ کی
تدابیر اختیار کرتے ہیں یعنی خدا تعالیٰ کی طرف جُھک جاتے
ہیں - لیکن ہمیشہ کے لئے اپنے آپ کو اُس کے عذاب سے
محفوظ نہیں کر سکتے - بلکہ جب مصیبت ہٹ جاتی ہے -
تو پھر شرارتوں کی طرف عود کر آتے ہیں -

لیکن جب اِس سے بھی زیادہ خدا تعالیٰ کی محبت
کا احساس پیدا ہو جائے تو چوتھا درجہ انسان کو
یہ حاصل ہوتا ہے کہ اُسے تقویٰ اور روحانیت سے
لگاؤ ہو جاتا ہے اور وہ سب کام عقل اور سمجھ سے کرنے
لگتا ہے مگر کبھی کبھی اس پر شیطان بھی غالب آجاتا ہے
ہاں بدی کا حملہ اس پر بہت کم کارگر ہوتا ہے - کیونکہ
اُس میں بدی کو بدی سمجھنے کی اہلیت پیدا ہو جاتی ہے
اِس حالت کی طرف اللہ تعالیٰ نے اِن الفاظ میں اشارہ
فرمایا ہے کہ اِنَّ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا اِذَا مَسَّھُمْ طٰٓئِفٌ
مِّنَ الشَّیْطٰنِ تَذَکَّرُوْا فَاِذَا ھُمْ مُّبْصِرُوْنَ (اعراف ع۲۴)
یعنی وہ لوگ جنہوں نے اُس وقت تقویٰ اختیار کیا جب
شیطان کی طرف سے آنے والا کوئی خیال اُن کو محسوس
ہُوا اور وہ ہوشیار ہو گئے اور اُن کی آنکھیں کُھل گئیں
وہ ہدایت پا جاتے ہیں - اِس آیت سے ظاہر ہے کہ کبھی
کبھی ایسے لوگوں کو شیطان اپنی طرف کھینچتا ہے - مگر
وہ جھٹ ہوشیار ہو جاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کو اپنی
مدد کے لئے پکارتے ہیں - اور شیطانی حملہ سے محفوظ ہو جاتے
ہیں -

پھر انسان اِس سے بھی ترقی کرتا اور پانچویں درجہ
میں پہنچ کر مَلَک بن جاتا ہے - یعنی اُس کی معرفتِ الٰہی ایسی ترقی
کر جاتی ہے کہ خدا تعالیٰ کے تمام احکام پر عمل اُس کی غذا بن
جاتا ہے اور جس طرح ملائکہ یَفْعَلُوْنَ مَا یُؤْمَرُوْنَ کے
مصداق ہوتے ہیں اِسی طرح ایسا انسان بھی خدا تعالیٰ کے
سب حکموں کو پُورا کرتا ہے اور اس پر کبھی غفلت کی نیند
نہیں آتی - ایسے ہی لوگوں کے متعلق اللہ تعالیٰ قرآن کریم
میں فرماتا ہے وَالْمَلٰٓئِکَۃُ یَدْخُلُوْنَ عَلَیْھِمْ مِّنْ کُلِّ بَابٍ
سَلٰمٌ عَلَیْکُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَی الدَّارِ (رعد ع۳)
یعنی ایسے لوگوں کے پاس ہر دروازہ سے فرشتے آئیں گے۔
اور اُن سے کہیں گے کہ تمہارے لئے سلامتی ہی سلامتی ہے -
کیونکہ تم خدا تعالیٰ کی راہ میں ثابت قدم رہے ہو - پس اب
دیکھو کہ تمہارے لئے اس گھر کا کیا ہی اچھا انجام ہے - چونکہ
یہ لوگ ملکوتی صفات رکھنے والے ہونگے اِس لئے انکو دیکھتے
ہی فرشتے اُن کی طرف دوڑ پڑیں گے اور انہیں اللہ تعالیٰ
کے قرب اور اُس کے انعامات کے حصول کی خوشخبری دینگے
مگر یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ اِس آیت کے یہ معنے نہیں کہ
فرشتے اپنی کثرت کی وجہ سے ایک دروازہ کی بجائے
بہت سے دروازوں سے داخل ہونگے بلکہ اس کے اصل
معنے یہ ہیں کہ ہر دروازہ کا فرشتہ اُن کے پاس آئے گا
اور انہیں مبارک باد دیگا کہ تم اِس جدوجہد میں کامیاب
ہوگئے جس میں میں اور تم دونوں مل کر شیطان کا مقابلہ کیا کرتے
تھے - کیونکہ بدی انسانی قلب میں کئی راستوں سے داخل
ہوتی ہے - کبھی آنکھ کے ذریعہ بدی کی تحریک ہوتی ہے -
کبھی کانوں کے ذریعہ بدی کی تحریک ہوتی ہے اور کبھی
چھونے اور چکھنے کے ذریعہ بدی کی تحریک ہوتی ہے اور
چونکہ ہر راستہ کی حفاظت کیلئے خدا تعالیٰ کے فرشتے

مقرر ہیں۔ اِس لئے جب انسان شیطان پر کامیابی حاصل کریگا۔ تو ہر دروازہ کا فرشتہ اُسے مبارکباد دینے کے لئے آئے گا۔

پھر انسان اِس سے بھی آگے ترقی کرتا ہے۔ اور چھٹا درجہ اُسے حاصل ہوتا ہے کہ اُس میں ایسا تقویٰ پیدا ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو کلّی طور پر اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں دے دیتا ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے بَلٰى مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗۤ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (بقرۃ ع ۱۳) یعنی جو لوگ اپنے آپ کو کُلّیۃً اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دیں اور نیک اعمال بجا لائیں۔ اُن کے لئے اپنے رب کے حضور بہت بڑا اجر مقدّر ہے اور وہ ہر قسم کے خوف اور حزن سے محفوظ رہیں گے۔ ملکوتی مقام میں تو وہ سمجھتا تھا کہ مَیں بھی کچھ کر سکتا ہوں۔ مجھے حکم دو تو مَیں دوڑ کر اُس کی تعمیل کروں گا۔ مگر اِس مقام پر پہنچ کر انسان کی یہ حالت ہو جاتی ہے کہ وہ کہتا ہے کہ مَیں تو کچھ بھی نہیں ہوں جس طرح آپ کی مرضی ہو اسی طرح مجھے چلا لیجیئے۔ اس مقام پر پہنچ کر اس کے تمام کام خدا تعالیٰ کے کام ہو جاتے ہیں کیونکہ وہ اپنے آپ کو خدا تعالیٰ کے ہاتھ میں ایک بے جان ہتھیار کی طرح دے دیتا ہے۔ ایسے لوگوں کی نسبت ہی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ بعض لوگ ترقی کرتے کرتے ایسے مقام پر پہنچ جاتے ہیں کہ خدا اُن کی آنکھیں اور کان اور ہاتھ پاؤں بن جاتا ہے۔ یعنی اُن کی تمام حرکات و سکنات اُس کے منشا کے مطابق ہوتی ہیں اور وہ ہر ابتلاء اور ٹھوکر سے محفوظ ہو جاتے ہیں۔

ساتواں مقام جس پر انسان ترقی کرکے پہنچتا ہے وہ وہی ہے جس کا ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ میں ذکر کیا گیا ہے۔ یعنی پھر اُسے ایک اور خلق میں بدل دیا جاتا ہے اور اس پر ایسا آسمانی رنگ چڑھ جاتا ہے کہ پہلے تو وہ خدا تعالیٰ کے بلائے بولتا تھا مگر اب اُس کو وہ مقام بخشا جاتا ہے کہ جو کچھ وہ کہتا ہے خدا تعالیٰ بھی اُسی کے مطابق اپنے احکام جاری کر دیتا ہے گویا پہلے تو خدا اس کے ہاتھ پاؤں بنا تھا مگر پھر وہ ترقی کرتے کرتے ایسے مقام پر پہنچ جاتا ہے۔ کہ اُس کے اپنے ہاتھ پاؤں خدا تعالیٰ کے ہاتھ پاؤں اور اُس کی اپنی زبان خدا تعالیٰ کی زبان بن جاتی ہے۔ اور وہ مَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى کا مصداق ہو جاتا ہے۔ یہ انسانی کمال کا وہ آخری نقطہ ہے جس پر پہنچ کر خدائی صفات اُس کے آئینۂ قلب میں منعکس ہونے لگتی ہیں۔ اور وہ اس کے جلال اور جمال کا مظہر ہو جاتا ہے۔ اِس سے دشمنی رکھنے والے خدا تعالیٰ سے دشمنی رکھنے والے قرار پاتے ہیں۔ اور اُس سے محبت رکھنے والے خدا تعالیٰ کی برکات اور اُس کے انعامات کے مورد بنتے ہیں۔ اِسی مقام کی طرف بانیٔ سلسلہ احمدیہ نے ایک جگہ اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ ؎

اے آں کہ سوئے من بدویدی بصد تبر
از باغباں بترس کہ من شاخِ مثمرم

یعنی اے وہ شخص جو میری طرف تبر اور کلہاڑے لے کر اِس نیّت سے دوڑا چلا آرہا ہے کہ تو میرے لگائے ہوئے باغ کو کاٹ دے تو باغبان سے ڈر کہ مَیں وہ شاخ نہیں ہوں جو کاٹی جا سکے۔ تیری تدابیر الٹ کر تجھ پر ہی پڑیں گی اور تیرا منصوبہ خود تجھے ہی تباہ کر دیگا۔ کیونکہ میرے سر سے پاؤں تک میرا خدا مجھ میں نہاں ہے اور حملہ کرنیوالا مجھ پر حملہ نہیں کرتا۔ بلکہ خدا پر حملہ کرتا ہے اور کون ہے جو خدا پر اپنے حملہ میں کامیاب ہو سکے۔

وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءًۢ بِقَدَرٍ فَاَسْكَنّٰهُ فِي الْاَرْضِ ۖ

اور ہم نے آسمان سے ایک اندازہ کے مطابق پانی اُتارا ہے ۔ پھر اُس کو زمین میں ٹھہرا دیا ۔

وَاِنَّا عَلٰى ذَهَابٍۢ بِهٖ لَقٰدِرُوْنَ ۟ۚ ﴿۱۹﴾ فَاَنْشَاْنَا لَكُمْ بِهٖ جَنّٰتٍ

اور ہم اُس کے فنا کرنے پر بھی قادر ہیں ۔ پھر ہم نے تمہارے لئے اُس سے باغات بنائے

مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّاَعْنَابٍ ۘ لَكُمْ فِيْهَا فَوَاكِهُ كَثِيْرَةٌ وَّمِنْهَا

کھجور کے (بھی) اور انگوروں کے (بھی) اُن میں تمہارے لئے بہت سے پھل (پیدا کئے گئے) ہیں ۔ اور اُن سے

تَاْكُلُوْنَ ۟ۙ ﴿۲۰﴾ وَشَجَرَةً تَخْرُجُ مِنْ طُوْرِ سَيْنَآءَ تَنْۢبُتُ

تم کھاتے ہو ۔ اور ہم نے تمہارے لئے) وہ درخت بھی (پیدا کیا ہے) جو طورِ سینا سے نکلتا ہے جو اپنے اندر

بِالدُّهْنِ وَصِبْغٍ لِّلْاٰكِلِيْنَ ﴿۲۱﴾

تیل لیکر اُگتا ہے اور کھانے والوں کیلئے سالن لے کر (بھی) ؎

غرض یہ وہ سات مقامات ہیں جو رُوحانی ترقی کے حصول کے لئے اللہ تعالیٰ نے مقرر فرمائے ہیں اور جن کو درجہ بدرجہ طے کرتے ہوئے انسان اللہ تعالیٰ کے قریب پہنچ جاتا ہے اور اُس کی لازوال محبت کو حاصل کر لیتا ہے۔

؎ حل لغات: الدُّهْن: دُهْنُ السِّمْسِمِ وَغَيْرِهٖ زَيْتُهٗ یعنی تلوں اور دوسرے بیجوں کے تیل کو عربی زبان میں دُھن کہتے ہیں ۔

الصِّبْغ: مَا يُصْطَبَغُ اَےْ يُؤْتَدَمُ بِهٖ مِنَ الْاِدَامِ ۔ یعنی وہ سالن جسے کھانے کے ساتھ استعمال کیا جاتا ہے ۔ (اقرب)

تفسیر:- فرماتا ہے ۔ ہم نے آسمان سے روحانی زندگی کا پانی ایک اندازہ کے مطابق اتارا ہے اور پھر اس کو زمین میں ٹھہرا دیا ہے ۔ لیکن اگر لوگوں نے اس آسمانی پانی کی قدر نہ کی تو ہم اس کو اس دنیا سے غائب کر دینے پر بھی قادر ہیں ۔ یہ وہی خبر ہے جس کی طرف قرآن کریم کے متعدد مقامات میں اشارہ کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے آخری شرعی کلام کو آسمان سے نازل کرکے زمین میں قائم کرے گا اور لوگوں کی مخالفت اُس کے راستہ میں روک نہیں بنے گی ۔ لیکن پھر ایک عرصہ کے بعد جبکہ لوگوں میں بگاڑ پیدا ہو جائیگا یہ کلام آسمان پر چڑھنا شروع ہو جائیگا اور ایک ہزار سال میں یہ دُنیا سے اُٹھ جائیگا ۔ (سورۂ سجدہ ع ۱) رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قیامِ شریعت کے زمانہ کو تین سو سال کا عرصہ قرار دیا ہے ۔ جیسا کہ آپ ایک حدیث میں فرماتے ہیں ۔ کہ:-
خَيْرُكُمْ قَرْنِيْ ثُمَّ الَّذِيْنَ يَلُوْنَهُمْ ثُمَّ الَّذِيْنَ يَلُوْنَهُمْ ثُمَّ يَكُوْنُ بَعْدَهُمْ قَوْمٌ يَشْهَدُوْنَ وَلَا يُسْتَشْهَدُوْنَ وَيَخُوْنُوْنَ وَلَا يُؤْتَمَنُوْنَ وَيَنْذِرُوْنَ وَلَا يَفُوْنَ وَ

يَظْهَرُ فِيْهِمُ السِّمَنُ (بخاری جلد ۴ کتاب الرقاق باب مایحذر من زھرۃ الدنیا والتنافس فیھا) یعنی سب سے بہتر میری صدی ہے پھر اس سے اُتر کر وہ لوگ ہونگے جو دوسری صدی میں ہونگے اور اُن سے اُتر کر وہ لوگ ہونگے جو تیسری صدی میں ہونگے۔ مگر اس کے بعد ایسے لوگ پیدا ہوجائینگے جو گواہی دیں گے تو لوگ کہیں گے کہ تمہاری گواہی کا ہم کیا اعتبار کریں تم تو جھوٹ بولتے ہو۔ کوئی شخص اُن کے پاس امانت رکھنے کے لئے تیار نہیں ہوگا کیونکہ وہ سخت خائن اور بددیانت ہونگے۔ اسی طرح اُن کا حال یہ ہوگا کہ وہ نذریں مانیں گے تو اُن کو پورا نہیں کریں گے۔ اور کھا کھا کر خوب موٹے ہوجائیں گے یعنی دین کی محبت اور قربانی کا جذبہ اُن کے اندر نہیں ہوگا۔ اسی طرح آپؐ نے فرمایا کہ اُس زمانہ میں مسلمانوں کی یہ حالت ہوگی کہ لَا يَبْقٰى مِنَ الْاِسْلَامِ اِلَّا اِسْمُهٗ وَلَا يَبْقٰى مِنَ الْقُرْاٰنِ اِلَّا رَسْمُهٗ (مشکوٰۃ کتاب العلم) اسلام کا صرف نام ہی باقی رہ جائیگا۔ اور قرآن کریم کی صرف تحریر رہ جائیگی۔ یعنی اسلام کا مغز لوگوں میں باقی نہیں رہیگا اور قرآن کریم کے مطالب کسی پر روشن نہیں ہونگے۔ اُن کی عبادتیں اخلاص سے خالی ہونگی اور اُن کے دماغ قرآنی معارف کو سمجھنے سے عاری ہوجائینگے قرآن کریم اور رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی اِن پیشگوئیوں کے مطابق ابتدائی تین صدیوں کے بعد اسلام پر زوال آنا شروع ہُوا۔ اور یہ زوال اتنا بڑھا کہ مسلمان اپنی طاقت کو بالکل کھو بیٹھے۔ کُجا تو وہ وقت تھا کہ یورپ ایک ایک مسلمان بادشاہ سے ڈرتا تھا اور کُجا یہ حالت ہے کہ اب یورپ اور امریکہ کا مقابلہ کرنے کی طاقت سارے عالمِ اسلام میں بھی نہیں ہے۔ پھر مسلمانوں کی عملی حالت خود بخود بتا رہی ہے کہ وہ اسلام سے کس قدر دُور جاچکے ہیں۔ انہوں نے اسلام کی تعلیم کے صریح خلاف عقائد اختیار کر رکھے ہیں اور اسلام کی اشاعت کا جذبہ اُن کے دلوں سے مفقود ہوچکا ہے۔ نہ محبتِ الٰہیہ اُن میں پائی جاتی ہے اور نہ محبتِ رسول کا کوئی نمونہ اُن کی عملی زندگی میں نظر آتا ہے۔ مُونہہ سے بے شک وہ اسلام کی طرف اپنے آپ کو منسوب کرتے ہیں مگر اُنکے اپنے دل بھی تسلیم کرتے ہیں کہ اسلاف کی رُوح اُن میں باقی نہیں رہی۔ خود علماء کہلانے والوں کی یہ حالت ہے کہ وہ فتنہ و فساد کو ہوا دینے کے لئے تو ہر وقت تیار رہتے ہیں لیکن وہ غرض جس کے لئے اسلام مبعوث ہُوا تھا اس کی طرف انہیں کوئی توجہ نہیں۔ نماز اور روزہ اور حج اور زکوٰۃ کی طرف اوّل تو اکثریت کی کوئی توجہ نہیں اور جو لوگ اِن عبادات میں حصّہ لیتے ہیں وہ بھی رسمی رنگ میں حصّہ لیتے ہیں۔ ورنہ نہ نماز کی غرض و غایت اُن کو معلوم ہے نہ روزہ کا مقصد اُن کے سامنے ہوتا ہے۔ نہ حج اور زکوٰۃ کی حکمت کا انہیں احساس ہوتا ہے۔ پھر خدا جو سب سے بڑی دولت ہے اور جس کے کلام کے بغیر روحانیت کا پودہ کبھی پنپ نہیں سکتا اس کی محبت سے وہ ایسے بیگانہ ہوچکے ہیں کہ وہ سمجھتے ہیں اب خدا تعالےٰ کے کلام اور اُس کے الہام کا دروازہ بند ہوچکا ہے اور اللہ تعالےٰ اپنے بندوں کی اصلاح کے لئے پہلے تو اپنے مامورین کو مبعوث فرماتا رہا ہے مگر اَب اُس نے اِس چشمۂ فیض کو بھی بند کر دیا ہے اور اُمتِ محمدیّہ سے اپنا چہرہ ہمیشہ کے لئے چُھپا لیا ہے اور وحی اور الہام کا سلسلہ قیامت تک بند کر دیا ہے۔ اب خواہ کوئی لاکھ چلّائے اللہ تعالیٰ اُس کی رُوح کی تسکین کا کوئی سامان پیدا نہیں کریگا۔ اور اُسے ظلمات کی وادیوں میں بھٹکتا چھوڑ دیگا۔ یہ وہ حالات ہیں جن سے موجودہ دَور کا مسلمان گذر رہا ہے۔ وہ مایوسی اور نکبت کا شکار ہوچکا ہے۔ رُوحِ فاعلی اُس کے اندر سے مفقود ہوچکی ہے اور

کفر پر غالب آنے کے دلولے اُس کے قلب کے کسی گوشہ
میں بھی نہیں پائے جاتے۔ اور یقیناً اگر یہی حالات رہتے تو
اسلام کی ہستی معرضِ خطر میں پڑ جاتی۔ اور ابلیس کا سر
کبھی کچلا نہ جا سکتا۔ لیکن وہ خدا جس نے اسلام کے
ایک ہزار سالہ دَورِ تنزّل کی خبر دی تھی اُسی نے قرآن کریم
میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک دوسری بروزی
بعثت کی بھی خبر دی تھی اور پھر اُس زمانہ کی علامات
بیان کرتے ہوئے بتایا تھا کہ اُس زمانہ میں خدا ترس علماء
جو دنیا کے لئے ہدایت اور راہنمائی کا موجب ہُوا کرتے ہیں
دنیا سے مفقود ہو جائیں گے اور اُن کی جگہ ایسے علماء
لے لیں گے جو دین سے بے بہرہ ہونگے۔ اُس زمانہ میں
ایک نئی سواری ایجاد ہوگی جس کی وجہ سے اونٹ ترک
کر دیئے جائیں گے۔ اُس وقت کتابیں اور اخبار کثرت سے
شائع ہونگے۔ علومِ ہیئت کے کئی نئے عظیم الشان
انکشافات ہونگے۔ دریاؤں میں سے نہریں نکالی جائینگی
پہاڑوں کو اُڑایا جائیگا۔ سفر کا رواج زیادہ ہو جائیگا
ستی وغیرہ کی قدیم رسوم قانوناً بند کر دی جائیں گی۔
ایسی سواریاں ایجاد ہونگی جو اس سے پہلے دنیا میں موجود
نہیں تھیں اور دو سمندروں کے درمیان کی ایک خشکی
کو پھاڑ کر جس کے ایک طرف مونگا پایا جاتا ہے اور
دوسری طرف موتی دونوں سمندروں کو ملا دیا جائیگا۔
اور اُس میں کثرت سے جہاز چلیں گے جس میں سویز اور
پانامہ کی نہروں کی طرف اشارہ تھا۔ چنانچہ اللہ
تعالیٰ نے سورۂ رحمٰن میں اس کی خبر دیتے ہوئے فرمایا
مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيٰنِ بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا يَبْغِيٰنِ
فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ يَخْرُجُ مِنْهُمَا اللُّؤْلُؤُ
وَالْمَرْجَانُ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ (سورۂ
رحمٰن ع ۱) یعنی اُس نے دو سمندروں کو اس طرح چلایا ہے
کہ وہ ایک وقت آکر آپس میں مل جائیں گے لیکن سردست
اُن دونوں کے درمیان خشکی کا ایک پردہ حائل ہے جس کی
وجہ سے وہ ایک دوسرے سے مل نہیں سکتے۔ ان دونوں
سمندروں میں سے موتی اور مونگا نکلتے ہیں۔ اب بتاؤ
کہ تم اپنے ربّ کی نعمتوں میں سے کس کس کا انکار کروگے
چنانچہ ان دونوں نہروں نے بحیرۂ قلزم اور احمر کو
ایک طرف اور بحر اوقیانوس اور بحر الکاہل کو دوسری
طرف ملا دیا اور اس طرح یہ قرآنی پیشگوئی پوری ہوئی۔
پھر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی امّتِ محمدیہ کو
خوشخبری دی اور فرمایا کہ بے شک ایک زمانہ ایسا آئیگا
جب کہ رُوحانی پانی آسمان کی طرف اُٹھ جائیگا۔ مگر پھر
آسمان سے ہی ایمان کا خزانہ واپس لیکر ایک فارسی الاصل
انسان دُنیا میں مبعوث ہوگا۔ جو صلیبی طاقتوں کو پاش پاش
کر دیگا اور اسلام پر حملہ آور عاقبت نااندیش لوگوں کو
اپنے دلائل و براہین اور آسمانی حربوں اور معجزات و نشانات
اور دُعاؤں کی مدد سے ایسا گھائل کریگا کہ وہ سر اُٹھانے
کی بھی تاب نہیں رکھیں گے۔ وہ اسلام کو پھر ساری زمین
پر غالب کریگا کہ قرآن اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
کا جھنڈا دنیا میں بلند کریگا۔ اور ادیانِ باطلہ کو اسلام
کے مقابلہ میں ایسی شکست دیگا کہ جس کی مثال دنیا میں
نظر نہیں آئیگی۔ پھر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے
احیاءِ اسلام کے لئے صرف ایک موعود کے آنے کی ہی
خبر نہیں دی بلکہ آپ نے وہ علامات بھی بتائیں جن سے
اس کا پہچاننا مسلمانوں کے لئے آسان ہو جائے۔ آپ نے
بتایا کہ یہ موعود دو بیماریوں میں مبتلا ہوگا ایک دھڑ کے
اوپر کے حصے سے تعلق رکھتی ہوگی اور ایک نچلے حصے سے
اور یہ کہ اُس کا رنگ گندم گوں ہوگا۔ سر کے بال سیدھے
ہونگے۔ کسانوں کے خاندان میں سے ہوگا۔ اُس کے کلام
میں لکنت ہوگی۔ وہ بات کرتے وقت ہاتھ کو اپنی ران
پر ماریگا۔ اور کدعہ یعنی قادیان نامی گاؤں سے ظاہر ہوگا۔

اسی طرح آپ نے فرمایا کہ وہ مسیحیت اور مہدویت کی دونوں شاخوں کا جامع ہو گا۔ اُسوقت عیسائیت کو دوسری اقوام پر غلبہ حاصل ہوگا اور اسلامی شریعت کی مقرر کردہ حدود کو ترک کر دیا جائیگا۔ جُوا کثرت سے پھیل جائیگا۔ امراء اپنے مالوں کی زکوٰۃ نکالنے کو بوجھ تصور کریں گے۔ اسلامی حکومتیں ضعف و انحطاط کا شکار ہو جائیں گی۔ پھر فرمایا کہ اُس زمانہ میں عورتیں زیادہ ہو جائیں گی۔ اور تجارتی کاروبار میں سے اشیاء فروخت کرنے کا کام عورتوں کے سپرد کر دیا جائیگا اور عورتوں کے لباس ایسے ہونگے کہ اُن کے جسم کا وہ حصّہ جسے پہلے لوگ بھی پردہ کے قابل سمجھتے تھے ننگا نظر آئیگا۔ پھر یہیں تک بس نہیں بلکہ یہ بھی بتایا کہ آنے والا موعود مشرق سے ظاہر ہوگا۔ اس کے زمانہ میں کئی قسم کی بیماریاں پھیلینگی اور سورج اور چاند دونوں تاریک ہو جائیں گے۔ یعنی رمضان کے مہینہ میں سورج کو اُس کے گرہن کی تاریخوں میں سے دوسری کو اور چاند کو اُس کے گرہن کی تاریخوں میں سے پہلی تاریخ کو گرہن لگیگا اور اس علامت پر اتنا زور دیا گیا تھا کہ کہا گیا تھا کہ یہ علامت پہلے کسی مدعیٔ مہدویت کے لئے بطور نشان مقرر نہیں کی گئی (دار قطنی) ان تمام پیشگوئیوں پر اگر بحیثیت مجموعی نظر ڈالی جائے تو سوائے موجودہ زمانہ کے اور کسی زمانہ پر چسپاں نہیں ہوتیں۔ اور سوائے بانیٔ سلسلہ احمدیہ کے جنہوں نے مسیحیت اور مہدویت کا دعویٰ کیا اور جن کے زمانہ میں یہ تمام پیشگوئیاں پُوری ہوئیں اور کوئی وجود ان پیشگوئیوں کا مورد نظر نہیں آتا۔ پس یہی وہ زمانہ ہے جس کی خبر قرآن کریم اور احادیث اور انبیائے سابقین کے کلام میں پائی جاتی تھی۔ اور بانیٔ سلسلہ احمدیہ ہی وہ موعود ہیں جن کی انتظار میں صدیوں سے لوگ چشم براہ تھے۔ آپ خود فرماتے ہیں:—

"وہ کام جس کے لئے خدا نے مجھے مامور فرمایا ہے وہ یہ ہے کہ خدا میں اور اُسکی مخلوق کے رشتہ میں جو کدورت واقع ہو گئی ہے اُس کو دُور کر کے محبت اور اخلاص کے تعلّق کو دوبارہ قائم کروں اور سچائی کے اظہار سے مذہبی جنگوں کا خاتمہ کر کے صلح کی بنیاد ڈالوں اور وہ دینی سچائیاں جو دُنیا کی آنکھ سے مخفی ہو گئی ہیں اُن کو ظاہر کر دوں اور وہ روحانیت جو نفسانی تاریکیوں کے نیچے دب گئی ہے اس کا نمونہ دکھاؤں اور خدا کی طاقتیں جو انسان کے اندر داخل ہو کر توجہ یا دُعا کے ذریعہ سے نمودار ہوتی ہیں حال کے ذریعہ سے نہ محض قال سے اُنکی کیفیت بیان کر دوں اور سب سے زیادہ یہ کہ وہ خالص اور چمکتی ہوئی توحید جو ہر ایک قسم کے شرک کی آمیزش سے خالی ہے جو نابود ہو چکی ہے اُس کا دوبارہ قوم میں دائمی پودہ لگاؤں۔ اور یہ سب کچھ میری قوت سے نہیں ہوگا۔ بلکہ اُس خدا کی طاقت سے ہو گا جو آسمان اور زمین کا مالک ہے۔" (لیکچر اسلام صفحہ ۲۴)

سو خدا نے وَاِنَّا عَلٰی ذَهَابٍ بِهٖ لَقٰدِرُوْنَ میں صرف تنزّلِ اسلام کی ہی خبر نہیں دی تھی بلکہ یہ بھی بتایا تھا کہ اِس تاریکی کے زمانہ میں جبکہ روحانیت کے متلاشی اندھوں کی طرح مارے مارے پھر رہے ہونگے اللہ تعالیٰ مشرق کی سرزمین سے اپنا ایک مامور مبعوث فرمائیگا جس کی نورانی کرنوں سے وساوس اور شکوک کی تاریکیوں کو پھاڑ دیا جائیگا۔ خشک زمین کو سیراب کیا جائیگا اور روحانیت اور تقویٰ کی روئیدگی

وَإِنَّ لَكُمْ فِي الْأَنْعَامِ لَعِبْرَةً ۚ نُسْقِيكُمْ مِمَّا

اور تمہارے لئے چارپایوں میں بڑی عبرت ہے۔ ہم تم کو اس چیز سے جو اُن کے پیٹ

فِي بُطُونِهَا وَلَكُمْ فِيهَا مَنَافِعُ كَثِيرَةٌ وَمِنْهَا

میں ہوتی ہے پلاتے ہیں اور ان چارپایوں میں تمہارے لئے اور بھی بہت سے نفعے ہیں اور تم ان میں سے بعض کو

کو نکالا جائیگا۔ تاکہ وہ دنیا جو ایک خشک جنگل کی طرح ہو گئی تھی ایک شاداب کھیت کی طرح ہو جائے۔ اور لوگ زندگی اور خوشی کا سانس لینے لگیں۔ اور تاکہ لوگ اُس حقیقی راحت کو پالیں جو خدا تعالیٰ کی محبت اور اُس کی لقاء کے بغیر کبھی حاصل نہیں ہو سکتی۔

چنانچہ وہ زمانہ آگیا جس میں اسلام کے دوبارہ احیاء کی بنیاد رکھ دی گئی ہے۔ اُس کی رحمت کا دریا دلوں کی خشک زمینوں کو سیراب کرنے کے لئے اپنے کناروں سے اچھل کر بہہ پڑا ہے۔ اب وہی لوگ کامیاب ہو سکتے ہیں جو اس آسمانی پانی سے فائدہ اٹھائیں۔ اور ابی اور استکبار سے کام نہ لیں۔

پھر فرماتا ہے جس طرح تازہ اُترنے والے مادی پانی سے کھجور اور انگور اور دوسرے پھل پیدا ہوتے ہیں اسی طرح تازہ اُترنے والے روحانی پانی سے بھی قسم قسم کے اعلیٰ درجہ کے پھل پیدا ہوتے رہیں گے۔ ان پھلوں میں سے کچھ تو تم کھاتے ہو۔ اور کچھ دوسرے کاموں میں استعمال کرتے ہو۔ جیسے اس درخت کا پھل جو طورِ سینا سے نکلتا ہے اور جس میں تیل بھی پایا جاتا ہے۔ اور جو کھانے والوں کے لئے سالن کے کام بھی آتا ہے یعنی زیتون۔

ان آیات میں اس مضمون کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو اسلام کے دوبارہ احیاء کے سلسلہ میں بیان کیا جا رہا ہے۔ اور بتایا گیا ہے کہ تم اسلام کو

ایک بے ثمر باغ تصوّر مت کرو۔ بلکہ یاد رکھو کہ یہ وہ باغ ہے جو ہر زمانہ میں اپنے تازہ پھل لوگوں کو کھلاتا رہے گا۔ اور جب بھی اسلام میں کوئی خرابی واقعہ ہو گی اُس کو دُور کرنے کے لئے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی غلام جو آپ کی ہی روحانیت کا پھل ہو گا۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مبعوث ہو کر اُس خرابی کو دُور کر دے گا۔ چنانچہ موجودہ زمانہ میں جبکہ دُنیا معجزات و نشانات کا انکار کر رہی تھی بانیٔ سلسلہ احمدیہ نے مخالفینِ اسلام کو چیلنج دیتے ہوئے فرمایا ؎

کرامت گرچہ بے نام و نشان است
بیا بنگر ز غلمانِ محمدؐ

یعنی اس زمانہ میں اگر تمہیں معجزات و نشانات کا کوئی نمونہ نظر نہیں آتا تو تم آؤ اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے غلاموں سے ان کرامات کا مشاہدہ کر لو۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اللہ تعالیٰ کے اس انعام کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ اِنَّ اللّٰهَ يَبْعَثُ لِهٰذِهِ الْأُمَّةِ عَلٰى رَأْسِ كُلِّ مِائَةِ سَنَةٍ مَنْ يُّجَدِّدُ لَهَا دِيْنَهَا (ابوداؤد جلد ۲) یعنی اللہ تعالیٰ میری امت میں ہر صدی کے سر پر ایسے مُصلحین کھڑا کرتا رہے گا جو اُن خرابیوں کو دُور کر دیا کریں گے جو مرورِ زمانہ کی وجہ سے اسلام میں داخل ہونگی اور اس طرح اسلام کا پاک اور بے عیب چہرہ لوگوں کے سامنے بار بار آتا رہے گا۔

تَاْكُلُوْنَ ﴿۲۲﴾ وَعَلَيْهَا وَعَلَى الْفُلْكِ تُحْمَلُوْنَ ﴿۲۳﴾ ع

کھاتے ہو ۔ اور ان پر اور کشتیوں پر اُٹھائے جاتے ہو ۔ ؎۵

اسجگہ زیتون کا ذکر اس لئے کیا گیا ہے کہ علاوہ اس کے
کہ وہ ایک پھل کا کام دیتا ہے ۔ اس کا تیل اچار میں بھی
ڈالا جاتا ہے جو اس کو دیر تک قائم رکھتا ہے ۔ اس طرح
تمثیلی زبان میں اس امر کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ اسلام
کے ذریعہ ہم نہ صرف اس کے تازہ پھل تمہیں کھلائینگے
بلکہ ہم تمہارے اندر اس تعلیم کو قائم کریں گے جو سڑنے
اور خراب ہونے سے محفوظ ہو گی ۔ چنانچہ دیکھ لو موسوی
اور عیسوی تعلیمیں بے کار ہو کر رہ گئیں مگر محمد رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم جو تعلیم لائے وہ اب بھی قائم ہے اور
قیامت تک قائم رہے گی ۔ اور کوئی شخص اس قرآن کا ایک
شوشہ بدلنے کی بھی طاقت نہیں رکھتا ۔

؎۵ تفسیر ۔ فرماتا ہے جس طرح تم دیکھتے ہو کہ مُردہ مٹی
میں سے ہم گھاس نکالتے ہیں جسے جانور کھاتے ہیں اور
پھر وہ اس کے پیٹ کے راستہ سے تمہارے لئے عمدہ
غذا بن جاتا ہے ۔ اسی طرح انسانی عقل بیشک طرح طرح
کی تدبیریں نکالتی ہے لیکن ان تدبیروں کو اعلیٰ درجہ کا
مفید اور بے عیب بنانا خدا کا کام ہے ۔ جو خدا گھاس کو
جانور کی مشین میں ڈال کر دودھ بنا کر نکالتا ہے وہی
خدا جب ایک کامل دماغ پر اپنا پرتو ڈالتا ہے اور
اعلیٰ الہام سے اُس کی مدد کرتا ہے تو اُس کے نتیجہ میں
ایک ایسی اعلیٰ درجہ کی تعلیم پیدا ہوتی ہے جو دودھ کی
طرح رُوحانی انسان کی پرورش کرتی ہے ۔ اور گھاس کا
فضلہ سب اُس میں سے نکل جاتا ہے ۔

حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مادی اور رُوحانی
عالم کو ایک دوسرے کے مشابہ بنایا ہے جسطرح مادی
عالم میں ہمیں یہ قانون دکھائی دیتا ہے کہ زمین اپنی
قوتوں کے نشوونما کے لئے آسمانی بارش کی محتاج ہوتی
ہے اسی طرح عقل انسانی بھی وحی اور الہام کی بارش
کی محتاج ہے جس طرح جسمانیات میں ہمیں روزانہ یہ
نظارہ نظر آتا ہے کہ اگر ایک لمبے عرصہ تک بارش نازل
نہ ہو تو کنوؤں کے پانی تک خشک ہو جاتے ہیں ۔ درخت
مُرجھا جاتے ہیں ۔ سبزے گل سڑ جاتے ہیں اور باغات
اپنے پھل سے محروم ہو جاتے ہیں ۔ اسی طرح جب ایک
لمبے عرصہ تک آسمانِ روحانی سے وحی و الہام کی بارش
نازل نہیں ہوتی تو ارتقاءِ دماغی بھی بند ہو جاتا ہے اور
محض عقل بنی نوع انسان کی کوئی راہنمائی نہیں کر سکتی ۔
فلسفیوں کی گمراہی اس بات کا نتیجہ ہوتی ہے کہ وہ
صرف عقل کو اپنا راہنما سمجھتے ہیں اور خیال کرتے ہیں کہ
ہم اپنی بہبودی کے لئے خود قوانین تجویز کر سکتے ہیں ہمیں
کسی مذہب یا الہام کی ضرورت نہیں حالانکہ اُن کے
اس نظریہ کی خود نیچر تردید کر رہا ہے ۔ زمین اپنے اندر
بڑی بھاری طاقتیں رکھتی ہے مگر وہ بارش کی محتاج
ہے ۔ بارش نازل ہوتی ہے تو زمین کے سوتے بھی پھوٹ
پڑتے ہیں ۔ اُس کی سبزیاں اُگنے لگتی ہیں ۔ اُس کے درخت
لہلہانے لگتے ہیں ۔ اُس کے پھول اپنی بھینی بھینی خوشبو
سے دل و دماغ کو معطر کرنے لگتے ہیں ۔ اُس کا سبزہ
آنکھوں کو طراوت بخشنے لگتا ہے اور یوں معلوم ہوتا ہے
کہ ہر چیز میں زندگی کے آثار پیدا ہو گئے ہیں ۔ یہانتک
کہ فضائے آسمانی میں اُڑنے والے پرندے بھی خوشی سے
چہچہانے لگتے ہیں اور لوگ اطمینان اور خوشی کا سانس
لینے لگتے ہیں ۔ وہی لوگ جن کے دل قحط سالی کے خوف
سے دھڑک رہے ہوتے ہیں اُن کے چہروں پر بشاشت

آجاتی ہے اور وہ سمجھتے ہیں کہ خدا تعالیٰ نے بارش نازل کرکے ہمیں تباہ ہونے سے بچا لیا۔ جس طرح مادی عالم میں زمین آسمانی بارش کی محتاج ہے۔ اسی طرح انسانی عقل وحی و الہام کی محتاج ہے۔ گویا جس طرح انسانی آنکھ سورج کی روشنی کے بغیر بے کار ہے۔ اسی طرح انسانی عقل اللہ تعالیٰ کے کلام اور اُس کے الہام کے بغیر ایک بے کار چیز ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ کا ہاتھ اُس کی مدد کے لئے آسمان سے نہ اُترے تو وہ کبھی اپنی اُس پیاس کو نہیں بجھا سکتا جو اُس کی فطرت کے اندر ودیعت کی گئی ہے اور جس کے لئے وہ چاروں طرف اپنے ہاتھ پاؤں مارتا دکھائی دے رہا ہے۔ یورپ کو دیکھ لو۔ اُس نے مادی علوم میں کسقدر ترقی کرلی ہے۔ سائنس اپنے معراجِ کمال کو پہنچ چکی ہے اور مذہب کو انسانی زندگی کے لئے ایک بے کار چیز سمجھا جانے لگا ہے۔ مگر اُس کے ساتھ ہی ہمیں یہ نظارہ بھی نظر آتا ہے کہ ذرا کوئی شخص اُن سے کہدے کہ میں ہتھیلی دیکھ کر تمہیں غیب کی خبریں بتا سکتا ہوں تو بڑے بڑے لائق وکیل اور گریجوایٹ اور ڈاکٹر اور انجنیئر اُس کے سامنے بیٹھ جائیں گے اور کہیں گے ہمارا ہاتھ دیکھ کر ہمیں بتاؤ کہ ہمارا مستقبل کیسا ہے۔ اور پھر وہ جو کچھ بتاتا ہے سُنے پتھر کی لکیر سمجھ لیتے ہیں۔ اُن کی یہ کیفیت بتاتی ہے کہ فطرتی طور پر انسان کے اندر ایک پیاس رکھی گئی ہے۔ اور وہ کائناتِ عالم کی حقیقت اور اُسکے راز معلوم کرنا چاہتا ہے۔ بیشک انہوں نے سینکڑوں سالوں تک سمندروں پر حکمرانی کی۔ انہوں نے ایک ایک چلّو پانی کو چھان مارا اور سب گہرائیوں کو دریافت کیا انہوں نے موتی نکالنے کے لئے سمندروں کی تہ میں غوطے لگائے اور فضائے آسمانی کی بلندیوں کے راز معلوم کرنے کے لئے آسمان کی طرف اپنے تیر پھینکے اُن کے بیڑوں نے جزیروں کی تلاش میں زمین کا چپّہ چپّہ دیکھ مارا اور ملکوں پر قبضہ کرلیا۔ مگر اُن کا غیب معلوم کرنے کے لئے اپنے ہاتھ دکھانا صاف بتا رہا ہے کہ یہ مادی علوم اُن کو مطمئن کرنے سے قاصر رہے ہیں اور وہ ماوراء الطبیعات علوم کے حصول کی ایک تڑپ اِس لامذہبیت میں بھی اپنے اندر محسوس کرتے ہیں یہی تڑپ اور پیاس ہے جو انسان کو کبھی کسی راستہ پر لے جاتی ہے اور کبھی کسی راستہ پر۔ کوئی ستاروں کو دیکھ کر آئندہ کے حالات معلوم کرنا چاہتا ہے۔ کوئی پامسٹری کو علمِ غیب کے حصول کا ایک ذریعہ سمجھتا ہے۔ کوئی تسبیح کے منکوں سے اپنی کامیابی یا ناکامی کی فال لیتا ہے۔ اگر طاق منکا آجائے تو کہتا ہے کامیابی یقینی ہے جُفت آجائیں تو سر نیچے ڈال لیں گے اور کہیں گے ناکامی یقینی ہے۔ عرب کے رہنے والے کبھی تیروں سے فال لیتے تھے اور کبھی پرندوں کی شکلوں اور اُن کی آوازوں سے مختلف قسم کے نتائج اخذ کرتے تھے اگر اُلّو اُن کی دیوار پر آبیٹھتا تو وہ سمجھتے کہ اب ہمارے لئے ویرانی اور بربادی مقدّر ہے اور اگر کوّا آبیٹھتا تو سمجھتے کہ کوئی سفر پیش آنے والا ہے۔ غرض یہ خواہش کہ کائنات کے راز اور عالمِ بالا کے اسرار کس طرح منکشف ہوں ہر انسان کے اندر فطرتی طور پر پائی جاتی ہے اور یہ خواہش اِس قدر بڑھی ہوئی ہے کہ ہمارے ملک میں کئی لوگ ایسے دکھائی دیتے ہیں جو جنّات کو قابو کرنے کے لئے مختلف قسم کی چلّہ کشیاں کرتے رہتے ہیں۔ اگر انہیں معلوم ہو کہ کسی شخص کے قبضہ میں جنّ ہیں تو وہ دُور دراز کا سفر کرکے بھی اُسکے پاس پہنچیں گے۔ اُس کی منّتیں کریں گے اور اُس سے عاجزانہ التجائیں کرینگے کہ وہ انہیں بھی ایسا طریق بتا دے جس سے جنّات قابو میں آجائیں اور وہ اُن کی مدد سے اپنی تمام مشکلات کو دُور کرسکیں۔ کوئی اسمِ اعظم کی دریافت کے پیچھے لگا ہُوا ہے اور کوئی عمل حبّ اور عمل تسخیر کو دریافت کرنے کے لئے مارا مارا پھر رہا ہے۔ اگر مادی علوم ہی انسان

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖ فَقَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا

اور ہم نے نوحؑ کو اُس کی قوم کی طرف مبعوث کیا۔ پس اُس نے کہا۔ اے میری قوم! اللہ کی

اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ۝۲۴

عبادت کرو۔ اُس کے سوا اور کوئی تمہارا معبود نہیں۔ کیا تم اس کا تقویٰ اختیار نہیں کرتے۔

فَقَالَ الْمَلَؤُا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ مَا هٰذَآ

اس پر اُس کی قوم کے کافروں کے سرداروں نے کہا۔ یہ شخص تو فقط

کی پیاس بجھانے کیلئے کافی تھے تو کیا وجہ ہے کہ یورپ کا عقلمند بھی اِن باتوں کے پیچھے پڑا ہوا ہے اور ایشیا کا جاہل بھی اِن علوم کے حاصل کرنیکا متمنی ہے۔ یہ نظارہ بتاتا ہے کہ ہر انسان کے اندر فطرتی طور پر ایک بالا طاقت کا احساس پایا جاتا ہے۔ بے شک مادیات کا بوجھ بعض دفعہ اس کی اِس فطرتی طاقت کو دبا دیتا ہے مگر اُس کی جدوجہد بتا رہی ہے کہ جب اس کا شعوری دماغ غافل ہوتا ہے تو اُس کا غیر شعوری دماغ اپنے کام میں مشغول ہوتا ہے۔ اور وہ اپنے مقصد کے حصول کے لئے کئی قسم کے راستے تلاش کرتا رہتا ہے۔ چنانچہ دیکھ لو دہریہ خدا تعالےٰ کے وجود کا انکار کرتا ہے مگر بسا اوقات جب کوئی اچانک مصیبت آتی ہے تو اُس کے مُنہ سے بھی اللہ تعالیٰ کا نام نکل جاتا ہے اور وہ اُسی کو اپنی مدد کیلئے پکارنے لگ جاتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس کی فطرت بھی خدا تعالیٰ کو تسلیم کرتی تھی مگر مادیات کے بوجھ نے فطرت کو مسخ کر دیا اور اُس پر کئی قسم کے پردے ڈال دیئے مگر جونہی وہ پردے ہٹے فطرت کا نُور پھر چمک اُٹھا۔ اور اُس نے خدا کو پکارنا شروع کر دیا۔

غرض ہر انسان کے اندر اللہ تعالےٰ نے اپنی ملاقات کی ایک تڑپ رکھی ہے۔ مگر انسانی جدوجہد بتا رہی ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کا الہام اُس کی راہنمائی کے لئے نازل نہ ہوتا تو وہ اِسی طرح بھول بھلیوں کے چکّر میں پھنسا رہتا اور وہ خدا تعالیٰ کو کبھی نہ پا سکتا۔ خدا تعالیٰ نے اُس پر یہ احسان کیا ہے کہ اُس نے اپنے نبیوں کی معرفت اُسے وہ راستہ دکھایا جس پر چل کر وہ آسانی سے خدا تعالیٰ تک پہنچ سکتا اور ہر قسم کے مصائب سے امن حاصل کر سکتا ہے۔

یہی مضمون ایک تمثیلی زبان میں اللہ تعالےٰ نے اِن آیات میں بیان فرمایا ہے۔ اور بنی نوع انسان کو اِس امر کی طرف توجہ دلائی ہے کہ کیا تم دودھ کو نہیں دیکھتے وہ کتنا لذیذ اور تمہاری طاقتوں کے نشوونما کے لئے کتنی مفید چیز ہے۔ لیکن یہ دودھ تم نہیں بناتے بلکہ خدا خود جانور کی مشین میں گھاس ڈالتا اور اُس سے دودھ پیدا کرتا ہے۔ اِسی طرح بے شک تمہارے اندر بھی عقل پائی جاتی ہے۔ مگر وہ گھاس کی طرح ہے جب تک تمہاری عقل پر الہام کا پانی نازل نہ ہو اُس وقت تک وہ گھاس کی طرح ایک ذلیل چیز ہے۔ لیکن جب خدا تعالیٰ اپنا الہام نازل کرتا ہے تو اُس سے دودھ کی طرح ایک قیمتی تعلیم دنیا کے سامنے آتی ہے جو بنی نوع انسان کے دماغی اور عقلی قویٰ کو نشوونما دے کر انہیں ایسے بلند مقام پر پہنچا دیتی ہے کہ وہ خود وحی و الہام

إِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُرِيدُ أَنْ يَتَفَضَّلَ عَلَيْكُمْ وَلَوْ

تمہارے جیسا ایک انسان ہے (اور) چاہتا ہے کہ تم پر فضیلت اختیار کرے - (اور) اگر

شَاءَ اللَّهُ لَأَنْزَلَ مَلَائِكَةً ۖ مَّا سَمِعْنَا بِهَٰذَا فِي

اللہ (تعالیٰ پیغمبر بھیجنا) چاہتا تو فرشتوں کو اتارتا - ہم نے اپنے پہلے باپ دادوں میں تو کوئی اِس

آبَائِنَا الْأَوَّلِينَ ﴿٢٥﴾ إِنْ هُوَ إِلَّا رَجُلٌ بِهِ جِنَّةٌ

قسم کا واقعہ ہوتا سُنا نہیں - یہ تو فقط ایک انسان ہے جس کو جنون ہو گیا ہے

فَتَرَبَّصُوا بِهِ حَتَّىٰ حِينٍ ﴿٢٦﴾ قَالَ رَبِّ انْصُرْنِي بِمَا كَذَّبُونِ ﴿٢٧﴾

پس اِس کے انجام کا کچھ دیر انتظار کرو ۔(اس پر نوحؑ نے) کہا ۔ اے میرے رب! میری مدد کر کیونکہ یہ لوگ مجھے جھٹلاتے ہیں -

کے مورد ہو جاتے ہیں - اور انسان اپنی پیاس میں تسکین اور اپنی رُوح میں ایک نئی چمک محسوس کرتا ہے -

حل لغات :- اَلْجِنَّةُ : طَائِفَةٌ مِّنَ الْجِنِّ یعنی جنّوں کا ایک گروہ - اِسْمٌ مِّنَ الْجُنُوْنِ - دیوانگی اور پاگل پن (اقرب)

تفسیر :- انبیاء اور خلفاء کے دشمن ہمیشہ حرّیت کے نام پر اُن کی مخالفت کرتے رہے ہیں اور کہتے رہے ہیں کہ کیا اپنے جیسے انسان کو ہم اپنا حاکم تسلیم کریں! اصل بات یہ ہے کہ یہ شخص ہم پر فضیلت حاصل کرنا چاہتا ہے - یعنی ایسا خلیفہ جو ساری جماعت کی راہنمائی کرے - اور جس کا حکم سب مانیں انسانیت اور حریت کے خلاف ہے - چنانچہ دیکھ لو - جب اللہ تعالیٰ نے نسلِ انسانی کو آدمؑ کی اطاعت اور اُس کی کامل فرمانبرداری کا حکم دیا تو اُس وقت بھی حرّیت کے نام پر ابلیس آدم کے مقابلہ میں کھڑا ہو گیا اور اُس نے کہا - اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّ خَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ (ص ع۵) میں آدمؑ کی اطاعت کس طرح کر سکتا ہوں - میں تو اِس سے بہت بہتر اور افضل ہوں - میرے اندر حرّیت اور آزادی کی آگ پائی جاتی ہے اور آدمؑ غلامانہ ذہنیت کا مالک ہے - وہ لوگ جو غلامی کو پسند کرتے ہیں اور اپنی حرّیت کی رُوح کو کچل دینا چاہتے ہیں وہ تو بیشک آدمؑ کی اطاعت کریں مگر میں اس کی اطاعت کرنے کیلئے تیار نہیں - یہی دھونی جو آجکل انارکسٹ کرتے رہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم دوسروں کی غلامی برداشت نہیں کر سکتے ہم بغاوت کریں گے اور اپنی آزادی کی رُوح کو برقرار رکھیں گے - چونکہ دنیا کا نظام اُسوقت تک قائم نہیں رہ سکتا جب تک باہم مادۂ تعاون نہ پایا جائے اور اعلیٰ حکام کی اطاعت کا جُوا اپنی گردن پر نہ رکھا جائے اِس لئے ایسے لوگ جو باغیانہ رُوح اپنے اندر رکھتے ہیں مذہبی نقطۂ نگاہ سے بھی قابلِ نفرت سمجھے جاتے ہیں - اور دنیوی حکومتیں بھی ایسے لوگوں کو گرفتار کر کے انہیں مختلف قسم کی سزائیں دیتی ہیں - رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں بھی اِس قسم کی حرّیت کا نعرہ بلند کرنے والوں نے اسلام کی شدید مخالفت کی جن میں خود رسول کریمؐ

اَلْجِنَّةُ

صلی اللہ علیہ وسلم کے بعض اپنے رشتہ دار بھی شامل تھے چنانچہ ابولہب جو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا ایک چچا تھا۔ اُس کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ تَبَّتْ یَدَآ اَبِیْ لَهَبٍ وَّتَبَّ۔ یعنی آگ کے شعلوں کا باپ ہلاک ہو گیا۔ اِس جگہ اُسے آگ کے شعلوں کا باپ اِسی لئے قرار دیا گیا ہے کہ وہ ناری طبیعت رکھنے والے لوگوں کا سردار تھا۔ اور وہ اور اُس کے ساتھی اِسی لئے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کے لئے تیار نہیں ہوتے تھے کہ آپ کو مانا تو انہیں اپنی سرداری چھوڑ کر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی غلامی اختیار کرنی پڑے گی۔ اور یہ چیز اُن کے لئے ناقابل برداشت تھی۔

حضرت نوح علیہ السلام کے زمانہ میں بھی ایسا ہی ہؤا۔ نوح علیہ السلام نے خدا تعالیٰ کی توحید کی تعلیم پیش کی تو لوگوں نے اسکو ماننے سے انکار کر دیا اور انہوں نے دوسروں کو بھی یہ کہہ کر بہکانا شروع کر دیا کہ یہ تو تمہارے جیسا ایک انسان ہے اِس کے اندر کونسی ایسی خصوصیت پائی جاتی ہے جس کی بنا پر اس کی اطاعت کی جائے۔ اِس نے جو یہ ساری قوم کے خلاف ایک نئی آواز بلند کرنی شروع کر دی ہے تو اس کا مقصد محض اتنا ہے کہ اس کے نتیجہ میں کچھ لوگ اس کے گرد جمع ہو جائیں اور اِس کا جتھہ مضبوط ہو جائے اور یہ ہم پر حکومت کرنے لگ جائے۔ مگر ہم اس کو کبھی برداشت نہیں کریں گے۔ ہم مٹ جائیں گے مگر اپنی حرّیت اور آزادی میں کوئی فرق نہیں آنے دیں گے۔

پھر انہوں نے اس سے بھی آگے قدم بڑھایا اور کہا کہ اگر آسمان سے فرشتے ہم پر حاکم بنا کر بھیجے جاتے تو ہم مان بھی لیتے لیکن انسان نبی یا انسان خلیفہ کو ہم ماننے کے لئے تیار نہیں۔ کیونکہ اس کو ہم پر کوئی فضیلت حاصل نہیں یہ ایک عجیب بات ہے کہ باوجود اس کے کہ شروع سے ہی خدا تعالےٰ کے انبیاء خدائی توحید کا وعظ کرتے چلے آئے ہیں۔ اُن کے دشمنوں کا ہمیشہ یہ اعتراض رہا ہے کہ ہدایت کیلئے انسان سے بالا کوئی وجود آنا چاہیئے لیکن باوجود اس اعتراض کے خدا ہمیشہ انسانوں کو ہی لوگوں کی ہدایت کے لئے بھیجتا رہا۔ کیونکہ اگر رسول کسی غیر جنس سے ہو تو وہ بنی نوع انسان کیلئے نمونہ نہیں بن سکتا جس طرح ایک انسان شیر کی نقل نہیں کر سکتا اور نہ شیر انسان کی نقل کر سکتا ہے۔ اور یا پھر وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَاَنْزَلَ مَلٰٓئِكَةً کے ایک یہ معنے بھی ہو سکتے ہیں کہ اس کے ساتھ فرشتے کیوں نہیں اُترے کہ اُن کو دیکھ کر ہم سمجھ جاتے کہ یہ سچا ہے اس میں اُن کی اس جہالت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ انہوں نے پہلے لوگوں سے یہ سُن کر کہ نبیوں پر فرشتے اُترا کرتے تھے یہ سمجھ لیا کہ وہ دوسروں کو بھی نظر آتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے کہنا شروع کر دیا کہ اگر اللہ تعالےٰ نے ہمیں ہدایت دینا چاہتا تو جس طرح پہلے لوگوں کے ساتھ فرشتے آیا کرتے تھے اِسی طرح اس کے ساتھ بھی فرشتے اُترتے۔ ایسا خاموشی سے آنے والا نبی تو ہم نے کبھی نہیں سُنا۔ مگر ان مخالفتوں کے باوجود ہمیشہ انبیاء کی تعلیم ہی کامیاب ہوتی رہی ہے۔ کیونکہ ماننے کے قابل وہی بات ہوتی ہے جو خدا تعالےٰ کی طرف سے آئے۔ اور وہ جس وجود میں بھی انسان کو آواز دے اُس کا فرض ہے کہ اُس کی سُنے اور غلط حرّیت اور مادر پدر آزادی کو اپنے لئے لعنت کا طوق سمجھے۔

پھر فرماتا ہے کہ جب نوحؑ کے مخالفوں نے دیکھا کہ ہمارے اِن حرّیت کے بلند بانگ دعاوی کے باوجود کچھ نہ کچھ لوگ اِس کی جماعت میں شامل ہوتے جا رہے ہیں تو انہوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ اِنْ هُوَ اِلَّا رَجُلٌۢ بِهٖ جِنَّةٌ کہ اِس آدمی کے ساتھ تو کوئی جنّوں کا تعلق ہے مذہبی آدمی نہیں۔ اِس کی کامیابی کو محض جنّوں کی کامیابی کہنا چاہیئے۔ خدائی نصرت نہیں کہنا چاہیئے۔ فَتَرَبَّصُوْا بِهٖ حَتّٰى حِيْنٍ۔ پس کچھ دن

فَاَوْحَيْنَآ اِلَيْهِ اَنِ اصْنَعِ الْفُلْكَ بِاَعْيُنِنَا وَ

پس ہم نے اُس کی طرف وحی کی کہ (جس) کشتی (کا ہم نے حکم دیا ہے اُس) کو ہماری آنکھوں کے سامنے اور ہماری

وَحْيِنَا فَاِذَا جَآءَ اَمْرُنَا وَ فَارَ التَّنُّوْرُ فَاسْلُكْ

وحی کے مطابق بنا۔ پس جب ہمارا حکم آ جائے اور زمین کا سوتا پھوٹ پڑے تو اُس (کشتی) میں ہر ایک

فِيْهَا مِنْ كُلٍّ زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ وَ اَهْلَكَ اِلَّا مَنْ

جانور میں سے (جس کا ہم حکم دیں) ایک ایک جوڑا رکھ لے اور اپنے رشتہ داروں کو بھی اُن کے سوا جن کے خلاف

انتظار کرو اور دیکھو کہ اس کا کیا انجام ہوتا ہے۔ یہ بھی وہی ہتھیار ہے جو ہر زمانہ میں انبیاء کے مخالفین استعمال کرتے چلے آئے ہیں۔ یہاں تک کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی مخالفین نے مجنون کہا۔ اسی طرح بعض لوگ کہتے ہیں کہ آپ پر جن آتے تھے۔ عیسائی پادری جب دیکھتے ہیں کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مخالفین نے مجنون کہا تو وہ خوشی سے پھولے نہیں سماتے اور کہتے ہیں کہ اگر آپ میں کوئی دماغی نقص نہیں تھا تو دشمن نے آپ کو مجنون کیوں کہا؟ وہ اِس امر کو بھول جاتے ہیں کہ خود مسیحؑ جن کو وہ ابن اللہ قرار دیتے ہیں اُن کو بھی لوگوں نے دیوانہ اور مجنون قرار دیا تھا۔ چنانچہ انجیل میں لکھا ہے کہ:-

"اِن باتوں کے سبب یہودیوں میں پھر اختلاف ہُوا۔ اُن میں بہتیرے تو کہنے لگے کہ اِس میں بدرُوح ہے (یعنی اِس پر جن آتے ہیں) اور وہ دیوانہ ہے۔ تم اُس کی کیوں سُنتے ہو۔" (یوحنا باب ۱۰ آیت ۱۹، ۲۰)

پھر پولوس کو وہ رسول قرار دیتے ہیں اور عہد نامہ جدید بتاتا ہے کہ اُس کو بھی دیوانہ قرار دیا گیا۔ چنانچہ لکھا ہے:-

"جب وہ اِس طرح جواب دہی کر رہا تھا تو فیتس نے بڑی آواز سے کہا۔ اے پولوس! تو دیوانہ ہے۔ بہت علم نے تجھے دیوانہ کر دیا ہے۔"

(اعمال باب ۲۶۔ آیت ۲۴)

اب اگر لوگوں کے دیوانہ اور مجنون کہنے کی وجہ سے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں کوئی دماغی نقص تسلیم کرنا جائز ہے تو عیسائی کیوں اپنے مسیح کو بھی مجنون نہیں کہتے اور کیوں پولوس کو بھی دیوانہ قرار نہیں دیتے۔ اور اگر مسیح لوگوں کے مجنون کہنے کی وجہ سے واقعہ میں کوئی دماغی نقص اپنے اندر رکھتا تھا تو وہ دنیا کا نجات دہندہ کس طرح ہو گیا۔

حقیقت یہ ہے کہ دنیا اگر انبیاء کو مجنون کہتی ہے تو صرف اِس لئے کہ وہ ایسی تعلیم پیش کرتے ہیں جو زمانہ کی رَو کے بالکل خلاف ہوتی ہے اور جس کو انسانی عقل نہیں بنا سکتی۔ علماء اُس کو سُنتے ہیں تو مخالفت میں کھڑے ہو جاتے ہیں۔ امراء سُنتے ہیں تو طیش میں آ جاتے ہیں۔ عوام سُنتے ہیں تو وہ بھڑک اُٹھتے ہیں۔ مگر چونکہ وہ خدا تعالیٰ کی طرف سے مؤیّد ہوتے ہیں اور اُن کی پُشت پر اللہ تعالیٰ کھڑا ہوتا ہے۔ وہ نہ مخالفت کی پرواہ کرتے ہیں اور

سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ مِنْهُمْ ۚ وَلَا تُخَاطِبْنِي فِي

ہمارا حکم پہلے اُتر چکا ہے سوار کر دے۔ اور جنہوں نے ظلم کیا ہے اُن کے متعلق

الَّذِينَ ظَلَمُوا ۚ إِنَّهُمْ مُّغْرَقُونَ ﴿۲۸﴾ فَإِذَا اسْتَوَيْتَ أَنْتَ

مجھ سے کوئی بات نہ کر۔ کیونکہ وہ تو ضرور غرق کئے جائیں گے۔ پس جب تُو اور تیرے ساتھی کشتی میں

وَمَنْ مَّعَكَ عَلَى الْفُلْكِ فَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِي

اچھی طرح بیٹھ جائیں تو تم سے ہر ایک کہے کہ سب تعریف اللہ ہی کے لئے ہے جس نے

نَجّٰنَا مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِينَ ﴿۲۹﴾ وَقُلْ رَّبِّ أَنْزِلْنِي

ہمیں ظالموں کی قوم سے نجات دی۔ تُو (کشتی سے اُترتے وقت) کہہ کہ اے میرے رب! تو مجھے (اس کشتی سے)

دشمنوں کی ایذاء رسانیوں سے گھبراتے ہیں اور برابر اپنے کام میں مشغول رہتے ہیں۔ لوگ حیرت اور استعجاب سے اُن کو دیکھتے ہیں۔ مگر بجائے یہ سمجھنے کے کہ زمین و آسمان کا خدا اُن کی پُشت پر ہے وہ یہ خیال کرنے لگ جاتے ہیں کہ یہ دیوانہ ہے۔ یعنی جس طرح دیوانہ اپنا کام کئے جاتا ہے اور لوگوں کی ہنسی یا مخالفت کی کوئی پرواہ نہیں کرتا اِسی طرح وہ بھی کسی مصیبت کی پرواہ نہیں کرتے اور خدا تعالیٰ کی توحید کو پھیلاتے چلے جاتے ہیں۔ جب مکّہ کے لوگوں نے دیکھا کہ ہم نے محمد رسول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) کو توحید کے وعظ سے باز رکھنے کے لئے ہر قسم کی تدابیر اختیار کیں مگر یہ پھر بھی اپنے کام سے نہیں رُکا اور اُس نے بتوں کو بُرا بھلا کہنا نہیں چھوڑا تو انہوں نے کہنا شروع کر دیا کہ یہ شخص تو مجنون ہے اللہ تعالیٰ اُن کے اِس اعتراض کا جواب دیتے ہوئے فرماتا ہے کہ نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُوْنَ ۔ مَآ اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُوْنٍ (سورۃ قلم ع) یعنی ہم دوات اور قلم کو اور اُن تمام تحریروں کو جو دوات اور قلم سے لکھی گئی ہیں اِس بات کی شہادت کے طور پر پیش کرتے ہیں کہ تُو اپنے رب کے فضل سے مجنون نہیں ہے یعنی قلم اور دوات سے جسقدر علوم احاطۂ تحریر میں آئے ہیں یا آئندہ زمانوں میں آئیں گے اگر ان سب کو جمع کر لیا جائے اور پھر اُن کا تیرے علوم کے ساتھ مقابلہ کیا جائے تو دُنیا کو معلوم ہو گا کہ تُو اُن سے بہت زیادہ علوم پھیلا رہا ہے۔ پس اگر اور لوگ ادنیٰ اور معمولی علوم پھیلانے کی وجہ سے اعلیٰ درجہ کے موجد اور سائنس دان اور فلاسفر اور فقیہہ اور عالم کہلا سکتے ہیں تو تُو اُن سے ہزاروں گنا زیادہ علوم پھیلانے کی وجہ سے مجنون کس طرح ہو گیا۔

غرض انبیاء کے مخالفین کا یہ ایک پُرانا حربہ ہے جس سے وہ ہمیشہ کام لیتے رہے ہیں۔ یا یُوں کہو کہ جس طرح ڈوبتا ہُوا آدمی سہارے کیلئے تنکوں پر بھی ہاتھ ڈال دیتا ہے اِسی طرح وہ بھی مجنون کہہ کر الٰہی سلسلوں کی ترقی کو روکنا چاہتے ہیں مگر آخر خدا کے رسول ہی کامیاب ہوتے ہیں اور مخالفین مجنون کہنے والے ناکامی اور نامرادی کا مُنہ دیکھتے ہیں۔

مُنۡزَلًا مُّبٰرَكًا وَّاَنۡتَ خَيۡرُ الۡمُنۡزِلِيۡنَ ﴿۳۰﴾ اِنَّ فِيۡ

(ایسی حالت میں) اُتار کہ مجھ پر کثرت سے برکتیں نازل ہو رہی ہوں اور مجھے (اس دُعا کی بھی کیا ضرورت ہے جبکہ) تمام اُتارنے والوں سے

ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ وَّاِنۡ كُنَّا لَمُبۡتَلِيۡنَ ﴿۳۱﴾

تیرا وجود بہتر ہے۔ اِس میں بہت سے نشان ہیں۔ اور ہم یقیناً بندوں کا امتحان لینے والے ہیں ۔؎

اَلتَّنُّوۡرُ

؎ **حل لغات** :- اَلتَّنُّوۡرُ کے معنے ہیں۔ الكَانُوْنَ يُخْبَزُ فِيْهِ۔ تنور جس میں روٹیاں پکاتے ہیں۔ كُلُّ مَفْجَرِ مَاءٍ۔ ہر وہ جگہ جہاں سے پانی پھوٹ رہا ہو یعنی چشمہ۔ مَحْفَلُ مَاءِ الْوَادِيْ۔ پہاڑی وادی کا پانی جمع ہونے کی جگہ۔ (اقرب) نیز تنور کے ایک معنے وَجْهُ الْاَرْضِ یعنی سطح زمین کے بھی ہیں (تاج)

تفسیر :- جب حضرت نوح علیہ السلام کی مخالفت اپنی انتہا کو پہنچ گئی تو اللہ تعالیٰ نے اُن کی طرف وحی کی کہ ہماری آنکھوں کے سامنے اور ہماری وحی کے مطابق ایک کشتی بنا۔ اسجگہ جو بِاَعْيُنِنَا کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں لُغت کے لحاظ سے اس کے یہ معنے ہیں کہ میری حفاظت میں کشتی بنا۔ کیونکہ عَيْنٌ کے معنے عربی زبان میں جہاں آنکھ کے ہیں وہاں اِس کے ایک معنے حفاظت کے بھی ہیں۔ چنانچہ عربی زبان میں جب یہ کہا جائے کہ اَنْتَ عَلٰى عَيْنِيْ تو اس کے معنے یہ ہوتے ہیں کہ تُو میری حفاظت میں ہے اور میں تیری عزت کرتا ہوں (اقرب) اِسی طرح فُلَانٌ بِعَيْنِيْ کے یہ معنے ہوتے ہیں کہ اَحْفَظُهٗ وَاُرَاعِيْهِ کہ میں اُس کی حفاظت کرتا ہوں اور اُس کی رعایت ملحوظ رکھتا ہوں (اقرب) مفرداتِ امام راغبؒ میں بھی لکھا ہے کہ وَاصْنَعِ الْفُلْكَ بِاَعْيُنِنَا کے یہ معنے ہیں کہ وَاصْنَعِ الْفُلْكَ بِحِفَاظَتِيْ یعنی تو میری حفاظت میں کشتی بنا اور اسی سے عربی زبان کا یہ محاورہ ہے کہ عَيْنُ اللّٰهِ عَلَيْكَ اور اس کے معنے یہ ہوتے ہیں کہ تُو خدا تعالیٰ کی حفاظت میں ہے (مفردات) پس اِصْنَعِ الْفُلْكَ بِاَعْيُنِنَا میں اِس طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ کہ جب تم کشتی بنانے لگو گے تو کفار روکیں گے مگر ہم تمہاری حفاظت کریں گے اور تم کامیاب ہو جاؤ گے۔ اور وَحْيِنَا سے اِس طرف اشارہ کیا کہ اصل چیز دِل کا تقوٰی ہے جو انسان کو عذاب الٰہی سے بچاتا ہے پس تُو روحانی کشتی بھی تیار کرو جو وحیٔ الٰہی کی اِتباع سے تیار ہُوا کرتی ہے اور جس میں بیٹھنے والے خدا تعالیٰ کے عذاب سے محفوظ رہا کرتے ہیں۔

اسجگہ کشتی سے مراد ظاہری کشتی بھی ہو سکتی ہے مگر سیاق و سباق سے معلوم ہوتا ہے کہ اِس سے مُراد حضرت نوح علیہ السلام کی جماعت ہے جس کے بننے میں کافر روک تھے۔ کیونکہ درحقیقت نبی کی جماعت ہی ہوتی ہے جس میں شامل ہو کر لوگ نجات پاتے ہیں۔ اور یہ جو فرمایا کہ جب ہمارا حکم آ جائے اور تنور جوش میں آ جائے تو اس کے متعلق مفسّرین کہتے ہیں کہ یہ حضرت آدمؑ کا تنور تھا مگر یہ بات محض قصّوں کی محبت کا نتیجہ ہے ورنہ آدمؑ کا اسجگہ کوئی ذکر نہیں۔ تنور کے معنے عربی زبان میں ایک تو اُس چیز کے ہوتے ہیں جس میں روٹی لگائی جاتی ہے۔ اور تنور کے معنے سطح زمین کے بھی ہوتے ہیں۔ چنانچہ تاج العروس میں لکھا ہے۔ اَلتَّنُّوْرُ: وَجْهُ الْاَرْضِ۔ تنور کے معنے سطح زمین کے بھی ہُوا کرتے ہیں۔ اِسی طرح تنور کے معنے چشمہ کے بھی ہوتے ہیں اور تنور اُس پہاڑی وادی کو بھی کہتے ہیں

جہاں پانی جمع ہو جائے (اقرب) لیکن ابو حیان لکھتے ہیں کہ فَارَ التَّنُّوْرُ کا استعمال مجازی رنگ میں بھی ہو سکتا ہے جیسے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک موقعہ پر جب کہ جنگ خوب تیز ہو گئی فرمایا کہ حَمِیَ الْوَطِیْسُ تنور گرم ہو گیا۔ حالانکہ آپ کی مراد یہ تھی کہ جنگ خوب تیز ہو گئی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ فار اور حمی ایک ہی معنے رکھتے ہیں جیسے قرآن کریم میں بھی آتا ہے کہ سَمِعُوْا لَهَا شَهِيْقًا وَّ هِيَ تَفُوْرُ (ملک ع) یعنی کفار جب جہنم میں ڈالے جائیں گے تو وہ اُس میں ایک بڑی چیخ سُنیں گے اور وہ بڑے جوش میں آرہی ہو گی۔ پس اُن کے نزدیک فَارَ التَّنُّوْرُ کے الفاظ مجازی رنگ میں استعمال ہوئے ہیں اور اُس کے معنے یہ ہیں کہ پانی چاروں طرف پھیل گیا۔ اِن دونوں معنوں کو مدِّنظر رکھتے ہوئے اس آیت کا یہ مفہوم ہے کہ جب ہمارے عذاب کا وقت آیا تو چشموں کی جگہ سے پانی پھوٹ پڑا۔ یا سطح زمین پر پانی بہنے لگا اور چاروں طرف پانی ہی پانی ہو گیا۔ یہ عذاب جیسا کہ قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے صرف زمینی چشموں کے پھوٹنے کی وجہ سے نہیں آیا۔ بلکہ پانی کا اصل سرچشمہ بادل تھے یعنی اُس وقت اتنے زور سے بارش ہوئی کہ اُس سے چاروں طرف پانی ہی پانی ہو گیا۔ اور جس طرح کثرت بارش کی وجہ سے زمین کے سوتے بھی پھوٹ پڑتے ہیں اور دریاؤں کا پانی بھی اُچھل جاتا ہے اسی طرح اس وقت زمین کے سوتے بھی جاری ہو گئے۔ اور آسمانی اور زمینی پانی نے مل کر اُن لوگوں کو تباہ کر دیا چنانچہ اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں ایک اور مقام پر فرماتا ہے کہ فَفَتَحْنَآ اَبْوَابَ السَّمَآءِ بِمَآءٍ مُّنْهَمِرٍ ۖ وَّ فَجَّرْنَا الْاَرْضَ عُيُوْنًا فَالْتَقَى الْمَآءُ عَلٰٓى اَمْرٍ قَدْ قُدِرَ (سورۃ قمر ع) یعنی ہم نے بادل کے دروازے ایک جوش سے بہنے والے پانی کے ذریعہ کھول دیئے اور زمین میں بھی ہم نے چشمے پھوڑ دیئے۔ پس آسمان کا پانی زمین کے پانی کے ساتھ ایک ایسی بات کیلئے اکٹھا ہو گیا جسکا فیصلہ کیا جا چکا تھا۔ یعنی آسمانی پانی زمینی پانی سے مل کر دُنیا کو تباہ کرنے لگا۔ اسی طرح سورۂ ہود میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جب عذاب کا وقت پورا ہو گیا اور جس تباہی کا فیصلہ کیا جا چکا تھا وہ آگئی تو ہم نے کہا کہ يٰٓاَرْضُ ابْلَعِيْ مَآءَكِ وَيٰسَمَآءُ اَقْلِعِيْ وَغِيْضَ الْمَآءُ وَقُضِيَ الْاَمْرُ وَاسْتَوَتْ عَلَى الْجُوْدِيِّ وَقِيْلَ بُعْدًا لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ (ہود ع) یعنی اس کے بعد زمین سے کہہ دیا گیا کہ اے زمین: تو اب اپنے پانی کو نگل جا اور آسمان سے بھی کہہ دیا گیا کہ اے آسمان! اب تو برسنے سے تھم جا۔ اور پانی کو جذب کر دیا گیا اور یہ معاملہ ختم کر دیا گیا۔ اور وہ کشتی جودی پہاڑ پر جا کر ٹھہر گئی اور کہہ دیا گیا کہ اے عذاب کے فرشتو! ظالم لوگوں کے لئے ہلاکت مقدر کر دو۔ پس آیاتِ قرآنیہ سے یہ امر ثابت ہے کہ اُسوقت آسمان سے بھی پانی برسا اور زمین کے سوتے بھی پھوٹ پڑے جس طرح کہ پہاڑی علاقوں میں جب شدید بارش ہوتی ہے تو اونچے پہاڑوں پر پڑی ہوئی برف کے گھلنے کی وجہ سے چشموں کے پانیوں میں بھی زیادتی آجاتی ہے۔ اور قرآن کریم سے بھی اور تاریخ سے بھی ثابت ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام پہاڑی علاقہ میں رہتے تھے۔ اسی لئے جب حضرت نوحؑ نے اپنے بیٹے سے کہا کہ اے بیٹے: ہمارے ساتھ سوار ہو جا۔ اور کافروں کے ساتھ مت شامل ہو تو اُن کے بیٹے نے جواب دیا۔ سَاٰوِيْٓ اِلٰى جَبَلٍ يَّعْصِمُنِيْ مِنَ الْمَآءِ (ہود ع) میں ابھی کسی پہاڑ پر جا ٹھہروں گا جو اس پانی سے مجھے بچا لیگا۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کسی پہاڑی وادی میں رہا کرتے تھے۔ اور ایسی جگہ پر پانی کا یکدم اونچا ہو جانا اور غیر معمولی طور پر بلند ہو جانا بالکل قرینِ قیاس ہے۔ اُن کے بیٹے نے خیال کیا

کہ میں آسانی سے تیر کر کسی پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ جاؤں گا۔ اور عذاب سے محفوظ ہو جاؤنگا۔

غرض حضرت نوح علیہ السلام کو بتایا گیا کہ جب آسمان سے شدید بارش شروع ہو جائے یہاں تک کہ زمین کے سوتے بھی پھوٹ پڑیں اور تمام زمین جھیل بن جائے تو اس کشتی میں ہر قسم کے جوڑے اور اپنے اہل کو داخل کر دیجیو عربی زبان میں زوج کے معنے کُلُّ وَاحِدٍ مَعَهُ آخَرُ مِنْ جِنْسِهٖ کے ہوتے ہیں یعنی ہر وہ چیز جس کے ساتھ اُس کی جنس میں سے ایک اَور وجود بھی ہو۔ پس زوج کے معنے ساتھ کے جوڑے یعنی نر و مادہ کے ہوتے ہیں۔ نہ کہ دو دو چیزوں کے۔ اسی وجہ سے اثنین کا لفظ لگا کر واضح کر دیا گیا ہے کہ زوجین سے مراد دو ہم جنس افراد ہیں نہ کہ دو دو جوڑے اور مراد یہ ہے کہ ہر قسم کے نر و مادہ اس ظاہری کشتی میں یا جماعت میں داخل کیجیو۔ اور اپنے اہل کو بھی داخل کیجیو سوائے اُن کے جن کے خلاف خدا کا فیصلہ ہو چکا ہے۔

اس جگہ جو اللہ تعالیٰ نے مِنْ كُلٍّ زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ فرمایا ہے تو اس کے یہ معنے نہیں کہ دنیا کے ہر جانور کے جوڑے لے لے۔ ورنہ ماننا پڑیگا کہ اربوں ارب حشرات الارض اور کروڑوں کروڑ درندے پرندے اور جانور سب حضرت نوحؑ نے اپنی کشتی میں جمع کر لئے تھے۔ اس صورت میں تو انہیں اتنی بڑی کشتی بنانی پڑتی جو اُن کے ملک میں بھی سما نہ سکتی اور یہ عقل کے خلاف ہے۔ پس اسجگہ کُلّ کے معنے سب کچھ کے نہیں بلکہ ہر ضروری چیز کے ہیں۔ جیسے قرآن کریم میں ایک دوسرے مقام پر ملکہ سبا کے متعلق آتا ہے کہ اُوْتِيَتْ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ (نمل ع ۲) اُسے ہر ایک چیز دی گئی تھی۔ اب ہر ایک چیز سے یہ مراد نہیں تھی کہ حضرت سلیمانؑ اور اُن کا لشکر بھی اُسے ملا ہوا تھا۔ اور ہندوستان اور چین اور امریکہ بھی اُسے ملے ہوئے تھے بلکہ مراد یہ تھی کہ ہر چیز جس کی اُسے ضرورت ہے اُسے ملی ہوئی ہے۔

اسجگہ بھی مِنْ كُلٍّ زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ سے یہی مُراد ہے۔ کہ ہر وہ جاندار جس کی تجھے ضرورت ہے اُسکے نر و مادہ ساتھ رکھ لے۔ نہ یہ کہ ہاتھی اور شیر اور چیتے کو بھی رکھ لے۔ اور اثْنَيْنِ کا لفظ تاکید کے لئے ہے کوئی نئے معنے نہیں دیتا۔ مطلب یہ ہوا کہ نر و مادہ جو مل کر دو بنتے ہیں۔ اور جن سے آئندہ نسل چلتی ہے۔

اگر کشتی سے اسجگہ جماعت مُراد لی جائے تو یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ ظاہری کشتی کی صورت میں تو یہ معنے لئے جا سکتے ہیں کہ ہر قسم کے ضروری جانور نر و مادہ کی صورت میں اپنے پاس رکھ لے۔ لیکن جماعت کی صورت میں کیا معنے ہونگے؟ سو یاد رکھنا چاہیئے کہ جماعت کی صورت میں اس سے مراد ہر قسم کے رُوحانی لوگ ہونگے یعنی اپنی جماعت میں ہر قسم کے لوگوں کو داخل کرو۔ غریب بھی اور امیر بھی اور درمیانہ درجہ کے بھی۔ اور اس کی پرواہ نہ کرو کہ لوگ ان کو ذلیل سمجھتے ہیں یا کیا سمجھتے ہیں۔ اگر کہا جائے کہ جماعت میں داخل کرنا تو حضرت نوحؑ کے اختیار میں نہیں تھا یہ تو لوگوں کے اپنے اختیار میں تھا تو اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت نوحؑ کوشش تو کر سکتے تھے ہم دیکھتے ہیں کہ بعض لوگ صرف امراء کی طرف توجہ کرتے ہیں بعض غرباء کی طرف توجہ کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ بعض درمیانہ درجہ کے لوگوں کی طرف توجہ رکھتے ہیں بعض علماء کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ بعض پیشہ وروں کی طرف میلان رکھتے ہیں بعض زمینداروں کی طرف توجہ کرتے ہیں اور بعض تاجروں کی طرف توجہ کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت نوحؑ کو بتایا کہ اگر جماعت کو پھیلانا مقصود ہے تو ہر طبقہ اور ہر قسم کے ایسے لوگوں کی طرف توجہ کرو جو آپس میں تعاون کی رُوح رکھتے ہوں یعنی جوڑوں کی مانند ہوں۔ اور یہ جو زوجین فرمایا تو جماعت کی صورت میں اس کے معنے نر و مادہ کے نہیں ہونگے بلکہ مراد یہ ہوگی کہ ایسے لوگ جو ایک دوسرے سے اُنس اور

محبت رکھتے ہوں اور تعاون کرنے والے ہوں چنانچہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی مدینہ جاکر ایک ایک مہاجر اور ایک ایک انصاری کو بھائی بھائی بنا دیا تھا۔ گویا وہ ندجین ہو گئے تھے۔ یہی نصیحت حضرت نوح علیہ السلام کو کی گئی ہے۔ اور کہا گیا ہے کہ اپنی جماعت میں اخوت پیدا کرو۔ اور اپنے ماننے والوں کو جو ہر طبقہ کے لوگ ہوں آپس میں بھائی بھائی بناؤ۔ یا عورتوں کو بہنیں بناؤ۔ پھر اُن سب کو لے کر ایک جگہ پر رہو۔ تاکہ اللہ تعالیٰ کی نصرت تمکو اور تمہارے ساتھیوں کو حاصل ہو اور خدا کا عذاب تمہارے دشمنوں پر نازل ہو اگر تم دشمن کے ساتھ مل کر رہوگے تو تمہارے دشمن پر بھی خدا عذاب نہیں بھیجیگا۔ جیسا کہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ فِيْهِمْ وَمَا كَانَ اللّٰهُ مُعَذِّبَهُمْ وَهُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ (انفال آیت ۳۴) یعنی اللہ انہیں اس حالت میں کبھی عذاب نہیں دے سکتا۔ جب تک تو اُن میں ہو۔ اور نہ اللہ تعالیٰ اُنکو ایسی حالت میں عذاب دے سکتا ہے جبکہ وہ استغفار کر رہے ہوں۔ اِس آیت میں جو اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام کو حکم دیا کہ اپنے اہل کو بھی کشتی میں بٹھالے تو اس سے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی تعریف نکلتی ہے۔ کیونکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے تمام انبیاء کا مثیل قرار دیا ہے اور آپؐ حضرت نوحؑ کے بھی مثیل تھے۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اِس پر اس طرح عمل کیا کہ ہجرت میں حضرت ابوبکرؓ کو ساتھ رکھا جس کے معنے یہ ہیں کہ حضرت ابوبکرؓ آپ کے اہل میں شامل تھے۔ پس جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ حضرت ابوبکرؓ نعوذ باللہ منافق اور زیرِ عتاب تھے وہ غلط کہتے ہیں اور اگر ایسا ہوتا تو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم اس آیت کے خلاف اُنکو ہجرت میں ساتھ کیوں رکھتے!

پھر فرماتا ہے۔ وَلَا تُخَاطِبْنِيْ فِي الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا اِنَّهُمْ مُّغْرَقُوْنَ۔ ظالموں کے متعلق مجھسے کوئی بات نہ کر کیونکہ وہ ضرور غرق کئے جائیں گے۔ اِس میں اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے کہ ایک وقت ایسا بھی آتا ہے جبکہ کفار کی تباہی کا آخری فیصلہ کر دیا جاتا ہے۔ اُسوقت اُن کے لئے دُعا کرنے کی بھی نبی کو اجازت نہیں ہوتی۔ جیسا کہ قرآن کریم میں حضرت لوط علیہ السلام کی قوم کی تباہی کے ذکر میں بیان کیا گیا ہے کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو یہ خبر ملی کہ قوم لوطؑ کی تباہی کا فیصلہ کیا جا چکا ہے اور اُس کے ساتھ ہی انہیں حضرت اسحاقؑ اور یعقوبؑ کی پیدائش کی بھی خوشخبری ملی تو يُجَادِلُنَا فِيْ قَوْمِ لُوْطٍ (ہود ع) حضرت ابراہیم علیہ السلام قوم لوط کے متعلق اللہ تعالیٰ سے جھگڑنے لگے۔ یعنی انہوں نے دُعا کرنی شروع کر دی کہ الٰہی اس قوم کو بچا لے۔ اِس پر اللہ تعالیٰ نے انہیں الہاماً فرمایا کہ يَا اِبْرَاهِيْمُ اَعْرِضْ عَنْ هٰذَا اِنَّهٗ قَدْ جَآءَ اَمْرُ رَبِّكَ وَاِنَّهُمْ اٰتِيْهِمْ عَذَابٌ غَيْرُ مَرْدُوْدٍ۔ یعنی اے ابراہیم! تو اب اِس سفارش سے رُک جا۔ کیونکہ تیرے رب کا آخری حکم آچکا ہے اور ان کفار کی ایسی حالت ہے کہ ان پر نہ ٹلنے والا عذاب آکر رہے گا۔ گویا ایک مقام ایسا آیا۔ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو دُعا کرنے سے بھی منع کر دیا گیا۔ اِس آیت میں ظَلَمُوْا کا لفظ استعمال فرما کر اللہ تعالیٰ نے اس امر کی طرف بھی اشارہ فرمایا ہے کہ وہ بلاوجہ لوگوں کو عذاب سے ہلاک نہیں کیا کرتا بلکہ اُن کی ہلاکت اُن کے متواتر ظلموں کا نتیجہ ہوتی ہے۔ آج تک جسقدر قومیں دنیا میں ہلاک ہوئی ہیں محض اِس لئے ہلاک ہوئی ہیں کہ وہ ظالم بن گئی تھیں یعنی یا تو انہوں نے دینی احکام کو نظر انداز کر دیا یا دنیوی ترقی کے قوانین کو نظر انداز کر دیا تھا۔ دینی احکام کو نظر انداز کر دینے کے نتیجہ میں وہ شرعی عذاب کے مستحق ہوئے اور قوانین نیچر کے نظر انداز کر دینے کے نتیجہ میں وہ مختلف قسم کے طبعی عذابوں کا شکار ہوئے۔

مگر اللہ تعالیٰ کے بے مثال رحم کا یہ ثبوت ہے کہ باوجود لوگوں کے ظالم ہو جانے کے آج تک کوئی قوم بھی اُس وقت تک ہلاک نہیں ہوئی جب تک خدا تعالےٰ نے اپنے کسی رسول کے ذریعہ اُن پر حجت تمام نہ کر دی ہو۔ اور انہیں اُن کی غلطیوں پر متنبہ نہ کر دیا ہو۔ جس طرح نوحؑ کی قوم کو رات اور دن نصیحت کی گئی مگر وہ اپنی نافرمانیوں سے باز نہ آئے اور آخر اُن کی صف لپیٹ دی گئی۔

فَإِذَا اسْتَوَيْتَ أَنْتَ وَمَنْ مَّعَكَ عَلَى الْفُلْكِ فَقُلِ الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي نَجَّانَا مِنَ الْقَوْمِ الظَّالِمِينَ۔ فرماتا ہے تمہیں دشمنوں کے ظلموں سے بچا لینا میرا ایک بہت بڑا فضل ہے۔ اس لئے جب کشتی مکمل ہو جائے اور تُو اُس میں بیٹھ جائے۔ یا تیری جماعت مکمل ہو جائے اور سب سعید روحیں اُس میں داخل ہو جائیں تو اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ کہو اور خدا تعالیٰ کا شکر ادا کرو کہ تمہارا مشن پورا ہو گیا۔

بائبل بتاتی ہے کہ جب طوفان ختم گیا تو حضرت نوح علیہ السلام نے یہ معلوم کرنے کے لئے کہ زمین پر پانی کم ہوا ہے یا نہیں پہلے ایک کوّے کو اُڑایا۔ مگر چونکہ ابھی زمین پر پانی تھا۔ اس لئے وہ روزانہ کشتی میں واپس آتا رہا۔ چند دنوں کے بعد انہوں نے ایک کبوتری اُڑائی مگر اُسے زمین پر کوئی ایسی جگہ نہ ملی جہاں وہ تھوڑی دیر کے لئے بھی بیٹھ سکتی۔ اس لئے وہ بھی کشتی میں واپس آگئی۔ پھر سات دن اور انتظار کرنے کے بعد انہوں نے دوبارہ اس کبوتری کو اُڑا دیا۔ اور جب وہ شام کو واپس آئی تو "زیتون کی ایک تازہ پتی اُس کی چونچ میں تھی تب نوحؑ نے معلوم کیا کہ پانی زمین پر سے کم ہو گیا ہے"۔ (پیدائش باب ۸ آیت ۱۱)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ زیتون کی پتی کے ذریعہ حضرت نوح علیہ السلام کو یہ خوشخبری دی گئی تھی کہ تیرے دشمن ہمیشہ کے لئے مغلوب ہو گئے ہیں۔ جیسے سورۂ تین میں اللہ تعالےٰ نے زیتون کو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت میں پیش کیا ہے اور بتایا ہے کہ بیشک تم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے وطن سے نکال دو مگر یاد رکھو تم نوحؑ کے دشمنوں کی طرح تباہ کئے جاؤ گے۔ اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو زیتون کی پتی کے ذریعہ اُس کی کامیابی اور فتوحات کی خوشخبری دی جائیگی۔ چنانچہ تعطیر الانام میں لکھا ہے کہ اگر کوئی شخص رؤیا میں زیتون کے پتے دیکھے تو اُس کی تعبیر یہ ہوتی ہے کہ وہ عروۂ وثقیٰ کو مضبوطی سے پکڑ لیگا۔ پس زیتون کے ذریعہ آپ کو اپنی کامیابی کی خوشخبری ملنا بتاتا تھا کہ خدا تعالیٰ کی طرف سے آپ کو ایک ایسی جماعت عطا کی جائیگی جو اپنے ایمان میں مضبوط اور قربانی اور اطاعت میں حدِ کمال کو پہنچی ہوئی ہوگی۔ اور کسی قسم کی تکلیف اُسے جادۂ حق سے منحرف نہیں کر سکے گی۔ یہی خوشخبری حضرت نوحؑ کو زیتون کی پتی کے ذریعہ دی گئی۔ اور انہیں کشتی سے اُترنے سے پہلے پہلے اپنی جماعت کی آئندہ ترقی اور اُس کے ایمان کی مضبوطی کی خبر دی گئی۔ اور اللہ تعالیٰ نے انہیں ہدایت فرمائی کہ اُس خدا کا شکر ادا کرو جس نے اپنے فضل سے تمہارے مشن کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔

وَقُلْ رَّبِّ أَنْزِلْنِي مُنْزَلًا مُّبَارَكًا وَّأَنْتَ خَيْرُ الْمُنْزِلِينَ۔ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ وَّإِنْ كُنَّا لَمُبْتَلِينَ۔ اس جگہ اگر ظاہری کشتی مراد لی جائے تو اس کے معنے یہ ہونگے کہ تُو دُعا کرتا جا کہ یہ کشتی اُس جگہ ٹھہرے جو ہمارے لئے مبارک ہو۔ اور اگر جماعت مُراد ہو تو اس کے یہ معنے ہونگے کہ تُو دُعا کرتا رہ۔ کہ اے اللہ! میری جماعت اپنے مقصد کو پالے۔ اور ایسی ترقی اس کو حاصل ہو جو اس کے لئے دینی اور دنیوی طور پر مبارک ہو۔

قرآن کریم نے اُس مقام کا نام جہاں حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی ٹھہری تھی جُودی بتایا ہے (ھود ع ۴) لیکن بائیبل اُس کا نام ارارط بتاتی ہے ۔ چنانچہ پیدائش میں لکھا ہے :-

" ساتویں مہینہ کی سترھویں تاریخ کو
کشتی ارارط کے پہاڑوں پر ٹک گئی "
(پیدائش باب ۸ آیت ۴)

اِن دونوں ناموں کو دیکھنے سے بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں الگ الگ نام ہیں ۔ لیکن اگر غور کیا جائے تو اِن دونوں میں کوئی حقیقی اختلاف نہیں ۔ اصل بات یہ ہے کہ جُودؔ کے معنے عربی زبان میں رحمت اور احسان کے ہوتے ہیں ۔ پس اس مقام کا نام اللہ تعالیٰ نے جُودی رکھ کر اس طرف اشارہ کیا کہ وہ میری رحمت اور احسان کے ظہور کا مقام اور اس کی تجلّی گاہ تھا ۔ اور یہی معنے ارا راط کے بھی ہیں ۔ کیونکہ راط کے معنے ہوتے ہیں ۔ اُس نے پناہ چاہی ۔ اور ارا راط کے معنے ہوئے ۔ میں پناہ کی جگہ کو اپنے سامنے دیکھ رہا ہوں ۔ گویا بائیبل اُسے پناہ کی جگہ قرار دیتی ہے اور قرآن اُسے خدا تعالیٰ کی رحمت اور احسان کے ظہور کا مقام بتاتا ہے ۔ جہاں حضرت نوح علیہ السلام کو پناہ ملی اور دشمنوں کے شر سے محفوظ ہو گئے ۔ پس اِن دونوں ناموں میں کوئی حقیقی اختلاف نہیں ۔

اِس کے بعد اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ وَّ اِنۡ کُنَّا لَمُبۡتَلِیۡنَ ۔ یعنی یہ واقعہ ایک قصہ اور کہانی کے طور پر بیان نہیں کیا گیا ۔ بلکہ اِس میں بہت سے نشانات ہیں اور ہم یقیناً اپنے بندوں کا خیر اور شر کے ساتھ امتحان لینے والے ہیں یعنی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی قوم کے ساتھ بھی ایسے ہی حالات پیش آنے والے ہیں ۔ چنانچہ جس طرح نوحؑ کو اپنے دشمنوں کی اذیت کے نتیجہ میں اپنا وطن چھوڑنا پڑا اِسی طرح محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی مکہ والوں کی متواتر تکالیف اور ایذاء رسانیوں کے نتیجہ میں اپنا وطن چھوڑنا پڑا ۔ جس طرح نوحؑ کی کشتی جُودی پہاڑ پر جا کر ٹھہر گئی تھی جہاں نوحؑ کو پناہ ملی اور خدا تعالیٰ نے اُس پر اپنے انعامات کی بارش نازل کی اِسی طرح مدینہ بھی وہ جودی تھا جہاں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے صحابہؓ کی کشتی لنگر انداز ہوئی ۔ اور جس طرح زیتون کی پتّی کے ذریعے نوحؑ کو اُس کی جماعت کی آئندہ ترقی اور اُس کی ایمانی ترقی کی بشارت دی گئی اِسی طرح محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مدینہ میں اللہ تعالیٰ نے وہ انصار عطا فرمائے جو عروۃ الوثقیٰ کو مضبوطی سے پکڑنے والے تھے اور جنہوں نے اپنی ایمانی قوت کے ایسے شاندار مظاہرے کئے جن کو دیکھ کر انسان کا دل لذّت اور سرور سے بھر جاتا ہے ۔ مدینہ آنے کے بعد جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ خبر ملی کہ شام سے کفار کا ایک تجارتی قافلہ ابوسفیان کی سرکردگی میں آ رہا ہے اور وہ راستہ میں تمام عرب قبائل کو مسلمانوں کے خلاف بھڑکاتا آ رہا ہے ۔ تو آپ نے ضروری سمجھا کہ اُس کی شرارتوں کا سدِّ باب کیا جائے ۔ چنانچہ آپ صحابہؓ کی ایک جماعت کو اپنے ساتھ لے کر مدینہ سے چل پڑے ۔ چونکہ یہ ایک چھوٹا سا قافلہ تھا ۔ اِس لئے مسلمانوں نے اس کو کوئی زیادہ اہمیت نہ دی اور انہوں نے سمجھا کہ تھوڑے سے آدمی بھی اگر چلے گئے تو اس قافلہ کا آسانی کے ساتھ مقابلہ کیا جا سکتا ہے ۔ مگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر دے دی گئی کہ اصل مقابلہ اس تجارتی قافلہ سے نہیں بلکہ کفار کے ایک بڑے لشکر سے مقدّر ہے جو مکہ سے اِس قافلہ کی مدد کے لئے آ رہا ہے ۔ مگر ساتھ ہی اللہ تعالیٰ نے آپ کو اِس راز کے انکشاف کی ممانعت فرما دی ۔

کیونکہ اللہ تعالیٰ چاہتا تھا کہ صحابہؓ کا امتحان لے اور اُن کے اعلیٰ درجہ کے ایمان اور اُن کی قربانیوں کے اَن مٹ نقوش کو صفحۂ عالم پر ثبت کر دے اور اُن کا اخلاص لوگوں کیلئے ایک زندہ نمونہ کا کام دے جو آنے والی نسلوں کی مُردہ عروق میں بھی زندگی کا خون دوڑا دے۔ جب مدینہ سے کئی منزل دُور آپ پہنچ گئے تو آپ نے صحابہؓ کو جمع کیا۔ اور انہیں بتایا کہ اللہ تعالےٰ کا منشا یہ ہے کہ تمہارا کفار مکہ کے ایک بڑے لشکر سے مقابلہ ہو۔ اَب بتاؤ کہ تمہاری کیا رائے ہے۔ مہاجرین میں سے ایک ایک صحابی اٹھتا اور کہتا یارسول اللہ مشورہ کا کیا سوال ہے۔ آگے بڑھیئے اور دشمن کا مقابلہ کیجیئے ہم آپ کے ساتھ ہیں۔ اور اپنی جانیں قربان کرنے کیلئے تیار ہیں مگر جب بھی کوئی مہاجر بیٹھ جاتا۔ آپ پھر فرماتے اے لوگو مجھے مشورہ دو۔ انصار جو ایک بڑی سمجھدار اور قربانی کرنے والی قوم تھی اُس کے افرادِ ابھی خاموش تھے کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ اگر ہم نے یہ کہا کہ ہم لڑنے کے لئے تیار ہیں تو چونکہ کفّار مکہ اِن مہاجرین کے رشتہ دار ہیں۔ اُن میں سے کوئی اِن کا باپ ہے کوئی بیٹا ہے کوئی بھائی ہے۔ کوئی ماموں ہے کوئی چچا ہے۔ اِس لئے ہمارا جوش اِن پر گراں گذرے گا اور یہ سمجھینگے کہ انہیں ہمارے رشتہ داروں کو مارنے میں بڑا مزہ آتا ہے۔ مگر جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بار بار فرمایا کہ اے لوگو! مجھے مشورہ دو۔ تو ایک انصاری کھڑے ہوئے اور انہوں نے کہا۔ یارسول اللہ مشورہ تو آپ کو مل رہا ہے۔ مگر آپ جو بار بار مشورہ طلب فرما رہے ہیں تو شاید آپ کی مُراد ہم انصار سے ہے کہ اِس بارہ میں ہماری کیا رائے ہے؟ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ٹھیک ہے۔ انہوں نے کہا یا رسول اللہ! جب ہم مکہ مکرمہ میں گئے تھے اور ہمیں آپ کی بیعت کی سعادت حاصل ہوئی تھی تو اُس وقت ہم نے آپ سے درخواست کی تھی کہ آپ مدینہ تشریف لے آئیں۔ آپ نے ہماری درخواست کو قبول فرمایا اور ہم نے یہ معاہدہ کیا کہ اگر مدینہ پر کسی دشمن نے حملہ کیا تو ہم اپنی جانیں اور اپنے اموال قربان کرکے آپکی حفاظت کریں گے لیکن اگر مدینہ سے باہر مقابلہ ہُوا تو پھر ہم پر کوئی پابندی نہیں ہوگی۔ اَب چونکہ مدینہ سے باہر مقابلہ ہو رہا ہے۔ اِس لئے شاید آپ کا اشارہ اُس معاہدہ کی طرف ہے اور آپ ہم سے یہ دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ اَب اس معاہدہ کے مطابق ہماری کیا رائے ہے؟ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ تم درست سمجھتے ہو۔ میرا اشارہ اسی معاہدہ کی طرف تھا۔ انہوں نے کہا۔ یا رسول اللہ! اُس معاہدہ کا خیال جانے دیجیئے۔ جب ہم نے یہ معاہدہ کیا تھا اُس وقت ابھی ہم پر آپ کی پوری شان ظاہر نہیں ہوئی تھی مگر اَب ہم نے دیکھ لیا ہے کہ آپ کی کیا شان ہے اور آپ کتنی بڑی عظمت اور جاہ و جلال کے نبی ہیں۔ اَب کسی معاہدہ کا سوال نہیں۔ یارسول اللہ! چند منزل کے فاصلہ پر سمندر ہے آپ حکم دیں تو ہم اپنے گھوڑے اُس میں ڈالنے کے لئے تیار ہیں اور یا رسول اللہ! اگر لڑائی ہوئی تو خدا کی قسم ہم آپ کے دائیں بھی لڑیں گے اور بائیں بھی لڑیں گے۔ آگے بھی لڑیں گے اور پیچھے بھی لڑیں گے اور دشمن اُسوقت تک آپ تک نہیں پہنچ سکتا جب تک وہ ہماری لاشوں کو روندتا ہُوا نہ گذرے۔ یہ وہ اخلاص تھا جس کا نمونہ انصار نے دکھایا اور یہ وہ جذبۂ فدائیت تھا جس کا انہوں نے مظاہرہ کیا۔ اور پھر انہوں نے جس طرح بھیڑ اور بکریوں کی طرح اپنے سروں کو اسلام کی راہ میں کٹوایا اس کے نقوش تاریخ کے صفحات پر ہی نہیں دلوں کی گہرائیوں پر اِس طرح ثبت ہیں کہ قیامت تک آنے والی نسلیں اُن کی شاندار قربانیوں کو کبھی فراموش نہیں کرسکتیں۔ اِس واقعہ کو دیکھو اور پھر موسیٰؑ کے ساتھیوں کے جواب کے ساتھ اِس کا مقابلہ کرو۔ تو تمہیں معلوم ہوگا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی قوتِ قدسیہ سے کیسے شاندار پھل

ثُمَّ اَنْشَاْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ قَرْنًا اٰخَرِيْنَ ﴿۳۲﴾ فَاَرْسَلْنَا فِيْهِمْ

پھر ہم نے اُن کے بعد کئی قومیں پیدا کیں ۔ اور ہم نے اُن میں اُنہی میں سے رسول

رَسُوْلًا مِّنْهُمْ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ

بھیجا (یہ پیغام دیتے ہوئے) کہ اللہ کی عبادت کرو ۔ اُس کے سوا تمہارا کوئی اور معبود نہیں ۔

اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۳۳﴾ ع وَقَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِهِ الَّذِيْنَ

۲ ع ۲

کیا تم اُس کے ذریعہ سے اپنے آپکو ہلاکت سے بچاتے نہیں ؟ اور اِس (نئے رسول) کی قوم میں سے جنہوں نے کفر کیا تھا

كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِلِقَآءِ الْاٰخِرَةِ وَاَتْرَفْنٰهُمْ فِى

اور بعد الموت (خدا سے ملنے) کا انکار کیا تھا ۔ اور جن کو ہم نے اِس دنیا کی زندگی میں مالدار بنایا

الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۙ مَا هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ۙ يَاْكُلُ مِمَّا

اُنکے سرداروں نے کہا ۔ یہ تو تمہارے جیسا ایک آدمی ہے ۔ اُنہی (کھانوں) میں سے کھاتا ہے جو

تَاْكُلُوْنَ مِنْهُ وَيَشْرَبُ مِمَّا تَشْرَبُوْنَ ﴿۳۴﴾ وَلَئِنْ اَطَعْتُمْ

تم کھاتے ہو ۔ اور اُنہی (پانیوں) میں سے پیتا ہے جو تم پیتے ہو ۔ اور اگر تم اپنے جیسے ایک آدمی کی

بَشَرًا مِّثْلَكُمْ اِنَّكُمْ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ ﴿۳۵﴾ اَيَعِدُكُمْ اَنَّكُمْ اِذَا

بات مانو گے تو تم گھاٹا پانے والوں میں سے ہو جاؤ گے ۔ کیا وہ تم سے یہ وعدہ کرتا ہے کہ جب تم

مِتُّمْ وَكُنْتُمْ تُرَابًا وَّعِظَامًا اَنَّكُمْ مُّخْرَجُوْنَ ﴿۳۶﴾

مر جاؤ گے اور مٹی ہو جاؤ گے اور ہڈیاں بن جاؤ گے تو تم (پھر زندہ کر کے) نکالے جاؤ گے ۔

پیدا کئے تھے ۔ موسیٰؑ نے جب اپنی قوم سے کہا کہ کنعان کی سرزمین پر حملہ کرنے کے لئے تیار ہو جاؤ تو اُنہوں نے کہا کہ اے موسیٰؑ! تُو اور تیرا رب دونوں جاؤ اور دشمنوں سے لڑتے پھرو ہم تو یہیں بیٹھے ہیں ۔ مگر انصار نے یہ نہیں کہا کہ ہم معاہدہ کے مطابق مدینہ میں بیٹھ کر آپ کی حفاظت کرینگے مدینہ سے باہر ہم آپ کی حفاظت کے پابند نہیں بلکہ انہوں نے قربانیوں کی آگ میں اپنے آپکو بلا دریغ جھونک دیا اور خون کے دریا میں تیر کر اپنے رب کے قُرب کو حاصل کر لیا ۔ یہ وہ زیتونی ورق تھے جو نوحؑ کی مماثلت میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ملے اور جس کی اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ

هَيْهَاتَ هَيْهَاتَ لِمَا تُوْعَدُوْنَ ﴿۳۷﴾ إِنْ هِيَ إِلَّا

جس بات کا تم سے وعدہ کیا جاتا ہے وہ عقل سے بہت ہی دُور ہے اور ماننے کی بات نہیں ۔ زندگی تو صرف

حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَنَحْيَا وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوْثِيْنَ ﴿۳۸﴾

ہماری اِس دُنیا کی زندگی ہے ہم کبھی مُردہ حالت میں ہوتے ہیں اور کبھی زندہ حالت میں اور ہم کبھی مرنے کے بعد دوبارہ نہیں اُٹھائے جائینگے

إِنْ هُوَ إِلَّا رَجُلُ ۨافْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا وَّمَا نَحْنُ

یہ شخص تو (صرف) ایک اکیلا شخص ہے جو اللہ (تعالیٰ) پر جھوٹا افترار کرتا ہے اور ہم اِس کی باتوں) کو

لَهٗ بِمُؤْمِنِيْنَ ﴿۳۹﴾ قَالَ رَبِّ انْصُرْنِيْ بِمَا كَذَّبُوْنِ ﴿۴۰﴾

کبھی نہیں مانیں گے ۔ (اِس پر) اُس نے کہا ۔ اے میرے رب! اِن لوگوں نے مجھے جھٹلا دیا ہے پس تو میری مدد کر ۔

قَالَ عَمَّا قَلِيْلٍ لَّيُصْبِحُنَّ نٰدِمِيْنَ ﴿۴۱﴾ فَاَخَذَتْهُمُ

(تب خدا تعالیٰ نے) فرمایا ۔ یہ لوگ تھوڑے ہی عرصہ میں شرمندہ ہو جائیں گے ۔ اور اُن کو ایک عذاب نے پکڑ لیا

الصَّيْحَةُ بِالْحَقِّ فَجَعَلْنٰهُمْ غُثَآءً ۚ فَبُعْدًا

جس کی پختہ خبر دی گئی تھی اور ہم نے اُن کو کوڑا کرکٹ بنا دیا ۔ اور (فرشتوں کو حکم دیا گیا کہ) ظالموں

لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۴۲﴾

کے لئے خدا کی لعنت (مقدر کر دو) ۵۸

میں خبر دی گئی تھی اور بتایا گیا تھا کہ نوحؑ کا واقعہ ہم نے ایک افسانہ کے رنگ میں بیان نہیں کیا بلکہ اس میں اسلام اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ترقی کی عظیم الشان پیشگوئیاں ہیں اور اسلام کے روشن مستقبل کی جھلک اِس آئینہ میں تمہارے سامنے پیش کی گئی ہے۔

۵۸ حل لغات :۔ اَلصَّيْحَةُ : اَلصَّوْتُ الشَّدِيْدُ ۔ سخت آواز ۔ اَلزَّجْرُ ۔ ڈانٹ ۔ اَلْعَذَابُ ۔ عذاب ۔ اَلْغَارَةُ ۔ اچانک حملہ ۔ (اقرب)

غُثَآءً : یہ لفظ غُثَاءٌ اور غُثَّاءٌ دونوں طرح بولا جاتا ہے ۔ اور اِس کے معنے ردّی چیز کے ہوتے ہیں چنانچہ ہر قسم کی چیز جو ردّی ہو جائے اُس کے متعلق کہتے ہیں کہ وہ غُثَاء ہو گئی ۔ اور غُثَاءٌ کے معنے جھاگ کے بھی ہوتے ہیں اور اِس کے معنے ہلاک ہونے والی چیز کے بھی ہوتے ہیں ۔ اور اُن پتّوں کو بھی کہتے ہیں جو گِر کر سڑ جاتے ہیں ۔

تفسیر : فرماتا ہے نوحؑ پر ہم نے نبوت کا سلسلہ ختم نہیں کر دیا بلکہ نوحؑ کے بعد اور رسول آئے ۔ اور

غُثَآءً

اَلصَّيْحَةُ

نوحؑ کی قوم کے بعد اَور قومیں آئیں اور وہ بھی نوحؑ کی قوم کی طرح اعتراض کرتی چلی گئیں۔ جب خدا کے رسول نے انکو حکم دیا کہ ایک خدا کے سوا اَور کسی کی پرستش نہ کرو۔ تو اس کی قوم کے سرداروں نے جو کہ مابعد الموت زندگی کے منکر تھے اور دنیوی عزت اور مال و دولت کی وجہ سے تکبّر میں مبتلا ہو چکے تھے لوگوں سے کہنا شروع کر دیا کہ کیا تم دیکھتے نہیں کہ یہ تو تمہارے جیسا ایک انسان ہے جو کچھ تم کھاتے ہو وہی کچھ یہ کھاتا ہے اور جو کچھ تم پیتے ہو وہی کچھ یہ پیتا ہے۔ اگر تم ایسے آدمی کے پیچھے چلے تو یقیناً نقصان اٹھاؤ گے۔ یہ تو کہتا ہے کہ تم مر کر پھر زندہ کئے جاؤ گے حالانکہ یہ ایسی بات ہے جسے کوئی عقل تسلیم نہیں کر سکتی۔ ہم تو اسی دنیا میں جئیں گے اور مرینگے اور ہماری موت کے بعد کوئی اور زندگی ہم کو نہیں ملے گی۔ یہ شخص یقیناً جھوٹا ہے اور ہم اسپر کبھی ایمان نہیں لا سکتے۔ تب خدا تعالیٰ کے نبی نے دُعا کی کہ اے میرے رب! انہوں نے تو میرا انکار کر دیا ہے اَب تُو ہی میری مدد فرما۔ اللہ تعالےٰ نے فرمایا کہ یہ جلد ہی اپنے کئے پر نادم ہونگے۔ چنانچہ انکو ایک عذاب نے آپکڑا اور وہ تباہ ہو گئے۔

اِن آیات میں ثُمَّ اَنْشَاْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ قَرْنًا اٰخَرِيْنَ کے الفاظ میں قومِ عاد کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جن کی ہدایت کے لئے حضرت ہود علیہ السلام مبعوث ہوئے تھے۔ کیونکہ اِن قوموں کا ذکر قومِ نوحؑ کی ہلاکت کے بعد کیا گیا ہے اور قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ حضرت ہودؑ نے قومِ عاد کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا وَاذْكُرُوْٓا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنْۢ بَعْدِ قَوْمِ نُوْحٍ (اعراف ع۹) یعنی اس وقت کو یاد کرو جبکہ خدا نے تم کو نوحؑ کی قوم کے بعد اُس کا جانشین بنا دیا تھا۔ اور قومِ عاد کے متعلق فرماتا ہے کہ وَاِلٰى عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا (اعراف ع۹) یعنی عاد کی طرف ہم نے اُنکے بھائی ہودؑ کو رسول بنا کر بھیجا تھا۔ پھر جس طرح اِن آیات میں یہ بتایا گیا ہے کہ اُس رسول نے انہیں توحید کی طرف بلایا اور بتوں کی پرستش سے روکا اِسی طرح سورۂ اعراف میں حضرت ہودؑ کے متعلق بتایا گیا ہے کہ انہوں نے اپنی قوم سے یہی کہا کہ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ یعنی اے میری قوم اللہ کی عبادت کرو۔ اس کے سوا تمہارا اَور کوئی معبود نہیں پھر جس طرح اِس قوم کے متعلق یہ کہا گیا ہے کہ اَتْرَفْنٰهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ہم نے انکو اِس دُنیا کی زندگی میں ہر قسم کی آسائش عطا کی تھی اِسی طرح قومِ عاد کو حضرت ہودؑ نیکی اور تقوٰی کی طرف توجہ دلاتے ہوئے فرماتے ہیں۔ کہ زَادَكُمْ فِي الْخَلْقِ بَصْۜطَةً ۚ فَاذْكُرُوْٓا اٰلَآءَ اللّٰهِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ۔ اُس نے تمہاری نسلوں کو زیادہ کیا اور تمہارے جسم کو بہت مضبوط بنایا۔ پس اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو یاد کرو تاکہ تم کامیاب ہو جاؤ۔

پھر جس طرح یہاں یہ کہا گیا ہے کہ انہوں نے یہ اعتراض کیا کہ وَلَئِنْ اَطَعْتُمْ بَشَرًا مِّثْلَكُمْ اِنَّكُمْ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ کہ اگر تم اپنے جیسے ایک آدمی کی بات مانو گے تو گھاٹا پانے والوں میں سے ہو جاؤ گے اِسی طرح سورۂ اعراف میں قوم عاد کا ذکر کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ حضرت ہودؑ نے اُن سے کہا اَوَعَجِبْتُمْ اَنْ جَآءَكُمْ ذِكْرٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَلٰى رَجُلٍ مِّنْكُمْ لِيُنْذِرَكُمْ کہ کیا تم اس بات پر تعجب کرتے ہو کہ تم میں سے ہی ایک شخص پر تمہارے رب کی طرف سے ہدایت نازل ہوئی ہے تاکہ وہ تمہیں آنے والے عذاب سے ہوشیار کرے۔

غرض قرآن کریم کا یہ بتانا کہ قومِ نوحؑ کی ہلاکت کے بعد عاد کو ہم نے اس کا جانشین بنایا تھا اور پھر انہی اعتراضات کا ذکر جو عاد نے کئے بتاتا ہے کہ اِس جگہ قَرْنًا اٰخَرِيْنَ میں عاد ہی کا ذکر کیا گیا ہے۔

مَا هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يَاْكُلُ مِمَّا تَاْكُلُوْنَ

مِنْهُ وَيَشْرَبُ مِمَّا تَشْرَبُوْنَ سے معلوم ہوتا ہے کہ
انبیاء علیہم السلام پر اُن کے مخالفین کی طرف سے جو اعتراضات
ہوتے رہے ہیں اُن میں سے ایک بڑا اعتراض اُن کا ہمیشہ
یہ رہا ہے کہ بشر رسول کی بات ماننے کے لئے ہم تیار
نہیں۔ ہماری ہدایت کے لئے بشر سے بالا کوئی اور وجود
آنا چاہیئے۔ اُن کا یہ اعتراض کئی وجوہ کی بنا پر ہوتا ہے
بعض لوگ یہ اعتراض اس لئے کرتے ہیں کہ وہ ضد اور
تعصب کا شکار ہوتے ہیں اور اُن کے قلب کے مخفی گوشوں
میں کبر پایا جاتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ آخر اس کو ہم پر کیا
فضیلت حاصل ہے کہ اِسے کلامِ الٰہی کا حامل بنا دیا
گیا ہے ہم بھی انسان ہیں اور یہ بھی انسان ہے۔ اگر ہماری
ترقی کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی کلام ہی نازل
ہونا تھا تو وہ ہم پر ہوتا اِس پر کیوں نازل ہُوا ہے؟
اور اِس کا کیا حق ہے کہ ہمارے جیسا ایک انسان ہوتے
ہوئے ہم پر اپنی بڑائی کا اظہار کرے اور ہمیں اپنے پیچھے
چلانا چاہے۔ ایسے لوگ یہ تو تسلیم کرتے ہیں کہ کلامِ الٰہی
نازل ہوسکتا ہے مگر وہ انبیاء کو ایک گھٹیا وجود قرار
دیتے ہیں اور اپنی دنیوی قابلیتوں یا مال و دولت یا
ظاہری علم کی وجہ سے اپنے آپ کو اُن سے بالا سمجھتے ہیں
اِس لئے وہ اُن کا پیغام سُننے سے انکار کر دیتے ہیں۔
اور کہتے ہیں کہ ہم ان کی بات نہیں مان سکتے۔
پھر بعض لوگ یہ اعتراض اِس بنا پر کیا کرتے ہیں
کہ اُن کے نزدیک اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کو دماغی اور
عقلی قوٰی کے لحاظ سے ایسا مکمل بنا دیا ہے کہ اب اسے
اپنی ہدایت کے لئے کسی بیرونی مدد کی ضرورت نہیں۔ اُن
کے نزدیک ایک انسان اپنی طاقتوں سے کام لے کر اپنی
نجات کی راہ اپنے لئے خود تجویز کر سکتا ہے اور بُری
اور بھلی بات میں امتیاز کر سکتا ہے۔ اُسے یہ ضرورت نہیں
کہ وہ اپنے جیسے آدمی کے سامنے سر جھکا دے اور
اُس کی ہر بات پر آمنّا و صدّقنا کہنا شروع کر دے
گویا اُن کے نزدیک ایک اپنے جیسے آدمی کی بات مان لینا
اُن اعلیٰ درجہ کی طاقتوں کی توہین ہے جو قدرت کی طرف
سے ہر انسان کو ودیعت کی گئی ہیں۔

اِن کے علاوہ ایک تیسری قسم کے بھی لوگ ہوتے ہیں۔
وہ سمجھتے ہیں کہ نبوت و رسالت کے لئے جن طاقتوں کی
ضرورت ہے وہ کسی بشر میں نہیں پائی جاتیں۔ اگر کوئی ایسا
وجود ہو جو مافوق الانسانیت طاقتیں رکھتا ہو تو
بے شک ہم اُس کو ماننے کے لئے تیار ہیں لیکن اپنے جیسے
ایک وجود کو جو ہماری طرح کھاتا پیتا اور ہماری طرح
حوائجِ بشریہ کا محتاج ہے ہم ماننے کے لئے تیار
نہیں ہوسکتے۔ ایسے لوگ کلامِ الٰہی کے نزول کے منکر
نہیں ہوتے۔ مگر وہ کسی ایسے وجود کے منتظر ہوتے ہیں جو
مافوق الانسانیت طاقتیں رکھتا ہو۔ اِس لئے وہ نبیوں
کا انکار کر دیتے ہیں۔

غرض یہ اعتراض مختلف وجوہ کی بنا پر ہوتا ہے۔ مگر
اللہ تعالیٰ نے ہمیشہ بشر کو ہی رسول بنا کر بھیجا رہا کیونکہ
ہر انسان ایک نمونہ کا محتاج ہے۔ اگر انبیاء مافوق الانسانیت
طاقتیں اپنے اندر رکھیں تو وہ بنی نوع انسان کے لئے
نمونہ نہیں ہوسکتے۔ وہ بڑی آسانی سے کہہ سکتے ہیں کہ تم تو
اِس لئے اِن احکام کو بجا لا رہے ہو کہ تم اپنے اندر غیر معمولی
طاقتیں رکھتے ہو۔ اگر ہمارے جیسی طاقتیں تم میں بھی ہوتیں
تو پھر ہم دیکھتے کہ تم کس طرح اِن احکام پر عمل کرتے ہو
پس اِس اعتراض کو دُور کرنے اور بنی نوع انسان کے
سامنے ایک نمونہ پیش کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ ہمیشہ
بشر رسول ہی بھیجا کرتا ہے تاکہ قیامت کے دن وہ
کوئی عذر نہ کر سکیں اور اللہ تعالیٰ اُن پر حجّت تمام
کرے اور کہے کہ جب یہ لوگ جو تمہارے جیسے انسان
تھے انہوں نے میرے احکام پر عمل کیا اور میری ہدایات

ثُمَّ اَنْشَاْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ قُرُوْنًا اٰخَرِيْنَ ﴿۴۲﴾ مَا تَسْبِقُ

پھر اُن کے بعد ہم نے کئی اَور قومیں پیدا کیں - کوئی قوم اپنی مدت سے

مِنْ اُمَّةٍ اَجَلَهَا وَمَا يَسْتَاْخِرُوْنَ ﴿۴۳﴾ ثُمَّ اَرْسَلْنَا

آگے نہیں گذرتی اور نہ ہی اس سے پیچھے رہ (کر بچ) سکتی ہے - پھر ہم نے اپنے رسول

رُسُلَنَا تَتْرَا ؕ كُلَّمَا جَآءَ اُمَّةً رَّسُوْلُهَا كَذَّبُوْهُ

متواتر بھیجے - جب کبھی کسی قوم کے پاس اُس کا رسول آتا تھا وہ اُسکو جھٹلاتے تھے -

کی پیردی کی تو تم کیونکر کہہ سکتے ہو کہ ہمارے لئے اِن احکام پر عمل کرنا ناممکن تھا - تمہارا یہ عذر محض بے بنیاد ہے - اور تم اس بات کے مستحق ہو کہ تمہیں سزا دی جائے - پس بنی نوع انسان کے لئے ہمیشہ بشر رسول کا آنا ہی ضروری ہوتا ہے مگر افسوس کہ انسان ہمیشہ تمرّد رنگ تلاش کرتا ہے اور حیلوں بہانوں سے خدا تعالےٰ کے احکام کو توڑتا رہتا ہے -

اِنْ هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَنَحْيَا وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوْثِيْنَ میں اللہ تعالیٰ نے یہ بتایا ہے کہ منکرین انبیاء کے انکار کی دوسری وجہ یہ ہوتی ہے کہ وہ لوگ بعث بعد الموت کے منکر ہوتے ہیں اور اِس وجہ سے اُن کے اندر اپنے اعمال کے اچھا یا بُرا ہونے کے متعلق کبھی کوئی صحیح احساس پیدا نہیں ہوتا - وہ جس ڈگر پر چل رہے ہوتے ہیں اُس پر آنکھیں بند کر کے چلتے چلے جاتے ہیں اور خیال کرتے ہیں کہ ہمارا کام اِتنا ہی ہے کہ ہم کھائیں پئیں اور اس چند روزہ زندگی کو عیش و آرام میں گذار دیں - یہی وجہ ہے کہ جب اللہ تعالےٰ کے انبیاء اُن کے پاس خدا تعالیٰ کا پیغام لے کر آتے ہیں تو وہ چونکہ اُن کے عقائد اور اعمال میں ایک عظیم الشان تغیر پیدا کرنا چاہتے ہیں اسلئے اُنکو ایک دھکا لگتا ہے اور وہ یہ شور مچانا شروع کر دیتے ہیں کہ تم ہمیں خدا تعالیٰ کے عذاب سے کیا ڈراتے ہو - ہمارا تو یہ عقیدہ ہی نہیں کہ ہم مر کر پھر زندہ ہونگے - اس لئے ہمیں کسی جواب دہی کا کیا خطرہ ہو سکتا ہے - ہم جو بھی عمل کرینگے اپنی اس چند روزہ حیات کے لئے کرینگے اور ہم اپنے نفع و نقصان کو سمجھنے کی خوب اہلیت رکھتے ہیں - اس لئے تم ہمیں آخرت کے عذاب سے مت ڈراؤ -

حقیقت یہ ہے کہ بعث بعد الموت پر ایمان ہی ایک ایسی چیز ہے جو انسان کے اندر اللہ تعالیٰ کا خوف اور اُس کی محبت پیدا کرتی ہے اور اس کے اعمال کی اِصلاح کا ایک اہم ذریعہ ہے - اگر آئندہ زندگی پر ایمان نہ رہے تو نہ صرف تمام کارخانۂ عالم کو ایک عبث اور لغو چیز تسلیم کرنا پڑتا ہے بلکہ نیکی اور تقوٰی میں ترقی بھی ایک بیکار عمل قرار پاتا ہے - مگر یہ خیال کہ اللہ تعالیٰ نے سورج اور چاند اور ستاروں اور سیاروں اور آسمان اور زمین کے درمیان کی ہزارہا چیزیں پیدا کر کے اور اُن میں اپنی قدرت کے ہزارہا راز ودیعت کر کے ایک ایسے انسان کو پیدا کیا جس نے چند سالہ زندگی بسر کر کے ہمیشہ کے لئے فنا ہو جانا ہے اور اُس کی زندگی کا کوئی اہم مقصد نہیں ایک ایسا خیال ہے

فَاَتْبَعْنَا بَعْضَهُمْ بَعْضًا وَّجَعَلْنٰهُمْ اَحَادِيْثَ ۚ

پس ہم اُن میں سے بعض کو بعض کے پیچھے پیچھے چلے جاتے تھے (یعنی ہلاک کرتے جاتے تھے) اور ہم نے اُن سب کو گزشتہ افسانے کر کے رکھ دیا (یعنی دنیا میں

فَبُعْدًا لِّقَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۴۵﴾ ثُمَّ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى

اور (انکے متعلق فرشتوں کو حکم دیا کہ) جو لوگ ایمان نہیں لائے اُن کیلئے خدا کی لعنت (مقدر کر دو) پھر اُس کے بعد ہم نے موسیٰ

وَاَخَاهُ هٰرُوْنَ ۙ بِاٰيٰتِنَا وَسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ﴿۴۶﴾ اِلٰى

اور اس کے بھائی ہارون کو اپنے نشان اور کھلا کھلا غلبہ دے کر

فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهٖ فَاسْتَكْبَرُوْا وَكَانُوْا قَوْمًا

فرعون اور اُس کے سرداروں کی طرف بھیجا پس انہوں نے تکبر کیا اور وہ سرکش لوگوں

جسے کوئی عقل تسلیم نہیں کر سکتی۔ انسان کیلئے اس قدر وسیع کائنات کا پیدا کرنا اور اُس پر عقل کے ذریعہ انسان کو حکومت بخشنا بتاتا ہے کہ اُس کیلئے اس محدود زندگی کے علاوہ کوئی اور مقصد بھی مقرر کیا گیا ہے۔ اور اسلام کہتا ہے کہ وہ مقصد یہی ہے کہ اُسے ایک دائمی حیات کیلئے پیدا کیا گیا ہے۔ اور دائمی روحانی ترقیات کا راستہ اُس کیلئے کھولا گیا ہے پس موت کے صرف اتنے معنے ہیں کہ انسانی رُوح جسم سے جُدا ہو گئی ورنہ رُوح پر کوئی فنا نہیں اور وہ ہمیشہ زندہ رہتی اور اللہ تعالیٰ کے قرب کے غیر متناہی مراتب حاصل کرتی رہتی ہے۔

بہرحال انبیاء کے انکار کی ایک بڑی وجہ بعث بعد الموت کا انکار بھی ہوتا ہے جس کی طرف ان آیات میں اشارہ کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جب مخالفین نے ہمارے نبی کا انکار کیا۔ اور اُس کی باتوں پر ہنسی اڑائی تو وہ ہمارے حضور جھکا اور اس نے دُعا سے ہماری مدد چاہی۔ تب ہم نے اُسے الہام کیا کہ یہ لوگ تھوڑے عرصہ میں ہی ہمارے عذاب سے ہلاک ہونے والے ہیں۔ چنانچہ ایک دن عذاب آ گیا اور ہم نے انکو کوڑا کرکٹ بنا کر رکھدیا قرآن کریم نے ایک دوسرے مقام پر بتایا ہے کہ اَمَّا عَادٌ فَاُهْلِكُوْا بِرِيْحٍ صَرْصَرٍ عَاتِيَةٍ سَخَّرَهَا عَلَيْهِمْ سَبْعَ لَيَالٍ وَّثَمٰنِيَةَ اَيَّامٍ حُسُوْمًا فَتَرَى الْقَوْمَ فِيْهَا صَرْعٰى كَاَنَّهُمْ اَعْجَازُ نَخْلٍ خَاوِيَةٍ (الحاقۃ) یعنی عاد ایک ایسے عذاب سے ہلاک کئے گئے تھے جو ایک سخت تیز اور تند ہوا کی صورت میں آیا تھا۔ خدا تعالیٰ نے اُس ہوا کو متواتر سات راتیں اور آٹھ دن اُنکی تباہی کے لئے مقرر کر چھوڑا تھا۔ سو اُس کا نتیجہ تمہیں معلوم ہے کہ وہ قوم بالکل گر گئی گویا وہ کھجور کے ایک کھوکھلے درخت کی جڑیں ہیں جن کو تیز آندھی نے گرا کر رکھدیا ہے۔

فَجَعَلْنٰهُمْ غُثَاۗءً کی صداقت کا اس سے بڑا اور کیا ثبوت ہوگا کہ بعض یورپین محققین عاد کے وجود کو ہی تسلیم نہیں کرتے حالانکہ یونان میں جو جغرافیے لکھے گئے ہیں اُن میں ایک قبیلے کا نام عاد بھی موجود ہے (العرب قبل الاسلام) جس سے قرآنی بیان کی صداقت واضح ہوتی ہے مگر چونکہ اللہ تعالیٰ کے عذاب نے اُن کو کوڑا کرکٹ بنا کر رکھ دیا تھا اس لئے بعض یورپین

عَالِيْنَ ﴿۴۷﴾ فَقَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ لِبَشَرَيْنِ مِثْلِنَا وَقَوْمُهُمَا

میں سے بن گئے۔ پھر انہوں نے کہا کیا ہم اپنے جیسے دو انسانوں پر ایمان لے آئیں حالانکہ ان دونوں کی قوم

لَنَا عٰبِدُوْنَ ﴿۴۸﴾ فَكَذَّبُوْهُمَا فَكَانُوْا مِنَ الْمُهْلَكِيْنَ ﴿۴۹﴾

ہماری غلامی کر رہی ہے۔ پس انہوں نے اُن دونوں (یعنی موسیٰؑ اور ہارونؑ) کو جھٹلا دیا۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ وہ بھی ہلاک ہونیوالے لوگوں

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ لَعَلَّهُمْ يَهْتَدُوْنَ ﴿۵۰﴾

اور ہم نے موسیٰؑ کو (وہ) کتاب دی (جس کو سب جانتے ہیں) تاکہ وہ (اور اُسکی قوم) ہدایت پائیں ۹؎

محققین کو عاد کا وجود تسلیم کرنے میں ہی مشکل پیش آگئی۔

۹؎ **تفسیر**:۔ فرماتا ہے۔ عاد کے بعد پھر کچھ اَور لوگ گذرے تھے۔ جیسا کہ ثمود کی قوم جسے قرآن کریم نے عاد کا جانشین قرار دیا ہے (اعراف ع ۹) اور ہم نے اُن کے اندر پے در پے رسول بھیجنے شروع کر دیئے مگر جس قوم کے پاس بھی رسول آیا۔ اُس نے انکار کیا اور ہم نے پہلی قوم کے بعد قوم کو ہلاک کرنا شروع کر دیا۔

اِس آیت میں بائیبل سے ایک بہت بڑا اختلاف کیا گیا ہے لیکن تاریخ شاہد ہے کہ قرآن کریم نے جو بات کہی ہے وہی ٹھیک ہے اور بائیبل کی غلط۔ بائیبل میں لکھا ہے کہ نوحؑ کے وقت میں جب عذاب آیا۔ اور اُس کے زمانہ کے لوگ تباہ ہوگئے۔ تو اللہ تعالیٰ پچھتایا اور اُس نے وعدہ کیا کہ آئندہ وہ ایسا عذاب دنیا پر کبھی نہیں لائیگا۔ چنانچہ پیدائش باب ۸ آیت ۲۱ میں لکھا ہے کہ

"خداوند نے اپنے دل میں کہا کہ انسان کے سبب سے میں پھر کبھی زمین پر لعنت نہیں بھیجونگا کیونکہ انسان کے دل کا خیال لڑکپن سے بُرا ہے۔"

مگر پھر بائیبل ہی بتاتی ہے کہ

"خداوند نے اپنی طرف سے سدوم اور عمورہ پر گندھک اور آگ آسمان سے برسائی اور اُس نے اُن شہروں کو اور اُس ساری ترائی کو اور اُن شہروں کے سب رہنے والوں کو اور سب کچھ جو زمین سے اُگا تھا غارت کیا۔"

گویا وہ عہد جو بائیبل کی رو سے خدا تعالیٰ نے کیا تھا۔ اُسے اُس نے خود ہی توڑ دیا اور سدوم کو آگ اور گندھک سے برباد کر دیا۔ اِسی طرح بائیبل بتاتی ہے کہ موسیٰ کے زمانہ میں فرعون پر بھی مختلف عذاب آئے۔ ایک دفعہ ایسا عذاب آیا کہ

دریا کا پانی سب خون ہوگیا اور دریا کی مچھلیاں مرگئیں اور دریا سے تعفن اُٹھنے لگا اور مصری دریا کا پانی نہ پی سکے۔" (خروج باب ۷ آیت ۲۰ و ۲۱)

ایک دفعہ خدا تعالیٰ نے عذاب کے طور پر ملک مصر میں اتنے مینڈک پیدا کر دیئے کہ بائیبل بتاتی ہے کہ اُن مینڈکوں نے ملک مصر کو ڈھانک لیا۔ (خروج باب ۸ آیت ۱ تا ۷)

ایک دفعہ عذاب کے طور پر اتنی جوئیں پیدا ہوگئیں کہ بائبل کہتی ہے کہ " تمام ملک مصر میں زمین کی ساری گرد جوئیں بن گئی۔" (خروج باب ۸ آیت ۱۶ تا ۱۸)

ایک دفعہ موسیٰ کی بد دعا سے " سارے ملک مصر میں مچھروں کے غول کے غول بھر گئے اور اُن مچھروں کے غولوں کے سبب سے ملک کا ناس ہوگیا۔" (خروج باب ۸ آیت ۲۴)

ایک دفعہ ایسی مری پڑی کہ مصریوں کے سب چوپائے مر گئے (خروج باب ۹ آیت ۵ و ۶)

ایک دفعہ عذاب کے طور پر اللہ تعالیٰ نے مصریوں اور اُن کے جانوروں کے جسموں پر پھوڑے اور پھپھولے پیدا کر دیئے۔ (خروج باب ۹ آیت ۸ تا ۱۱)

ایک دفعہ مصری قوم پر اولوں کا عذاب آیا اور یہ عذاب ایسا تھا کہ لکھا ہے:۔

" اولوں کے ساتھ آگ ملی ہوئی تھی اور وہ اولے ایسے بھاری تھے کہ جب سے مصری قوم آباد ہوئی ایسے اولے ملک میں کبھی نہیں پڑے تھے۔" (خروج باب ۹ آیت ۲۲ تا ۲۴)

ایک دفعہ عذاب کے طور پر اتنی ٹڈیاں پیدا کر دیں کہ لکھا ہے:۔

" نہ تو اُن سے پہلے ایسی ٹڈیاں کبھی آئیں نہ اُن کے بعد پھر آئیں گی۔ کیونکہ انہوں نے تمام روئے زمین کو ڈھانک لیا۔ ایسا کہ ملک میں اندھیرا ہو گیا اور انہوں نے اس ملک کی ایک ایک سبزی کو اور درختوں کے میووں کو جو اولوں سے بچ گئے تھے چٹ کر لیا۔" (خروج باب ۱۰ آیت ۱۲ تا ۱۶)

لیکن بائبل کے اس بیان کے مقابلہ میں جغرافیہ سے ثابت ہے کہ ٹڈی جن ملکوں میں خاص طور پر نشوونما پاتی ہے اُن میں سے ایک مصر بھی ہے۔

پھر ایک دفعہ عذاب کے طور پر مصر میں ایسی تاریکی چھائی کہ لکھا ہے:۔

" تین دن تک سارے ملک مصر میں گہری تاریکی رہی۔ تین دن تک نہ تو کسی نے کسی کو دیکھا۔ اور نہ کوئی اپنی جگہ سے ہلا۔"

(خروج باب ۱۰ آیت ۲۱ تا ۲۳)

اسی طرح ایک دفعہ اللہ تعالیٰ نے ملک مصر کے تمام پلوٹھے بچوں کو مار ڈالا۔ اور لوگوں کی چیخ و پکار سے کہرام مچ گیا۔ بائبل کہتی ہے کہ:۔

" آدھی رات کو خداوند نے ملک مصر کے سب پلوٹھوں کو فرعون جو اپنے تخت پر بیٹھا تھا اُس کے پلوٹھے سے لیکر وہ قیدی جو قید خانہ میں تھا اس کے پلوٹھے تک بلکہ چوپاؤں کے پلوٹھوں کو بھی ہلاک کر دیا۔ اور فرعون اور اُس کے سب نوکر اور سب مصری رات ہی کو اُٹھ بیٹھے اور مصر میں بڑا کہرام مچ گیا۔ کیونکہ ایک بھی ایسا گھر نہ تھا جس میں کوئی نہ مرا ہو۔"

(خروج باب ۱۲ آیت ۲۹ و ۳۰)

اب اگر بائبل کی یہ بات درست تھی کہ قوم نوحؑ کی ہلاکت کے بعد خدا تعالیٰ نے یہ عہد کیا تھا کہ وہ آئندہ لوگوں کو کبھی اپنے عذاب سے ہلاک نہیں کریگا کیونکہ " انسان کے دل کا خیال لڑکپن سے بُرا ہے۔" تو سدوم کیوں تباہ ہُوا؟ اور اُس پر گندھک اور آگ کیوں برسائی گئی۔ فرعونیوں پر جوؤں اور مینڈکوں اور مچھروں اور ٹڈیوں کا عذاب کیوں نازل کیا گیا۔ اُن پر اولے اور آگ کیوں برسائی گئی۔ اُن کے لئے دریا کے پانی کو لہو میں کیوں تبدیل کیا گیا۔ اُن کے پلوٹھوں کو کیوں مارا گیا۔ اُن کے جسموں پر پھوڑے اور پھپھولے کیوں پیدا

وَجَعَلْنَا ابْنَ مَرْيَمَ وَاُمَّهٗۤ اٰيَةً وَّاٰوَيْنٰهُمَاۤ اِلٰى رَبْوَةٍ ذَاتِ قَرَارٍ وَّمَعِيْنٍ ﴿۵۱﴾

اور ہم نے ابن مریم اور اُس کی ماں کو ایک نشان بنایا اور ہم نے اُن دونوں کو ایک اونچی جگہ پر پناہ دی جو ٹھہرنے کے قابل اور بہتے ہوئے پانیوں والی تھی ۝۱۰

کردیئے گئے۔" انکو گہری تاریکی میں تین دن تک کیوں رکھا گیا؛ کیا خدا تعالیٰ نہیں جانتا تھا کہ انسان کا خیال لڑکپن سے بُرا ہے اِسے کچھ نہیں کہنا چاہیئے۔ پھر اگر خدا تعالیٰ نے نوحؑ کے بعد کسی قوم پر عذاب نازل نہیں کرنا تھا تو خدا تعالیٰ نے موسیٰ کی معرفت یہ کیوں کہا کہ

"خداوند تیرا خدا بھسم کرنیوالی آگ ہے۔"
(استثناء باب ۴ آیت ۲۴)

اگر اُس کی یہ بات درست تھی کہ " انسان کے سبب سے مَیں پھر کبھی زمین پر لعنت نہیں بھیجونگا۔" (پیدائش ۸/۲۱) تو اُس نے بنی اسرائیل سے یہ کیوں کہا کہ اگر تم میں سے کسی نے میرے احکام کو نہ مانا تو

"شہر میں بھی تو لعنتی ہوگا اور کھیت میں بھی لعنتی ہوگا۔ تیرا ٹوکرا اور تیری کٹھوتی (یعنی آٹا گوندھنے کا برتن) دونوں لعنتی ٹھہریں گے۔ تیری اولاد اور تیری زمین کی پیداوار اور تیرے گائے بیل کی بڑھتی اور تیری بھیڑ بکریوں کے بچے لعنتی ہونگے۔ تو اندر آتے لعنتی ٹھہریگا اور باہر جاتے بھی لعنتی ٹھہریگا۔ خداوند اُن سب کاموں میں جن کو تو ہاتھ لگائے لعنت اور اضطراب اور پھٹکار کو تجھ پر نازل کرے گا۔ جب تک تو ہلاک ہوکر جلد نیست و نابود نہ ہوجائے۔" (استثناء باب ۲۸ آیت ۱۶ تا ۲۰)

غرض بائیبل نے جو کچھ کہا تھا وہ خود اس کی اپنی اندرونی شہادت سے باطل ثابت ہوتا ہے لیکن قرآن بتاتا ہے کہ نوحؑ کے بعد متواتر رسول آئے اور اُن کے دشمن اپنی نافرمانیوں کی وجہ سے ہلاک ہوتے رہے۔ یہاں تک کہ آخر میں حضرت موسیٰ علیہ السلام آئے اور اُن کے مخالف بھی تباہ ہوگئے۔ اور تاریخ بتاتی ہے کہ قرآن کریم کی بات ہی سچی ہے۔ یعنی متواتر کئی قومیں حضرت نوحؑ کے بعد اللہ تعالےٰ کے عذاب سے ہلاک ہوتی رہیں پس بائیبل کی یہ بات صریح غلط ہے کہ نوحؑ کی قوم پر عذاب بھیجنے کے بعد خدا تعالیٰ پچھتایا اور اُس نے عہد کیا کہ آئندہ وہ ایسا عذاب دنیا پر کبھی نازل نہیں کرے گا۔ اگر وہ سچا عہد تھا تو پھر اُس نے مختلف وقتوں میں کیوں عذاب نازل کئے اور کیوں بنی نوع انسان کو ہلاک کیا؟

۝۱۰ حل لغات :- اٰوٰی ، اٰوَيْتُهٗ اَنْزَلْتُهٗ۔ یعنی اٰوَيْتُهٗ کے معنے ہیں۔ مَیں نے اُسے اپنے پاس اُتارا۔ وَمِنْهُ اَللّٰهُمَّ اٰوِنِيْ اِلٰى ظِلِّ كَرَمِكَ وَعَفْوِكَ اور انہی معنوں میں یہ لفظ اِس دُعا میں بھی استعمال ہوا ہے کہ اے اللہ! مجھے اپنے کرم اور عفو کے سایہ میں جگہ دے (اقرب) اٰوٰى مَنْزِلَهٗ اَوْ اِلٰى مَنْزِلِهٖ کے معنے ہیں نَزَلَ بِهٖ لَيْلًا اَوْ نَهَارًا (اقرب) دن کو یا رات کو اپنے گھر میں آٹھہرا۔ یعنی بے اطمینانی کی جگہ سے آرام کی جگہ پر آگیا۔

رَبْوَةٌ : الربوة : الرابية۔ یعنی ربوۃ کے

(حاشیہ: ۳۴۲ — ۲/اٰوٰی — ۲/رَبْوَةٌ)

قَرَارٍ

معنے اونچے ٹیلے کے ہیں (اقرب)

قَرَارٍ ۔ قَرَّ کا مصدر ہے ۔ اور قَرَّ فِی الْمَکَانِ قَرَارًا کے معنے ہیں ثَبَتَ وَ سَکَنَ کسی جگہ پر ٹھہرا ۔ نیز قَرَارٌ کے معنے ہیں مَا قُرَّ فِیْهِ جس میں ٹھہرا جائے اَلْمُسْتَقَرُّ ۔ جائے قرار (اقرب)

تفسیر :۔ اِس آیت میں اللہ تعالےٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور اُن کی والدہ حضرت مریم صدیقہ کا ذکر کیا ہے ۔ اور فرمایا ہے کہ جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بہت تکلیفیں دی گئیں ۔ تو اللہ تعالیٰ نے اُن کی مدد کی اور انہیں خدا تعالےٰ کے زندہ اور طاقتور ہونے کا ایک نشان بنا دیا ۔ اور پھر اُن دونوں کو دشمنوں کے عذاب سے بچایا ۔ اور ایک بلند زمین پر جو رہنے کے لحاظ سے بھی اچھی تھی اور جس میں پانی کے چشمے بھی جاری تھے اُنکو بسا دیا ۔ عربی زبان میں اٰوٰی کا لفظ ہمیشہ ایسی جگہ بولا جاتا ہے جہاں احسان کے طور پر کسی مصیبت اور دُکھ سے بچائے جانے کا ذکر ہو جیسے قرآن کریم میں اللہ تعالےٰ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے فرماتا ہے کہ اَلَمْ یَجِدْكَ یَتِیْمًا فَاٰوٰی (سورۃ الضحیٰ ع) کیا اُس نے تجھے یتیم پاکر اپنے زیر سایہ جگہ نہیں دی ۔ تُو ابھی رحم مادر میں ہی تھا کہ تیرا والد فوت ہو گیا ۔ اور تُو یتیمی کی حالت میں آگیا مگر اللہ تعالیٰ نے خود تیری پرورش کے سامان پیدا فرمائے اور تجھے اپنے سایۂ عاطفت میں پناہ دی ۔ اِسی طرح سورۃ انفال میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ۔ وَاذْكُرُوْٓا اِذْ اَنْتُمْ قَلِیْلٌ مُّسْتَضْعَفُوْنَ فِی الْاَرْضِ تَخَافُوْنَ اَنْ یَّتَخَطَّفَكُمُ النَّاسُ فَاٰوٰىكُمْ وَاَیَّدَكُمْ بِنَصْرِهٖ وَرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّیِّبٰتِ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ (انفال ع) یعنی تم اُس وقت کو یاد کرو جب کہ تم تھوڑے تھے اور زمین میں کمزور سمجھے جاتے تھے اور تم ڈرتے تھے کہ لوگ تم کو اُچک کر نہ لے جائیں پھر اللہ تعالیٰ نے تمہیں پناہ دی اور اپنی تائید تمہارے شامل حال رکھی ۔ اور ہر قسم کی پاک چیزوں سے تمہیں رزق بخشا تاکہ تم خدا تعالیٰ کا شکر ادا کرو ۔ اِس آیت میں بھی اٰوٰی کا لفظ ایسے موقعہ پر استعمال کیا گیا ہے جب کہ ایک بڑی مصیبت اور تکلیف کے بعد خدا تعالیٰ نے مسلمانوں کو مدینہ میں امن بخشا اور انہیں اپنی تائید سے نوازا ۔

اِسی طرح قرآن کریم میں ذکر آتا ہے کہ جب حضرت نوحؑ نے طوفان کے وقت اپنے بیٹے سے کہا کہ یٰبُنَیَّ ارْكَبْ مَّعَنَا اے بیٹے ہمارے ساتھ سوار ہو جا تو اُن کے بیٹے نے یہ جواب دیا کہ سَاٰوِیْٓ اِلٰی جَبَلٍ یَّعْصِمُنِیْ مِنَ الْمَآءِ (ہود ع) یعنی مَیں ابھی کسی پہاڑ کی چوٹی پر پہنچ کر پناہ لے لونگا ۔ جو اِس طوفان کی زد سے مجھے بچا لے گا ۔

حضرت یوسف علیہ السلام کے متعلق بھی قرآن کریم میں آتا ہے کہ وَلَمَّا دَخَلُوْا عَلٰی یُوْسُفَ اٰوٰٓی اِلَیْهِ اَخَاهُ قَالَ اِنِّیْٓ اَنَا اَخُوْكَ فَلَا تَبْتَئِسْ بِمَا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ (یوسف ع) یعنی جب حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائی اُن کے پاس آئے تو انہوں نے بن یامین کو اپنے پاس جگہ دی اور اُس سے کہا کہ مَیں ہی تیرا گمشدہ بھائی ہوں ۔ پس جو کچھ یہ تجھ سے سلوک کرتے رہے ہیں اُسکی وجہ سے اب تُو غمگین نہ ہو ۔ اِس جگہ بھی اٰوٰی کا لفظ انہی معنوں میں استعمال کیا گیا ہے کہ اُن کا بھائی حضرت یوسفؑ کی گمشدگی اور پھر اپنے ہی بھائیوں کے ظلم وستم کی وجہ سے نہایت تکلیف سے اپنے دن گذار رہا تھا حضرت یوسف علیہ السلام نے اُسے عزت کے ساتھ اپنے پاس جگہ دی اور پھر اُسے تسلی دی کہ مَیں ہی تیرا بھائی ہوں اور اِس طرح اُس کی سب تکلیف دُور ہو گئی ۔ اور اُسے امن اور سکون میسر آگیا ۔

لغتِ عرب کے لحاظ سے بھی جب اٰوٰی اِلَی الْمَنْزِلِ کہیں تو اِس کے معنے یہ ہوتے ہیں کہ وہ بے اطمینانی کی جگہ سے آرام کی جگہ پر آگیا ۔ چنانچہ اِنہی معنوں میں اللہ تعالےٰ

کے حضور یہ دُعا کی جاتی ہے کہ اَللّٰھُمَّ اٰوِیْ اِلٰی ظِلِّ کَرَمِكَ وَعَفْوِكَ (اقرب) یعنی اے اللہ! مجھے اپنے کرم اور عفو کے سایہ میں پناہ دے۔ پس اٰوَیْنٰھُمَآ اِلٰی رَبْوَۃٍ ذَاتِ قَرَارٍ وَّ مَعِیْنٍ میں اٰوٰی کا لفظ استعمال فرما کر اللہ تعالیٰ نے اس امر کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ اُس نے مسیحؑ اور اُن کی والدہ کو ایک بڑی مصیبت سے نجات دیکر ایسی جگہ پناہ دی جو بلند اور اونچی زمین پر واقع تھی اور جہاں پانی کے چشمے جاری تھے۔ کیونکہ اٰوٰی کے معنے ہی یہی ہوتے ہیں کہ مصیبت سے نجات دیکر پناہ دی۔" اب اگر تاریخی طور پر غور کیا جائے۔ تو معلوم ہو گا کہ واقعہ صلیب سے پہلے حضرت مسیحؑ اور اُن کی والدہ پر کوئی ایسا زمانہ نہیں گذرا جس میں اُن کو کوئی بڑی مصیبت پہنچی ہو۔ اور جس سے اُن کو پناہ دی جانی ضروری ہو۔ صرف صلیب کا واقعہ ایسا تھا جس نے اُن کو اور اُن کی والدہ حضرت مریم صدیقہ کو سخت غم پہنچایا۔ اور چونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے حضرت مسیحؑ کو صلیب سے بچا لیا تھا اس لئے ضروری تھا کہ اب وہ کسی اَور ملک کو ہجرت کر جاتے۔ کیونکہ ملک شام قیصر روم کے ماتحت تھا اور وہ قیصر کے باغی قرار پا چکے تھے۔ اگر حضرت مسیحؑ اس ملک میں رہتے تو دوبارہ گرفتار کر لئے جاتے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے انہیں ہجرت کا حکم دے دیا اور پھر اپنے فضل و احسان سے انہیں ایک ایسے بلند مقام پر جگہ دی جو اُن کے دشمنوں کی دست درازی سے محفوظ تھا۔ اور جہاں خوشگوار پانی کے چشمے بہتے تھے۔ یہ مقام جیسا کہ تاریخی شواہد سے ثابت ہے کشمیر کا علاقہ ہے جسے اعلیٰ درجہ کے چشموں اور سرسبز و شاداب مقامات اور نہایت عمدہ آب و ہوا کی وجہ سے لوگ جنت نظیر قرار دیتے ہیں۔ بلکہ خود کشمیر کا لفظ حضرت مسیحؑ کے سفرِ کشمیر کی طرف صریح اشارہ کرتا ہے۔ کیونکہ کشمیری زبان میں کشمیر کو کشیر کہتے ہیں جو درحقیقت ایک عبرانی لفظ ہے جو کاف اور اشیر سے مرکب ہے کاف کے معنے مانند کے ہیں اور اشیر عبرانی زبان میں ملک شام کو کہتے ہیں۔ پس کشیر کے معنے تھے "ملک شام کی مانند۔" لیکن کثرتِ استعمال سے الف ساقط ہو گیا اور صرف کشیر رہ گیا۔ جسے بعد میں غیر قوموں کے لوگوں نے آہستہ آہستہ کشمیر بنا دیا۔ مگر یہ عجیب بات ہے کہ کشمیری زبان میں اب تک کشمیر کو کشیر ہی کہا جاتا اور اسی طرح لکھا جاتا ہے اور کشمیر کے رہنے والوں کو کشمیری لوگ کاشر کہتے ہیں اور پنجابی لوگ کشمیری کہتے ہیں۔ پھر صرف کشمیر کا لفظ ہی اِس امر کا ثبوت نہیں کہ کسی زمانہ میں عبرانی قوم اسجگہ ضرور آباد رہ چکی ہے بلکہ تاریخی کتب سے صراحتہً ثابت ہے کہ آج سے دو ہزار سال پہلے ایک اسرائیلی نبی کشمیر میں آیا تھا جو بنی اسرائیل میں سے تھا اور شہزادہ نبی کہلاتا تھا اُس کی قبر محلہ خان یار میں ہے جو یوز آسف کی قبر کے نام سے مشہور ہے۔ یہ لفظ جیسا کہ بانیٔ سلسلہ احمدیہ نے اپنی کتب میں لکھا ہے یسوع آصف کا بگڑا ہُوا ہے۔ آصف عبرانی زبان میں اُس شخص کو کہتے ہیں جو اپنی قوم کو تلاش کرنے والا ہو اور یوز کا لفظ یسوع سے بگڑا ہوا ہے گویا مسیح کا یہ نام اس لئے رکھا گیا کہ وہ اسرائیل کے اُن دس قبائل کی تلاش اور اُن کو خدا تعالیٰ کا پیغام پہنچانے کے لئے نکلے تھے جن کو بخت نصر غلام بنا کر لے آیا تھا۔ اور جسے اُس نے مشرق کے علاقوں یعنی افغانستان اور کشمیر میں لا کر بسا دیا تھا۔ حضرت مسیحؑ نے خود ایک موقعہ پر اپنے اِس مشن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ

" مَیں اسرائیل کے گھرانے کی کھوئی ہوئی

يٰۤاَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبٰتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا

(اور ہم نے کہا) اے رسولو! پاک چیزوں میں سے کھاؤ اور مناسب حال عمل کرو۔

اِنِّيْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ ﴿۵۲﴾ وَاِنَّ هٰذِهٖۤ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً

(اور) مَیں اُس کو جو تم کرتے ہو جانتا ہوں۔ اور یہ تمہاری جماعت (یعنی نبیوں کی) ایک ہی جماعت

وَّاحِدَةً وَّاَنَا رَبُّكُمْ فَاتَّقُوْنِ ﴿۵۳﴾ فَتَقَطَّعُوْۤا اَمْرَهُمْ

اور مَیں تمہارا ربّ ہوں پس مجھے ہلاکت سے بچنے کیلئے اپنی ڈھال بناؤ۔ جس پر انہوں نے (یعنی کفار نے) سے

بَيْنَهُمْ زُبُرًا ۭ كُلُّ حِزْبٍۢ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ ﴿۵۴﴾

شریعت کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور جو ٹکڑا اپنے لئے اختیار کیا اُس پر فخر کرنے لگ گئے۔

بھیڑوں کے سوا اور کسی کے پاس نہیں بھیجا گیا۔"

(متی باب ۱۵ آیت ۲۴)

اِسی طرح یوحنا میں حضرت مسیحؑ کا یہ قول درج ہے کہ :—

"میری اور بھی بھیڑیں ہیں جو اس بھیڑخانہ کی نہیں مجھے اُن کا بھی لانا ضرور ہے۔ اور وہ میری آواز سُنینگی۔ پھر ایک ہی گلّہ اور ایک ہی چرواہا ہوگا۔" (یوحنا باب ۱۰ آیت ۱۶)

پھر حضرت مسیحؑ نے اپنے حواریوں کو ایک دفعہ تبلیغی ہدایات دیتے ہوئے فرمایا :—

"غیر قوموں کی طرف نہ جانا۔ اور سامریوں کے کسی شہر میں داخل نہ ہونا بلکہ اسرائیل کے گھرانے کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے پاس جانا"

(متی باب ۱۰ آیت ۶)

اِن حوالہ جات سے یہ امر واضح ہوتا ہے کہ جس طرح فلسطین کے یہود کو حضرت مسیحؑ نے خدا تعالیٰ کا پیغام پہنچایا اِسی طرح اُن کا یہ بھی فرض تھا کہ وہ مشرقی ممالک کے یہود کو خدا تعالیٰ کا پیغام پہنچاتے اور وہ اُن کی آواز پر لبیک کہتے۔ کیونکہ مسیح کے نزدیک فلسطین کی بھیڑوں نے تو اُسے کم ماننا تھا لیکن دوسری بھیڑوں نے اُسکی آواز پر بہت جلد جمع ہو جانا تھا۔ ان پیشگوئیوں کے مطابق اللہ تعالیٰ نے ایسے حالات پیدا کئے کہ فلسطین میں اُن کے خلاف مخالفت کی ایک عام رو چل پڑی۔ یہاں تک کہ حکومت کی طرف سے آپ پر بغاوت کا مقدمہ دائر کیا گیا اور اس کے لئے پھانسی کی سزا تجویز ہوئی مگر جس طرح اللہ تعالیٰ نے یوناہ نبی کو موت کے مونہہ سے بچا لیا تھا اسی طرح حضرت مسیحؑ کو بھی اُس نے صلیبی موت سے بچا لیا۔ اور چونکہ اس کے بعد وہ اپنے ملک میں نہیں رہ سکتے تھے کیونکہ حکومت کی طرف سے جسے پھانسی کا حکم مل چکا ہو وہ اگر بچ بھی رہے تو دوبارہ تختۂ دار پر لٹکایا جاتا ہے۔ اس لئے انہوں نے اس ملک کو چھوڑ دیا۔ اور باوجود اس کے کہ فلسطین سے افغانستان اور کشمیر تک کا راستہ بڑا ہولناک تھا۔ پھر بھی وہ ہجرت کر کے اِن ممالک میں آئے اور جیسا کہ قرآن کریم بتاتا ہے اللہ تعالیٰ نے اُن کے لئے کشمیر کو دارالہجرت بنایا

فَذَرْهُمْ فِيْ غَمْرَتِهِمْ حَتّٰى حِيْنٍ ﴿۵۵﴾ اَيَحْسَبُوْنَ اَنَّمَا

پس تو اُن کو ایک مدت تک اپنی غفلت میں پڑا رہنے دے۔ کیا وہ خیال کرتے ہیں کہ ہمارا

نُمِدُّهُمْ بِهٖ مِنْ مَّالٍ وَّ بَنِيْنَ ﴿۵۶﴾ نُسَارِعُ لَهُمْ فِي

اُن کو مال اور بیٹوں سے مدد دینا اُن کو نیکیوں میں جلد جلد بڑھاتا ہے ؟

الْخَيْرٰتِ ؕ بَلْ لَّا يَشْعُرُوْنَ ﴿۵۷﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ هُمْ مِّنْ

(ایسا نہیں) بلکہ وہ (حقیقت حال کو) سمجھتے نہیں۔ وہ لوگ جو اپنے رب کے

خَشْيَةِ رَبِّهِمْ مُّشْفِقُوْنَ ﴿۵۸﴾ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ

ڈر سے کانپتے ہیں ۔ اور وہ لوگ جو اپنے رب کی آیتوں پر

يُؤْمِنُوْنَ ﴿۵۹﴾ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِرَبِّهِمْ لَا يُشْرِكُوْنَ ﴿۶۰﴾ وَالَّذِيْنَ

ایمان لاتے ہیں ۔ اور جو اپنے رب کا شریک کسی کو نہیں بناتے ۔ اور جو

يُؤْتُوْنَ مَاۤ اٰتَوْا وَّ قُلُوْبُهُمْ وَجِلَةٌ اَنَّهُمْ اِلٰى رَبِّهِمْ رٰجِعُوْنَ ﴿۶۱﴾

خدا تعالیٰ کے بخشے ہوئے مال کو ڈرتے ڈرتے مستحقین کو دیتے رہتے ہیں۔ اور اُنکے دل اس بات سے ڈرتے رہتے ہیں کہ انہیں ایک دن اپنے رب کی طرف لوٹ کر جانا ہے ۔

اُولٰٓئِكَ يُسٰرِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ وَهُمْ لَهَا سٰبِقُوْنَ ﴿۶۲﴾

یہی لوگ نیکیوں میں جلدی کرنے والے ہیں اور وہ اُن (نیکیوں) کی طرف ایک دوسرے سے آگے بڑھتے جا رہے ہیں ؀۱۱

جو ذَاتِ قَرَارٍ وَّ مَعِيْنٍ کا مصداق تھا۔ یعنی وہاں انہوں نے بغیر کسی مزاحمت کے امن و عافیت کے ساتھ رہائش اختیار کر لی۔ اور پھر یہ جگہ ایسی تھی جہاں نہ صرف صاف پانی کے چشمے تھے بلکہ یہ علاقہ اپنی ٹھنڈک اور سرسبزی و شادابی میں ملک شام کی مانند تھا جہاں پہنچ کر اُنکی تمام کلفتیں دُور ہو گئیں اور وہ ایک سَو بیس ۱۲۰ سال کی عمر تک خدا تعالیٰ کا پیغام لوگوں کو پہنچاتے رہے اور آخر انہوں نے یہیں وفات پائی اور سری نگر کے محلہ خان یار میں دفن ہوئے جہاں آج تک اُن کی قبر پائی جاتی ہے۔

؀۱۱ حل لغات

زُبُرًا :— زُبُرًا : زُبُرٌ، زُبْرَةٌ کی جمع ہے اور اس کے معنے ہیں اَلْقِطْعَةُ الضَّخْمَةُ بڑا ٹکڑا (اقرب)

غَمْرَةٌ :— غَمْرَةٌ کے متعلق امام راغب اپنی کتاب مفردات میں لکھتے ہیں کہ جُعِلَ مَثَلًا لِلْجَهَالَةِ الَّتِيْ تَغْمُرُ صَاحِبَهَا۔ یعنی غمرۃ کا لفظ اس غفلت اور جہالت کے لئے استعمال ہوتا ہے جو انسان پر چھا جاتی ہے (مفردات)

تفسیر:۔ اس آیت سے یہ دھوکا نہیں کھانا چاہیئے کہ اس میں صرف نبیوں کو مخاطب کیا گیا ہے کیونکہ قرآن کریم کا یہ قاعدہ ہے کہ اس میں بعض جگہ مخاطب تو نبیوں کو کیا جاتا ہے لیکن مُراد اُن کے سب متبع ہوتے ہیں۔ جیسے قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کرکے فرماتا ہے اِمَّا یَبْلُغَنَّ عِنْدَکَ الْکِبَرَ اَحَدُھُمَآ اَوْکِلٰھُمَا فَلَا تَقُلْ لَّھُمَآ اُفٍّ وَّلَا تَنْھَرْھُمَا وَقُلْ لَّھُمَا قَوْلًا کَرِیْمًا (بنی اسرائیل ع) کہ اگر تیرے والدین میں سے کسی ایک پر یا ان دونوں پر تیری زندگی میں ہی بڑھاپا آجائے تو تُو اُن کی کسی بات پر ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے انہیں اُف تک بھی نہ کہہ اور نہ انہیں سختی سے جھڑک۔ بلکہ ہمیشہ اُن سے نرمی سے بات کیا کر۔ اب اسجگہ خطاب بظاہر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے لیکن مراد آپ کی اُمت کے افراد ہیں۔ کیونکہ آپؐ کے والد تو آپ کی پیدائش سے بھی پہلے اور آپ کی والدہ آپؐ کے بلوغ سے پہلے وفات پا چکی تھیں۔ اِسی قاعدہ کے مطابق گو یہاں رسولوں کو مخاطب کیا گیا ہے لیکن مراد اُن رسولوں کے متبع ہیں اور اللہ تعالیٰ نے انہیں حکم دیا ہے کہ تم حلال اور طیّب اشیاء کھاؤ۔ کیونکہ اس کے نتیجہ میں تم کو نیک اعمال بجالانے کی توفیق ملے گی۔

حقیقت یہ ہے کہ انسان کی خوراک کا اس کے اخلاق پر نہایت گہرا اثر پڑتا ہے اور جس قسم کے اثرات کسی غذا میں پائے جائیں ویسے ہی جسمانی یا اخلاقی تغیرات پیدا ہونے شروع ہو جاتے ہیں۔ چونکہ دنیا میں انسان کو اپنے تمام طبعی جذبات ابھارنے اور اُن کو ترقی دینے کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ وہ اُن کا برمحل استعمال کرکے اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کرسکے اس لئے قرآن کریم نے اُن غذاؤں کے استعمال سے منع فرمادیا ہے جن کا کوئی جسمانی اخلاقی یا رُوحانی ضرر ظاہر ہو۔ مثلاً اللہ تعالیٰ نے مُردار۔ خون اور سؤر کے گوشت کو حرام قرار دیا ہے۔ اِسی طرح ہر ایسی چیز کو بھی حرام قرار دیا گیا ہے جس پر اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اَور کا نام لیا گیا ہو۔ اب ظاہر ہے کہ ان میں سے کوئی چیز بھی ایسی نہیں جو اپنے اندر بہت بڑے نقصانات نہ رکھتی ہو۔ مُردار کو ہی لے لو۔ اگر کوئی جانور مر جائے۔ تو اُس کے متعلق یہی کہا جاسکتا ہے کہ یا تو وہ بالکل بوڑھا ہو کر مرا ہے یا کسی زہریلے جانور کے کاٹنے کی وجہ سے مرا ہے یا کسی بیماری اور زہر کے نتیجہ میں مرا ہے۔ اور یہ ساری چیزیں ایسی ہیں جو اس کے گوشت کو زہریلا اور ناقابلِ استعمال بنا دیتی ہیں۔ اور اگر وہ کسی سخت صدمہ سے مرا ہو مثلاً کنوئیں میں گر کر یا جانوروں کی آپس کی لڑائی میں تب بھی اُس کے خون میں زہر پیدا ہو جاتا ہے جو اس کے گوشت کو ناقابلِ استعمال بنا دیتا ہے۔ اور خون تو اپنی ذات میں ہی ایسی چیز ہے جو کئی قسم کی زہریں اپنے اندر رکھتا ہے۔ اور طبّی لحاظ سے اس کا استعمال صحت کو تباہ کرنے والا ہے۔ یہی حال سؤر کے گوشت کا ہے۔ اس کے استعمال سے بھی کئی قسم کی بیماریاں لاحق ہو جاتی ہیں۔ اور پھر سؤر میں بعض اخلاقی عیوب بھی پائے جاتے ہیں جو اس کا گوشت استعمال کرنے والوں میں منتقل ہو جاتے ہیں۔ اور جو چیز غیر اللہ کے نام پر ذبح کی جائے اس کا استعمال انسان کو بے غیرت بنا دیتا ہے اور اس کے دل سے اللہ تعالیٰ کا ادب دُور کر دیتا ہے۔ اِسی طرح پینے کی چیزوں میں سے اسلام نے شراب کو حرام قرار دیا ہے۔ کیونکہ وہ انسانی عقل پر پردہ ڈالتی اور اُس کی ذہانت اور علم کو نقصان پہنچاتی ہے۔ غرض اللہ تعالیٰ نے جسقدر چیزوں کو حرام قرار دیا ہے اس کی وجہ ان کے جسمانی یا اخلاقی یا روحانی مضرات ہیں اور صرف ایسی ہی اشیاء کا کھانا جائز قرار دیا ہے جو انسان کی جسمانی اخلاقی اور روحانی ترقی کا موجب ہوں

اور پھر حلال اشیاء میں سے بھی طیبات کے استعمال پر زیادہ
زور دیا ہے یعنی ایسی اشیاء پر جو انسان کی صحت اور
اُس کی طبیعت کے مطابق ہوں اور جن کے استعمال سے
اُسے کوئی ضرر لاحق ہونے کا اندیشہ نہ ہو۔ اِس سے
ظاہر ہے کہ اسلام نے اخلاق پر خوراک کے اثر کو تسلیم
کیا ہے اور اس کو خاص قیود اور شرائط سے وابستہ کر کے
اخلاق کے حصول کا ایک نیا دروازہ کھول دیا ہے۔ اسلام
دنیا کے سامنے یہ اصل پیش کرتا ہے کہ انسانی رُوح جسمانی
تغیرات سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتی۔ پس وہ غذا پر
بھی ایک حد تک پابندی عائد کرتا ہے تاکہ معدہ کے
ذریعہ انسانی دل اور دماغ پر بد اثرات نہ پہنچیں اور
اس کی رُوح مردہ ہو کر نہ رہ جائے۔ وہ کہتا ہے کہ
اگر تم حلال کھاؤ گے بلکہ حلال میں سے بھی طیبات کا
استعمال کرو گے تو اس کے نتیجہ میں لازمی طور پر تمہیں عمل صالح
کی توفیق ملے گی۔ جس طرح آجکل کمیونسٹوں سے جہاں بھی کسی کو
بات کرنے کا موقعہ ملے وہ کہتے ہیں کہ اور مسائل کو جانے
دیجیئے سارا جھگڑا ہی پیٹ کا ہے۔ اِسی طرح قرآن کریم
بھی کہتا ہے کہ تمہارا پیٹ ہی اصل چیز ہے مگر انہوں نے
تو یہ کہا ہے کہ جس نے پیٹ کا مسئلہ حل کر لیا وہ کامیاب ہو گیا
اور قرآن کریم یہ کہتا ہے کہ جس نے اپنے پیٹ کو ہر قسم کی گندی
چیزوں سے بچا لیا وہ کامیاب ہو گیا جس نے حلال اور حرام میں
ہمیشہ امتیاز کیا اور جس نے طیّبات کا استعمال ہمیشہ اپنا معمول
رکھا وہی ہے جسے عمل صالح کی توفیق ملتی ہے یعنی نماز کی بھی اُسے ہی
توفیق ملتی ہے جو حلال کھاتا ہے۔ اور روزہ بھی اُسی کو نصیب ہوتا ہے جو
حلال کھاتا ہے اور حج بھی اُسی کو نصیب ہوتا ہے جو حلال کھاتا ہے اور
زکوٰۃ کی بھی اُسی کو توفیق ملتی ہے جو حلال کھاتا ہے۔ غرض کمیونزم تو یہ کہتی ہے
جس نے پیٹ بھرا وہی ہمارا لیڈر اور نجات دہندہ ہے اور قرآن کہتا ہے
کہ جس نے اپنے پیٹ میں حلال ڈالا وہی ہمارا بندہ ہے اور اسکے نتیجہ میں
اس کے لئے نیکیوں کے راستے کھلتے ہیں جب تک وہ اِس امر کی
پرواہ نہیں کرتا کہ اُس کا رزق حلال ذرائع سے کمایا ہوا
ہے یا حرام ذرائع سے اس وقت تک نہ اُس کا لَآ اِلٰہَ
اِلَّا اللّٰہُ کہنا اُسے کوئی فائدہ پہنچا سکتا ہے اور نہ
اسلام کے کسی فرقہ کی طرف اپنے آپ کو منسوب کر کے
وہ خدا تعالیٰ کو خوش کر سکتا ہے۔ خدا تعالیٰ اُسی وقت
خوش ہوگا جب وہ اپنے پیٹ میں حلال روزی ڈالیگا۔
اگر وہ دھوکا بازی کے ساتھ روپیہ کماتا ہے اور حرام
روٹی اپنے پیٹ میں ڈالتا ہے تو اس کا یہ سمجھنا کہ اسکے
نتیجہ میں اُسے نیک اعمال کی بھی توفیق مل جائیگی بالکل غلط
ہے لیکن اگر وہ حلال روزی کھائیگا تو اُس کے نتیجہ میں
اُسے نیک اعمال کی بھی توفیق مل جائیگی۔ یعنی اُس کے بعد
اگر وہ سنوار کر نماز پڑھنا چاہے تو پڑھ سکتا ہے۔ اگر
وہ احتیاط کے ساتھ روزہ رکھنا چاہے تو رکھ سکتا ہے
اگر وہ شرائط کے مطابق زکوٰۃ دینا چاہے تو دے سکتا ہے
یہ نہیں کہ آپ ہی آپ اُس سے یہ اعمال صادر ہونے شروع
ہو جائینگے، آپ ہی آپ کوئی عمل ظاہر نہیں ہو سکتا صرف
اُن کے لئے ایک رستہ کھل جاتا ہے۔ پس اس کے یہ معنے
نہیں کہ اگر ایک ہندو حلال روزی کھائیگا تو وہ نماز پڑھنے
لگ جائیگا۔ یا ایک سکھ حلال روزی کھائیگا تو وہ ذکرِ الٰہی
کرنے لگ جائیگا بلکہ اس کے یہ معنے ہیں کہ اِن نیکیوں کا
راستہ اُس کے لئے کھل جائیگا اور اگر وہ نماز اور روزہ اور
ذکرِ الٰہی کو اختیار کرنا چاہیگا تو اِن نیکیوں کی اُسے توفیق
مل جائیگی لیکن اِس کے بغیر وہ عمل صالح کی اُمید رکھے
تو اُس کی یہ اُمید پوری نہیں ہو سکتی۔ دنیا میں لوگ عام
طور پر پوچھا کرتے ہیں کہ ہم خدا تعالیٰ سے کس طرح محبت
کریں۔ نیکیوں میں کس طرح ترقی کریں۔ گناہوں اور مختلف
قسم کی بدیوں سے کس طرح بچیں۔ اپنے مقاصد میں کامیابی
کس طرح حاصل کریں۔ اللہ تعالیٰ اِن سب سوالات
کا یہ جواب دیتا ہے کہ كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبٰتِ وَاعْمَلُوْا

صَالِحًا۔ اگر تم یہ چاہتے ہو کہ عمل صالح تم سے صادر ہوں تو تم حلال اور طیب چیزیں استعمال کرو۔ اگر تم حرام خوری کروگے تو تم میں دھوکا بھی ہوگا۔ فریب بھی ہوگا۔ دغا بازی بھی ہوگی۔ لالچ بھی ہوگا۔ معاملات میں خرابی بھی ہوگی۔ اس کے بعد یہ امید رکھنا کہ تم نیکیوں میں ترقی کرنے لگ جاؤگے اور خدا تعالےٰ کی محبت تمہارے دلوں میں پیدا ہو جائیگی محض ایک خام خیالی ہے۔ تمہیں دو میں سے ایک چیز بہر حال چھوڑنی پڑے گی۔ یا تو اعمال صالحہ چھوڑنے پڑیں گے اور یا حرام خوری چھوڑنی پڑے گی۔ جو شخص ان دونوں کو اکٹھا کرنا چاہیگا وہ ہمیشہ ناکام ہوگا۔ کامیاب وہی ہوگا جو حرام خوری کو چھوڑ دے اور حلال اور طیب رزق حاصل کرنے کی کوشش کرے۔

پھر فرماتا ہے وَاِنَّ هٰذِهٖٓ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّاَنَا رَبُّكُمْ فَاتَّقُوْنِ۔ یعنی دیکھو یہ تمہاری جماعت ایک ہی جماعت ہے اور میں تمہارا رب ہوں۔ پس مجھے ہلاکت سے بچنے کے لئے اپنی ڈھال بنالو۔ اسجگہ اُمَّةً سے مراد انبیاء کے ماننے والے نہیں بلکہ خود انبیاء مراد ہیں اور اللہ تعالےٰ نے اُمَّةً وَّاحِدَةً کہہ کر اس طرف اشارہ فرمایا ہے کہ تمام انبیاء کی تعلیموں پر غور کرکے دیکھو تو سب کے حالات آپس میں ملتے جلتے ہیں اور ان کے دعوے بھی ملتے جلتے ہیں۔ جس طرح نوحؑ نے توحید کا مسئلہ پیش کیا تھا اسی طرح نوحؑ کے بعد جسقدر نبی آئے انہوں نے بھی یہی تعلیم دی کہ خدا ایک ہے۔ اس کے بعد پھر اور رسول آئے اور وہ بھی یہی تعلیم دیتے رہے اور جو منکر تھے وہ ہلاک ہوتے رہے۔ پھر موسیٰؑ اور ہارونؑ آئے اور انہوں نے بھی ایسی ہی تعلیم دی۔ پھر مریم کے بیٹے مسیحؑ آئے اور ان کو بھی خدا تعالےٰ نے دنیا کے لئے ایک نشان قرار دیا اور دشمنوں سے بچا کر ایک محفوظ جگہ پہنچا دیا۔ پس معلوم ہوا کہ توحید باری تعالےٰ مذہب کا اعلیٰ جزو ہے۔ اور سب نبی اس کی تعلیم دیتے رہے ہیں اور یہ تعلیم دینے والے لوگ ہمیشہ اپنے دشمنوں پر غالب رہے ہیں۔ پھر مسیحؑ کے بعد جو اُن کی اُمت نے یہ بیٹے کا مسئلہ نکالا ہے یہ کس طرح صحیح ہو سکتا ہے؟

اس کے بعد اللہ تعالیٰ اس اختلاف کی وجہ بیان کرتا ہے اور فرماتا ہے فَتَقَطَّعُوْٓا اَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ زُبُرًا۔ یعنی اس اختلاف کی اصل وجہ یہ ہے کہ جب نبی وفات پا گئے اور اُن کی تعلیم پر ایک لمبا زمانہ گذر گیا تو اُن کے ماننے والوں نے ہی غفلت میں مبتلا ہو کر اُن کی تعلیم کو کوئی اور شکل دے دی۔ اور نئے نئے مذہب بن گئے۔ اور چونکہ ہر ایک مذہب میں تھوڑی تھوڑی سچائیاں موجود ہیں۔ اُن کے ماننے والے ان سچائیوں کو پیش کرکے خوش ہیں کہ دیکھو ہم سچے ہیں۔ حالانکہ جب سچے مذہب کے انہوں نے ٹکڑے کئے تو ضرور تھا کہ اُن میں سچائی بھی ہو پس اس سچائی کا وجود اُن کے سچا ہونے کی علامت نہیں۔ سچا وہ ہے جس کے پاس کامل تعلیم ہو۔

پھر فرماتا ہے۔ اَيَحْسَبُوْنَ اَنَّمَا نُمِدُّهُمْ بِهٖ مِنْ مَّالٍ وَّبَنِيْنَ۔ نُسَارِعُ لَهُمْ فِي الْخَيْرٰتِ بَلْ لَّا يَشْعُرُوْنَ۔ یعنی یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ ان کو جو مال ملا ہے اور نہیں اولاد دی گئی ہے وہ ان کی عزت اور وجاہت اور اُن کے درجہ کی بلندی کی وجہ سے ہے حالانکہ وہ جانتے نہیں کہ یہی چیزیں ان کو تباہی کی طرف لے جانے والی ہیں۔

پھر فرماتا ہے ان لوگوں کے مقابلہ میں مومنوں کی یہ حالت ہوتی ہے کہ وہ اپنے رب کے خوف سے ہمیشہ لرزاں رہتے ہیں اور اُس کے نشانوں پر ایمان لاتے ہیں اور خدا تعالےٰ کا کسی کو شریک قرار نہیں دیتے اور ہر قسم کی نیکی کرکے بھی اپنے آپ کو قصور وار ہی سمجھتے ہیں۔ اور خدا تعالےٰ کے سامنے اپنے آپ کو جواب دہ قرار دیتے ہیں۔ یعنی ہر قسم کی نیکیاں بجا لانے کے باوجود اُن میں کبر پیدا

نہیں ہوتا بلکہ اُور بھی انکسار پیدا ہو جاتا ہے اور اُٹھتے بیٹھتے خدا تعالیٰ کا خوف اُن کے دلوں پر مستولی رہتا ہے۔
اِن آیات میں اللہ تعالیٰ نے اس طرف اشارہ فرمایا ہے کہ کفر اور اسلام کے مقابلہ میں اُسی فریق کا انجام اچھا ہوگا جس میں یہ چار خوبیاں پائی جائیں گی۔ اوّل خشیت اللہ دوم ایمان بآیات اللہ۔ سوم شرک سے اجتناب اور چہارم خدمتِ دین اور پھر یہ خوف کہ ہم نے کچھ نہیں کیا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے۔ کہ ایک دفعہ انہوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ کیا وَالَّذِيْنَ يُؤْتُوْنَ مَآ اٰتَوْا وَّ قُلُوْبُهُمْ وَجِلَةٌ کا یہ مطلب ہے کہ انسان جو کچھ چاہے کرے مگر خدا تعالےٰ سے ڈرتا رہے۔ آپ نے فرمایا۔ نہیں۔ اِس سے یہ مراد نہیں بلکہ مراد یہ ہے کہ انسان نیکی کرے اور ساتھ ہی خدا تعالےٰ سے ڈرتا بھی رہے (فتح البیان) اس کے بعد فرماتا ہے کہ یہی لوگ ہیں جو دوڑ کر نیکیوں میں حصّہ لیتے اور ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی کوشش کرتے ہیں۔ گویا مسابقت کی رُوح اُن میں پائی جاتی ہے۔ یہ ایک فطری جذبہ ہے جو ہر انسان کے اندر پایا جاتا ہے اور وہ چاہتا ہے کہ ترقی کے میدان میں دوسروں سے آگے نکل جائے۔ طالب علم اِسی جذبہ کے ماتحت محنت کرتے ہیں اور وہ ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بچّے اِسی جذبہ کے ماتحت کھیلوں میں امتیازی مقام حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ تاجر۔ صنّاع۔ زمیندار ڈاکٹر۔ انجنیئر۔ موجد اور سائنسدان اِسی جذبہ کے ماتحت اپنی تجارت اور صنعت اور زراعت اور طب اور انجنیئرنگ اور سائنس اور ایجادات کے سلسلہ میں ایک دوسرے پر برتری حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ قومیں اور حکومتیں بھی اِسی جذبہ کے ماتحت اپنے اندر زیادہ سے زیادہ طاقت پیدا کرتیں اور دوسروں سے ایک بلند اور نمایاں مقام حاصل کرنا چاہتی ہیں بلکہ اَور تو اَور حیوانوں میں بھی یہ جذبہ پایا جاتا ہے اور وہ بھی مسابقت کی رُوح اپنے اندر رکھتے ہیں۔ اگر دو گھوڑے آگے پیچھے آ رہے ہوں تو فوراً اگلا گھوڑا پچھلے گھوڑے کے پاؤں کی آہٹ پاکر اپنے قدم تیز کر دیتا ہے اور چاہتا ہے کہ دوسرا اُس سے آگے نہ نکل جائے مگر اس کو دوڑتا دیکھ کر پچھلا گھوڑا بھی اپنے قدم تیز کر دیتا ہے۔ پھر بسا اوقات پچھلا گھوڑا آگے نکل جاتا ہے اور اگلا گھوڑا پیچھے رہ جاتا ہے۔

غرض یہ ایک طبعی اور فطری جذبہ ہے جو ہر انسان کے اندر پایا جاتا ہے۔ اسلام نے اسی طبعی جذبہ کی طرف مومنوں کو ان آیات میں توجہ دلائی ہے اور بتایا ہے کہ تمہارا کام ہر میدان میں دوسروں سے آگے نکلنا ہے اگر تم معمار ہو تو تمہاری کوشش یہ ہونی چاہیئے کہ کسی قوم کا معمار تم سے آگے نہ بڑھے۔ اگر تم صنّاع ہو تو تمہاری کوشش یہ ہونی چاہیئے کہ کسی قوم کا صنّاع تم سے آگے نہ بڑھے۔ اگر تم موجد ہو تو تمہاری کوشش یہ ہونی چاہیئے کہ کسی قوم کا موجد تم سے آگے نہ نکل سکے۔ اگر تم ڈاکٹر یا طبیب ہو تو تمہاری کوشش یہ ہونی چاہیئے کہ کسی قوم کا ڈاکٹر اور طبیب تم سے اِس فن میں آگے نہ نکلے۔ اِسی طرح تمہیں دیانت اور امانت میں اتنا اعلیٰ نمونہ پیش کرنا چاہیئے کہ کوئی قوم اس نیکی میں تمہارا مقابلہ نہ کر سکے۔ اگر تم ایسا کروگے تو تم دُنیا کے معلّم اور استاد بن جاؤگے اور لوگ تمہارے پیچھے چلنے پر مجبور ہونگے۔

مجھے یاد ہے مسٹر سٹرک لینڈ کو اپریٹو سوسائٹیز کے ایک انگریز رجسٹرار تھے۔ وہ ایک دفعہ شملہ میں مجھے ملے اور کہنے لگے کہ آپ کی جماعت میں جو چندہ وصول کرنے کا کام کرتے ہیں وہ کس طرح دیانت داری سے کام کرتے ہیں مَیں تو جسے بھی مقرر کرتا ہوں وہ تھوڑے دنوں میں ہی

وَلَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا وَلَدَيْنَا كِتٰبٌ يَّنْطِقُ

اور ہم کسی جان کے ذمہ کوئی کام نہیں لگاتے مگر اُس کی طاقت کے مطابق - اور ہمارے پاس ایک اعمالنامہ ہے جو بالکل سچی سچی بات

بِالْحَقِّ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۶۳﴾ بَلْ قُلُوْبُهُمْ فِيْ غَمْرَةٍ

کہتا ہے - اور اُن پر کوئی ظلم نہیں کیا جائیگا - لیکن اُن کے دل تو اِس تعلیم کے متعلق غفلت

مِّنْ هٰذَا وَلَهُمْ اَعْمَالٌ مِّنْ دُوْنِ ذٰلِكَ هُمْ لَهَا عٰمِلُوْنَ ﴿۶۴﴾

میں پڑے ہوئے ہیں اور اِن کے سوا اُن کے اور بھی بہت سے (خراب) اعمال ہیں جو وہ کر رہے ہیں - ۱۲؎

خائن ثابت ہو جاتا ہے اور مجھے اُسے نکالنا پڑتا ہے - مَیں نے کہا - ہمارے ہاں لوگ اِس لئے بد دیانتی نہیں کرتے کہ اُن کا ایمان ہے کہ بد دیانتی انسان کے ایمان کو ضائع کر دیتی ہے - وہ اُس وقت انگلستان چھٹی پر جا رہے تھے - کہنے لگے اگر مَیں واپس آیا تو مَیں حکومت سے درخواست کرونگا کہ کوآپریٹو سوسائیٹیز کے انسپکٹر پہلے چھ ماہ کے لئے امام جماعت احمدیہ کے پاس بھجوا دیئے جایا کریں تاکہ وہ اُن میں دیانت کی رُوح پیدا کریں - ہماری جماعت کی برتری کا یہ احساس اُس انگریز رجسٹرار کے دل میں اِسی لئے پیدا ہُوا کہ اسلامی تعلیم کے مطابق ہمارا ہر فرد نیکی میں دوسروں سے آگے نکلنے کی کوشش کرتا ہے اور وہ چاہتا ہے کہ کوئی دوسرا شخص اُس سے آگے نہ نکل جائے - اگر یہ جذبۂ مسابقت قومی رنگ میں پیدا ہو جائے اور ہر فرد نیکیوں میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرے تو دنیا کے تمام جھگڑے اور فسادات مٹ جائیں اور امن اور صلح کا دور دورہ ہو جائے - مَیں نے کئی دفعہ اپنی جماعت کے مخالفین کے سامنے یہ بات پیش کی ہے کہ گالیاں دینا اور بُرا بھلا کہنا کوئی خوبی کی بات نہیں اگر تم ہماری جماعت کا مقابلہ کرنا چاہتے ہو تو اِس طرح مقابلہ کرو کہ اگر ہم نے بیرونی ممالک میں سَو جگہ اپنے تبلیغی مشن قائم کئے ہوئے ہیں تو تم دو سَو جگہ اسلام کے تبلیغی مشن قائم کرو - اگر ہم پانچ یا دس ہزار آدمی سالانہ غیر مذاہب میں سے اسلام میں شامل کرتے ہیں تو تم بیس ہزار آدمی سالانہ غیر مذاہب میں سے اسلام میں شامل کرو - اگر ہمارے اندر دو ہزار واقفین زندگی پائے جاتے ہیں تو تم اپنے اندر چار ہزار واقفینِ زندگی پیدا کر کے دکھا دو - اور ہم سے بڑھ کر اسلام اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام پھیلانے کی کوشش کرو - مگر اِس مقابلہ کی طرف کوئی نہیں آتا - گالیاں دیکر اور جھوٹے الزامات لگا کر وہ چاہتے ہیں کہ انہیں غلبہ حاصل ہو جائے مگر اسلام ایسے گندے مقابلوں کی اجازت نہیں دیتا - اسلام کہتا ہے کہ اگر تم نے مقابلہ ہی کرنا ہے تو نیکی اور تقوٰی میں کرو - خدا تعالیٰ کی محبت اور تعلق باللہ میں کرو - اسلام کی اشاعت اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نام کے پھیلانے میں کرو - دنیوی ترقی کی تدابیر میں کرو - اور گندے مقابلوں میں اپنی طاقتیں خرچ نہ کرو -

۱۲؎ حل لغات :- اَلْحَقُّ : حَقَّ کا مصدر ہے اور حَقَّهٗ حَقًّا کے معنے ہیں غَلَبَهٗ عَلَى الْحَقِّ حق کی وجہ سے اُس پر غالب آیا - وَالْاَمْرَ اَثْبَتَهٗ وَ اَوْجَبَهٗ کسی امر کو ثابت کیا اور واجب کیا - كَانَ عَلٰى يَقِيْنٍ مِّنْهُ کسی بات پر یقین سے قائم ہُوا - وَالْحَقُّ

اَلْحَقُّ

ضِدُّ الْبَاطِلِ۔ اور حق کے معنے سچ کے بھی ہیں۔ نیز اس کے معنے اَلْاَمْرُ الْمَقْضِیُّ کے بھی ہیں یعنی فیصلہ شدہ بات۔ اسی طرح اس کے معنے اَلْمَوْجُوْدُ الثَّابِتُ کے بھی ہیں یعنی ایسی چیز جو مضبوط اور قائم رہنے والی ہو۔ اور اس کے معنے عدل۔ مال۔ ملکیت۔ یقین۔ موت اور دانائی کے بھی ہیں (اقرب)

تفسیر: فرماتا ہے۔ ہم نے یہ تو کہا ہے کہ تم نیکیوں میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرو۔ لیکن ہم انسان سے اتنی ہی اُمید کرتے ہیں جتنی اُس میں طاقت ہوتی ہے۔ یہ نہیں کہ کسی سے اُس کی طاقت سے زیادہ کی اُمید کی جائے۔ یا اس کام کے نہ کرنے پر جو اسی کی طاقت سے زیادہ ہو اُسے سزا دی جائے۔ اسلام لوگوں کی طبائع کے اختلاف اور اُن کی طاقتوں کی کمی بیشی کو ملحوظ رکھتا ہے۔ مثلاً نماز کو ہی لے لو۔ یہ اسلام کے بنیادی مسائل میں شامل ہے۔ اور حکم دیا گیا ہے کہ تمام مسلمانوں کو پانچ وقت مساجد میں باجماعت نماز ادا کرنی چاہیئے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا گیا ہے کہ ساری زمین ہی خدا تعالیٰ کی مسجد ہے۔ اگر کسی جگہ مسجد موجود نہیں تو تم نماز کو چھوڑ نہیں سکتے بلکہ جہاں بھی چاہو صاف ستھری زمین پر نماز پڑھ سکتے ہو پھر اگر تم بیمار یا مسافر ہو تو بغیر جماعت کے بھی نماز پڑھ سکتے ہو اسی طرح اسلام نے نماز کیلئے وضو کی شرط رکھی ہے مگر ساتھ ہی کہہ دیا ہے کہ اگر پانی نہ ملے یا پانی کا استعمال طبی نقطۂ نگاہ سے انسان کے لئے مضر ہو تو وہ تیمم کرلے۔ کھڑے ہو کر نماز نہیں پڑھ سکتا تو بیٹھ کر پڑھ لے۔ بیٹھنا بھی دوبھر ہو تو لیٹ کر پڑھ لے۔ لیٹ کر پڑھنا بھی تکلیف دہ ہو تو اشارہ سے پڑھ لے۔ یہی حال روزہ کا ہے۔ اسلام نے رمضان کے روزے رکھنا فرض قرار دیا ہے مگر ساتھ ہی فرمایا ہے کہ اگر تم بیمار ہو یا سفر پر ہو تو بیماری سے اچھا ہونے پر یا سفر سے واپس آنے پر روزہ رکھ لو۔ جہاد پر اسلام نے بڑا زور دیا ہے۔ مگر ساتھ ہی کہہ دیا ہے کہ وہ بیمار اور کمزور اور لولے لنگڑے جو جہاد کرنے کی طاقت نہیں رکھتے لیکن اُن کے دل اس شوق میں تڑپ رہے ہوتے ہیں کہ کاش اُن میں بھی طاقت ہوتی اور وہ بھی جہاد میں شریک ہوتے اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں ویسے ہی جہاد میں شریک سمجھے جاتے ہیں جیسے وہ تندرست لوگ جو اپنی جانوں اور مالوں کو قربان کر رہے ہوتے ہیں۔ چنانچہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ لَا يَسْتَوِي الْقٰعِدُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ غَيْرُ اُولِي الضَّرَرِ (نساء ع۱۳) یعنی مومنوں میں سے جو لوگ خدمتِ دین نہیں کر رہے وہ ان لوگوں کے برابر نہیں ہو سکتے جو اپنی تمام طاقتوں کے ساتھ خدا تعالیٰ کے دین کی خدمت اور اُس کے کلمہ کے اعلاء میں مشغول رہتے ہیں۔ ہاں جو لوگ خدمتِ دین سے اس لئے محروم رہتے ہیں کہ اُنکو کوئی تکلیف لاحق ہے۔ تو اُن کے متعلق یہ حکم نہیں۔ اللہ تعالیٰ اُن کی اِس معذوری کو مدِّ نظر رکھیگا اور انہیں اپنے قرب اور ثواب سے محروم نہیں کرے گا۔

اِسی حقیقت کو قرآن کریم نے اِن الفاظ میں بھی بیان کیا ہے کہ وَالْوَزْنُ يَوْمَئِذِ ۣ الْحَقُّ (اعراف ع۱) یعنی قیامت کے دن جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے جزا دی جائیگی تو اُن تمام امور کو ملحوظ رکھا جائیگا جو انسان کی ترقی میں حائل رہے اور دیکھا جائیگا کہ کن امور کے بجا لانے میں یہ طبعی طور پر معذور تھا اور کن امور کو اس نے غفلت سے ترک کیا۔ غرض قرآن کریم کی یہ خوبی ہے۔ کہ اُس میں فطرتِ انسانی کے کسی پہلو کو نظر انداز نہیں کیا گیا اور کوئی ایسی تعلیم نہیں دی گئی جس پر عمل کرنا طبائع پر گراں ہو بلکہ اُس میں ایسی سہولتیں موجود ہیں جن کی وجہ سے ہر فطرت اور طبیعت کا انسان اس کے احکام پر عمل کر سکتا ہے۔ جس طرح اس مادی عالم میں اللہ تعالیٰ نے ہر قسم کی اشیاء پیدا کر دی ہیں اور کسی فطرت اور طبیعت کا انسان بھی

یہ نہیں کہہ سکتا کہ میری سہولت کیلئے اللہ تعالیٰ نے دنیا میں کوئی چیز پیدا نہیں کی۔ اگر اس کے دانت سخت چیزوں کے چبانے کی طاقت رکھتے ہیں تو سخت چیزیں موجود ہیں اور اگر اُس کے دانت کمزور ہیں اور وہ نرم چیزوں کا محتاج ہے تو نرم نرم چیزوں کی بھی کمی نہیں۔ اسی طرح رُوحانی عالم میں اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کے ذریعہ ہر قسم کے لوگوں کی ترقی کی تعلیم پیش کر دی ہے اور ساتھ ہی ایسی سہولتیں بھی رکھی ہیں جن کی وجہ سے کوئی انسان دیانت داری کے ساتھ یہ نہیں کہہ سکتا کہ اُس کے لئے اسلامی شریعت ناقابلِ عمل ہے۔ کج بحثی اور بہانہ سازی ایک دوسری چیز ہے لیکن جہاں تک احکامِ شریعت کا سوال ہے اُن میں ایسی لچک موجود ہے کہ ہر طبیعت کا انسان بڑی آسانی سے ان پر عمل کر سکتا ہے۔

اس کے مقابلہ میں عیسائیت دنیا کے سامنے یہ تعلیم پیش کرتی ہے کہ

"مسیح جو ہمارے لئے لعنتی بنا اُس نے ہمیں
مول لے کر شریعت کی لعنت سے چھڑایا۔"
(گلتیوں باب ۳ آیت ۱۳)

گویا نعوذ باللہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ذریعہ خدا تعالیٰ نے دنیا کے گلے میں لعنت کا ایک طوق ڈالا تھا جسے مسیح نے اُن کے گلے سے اُتار ڈالا۔ اور انہیں شریعت کے احکام پر عمل کرنے سے نجات دے دی۔ گو یہ خدا تعالیٰ کی قدوسیت اور اُس کی سبوحیت پر بدترین قسم کا الزام ہے کہ اُس نے آنکھیں بند کر کے موسیٰ کے ذریعہ ایسے احکام بھجوا دیئے جن پر لوگوں کے لئے عمل ناممکن تھا۔ اسلام اس گندے عقیدہ کو رد کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ شریعت میں ہمیشہ وہی احکام نازل کئے جاتے ہیں جن پر دنیا عمل کر سکتی ہے۔ پس شریعت لعنت نہیں بلکہ شریعت سے انحراف ایک لعنت ہے جس سے ہر انسان کو بچنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔

پھر فرماتا ہے۔ وَلَدَيْنَا كِتٰبٌ يَّنْطِقُ بِالْحَقِّ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ۔ مفسرین لکھتے ہیں کہ اس جگہ کتاب سے مُراد وہ نامۂ اعمال ہے جو ملائکہ لکھتے رہتے ہیں اور چونکہ ملائکہ یہ کام اللہ تعالیٰ کے حکم سے کر رہے ہیں اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس کتاب کو اپنی طرف منسوب کیا ہے بعض کہتے ہیں کہ اس کتاب سے لوحِ محفوظ مراد ہے اور بعض نے وَلَدَيْنَا كِتٰبٌ سے قرآن کریم مراد لیا ہے۔ نامۂ اعمال کی صورت میں تو اس آیت کے یہ معنے ہونگے کہ قیامت کے دن ہم ایسے امتیازی طریقوں کے ساتھ فیصلہ کرینگے کہ جتنا جتنا کوئی شخص انعام کا حقدار ہو گا اتنا انعام اُس کو مل جائیگا۔ اور کوئی وجہ جو کسی کے غیر مجرم بنانے کی ہو اُسے نظر انداز نہیں کیا جائیگا۔ لیکن چونکہ اس سے پہلے اسلامی شریعت کا ذکر کرتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ اس میں کوئی حکم ایسا نہیں جو ناقابلِ عمل ہو بلکہ ہر طبیعت اور فطرت کا انسان اس پر عمل کر سکتا ہے اس لئے وَلَدَيْنَا كِتٰبٌ سے درحقیقت قرآن کریم ہی مراد ہے اور اللہ تعالیٰ اس میں اسلامی شریعت کی بعض اور خصوصیات پر روشنی ڈالتا ہے۔ مفردات امام راغبؒ جو قرآنی لغت کی ایک مشہور کتاب ہے اُس میں حق کے معنوں پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس کے ایک معنے اُس چیز کے بھی ہوتے ہیں جو حکمت کے مطابق ہو۔ اسی لئے کہا جاتا ہے کہ فِعْلُ اللّٰهِ تَعَالٰى كُلُّهٗ حَقٌّ یعنی اللہ تعالیٰ کا ہر کام حکمت پر مبنی ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں سورج اور چاند کی پیدائش کا ذکر کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ مَا خَلَقَ اللّٰهُ ذٰلِكَ اِلَّا بِالْحَقِّ (یونس ع ۱) اللہ تعالیٰ نے اس سلسلہ کو حق و حکمت کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ یعنی ان چیزوں کی پیدائش بلا وجہ نہیں کی گئی بلکہ ان میں بڑی بھاری حکمتیں رکھی گئی ہیں۔

پھر وہ لکھتے ہیں کہ حق کا لفظ اکمال شریعت کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے هُوَ الَّذِيٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ۔ (مفردات مصنفہ) یعنی وہ خدا ہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا تاکہ وہ اس کو تمام دینوں پر غالب کرے خواہ مشرک لوگ دین کے اس غلبہ کو کتنا ہی ناپسند کریں۔ اِس جگہ اسلام کو دین الحق انہی معنوں میں قرار دیا گیا ہے کہ یہ دین باقی تمام ادیان پر اپنی کامل شریعت کے لحاظ سے غلبہ اور تفوق رکھتا ہے۔ اِن معانی کو ملحوظ رکھتے ہوئے وَلَدَيْنَا كِتٰبٌ يَّنْطِقُ بِالْحَقِّ کے ایک معنے یہ ہونگے کہ ہمارے پاس وہ کتاب ہے جس کے تمام احکام حکمت پر مبنی ہیں اور دوسرے معنے یہ ہونگے کہ ہمارے پاس وہ کتاب ہے جو تمام شریعتوں پر اپنے کامل ہونے کے لحاظ سے افضلیت رکھتی ہے۔ اور یہ دونوں خوبیاں ایسی ہیں جو دنیا کی کسی اَور کتاب میں نہیں پائی جاتیں۔

جہاں تک حکمت اور فلسفہ کا سوال ہے اِس آیت سے یہ نتیجہ مستنبط ہوتا ہے کہ اسلام کے سارے قانون کوئی نہ کوئی خوبی اپنے اندر رکھتے ہیں۔ وہ صرف حکم کے طور پر نہیں دیئے گئے بلکہ انسانی مقاصد اور ضروریات کو مدّنظر رکھتے ہوئے دیئے گئے ہیں۔ دنیا میں بعض دفعہ ایک آقا اپنے نوکر کو حکم دے دیتا ہے کہ یوں کرو۔ مگر اس میں کوئی حکمت نہیں ہوتی یا سزا کے طور پر وہ بعض احکام دے دیتا ہے مگر ان کے پس پردہ بھی کوئی حکمت کام نہیں کر رہی ہوتی۔ مثلاً بعض لوگ جب کسی کو سزا دینا چاہیں تو کہہ دیتے ہیں کہ دیوار کی طرف مُنہ کر کے کھڑے ہو جاؤ۔ اب دیوار کی طرف مُنہ کرانے میں کوئی حکمت نہیں ہوتی محض دوسرے کی تذلیل مدّنظر ہوتی ہے لیکن اسلام کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اِس میں جس قدر احکام دیئے گئے ہیں اُن میں کوئی نہ کوئی حکمت پوشیدہ ہے کوئی نہ کوئی غرض ہے جس کو مدّنظر رکھتے ہوئے وہ احکام دیئے گئے ہیں۔ کوئی حکم نہیں دیا گیا مگر اسی صورت میں کہ اُس کا فائدہ بنی نوع انسان کو پہنچ سکتا تھا اور کسی بات سے نہیں روکا گیا مگر اُسی صورت میں کہ اُس کا نقصان بنی نوع انسان کو پہنچ سکتا تھا اور یہ اسلامی شریعت کی باقی تمام شریعتوں پر ایک امتیازی فوقیت ہے۔ باقی شریعتوں کے احکام کسی حکمت اور فلسفہ کے ماتحت نہیں۔ مگر اسلام نے کوئی حکم بھی ایسا نہیں دیا جس میں کوئی حکمت اور غرض مدّنظر نہ ہو۔ مثلاً نماز کو ہی لے لو۔ اللہ تعالیٰ نے اگر ایک طرف ہمیں نماز پڑھنے کا حکم دیا ہے تو اُس کے ساتھ ہی اُس نے نماز کا فائدہ بھی بیان کر دیا ہے۔ اور فرمایا ہے کہ اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ (عنکبوت ع ۵) نماز انسان کو بے حیائی اور ناپسندیدہ باتوں سے روکتی ہے۔ یعنی نماز میں ایسی تعلیمیں دی گئی ہیں اور ایسے اعلیٰ اور بلند مقاصد انسان کے سامنے رکھے گئے ہیں کہ اگر انسان صحیح طور پر نماز پڑھے تو یقیناً وہ فحشاء اور منکر سے بچ جائے گا۔ فَاحِشَۃٌ کے معنے ہوتے ہیں مَا اشْتَدَّ قُبْحُهٗ مِنَ الذُّنُوْبِ (اقرب) ہر وہ فعل جو بہت ہی معیوب ہو اور جس کا عیب اتنا ظاہر ہو کہ لوگ اس کی طرف انگلیاں اٹھانے لگ جائیں اور کہنے لگیں کہ دیکھو یہ کتنی بُری حرکت ہے اور مُنْكَرٌ کے معنے ہوتے ہیں مَا لَيْسَ فِيْهِ رِضَى اللّٰهِ مِنْ قَوْلٍ اَوْ فِعْلٍ (اقرب) ہر ایسا قول یا فعل جو اللہ تعالیٰ کو ناپسند ہو۔ یہ نماز کا فائدہ ہے جو قرآن کریم نے بیان کیا۔ اب اگر ہم اور احکام کو جانے دیں اور صرف اِسی حکم پر غور کریں۔ تو اِس حکم میں ہی ہمیں اسلام کی فضیلت نہایت نمایاں طور پر دکھائی دیتی ہے

اور ہمیں تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ واقعہ میں اگر کوئی شخص سچے دل سے نمازیں پڑھے تو وہ فحشاء اور منکر سے بچ جائیگا۔ ہر مسلمان دن رات میں پانچ نمازیں پڑھتا ہے اور ہر نماز میں کچھ فرض ہوتے ہیں اور کچھ سنتیں ہوتی ہیں۔ اور کچھ نوافل ہوتے ہیں۔ اور پھر تہجد اور اشراق وغیرہ کی بھی نمازیں ہیں۔ ان سب نمازوں میں وہ سورۂ فاتحہ پڑھتا ہے اور نماز کی ہر رکعت میں اللہ تعالیٰ سے یہ دُعا کرتا ہے کہ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ۔ یعنی اے خدا! میری زندگی میں بعض کام بُرے ہونگے اور بعض اچھے ہونگے بعض ایسے ہونگے جو پسندیدہ ہونگے اور اعلیٰ درجہ کے اخلاق کے مطابق ہونگے۔ اور بعض ایسے ہونگے جو ناپسندیدہ ہونگے اور اخلاقی معیار سے گرے ہوئے ہونگے۔ الٰہی میری دُعا تجھ سے یہ ہے کہ تُو ہمیشہ میرا قدم ایسے راستہ پر رکھیو جو صراطِ مستقیم ہو جس پر چلنے کے نتیجہ میں کسی قسم کا ظلم نہ ہو کسی قسم کی تعدی نہ ہو کسی قسم کی بے حیائی نہ ہو اور جس پر چل کر مَیں ہر قسم کے نقصانات سے محفوظ رہوں۔ اب جو شخص دن رات اللہ تعالیٰ سے یہ دُعا کرتا رہیگا اور دُعا بھی سچے دل سے کرے گا وہ برائیوں اور گناہوں میں ملوث ہی کس طرح ہو سکتا ہے۔ اگر اس کے سامنے شہوات کا سوال آئیگا تو فوراً اُس کے دل میں خیال پیدا ہوگا کہ مَیں سیدھے راستہ پر چلوں یعنی شہوات کو پورا کرنے کے جو حلال طریق اللہ تعالیٰ نے بتائے ہیں اُنکو اختیار کروں۔ ناجائز اور حرام راستہ اختیار نہ کروں۔ کھانے پینے کا سوال آئیگا تو فوراً اُس کے سامنے اللہ تعالیٰ کا یہ حکم آجائیگا کہ كُلُوْا وَ اشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا۔ (اعراف ع ۳) کھاؤ اور پیئو مگر اسراف سے کام نہ لو۔ معاملات کی طرف آئیگا تو فوراً اس کے سامنے یہ بات آجائیگی کہ مَیں نے دھوکا بازی نہیں کرنی۔ دغا اور فریب سے کام نہیں لینا کیونکہ ایسا کرنا ظلم ہے۔ غرض جو شخص یہ سمجھ کر دُعا کریگا کہ مَیں نماز پڑھ رہا ہوں مسخر نہیں کر رہا ہنسی نہیں کر رہا۔ دین سے تلعب نہیں کر رہا۔ وہ کھانے پینے کے معاملات میں دوستوں کے تعلقات میں۔ بیوی بچوں سے سلوک کرنے میں۔ شہریت کے حقوق اور فرائض ادا کرنے میں۔ غیر ممالک اور اقوام سے تعلقات رکھنے میں ہمیشہ یہ غور کرتا رہیگا کہ مَیں وہ راستہ اختیار کروں جو سیدھا ہے اور جس میں کسی قسم کی کجی نہیں پائی جاتی۔ آخر جو شخص خدا سے کچھ مانگے گا۔ وہ خود اُس کے مطابق عمل کرنے کے لئے کیوں تیار نہیں ہوگا۔ کیا کوئی شخص کبھی یہ دُعا کیا کرتا ہے کہ یا اللہ مجھے ہیضہ ہو جائے؟ وہ کیوں یہ دُعا نہیں کرتا اس لئے کہ وہ ہیضہ کو بُرا سمجھتا ہے۔ اگر وہ اچھا سمجھتا تو اللہ تعالےٰ سے ضرور مانگتا۔ پس وہی چیز انسان اللہ تعالےٰ سے مانگتا ہے جسے وہ اپنے لئے اچھا سمجھتا ہے۔ اور جب وہ کسی چیز کو اچھا سمجھیگا تو لازماً اُس کو حاصل کرنے کی کوشش بھی کریگا۔ پھر یہیں تک بس نہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ سے یہ دُعا کرتا ہے کہ الٰہی مجھے سیدھے راستے پر چلا بلکہ وہ ساتھ ہی یہ دُعا بھی کرتا ہے کہ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ۔ الٰہی میری یہی خواہش نہیں کہ تُو مجھے سیدھے راستے پر چلنے کی توفیق عطا فرما۔ بلکہ میری یہ بھی خواہش ہے کہ تُو مجھے اُن لوگوں کے راستہ پر چلا جو تیرے دربار میں خاص طور پر مقرب ہیں۔ مَیں عام لوگوں کے راستہ پر نہیں چلنا چاہتا۔ مَیں درمیانی درجہ کے لوگوں کے راستہ پر بھی نہیں چلنا چاہتا بلکہ مَیں اُن اعلیٰ درجہ کے لوگوں کے نقشِ قدم پر چلنے کی خواہش رکھتا ہوں جنہوں نے تجھ سے انعامات حاصل کئے اور جو منعم علیہ گروہ میں شامل ہوئے۔ دوسری جگہ اللہ تعالیٰ منعم علیہ گروہ کا ذکر کرتے ہوئے فرماتا ہے۔ اُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِنَ النَّبِيّٖنَ وَ

الصِّدِّيْقِيْنَ وَ الشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ (نساء ع)
یعنی منعم علیہ گروہ وہ ہے جس میں نبی صدیق شہید اور صالح شامل ہیں۔ پس یہی نہیں کہ ہر مومن نماز میں پانچ وقت اللہ تعالےٰ سے یہ دُعا کرتا ہے کہ یا اللہ مجھے بدی سے بچا۔ یہی نہیں کہ ہر مومن نماز میں اللہ تعالیٰ سے دُعا کرتا ہے کہ یا اللہ مجھے نیکی کی توفیق عطا فرما بلکہ ہر مومن نماز میں اللہ تعالیٰ سے یہ دُعا کرتا ہے کہ یا اللہ مجھے موسیٰؑ اور عیسیٰؑ والی نیکی دے۔ یا اللہ مجھے اُسی طرح گناہ سے بچا جس طرح تُونے نوحؑ اور یعقوبؑ اور یُوسفؑ اور دوسرے انبیاء کو بچایا۔ یہ کتنا بلند مقام ہے جس کو حاصل کرنے کی دُعا سکھائی گئی ہے اور کتنا جوش ہے جو اس میں پایا جاتا ہے۔ اگر کوئی شخص سچے دل سے نماز پڑھتا ہے تو لازمی طور پر وہ اس مقام کے حصول کے لئے کچھ تو جدوجہد کریگا۔ اور جب وہ جدوجہد کریگا تو لازمی طور پر وہ اُن دوسروں کی نسبت جن کے دلوں میں یہ جوش نہیں پایا جاتا بہتر حالت میں ہوگا۔ اور اس دُعا کے نتیجہ میں وہ ہر قسم کی بدیوں سے بچ جائیگا اور ہر قسم کی نیکیوں کو حاصل کریگا۔ پھر ہمیں کہا گیا ہے کہ ہم نماز میں اللہ تعالےٰ سے یہ دُعا کیا کریں کہ اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ اے خدا "ہم" تیری عبادت کرتے ہیں اور اے خدا "ہم" تجھ سے ہی مدد طلب کرتے ہیں۔ اسی طرح اگلی آیت میں یہ دُعا سکھائی گئی ہے کہ اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ۔ اے خدا "ہم" کو سیدھے راستے پر چلنے کی توفیق عطا فرما۔ اب نماز میں دُعا مانگنے والا شخص تو ایک ہوتا ہے مگر وہ بار بار "ہم" کا لفظ استعمال کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے۔ اے خدا "ہم" تیری عبادت کرتے ہیں۔ "ہم" تجھ سے مدد طلب کرتے ہیں۔ "ہم" تجھ سے دُعا کرتے ہیں کہ "ہم" کو سیدھا راستہ دکھا۔ ہمیں غور کرنا چاہیئے کہ اِس سے کیا مُراد ہے اور کیوں ہمیں بار بار "ہم" کا لفظ استعمال کرنے کی تاکید کی گئی ہے۔ اگر ہم سوچیں تو ہمیں تسلیم کرنا پڑیگا کہ یا تو اس سے ساری دُنیا کے لوگ مراد ہیں یا سارے مسلمان مراد ہیں یا سارے شہر والے مُراد ہیں یا سارے محلہ والے مُراد ہیں یا اپنی حکومت کے سب افراد مراد ہیں۔ بہر حال جب ایک شخص نماز میں "ہم" کا لفظ استعمال کرے تو ہمیں تسلیم کرنا پڑے گا کہ وہ اپنی دُعا میں اُن لوگوں کو بھی شریک کرتا ہے جو اس کے علاوہ ہیں۔ وہ نماز میں بڑے جوش اور درد سے یہ دُعا کر رہا ہوتا ہے۔ کہ الٰہی ہماری مدد کر۔ الٰہی ہمیں سیدھا راستہ دکھا۔ الٰہی ہمیں بدیوں سے بچا۔ الٰہی ہمیں اعلیٰ درجہ کی نیکیوں کی توفیق عطا فرما اور اُس کے پاس کھڑا ہوا ایک دوسرا شخص یہ خیال کر رہا ہوتا ہے کہ نماز جلدی ختم ہو تو مَیں گھر جاؤں۔ مَیں نے جانوروں کو چارہ ڈالنا ہے۔ یا میری بیوی بیمار ہے اُس کے لئے ڈاکٹر سے دوائی لانی ہے۔ وہ بظاہر نماز پڑھ رہا ہوتا ہے لیکن درحقیقت اس کی وجہ کسی اَور طرف ہوتی ہے۔ اگر اُس کے ساتھ کھڑا ہونے والا مومن بندہ اپنی دُعا میں اُسے بھی شریک کر رہا ہوتا ہے جسے نماز کا کچھ بھی خیال نہیں ہوتا جسے نماز میں بھی خدا یاد نہیں آتا۔ اور وہ اللہ تعالیٰ سے یہ دُعا کرتا ہے کہ یا اللہ تُو اِسے بھی ہدایت دے یا اللہ تو اِس کے سینہ کو بھی نیکی کے لئے کھول دے۔ پھر جب ہم نماز میں "ہم" کا لفظ استعمال کرتے ہیں تو اس میں ہمارے محلّہ والے بھی شریک ہوتے ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ محلّہ والوں میں سے چند آدمی تو نماز کیلئے مسجد میں آجاتے ہیں لیکن باقی آدمی اپنے اپنے کاروبار میں مشغول رہتے ہیں اور پھر اُنکی حالت یہ ہوتی ہے کہ وہ بات بات پر جھوٹ بولتے ہیں کوئی شخص قسم کھا کر کہہ رہا ہوتا ہے کہ مَیں نے چار آنے کو یہ چیز لی تھی جو سوا چار آنے کو فروخت کر رہا ہوں اور صرف ایک پیسہ نفع لے رہا ہوں۔ حالانکہ اُس نے وہ چیز صرف ڈیڑھ آنہ میں لی ہوتی ہے اور اُس کا یہ کہنا کہ مَیں نے چار آنہ کو یہ چیز لی تھی محض جھوٹ ہوتا ہے۔ کوئی شخص کہہ رہا ہوتا ہے کہ یہ بالکل خالص گھی ہے حالانکہ اُس گھی میں

اُس نے خود چھپی ہوئی ہوتی ہے بغرض اُس کے دل کے کسی گوشہ میں بھی خدا تعالیٰ کی خشیت نہیں ہوتی مگر ہم اللہ تعالیٰ کے حضور جاتے ہیں تو کہتے ہیں اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ خدایا ہمارے محلہ کے وہ آدمی جو غلطی سے نماز میں نہیں آتے اور جو جھوٹ بول بول کر اپنی عاقبت خراب کر رہے ہیں تو اُن کو بھی ہدایت دے اور انہیں سیدھے راستہ پر چلا۔ اگر کوئی شخص اس طرح غور کر کے نماز پڑھے تو اس کے دل میں بنی نوع انسان کی محبت کس قدر بڑھ جائیگی اُنکی اصلاح کا جذبہ اُس کے دل میں کسقدر ترقی کر جائیگا اور وہ کسقدر تڑپ رکھے گا کہ سب لوگ راہ راست پر آ جائیں - اور ہر قسم کی بدیوں اور گناہوں سے محفوظ ہو جائیں - پھر جو شخص اپنے ہمسایوں، اپنے محلہ والوں اور اپنے شہر والوں کے لئے اِس طرح دُعائیں کریگا ضروری ہے کہ اُس کی یہ دُعائیں کسی دن قبول ہوں اور اُن کو ہدایت میسر آ جائے۔ آخر ہم یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ یہ دُعا کبھی قبول نہیں ہو سکتی اگر اِس دُعا نے قبول ہی نہیں ہونا تھا تو اللہ تعالیٰ نے یہ دُعا ہمیں سکھائی کیوں؟ اِس کا سکھانا بتاتا ہے کہ یہ دُعا قبول ہونے والی ہے اور جب یہ دُعا قبول ہونے والی ہے تو ضروری ہے کہ اس دُعا کے نتیجہ میں کسی دن دوسروں کو ہدایت میسر آ جائے کبھی کسی واعظ کا وعظ سُنکر ہدایت حاصل ہو جاتی ہے اور کبھی گھر میں کوئی مصیبت آتی ہے، تو انسان اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔ بہر حال کسی نہ کسی ذریعہ سے جب بھی دوسرے شخص کو ہدایت میسر آئیگی تو چونکہ یہ ہدایت اس دُعا کے نتیجہ میں ہو گی اس لئے نماز صرف نماز پڑھنے والے کو ہی بدیوں سے روکنے والی نہیں ہو گی بلکہ دوسروں کو بھی بدی اور بے حیائی کے کاموں سے روکنے والی بن جائیگی - پھر اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ میں صلوٰۃ کے معنے جہاں اللہ تعالیٰ کی عبادت کے ہیں وہاں اس کے ایک معنے دُعا کے بھی ہیں اور اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ یہ نماز جو ہم نے تمہیں سکھائی ہے اپنے دونوں معنوں کے لحاظ سے فحشاء اور منکر سے بچاتی ہے۔ اگر عبادت مراد لو تو جب کوئی شخص اخلاص اور محبت سے خدا تعالیٰ کی درگاہ میں بار بار جائیگا تو لازمی طور پر وہ کوشش کریگا کہ میں بُرائی اور بے حیائی کے کاموں سے الگ رہوں اور اِس طرح نماز اُسے گناہوں سے محفوظ کرنے والی بن جائیگی۔ اور اگر دُعا مراد لو تب بھی نماز انسان کو فحشاء اور منکر سے بچانے والی ہے کیونکہ نماز میں بار بار یہ دُعائیں آتی ہیں کہ الٰہی مجھ پر بھی رحم فرما۔ میرے ہمسایہ پر بھی رحم فرما۔ میرے اہل ملک پر بھی رحم فرما۔ میرے دوستوں اور عزیزوں پر بھی رحم فرما۔ اگر ساری عمر میں ایک دفعہ بھی یہ دعا قبول ہو جائے تو کم از کم اس کے ذریعہ ایک آدمی تو ضرور ہدایت پا جائیگا اور اس طرح یہ نماز جہاں خود اُس کی ذات کیلئے ہدایت کا موجب ہو گی وہاں دوسرے لوگوں کے لئے بھی ہدایت کا موجب بن جائیگی - اور انہیں فحشاء اور منکر سے بچانے والی ہو گی حقیقت یہ ہے کہ اگر آج ساٹھ کروڑ مسلمان سچے دل سے نمازیں پڑھنے لگ جائیں - اور ایک شخص کی دُعا سے ایک شخص کو ہی ہدایت میسر آ جائے - تب بھی ساٹھ کروڑ مسلمان اِس دُعا کی برکت سے ایک ارب بیس کروڑ بن جاتے ہیں- اور اسلام کے غلبہ اور اُس کی شوکت میں کوئی کسر باقی نہیں رہتی- اِس موقعہ پر بعض لوگ کہا کرتے ہیں کہ ہم تو نمازوں میں دُعائیں مانگتے ہیں مگر ہماری دُعائیں قبول نہیں ہوتیں ایسے لوگوں کو یاد رکھنا چاہیئے کہ یہ دُعا کا قصور نہیں- دُعا مانگنے والے کا قصور ہے - وہ مانگ یہ رہے ہوتے ہیں اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ مگر ان کے دلوں میں دعاؤں کی قبولیت کا کوئی یقین نہیں ہوتا اور جب انہیں اللہ تعالیٰ کی ذات پر یقین ہی نہ ہو تو وہ انہیں دے کیوں؟ جب آپ ہی وہ اللہ تعالیٰ پر بدظنی رکھتے ہوں اور جب آپ ہی وہ اُس کی طاقتوں کے

منکر ہوں تو اللہ تعالیٰ اُن کی دُعا کو قبول کیوں کرے؟ اس کے مقابلہ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ نے بھی یہی کہا تھا کہ الٰہی ہمیں سیدھا راستہ دکھا۔ مگر اس کے نتیجہ میں سارا عرب مسلمان ہو گیا۔ سارا شام مسلمان ہو گیا سارا فلسطین مسلمان ہو گیا۔ سارا مصر مسلمان ہو گیا۔ سارا ایران مسلمان ہو گیا۔ آخر فلسطین اور شام اور مصر اور ایران اور عراق کے لوگوں کو اس زمانہ کے لوگوں سے کوئی علیحدہ دماغ تو نہیں ملا ہوا تھا جو بدیاں آج یورپ اور امریکہ میں پائی جاتی ہیں وہی اُن لوگوں میں پائی جاتی تھیں۔ پھر اُن لوگوں کو کیوں ہدایت ملی؟ اسی لئے کہ اُس زمانہ میں مسلمان نمازیں پڑھتے تھے تو وہ یقین رکھتے تھے کہ خدا تعالیٰ ہماری دعاؤں کو سُننے والا ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ دل میں درد بھی اُسی وقت پیدا ہوتا ہے جب انسان کو خدا تعالیٰ کی ذات پر یقین کامل ہو۔ فرض کرو ایک شخص پر ڈاکو حملہ کرتا ہے اور وہ اُس سے ڈر کر بھاگتا ہے اور اپنی حفاظت اور بچاؤ کے لئے ایک مکان کے پاس پہنچ کر دستک دیتا اور زور زور سے مالکِ مکان کو آوازیں دیتا ہے تو جس درد سے وہ اُس وقت یہ کہہ رہا ہوگا کہ خدا کے واسطے دروازہ کھولو وہ بالکل اَور قسم کا ہوگا۔ لیکن اگر وہی شخص بھاگتے ہوئے ایک چٹان کی طرف چلا جاتا ہے اور یونہی اُس ڈاکو کو ڈرانے کے لئے آوازیں دینا شروع کر دیتا ہے کہ دروازہ کھولو تو چونکہ وہ جانتا ہوگا کہ اسجگہ کوئی آدمی نہیں اسلئے باوجود اس کے کہ وہ کوشش کریگا کہ زور زور سے آوازیں دے اور ڈاکو پر یہ اثر ڈالے کہ مَیں کسی آدمی کو اپنی مدد کے لئے بلا رہا ہوں پھر بھی اس کی آواز میں درد نہیں ہوگا کیونکہ وہ جانتا ہوگا کہ یہاں آدمی کوئی نہیں۔ مَیں محض ڈرانے کے لئے یہ شور مچا رہا ہوں۔ اسی طرح اگر کوئی شخص اس اخلاص سے نمازیں پڑھتا ہے کہ واقعہ میں خدا میری دُعاؤں کو سُن رہا ہے تو اُس کے اندر جو درد اور جوش پیدا ہوگا وہ اُس شخص کے اندر کہاں پیدا ہو سکتا ہے جو محض بناوٹ اور ریاء کے لئے نمازیں پڑھتا ہے اور دل میں اللہ تعالیٰ کی ذات اور اُس کی قدرتوں پر کوئی یقین نہیں رکھتا۔

اِسی طرح روزہ ہے۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم نے روزے تم پر اس لئے فرض کئے ہیں کہ لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ تاکہ تم میں تقویٰ پیدا ہو۔ روزہ کے معنے یہ ہوتے ہیں کہ پانی ہمارے گھر میں موجود ہوتا ہے۔ روٹی ہمارے گھر میں موجود ہوتی ہے مگر ہم محض خدا تعالیٰ کی رضا کے لئے اپنے گھر کے پانی اور اپنے گھر کی روٹی کو چھوڑ دیتے ہیں۔ اَب جو شخص سچے دل سے روزہ رکھیگا اور خدا تعالیٰ کی رضا کے لئے اپنی روٹی اور اپنے پانی کو بھی چھوڑ دیگا وہ دوسرے کی روٹی کیوں کھائیگا۔ جس شخص کے اندر اتنا اخلاص پیدا ہو جائے کہ وہ خدا تعالیٰ کی رضاء کے لئے اپنا مال بھی استعمال نہ کرے وہ کب یہ کوشش کر سکتا ہے کہ دوسروں کے اموال کو لوٹ لے۔ دوسروں کے مال کو لوٹنے کی وہی شخص کوشش کرتا ہے جو روزہ نہیں رکھتا یا روزہ تو رکھتا ہے مگر صرف رسمی طور پر رکھتا ہے۔ روزہ کی حقیقت اور اُس کی غرض کو مدّنظر نہیں رکھتا۔ اور ایسا روزہ درحقیقت کوئی روزہ نہیں۔ خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ روزہ یہ نہیں کہ تم بھوکے اور پیاسے رہو اور عملی طور پر دنگا اور فساد کرتے رہو یا گالی گلوچ سے کام لیتے رہو۔ اگر تم ایسا کرتے ہو تو تم روزہ نہیں رکھتے بلکہ محض بھوکے اور پیاسے رہتے ہو۔

اِسی طرح قرآن کریم میں آتا ہے کہ لوگ قربانیاں کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ محض اِن قربانیوں کی وجہ سے ہمارا خدا ہم سے راضی ہو جائیگا۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ لَنْ یَّنَالَ اللّٰہَ لُحُوْمُھَا وَلَا دِمَآؤُھَا وَلٰکِنْ یَّنَالُہُ التَّقْوٰی مِنْکُمْ (حج ع ۵) قربانی کا گوشت ہمارے پاس نہیں آتا بلکہ قربانیوں کے ساتھ جسقدر تقویٰ

تمہارے دل میں ہوتا ہے وہ ہمارے پاس آتا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ ایک دوسرے مقام پر فرماتا ہے کہ فَإِذَا وَجَبَتْ جُنُوبُهَا فَكُلُوا مِنْهَا وَأَطْعِمُوا الْقَانِعَ وَالْمُعْتَرَّ (حج ۴ ع) یعنی جب قربانی کے جانوروں کے پہلو زمین پر لگ جائیں۔ تو ان کا گوشت تم خود بھی کھاؤ اور انکو بھی کھلاؤ جو اپنی غربت سے پریشان ہیں۔ اِس آیت میں اللہ تعالیٰ نے قربانی کا فلسفہ بیان کر دیا ہے اور بتایا ہے کہ ہم نے تمہیں اس کا کیوں حکم دیا ہے۔ کئی لوگ اعتراض کیا کرتے ہیں کہ قربانی میں کیا رکھا ہے۔ سارا سال جب لوگ گوشت کھاتے رہتے ہیں تو ایک خاص دن جانوروں کو قربان کرنیکا حکم دینے کے معنے ہی کیا ہوئے؟ ایسے لوگ یہ نہیں سمجھتے کہ قربانی کا حکم اللہ تعالیٰ نے غرباء کو مدّنظر رکھتے ہوئے دیا ہے۔ جنہیں اور دنوں میں بہت کم گوشت کھانے کو میسر آتا ہے۔ امراء تو سال بھر گوشت کھاتے رہتے ہیں لیکن غرباء نے بعض دفعہ مہینوں گوشت کی شکل تک نہیں دیکھی ہوتی۔ ایسے لوگوں کے لئے اللہ تعالیٰ نے حج کے موقعہ پر عقیقہ کے موقع پر اور شادی بیاہ کے موقعہ پر قربانی کرنیکا حکم دے دیا۔ احادیث میں ذکر آتا ہے کہ ایک دفعہ ایک صحابیؓ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انہوں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! میں نے شادی کرلی ہے۔ آپ نے فرمایا۔ تم نے کسی کنواری لڑکی سے شادی کی ہے یا بیوہ سے اُس نے کہا یا رسول اللہ! میرے بھائی یتیم رہ گئے تھے میں نے اُن کی پرورش کو مدّنظر رکھتے ہوئے ایک بیوہ سے شادی کی ہے تاکہ اُن کی بھی پرورش ہو جائے اور بیوہ سے شادی کرنیکا ثواب بھی مجھے مل جائے۔ آپؐ نے فرمایا۔ تم نے بڑے ثواب کی بات کی ہے لیکن دیکھو أَوْلِمْ وَلَوْ بِشَاةٍ اب ولیمہ کرو خواہ تمہیں ایک بکری ہی مل جائے۔ یعنی اگر زیادہ جانور خریدنے کی تم میں استطاعت نہیں تو کم از کم ایک بکری ہی ذبح کرکے ولیمہ کردو۔ اسی طرح اسلام نے عقیقہ کے موقعہ پر جانوروں کی قربانی کا حکم دیا ہے۔ بعض گناہ ایسے ہیں جن کا کفارہ اسلام نے یہی قرار دیا ہے کہ جانوروں کو قربان کیا جائے صدقۃ الفطر میں بھی یہی حکمت ہے کہ عید کے موقعہ پر غرباء ان روپیہ سے اپنے لئے گوشت وغیرہ خرید سکتے ہیں۔ اگر اسلام میں قربانیوں کے یہ احکام نہ ہوتے تو امراء آپ ہی گوشت کھاتے رہتے اور غرباء کا انہیں کبھی خیال بھی نہ آتا۔

غرض جسقدر احکام اسلام میں پائے جاتے ہیں ان سب میں حکمتیں ہیں اور یہی بات اللہ تعالےٰ نے اِس آیت میں بیان فرمائی ہے کہ وَلَدَيْنَا كِتٰبٌ يَّنْطِقُ بِالْحَقِّ ہمارا کوئی حکم ایسا نہیں جس میں کوئی حکمت اور فلسفہ نہ ہو اور جسکا کسی نہ کسی رنگ میں بنی نوع انسان کو کوئی نہ کوئی فائدہ نہ پہنچتا ہو۔ یہ کبھی نہیں ہوسکتا کہ لوگ تو قرآنی احکام پر عمل کریں اور انہیں نقصان ہو۔ ان احکام پر عمل کرنے کے نتیجہ میں ہمیشہ فائدہ ہی فائدہ انکو ہوگا اور برکت ہی برکت ان کو ملے گی۔

دوسرے معنوں کے لحاظ سے اِس آیت کا یہ مفہوم ہے کہ یہ کتاب ایک کامل شریعت کی حامل ہے اور اِس کی کوئی تعلیم ایسی نہیں جو مرورِ زمانہ سے باطل ہوسکے۔ بلکہ ہر زمانہ میں اس کے پیش کردہ نظریات دنیا پر غالب رہینگے اور کبھی ایسا وقت نہیں آئیگا کہ دنیا کو اِس میں کسی تبدیلی کی ضرورت محسوس ہو۔ چنانچہ لغتِ عرب میں حق کے ایک معنے اَلْمَوْجُوْدُ الثَّابِتُ کے بھی لکھے ہیں۔ یعنی ایسی چیز جو مضبوط اور قائم رہنے والی ہو (اقرب)۔ اِسی طرح اِس کے ایک معنے اَلْاَمْرُ الْمَقْضِيُّ کے بھی ہیں یعنی قطعی اور فیصل شدہ امر۔ اور فیصل شدہ بات وہی ہوتی ہے جس میں کوئی تبدیلی ناممکن ہو۔ اور قائم بھی اسی چیز کو رکھا جاتا ہے جو اپنی ذات میں مکمل ہو۔ پس وَلَدَيْنَا كِتٰبٌ يَّنْطِقُ بِالْحَقِّ میں قرآن کریم کی اکملیت کا دعویٰ کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ یہ دنیا کیلئے آخری اور کامل ہدایت نامہ ہے۔ جیسا کہ ایک دوسرے مقام پر

اس دعویٰ کو اِن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے کہ اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا (مائدہ ع) یعنی آج میں نے تمہارا دین تمہارے لئے مکمل کر دیا ہے اور اپنی نعمت کا تم پر اتمام کر دیا ہے اور تمہارے لئے اسلام کو ایک دین کے طور پر پسند کر لیا ہے۔ یہ آیت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر حجۃ الوداع کے موقعہ پر نازل ہوئی تھی۔ یہ موقع وہ تھا جب مکہ فتح ہو چکا تھا اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی جماعت کے لئے حج اور عمرہ کھل چکا تھا۔ آپ نے جو آخری حج فرمایا اور جس کے اسّی دن بعد آپ وفات پا گئے اسے حجۃ الوداع کہتے ہیں۔ اس میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت سی ایسی باتیں کہیں کہ صحابہؓ کہتے ہیں ہم حیران ہوتے تھے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم یہ باتیں کیوں فرما رہے ہیں۔ مگر جب آپ حجۃ الوداع کے صرف اسّی دن کے بعد وفات پا گئے، تب ہمیں معلوم ہوا کہ خدا تعالیٰ کی طرف سے آپ کو وفات کی خبر مل چکی تھی اور آپ مسلمانوں کو اُس وقت آخری نصیحتیں کر رہے تھے۔ اُس وقت آپ نے فرمایا۔ اے مسلمانو! میں تمہیں نصیحت کرتا ہوں کہ تم اپنی عورتوں سے اچھا سلوک کیا کرو۔ اے مسلمانو! میں تمہیں نصیحت کرتا ہوں کہ تم اپنے غلاموں اور نوکروں سے اچھا سلوک کیا کرو۔ پھر آپ نے فرمایا۔ آپس میں قوموں کا لڑنا بہت ہی بُرا اور ناپسندیدہ امر ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ جس طرح حضرت ابراہیم نے مکہ کی حرمت کے متعلق بعض احکام دیئے تھے اسی طرح میں بھی تمہیں بعض احکام دوں۔ چنانچہ آپ نے فرمایا۔ میں اس امر کا اعلان کرتا ہوں کہ ہر مسلمان کی جان اور مال اور عزت اسلامی شریعت کے لحاظ سے محفوظ ہے اس لئے کسی مسلمان کی جان اور مال اور عزت کو تمہارے ہاتھوں سے نقصان نہیں پہنچنا چاہیئے۔ پھر چونکہ عربوں میں چھوٹی چھوٹی باتوں پر دیر تک لڑائیاں ہوتی رہتی تھیں اس لئے آپ نے اُن کا بھی ذکر کیا اور فرمایا۔ یہ لڑائیاں کبھی تو ختم ہونی چاہئیں ورنہ قوم میں کبھی اعلیٰ اخلاق پیدا نہیں ہو سکتے چنانچہ آپ نے فرمایا۔ آج کے دن میں اس مقام پر کھڑے ہو کر اُن تمام لڑائیوں کو ختم کرنے کا اعلان کرتا ہوں جو جاہلیت سے چلی آ رہی ہیں۔ اُس کے ساتھ ہی آپ نے زمین پر اپنا پاؤں مارا۔ اور فرمایا۔ میں اُن تمام لڑائیوں کو اپنے پاؤں کے نیچے مسلتا ہوں۔ اَب پرانی رنجشوں اور لڑائیوں کی وجہ سے کسی سے بدلہ لینا ہرگز جائز نہیں ہوگا۔ اسی مقام پر آپ نے یہ آیت بھی پڑھی اور فرمایا۔ مجھے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا بعض صحابہؓ اور بہت سے مفسرین کا قول ہے کہ قرآن کریم کی یہ آخری آیت ہے جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی۔ اس کے بعد کوئی اَور کلام الٰہی نازل نہیں ہوا۔ لیکن بعض نے اِس سے اختلاف بھی کیا ہے۔ بہر حال اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یہ نہایت ہی آخری آیتوں میں سے ایک آیت ہے۔ اگر یہ سب سے آخر میں نازل نہیں ہوئی تو آخر میں نازل ہونے والی چند آیتوں میں سے ایک آیت ضرور ہے۔ اِس میں یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے شریعت کو مکمل کر دیا گیا ہے۔ اَب کوئی نیا حکم نازل نہیں ہوگا اور نہ کوئی ایسا حکم نازل ہوگا جو اِن حکموں کو بدل سکے۔ اِس سے معلوم ہوا کہ شریعتِ اسلامی ہر لحاظ سے مکمل ہے اور اس کا قانون آخری قانون ہے ہندو ہمارے اس دعویٰ کو مانیں یا نہ مانیں۔ عیسائی ہمارے اس دعویٰ کو مانیں یا نہ مانیں ایک مسلمان کو بہر حال یہ ماننا پڑیگا کہ احکامِ شریعت کو قرآن کریم میں مکمل کر دیا گیا ہے۔ اور دنیا کو جتنے قوانین کی ضرورت تھی وہ سب اِس میں بیان کر دیئے گئے ہیں۔ اِس میں کوئی شبہ نہیں کہ ایسے قوانین بن سکتے ہیں جو وقتی اور مقامی طور پر ضروری ہوں۔

ایسے قانون بھی بن سکتے ہیں جو عارضی مشکلات کو دُور کرنیوالے ہوں۔ جیسے حکومتوں کی آپس میں لڑائیاں ہوں تو انہیں اپنے جھگڑوں کو نپٹانے کے لئے بعض قوانین بنانے پڑتے ہیں یہ شریعت کا کام نہیں کہ وہ یہ بتائے کہ اگر امریکہ اور سپین میں جھگڑا ہو تو اس جھگڑے کو اس طرح دُور کیا جائے۔ لیکن جہاں تک اُن اُمور کا سوال ہے جن میں قرآن کریم دخل دیتا ہے اور جہاں تک اُن اُمور کا سوال ہے جن میں مذہب کو اِس بات کا ذمہ وار سمجھا جاتا ہے کہ وہ ہدایت دے اُن تمام اُمور کو قرآن کریم میں بیان کر دیا گیا ہے۔ کسی کو بالتفصیل اور کسی کو بالاجمال - اور اس کا نتیجہ یہ بیان فرمایا ہے کہ میں نے اپنا انعام تم پر مکمل کر دیا ہے۔

احادیث میں آتا ہے کہ ایک دفعہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ دربار لگائے بیٹھے تھے اور عیسائی اور یہودی بھی وہاں موجود تھے کیونکہ وہ سب آپ کی رعایا بن چکے تھے کہ آپ نے اِس آیت کا ذکر کیا۔ ایک یہودی یہ آیت سُن کر کہنے لگا کہ اگر ہم پر ایسی آیت نازل ہوتی تو ہم اِسے اپنے لئے عید کا دن قرار دے لیتے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا۔ تمہیں معلوم نہیں جب یہ آیت نازل ہوئی تھی تو وہ جمعہ کا دن تھا۔ اور حجۃ الوداع کا موقعہ تھا۔ اور یہ دونوں ہمارے لئے عید کا دن تھے۔ تم تو کہتے ہو کہ ہم اس آیت کے نازل ہونے پر آپ عید مقرر کرتے۔ مگر ہم نے یہ عید خود تجویز نہیں کی بلکہ اللہ تعالیٰ نے خود ایک ایسے دن اِس آیت کو اتارا جس میں ہمارے لئے دو۲ عیدیں جمع تھیں یعنی جمعہ کا دن بھی تھا۔ اور حج کا بھی موقعہ تھا۔

اِس آیت میں اللہ تعالیٰ نے نہایت وضاحت کے ساتھ یہ امر بیان فرمایا ہے کہ ہم نے تمہارے دین کو تمہارے لئے مکمل کر دیا ہے۔ اب مسلمانوں کی کوئی ضرورت ایسی نہیں جس کو پورا کرنے کا سامان انہیں باہر سے لانا پڑے۔ سارے احکام قرآن کریم میں بیان کر دیئے گئے ہیں اور ساری برکت ان احکام پر عمل کرنے میں ہے کبھی ایسا نہیں ہو سکتا کہ مسلمانوں کو کوئی ضرورت ہو اور وہ انہیں باہر سے پوری کرنی پڑے۔ اِسی مضمون کی مزید وضاحت سورۂ مائدہ کی اِن آیات میں بھی کی گئی ہے کہ وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتٰبِ وَمُهَيْمِنًا عَلَيْهِ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ عَمَّا جَآءَكَ مِنَ الْحَقِّ ۚ لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا ۚ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلٰكِنْ لِّيَبْلُوَكُمْ فِيْ مَآ اٰتٰىكُمْ فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ ۚ اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ۔ وَاَنِ احْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ وَاحْذَرْهُمْ اَنْ يَّفْتِنُوْكَ عَنْۢ بَعْضِ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَيْكَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاعْلَمْ اَنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّصِيْبَهُمْ بِبَعْضِ ذُنُوْبِهِمْ ۚ وَاِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ لَفٰسِقُوْنَ ۔ اَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُوْنَ ۚ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ حُكْمًا لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُوْدَ وَالنَّصٰرٰٓى اَوْلِيَآءَ ۘ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۚ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ ۚ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۔ (سورہ مائدہ ع)

یعنی ہم نے تمہاری طرف ایک کامل کتاب نازل کی ہے اور اُس کے ساتھ ہر قسم کی ثابت شدہ حقیقتیں نہایت کھول کر بیان کر دی ہیں اور جو الہامی کتب اِس سے پہلے نازل ہو چکی ہیں یہ کتاب اُن کی پیشگوئیوں کو پورا کرنے والی اور اُنکی اعلیٰ تعلیموں کو محفوظ رکھنے والی ہے۔ پس جو کچھ اللہ تعالیٰ نے اُتارا ہے اس کے مطابق تم لوگوں کے جھگڑوں کا فیصلہ کرو۔ اور اگر دوسرے لوگ اپنے پاس سے کچھ سکیمیں بنا کر

تمہارے پاس لائیں تو تم اُن کی باتوں کو مت سُنو۔ اور اُنکی سکیموں کو ہرگز اختیار نہ کرو کیونکہ اگر تم دوسرے فلسفیوں کی باتیں مانوگے تو نتیجہ یہ ہوگا کہ خدا تعالیٰ نے جو اعلیٰ درجہ کی تعلیم تمہیں دی ہے تمہیں اُسے چھوڑنا پڑیگا آخر یہ تو نہیں ہو سکتا کہ تم اس پر بھی عمل کرو اور اُن کی باتوں پر بھی عمل کرو۔ بہر صورت ایک چیز پر ہی عمل ہو سکتا ہے اور جب تم اُن کے پیچھے چلوگے۔ تو اللہ تعالیٰ کی تعلیم اور اُس کے احکام تمہیں چھوڑنے پڑینگے اور ایک اعلیٰ چیز کی بجائے تمہیں ادنیٰ چیز اختیار کرنی پڑیگی۔ یہ امر یاد رکھنا چاہیئے کہ اسجگہ مخاطب گو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو کیا گیا ہے مگر مراد آپ کی اُمت ہے۔ کیونکہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم تو کسی دشمن کے اثر کو قبول نہیں کر سکتے تھے۔ پس آپ کو مخاطب کرکے جو کچھ کہا گیا ہے درحقیقت اُس میں آپ کی اُمت سے خطاب ہے اور اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو انتباہ کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ قرآن کریم کے مقابلہ میں دوسرے لوگوں کی کبھی اتباع نہ کرنا۔ ورنہ گمراہ ہو جاؤگے پھر فرماتا ہے لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنكُمْ شِرْعَةً وَمِنْهَاجًا۔ تم میں سے ہر ایک کے لئے الہامی پانی تک پہنچنے کے لئے ہم نے ایک چھوٹا یا بڑا راستہ بنایا ہوا ہے۔ کوئی کچھ کہتا ہے اور کوئی کچھ۔ کوئی کہتا ہے مَیں اپنے باپ دادا کی باتیں مانوں گا۔ کوئی کہتا ہے مَیں فلسفیوں کی باتیں مانوں گا کوئی کہتا ہے میں اقتصادیات کے ماہرین کی باتیں مانونگا کوئی کہتا ہے مَیں فن قانون کے ماہر لوگوں کی باتیں مانونگا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ تمہارے طریق کار اور اِن لوگوں کے طریق کار میں کوئی مشابہت نہیں۔ تم نے یہ کہنا ہے کہ ہم خدا کی باتیں مانیں گے اور انہوں نے یہ کہنا ہے کہ ہم کسی فلسفی یا اقتصادیات کے ماہر یا صنّاع یا قانون ساز کے پیچھے چلینگے وہ اور لوگوں کی پیروی کا دعویٰ کرتے ہیں اور تم اور ہستی کی پیروی کا دعویٰ کرتے ہو۔ وہ اقتصادیوں اور فلسفیوں اور مقنّنوں کے پیچھے جا رہے ہیں اور تم خدا کے پیچھے جا رہے ہو

وَلَوْ شَاءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً وَلٰكِنْ لِّيَبْلُوَكُمْ فِي مَا آتَاكُمْ مگر یاد رکھو۔ یہ اختلاف جو دنیا میں پایا جاتا ہے یہ قیامت تک رہیگا تمہاری اُمت خدا تعالیٰ کے پیچھے چلے گی اور دوسرے لوگ اپنے بنائے ہوئے قانونوں کے پیچھے چلیں گے اور کہیں گے کہ فلاں ماہر نفسیات یُوں کہتا ہے اُن کے پیچھے چلنا چاہیئے۔ فلاں مقنّن یُوں کہتا ہے اُس کے پیچھے چلنا چاہیئے۔ فلاں فلسفی یوں کہتا ہے اُس کے پیچھے چلنا چاہیئے۔ فرماتا ہے ہم اگر چاہتے تو دنیا کو مجبور کرکے ایک خیال پر لے آتے ہم میں طاقت تھی کہ ہم دنیا کے فلسفیوں کو مجبور کر دیتے۔ یونیورسٹیوں کے پروفیسروں۔ مقنّنوں اور بڑے بڑے سائنس دانوں کو مجبور کرتے کہ وہ اسلام کے پیچھے چل پڑیں مگر ہم نے ایسا نہیں کیا۔ اِس لئے کہ مجبور کرنے سے انسان کسی انعام کا مستحق نہیں رہ سکتا۔ مثلاً بجلی کا انجن خواہ کتنی تیزی سے چل رہا ہو ہم کبھی اُسے یہ نہیں کہتے کہ چونکہ تم بڑی تیزی سے چل رہے ہو اس لئے ہم تمہیں فلاں انعام دیتے ہیں۔ اِس لئے کہ بالارادہ کام نہیں کر رہا ہوتا۔ لیکن اگر ایک چھوٹا بچہ بھی سکول کی دوڑ میں آگے نکل جاتا ہے تو اُسے انعام ملتا ہے۔ اس لئے کہ چھوٹے بچے نے عقل اور قربانی سے کام لیا۔ وہ مجبور نہیں تھا کہ ضرور محنت کرتا وہ سستی کر سکتا تھا وہ غفلت کر سکتا تھا۔ لیکن اُس نے دوسروں سے اچھا نمونہ دکھایا۔ وہ صبح کو اُٹھا اُس نے دوڑنے کی مشق کی۔ اپنی صحت کے معیار کو اونچا کیا۔ اور دوسروں سے آگے نکل گیا۔ پس اُس نے جو کچھ کیا اپنی مرضی سے کیا۔ اپنی خواہش اور اپنے ارادہ کے ماتحت کیا۔ اِس لئے اُسے انعام مل گیا۔ پس اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ ہم جبر کر سکتے تھے لیکن ہم نے کیوں جبر نہیں کیا۔ کیوں ہم نے دنیا کے فلسفیوں اور اقتصادیات کے ماہروں اور سائنسدانوں اور مقنّنوں کو زندہ رکھا اس لئے کہ

لِيَبْلُوَكُمْ فِيْ مَآ اٰتٰىكُمْ ہم دنیا کو یہ بتانا چاہتے تھے کہ کون خدا کو خوش کرتا ہے اور کون دنیا کے پیچھے چلتا ہے لیکن فرماتا ہے۔ اب ہم تم کو یہ بتاتے ہیں کہ تمہارا دنیا سے ایک اور مقابلہ ہو گیا ہے۔ دنیا کا فلسفی اور اقتصادی ماہر بھی کچھ سکیمیں پیش کریگا اور قرآن کریم بھی کچھ سکیمیں پیش کرے گا اور وہ تمہارے لئے بڑی آزمائش کا وقت ہو گا کیونکہ ایک طرف خدا کی آواز ہوگی اور دوسری طرف دنیا کے فلسفیوں اور سیاستدانوں کی آواز ہوگی اُسوقت ایک صورت تو یہ ہو سکتی ہے کہ تم ہتھیار ڈال دو اور کہو کہ ہم ہارے اور تم جیتے۔ اور دوسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ تم ضد کر کے بیٹھ رہو اور عملی رنگ میں تو کچھ نہ کرو مگر زبان سے یہ کہتے جاؤ کہ قرآن کریم کی سکیم اچھی ہے۔ اگر تم ایسا کروگے اور زبان سے تو یہ کہوگے کہ قرآن کریم کی سکیم اچھی ہے مگر اُسے اچھا ثابت کرنے کی کوشش نہیں کروگے تو دنیا تمہاری بات نہیں مانیگی کیونکہ وہ تمہارے عمل کو دیکھیگی۔ جب تم خود قرآنی احکام پر عمل نہیں کروگے۔ جب تم خود اُس کی تعلیموں کے مطابق نہیں چلوگے تو محض زبان سے اُسے اچھا کہہ کر تم اُسے اور بھی بدنام کروگے۔ اِس لئے ہم تمہیں نصیحت کرتے ہیں کہ فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ اگر تم سچے مومن ہو۔ اگر تمہارے دل میں حقیقی ایمان موجود ہے۔ اگر تم واقعہ میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت رکھتے ہو تو جو بہتر سے بہتر احکام اور بہتر سے بہتر تعلیمیں ہم نے تمہارے سامنے پیش کی ہیں تم دوڑ کر اُن کو اختیار کرو اور اپنی عملی زندگی میں اُن کو شامل کرو۔ اگر تم ایسا کروگے تو چونکہ اعلیٰ درجہ کی سکیمیں تمہارے پاس ہونگی اور اُن سکیموں پر تم عمل بھی کر رہے ہوگے۔ اِس لئے دنیا مجبور ہوگی کہ وہ تمہاری طرف آئے اور اپنی ناقص سکیموں اور ناقص قانونوں کو ترک کر دے۔ گویا دنیا پر اسلام کی صداقت اور اُسکی عظمت صرف اِسی طریق سے واضح ہو سکتی ہے کہ تم اپنی ذات میں قرآنی احکام پر عمل کرنے کی کوشش کرو۔ پھر فرماتا ہے کہ اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ۔ جب تم اِس دنیا میں خدا تعالیٰ کے احکام کی برتری اور اُن کی عظمت کو روشن کر دوگے تو چونکہ مر کر تم نے ہماری طرف ہی آنا ہے اس لئے ہم تمہیں اگلے جہان میں اونچے مقامات عطا کرینگے کیونکہ تم نے دنیا میں ہماری بات کو اونچا کرنے کی کوشش کی۔ اِس کے بعد فرماتا ہے وَاَنِ احْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ ہم پھر دوبارہ تمہیں حکم دیتے ہیں کہ اے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کا دم بھرنے والو! تم لوگوں کے سامنے اُس قرآن کو پیش کرو جو اللہ تعالیٰ نے نازل کیا ہے اور دوسرے لوگ جو اپنی عقلوں سے سکیمیں بنا بنا کر دنیا کے سامنے پیش کر رہے ہیں اِن کے پیچھے ہرگز نہ چلو۔ وَاحْذَرْهُمْ اَنْ يَّفْتِنُوْكَ عَنْۢ بَعْضِ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَيْكَ اور اِس سے ڈرو کہ اگر تم نے قرآن کو نہ سمجھا اور اُس کی سکیموں پر عمل نہ کیا تو تم میں سے بھی کمزور ایمان والے لوگ اُن ناقص سکیموں کے پیچھے چل پڑیں گے جو دنیا کی طرف سے پیش کی جا رہی ہیں اور قرآن کریم کو چھوڑ دینگے۔ چنانچہ دیکھ لو۔ یہ نتیجہ آج ظاہر ہو چکا ہے۔ اعلیٰ درجہ کی تعلیم مسلمانوں کے پاس موجود تھی مگر چونکہ انہوں نے اس پر عمل نہ کیا اس لئے خود مسلمانوں میں یہ خیال پیدا ہو گیا کہ انہیں اپنی قومی ترقی کے لئے قرآن کریم کے علاوہ کسی اور سکیم کی بھی ضرورت ہے۔ اس کے بعد چونکہ یہ سوال پیدا ہو سکتا تھا کہ وہ لوگ تو اپنی سکیموں کے متعلق بڑے بڑے جتھے اور پارٹیاں بنائیں گے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم اُن کے مقابلہ میں فیل ہو جائیں۔ اسلئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاعْلَمْ اَنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّصِيْبَهُمْ بِبَعْضِ ذُنُوْبِهِمْ وَاِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ لَفٰسِقُوْنَ اگر تم

اسلام کے احکام پر عمل کروگے تو باوجود اس کے کہ وہ تم سے زیادہ طاقتور ہونگے اگر انہوں نے اسلام کی تعلیموں کو اختیار نہ کیا تو خدا تعالیٰ اُن کے گناہوں کی وجہ سے اُنکو کچل ڈالیگا وَ اِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ لَفٰسِقُوْنَ اور یہ مت دیکھا کرو کہ وہ اچھی سکیمیں بناکر پیش کر رہے ہیں اگر تم غور سے کام لو تو تم دیکھوگے کہ صرف اپنے جتھہ اور اپنی پارٹی کی مضبوطی اُن کے مدنظر ہے یہ نہیں کہ ساری دنیا کو فائدہ پہنچانا اُن کا مقصود ہے پھر فرماتا ہے۔ اَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُوْنَ. کیا وہ جاہلیت کے فیصلوں کو پسند کرتے ہیں؟ اگر وہ جاہلیت کے فیصلوں کو ہی پسند کرتے ہیں تو بے شک کریں ایک سچا مومن بہرحال خدا تعالیٰ کی بات ہی مانیگا کسی آدمی کی بات ماننے کیلئے تیار نہیں ہوگا. پھر فرماتا ہے اے مومنو! تم سوچو تو سہی اگر واقعہ میں خدا تعالیٰ نے یہ کتاب نازل کی ہے تو وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ حُكْمًا لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ. خدا تعالیٰ سے بہتر اور کون سکیمیں پیش کرسکتا ہے اور اُس کی تعلیم سے بہتر اور کس کی تعلیم ہوسکتی ہے؟ یا تو تم یہ مانو کہ اِس دنیا کا کوئی خدا نہیں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اُس کے رسول نہیں۔ اور یہ کتاب خدا تعالیٰ کی کتاب نہیں۔ اور اگر تم یہ باتیں ماننے کے لئے تیار نہیں۔ تم واقعہ میں اِسے خدا تعالیٰ کی کتاب سمجھتے ہو اور تم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا تعالیٰ کا سچا رسول سمجھتے ہو تو یہ کس طرح تسلیم کیا جاسکتا ہے کہ روس کا لینن اور سٹالن تو زیادہ اچھا قانون بنائیگا اور خدا نہیں بنائیگا۔ امریکہ کی سٹیٹ تو زیادہ اچھا قانون بنائیگی اور خدا ویسا قانون نہیں بنائیگا۔ یہ تو ایسی ہی بات ہے جیسے کوئی شخص کہے کہ ایک دھیلے سے زیادہ شکر آتی ہے اور اشرفی سے کم آتی ہے۔ بلکہ دھیلے اور اشرفی میں تھوڑی بہت نسبت بھی ہے۔ خدا اور بندے میں تو کوئی بھی نسبت نہیں. خدا تعالیٰ عالم الغیب ہے وہ اپنے بندوں کے حالات کو خوب جانتا ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ ان کے لئے کونسی چیز مفید ہے اور کونسی مضر۔

پس یہ ہو ہی کس طرح سکتا ہے کہ اس کا قانون ناقص ہو اور لوگوں کے قانون ہر قسم کے نقائص سے پاک ہوں۔ مگر فرماتا ہے لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ۔ یہ نکتہ صرف ان لوگوں کی سمجھ میں آ سکتا ہے جو خدا تعالیٰ کی باتوں پر یقین لانے کی کوشش کرتے ہوں اُن لوگوں کی سمجھ میں نہیں آسکتا جو سُنتے ہی اُن کو رد کر دیتے ہوں۔ پھر فرماتا ہے يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُوْدَ وَالنَّصٰرٰى اَوْلِيَآءَ۔ اے مسلمانو! جن دنوں اسلام پر یہ آفت آنے والی ہے اُن دنوں یہود اور نصاریٰ کا غلبہ ہوگا اور انہی لوگوں کی طرف سے اسلام کے مقابلہ میں نئی نئی سکیمیں پیش کی جائیں گی۔ اس لئے تم کبھی اُن کو اپنا دوست مت سمجھنا کبھی یہ خیال نہ کرنا کہ وہ تمہاری خیرخواہی اور ترقی کے لئے یہ سکیمیں تمہارے سامنے پیش کر رہے ہیں۔ چنانچہ دیکھ لو اِس وقت یا یہود تھیوری دنیا میں کام کر رہی ہے، یا عیسائیت کی تھیوری دنیا میں چکر لگا رہی ہے۔ لینن جو کمیونزم کا بانی تھا یہودی تھا اور سٹالن بھی یہودی تھا۔ اِسی طرح فرائیڈ جس کے فلسفہ نے دنیا پر بہت بُرا اثر ڈالا ہے وہ بھی یہودی تھا۔ اِس کے مقابلہ میں کچھ عیسائی ہیں جو اپنے اپنے فلسفے پیش کر رہے ہیں۔ غرض اِسوقت مغرب کی طرف سے جس قدر فلسفے آ رہے ہیں وہ یا تو یہودیوں کے بنائے ہوئے ہیں یا عیسائیوں کے بنائے ہوئے ہیں۔ پس اللہ تعالیٰ فرماتا ہے يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُوْدَ وَالنَّصٰرٰى اَوْلِيَآءَ۔ اُس زمانہ کے یہود اور نصاریٰ تمہارے سامنے بڑی بڑی خوبصورت سکیمیں بناکر پیش کرینگے اور وہ تمہیں اپنے پیچھے چلانا چاہیں گے مگر ہم تمہیں یہی نصیحت کرتے ہیں کہ تم اُن کو کبھی اپنا دوست نہ سمجھنا بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ اُن کی یہ سکیمیں محض اپنے مفاد کیلئے ہیں۔ اِن سکیموں سے اُن کو تو کچھ نہ کچھ فائدہ پہنچ جائیں گے مگر وہ تمہارے لئے کسی صورت میں بھی فائدہ بخش نہیں ہونگے وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ اور یاد رکھو اگر تم میں سے کسی نے

اُن کی دوستی اختیار کی تو خدا تعالیٰ کے نزدیک وہ ہرگز مسلمان نہیں سمجھا جائیگا وہ یہودی ہوگا یا عیسائی ہوگا۔ اِنَّ اللّٰہَ لَا یَھْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ اور یقیناً جو لوگ کسی مذہب کو قبول کرکے اُس سے غداری کرتے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک ظالم ہیں اور تم یہ سمجھ لو کہ ظالم کو ہم کبھی چھوڑا نہیں کرتے بلکہ اُسے ضرور سزا دیتے ہیں۔

یہ آیات بھی وَلَدَیْنَا کِتٰبٌ یَّنْطِقُ بِالْحَقِّ کی تفسیر ہیں اور اللہ تعالیٰ نے اِن میں یہ مضمون بیان فرمایا ہے کہ جب قرآن کریم میں سارے احکام موجود ہیں اور ہم نے کوئی ایسی بات نہیں چھوڑی جو تمہاری ترقی کے لئے ضروری تھی تو وجہ کیا ہے کہ تم قرآن اور اسلام کو چھوڑ کر اُن کے پیچھے دوڑتے ہو۔ اُن کی غرض محض اپنی قوموں کو فائدہ پہنچانا ہے۔ چنانچہ یورپ کی ہزاروں تھیوریاں ایسی ہیں کہ جب وہ پُرانی اور بوسیدہ ہوجاتی ہیں تو ہمارے سر مڑھ دی جاتی ہیں۔ آخر یہ غور کرنے والی بات ہے کہ ایک بندوق ہمارے ملک کو زیادہ فائدہ پہنچا سکتی ہے یا ایک فلسفہ کا خیال ہمارے ملک کو زیادہ فائدہ پہنچا سکتا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ فلسفہ کا خیال ہمارے ملک کو زیادہ فائدہ پہنچا سکتا ہے مگر میرا تجربہ ہے کہ یورپ جب کسی فلسفہ کے خیال کو رد کر دیتا ہے اور اُسے ناکارہ اور ناقابلِ عمل قرار دے دیتا ہے تو بیس سال کے بعد ہمارے پروفیسر وہی فلسفہ کالجوں میں پڑھانے لگ جاتے ہیں اور کہتے ہیں یہ جدید نظریہ ہے جو یورپ کی طرف سے پیش کیا گیا ہے گویا اُن کی مثال بالکل ویسی ہی ہوتی ہے جیسے کہتے ہیں کہ کوئی براہمن راجہ کے پاس گیا اور اُسے کہنے لگا کہ مجھے کچھ پُن دیجیئے۔ ہندو مذہب میں یہ مسئلہ پایا جاتا ہے کہ اگر کوئی براہمن مانگنے آئے تو اُسے ضرور کچھ دینا چاہیئے ورنہ اللہ تعالیٰ ناراض ہوتا ہے۔ راجہ بخیل تھا۔ اُس کا جی نہیں چاہتا تھا کہ کچھ دے مگر مذہبی حکم کی وجہ سے مجبور بھی تھا اسلئے وہ اپنے وزیر سے کہنے لگا۔ وزیر صاحب! پچھلے سال جو ہماری گائے گم ہوگئی تھی وہ ان کو دے دیں۔ اُسکا بیٹا پاس ہی کھڑا تھا وہ اپنے باپ سے بھی زیادہ بخیل تھا اُسے خیال آیا کہ یہ براہمن ہے ممکن ہے لوگوں میں اعلان کرے تو اسے وہ گائے مل جائے اس لئے کہنے لگا آپ یہ گائے کیوں دیتے ہیں۔ پرار سال جو ہماری گائے مر گئی تھی وہ دیدیں۔ یہی یورپ کا حال ہے۔ وہ ہر پُرانی اور بوسیدہ اور سڑی گلی چیز ہماری طرف پھینک دیتا ہے اور کہتا ہے لینی ہے تو پندرہ سال پہلے کی بندوق لے لو بیس سال پہلے کے بنے ہوئے ٹینک لے لو۔ نئی بندوقیں اور نئے ٹینک تو ہماری ضروریات کے لئے ہیں۔ اسی طرح بیس بیس سال کے پُرانے ڈسٹرائر اور کروزر دیتا ہے اور کہتا ہے اِن کی مرمت کرالو۔ اب بھلا یورپ سے ایٹم بم تو مانگ کر دیکھو وہ کبھی دینے کے لئے تیار نہیں ہوگا۔ لیکن جب اٹامک انرجی سے ہر ملک کام لینے لگ گیا اور یہ چیز تمام دنیا میں پھیل گئی تو اُس وقت امریکہ بھی آفر کریگا کہ ۲۵ ایٹم بم فلاں سال کے بنے ہوئے ہمارے پاس موجود ہیں اگر چاہو تو ہم سے خرید لو ہم دینے کیلئے تیار ہیں۔ جب یورپ کی یہ حالت ہے کہ وہ ہمیں اپنی نئی مادی چیزیں دینے میں بھی ہچکچاہٹ محسوس کرتا ہے تو ہمارے سمجھدار اور تعلیمیافتہ آدمی یہ خیال بھی کس طرح کرتے ہیں کہ وہ فلسفے جن سے قومیں بنتی ہیں۔ وہ فلسفے جن سے ملک ترقی کرتے ہیں۔ وہ فلسفے جن سے دنیا پر غلبہ حاصل ہوتا ہے۔ وہ فلسفے جن سے اقوام کو عظمت حاصل ہوتی ہے وہ یورپ ہمیں فوراً دینے کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب وہ کسی نظریہ سے اُکتا جاتے ہیں۔ جب وہ اُسے بے کار اور ناکارہ چیز قرار دینے لگتے ہیں تو اُس وقت کہتے ہیں اب یہ نظریہ تم سے لو اور اپنے اندر رائج کرلو۔ یہی بات اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں بیان فرماتا ہے اور مومنوں سے

کہتا ہے تم یہ تو سوچو کہ کیا وہ تمہارے خیر خواہ ہیں؟ اوّل تو تمہیں غور کرنا چاہیئے کہ یہ خدا تعالیٰ کا بنایا ہُوا قانون ہے اور وہ انسانوں کے بنائے ہوئے قانون ہیں - اور خدا تعالیٰ کا قانون اور انسان کا بنایا ہُوا قانون برابر نہیں ہو سکتے۔ پھر یہ تمہارے دشمن ہیں۔ یہ لوگ اس بات کو برداشت ہی کب کر سکتے ہیں کہ تم ترقی کر جاؤ - اور دنیا میں تمہیں اعلےٰ مقام حاصل ہو جائے۔ مثلاً امریکہ اور روس کو لے لو۔ کیا امریکہ اور روس یہ پسند کرینگے کہ اُن کا ملک ترقی کرے یا یہ پسند کرینگے کہ اُن کا ملک پیچھے رہ جائے اور دوسرے ملک آگے نکل جائیں۔ اگر کسی وقت ہم بڑے صنّاع ہو جائیں تو کیا امریکہ کی چیزیں ہم اُسی طرح منگواتے رہیں گے جس طرح اب منگواتے ہیں؟ اور جب نہیں منگوائیں گے تو کیا امریکہ یہ پسند کر سکتا ہے کہ دوسرے ملک اتنی ترقی کر جائیں کہ وہ اس سے چیزیں نہ منگوائیں۔ وہ تو ایسی ہی تدابیر اختیار کریگا جن سے اُسے ترقی ہو اور دوسرے ممالک اُس سے پیچھے رہیں۔ وہ جب تیسری منزل پر پہنچیگا۔ تب وہ ہمیں دوسری منزل پر لے جائیگا ورنہ نہیں۔ اُسوقت بظاہر ہم یہ سمجھ رہے ہونگے کہ ہم نے بہت بڑی ترقی کی ہے مگر حقیقت یہ ہوگی کہ اُس نے دوسری منزل ہمارے سامنے اس لئے پیش کی ہوگی کہ وہ منزل اس کے کام کی نہیں رہی تھی اور وہ اُس سے آگے نکل چکا تھا۔ اسی طرح مذہبی لحاظ سے دیکھو تو یورپ عیسائیت کو پیش کر رہا ہے جو قرآن کریم کے نزول سے بھی چھ سو سال پہلے کی تعلیم تھی اور قرآن کریم کے آنے پر منسوخ ہو گئی۔ اور اس طرح ہمیں پیچھے کی طرف گھسیٹنا چاہتا ہے تاکہ ہم کسی کام کے نہ رہیں۔ مگر مسلمان ہے کہ اس کے فریب میں آجاتا ہے۔ وہ صرف اُس کی پتلون۔ اُس کا کھانا اور اُسکی کوٹھی دیکھتا ہے اور اُس کے ہوائی جہاز دیکھتا ہے اور یہ نہیں سمجھتا کہ وہ میرے دماغ کو اپنا غلام بنا رہا ہے۔

غرض وَلَدَيْنَا كِتٰبٌ يَّنْطِقُ بِالْحَقِّ میں اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کی یہ دو عظیم الشان خوبیاں بیان کی ہیں۔ اوّل یہ کہ اُس کے تمام احکام حکمت پر مبنی ہیں اور دوّم یہ کہ وہ اپنے قوانین کے لحاظ سے دنیا کے لئے کامل اور آخری ہدایت نامہ ہے۔ پس جب اُس میں تمام طبائع کا لحاظ رکھا گیا ہے اور تمام احکام حکمت کے ماتحت دیئے گئے ہیں اور شریعت کو ہر لحاظ سے مکمل کر دیا گیا ہے تو اب دنیا اپنی نجات کے لئے اور کس چیز کی محتاج ہے۔ اُس کی کامیابی اور نجات اِسی میں ہے کہ وہ قرآن کریم کو حق سمجھتے ہوئے اس کی اتباع کرے اور سمجھے کہ جو کچھ اس کتاب میں لکھا گیا ہے وہی سچ ہے مگر فرماتا ہے بَلْ قُلُوْبُهُمْ فِيْ غَمْرَةٍ مِّنْ هٰذَا۔ باوجود اِس کے کہ شریعت قابلِ عمل ہے اور اسے ہر لحاظ سے کامل کر دیا گیا ہے انبیاء کے منکر نیکی میں بڑھنے کی کوشش نہیں کرتے اور وہ غفلت کے لحافوں میں ہی سوئے رہتے ہیں یہاں تک کہ اُن پر عذاب آجاتا ہے اور وہ تباہ ہو جاتے ہیں۔ اِس میں بتایا کہ اُن کا حق کو قبول نہ کرنا ایک تو اِس وجہ سے ہے کہ وہ غفلت سے کام لے رہے ہیں اور کلام الٰہی کی طرف توجہ نہیں کرتے اور دوسرے اُن کی بداعمالی اِس میں روک بنی ہوئی ہے۔ اگر وہ غفلت کو ترک کر دیں اور بداعمالی کی بجائے نیک اعمال اختیار کریں تو انہیں بھی ہدایت میسّر آ سکتی ہے۔

ضمنی طور پر یہ آیت شیعوں کا بھی ردّ کرتی ہے۔ شیعہ کہتے ہیں کہ حضرت علیؓ کا حق مارا گیا تھا خلیفہ انہیں ہونا چاہیئے تھا مگر حضرت ابوبکرؓ نے اُن سے خلافت کا حق غصب کر لیا۔ اللہ تعالیٰ اِن آیات میں اُن کے اِس خیال کی بھی تردید کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ جس انعام کے دینے کا ہم فیصلہ کرتے ہیں وہ کبھی نہیں مارا جاتا۔ کیونکہ قرآن کریم میں جو بات کہی جاتی ہے وہ ضرور پُوری ہو کر رہتی ہے اگر قرآن کریم حضرت علیؓ کی خلافت یا امامت کا فیصلہ کرتا تو کوئی طاقت اُن سے یہ انعام چھین نہیں سکتی تھی۔ ان معنوں

حَتّٰىٓ اِذَآ اَخَذْنَا مُتْرَفِيْهِمْ بِالْعَذَابِ اِذَا هُمْ يَجْئَرُوْنَ ﴿۶۵﴾

یہاں تک کہ جب ہم اُن میں سے آسودہ حال لوگوں کو عذاب میں گرفتار کر لیتے ہیں تو اچانک وہ فریادیں کرنے لگ جاتے ہیں

لَا تَجْئَرُوا الْيَوْمَ قف اِنَّكُمْ مِّنَّا لَا تُنْصَرُوْنَ ﴿۶۶﴾ قَدْ كَانَتْ

(سو اُن وقت ہم اُن کو کہتے ہیں) آج فریادیں نہ کرو۔ ہماری طرف سے تمہیں کوئی مدد نہ پہنچے گی۔ میری آیتیں تم کو

اٰيٰتِيْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ فَكُنْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ تَنْكِصُوْنَ ﴿۶۷﴾

پڑھ کر سُنائی جاتی تھیں مگر تم اُن (آیات یعنی مجموعہ قرآن) سے بے پروا ہی کا اظہار کرتے ہوئے اور بیہودہ باتیں کرتے ہوئے

مُسْتَكْبِرِيْنَ ڰ بِهٖ سٰمِرًا تَهْجُرُوْنَ ﴿۶۸﴾

اور اُس سے رُوگردانی کرتے ہوئے اپنی ایڑیوں کے بل پھر جایا کرتے تھے۔ ۱۳ ؎

کے لحاظ سے بَلْ قُلُوْبُهُمْ فِيْ غَمْرَةٍ مِّنْ هٰذَا وَلَهُمْ اَعْمَالٌ مِّنْ دُوْنِ ذٰلِكَ هُمْ لَهَا عٰمِلُوْنَ کا یہ مفہوم ہوگا کہ جو لوگ ایک طرف تو یہ کہتے ہیں کہ قرآن کریم نے یہ حق مقرر کیا تھا اور دوسری طرف یہ کہتے ہیں کہ لوگوں نے وہ حق چھین لیا وہ قرآنی علوم سے ناواقف ہیں اور چونکہ وہ جو کچھ عمل کر رہے ہیں وہ قرآن کریم کے مطابق نہیں اس لئے اُنکے دلوں میں وہ ایمان پیدا نہیں ہوتا جو قرآن کریم پر عمل کرنے والوں کے دلوں میں پیدا ہُوا کرتا ہے۔

۱۳ ؎ **حل لغات**:۔ يَجْئَرُوْنَ: جَاَرَ سے مضارع جمع مذکر غائب کا صیغہ ہے اور جَاَرَ اِلَى اللّٰهِ جُؤَارًا کے معنے ہیں تضرّع وتضرّع واستغاث۔ اُس نے اللہ تعالیٰ کے حضور عاجزی سے فریاد اور دُعا کی اور اُس سے مدد چاہی۔ اور جاَر الداعی جائرًا کے معنے ہیں رفع صوتہٗ بالدعاء پکارنے والے نے اونچی آواز سے پکارا۔ پس يَجْئَرُوْنَ کے معنے یہ ہوئے کہ وہ عاجزی کا اظہار کرتے اور فریاد کرتے ہیں۔

يَجْئَرُوْنَ

سٰمِرًا: سَمَرَ فُلَانٌ کے معنے ہوتے ہیں لَمْ ينم وتحدّث ليلًا یعنی وہ رات کو نہ سویا اور باتیں کرتا رہا۔ پس سٰمِرًا جو سَمَرَ کا اسم فاعل ہے۔ اِس کے معنے ہونگے رات کو باتیں کرنے والا (اقرب)

سٰمِرًا

تفسیر۔ اِن آیات میں اللہ تعالیٰ نے یہ بتایا ہے کہ خدائی منشا کو پورا نہ کرنے والے لوگ بعض دفعہ دولتیں تو حاصل کر لیتے ہیں لیکن اُن کی دولتیں انہیں خدائی عذاب سے نہیں بچا سکتیں۔ وہ اپنی دولت کے گھمنڈ میں ہی رہتے ہیں یہاں تک کہ وہ خدا تعالیٰ کے عذاب میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اور پھر چلّاتے اور گریہ و زاری کرنے لگ جاتے ہیں۔ مگر اُس دن ہم اُن سے کہتے ہیں کہ آج گریہ و زاری کا کیا فائدہ؟ آج ہم تمہاری مدد کس طرح کر سکتے ہیں۔ تمہارے سامنے ہماری تعلیم سُنائی جاتی تھی لیکن تم اس سے بے پرواہی کا اظہار کرتے ہوئے اور اپنے آپ کو بڑا سمجھتے ہوئے ایڑیوں کے بل پھر جاتے تھے اور اُس پر کبھی غور نہیں کرتے تھے اور راتوں کو بیٹھ بیٹھ کر ہماری تعلیم کو بُرا بھلا کہا کرتے تھے۔ اُس کا نتیجہ آج تم نے دیکھ لیا کہ تمہارا تکبّر تمہیں لے ڈوبا اور تمہاری دولتیں تمہارے کسی کام نہ آئیں۔ یعنی خدائی عذاب پر چلّانا کوئی فائدہ نہیں دیتا کیونکہ خدا تعالیٰ کا عذاب حجّت تمام ہونے کے بعد آتا ہے اور

أَفَلَمْ يَدَّبَّرُوا الْقَوْلَ أَمْ جَآءَهُمْ مَّا لَمْ يَأْتِ آبَآءَهُمُ

کیا اِن لوگوں نے اِس قول (یعنی قرآن) پر غور نہیں کیا یا اِن کو وہ (وعدہ) ملا ہے جو اِن کے پہلے باپ دادوں

الْأَوَّلِينَ ﴿٦٩﴾ أَمْ لَمْ يَعْرِفُوا رَسُولَهُمْ فَهُمْ لَهُ مُنْكِرُونَ ﴿٧٠﴾

کو نہیں ملا تھا - (اور) کیا انہوں نے اپنے رسول کو نہیں پہچانا جس کی وجہ سے وہ اُس کا انکار کر رہے ہیں۔

أَمْ يَقُولُونَ بِهِ جِنَّةٌ ۚ بَلْ جَآءَهُمْ بِالْحَقِّ وَأَكْثَرُهُمْ

کیا وہ کہتے ہیں کہ اِس کو جنون ہے (مگر ایسی بات نہیں) بلکہ وہ اِن کے پاس حق لیکر آیا ہے اور اِن میں سے اکثر

لِلْحَقِّ كَارِهُونَ ﴿٧١﴾ وَلَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ أَهْوَآءَهُمْ لَفَسَدَتِ

لوگ حق کو ناپسند کرتے ہیں - اور اگر حق اِن کی خواہشات کی اتباع کرتا تو آسمان اور زمین

السَّمٰوٰتُ وَالْأَرْضُ وَمَنْ فِيهِنَّ ۚ بَلْ أَتَيْنٰهُمْ بِذِكْرِهِمْ

اور جو ان کے اندر بستے ہیں تباہ ہو جاتے حقیقت یہ ہے کہ ہم ان کے پاس اُنکی عزت کا سامان لیکر آئے ہیں

فَهُمْ عَنْ ذِكْرِهِمْ مُّعْرِضُونَ ﴿٧٢﴾

اور وہ اپنی عزت کے سامان سے اعراض کر رہے ہیں ؎۱۴

حجت پوری ہونے کے بعد عذاب پر چلّانا بے فائدہ ہوتا ہے.

؎۱۴ **حل لغات** :- ذِكْرُ: الذکر کے معنے ہیں اَلتَّلَفُّظُ بِالشَّيْءِ وَ اِحْضَارُهٗ فِي الذِّهْنِ بِحَيْثُ لَا يَغِيْبُ عَنْهُ۔ کسی چیز کا زبان سے ذکر کرنا اُسے ایسے طور پر ذہن میں مستحضر کرنا کہ وہ بھول نہ جائے ۔ الصیتُ شہرت ۔ الثَّنَاءُ: تعریف ۔ الشَّرَفُ ۔ شرف ۔ اَلصَّلٰوةُ لِلّٰهِ تَعَالٰى وَالدُّعَاءُ اللہ تعالیٰ کے حضور دُعا - اور اِس کے معنے ایسی کتاب کے بھی ہیں جس میں دین کی تفصیل اور شریعت کے اصول ہوں - اور ایسے بہادر شخص کو بھی کہتے ہیں کہ جو کسی کا رعب نہ برداشت کر سکے ۔ نیز موسلادھار بارش اور پکی بات کو بھی الذکر کہتے ہیں (اقرب)

تفسیر :- فرماتا ہے کیا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دشمنوں نے اپنے رسول کو نہیں پہچانا کہ وہ اُس کا انکار کر رہے ہیں ۔ یعنی یہ کتنے تعجب کی بات ہے کہ انہوں نے چالیس سال تک محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا - آپ کے اخلاق اور عادات کا انہوں نے مشاہدہ کیا اور انہوں نے اپنی عینی شہادات سے اِس امر کو تسلیم کیا - کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہایت راستباز انسان ہیں مگر جب اس راستباز انسان نے یہ کہا کہ میں خدا کی طرف سے تمہاری ہدایت کے لئے مبعوث کیا گیا ہوں تو اُس کی مخالفت کے لئے کھڑے ہو گئے ۔ اگر کوئی غیر شخص یہ بات کہتا تو وہ معذور سمجھا جا سکتا تھا - اور اُس کے متعلق خیال

ذِكْرُ

کیا جا سکتا تھا کہ چونکہ اُس نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں دیکھا اِس لئے وہ آپ کی طرف یہ بات منسوب کر رہا ہے کہ آپ نے خدا تعالیٰ پر افترا کیا ہے لیکن مکّہ کے رہنے والے جن کے سامنے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ساری زندگی ایک کھلی کتاب کی طرح تھی آپ کو کس طرح مفتری قرار دینے لگ گئے۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی راستبازی کا تو مکّہ والوں پر اتنا اثر تھا کہ دعویٰ نبوّت کے بعد جب ایک دفعہ کفّار یہ مشورہ کرنے کے لئے جمع ہوئے کہ حج کے موقعہ پر باہر سے آنے والے لوگوں کو ہم اِس شخص کے متعلق کیا کہیں تو ایک شخص نے کہدیا کہ اگر ہم سے کسی نے پوچھا تو ہم فوراً کہہ دیں گے کہ یہ شخص جھوٹ بول رہا ہے اِس پر ایک شدید مخالف نضر بن الحارث جوش سے کھڑا ہو گیا۔ اور اُس نے کہا۔ تم یہ کیا کہہ رہے ہو۔ محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) تمہارے درمیان پیدا ہُوا اور اُس نے تمہارے سامنے اپنے شباب کی منزلیں طے کیں۔ تم جانتے ہو کہ اُس کے اخلاق کتنے پاکیزہ تھے وہ تم سب سے زیادہ راستباز انسان تھا۔ امانت اور دیانت میں اس کا کوئی ہم پلّہ نہیں تھا اور وہ اسی نیکنامی کی حالت میں اپنی زندگی کے دن گذارتا چلا گیا۔ مگر اب جبکہ اُس کی کنپٹیوں میں سفید بال آرہے ہیں اور وہ شباب سے گذر کر کہولت کی عمر کو پہنچ چکا ہے اور اُس نے اپنی تعلیم تمہارے سامنے پیش کی ہے تم یہ کہنے لگے ہو کہ وہ جھوٹا ہے۔ خدا کی قسم وہ ہرگز جھوٹا نہیں۔ اگر تم نے احمقانہ بات کہی تو کوئی شخص اس کو تسلیم نہیں کریگا (شفاء قاضی عیاض) ابوجہل محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کتنا شدید دشمن تھا۔ مگر اُس نے بھی ایک موقعہ پر کہدیا کہ اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہم تجھ کو تو جھوٹا نہیں کہتے۔ ہم تو اُس تعلیم کی تکذیب کرتے ہیں جسے تو پیش کر رہا ہے (ترمذی کتاب التفسیر) گویا ابوجہل جیسا معاند اور سیاہ باطن انسان کا دل بھی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جھوٹا کہنے کیلئے تیار نہیں تھا۔ گویا جھوٹا کہتے ہوئے اُس کی ضمیر بھی اُسے ملامت کرتی تھی اور اُس کا دل بھی دھڑکنے لگتا تھا کہ میں کیسی قبیح حرکت کر رہا ہوں مگر اُس نے بہانہ یہ بنایا کہ میں تو محمد رسول اللہ کی تعلیم کو جھٹلاتا ہوں۔ آپ کو تو جھوٹا نہیں کہہ رہا۔ یہ "عذرِ گناہ بدتر از گناہ" والی بات ہے مگر بہرحال اِس سے اُس اثر کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے جو شدید ترین معاندین کے دلوں پر بھی آپ کی صداقت اور راستبازی کی وجہ سے قائم ہو چکا تھا۔

اُمیّہ ابن خلف بھی آپ کا ایک شدید معاند تھا مگر ایک موقعہ پر اُس کی زبان سے بھی یہ الفاظ نکل گئے کہ خدا کی قسم جب محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) بات کرتا ہے تو سچی ہی کرتا ہے جھوٹ نہیں بولتا (بخاری باب علامات النبوۃ) کہتے ہیں "جادو وہ جو سر پر چڑھ کے بولے"۔ محمد رسول اللہ کا یہ کتنا بڑا جادو ہے کہ آپ کے اپنے دشمنوں سے بھی اپنی صداقت اور راستبازی تسلیم کروالی۔ اللہ تعالیٰ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اِسی پاک اور بے عیب زندگی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ کیا انہوں نے اپنے رسول کو نہیں پہچانا؟ یعنی انہیں تو چاہیئے تھا کہ آپ کو فوراً پہچان لیتے اور آپ کی تکذیب کا راستہ اختیار نہ کرتے مگر دیکھتے ہوئے اُن کی آنکھوں پر پردے پڑ گئے اور واقف ہوتے ہوئے ناواقفوں کی سی باتیں کرنے لگے۔ پھر فرماتا ہے اَمْ يَقُوْلُوْنَ بِهٖ جِنَّةٌ ۚ بَلْ جَآءَهُمْ بِالْحَقِّ وَاَكْثَرُهُمْ لِلْحَقِّ كٰرِهُوْنَ۔ یعنی کیا وہ یہ کہتے ہیں کہ اِس آدمی کے ساتھ جنّوں کا تعلّق ہے؟ اِن کی یہ بات بھی بالکل غلط ہے۔ اصل بات صرف یہ ہے کہ وہ اُن کے پاس ایک ایسی تعلیم لےکر آیا ہے جس پر عمل کرنا اُن کو دوبھر معلوم ہوتا ہے اور وہ اُسے ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ کیونکہ اِس تعلیم کے غالب آنے سے اُن کی چودھرپٹ جاتی ہے اور

اُن کی سرداریاں ختم ہوتی ہیں اور وہ یہ برداشت نہیں کر سکتے کہ اُن کی چودھریت ختم ہو۔ گویا مخالفین نے جب دیکھا کہ ہم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جھوٹا تو نہیں کہہ سکتے تو انہوں نے دوسرا پہلو بدلا اور یہ کہنا شروع کر دیا کہ یہ جھوٹا تو نہیں ہاں اِس کا جنات کے ساتھ تعلق ہے اور وہ اِسے اِس قسم کی باتیں سکھاتے رہتے ہیں۔

عیسائی لوگ اعتراض کیا کرتے ہیں کہ یہ کیا توہم والی باتیں ہیں لیکن وہ یہ نہیں سوچتے کہ یہ توہم تو کفار کا ہے اور اُن کو عقلمند کون کہتا ہے۔ پھر خود انجیل میں حضرت مسیحؑ کے متعلق اُن کے دشمنوں کا قول درج ہے کہ

"اِس میں بدرُوح ہے اور وہ دیوانہ ہے۔" (یوحنا باب ۱۰ آیت ۲۰)

اگر حضرت مسیحؑ کے زمانہ میں بھی یہی بات کہی گئی اور اُسپر انہیں تعجب نہیں ہُوا تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں اگر یہی بات کہی گئی تو اُسپر تعجب کیوں۔ بہر حال اللہ تعالیٰ نے بَلْ جَآءَهُمْ بِالْحَقِّ میں اُن کے اس اعتراض کا جواب دیا ہے اور اَكْثَرُهُمْ لِلْحَقِّ كٰرِهُوْنَ میں اُن کے انکار کی وجہ بتائی ہے۔ اُن کے اعتراض کا تو یہ جواب دیا ہے کہ کیا کبھی جنات سے تعلق رکھنے والوں نے بھی لوگوں کے سامنے ایسی تعلیم پیش کی ہے جو اُن کی تمام اخلاقی روحانی اقتصادی اور سیاسی مشکلات کا حل ہو اور جس پر عمل کرنے کے نتیجہ میں اُن کو اعلیٰ سے اعلیٰ ترقیات حاصل ہوں۔ اگر دنیا میں کبھی ایسا نہیں ہُوا تو محمد رسول اللہ ایسی تعلیم کو پیش کر کے جنات سے تعلق رکھنے والا کس طرح ہُوا۔ اور اَكْثَرُهُمْ لِلْحَقِّ كٰرِهُوْنَ میں اللہ تعالیٰ نے یہ بتایا ہے کہ اُن کے انکار کی یہ وجہ نہیں کہ محمد رسول اللہ میں کوئی عیب پاتے ہیں بلکہ انکار کی اصل وجہ یہ ہے کہ حق پر عمل کرنا اُن کو ناپسند ہے۔ اگر وہ محمد رسول اللہ کو قبول کریں تو انہیں لوگوں سے ماریں کھانی پڑتی ہیں انہیں گندی سے گندی گالیاں سُننی پڑتی ہیں۔ انہیں مالی اور جانی قربانیاں کرنی پڑتی ہیں۔ اُنہیں اپنا وطن چھوڑنا پڑتا ہے۔ انہیں اپنی سرداریوں کو ترک کرنا پڑتا ہے اور یہ چیز ایسی ہے جسے وہ پسند نہیں کرتے۔ پس وہ مخالفت کیلئے بہانے تلاش کرتے رہتے ہیں۔ کبھی لوگوں سے یہ کہہ دیتے ہیں کہ یہ جھوٹا ہے۔ اور کبھی یہ کہہ دیتے ہیں کہ اِس کا جنات کے ساتھ تعلق ہے اور چاہتے ہیں کہ سچائی دنیا میں ظاہر نہ ہو۔ حالانکہ اگر حق کو لوگوں کی خواہشات کا تابع کر دیا جائے تو آسمان اور زمین میں فساد پیدا ہو جائے یعنی تعلق باللہ بھی نہ رہے۔ اور تعلق بالعباد کے متعلق بھی لوگوں کو کہیں سے راہنمائی میسر نہ آسکے اور اِس طرح ہر طرف ظلمت اور تاریکی ہی دکھائی دینے لگے۔

اِس کے بعد فرماتا ہے بَلْ اَتَيْنٰهُمْ بِذِكْرِهِمْ فَهُمْ عَنْ ذِكْرِهِمْ مُّعْرِضُوْنَ حقیقت یہ ہے کہ ہم اُن کے پاس اُن کی عزت اور شرف کا سامان لے کر آئے ہیں مگر وہ اپنی عزت اور شرف کے سامانوں سے بھی اعراض کر رہے ہیں یعنی قرآنی تعلیم کی اتباع میں اُن کی بزرگی اور شرف کے سامان مخفی تھے پس اُس کو چھوڑ کر وہ اِس سے مُنہ نہیں موڑ رہے بلکہ اپنی ترقی سے مُنہ موڑ رہے ہیں۔ اِس آیت میں قرآن کریم کو ذکر قرار دے کر اِس امر کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے کہ یہ کتاب نہ صرف ذاتی کمالات کے لحاظ سے ایک عظیم الشان شرف اور عظمت رکھتی ہے بلکہ جو لوگ سچے دل سے اِسپر ایمان لائیں گے وہ بھی دنیا میں معزز اور مکرم ہو جائیں گے چنانچہ دیکھ لو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک ایسی قوم کی طرف آئے تھے جو غیر متمدن اور تہذیب و شائستگی کے اصول سے بالکل بے گانہ تھی۔ اور ہر قسم کی خرابیاں اُس میں پائی جاتی تھیں۔ وہ لوگ ڈاکہ۔ چوری اور رہزنی میں مشہور تھے اور فسق و فجور اُن کی گھُٹی میں رچا ہُوا تھا۔ دوسرے کو قتل کر دینا اُن کے نزدیک ایک معمولی بات تھی۔ ماؤں سے

شادی کر لیتے تھے۔ شراب کے نشہ میں ہر وقت چُور رہتے تھے۔ لڑکیوں کو زندہ درگور کر دیتے تھے۔ عورتوں کو حیوانوں سے بدتر سمجھتے تھے۔ معمولی معمولی باتوں پر آپس میں لڑائی شروع کر دیتے تھے جو بعض دفعہ سالہا سال تک جاری رہتی تھی۔ غرض نہ انہیں کوئی اخلاقی برتری حاصل تھی۔ نہ تمدنی برتری حاصل تھی۔ نہ سیاسی برتری حاصل تھی۔ نہ مذہب سے انہیں کسی قسم کی دلچسپی تھی۔ مگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع اور قرآن کریم کی برکت سے وہ تھوڑے دنوں میں ہی دنیا کے معلّم اور استاد بن گئے اور ایک نئی تہذیب اور تمدن کی انہوں نے بنیاد ڈال دی۔ قیصر و کسریٰ کی حکومتیں بھی اُن سے ٹکرائیں تو وہ پاش پاش ہوگئیں اور پھر وہ جس جگہ بھی گئے انہوں نے علوم کے دریا بہا دیئے۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے عربوں کو کچھ پتہ نہیں تھا کہ علم تاریخ کیا چیز ہے۔ یا صرف اور نحو کونسے علوم ہیں۔ یا فقہ اور اصول فقہ کس کو کہتے ہیں۔ یا علم معانی اور بیان کس چیز کا نام ہے۔ یا فنِ بلاغت کس کو کہتے ہیں۔ یا علمِ اقتصادیات کونسا علم ہے۔ یا علمِ کلام کیا چیز ہے۔ مگر قرآن کریم کے نزول کے بعد اللہ تعالیٰ نے انہی خانہ بدوش اور اونٹوں کے چرواہوں کے ذریعہ دنیا میں ان تمام علوم کو پھیلا دیا۔ اسی طرح فنِ تعمیر، قالین بافی اور عمارتوں پر رنگدار بیل بوٹے بنانے بھی مسلمانوں سے ہی یورپ نے سیکھے۔ بلکہ فنِ موسیقی جو آج تمام متمدن دنیا کی توجہ کا مرکز بنا ہوا ہے اُس کی ایجاد کا سہرا بھی مسلمانوں کے سر ہی ہے اور خود یورپین مصنفین نے اس حقیقت کو تسلیم کیا ہے۔ اسی طرح فلسفہ کو یورپ کی ایجاد سمجھا جاتا ہے لیکن ایک یورپین فلاسفر نے لکھا ہے کہ یہ بالکل جھوٹ ہے۔ فلسفہ میں بھی ہم مسلمانوں کے ہی مرہونِ منّت ہیں۔ غرض قرآن کریم نے مسلمانوں کو اس قدر شرف بخشا اور اس قدر عزت دی کہ وہ دنیا کے معلّم اور راہنما بن گئے۔

حضرت عمرؓ کے زمانہ میں جب خسرو پرویز کے پوتے یزدجرد کی تخت نشینی کے بعد عراق میں مسلمانوں کے خلاف وسیع پیمانہ پر جنگی تیاریاں شروع ہوگئیں تو حضرت عمرؓ نے اُن کے مقابلہ کے لئے حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کی سرکردگی میں ایک لشکر روانہ کیا۔ حضرت سعدؓ نے جنگ کے لئے قادسیہ کا میدان منتخب کیا اور حضرت عمرؓ کو اُس مقام کا نقشہ بھجوا دیا۔ حضرت عمرؓ نے اس مقام کو بہت پسند کیا مگر ساتھ ہی لکھا کہ پیشتر اس کے کہ شاہِ ایران کے ساتھ جنگ کی جائے۔ تمہارا فرض ہے کہ ایک نمائندہ وفد شاہِ ایران کے پاس بھیجو اور اسے اسلام قبول کرنے کی دعوت دو۔ چنانچہ انہوں نے اس حکم کے ملنے پر ایک وفد یزدجرد کی ملاقات کیلئے بھجوا دیا جب یہ وفد شاہِ ایران کے دربار میں پہنچا۔ تو شاہِ ایران نے اپنے ترجمان سے کہا کہ ان لوگوں سے پوچھو کہ یہ کیوں آئے ہیں اور انہوں نے ہمارے ملک میں کیوں فساد برپا کر رکھا ہے جب اُس نے یہ سوال کیا تو وفد کے رئیس حضرت نعمان بن مقرنؓ کھڑے ہوئے اور انہوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ آپ نے ہمیں حکم دیا ہے کہ ہم اسلام کو پھیلائیں اور دُنیا کے تمام لوگوں کو دینِ حق میں شامل ہونے کی دعوت دیں۔ اِس حکم کے مطابق ہم آپ کی خدمت میں بھی حاضر ہوئے ہیں اور آپ کو اسلام میں شمولیت کی دعوت دیتے ہیں۔ یزدجرد اس جواب سے بہت برہم ہوا اور کہنے لگا کہ تم ایک وحشی اور مُردار خوار قوم ہو۔ تمہیں اگر بھوک اور افلاس نے اِس حملہ کیلئے مجبور کیا ہے تو میں تم سب کو اتنا کھانے پینے کا سامان دینے کیلئے تیار ہوں کہ تم اطمینان کے ساتھ اپنی زندگی بسر کر سکو اسی طرح تمہیں پہننے کے لئے لباس بھی دونگا۔ تم یہ چیزیں لو اور اپنے ملک کو واپس چلے جاؤ تم ہم سے جنگ کر کے اپنی جانوں کو کیوں ضائع کرنا چاہتے ہو۔ جب وہ بات ختم کر چکا تو اسلامی وفد کی طرف سے حضرت مغیرہ بن زرارہؓ کھڑے ہوئے اور انہوں نے کہا۔ آپ نے ہمارے متعلق جو کچھ بیان کیا ہے یہ بالکل درست ہے۔ ہم واقعہ میں ایک وحشی اور مُردار خوار قوم تھے۔ سانپ اور بچھو

اور ٹڈیاں اور چھپکلیاں تک کھا جاتے تھے لیکن اللہ تعالیٰ نے ہم پر فضل کیا۔ اور اُس نے اپنا رسول ہماری ہدایت کیلئے بھیجا۔ ہم اُس پر ایمان لائے اور ہم نے اُس کی باتوں پر عمل کیا جسکا نتیجہ یہ ہُوا کہ اب ہم میں ایک انقلاب پیدا ہو چکا ہے اور اَب ہم میں وہ خرابیاں موجود نہیں جن کا آپ نے ذکر کیا ہے۔ اَب ہم کسی لالچ میں آنے کے لئے تیار نہیں۔ ہماری آپ سے جنگ شروع ہو چکی ہے۔ اَب اس کا فیصلہ میدانِ جنگ میں ہی ہوگا دنیوی مال و متاع کا لالچ ہمیں اپنے ارادہ سے باز نہیں رکھ سکتا۔ یزدجرد نے یہ بات سُنی تو اُسے سخت غصہ آیا۔ اور اُس نے ایک نوکر سے کہا کہ جاؤ اور مٹی کا ایک بورا لے آؤ۔ مٹی کا بورا آیا تو اُس نے اسلامی وفد کے سردار کو آگے بلایا اور کہا چونکہ تم نے میری پیشکش کو ٹھکرا دیا ہے اس لئے اب اِس مٹی کے بورے کے سوا تمہیں اور کچھ نہیں مل سکتا۔ وہ صحابیؓ نہایت سنجیدگی کے ساتھ آگے بڑھے۔ انہوں نے اپنا سر جھکا دیا اور مٹی کا بورا اپنی پیٹھ پر اٹھا لیا۔ پھر انہوں نے ایک چھلانگ لگائی اور تیزی کے ساتھ اس کے دربار سے نکل کھڑے ہوئے اور اپنے ساتھیوں کو بلند آواز سے کہا۔ آج ایران کے بادشاہ نے اپنے ہاتھ سے اپنے ملک کی زمین ہمارے حوالے کر دی ہے اور پھر گھوڑوں پر سوار ہو کر تیزی سے نکل گئے۔ بادشاہ نے جب اُن کا یہ نعرہ سُنا تو وہ کانپ اُٹھا اور اُس نے اپنے درباریوں سے کہا۔ دوڑو اور مٹی کا بورا اُن سے واپس لے آؤ۔ یہ تو بڑی بدشگونی ہوئی کہ میں نے اپنے ہاتھ سے اپنے ملک کی مٹی اُن کے حوالے کر دی ہے۔ مگر وہ اُس وقت تک گھوڑوں پر سوار ہو کر بہت دُور نکل چکے تھے۔ لیکن آخر وہی ہُوا جو انہوں نے کہا تھا اور چند سال کے اندر اندر سارا ایران مسلمانوں کے ماتحت آگیا (محاضرات تاریخ الامم الاسلامیہ جلد ۱ صفحہ ۲۱۷ تا صفحہ ۲۰۹ و ابن خلدون جلد ۲ صفحہ ۹۲) یہ عظیم الشان تغیر مسلمانوں میں کیوں پیدا ہُوا؟ اِسی لئے کہ قرآنی تعلیم نے اُنکے اخلاق اور اُن کی عادات میں ایک انقلاب پیدا کر دیا تھا اُنکی سفلی زندگی پر اُس نے ایک موت طاری کر دی تھی۔ اور انہیں بلند کردار اور اعلیٰ درجہ کے اخلاق کی سطح پر لا کر کھڑا کر دیا تھا۔

حضرت عمرؓ کے متعلق لکھا ہے کہ وہ ایک دفعہ حج کے لئے گئے۔ تو راستہ میں ایک مقام پر کھڑے ہو گئے۔ اُسوقت دھوپ چمک رہی تھی اور پسینہ بہ رہا تھا مگر آپ وہاں بڑی دیر تک کھڑے رہے۔ اُسوقت کسی کو اتنی جرأت نہ ہوئی کہ وہ آگے بڑھ کر آپ سے کچھ عرض کر سکے مگر جب زیادہ دیر ہو گئی تو ایک صحابیؓ جو حضرت عمرؓ کے بڑے دوست تھے لوگوں نے اُن سے کہا کہ آپ حضرت عمرؓ سے پوچھیں کہ آپ یہاں کیوں کھڑے ہیں۔ انہوں نے جرأت کی اور آگے بڑھ کر حضرت عمرؓ سے دریافت کیا کہ حضور یہاں کیوں کھڑے ہیں سخت گرمی کا وقت ہے اور لوگ تکلیف محسوس کر رہے ہیں حضرت عمرؓ نے فرمایا۔ مَیں یہاں اس لئے کھڑا ہوں کہ ایک دفعہ مَیں اونٹ چرانے کی وجہ سے تھک کر اس درخت کے نیچے تھوڑی دیر کے لئے لیٹ گیا تھا کہ اچانک میرا باپ آگیا اور اُس نے مجھے مارا کہ کیا مَیں نے تجھے اِس لئے بھیجا تھا کہ تُو جا کر سو رہے اور اونٹوں کا خیال چھوڑ دے آج جب مَیں یہاں سے گذرا تو میرے دل میں خیال آیا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قبول کرنے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے مجھے کتنا اعزاز بخشا کہ آج لاکھوں آدمی میرے پسینہ کی جگہ اپنا خون بہانے کیلئے تیار ہیں حالانکہ مَیں وہی ہوں جو اکیلا اِس جنگل میں اونٹ چرایا کرتا تھا اور جسے باپ نے اسلئے مارا کہ مَیں تھوڑی دیر کے لئے سو کیوں گیا تھا۔

حضرت ابوبکرؓ کو دیکھ لو۔ آپ مکّہ کے ایک معمولی تاجر تھے اگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث نہ ہوتے اور مکّہ کی تاریخ لکھی جاتی تو مؤرخ صرف اتنا ذکر کرتا کہ ابوبکرؓ عرب کا ایک شریف اور دیانت دار تاجر تھا۔ مگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع سے ابوبکرؓ کو وہ مقام

اَمْ تَسْـَٔلُهُمْ خَرْجًا فَخَرَاجُ رَبِّكَ خَيْرٌ ۖ وَّهُوَ

کیا تو اُن سے کوئی تاوان مانگتا ہے؟ (ایسا نہیں ہو سکتا) کیونکہ تیرے رب کا دیا ہوا مال بہت اچھا ہے اور وہ

خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ ﴿۷۳﴾ وَاِنَّكَ لَتَدْعُوْهُمْ اِلٰى صِرَاطٍ

(رب) بہترین رزق دینے والا ہے۔ اور تو اُن کو سیدھے راستے کی طرف

مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۷۴﴾ وَاِنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ

الربع

بُلاتا ہے۔ اور جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں لاتے وہ

تو آج ساری دنیا اُن کا ادب اور احترام کے ساتھ نام لیتی ہے۔ جب رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم وفات پاگئے اور حضرت ابوبکرؓ کو مسلمانوں نے اپنا خلیفہ اور بادشاہ بنا لیا تو مکہ میں بھی یہ خبر جا پہنچی۔ ایک مجلس میں بہت سے لوگ بیٹھے تھے جن میں حضرت ابوبکرؓ کے والد ابو قحافہ بھی موجود تھے۔ جب انہوں نے سُنا کہ ابوبکرؓ کے ہاتھ پر لوگوں نے بیعت کر لی ہے تو اُن کے لئے اِس امر کو تسلیم کرنا ناممکن ہوگیا۔ اور انہوں نے خبر دینے والے سے پُوچھا کہ تم کس ابوبکرؓ کا ذکر کر رہے ہو؟ اُس نے کہا۔ وہی ابوبکرؓ جو تمہارا بیٹا ہے انہوں نے عرب کے ایک ایک قبیلے کا نام لے کر کہنا شروع کر دیا کہ اُس نے بھی ابوبکرؓ کی بیعت کر لی ہے اور جب اُس نے کہا کہ سب نے متفقہ طور پر ابوبکرؓ کو خلیفہ اور بادشاہ بنا لیا ہے تو ابو قحافہ بے اختیار کہنے لگے کہ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ یعنی میں گواہی دیتا ہوں کہ خدا تعالیٰ کے سوا اور کوئی معبود نہیں۔ اور میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد رسول اللہ اُس کے سچے رسول ہیں۔ حالانکہ وہ دیر سے مسلمان تھے۔ انہوں نے جو یہ کلمہ پڑھا۔ اور دوبارہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا اقرار کیا تو اِسی لئے کہ جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ خلیفہ ہوئے تو اُن کی آنکھیں کھل گئیں اور انہوں نے سمجھا کہ یہ اسلام کی سچائی کا ایک زبردست ثبوت ہے۔ ورنہ میرے بیٹے کی کیا حیثیت تھی کہ اُس کے ہاتھ پر سارا عرب متحد ہو جاتا۔

غرض اسلام نے اپنے ماننے والوں کو فرشِ زمین سے اٹھایا اور انہیں ثریا تک جا پہنچایا۔ تاریخ اُن کے کارناموں سے بھری پڑی ہے۔ اور کوئی شخص جو دیدۂ بینا رکھتا ہو اس امر سے انکار نہیں کر سکتا کہ قرآن کریم نے اپنے ماننے والوں کو ایک لازوال شہرت بخشی اور اُن کی عزت کو اس نے چار چاند لگا دیئے۔ مگر وہ لوگ جنہوں نے قرآن کریم کو نہ مانا وہ اپنی پہلی عزتیں بھی کھو بیٹھے اور ذلت کے ایسے گڑھوں میں گرے کہ آج کوئی شخص اُن کا نام تک نہیں جانتا۔ اور جن کو جانتا بھی ہے اُن کو وہ عزت سے یاد نہیں کرتا۔ بلکہ ذلت اور رسوائی سے یاد کرتا ہے۔

عَنِ الصِّرَاطِ لَنٰكِبُوْنَ ﴿۷۵﴾

سچے راستہ سے ہٹنے والے ہیں۔ ؎۱۵

؎۱۵ **حل لغات:** خَرْجًا : اَلْخَرْجُ : اَلْخَرَاجُ یعنی خرج کے معنے لگان کے ہیں (اقرب)

تفسیر:۔ فرماتا ہے۔ تُو ان سے کچھ مانگتا تو نہیں کہ ان پر تیری تعلیم کا قبول کرنا گراں گذر رہا ہے۔ اگر تُو ان سے اپنی ذات کے لئے کچھ مانگتا تو کوئی بات بھی تھی مگر تیرا بوجھ تو سارا تیرے رب نے اٹھایا ہُوا ہے۔ اور اُسی کا بوجھ اُٹھانا اور رزق دینا سب سے بہتر چیز ہے پھر کیا یہ اتنا بڑا نشان دیکھنے کے بعد بھی آنکھیں نہیں کھولتے اور تیری صداقت کو تسلیم نہیں کرتے؟ یعنی ان کے راستہ میں سب سے بڑی روک یہ ہے کہ یہ لوگ خیال کرتے ہیں کہ شاید محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنی ذاتی وجاہت اور برتری کے حصول کے لئے بتوں کو بُرا بھلا کہہ رہے ہیں حالانکہ اگر وہ اپنی ذاتی برتری کے لئے جد وجہد کر رہے ہوتے تو مکّہ والوں سے کبھی تو کچھ مانگتے مگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تو یہ کیفیت تھی کہ خود مکّہ والوں نے آپ کو پیغام بھجوایا کہ اگر آپ کو حکومت اور سرداری کی خواہش ہے تو ہم سب آپ کو اپنا سردار ماننے کے لئے تیار ہیں۔ اگر دولت کی خواہش ہے تو ہم اپنی دولت جمع کر کے آپ کو دینے کے لئے تیار ہیں کہ سارے عرب میں آپ سے بڑھ کر کوئی دولت مند نہ ہو۔ اور اگر کسی حسین اور خوبصورت لڑکی سے شادی کرنے کی خواہش ہے تو ہم سب اعلیٰ اور معزز گھرانے کی حسین ترین لڑکی آپ کے عقد کے لئے پیش کرنے کو تیار ہیں اور اس کے بدلہ میں ہم آپ سے صرف اس بات کی خواہش کرتے ہیں کہ آپ ہمارے بتوں کو بُرا بھلا نہ کہیں۔ اسی طرح ایک مرتبہ رؤسائے قریش ابوطالب کے پاس آئے اور یہ درخواست کی کہ آپ اپنے بھتیجے کو ہمارے بتوں کو گالیاں دینے سے روک لیں اور جب ابوطالب نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا ذکر کیا اور کہا کہ مجھ پر اور اپنی جان پر رحم کرو اور ظاہر کیا کہ مجھ میں ساری قوم کی مخالفت کی طاقت نہیں ہے، تو آپ نے فرمایا۔ اگر یہ لوگ سورج کو میرے دائیں اور چاند کو میرے بائیں بھی لا کر کھڑا کر دیں تب بھی میں اس پیغام کو نہیں چھوڑ سکتا جس پیغام کا پہنچانا خدا نے میرے سپرد کیا ہے (دیکھو مواہب اللدنیہ جلد ۱ صفحہ ۴۸ وطبری جلد ۲ صفحہ ۱۱۷۸ و صفحہ ۱۱۸۹ اور سیرۃ ابن ہشام وغیرہ) اس واقعہ سے مکّہ والے سمجھ سکتے تھے کہ محمد رسول اللہ اُن سے اپنی ذات کے لئے کوئی مطالبہ نہیں کر رہے بلکہ جو کچھ کہہ رہے ہیں خود اُن کی اصلاح اور ترقی کے لئے کہہ رہے ہیں۔ پھر اس کے علاوہ وہ اللہ تعالیٰ کے اس عظیم الشان نشان کو بھی دیکھ سکتے تھے کہ محمد رسول اللہ اکیلا اور بے یار و مددگار تھا۔ کوئی اُس کا ساتھی نہیں تھا۔ کوئی اس کا ہم نوا نہیں تھا۔ کوئی اُسے دشمنوں کے حملوں سے بچانے والا نہیں تھا کوئی اُسے مالی مدد دینے والا نہیں تھا۔ مگر جونہی خدا تعالیٰ کی آواز اُس کی زبان سے بلند ہوئی۔ اُس آواز نے لوگوں کے قلوب میں ایک ارتعاش پیدا کرنا شروع کر دیا سعید طبع لوگوں پر ملائکہ کا نزول شروع ہو گیا اور اُن کے دلوں میں اسلام کی رغبت اور محبت پیدا ہوئی۔ یہاں تک کہ آپ پر ایمان لانے والے جو پہلے انگلیوں پر گنے جا سکتے تھے سینکڑوں سے ہزاروں اور پھر ہزاروں سے لاکھوں کی تعداد تک جا پہنچے اور اب اس زمانہ میں تو کروڑوں تک پہنچ گئے ہیں۔ ہر قسم کی مالی اور جانی قربانیاں کرنے والے نوجوان آپ کے گرد جمع ہو گئے۔ جہاندیدہ اور تجربہ کار

خَرْجًا

بڑے آپ کے حلقۂ ارادت میں شامل ہو گئے ۔ مالدار اور
ذی وجاہت خاندانوں کے چشم و چراغ آپ پر اپنی جانیں
قربان کرنے لگ گئے عوام جو ملک کی ریڑھ کی ہڈی کہلاتے
ہیں وہ آپ کے دائیں اور بائیں پروانوں کی طرح اپنی فدائیت
اور جاں نثاری کے مظاہرے کرنے لگے ۔ دولت آپ کے قدموں
پر نثار ہونے لگی اور حکومت کی عنان آپ کے مقدس ہاتھوں
میں آگئی ۔ یہ سب کچھ خدائے قادر و برتر کا ایک نمایاں نشان
تھا جو اُس نے آپ کی صداقت کے لئے ظاہر کیا مگر بدقسمت
لوگوں نے پھر بھی آپ کو شناخت نہ کیا ۔ وہ آنکھیں رکھتے
ہوئے نابینا ہو گئے اور کان رکھتے ہوئے بہرے ہو گئے ۔
اور دل رکھتے ہوئے عقل اور سمجھ سے بیگانہ ہو گئے ۔ پھر
فرماتا ہے ۔ اگر یہ نشان بھی اُن کی آنکھیں کھولنے کے لئے کافی
نہیں تھا تو وہ اتنا تو سوچتے کہ اِنَّكَ لَتَدْعُوْهُمْ اِلٰى
صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ تو انہیں صراطِ مستقیم کی طرف بُلا رہا
ہے جس میں خود اُن کا اپنا فائدہ ہے ۔ مگر یہ لوگ اُس
راستہ کو ترک کر کے ایک غلط راہ اپنے لئے اختیار کر رہے
ہیں جس کا نتیجہ بہرحال یہی ہوگا کہ وہ نقصان اٹھائیں گے
اور اپنے آپ کو اور اپنی قوم کو ہلاکت میں ڈالیں گے ۔ کیونکہ
سیدھے راستہ کو ترک کر کے کبھی کوئی قوم نجات حاصل
نہیں کر سکتی ۔

یہ آیت اسلام کی صداقت اور محمد رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم کی راستبازی کا اتنا کھلا ثبوت ہے کہ اس پر
جتنا بھی غور کیا جائے اتنی ہی اسلام کی صداقت اور اُسکی
حقانیت واضح ہوتی ہے ۔ اسلام تیرہ سو سال سے دنیا کے
سامنے یہ دعویٰ پیش کر رہا ہے کہ صراطِ مستقیم وہی ہے جسکی
طرف محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کو بلا رہے ہیں
اور یہ کہ دنیا جب بھی اس کے خلاف کسی اور راستہ پر
چلے گی وہ تباہ و برباد ہو گی ۔ اور واقعات شہادت دیتے
ہیں کہ ہمیشہ یہی دعویٰ سچا ثابت ہو رہا ہے ۔ چنانچہ
دیکھ لو ۔ اِس وقت تک یورپ کے مختلف نظریئے اسلام
سے ٹکرا چکے ہیں ۔ جن میں سے بعض مذہبی ہیں اور بعض سیاسی
اور اقتصادی ۔ مگر ہر نظریہ میں یورپ نے بہت بُری طرح
شکست کھائی ہے ۔ اور آخر وہ اُسی راستہ کی طرف آیا ہے
جو اسلام نے پیش کیا تھا ۔

مذہبی نظریوں میں سے سب سے بڑا توحید کا عقیدہ
ہے ۔ جب عیسائیوں نے ترقی کی تو انہوں نے حضرت عیسیٰ
علیہ السلام کے متعلق جو اللہ تعالیٰ کے ایک بندے تھے اور
ہر قسم کے بشری حوائج اپنے اندر رکھتے تھے یہ کہنا شروع
کر دیا کہ وہ نعوذ باللہ خدا اور خدا کے بیٹے تھے اور مسلمانوں
سے اِس عقیدہ میں انہوں نے لڑائی شروع کر دی ۔ یورپ
کا یہ حملہ اتنا شدید تھا کہ مسلمانوں نے بھی بعض باتوں میں
اُن کی ہمنوائی اختیار کر لی اور کہنے لگے کہ حضرت مسیحؑ خدا
تو نہیں تھے مگر کسی حد تک وہ علمِ غیب ضرور رکھتے تھے
وہ مُردوں کو بھی زندہ کر لیا کرتے تھے ۔ کچھ جانور بھی وہ
پیدا کر لیا کرتے تھے ۔ اِس طرح آہستہ آہستہ انہوں نے
خدا تعالیٰ کی کئی صفات حضرت مسیحؑ کی طرف منسوب کر دیں
اور وہ بھی عیسائیت کی تقویت کا موجب بن گئے ۔ مگر
یورپ اور اسلام کی اِس ٹکر کا نتیجہ کیا ہوا ؟ عیسائی اسلام
سے ٹکرائے اور اِس لئے ٹکرائے کہ وہ اسلام کو مسیحیت کا
شکار بنائیں ۔ مگر اس ٹکراؤ کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہی یورپ جو
توحید پر حملہ کیا کرتا تھا ۔ وہی یورپ جو تثلیث کا پرستار
تھا آج اپنے مُنہ سے توحید کا اقرار اور تثلیث کا انکار
کر رہا ہے ۔ یہ الگ سوال ہے کہ قومی لحاظ سے یورپ کیا
کہہ رہا ہے ۔ یوں انفرادی رنگ میں اُن سے پوچھ کر دیکھو
کہ کیا تم مسیحؑ کو خدا مانتے ہو ۔ تو وہ صاف کہہ دیں گے
کہ ہم تو توحید کے قائل ہیں اور ہم اگر مسیحؑ کو خدا کا بیٹا
کہتے ہیں تو صرف اِن معنوں میں کہ وہ خدا تعالیٰ کے مقرب
اور راستباز انسان تھے ۔ غرض مغرب اِس عقیدہ میں

اسلام سے ٹکرایا مگر آخر اسلام ہی غالب آیا اور مغرب اپنے نظریہ میں ناکام ہوا۔ یہ انہی لوگوں کا نظریہ تھا جنہوں نے توپیں بنائیں۔ ریلیں ایجاد کیں۔ ہوائی جہاز بنائے اور دنیا پر اپنی عظمت کا سکہ بٹھایا لیکن اسلام سے ٹکرا کر اُن کے لئے اپنی شکست ماننے کے سوا اَور کوئی چارہ نہ رہا۔ پھر عملی نظریوں میں سے ایک طلاق کا مسئلہ ہے جو اسلام نے پیش کیا۔ اور جس پر مغرب نے مدتوں ہنسی اُڑائی۔ بڑے بڑے مقنن اور ماہر فنون جو یورپ میں چوٹی کے آدمی سمجھے جاتے ہیں اُن کی کتابوں میں طلاق پر ہنسی اڑائی گئی ہے اور کہا گیا ہے کہ یہ بڑی بے حیائی کی بات ہے کہ مرد اپنی عورت کو چھوڑ دے اور پھر وہی عورت ایک دوسرے گھر میں جا کر اپنی زندگی بسر کرنے لگے۔ مگر اب پچھلے تیس سال سے یورپ کے ہر ملک میں طلاق کے قانون پاس ہونے لگے ہیں اور وہی مسئلہ جس کی مخالفت کی جاتی تھی اُس کی تائید کی جا رہی ہے۔ پھر اسلام نے اگر طلاق کا مسئلہ رکھا تھا تو اُس کے ساتھ کئی قسم کی شرطیں لگا دی تھیں جو عورت کے حقوق کی حفاظت کرتی تھیں مگر یورپ کے بڑے بڑے فلسفیوں اور مقننوں نے اِس پر ہنسی اڑائی اُنکی کتابوں کے ہزاروں صفحات اِن اعتراضوں سے بھرے ہوئے ہیں کہ اِس سے عورت اور مرد کی محبت کے حقوق کو تلف کر دیا گیا ہے۔ انکے جذبات کو کچل دیا گیا ہے اور انکی زندگی کو تباہ کر دیا گیا ہے۔ مگر اب انہی ہنسی اُڑانے والوں کی یہ حالت ہے کہ اُن کے ملکوں میں اس کثرت کے ساتھ طلاق کا رواج ہے کہ ٹائمز آف لنڈن میں میں نے ایک دفعہ خبر پڑھی کہ امریکہ کی فلاں عورت مری تو اُس کے جنازہ میں گیارہ خاوند شریک ہوئے۔ میں اِس خبر کو پڑھ کر حیران رہ گیا کہ گیارہ خاوندوں کے کیا معنے ہیں۔ نیچے تفصیل پڑھی تو لکھا تھا کہ اِس عورت نے اٹھارہ خاوند کئے تھے۔ جن میں سے سترہ سے اِس نے طلاق لے لی۔ اُن سترہ میں سے چھ مر گئے۔ باقی گیارہ زندہ تھے جو اِس احترام میں کہ کسی وقت یہ ہماری بیوی رہ چکی ہے اُس کے جنازہ میں شریک ہوئے۔ پھر علیحدگی کی جو وجوہ بیان کی گئی تھیں وہ اَور بھی حیرت انگیز تھیں۔ ایک وجہ یہ لکھی تھی کہ اُس عورت نے عدالت میں درخواست دی کہ میرا خاوند گھر میں آتا ہے تو مجھے چومتا نہیں۔ اِس پر مجسٹریٹ نے لکھا۔ اُف اِتنا غضب۔ یہ خاوند ہرگز عورت رکھنے کا مستحق نہیں میں اِس کی علیحدگی کے حق میں فیصلہ دیتا ہوں۔ ایک اَور وجہ یہ لکھی تھی کہ عورت نے جج سے کہا۔ میں نے ایک ناول لکھا ہے مگر میرا خاوند کہتا ہے یہ سخت بیہودہ ہے۔ اِس پر مجسٹریٹ لکھتا ہے۔ یہ اتنا بڑا جرم ہے کہ اب علیحدگی کے سوا اَور کوئی چارہ ہی نہیں۔ اِسی طرح اَور کئی وجوہ لکھی تھیں۔ اَب انگلستان میں بھی آہستہ آہستہ طلاق کو نرم کیا جا رہا ہے۔ مگر نتیجہ یہ ہے کہ اَب امریکہ چلا رہا ہے کہ ہمارے ملک میں طلاق اتنی سستی ہو گئی ہے کہ گھر برباد ہو گئے ہیں۔ خاوند دفتر سے چڑا ہُوا آتا ہے اور وہ اپنی بیوی سے ذرا اونچا بولتا ہے تو بیوی اٹھتی ہے اور گھر سے باہر چلی جاتی ہے۔ پوچھو کہ کہاں جا رہی ہو۔ تو کہتی ہے عدالت میں جا رہی ہوں تاکہ خاوند سے علیحدگی کا فیصلہ کراؤں۔ غرض اِس مسئلہ میں بھی یورپ نے اسلام سے ٹکرا کر بہت بُری طرح شکست کھائی۔ اگر یورپ کے فلاسفر بڑے بڑے اعلیٰ فلسفے بنا سکتے ہیں تو اُن کا یہ چھوٹا سا فلسفہ زیادہ اچھا ہونا چاہیئے تھا۔ کیونکہ چھوٹی چیز زیادہ آسانی سے بن جاتی ہے اور بڑی چیز بنانی مشکل ہوتی ہے۔ مگر اس چھوٹے سے فلسفے میں بھی اسلام سے ٹکرا کر یورپ کی جو حالت ہوئی ہے وہ آج ساری دنیا پر ظاہر ہے۔

پھر شراب کو لے لو۔ اسلام نے کہا ہے کہ شراب مت پیو۔ مگر ساتھ ہی اُس نے یہ بھی کہا ہے کہ ہم یہ نہیں کہتے کہ شراب کلی طور پر خراب ہے شراب اور جوئے میں فوائد بھی ہیں مگر چونکہ اِن کی مضرتیں زیادہ ہیں اور فوائد کم ہیں اِس لئے ہم یہ چیزیں تمہارے لئے حرام قرار دیتے ہیں۔ اَب

ڈاکٹر بعض مریضوں کو شراب دیتے ہیں تو جن لوگوں کو پتہ نہیں ہوتا کہ اسلام نے شراب کے کچھ فوائد بھی تسلیم کئے ہیں۔ وہ جھٹ کہنے لگ جاتے ہیں کہ اسلام نے ایسی اچھی چیز کیوں حرام قرار دے دی ہم نے تو دیکھا ہے کہ فلاں کی نبضیں چھوٹ چکی تھیں مگر برانڈی دیتے ہی اُس کی مُردہ نبض میں حرکت ہونے لگی اور اُس کے جسم میں جان پڑ گئی۔ ایسے لوگوں کے سامنے ہم قرآن کھول کر رکھ دیتے ہیں کہ تم نے تو یہ شراب کا فائدہ آج معلوم کیا ہے مگر ہمارے قرآن نے آج سے تیرہ سو سال پہلے بتا دیا تھا کہ اِس میں محض خرابی ہی خرابی نہیں بلکہ فوائد بھی ہیں مگر چونکہ اِس کے نقصانات زیادہ ہیں اور چونکہ اِس میں بڑا بھاری نقص یہ ہے کہ جب کوئی شخص اسے پینا شروع کرتا ہے تو اُس کی اعلیٰ دماغی طاقتیں ناکارہ ہونے لگتی ہیں اور پھر اُسے شراب کی ایسی عادت ہو جاتی ہے کہ وہ اُسے چھوڑ نہیں سکتا اِس لئے اسلام نے اسے حرام قرار دے دیا۔ یہ ہو سکتا ہے کہ سو میں سے ایک آدمی ایسا ہو جسے شراب پینے کے باوجود اس کی عادت نہ پڑے مگر ننانوے یقیناً اس کے عادی ہو جائیں گے۔ اور ایک کی خاطر ننانوے کو قربان نہیں کیا جا سکتا۔ جب سو میں سے ننانوے آدمی اِس سے خراب ہو جاتے ہیں تو ضروری تھا کہ اس ایک کو ننانوے پر قربان کیا جاتا۔ نہ کہ ننانوے کو ایک کے لئے قربان کیا جاتا آخر ہر زمانہ کا معقول یہ کس طرح ثابت کر سکتا ہے کہ فلاں شخص زیادہ مضبوط ہے اور فلاں شخص کم۔ فلاں شخص میں شراب کو برداشت کرنے کی زیادہ طاقت ہے اور فلاں میں نہیں۔ ہر شخص کے متعلق نہ اس قسم کی تحقیق ہو سکتی ہے اور نہ ایسی تحقیق یقینی کہلا سکتی ہے۔ اس لئے اسلام نے ایک قانون مقرر کر دیا کہ شراب حرام ہے کیونکہ ننانوے فیصدی اس کا نتیجہ یہی پیدا ہوتا ہے کہ پینے والے شراب کی عادت پڑ جاتی ہے اور پھر وہ اُسے چھوڑ نہیں سکتا۔ پس اس مسئلہ میں بھی اسلام نے جو راہ اختیار کی وہی درست ہے نہ کہ وہ راہ جو یورپ نے اختیار کی۔

پھر کثرتِ ازدواج کا مسئلہ ہے۔ قرآن نے اِس مسئلہ کو بیان کیا مگر مسلمانوں نے عیسائیوں اور یوروپین مصنفین کے ڈر کے مارے یہ کہنا شروع کر دیا کہ یہ تو عربوں کے زمانہ کی بات تھی۔ چونکہ عربوں کے رسم و رواج میں یہ بات شامل تھی اِس لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اُن کی دلداری کرتے ہوئے اِس تعلیم کو جاری کر دیا۔ میں ایک دفعہ شملہ گیا۔ وہاں درد صاحب مرحوم جو میرے پرائیویٹ سکرٹری تھے اُن کی طرف سے ایک دعوتِ عصرانہ میری ملاقات کے لئے گورنمنٹ کے بڑے بڑے افسروں کو دی گئی۔ میں وہاں بیٹھا تھا کہ مسلمانوں کے ایک بہت بڑے رئیس جنہیں سَر کا خطاب بھی ملا ہوا تھا مسٹر متّرا کے ساتھ جو [illegible] ممبر تھے کمرہ میں داخل ہوئے۔ وہ آپس میں کچھ باتیں کرتے آ رہے تھے جب وہ کمرہ میں داخل ہوئے تو میرے کانوں میں اُنکی یہ آواز پڑی کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو علم نہیں تھا کہ گائے کے سوال پر ہندوؤں میں اس قدر خفگی پیدا ہو گی ورنہ قرآن میں وہ اس کو ضرور حرام قرار دے دیتے۔ جب میرے کانوں میں یہ آواز پڑی تو طبعی طور پر میرے دل میں احساس پیدا ہوا کہ میں ان سے دریافت کروں کہ کیا بات ہو رہی تھی۔ چنانچہ جب وہ بیٹھ گئے۔ تو میں نے مسٹر متّرا سے کہا کہ ابھی میرے کانوں میں اِس قسم کی آواز آئی تھی کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ آپ دونوں کی آپس میں کیا گفتگو ہو رہی تھی۔ انہوں نے کہا۔ ہاں صاحب! انہوں نے تو کمال کر دیا۔ اِن صاحب سے آج مجھے ایک ایسا نکتہ معلوم ہوا جس سے اسلام کی عظمت میرے دل میں بہت ہی بڑھ گئی ہے اور میں اسلام کا بہت زیادہ قائل ہو گیا ہوں یہ صاحب مجھے بتا رہے تھے کہ اسلام غیر اقوام کی دلداری کا اس قدر خیال رکھتا ہے کہ محض یہودیوں کے لئے اُس نے سؤر کو حرام کر دیا۔ چونکہ یہودیوں کو سؤر سے نفرت تھی اِس لئے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کے جذبات کا احترام کرتے ہوئے سؤر کو ممنوع قرار دے دیا۔ اگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

کو معلوم ہوتا کہ ہندوؤں کے دلوں میں گائے کی کیا عظمت ہے تو یقیناً آپ قرآن میں گائے کھانے سے بھی مسلمانوں کو منع کر دیتے۔ کیونکہ اسلام نہایت ہی ملاطفت اور نرمی کی تعلیم دیتا ہے اور وہ دوسروں کے جذبات کا بہت خیال رکھتا ہے مجھے علم نہیں تھا کہ اسلام دوسری اقوام کا اسقدر خیال رکھتا ہے ان صاحب سے آج پہلی دفعہ مجھے یہ بات معلوم ہوئی ہے اور اس بات نے اسلام کی عظمت میرے دل میں بہت ہی بٹھا دی ہے۔ میں نے کہا۔ مجھے افسوس ہے کہ مَیں اُس عظمت کو جو آپ کے دل میں پیدا ہوئی ہے کچھ کم کرنے لگا ہوں۔ آپ ذرا اِن صاحب سے پُوچھیئے کہ قرآن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بنایا ہے یا خدا نے بنایا ہے۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تو علم نہیں تھا کہ ہندو اپنے دلوں میں گائے کی کسقدر عظمت رکھتے ہیں۔ کیا خدا کو بھی اس بات کا پتہ نہیں تھا! اِس پر وہ مسلمان دُمیس گھبرا کر کہنے لگا۔ اوہو مجھ سے غلطی ہوگئی ہے ممکن ہے میرے اس جواب سے مسٹر متراکے دل میں اسلام کی عزت کچھ کم ہوگئی ہو مگر یہ زیادہ خطرناک بات تھی کہ وہ قرآن کے متعلق یہ سمجھنے لگتے کہ یہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بنائی ہوئی کتاب ہے اور جو نیا نکتہ اُن کے ذہن میں آتا تھا وہ اس میں داخل کر دیتے تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلام نے تمام احکام محض ہمارے فائدہ کیلئے دیئے ہیں۔ یہ بات بالکل غلط ہے کہ چونکہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو آئندہ کے حالات کا علم نہ تھا یا چونکہ عربوں میں فلاں فلاں بات پائی جاتی تھی اسلئے قرآن نے بھی اُن کا ذکر کر دِیا۔ کثرت ازدواج کا ہی مسئلہ لے لو۔ ہم یہ مان لیتے ہیں کہ ساری دنیا ایسا نہیں کر سکتی اِس لئے کہ بعض ملک ایسے ہیں جن میں کچھ مرد زیادہ ہیں۔ بعض ملک ایسے ہیں جن میں کچھ عورتیں زیادہ ہیں اور بعض ملک عورتوں اور مردوں کی تعداد کے لحاظ سے مساوی ہیں۔ اب اگر عورتیں ایک دو فیصدی بھی زیادہ ہوں تو بہر حال تھوڑے لوگ ہی ایک سے زیادہ شادیاں کر سکتے ہیں ہر ایک نہیں کر سکتا۔ مگر سوال یہ ہے کہ آیا یہ حکم ہے یا ایک سے زیادہ شادیاں کرنیکی اجازت ہے، قرآن کریم اِسے حکم قرار نہیں دیتا بلکہ اجازت قرار دیتا ہے۔ اور جب یہ اجازت ہے تو جو لوگ اس سے فائدہ اٹھانے کے قابل ہونگے وہی اس پر عمل کریں گے دوسرے نہیں۔ اور جیسا کہ مَیں بتا چکا ہوں ایسے لوگ ایک دو فیصدی سے زیادہ نہیں ہو سکتے۔ مگر بعض دفعہ زمانہ میں مخصوص حالات کے ماتحت ایسے تغیرات بھی ہو سکتے ہیں کہ قومی ترقی کے لئے ایک سے زیادہ شادیاں کرنی ضروری ہو جائیں۔

۱۹۴۶ء کے شروع میں جب بہار میں فسادات ہوئے اور مسلمانوں کا قتل عام کیا گیا تو وہاں سے مسلمان بھاگے اور اِدھر اُدھر چلے گئے۔ کوئی مدراس چلا گیا کوئی بمبئی چلا گیا کوئی کلکتہ چلا گیا اور کوئی کسی اور جگہ چلا گیا۔ ہماری جماعت کا مرکز چونکہ قادیان تھا اسلئے جو لوگ ہماری جماعت سے تعلق رکھتے تھے اُن میں سے بعض قادیان آ گئے۔ ایک دفعہ ان لوگوں میں سے ایک شخص مجھے ملنے آیا۔ اور اُس نے کہا مَیں بہار سے آیا ہوں وہاں مسلمانوں پر جو تباہی آئی ہے اور جس طرح ہزاروں ہزار مسلمان وہاں سے بھاگ گئے ہیں وہ آپ اچھی طرح جانتے ہیں۔ مَیں آپ کے پاس صرف اس لئے آیا ہوں کہ مسلمانوں کی اِس بربادی اور تباہی کو دیکھ کر میرے دل میں یہ سوال پیدا ہُوا ہے کہ اب مسلمان کیا کریں؟ اور وہ کس طرح دوبارہ ہندوستان میں ترقی کر سکتے ہیں؟ مَیں نے کہا۔ اِس کا علاج تو موجود ہے مگر آپ لوگوں نے کرنا نہیں کیونکہ تمہیں ہو۔ کیوں نہ کریں گے۔ اتنی بڑی تباہی کے بعد بھی

اگر ہم نے اپنی بقا کے لئے کوئی تدبیر نہ کی تو اَور کب کرینگے میں نے کہا۔ اسلام نے اِسی قسم کی ضرورت کے لئے کثرتِ ازدواج کی تعلیم دی تھی مگر مسلمانوں نے کہنا شروع کر دیا کہ یہ تعلیم تو محض وقتی ضرورت کے ماتحت دی گئی تھی۔ عرب لوگ جاہل تھے اور اُن کو فوراً دبایا نہیں جا سکتا تھا چونکہ اُن میں کثرتِ ازدواج کا رواج تھا اس لئے اسلام نے بھی اُن کی دلداری کے لئے یہ تعلیم دے دی ورنہ اسلام کا منشا یہ نہیں تھا کہ ایک سے زیادہ شادیاں کی جائیں اسلام درحقیقت ایک شادی کا ہی قائل ہے عرب کے حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے جو تعلیم اس نے دی تھی اُسے سارے زمانوں پر چسپاں نہیں کیا جا سکتا۔ میں نے کہا۔ آج مسلمانوں پر جو وبال آیا ہے یہ محض اسلامی احکام کی بے حرمتی کرنے کا نتیجہ ہے۔ قرآن کریم کے اور احکام چلنے دو اس کے صرف دو مسئلے ہی ایسے ہیں کہ اگر مسلمان صرف انہی پر عمل کرتے تو آج سارا ہندوستان مسلمانوں سے بھرا ہُوا ہوتا۔ اُن میں سے ایک تبلیغ ہے اور ایک کثرتِ ازدواج اگر سارے مسلمان تبلیغ کرنے لگ جاتے تو آدھے ہندوستان کو مسلمان بنا لیتے اور اگر تعدّد ازدواج پر عمل کرتے تو باقی آدھا ہندوستان بھی مسلمان ہو جاتا اور ہندو کہیں نظر بھی نہ آتا۔ مگر تم نے اس پر عمل نہ کیا اور یہ بحث کرنی شروع کر دی کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات یونہی کہہ دی تھی اِسی کا خمیازہ آج مسلمان بھگت رہے ہیں۔ پھر میں نے انہیں کہا کہ اگر آج بھی مسلمان اِس پر عمل کریں تو میں ذمہ لیتا ہوں کہ پچاس سال میں ایک ہندو بھی ہندوستان میں نظر نہیں آئیگا۔ آخر یہ واضح بات ہے کہ جب ہر شخص چار شادیاں کرنے کے لئے تیار ہو جائیگا تو شادی کے لئے اعلیٰ خاندان کی عورتیں میسّر نہیں آ سکینگی لازماً گونڈ بھیل گوہل اور دوسری ادنیٰ اقوام کی طرف انہیں توجہ کرنی پڑے گی۔ اور انکی لڑکیوں سے شادی کرنی پڑے گی۔ اِس طرح دو چار سال میں ہی وہ سارے کے سارے خاندان ہی مسلمان ہو جائیں گے۔ پھر ہندو کے ہاں اگر ایک بچہ پیدا ہوگا تو مسلمان کے ہاں چار چار پیدا ہونگے۔ ہندو یوں بھی نسل کے لحاظ سے کمزور ہوتا ہے۔ اِس لئے اس کے اگر دو بچے ہونگے تو تمہارے سولہ ہونگے نتیجہ یہ ہوگا کہ بیس پچیس سال میں صرف تم ہی تم ہوگے اور تمہارا ہی ہندوستان میں زور ہوگا۔ وہ کہنے لگا۔ جو بچے پیدا ہونگے وہ کھائیں گے کہاں سے؟ میں نے کہا یہی تو اِس میں نکتہ ہے۔ جسے تم سمجھے نہیں۔ جب کوئی قوم بھوکی ہوتی ہے تو وہ ہمیشہ لڑنے مرنے پر آمادہ ہو جایا کرتی ہے۔ ایک زمانہ آئیگا جب انہیں کھانے کیلئے روٹی نہیں ملیگی۔ تن ڈھانکنے کیلئے کپڑا میسّر نہیں آئے گا۔ علاج کے لئے دوا نہیں ملیگی۔ رہنے کیلئے مکان نہیں ملیگا تب یکدم اُن میں جوش پیدا ہوگا۔ اور وہ کہیں گے اب ہم اس حالت میں زیادہ دیر تک نہیں رہ سکتے ہم مر جائینگے یا دوسروں کو مار ڈالیں گے۔ اور جب وہ اٹھے تو یکدم سارے ملک پر قابض ہو جائیں گے۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ بھوک ایک عذاب ہے حالانکہ بھوک خود ایک اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا انعام ہے۔ جس قوم میں بھوک آ جائیگی وہ زیادہ دیر تک غلام بنا کر نہیں رکھی جا سکیگی۔ وہ شیر بن جائیگی۔ اور اس کا ایک ایک فرد مرنے مارنے کیلئے تیار ہو جائیگا۔ اور جب وہ مرنے مارنے کیلئے تیار ہو گئے تو اُن کے مقابلہ میں کوئی اَور قوم کہاں ٹھہر سکیگی۔ پہلے ہی یہ ایک کے مقابلہ میں آٹھ ہونگے اور پھر بھوکے شیر ہونگے۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ یہ لڑیں گے اور ملک پر قابض ہو جائیں گے۔ اِسی وجہ سے ہندوستان میں آج کل ادنیٰ اقوام زیادہ طاقتور ہیں لیکن مسلمان ذلیل ہیں کیونکہ ہندو سمجھتا ہے کہ مسلمانوں پر بے شک ظلم کر لو وہ اپنے اموال کی وجہ سے کبھی بغاوت نہیں کر سکتے لیکن ادنیٰ اقوام پر

ظلم نہ کرو کیونکہ وہ غربت کی وجہ سے بغاوت پر آمادہ ہو جائیں گی۔ حقیقت یہ ہے کہ تم جس کو عیب سمجھتے ہو وہ عیب نہیں بلکہ بہت بڑا انعام ہے اور یہی علاج ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمہارے لئے مقرر ہے۔ مگر میں نے پھر کہا کہ علاج تو میں نے بتا دیا ہے مگر تم نے میری بات مانی نہیں۔ اس واقعہ پر چھ ماہ گذرے تھے کہ انڈیان سے مجھے ایک خط ملا۔ خط لکھنے والا کوئی مدرس یا پروفیسر تھا۔ اُس نے سخت سُست کہنے کے بعد مجھے لکھا کہ آپ لوگ کچھ کرتے نہیں۔ اگر کثرت ازدواج پر ہی مسلمان عمل کرتے تو آج اُن کی یہ حالت کیوں ہوتی۔ میں نے اُسے جواب میں لکھا کہ تم مجھے مت کوسو۔ میں تو لوگوں سے کہتا رہتا ہوں۔ ملامت کرنی ہے تو اپنے لوگوں کو کرو جو اس پر عمل نہیں کرتے۔ اب دیکھو یہ کثرت ازدواج کا مسئلہ ہے جو اسلام نے پیش کیا۔ یہ کتنا اہم مسئلہ تھا۔ مگر مسلمانوں نے اِس کو کس طرح فراموش کر دیا اور وہ بھی عیسائیوں اور ہندوؤں اور دوسرے مذاہب والوں سے ڈر کر حالانکہ قرآن کریم میں بار بار آتا تھا کہ عیسائی اور یہودی تمہارے دشمن ہیں۔ تم ان کی باتیں کبھی نہ ماننا۔ آخر یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ ایک لچکدار قانون ہو اور ایک غیر لچکدار اور پھر ان قانونوں کو ماننے والی قومیں اکٹھی رہ سکیں۔ ایک عیسائی اپنی قوم کی حالت دیکھیگا تو فوراً کہیگا کہ اِس کے لئے یوں قانون بناؤ۔ مگر مسلمان کہیگا قانون ہم نے بنانا ہے یا خدا نے۔ قانون تو وہ بنا چکا۔ اب ہمارا اختیار نہیں کہ ہم اس کے مقابلہ میں کوئی اَور قانون بنائیں۔ اِس پر وہ کہیگا۔ تم پاگل ہو تم حالات کو نہیں سمجھتے۔ ایک پُرانے قانون کی رٹ لگائے چلے جا رہے ہو۔ اِس طرح قدم قدم پر ہمارا اور اس کا اختلاف ہو جائیگا۔ ہمارے نزدیک خدا تعالیٰ کے قانون کو چھوڑنا بے وقوفی ہے۔ اور اُس کے نزدیک خدا تعالیٰ کے قانون پر عمل کرنا بے وقوفی ہے۔ ہمارے نزدیک خدا تعالےٰ کا قانون آج سے تیرہ سو سال پہلے نازل ہو چکا تھا اب قیامت تک کوئی اور قانون نازل نہیں ہو سکتا مگر اُس کے نزدیک اب نئے قانون کی ضرورت ہے۔ نئے نظریات اور نئے مسلّمات کی اُس کو جستجو ہے۔ جب وہ ہم میں اسقدر اختلاف دیکھتا ہے تو وہ ہمارے نقطۂ نگاہ کا دشمن ہو جاتا ہے اور اُس کی یہ دشمنی ایک ایک قدم پر ظاہر ہو جاتی ہے۔ سنہ ۲۴ء میں جب میں ولایت گیا تو سر تھامس آرنلڈ جو علی گڑھ میں پروفیسر رہ چکا تھا اور اُس وقت وہ مشرقی افریقہ کا گورنر تھا اور وہیں سے آیا تھا ایک میٹنگ میں شامل ہُوا جس میں مَیں بھی شریک تھا۔ اُس وقت بعض عورتوں نے مجھ سے مصافحہ کرنا چاہا تو میں نے انکار کر دیا اور کہا کہ اسلام میں عورتوں سے مصافحہ کرنا جائز نہیں۔ میری یہ بات اُس پر طبعاً گراں گذری۔ اور اُس نے بعد میں کہنا شروع کر دیا کہ مَیں اسلام کا بڑا ماہر ہوں۔ بہت بڑا مصنّف ہوں اسلام میں ایسی کہیں تعلیم نہیں۔ اِس کے بعد کچھ طالب علم میرے پاس آئے۔ اور انہوں نے ذکر کیا کہ پروفیسر آرنلڈ اس طرح ذکر کرتا تھا۔ کیا اسلام میں عورتوں سے مصافحہ کرنا جائز ہے یا نہیں؟ مَیں نے انہیں تفصیل سے اسلام کی تعلیم بتائی اور کہا کہ اسلام عورتوں سے مصافحہ کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ اِس پر پروفیسر آرنلڈ کے دل میں میرے متعلق اِس قدر بغض پیدا ہو گیا کہ جب کوئی میٹنگ ہوتی تو وہ میری موجودگی میں اُس میں شامل نہیں ہوتا تھا۔ ایک دفعہ وہ میٹنگ میں تو آیا مگر مجھ سے دُور دُور رہا۔ مَیں نے سکرٹری سے ذکر کیا کہ پروفیسر آرنلڈ محض میری وجہ سے آگے نہیں آتا۔ اُس نے کہا۔ یہ کس طرح ہو سکتا ہے مَیں ابھی اُسے بلواتا ہوں۔ مَیں نے کہا۔ آپ دیکھ لیں۔ وہ میرے سامنے نہیں آئیگا۔ چنانچہ ایسا ہی ہُوا۔ اُس نے

آواز دی اور کہا پروفیسر آرنلڈ ادھر آؤ۔ اِسپر وہ آ تو گیا۔ مگر مجھے دیکھتے ہی ایک دوسرے راستہ سے نکل گیا۔ غرض اس قدر بُغض ان کے دلوں میں اسلامی تعلیم سے پایا جاتا ہے کہ جس کی کوئی حد ہی نہیں۔ وہ کہتے ہیں ہم اپنی مرضی سے قانون بنانا چاہتے ہیں اور یہ ہر جگہ روڑا اٹکا دیتے ہیں۔ اور کہتے ہیں۔ اسلام یوں کہتا ہے ہیں مسلمانوں اور عیسائیوں اور یہودیوں کی آپس میں کبھی دِلی مودت نہیں ہو سکتی۔ ہاں اگر کوئی مسلمان اسلام کو چھوڑ دے۔ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا انکار کر دے اور کہے کہ نعوذ باللہ خدا تعالےٰ کو غلطی لگ گئی تھی۔ اُس نے زمانہ کے حالات کو مدّنظر رکھتے ہوئے قانون نہیں بنایا تب بے شک اُس کی یورپ سے مودت ہو سکتی ہے۔ مگر جب تک وہ ایک خدا کو مانتا ہے۔ جب تک وہ محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان رکھتا ہے جب تک وہ قرآن کو خدا تعالیٰ کی کتاب سمجھتا ہے اُسوقت تک ایک مسلمان اور یورپ کی آپس میں دلی مودت نہیں ہو سکتی

ایک دفعہ میں ہوائی جہازوں کے ایک بڑے افسر سے ملا بعض اور افسر بھی اُسوقت موجود تھے۔ اُس نے باتوں باتوں میں اسلام پر اعتراض کر دیا۔ میں نے اُس کا جواب دیا اُس نے پھر اعتراض کیا میں نے پھر جواب دیا۔ غرض اِسی طرح وہ اعتراض کرتا چلا گیا اور میں جواب دیتا گیا میں جانتا تھا کہ باتوں باتوں میں میں اسے اِسطرح پھنساؤنگا کہ اِس کے اعتراضات کا خدا تعالیٰ سے ٹکراؤ ہو جائے گا۔ چنانچہ ایک مقام پر آکر وہ پھنس گیا۔ اور میں نے کہا۔ فرمائیے آپ زیادہ عقلمند ہیں یا خدا زیادہ عقلمند ہے؟ اُس میں کچھ نوجوانی کی ترنگ تھی اور کچھ یُوں بھی نوتعلیمیافتہ مسلمانوں میں اللہ تعالےٰ کا ادب کچھ کم ہوتا ہے۔ تھوڑی دیر وہ خاموش رہا۔ مگر پھر کہنے لگا۔ میں سمجھتا ہوں کہ میں زیادہ عقلمند ہوں۔ اِس پر اُسکے تمام ساتھی ہنس پڑے کہ بے وقوفی کی وجہ سے یہ شخص تو گیا ہے مگر بے حیا بن کر اب یہ کہہ رہا ہے کہ میں خدا تعالےٰ سے زیادہ عقلمند ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ جب تک مسلمان یہ سمجھتا ہے کہ یہ خدا تعالےٰ کی کتاب ہے۔ جب تک وہ یہ سمجھتا ہے کہ خدا تعالےٰ مجھ سے زیادہ عقلمند ہے لازمًا اُسے یورپ کا مقابلہ کرنا پڑے گا۔ اور اس مقابلہ میں آخر یہی ظاہر ہوگا کہ یورپ ہارا اور اسلام کا خدا جیتا۔

شراب کے متعلق ہی دیکھ لو۔ کس طرح یہ اعتراض کیا جاتا تھا کہ اسلام انسان کی علوّ حوصلگی کو نہیں سمجھتا وہ فطرت کے نازک جوہروں کو نہیں پہچانتا۔ وہ سمجھتا ہے کہ شراب صرف اِسی طرح پی جاتی ہے کہ انسان بدمست ہو کر بکواس کرنے لگ جائے۔ وہ ایشیائی لوگ تھے جو اِس طرح شراب پیا کرتے تھے۔ ہمارے یورپ کے لوگ وحشی نہیں۔ وہ صرف ایک یا دو پیگ پیتے ہیں جس سے اُن پر کوئی بدحواسی طاری نہیں ہوتی اور انکی عقل ٹھکانے رہتی ہے۔ مگر پھر وہی امریکہ جو اسلام پر اعتراض کیا کرتا تھا۔ اُس نے قانون بنایا کہ شراب نوشی قطعًا ممنوع کی جاتی ہے۔ اگر شراب کے ایک یا دو پیگ عقل کو تیز کرتے ہیں تو امریکہ جو سب سے زیادہ شراب پیا کرتا تھا اُس نے شراب کو ممنوع کرنے کی کیوں کوشش کی؟ اور پھر ممنوع قرار دینے کے بعد اُسے جائز کیوں کر دیا؟ یہ بھی ایک ثبوت ہے اِس بات کا کہ اسلامی قوانین ہی تمام قوانین سے بہتر ہیں۔ امریکہ نے مجبور ہو کر شراب کو ممنوع قرار دیا۔ مگر پھر مجبور ہو کر اسی حرام چیز کو اُس نے حلال کر دیا۔ اس کی یہ شکست بتا رہی ہے کہ قرآن جو کچھ کہتا ہے اس کے پیچھے خدائی طاقت ہوتی ہے۔ مگر یورپ جو کچھ کہتا ہے اس کے پیچھے کوئی خدائی طاقت نہیں ہوتی۔ اسلام نے کہا کہ شراب حرام ہے اور امریکہ نے بھی کہا کہ شراب حرام ہے۔ مگر اسلام کی حرام کی ہوئی

چیز آج تک حرام ہے اور امریکہ نے پندرہ سال کے بعد پھر اسی حرام چیز کو حلال کر دیا۔ یہ تفاوت بتا رہا ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کتنی بڑی طاقت اور عظمت حاصل تھی۔ عرب کے لوگ شراب کے اسقدر عادی تھے کہ وہ اور وقتوں کے علاوہ تہجد کے وقت شراب پینا خاص طور پر فخر کا موجب خیال کیا کرتے تھے۔ اسلام نے بھی دجہ سے اس وقت مومنوں کے لئے تہجد کی نماز مقرر کر دی۔ پھر رات کی شراب کے علاوہ اُن کے امراء صبح سے سوتے وقت تک پانچ دفعہ شراب پیا کرتے تھے۔ اسلام نے انہی اوقات کے مقابلہ میں مومنوں کے لئے پانچ نمازیں فرض کر دیں۔ ان نمازوں میں اور بھی حکمتیں ہیں مگر ایک حکمت یہ بھی ہے کہ انہی اوقات میں عرب کے لوگ شراب پیا کرتے تھے۔ ایک دن محمد رسول صلی اللہ علیہ وسلم اپنی مجلس میں بیٹھے تھے کہ آپ نے اپنے صحابہؓ سے فرمایا۔ آج خدا نے کہا ہے کہ شراب پینا حرام ہے۔ اُس وقت مدینہ کے ایک گھر میں کوئی تقریب تھی جس میں بہت سے لوگ مدعو تھے۔ اور نہایت اعلیٰ درجہ کی شراب کے مٹکے انہوں نے منگوائے ہوئے تھے۔ شراب کا ایک مٹکا ختم ہو چکا تھا اور دوسرا شروع ہونے والا تھا کہ ایک ڈھنڈورا پیٹنے والا مدینہ کی گلیوں میں سے گذرا۔ اور اُس نے کہا۔ اے لوگو! سُن لو۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آج خدا کے حکم سے شراب حرام کر دی ہے۔ وہ لوگ جو شراب کا ایک مٹکا پی چکے تھے اُن کے متعلق ہر شخص آسانی سے یہ اندازہ لگا سکتا ہے کہ وہ کتنے بدمست ہونگے۔ کس طرح اُن کی عقل پر پردہ پڑ چکا ہوگا مگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حکومت کا یہ عالم تھا کہ جونہی اُن کے کانوں میں یہ آواز پڑی۔ وہ چونک اُٹھے اور اُن میں سے ایک نے کہا۔ ارے باہر آواز آ رہی ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شراب حرام کر دی ہے۔ دروازہ کھول کر پوچھو تو سہی کہ کیا بات ہے۔ دوسرے نے کہا۔ جب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک حکم ہمارے کانوں میں پہنچ چکا ہے تو اب یہ کیا سوال ہے کہ میں دروازہ کھولوں اور اعلان کرنے والے سے پوچھوں کہ کیا بات ہے۔ میں پہلے شراب کا مٹکا توڑونگا اور پھر اس سے پوچھونگا کہ کیا بات ہے!

اِدھر امریکہ جو عرب کو وحشی قرار دیتا ہے اور جس کے ڈر کے مارے بعض مسلمان بھی اپنی نادانی سے یہ کہہ دیا کرتے ہیں کہ عرب ایک غیر مہذب اور ناتربیت یافتہ قوم تھی وہ دوسروں کی بات ماننے کے لئے آسانی سے تیار نہیں نہیں ہوتے تھے۔ محض ان کی خاطر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کثرتِ ازدواج کی تعلیم دے دی یا ایسے ہی اور احکام دے دیئے اُس ملک کی اکثریت یہ فیصلہ کرتی ہے کہ شراب بُری چیز ہے۔ اس ملک کے سائنسدان یہ فیصلہ کرتے ہیں کہ شراب بُری چیز ہے۔ اس ملک کے ڈاکٹر یہ فیصلہ کرتے ہیں کہ شراب بُری چیز ہے۔ اُس ملک کی آئین ساز حکومت یہ فیصلہ کرتی ہے کہ شراب بُری چیز ہے اور وہ اس کے خلاف ملک میں قانون پاس کرتے ہیں مگر اس زمانہ کا وہ تعلیمیافتہ اور مہذب آدمی جو عرب کو جاہل قرار دیتا ہے جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم پر اعتراض کیا کرتا ہے خود اتنا جاہل ہو جاتا ہے کہ وہ پھر بھی شراب نہیں چھوڑ سکتا بلکہ اس قانون کے بعد لوگ اتنی گندی شرابیں پینے لگ گئے کہ ملک میں ایک ہیجان برپا ہو گیا۔ یہاں تک واقعات ہوئے کہ لوگوں نے جوش میں آ کر میتھیلیٹڈ سپرٹ پینی شروع کر دی اور اندھے ہو گئے۔ میتھیلیٹڈ سپرٹ ایک قسم کی شراب ہے جس میں میتھل جو زہر ہے ملایا جاتا ہے تاکہ لوگ اس کو پی نہ سکیں اور صرف چولھے میں جلانے کے کام آئے۔ یہ وہ سمجھدار لوگ ہیں جو موجودہ زمانہ میں اپنی

تہذیب کا ڈھنڈورا پیٹتے پھرتے ہیں - اور وہ نعوذ باللہ "جاہل اور بدتہذیب" عرب تھے جن کی زبان سے بدمستی کی حالت میں بھی اگر کوئی فقرہ نکلا تو یہ کہ یہ کیا سوال ہے کہ میں دروازہ کھولوں اور دریافت کروں کہ کیا بات ہے - کیا شراب کے مٹکے کی زیادہ قیمت ہے یا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی زیادہ قیمت ہے - جب ایک آواز ہمارے کانوں میں پہنچ چکی ہے تو اب میں پہلے مٹکا توڑوں گا اور پھر اس سے دریافت کرونگا کہ کیا بات ہے اگر بات غلط نکلی تو ہم اور شراب منگوا لیں گے اور اگر ٹھیک نکلی تو ہم اس فخر سے اپنا سر اونچا کر سکیں گے کہ ہم نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کو سُنتے ہی اُس پر عمل کر لیا -

پھر جُوا ہے - دنیا نے اسلام کے اس حکم پر بھی کہ جُوا مت کھیلو ہنسی اُڑائی - انگریز ساری کی ساری جُوا باز قوم تھی مگر آج کوئی ملک دکھاؤ جس میں جوئے کے متعلق قانون نہ بن رہے ہوں - وہ ابھی کھلے طور پر اسے چھوڑ نہیں سکے مگر اسلام کی برتری اور اُس کی فضیلت کی یہ کتنی بیّن دلیل ہے کہ اسلام نے آج سے تیرہ سو سال پہلے جو حکم دیا تھا مغرب رفتہ رفتہ بعض قیود اور شرائط عائد کرتے ہوئے اس کی طرف آ رہا ہے - مگر کھلے طور پر جوئے کو ممنوع قرار دینے میں ابھی اُسے شرم آتی ہے - جیسے ذوقؔ کہتا ہے ؎

بعد مدت کے گلے ملتے ہوئے آتی ہے شرم
اب مناسب ہے یہی کچھ تم بڑھو کچھ میں بڑھوں

اگر وہ یکدم جُوا بند کر دیں تو انہیں یہ ڈر محسوس ہوتا ہے کہ لوگ کہیں گے آخر تم اسی بات کی طرف آ گئے جو اسلام نے پیش کی تھی اس لئے وہ مختلف قیود عائد کرتے چلے جا رہے ہیں - کہتے ہیں فلاں طرز کا جُوا منع ہے - اِس اِس طرح کھیلنا منع ہے - اگر کھیلنا ہی ہو تو کسی فرم کی معرفت جُوا کھیلا جائے اور اُس کا ریکارڈ رکھا جائے - غرض کئی قیود ہیں جو وہ عائد کر رہے ہیں - گویا بات وہی آ گئی جو اسلام نے کہی تھی کہ جُوا مت کھیلو مگر کھلے بندوں ابھی اسے ماننے کی ہمت اُن میں نہیں -

پھر سزائے موت ہے - قرآن کریم نے بعض جرموں کے متعلق سزائے موت تجویز کی تو کہا گیا کہ یہ کتنے بڑے ظلم کی بات ہے کہ ایک انسان کی جان لے لی جائے - ہمارے مسیح نے تو یہ کہا ہے کہ اگر کوئی شخص تمہارے ایک گال پر تھپڑ مارے تو تم اپنا دوسرا گال بھی اُس کی طرف پھیر دو - چنانچہ یورپ کے بعض ملکوں نے سزائے موت کو منسوخ کر دیا - مگر پچیس تیس سال کے بعد انہوں نے پھر قانون بنائے کہ سزائے موت ضرور ہونی چاہیئے کیونکہ اس کے بغیر امن قائم نہیں رہتا - غرض جیسیوں چیزیں ہیں جو اسلام نے پیش کیں اور جن پر مغرب نے ہنسی اُڑائی مگر ایک ایک چیز سے ٹکرانے کے بعد آخر مغرب کو تسلیم کرنا پڑا کہ وہی راہ درست ہے جس پر اسلام دنیا کو چلانا چاہتا ہے اور یہ ثبوت ہے اِس بات کا کہ آج سے تیرہ سو سال پہلے کی کتاب جو ایک اُمّی نبیؐ نے دنیا کے سامنے پیش کی تھی وہ اُسی خدا کا قانون ہے جو فطرتِ انسانی کا خالق ہے - وہ جانتا تھا کہ جو مشین میں نے بنائی ہے وہ کس طرح چل سکتی ہے اور اُس کی درستی کے لئے کیا کیا چیزیں ضروری ہیں - مگر مصیبت یہ ہے کہ مسلمانوں کے اندر خود کامل ایمان نہیں - وہ یورپ کی ہر بات پر حیران ہو کر اُس کے پیچھے دوڑ پڑتے ہیں اور جب دیکھتے ہیں کہ یورپ ناکام ہُوا تو اس کے بعد انہیں خیال پیدا ہوتا ہے کہ اصل تعلیم تو وہی ہے جو قرآن نے پیش کی مگر اتنے میں یورپ ایک اَور بات نکال لیتا ہے اور

وَلَوْ رَحِمْنٰهُمْ وَكَشَفْنَا مَا بِهِمْ مِّنْ ضُرٍّ لَّلَجُّوْا

اور اگر ہم ان پر رحم کریں اور جو ضرر انکو پہنچ رہا ہے اُسے دُور کر دیں تو وہ

فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ﴿۷۶﴾ وَلَقَدْ اَخَذْنٰهُمْ بِالْعَذَابِ

اپنی سرکشی میں اور بھی بڑھ جائیں - اور ہم نے ان کو سخت عذاب میں جکڑا رکھا ہے

مسلمان پھر اس کے پیچھے دوڑ پڑتے ہیں - انکی مثال بالکل ویسی ہی ہے جیسے کہتے ہیں کہ عرب میں ایک فاتر العقل لڑکا تھا جسے اُس کے ساتھی لڑکے ہمیشہ چھیڑتے اور دق کرتے رہتے جب وہ سخت تنگ آجاتا تو اُن سے پیچھا چھڑانے کیلئے کہتا - ارے تمہیں پتہ نہیں کہ فلاں رئیس کے ہاں بہت بڑی دعوت ہے - اُس نے کئی اونٹ اور دُنبے ذبح کئے ہیں اور ہزاروں لوگوں کو کھانا کھلا رہا ہے - تمہارے ماں باپ اور بھائی بہنیں سب وہاں گئے ہوئے ہیں - تم اگر یہیں رہے تو گوشت وہ کھا جائینگے اور تم محروم رہ جاؤگے - لڑکے اُس کی بات سُن کر دھوکے میں آجاتے اور دعوت کھانے کے لئے اُس رئیس کے مکان کی طرف دوڑ جاتے اور یہ اُن کی مارسے بچ جاتا - مگر اُن کے جانے کے بعد اس کے دل میں خیال پیدا ہوتا کہ مَیں نے تو ان سے جھوٹ موٹ ایک بات کہی تھی شاید سچ مچ ہی وہاں کوئی دعوت ہو - اور اگر ایسا ہُوا تو یہ لڑکے تو گوشت کھا جائیں گے اور مَیں محروم رہ جاؤنگا - اس خیال کے آتے ہی وہ خود بھی اُس رئیس کے مکان کی طرف دوڑ پڑتا - یہ ابھی راستہ میں ہی ہوتا کہ آگے سے وہ لڑکے غصہ میں بھرے ہوئے آرہے ہوتے اور ادھر سے یہ صاحب ہانپتے کانپتے جا پہنچتے کہ کہیں مَیں گوشت سے رہ نہ جاؤں - وہ اسے دیکھتے تو پکڑ کر خوب مارتے اور کہتے تم نے ہمیں بڑا دھوکا دیا - یہ مار کھانے کے بعد کہتا - تم جو مجھے مارتے پیٹتے ہو اِس لئے مجھے دھوکا کرنا پڑتا ہے اصل میں فلاں جگہ دعوت تھی مگر مَیں نے تمہیں بتایا نہیں اِس پر انہوں نے پھر اُسے چھوڑ کر اُس طرف کو دوڑ پڑنا - مگر اُن کے جاتے ہی اِس کے دل میں پھر خیال آجاتا کہ اگر وہاں سچ مچ دعوت ہوئی تو مَیں محروم رہ جاؤں گا اور یہ لڑکے دعوت اُڑا جائینگے چنانچہ اس کے بعد وہ خود بھی اسی طرف کو دوڑ پڑتا - یہ ابھی راستہ میں ہی ہوتا کہ لڑکے اس طرف سے بھی واپس آرہے ہوتے تھے اور وہ پھر اُسے پکڑ کر مارنا شروع کردیتے وہ تو بیچارہ فاتر العقل تھا مگر مسلمان جو قرآن کو مانتے ہیں اُن کا یہ حال ہے کہ پہلے ایک بات میں یورپ کے پیچھے دوڑتے ہیں اور جب وہ ناکام ہوکر دوسری سکیم پیش کرتا ہے تو پھر اُس کے پیچھے دوڑنے لگ جاتے ہیں - دوسری سکیم میں ناکام ہوکر وہ تیسری سکیم پیش کرتا ہے تو پھر اُس کے پیچھے دوڑ پڑتے ہیں - غرض یورپ آگے آگے ہے اور مسلمان پیچھے پیچھے - اب سٹالن اور رشیا کے پیچھے دوڑ رہے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ساری عزت اور ساری ترقی رشیا کے پیچھے چلنے میں ہے - اِس قسم کی غلطیاں اور کمزوریاں اِس لئے واقعہ ہوتی ہیں کہ قرآن کریم کو خدا تعالیٰ کا سچّا کلام سمجھ کر نہیں مانا جاتا بلکہ صرف رسمی طور پر اُس پر ایمان رکھا جاتا ہے - حالانکہ مسلمان اگر ترقی کرنا چاہتے ہیں تو اُن کے لئے سوائے اِس کے اور کوئی راہ نہیں کہ وہ حقیقی طور پر

فَمَا اسْتَكَانُوا لِرَبِّهِمْ وَمَا يَتَضَرَّعُونَ ﴿٧٧﴾ حَتَّىٰ إِذَا فَتَحْنَا

پھر بھی وہ اپنے رب کے سامنے عاجزانہ طور پر نہیں جھکے اور نہ اسکے سامنے گریہ وزاری کی۔ یہاں تک کہ جب ہم اُن پر ایک

عَلَيْهِمْ بَابًا ذَا عَذَابٍ شَدِيدٍ إِذَا هُمْ فِيهِ مُبْلِسُونَ ﴿٧٨﴾ ع

سخت عذاب کا دروازہ کھول دیں گے تو وہ مایوس ہو کر بیٹھ جائیں گے ۱۶

ع ۴ ۴

اس بات پر ایمان لائیں کہ ساری برکت قرآن کریم میں ہے اور ساری برکت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت میں ہے اور اگر ہم ذرا بھی اس سے اِدھر اُدھر ہوئے تو ہمیں بھی نقصان پہنچیگا اور ہماری آئندہ نسلیں بھی تباہ ہونگی کیونکہ صراطِ مستقیم پر چلے بغیر کوئی انسان اپنی منزل پر نہیں پہنچ سکتا۔

مُبْلِسُوْنَ

۱۶ حل لغات :۔ مُبْلِسُوْنَ : اَبْلَسَ سے ہے اور اَبْلَسَ کے معنے ہیں قَلَّ خَيْرُهٗ۔ اُس سے بھلائی کی توقع کم ہوگئی ۔ اِنْكَسَرَ وَحَزِنَ شکستہ خاطر اور غمگین ہوگیا اور جب اَبْلَسَ مِنْ رَحْمَةِ اللّٰهِ کہیں تو اس کے معنے ہونگے يَئِسَ۔ وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس ہوگیا ۔ اور اَبْلَسَ فِيْ اَمْرِهٖ کے معنے ہیں تَحَيَّرَ۔ وہ اپنے معاملہ کے بارے میں حیرت میں پڑ گیا۔ اَبْلَسَ فُلَانٌ کے ایک معنے سَكَتَ غَمًّا کے بھی ہیں یعنی غم واندوہ کی وجہ سے خاموش ہوگیا ۔ (اقرب)

تفسیر :۔ فرماتا ہے ۔ ہم تو اپنی صفات کے مطابق چاہتے ہیں کہ ان پر رحم کریں اور ان کی مصیبتوں کو دُور کریں۔ لیکن ہمیں نظر آرہا ہے کہ اگر ہم ایسا کریں گے تو وہ شرارتوں میں اَور بھی بڑھ جائیں گے اور ہمارا یہ دعوٰے بے ثبوت نہیں ۔ اس قوم پر پہلے بھی عذاب آچکے ہیں مگر پھر بھی وہ اپنے ربّ کے حضور نہیں جھکی اور اُس نے کوئی عاجزی نہیں دکھائی ۔ ہاں جب ہمارا آخری سخت عذاب آجائیگا تو اُس وقت وہ مایوس ضرور ہو جائینگے

اِن آیات میں اللہ تعالےٰ نے بتایا ہے کہ ہم جب بھی کسی قوم پر عذاب نازل کرتے ہیں ہماری اصل غرض اس عذاب سے یہ ہوتی ہے کہ لوگ اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوں اور اپنی بداعمالیوں سے باز آجائیں مگر لوگوں کی یہ کتنی بڑی بدقسمتی ہے کہ وہ عذاب کے آنے پر بھی اپنی اصلاح کی طرف متوجہ نہیں ہوتے اور اپنے دلوں میں خدا تعالیٰ کی خشیت پیدا نہیں کرتے حالانکہ اگر وہ ذرا بھی خدا تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوں تو اللہ تعالیٰ اُن سے اپنے عذاب کو دُور کرلے ۔ یونسؑ کی قوم کا واقعہ ہمارے سامنے ہے ۔ بائیبل میں لکھا ہے کہ جب حضرت یونسؑ نے اعلان کیا کہ چالیس دن کے اندر اندر نینوہ تباہ ہوجائیگا تو نینوہ کے باشندوں نے خدا پر ایمان لاکر روزہ کی منادی کی اور ادنیٰ و اعلیٰ سب نے ٹاٹ اوڑھا اور یہ خبر نینوہ کے بادشاہ کو پہنچی اور وہ اپنے تخت پر سے اُٹھا اور بادشاہی لباس کو اتار ڈالا اور ٹاٹ اوڑھ کر راکھ پر بیٹھ گیا اور بادشاہ اور اُسکے ارکانِ دولت کے فرمان سے نینوہ میں یہ اعلان کیا گیا اور اس بات کی منادی ہوئی کہ کوئی انسان یا حیوان گلہ یا رمہ کچھ نہ چکھے اور نہ کھائے نہ پیئے لیکن حیوان اور انسان ٹاٹ سے ملبّس ہوں اور خدا کے حضور گریہ وزاری کریں بلکہ ہر شخص اپنی بُری روش اور اپنے ہاتھ کے ظلم سے باز آئے شائد خدا رحم کرے اور اپنا ارادہ بدلے اور اپنے قہرِ شدید سے باز آئے اور ہم ہلاک نہ ہوں۔ جب

خدا نے اُن کی یہ حالت دیکھی کہ وہ اپنی اپنی بُری روش
سے باز آ گئے تو وہ اس عذاب سے جو اُس نے اُن پر نازل
کرنے کو کہا تھا باز آیا اور اُسے نازل نہ کیا۔

(یوناہ باب ۳ آیت ۵ تا ۱۰)

قرآن کریم خود اس واقعہ کا ذکر کرتا ہے اور فرماتا ہے
کہ فَلَوْلَا كَانَتْ قَرْيَةٌ اٰمَنَتْ فَنَفَعَهَآ اِيْمَانُهَآ
اِلَّا قَوْمَ يُوْنُسَ لَمَّآ اٰمَنُوْا كَشَفْنَا عَنْهُمْ عَذَابَ
الْخِزْيِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَمَتَّعْنٰهُمْ اِلٰى حِيْنٍ۔
(یونس ع ۱۰) یعنی یونسؑ کی قوم کے سوا کیوں کوئی اور بستی
بھی ایسی نہ ہوئی جو سب کی سب ایمان لاتی اور اس کا
ایمان لانا اُسے نفع دیتا۔ چنانچہ دیکھ لو۔ یونسؑ کی قوم
کے لوگ جب ایمان لائے تو ہم نے اُن پر سے اس دنیا کا
رسوا کن عذاب دُور کر دیا اور انہیں ایک وقت تک ہر طرح
کا سامان اور رزق عطا فرمایا۔ اس سے ظاہر ہے کہ بندے
اگر توبہ کریں اور اللہ تعالیٰ کی طرف سچے دل سے رجوع
کریں اور بد اعمالیوں سے باز آ جائیں تو اللہ تعالیٰ اپنے
عذاب کو دُور کر دیا کرتا ہے خواہ اُس عذاب کی اُس نے
پیشگوئی ہی کیوں نہ کی ہوئی ہو۔ کیونکہ انذاری پیشگوئیوں
سے بڑی غرض یہی ہوتی ہے کہ لوگوں کو اصلاح کا موقعہ
دیا جائے۔ چنانچہ دیکھ لو فتح مکہ کے وقت حضرت محمد رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم کی ساری قوم نے آپ کی غلامی کو قبول کر
لیا تو باوجود اس کے کہ وہ شدید جرائم کی مرتکب رہ چکی تھی
اور اگر اُسے سزا دی جاتی تو قانونی رنگ میں بالکل جائز ہوتی
اللہ تعالیٰ نے اسے جسمانی سزا سے بھی بچا لیا اور روحانی
لحاظ سے بھی اُسے بڑی ترقیات عطا فرمائیں۔ مگر فرماتا ہے
ان لوگوں کی یہ حالت نہیں وَلَقَدْ اَخَذْنٰهُمْ بِالْعَذَابِ
فَمَا اسْتَكَانُوْا لِرَبِّهِمْ وَمَا يَتَضَرَّعُوْنَ ہم نے
ان کو سخت عذاب میں جکڑا مگر پھر بھی یہ اپنے رب کے
حضور عاجزانہ رنگ میں نہ جھکے۔ اور اُس سے اپنے گناہوں
کی معافی انہوں نے طلب نہ کی۔ آخر اس کا یہی نتیجہ
ہوگا کہ یہ ایک دن آخری عذاب میں مبتلا ہو جائیں گے
اور اُس وقت اپنی نجات کی کوئی راہ نہیں پائیں گے۔ اور
دنیوی سہاروں کو ٹوٹتا دیکھ کر بالکل مایوس اور ناامید ہو جائیں گے

اس جگہ یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ قرآن کریم نے صرف
یہی نہیں بتایا کہ مجرم قوم اس کے عذاب کا شکار ہوا کرتی
ہے بلکہ اُس نے اس مضمون کو بھی بیان کیا ہے کہ وہ
سزا دیتے وقت کن امور کو ملحوظ رکھا کرتا ہے۔ تاکہ
اُس کی سزا کو ظلم قرار نہ دیا جا سکے۔ چنانچہ قرآن کریم کے
مطالعہ سے پہلی بات تو یہ معلوم ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ
ہر فعل کے تمام پہلوؤں کو مدنظر رکھ کر فیصلہ کیا کرتا ہے
چنانچہ فرماتا ہے۔ وَالْوَزْنُ يَوْمَئِذِ ۣالْحَقُّ (اعراف ع ۱)
اس دن تمام اعمال کا وزن کرنا ایک ثابت شدہ حقیقت
ہے۔ انسانوں کی تو یہ کیفیت ہوتی ہے کہ اگر وہ کسی شخص
سے اڑتی ہوئی خبر بھی سُن لیں کہ فلاں شخص نے چوری
کی ہے تو اسے فوراً چور سمجھنے لگ جاتے ہیں اور تحقیق کی
کوئی ضرورت نہیں سمجھتے مگر اللہ تعالیٰ سزا دیتے وقت یہ
بھی ملحوظ رکھتا ہے کہ اُس نے یہ فعل کن حالات میں کیا ہے
اور کتنی سزا کا مستحق ہے۔

دوسری بات اللہ تعالیٰ نے یہ بیان فرمائی ہے
کہ جس کا جرم ہو صرف اسی کو پکڑا جاتا ہے۔ یہ نہیں ہوتا
کہ دوسروں کے جرائم کے بدلہ میں ایک غیر مجرم کو سزا دے
دی جائے۔ بلکہ جس کا قصور ہو صرف اسی کو سزا دی جاتی
ہے۔ چنانچہ وہ فرماتا ہے وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ
اُخْرٰى (انعام ع ۲۰) کوئی بوجھ اٹھانے والی ہستی کسی دوسری
ہستی کا بوجھ نہیں اٹھا سکتی یعنی وہ شخص جو خود ہی اللہ
تعالیٰ کے سامنے جواب دہ ہو وہ کسی دوسرے کی کوئی مدد
نہیں کر سکتا۔ پس سزا صرف مجرم کو دی جاتی ہے۔ یہ
نہیں ہوتا کہ اُس کا بوجھ کسی دوسرے پر ڈال دیا جائے۔

وَهُوَ الَّذِيْٓ اَنْشَاَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ ؕ

اور وہ خدا ہی ہے جس نے تمہارے لئے کان اور آنکھیں اور دل پیدا کیا ہے۔

قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ﴿۷۹﴾ وَهُوَ الَّذِيْ ذَرَاَكُمْ فِي

لیکن تم بالکل شکر نہیں کرتے ۔ اور وہی ہے جس نے زمین میں تم کو پھیلا

الْاَرْضِ وَاِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ﴿۸۰﴾ وَهُوَ الَّذِيْ يُحْيٖ وَ

دیا ہے اور تم اُسی کی طرف پھر اکٹھے کئے جاؤ گے۔ اور وہی ہے جو تمہیں زندہ کرتا ہے اور

يُمِيْتُ وَلَهُ اخْتِلَافُ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ ؕ اَفَلَا

جو تمہیں مارے گا اور رات اور دن کا آگے پیچھے آنا اُسی کے اختیار میں ہے ۔ کیا تم

تَعْقِلُوْنَ ﴿۸۱﴾ بَلْ قَالُوْا مِثْلَ مَا قَالَ الْاَوَّلُوْنَ ﴿۸۲﴾

عقل نہیں کرتے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ وہی بات کہتے ہیں جو اُن سے پہلوں نے کہی تھی ۔

یہی مضمون اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں بھی بیان فرمایا ہے لَا تَجْزِیْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَیْئًا (بقرۃ ع) یعنی کوئی شخص کسی دوسرے شخص کا سزا میں قائم مقام نہیں بن سکیگا۔

تیسری بات اللہ تعالیٰ نے یہ بیان فرمائی ہے کہ جتنا کسی کا جرم ہو اتنی ہی اسے سزا دی جاتی ہے۔ یہ نہیں ہوتا کہ جرم تو تھوڑا ہو اور سزا زیادہ ہو۔ چنانچہ وہ فرماتا ہے جَزٰٓؤُا سَیِّئَةٍ سَیِّئَةٌ مِّثْلُهَا (شوریٰ ع) یعنی بدی کی سزا اتنی ہی دی جاتی ہے جتنا کہ جرم ہو۔ اور دونوں کے تناسب کو ملحوظ رکھا جاتا ہے۔

چوتھی بات اللہ تعالیٰ نے یہ بیان فرمائی ہے کہ سزا دینے سے پہلے یہ بھی دیکھا جاتا ہے کہ اس نے نیک کام کون کون سے کئے ہیں۔ اور اگر کسی کے نیک اعمال زیادہ ہوں تو سزا معاف کردی جاتی ہے چنانچہ وہ فرماتا ہے۔ فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِیْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (اعراف ع) جن کے وزن بھاری ہونگے یعنی جن کے اعمال نیک اُن کے اعمال بد سے بڑھ کر ہونگے اللہ تعالیٰ انہیں اپنے عفو کی چادر میں لے لیگا اور اُن کے گناہوں سے درگذر فرمائیگا۔

پانچویں بات اللہ تعالیٰ نے یہ بیان فرمائی ہے کہ سزا کا فیصلہ کرتے وقت کوئی سفارش قبول نہیں کی جاتی چنانچہ وہ فرماتا ہے وَلَا یُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ (بقرۃ ع) کوئی شفاعت اور سفارش کسی جان کی طرف سے قبول نہیں کی جاتی۔

چھٹی بات اللہ تعالیٰ نے یہ بیان فرمائی ہے کہ سزا دیتے وقت اُس کے رحم کا پہلو ہمیشہ غالب ہوتا ہے اور وہ کبھی کسی مجرم کو انتہائی سزا نہیں دیتا بلکہ جب بھی سزا دیتا ہے اس کے جرم سے کم دیتا ہے۔ چنانچہ فرماتا ہے رَحْمَتِیْ وَسِعَتْ كُلَّ شَیْءٍ (اعراف ع)

قَالُوْٓا ءَاِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَّعِظَامًا ءَاِنَّا

انہوں نے کہا تھا کہ کیا جب ہم مر جائینگے اور مٹی ہو جائیں گے اور ہڈیاں بن جائیں گے تو ہم پھر

لَمَبْعُوْثُوْنَ ۝۸۳ لَقَدْ وُعِدْنَا نَحْنُ وَاٰبَآؤُنَا هٰذَا

اُٹھائے جائیں گے - اس سے پہلے اسی بات کا وعدہ ہم سے اور ہمارے باپ دادوں سے کیا گیا تھا مگر ایسا

مِنْ قَبْلُ اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ۝۸۴ قُلْ

نہیں ہوا) یہ تو صرف پہلوں کی کہانیاں ہیں تو کہہ دے

لِّمَنِ الْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهَآ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝۸۵

کہ اگر تم جانتے ہو تو (بتاؤ تو سہی) کہ یہ زمین اور جو کچھ اس میں ہے - کس کا ہے ؟

سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ ۭ قُلْ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ۝۸۶

یقیناً وہ (اس کے جواب میں) کہیں گے اللہ کا - اس پر تو کہہ دے کیا تم سمجھ سے کام نہیں لیتے؟ کلہ

یعنی میری رحمت ہر چیز پر حاوی ہے - اور ہر چیز میں اس کی طرف سے آنے والی سزا اور عذاب بھی شامل ہے - اس تفصیل سے معلوم ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ سزا دینے میں کتنا دھیما ہے - اور وہ اپنے بندوں سے کتنی شفقت اور رحمت کا معاملہ کرتا ہے - مگر افسوس ہے کہ لوگ پھر بھی اُس کی رحمت سے فائدہ نہیں اٹھاتے وہ اُن کی طرف اپنی محبت کا ہاتھ بڑھاتا ہے - مگر نادان انسان اُس کے ہاتھ کو ٹھکرا دیتا اور آخر اپنی ہی بداعمالیوں کے چکر میں پھنس کر عذاب کا شکار ہو جاتا ہے -

کلہ حل لغات :- اَسَاطِيْر سَطَرَ سے بنا ہے اور سَطَرَ الْكِتَابَ کے معنے ہیں كَتَبَ اُس نے لکھا - اور سَطَرَ الرَّجُلَ کے معنے ہیں صَرَعَهٗ اُسکو کشتی میں گرا لیا - اور سَطَرَهٗ بِالسَّيْفِ کے معنے ہیں قَطَعَهٗ بِهٖ اُس کو تلوار سے کاٹ ڈالا - اور اِسطَار اُسطَار - اُسطُور اور اَساطِير کے معنے لکھی ہوئی چیز کے ہیں - اور ایسی باتوں کو بھی اَساطِير کہتے ہیں جن میں کوئی نظام نہ ہو - اور قصے اور کہانیوں کو بھی اَساطِير کہتے ہیں ۔ (اقرب)

اَساطِير

تفسیر :- فرماتا ہے - ذرا سوچو تو سہی کہ تمہاری یہ شنوائیاں - تمہاری بینائیاں اور تمہارے دل تمہارے کس کام کے بدلہ میں تمہیں ملے ہوئے ہیں - ان چیزوں کے تم خالق نہیں بلکہ خدا ہی ہے جس نے تمہیں کان اور آنکھیں اور دل بخشے ہیں اور تمہاری پیدائش کی ابتداء بھی اُسی نے کی ہے اور تمہاری اُخروی پیدائش بھی وہی کرے گا - اور تمہاری زندگی اور موت اور رات اور دن کا آگے پیچھے آنا بھی اُسی کے قبضے میں ہے - کیونکہ تمام نظامِ شمسی انسان کے اختیار سے باہر ہے - اور

قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ السَّبْعِ وَرَبُّ الْعَرْشِ

(پھر) تو اُن سے کہہ کہ ساتوں آسمان اور عرشِ عظیم کا ربّ

الْعَظِيْمِ ﴿۸۷﴾ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ ۭ قُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۸۸﴾ قُلْ

کون ہے؟ وہ فوراً کہیں گے (یہ سب) اللہ کے ہیں۔ تو کہدے کیا پھر تم (اُس خدا کے ذریعہ تباہی سے) بچنے کی کوشش نہیں کرتے (نیز)

مَنْۢ بِيَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُوَ يُجِيْرُ وَلَا يُجَارُ

تو کہدے کہ کس کے قبضہ میں ہر چیز کی بادشاہت ہے، اور وہ (سب کو) پناہ دیتا ہے اور اُس کے عذاب کے خلاف کوئی دوسرا

عَلَيْهِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۸۹﴾ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ ۭ قُلْ

پناہ نہیں دے سکتا اگر تم جانتے ہو (تو اسکو سمجھ سکتے ہو)۔ وہ (اوپر کا سوال سُنکر) فوراً کہیں گے۔ اللہ کے (قبضہ میں) اسپر تو کہدے

رات اور دن اس سے پیدا ہوتے ہیں۔ اسجگہ کانوں اور آنکھوں کی پیدائش کی طرف توجہ دلا کر اللہ تعالیٰ نے اس طرف اشارہ فرمایا ہے کہ جب خدا نے تمہیں کان اور آنکھیں عطا فرمائی ہیں اور جس نے اِس چند روزہ حیات میں تمہیں سُننے اور دیکھنے کی قابلیت عطا فرمائی ہے کیا وہ تمہارے روحانی کانوں کی سماعت اور روحانی آنکھوں کی بصارت کے لئے کوئی سامان پیدا نہ کرتا۔ اِسی طرح جب اُس نے تمہیں وہ دل بخشے ہیں جن پر تمہاری اِس مادی زندگی کا انحصار ہے تو خدا تعالیٰ یہ کب برداشت کر سکتا تھا کہ وہ تمہاری رُوحانی زندگی کا کوئی سامان پیدا نہ کرتا اور تمہیں کانوں اور آنکھوں اور دل کے بغیر رکھتا۔ اِسی طرح زندگی اور موت بھی اُسی کی طرف سے آ رہی ہے۔ وہی پیدا کرتا اور وہی مارتا ہے۔ یہی کیفیت روحانی عالم میں بھی دکھائی دیتی ہے۔ وہ انبیاء کے ذریعہ مُردہ اور گری ہوئی اقوام کو زندہ کر دیتا ہے اور اُن کا مقابلہ کرنے والی اقوام کو بام عروج سے اٹھا کر قعر مذلت میں گرا دیتا ہے۔ یہی سبق رات اور دن کے آگے پیچھے آنے میں بھی مخفی ہے

یا رات اور دن کی ظلمت اور بیاض میں جو اختلاف پایا جاتا ہے اُس میں بھی سوچنے والوں کے لئے بڑے بھاری نشانات ہیں۔ کئی بیماریاں ایسی ہیں جو اندھیرے میں بڑھ جاتی ہیں اور کئی حوادث ہیں جو رات کی تاریکی کی وجہ سے پیش آتے ہیں۔ دنیا میں جتنی چوری اور ڈاکہ کی وارداتیں ہوتی ہیں اُن میں سے اکثر وارداتیں رات کی تاریکی میں ہی ہوتی ہیں۔ اِسی طرح سانپ اور بچھو اور دوسرے حشرات الارض بھی رات کو ہی باہر نکلتے ہیں۔ پھر تاریکی ایسی بلا ہے کہ نہ اس میں خوبصورت کی خوبصورتی کا پتہ لگتا ہے اور نہ بدصورت کی بدصورتی کا۔ سیاہ اور سفید اور سُرخ اور زرد سب برابر ہوتے ہیں۔ لیکن جب دن چڑھتا ہے۔ تو بدصورت کی بدصورتی اور خوبصورت کی خوبصورتی نظر آنے لگتی ہے۔ حشرات الارض اپنے اپنے بلوں میں گھس جاتے ہیں۔ چور چوری کرنے سے ڈرتا ہے اور ڈاکو ڈاکہ ڈالنے سے گریز کرتا ہے۔ پھر کئی بیماریاں ہیں جن کا علاج سورج کی شعاعوں سے ہی ہو جاتا ہے اور مختلف امراض کے جراثیم سورج کی تپش سے فنا ہو جاتے ہیں۔ غرض رات

فَاَنّٰى تُسْحَرُوْنَ ﴿۹۰﴾ بَلْ اَتَيْنٰهُمْ بِالْحَقِّ وَاِنَّهُمْ

کہ پھر تمہیں دھوکا دیکر کدھر لے جایا جا رہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم اُن کے پاس حق لائے ہیں۔ اور وہ

لَكٰذِبُوْنَ ﴿۹۱﴾ مَا اتَّخَذَ اللّٰهُ مِنْ وَّلَدٍ وَّمَا كَانَ

یقیناً جھوٹے ہیں۔ اللہ (تعالیٰ) نے کسی کو بیٹا نہیں بنایا اور اُس کے ساتھ

مَعَهٗ مِنْ اِلٰهٍ اِذًا لَّذَهَبَ كُلُّ اِلٰهٍۢ بِمَا

کوئی معبود نہیں (اگر ایسا ہوتا) تو ہر معبود اپنی پیدا کی ہوئی اشیاء کو

خَلَقَ وَلَعَلَا بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ؕ سُبْحٰنَ اللّٰهِ

الگ کرکے لے جاتا۔ اور اِن (معبودوں) میں سے بعض بعض پر ہلّہ بول دیتے۔ اللہ تعالیٰ پاک ہے

اور دن کا اختلاف بھی ایک عقلمند انسان کو اس طرف توجہ دلاتا ہے کہ جس طرح مادی عالم پر ایک تاریکی کا دور آتا ہے اور ایک روشنی کا۔ اِسی طرح روحانی عالم میں بھی بعض دفعہ الٰہی نور لوگوں کی نگاہ سے مخفی ہو جاتا ہے اور کئی قسم کی بُرائیاں لوگوں میں پیدا ہونی شروع ہو جاتی ہیں۔ مگر جب اللہ تعالیٰ اپنے کسی مامور کے ذریعہ ہدایت کی روشنی پھیلاتا ہے تو رات سے تعلق رکھنے والی تمام بلائیں اور آفات دُور ہونے لگتی ہیں اور ایک نئی زندگی بنی نوع انسان کو حاصل ہو جاتی ہے۔ پس جس طرح نیچر میں رات اور دن کا اختلاف پایا جاتا ہے اِسی طرح لوگوں کو سمجھنا چاہیئے کہ روحانی عالم میں بھی رات اور دن کی گھڑیاں آنی ضروری ہیں۔ مگر مخالف بس ایک ہی رٹ لگائے چلے جاتے ہیں کہ کیا مرنے کے بعد مٹی ہو کر ہم پھر زندہ ہو جائینگے؟ یعنی کفّار جب دلائل سے عاجز آجاتے ہیں تو یہ کہنا شروع کر دیتے ہیں کہ اِس زندگی کا تو مقصد ہی کوئی نہیں پھر اِن جھگڑوں میں پڑنے کا کیا فائدہ؟ یہ تو پہلوں کی باتیں ہیں جو ہمارے کانوں میں دیر سے پڑتی چلی آرہی ہیں مگر قیامت ہے کہ وہ آتی ہی نہیں۔ اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ دُنیا بہت لمبے عرصہ سے چلی آرہی ہے اور ہمیشہ قربِ قیامت کا لوگوں کو خیال رہا ہے۔ چنانچہ انبیاء کے مخالفین یہی اعتراض کرتے ہیں کہ آج تک تو ہم قیامت کا شور سُنتے رہے ہیں مگر وقت کے بعد وقت گذر رہا ہے اور قیامت ابھی تک نہیں آئی۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خیال ہی غلط ہے۔ حالانکہ یہ اُن لوگوں کا توہم ہے کیونکہ قیامت کسی خاص دن کا نام نہیں اور نہ وہ اِس دنیا میں آئے گی بلکہ مرنے کے بعد کی جو زندگی ہے اور جس میں مجموعی طور پر تمام مُردہ رُوحوں کو جزا سزا دی جائیگی اس کا نام قیامت ہے اور وہ اِس دنیا کے لوگوں کو نہ نظر آتی ہے اور نہ آئیگی۔ پس اُن کا یہ کہنا بیوقوفی کی بات ہے۔ کہ اب تک تو قیامت آئی نہیں؟ ہاں یہ ممکن ہے کہ کسی دن اِس دنیا کا نظام ختم کرکے پھر نئے سرے سے شروع کر دیا جائے۔ لیکن مذہبی کتابوں میں قیامت اِس کا نام نہیں۔ قیامت اُسی کا نام ہے جسے ہم نے اوپر بیان کیا ہے۔ اور اِس کا ذکر

عَمَّا يَصِفُوْنَ ﴿۹۲﴾ عٰلِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَتَعٰلٰى

اس سے جو یہ باتیں کرتے ہیں - وہ غیب کا بھی علم رکھتا ہے اور حاضر کا بھی (علم رکھتا ہے) پس جن کو وہ اُس کا

عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿۹۳﴾ ع

شریک بناتے ہیں اُن سے وہ بہت اونچا ہے ۵۱۸

۵ ع ۵

قرآن کریم کی اِس آیت میں ہے کہ کُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ وَّيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ (رحمٰن ع ۲) بہرحال اللہ تعالیٰ مخالفین کے اِس اعتراض کا جواب دیتے ہوئے فرماتا ہے کہ دنیا میں جو کوئی بھی بستا ہے کیا اُس کی موت وحیات خدا تعالیٰ کے قبضہ میں نہیں- وہی باپ کے صُلب میں بچّہ کا نطفہ پیدا کرتا ہے اور وہی ماں کے رحم میں اُس کی پرورش کا سامان کرتا ہے اور وہی اُس کے پیدا ہونے کے بعد اُس کی غذا کا سامان مہیّا کرتا ہے اب بتاؤ کہ جس خدا نے یہ سب کچھ پیدا کیا ہے کیا وہ دوبارہ جسم کے کسی باریک حصّہ سے انسان کو پیدا نہیں کر سکتا۔

احادیث میں آتا ہے کہ مرنے کے بعد انسان کی پیدائش عجب الذنب سے ہوگی- یعنی پیٹھ کے نیچے کی جو ہڈی ہے جس کے متعلق سائنسدان کہتے ہیں کہ یہ بندر کی دُم کی علامت ہے اس کے ایک ذرہ سے انسان کی پیدائش ہوگی - اگر نطفہ کے خوردبینی ذرہ حیات سے انسان پیدا ہو سکتا ہے تو عجب الذنب کے کسی حصّہ سے جس کو خدا تعالیٰ باقی رکھے انسان دوبارہ کیوں پیدا نہیں ہو سکتا - آخر وہ کیڑے بھی تو ہیں جو زمین کی تہوں میں اور پتھروں کے نیچے پیدا ہو جاتے ہیں- اگر انسان کی پہلی پیدائش رحم مادر میں ہوئی تھی تو اُس کی دوسری پیدائش کسی اور جگہ کیوں نہیں ہو سکتی؟ یہ محض خدا تعالیٰ کی طاقتوں کا اپنی طاقتوں پر قیاس کر لینے کا نتیجہ ہے ورنہ جو خدا ایک دفعہ پیدا کر سکتا ہے اُس کے لئے دوبارہ پیدا کرنا ایک ایسا امر ہے جس کو کوئی انسان بھی بعید از عقل تصوّر نہیں کر سکتا -

پھر قُلْ لِّمَنِ الْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهَآ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ کہہ کر اللہ تعالےٰ نے کفار کو اس امر کی طرف توجہ دلائی ہے کہ کیا دین کی بنیاد صرف اگلے جہان پر ہی ہے کہ تم اس کا ذکر کرتے ہو - کیا اِس دنیا میں تم کو خدا سے واسطہ نہیں پڑتا - پھر اُس کے احکام سے اِس قدر دُوری اور غفلت تمہارے اندر کیوں پائی جاتی ہے -

۵۱۸ تفسیر:- فرماتا ہے - تم اِن لوگوں سے پوچھو کہ ساتوں آسمانوں اور عرشِ عظیم کا رب کون ہے - اِس کے جواب میں یہ لوگ یہی کہیں گے کہ اللہ ہے پس جب سب بلندیاں اللہ تعالےٰ نے ہی بنائی ہیں تو اعلیٰ روحانی تعلیم بھی اسی کی طرف سے آ سکتی ہے اور وہی عرشِ عظیم کا مالک ہے - یعنی رُوحانی بادشاہت اُسی کے قبضہ میں ہے - رُوحانی علوم کے لئے انسانی دماغ کی طرف توجّہ کرنا اور فلاسفروں کی طرف جانا بیوقوفی کی بات ہے - یہ علوم خدا تعالیٰ ہی کی طرف سے آ سکتے ہیں- پھر فرماتا [illegible] م ان لوگوں سے پوچھو کہ تمام [illegible]الم کی بادشاہت کس کے ہاتھ میں نظر آتی ہے اور وہ کون ہے کہ جب دوسروں کی سزا سے کوئی بھاگ کر اُس کے پاس آتا ہے تو وہ اُسے پناہ دیتا ہے - لیکن جب وہ کسی کو سزا دے تو اُس کی سزا سے کوئی بچانیوالا نہیں ہوتا - وہ یہی جواب دینگے کہ اللہ - جب وہ

قُلْ رَّبِّ اِمَّا تُرِيَنِّيْ مَا يُوْعَدُوْنَ ﴿۹۴﴾ رَبِّ فَلَا

تو کہہ اے میرے رب! اگر تو میری زندگی میں وہ کچھ دکھائے جس کا ان سے وعدہ کیا جا رہا ہے۔ تو اے میرے رب! تو مجھے

تَجْعَلْنِيْ فِي الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۹۵﴾

ظالم قوم میں سے نہ بنائیو۔ (یعنی اُن کے عذاب میں شریک نہ کیجیئو) ۱۹ھ

یہ جواب دیں تو تُو انہیں کہہ کہ پھر تمہاری عقل کیوں ماری گئی ہے اور تم فریب دے کر کدھرلے جائے جا رہے ہو۔ یعنی جب ہدایت کے اِتنے دروازے تمہارے لئے کھلے ہیں تو پھر شیطان تم کو کس دروازہ سے دھوکا دے دیتا ہے کہ تم اِس بات کے جاننے کے باوجود شرک کر رہے ہو۔ قرآن تو سچائی یعنی توحید کی تعلیم دیتا ہے مگر وہ لوگ جھوٹے ہیں یعنی مشرکانہ باتیں کرتے ہیں۔ حالانکہ اللہ تعالےٰ نے اپنے لئے کبھی کوئی بیٹا تجویز نہیں کیا اور کبھی بھی اُس کے ساتھ کوئی اَور معبود نہیں ہُوا۔ اگر ایسا ہوتا تو ہر معبود اپنی مخلوق اپنے ساتھ لے جاتا اور اپنی بڑائی دوسرے پر ثابت کرنے کی کوشش کرتا۔ لیکن ایسا کبھی نہیں ہُوا۔ دنیا میں ایک ہی قانون جاری رہا ہے پس جو کچھ یہ مشرک کہتے ہیں خدا تعالیٰ اس سے پاک ہے۔ وہ غائب اور حاضر کو جانتا ہے اور خواہ ظاہری تغیرات ہوں یا باطنی سب پر ایک قسم کا قانون جاری ہونا بتاتا ہے کہ مشرک جھوٹے ہیں۔ اگر ایک سے زیادہ خدا ہوتے تو دو صورتوں میں سے ایک صورت ضروری تھی۔ یا تو وہ کسی ایک خدا کی اطاعت کرتے اور اس کے احکام میں کوئی دخل نہ دیتے مگر اِس صورت میں دوسرے خداؤں کا ہونا یا نہ ہونا بالکل برابر ہوتا اور یہ اعتراض واقعہ ہوتا کہ جب ایک خدا سب کام کر رہا ہے تو باقی خداؤں کی کیا ضرورت ہے؟ اور یا پھر دوسری صورت یہ ہو سکتی تھی کہ ایک کے علاوہ جسقدر خدا ہوتے وہ اپنا الگ الگ نظام جاری کرتے۔ مگر اس صورت میں یہ ضروری تھا کہ نظامِ عالم میں اختلاف نظر آتا لیکن چونکہ دنیا میں جو نیچر کا قانون ہمیں دکھائی دیتا ہے وہ لاکھوں بلکہ کروڑ ہا سال سے ایک ہی شکل میں چلا آ رہا ہے اور اس میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ اِس لئے معلوم ہُوا کہ اس کارخانۂ عالم میں صرف ایک خدا کا وجود ہی کام کر رہا ہے۔ کوئی دوسرا اُس کے ساتھ شریک نہیں۔

اسجگہ عالم الغیب والشہادۃ کہہ کر مسیح کی خدائی کو بھی ردّ کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ خدا کے لئے عالم الغیب ہونا ضروری ہے۔ مگر مسیح تو خود کہتا ہے کہ

"اُس دن یا اس گھڑی کی بابت کوئی نہیں جانتا۔ نہ آسمان کے فرشتے نہ بیٹا مگر باپ۔" (مرقس باب ۱۳۔ آیت ۳۲)

پس جبکہ وہ علمِ غیب ہی نہیں رکھتا تو اُسے خدا قرار دینا کس طرح درست ہو سکتا ہے۔

۱۹ھ تفسیر:۔ قرآن کریم کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس میں بعض جگہ جمع کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے مگر مراد ایک شخص ہوتا ہے۔ جیسے قرآن کریم میں بہت جگہ ایک رسول کی طرف اشارہ کرتے ہوئے رُسُل کا لفظ بولا گیا ہے کیونکہ ہر رسول پہلے رسولوں کے مشابہ ہوتا ہے۔ اِسی طرح بعض جگہ ایک شخص کا ذکر ہوتا ہے اور مراد قوم ہوتی ہے۔ جیسا کہ اسجگہ گو لفظ مفرد ہیں مگر مراد قوم ہے کیونکہ کفار پر عذاب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کی وجہ سے آنا تھا اور جب اُس

وَاِنَّا عَلٰٓى اَنْ نُّرِيَكَ مَا نَعِدُهُمْ لَقٰدِرُوْنَ ﴿۹۶﴾ اِدْفَعْ

اور ہم اس بات پر قادر ہیں کہ جو ان سے وعدہ کرتے ہیں تجھے دکھادیں ۲۰ تو اُن کی

بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ السَّيِّئَةَ ۭ نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا يَصِفُوْنَ ﴿۹۷﴾

بُری باتوں کو ایسی (جوابی) باتوں سے دُور کر جو نہایت خوبصورت ہوں۔ ہم ان کی باتوں کو خوب جانتے ہیں ۲۱

عذاب کا اصل باعث رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی مخالفت ہی تھی تو پھر آپکو اس دُعا کے سکھانے کا کچھ مطلب ہی نہیں رہتا۔ کہ اے خدا۔ اِن کفار پر جب موعودہ عذاب آئے تو مجھے اُس میں شریک نہ کیجیو۔ درحقیقت اسجگہ ہر قرآن کا پڑھنے والا مخاطب ہے۔ اور اس کو سکھایا گیا ہے کہ (۱) تو ہمیشہ یہ دُعا کرتا رہ کہ کفار پر جب عذاب آئے تو مَیں انکے عذاب میں شریک نہ ہوں۔ کیونکہ مَیں تو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لے آیا ہوں۔ مجھے کسی کمزوری کی وجہ سے کفار کے ساتھ شریک کرکے دشمن کو ہنسی کا موقعہ نہ دیجیو۔ یا (۲) اے میرے خدا۔ جب عذاب آئے اور کفار تباہ ہوجائیں اور مسلمانوں کے ہاتھ میں حکومت کی باگ ڈور آجائے تو مَیں تجھ سے دُعا کرتا ہوں کہ تُو مجھے اُس وقت بھی انصاف پر قائم رکھیو اور مجھے ظالم نہ بننے دیجیو۔ اِس لحاظ سے یہ اُن کے ظلم میں اشتراک سے بچنے کی دُعا ہے۔ اور مراد یہ ہے کہ اے خدا! جب اِن پر تیرا عذاب آئے اور اِن کی حکومت ٹوٹ کر مسلمانوں کو مل جائے تو ایسا نہ ہو کہ ہم لوگ نشۂ حکومت میں انصاف کو بھول کر ظلم کرنے لگیں اور تیری ناراضگی مول لے لیں۔

۲۰ تفسیر: یعنی ہم اس بات پر قادر ہیں کہ تیری آنکھوں کے سامنے ان پر عذاب لے آئیں۔ اور تیری زندگی میں ہی تیرے دشمنوں کو تباہ کردیں جیسا کہ ہوا کہ مکہ آپ کی زندگی میں فتح ہوگیا اور کفار کی طاقت تباہ ہوگئی۔ اور حکومت مسلمانوں کے ہاتھ میں آگئی۔ اور پھر حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے دور میں تو اس حکومت نے اور بھی ترقی کی۔ اور قیصر و کسریٰ کی حکومتوں کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔

۲۱ تفسیر: اس جگہ یہ سکھایا گیا ہے کہ دشمن اگرچہ ظالم ہے مگر تو پھر بھی اس کے مقابلہ میں احسان اور عفو سے کام لیجیو۔ کیونکہ بُرائی کے بدلہ میں نیکی کرنا اولوالعزم انبیاء کا کام ہے۔ اور تیرے دل میں یہ خیال نہ آئے کہ دشمن نے تو ظلم بھی کرلیا اور پھر میرے عفو سے سزا سے بھی بچ گیا۔ ایسا نہ ہو کہ وہ پھر کوئی شرارت کرے۔ کیونکہ مَیں اس کی ہر تدبیر کو جانتا ہوں اور کوئی چیز بھی میری جزا سزا سے باہر نہیں رہ سکتی۔

دوسری جگہ اللہ تعالیٰ اس کی حکمت بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِيْ بَيْنَكَ وَبَيْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِيٌّ حَمِيْمٌ (حٰمٓ السجدہ ع ۵) یعنی تُو دشمن کی بُرائی کا جواب نہایت نیک سلوک سے دے کیونکہ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ شخص جس سے تیری عداوت ہے وہ تیرے اس حسنِ سلوک کو دیکھ کر شرمندہ ہوگا اور وہ تیرا گرم جوش دوست بن جائیگا۔ گویا بتایا کہ سزا آخر اس لئے دی جاتی ہے کہ انسان دوسروں کے ضرر سے بچ جائے اور اُسے اپنی اصلاح کا خیال آئے۔ لیکن دوسرے کے ضرر سے بچنے کا صرف یہی طریق نہیں کہ اُس کو سزا دی جائے بلکہ

وَقُلْ رَّبِّ اَعُوْذُبِكَ مِنْ هَمَزٰتِ الشَّيٰطِيْنِ ﴿۹۸﴾

اور تو کہہ دے۔ اے میرے رب! میں سرکش لوگوں کی شرارتوں سے تیری پناہ چاہتا ہوں۔

وَاَعُوْذُبِكَ رَبِّ اَنْ يَّحْضُرُوْنِ ﴿۹۹﴾ حَتّٰٓى اِذَا جَآءَ

اور اے میرے رب! میں تیری پناہ مانگتا ہوں اس سے (بھی) کہ وہ میرے سامنے آ جائیں ۲۲؎ اور (موقت) جب اُن میں سے

اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ رَبِّ ارْجِعُوْنِ ﴿۱۰۰﴾ لَعَلِّيْٓ

کسی کی موت آ جائے گی وہ کہے گا۔ اے میرے رب! مجھے واپس لوٹا دے مجھے واپس لوٹا دے۔ تاکہ میں

اَعْمَلُ صَالِحًا فِيْمَا تَرَكْتُ كَلَّا ۭ اِنَّهَا كَلِمَةٌ

اس جگہ جس کو میں چھوڑ کر آ گیا ہوں (یعنی دنیا میں) مناسب حال عمل کروں۔ ہرگز ایسا نہیں ہوگا۔ یہ صرف ایک منہ کی بات ہے،

اگر عفو سے اس کی اصلاح ہو سکتی ہو تو بہتر یہی ہے کہ اس کو معاف کر دو۔ اور اس بات سے مت گھبراؤ کہ اس کا کوئی خراب نتیجہ نکلیگا۔ کیونکہ دوسرا شخص اس سلوک سے متأثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا اُسکی آنکھیں نیچی ہو جائیں گی اور وہ تمہاری دوستی اور محبت کا دم بھرنے لگیگا۔

۲۲؎ حل لغات: ھَمَزٰت۔ اَلْھَمْزُ: اَلْعَصْرُ۔ ھمز کے معنے نچوڑنے کے ہیں (مفردات) چنانچہ ھَمَزَ رَاْسَهٗ کے معنے ہوتے ہیں عَصَرَهٗ اُس کے سر کو سختی کے ساتھ دبایا (اقرب) اور ھَمَزَ الشَّيْطٰنُ الْاِنْسَانَ کے معنے ہوتے ہیں ھَمَسَ فِيْ قَلْبِهٖ وَسْوَاسًا۔ اس کے دل میں وسوسہ ڈالا (اقرب)

تفسیر:۔ اس جگہ ھَمَزٰتِ الشَّيٰطِيْنِ میں کسی شیطانی وسوسہ کا ذکر نہیں بلکہ یہاں ان دشمنوں کو شیاطین کہا گیا ہے جو اسلام کے مخالف تھے اور جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مختلف قسم کی تکالیف پہنچاتے رہتے تھے چنانچہ ھمز کے ایک معنے نچوڑنے یعنی تکلیف دینے کے بھی ہوتے ہیں۔ اور ھَمَزْتُ الشَّيْءَ فِيْ كَفِّيْ کے یہ معنے ہوتے ہیں کہ میں نے فلاں چیز کو اپنے ہاتھ میں دبا کر نچوڑ ڈالا (مفردات امام راغبؒ) پس رَبِّ اَعُوْذُبِكَ مِنْ هَمَزٰتِ الشَّيٰطِيْنِ وَاَعُوْذُبِكَ رَبِّ اَنْ يَّحْضُرُوْنِ میں یہ دعا سکھائی گئی ہے کہ اے خدا مجھے شیطان کے چیلوں کے اُن حملوں سے بچائیو جو مجھے کچل ڈالنے کے لئے اُس کی طرف سے ہو رہے ہیں۔ بلکہ میں تجھ سے دُعا کرتا ہوں کہ مجھ پر غالب آنا تو الگ رہا وہ میرے قریب بھی نہ پھٹک سکیں یعنی وہ مجھے کسی قسم کی تکلیف نہ دے سکیں۔ چنانچہ اس سے اگلی آیت حَتّٰٓى اِذَا جَآءَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ رَبِّ ارْجِعُوْنِ۔ لَعَلِّيْٓ اَعْمَلُ صَالِحًا فِيْمَا تَرَكْتُ بھی انہی معنوں پر دلالت کرتی ہے اور بتاتی ہے کہ اِس جگہ کسی شیطانی وسوسہ کا ذکر نہیں بلکہ اُن انسان شیاطین کا ذکر ہے۔ جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تکالیف پہنچاتے تھے

ورنہ اگلی پچھلی عبادت سب بے جوڑ ہو جاتی ہے۔

هُوَ قَآئِلُهَا ؕ وَمِنْ وَّرَآئِهِمْ بَرْزَخٌ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ﴿۱۰۱﴾

جیسے وہ کہہ رہے ہیں ۔ اور ان کے پیچھے ایک پردہ ہے اُس دن تک کہ وہ دوبارہ اٹھائے جائینگے (پس وہ دنیا کی طرف زندہ کرکے کبھی نہ لوٹائے

فَاِذَا نُفِخَ فِى الصُّوْرِ فَلَاۤ اَنْسَابَ بَيْنَهُمْ يَوْمَئِذٍ

پھر جب بگل میں پھونک ماری جائیگی تو اُس دن اُن کے درمیان کوئی قرابتیں باقی نہیں رہیں گی ۔

وَّلَا يَتَسَآءَلُوْنَ ﴿۱۰۲﴾ فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ

اور نہ وہ ایک دوسرے کا حال پوچھیں گے ۔ پس جن کے وزن بھاری ہو جائینگے ۔ وہ لوگ

هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۱۰۳﴾ وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ

بامراد ہوں گے اور جن کے وزن ہلکے ہو جائیں گے

۲۳ تفسیر ۔ ان آیات میں بتایا گیا ہے کہ جب مشرک کی تباہی کا وقت آتا ہے تو اُسوقت وہ اپنے بتوں کو بالکل بھول جاتا ہے اور خدا تعالیٰ کو مخاطب کرکے عجز اور انکسار کے ساتھ اُس سے دعائیں کرنے لگ جاتا ہے ۔ یہ ایک نہایت ہی لطیف آیت ہے جس میں مختصر الفاظ میں وسیع معنوں کو ادا کیا گیا ہے ۔ اس میں کافر کے مُنہ سے ایک تو رب کا لفظ کہلایا گیا ہے جس میں اِس طرف اشارہ ہے کہ اُسوقت وہ خدا تعالیٰ کی توحید کا کھلے بندوں اقرار کریگا ۔ اور دوسری طرف اِرْجِعُوْنِ کہہ کر جو جمع کا صیغہ ہے اور جس کے معنے یہ ہیں کہ "مجھے لوٹا دیں" خدا تعالیٰ کی عظمت اور تمام کمالات کے جامع ہونے کا اُس کے مونہہ سے اقرار کروایا گیا ہے ۔

پھر اِرْجِعُوْنِ کہہ کر اللہ تعالیٰ نے کفار کی حیرت اور اُن کی گھبراہٹ کو بھی ظاہر کر دیا ہے ۔ کیونکہ جمع کا لفظ استعمال کرکے اس میں یہ بتایا گیا ہے کہ کافر اُسوقت گھبرا کر کہیگا ۔ اے میرے خدا مجھے لوٹا دے اے میرے خدا مجھے لوٹا دے اے میرے خدا مجھے لوٹا دے ۔ گویا اِرْجِعُوْنِ دراصل اَرْجِعْنِيْ اَرْجِعْنِيْ اَرْجِعْنِيْ کا قائم مقام ہے ۔ کیونکہ عربی زبان میں جمع کا صیغہ جب مفرد کے لئے استعمال کیا جائے تو بعض دفعہ تکرار کے معنے دیتا ہے پس اللہ تعالیٰ نے ایک ہی لفظ میں کفار کی حیرت کا بھی ذکر کر دیا اور حالتِ گھبراہٹ میں اُن کا اپنی درخواست کو بار بار اور جلدی جلدی پیش کرنا بھی بیان کر دیا ۔

پھر لَعَلِّيْٓ اَعْمَلُ صَالِحًا کے الفاظ میں اور بھی عظمتِ الٰہی کا ذکر کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ اُسوقت کافر پر اپنی بے حقیقتی اور خدا تعالیٰ کی قدرت کا کامل انکشاف ہو جائیگا اور وہ باوجود اپنے خیال میں سچی توبہ کرنے کے یہی کہے گا کہ اے خدا ! آج میرا غرور ٹوٹ گیا ۔ میں یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ اگر تو مجھے لوٹا دے تو میں ضرور نیک کام کرونگا ۔ میں صرف اُمید ظاہر کر سکتا ہوں کیونکہ اپنے نفس کی بے حقیقتی مجھ پر کھل چکی ہے ۔

كَلَّا ؕ اِنَّهَا كَلِمَةٌ هُوَ قَآئِلُهَا میں بتایا گیا کہ ہر کافر حسرت و ندامت کا مجسمہ بن کر قیامت کے دن یہ بات ضرور کہے گا مگر اُس کا یہ قول بالکل بے نتیجہ رہیگا ۔ اور

فَاُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فِيْ جَهَنَّمَ خٰلِدُوْنَ ﴿۱۰۴﴾

وہ لوگ گھاٹے میں پڑیں گے (اور اپنی جانوں کو تباہ کر دیں گے) اور جہنم میں ہمیشہ رہیں گے۔

تَلْفَحُ وُجُوْهَهُمُ النَّارُ وَهُمْ فِيْهَا كٰلِحُوْنَ ﴿۱۰۵﴾ اَلَمْ

آگ اُن کے مونہوں کو جھلسے گی۔ اور وہ اُس میں ترو سیاہ ہو جائینگے ۲۴؎ (اور کہا جائیگا)

تَكُنْ اٰيٰتِيْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ فَكُنْتُمْ بِهَا تُكَذِّبُوْنَ ﴿۱۰۶﴾

کیا تمہارے سامنے میری آیتیں نہیں پڑھی جاتی تھیں؟ اور تم اُن کا انکار نہیں کرتے تھے؟

قَالُوْا رَبَّنَا غَلَبَتْ عَلَيْنَا شِقْوَتُنَا وَكُنَّا قَوْمًا ضَآلِّيْنَ ﴿۱۰۷﴾

وہ کہیں گے۔ اے ہمارے رب! ہماری بدقسمتی ہم پر غالب آگئی اور ہم ایک گمراہ جماعت تھے۔

رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْهَا فَاِنْ عُدْنَا فَاِنَّا ظٰلِمُوْنَ ﴿۱۰۸﴾

اے ہمارے رب! ہمیں اِس (دوزخ) سے نکال۔ اگر ہم (ان گناہوں کی طرف) پھر لوٹیں تو ہم ظالم ہونگے۔

اور اسکی یہ خواہش کبھی پوری نہیں ہوگی۔ لیکن اس کے علاوہ اِس کے ایک یہ معنے بھی ہیں کہ مَاهِيَ اِلَّا كَلِمَةٌ يَقُوْلُهَا لَكَا ذِبٌ وَلٰكِنْ لَا يُسْتَجَابُ دُعَاؤُهٗ۔ یعنی کافر صرف مُنہ سے ایک بات کہہ رہا ہے جو کبھی پوری نہیں ہوگی کیونکہ اُس کے اور دنیا کے درمیان قیامت تک کے لئے ایک پردہ حائل کر دیا گیا ہے۔ پس اُس کے لئے دنیا میں لوٹ کر واپس جانا بالکل ناممکن ہے۔

۲۴؎ تفسیر:۔ فرماتا ہے۔ جب صُور پھونکا جائیگا تو اُس دن کوئی رشتہ داریاں باقی نہیں رہیں گی۔ اور نہ ایک دوسرے سے کوئی سوال کرے گا۔

اِسجگہ صُور کے ایک معنے تو اَلْقَرْنُ یعنی بگل کے ہیں جو فوج کو جمع کرنے کے لئے بجایا جاتا ہے۔ اور جس میں اِس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ وہ ایسا دن ہوگا جب تمام کفار کو جواب دہی کے لئے اللہ تعالیٰ کے سامنے کھڑا کیا جائیگا۔ لیکن چونکہ صُوْرَةٌ کی جمع بھی صُور آتی ہے اِس لئے اس کو مدنظر رکھتے ہوئے آیت کے یہ معنے ہونگے کہ جب انسانی صورتوں میں رُوح پھونکی جائیگی اور وہ زندہ ہو کر کھڑے ہو جائینگے۔ اِس سے ظاہر ہے کہ اگلے جہان میں کوئی نہ کوئی جسم انسان کو ضرور ملیگا۔ خواہ وہ یہ مادی جسم نہ ہو جو انسان کو اس دنیا میں ملا ہوا ہے۔

فَلَآ اَنْسَابَ بَيْنَهُمْ يَوْمَئِذٍ میں یہ بتایا کہ اُس دن کسی دوسرے کی مدد کام نہیں دیگی۔ بلکہ انسان کے اپنے ہی اعمال اُس کے کام آئیں گے۔ اگر نیک اعمال زیادہ ہوئے تو انسان نجات پا جائیگا اور اگر نیک اعمال کم ہوئے تو وہ گھاٹے میں پڑے گا۔

وَلَا يَتَسَآءَلُوْنَ میں یہ بتایا کہ اُس دن ایک دوسرے کے متعلق لوگوں کو کوئی تجسس نہیں ہوگا بلکہ ہر شخص کو

قَالَ اخْسَـُٔوْا فِيْهَا وَلَا تُكَلِّمُوْنِ ﴿۱۰۹﴾ اِنَّهٗ كَانَ فَرِيْقٌ

(خدا) فرمائیگا دُور ہو جاؤ (اور) دوزخ میں چلے جاؤ اور مجھ سے کلام مت کرو۔ بات یہ ہے کہ میرے بندوں میں سے ایک

مِّنْ عِبَادِيْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اٰمَنَّا فَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا

گروہ ایسا تھا جو کہتا تھا کہ اے ہمارے رب! ہم ایمان لے آئے ہیں سو تو ہم کو بخش دے اور ہم پر رحم کر۔

وَاَنْتَ خَيْرُ الرّٰحِمِيْنَ ﴿۱۱۰﴾ فَاتَّخَذْتُمُوْهُمْ سِخْرِيًّا حَتّٰٓى

اور تُو سب رحم کرنے والوں میں سے اچھا ہے۔ مگر تم نے اُن کو ہنسی مذاق کا مورد بنا لیا یہاں تک کہ

اَنْسَوْكُمْ ذِكْرِيْ وَكُنْتُمْ مِّنْهُمْ تَضْحَكُوْنَ ﴿۱۱۱﴾ اِنِّيْ جَزَيْتُهُمُ

انہوں نے (تمہاری ہنسی کا سامان بنکر) تمکو میری یاد بھلا دی۔ اور تم اُن سے ہمیشہ ہنسی کرتے رہے۔ اُن کے صبر کرنے کی وجہ سے

الْيَوْمَ بِمَا صَبَرُوْٓا ۙ اَنَّهُمْ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ ﴿۱۱۲﴾

مَیں آج اُن کو (مناسب حال) بدلہ دوں گا۔ یقیناً وہ کامیاب ہوں گے۔ ۲۵

اپنی اپنی پڑی ہوگی اور کسی دوسرے کی طرف اُسے کوئی توجہ نہیں ہوگی۔

تَلْفَحُ وُجُوْهَهُمُ النَّارُ وَهُمْ فِيْهَا كٰلِحُوْنَ میں یہ بتایا کہ کفار کے سردار بھی عذاب میں مبتلا ہونگے وَجْهٌ کے ایک معنے سردار کے بھی ہوتے ہیں اور وہ اس عذاب پر دانت پیسیں گے۔ یعنی اپنی کوتاہی پر حسرت اور افسوس کرینگے مگر اُس وقت اُن کا افسوس کرنا اُن کو کوئی فائدہ نہیں دیگا۔

۲۵ تفسیر:- فرماتا ہے۔ ہم نے بغیر حجّت پُورا کئے تو تم پر عذاب نازل نہیں کیا۔ مگر تم لوگ تو حجّت پُورا ہونے پر بھی انکار کرتے رہے۔ جب کافر یہ بات سُنیں گے تو کہیں گے۔ اے خدا! بدبختی نے ہم کو گھیر لیا اور ہم گمراہ ہو گئے۔ تُو ایک دفعہ اِس موجودہ حالت سے ہم کو نکال دے اگر ہم نے پھر وہی پہلے سے کام کئے تو بے شک ہمارے ظالم ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہوگا۔ پھر جو چاہیں سزا دے دیں۔

اِس پر اللہ تعالیٰ فرمائیگا کہ میرے سامنے سے دُور ہو جاؤ اور دوزخ میں داخل ہو جاؤ۔ اور مجھ سے کلام مت کرو۔ ایک وہ وقت تھا کہ میرے مومن بندے جب یہ کہا کرتے۔ کہ اے ہمارے رب ہم ایمان لے آئے ہیں۔ پس ہم کو معاف کر دے اور ہم پر رحم کر اور تُو سب رحم کرنے والوں میں سے اچھا ہے تو تم اُن کی نیکی کے باوجود اُن سے ہنسی مذاق کرتے تھے۔ اور اِس میں تم کو اِتنا لطف آتا تھا کہ تمہیں خدائی گرفت کا بھی کچھ خیال نہ رہا اور تم اِن بے کسوں پر خوب قہقہے لگاتے تھے۔ آج مَیں نے اُن کے صبر کی جزا ان کو دے دی ہے۔ یعنی ان کو غلبہ بخش دیا ہے اور انہوں نے اپنے مقصد کو پالیا ہے۔

یہ عجیب بات ہے کہ اللہ تعالیٰ تو یہ کہتا ہے کہ مَیں جن سے خفا ہوتا ہوں اُن سے کلام نہیں کرتا بلکہ اُنکو اپنے ساتھ بولنے کی اجازت بھی نہیں دیتا۔ مگر مسلمانوں پر

قَالَ كَمْ لَبِثْتُمْ فِي الْأَرْضِ عَدَدَ سِنِينَ ﴿۱۱۳﴾ قَالُوا

پھر وہ (یعنی خدا) فرمائیگا - کتنے سال تم زمین میں رہے ہو! وہ کہیں گے -

لَبِثْنَا يَوْمًا أَوْ بَعْضَ يَوْمٍ فَسْئَلِ الْعَادِّينَ ﴿۱۱۴﴾

ہم ایک ہی دن یا دن کا کچھ حصہ زمین میں رہے ہیں۔ تُو گننے والوں سے پوچھ لے۔

قَالَ إِنْ لَّبِثْتُمْ إِلَّا قَلِيلًا لَّوْ أَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿۱۱۵﴾

(اس پر خدا تعالیٰ) فرمائیگا - اگر تم سمجھ سے کام لو تو تم بہت تھوڑا عرصہ رہے ہو۔ ۲۶

أَفَحَسِبْتُمْ أَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّأَنَّكُمْ إِلَيْنَا لَا تُرْجَعُونَ ﴿۱۱۶﴾

کیا تم یہ سمجھا کرتے تھے کہ ہم نے تم کو بغیر کسی مقصد کے پیدا کیا ہے؟ اور یہ کہ تم ہماری طرف لوٹائے نہیں جاؤگے۔

بدقسمتی کا وہ زمانہ آیا کہ انہوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ چونکہ امتِ مسلمہ سب اُمتوں سے افضل ہے اسلئے اب اس کے کسی فرد کے ساتھ خدا تعالیٰ کلام نہیں کرے گا۔ انّا للہ وانّا الیہ راجعون -

۲۶ حل لغات :- یَوْمٌ - اس کے معنے مطلق وقت کے ہوتے ہیں - جیساکہ شاعر کہتا ہے ؎

یَوْمَاهُ يَوْمٌ نَدًى وَ يَوْمٌ طَعَانٍ

یعنی میرے ممدوح پر دو ہی قسم کے وقت آتے ہیں یا تو وہ سخاوت میں مشغول ہوتا ہے یا دشمنوں کے قتل کرنے میں۔ اور اس کے معنے اَلدَّهْرُ یعنی زمانہ کے بھی ہیں (لسان العرب)

تفسیر :- فرماتا ہے - اُس وقت خدا تعالےٰ کفار سے کہیگا کہ بھلا بتاؤ تو سہی کہ تم دنیا میں کتنے سال رہے؟ وہ کہیں گے کہ کچھ نہیں کوئی ایک دن یا دن کا کچھ تھوڑا سا حصہ۔ یہ فقرہ ناواقفیت کے اظہار کے لئے بولا جاتا ہے چنانچہ اسی آیت کے آخر میں کہا گیا ہے کہ فَسْئَلِ الْعَادِّيْنَ - تو گننے والوں سے پوچھ لے - اور

اللہ تعالےٰ بھی فرماتا ہے کہ اگر تم کو حقیقی علم ہو تو تم بہت تھوڑا عرصہ دنیا میں رہے ہو۔ ان الفاظ کے ذریعہ اِس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ کفار اپنی زندگی ہنسی کھیل میں گذار دیتے ہیں اور ہنسی کھیل میں گذرا ہُوا وقت بہت تھوڑا معلوم ہوتا ہے۔ اِسی وجہ سے آگے چل کر اللہ تعالےٰ فرماتا ہے کہ اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّاَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ - فَتَعَالَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْكَرِيْمِ - یعنی اے لوگو! کیا تم نے یہ سمجھا تھا کہ ہم نے تم کو بغیر کسی غرض کے پیدا کیا ہے کہ تم نے اپنی عمریں ضائع کرنی شروع کر دیں - اور یہ خیال کرتے رہے کہ تم لوٹ کر ہمارے پاس نہیں آؤگے تاکہ اپنی زندگی کی روشن اور تاریک گھڑیوں کا ہمیں حساب دو۔ حالانکہ اگر تمہارا خیال ٹھیک ہوتا تو خدا تعالیٰ کی توحید اور خدا تعالیٰ کی بادشاہت ثابت نہ ہوتی۔ خدا تعالےٰ کی توحید اور خدا تعالیٰ کی بادشاہت تبھی ثابت ہوسکتی ہے

یَوْمٌ

فَتَعٰلَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ رَبُّ الْعَرْشِ الْكَرِيْمِ ﴿۱۱۷﴾

پس اللہ بڑی بلند شان والا۔ بادشاہ اور قائم رہنے والا اور قائم رکھنے والا ہے۔ اُس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہ عرش کریم کا رب ہے ۲۷

جبکہ دنیا ایک مقصد کے لئے پیدا کی گئی ہو۔ اور اگر کوئی شخص اُس مقصد کو پُورا نہ کرے اور ہنسی کھیل میں اپنے دن گذار دے تو اُس سے جواب طلبی کی جائے۔

۲۷ تفسیر:- اس آیت میں بنی نوع انسان کو اس امر کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ تم اپنی پیدائش کے مقصد پر غور کرو۔ اور سوچو کہ کیا ہم نے دنیا کو بلا وجہ پیدا کیا ہے یا کیا یہ ایک کھیل اور تماشہ ہے جو تمہیں دکھائی دے رہا ہے کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ جس طرح بچے کھلونے بناتے اور پھر اُسے توڑ پھوڑ دیتے ہیں اسی طرح ہم بھی کھیل کے طور پر تمہیں پیدا کرتے اور پھر ہلاک کر دیتے ہیں اور تم ہماری طرف لوٹائے نہیں جاؤ گے؟ فرماتا ہے۔ یہ بالکل احمقانہ خیال ہے۔ اِسے ہماری طرف منسوب کرنا بھی ہماری ہتک ہے کیونکہ اس کے معنے یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو تم نے بچہ بنا دیا حالانکہ اللہ تعالیٰ کی شان اس سے بہت بلند ہے وہ کامل الصفات خدا ہے اُس کے متعلق یہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ وہ بچوں کی طرح کھیل رہا ہے۔ اور دنیا کو پیدا کرتا اور اُسے تباہ کرتا رہتا ہے۔ نہ اس کا کوئی مقصد ہے نہ مدعا۔ جیسے بچے ریت کے میدانوں میں جاتے ہیں تو اوپر کی خشک ریت ہٹا کر نیچے سے گیلی ریت نکال لیتے ہیں اور اُس میں پاؤں یا ہاتھ رکھ کر اوپر سے تھپکتے جاتے ہیں اور اِسطرح ریت کے مکان بنا لیتے ہیں۔ مگر گھر آتے وقت لات مار کر انہیں گرا دیتے ہیں۔ فرماتا ہے۔ کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ ہم نے بھی دنیا کو بچوں کے کھیل کی طرح پیدا کیا ہے۔ یعنی ہم انسان کو پیدا کرتے اور کچھ عرصہ کے بعد اُسے مار دیتے ہیں۔ گویا بچے کی کھیل تو گھنٹہ دو گھنٹے کی ہوتی ہے مگر خدا تعالیٰ کی کھیل چند سالوں کی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے

کہ تَعَالَى اللّٰهُ۔ تم تو ایک عقلمند انسان کی طرف بھی ایسی بات منسوب نہیں کرتے۔ وہ اگر کھیلے بھی تو اس کے کھیلنے کا وقت کام کے وقت کے مقابلہ میں کچھ بھی نہیں ہوتا اور پھر بڑی عمر کا آدمی جب کوئی مکان بناتا ہے تو اُسے توڑتا نہیں۔ سوائے اِس کے کہ اُس میں کوئی نقص ہو یا اُس سے بہتر عمارت بنانے کا اُسے خیال ہو۔ مگر خدا تعالےٰ کے کام میں تو کوئی نقص بھی نہیں ہوتا۔ پھر وہ جو تمام عقلوں کا پیدا کرنے والا اور علو شان رکھنے والا ہے اس کے متعلق تم کس طرح کہہ سکتے ہو کہ وہ کھیل رہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دنیا میں کئی ایسے فلسفی موجود ہیں جن کا یہ خیال ہے کہ یہ دنیا خدا تعالیٰ کی ایک کھیل ہے۔ خدا تعالیٰ تنہائی سے گھبرایا تو اُس نے کہا آؤ کوئی شغل جاری کریں اور اُس نے انسان کو پیدا کر دیا۔ کوئی انسان مرتا ہے تو وہ ہنستا ہے جس طرح بچہ کھلونے کو توڑ کر ہنس دیتا ہے۔ اُس کے ماں باپ اس پر ناراض ہو رہے ہوتے ہیں اور وہ قہقہہ لگا رہا ہوتا ہے۔ اِسی طرح جب کوئی انسان مرتا ہے تو لوگ تو رو رہے ہوتے ہیں مگر خدا نعوذ باللہ ہنستا ہے کہ کیا خوب گلا گھونٹا گیا۔ اِسی طرح جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو ماں دردِ زہ کی شدت سے کراہ رہی ہوتی ہے اور خدا تعالیٰ نعوذ باللہ ہنس رہا ہوتا ہے پھر کئی لوگ ایسے ہیں جو گو مُنہ سے تو یہ نہ کہتے ہوں لیکن اُن کے اعمال کے پس پشت یہ خیال ضرور موجود ہوتا ہے وہ سوچتے ہیں کہ ہم دنیا میں کیوں آئے؟ اور پھر خیال کر لیتے ہیں کہ یونہی آ گئے ہیں۔ جو لوگ اپنی زندگیوں کا کوئی روحانی مقصد نہیں سمجھتے اُن پر اگر جرح کر کے دیکھو تو اُن کا یہی عقیدہ نکلے گا کہ خدا تعالیٰ نعوذ باللہ کھیل رہا ہے مگر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے تَعَالَى اللّٰهُ۔ اللہ تعالیٰ بہت

بلند شان والا ہے۔ اُس نے دنیا کو کھیل کے طور پر پیدا نہیں کیا بلکہ خدا تعالیٰ کی چار صفات تھیں جنہوں نے دنیا کی پیدائش کا تقاضا کیا وہ صفات اپنا ظہور چاہتی تھیں اور اُن صفات کے ظہور کے لئے ہی اُس نے دنیا کو پیدا کیا۔ وہ چار صفات کیا ہیں۔ اَلْمَلِكُ ۔ اَلْحَقُّ ۔ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۔ اور رَبُّ الْعَرْشِ الْكَرِيْمِ ۔ فرماتا ہے۔ اللہ تعالیٰ مَلِکْ ہے اُس کی ملکیت چاہتی تھی کہ وہ ظاہر ہو۔ وہ الحق ہے اُسکا حق ہونا چاہتا تھا کہ وہ ظاہر ہو۔ وہ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ کا مصداق ہے اُس کی توحید چاہتی تھی کہ وہ ظاہر ہو۔ اور وہ رَبُّ الْعَرْشِ الْكَرِيْمِ ہے اُس کا رب العرش الکریم ہونا چاہتا تھا کہ وہ ظاہر ہو۔ یہ چار صفات چونکہ اپنا ظہور چاہتی تھیں۔ اِس لئے اُس نے دنیا کو پیدا کر دیا۔ اِن چاروں صفات پر غور کرکے دیکھو تو درحقیقت یہ وہی صفات ہیں جو سورۃ فاتحہ میں بیان کی گئی ہیں۔ وہاں بھی اللہ تعالےٰ فرماتا ہے اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۔ اَلرَّحْمٰنِ ۔ اَلرَّحِيْمِ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ۔ یعنی اللہ تعالیٰ ربّ العالمین ہے رحمٰن ہے رحیم ہے اور مالکِ یوم الدین ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ سورۂ فاتحہ میں ترتیب بدل دی گئی ہے۔ اِس آیت میں جو صفت پہلے بیان کی گئی تھی سورۂ فاتحہ میں اُسے آخر میں رکھ دیا ہے اور پھر اسی ترتیب سے تمام صفات کو درجہ بدرجہ بیان کیا ہے۔ چنانچہ دیکھ لو اِس آیت میں جو اَلْمَلِكُ آیا ہے یہ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ الحق صفتِ رحیمیت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ صفت رحمانیت کی طرف اشارہ کرتا ہے اور ربّ العرش الکریم صفت ربّ العٰلمین کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ گویا اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّاَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ میں تو چار صفات بطور منبع کے بیان کی گئی ہیں یعنی وہ صفات جنہوں نے دنیا کی پیدائش کا تقاضا کیا لیکن اِن کے نتیجہ میں جب انسان کو پیدا کیا گیا تو بندوں کے تعلق کے لحاظ سے وہی چار صفات ایک دوسرے رنگ میں ظاہر ہو گئیں۔ گویا تختِ شاہی کے مالک بلند شان والے مہربان رب کی طرف سے جب دنیا پیدا ہوئی تو وہ دنیا کے لحاظ سے رب العالمین بن گیا۔ پھر توحید کامل نے جب اپنا جلوہ دکھانا چاہا تو وہ انسانوں کے لئے رحمانیت کی صفت میں ظاہر ہوئی اور دنیا کی ہر ضرورت کو اس نے پورا کرکے بتا دیا کہ سوائے اس کے اَور کوئی خدا نہیں۔ پھر الحق کی صفت نے جب ظہور چاہا۔ جو سچ کو ظاہر کرنے والی اور دنیا کو قائم رکھنے والی ہے تو اُس نے رحیمیت کی شکل میں اپنا جلوہ دکھایا۔ پھر ملکیت نے چاہا کہ وہ کوئی قانون جاری کرے اور جب اُس نے قوانین جاری کئے تو اُس نے کہا۔ اَب میں ہر ایک سے حساب لونگا کہ اُس نے قانون کی کس حد تک پیروی کی ہے۔ اور وہ مالک یوم الدین کی صورت میں ظاہر ہُوا۔ پس یہ چار صفات جو اس آیت میں بیان کی گئی ہیں یہ سورۂ فاتحہ کی چار صفات کے لئے بطور منبع ہیں۔ مگر سورۂ فاتحہ میں جو ترتیب رکھی گئی ہے وہ اس سورۃ کے لحاظ سے موزوں تھی اور جو اسجگہ ترتیب رکھی گئی ہے یہ پیدائشِ عالم کے لحاظ سے موزوں ہے۔ یعنی مَلِکْ نے جب اپنی جلوہ گری کی۔ تو مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ کی صفت انسانوں کے لئے ظاہر ہوئی۔ کیونکہ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ کے معنے ہیں جزا سزا کے دن کا مالک اور جزا سزا اُس وقت تک مترتّب نہیں ہو سکتی جب تک مَلِکْ کی طرف سے پہلے کوئی قانون نہ ہو۔ پس مالک یوم الدین نتیجہ ہے ملکیت کا۔ اِسی طرح توحید نے جب اپنا ظہور چاہا تو اُسکی رحمانیت کی صفت ظاہر ہوئی۔ کیونکہ الرحمٰن کے معنے یہ ہیں کہ وہ ہر مخلوق کی جائز ضرورت کو پورا کرتا ہے خواہ اُس نے کوئی کام کیا ہو یا نہ کیا ہو۔ اور یہ تبھی ہو سکتا ہے جب ایک ہی خدا ہو۔ اگر پانی کسی خدا نے دینا ہے اور روٹی کسی نے تو توحید کو تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن جب ہم اپنی ہر ضرورت خدا تعالیٰ سے پوری ہوتی دیکھیں تو پھر ہماری عقل کہتی ہے کہ اُس کے سوا

کسی اَور خدا کی ضرورت نہیں۔ پس رحمانیت کی صفت توحیدِ الٰہی کی ایک زبردست دلیل ہے کیونکہ بغیر کسی وقفہ اور رخنہ کے سب مخلوق کی ضرورتیں پوری ہو رہی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کامل توحید اُنہی قوموں میں پائی جاتی ہے جو خدا تعالیٰ کی رحمانیت کی قائل ہیں۔ ہندو اور مسیحی مشرک قومیں ہیں اور یہ دونوں رحمانیت کی قائل نہیں۔ ایک نے رحمانیت کا انکار کرکے تناسخ کا مسئلہ نکال لیا اور دوسری نے کفارہ کا مسئلہ ایجاد کر لیا۔ پھر خدا تعالیٰ کی صفت اَلْحَقّ نے جب اپنا ظہور چاہا تو اُس نے رحیمیت کے ذریعہ سے سچائی کے دلدادوں کو ہمیشہ کی زندگی بخشی۔ کیونکہ رحیم کے معنے ہیں اچھے کاموں کا اعلیٰ سے اعلیٰ بدلہ دینے والی ہستی۔ جو کسی کی محنت کو ضائع نہیں کرتی اور یہی الحق کی صفت کا تقاضا ہے۔ الحق چاہتا ہے کہ اُس کا کوئی وعدہ غلط نہ جائے اور جو جو اُس نے لوگوں سے انعامات کے وعدے کئے ہیں وہ اُن کو ضرور مل جائیں پھر اَلْحَقّ کے معنے قائم رہنے اور قائم رکھنے کے بھی ہوتے ہیں۔ اور رحیم کی صفت میں جو بار بار بدلہ دینے کے معنے پائے جاتے ہیں وہ بھی اِس صفت سے تعلق رکھتے ہیں کیونکہ الحق نہ صرف خود قائم رہتا ہے بلکہ دوسروں کو بھی قائم رکھتا اور ان کے انعامات کو بھی قائم رکھتا ہے۔ حق درحقیقت مصدر ہے اور مصدر مبالغہ کے معنوں کے ساتھ اسم فاعل کے معنے بھی دے دیتا ہے۔ جیسے اَلْعَدْلُ نہایت انصاف کرنیوالے کو کہتے ہیں۔ پس الحق کے معنے قائم رہنے والے۔ قائم رکھنے والے اور سچے وعدے کرنے والے کے ہونگے۔ اور چونکہ رحیم کے معنے بھی کسی کے نیک کام کو ضائع نہ کرنے والے اور متواتر انعامات دینے والے کے ہیں اس لئے اِس صفت کا تعلق الحق سے ہی ہے۔ پھر ربّ العرش الکریم نے چاہا کہ کوئی ایسی مخلوق ہو جس کی وہ ربوبیت کرے پس اُس نے دنیا پیدا کی۔ اور اس کے لئے وہ ربّ العالمین ہو کر ظاہر ہوا۔ ربّ العرش الکریم میں بتایا گیا تھا کہ وہ تمام صفاتِ حسنہ کا مرکز اور حکومت کا مالک ہے اور اُس کا عرش کریم ہے اور کریم اُسے کہتے ہیں جس میں اعزاز اور احسان پایا جاتا ہو۔ اور یہی ربّ العالمین میں بیان کیا گیا ہے۔ غرض ربّ العالمین کی صفت تابع ہے ربّ العرش الکریم کی صفت کے اور مالک یوم الدین کی صفت تابع ہے اُسکے ملک ہونیکی صفت کے اور الرّحیم کی صفت تابع ہے الحقّ کی صفت کے اور الرّحمٰن کی صفت تابع ہے لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ کی صفت کے۔ گویا یہ چاروں صفات جو سورۂ فاتحہ میں بیان کی گئی ہیں وہی ہیں جو اللہ تعالیٰ نے فَتَعٰلَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ ۚ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ رَبُّ الْعَرْشِ الْكَرِيْمِ میں بیان کی ہیں۔ اور اس طرح بنی نوع انسان کو اس طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ ہم نے دنیا کو کھیل کے طور پر نہیں بنایا بلکہ اس لئے بنایا ہے کہ ہم الملک ہیں۔ ہم الحقّ ہیں۔ ہم لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ہیں۔ ہم ربّ العرش الکریم ہیں۔ یہ چار صفات ہیں جنہوں نے تقاضا کیا کہ ہم اپنے آپ کو ظاہر کریں۔ پس ہم نے اپنے آپ کو ظاہر کر دیا۔ چنانچہ اگر غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ چاروں صفات تنزلی طور پر ہر انسان کے اندر پائی جاتی ہیں۔ اس کے اندر خدا تعالیٰ نے مَلِك والی صفت بھی رکھی ہے جس کے نتیجہ میں وہ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ کا مظہر بنتا ہے اور اس صفت کا اتنا غلبہ ہے کہ دنیا میں ناقابل سے ناقابل انسان کو بھی مجازی طور پر بادشاہ بننے کی خواہش ہوتی ہے اور وہ اپنا مشورہ دینے کیلئے بیتاب رہتا ہے پھر بادشاہت ایک نظام چاہتی ہے اور انسان بھی ملک ہو کر قانون بناتا اور مالک یوم الدین ہو کر قاضی بنتا اور لوگوں کے باہمی جھگڑوں کا فیصلہ کرتا ہے۔ پھر ملکیت نظام کامل پر بھی دلالت کرتی ہے۔ کیونکہ بادشاہ کا یہ کام ہوتا ہے کہ وہ نظام کو قائم رکھے اور ایک کو دوسرے پر ظلم نہ کرنے دے۔ اور چونکہ خدا تعالیٰ الملک تھا اُس کی ملکیت نے تقاضا کیا کہ بنی نوع انسان میں بھی نظام جاری ہو۔ اِسی لئے اُس نے انسان کو مدنی الطبع بنایا

اور اُس میں مِل جُل کر رہنے کی طرف رغبت پیدا کی۔ اور بیوی بچے رشتہ دار اور دوست وغیرہ اُس کے ساتھ لگا دیئے گئے۔ بیشک وہ جانوروں کے ساتھ بھی ہیں مگر اس طرح نہیں جس طرح انسان کے ساتھ ہیں۔ مثلاً اُن میں تربیتِ اولاد کا طریق نہیں۔ بچہ جب دانہ کھانے لگے تو وہ اُسے مار کر باہر نکال دیتے ہیں۔ یہ کبھی نہیں ہوگا کہ بچے کو بوڑھا ہونے تک وہ اپنے ساتھ لئے پھریں۔ لیکن انسانوں میں یہ بات نظر آتی ہے کہ بچے کے بوڑھا ہونے تک بھی اگر ماں باپ زندہ ہوں تو اُس کا فکر رکھتے ہیں۔ پھر جانوروں میں برادری سسٹم کوئی نہیں لیکن اگر بعض کے تعاون کو جیسا کہ چیونٹیوں میں ہوتا ہے برادری کا طریق بھی سمجھ لیا جائے تو خاندانوں کا سسٹم اُن میں قطعاً نہیں۔ اور وارث ہونا اور قرابت کی وجہ سے دوسرے کا ذمہ دار قرار پانا یہ باتیں تو اُن میں کُلی طور پر مفقود ہیں۔ غرض ملکیت چونکہ نظامِ کامل پر دلالت کرتی تھی اللہ تعالےٰ نے چاہا کہ دنیا میں بھی نظامِ کامل جاری کیا جائے۔ اور اِسی لئے اس نے انسان کو مدنی الطبع بنایا۔ پھر صفت الحق جس کے تابع رحیمیت کی صفت ہے اخلاقِ فاضلہ اور عمل کی درستی پر دلالت کرتی ہے۔ رحیمیت کے معنے ہیں اچھے کام کا بہتر سے بہتر بدلہ دینا۔ اور یہ چیز اخلاق سے تعلق رکھتی ہے۔ اچھے کام ہوں تو بدلہ دیا جا سکتا ہے۔ ورنہ نہیں۔ چنانچہ جس طرح ملکیت کے نظام کو قبول کرنے کے لئے اُس نے انسان کے اندر قابلیت رکھی تھی اور اُسے مدنی الطبع بنایا تھا اِسی طرح الحق کے مقابلہ میں اخلاقِ فاضلہ انسان کو عطا کئے گئے۔ مذہب ہو یا نہ ہو۔ تعلیم ہو یا نہ ہو۔ خلافِ اخلاق بات دیکھ کر ہر شخص کا چہرہ فوراً سُرخ ہو جائیگا اور پتہ لگ جائے گا کہ اُس کی فطرت بول رہی ہے۔ جھوٹ بولنے یا چوری کرنے کی کسی کو عادت پڑ جائے تو اَور بات ہے ورنہ پہلا جھوٹ بولتے ہوئے اُس کا رنگ ضرور فق ہوگا اور پہلی چوری کرتے ہوئے اُس کا ہاتھ ضرور کانپے گا کیونکہ اخلاقِ فاضلہ اللہ تعالیٰ نے انسان کی فطرت میں داخل کئے ہیں۔

اور جب خدا تعالیٰ رحیم تھا تو ضروری تھا کہ دنیا میں اچھے کام بھی ہوں تاکہ اُن کا بدلہ دیا جا سکتا۔ پھر الحق میں چونکہ سچا وعدہ کرنے والے کے معنے بھی پائے جاتے ہیں اللہ تعالےٰ نے انسان میں الحق کی صفت بھی رکھی۔ چنانچہ انسان ہی وہ وجود ہے جو سچائی کو اُس کی انتہائی حد تک پہنچا دیتا ہے اور سچائی کے قیام کے لئے اتنی عظیم الشان قربانی کرتا ہے کہ جس کی مثال کسی اَور مخلوق میں نہیں مل سکتی۔ امتِ محمدیہ میں ایسے کئی اولیاء ہوئے ہیں جنہوں نے سچائی کے لئے بڑی بڑی تکالیف اُٹھائی ہیں۔ یہاں تک کہ انہوں نے اِس راہ میں مرنا قبول کر لیا مگر سچائی کو ترک نہیں کیا۔ خود ہماری جماعت میں شہدائے کابل کی مثالیں موجود ہیں جنہوں نے پتھر کھا کھا کر مر جانا قبول کر لیا مگر اِس بات کو ایک لمحہ کے لئے برداشت نہ کیا کہ جو سچائی انہوں نے اختیار کی تھی اُس کو لوگوں کے کہنے سے ترک کر دیں۔ ہمارے سردار اور آقا حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہی دیکھ لو۔ مکی زندگی میں ابو طالب جو آپ کے چچا تھے آپ کی بڑی حفاظت کیا کرتے تھے۔ اور چونکہ وہ اپنی قوم کے سردار تھے اِس لئے قریشِ مکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس طرح دق نہ کر سکتے تھے جس طرح وہ آپ کے صحابہؓ کو دق کیا کرتے تھے۔ مگر جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وعظ و نصیحت کو سُن سُن کر انہوں نے محسوس کیا کہ اسلام بڑھتا چلا جاتا ہے اور اگر اسے جلدی روکا نہ گیا تو اُس کا مٹانا اُن کیلئے سخت مشکل ہو جائیگا تو وہ ایک وفد کی صورت میں ابو طالب کے پاس گئے اور انہیں کہا کہ آپ کے بھتیجے نے ہمیں سخت دق کر رکھا ہے وہ ہمارے بتوں کو گالیاں دیتا اور ایک خدا کا وعظ کرتا رہتا ہے۔ آپ اِسے سمجھائیں کہ وہ ایسا نہ کرے اور اگر وہ نہ رُکے تو آپ

اس سے الگ ہو جائیں اور ہم پر اس کا معاملہ چھوڑ دیں ہم خود اس سے نپٹ لیں گے اور اگر آپ اُن سے الگ ہونے کے لئے بھی تیار نہ ہوں تو مجبوراً ہمیں آپ کی سرداری کو بھی جواب دینا پڑے گا۔ اور پھر اس کا نتیجہ اچھا نہیں نکلیگا۔ ابوطالب اپنے قبیلہ کے سردار تھے اور جن قوموں میں قبائلی زندگی ہوتی ہے وہ اپنی سرداری کی بڑی قیمت سمجھتی ہیں۔ ابوطالب نے جب یہ بات سُنی تو گھبرا گئے اور انہوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بُلا کر کہا۔ اے میرے بھتیجے! اب قوم سخت مشتعل ہو گئی ہے اور قریب ہے کہ تجھے ہلاک کر دیں اور ساتھ ہی مجھے بھی۔ میں نے ہمیشہ تیری حفاظت کرنے کی کوشش کی ہے مگر آج میری قوم کے افراد نے مجھے صاف طور پر کہہ دیا ہے کہ یا تو اپنے بھتیجے سے الگ ہو جائیں اور اگر آپ الگ ہونے کیلئے تیار نہ ہوں تو ہم آپ کی سرداری کو بھی جواب دے دیں گے۔ ابوطالب کے لئے یہ ایک ایسا امتحان تھا کہ باتیں کرتے کرتے انہیں رقت آگئی اور اُن کی تکلیف کو دیکھ کر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھیں بھی ڈبڈبا گئیں۔ مگر آپ نے فرمایا۔ اے چچا! میں آپکے احسانات کو بھول نہیں سکتا۔ میں جانتا ہوں کہ آپ نے میری خاطر بڑی بڑی قربانیاں کی ہیں۔ لیکن اے چچا! مجھے خدا تعالےٰ نے اسی کام کے لئے مبعوث کیا ہے۔ اگر آپ کو اپنی تکلیف کا احساس ہے تو اپنی پناہ واپس لے لیں۔ خدا نے مجھے سچائی دی ہے جسے میں کبھی نہیں چھوڑ سکتا۔ اگر یہ لوگ سورج کو میرے دائیں اور چاند کو میرے بائیں بھی لا کر رکھ دیں تب بھی میں اس تعلیم کو نہیں چھوڑ سکتا جو خدا تعالیٰ کی طرف سے مجھے ملی ہے یہ الفاظ کوئی معمولی الفاظ نہیں تھے۔ آج بھی یورپ کے معاند مؤرخین جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے واقعات لکھتے ہوئے اس مقام پر پہنچتے ہیں تو اُن کے دل کانپ اٹھتے ہیں اور وہ یہ لکھنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ محمد رسول اللہ جھوٹ بولنے والے نہ تھے اور آپکو اس تعلیم کی سچائی پر پُورا یقین تھا جو آپؐ لائے تھے۔

غرض اللہ تعالیٰ نے انسان کے اندر سچائی کا وہ مادہ رکھا ہے کہ سچائی پر قائم ہوتے ہوئے انسان کچھ کا کچھ ہو جاتا ہے۔ پھر الحق کے دوسرے معنے دنیا کو قائم رکھنے والے کے ہیں۔ اِس کا بہترین نمونہ بھی انبیاء علیہم السلام کا وجود ہوتا ہے۔ جب خدا تعالیٰ کا غضب دنیا کے گناہوں کی وجہ سے بھڑکنے والا ہوتا ہے تو اُس وقت خدا تعالیٰ کا الحق ہونا فوراً اپنے نبی کی طرف نگاہ دوڑاتا ہے اور کہتا ہے اس وجود کے ہوتے ہوئے میں دنیا کو کیونکر تباہ کر دوں۔ پس اُس کا وجود اِس دنیا کے لئے ایک حرز اور تعویذ ہوتا ہے اور اُس کی وجہ سے مخلوق بہت سے مصائب اور اللہ تعالےٰ کے غضب کا نشانہ بننے سے محفوظ رہتی ہے۔

پھر لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ جو رحمانیت کا منبع ہے اُس کے ساتھ قربانی اور ایثار کا تعلق ہے۔ کیونکہ رحمانیت تقاضا کرتی ہے کہ بغیر کسی مزدوری اور محنت کے دوسرے پر احسان کیا جائے اور یہ چیز بھی انسان کی فطرت میں رکھی گئی ہے چنانچہ دیکھ لو قطع نظر اس خیال کے کہ بڑے ہو کر بچہ کسی کام بھی آئیگا یا نہیں ماں باپ اُسے پالتے اور اُس کے آرام و آسائش کا ہر طرح خیال رکھتے ہیں۔ وہ اپنے دن کا آرام اور راتوں کی نیند اُس کے لئے حرام کر دیتے ہیں اور ہر ممکن کوشش اُس کے بقاء اور تحفظ کے لئے کرتے ہیں۔ یہ صفت رحمانیت کا ہی پرتو ہے جو انسان میں دکھائی دیتا ہے۔

اسی طرح ہمیں یہ بھی نظر آتا ہے کہ جو شخص لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ کا مقام دیکھ لیتا ہے وہ خود بھی توحید کے مقام پر کھڑا ہو جاتا ہے۔ توحید کے مقام پر کھڑا ہونے کے یہ معنے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو جس طرح اپنی توحید اور تفرید سے محبت ہے اسی طرح انسان سے بھی محبت ہو جاتی ہے اور وہ اُس کے مقابلہ میں ساری دنیا کی بھی پروا نہیں کرتا۔ یہی وہ مقام ہے جسے حدیث قدسی میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے کہ لَوْلَاکَ لَمَا خَلَقْتُ الْاَفْلَاکَ۔ یعنی اے محمد رسول اللہ! اگر تو

نہ ہوتا تو مَیں زمین و آسمان کو بھی پیدا نہ کرتا۔ پھر یہ بھی توحید کا مقام تھا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے سیّد ولد آدم اور اوّلین و آخرین کا سردار بنایا اور فیصلہ فرما دیا کہ اب کوئی ماں ایسا بچہ نہیں جن سکتی جو آپؐ کے درجہ کی بلندی کو پہنچ سکے۔ پھر اس لحاظ سے بھی آپؐ توحید کے مقام پر تھے کہ توحید کے قیام کے لئے آپؐ نے اسقدر جدوجہد کی کہ دنیا و مافیہا آپ کی نظروں سے غائب ہو گئے اور خدا ہی خدا آپ کو نظر آنے لگا۔ اور پھر اس لحاظ سے بھی آپؐ توحید کے مقام پر تھے کہ توکل کا بلند ترین مقام آپ کو حاصل تھا اور آپ کی نظر خدا تعالیٰ کے سوا اور کسی کی طرف اٹھتی ہی نہیں تھی۔ پھر رب العرش الکریم کے ماتحت صفت ربّ العالمین کا مادہ بھی خدا تعالیٰ نے ہر انسان میں پیدا کیا۔ اور اُسے اتنا وسیع کیا کہ ہر ماں اور ہر باپ اپنے بچہ کی تربیت کر رہا ہے اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں تو یہ صفت اس درجہ تک پائی جاتی تھی کہ دنیا کی کوئی چیز ایسی نہیں جو آپ کے احسان سے باہر رہ گئی ہو۔ یہ ظاہر ہے کہ ربوبیتِ عالمین میں تمام مخلوق شامل ہے یعنی انسان بھی اس میں شامل ہیں اور حیوان بھی اُس میں شامل ہیں۔ مرد بھی اس میں شامل ہیں اور عورتیں بھی اس میں شامل ہیں۔ مومن بھی اس میں شامل ہیں اور کافر بھی اس میں شامل ہیں۔ امیر بھی اس میں شامل ہیں اور غریب بھی اس میں شامل ہیں۔ یہاں تک کہ انبیاء اور ملائکہ بھی اس میں شامل ہیں۔ اب جب ہم رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی پر غور کرتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ آپ صفتِ ربّ العالمین کے ایسے کامل مظہر تھے کہ دنیا کی کوئی مخلوق آپ کے احسان سے باہر نہیں تھی۔ مخلوق میں سے اہم جنس حیوان ہیں جن کے متعلق رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی اُمت کو کئی قسم کے احکام دیئے ہیں مثلاً آپؐ نے فرمایا۔ کہ آزاد جانوروں کو باندھ کر مت رکھو اور اگر باندھ کر رکھتے ہو تو ان کے کھانے پینے کا انتظام کرو۔ کسی جانور کو کسی دوسرے جانور کے سامنے ذبح نہ کرو تاکہ اُسے تکلیف نہ ہو۔ کسی جانور کو کند چھری سے ذبح نہ کرو کسی جانور کو باندھ کر نشانہ نہ بناؤ۔ کسی جانور پر اُس کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہ لادو۔ کسی جانور کے مونہہ پر داغ نہ لگاؤ۔ اگر لگانا ہی ہو تو پیٹھ پر لگاؤ۔ اسی طرح فرمایا کہ جو پالتو جانور ہیں اُن کو دانے وغیرہ ڈال دینا بھی ثواب کا موجب ہے۔ چنانچہ آپ نے فرمایا کہ ایک شخص جو جانوروں کو دانے وغیرہ ڈالا کرتا تھا اللہ تعالیٰ کو اُس کی یہ نیکی ایسی پسند آئی کہ اُس نے اس نیکی کے عوض اُسے اسلام میں داخل ہونے کی توفیق عطا فرما دی۔ عورتوں کے حقوق کا آپ نے اسقدر خیال رکھا کہ فرمایا وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ کہ جس طرح عورتوں پر مردوں کے حقوق ہیں اسی طرح عورتوں کے بھی بہت سے حقوق ہیں جو مردوں کو ادا کرنے چاہئیں۔ پھر ہر شعبۂ زندگی میں عورت کی ترقی کے راستے آپ نے کھولے اُسے جائیداد کا مالک قرار دیا۔ اُس کے جذبات اور احساسات کا خیال رکھا۔ اس کی تعلیم کی نگہداشت کی۔ اُس کی تربیت کا حکم دیا اور پھر فیصلہ فرما دیا کہ جس طرح جنت میں مرد کے لئے ترقیات کے غیر متناہی مراتب ہیں۔ اسی طرح عورتوں کیلئے بھی ترقیات کے غیر متناہی دروازے کھلے ہیں۔

پھر انسانوں میں قوموں مذہبوں اور حکومتوں کے تفاوت کی وجہ سے اختلاف ہوتا ہے اور اس اختلاف کے نتیجہ میں کئی دفعہ لڑائیاں ہو جاتی ہیں۔ مگر جہاں گھمسان کی لڑائی ہو رہی ہوتی ہے جہاں کوئی انسان کسی کی پرواہ نہیں کرتا وہاں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ یہ آواز بلند ہوتی ہے کہ دیکھنا ان کفار میں سے کسی عورت کو نہ مارنا۔ کسی بچے کو نہ مارنا کسی پنڈت یا پادری یا راہب کو قتل نہ کرنا۔ باغات نہ جلانا معبد نہ گرانا۔ پھلدار درخت نہ کاٹنا۔ جھوٹ اور فریب سے کام نہ لینا۔ کسی ایسے شخص کو قتل نہ کرنا جس نے تمہارے سامنے ہتھیار ڈال دیئے ہوں۔ زخمی کو نہ مارنا۔ کسی کو آگ سے عذاب نہ دینا۔ کفار کا مثلہ نہ کرنا گویا تمثیلی زبان میں اگر ہم ان ہدایات کو بیان کریں تو اس کا نقشہ

یوں کھینچا جا سکتا ہے کہ مسلمان ایک لمبے عرصہ تک کفار کے مظالم برداشت کرنے کے بعد جب تلواریں سونت سونت کر کفار پر حملہ آور ہوئے تو وہی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو مسلمانوں کو کفار سے لڑا رہے تھے کیا دکھائی دیتا ہے کہ دشمنوں کے آگے بھی کھڑے ہیں اور مسلمانوں سے کہہ رہے ہیں کہ ان پر یہ سختی نہ کرو۔ وہ سختی نہ کرو۔ گویا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صرف مسلمانوں کے لشکر ہی کی کمان نہیں کر رہے تھے بلکہ آپ کفار کے لشکر کی بھی کمان کر رہے تھے۔ اور انہیں بھی مسلمانوں کے حملہ سے بچا رہے تھے۔ پس لڑائیوں میں بھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صفت رب العالمین کے مظہر ہونے کا ثبوت نظر آ رہا ہے۔ پھر غلاموں پر بھی آپ نے احسان کیا اور فرمایا کہ جو شخص کسی غلام کو مارتا ہے وہ گناہ کا ارتکاب کرتا ہے اور اس کا فدیہ یہ ہے کہ وہ اُسے آزاد کر دے۔ آپ نے فرمایا۔ اپنے غلام سے وہ کام نہ لو جو وہ کر نہیں سکتا۔ اور اگر زیادہ کام ہو تو خود ساتھ لگ کر کام کراؤ۔ اور اگر تم اس کیلئے تیار نہیں تو تمہارا کوئی حق نہیں کہ اس سے کام لو۔ اسی طرح اگر غلام کے لئے تمہارے مونہہ سے کوئی گالی نکل جاتی ہے تو تمہارا فرض ہے کہ اُسے فوراً آزاد کر دو۔ غرض مزدور اور آقا کے لحاظ سے بھی آپ نے صفت رب العالمین کا مظہر بن کر دنیا کو دکھا دیا۔ آپ نے ایک طرف مزدور کو کہا کہ اے مزدور تو حلال کما اور محنت سے کام کر اور دوسری طرف آقا سے کہا کہ اے محنت لینے والے تو حد سے زیادہ اس سے کام نہ لے اور اس کا پسینہ خشک ہونے سے پہلے اس کی مزدوری اُسے دے۔ اسی طرح تجارتوں کے متعلق اور لین دین کے معاملات کے متعلق بھی رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے احکام دیئے بلکہ زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جس کے متعلق واضح ہدایات دے کر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے بنی نوع انسان پر احسان نہ فرمایا ہو۔ کوئی کہہ سکتا ہے کہ موجودہ لوگوں پر تو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے یہ احسانات کئے لیکن آپ نے پہلوں پر کیا احسان کیا۔ سو ایسے لوگوں کو میں بتانا چاہتا ہوں کہ آپ کے احسانات نہ صرف موجودہ نسل اور آئندہ آنے والی نسلوں پر ہیں بلکہ اُن لوگوں پر بھی ہیں جو آپ سے پہلے گذر چکے۔ آپ جس زمانہ میں مبعوث ہوئے اُس وقت تمام انبیاء پر مختلف قسم کے الزامات لگائے جاتے تھے اور عجیب بات یہ ہے کہ ہر نبی پر اُسی قوم نے الزام لگائے جو اُس نبی کو ماننے والی تھی۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر بھی الزام لگا۔ حضرت داؤد علیہ السلام پر بھی الزام لگا۔ حضرت سلیمان علیہ السلام پر بھی الزام لگا۔ بلکہ عیسائیوں نے تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو مستثنیٰ کرتے ہوئے کہہ دیا کہ سب نبی نعوذ باللہ چور اور بٹمار تھے مگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نیکی بھی اُن کی نگاہ میں کیا تھی انہوں نے مُنہ سے تو کہہ دیا کہ حضرت عیسیٰ بے گناہ تھے۔ مگر تفصیلات میں وہ اُن پر الزام لگانے سے بھی باز نہیں آئے چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ وہ کسی کا گدھا بے پُوچھے لے گئے اور اُس پر سواری کرتے پھرے۔ لوگوں کو گالیاں دیتے تھے۔ اور انہیں حرامکار اور بدکار کہتے تھے۔ وہ لوگوں کے گناہ اٹھا کر صلیب پر لٹک گئے اور اس طرح نعوذ باللہ لعنتی بنے اور تین دن دوزخ میں رہے۔ وہ لوگوں کے سؤروں کے گلّے بغیر اُن کے مالکوں کو کوئی قیمت دینے کے تباہ کر دیا کرتے تھے۔ یہ سب باتیں مسیحی کتب میں لکھی ہیں۔ پھر ہندوؤں کو دیکھ لو۔ وہ حضرت کرشن اور حضرت رامچندر کو اپنا اوتار مانتے ہیں۔ مگر رامچندر جی کا سیتا سے جو سلوک بیان کرتے ہیں وہ اگر ایک طرف رکھ لیا جائے اور دوسری طرف اُن کی بزرگی اور نیکی دیکھی جائے تو یہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ انہوں نے اتنا بڑا ظلم کیا ہو۔ پھر حضرت کرشن کے متعلق کہتے ہیں کہ وہ مکھن چرا چرا کر بیچا کرتے تھے

حالانکہ وہ خدا تعالیٰ کے نبی تھے۔ غرض تمام انبیاء پر جیسیوں الزامات لگائے جاتے تھے۔ یہ صرف محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہی ذات ہے جس نے تمام انبیاء پر سے ان اعتراضات کو دُور کیا اور بتایا کہ یہ لوگ نیک پاک اور راستباز تھے ان پر الزام نہیں لگانا چاہیئے۔ پس رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ صرف موجودہ اور آئندہ نسلوں پر احسان کیا بلکہ پہلے لوگوں پر بھی احسان کیا جو وفات پا چکے تھے اور اُن کی قوموں پر بھی احسان کیا۔ جب ایک یہودی کو بتا دیا جائے کہ تمہارے بزرگ تمام نقائص سے پاک تھے تو اُس کی گذشتہ تاریخ کتنی صاف ہو جاتی ہے اور وہ کیسی خوشی کے ساتھ ان بزرگوں کے نمونہ پر چلنے کی کوشش کرے گا۔ یہی حال عیسائیوں کا ہے اور یہی حال دوسری قوموں کا ہے پس رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے نہ صرف اپنی قوم ہی کی ترقی کے راستے کھولے بلکہ دوسری قوموں کی روایات کو بھی صاف کیا اور اُن کے سامنے بھی اُن کے بزرگوں کے اعلےٰ نمونے پیش کئے جن کو اپنے سامنے رکھتے ہوئے وہ عظیم الشان ترقی کر سکتے ہیں۔ پھر آپ نے ملائکہ پر بھی احسان کیا۔ طرح طرح کے الزام تھے جو اُن پر لگائے جاتے تھے۔ مگر اسلام نے آکر بتایا کہ ملائکہ گنا ہگار نہیں بلکہ اُن کے اندر خدا تعالےٰ نے انکار کا مادہ ہی نہیں رکھا۔ انہیں جو بھی حکم ملے اُس کی وہ اطاعت کرتے ہیں پس اُن پر کسی قسم کا الزام لگانا اور یہ کہنا کہ انہوں نے بھی فلاں گناہ کیا تھا سخت ظلم ہے۔ پھر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا کے ہر گنا ہگار پر احسان کیا اور اُس کے دل کو خوشی سے لبریز کر دیا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے ساری دنیا یہ کہا کرتی تھی کہ گنہگار ہمیشہ دوزخ میں گرائے جائینگے اور جو شخص ایک دفعہ جہنم میں چلا گیا وہ وہاں سے نہیں نکل سکیگا۔ گویا دنیا گنہگاروں کو اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس کرتی تھی اور توبہ کا دروازہ اس پر بند کرتی تھی مگر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ انسان کتنا ہی گنا ہگار ہو جائے اللہ تعالیٰ اُسے معاف کرنے کے لئے تیار ہے۔ بے شک گنا ہگاروں کے گناہ بڑے ہوں مگر خدا تعالیٰ کا رحم اُس سے بھی بڑا ہے پس تم اس بات سے مت گھبراؤ کہ تم گناہوں میں ملوث ہو تم توبہ کرو تو خدا آج بھی تمہیں معاف کرنے کیلئے تیار ہے۔ کتنی امید ہے جو گنہگاروں کے دلوں میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پیدا کر دی۔ کتنی امنگ ہے جو آپ نے انکے قلوب میں موجزن کر دی۔ غرض ربّ العالمین کی صفت اعلیٰ درجہ کے کمال کے ساتھ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں ظاہر ہوئی اور آپ سے اُتر کر اُمتِ محمدیہ کے اور بہت سے اولیاء اور صلحاء میں ظاہر ہوئی اور ظاہر ہوتی رہتی ہے۔

غرض یہ چاروں صفات جو اللہ تعالےٰ نے بیان کی ہیں انہی کے ماتحت دنیا میں امن قائم رہ سکتا ہے۔ اگر قانون نہ ہو اور پھر اس قانون کا نفاذ نہ ہو تو ہرگز امن قائم نہیں ہو سکتا۔ اِسی طرح اگر صحیح رنگ میں تربیت نہ ہو اور اہلی اور عائلی زندگی درست نہ ہو تب بھی امن مفقود ہوتا ہے۔ امن کے قیام کا صرف یہی ذریعہ ہے کہ انسان اس حقیقت کو سمجھ لے کہ وہ دنیا میں کیوں پیدا کیا گیا ہے۔ اور یہ حقیقت اُسوقت تک سمجھ میں نہیں آسکتی جب تک محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی تعلیم انسان کے سامنے پیش نہ کی جائے جب تک اللہ تعالےٰ کی رحمت کے نظارے اُس کے سامنے نہ رکھ دئے جائیں۔ جب تک ہم اُسے یہ یقین نہ دلادیں کہ یہی دنیوی زندگی کا اصل مقصود نہیں بلکہ اصل زندگی وہ ہے جو مرنے کے بعد

اپنے رب کے سامنے پیش کیا جائے گا تو خدا اُسے کہیگا کہ فَادْخُلِیْ فِیْ عِبَادِیْ وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ. کہ اے میرے بندے مَیں نے تجھے بے انتہا انعامات دینے ہیں۔ مَیں نے تیری روح ہمیشہ قائم رکھنی ہے۔ بیشک تیری دنیوی زندگی ہزاروں مایوسیوں ہزاروں ناکامیوں اور ہزاروں بیماریوں کی آماجگاہ تھی لیکن یاد رکھ کہ وہی تیری زندگی نہیں تھی بلکہ اصل زندگی وہ ہے جو اَب تجھے دیتا ہوں اور جو ہر قسم کی تکلیفوں اور ہر قسم کی ذلتوں اور ہر قسم کے تنزل سے محفوظ ہے آ اور میری جنت میں داخل ہو جا۔ جب یہ خیال کسی کے دل میں پیدا ہو جاتا ہے۔ جب وہ سمجھتا ہے کہ میری زندگی عبث نہیں بلکہ یہ ایک اَور عظیم الشان زندگی کا پیش خیمہ ہے اور اصل زندگی وہی ہے جو میری موت کے بعد شروع ہوگی تو اس وقت وہ اپنے دل میں حقیقی اطمینان اور حقیقی امن محسوس کرتا ہے اور اس وقت وہ صرف اپنی پیدائش پر ہی خوش نہیں ہوتا بلکہ وہ اپنی موت پر بھی خوش ہوتا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ موت اس لئے نہیں کہ مجھے تباہ کرے بلکہ اس لئے ہے کہ وہ مجھے چھوٹی جگہ سے اُٹھا کر ایک بلند مقام پر پہنچا دے۔ کیا تم نے کبھی دیکھا کہ کوئی شخص تحصیلدار سے ای۔ اے۔ سی ہو گیا ہو یا ڈپٹی کمشنر سے کمشنر بن گیا ہو اور وہ بجائے خوش ہونے کے رونے لگ گیا ہو۔ اسی طرح مومن اپنی موت پر روتا نہیں بلکہ خوش ہوتا ہے اور سمجھتا ہے کہ مجھے انعامات ملنے کا وقت آ گیا۔ لیکن جو شخص روتا ہے وہ اس لئے روتا ہے کہ اُس نے زندگی محض دنیوی حیات کو سمجھ رکھا تھا اور اس نے دیکھا کہ اس زندگی کا بیشتر حصہ ناکامی اور بدمزگی میں گذر گیا اور اُسے کچھ بھی لطف نہ آیا۔ مگر جو شخص جانتا ہے کہ یہ دنیا کی زندگی ایک امتحان کا کمرہ ہے وہ اس کمرے سے نکلتے وقت خوشی محسوس کرتا ہے۔ جس طرح وہ لڑکا جو اچھے پرچے کر کے آتا ہے خوش ہوتا ہے اسی طرح مومن جب دنیا کے امتحان کے کمرہ سے اچھے پرچے کر کے نکلتا ہے تو وہ خوش ہوتا ہے اور کہتا ہے ایک رحیم ہستی میرے سامنے ہے جس نے مجھ سے بے انتہا انعامات کا وعدہ کیا ہوا ہے۔ اَب مَیں اُس کے پاس جاؤں گا اور اُس سے انعام لونگا۔ جیسے یونیورسٹی کی ڈگریاں لینے کے لئے جب طالب علم جاتے ہیں تو وہ بھڑکیلے لباس اور گاؤن وغیرہ پہن کر جاتے ہیں۔ اسی طرح وہ مومن جو اللہ تعالیٰ کی رحمت اور اُس کے عظیم الشان فضلوں پر ایمان رکھتا ہے جب مرنے لگتا ہے تو اس کا دل خوشی سے اچھل رہا ہوتا ہے۔ اور وہ کہتا ہے۔ مَیں اپنے رب کے پاس ڈگری لینے چلا ہوں مَیں اپنے رب سے انعام لینے چلا ہوں۔ جب تک یہ امید انسان کے دل میں پیدا نہیں ہوتی اُس وقت تک اُسے حقیقی راحت میسّر نہیں آ سکتی۔

غرض انسان میں اللہ تعالیٰ نے عظیم الشان طاقتیں رکھی ہیں اور اُس کا یہ فرض مقرر کیا ہے کہ وہ اپنے آپ کو صفاتِ الٰہیہ کا مظہر بنانے کی کوشش کرے اور یہی وہ چیز ہے جس کو قائم کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ اپنے نبیوں کو بھیجتا ہے اور چاہتا ہے کہ اُن کے ذریعہ دنیا میں ایک ایسی روحانی حکومت قائم کرے جس کے افراد اُنہی صفات کے مظہر ہوں جو اُس کے اندر پائی جاتی ہیں۔ پس جب تک کوئی شخص ان تمام ذمہ واریوں کو سمجھ کر مذہب قبول نہیں کرتا اس وقت تک اس کا مذہب میں شامل ہونا یا نہ ہونا برابر ہوتا ہے۔ وہ مسلمان ہوتا ہے اور خیال کرتا ہے کہ مسلمان ہونے کے لئے صرف اتنا ہی کافی ہے کہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ پڑھ لیا جائے اور وہ یہ نہیں سمجھتا کہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ

وَمَنْ يَّدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ لَا بُرْهَانَ لَهٗ بِهٖ

اور جو کوئی اللہ کے سوا کسی اور معبود کو پکارے جس کی کوئی دلیل نہیں۔ تو

فَاِنَّمَا حِسَابُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ؕ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْكٰفِرُوْنَ ﴿۱۱۸﴾

اُس کا حساب اس کے رب کے پاس ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کافر کبھی کامیاب نہیں ہوتے۔

وَقُلْ رَّبِّ اغْفِرْ وَارْحَمْ وَاَنْتَ خَيْرُ الرّٰحِمِيْنَ ﴿۱۱۹﴾

اور تُو کہدے۔ اے میرے رب! معاف کر اور رحم کر اور تُو سب سے اچھا رحم کرنے والا ہے ۲۸ؔ

ع ۶

۲۸ؔ تفسیر:۔ فرماتا ہے۔ جو شخص اللہ تعالےٰ کے سوا کسی اَور کو اپنا معبود سمجھ کر اپنی مدد کے لئے پکارتا ہے جس کی اُس کے پاس کوئی دلیل نہیں تو اس کو اپنے ربّ کے سامنے حساب دینا پڑے گا اور ایسے کافر لوگ کبھی اپنی مراد نہیں پائیں گے۔ یعنی وہ کبھی بھی مسلمانوں پر غالب نہیں آئیں گے بلکہ مسلمان ہی اُن پر غالب رہیں گے۔ مگر اس مقصد کو پُورا کرنے کے لئے تُو اپنے رب سے بخشش اور رحم مانگتا رہا کر اور یہ کہتا رہا کر کہ الٰہی تُو ہی سب سے اچھا رحم کرنے والا ہے۔ یعنی اسلام کی اشاعت کے لئے سب سے کارگر حربہ یہی ہے کہ تم اللہ تعالےٰ کے حضور جُھک کر اُس سے دُعائیں کرتے رہو کہ وہ تمہاری کمزوریوں کو دُور فرمائے۔ تمہیں اپنے رحم اور کرم سے حصّہ دے اور تمہیں ایسا روحانی غلبہ عطا کرے کہ تم لوگوں کے خیالات اور اُن کے افکار اور ان کے رجحانات میں ایک نیک تغیّر پیدا کرسکو اور انہیں توحید کی طرف کھینچ کر ایک نئے تمدّن کی بنیاد رکھ سکو۔ تا کہ اللہ تعالیٰ کے جلال اور اس کے جمال کا اظہار ہو اور خدا تعالیٰ کی بادشاہت جس طرح آسمان پر ہے زمین پر بھی قائم ہو۔ یہ وہ حربہ ہے جسے ہر شخص استعمال کرسکتا ہے۔ یہاں تک کہ چارپائیوں پر پڑے ہوئے کمزور اور بیمار جن میں

کی تفسیر سارا قرآن ہے اور اس سارے قرآن پر عمل کئے بغیر وہ حقیقی معنوں میں مسلمان نہیں ہوسکتا۔ جس طرح انسان کسی ایک عضو کا نام نہیں بلکہ انسان مجموعہ ہے ناک کان آنکھوں مُنہ گردن سر سینہ ہاتھ اور پاؤں وغیرہ کا اور ان میں سے کوئی چیز بھی علیحدہ نہیں ہوسکتی۔ نہ سر الگ ہوسکتا ہے۔ نہ دھڑ الگ ہوسکتا ہے۔ نہ ہاتھ اور پاؤں الگ ہوسکتے ہیں۔ اسی طرح لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ایک مفرد شے نہیں، بلکہ وہ چار اعضاء روحانی کے مجموعہ کا نام ہے۔ وہ الْمَلِكُ اور الْحَقُّ اور لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ اور ربّ العرش الکریم کے بروز کا نام ہے۔ پس انسان صحیح معنوں میں اسی وقت لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہنے والا سمجھا جا سکتا ہے جب وہ ربّ العالمین۔ الرحمٰن۔ الرحیم اور مالک یوم الدین کی صفات کا مظہر ہو۔ اگر کوئی شخص ان صفات کو اپنے اندر پیدا نہیں کرتا۔ تو وہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص کسی ایسی چیز کو آدمی سمجھتا رہے جس کا نہ دل ہو۔ نہ دماغ ہو۔ نہ ہاتھ ہوں۔ نہ پاؤں ہوں۔ کامیابی حاصل کرنے والے وہی لوگ ہوتے ہیں جو اپنے آپ کو صفاتِ الٰہیہ کا مظہر بنا کر اپنے اندر تغیّر پیدا کرتے ہیں اور اس طرح اُس مقصد کو حاصل کرلیتے ہیں جس کے لئے اُن کی پیدائش معرضِ وجود میں آئی تھی۔

چلنے کی تاب نہیں۔ وہ بھی اپنے رب کا دروازہ کھٹکھٹا کر اس کی نصرت کو کھینچ سکتے ہیں۔ قید و بند میں مبتلا انسان جو زندان کی چار دیواریوں میں مقید ہیں وہ بھی اس حربہ کو استعمال کر کے خدمتِ دین کا ثواب لے سکتے ہیں اور نادار اور غریب انسان جن کے دل اس حسرت سے بے تاب رہتے ہیں کہ کاش اُن کے پاس بھی روپیہ ہوتا اور وہ بھی دین کی اشاعت میں مدد دے سکتے وہ بھی اس ذریعہ سے اسلام کی کامیابی کو قریب تر لا کر ثواب میں دوسروں کے شریک ہو سکتے ہیں۔ ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں جھکے اور اس سے نہایت عجز و انکسار سے یہ دُعا کرتا رہے کہ

رَّبِّ اغْفِرْ وَارْحَمْ وَأَنْتَ خَيْرُ الرّٰحِمِيْنَ

سُورَةُ النُّورِ مَدَنِيَّةٌ

سورۃ نور - یہ سورۃ مدنی ہے

وَهِيَ مَعَ الْبَسْمَلَةِ خَمْسٌ وَّسِتُّوْنَ اٰيَةً وَّتِسْعَةُ رُكُوْعَاتٍ

اور بسم اللہ سمیت اس کی پینسٹھ (۶۵) آیتیں ہیں - اور نو رکوع ہیں ۱؎

۱؎ سورۃ النور بغیر اختلاف کے مدنی ہے۔ نہ مسلمان اس بارہ میں اختلاف کرتے ہیں اور نہ عیسائی اس کے متعلق اختلاف کرتے ہیں۔ اور اس کی پینسٹھ (۶۵) آیتیں ہیں یعنی بسم اللہ کو شامل کر کے۔ بسم اللہ کو نکال کر چونسٹھ (۶۴) بنتی ہیں۔

سورۃ نور کا پہلی سورۃ سے تعلق اس سورۃ کا پہلی سورۃ سے قریبی تعلق یہ ہے کہ سورۃ مؤمنون کے آخر میں یہ بتایا گیا تھا کہ مسلمانوں میں ایسے لوگ پیدا ہونگے جو روحانیت میں ترقی کر کے خدا تعالیٰ کی مدد حاصل کر سکیں گے۔ اب اس سورۃ میں وہ طریق بتائے گئے ہیں جن پر چل کر خدا تعالیٰ کی مدد حاصل کی جاتی ہے۔ اور بتایا ہے کہ عبادت اور تقویٰ کی راہوں کے علاوہ خدا تعالیٰ کی نصرت حاصل کرنے کے ذریعہ قوم کی اخلاقی حالت کی درستی اور عائلی اور قومی تنظیم بھی ہوتے ہیں۔ چنانچہ اس سورۃ کو اخلاقی حالت کی درستی کی تدابیر سے ہی شروع کیا گیا ہے اور مرد و عورت کے تعلقات کی درستی اور اصلاح کی طرف توجہ دلائی گئی ہے گویا بتایا ہے کہ اسلام کے مخالفوں کی نہ صرف مذہبی حالت بگڑ گئی ہے بلکہ اخلاقی حالت بھی بگڑ گئی ہے۔ اس لئے وہ کامیاب نہیں ہو سکتے (خصوصاً مسیحی) لیکن مسلمانوں کی یہ دونوں حالتیں درست ہو جائیں گی اس لئے وہ کامیاب ہو جائیں گے۔ درحقیقت یہ مضمون کا بیج سورۃ مؤمنون میں موجود تھا چنانچہ سورۃ مؤمنون میں کامیاب ہونیوالے مومنوں کے لئے جو امور بیان کئے گئے تھے اُن میں سے ایک لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ بھی تھا پس یوں کہنا چاہیئے کہ کامیاب ہونے والے مومنوں کے مضمون کو اس سورۃ میں زیادہ تفصیل سے بیان کیا گیا ہے ضمنی طور پر ان دونوں سورتوں کے مضمون سے یہ امر بھی نکلتا ہے۔ کہ لوگوں میں جو یہ خیال پایا جاتا ہے کہ کسی سچے مذہب کو محض مان لینے سے کامیابی ہو سکتی ہے۔ یا یہ کہ اس طرح وہ کامیابی ہمیشہ کے لئے قائم بھی رکھی جا سکتی ہے یہ غلط ہے۔ کامیابی کے لئے ضروری ہے کہ عقیدہ کے ساتھ ذہنی افکار اور اخلاق کی اصلاح بھی کی جائے۔ اور افراد اور قوم کے تعلقات کی بنیاد بھی صلاحیت اور رُشد پر رکھی جائے۔ اور قومی تنظیم کو خاص اہمیت دی جائے اور افراد کے حقوق پر قوم کے حقوق کو مقدم کیا جائے۔

زمانۂ سورۃ یہ تو ہم کہہ چکے ہیں کہ یہ سورۃ مدنی ہے۔ اب اس کی معین تاریخ کا سوال رہ جاتا ہے۔ سو یاد رکھنا چاہیئے کہ اس سورۃ میں جو حضرت عائشہؓ کا واقعہ بیان کیا گیا ہے یہ ۵ھ ہجری کا ہے۔ بنو مصطلق کی جنگ سے واپسی کے وقت یہ واقعہ پیش آیا تھا۔ اور بنو مصطلق کی جنگ شعبان ۵ھ ہجری میں ہوئی تھی۔ پس ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ سورۃ پانچویں سال ہجری کے آخری مہینوں میں اتری ہے۔

خلاصۂ سورۃ اس سورۃ میں خاص احکام بیان کئے گئے ہیں۔ اور ایسے امور بیان کئے گئے ہیں جن سے قوم ترقی کر سکتی ہے (آیت ۲ و ۱)

بدکاری قومی نظام کو توڑ دیتی ہے اور اُسکی شہرت قومی اخلاق کو بگاڑ دیتی ہے۔ اِن دونوں باتوں سے بچنا چاہیئے۔ (آیت ۳ تا ۶)

پھر فرماتا ہے اگر میاں بیوی میں بدظنی پیدا ہو تو چونکہ اُس کا اثر خاندانی تعلقات پر پڑتا ہے اسلئے اس کا قانون دوسروں سے مختلف ہونا چاہیئے اور وہ یہ ہے کہ بجائے غیر گواہوں کے ذاتی قسموں کے ذریعہ سے اُن کا تصفیہ کروایا جائے۔ (آیت ۷ تا ۱۱)

پھر فرمایا کہ بعض دفعہ خرابی کے انفرادی واقعات قوم کیلئے مفید ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ قوم اُن کی وجہ سے بیدار ہو جاتی ہے پس ایسی باتوں سے چڑنا نہیں چاہیئے بلکہ ان سے فائدہ اٹھانا چاہیئے اور ہمیشہ اس بات کو مدِنظر رکھنا چاہیئے کہ وہی بات کہی جائے جو قانونی گواہی کی حد تک دلیل رکھتی ہو ورنہ وہ بات زبان پر نہ لائی جائے۔ کیونکہ اگر محض بدظنی یا محض کمزور گواہوں پر ایک دوسرے کے خلاف الزام لگائے جائیں تو قوم میں گناہ بہت بڑھ جاتا ہے اور نوجوانوں میں یہ احساس پیدا ہو جاتا ہے کہ ہماری قوم میں یہ بدی کثرت سے پائی جاتی ہے اسلئے اِس میں کوئی حرج نہیں (آیت ۱۲ تا ۲۱)

پھر فرماتا ہے کہ اے مومنو! اخلاق کی حفاظت بڑی ضروری چیز ہے ایسے تمام کام جو معیارِ اخلاق کو قوم میں کمزور کر دینے والے ہوں شیطانی کام ہیں۔ اور قومی اخلاق کو قائم رکھنے کے لئے بڑی بیداری کی ضرورت ہے اگر انسان اس بیداری کو کھو بیٹھے تو قوم کے اخلاق گر جاتے ہیں۔ لیکن یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ اگر قوم میں سے بعض افراد بعض دفعہ غلطی کر بیٹھیں تو محض اس لئے کہ وہ فعل اگر بڑھ جائے تو قوم کی تباہی کا موجب ہو جاتا ہے اُن کو پیسنے اور کچلنے کی کوشش نہیں کرنی چاہیئے۔ بلکہ اس بات کو سمجھتے ہوئے کہ قوم میں سے بعض کے اخلاق کمزور بھی ہوتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی اصلاح بہت عفو سے کرنی چاہیئے۔ (آیت ۲۲، ۲۳)

لیکن وہ لوگ جو کہ اصرار کے ساتھ قوم میں تفرقہ پیدا کرنے کی کوشش کریں اور بدگوئی کے عادی ہوں انکو یقیناً اِس دنیا میں بھی سزا ملنی چاہیئے اور آخرت میں بھی سزا ملیگی۔ اللہ تعالیٰ انکی بدیوں کو ظاہر کرکے اُن کو ذلیل کرے گا اور جس سزا کے وہ مستحق ہیں اس میں انہیں مبتلا کریگا۔ جب ایک شخص کا ظاہر نیک نظر آتا ہو تو اُس کے متعلق بد باتیں قبول ہی نہیں کرنی چاہئیں جس طرح کہ بد آدمی کے متعلق نیک بات سُن کر انسان کو تعجب ہوتا ہے اور اُسکو ماننے پر آمادہ نہیں ہوتا۔ (آیت ۲۴ تا ۲۷)

پھر فرماتا ہے کہ انفرادی اخلاق پر اعتراضات بعض بے احتیاطیوں کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں اور سب سے بڑی بے احتیاطی مرد اور عورت کا آزادانہ اختلاط ہے پس تم کو چاہیئے کہ اِن چیزوں سے بچنے کے لئے ایک دوسرے کے گھر آزادانہ نہ گھس جایا کرو بلکہ پہلے اجازت لیا کرو۔ اور گھر والوں پر سلام کیا کرو۔ پھر اگر تمہیں تمہارے سلام کا جواب نہ ملے تو جب تک تمہیں اجازت نہ ملے اُس گھر میں داخل نہ ہو اور اگر گھر میں بعض افراد ہوں اور وہ تمہیں کہیں کہ چلے جاؤ اِس وقت ہم نہیں مل سکتے تو پھر ملاقات پر اصرار نہ کرو۔ ہاں ایسے گھر جن میں تمہارا اسباب پڑا ہُوا ہے اور اُن میں کوئی رہتا نہیں اُن میں تم بلا اجازت جاسکتے ہو۔ اور اگر مرد اور عورت کا آمنا سامنا ہو جائے تو انکو چاہیئے کہ ایک دوسرے کو آنکھیں کھول کر نہ دیکھا کریں اور اُن تمام راستوں کی حفاظت کریں۔ جن سے بدی انسانی قلب میں داخل ہوتی ہے۔ یہی حکم عورتوں کے لئے بھی ہے جس طرح مردوں کے لئے ہے۔ اور عورتوں کو چاہیئے کہ وہ بھی ایسے راستوں کو بند کریں جن کے ذریعہ سے بدی انسان کے اندر داخل ہوتی ہے اور اپنے جسم کے ایسے حصّے جن کو خدا تعالیٰ نے خوبصورت بنایا ہے غیر محرموں پر ظاہر نہ کریں۔ سوائے اِس کے کہ کوئی حصّہ آپ ہی آپ ظاہر ہو جائے (جیسے قد اور جسم کی بناوٹ وغیرہ) اور چاہیئے کہ وہ اپنی اوڑھنیوں کو اپنے منہ کے اوپر سے کھینچ کر

سینوں تک لے آئیں (یعنی لمبا گھونگھٹ نکالیں) اور اپنی زینت
سوائے اپنے قریبی رشتہ داروں کے یا ایسے متعلقین کے جن کی
فہرست دی گئی ہے اور کسی کو نہ دکھائیں۔ (آیت ۲۸ تا ۳۲)

اسی طرح چاہئیے کہ قومی اخلاق کی درستی کے لئے بیوائیں قوم
میں نہ رہنے دی جائیں۔ بلکہ اُن کی شادی کر دی جائے۔ اسی طرح
غلاموں اور لونڈیوں کی بھی شادی کی جائے۔ اور شادی میں مالی
کمزوری کو مدنظر نہ رکھا جائے۔ اور جو شادی کر ہی نہ سکیں وہ
اپنے اخلاق کی درستی کا خاص طور پر خیال رکھا کریں۔

دوسرا طریقہ نیکی کے قائم رکھنے کا یہ ہے کہ جنگی قیدیوں کو
آزاد کیا جائے۔ پس اگر کوئی جنگی قیدی فوراً اپنی آزادی کی قیمت
دینے کی طاقت نہیں رکھتا تو اس کے ساتھ یہ معاہدہ کیا جائے
کہ وہ قسط وار اپنا جرمانہ ادا کر دے گا بلکہ حکومت کو
اور دوسرے مسلمانوں کو چاہیئے کہ وہ خود اس کی طرف سے
اس کی آزادی کی رقم ادا کر دیں۔ اسی طرح جو عورتیں جنگی
قیدی ہوں اور تمہارے قبضہ میں ہوں اُن پر بھی ایسے احکام
جاری نہ کرو کہ وہ بدکاری پر مجبور ہو جائیں۔ اگر تم ایسے
حالات میں ان کو رکھو گے تو پھر تم ذمہ دار ہو گے وہ نہیں۔
ان باتوں میں تمہارے لئے اعلیٰ درجہ کی تعلیم دی گئی ہے۔
اور تم سے پہلے جو لوگ گذرے ہیں اُن سے بڑھ کر روحانی
مرتبے دینے والی یہ تعلیم ہے (آیت ۳۳ تا ۳۵)

زمین اور آسمان کی روشنی سب خدا سے ہی آتی ہے
پھر اُس روشنی کی حقیقت بیان کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے
کہ یہ خدائی نور مسلمانوں میں ظاہر ہونے والا ہے اور ان کو
عزت بخشنے والا ہے۔ (آیت ۳۶ تا ۳۹)

پھر بتایا کہ جو لوگ اسلام کو نہیں مانیں گے چونکہ اُن
کے اخلاق کی بنیاد یا تو ایک غیر مصفی شریعت پر ہوگی یا
صرف انسانی ذہنوں پر ہوگی (جیسے مسیحیوں کی) اس لئے
اُن کی تدبیریں کبھی کامیاب نہیں ہونگی اور اُن کی کوششیں
رائیگاں چلی جائیں گی اور اصلاح قومی کے کام کو وہ بڑا مشکل
پائیں گے کیونکہ اصلاح بغیر خدائی ہدایت کے نہیں ہو سکتی (یعنی
بغیر شریعت کے)۔ (آیت ۴۰-۴۱)

پھر فرماتا ہے کہ کیا انسانوں کو یہ نظر نہیں آتا کہ تمام
کائنات میں خدا تعالیٰ کے قانون سے برکت ہی برکت نظر آرہی
ہے۔ اور تمام قانونِ قدرت خدا تعالیٰ کی ایک بہت بڑی رحمت
نظر آرہا ہے پھر یہ کیونکر سمجھتے ہیں کہ اُسی خدا کا بنایا ہوا قانونِ
شریعت ایک لعنت ہے۔ انسان اگر اپنے لئے صحیح رستہ
تلاش کر سکتا ہے تو خدا اُس کے لئے صحیح رستہ کیوں تلاش
نہیں کر سکتا۔ (آیت ۴۲ تا ۴۷)

مگر یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ محض منہ کے ایمان سے
کچھ نہیں بنتا بلکہ کوشش یہ ہونی چاہیئے کہ احکامِ الٰہیہ پر عمل
کیا جائے۔ یہ نہ ہو کہ جب فائدہ دیکھا عمل کر لیا اور جب
فائدہ نہ ہوا تو چھوڑ دیا۔ (آیت ۴۸ تا ۵۵)

ہم مسلمانوں سے یہ وعدہ کرتے ہیں کہ اگر وہ ہمارے
بتائے ہوئے طریق پر چلیں گے تو ہم انہیں دین و دنیا میں
بادشاہ بنا دیں گے۔ (یعنی اپنے وقت پر مناصب حال
دینی و دنیوی لیڈری، یا دونوں نعمتیں ایک ہی وقت میں ان کو
ملیں گی) اور اُن کے دین کو دنیا میں پھیلا دیں گے اور اُن کے
ذریعہ توحید کو دنیا میں قائم کر دیں گے لیکن انکو بھی چاہیئے
کہ وہ خدا تعالیٰ کی عبادت کو قائم کریں۔ اپنے مالوں سے غریبوں
کی مدد کریں اور محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے احکام کی
اطاعت کریں اور یہ کبھی خیال نہ کریں کہ اُن کے دشمن بوجہ اپنی
طاقت اور کثرت کے اُن پر فاتح ہو جائیں گے وہ کبھی فاتح نہیں
ہوں گے۔ (آیت ۵۶ تا ۵۸)

اے مومنو! ہم پھر تم کو نصیحت کرتے ہیں کہ اپنی عائلی
اور قومی زندگی کو درست کرو۔ اور آزادانہ خلا ملا نہ کیا کرو۔
صبح کے ہونے سے پہلے اور دوپہر کو اور رات گئے وہ خادم
جو جنگی قیدی ہیں اور نابالغ بچے بھی اُن کمروں میں نہ جایا کریں
جن میں میاں بیوی رہتے ہیں۔ ہاں ان وقتوں کے علاوہ جو لوگ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ①

(میں) اللہ (تعالیٰ) کا نام لے کر جو بیحد کرم کرنیوالا (اور) بار بار رحم کرنیوالا ہے (پڑھتا ہوں)

سُوْرَةٌ اَنْزَلْنٰهَا وَفَرَضْنٰهَا وَاَنْزَلْنَا فِيْهَآ اٰيٰتٍۭ بَيِّنٰتٍ

(یہ) ایک ایسی سورۃ ہے جو ہم نے اتاری ہے اور (جس پر عمل کرنا) ہم نے فرض کیا ہے اور اسمیں ہم نے اپنے روشن احکام بیان کئے ہیں

لَّعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ② اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِيْ فَاجْلِدُوْا كُلَّ

تاکہ تم نصیحت حاصل کرو۔ ؎۲ زانیہ عورت اور زانی مرد (اگر ان پر الزام ثابت ہو جائے) تو ان میں سے ہر ایک کو

گھر کا حصہ ہیں وہ آجا سکتے ہیں۔ اس میں تمہاری اخلاقی بہتری ہے۔ اور جب بچے جوان ہو جائیں تو اُن پر بھی نوجوانوں والے احکام کا اطلاق ہونا چاہیئے۔ اسلامی پردہ اُن عورتوں کے لئے ہے جو جوان اور شادی کے قابل ہیں۔ بوڑھی عورتیں اگر چاہیں تو اس پردہ کو ترک کر سکتی ہیں۔ مگر وہ بھی زینت کرکے باہر نہ نکلیں۔ (آیت ۵۹ تا ۶۱)

جو لوگ جسمانی طور پر معذور ہیں جو قریبی رشتہ دار ہیں اگر ایک دوسرے کے گھر سے بن بلائے کھانا کھالیں تو ہرج نہیں۔ مگر دوسرے لوگوں کو چاہیئے کہ دعوت کے بغیر ایک دوسرے کے گھر کھانے کے وقت نہ جایا کریں۔ (آیت ۶۲)

عائلی نظام کے بعد یاد رکھو کہ قومی نظام بھی نہایت اہم شے ہے بلکہ عائلی اور انفرادی نظام سے بالا ہے۔ اس لئے چاہیئے کہ جب کوئی قومی مجلس ہو تو بلا اجازت افسر وہاں سے کوئی نہ جائے جیسے کہ بعض پارلیمنٹوں نے آجکل قانون بنا رکھا ہے جو لوگ اجازت سے جائیں اور قانون شکن نہ ہوں ایسوں کو ضرورت کے وقت اجازت دے دینی چاہیئے (آیت ۶۳)

اے مومنو! دنیوی نظام سے بھی اہم تر دینی نظام ہے۔ اسلئے رسول کی آواز کو دوسروں کی آوازوں کی طرح مت سمجھو۔ جو لوگ رسول کی مجلس سے بغیر اجازت چلے جاتے ہیں وہ خدا کے نافرمان ہیں اُن کو عذاب سے ڈرنا چاہیئے (آیت ۶۴)

پھر فرماتا ہے جو کچھ آسمان اور زمین میں ہے وہ خدا ہی کا ہے اور وہ تمہارے معیارِ اخلاق کو خوب جانتا ہے۔ پس اسکے بتلائے ہوئے طریق پر چلو تاکہ اس کی مخلوق تمہارا ساتھ دے اور خدا تعالیٰ کی مدد بھی تم کو حاصل ہو۔ (آیت ۶۵)

؎۲ **تفسیر**:- سورۃ نُور کو جو امتیازی خصوصیات حاصل ہیں اُن کی وجہ سے اس کی ابتداء ہی سُوْرَةٌ کے لفظ سے کی گئی ہے۔ حالانکہ سورۃ فاتحہ سے لے کر قرآن کریم کے آخر تک ایکسو چودہ (۱۱۴) سورتیں ہیں مگر سورۃ نُور کے سوا اور کوئی سورۃ ایسی نہیں ہے جس کے ابتداء میں ہی سُوْرَةٌ کا لفظ رکھ کر اس کی اہمیت کی طرف توجہ دلائی گئی ہو۔ درحقیقت اس میں حکمت یہ ہے کہ عربی زبان میں سُوْرَةٌ کا لفظ کئی معانی پر مشتمل ہوتا ہے اور وہ سارے کے سارے اس سورۃ پر نہایت عمدگی سے چسپاں ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ لغتِ عرب کے لحاظ سے سورۃ کے ایک معنے درجہ کے ہوتے ہیں۔ دوسرے معنے بزرگی اور شرف کے ہوتے ہیں۔ تیسرے معنے نشان اور علامت کے ہوتے ہیں۔ چوتھے معنے ایسی عمارت کے ہوتے ہیں جو بلندی میں آسمان سے باتیں کر رہی ہو۔ اور خوبصورت بھی ہو۔ پانچویں معنے ایسی چیز کے ہوتے ہیں جو اپنی ذات میں مکمل ہو (اقرب) اور چھٹے معنے کسی چیز کے حصہ اور جزو کے ہوتے ہیں (تفسیر قرطبی)۔ ان معانی کے اعتبار سے اِس جگہ سُوْرَةٌ کا لفظ استعمال فرما کر اِس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ یہ سورۃ قرآن کریم کا ایک اہم حصہ ہے

وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ ۪ وَّلَا تَاْخُذْكُمْ بِهِمَا

سو کوڑے لگاؤ اور اگر تم اللہ اور یوم آخرت پر

رَاْفَةٌ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۚ

ایمان لاتے ہو تو اللہ کے حکم کے بجا لانے میں اِن دونوں قسم کے مجرموں کے متعلق تمہیں رحم نہ آئے۔

وَلْيَشْهَدْ عَذَابَهُمَا طَآئِفَةٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۳﴾

اور چاہیئے کہ اِن دونوں کی سزا کو مومنوں کی ایک جماعت مشاہدہ کرے ۵۳

جس میں انسان کی تمدنی، اخلاقی اور روحانی ترقی کے متعلق ایک جامع اور مکمل تعلیم دی گئی ہے۔ یہ ایک بلند اور نہایت درجہ خوبصورت روحانی تعلیم پر مشتمل ہے جس پر عمل کرنے سے انسان خدا تعالیٰ کے حضور اعلیٰ روحانی مراتب حاصل کر لیتا ہے اور دنیا میں بھی شرف اور بندگی کا حامل بنتا ہے۔ اسی طرح اس کے احکام پر عمل کرنیوالے کو دوسرے لوگوں کے مقابلہ میں ایک خاص امتیاز حاصل ہو جاتا ہے اور وہ اخلاق اور روحانیت کی ایک بلند سطح پر کھڑا ہو جاتا ہے۔ پھر اس سورۃ کی اہمیت پر اللہ تعالیٰ نے اور زیادہ زور دیا اور فرمایا اَنْزَلْنٰهَا وَفَرَضْنٰهَا۔ یعنی ہم نے ہی اس کو نازل کیا ہے اور ہم نے اس پر عمل کرنا لوگوں کیلئے فرض قرار دیا ہے۔ قرآن کریم میں عام طور پر مختلف آیات اور سور کے متعلق یہ تو آتا ہے کہ ہم نے انکو نازل کیا ہے مگر اس کے ساتھ ان الفاظ کی زیادتی نہیں کی جاتی کہ ہم نے ان پر عمل کرنا لوگوں کیلئے فرض قرار دیا ہے مگر یہاں فَرَضْنٰهَا کے الفاظ خاص طور پر بڑھائے گئے ہیں اور چونکہ قرآن کریم سارے کا سارا ہی فرض ہے جیسا کہ ایک دوسری جگہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اِنَّ الَّذِيْ فَرَضَ عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لَرَآدُّكَ اِلٰى مَعَادٍ (قصص ع ۹) یعنی وہ خدا جس نے تجھ پر قرآن فرض کیا ہے اپنی ذات کی قسم کھا کر کہتا ہے کہ وہ تجھے اس مقام کی طرف ضرور لوٹا کر لے آئیگا جس کی طرف لوگ بار بار لوٹ کر آتے ہیں یعنی مکہ مکرمہ۔ اس لئے سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہاں اَنْزَلْنٰهَا کے بعد فَرَضْنٰهَا کے الفاظ کیوں بڑھائے گئے ہیں۔ سو یاد رکھنا چاہیئے کہ اسجگہ فرض کے معنے احکام کو واجب کرنیکے نہیں بلکہ تاکید کرنے کے ہیں۔ چنانچہ گذشتہ مفسرین میں سے بھی بعض نے اسکے معنے اَلْزَمْنٰكُمُ الْعَمَلَ بِهَا کے لئے ہیں (تفسیر فتح البیان) یعنی ہم نے اس پر عمل کرنا تمہارے لئے لازم کر دیا ہے۔ پس سُوْرَةٌ اَنْزَلْنٰهَا وَفَرَضْنٰهَا کہہ کر اس امر کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ یہ ایک نہایت ہی اہمیت رکھنے والی سورۃ ہے۔ اس میں ایک اعلیٰ درجہ کا اخلاقی اور روحانی ضابطۂ حیات بنی نوع انسان کے سامنے پیش کیا گیا ہے جس پر عمل کرنے والا دنیا میں بھی عزت پاتا ہے اور خدا تعالیٰ کے حضور بھی اُسے ایک بلند روحانی مقام حاصل ہو جاتا ہے۔ اور پھر اس سورۃ کو ہم نے اس تاکید کے ساتھ اُتارا ہے کہ اس کی تعلیم پر تم ہمیشہ عمل کرو اور اسے کبھی اپنی آنکھوں سے اوجھل نہ ہونے دو کیونکہ اس میں سارے کے سارے احکام ایسے ہیں جو بنی نوع انسان کی فلاح و بہبود کے ساتھ تعلق رکھنے والے ہیں اور جن میں سے کسی ایک کو بھی نظر انداز کرنا اپنی ہلاکت اور بربادی کو مول لینا ہے پس اس کی اہمیت اور عظمت کبھی بھی فراموش نہیں کرنی چاہیئے۔

۵۳ حل لغات:۔ اِجْلِدُوْا: جَلَدَهٗ بِالسِّيَاطِ کے معنے ہوتے ہیں۔ ضَرَبَهٗ بِهَا وَاَصَابَ جِلْدَهٗ اُس نے اُسے کوڑے سے مارا اور کوڑے کے نشان اس کے چمڑے پر

اِجْلِدُوْا

رَأْفَةٌ

لپٹ گئے (اقرب) پس اِجْلِدُوْا کے معنے ہونگے۔ تم کوڑے سے مارو۔

رَاْفَةٌ: اَلرَّاْفَةُ: اَلرَّحْمَةُ۔ رأفت کے معنے رحمت کے ہوتے ہیں (مفردات)

تفسیر: ۔ سورۂ نور کی ابتداء بعض ایسے احکام سے کی گئی ہے جن کو نظر انداز کرنا انسانی تمدّن میں کئی قسم کی خرابیاں پیدا کر دیتا ہے۔ چنانچہ نسل انسانی کے بقاء اور اس کی حفاظت کے قوانین سے اس سورۃ کو شروع کیا گیا ہے تاکہ جسمانی اور اخلاقی حفاظت کے قوانین کو مدنظر رکھتے ہوئے رُوحانی ترقیات کی طرف انسان کی توجہ پھرے۔ یہ ایک یقینی بات ہے کہ جس طرح جسمانی حفاظت کے قواعد کو مدّنظر نہ رکھنے سے انسانی جسم تباہ اور قومیں برباد ہو جاتی ہیں۔ اِسی طرح رُوحانی تعلقات میں غلطی کرنے سے بھی بڑے بھاری نقصانات پیدا ہوتے ہیں اور روحانی کوششوں کے نتائج مخلوط ہو جاتے ہیں۔

جسمانی تعلقات میں دیکھو۔ بظاہر جس طرح جائز تعلق رکھنے والے مرد و عورت ملتے ہیں اور بچہ پیدا ہو جاتا ہے۔ اسی طرح ناجائز تعلق رکھنے والے بھی ملتے ہیں اور ان کے تعلق سے بھی بچہ پیدا ہو جاتا ہے لیکن پہلا تعلق جہاں انسانی تمدن کو ترقی دینے والا ہے وہاں ناجائز تعلق کے نتیجہ میں انسانی تمدّن کے سر پر کلہاڑا رکھ دیا جاتا ہے اور آئندہ نسلیں ایسی مشکوک ہو جاتی ہیں کہ اُن کا امتیاز کرنا ہی ناممکن ہو جاتا ہے۔ اسی طرح روحانی تعلق پیدا کرنے میں جب لوگ احتیاط سے کام نہیں لیتے اور غلط طریق اختیار کر لیتے ہیں یعنی جس سے روحانی تعلق پیدا کرنا چاہیئے اُس سے نہیں کرتے بلکہ جس سے نہیں کرنا چاہیئے اُس سے کر لیتے ہیں تو اس سے بھی بڑے خوفناک نتائج نکلتے ہیں مگر بہت لوگ ہیں جو اس بات کو نہیں سمجھتے حالانکہ اَرواح کا بھی آپس میں تعلق ہوتا ہے۔ اور جب تک اُن کا تعلق جائز اور صحیح طور پر نہ ہو خراب نتیجہ نکلتا ہے اور خواہ کتنی کوشش کی جائے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوتا۔ دیکھو ایک طالب علم ایک استاد سے کچھ نہیں سیکھ سکتا لیکن دوسرے اُستاد سے بہت کچھ سیکھ لیتا ہے۔ ایک افسر کے ماتحت ایک شخص اچھی طرح کام نہیں کرتا لیکن دوسرے افسر کے ماتحت وہی شخص خوب عمدگی سے کام کرتا ہے۔ ایک تاجر کو اگر دوسرے تاجر سے ملا دیا جائے تو اُن کا ملنا نقصان کا موجب ہوتا ہے۔ لیکن ایک اَور کے ساتھ ملنے سے اُس کی تجارت خوب ترقی کر جاتی ہے۔

پس اَرواح کا بھی آپس میں تعلق ہوتا ہے مگر یہ تعلق خدا ہی پیدا کرتا ہے۔ جو دو طرح ہوتا ہے یا تو اِس طرح کہ ایسی رُوح کے متعلق دنیا میں خدا تعالیٰ کی طرف سے اعلان کر دیا جاتا ہے کہ اِس سے تعلق رکھنے والے روحانی فائدہ اُٹھائیں گے اور یا ایسا ہوتا ہے کہ اعلان تو نہیں ہوتا ہاں انسان اپنی کوشش اور سعی سے اس کو دریافت کر لیتا ہے پہلی شق میں مامورین اور اُن کے خلفاء شامل ہیں اور دوسری شق میں غیر مامور اور اُن کے خلفاء داخل ہیں۔ جب اُن سے تعلق ہو تب روحانی طور پر نیک نتائج نکلتے ہیں ورنہ نہیں۔ پہلی قسم کی ارواح کے متعلق تو چونکہ خدا تعالیٰ کی طرف سے اعلان ہو جاتا ہے اِس لئے اُن کی تلاش میں کوئی دِقّت پیش نہیں آتی لیکن دوسری قسم کی ارواح کے متعلق عقل اور فراست سے جستجو کرنا ضروری ہوتا ہے اور اگر کوئی شخص ان کے لئے کامل جستجو نہیں کرتا اور اُن سے تعلق نہیں رکھتا تو دوسرے لوگوں سے خواہ وہ بیس بیس سال بھی تعلق رکھے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔

پس روحانی تعلقات کی طرف توجہ دلانے کیلئے اِس سورۃ کو مرد و عورت کے تعلقات سے شروع کیا گیا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ زانیہ عورت اور زانی مرد میں سے ہر ایک کو سَو سَو کوڑے لگاؤ۔ اور اس حکم الٰہی کو سرانجام دینے کے سلسلہ میں تمہارے دل میں کوئی نرمی پیدا نہ ہو بلکہ سزا دیتے وقت کچھ اَور مومنوں کو بھی بُلا لیا کرو۔

قرآن کریم کی اِس آیت سے بالبداہت ثابت ہے کہ

زانی مرد اور زانیہ عورت کی سزا ایک سو کوڑے ہیں۔ اور سورۂ نساء رکوع ۴ میں آتا ہے کہ یہ سزا اُن عورتوں اور مردوں کے لئے ہے جو آزاد ہوں۔ جو عورتیں آزاد نہ ہوں اُنکی سزا بدکاری کی صورت میں نصف ہے یعنی پچاس کوڑے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ فَاِذَآ اُحْصِنَّ فَاِنْ اَتَيْنَ بِفَاحِشَةٍ فَعَلَيْهِنَّ نِصْفُ مَا عَلَى الْمُحْصَنٰتِ مِنَ الْعَذَابِ (نساء ع ۴) یعنی جب وہ عورتیں جو آزاد نہ ہوں دو مردوں کے نکاح میں آجائیں تو اگر وہ کسی قسم کی بے حیائی کی مرتکب ہوں تو اُن کی سزا آزاد عورتوں کی نسبت نصف ہوگی۔ اس آیت سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ مقررہ سزا ایسی ہے جو نصف ہو سکتی ہے۔ اور سَو کوڑوں کی نصف سزا پچاس کوڑے بن جاتی ہے۔ لیکن بعض لوگ اس آیت کے متعلق یہ بیان کرتے ہیں کہ یہ سزا بعد میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے رجم کی شکل میں بدل دی تھی۔ یعنی آپ نے یہ حکم دیا تھا کہ بجائے اِس کے کہ کوڑے مارے جائیں رجم کرنا چاہیئے۔ لیکن ظاہر ہے کہ اگر یہ معنے کئے جائیں تو نہ صرف محولہ بالا آیت خود ہی منسوخ ہو جاتی ہے۔ بلکہ سورۂ نساء کی آیت بھی بالکل بے معنی ہو جاتی ہے کیونکہ اس میں صاف بتایا گیا ہے کہ لونڈی کی سزا آدھی ہے اور رجم کا آدھا قیاس میں بھی نہیں آسکتا۔ پس اس آیت کی صریح اور واضح مفہوم کے ہوتے ہوئے اور سورۃ نساء کی آیت کی تصدیق کی موجودگی میں یہ بات بغیر کسی شک اور شبہ کے کہی جا سکتی ہے کہ قرآن کریم میں زنا کی سزا آزاد عورت اور مرد کے لئے سَو کوڑے ہیں اور لونڈی یا قیدی کے لئے پچاس کوڑے ہیں۔

اب رہا یہ سوال کہ رجم کا دستور مسلمانوں میں کس طرح پڑا؛ سو اس بارہ میں یاد رکھنا چاہیئے کہ احادیث سے یہ امر ثابت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بدکار عورت اور مرد کے متعلق رجم کا حکم دیا۔ پس اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مسلمانوں میں کبھی نہ کبھی اور کسی نہ کسی صورت میں رجم کا حکم یقیناً تھا۔ سوال صرف یہ رہ جاتا ہے کہ آیا رجم نے کوڑے مارنے کے حکم کو منسوخ کیا یا کوڑے مارنے کے حکم نے رجم کے حکم کو منسوخ کیا۔ یا یہ دونوں حکم ایک وقت میں موجود تھے اگر یہ تسلیم کیا جائے کہ اس حکم کے متعلق ناسخ اور منسوخ کا قاعدہ استعمال ہوا ہے تو ہمارے اپنے عقیدہ کے رُو سے تو معاملہ بالکل صاف ہو جاتا ہے۔ کیونکہ ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ کوئی منسوخ حکم قرآن کریم میں موجود نہیں۔ قرآن کریم میں جتنے احکام موجود ہیں وہ سب غیر منسوخ ہیں۔ اس عقیدہ کے رُو سے ہم یہ تو کہہ سکتے ہیں کہ اگر رجم کا کوئی حکم تھا۔ تو اس آیت کے نازل ہونے سے پہلے تھا اور اس آیت نے اُسے منسوخ کر دیا لیکن ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ کوئی اور حکم بعد میں نازل ہوا اور اُس نے اِس حکم کو منسوخ کر دیا۔ اور اگر کوئی حدیث اس کے خلاف ہے تو وہ مردود ہے کیونکہ وہ قرآن شریف کو ردّ کرتی ہے۔ نیز اگر یہ آیت منسوخ ہو گئی ہوتی تو پھر یہ قرآن سے نکال دی جاتی۔ یہ جو بعض فقہاء نے مسئلہ بنایا ہوا ہے کہ بعض آیتیں ایسی ہیں کہ تلاوتاً قائم ہیں اور حکماً منسوخ ہیں یہ نہایت ہی خلافِ عقل۔ خلافِ دلیل اور خلافِ آدابِ قرآنی ہے۔ ہم اس مسئلہ کو ہرگز تسلیم نہیں کرتے۔ ہمارے نزدیک اگر منسوخ آیتیں قرآن کریم میں موجود ہیں تو پھر سارے قرآن کا اعتبار اُٹھ جاتا ہے۔ اِس صورت میں ہمارے پاس کیا دلیل رہ جاتی ہے کہ ہم فلاں آیت پر عمل کریں اور فلاں پر نہ کریں۔ قرآن کریم کی سب سے بڑی عظمت تو یہی ہے کہ وہ ایک یقینی بنیاد پر قائم ہے اور اس کا ایک ایک لفظ یقینی ہے۔ اگر اس کے احکام کو بلکہ اس کی آیات کے قابلِ عمل ہونے کو ہم علماء اور فقہاء کے قیاس کے ساتھ وابستہ کر دیں تو پھر تو وہ ایسا ہی مشکوک اور مبہم ہو جاتا ہے جیسا کہ علماء کے قیاس ہوتے ہیں۔ اگر یہ بات ہو تو ہمارا حق ہے کہ جس طرح ہم علماء کے قیاسات کو دلیل کے ساتھ ردّ کر سکتے ہیں قرآن کریم کی آیتوں

کو بھی ہم دلیل کے ساتھ رد کر دیں ساعد یہ ایک نہایت ہی گمراہ کن اور غیر اسلامی عقیدہ ہوگا۔ پس صرف یہ صورت رہ جاتی ہے کہ ہم کہیں کہ رجم کا کوئی حکم پہلے موجود تھا۔ جسے قرآن کریم کی اس آیت نے منسوخ کر دیا۔ اگر یہ بات مانی جائے تو سارا مسئلہ ہی صاف ہو جاتا ہے اور شکل یہ بنتی ہے کہ یہود میں رجم کا حکم موجود تھا (دیکھو یوحنا باب ۸ آیت ۵ و حزقی ایل باب ۱۶ آیت ۴۰ و احبار باب ۲۰ آیت ۱۰ واستثناء باب ۲۲ آیت ۲۲) رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حکم کے ماتحت مسلمانوں میں بھی یہی طریق جاری کیا کیونکہ اُس وقت تک قرآن کریم نے کوئی فیصلہ نہیں کیا تھا۔ جب قرآن کریم نے فیصلہ کر دیا تو پہلا طریق منسوخ ہو گیا جو قرآنی حکم نہیں تھا بلکہ اتباع یہود میں ایک اسلامی دستور قائم ہوا تھا۔ مگر اس عقیدہ کے ماننے کیلئے ضروری ہے کہ تاریخی طور پر یہ ثابت کیا جائے کہ رجم پر مسلمانوں کا عمل سو کوڑے مارنے کے عمل سے پہلے تھا لیکن تاریخ سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی۔ بلکہ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ رجم کرنے کا طریق مسلمانوں میں بعد میں بھی جاری رہا اور حضرت عمرؓ کے متعلق تو یہاں تک بیان کیا جاتا ہے کہ انہوں نے کہا کہ قرآن کریم میں رجم کی ایک آیت تھی جو کہ بعد میں غائب ہو گئی۔ اور وہ اس کے الفاظ یہ بتاتے ہیں کہ اَلشَّیْخُ وَالشَّیْخَۃُ اِذَا زَنَیَا فَارْجُمُوْھُمَا اَلْبَتَّۃَ۔ (کشف الغمۃ جلد ۲ ملاا) ایک بڑی عمر والا مرد یا ایک بڑی عمر والی عورت جب زنا کریں تو انکو پتھر مار کر کلّی طور پر قتل کر دو۔

اسی طرح حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ لَقَدْ نَزَلَتْ اٰیَۃُ الرَّجْمِ وَ الرَّضَاعَۃِ فَکَانَتَا فِیْ صَحِیْفَۃٍ تَحْتَ سَرِیْرِیْ فَلَمَّا مَاتَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَتَشَاغَلْنَا بِمَوْتِہٖ فَدَخَلَ دَاجِنٌ فَاَکَلَھَا۔ (محلّی ابن حزم جلد ۱۱ ص۲۳۶) یعنی رجم اور رضاعت کا حکم اللہ تعالٰی کی طرف سے نازل ہوا تھا۔ اور وہ ایک کاغذ پر لکھا ہوا تھا اور میرے تکیہ کے نیچے پڑا تھا۔ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فوت ہوئے تو ہم آپ کے کفن دفن میں مشغول ہو گئے۔ اتنے میں ایک بکری آئی اور وہ اُس کاغذ کو کھا گئی۔

ان روایات سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے نزدیک اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے نزدیک کوئی آیت اُتری تھی جس میں زانی کو رجم کرنے کا حکم تھا حضرت عائشہؓ کی روایت سے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ حکم آپ کے تکیہ کے نیچے رکھا ہوا تھا اور ایک بکری اُس کو کھا گئی۔ اور حضرت عمرؓ اس کے متعلق خاموش ہیں۔ اگر ان سے کوئی روایت ثابت ہے تو صرف یہ کہ کَانَ عُمَرُ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ یَقُوْلُ اِیَّاکُمْ اَنْ تَھْلِکُوْا فَیَقُوْلَ قَائِلٌ لَا نَجِدُ الرَّجْمَ فِیْ کِتَابِ اللّٰہِ عَزَّوَجَلَّ فَقَدْ رَجَمَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَ رَجَمْنَا بَعْدَہٗ وَاِنِّیْ وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِہٖ لَوْلَا اَنْ یَّقُوْلَ قَائِلٌ اَحْدَثَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ فِیْ کِتَابِ اللّٰہِ تَعَالٰی لَکَتَبْتُھَا (کشف الغمہ جلد ۲ ملاا)۔ وَفِیْ رِوَایَۃٍ لَکَتَبْتُھَا عَلٰی حَاشِیَۃِ الْمُصْحَفِ (فتح القدیر شرح ہدایہ جلد ۴ ملاا) یعنی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کہا کرتے تھے کہ ایسا نہ ہو تم لوگوں کے مرنے کے بعد کوئی شخص یہ کہنے لگ جائے کہ ہم کو تو خدا کی کتاب میں رجم کا مسئلہ نہیں ملتا کیونکہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے بھی رجم کیا ہے اور ہم نے بھی آپ کے بعد رجم کیا ہے۔ اور مجھے خدا کی قسم اگر مجھے یہ ڈر نہ ہوتا کہ کوئی شخص یہ اعتراض کر دیگا کہ عمرؓ نے خدا کی کتاب میں اپنے پاس سے زیادتی کر دی ہے تو میں یہ حکم بھی لکھ دیتا۔ اور ایک روایت میں آیا ہے کہ میں یہ حکم قرآن کریم کے حاشیہ پر لکھ دیتا۔ چونکہ یہ ایک عقلی اور نقلی مسلّمہ اصول ہے کہ کسی روایت کی زیادتی اس کے معنوں کی اصل تشریح ہوتی ہے اسلئے ہمیں یہ ماننا پڑے گا کہ درحقیقت

یہی زیادہ معتبر قول ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ خیال ظاہر کیا کہ میں قرآن کے حاشیے پر یہ عبارت لکھ دیتا۔ اور قرآن کے حاشیہ پر اگر کوئی چیز لکھی ہوئی ہو تو وہ قرآن نہیں بن جاتی پس حضرت عمر رضی اللہ عنہ جو اس روایت کے مطابق اس کو حکم الٰہی سمجھتے تھے وہ بھی یہ جرأت نہیں کر سکے کہ اس کو قرآن کریم میں داخل کردیں۔ حالانکہ اُسوقت قرآنی وحی کے بہت سے کاتب موجود تھے اور وہ اُن سے پوچھ سکتے تھے لیکن اُن سے نہ پوچھنا بھی بتاتا ہے کہ حضرت عمرؓ کو یقین تھا کہ میرا یہ خیال صرف ایک وہم ہے حقیقت یہ ہے کہ قرآن کریم کی جو آیتیں اُترتی تھیں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کاتب وحی کو بلوا کر وہ آیت اسجگہ پر لکھوا دیتے تھے جہاں اس آیت کا لکھوایا جانا ضروری ہوتا تھا۔ اگر یہ قرآن کی آیت ہوتی اور واقعہ میں یہ خدائی حکم ہوتا تو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم اسے کیوں نہ لکھواتے۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے کاتب وحی حضرت زید بن ثابتؓ سے یہی روایت تفصیل کے ساتھ مذکور ہے اور اس سے صاف ثابت ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے اِس حکم کو جس شکل میں بھی تھا قرآن کریم کا حکم قرار نہیں دیا۔ اُن کی روایت یہ ہے کہ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ اِذَا زَنَی الشَّیْخُ وَالشَّیْخَۃُ فَارْجُمُوْھُمَا اَلْبَتَّۃَ (محلّی ابن حزم جلد ۱۱ صفحہ ۲۳۵) یعنی میں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سُنا کہ جب کوئی بڑی عمر کا مرد یا بڑی عمر کی عورت زنا کریں تو ان کو رجم کرکے مار دو۔ ان الفاظ سے ثابت ہے کہ حضرت زید بن ثابتؓ نے اسکو کبھی وحیٔ قرآنی قرار نہیں دیا۔ بلکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا قول قرار دیا ہے۔ ممکن ہے حضرت عمر نے بھی یہی سُنا ہو لیکن انہوں نے بجائے قول کے اس کو وحی سمجھ لیا ہو اور حضرت عمرؓ ایسی غلطیاں جلد بازی میں کر لیا کرتے تھے چنانچہ وہ خود روایت کرتے ہیں کہ میں نے ایک دفعہ نماز میں ہشام بن حکیمؓ کو سورۂ فرقان پڑھتے سُنا مگر وہ اِس

سورۃ کو اُس طرح نہیں پڑھ رہے تھے جس طرح میں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو پڑھتے سُنا تھا۔ اِسپر مجھے سخت غصہ آیا اور قریب تھا کہ میں نماز میں ہی اُن پر حملہ کر دیتا مگر میں نے صبر کیا۔ جب انہوں نے سلام پھیرا تو میں نے اُن کی چادر پکڑ لی اور اُن سے کہا کہ اس سورۃ کو اِس طرح پڑھنا آپ کو کس نے سکھایا ہے۔ انہوں نے کہا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے۔ میں نے کہا تم جھوٹ بولتے ہو۔ چلو میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے تمہارا معاملہ پیش کرتا ہوں۔ اصل سورۃ اَور طرح ہے۔ اور تم اَور طرح پڑھ رہے ہو۔ چنانچہ وہ انہیں کھینچ کر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لے گئے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ہشام تم کس طرح پڑھ رہے تھے۔ انہوں نے پڑھ کر سُنایا تو فرمایا ٹھیک ہے۔ پھر آپؐ نے حضرت عمرؓ سے فرمایا کہ تم پڑھو۔ انہوں نے یہ سورۃ اس طرح پڑھی جس طرح رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں سکھائی تھی آپؐ نے فرمایا یہ بھی ٹھیک ہے۔ پھر آپ نے فرمایا۔ قرآن کریم سات قرأتوں میں نازل کیا گیا ہے۔ اس لئے تم ان معمولی معمولی باتوں پر آپس میں لڑا نہ کرو۔ جس طرح کسی کی زبان پر کوئی لفظ چڑھے اُسی طرح پڑھ لیا کرے۔ معلوم ہوتا ہے جس طرح حضرت عمرؓ سے اسجگہ غلطی ہوئی۔ اِسی طرح زنا کی سزا کے معاملہ میں بھی حضرت عمرؓ سے غلطی ہو گئی۔ اور انہوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک قول کو وحی سمجھ لیا۔ ورنہ فی الواقعہ اگر یہ قرآنی آیت ہوتی تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت زید بن ثابتؓ کو حکم دیتے جیسا کہ آپ اَور آیتوں کے متعلق حکم دیا کرتے تھے کہ یہ قرآن کی وحی ہے اسے قرآن کریم میں فلاں مقام پر درج کرو۔ لیکن حضرت زید بن ثابتؓ نے اس کو قرآن کریم میں درج نہیں کیا جس کا نسخہ حضرت ابوبکرؓ کے زمانہ میں تیار ہو گیا تھا یعنی حضرت عمرؓ کے خلیفہ ہونے سے پہلے۔ پس صاف ثابت ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ کو غلطی لگی تھی۔ اور

انہوں نے ایک قول کو وحی سمجھ لیا تھا۔ بہرحال اس روایت سے قطعی طور پر ثابت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی کوئی ایسا فقرہ تو کہا ہے۔ مگر یہ نہیں کہا کہ یہ قرآن کریم کی آیت ہے۔ بالکل ممکن ہے کہ آپ نے اس قسم کی خواہش کا اظہار کیا ہو کہ اگر ایسے حالات میں یہ فعل ہو تو میرا دل چاہتا ہے کہ ایسے آدمی کو بائیبل کے احکام کے مطابق رجم کر دیا جائے۔ اِسی طرح شعبہؓ کی روایت ہے کہ قَالَ عُمَرُ لَمَّا نَزَلَتْ اَتَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَيْہِ وَسَلَّمَ فَقُلْتُ اَكْتُبْنِيْهَا قَالَ شُعْبَةُ كَاَنَّهٗ ذَكَرَ ذٰلِكَ فَقَالَ عُمَرُ اَلَا تَرٰى اَنَّ الشَّيْخَ اِذَا لَمْ يُحْصِنْ جُلِدَ وَاَنَّ الشَّابَّ اِذَا زَنٰى وَقَدْ اَحْصَنَ رُجِمَ (محلّی ابن حزم جلد ۱۱ ص ۲۳۵) یعنی شعبہؓ کہتے ہیں۔ ایک دفعہ حضرت عمرؓ نے بیان کیا کہ جب رجم کا حکم نازل ہوا تو میں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس گیا اور آپؐ کو کہا کہ مجھے یہ حکم لکھ دیجیئے لیکن رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کے اس سوال کو پسند نہیں فرمایا۔ اور آپکو یہ حکم لکھ کر نہیں دیا۔ اس پر حضرت عمرؓ نے کہا یا رسول اللہ! کیا آپ کا یہ خیال نہیں کہ جب شیخ یعنی بڑی عمر کا آدمی جو شادی شدہ نہ ہو زنا کرے تو اس کو کوڑے لگائے جائیں اور جب جوان زنا کرے اور وہ شادی شدہ ہو تو اُسے رجم کیا جائے۔ اِس روایت سے ثابت ہے کہ حضرت عمرؓ کے نزدیک ایسی کوئی آیت اُتری تھی اور اِسی بناء پر انہوں نے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ وہ یہ آیت آپ کو لکھ دیں مگر آپؐ نے اس کو پسند نہیں کیا اور انکار کیا۔ اس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ یہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی قول تھا آیت نہیں تھی۔ ورنہ کیا یہ ممکن تھا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم وحیٔ قرآنی کو چھپاتے۔ قرآن تو کہتا ہے کہ يٰۤاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ (مائدہ ع ۱۰) یعنی اے ہمارے رسول! تیرے رب کی طرف سے جو کلام تجھ پر اُتارا گیا ہے تُو اُسے لوگوں تک پہنچا۔ اور اگر تُو نے ایسا نہ کیا تو گویا تُو نے اُس کا پیغام بالکل نہ پہنچایا۔ مگر اس کے باوجود آپ خود بھی یہ حکم لوگوں تک نہیں پہنچاتے بلکہ حضرت عمرؓ کے پوچھنے پر بھی اُن کی بات کو ناپسند کرتے ہیں اور یہ حکم لکھ کر نہیں دیتے اِس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک قول تھا۔ اور حدیثوں سے ثابت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم قرآن کریم تو تعہد کے ساتھ لکھواتے تھے لیکن حدیث کے لکھنے سے منع فرمایا کرتے تھے۔ چنانچہ حضرت زید بن ثابتؓ کی ہی روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں حدیثیں لکھنے سے منع فرمایا کرتے تھے۔ (مسند احمد بن حنبل جلد ۵ ص ۱۸۲) اِسی طرح حضرت ابوسعیدؓ فرماتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں ہدایت دی تھی کہ سوائے قرآن کریم کے ہم کوئی اور بات نہ لکھا کریں تا ایسا نہ ہو کہ قرآنی آیات کے متعلق لوگوں کو شبہ پڑ جائے (مسند احمد بن حنبل جلد ۳ ص ۱۲) حضرت عبداللہ بن عمروؓ کے متعلق بھی احادیث سے ثابت ہے کہ چونکہ انہیں لکھنا آتا تھا اس لئے وہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث لکھا کرتے تھے۔ مگر بعد میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں حدیثیں لکھنے سے منع فرما دیا۔ پس حضرت عمرؓ کا اِس کو آیت سمجھنا مگر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اِس کو لکھ کر دینے سے انکار کرنا بلکہ اس کو ناپسند کرنا بتاتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس کو آیت نہیں قرار دیتے تھے بلکہ محض اپنا خیال سمجھتے تھے۔ اور عام باتوں کے لکھنے سے چونکہ آپ منع فرماتے تھے اِس لئے آپ نے کچھ لکھ کر نہیں دیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے تورات میں سے رجم کا حکم دیکھا ہو گا۔ جسے انہوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے بھی پیش کر دیا۔ کیونکہ احادیث سے ثابت ہے کہ آپ تورات پڑھا کرتے تھے۔ چنانچہ حدیثوں میں آتا ہے کہ

حضرت عمرؓ ایک دفعہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس تورات کا ایک نسخہ لے کر آئے اور کہنے لگے کہ یا رسول اللہ! یہ تورات ہے۔ آپؐ انکی بات سن کر خاموش ہو گئے۔ مگر حضرت عمرؓ نے تورات کھول کر اُسے پڑھنا شروع کر دیا۔ اس پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرہ پر ناپسندیدگی کے آثار ظاہر ہوئے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے یہ بات دیکھی تو وہ حضرت عمرؓ پر ناراض ہوئے اور انہوں نے کہا۔ کیا تمہیں نظر نہیں آتا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اسے بُرا منا رہے ہیں۔ اُن کی بات سُن کر حضرت عمرؓ کو بھی توجہ پیدا ہوئی اور انہوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرہ کو دیکھا اور جب انہیں بھی آپ کے چہرہ پر ناراضگی کے آثار دکھائی دیئے تو انہوں نے معذرت کی اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے معافی طلب کی (مشکوٰۃ کتاب الاعتصام بالکتاب والسنۃ) پھر یہ امر بھی روایتوں سے ثابت ہے کہ یہودیوں کے ہاں جب تورات کا درس ہُوا کرتا تھا تو حضرت عمرؓ اس میں اکثر شریک ہُوا کرتے تھے اور یہودی کہا کرتے تھے کہ تمہارے ہم مذہبوں میں سے ہم تم کو سب سے زیادہ عزیز رکھتے ہیں کیونکہ تم ہمارے پاس آتے جاتے ہو (کنز العمال بروایت بیہقی جلد اوّل ص۲۲۳) معلوم ہوتا ہے حضرت عمرؓ نے تورات سے ہی رجم کا حکم دیکھا تھا جسے انہوں نے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے سامنے بھی پیش کر دیا۔

پھر اس حدیث کا آخری ٹکڑہ بھی بتاتا ہے کہ خود حضرت عمرؓ کو بھی شبہ تھا کہ یہ آیت ہے یا نہیں کیونکہ خود حضرت عمرؓ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کرتے ہیں کہ یا رسول اللہ! کیا آپ کا یہ خیال نہیں کہ بڑی عمر کا آدمی جو شادی شدہ نہ ہو اگر بدکاری کرے تو اس کو کوڑے لگائے جائیں اور جوان اگر شادی شدہ ہو اور وہ بدکاری کرے تو اس کو رجم کیا جائے۔ اب یہ خیال اس خیالی آیت کے بالکل خلاف ہے جو اوپر بیان ہوئی ہے۔ اس خیالی آیت کے معنے یہ ہیں کہ جب کوئی بوڑھا مرد یا بوڑھی عورت زنا کرے (قطع نظر اس کے کہ وہ شادی شدہ ہوں یا نہ ہوں) تو اُن کو رجم کر دو۔ اگر واقعہ میں حضرت عمرؓ بھی اس کو قرآنی آیت سمجھتے تو وہ اس کے خلاف اظہار رائے کیوں کرتے۔ اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کی تصدیق کیوں چاہتے جب انکی مزعومہ قرآنی آیت میں بوڑھے مرد اور بوڑھی عورت کا ذکر تھا تو انہوں نے یہ کیوں کہا کہ بڑی عمر کا آدمی جو شادی شدہ نہ ہو اگر بدکاری کرے تو اس کو کوڑے لگائے جائیں اور جوان شادی شدہ اگر بدکاری کرے تو اس کو رجم کیا جائے۔ یہ بات بتاتی ہے کہ خود حضرت عمرؓ کو بھی یہ شبہ تھا کہ یہ قرآنی آیت ہے یا نہیں۔

پُرانے علماء میں سے بھی ایک حصّہ ایسا ہے جو اِس بات کا قائل ہے کہ جَلْدُ مِائَةٍ ہی اصل حکم ہے رجم قرآن کریم سے ثابت نہیں۔ چنانچہ امام ابن حزم سورۂ نساء کی آیت پر بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔ اِنَّ الْاِحْصَانَ اِسْمٌ یَقَعُ عَلَی الْحُرَّةِ الْمُطْلَقَةِ فقط۔ فَلَوْ کَانَ هٰذَا کَمَا قَالُوْا فَالنَّفْیُ وَاجِبٌ عَلَی الْاِمَاءِ الْمُحْصَنَاتِ مِنْ هٰذِهِ الْاٰیَةِ لِاَنَّ مَعْنَی الْاٰیَةِ فَعَلَیْهِنَّ نِصْفُ مَا عَلَی الْحَرَائِرِ مِنَ الْعَذَابِ وَعَلَی الْحَرَائِرِ هُنَا مِنَ الْعَذَابِ جَلْدُ مِائَةٍ وَمَعَهُ نَفْیُ سَنَةٍ اَوْ رَجْمٌ۔ وَالرَّجْمُ لَا یَنْتَصِفُ اَصْلًا لِاَنَّهٗ مَوْتٌ وَالْمَوْتُ لَا نِصْفَ لَهٗ اَصْلًا۔ وَکَذٰلِکَ الرَّجْمُ لِاَنَّهٗ قَدْ یَمُوْتُ الْمَرْجُوْمُ مِنْ رَمْیَةٍ وَاحِدَةٍ وَقَدْ لَا یَمُوْتُ مِنْ اَلْفِ رَمْیَةٍ وَمَا کَانَ هٰکَذَا فَلَا یُمْکِنُ ضَبْطُ نِصْفِهٖ اَبَدًا وَاِذَا لَا یُمْکِنُ هٰذَا فَقَدْ اَمِنَّا اَنْ یُکَلِّفَنَا اللّٰهُ تَعَالٰی مَا لَا نُطِیْقُ بِقَوْلِهٖ تَعَالٰی لَا یُکَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا وَلِقَوْلِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِذَا اَمَرْتُکُمْ بِشَیْءٍ فَاْتُوْا مِنْهُ مَا اسْتَطَعْتُمْ اَوْ کَمَا قَالَ عَلَیْهِ السَّلَامُ فَسَقَطَ الرَّجْمُ وَبَقِیَ الْجَلْدُ وَنَفْیُ سَنَةٍ وَکِلَاهُمَا لَهٗ نِصْفٌ فَعَلَی الْاَمَةِ

نِصْفُ مَا عَلَى الْحُرَّةِ مِنْهَا (محلّٰی ابن حزم جلد ۱۱ صفحہ ۲۳۴ و ۲۳۸)
یعنی احصان کا لفظ خالص آزاد عورت پر بولا جاتا ہے۔ پس اگر لونڈیوں کی سزا آزاد عورتوں کی سزا سے نصف ہے تو لونڈیوں پر بھی جلاوطنی واجب ہوگی۔ کیونکہ اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ آزاد عورتوں کو جو عذاب دیا جائیگا اس سے نصف لونڈیوں کو دیا جائیگا۔ اور آزاد عورتوں کے لئے جو عذاب بیان کیا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ ان کو سو کوڑے مارے جائیں اور ایک سال کے لئے جلاوطن کیا جائے۔ یا بقول بعض کے رجم کیا جائے اور رجم کسی صورت میں بھی آدھا نہیں ہو سکتا کیونکہ رجم درحقیقت موت کے ہم معنی ہے اور موت کو کسی صورت میں بھی آدھا نہیں کیا جاسکتا۔ اسی طرح رجم کو بھی کسی صورت میں آدھا نہیں کیا جاسکتا کیونکہ جس پر پتھر مارے جاتے ہیں کبھی تو وہ ایک پتھر سے ہی مر جاتا ہے اور کبھی ہزار پتھر سے بھی نہیں مرتا۔ پس جو چیز اپنے اختیار میں نہیں اس پر عمل کس طرح کیا جائے۔ ہم کو کسی صورت سے یہ معلوم نہیں ہو سکتا کہ وہ شخص کتنے پتھروں سے مریگا کہ اُس سے آدھے ہم اس کو مار یں اور قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا (بقرۃ ع ۴۰) وہ کوئی ایسا حکم نہیں دیتا جو انسان کی طاقت میں نہ ہو۔ اسی طرح رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ جب میں تم کو کسی بات کا حکم دوں تو اس حکم پر اس حد تک عمل کرو جتنی تمہیں طاقت ہو یا اسی سے ملتے جلتے الفاظ میں آپؐ نے ارشاد فرمایا۔ پس ان الفاظ سے رجم کا حکم ساقط ہو گیا اور کوڑوں والا حکم اور ایک سال کی جلاوطنی کا حکم باقی رہا۔ کیونکہ یہ دونوں حکم ایسے ہیں جن کا نصف ہو سکتا ہے لیکن رجم نصف نہیں ہو سکتا۔

اسی طرح امتِ محمدیہ میں سے معتزلین اور خوارج کا یہ عقیدہ ہے کہ رجم قرآن سے ثابت نہیں۔ اسلامی حکم یہی ہے کہ سو کوڑے لگائے جائیں۔ چنانچہ لکھا ہے کہ اَمَّا الرَّجْمُ فَهُوَ مُجْمَعٌ عَلَيْهِ وَحُكِيَ فِي الْبَحْرِ عَنِ الْخَوَارِجِ اَنَّهُ غَيْرُ وَاجِبٍ وَكَذٰلِكَ حَكَاهُ عَنْهُمْ اَيْضًا ابْنُ الْعَرَبِيِّ وَحَكَاهُ اَيْضًا عَنْ بَعْضِ الْمُعْتَزِلَةِ كَالنَّظَّامِ وَاَصْحَابِهٖ وَلَا مُسْتَنَدَ لَهُمْ اِلَّا اَنَّهٗ لَمْ يُذْكَرْ فِي الْقُرْاٰنِ (نیل الاوطار جلد ۷ صفحہ ۹۱) یعنی نیل الاوطار والا کہتا ہے کہ رجم پر سب مسلمان متفق ہیں لیکن کتاب بحر میں خوارج سے روایت کی گئی ہے کہ رجم ہرگز اسلام میں واجب نہیں اور حضرت محی الدین صاحب ابن عربیؒ جو صوفیاء کے سردار ہیں انہوں نے بھی خوارج کا یہی مذہب بیان کیا ہے اور ابن العربیؒ نے نظّام اور اُن کے ساتھیوں کا مذہب بھی یہ بیان کیا ہے (جو معتزلی تھے) کہ رجم اسلام سے ثابت نہیں۔ لیکن ان لوگوں کے پاس سوائے اس کے کوئی دلیل نہیں کہ قرآن میں اس کا ذکر نہیں۔

اس حوالہ سے ثابت ہے کہ خوارج اور معتزلہ کے نزدیک رجم کا حکم اسلام میں نہیں ہے لیکن نیل الاوطار کے نزدیک یہ دلیل بالکل کمزور ہے کیونکہ یہ دلیل صرف قرآن پر مبنی ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

روح المعانی میں لکھا ہے۔ وَيُعْلَمُ مِنْ قَوْلِهِ الْمَذْكُوْرِ كَرَّمَ اللّٰهُ تَعَالٰى وَجْهَهٗ اَنَّهٗ قَائِلٌ بِعَدَمِ نَسْخِ عُمُوْمِ الْاٰيَةِ فَيَكُوْنُ رَأْيُهٗ اَنَّ الرَّجْمَ حُكْمٌ زَائِدٌ فِيْ حَقِّ الْمُحْصَنِ ثَبَتَ بِالسُّنَّةِ وَبِذٰلِكَ قَالَ اَهْلُ الظَّاهِرِ وَهُوَ رِوَايَةٌ عَنْ اَحْمَدَ وَاسْتَدَلُّوْا عَلٰى ذٰلِكَ بِمَا رَوَاهُ اَبُوْ دَاوٗدَ مِنْ قَوْلِهٖ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلثَّيِّبُ بِالثَّيِّبِ جَلْدُ مِائَةٍ وَرَمْيٌ بِالْحِجَارَةِ وَفِيْ رِوَايَةِ غَيْرِهٖ وَرَجْمٌ بِالْحِجَارَةِ وَعِنْدَ الْحَنَفِيَّةِ لَا يُجْمَعُ بَيْنَ الرَّجْمِ وَالْجَلْدِ فِي الْمُحْصَنِ وَهُوَ قَوْلُ مَالِكٍ وَالشَّافِعِيِّ (روح المعانی جلد ۱۸ صفحہ ۷۷)
یعنی حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے قول سے یہ ثابت ہے کہ وہ یہ مانتے ہیں کہ قرآن کریم کی سورۃ نور والی آیت جس میں کوڑوں کا ذکر ہے منسوخ نہیں۔ پس معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علیؓ کے نزدیک

رجم کا حکم ایک زائد حکم تھا جو سنّت سے ثابت ہے وہ حکم قرآن کو منسوخ کرنے والا نہیں۔ اور اہل ظاہر یعنی ابو داؤدؒ جو فقہاء خمسہ میں سے ایک بڑے رکن ہیں اور امام احمد بن حنبلؒ زیادہ تر اُن کے حکم کو ترجیح دیتے ہیں وہ اور ان سے تعلق رکھنے والے بھی اس مذہب کے قائل ہیں اور امام احمد بن حنبلؒ سے بھی یہی روایت کی گئی ہے۔ اور یہ لوگ ابو داؤدؒ کی اس روایت سے سند پکڑتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اَلثَّیِّبُ بِالثَّیِّبِ جَلْدُ مِائَةٍ وَرَمْیٌ بِالْحِجَارَةِ یعنی شادی شدہ مرد اور شادی شدہ عورت کو سو کوڑے لگائے جائیں اور پتھر مارے جائیں۔

اِس روایت سے حضرت علیؓ کے متعلق بھی یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ اُن کے نزدیک کوڑے مارنے کا حکم قائم ہے اور یہ آیت منسوخ نہیں۔ چنانچہ حضرت علیؓ کے متعلق بخاری میں ایک روایت آتی ہے کہ ایک عورت شرحة الھمدانیہ کو آپ نے کوڑے بھی لگوائے اور رجم بھی کیا اور پھر فرمایا۔ جَلَدْتُهَا بِكِتَابِ اللهِ وَرَجَمْتُهَا بِسُنَّةِ رَسُوْلِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ (بخاری) یعنی میں نے کوڑے تو خدا کے حکم کے مطابق لگائے ہیں۔ اور رجم رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنّت کے مطابق کیا ہے۔ اس سے صاف پتہ لگتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اس آیت کو منسوخ نہیں قرار دیتے تھے۔ حضرت عبادة ابن الصامتؓ کی روایت ہے کہ کنواری سے زنا سرزد ہو جائے تو اس کی سزا میں ایک سال کی جلاوطنی بھی زائد کر دی گئی تھی اور بیاہی ہوئی عورت سے زنا سرزد ہو جائے تو کوڑوں کے علاوہ اس کے لئے رجم کا بھی اضافہ کر دیا گیا تھا (مسلم) اِس سے بھی حضرت علیؓ والے خیال کی تصدیق ہوتی ہے کہ قرآنی آیت منسوخ نہیں بلکہ قرآنی حکم کے ساتھ ایک چیز کا اپنی طرف سے اضافہ کیا گیا تھا پس یہ ایک ثابت شدہ حقیقت ہے کہ قرآنی حکم یہی ہے کہ اگر کسی عورت یا مرد سے زنا صادر ہو جائے تو اس کو سَو کوڑے لگائے جائیں۔ لیکن رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بائبل کی تعلیم کے مطابق اپنے استدلال سے یہودی مذہب کی سزا کو پہلے جاری کیا اس کے بعد چونکہ قرآنی حکم نازل ہو گیا اس لئے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے حکم کو ہم محض عارضی حکم کہیں گے مستقل حکم نہیں کہیں گے کیونکہ مستقل حکم آپ کا وہی ہوتا ہے جس کے متعلق قرآنی حکم موجود نہ ہو۔ اس کا ثبوت اس طرح بھی ملتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے شروع میں قبلہ بھی یہودیوں کے طریق کے مطابق بیت المقدس کو ہی رکھا تھا۔ لیکن جب قرآن کریم میں یہ حکم نازل ہوا کہ خانہ کعبہ کی طرف مُنہ کیا جائے تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بیت اللہ کی طرف مُنہ کر لیا۔ چنانچہ دوسرے پارہ کے شروع میں اس کا ذکر آتا ہے۔ اسی طرح احادیث سے یہ بات ثابت ہے کہ بعض دفعہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم قوم کی اصلاح کے لئے ایک حکم فرما دیا کرتے تھے لیکن وہ دائمی حکم نہیں ہوتا تھا مثلاً بخاری میں ہی آتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک دفعہ وفد عبد القیس آیا اور اس نے کہا یا رسول اللہ ہمیں کوئی خاص ہدایت دیجیئے۔ آپ نے فرمایا۔ فلاں فلاں چار قسم کے برتن استعمال نہ کئے جائیں (بخاری کتاب الایمان باب اداء الخمس من الایمان) لیکن قریباً سب مسلمان آج اُن برتنوں کو استعمال کرتے ہیں اور سب فقہاء کہتے ہیں کہ یہ برتن جائز ہیں اور اس کی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ اُن لوگوں میں رواج تھا کہ اس قسم کے برتنوں میں وہ شراب بناتے تھے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کی اس عادت کو چھڑانے کے لئے حکم دیدیا کہ یہ برتن استعمال نہ کیا کرو۔ ان برتنوں کے استعمال نہ کرنے کی وجہ سے شراب بنانے کی عادت اُن میں سے جاتی رہی اور بعد میں تمام مسلمانوں کے اتفاق کے مطابق یہ حکم غیر ضروری ہو گیا۔ اور اس قسم کے برتنوں کا استعمال سب مسلمانوں کیلئے جائز ہو گیا۔

حدیثوں سے یہ بات ثابت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے رجم کا حکم محض یہودی احکام کی اتباع میں دیا تھا۔ چنانچہ ایک روایت میں یہ الفاظ آتے ہیں کہ اَللّٰھُمَّ

اِنِّیْ اَوَّلُ مَنْ اَحْیَا اَمْرَكَ اِذْ اَمَاتُوْهُ فَاَمَرَ بِهٖ فَرُجِمَ (مسلم جلد۲ - کتاب الحدود) یعنی جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ایک دفعہ یہود نے یہ اقرار کیا کہ اس میں تو ہمارے ہاں رجم کا ہی حکم ہے مگر بڑے لوگوں کو خوش کرنے کے لئے ہم نے رجم کا طریق ترک کر دیا ہے تو آپ نے وہ بات فرمائی جو ہم نے اوپر درج کی ہے اور جس کا ترجمہ یہ ہے کہ اے اللہ! مَیں اس زمانہ میں پہلا شخص ہوں جس نے تیرے اس حکم کو جو تو نے یہودیوں کو دیا تھا زندہ کر دیا ہے حالانکہ خود یہودی جن کو یہ حکم دیا گیا تھا انہوں نے اس حکم کو ترک کر دیا ہے - اس کے بعد آپ نے اُس مجرم کو جو آپ کے سامنے لایا گیا تھا رجم کی سزا دی - اس سے ثابت ہوتا ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے رجم کی سزا محض بائیبل کی اتباع میں دی تھی - چنانچہ احادیث میں بیان شدہ ایک اور واقعہ بھی اس کی تصدیق کرتا ہے - حدیث میں آتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک شخص آیا اور اُس نے کہا - یا رسول اللہ! مَیں نے زنا کیا ہے - رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس کی یہ بات سُنکر غصہ سے اُسکی طرف سے مُنہ پھیر لیا - مگر وہ بار بار چکر کاٹ کر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہی کہتا رہا کہ یا رسول اللہ مَیں نے زنا کیا ہے - جب وہ چار دفعہ اقرار کر چکا تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا - کیا تو پاگل ہے؟ اُس نے کہا یا رسول اللہ! نہیں - آپ نے فرمایا کہ اچھا اسے سنگسار کر دیا جائے - صحابہؓ کہتے ہیں کہ ہم اسے باہر لے گئے لیکن جب ہم نے اُسے پتھر مارنے شروع کئے تو وہ بھاگا - ہم اُس کے پیچھے پیچھے دوڑے اور اُسے پکڑ کر مار ڈالا - جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ بات پہنچی - تو آپ نے اس پر ناراضگی کا اظہار کیا اور فرمایا کہ اُس کا بھاگنا ہی اپنے اقرار سے رجوع کرنا تھا - پھر تم نے اُسے کیوں نہ چھوڑ دیا - یہ حدیث بھی بتاتی ہے کہ رجم کا حکم خدا تعالیٰ کی طرف سے نہیں تھا - ورنہ یہ کس طرح ہو سکتا تھا کہ خدا تعالیٰ تو یہ کہتا کہ رجم کرو - اور رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم اس کے اُلٹ اپنے صحابہؓ سے یہ فرماتے کہ جب وہ بھاگا تھا تو تم نے اُسے چھوڑ کیوں نہ دیا - اگر رجم کا حکم خدا تعالیٰ کی طرف سے ہوتا تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم یہ کس طرح کہہ سکتے تھے کہ تم نے اُسے مارا کیوں؟

اسجگہ ایک لطیفہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے اور وہ یہ کہ مفسّرین حضرت ایوبؑ کے ذکر میں لکھتے ہیں کہ جب وہ شدید بیمار ہو گئے تو شیطان نے اُن کی بیوی کو ورغلایا اور اُسے ایک بکری کا بچہ دیکر کہا کہ اگر ایوبؑ میرے نام پر اسکو ذبح کر دیں تو یہ اچھے ہو جائیں گے - بیوی نے حضرت ایوبؑ سے اس کا ذکر کیا - تو انہوں نے اُسے ڈانٹا اور کہا کہ یہ تو خدا کا دشمن ہے تم اس کے فریب میں کیوں آئیں؟ اور پھر قسم کھائی کہ اگر اللہ تعالیٰ نے مجھے شفا دی تو مَیں اپنی بیوی کو اس غلطی پر اُسے سو کوڑوں کی سزا دونگا - مگر جب اچھے ہو گئے تو حضرت ایوبؑ نے اپنی قسم کو اس طرح پُورا کیا کہ سَو تیلیاں اکٹھی کر کے اُن کو ماردیں (تفسیر خازن) اگر یہ روایتیں درست ہیں تو پھر زانی اور زانیہ کو بھی حضرت ایوبؑ کی طرح ایک جھاڑو اٹھا کر مار دینا چاہیئے جس میں سو تیلیاں ہوں اور سمجھ لینا چاہیئے کہ سزا پوری ہو گئی - اور جب سو کوڑے بھی نہ رہے بلکہ ایک جھاڑو مار دینا بھی جائز ہو گیا تو رجم کہاں باقی رہا - بے شک ہم مفسّرین کی ان روایات سے متفق نہیں لیکن جو علماء اس قسم کی روایات کو تسلیم کرتے ہیں اُن پر واقعۂ ایوبؑ بھی ایک حجّت ہے کیونکہ جب وہاں وہ یہ تسلیم کرتے ہیں کہ حضرت ایوبؑ نے سو کوڑوں کی بجائے سَو تیلیاں مار کر قسم پوری کر لی تو پھر یہاں بھی رجم پر کیوں زور دیتے ہیں - یہاں بھی انہیں چاہیئے کہ سَو تیلیوں والا جھاڑو اٹھا کر زانیہ اور زانی کو ایک دفعہ مار دیں اور سمجھ لیں کہ سزا پوری ہو گئی -

بہرحال رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا بعض لوگوں کو رجم کرنا محض یہودی تعلیم کی اتباع میں تھا۔ لیکن اس کے بعد جب قرآن کریم میں واضح حکم آگیا تو پہلا حکم بھی بدل گیا اور وہی حکم آج بھی موجود ہے جو قرآن کریم میں بیان ہؤا ہے یعنی اگر کسی کی نسبت زنا کا جرم ان شرائط کے ساتھ ثابت ہو جائے جو قرآن کریم میں بیان ہوئے ہیں تو اُسے سو کوڑے لگائے جائیں۔ کوڑوں کی تشریح قرآن کریم نے بیان نہیں فرمائی لیکن قرآنی الفاظ سے یہ بات ثابت ہے کہ کوڑا ایسی طرز پر مارا جانا چاہیئے کہ جسم کو اس کی ضرب محسوس ہو۔ کیونکہ جَلَدَہٗ بِالسِّیَاطِ کے معنے ہوتے ہیں ضَرَبَہٗ بِھَا وَاَصَابَ جِلْدَہٗ (اقرب) یعنی کوڑے سے اس طرز پر مارا کہ جلد تک اُس کا اثر پہنچا۔ پس کسی چیز سے جس کی ضرب اتنی ہو کہ جسم محسوس کرے سزا دینا اور لوگوں کے سامنے سزا دینا اس حکم سے ثابت ہوتا ہے۔ خواہ وہ کوڑا چمڑے کا نہ ہو بلکہ کپڑے کا ہو۔ یہ ضروری نہیں کہ وہ کوڑا وہی ہو جیسا کہ آجکل عدالتیں استعمال کرتی ہیں اور جس کی ضرب اگر سو کی حد تک پہنچے تو انسان غالبًا مر جائے۔ سورۂ نساء کی آیت نے ثابت کر دیا ہے کہ ایسے کوڑے مارنے ناجائز ہیں جن کے نتیجہ میں موت وارد ہو جائے۔ ایسے ہی کوڑے مارے جا سکتے ہیں اور اتنی ہی شدت سے مارے جا سکتے ہیں جن سے انسان پر موت وارد ہونیکا کوئی امکان نہ ہو۔ یعنی نہ تو کوڑا ایسا ہونا چاہیئے جس سے ہڈی ٹوٹ جائے کیونکہ حل لغات میں بتایا جا چکا ہے کہ جَلَدَہٗ بِالسِّیَاطِ کے معنوں میں یہ بات داخل ہے کہ صرف جلد کو تکلیف پہنچے ہڈی کے ٹوٹنے یا اس کو نقصان پہنچنے کا کوئی ڈر نہ ہو۔ اور نہ ایسا ہونا چاہیئے کہ اس کی ضرب سے انسان پر موت وارد ہونے کا کوئی امکان ہو۔

یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ اللہ تعالےٰ نے اِس آیت میں صرف زانی یا زانیہ کا لفظ نہیں رکھا۔ بلکہ الزانیۃ والزانی کے الفاظ رکھے ہیں یعنی الف لام کی زیادتی کی گئی ہے اور الف لام کی زیادتی ہمیشہ معنوں میں تخصیص پیدا کر دیا کرتی ہے۔ پس اس جگہ الزانیۃ والزانی سے صرف ایسا ہی شخص مراد ہو سکتا ہے جو یا تو زنا کا عادی ہو یا علی الاعلان ایسا فعل کرتا ہو۔ اور اتنا نڈر اور بیباک ہو گیا ہو کہ وہ اس بات کی ذرا بھی پرواہ نہ کرتا ہو کہ کوئی اُسے دیکھ رہا ہے یا نہیں یا اُس میں شہوت کا مادہ تو نہ ہو اور پھر بھی وہ زنا کرتا ہو جیسے بوڑھا مرد یا بوڑھی عورت۔ اِن معنوں کے لحاظ سے اس حدیث کی بھی ایک رنگ میں تصدیق ہو جاتی ہے جس میں یہ ذکر آتا ہے کہ اَلشَّیْخُ وَالشَّیْخَۃُ اِذَا زَنَیَا فَارْجُمُوْھُمَا اَلْبَتَّۃَ۔ ایک بڑی عمر والا مرد یا ایک بڑی عمر والی عورت اگر زنا کریں تو ان کو پتھر مار مار کر مار دو۔ گویا اَلزَّانِیَۃُ وَالزَّانِیْ کے معنے اَلشَّیْخُ وَالشَّیْخَۃُ کے ہی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہی خیالات کا اظہار فرمایا تھا۔ مگر حضرت عمرؓ نے اس کو غلطی سے قرآنی آیت سمجھ لیا۔ لیکن بوڑھے مرد اور بوڑھی عورت کے لئے بھی قرآن کریم نے فَاجْلِدُوْا کُلَّ وَاحِدٍ مِّنْھُمَا مِائَۃَ جَلْدَۃٍ کا ہی حکم دیا ہے رجم کا نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب حضرت عمرؓ نے کہا کہ یا رسول اللہ۔ یہ بات مجھے لکھ دیجیئے تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمرؓ کی اس بات کو ناپسند فرمایا۔ کیونکہ یہ قرآنی حکم کے خلاف تھی۔ پس الزَّانِیَۃُ وَالزَّانِیْ سے کامل زانی مراد ہے جو یا تو زنا کا عادی ہو یا اتنا نڈر ہو گیا ہو کہ وہ کھلے بندوں اس فعل کا ارتکاب کرتا ہو۔ یا محصن یعنی شادی شدہ ہو یا بڈھا ہو اور پھر بھی وہ زنا کرتا ہو۔ ایسے تمام لوگوں کے متعلق قرآن کریم یہی کہتا ہے کہ اُن کا جرم ثابت ہونے پر انہیں سو سو کوڑے لگاؤ۔

اَلزَّانِيْ لَا يَنْكِحُ اِلَّا زَانِيَةً اَوْ مُشْرِكَةً وَّ الزَّانِيَةُ

اور ایک زانی زانیہ یا مشرکہ کے سوا کسی سے ہم صحبت نہیں ہوتا ۔ اور نہ زانیہ

وَلَا تَاْخُذْكُمْ بِهِمَا رَاْفَةٌ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ۔

یہ امر یاد رکھنا چاہیئے کہ خدا تعالیٰ کی طرف سے دو قسم کی سزائیں آتی ہیں ۔ ایک تو وہ سزائیں ہوتی ہیں جو قوانینِ نیچر کی خلاف ورزی کا نتیجہ ہوتی ہیں اور ایک ایسی سزائیں ہوتی ہیں جو قوانینِ شریعت کی خلاف ورزی کرنے کی وجہ سے انسان کو برداشت کرنی پڑتی ہیں ۔ جو سزائیں قوانینِ نیچر کی خلاف ورزی کا نتیجہ ہوتی ہیں ان میں رحم کرنا اور ہمدردی سے پیش آنا جائز ہوتا ہے ۔ لیکن وہ سزائیں جو قوانینِ شریعت کی خلاف ورزی کرنے کی وجہ سے دی جائیں اُن میں رحم کرنا جائز نہیں ہوتا کیونکہ خدا تعالیٰ کی طرف سے سزا اُسی صورت میں آتی ہے جبکہ بندہ اس کا مستحق ہو جاتا ہے ۔ اور ایسی حالت میں رحم کرنے یعنی مجرم کو اس سزا سے بچانے کا یہ مفہوم ہوگا کہ انسان خدا تعالیٰ کے فیصلہ کو جھٹلانے کی کوشش کرے ۔

یہاں خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ تمہیں اُس سزا پر جو فی دین اللہ ہو یعنی دین کے حکم کے پورا کرنے کے لئے دی جائے رحم نہیں آنا چاہیئے ۔ پس اس سے وہ سزا نکل گئی جو قوانینِ نیچر کی خلاف ورزی کی وجہ سے ملتی ہے مثلاً اگر کسی کا گر کر دانت ٹوٹ جائے تو اس پر رحم کرنا جائز ہے یا کوئی بیمار ہو تو اُس پر بھی رحم کرنا جائز ہے اسی طرح جو لوگ ڈوب جاتے ہیں یا زلازل وغیرہ سے تباہ ہو جاتے ہیں اُن کے متعلق بھی رحم کے جذبات کا اظہار کرنا یا اُن کے پسماندگان کی مالی امداد کرنا اور اُن سے محبت اور ہمدردی سے پیش آنا جائز ہے ۔ کیونکہ ان حوادث میں ہزاروں ایسے لوگ بھی تباہ ہو جاتے ہیں جن کی تباہی کسی مامور کے انکار کا نتیجہ نہیں ہوتی ۔ پس اس قسم کے حوادث میں بنی نوع انسان کے ساتھ ہمدردی سے پیش آنا نہایت ضروری ہوتا ہے مگر جیسے دینی احکام اور قانونِ شریعت کی خلاف ورزی کرنے پر سزا ملے اس پر رحم نہیں کیا جا سکتا ۔ یعنی یہ نہیں ہو سکتا کہ جس کے متعلق شرعی قانون کے ماتحت زنا کا الزام ثابت ہو جائے اُس کو قرآنی کوڑے نہ لگائے جائیں ۔ ہاں اگر یہ خواہش کی جائے کہ کاش یہ ایسا نہ کرتا تو یہ جائز ہے ۔

یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ اس آیت میں قرآنِ کریم نے اپنے عام دستور کے خلاف عورت کا ذکر پہلے کیا ہے اور مرد کا بعد میں ۔ یعنی یہ کہا ہے کہ زانیہ عورت اور زانی مرد کو سو سو کوڑے لگائے جائیں ۔ اس میں ایک نکتہ ہے جو فراموش نہیں کرنا چاہیئے اور وہ یہ کہ یہ فعل پیشہ کے طور پر عورتوں میں ہی پایا جاتا ہے ۔ مردوں میں نہیں پایا جاتا ۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں جیسا کہ بعض لوگ غلطی سے سمجھتے ہیں کہ اس سے مردوں میں عورتوں کی نسبت زیادہ نیکی اور تقویٰ کا ثبوت ملتا ہے بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ مرد اس کو اختیار ہی نہیں کر سکتے ۔ صرف عورتیں ہی مالی فائدہ کے لئے اس پیشہ کو اختیار کرتی ہیں ۔ اسی لئے ان کا ذکر پہلے کیا گیا ہے ۔ اور مردوں کا اُن کے بعد ۔ دوسرے اس معاملہ میں عورت میں فطرۃً حیاء کا مادہ زیادہ پایا جاتا ہے ۔ بلکہ عورتوں میں ہی نہیں ہر نر و مادہ میں یہ بات پائی جاتی ہے کہ اُن میں سے جو چیزیں اثر قبول کرتی ہیں اُن میں حیاء زیادہ ہوتی ہے بہ نسبت اُن کے جو دوسروں پر اثر ڈالتی ہیں

لَا يَنْكِحُهَآ اِلَّا زَانٍ اَوْ مُشْرِكٌ ج وَحُرِّمَ ذٰلِكَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۴﴾

زانی یا مشرک کے سوا کسی سے ہم صحبت ہوتی ہے۔ اور مومنوں پر یہ (بات) حرام کی گئی ہے۔ ؎۴

اثر لینے والی چیز پیچھے کو ہٹتی ہے۔ اور اثر ڈالنے والی اُسکی طرف بڑھتی ہے۔ اور یہ بات انسانوں اور حیوانوں میں ہی نہیں بلکہ درختوں میں بھی جو نر و مادہ کی خاصیت رکھتے ہیں پائی جاتی ہے کہ جو پودہ نر کا قائم مقام ہوتا ہے اُس میں حرکت پیدا ہوتی ہے اور وہ اُس پودے کی طرف جھکتا ہے جو مادہ کا قائم مقام ہوتا ہے۔ اس علم کی تحقیق موجودہ زمانہ میں کی گئی ہے۔ مگر اسلام نے اس کو پہلے سے ہی بیان کر دیا ہے۔ پس عورت میں چونکہ حیاء کا مادہ نسبتًا زیادہ ہوتا ہے۔ اور وہ طبعًا رکھتی ہے۔ اس لئے اگر اس طبعی حیاء کے باوجود کوئی عورت شرم و حیاء کو ترک کر دیتی ہے تو وہ زیادہ نفرین کی مستحق ہوتی ہے۔ اسی لئے اس جگہ عورت کا ذکر پہلے کیا گیا ہے اور مرد کا بعد میں۔

؎۴ حلِ لغات: لَا يَنْكِحُ۔ لسان العرب میں لکھا ہے کہ علامہ ازہری جو لغت کے امام ہیں کہتے ہیں۔ اَصْلُ النِّكَاحِ فِيْ كَلَامِ الْعَرَبِ الْوَطْءُ کہ نکاح کے اصل معنے لغت عرب میں عورت کے ساتھ تعلقات قائم کرنے کے ہیں۔ پس اَلزَّانِيْ لَا يَنْكِحُ اِلَّا زَانِيَةً کے معنے ہونگے کہ کوئی زانی تعلقات قائم نہیں کرتا مگر زانیہ سے ہی۔

تفسیر: بعض لوگوں نے اس آیت سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ زانی کا زانیہ یا مشرکہ کے ساتھ ہی نکاح جائز ہے۔ شریف مومنہ کے ساتھ جائز نہیں۔ لیکن یہ معنے تواتر اور عقل کے بالکل خلاف ہیں۔ کیونکہ کسی کو زانی یا زانیہ کا علم کس طرح ہو سکتا ہے۔ اگر زانی یا زانیہ پہلے سے شادی شدہ ہونگے تو روایت کے مطابق تو اُن کو سنگسار کیا جا چکا ہوگا۔ پس اس روایت کے مطابق تو اس آیت کے یہ معنے بنیں گے کہ سنگسار شدہ عورت صرف سنگسار شدہ مرد کے ساتھ شادی کر سکتی ہے جو نہایت احمقانہ خیال ہے۔ اور مومنوں پر یہ بات حرام کر دی گئی ہے کہ وہ کسی سنگسار شدہ عورت سے شادی کریں۔ ایک معمولی سے معمولی عقل کا آدمی بھی اس کو بالکل بے ہودہ حکم قرار دیگا۔ یہ ساری غلطی درحقیقت نَكَحَ کے معنے نہ سمجھنے کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے۔ نکاح کے دو معنے ہوتے ہیں۔ ایک معنے شریعت کے قانون کے مطابق اعلانِ ازدواج کے ہیں وہ معنے اسجگہ مراد نہیں۔ کیونکہ اِن معنوں کی رُو سے یہ آیت بالکل لغو ہو جاتی ہے دوسرے معنے نکاح کے مرد عورت کے باہمی اجتماع کے ہیں اور یہی معنے اسجگہ لگتے ہیں۔ یہ معنے اس آیت پر چسپاں کر کے دیکھو تو یہ آیت بڑے اعلیٰ درجہ کے معنوں پر مشتمل نظر آئے گی۔

فرماتا ہے کہ زنا کرنے والا مرد جب بھی صحبت کرتا ہے زنا کرنے والی عورت سے کرتا ہے۔ اور یہ ایک حقیقت ہے کہ زنا کرنے والا مرد تب ہی زنا کرنے والا کہلا سکتا ہے جبکہ اس سے صحبت کرنے والی عورت بھی زانیہ ہو۔ اگر وہ پاک دامن ہے تو مرد اُس کا خاوند کہلائیگا زنا کرنیوالا نہیں کہلائیگا۔ اسی طرح ہر زنا کرنے والی عورت تب ہی زنا کرنے والی کہلا سکتی ہے جبکہ وہ کسی غیر محرم سے صحبت کرتی ہو۔ اور یہ سیدھی بات ہے کہ جو عورت کسی غیر محرم مرد سے صحبت کریگی وہ زانیہ ہی کہلائے گی۔ ورنہ اگر وہ پاک دامن ہوگی تو جب بھی وہ مجامعت کریگی اپنے خاوند سے کریگی۔

غرض اس آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ زانیہ یا زانی کا نام اس وقت ملتا ہے جبکہ بالمقابل شخص کو بھی یہی نام حاصل ہو۔ ورنہ مومن آدمی جب بھی مجامعت کرے گا۔

وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَاْتُوْا بِاَرْبَعَةِ

اور جو لوگ پاک دامن عورتوں پر الزام لگاتے ہیں - پھر چار گواہ مہیا نہیں کرتے

شُهَدَآءَ فَاجْلِدُوْهُمْ ثَمٰنِيْنَ جَلْدَةً وَّلَا تَقْبَلُوْا

تو (اُن کی سزا یہ ہے کہ) اُن کو اسّی کوڑے لگاؤ اور اُن کی گواہی

لَهُمْ شَهَادَةً اَبَدًا ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿۵﴾

کبھی قبول نہ کرو ۔ اور وہ لوگ (اپنے اس فعل کی وجہ سے شریعت اسلامی کی) اطاعت سے خارج ہیں ؁۵

اُس کا بالمقابل فرد اس کی بیوی ہوگی - پس مومن مرد یا مومن عورت کے لئے زانیہ کا لفظ استعمال ہی نہیں ہوسکتا اور چونکہ ہم نے اسجگہ نکاح کے معنے صحبت کے کئے ہیں اسلئے وَحُرِّمَ ذٰلِكَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ کے لازمًا یہ معنے ہونگے کہ مومنوں کے لئے زانی کا لفظ استعمال کرنا حرام ہے - یہ معنے نہیں ہونگے کہ وہ زنا نہیں کرتے کیونکہ زنا تو کوئی مومن کرتا ہی نہیں -

پھر اِس آیت میں ایک سوال کا بھی جواب دیا گیا ہے - چونکہ پچھلی آیت میں یہ حکم دیا گیا تھا کہ زانیہ عورت اور زانی مرد دونوں کو کوڑے مارے جائیں ۔ اس لئے کوئی شخص کہہ سکتا تھا کہ کیوں صرف مرد کو ہی نہ مارا جائے عورت تو اثر قبول کرنے والی ہے - جب اثر ڈالنے والا اُسکی طرف جھکے گا تو وہ مجبورًا اثر قبول کرے گی - اسلئے فرمایا کہ یہ فعل دونوں کی رضامندی سے ہوتا ہے - زانی مرد زانیہ عورت کے ساتھ اُس کی مرضی کے بغیر تعلق پیدا نہیں کرسکتا - اور زانیہ عورت زانی مرد کے ساتھ اُس کی مرضی کے بغیر تعلق پیدا نہیں کرسکتی - اور مومنوں کے لئے یہ بات قطعًا حرام ہے - اسوجہ سے زانی مرد اور زانیہ عورت دونوں کے لئے شریعت نے سزا تجویز کی ہے -

؁۵ حل لغات - يَرْمُوْنَ رَمَاهُ يَرْمِيْهِ سے جمع مذکر غائب کا صیغہ ہے اور رَمَا فُلَانًا بِكَذَا کے معنے ہوتے ہیں عَابَهٗ وَقَذَفَهٗ وَاتَّهَمَهٗ (اقرب) یعنی اس پر الزام اور اتہام لگایا - پس يَرْمُوْنَ کے معنے ہونگے وہ الزام لگاتے ہیں -

یَرْمُوْنَ

تفسیر :- اس آیت میں الزام زنا کی شہادت کا طریق بیان کیا گیا ہے - اور وہ یہ ہے کہ دوسرے پر زنا کا الزام لگانے والا چار گواہ لائے جو اس الزام زنا کی تصدیق کرتے ہوں - مگر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ کے اقوال سے ثابت ہے کہ اگر گواہ مختلف جگہوں کے متعلق شہادت دے رہے ہوں تو وہ شہادت ہرگز تسلیم نہیں کی جائیگی - اور چاہے وہ چار گواہ ہوں پھر بھی وہ ایک ہی گواہی سمجھی جائیگی - یہ ضروری ہے کہ ایک ہی واقعہ اور ایک ہی جگہ کے متعلق الزام لگانے والے کے علاوہ چار عینی شاہد ہوں اور دوسرے اُن کی گواہی اتنی مکمل ہو کہ وہ اس فعل کی تکمیل کی شہادت دیں - فقہاء نے لکھا ہے کہ وہ چاروں گواہ یہ گواہی دیں کہ انہوں نے مرد و عورت کو اِس طرح اکٹھے دیکھا ہے جس طرح سرمہ دانی میں سلائی پڑی ہوئی ہوتی ہے -

فقہاء کے نزدیک مجرم پر حد زنا تین طرح لگتی ہے - اوّل - قاضی کے علم سے - دوم - اقرار سے - سوم چار گواہوں کی شہادت سے - مگر قاضی کے علم سے حد لگا

میرے نزدیک قرآن کریم کی رُو سے غلط ہے کیونکہ قاضی بہرحال ایک شاہد بنتا ہے۔ لیکن قرآن کریم کی رُو سے پانچ شاہد ہونے چاہئیں۔ ایک الزام لگانے والا اور چار مزید گواہ بلکہ میرے نزدیک اگر قاضی کو کوئی ایسا علم ہو تو اُسے وہ مقدمہ سُننا ہی نہیں چاہیئے۔ بلکہ اس مقدمہ کو کسی دوسرے قاضی کے پاس بھجوا دینا چاہیئے اور خود بطور گواہ پیش ہونا چاہیئے۔ قاضی صرف امور سیاسیہ میں اپنے علم کو کام میں لا سکتا ہے حدودِ شرعیہ میں نہیں۔ کیونکہ حدودِ شرعیہ کی سزا خود خدا تعالیٰ نے مقرر کی ہوئی ہے۔ اِسی طرح گواہی کا طریق بھی اس کا مقرر کردہ ہے۔

اقرار کے متعلق بھی یہ امر یاد رکھنا چاہیئے کہ اقرار وہ ہے جو بغیر جبر اور تشدد کے ہو۔ ورنہ پولیس کئی دفعہ مار پیٹ کر بھی اقرار کروا لیتی ہے۔ حالانکہ وہ اقرار صرف جبر کا نتیجہ ہوتا ہے۔ پھر یہ اقرار ایک دفعہ کافی نہیں بلکہ چار دفعہ بغیر پولیس کے قاضی کے سامنے اقرار ہونا چاہیئے۔ اور اقرار بھی قسمیہ ہونا چاہیئے۔ تب اس کو حد لگے گی۔ لیکن اگر ایسا شخص چار دفعہ اقرار کرنے کے باوجود بعد میں انکار کر دے تو اسکو حدِ زنا نہیں لگے گی۔ ہاں اگر اُس نے کسی عورت کا نام لیا ہو تو حدِ قذف اس کو لگے گی۔ کیونکہ اُس نے ایک عورت پر زنا کا الزام لگایا۔ قذف کے متعلق فقہاء میں یہ بحث ہے کہ وہ کس طرح ہوتا ہے۔ اگر صریح ہو تو اُس پر حد ہے اور اگر کنایۃً ہو جیسے یہ کہدے کہ اے فاسقہ یا اے مُواجرہ یا اے ابنۃ الحرام تو اُسے قذف نہیں سمجھا جائے گا۔ جب تک اُس کے ساتھ نیت نہ ہو۔ بلکہ عام طور پر یہ گالی سمجھی جائیگی۔ اور اگر تعریضاً ہو جیسے کوئی کہے کہ میں تو زانی نہیں اور وہ اشارۃً یہ کہنا چاہتا ہو کہ تُو زانی ہے یا کسی کو مخاطب کرتے ہوئے کہہ دے کہ اے ابن حلال اور اس کا مقصد یہ ہو کہ مخاطب ابن حلال نہیں تو امام شافعیؒ اور امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک تو تعریض قذف نہیں لیکن امام مالکؒ کے نزدیک قذف ہے اور امام احمدؒ کے نزدیک غصہ کی حالت میں ایسا کہا گیا ہو تو قذف ہے ورنہ نہیں۔ لیکن میرے نزدیک جو کلام بھی کسی ایسے رنگ میں ثابت ہو جائے کہ اُس کے سُننے والوں پر کسی الزام کا اثر ڈالنا مقصود ہو تو وہ قذف ہے اور اسی طرح قابلِ سزا ہے جسطرح آزاد آدمی اگر قذف کرے تو اس کے لئے اسّی کوڑے سزا مقرر ہے۔ اگر غلام قذف کرے تو اس کے لئے چالیس کوڑوں کی سزا مقرر ہے۔ لیکن اس کا فیصلہ قاضی کرے گا پبلک کا کام نہیں کہ اس کا فیصلہ کرے۔ اگر غیر شادی شدہ عورت یا غیر شادی شدہ مرد پر کوئی قذف کرے تو قرآن کی رُو سے اس پر کوئی حد نہیں ہاں قانون یا قاضی مناسب حال سزا اس کے لئے تجویز کریگا۔ گویا ایسے مقدمہ کا فیصلہ صرف اس بنا پر ہوگا کہ قاضی اسکو مجرم قرار دے دے۔ اس کے بعد حکومت اس سے مجرموں والا سلوک کرے گی ورنہ نہیں۔ گویا اسلام نے دونوں کو پابند کر دیا۔ قاضی کو طریق شہادت سے پابند کر دیا اور حکومت کو قاضی کے فیصلہ سے پابند کر دیا۔

اور اگر کوئی شخص کسی غیر محصنہ پر جس کو پہلے کبھی سزا مل چکی ہو الزام لگائے تو اس کو تعزیر کی سزا ملے گی۔ کیونکہ پھر عزت کا سوال نہیں بلکہ فتنہ ڈالنے کا سوال ہوگا۔ لیکن اگر الزام کسی ایسے شخص پر لگایا جائے جو مشہور بدنام اور آوارہ ہو اور قاضی بھی اُسے بدنام اور آوارہ قرار دیدے تو پھر الزام لگانے والے کو صرف فتنہ پیدا کرنے کی سزا دی جائیگی۔

یہ بھی فقہاء نے بحث کی ہے کہ گو یہاں محصنات کا لفظ استعمال کیا گیا ہے محصنین کا لفظ استعمال نہیں کیا گیا مگر اس میں مرد اور عورت دونوں شامل ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ جبکہ مردوں کے ذکر میں عورتیں شامل سمجھی جاتی ہیں تو عورتوں کے ذکر میں مرد کیوں نہ شامل سمجھے جائیں گے۔ پس وہ اس آیت کو مردوں اور عورتوں دونوں کے لئے

سمجھتے ہیں۔ پھر فقہاء نے یہ بھی کہا ہے کہ اس جگہ محصنات کا جو لفظ استعمال کیا گیا ہے اور محصنین کا نہیں کیا گیا تو اس سے اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ گو مرد بھی اس حکم میں شامل ہیں مگر عورتوں کی عزت کو بچانا سوسائٹی کا پہلا فرض ہے۔ کیونکہ جھوٹے الزاموں سے عورت کی عزت کو زیادہ نقصان پہنچتا ہے اور مرد کی عزت کو کم۔ اگر چار گواہ نہ ہوں تو خواہ وہ تین ہوں اُن پر حد لگیگی۔ اور اگر چار گواہ تو ہوں لیکن فاسق ہوں۔ تب بھی بعض فقہاء کے نزدیک گواہوں پر حد لگیگی لیکن میرے نزدیک حد نہیں لگیگی کیونکہ فاسق قرار دینے کا فیصلہ قاضی کے اختیار میں تھا اور گواہ کو اس کا کوئی علم نہیں ہو سکتا تھا کہ مجھے فاسق قرار دیا جائیگا یا نہیں۔ ہاں قاضی کو تعزیر کا اختیار ہوگا یعنی حالات کے مطابق سزا دینے کا تاکہ آئندہ احتیاط رہے اور جس پر الزام لگایا گیا ہو اُس کی براءت کی جائیگی۔ قرآن کریم کے الفاظ ظاہر کرتے ہیں کہ قاذف کے علاوہ چار گواہ ہونگے یعنی کل پانچ نہ کہ قاذف سمیت چار۔ بعض لوگوں نے اس بارہ میں اختلاف کیا ہے کہ شہادت ایک مقام پر ہوگی یا مختلف مقامات پر لیکن میرے نزدیک یہ بحث فضول ہے۔ قاضی جس طرح چاہے گواہی لے لیکن یہ ضروری ہے کہ گو مقامِ شہادت مختلف ہوں مگر جس واقعہ کی شہادت ہو وہ ایک ہی ہو تاکہ وہ احتیاط جو غلطی سے بچنے کے لئے کی گئی تھی ضائع نہ ہو جائے اور منصوبہ بازی کا ازالہ ہو جائے۔

یہ حکم اس زمانہ میں خوب یاد رکھنے کے قابل ہے کیونکہ جسقدر بے حرمتی اور ہتک اس زمانہ میں اس کی ہو رہی ہے اور کسی حکم کی نہیں ہو رہی۔ بلا دلیل اور بلا وجہ اور بلا کسی ثبوت کے محض کھیل اور تماشہ کے طور پر دوسروں پر الزام لگائے جاتے ہیں اور قطعاً اس بات کی پرواہ نہیں کی جاتی کہ یہ کتنا بڑا گناہ ہے۔ اور خدا تعالیٰ نے اس کی کسقدر سزا مقرر کی ہوئی ہے۔ ایسا الزام لگانے والے کے لئے خدا تعالیٰ نے اسّی کوڑے سزا رکھی ہے جو زنا کی سزا کے قریب قریب ہے۔ یعنی اس کے لئے سَو کوڑے کی سزا ہے لیکن الزام لگانے والے کے لئے اسّی کوڑے کھا لینے کے بعد بھی یہ سزا ہے کہ کبھی اس کی گواہی قبول نہ کرو۔ پھر اسی پر بس نہیں بلکہ سزا اور زیادہ آگے بڑھتی ہے اور خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ ایسا انسان خدا تعالیٰ کے حضور فاسق ہے۔ اور جسے خدا تعالیٰ فاسق قرار دیدے اس کے متعلق یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ مومن اور متقی ہے یونہی خدا نے اس کا نام فاسق رکھدیا ہے بلکہ اس میں یہ اشارہ مخفی ہے کہ الزام لگانے والا خود اُسی بدی میں مبتلا ہو جائیگا۔ کیونکہ خدا تعالیٰ بلا وجہ کسی کا نام نہیں رکھتا بلکہ جب بھی کسی کا کوئی نام رکھتا ہے اُس کے مطابق اس میں صفات بھی پیدا کر دیتا ہے۔ خدا تعالیٰ جس کو دلیر کہتا ہے وہ دلیر ہو کر رہتا ہے اور خدا تعالیٰ جس کو متقی کہتا ہے وہ متقی ہو کر رہتا ہے۔ اسی طرح خدا تعالیٰ جس کو فاسق کہتا ہے۔ وہ فاسق بن کر رہتا ہے۔ اور دنیا دیکھتی ہے کہ جو الزام اس نے دوسرے پر لگایا تھا اس کا وہ خود مصداق بن گیا ہے۔

بعض لوگ یہ بھی کہا کرتے ہیں کہ چونکہ یہاں يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ آیا ہے اس لئے جو واقع میں پاک دامن عورتیں ہوں اُن پر اتہام لگانے والے کے لئے سزا رکھی گئی ہے دوسروں کے لئے نہیں۔ حالانکہ اگر یہ درست ہو تو اس کا پتہ کون لگا سکیگا کہ جس پر الزام لگایا گیا ہے وہ فی الواقعہ پاک دامن ہے یا نہیں۔ ایک خبیث اور بے باک آدمی بڑی دلیری کے ساتھ کہہ سکتا ہے کہ جس عورت پر مَیں نے الزام لگایا ہے۔ پہلے اس کی پاکدامنی تو ثابت کرو۔ پھر مجھے سزا دو۔ اور اس طرح ہر عورت کی عزت خطرہ میں پڑ سکتی ہے۔ پس اس کے یہ معنے نہیں کہ جب تک عورت کا پاک دامن ہونا ثابت نہ کیا جائے

الزام لگانیوالے کو کوئی سزا نہیں مل سکتی بلکہ یَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ کے یہ معنے ہیں کہ ایسی عورتیں جن پر بدکاری کا الزام لگایا گیا ہو ۔ اگر وہ الزام شہادت سے ثابت نہیں ہوتا تو خدا تعالیٰ کی نگاہ میں وہ یقینی طور پر پاکدامن ہیں اور الزام لگانے والا کذّاب اور جھوٹا ہے اور اس بات کا مستحق ہے کہ اسے سزا دی جائے ۔ کیونکہ قاعدہ ہے کہ بارِ ثبوت مدّعی پر ہوتا ہے اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی یہی فرمایا ہے ۔ چونکہ الزام لگانیوالا مدّعی ہوتا ہے اس لئے ثبوت لانا بھی الزام لگانے والے کا ہی کام ہے ۔ عورت کا یہ کام نہیں کہ وہ اپنی پاکدامنی کا ثبوت پیش کرے ۔ اگر یہ معنی نہ کئے جائیں تو جو شخص الزام لگانیوالا ہو وہ کہہ سکتا ہے کہ اگرچہ میں اتہام کا ثبوت نہیں لا سکا مگر ہے وہ درست ۔ ورنہ تم ثابت کرو کہ جس پر میں نے الزام لگایا ہے وہ محصنات میں سے ہے ۔ بہرحال اتہام لگانے والا اگر شریعت کی بیان کردہ شرائط کے مطابق چار گواہ نہیں لائیگا تو وہ مجرم ہوگا اور اگر لے آئیگا تو جس پر اتہام لگایا گیا ہو وہ مجرم ہوگا ۔

چونکہ بعض لوگوں کے دلوں میں یہ شبہ پیدا ہوسکتا ہے کہ کیوں قرآن کریم نے چار گواہیوں کی شرط لگائی ہے اور کیوں دوسرے الزامات کی طرح صرف دو گواہوں پر کفایت نہیں کی اس لئے یہ بتانا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ دو کی بجائے چار گواہوں کی شرط لگانا بتاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس قسم کے واقعات میں کثرت سے جھوٹ بولا جاتا ہے پس اس وجہ سے زیادہ گواہوں کی شرط لگا دی گئی ہے اور پھر ایک ہی واقعہ کے متعلق چار کی شرط اس لئے لگائی کہ ایک وقت میں پانچ آدمیوں کا اکٹھا ہونا یعنی الزام لگانے والے اور چار گواہوں کا۔ یہ ایک ایسا امر ہے کہ اس کا جھوٹ آسانی سے کھولا جا سکتا ہے اور جرح میں ایسے لوگ اپنے قدم پر نہیں ٹھہر سکتے ۔ کیونکہ پانچ آدمیوں کا ایک جگہ پر موجود ہونا ایک ایسا واقعہ ہے جس کا اخفاء مشکل ہوتا ہے اور پانچ آدمی مل کر یہ جھوٹ بہت کم بنا سکتے ہیں کیونکہ اُن میں سے بعض کی نسبت یہ ثابت کرنا آسان ہوتا ہے کہ یہ تو اُس وقت فلاں جگہ پر بیٹھا تھا ۔ پس چونکہ زنا ایک ایسا فعل ہے جس کے لئے بیرونی دلائل نہیں ہوتے جس طرح چوری میں پہلے کسی کے گھر سے مال کا نکلنا ضروری ہے پھر کسی شخص کے پاس اس کا موجود ہونا ضروری ہے یا قتل میں کسی کا جان سے مارا جانا ضروری ہے ۔ پھر دوسرے شخص کا اُس جگہ موجود ہونا ضروری ہے اور ایسے شواہد کسی شخص کے متعلق جمع کر دینے اگر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہوتے ہیں ۔ لیکن زنا کے لئے اس کی بیرونی علامات موجود نہیں ہوتیں اس لئے اس پر الزام لگانا آسان ہوتا ہے اِس وجہ سے شریعت نے چوری اور قتل کے لئے تو دو گواہوں کی گواہی کو تسلیم کیا ۔ لیکن بدکاری کے الزام کے متعلق چار گواہوں کی شرط لگائی اور الزام لگانے والوں سے ہمدردی کو بھی سخت جرم قرار دیا اور الزام سُنتے ہی اسکو جھوٹا قرار دینے کی نصیحت کی ۔

دوسری صورت انسان کے مجرم ہونے کی یہ ہے کہ وہ خود اقرار کرے ۔ مگر حدیثوں سے پتہ لگتا ہے کہ وہ بھی قاضی کے سامنے اپنے متعلق چار دفعہ گواہی دیگا کہ میں نے ایسا فعل کیا ہے ۔ مگر ایسی صورت میں بھی شریعت صرف اسی کو مجرم قرار دیگی عورت کو مجرم قرار نہیں دیگی ۔

بعض لوگ خیال کرتے ہیں کہ دوسرے کی نسبت الزام لگانا اَور بات ہے اور اپنی نسبت الزام لگانا اَور کہنا کہ میں نے ایسا فعل کیا ہے یا کسی عورت کا یہ کہنا کہ میرے ساتھ کسی دوسرے نے ایسا فعل کیا ہے بالکل اَور بات ہے ۔ یہ دونوں امور یکساں حیثیت رکھنے والے

نہیں سمجھے جا سکتے بلکہ بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ اپنی طرف اس الزام کی نسبت دینا کہنے والے کے تقویٰ اور اُس کی نیکی کا ثبوت ہوتا ہے۔ حالانکہ اپنی نسبت الزام لگانا تو الزام لگانے والے کی وقاحت اور بے شرمی پر دلالت کرتا ہے نہ کہ اس کے تقویٰ اور پاکیزگی پر۔ کیا یوسف علیہ السلام پر عزیز مصر کی بیوی نے اپنی ذات کے متعلق الزام نہیں لگایا تھا۔ پھر کیا اس سے زلیخا کے تقویٰ کا ثبوت ملتا ہے یا اس کی چالبازی اور مکاری کا ثبوت ملتا ہے۔ پھر اسی طرح ایک واقعہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں بھی ہُوا۔ ایک شخص رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور کہنے لگا یا رسول اللہ! مَیں نے زنا کیا ہے اِسپر آپ نے اس کو بُلا کر اس کی پیٹھ پر ہاتھ نہیں پھیرا کہ شاباش تم نے کیسا اچھا فعل کیا ہے کہ اپنے جرم کا اقرار کیا ہے۔ بلکہ آپ نے غصہ سے اُس کی طرف سے مُنہ پھیر لیا۔ اُس شخص نے دوسری طرف سے جا کر پھر یہی کہا کہ یا رسول اللہ: مَیں نے زنا کیا ہے۔ لیکن پھر بھی آپ نے غصہ سے مُنہ پھیر لیا۔ پھر اُس نے تیسری جانب سے جا کر کہا کہ یا رسول اللہ مَیں نے زنا کیا ہے مگر آپ نے پھر بھی اس کی طرف سے مُنہ پھیر لیا جب چوتھی دفعہ اس نے کہا کہ یا رسول اللہ مَیں نے زنا کیا ہے تو آپ نے فرمایا کیا تو دیوانہ ہے۔ یعنی کسی طرح ممکن ہے کہ ایک انسان اپنی ہوش میں ایسی بات کہے جو تُو کہہ رہا ہے۔ اُس نے کہا۔ یا رسول اللہ مَیں دیوانہ نہیں ہوں۔ تب آپ نے فرمایا۔ چونکہ اس نے چار دفعہ اپنے جرم کا اقرار کیا ہے اس لئے اب اسے سزا دیدو۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس کے اِس اقدام کی تعریف نہیں کی بلکہ اسے دیوانگی کا فعل قرار دیا ہے۔ اور دیوانگی کا شبہ تبھی ہو سکتا ہے جبکہ یہ سمجھا جائے کہ ایک انسان ہوش و حواس میں اپنے اوپر الزام نہیں لگا سکتا۔ ورنہ اگر یہ امکان نہ ہوتا تو آپ اُسے دیوانہ کیوں قرار دیتے۔ لیکن تعجب ہے کہ اس زمانہ میں بعض لوگ اس کو فرزانگی کا فعل قرار دیتے ہیں۔ حالانکہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے

اس قسم کے اقرار کو دیوانگی اور بے حیائی قرار دیا ہے۔ بہرحال اس صورت میں بھی صرف اقرار کرنے والے کو ہی مجرم قرار دیا جائے گا۔ عورت کو مجرم قرار نہیں دیا جائیگا۔ عورت سے اگر اس کا نام معلوم ہو تو بغیر قسم کے صرف اتنا سوال کیا جائیگا کہ آیا یہ درست کہتا ہے یا غلط اور اگر وہ کہہ دے کہ غلط کہتا ہے تو عورت کو چھوڑ دیا جائیگا۔ یہ کتنی بڑی خوبی ہے جو اسلام کے اس حکم سے ظاہر ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ایک ایسا شخص جو خود کوئی عزت نہیں رکھتا دوسروں کی عزت برباد کرنے کے لئے جھوٹا الزام لگا دے اور کہے کہ مَیں نے فلاں سے ایسا فعل کیا ہے۔ اُس کی اپنی عزت تو ہوتی نہیں کہ اس کی اُسے پرواہ ہو لیکن دوسروں کو بدنام کر سکتا ہے اگر اس کی اجازت دی جاتی تو کئی شریر النفس لوگ روزانہ اُٹھ کر دوسروں پر الزام لگا دیتے اور جب انہیں ملامت کی جاتی تو کہہ دیتے کہ ملامت اور غصہ کی بات نہیں مَیں تو خود اپنے آپ کو بھی ملزم قرار دے رہا ہوں۔ پھر میری بات ماننے میں آپ کو کیا عذر ہے۔ اگر کسی شریف انسان سے ایک بدمعاش جاکر کہدے کہ اُس کی بیوی سے اُس نے زنا کیا ہے۔ تو وہ آدمی اُسپر ناراض ہوگا یا اُس کی نیکی اور تقویٰ کی تعریف کرنے لگ جائے گا اور اپنی بیوی کو بھی اس گناہ میں ملوث قرار دے گا۔ اِس راستہ کو کھول کر دیکھو تو دنیا میں کسی شخص کی عزت محفوظ نہیں رہ سکتی۔ کیونکہ دنیا میں ایسے ہزاروں بے حیاء مل سکتے ہیں جو کسی بُغض یا غصہ کی وجہ سے یا دوسروں کے کہے کہلائے صرف ایک شغل کے طور پر اپنے ساتھ دوسرے مردوں یا عورتوں کے ملوث ہونے کا اقرار کرنے کیلئے تیار ہو جائیں گے۔ چنانچہ عرب میں تشبیب کا ایک علم رواج تھا یعنی وہ اپنی بے حیائی میں کسی عورت پر الزام لگا دیتے کہ میرا اس کے ساتھ ناجائز تعلق ہے اور اُن کی غرض یہ نہیں ہوتی تھی کہ وہ اپنا تقویٰ ظاہر کریں بلکہ اِس سے اُن کی غرض یہ ہوتی تھی کہ دوسری عورت کو بدنام کریں۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے

تشبیب کرنے والے کو واجب القتل قرار دیا ہے۔ پس یہ طریق عقل کے بالکل خلاف ہے اور اس کی اجازت دینے سے فتنہ کا بڑا بھاری دروازہ کھل جاتا ہے۔ اسی لئے ہماری شریعت نے ایک فریق کے اقرار سے دوسرے فریق کو مجرم قرار نہیں دیا۔ چنانچہ اس بارہ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک فیصلہ بھی احادیث سے ثابت ہے۔

حدیث میں آتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک شخص نے آکر بیان کیا کہ فلاں شخص کا بیٹا میرے بھائی کا ہے۔ کیونکہ میرے بھائی نے کہا تھا کہ وہ لڑکا اصل میں میرا ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سُن کر اس کی تعریف نہیں فرمائی یا یہ نہیں فرمایا کہ آؤ ہم دوسرے فریق کو قسم دیں۔ بلکہ فرمایا اَلْوَلَدُ لِلْفِرَاشِ وَلِلْعَاهِرِ الْحَجَرُ۔ یعنی بیٹا تو اسی کو ملے گا جس کی بیوی کہلاتی ہے۔ لیکن جو شخص کہتا ہے میں نے زنا کیا ہے اُس کی سزا سنگساری ہے۔ جیسا کہ ہم پہلے ثابت کر چکے ہیں کہ یہودی کتب میں یہی لکھا تھا۔

اس واقعہ پر غور کر کے دیکھ لو۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس اقرارِ جرم کرنے والے کی تعریف نہیں فرمائی بلکہ اس کی مذمت کی اور فرمایا کہ اس کے اقرار کا اثر خود اُسی پر پڑے گا نہ کہ دوسرے پر۔ پس کسی کا اپنے جرم کو ظاہر کرنا یا اُس کا اقرار کر لینا یہ ثابت نہیں کرتا کہ وہ بڑا نیک ہے۔ کیونکہ شریعت تو گناہ کو ظاہر کرنے سے روکتی ہے۔ جب تک قاضی کے سامنے شہادت کے موقعہ پر اس کا بیان کرنا از روئے شریعت ضروری نہ ہو۔ پس جو شخص بلا وجہ اپنی طرف بدکاریاں اور عیوب منسوب کرتا ہے اس کو تو شریعت شاہد عادل قرار نہیں دیتی کجا یہ کہ اس کے اقرار کو کوئی اہمیت دی جائے۔ یا اسے اُس کے تقوٰے کا ثبوت سمجھا جائے۔ لیکن اگر کوئی شخص اقرار کرنے کی بجائے کسی دوسرے پر اتہام لگائے تو جس پر اتہام لگایا جائیگا اس سے پُوچھا بھی نہیں جائے گا اور نہ اُس سے قسم یا مباہلہ کا مطالبہ کرنا جائز ہوگا۔ کیونکہ حدود میں قسم یا مباہلہ کرنا شریعت کی ہتک کرنا ہے۔ اور یہی پُرانے فقہاء کا مذہب ہے۔ چنانچہ امام محمدؒ جو امام ابوحنیفہؒ کے بعد اُن کے قائم مقام ہوئے اور جن کے متعلق علماء کا یہ خیال ہے کہ امام یوسفؒ جو حضرت امام ابوحنیفہؒ کے اوّل شاگرد تھے۔ اُن کا قول بھی فقہ میں اتنا قابلِ اعتماد نہیں جتنا امام محمدؒ کا۔ وہ اپنی کتاب المبسوط میں لکھتے ہیں۔ وَالْحُدُوْدُ لَا تُقَامُ بِالْاَيْمَانِ (المبسوہ جلد ۹ صفحہ ۵۰۲) یعنی جن امور میں حد مقرر ہے اُن میں قسموں کے ذریعہ حد قائم نہیں کی جا سکتی۔ ایسے امور کا فیصلہ بہرحال گواہوں کی گواہی پر منحصر ہوگا۔ پھر اگر کوئی الزام لگانے والا تین گواہ بھی لے آئے تو ان گواہوں کو بھی اور اتہام لگانے والے کو بھی اسّی اسّی کوڑوں کی سزا دی جائیگی۔ کیونکہ انہوں نے ایک ایسی بات کہی جس کا اُن کے پاس کوئی شرعی ثبوت نہیں تھا

تاریخ میں لکھا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں حضرت مغیرہ بن شعبہؓ پر جو بصرہ کے گورنر تھے بدکاری کا الزام لگایا گیا۔ حضرت عمرؓ نے گواہی لی۔ تو ایک شخص نے گواہی میں خفیف سی کمزوری دکھائی اور کہا کہ میں نے زنا ایسی صورت میں نہیں دیکھا کہ مرد کا آلہ تناسل عورت کی شرمگاہ کے اندر داخل ہو۔ اس پر دوسرے تینوں گواہوں کو قذف کی حد لگائی گئی (طبری جلد ۵ صفحہ ۲۵۲۹ تا صفحہ ۲۵۳۳) اور کسی نے نہ کہا کہ تین گواہ تو موجود ہیں۔ چوتھے نے صرف کسی قدر کمزور شہادت دی ہے۔ اس لئے کم از کم الزام لگانے والوں کو کوڑے ہی نہ لگائیں اور ملزم کو قسم دیکر پُوچھیں کہ یہ بات سچ ہے یا نہیں۔ مگر اُس کو قسم تک نہ دی گئی۔

إِلَّا الَّذِينَ تَابُوا مِنْ بَعْدِ ذٰلِكَ وَأَصْلَحُوا ۚ فَإِنَّ

سوائے اُن کے جو بعد میں توبہ کریں اور اصلاح کریں - سو (ایسا کرنے پر)

اللّٰهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿٦﴾ وَالَّذِينَ يَرْمُونَ أَزْوَاجَهُمْ

اللہ (تعالیٰ) یقیناً بہت بخشنے والا (اور) بار بار رحم کرنیوالا ہے اور جو لوگ اپنی بیویوں پر الزام لگاتے ہیں

وَلَمْ يَكُن لَّهُمْ شُهَدَاءُ إِلَّا أَنفُسُهُمْ فَشَهَادَةُ

اور اُن کے پاس سوائے اپنے وجود کے اور کوئی گواہ نہیں ہوتا تو اُن میں سے ہر شخص کو

أَحَدِهِمْ أَرْبَعُ شَهَادَاتٍ بِاللّٰهِ إِنَّهُ لَمِنَ الصَّادِقِينَ ﴿٧﴾

ایسی گواہی دینی چاہیئے جو اللہ (تعالیٰ) کی قسم کھاکر چار گواہیوں پر مشتمل ہو اور (ہر گواہی میں) وہ یہ کہے کہ وہ راستبازوں میں سے ہے -

وَالْخَامِسَةُ أَنَّ لَعْنَتَ اللّٰهِ عَلَيْهِ إِن كَانَ مِنَ الْكَاذِبِينَ ﴿٨﴾

اور پانچویں (گواہی) میں (کہے) کہ اُس پر خدا کی لعنت ہو اگر وہ جھوٹوں میں سے ہو -

اور الزام لگانے والوں کو کوڑوں کی سزا کے علاوہ شہادت سے بھی محروم کر دیا گیا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اعلان فرمایا کہ ان لوگوں کی شہادت آئندہ کسی معاملہ میں قبول نہیں کی جائے گی - چنانچہ اُن کی شہادت پھر کبھی قبول نہیں کی جاتی تھی -

۶ تفسیر:- فرماتا ہے - اس سزا کے بعد جو لوگ توبہ کریں اور اپنی اصلاح کی طرف توجہ کریں انہیں سمجھ لینا چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ یقیناً بہت بخشنے والا اور بار بار رحم کرنے والا ہے -

بعض فقہاء کہتے ہیں کہ توبہ کرنے پر اللہ تعالیٰ اُن کو فاسقوں میں سے نکال دے گا - اور بعض کہتے ہیں کہ ساری سزا ہی معاف کر دی جائے گی - اور بعض کہتے ہیں کہ صرف شہادت قبول نہ کرنے اور فاسق ہو جانے کی جو سزا تھی اُس سے انہیں بچا لیا جائے گا - یعنی اگر قاضی فیصلہ کر دے کہ فلاں شخص اپنی غلطی پر سچے طور پر نادم ہے اور آئندہ کے لئے اس نے اپنی اصلاح کر لی ہے تو اجازت ہے کہ اس کی شہادت قبول کر لی جائے - اور خدا تعالیٰ بھی اُسے فاسق ہونے سے بچا لے گا -

میرے نزدیک یہی بات درست ہے کہ بدنی سزا سے تو اُسے نہیں بچایا جائے گا - البتہ دوسری سزائیں اُس کی اصلاح ثابت ہونے پر معاف ہو سکتی ہیں - اِس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض گناہوں کی سزا دی جانی ضروری ہوتی ہے - کیونکہ تمدن کے قیام کے لئے سزا بھی ایک ضروری چیز ہے - لیکن اگر بندہ اس سزا کو برداشت کر لے - اور اپنے فعل پر نادم ہو تو اللہ تعالیٰ اس مقررہ سزا سے جو قیامت کے دن ملنے والی ہوتی ہے اسے محفوظ کر دیتا ہے اور اسکی توبہ کو قبول فرما لیتا ہے لیکن اس دنیا کی سزا کو معاف نہیں کرتا - کیونکہ وہ بندوں کے اختیار میں ہے -

وَيَدْرَؤُا عَنْهَا الْعَذَابَ اَنْ تَشْهَدَ اَرْبَعَ شَهٰدٰتٍ

اور وہ (مظلوم) بیوی (جس پر اُس کا خاوند الزام لگائے) اپنے نفس پر چار ایسی گواہیوں کے ذریعہ سے جو قسم کھا کر دی گئی ہوں

بِاللّٰهِ اِنَّهٗ لَمِنَ الْكٰذِبِيْنَ ۝۹ وَالْخَامِسَةَ اَنَّ

عذاب کو دُور کرے یہ کہتے ہوئے کہ وہ (یعنی خاوند) جھوٹا ہے۔ اور پانچویں (قسم) اس طرح (کھائے) کہ

غَضَبَ اللّٰهِ عَلَيْهَآ اِنْ كَانَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝۱۰ وَ

اللہ کا غضب اُس (یعنی عورت) پر نازل ہو اگر وہ (یعنی اس کا الزام لگانیوالا خاوند) سچا ہے۔ اور

لَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ وَاَنَّ اللّٰهَ تَوَّابٌ حَكِيْمٌ ۝۱۱

اور اگر اللہ (تعالیٰ) کا فضل اور اس کی رحمت تم پر نہ ہوتی اور یہ نہ ہوتا کہ اللہ بڑا فضل کرنیوالا (اور) بڑی حکمتوں والا ہے (تو تم لوگ ...)

۵۷ حل لغات: يَدْرَؤُا۔ دَرَأَ سے مضارع کا صیغہ ہے اور دَرَأَ کے معنی ہوتے ہیں دَفَعَهٗ اس کو دُور کیا (اقرب) پس يَدْرَؤُا کے معنے ہونگے وہ دُور کرے گا۔

تفسیر: فرماتا ہے۔ وہ لوگ جو اپنی بیویوں پر بدکاری کا الزام لگاتے ہیں اور کوئی بیرونی گواہ نہیں رکھتے صرف ان کا نفس ہی گواہ ہوتا ہے اُن میں سے ہر شخص چار دفعہ حلفیہ گواہی دے کہ واقعی میں نے اپنی عورت کو بدکاری کرتے دیکھا ہے اور میں سچا ہوں اور پانچویں دفعہ یہ کہے کہ اگر میں جھوٹا ہوں تو اللہ تعالیٰ کی مجھ پر لعنت ہو۔ جب خاوند اس طرح قسم کھا چکے تو عورت بھی چار دفعہ قسم کھا کر کہے کہ یہ شخص جھوٹا ہے اور پانچویں بار یہ کہے کہ اگر یہ سچا ہے تو مجھ پر خدا تعالیٰ کا عذاب نازل ہو۔ جب دونوں طرف سے قسمیں کھا لی جائیں تو پھر ان دونوں کو جُدا کر دیا جائیگا۔ یعنی خلع کا حکم دے دیا جائیگا۔ لیکن اگر خاوند بیوی پر قذف تو کرے مگر نہ گواہ لائے نہ لعان کرے۔ تو خاوند پر حد لگے گی (یعنی اُسے اسّی کوڑے لگیں گے) ہاں اگر وہ لعان کرلے تو پھر وہ حد سے آزاد ہوجائیگا یعنی کوڑے کھانے سے بچ جائیگا۔ لیکن اگر بیوی بھی لعان کردے تو پھر بیوی پر زنا کا الزام ثابت نہیں ہوگا اور دونوں طرف کا معاملہ برابر سمجھا جائے گا یہ لعان کسی مخفی مقام پر نہیں ہوتا بلکہ ضروری ہوتا ہے کہ ایسا شخص اوّل لوگوں کے مجمع میں قسم کھائے دوم کسی مقدس مقام پر قسم کھائے۔ سوم جب وہ لعنت کرنے لگے تو اس کو کہا جائے کہ دیکھو خوب سوچ سمجھ لو۔ خدا کی لعنت جس شخص پر نازل ہوتی ہے اسے تباہ کر دیتی ہے۔

پھر فرماتا ہے وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ وَاَنَّ اللّٰهَ تَوَّابٌ حَكِيْمٌ۔ اگر اللہ تعالیٰ کا فضل تم پر نہ ہوتا اور اُس کی رحمت تمہاری دستگیری نہ کرتی اور وہ اس قسم کے حکموں سے تمہاری عزت نہ بچاتا تو تم تباہ ہوجاتے۔

إِنَّ الَّذِيْنَ جَآءُوْ بِالْاِفْكِ عُصْبَةٌ مِّنْكُمْ لَا تَحْسَبُوْهُ

یقیناً وہ لوگ جنہوں نے ایک بڑا اتہام باندھا تھا تمہیں میں سے ایک گروہ ہے تم اس (فعل) کو اپنے لئے بُرا

شَرًّا لَّكُمْ بَلْ هُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ مَّا اكْتَسَبَ

نہ سمجھو بلکہ وہ تمہارے لئے بہت اچھا تھا (کیونکہ اس کی وجہ سے ایک پُرحکمت تعلیم تم کو مل گئی) اُن میں سے ہر شخص کو اس نے جتنا گناہ کیا تھا

مِنَ الْاِثْمِ وَالَّذِيْ تَوَلّٰى كِبْرَهٗ مِنْهُمْ لَهٗ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۲﴾

اس کی سزا مل جائیگی اور جو شخص اس گناہ کے بڑے حصہ کا ذمہ وار تھا اس کو بہت بڑا عذاب ملے گا۔ ۵

۵ حل لغات:۔ اَلْاِفْكُ: اَلْكِذْبُ۔ یعنی افک کے معنے جھوٹ کے ہیں (اقرب)

عُصْبَةٌ: جماعت کو کہتے ہیں۔ لیکن بعض کے نزدیک تین سے دس افراد تک کی جماعت کو عُصبہ کہتے ہیں اور بعض صرف دس افراد کی جماعت کو عُصبہ کہتے ہیں۔ بعض دس سے پندرہ افراد تک کی جماعت کو عُصبہ کہتے ہیں۔ اور بعض کہتے ہیں کہ دس سے لے کر چالیس تک کی جماعت کو عُصبہ کہا جاتا ہے (اقرب و فتح البیان)

تفسیر:۔ اس آیت میں اس واقعہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جبکہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا غزوۂ بنو مصطلق میں پیچھے رہ گئی تھیں۔ اور قافلہ چلا آیا تھا۔ اور منافقوں نے آپ پر ایک نہایت ہی گندہ اور ناپاک الزام لگا دیا تھا۔

یہ واقعہ یوں ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت تھی کہ جب آپ سفر پر تشریف لے جاتے تو بالعموم امہات المومنین میں سے کسی کو ساتھ لے جاتے اُن کے لئے باری مقرر نہ تھی بلکہ آپ قرعہ ڈالتے اور جن کا نام نکلتا انہیں آپ اپنے ساتھ لے جاتے۔ غزوۂ بنو مصطلق پر جاتے وقت حضرت عائشہؓ کا نام نکلا اور انہیں آپ اپنے ساتھ لے گئے۔ جب واپس آئے تو مدینہ کے قریب ایک جگہ ڈیرہ لگایا گیا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو رات کے وقت قضائے حاجت کی ضرورت پیش آئی اور آپ لشکر سے باہر تشریف لے گئیں۔ جب واپس آئیں تو معلوم ہوا کہ اُن کا ہار کہیں اُس جگہ گر گیا ہے۔ چنانچہ آپ ہار کو تلاش کرنے کیلئے دوبارہ باہر تشریف لے گئیں۔ اتنے میں قافلہ کے چلنے کا وقت آ گیا۔ اور چونکہ ان دنوں آپ بہت دُبلی پتلی تھیں۔ قافلہ کے منتظم نے اُن کا ہودج اٹھا کر اونٹ پر رکھ دیا اور سمجھا کہ اندر ہی ہونگی۔ جب وہ واپس آئیں تو قافلہ روانہ ہو چکا تھا۔ انہیں سخت پریشانی ہوئی۔ مگر پھر یہ خیال کرکے کہ جب لوگوں کو اُن کے پیچھے رہ جانے کا علم ہوگا تو وہ ضرور واپس آئیں گے آپ وہیں بیٹھ گئیں۔ مگر تھوڑی دیر کے بعد ہی آپ کو نیند آ گئی اور آپ وہیں زمین پر سو گئیں۔ جب صبح ہوئی تو ایک صحابیؓ جن کا نام صفوانؓ بن معطلؓ تھا اور جنہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس لئے پیچھے چھوڑ دیا تھا کہ دن چڑھے دیکھ لینا کہ کوئی چیز رہ تو نہیں گئی وہ اِدھر اُدھر گرے پڑے سامان کی تلاش میں وہاں سے گذرے تو انہوں نے دیکھا کہ ایک عورت

لیٹی ہوئی ہے پاس آئے تو معلوم ہوا کہ حضرت عائشہؓ ہیں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں سو رہی تھی کہ میرے کان میں اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَیْهِ رَاجِعُوْنَ کی آواز آئی۔ اُس وقت پردہ کا حکم نازل ہو چکا تھا۔ مگر چونکہ جنگل میں بے خبر سوئی پڑی تھیں مُنہ کھلا تھا اور پردہ سے پہلے اس صحابی نے آپ کو دیکھا ہوا تھا۔ پہچان لیا اور زور سے اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَیْهِ رَاجِعُوْنَ پڑھا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ اس آواز سے میری آنکھ کھل گئی۔ اِس کے بعد حضرت صفوانؓ نے چپکے سے قریب آکر اپنا اونٹ بٹھا دیا۔ اور حضرت عائشہؓ اُس پر سوار ہو گئیں۔ اور وہ صحابی اونٹ کی مہار پکڑ کر مدینہ کو چل پڑے جب مدینہ پہنچے تو عبد اللہ بن ابی بن سلول اور اس کے ساتھیوں نے مشہور کر دیا کہ حضرت عائشہؓ نعوذ باللہ جان بوجھ کر پیچھے رہی ہیں اور اُن کا صفوانؓ سے تعلق تھا۔ اور یہ شور اتنا بڑھا کہ بعض صحابہؓ بھی نادانی سے اُن کے ساتھ مل گئے جن میں سے ایک حسان بن ثابت ہیں اور دوسرے مسطح بن اثاثہ اسی طرح ایک صحابیہ حمنہ بنت جحش بھی تھیں جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سالی تھیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہ کو چونکہ اس حادثہ سے سخت صدمہ ہوا تھا اور وہ چھوٹی عمر میں ایک ایسے جنگل میں تن تنہا رہ گئی تھیں جہاں ہُو کا عالم تھا اسلئے وہ مدینہ پہنچ کر اس صدمہ سے بیمار ہو گئیں۔ اِدھر ان کے متعلق منافقین میں کھچڑی پکتی رہی۔ آخر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو بھی یہ باتیں پہنچ گئیں۔ مگر آپ حضرت عائشہؓ کی بیماری کو دیکھ کر اُن سے دریافت نہیں فرما سکتے تھے۔ اِدھر دن بدن باتیں زیادہ بڑھتی جاتی تھیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں۔ کہ میں یہ دیکھ کر حیران ہوتی کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم گھر میں تشریف لاتے تو آپ کا چہرہ اُترا ہوا ہوتا اور مجھ سے کوئی بات نہ کرتے۔ دوسروں سے حال پوچھتے اور چلے جاتے۔ اسی دوران میں آپ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے اجازت لے کر اپنے والدین کے ہاں تشریف لے گئیں۔

ایک دن قضائے حاجت کیلئے ایک اور عورت کے ساتھ جو اُن کی رشتہ دار تھیں باہر گئیں (اُس وقت تک پاخانے ابھی گھروں میں نہیں بنے تھے) جو عورت اُن کے ساتھ تھی اُس نے اپنے بیٹے مسطح کا نام لے کر کہا کہ اُس کا بُرا ہو حضرت عائشہؓ نے کہا۔ ایسا کیوں کہتی ہو۔ اُس نے کہا ایسا کیوں نہ کہوں آپ کو نہیں پتہ۔ وہ تو اِس اِس قسم کی باتیں کرتا ہے معلوم ہوتا ہے وہ عورت کوئی موقعہ نکالنا چاہتی تھی کہ بات کہے۔ جب حضرت عائشہؓ نے اس سے یہ بات سُنی تو انہیں سخت صدمہ ہوا۔ وہ جوں توں کر کے گھر تو پہنچیں مگر اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بیماری کا پھر زور ہو گیا۔ انہوں نے اپنے والد اور والدہ سے پوچھا کہ کیا بات ہے۔ انہوں نے کہا کہ لوگوں میں اِس اِس طرح بات مشہور ہو رہی ہے۔ اس پر اُنکی والدہ نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ کیا ہوا جہاں سوکنیں ہوتی ہیں۔ وہاں اس قسم کی باتیں ہُوا ہی کرتی ہیں۔ تجھے اس کی پرواہ نہیں کرنی چاہیئے۔ لیکن حضرت عائشہؓ کو اس قدر صدمہ ہوا کہ رونے لگ گئیں اور صبح تک اُن کی آنکھ نہ لگی۔ دن چڑھا تو پھر رونے لگ گئیں اور دوپہر تک یہی حالت رہی۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور حال پُوچھ کر باہر چلے گئے۔ باہر جا کر آپ نے حضرت عمرؓ۔ حضرت علیؓ اور اسامہ بن زیدؓ کو بلا کر مشورہ لیا کہ کیا کرنا چاہیئے۔ حضرت عمرؓ اور اسامہ بن زیدؓ دونوں نے کہا۔ یہ منافقوں کی پھیلائی ہوئی بات ہے اِس میں کوئی حقیقت نہیں لیکن حضرت علیؓ کی طبیعت تیز تھی۔ انہوں نے کہا بات کوئی ہو یا نہ ہو آپ کو ایسی عورت سے جس پر اتہام لگ چکا ہے تعلق رکھنے کی کیا ضرورت ہے لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ آپ اُن کی لونڈی سے پُوچھ لیں۔ اگر کوئی بات ہوئی تو وہ بتا دے گی۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہؓ کی لونڈی بریرہ سے پوچھا کہ کیا تجھے عائشہؓ کا کوئی عیب معلوم ہے۔ اُس نے کہا۔ میں نے عائشہؓ کا سوائے اِس کے اور کوئی عیب نہیں دیکھا کہ کم سنی کی وجہ سے

وہ سو جاتی ہیں اور بکری آکر آٹا کھا جاتی ہے۔ پھر رسول کریم
صلی اللہ علیہ وسلم باہر تشریف لے گئے اور صحابہؓ کو جمع کیا۔
اور فرمایا۔ کوئی ہے جو مجھے اس شخص سے بچائے جس نے
مجھے دُکھ دیا ہے۔ اس سے آپ کی مراد عبداللہ بن ابی ابن
سلول سے تھی۔ حضرت سعد بن معاذؓ جو اوس قبیلہ کے سردار
تھے کھڑے ہوئے۔ اور انہوں نے کہا۔ یا رسول اللہ اگر وہ
شخص ہم میں سے ہے تو ہم اس کو مارنے کیلئے تیار ہیں۔ اور
اگر وہ خزرج میں سے ہے تب بھی اس کو مارنے کے لئے تیار
ہیں۔ شیطان جو فتنہ ڈلوانے کے لئے موقعہ کی تلاش میں رہتا
ہے۔ اس موقعہ پر بھی نہ چوکا۔ خزرج کو یہ خیال نہ آیا کہ
رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو اس بات سے کتنا صدمہ
پہنچا ہے۔ انہوں نے اس کو قومیت کا سوال بنا لیا
چنانچہ سعد بن عبادہؓ کھڑے ہوئے۔ اور انہوں نے
سعد بن معاذؓ سے کہا۔ کہ تم ہمارے آدمی کو نہیں مار
سکتے اور نہ تمہاری طاقت ہے کہ ایسا کر سکو۔ اس
مقابلہ میں دوسرے صحابی اٹھے اور انہوں نے کہا ہم
اُسے مار ڈالیں گے اور دیکھیں گے کہ کون اسے بچاتا ہے
اب بجائے اس کے کہ یہ مقابلہ باتوں تک ہی رہتا
اوس اور خزرج نے میانوں سے تلواریں نکالنی شروع
کر دیں اور رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے بڑی مشکل
سے اُن کو ٹھنڈا کیا۔ اوس کہتے تھے کہ جس شخص نے رسول کریم
صلی اللہ علیہ وسلم کو دُکھ دیا ہے اُس کو ہم مار ڈالیں گے
اور خزرج کہتے تھے کہ تم یہ بات اخلاص سے نہیں
کہتے۔ چونکہ تم جانتے ہو کہ وہ ہم میں سے ہے اس
لئے یہ بات کہتے ہو۔ ان دونوں کو رسول کریم صلی اللہ
علیہ وسلم سے محبت تھی۔ مگر شیطان نے اُن میں فتنہ
پیدا کر دیا۔ اُس وقت کی حالت کے متعلق ہر شخص آسانی
سے سمجھ سکتا ہے کہ کیسی دردناک ہوگی۔ ادھر رسول کریم
صلی اللہ علیہ وسلم کو اتنی ایذاء پہنچ رہی تھی اور ادھر
مسلمانوں میں تلوار چلنے تک نوبت پہنچ گئی۔
رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم اُن کو ٹھنڈا کر کے
گھر تشریف لے گئے تو دیکھا کہ حضرت عائشہؓ رو رہی ہیں
رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو بات لوگوں میں
مشہور ہو رہی ہے تم نے سُنی ہے۔ انہوں نے کہا۔ ہاں
سُنی ہے۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ دیکھو
انسان سے گناہ ہو جاتا ہے۔ اگر تم سے غلطی ہو گئی ہو
تو توبہ کر لو۔ اور اگر نہیں ہوئی تو خدا تمہاری براءت کر
دے گا۔ حضرت عائشہؓ نے اپنے باپ حضرت ابو بکرؓ
کی طرف دیکھا اور کہا کہ آپ اس کا جواب دیں۔ انہوں
نے کہا مجھے تو اس کا کوئی جواب نہیں آتا۔ پھر انہوں
نے اپنی والدہ سے کہا کہ آپ اس کا جواب دیں۔ انہوں
نے بھی کہا کہ میں کوئی جواب نہیں دے سکتی۔ حضرت
عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ یہ جواب سن کر مجھ
پر ایسی حالت طاری ہوئی کہ میرے آنسو جو بہ رہے تھے
یکدم تھم گئے اور میں نے بڑے جوش سے کہا کہ وہ بات
جو مشہور ہو رہی ہے۔ اس کے متعلق اگر میں یہ کہتی ہوں
کہ غلط ہے تو آپ مانیں گے نہیں۔ اور اگر کہتی ہوں کہ
سچ ہے تو یہ جھوٹ ہے اس لئے میں اور تو کچھ نہیں
کہتی وہی کہتی ہوں جو حضرت یوسفؑ کے باپ حضرت
یعقوب علیہ السلام نے کہا تھا کہ فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ وَ
اللّٰهُ الْمُسْتَعَانُ۔ یہ کہہ کر میں وہاں سے اٹھی اور
اپنے بستر پر آ گئی۔ اتنے میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم
پر وحی کی حالت طاری ہوئی اور آپ پر یہ آیات
نازل ہوئیں کہ اِنَّ الَّذِيْنَ جَآءُوْ بِالْاِفْكِ عُصْبَةٌ
مِّنْكُمْ ؕ لَا تَحْسَبُوْهُ شَرًّا لَّكُمْ ؕ بَلْ هُوَ خَيْرٌ
لَّكُمْ ؕ لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ مَّا اكْتَسَبَ مِنَ
الْاِثْمِ ۚ وَالَّذِيْ تَوَلّٰى كِبْرَهٗ مِنْهُمْ لَهٗ عَذَابٌ
عَظِيْمٌ ۔ یعنی وہ لوگ جنہوں نے ایک خطرناک جھوٹ

لَوْلَآ إِذْ سَمِعْتُمُوْهُ ظَنَّ الْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ

جب تم نے یہ بات سُنی تھی تو کیوں نہ مومن مردوں اور مومن عورتوں نے اپنی قوم کے

بِاَنْفُسِهِمْ خَيْرًا ۙ وَّقَالُوْا هٰذَآ اِفْكٌ مُّبِيْنٌ ﴿۱۳﴾

متعلق نیک گمان کیا اور یہ کہہ دیا کہ یہ تو ایک بہت بڑا جھوٹ ہے؟

لَوْلَا جَآءُوْ عَلَيْهِ بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ ۚ فَاِذْ لَمْ

اور کیوں نہ وہ لوگ (جنہوں نے یہ جھوٹ پھیلایا تھا) اس پر چار گواہ لائے! - پس جب کہ وہ گواہ

يَاْتُوْا بِالشُّهَدَآءِ فَاُولٰٓئِكَ عِنْدَ اللّٰهِ هُمُ الْكٰذِبُوْنَ ﴿۱۴﴾

نہیں لائے تو اللہ (تعالیٰ) کے فیصلہ کے مطابق وہ جھوٹے ہیں۔ ۹

بولا ہے وہ تمہی میں سے ایک گروہ ہے۔ مگر تم اُس کے اس الزام کو اپنے لئے کسی خرابی کا موجب نہ سمجھو بلکہ خیر کا موجب سمجھو کیونکہ اس الزام کی وجہ سے جھوٹا الزام لگانے والوں کی سزاؤں کا جلدی ذکر ہوگیا اور تمہیں ایک پُر حکمت تعلیم مل گئی۔ اور یقیناً اُن میں سے ہر شخص اپنے اپنے گناہ کے مطابق سزا پائیگا اور جو شخص اس گناہ کے بڑے حصّے کا ذمہ وار ہے اُس کو بہت بڑا عذاب ملے گا۔ جب رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم پر یہ وحی نازل ہوئی۔ تو آپ کا چہرہ روشن ہوگیا۔ اور آپ نے حضرت عائشہؓ سے فرمایا۔ اے عائشہؓ خدا نے تمہیں اس الزام سے بری قرار دے دیا ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی والدہ نے یہ بات سُنی۔ تو انہوں نے کہا۔ عائشہؓ! رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا شکریہ ادا کرو۔ انہوں نے کہا۔ مَیں تو اسی خدا کا شکر ادا کرونگی جس نے مجھے اس الزام سے بری قرار دیا ہے۔ (سیرۃ الحلبیہ جلد ۲ صفحہ ۳۰۸ تا صفحہ ۳۱۴)

---

۹ تفسیر فرماتا ہے کہ خدائی حکم تو احسان کے طور پر نازل ہوگیا۔ مگر تمہارا اپنا قومی فرض تھا کہ جب تم نے اس قسم کی بے بنیاد بات سُنی تھی تو تم فوراً کہہ دیتے کہ مومن مرد اور مومن عورتیں ایسی نہیں ہو سکتیں۔ یہ محض جھوٹ ہے۔ اگر الزام لگانے والے سچے تھے تو وہ چار گواہ کیوں نہ لائے۔ حضرت عائشہؓ تو غلطی سے پیچھے رہ گئی تھیں اور صفوانؓ کو جنگی انتظام کے ماتحت پیچھے چھوڑا گیا تھا۔ پھر بغیر کسی گواہ کی موجودگی کے ایسا اتہام لگانا سوائے جھوٹوں اور کذابوں کے اور کس کا کام ہو سکتا ہے۔ پس آئندہ کے لئے یہ قانون یاد رکھو کہ جو لوگ چار گواہ نہیں لائیں گے وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے ماتحت جھوٹے سمجھے جائیں گے۔

اگر کوئی شخص کسی کو ایسا فعل کرتے دیکھتا ہے مگر گواہ نہیں رکھتا تو خواہ وہ اپنے آپ کو کتنا بھی سچا قرار دے اور بیت اللہ میں کھڑے ہو کر قسم کھائے تب بھی خدا تعالےٰ کے حکم اور اُس کے قانون کے مطابق وہ چار گواہ نہ لا سکنے کی وجہ سے جھوٹا اور کذّاب

وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ فِى الدُّنْيَا وَ

اور اگر اللہ (تعالیٰ) کا فضل اور رحمت تم پر دنیا اور آخرت میں نہ ہوتے

الْاٰخِرَةِ لَمَسَّكُمْ فِىْ مَاۤ اَفَضْتُمْ فِيْهِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۵﴾

تو تم کو اس کام (کی وجہ) سے جس میں تم پڑ گئے تھے بہت بڑا عذاب پہنچتا۔

اِذْ تَلَقَّوْنَهٗ بِاَلْسِنَتِكُمْ وَتَقُوْلُوْنَ بِاَفْوَاهِكُمْ مَّا لَيْسَ

اس وجہ سے کہ تم آپس میں ایک دوسرے کی زبان سے اس جھوٹ کو سیکھنے لگ گئے اور اپنے مونہوں سے وہ بات کہنے لگ گئے جس

لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ وَّتَحْسَبُوْنَهٗ هَيِّنًا ۖ وَّهُوَ عِنْدَ

تم کو کوئی علم نہیں تھا (خواہ تم پر نازل ہوا) اور تم اس بات کو معمولی سمجھتے تھے حالانکہ وہ اللہ کے نزدیک

اللّٰهِ عَظِيْمٌ ﴿۱۶﴾ وَلَوْلَاۤ اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ قُلْتُمْ مَّا

بہت بڑی تھی۔ اور کیوں نہ ہوا کہ جب تم نے اس بات کو سنا تھا تو فوراً کہہ دیا کہ

ہی ہوگا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کسی کا حق نہیں کہ ایسے شخص کی نسبت جو گواہ نہیں لا سکتا کہے کہ ممکن ہے وہ سچا ہی ہو۔ کیونکہ خدا تعالیٰ کہتا ہے کہ ہم اس کو جھوٹا قرار دیتے ہیں اور جب خدا اسے جھوٹا قرار دیتا ہے تو کسی اور کا کیا حق ہے کہ اُسے سچا قرار دے

اس آیت سے اصولی طور پر یہ امر مستنبط ہوتا ہے کہ اگر کسی کے متعلق کوئی بُری بات سُنی جائے تو مومن کا پہلا فرض یہ ہوتا ہے کہ وہ نیک ظنی کو کبھی ترک نہ کرے کیونکہ اگر وہ بُرائی بعد میں دوسرے میں ثابت بھی ہو جائے تب بھی اُسے نیک ظنی کا ثواب مل جائیگا۔ اور اگر ثابت نہ ہو تو انسان بدظنی کرکے دوہرا مجرم قرار پائیگا ایک تو اس لحاظ سے کہ اس نے بدظنی کی اور دوسرے اس لحاظ سے کہ ایک بے گناہ پر الزام لگا کر اُس نے شریعت کی بے حرمتی کی۔ شریعت کہتی ہے کہ جس شخص کے متعلق کوئی بُری بات تمہارے پاس بیان کی جائے تم ہمیشہ اس کے متعلق حسن ظن رکھو اور بُری بات کہنے والے کو جھوٹا سمجھو کیونکہ اس نے دوسرے کی عزت پر حملہ کیا ہے۔ اگر زید تمہارے پاس ایک شخص کی بُرائی بیان کرتا ہے اور تم زید کی بات سُن کر اس پر فوراً یقین کر لیتے ہو۔ اور جس کے متعلق کوئی بات کہی گئی ہو اس کو مجرم سمجھنے لگ جاتے ہو تو تم بدظنی کا ارتکاب کرتے ہو۔ اور اگر وہ عیب ایسا ہے جس کے لئے شریعت نے گواہی کا کوئی خاص طریق مقرر کیا ہوا ہے تو نہ صرف عیب لگانے والا شریعت کا مجرم بنتا ہے بلکہ جو اس کی ہاں میں ہاں ملاتا اور اس کی تائید کرتا ہے وہ بھی مجرم ہے۔ ایسے مواقع پر شریعت کی یہی ہدایت ہے کہ جسکا جرم بیان کیا جاتا ہے اسے بری سمجھو اور جو کسی کا عیب بیان کرتا ہے اس کا جرم چونکہ ثابت ہے،

يَكُوْنُ لَنَآ اَنْ نَّتَكَلَّمَ بِهٰذَا ۖ سُبْحٰنَكَ هٰذَا بُهْتَانٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۷﴾

یہ ہمارا کام نہیں کہ ہم اِس بات کو آگے دوہرائیں - اے خدا تُو پاک ہے یہ بہت بڑا بہتان ہے -

يَعِظُكُمُ اللّٰهُ اَنْ تَعُوْدُوْا لِمِثْلِهٖٓ اَبَدًا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۸﴾

اللہ (تعالیٰ) تم کو اس قسم کی بات کے دوبارہ کرنے سے ہمیشہ کے لئے روکتا ہے اگر تم مومن ہو -

وَيُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۱۹﴾

اور اللہ (تعالیٰ) تمہارے لئے اپنے احکام بیان کرتا ہے - اور اللہ (تعالیٰ) بہت جاننے والا حکمت والا ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يُحِبُّوْنَ اَنْ تَشِيْعَ الْفَاحِشَةُ فِى الَّذِيْنَ

یقیناً جو لوگ چاہتے ہیں کہ مومنوں میں بدی پھیل جائے

اُسے کبھی سچا قرار نہ دو -

ش۵ حل لغات :- اَفَضْتُمْ - اَفَاضَ سے جمع مخاطب کا صیغہ ہے اور اَفَاضَ الْقَوْمُ فِی الْحَدِیْثِ کے معنے ہوتے ہیں لوگ باتوں میں لگ گئے (اقرب) پس اَفَضْتُمْ فِیْهِ کے معنے ہونگے جس کے بارہ میں تم باتوں میں لگ گئے تھے۔

تَلَقَّوْنَهٗ - تَلَقّٰی سے جمع مخاطب کا صیغہ ہے۔ اور تَلَقَّی الشَّیْءَ مِنْهُ کے معنے ہوتے ہیں تَلَقَّنَهٗ اس سے کسی بات کو سیکھا اور قبول کیا (اقرب) پس تَلَقَّوْنَهٗ کے معنے ہونگے۔ تم اس کو سیکھتے تھے۔

هَیِّنٌ : کہتے ہیں هَانَ الْاَمْرُ عَلٰی فُلَانٍ اور معنے یہ ہوتے ہیں کہ سَهُلَ یعنی یہ بات فلاں پر آسان ہوگئی (اقرب) پس هَیِّنٌ کے معنی ہونگے۔ معمولی اور آسان بات۔

تفسیر :- فرماتا ہے کہ اس طرح اُن لوگوں پر الزام لگانا جو قوم کے لئے اپنی جانیں دینے کے لئے نکلتے ہیں نہایت خطرناک گناہ ہے۔ اور اگر خدا تعالیٰ دنیا اور آخرت میں مسلمانوں کو بچانا نہ چاہتا تو اس گناہ کے بدلہ میں تمہیں بڑی سخت سزا ملتی - جبکہ تم دوسروں سے

ایک بات سُن کر اپنی زبانوں سے دہراتے چلے جاتے تھے - اور ایسی باتوں کا چرچا کرتے تھے جن کا تمہیں کوئی علم نہیں تھا - اور قومی خادموں کے متعلق ایسی باتیں کہنا آسان سمجھتے تھے حالانکہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہ بہت بڑا جرم تھا۔

اَفَضْتُمْ

اور کیوں ایسا نہ ہوا کہ جس وقت یہ بہتان تم نے سُنا تھا تو تم نے فوراً کہدیا ہوتا کہ ہمیں زیبا نہیں کہ ہم ایسی بات مُنہ سے نکالیں جس نے یہ بات بیان کی ہے - وہ گواہ لائے اور اس الزام کو ثابت کرے - ہمارا اس سے کیا تعلق ہے کہ ہم سُنیں اور دوسروں کو سُنائیں - یہ ایک بہت بڑا بہتان ہے جو دوسرے پر لگایا جا رہا ہے - اللہ تعالیٰ تم کو نصیحت کرتا ہے کہ اگر تم مومن ہو تو ایسی بات پھر کبھی مُنہ سے نہ نکالنا -

تَلَقَّوْنَهٗ

هَیِّنٌ

اٰمَنُوْا لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ فِی الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ ؕ

اُن کے لئے بڑا دردناک عذاب ہے دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی

وَ اللّٰهُ يَعْلَمُ وَ اَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۰﴾ وَ لَوْ لَا فَضْلُ اللّٰهِ

اور اللہ (تعالیٰ) جانتا ہے اور تم نہیں جانتے ۔ اور اگر اللہ (تعالیٰ) کا فضل

عَلَيْكُمْ وَ رَحْمَتُهٗ وَ اَنَّ اللّٰهَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴿۲۱﴾ ع ۲ / ۸

اور رحم تم پر نہ ہوتا اور اگر اللہ (تعالیٰ) بہت مہربان (اور) بار بار رحم کرنیوالا نہ ہوتا (تو تم دُکھ میں پڑ جاتے ۔ ؎۱۱

؎۱۱ حل لغات:- تَشِيْعَ : شَاعَ الْخَبَرُ (يَشِيْعُ) کے معنے ہوتے ہیں ذَاعَ وَ فَشَا۔ خبر پھیل گئی (اقرب) پس اَنْ تَشِيْعَ الْفَاحِشَةُ کے معنے ہوں گے کہ بدی پھیل گئی ۔

اَلْفَاحِشَةُ : اَلزِّنٰی۔ فاحشہ کے معنے ہوتے ہیں زنا مَا يَشْتَدُّ قُبْحُهٗ مِنَ الذُّنُوْبِ۔ وہ گناہ جس کی بُرائی بہت سخت ہو ۔ وَ قِيْلَ كُلُّ مَا نَهَى اللّٰهُ عَنْهُ۔ اور بعض کے نزدیک فاحشہ کے معنے ہر اس امر کے ہیں جن سے اللہ تعالیٰ نے روکا ہے (اقرب)

تفسیر:- فرماتا ہے۔ ایسی باتیں کرنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لوگ فحش پر دلیر ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ جب نوجوان سُنتے ہیں کہ ہمارے بڑے بھی ایسے کام کر لیتے ہیں تو وہ بھی ایسے کام کرنے لگ جاتے ہیں۔ پس اس جرم پر جو سخت سزا تجویز کی گئی ہے تو وہ صرف فرد کی عزّت کی حفاظت کے لئے نہیں بلکہ قوم کی عزّت اور اس کے اخلاق کی حفاظت کے لئے ہے۔ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان اس قسم کی باتیں کرنے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے عذاب کا مستحق ہو جاتا ہے مگر بہت ہیں جو ایسی باتیں سُنتے ہیں. اور سُنتے ہی نہیں آگے پہنچاتے ہیں اور جب پوچھا جائے تو کہہ دیتے ہیں کہ یونہی بات مُنہ سے نکل گئی تھی حالانکہ اللہ تعالیٰ واضح طور پر فرماتا ہے کہ یہ چیز اللہ تعالےٰ کے عذاب کا نشانہ بنا دیتی ہے۔ پس اس بہت بڑے گناہ سے بچو اور کوشش کرو کہ کبھی تمہارے مُنہ سے کسی کے متعلق ایسی بات نہ نکلے ۔

اِس آیت میں خدا تعالیٰ نے علم النفس کا ایک ایسا نکتہ بیان کیا ہے جو قرآن کریم کے کلام الٰہی ہونے کا ایک زبردست ثبوت ہے۔ کیونکہ علم النفس کی تحقیق پہلے زمانہ میں نہیں ہوئی تھی یہ تحقیق انیسویں صدی میں شروع ہوئی اور اب بیسویں صدی میں اس نے ایک علم کی صورت اختیار کی ہے۔ وہ مسئلہ جو قرآن کریم نے اِن آیات میں بیان فرمایا ہے وہ یہ ہے کہ بُری باتوں کا مجالس میں تذکرہ نہیں کرنا چاہیئے ورنہ وہی برائیاں لوگوں میں کثرت کے ساتھ پھیل جائیں گی۔ بے شک دنیا میں لوگ کثرت سے ڈاکہ اور چوری وغیرہ بُرے افعال سے نفرت کرتے ہیں۔ لیکن باوجود اس کے میں سمجھتا ہوں کہ اگر ان کا ذکر لوگوں میں کثرت سے ہونے لگے تو تھوڑے ہی دنوں میں تم دیکھو گے کہ ڈاکہ کی وارداتیں زیادہ ہونے لگی ہیں جیسے گجرات، شیخوپورہ اور گوجرانوالہ وغیرہ اضلاع میں کئی بڑے بڑے شریف نمازی اور تہجد گذار کہلانے والے دوسرے کی بھینس کھول کر گھر لے آئیں گے۔ اور اس بات کا ذرا بھی احساس نہیں کریں گے کہ انہوں نے کوئی بُرا کام کیا ہے۔ بیر

ایک دفعہ گھوڑے چوری ہو گئے تو ایک احمدی نے جو پہلے چوروں کے ساتھ مل کر چوریاں کیا کرتے تھے مجھے کہلا بھیجا کہ آپ ہمیں اجازت دیں تو ہم سارے علاقہ کو سیدھا کر دیتے ہیں۔ میں نے پیغامبر کو جواب دیا کہ اُن سے کہہ دینا کہ آپ کو اللہ تعالیٰ نے بڑھاپے میں توبہ کی توفیق عطا فرمائی ہے۔ اب یہی بہتر ہے کہ آپ اپنی توبہ پر قائم رہیں اور اس کو توڑنے کی کوشش نہ کریں اللہ تعالیٰ مجھے اور گھوڑے دے دیگا۔

غرض بعض علاقوں میں جانوروں کی چوری کی اتنی کثرت ہے کہ اسے اعلیٰ درجہ کا بہادری کا فن سمجھا جاتا ہے مثلاً گجرات کے علاقہ میں ہی بعض اقوام میں پہلے یہ رواج ہوا کرتا تھا گو غالباً اب نہیں کہ بیٹے کو پگڑی نہیں پہناتے تھے جب تک وہ ایک چوری کی بھینس اپنی بہن کو لاکر نہ دیتا تھا۔ لڑکا جب جوان ہو جاتا اور پگڑی اس کے سر پر نہ ہوتی تو اپنے رشتہ دار اسے طعنے دیتے۔ اور کہتے۔ بے حیا اتنا بڑا ہو گیا ہے۔ مگر اب تک اس سے اتنا بھی نہیں ہو سکا کہ ایک بھینس چُرا کر اپنی بہن کو لادے اور اپنے سر پر پگڑی بندھوائے۔ اس طرح ہر نوجوان کو چوری پر مجبور کیا جاتا اور وہ بڑا ہو کر جانوروں کا چور بنتا۔ ہماری جماعت کے ایک مخلص دوست جواب مخلص احمدی ہیں جب شروع شروع میں آئے تو اُن کا ایک لڑکا اُن کے ساتھ تھا جس کے سر پر پگڑی نہیں تھی حضرت ام المومنینؓ نے گھر میں اُنکی اہلیہ سے دریافت کیا کہ اس بچے کے سر پر پگڑی کیوں نہیں۔ تو اُس نے بتایا کہ جب یہ کسی کی بھینس چُرا کر اپنی بہن کو لادیگا تب اس کے سر پر پگڑی باندھی جائیگی۔ کیونکہ یہ ہمارے علاقہ کا دستور ہے۔ گو وہ دوست ہمیشہ یہ واقعہ سُنکر شرمندہ ہوا کرتے تھے اور کہتے تھے کہ یہ بات نہیں تھی۔ میرے گھر والوں نے صرف ہنسی سے ایسا ذکر کیا تھا۔ مگر بہرحال اُنکے علاقہ میں یہ رواج تو تھا۔ تبھی اُن کی اہلیہ نے اِس کا ذکر کیا۔ یہی بات ایک دفعہ ہمارے نانا جان حضرت میر ناصر نواب صاحب مرحوم نے سُنی تو اس کا اُن پر اتنا اثر ہؤا کہ ایکدفعہ جبکہ مجلس میں بعض اَور دوست بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ برسبیل تذکرہ وہ کہنے لگے۔ کہ گجرات کا ہر شخص چور ہوتا ہے۔ میرے ذہن میں اس وقت یہ واقعہ نہیں تھا۔ میں نے کہا یہ صحیح نہیں۔ ہر علاقہ میں نیک لوگ بھی ہوتے ہیں۔ کہنے لگے نہیں. گجرات کا ہر شخص چور ہوتا ہے۔ میں نے کہا۔ میر صاحب آپ کی یہ بات درست نہیں۔ ہماری جماعت میں بھی اس علاقہ کے لوگ شامل ہیں اور وہ بڑے نیک ہیں وہ میری اس بات پر بھی کہنے لگے۔ خواہ کچھ ہو چور ضرور ہونگے۔ میرا ذہن اسوقت تک بھی اس قصہ کی طرف نہیں گیا اور میں نے چند دوستوں کے نام لئے کہ دیکھیں فلاں دوست کیسے نیک ہیں۔ فلاں دوست کیسے نیک ہیں۔ وہ کہنے لگے اگر وہ گجرات کے ہیں تو ضرور چور ہونگے۔ اِس دوران میں چونکہ ایک مذاق کی صورت پیدا ہو گئی تھی۔ اِس لئے میں نے نام لے کر کہا کہ حافظ روشن علیؓ صاحب بھی گجرات کے علاقہ کے ہیں۔ کیا وہ بھی چور ہیں۔ میرے اِس جواب پر میر صاحب کہنے لگے۔ حافظ روشن علی صاحب گجرات کے ہیں؟ میں نے کہا۔ ہاں! اِس پر وہ پہلے تو ذرا رُک گئے۔ مگر پھر کہنے لگے۔ اگر وہ گجرات کے ہیں تو وہ بھی چور ہونگے۔ آخر میں نے اُن سے پوچھا کہ آپ اتنے وثوق سے یہ بات کیوں کہہ رہے ہیں تو انہوں نے کہا کہ وہاں تو دستور ہے کہ بچّہ کے سر پر اُس وقت تک پگڑی نہیں باندھتے جب تک وہ ایک بھینس چُرا کر اپنی بہن کو نہ دے۔

اب یہ رسم جو ان علاقوں میں ہے اِس کی یہی وجہ ہے کہ اِن اضلاع میں چونکہ ہر وقت جانوروں کی چوری کا ذکر ہوتا رہتا ہے اِس لئے سارے علاقہ میں چوری کا

رواج ہوگیا۔ یوں اگر وہ سُنیں کہ کسی نے دوسرے کا روپیہ اُٹھا لیا ہے تو وہ بھی بُرا مناتے ہیں لیکن جانوروں کی چوری کے ذکر پر اُن کے دلوں میں کوئی احساس پیدا نہیں ہوتا کیونکہ اِس کا ذکر اُن میں عام ہے۔ اور جس بدی کا ذکر عام ہو جائے وہ قوم کے افراد میں پھیل جاتی ہے۔ اِسی طرح پٹھانوں میں قتل کا رواج ہے اور وہ اسے کوئی عیب نہیں سمجھتے۔ کیونکہ ہر وقت اُن میں قتل کا چرچا رہتا ہے۔ مشہور ہے کہ کسی پٹھان کا لڑکا ایک ہندو سے پڑھتا تھا۔ ایک دن اُستاد کسی بات پر ناراض ہُوا۔ تو لڑکے نے تلوار اُٹھالی اور چاہا کہ اُسے قتل کردے۔ وہ ہندو آگے آگے بھاگا اور لڑکا پیچھے پیچھے۔ وہ بھاگتا جارہا تھا کہ راستہ میں اس لڑکے کا باپ مل گیا۔ اُس نے یہ سمجھتے ہوئے کہ باپ اسے روک لیگا کہا خان صاحب دیکھئے آپ کا لڑکا مجھے قتل کرنا چاہتا ہے۔ اِسے روکئے۔ اب خان صاحب بجائے اس کے کہ اپنے لڑکے کو روکتے۔ اس ہندو کو گالی دے کر کہنے لگے۔ لو بنئے۔ کیا کر رہا ہے۔ میرے بیٹے کا یہ پہلا وار ہے خالی نہ جائے۔ غرض جب اشاعتِ فحش ہو اور بدی کا ذکر عام طور پر لوگوں کی زبان پر ہو۔ تو وہ بدی قوم میں پھیل جاتی ہے۔ اِسی لئے ہماری شریعت نے عیوب کا عام تذکرہ ممنوع قرار دیا ہے۔ اور فرمایا ہے کہ جو اولی الامر ہیں اُن تک بات پہنچا دو اور خود خاموش رہو۔ اگر ایسا نہ کیا جائے اور ہر شخص کو یہ اجازت ہو کہ وہ دوسرے کا جو عیب بھی سُنے اُسے بیان کرتا پھرے۔ تو اُس کے نتیجہ میں قلوب میں سے بدی کا احساس مٹ جاتا ہے اور بُرائی پر دلیری پیدا ہو جاتی ہے۔ پس اسلام نے بدی کی اس جڑ کو مٹایا۔ اور حکم دیا کہ تمہیں جب کوئی بُرائی معلوم ہو تو اولی الامر کے پاس معاملہ پہنچاؤ جو سزا دینے کا بھی اختیار رکھتے ہیں۔ اور تربیت نفوس اور اصلاح قلوب کے لئے اور تدابیر بھی اختیار کر سکتے ہیں۔ اس طرح بدی کی تشہیر نہیں ہوگی۔ قوم کا کیریکٹر محفوظ رہے گا اور لوگوں کی اصلاح بھی ہو جائیگی پس یاد رکھو کہ نیکی کی تشہیر اور بدی کا اخفاء یہ کوئی معمولی بات نہیں۔ بلکہ قومیں اس سے بنتی اور قومیں اِس کی خلاف ورزی سے بگڑتی ہیں۔ جتنا تم اس بات کا زیادہ ذکر کروگے کہ فلاں اتنی قربانی کرتا ہے۔ فلاں اِس طرح نمازیں پڑھتا ہے۔ فلاں اِس اہتمام سے روزے رکھتا ہے اتنا ہی لوگوں کے دلوں میں دین کے لئے قربانی کرنے اور نمازیں پڑھنے اور روزے رکھنے کی خواہش پیدا ہوگی اور جتنی تم اس بات کو شہرت دوگے کہ لوگ جھوٹ بولتے ہیں وہ خیانت کرتے ہیں۔ وہ چوری کرتے ہیں۔ وہ ظلم کرتے ہیں اتنا ہی لوگوں کے دلوں میں اُن بدیوں کی طرف رغبت پیدا ہوگی اِسی لئے قرآن کریم نے ہمیں یہ تعلیم دی ہے کہ جب تم کسی کی نیکی دیکھو تو اُسے خوب پھیلاؤ۔ اور جب کسی کی بدی دیکھو اس پر پردہ ڈالو۔ ایک بلّی بھی جب پاخانہ کرتی ہے تو اُس پر مٹی ڈال دیتی ہے۔ پھر انسان کے لئے کسقدر ضروری ہے کہ وہ بدی کی تشہیر نہ کرے بلکہ اُس پر پردہ ڈالے اور اس کے ذکر سے اپنے آپ کو روکے۔ اگر اس ذکر سے اپنے آپ کو نہیں روکا جائیگا تو متعدی امراض کی طرح وہ بدی قوم کے دوسرے افراد میں بھی سرایت کر جائے گی۔ اور خود اس کا خاندان تو لازماً اس میں مبتلا ہو جائیگا۔ کیونکہ انسان کا قاعدہ ہے کہ جو چیز کثرت سے اُس کے سامنے آئے وہ اس کی نظر میں حقیر ہو جاتی ہے اور جس بات کے متعلق یہ عام چرچا ہو کہ لوگ کثرت سے کرتے ہیں وہ بالکل معمولی سمجھی جاتی ہے۔ اس اصول کے ماتحت جو بات لوگوں میں عام طور پر پھیلائی جائے اس کا لوگوں پر یہ اثر پڑتا ہے کہ معمولی بات ہے۔ اور جب اس قسم کے الزام کثرت سے لگائے جائیں اور لوگ اُن کے پھیلانے میں کسی کی عزّت کی پرواہ نہ کریں تو لازماً وہ ان باتوں کو معمولی سمجھیں گے اور جب معمولی سمجھیں گے تو اُن کا ارتکاب بھی

اُن کے لئے معمولی بات ہوگی ۔ خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ اگر تم
ایسا کرو گے اور اس قسم کی افواہوں کو نہیں روکو گے تو
تمہاری قوم ان کو معمولی سمجھنے لگے گی ۔ اور جب معمولی سمجھیگی
تو اس کا ارتکاب بھی کثرت سے کرے گی ۔ اس لئے ایسی باتوں
کو پھیلنے ہی نہ دو ۔ اسی نکتہ کی طرف رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم
نے بھی ان الفاظ میں توجہ دلائی ہے کہ مَنْ قَالَ ھَلَکَ
الْقَوْمُ فَھُوَ اَھْلَکُھُمْ ۔ یعنی جس شخص نے یہ اعلان
کرنا شروع کر دیا کہ ہماری قوم تباہ ہو گئی وہ اپنی قوم کو
تباہ کرنے والا ہے ۔

بعض لوگوں نے اس حدیث سے یہ دھوکا کھایا ہے
کہ کسی شخص کے یہ کہنے سے کہ قوم ہلاک ہو گئی ۔ ساری کی ساری
قوم کس طرح ہلاک ہو سکتی ہے اور چونکہ یہ بات اُن کی سمجھ میں
نہیں آئی اس لئے وہ کہتے ہیں کہ اس حدیث میں اَھْلَکَھُمْ
کا لفظ نہیں بلکہ اَھْلَکُھُمْ کا لفظ ہے یعنی وہ شخص سب سے
زیادہ ہلاک ہونے والا ہے ۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ انہوں نے
قومی نفسیات کو سمجھا ہی نہیں ۔ یہ کہہ دینا کہ جو شخص کہتا ہے
قوم ہلاک ہو گئی وہ سب سے زیادہ ہلاک ہونے والا ہے
اوّل تو بعض حالتوں میں درست ہی نہیں اور پھر یہ صحیح بھی نہیں
کہ ان الفاظ کی وجہ سے وہ سب سے زیادہ ہلاک ہونے
والا بن جاتا ہے ۔ درحقیقت ان لوگوں نے اس بات کو نہیں سمجھا
کہ جب کسی قوم میں مایوسی پیدا کر دی جائے تو وہ بڑے بڑے
کام کرنے سے ہمیشہ کے لئے محروم ہو جاتی ہے کبھی کسی قوم
کا دانا اور سمجھدار لیڈر ایسا نہیں ہو سکتا جو اُس کو مایوس
کر دے اور آئندہ ترقیات کے متعلق اس کے دل میں ناامیدی
پیدا کر دے ۔ کیونکہ جب کسی قوم کو مایوس کر دیا جائے تو وہ
تباہ ہونی شروع ہو جاتی ہے ۔ چنانچہ دیکھ لو مسلمانوں میں
جب یہ خیال پیدا ہوا کہ قرآن کریم کی تفاسیر جو لوگ پہلے لکھ
چکے ہیں اُن سے زیادہ اب کچھ نہیں لکھا جا سکتا تو مسلمانوں
میں اُسی وقت تنزل پیدا ہونا شروع ہو گیا ۔ اُنکی معرفت
جاتی رہی اور وہ آسمانی علوم سے اس قدر محروم ہو گئے کہ ہم
زمانہ میں جب حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے
قرآن کریم کے نئے نئے معارف بیان کرنے شروع کر دیئے اور
پھر ہمارے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ نے اس کے عجیب و غریب
اسرار کھولے تو مسلمانوں نے کہنا شروع کر دیا کہ یہ تفسیر بالرائے
ہے ۔ گویا انہیں معرفت کی باتوں سے اتنی دُوری ہو گئی کہ اسلام
کی باتیں انہیں کفر کی باتیں دکھائی دینے لگیں ۔ اور قرآن کریم کی
باتیں انہیں بے دینی کی باتیں نظر آنے لگیں ۔ اس کی وجہ یہی ہے
کہ جب قوم سے کہہ دیا گیا کہ آئندہ لوگوں کو کوئی ذہنی ارتقاء
حاصل نہیں ہو سکتا ۔ آئندہ کوئی شخص ایسا پیدا نہیں ہو سکتا
جو قرآن کریم کو پہلوں سے زیادہ سمجھ سکے تو دوسرے الفاظ
میں انہوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ ہماری قوم ہلاک ہو گئی ۔
اب اس میں کوئی زندہ وجود باقی نہیں رہا ۔ اور جب انہوں
نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ ہماری قوم میں کوئی زندہ وجود
باقی نہیں رہا ۔ ہماری قوم میں کوئی ایسا شخص نہیں رہا جو یہ کہہ
سکے کہ میں نے قرآن سے فلاں نئی بات نکالی ہے ۔ تو نتیجہ یہ
ہوا کہ لوگوں نے قرآن پر تدبّر کرنا ترک کر دیا ۔ انہوں نے
حدیثوں پر غور کرنا چھوڑ دیا ۔ اور انہوں نے کہا کہ جب ہمیں
کوئی نئی بات نہ قرآن سے حاصل ہو سکتی ہے اور نہ حدیث
سے مل سکتی ہے تو ہمیں قرآن اور حدیث پر غور کرنے کی ضرورت
ہی کیا ہے ۔ پُرانی تفسیریں ہی ہمارے لئے کافی ہیں ۔ یہ ایک
لازمی نتیجہ تھا اس خیال کا کہ قرآن کریم سے اب کوئی نیا نکتہ
نہیں نکل سکتا ۔ بلکہ رازی اور ابن حیان اور دوسرے
مفسرین نے جو کچھ لکھا ہے وہی ہمارے لئے کافی ہے پھر
یہ عذاب اتنا بڑھا کہ آج سے پچیس[۲۵] تیس[۳۰] سال پہلے بڑے
بڑے مولوی ایسے تھے جو قرآن کریم کا صحیح ترجمہ تک نہیں
جانتے تھے ۔ کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ ہمارے لئے قرآن کریم کا
ترجمہ جاننا ضروری نہیں اتنا ہی کافی ہے کہ اگر موقعہ ملے
تو کوئی پُرانی تفسیر دیکھ لی جائے ۔

یہ ہلاکت محض اس وجہ سے ہوئی کہ قوم کو مایوس کر دیا گیا۔ اسے کہہ دیا گیا کہ قرآن کریم کے معارف تک اس کی رسائی نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح جب مسلمانوں کو کہہ دیا گیا کہ خدا بولتا نہیں۔ وہ کسی سے محبت نہیں کرتا۔ وہ کسی سے پیار نہیں کرتا۔ وہ کسی کی التجا اور دعا کا جواب نہیں دیتا تو لوگوں کے دلوں سے خدا تعالیٰ کا قرب حاصل کرنے اور اس سے ملنے کی خواہش بھی مٹنی شروع ہو گئی آخر یہ خواہش کہ خدا مجھ سے ملے۔ وہ میرے ساتھ باتیں کرے۔ وہ مجھے اپنا پیارا بنا لے۔ وہ میرا ہو جائے اور میں اس کا ہو جاؤں انسان تبھی کرے گا جب اُسے یہ خیال ہو گا کہ ایسا ہو سکتا ہے لیکن جب اُس کا یہ خیال ہو کہ ایسا ہو ہی نہیں سکتا تو وہ اس غرض کے لئے کوشش ہی کیوں کریگا۔ جب مسلمانوں میں یہ خیال پیدا کر دیا گیا کہ ہم خدا کے نہیں ہو سکتے اور خدا ہمارا نہیں ہو سکتا۔ جب قوم کے لیڈروں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ هَلَكَ الْقَوْمُ ہماری قوم ہلاک ہو گئی۔ ہماری قوم میں وہ استعداد ہی نہیں رہی کہ جس سے کام لے کر وہ خدا سے محبت کر سکے۔ اُس کے فضل کو اپنی طرف کھینچ سکے۔ اس کی وحی اور الہام کی مورد بن سکے تو نتیجہ یہ ہُوا کہ انہوں نے اس طرف سے اپنی توجہ ہی ہٹا لی اور خدا تعالیٰ کے دروازہ کو بند سمجھ کر اسے کھٹکھٹانا ترک کر دیا۔ اگر کسی مکان کا دروازہ بند ہو۔ باہر کی طرف اس پر قفل لگا ہُوا ہو تو کون بے وقوف ہے جو اس دروازہ پر بیٹھ کر مالکِ مکان کو آوازیں دینی شروع کر دیگا اگر کسی کے مکان کے دروازہ کے متعلق یہ اعلان کر دیا جائے کہ اُسے قطعی طور پر بند کر دیا گیا ہے اور پھر اس دروازہ کو کوئی شخص کھٹکھٹانا شروع کر دے۔ تو سب لوگ اسے احمق اور پاگل سمجھیں گے کیونکہ وہ ایسا دروازہ کھٹکھٹا رہا ہو گا جو بند ہو چکا ہے اور جس کے کھلنے کا کوئی امکان ہی نہیں ہے۔ اس کے مقابلہ میں اگر کسی عمارت کا دروازہ تو بند ہو لیکن کھڑکی کھلی ہو تو سب لوگ اس کھڑکی کی طرف جائیں گے دروازہ کی طرف نہیں جائیں گے۔ وہ کھڑکی کی طرف اس لئے جائیں گے کہ کھڑکی کھلی ہو گی اور دروازہ کی طرف اس لئے نہیں جائیں گے کہ دروازہ بند ہو گا۔ اسی طرح جب خدا تعالیٰ کی محبت کا دروازہ بند کر دیا گیا جب مسلمانوں میں یہ خیال پیدا کر دیا گیا کہ اس دروازہ سے تمہیں کوئی آواز نہیں آ سکتی خواہ تم کس قدر چلاؤ خواہ تم کس قدر آہ وزاری سے کام لو تو نتیجہ یہ ہُوا کہ انہوں نے خدا تعالیٰ کا دروازہ چھوڑ دیا اور پیروں اور فقیروں کے پیچھے چل پڑے۔ کیونکہ گو وہ چھوٹی چھوٹی کھڑکیاں تھیں مگر وہ چھوٹی چھوٹی کھڑکیاں انہیں کھلی نظر آئیں اور بڑا دروازہ انہوں نے مقفل پایا۔ پس وہ خدا کے دروازہ کو چھوڑ کر پیروں اور فقیروں کے پیچھے چل پڑے انہوں نے کہا کہ یہ ہیں تو کھڑکیاں مگر کھلی کھڑکیاں ہیں پس آؤ ہم ان کھڑکیوں سے اندر کی طرف جھانکیں۔ مگر جانتے ہو اس کا کیا نتیجہ ہُوا؟ یہی ہُوا کہ خدا کی محبت اور خدا کا پیار مسلمانوں کے دلوں سے جاتا رہا۔ روحانیت کا اُن میں فقدان ہو گیا۔ وہ اس کے قرب سے ہمیشہ کے لئے محروم ہو گئے اور خدا تعالیٰ کا تازہ بتازہ کلام سُننے سے اُن کے کان ہمیشہ کیلئے ناآشنا ہو گئے۔

اسی طرح اسلامی تمدّن اور سیاست میں بھی خطرناک نقص پیدا ہو گیا کیونکہ کہا گیا کہ صحابہؓ کے زمانہ میں تمدّن نے جو شکل اختیار کی تھی اس سے زیادہ اسلامی تمدّن کو کوئی شکل نہیں دی جا سکتی۔ حالانکہ تمدّن کی شکل ہر زمانہ کے لحاظ سے بدلتی چلی جاتی ہے۔ کسی زمانہ میں اس کی کوئی شکل موزوں ہوتی ہے اور کسی زمانہ میں

اُس کی کوئی شکل موزوں ہوتی ہے۔ سچا مذہب وہی ہوتا ہے جو اپنے اندر لچک رکھتا ہے۔ اسی لئے وہ مذہب جو دنیا میں ایک لمبے عرصہ کے لئے آتے ہیں اُن کی تعلیم کے اندر ایک قسم کی لچک پائی جاتی ہے جو مختلف زمانوں اور مختلف حالات کے مطابق تغیر پذیر ہوتی چلی جاتی ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں اسلامی تمدّن نے جو شکل اختیار کی وہ اَور تھی۔ مگر اب اس تمدّن نے جو شکل اختیار کرنی ہے وہ اَور ہے۔ بے شک اس تمدّن کے اصول ایک ہی رہیں گے مگر اس کی شکل زمانہ کے حالات کے لحاظ سے بدلتی چلی جائیگی اعتراض تب ہو جب اصول میں تبدیلی ہو لیکن جیسا کہ مَیں نے بتایا ہے اصول ہمیشہ ایک ہی رہیں گے۔ صرف اس تمدّن کی شکل میں زمانہ کے حالات کے لحاظ سے تبدیلی ہوتی چلی جائیگی۔ اور شکل میں یہ تبدیلی بالکل جائز ہوگی۔ مگر چونکہ کہہ دیا گیا کہ اسلامی تمدّن انتہا تک پہنچ چکا ہے اور یہ کہ اس قانون میں کوئی لچک نہیں اگر لوگ پُرانے زمانہ کے تمدّن کی نقل کریں تو بے شک کریں لیکن اس کے خلاف کوئی اَور شکل تجویز نہیں کر سکتے اس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ مسلمانوں نے تمدن کے متعلق غور و فکر کرنا چھوڑ دیا اور وہ اس چھوٹے سے تالاب کی صورت میں بدل گیا جس کا پانی نہیں بہتا جس میں بُو تو پیدا ہو جاتی ہے۔ مگر خوشنمائی اور دلکشی باقی نہیں رہتی۔

پس یہ جو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ مَنْ قَالَ هَلَكَ الْقَوْمُ فَهُوَ اَهْلَكَهُمْ یہ درحقیقت آپ نے ایک بہت بڑا نفسیاتی نکتہ بیان فرمایا تھا۔ اگر قوم کے لیڈر اس حدیث کو ہی یاد رکھتے۔ اگر وہ اپنی قوم کو مایوس نہ کرتے۔ اگر وہ اپنی جہالت سے اُن کو یہ نہ کہتے کہ تمہارے لئے اب ترقی کا کوئی امکان نہیں۔ تو مسلمان روحانی میدان میں بھی آگے رہتے۔ اقتصادی میدان میں بھی آگے رہتے۔ علمی میدان میں بھی آگے رہتے اور سائنٹفک میدان میں بھی آگے رہتے۔ مگر ہمارے ہاں تو یہاں تک مصیبت بڑھی کہ مذہب تو الگ رہا مسلمانوں نے دنیوی علوم بھی پہلے لوگوں پر ختم کر دیئے۔ بوعلی سینا کے متعلق کہہ دیا کہ اُس نے طب میں جو کچھ لکھ دیا ہے اس سے بڑھ کر اور کچھ نہیں لکھا جا سکتا۔ منطق کے متعلق کہہ دیا کہ اِس بارہ میں فلاں منطقی جو کچھ لکھ گیا ہے اُس کے بعد منطق کے علم میں کوئی زیادتی نہیں کی جا سکتی۔ اِسی طرح ایک ایک کرکے سارے علوم کے متعلق یہ فیصلہ کر دیا گیا کہ اُن کے متعلق پہلے لوگ جو کچھ لکھ چکے ہیں۔ اُن سے زیادہ اب کوئی شخص نہیں لکھ سکتا۔ گویا انہوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ هَلَكَ الْقَوْمُ جو کچھ پہلوں کو مل گیا وہ اب دوسروں کو نہیں مل سکتا۔ اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمان بالکل تباہ ہو گئے۔ نہ مسلمانوں میں خدا پرست رہے۔ نہ مسلمانوں میں فقیہہ رہے۔ نہ مسلمانوں میں قاضی رہے نہ مسلمانوں میں عارف رہے۔ نہ مسلمانوں میں محدّث رہے کیونکہ جو چیز بھی تھی اُسے گذشتہ لوگوں پر ختم کر دیا گیا اور قوم کو مایوس کر دیا گیا۔

غرض اس آیت میں خدا تعالیٰ نے قوم کی اصلاح کا یہ ایک لطیف نکتہ بیان فرمایا ہے کہ جس فعل کو روکنا چاہو تم اُس کی تشہیر کو روکو اور قوم کو مایوسی کا شکار نہ ہونے دو۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے اپنی کتابوں میں تحریر فرمایا ہے کہ قرآن کریم کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ ہر بدی کی جڑ کو پکڑتا ہے اور اُسے اکھیڑتا ہے۔ اِسی کے مطابق قرآن کریم بتاتا ہے کہ جس بدی کو تم روکنا چاہو اُس کے اتہام کو روکو۔ لیکن اسی کا اُلٹ یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ جس نیکی کو قائم کرنا چاہو اُس کی عظمت اور اہمیت پھیلاؤ مثلاً نماز ہے۔ اس کے متعلق کہا جائے کہ ایسے اہم فریضہ کو کون چھوڑ سکتا ہے؟ یا چوری ہے اس کے متعلق کہا جائے کہ کیا اتنا بڑا گناہ کوئی کر سکتا ہے؟ اِس قسم کی باتیں

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ط

اے مومنو! شیطان کے قدموں پر مت چلو

وَمَنْ يَّتَّبِعْ خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ فَاِنَّهٗ يَاْمُرُ بِالْفَحْشَآءِ

اور جو کوئی شیطان کے قدموں پر چلتا ہے وہ جان لے کہ شیطان بدیوں اور ناپسندیدہ باتوں کا

وَالْمُنْكَرِ ؕ وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ

حکم دیتا ہے اور اگر اللہ (تعالیٰ) کا فضل اور رحم تم پر نہ ہوتا تو

مَا زَكٰى مِنْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ اَبَدًا ۙ وَّلٰكِنَّ اللّٰهَ

کبھی بھی تم میں سے کوئی پاکباز نہ ہوتا۔ لیکن اللہ (تعالیٰ)

جس شخص کے کان میں بھی پڑیگی وہ ان کو بہت اہم سمجھے گا اور ان کے متعلق احتیاط سے کام لے گا۔ تم اپنے اندر اس کے مطابق تغیر کرکے دیکھ لو۔ تین چار سال میں ہی تمہیں اپنے اندر بہت بڑا فرق نظر آئیگا۔ اور تمہیں محسوس ہوگا کہ افرادِ جماعت میں پہلے سے زیادہ بیداری پائی جاتی ہے پہلے سے زیادہ اُن میں نیکیوں کو اختیار کرنے اور بدیوں سے بچنے کا جذبہ پایا جاتا ہے اور پہلے سے زیادہ اُنکے اخلاص اور ایمان میں ترقی ہوگئی ہے۔ جماعتی چندوں کو ہی دیکھ لو۔ اگر عام طور پر یہ ذکر ہو کہ لوگ چندہ نہیں دیتے تو یہ معمولی بات سمجھی جائیگی لیکن اگر یہ کہا جائے کہ کوئی شاذ ہی ہوگا جو چندہ نہ دیتا ہو تو ہر ایک کو اس کی اہمیت کا احساس ہوگا اور وہ چندہ میں کمزوری نہیں دکھائیگا۔

اسی طرح یہ گُر سب نقائص اور کمزوریوں پر حاوی ہے۔ اور تمام خرابیوں کی اس کے ذریعہ اصلاح ہوسکتی ہے۔ تم جس فعل کو روکنا چاہو اُس کے اتہام کو روکو اور اس کے اُلٹ جس نیکی کو قائم کرنا چاہو۔ اُس کو پھیلاؤ۔ اور اُسے اہمیّت دو۔

لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی یاد رکھو کہ فرائض کی ادائگی پر کسی کو کوئی خاص عظمت نہ دو۔ مثلاً کوئی شخص حج کرکے آتا ہے تو یہ نہ کہو کہ یہ بڑا نیک اور پارسا ہے کیونکہ حج کرنا تو اس کا فرض تھا جسے اُس نے ادا کیا۔ اسی طرح نماز، روزہ اور زکوٰۃ ہے۔ اِن کو ادا کرنے کی وجہ سے کسی کی تعریف نہ کرو۔ کیونکہ اگر انکی وجہ سے کسی کی تعریف کی جائیگی کہ وہ بڑا نیک اور پارسا ہے تو جو انکو ادا نہیں کرتا وہ کہیگا۔ کہ اچھا میں ایسا نیک اور پارسا نہ سہی معمولی مسلمان تو ہوں لیکن جب اُن کا ادا کرنا ہر ایک مومن کا فرض بتایا جائیگا تو اسے معلوم ہوگا کہ اِن کو ادا کئے بغیر تو میں معمولی مسلمان بھی نہیں بن سکتا۔ پس اس بات کو یاد رکھو اور جو نواہی ہیں اُن کے اتہام کو بُرا سمجھو اور انہیں کبھی اپنی قوم میں پھیلنے نہ دو۔ اگر تم ایسا کروگے تو تھوڑے ہی عرصہ میں تمہارے اندر ایک عظیم الشان تغیّر پیدا ہو جائے گا۔ اور تم قومی اصلاح کے کام میں کامیاب ہو جاؤ گے۔

يُزَكِّيْ مَنْ يَّشَآءُ، وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۲﴾

جس کو چاہتا ہے پاکباز بنا دیتا ہے اور اللہ بہت دُعائیں سُننے والا بہت جاننے والا ہے۔ ۱۲؎

۱۲؎ حل لغات۔ اَلْفَحْشَآءَ : اَلْفُحْشُ وَالْفَحْشَآءُ وَالْفَاحِشَةُ مَا اَعْظَمَ قُبْحُهٗ مِنَ الْاَفْعَالِ وَالْاَقْوَالِ یعنی فحش، فحشاء اور فاحشہ ہر ایسے فعل اور قول کو کہتے ہیں جس کی بُرائی نہایت واضح اور نمایاں ہو۔ (مفردات)

اَلْمُنْكَرُ: مَالَيْسَ فِيْهِ رِضَى اللّٰهِ مِنْ قَوْلٍ اَوْ فِعْلٍ۔ ہر وہ بات یا فعل جس میں اللہ تعالیٰ کی پسندیدگی نہ ہو منکر کہلاتی ہے (اقرب)

زَكٰى ؛ زَكَا الرَّجُلُ کے معنے ہیں صَلَحَ وَ تَنَعَّمَ۔ اچھا ہوگیا اور عمدہ حالت میں آگیا (اقرب)

تفسیر:۔ خُطُوٰتٌ کے معنے قدم کے ہوتے ہیں لیکن جب یہ لفظ جمع کی صورت میں استعمال ہو تو اسکے معنے مفسرین کے نزدیک مسلک اور مذہب اور اثر کے بھی ہوتے ہیں (فتح البیان) پس لَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ فرما کر اس طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ اے مومنو! شیطانی طریق اور شیطانی مذہب اور شیطانی اثر کو اختیار نہ کرو۔ اور اس امر کو یاد رکھو کہ جو شخص شیطانی طریق اور مسلک کو قبول کرتا ہے وہ لازماً بدی اور ناپسندیدہ باتوں کے پیچھے پڑ جاتا ہے۔ کیونکہ شیطان ہمیشہ بدی اور ناپسندیدہ باتوں کی ہی تحریک کیا کرتا ہے۔ لیکن یہ بھی یاد رکھو۔ کہ کامل پاکیزگی بغیر اللہ تعالےٰ کے فضل اور رحمت کے حاصل نہیں ہوتی۔ پس اس کا طریق یہ ہے کہ خدا تعالےٰ سے دُعائیں کرتے رہو اور اپنے حالات کو زیادہ سے زیادہ پاکیزہ لوگوں کی طرح بناؤ۔ تاکہ وہ یہ دیکھ کر کہ تم پاکیزہ بننے کی کوشش کر رہے ہو تم کو پاکیزہ بنا دے۔

اِس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ شیطان ہمیشہ انسان کے پیچھے پڑا رہتا ہے حتّٰی کہ جب انسان خدا تعالیٰ پر ایمان لے آتا ہے تب بھی وہ اس کا پیچھا نہیں چھوڑتا اور اُسے گمراہ کرنے کی کوشش کرتا رہتا ہے اور کئی لوگ اس کے دھوکے میں آکر ایمان لانے کے بعد بھی اس کی باتوں کو ماننے لگ جاتے ہیں اور مرتد اور فاسق ہو جاتے ہیں اور یہ خطرہ اس قدر عظیم ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کا فضل نہ ہو تو کوئی شخص بھی اس خطرہ سے محفوظ نہیں رہ سکتا۔ مگر اس فضل کو جذب کرنیکا طریق یہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کی صفت سَمِيْعٌ سے فائدہ اٹھائے اور اس کے دروازہ کو کھٹکھٹائے۔ اگر وہ اس کے دروازہ کو کھٹکھٹائے گا اور اُس سے دُعائیں کرنا اپنا معمول بنالیگا تو اللہ تعالےٰ جو علیم ہے اور اپنے بندوں کے حالات اور اُن کی کمزوریوں کو خوب جانتا ہے اس کے دل میں ایسی ایمانی قوت پیدا کردیگا جس کے نتیجہ میں وہ شیطانی حملوں سے محفوظ ہو جائیگا اور اسے طہارت اور پاکیزگی میسّر آجائیگی۔

کہا جاتا ہے کہ ایک بزرگ تھے جن کے پاس اُن کا ایک شاگرد کافی عرصہ رہا اور تعلیم حاصل کرتا رہا جب وہ تعلیم سے فارغ ہوکر اپنے گھر جانے لگا تو اُس بزرگ نے اُس سے دریافت کیا کہ میاں تم اپنے گھر جا رہے ہو کیا تمہارے ملک میں شیطان بھی ہوتا ہے؟ وہ یہ سوال سُن کر حیران رہ گیا۔ اور اُس نے کہا شیطان بھلا کہاں نہیں ہوتا ہر ملک میں شیطان ہوتا ہے اور جہاں میں جا رہا ہوں وہاں بھی شیطان موجود ہے۔ آپ نے فرمایا۔ اچھا۔ اگر وہاں شیطان ہے تو پھر جو کچھ تم نے میرے پاس رہ کر علم حاصل کیا ہے جب اس پر عمل کرنے لگوگے تو لازماً شیطان تمہارے رستہ میں روک بن کر حائل ہوگا۔ ایسی حالت میں تم کیا کروگے؟

اَلْفَحْشَآءَ

اَلْمُنْكَرَ

زَكٰى

وہ کہنے لگا۔ مَیں شیطان کا مقابلہ کرونگا۔ وہ بزرگ کہنے لگے۔ بہت اچھا۔ تم نے شیطان کا مقابلہ کیا اور وہ تمہارے دفاع کی تاب نہ لاکر بھاگ گیا۔ لیکن جب پھر تم عمل کی طرف متوجہ ہونے لگے اور خدا تعالیٰ کے قرب کے حصول کے رستوں پر تم نے چلنا شروع کیا اور پھر شیطان پیچھے سے آگیا اور اُس نے تمہیں پکڑ لیا اور تمہیں آگے بڑھنے سے اُس نے روک لیا تو پھر تم کیا کروگے؟ وہ کہنے لگا۔ مَیں پھر شیطان کا مقابلہ کرونگا۔ اور اُس سے پیچھا چھڑا کر اللہ تعالیٰ کے قرب کے حصول کی جد وجہد میں مشغول ہو جاؤنگا۔ انہوں نے کہا بہت اچھا۔ مَیں نے مان لیا کہ تمہارے مقابلہ کے نتیجہ میں شیطان اس دفعہ بھی بھاگ گیا اور تم جیت گئے لیکن جب پھر تم اللہ تعالیٰ کے حضور پہنچنے کے لئے جد وجہد کرنے لگے اور اپنی اصلاح کی طرف متوجہ ہوئے اور خدا تعالیٰ کے قرب کے حصول کے ذرائع اختیار کرنے لگے اور تم نے شیطان کی طرف سے پیٹھ پھیر کر اللہ تعالیٰ کی طرف رُخ کیا۔ تو پھر شیطان آگیا اور اُس نے تمہیں پکڑ لیا تو پھر کیا کروگے؟ شاگرد حیران رہ گیا اور کہنے لگا۔ مجھے تو پتہ نہیں لگتا آپ ہی فرمائیں کہ مجھے ایسی حالت میں کیا کرنا چاہیئے؟ وہ فرمانے لگے۔ اچھا یہ بتاؤ کہ اگر تم اپنے کسی دوست سے ملنے جاؤ جس نے اپنے مکان کی حفاظت کے لئے ایک بڑا سا مضبوط کتّا رکھا ہؤا ہو۔ اور جب تم اپنے دوست کے مکان میں داخل ہونے لگو تو وہ کتّا آئے اور تمہاری ایڑی پکڑلے تو اُسوقت کیا کروگے۔ شاگرد کہنے لگا۔ مَیں کتّے کا مقابلہ کرونگا اور اُسے مارونگا۔ اگر میرے پاس سوٹی ہوگی تو مَیں اسے سوٹی سے ماروں گا اور اگر پتھر قریب ہوگا تو اُسے پتھر سے مارونگا۔ انہوں نے کہا۔ مان لیا کہ تم نے کتّے کو سوٹی ماری یا پتھر مارا اور وہ بھاگ گیا لیکن جب پھر تم نے مکان میں داخل ہونے کی کوشش کی اور کتّے کی طرف سے پیٹھ پھیری تو وہ پھر آگیا اور اُس نے تمہاری ایڑی پکڑلی تو اُسوقت کیا کروگے؟ وہ کہنے لگا مَیں اُسے پھر ماروں گا اور اُسے ہٹا کر مکان کے اندر داخل ہونے کی کوشش کرونگا۔ انہوں نے فرمایا۔ اچھا فرض کرو دوسری دفعہ بھی کتّا بھاگ گیا۔ لیکن جب پھر تم دوست سے ملنے کے لئے مکان کے اندر داخل ہونے لگے تو وہ پھر تمہیں پکڑلے تو آخر تم کیا کروگے؟ وہ کہنے لگا۔ مَیں پھر اُسے مارونگا اور اُسے ہٹانے کی پوری کوشش کرونگا۔ وہ بزرگ فرمانے لگے۔ اگر یہ جنگ اِسی طرح جاری رہی کہ جب تم مکان کے اندر داخل ہونا چاہو تو کتّا تمہاری ایڑی پکڑنے لگے اور جب تم اُسے مارو تو وہ بھاگ جائے لیکن جب پھر مکان کے اندر داخل ہونے لگو تو وہ پھر آکر پکڑلے تو تم اپنے دوست سے مل کس طرح سکوگے؟ اور اُس سے ملاقات کرنے کا جو مقصد تم لئے ہوئے ہو گے وہ کس طرح پُورا ہوگا؟ شاگرد کہنے لگا۔ جب مَیں یہ دیکھوں گا کہ یہ جنگ کسی طرح ختم ہونے میں نہیں آتی اور کتّا بار بار مجھے پکڑلیتا ہے تو مَیں اپنے دوست کو آواز دونگا کہ میاں تمہارا کتّا مجھے نہیں چھوڑتا اِسے آکر ہٹاؤ۔ وہ بزرگ فرمانے لگے۔ بس یہی نسخہ شیطان کے مقابلہ میں بھی استعمال کرنا۔ شیطان اللہ میاں کا کتّا ہے اور جب یہ انسان پر بار بار حملہ آور ہو اور اللہ تعالیٰ کے قریب نہ ہونے دے تو اُس کا ایک ہی علاج ہے اور وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ کو پکارو اور اُسے آواز دو کہ اللہ میاں: مَیں آپ کے پاس آنا چاہتا ہوں مگر آپ کا یہ کتّا مجھے آنے نہیں دیتا۔ اِسے روکئے تاکہ مَیں آپ کے پاس پہنچ جاؤں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ اُسے روک لیگا۔ اور تم شیطان کے حملہ سے محفوظ ہو جاؤگے۔

غرض طہارتِ کامل جس کے بعد کوئی ارتداد اور فسق نہیں ہوتا محض اللہ تعالیٰ کے فضل اور رحم کے ساتھ حاصل ہوتی ہے جسے انسانی دُعائیں اپنی طرف کھینچتی رہتی ہیں۔

پھر اس آیت میں بدی کو روکنے کے متعلق اللہ تعالیٰ ایک اور لطیف نکتہ بیان فرماتا ہے۔ پہلے تو یہ بتایا تھا کہ

وَلَا يَأْتَلِ أُولُوا الْفَضْلِ مِنْكُمْ وَالسَّعَةِ أَنْ يُّؤْتُوْٓا

اور تم میں سے (دین و دنیا میں) فضیلت رکھنے والے اور کشائش رکھنے والے لوگ قسم نہ کھائیں کہ اپنے رشتہ داروں

أُولِي الْقُرْبٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَالْمُهٰجِرِيْنَ فِيْ سَبِيْلِ

اور مسکینوں اور اللہ کے راستہ میں ہجرت کرنے والوں کی مدد نہ

اللّٰهِ ۖ وَلْيَعْفُوْا وَلْيَصْفَحُوْا ۗ أَلَا تُحِبُّوْنَ أَنْ

کریں گے - اور چاہیئے کہ وہ عفو سے کام لیں اور درگذر سے کام لیں - کیا تم نہیں چاہتے کہ

ایک دوسرے کے متعلق بے بنیاد باتوں کا اپنی مجالس میں تذکرہ کرتے رہنا قوم کے اخلاقی معیار کو تباہ کر دیتا ہے - اب مومنوں کو ایک اور بات کی طرف توجہ دلاتا ہے اور فرماتا ہے - اے مومنو! تم شیطان کے قدموں کی پیروی نہ کرو - اس لئے کہ جو شخص شیطان کے قدموں کے پیچھے چلے گا - وہ بدی اور بدکاری میں مبتلا ہو جائیگا - کیونکہ شیطان فحشاء اور منکر کا حکم دیتا ہے - اس میں یہ بتایا گیا ہے کہ ہر برائی جو دنیا میں پھیلتی ہے اُس کی ابتدا بھیانک نہیں ہوتی - شیطان کا یہ طریق نہیں کہ کوئی خطرناک بات کرنے کیلئے ابتدا میں ہی انسان کو تحریک کرے - کیونکہ انسان کی فطرت میں حیاء و شرم کا مادہ رکھا گیا ہے - اس لئے جس کام کو انسان صریح طور پر بُرا سمجھے اُس کو فوری طور پر کرنے کے لئے وہ تیار نہیں ہوتا - مثلاً شیطان اگر کسی کو سیدھا ہلاکت کی طرف لے جانا چاہے تو وہ نہیں جائیگا ہاں چکر دے کر لے جائے تو چلا جائیگا - پس شیطان پہلے ہی کسی بڑی بدی کی تحریک نہیں کرتا - بلکہ پہلے چھوٹی برائی کی جو بظاہر برائی نہ معلوم ہوتی ہو تحریک کرتا ہے - پھر اُس سے آگے چلاتا ہے - پھر اس سے آگے حتیٰ کہ خطرناک برائی تک لے جاتا ہے - گویا شیطان پہلے ہی گڑھے کے سر پر لے جا کر انسان کو نہیں کہتا کہ اس میں کود پڑو بلکہ پہلے گھر سے دُور لے جاتا ہے جس طرح ڈاکو گھر کے پاس حملہ نہیں کرتے یا جو لوگ بچوں کو قتل کرتے ہیں وہ گھر کے پاس نہیں کرتے بلکہ اُن کو دھوکہ اور فریب سے دُور لے جاتے ہیں - کہتے ہیں آؤ تمہیں مٹھائی کھلائیں اور جب شہر یا گاؤں سے باہر لے جاتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ اب کوئی دیکھنے والا نہیں تو گلا گھونٹ کر مار دیتے ہیں یہی طریق شیطان کا ہوتا ہے - وہ پہلے انسان کو اُس قلعہ سے نکالتا ہے جہاں خدا نے انسان کو محفوظ کیا ہوا ہوتا ہے یعنی فطرتِ صحیحہ کے قلعہ سے - انسان اُس سے باہر چلا جاتا ہے اور سمجھتا ہے کہ کوئی حرج نہیں مگر ہوتے ہوتے وہ اتنا دُور چلا جاتا ہے کہ پھر اُس کا واپس لوٹنا مشکل ہو جاتا ہے اور شیطان کے پنجہ میں گرفتار ہو کر تباہ ہو جاتا ہے - جھوٹے الزامات کے ذکر کے ساتھ یہ نصیحت فرما کر اس طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ تم یہ نہ کہنا کہ یہ معمولی بات ہے کیا ہوا اگر کسی پر ہم نے زنا کا الزام لگا دیا - یا یہ کہ ہم نے تو نہیں لگایا کسی نے ہم کو بات سُنائی اور ہم نے آگے سُنا دی - شیطان کا یہی طریق ہے - وہ پہلے اپنے پیچھے چلاتا ہے اور آہستہ آہستہ روحانیت اور شریعت کے قلعہ سے دُور لے جاتا ہے اور جب انسان دُور

يَغْفِرَ اللّٰهُ لَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۲۲﴾

اللہ تمہارے قصور معاف کرے - اور اللہ بہت معاف کرنیوالا (اور) بار بار رحم کرنیوالا ہے - ۱۳

وَلَا يَأْتَلِ

چلا جاتا ہے۔ تو اُس کو مار ڈالتا ہے۔ پس شیطان پہلے تو یہی کریگا کہ تحریک کریگا کہ دوسرے کی کہی ہوئی بات بیان کر دو تمہارا اِس میں کیا حرج ہے لیکن جب تم ایسا کر لوگے تو پھر خود تمہارے مُنہ سے ایسی بات نکلوائیگا۔ اور جب یہ بھی کر لوگے تو پھر اس فعل کا تم سے ارتکاب کروائیگا۔ پس تم پہلے ہی اس کے پیچھے نہ چلو اور پہلے قدم پر ہی اس کی بات کو رد کر دو۔ تاکہ تم تباہی سے محفوظ رہو۔

پھر فرماتا ہے۔ وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ مَا زَكٰى مِنْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ اَبَدًا - وَّلٰكِنَّ اللّٰهَ يُزَكِّيْ مَنْ يَّشَاۗءُ - اگر اللہ تعالیٰ کا فضل اور اس کی رحمت تم پر نہ ہوتی تو تم میں سے کوئی شخص بھی پاک نہ ہو سکتا۔ اللہ ہی ہے جو تم میں سے جس کو چاہتا ہے پاک کرتا ہے۔ "جس کو چاہتا ہے" سے یہ مراد نہیں کہ اندھا دھند کرتا ہے بلکہ یہ کہ جو خدا کا پسندیدہ ہو جاتا ہے اور اس کے احکام پر عمل کرتا ہے اُسے خدا تعالیٰ اپنا محبوب بنا لیتا ہے اور پاک کر دیتا ہے۔ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ اور اللہ سننے والا اور جاننے والا ہے یعنی جب کوئی اس کو پکارتا ہے تو سُنتا ہے جس طرح اگر کوئی رستہ بھول جائے اور کسی کو آواز دے تو اگر وہ سُننے کی طاقت رکھتا ہو گا تو جواب دے گا۔ اسی طرح جو لوگ سیدھے راستہ سے بھٹک جاتے ہیں وہ جب دُعا کرتے ہیں اور خدا تعالیٰ کو پکارتے ہیں تو خدا تعالیٰ اُن کی پکار کو سُنتا ہے کیونکہ وہ سُننے والا ہے۔ پھر جب خدا آواز دیتا اور انسان اُس کی طرف چلتا ہے تو خدا تعالیٰ کی صفت علیم اُس کی راہ نمائی کرتی ہے اور اس طرح وہ اس کے قرب تک پہنچ جاتا ہے۔

۱۳ حل لغات:- لَا يَاْتَلِ - اِئْتَلٰى کے معنے ہیں حَلَفَ۔ قسم کھائی (اقرب) پس لَا يَاْتَلِ کے معنے ہونگے۔ چاہیئے کہ قسم نہ کھائیں۔

تفسیر:- فرماتا ہے۔ پاکیزہ بننے کا ایک یہ بھی طریق ہے کہ تم میں سے جن کو توفیق ہو وہ کبھی قسم نہ کھائیں کہ اپنے رشتہ داروں اور مسکینوں اور اللہ تعالیٰ کے راستہ میں ہجرت کرنے والوں پر آئندہ خرچ نہیں کرینگے یعنی بعض دفعہ رشتہ داروں سے بھی کوئی جھگڑا ہو جاتا ہے اور مسکینوں اور مہاجروں سے بھی ہو جاتا ہے۔ مگر مالداروں کو نہیں چاہیئے کہ اس ناراضگی پر وہ قسم کھائیں کہ اُن پر ہم کبھی خرچ نہیں کریں گے۔ بلکہ چاہیئے کہ وہ غصہ کی حالت میں درگذر کریں اور معاف کریں۔ کیونکہ اگر تم معاف کروگے تو تمہیں اُمید ہوگی کہ خدا تعالیٰ بھی تمہیں معاف کرے گا۔

بعض حدیثوں میں آتا ہے کہ حضرت عائشہؓ پر جو افتراء کیا گیا تھا اُس کے پھیلانے میں مسطح کا بھی دخل تھا جو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا بھانجہ اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا صحابی تھا۔ اُس کی ماں نہایت نیک عورت تھی۔ اُسی نے ایک موقعہ پر حضرت عائشہؓ کے سامنے مسطح کو گالی دی تھی جس پر حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ وہ تو بدری صحابی ہے اُس کو گالی کیوں دیتی ہو۔ مسطح کی ماں نے کہا جانے دو۔ وہ ایسی ایسی باتیں کرتا پھرتا ہے اور اس طرح بہتان کا واقعہ حضرت عائشہؓ کے کان میں پڑ گیا حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے جب یہ بات سُنی تو قسم کھائی کہ آئندہ میں مسطح کے خاندان کی مدد نہیں کرونگا۔ حالانکہ وہ پہلے اُن کی بہت مدد کیا کرتے تھے مفسرین کہتے ہیں کہ اسی واقعہ کی طرف اس آیت میں اشارہ ہے۔ لیکن اس آیت کا

کسی خاص واقعہ کی طرف اشارہ نکالنے کی ضرورت نہیں۔ اس آیت میں ایک عام سبق دیا گیا ہے کہ رشتہ داروں مسکینوں اور مہاجروں کی مدد کرنے کا جو قرآن کریم میں حکم ہے۔ وہ اُس وقت تک کے لئے نہیں ہے جب تک کہ تم اُن سے خوش ہو۔ بلکہ اگر وہ کوئی ایسی حرکت کر بیٹھیں جو تمہیں بُری لگے تو بھی اُن پر خرچ نہ کرنے کی قسم نہ کھا لیا کرو۔ یعنی غصہ کے دنوں میں اگر کچھ دن کمی آجائے تو اَور بات ہے مگر ہمیشہ کے لئے خرچ نہ کرنے کی قسم کھانا ناجائز امر ہے اس کی بجائے عفو اور درگذر اچھا ہے۔

مگر یہ آیت بتا رہی ہے کہ اسجگہ اپنے مال کے خرچ کرنے کا ذکر ہے۔ پبلک یا خدا تعالےٰ کے مال کے خرچ کرنیکا ذکر نہیں۔ اگر پبلک یا خدا تعالیٰ کے مال کے خرچ کرنے کا سوال ہو تو پھر پبلک کی مصلحت کے تقاضا کو مقدم کرنا پڑے گا یا خدا تعالیٰ کے حکم کو مقدم کرنا پڑے گا۔

اس آیت میں اللہ تعالےٰ نے وَلْيَعْفُوْا وَلْيَصْفَحُوْا فرما کر مومنوں کو یہ عام ہدایت دی ہے کہ انہیں دوسروں کی غلطیوں کو معاف کرنا اور ان کے قصوروں سے درگذر کرنا چاہیئے۔ مگر معاف کرنیکا مسئلہ بہت پیچیدہ ہے۔ بعض لوگ نادانی سے ایک طرف نکل گئے ہیں اور بعض دوسری طرف۔ وہ لوگ جن کا کوئی قصور کرتا ہے وہ تو کہتے ہیں کہ مجرم کو ضرور سزا دینی چاہیئے تاکہ دوسروں کو عبرت ہو۔ اور جو قصور کرتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ جب خدا معاف کرتا ہے تو بندے کو بھی معاف کرنا چاہیئے مگر یہ سب خود غرضی کے فتوے ہیں۔ جو شخص یہ کہتا ہے کہ خدا معاف کرتا ہے تو بندے کو بھی معاف کرنا چاہیئے وہ اس قسم کی بات اسی وقت کہتا ہے جب وہ خود مجرم ہوتا ہے۔ اگر مجرم نہ ہوتا تو ہم اس کی بات مان لیتے لیکن جب اُس کا کوئی قصور کرتا ہے تب وہ یہ بات نہیں کہتا۔ اسی طرح جو شخص اس بات پر زور دیتا ہے کہ معاف نہیں کرنا چاہیئے بلکہ سزا دینی چاہیئے وہ بھی اسی وقت یہ بات کہتا ہے جب کوئی دوسرا شخص اس کا قصور کرتا ہے لیکن جب وہ خود کسی کا قصور کرتا ہے تب یہ بات اس کے مُنہ سے نہیں نکلتی۔ اُسوقت وہ یہی کہتا ہے کہ خدا جو معاف کرتا ہے تو بندہ کیوں معاف نہ کرے۔ پس یہ دونوں فتوے خود غرضی پر مشتمل ہیں۔ اصل فتویٰ وہی ہو سکتا ہے جس میں کوئی اپنی غرض شامل نہ ہو۔ اور وہ وہی ہے جو قرآن کریم نے دیا ہے کہ جب کسی شخص سے کوئی جرم سرزد ہو تو تم یہ دیکھو کہ سزا دینے میں اُس کی اصلاح ہو سکتی ہے یا معاف کرنے سے اس کی اصلاح ہو سکتی ہے۔ اگر تمہیں سزا دینے میں مجرم کی اصلاح دکھائی دیتی ہو تو اُسے سزا دو۔ اگر معاف کرنے سے اُس کے اخلاق درست ہو سکتے ہوں تو اُسے معاف کر دو۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے۔ وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ (الشوریٰ ع ۴) یعنی بدی کا بدلہ اتنا ہی ہو جتنا کسی کا جرم ہو۔ لیکن اگر کوئی شخص دوسرے کو معاف کر دے اور اصلاح کو مدّ نظر رکھے یعنی اس معافی کے نتیجہ میں فساد پیدا نہ ہو بلکہ دوسرے کی اصلاح ہو تو ایسے شخص کا نیک اجر اللہ تعالےٰ کے ذمہ ہے۔ لیکن یہ بھی یاد رکھو کہ اللہ تعالیٰ ظالموں کو پسند نہیں کرتا۔ یعنی اگر کوئی شخص جرم سے زیادہ سزا دے دیتا ہے یا باوجود اس کے کہ عقلی طور پر وہ سمجھتا ہے کہ اگر مجرم کو سزا دی گئی تو اُس کے اخلاق اَور بھی بگڑ جائیں گے اور وہ نیکی سے اَور بھی دُور چلا جائیگا۔ لیکن پھر بھی وہ اس کو دُکھ دینے کیلئے سزا دے دے۔ یا اگر ذاتی طور پر وہ سمجھتا ہے کہ اس شخص کو معاف کرنا اسے گناہ پر اَور بھی دلیر بنا دے گا مگر اسکے باوجود وہ اسے معاف کر دے تو ایسے تمام لوگ خدا تعالےٰ کی نگاہ میں ظالم ہونگے اور وہ اپنے اس فعل کے متعلق اللہ تعالےٰ

کے سامنے جواب دہ ہونگے - یہ تعلیم ہے جو اسلام نے جرائم کے سلسلہ میں پیش کی ہے - اب غور کرکے دیکھ لو کہ یہ تعلیم کسقدر امن پیدا کرنے والی اور ہر قسم کے فسادات اور جھگڑوں کو دنیا سے مٹانے والی ہے - عیسائیت نے دنیا کے سامنے یہ تعلیم پیش کی تھی کہ

"شریر کا مقابلہ نہ کرنا بلکہ جو کوئی تیرے
داہنے گال پر طمانچہ مارے دوسرا گال بھی
اُس کی طرف پھیر دے -"
(متی باب ۵ آیت ۳۹)

مگر آج ساری عیسائی دنیا میں پھر کر دیکھ لو نہیں ایک شخص بھی اس تعلیم پر عمل کرتا دکھائی نہیں دیگا - اور اگر کوئی عمل بھی کرے تو یہ تعلیم دنیا میں امن قائم کرنے میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتی - فتنہ و فساد کو مٹانے والی اور ہر قسم کے جھگڑوں اور مناقشات کا سدِ باب کرنے والی وہی تعلیم ہے جو قرآن کریم نے دی اور جس کے ذریعہ مجرم کی اصلاح کو ضروری قرار دیا گیا ہے - خواہ یہ اصلاح سزا کی صورت میں ہو یا عفو اور درگذر کی صورت میں -

اسی مضمون کو قرآن کریم کی اس آیت میں بھی بیان کیا گیا ہے کہ وَالْكَاظِمِينَ الْغَيْظَ وَالْعَافِينَ عَنِ النَّاسِ ؕ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ ۚ (آل عمران ع ۱۴) یعنی مومن وہ ہیں جو اپنے غصہ کو دبا لیتے اور لوگوں کی غلطیوں سے درگذر کرتے ہیں اور پھر اُن پر احسان بھی کرتے ہیں - اور اللہ تعالےٰ احسان کرنیوالوں سے بڑی محبت رکھتا ہے - محسن کے معنے عربی زبان میں ایسے شخص کے ہوتے ہیں جو شریعت کے تمام احکام کی پابندی کرنے والا ہو - پس وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ فرماکر اللہ تعالےٰ نے اس طرف اشارہ فرمایا ہے کہ مومن اسی وقت کظم غیظ کرتا اور مجرم کو معاف کرتا ہے جب عفو وَ اَصْلَحَ کا حکم پورا ہوتا ہو - یعنی اس کے نتیجہ میں دوسرے کی اصلاح ہوتی ہو - اگر وہ معاف تو کر دیتا ہے مگر یہ نہیں دیکھتا کہ اس کی معافی کیا نتیجہ پیدا کرے گی تو وہ محسن نہیں کہلا سکتا - کیونکہ اُس نے شریعت کے اُن قواعد کو ملحوظ نہیں رکھا جو اُس نے سزا اور عفو کے سلسلہ میں دیئے تھے - اس بارہ میں حضرت امام حسنؓ کا بھی ایک نہایت لطیف واقعہ کتابوں میں درج ہے کہا جاتا ہے کہ اُن کے ایک غلام سے ایک دفعہ کوئی اعلیٰ درجہ کا برتن گر کر ٹوٹ گیا جس پر حضرت امام حسنؓ کے چہرہ پر غصہ اور ناراضگی کے آثار ظاہر ہوئے - اس غلام نے فوراً یہی آیت پڑھدی اور کہا - حضور اللہ تعالےٰ فرماتا ہے وَالْكَاظِمِينَ الْغَيْظَ مومن اپنے غصہ کو دبا لیتے ہیں - آپ نے فرمایا - بہت اچھا میں نے اپنے غصہ کو دُور کر دیا - اس پر اُس نے آیت کا اگلا ٹکڑا پڑھ دیا کہ وَالْعَافِينَ عَنِ النَّاسِ یعنی مومن صرف غصہ کو دباتے ہی نہیں بلکہ معاف بھی کرتے ہیں - آپنے فرمایا جاؤ میں نے تمہیں معاف کر دیا - وہ کہنے لگا حضور آگے یہ بھی لکھا ہے کہ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ اللہ تعالیٰ احسان کرنے والوں سے محبت کرتا ہے - آپ نے فرمایا - اچھا میں نے تمہیں آزاد کر دیا -

پس ہر جگہ یہ کہنا کہ سزا دو - نادانی ہے جس طرح ہر جگہ یہ کہنا کہ معاف کردو - یہ بھی نادانی ہے - شریعت نے بتا دیا ہے کہ جہاں سزا دینے کا فائدہ ہو - وہاں سزا دو - اور جہاں معاف کرنے سے فائدہ ہو وہاں معاف کرو - مثلاً فوج لڑ رہی ہو تو اُس وقت کوتاہی کرنے والوں کو اگر معاف کر دیا جائے تو دوسروں کو بھی سستی کی جرأت ہوتی ہے اور اس طرح ساری فوج تباہ ہو جاتی ہے - لیکن اگر کوئی ایسا فعل ہو جس کا اثر صرف ایک شخص کی ذات تک محدود ہو اور اس کے معاف کرنے سے اس کی اصلاح کی امید ہو تو اُسے معاف کر دیا جائیگا -

ایک ناول نویس نے جس کے متعلق عام طور پر یہ خیال

کیا جاتا ہے کہ وہ تاریخی واقعات کو اپناتا ہے فرانس
کا ایک قصّہ بیان کیا ہے۔ کہ فرانس کے بوربن خاندان
کو جب ملک سے نکالا گیا۔ تو وہ انگلستان چلا گیا
اور لنڈن جاکر بادشاہ نے کوشش کی کہ کسی طرح
ملک میں بغاوت پھیلائی جائے۔ اُس وقت فرانس
میں جمہوریت نہیں تھی۔ طوائف الملوکی پائی جاتی تھی
غالباً اُس وقت تک نپولین برسرِ اقتدار نہیں آیا
تھا یا اُس کے قریب زمانہ کا یہ واقعہ ہے۔ بادشاہ
نے لنڈن سے ایک جہاز میں بعض آدمی فرانس بھیجے
تاکہ وہ فرانس جاکر بغاوت پھیلائیں۔ جہاز کے
نچلے حصّہ میں ہتھیار بھی رکھے ہوئے تھے اور توپیں
زنجیر کے ساتھ بندھی ہوئی تھیں۔ ایک شخص صفائی
کے لئے وہاں گیا تو اُس سے ایک زنجیر کھل گئی
اور توپ جہاز کے اندر لڑھکنے لگی۔ اور خطرہ پیدا
ہوگیا کہ کہیں جہاز ٹوٹ نہ جائے۔ سارے لوگ جہاز
کو بچانے کے لئے بھاگے۔ بادشاہ کا نمائندہ بھی وہاں
موجود تھا۔ یہ حالت دیکھ کر اس شخص نے جس سے
کنڈا کھُلا تھا چھلانگ لگا دی اور اپنی جان کو انتہائی
خطرہ میں ڈال کر کنڈا لگانے میں کامیاب ہوگیا۔
اِس پر بادشاہ کے نمائندہ نے سب لوگوں کو اکٹھا کیا
اور کہا۔ اِس شخص نے بہت بڑی بہادری کا کام کیا ہے
اور ایک تمغہ جو فرانس میں سب سے زیادہ عزت کا
موجب سمجھا جاتا تھا اُسے کہا۔ مَیں بادشاہ کی طرف
سے یہ تمغہ اس کی بہادری کے صلہ میں اِس کے سینہ
پر لگاتا ہوں۔ اِس کے بعد اُس نے کمانڈر کو حکم دیا کہ
اِسے لے جاؤ اور گولی مار دو۔ اتفاقاً جہاں اُترنا تھا
وہاں سمندر میں سخت طوفان آیا ہوا تھا۔ اور خطرہ تھا
کہ کہیں جہاز غرق نہ ہو جائے۔ اُس وقت جہاز کے
کمانڈر نے کہا۔ کہ اس وقت مجھے ایک ایسے شخص کی
ضرورت ہے جو یقینی موت کو قبول کرے۔ چنانچہ ایک
ملّاح آگے آیا۔ اُس نے اُسے حکم دیا کہ اس شخص کو جو
بادشاہ کا نمائندہ ہے کشتی میں بٹھا کر ساحل فرانس تک
پہنچا دو۔ طوفان زوروں پر تھا لیکن وہ ملّاح کامیابی
کے ساتھ ساحل فرانس پر پہنچ گیا۔ وہاں پہنچ کر ملّاح
نے اپنا پستول نکال لیا اور کہا کہ مَیں نے اپنی جان کو
صرف اس لئے خطرہ میں ڈالا تھا کہ تم سے اپنے بھائی
کا بدلہ لوں۔ اُس نے کہا۔ تم نے حقیقت پر غور نہیں
کیا۔ تمہارے بھائی نے ایک نیک کام کیا تھا اور ایک
بُرا کام کیا تھا۔ مَیں نے اس کے اچھے کام کا اچھا بدلہ
دیا اور فرانس کا سب سے بڑا تمغہ اُس کے سینہ پر لگایا
اور اُس کے بُرے کام کے بدلہ میں اُسے گولی سے مار دینے
کا حکم دیا۔ تم جانتے ہو کہ مَیں بادشاہ کے مفاد کی خاطر
یہاں آیا ہوں۔ اور اپنے مقصد میں کامیابی کے لئے
ضروری ہے کہ مَیں ہر طرح کی احتیاط سے کام لوں اور
اس کے رستہ میں حائل ہونے والی کسی چیز کی پرواہ نہ
کروں۔ اُس نے ایک بُرا کام کیا تھا اور میری بادشاہ سے
وفاداری کا تقاضا یہی تھا کہ مَیں اُسے ہلاک کر دوں۔
اِس پر ملّاح نے ہتھیار پھینک دیا اور کہا مَیں سمجھ گیا
ہوں کہ میرا بھائی قصوروار تھا اور اپنے جرم کے بدلہ میں
موت کی سزا کا مستحق تھا۔

تو ایسے جرائم جن کا اثر دُور تک پہنچتا ہو۔ اُن
کی سزا دینا ضروری ہوتا ہے تاکہ دوسرے لوگ غافل نہ
ہوں۔ لیکن بعض دفعہ عفو بھی ضروری ہوتا ہے۔ دیکھو
یہاں تو خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ معاف کر دو۔ اور صرف
معاف ہی نہ کرو بلکہ فائدہ بھی پہنچاؤ۔ مگر اسی سورۃ
کے شروع میں فرمایا ہے کہ زانی کو سزا دو اور سزا دیتے
وقت تمہارے دل میں اس کے متعلق رحم کا کوئی جذبہ
پیدا نہ ہو۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام نہ ہر جگہ

إِنَّ الَّذِينَ يَرْمُونَ الْمُحْصَنٰتِ الْغٰفِلٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ

وہ لوگ جو کہ پاکدامن عورتوں پر الزام لگاتے ہیں جو (شریروں کی شرارت سے) غافل ہیں اور ایماندار ہیں۔

لُعِنُوا فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ﴿۲۴﴾

اُن پر دنیا اور آخرت میں لعنت کی جائیگی اور اُن کے لئے بڑا عذاب ہوگا ۱۴

يَوْمَ تَشْهَدُ عَلَيْهِمْ أَلْسِنَتُهُمْ وَأَيْدِيهِمْ وَأَرْجُلُهُمْ بِمَا

اُس دن جبکہ اُن کی زبانیں بھی اور انکے ہاتھ بھی اور اُنکے پاؤں بھی اعمال کے متعلق جو

كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿۲۵﴾ يَوْمَئِذٍ يُوَفِّيهِمُ اللّٰهُ دِينَهُمُ

وہ کرتے تھے ان کے خلاف گواہی دیں گے۔ اُس دن اللہ (تعالیٰ) اُن کو اُن کا صحیح بدلہ دے گا

الْحَقَّ وَيَعْلَمُونَ أَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ الْمُبِينُ ﴿۲۶﴾

اور وہ جان لیں گے کہ اللہ (تعالیٰ) ہی صدق مجسم ہے ایسا صدق جو اپنے آپکو آپ ظاہر کردیتا ہے۔ ۱۵

عفو کی تعلیم دیتا ہے اور نہ ہر مقام پر سزا دینے کی تلقین کرتا ہے بلکہ وہ موقعہ اور محل کے مطابق سزا اور عفو کے احکام جاری کرتا ہے تاکہ لوگوں کے اندر نہ تو جرائم پر دلیری پیدا ہو اور نہ عفو اور درگذر سے اگر کسی کی اصلاح ممکن ہو تو اس کا موقع ضائع ہو۔

۱۴ **حل لغات**:۔ لُعِنُوا: لَعَنَهٗ لَعْنًا کے معنے ہوتے ہیں طَرَدَهٗ اُس کو دھتکارا۔ وَاَبْعَدَهٗ مِنَ الْخَيْرِ اور اُس کو بھلائی سے دُور کیا۔ وَاَخْزَاهُ اور اسکو ذلیل کیا۔ وَسَبَّهٗ اور اُس کو گالی دی۔ اسی طرح اسکے ایک معنے عذاب کے بھی ہیں (اقرب)

تفسیر:۔ یعنی شریف اور بیگناہ عورتوں پر الزام لگانیوالوں کی اصل سزا خدا تعالیٰ کی طرف سے آتی ہے اور وہ سزا یہ ہوتی ہے کہ اُن پر دنیا اور آخرت میں لعنت کی جاتی ہے۔ لعنت کے معنے عربی زبان کے لحاظ سے دُوری کے ہوتے ہیں۔ پس بدکاری کا الزام لگانے والوں کو لعنتی قرار دینے سے یہ مراد ہے کہ ایسے لوگوں سے دُنیا میں بھی شریف آدمی تعلق رکھنا پسند نہیں کرتے کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ یہ لوگ سوسائٹی کو خراب کرنیوالے ہیں اگر ہم نے اِن سے تعلق رکھا تو یہ لوگ ہمارے خاندانوں کو بدنام کردیں گے اور اللہ تعالیٰ بھی قیامت کے دن اِن کو کوئی انعام نہیں دیگا بلکہ انہیں سزا کا مستحق قرار دیگا۔

۱۵ **تفسیر**:۔ فرماتا ہے۔ اُس دن کو یاد کرو جبکہ اُن کی زبانیں اور اُن کے ہاتھ اور اُن کے پاؤں اُن کے خلاف گواہی دیں گے اور اللہ تعالیٰ اُن کے اعمال کے مطابق اُن کو جزا دے گا اور اللہ تعالیٰ کی بات ہی آخر پوری ہو کر رہا کرتی ہے۔

اِس آیت سے ظاہر ہے کہ جو شخص انسانوں پر الزام لگاتا ہے وہ آخر خدا تعالیٰ پر بھی الزام

لگانا شروع کر دیتا ہے۔ کیونکہ اس میں الزام لگانے کی عادت بڑھتی چلی جاتی ہے۔ فرماتا ہے، ایسے لوگ جو انسانوں پر الزام لگاتے ہیں کسی دن خدا تعالیٰ پر بھی الزام لگانا شروع کر دیتے ہیں اور قیامت کے دن اُن کے اعضاء اُن کے خلاف گواہی دیں گے اور بتائیں گے کہ دنیا میں یہ لوگ خدا تعالیٰ کے متعلق کیا کیا بدظنیاں کرتے رہے ہیں اور انسانوں کے متعلق کیا کیا بدظنیاں کرتے رہے ہیں۔ گویا اس دن مجرموں پر اُن کے اعمال کی حقیقت ظاہر کرنے کے لئے اپنی ریکارڈنگ مشین کی سوئی اُن کی زبان پر رکھدی جائیگی اور زبان بولنا شروع کر دے گی کہ حضور فلاں دن اس نے خدا کو گالی دی۔ فلاں دن اس نے نبیوں کو گالی دی۔ فلاں دن اس نے اپنے ہمسائے کو گالی دی۔ فلاں دن اس نے اپنی بیوی کو گالی دی۔ فلاں دن اس نے حرام کا مال چکھا۔ اور فلاں دن اس نے یہ یہ الزام لگایا۔ غرض یہ سارے کا سارا ریکارڈ زبان بیان کرنا شروع کر دیگی۔ پھر ہاتھوں پر سوئی رکھی جائیگی تو ہاتھ بولنا شروع کر دیں گے کہ فلاں دن اس نے فلاں کو مارا اور فلاں دن اس نے ان کا یوں مال اٹھایا۔ پھر پاؤں بیان کرنا شروع کر دیں گے کہ فلاں رات کو فلاں کے گھر سیندھ لگانے کے لئے یا فلاں کا مال اٹھانے کے لئے یا اس کو قتل کرنے کے لئے یا اور کوئی نقصان پہنچانے کے لئے یہ شخص گیا۔ غرض کانوں آنکھوں اور چمڑوں کے علاوہ زبانیں بھی اور ہاتھ اور پاؤں بھی اپنے اپنے حصہ کے ریکارڈ سنائیں گے۔ اور ظاہر ہے کہ اس کے بعد انکار کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ کہتے ہیں۔ " گھر کا بھیدی لنکا ڈھائے "۔ جب اپنے ہاتھ گواہی دے رہے ہوں کہ ہم نے یہ یہ کچھ کیا تھا۔ اپنی زبان گواہی دے رہی ہو کہ میں نے یہ کچھ کیا تھا تو اب وہ فرشتوں کو کس طرح کہہ سکیں گے کہ یہ جھوٹ بول رہے ہیں۔

ممکن ہے کوئی شخص کہہ دے کہ یہاں دماغ کا کیوں ذکر نہیں کیا گیا۔ حالانکہ تمام گناہوں کی ابتداء دماغ سے ہی ہوتی ہے اور ہاتھ پاؤں ثانوی حیثیت رکھتے ہیں اور پھر بسا اوقات، دماغی گناہ ایسے بھی ہوتے ہیں جن کے کرنے کا ہاتھ پاؤں کو موقعہ نہیں ملتا اس کے متعلق یہ امر یاد رکھنا چاہیئے کہ اسلامی شریعت میں یہ قانون ہے کہ جو چیز دماغ میں آتی ہے لیکن اُس پر عمل نہیں کیا جاتا۔ وہ بدی شمار نہیں کی جاتی۔ بلکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اگر کوئی شخص کسی بدی کا خیال کرتا ہے لیکن اس پر عمل نہیں کرتا تو اُس کے نامۂ اعمال میں وہ ایک نیکی کی صورت میں لکھی جاتی ہے پس دماغ کو اس لئے شامل نہیں کیا گیا کہ اگر تو ہاتھ دماغ کے مطابق عمل کر چکے ہیں تو ہاتھ کی بات بیان ہو چکی اور اگر زبان دماغ کے مطابق عمل کر چکی ہے تو زبان کی بات بیان ہو چکی۔ اگر دماغ نے یہ کہا تھا کہ چوری کرو۔ تو پیروں نے بتا دیا کہ وہ فلاں گھر میں چوری کرنے کیلئے گئے تھے۔ لیکن اگر دماغ میں ایک بات آئی اور ہاتھ پاؤں سے اُس نے عمل نہیں کروایا۔ تو پھر اسلامی اصول کے ماتحت اُس کے نام ایک نیکی لکھی جائے گی۔ کیونکہ ہاتھ پیر جو دماغ کے تابع تھے اُن کا دماغ کے حکم پر عمل نہ کرنا بتاتا ہے کہ دماغ نے اپنی رائے بدل لی تھی۔ پس رائے بدلنے کی وجہ سے وہ نیکی کا مرتکب ہوگا بدی کا نہیں اور چونکہ وہ نیکی لکھی گئی اسلئے اسکو شرمندگی دلانے والی باتوں میں اُسے بیان نہیں کیا گیا کیونکہ ایک طرف خدا کا اُس کو نیکی قرار دینا اور دوسری طرف اس کو باعث فضیحت بنانا یہ خدا کے انصاف کے خلاف تھا۔ اگر تو وہ اس کو بدی قرار دیتا تو پھر بیشک اس کو فضیحت کی جگہ پر ذکر کر سکتا تھا۔ لیکن اُس نے تو خود فیصلہ کر دیا کہ ایسا بُرا خیال بھی نیکی تصور کیا جائیگا جس پر عمل

اَلْخَبِيْثٰتُ لِلْخَبِيْثِيْنَ وَالْخَبِيْثُوْنَ لِلْخَبِيْثٰتِ ۚ وَالطَّيِّبٰتُ

خبیث باتیں خبیث مردوں کیلئے ہیں اور خبیث مرد خبیث باتوں کے لئے ہیں اور پاک باتیں

لِلطَّيِّبِيْنَ وَالطَّيِّبُوْنَ لِلطَّيِّبٰتِ ۚ اُولٰٓئِكَ مُبَرَّءُوْنَ

پاک مردوں کیلئے ہیں اور پاک مرد پاک باتوں کے لئے ہیں۔ یہ سب لوگ اِن باتوں سے جو (دشمن)

مِمَّا يَقُوْلُوْنَ ۭ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ ﴿۲۶﴾ ع

کہتے ہیں پاک ہیں - اُن کے لئے بخشش اور معزز رزق (مقدر) ہے ۱۶

ع ۳ / ۹

نہ کیا گیا ہو - اور جب وہ نیکی تصور ہوگی تو اُسے فضیحت کا ذریعہ کس طرح بنایا جاسکتا تھا۔

اِس آیت پر عموماً یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ ہاتھ پاؤں کس طرح گواہی دیں گے؟ اس کا پہلا جواب تو یہ ہے کہ ہر چیز کی زبان الگ الگ ہوتی ہے جس سے اُسکی حالت ظاہر ہوتی ہے - دیکھو ہاتھ کی زبان کا تو سب لوگ مشاہدہ کرتے ہی رہتے ہیں۔ طبیب آتا ہے اور نبض دیکھ کر بتا دیتا ہے کہ یہ یہ تکلیف ہے۔ مگر اس کے علاوہ اَب نئی تحقیق سے یہ امر ثابت ہو چکا ہے کہ جس عضو کی کوئی حرکت ہو اس پر اس کا ایک نشان پڑ جاتا ہے۔ اسی طرح ہر حرکت کا ایک نشان جَوّ پر بھی پڑتا ہے جو محفوظ رہتا ہے۔ بے تار برقی کی ایجاد اِسی اصول پر ہے کہ ایک جگہ کی حرکت کا جَوّ پر جو اثر پڑتا ہے دوسری جگہ آلہ کے ذریعہ اسے معلوم کر لیا جاتا ہے۔ پس اس آیت کے یہ معنے بھی ہو سکتے ہیں کہ اِن اعضاء کی جو حرکات ہیں اُن کے اثرات اُن پر پڑتے ہیں لیکن دنیا میں انسانی نظر ایسی تیز نہیں ہوتی کہ ان اثرات کو دیکھ سکے مگر قیامت کے دن انسانی نظر بہت تیز کر دی جائیگی جو ان نشانات کو بھی دیکھ لیگی - اور یہ اُن اعضاء کی شہادت ہوگی جو اُن کے خلاف ہوگی - ہاں جو لوگ توبہ کر کے وفات پاتے ہیں اُن کے اعضاء پر جو اثرات ہونگے وہ مٹا دیئے جائیں گے۔ کیونکہ توبہ کرنے والوں کے گناہ اللہ تعالیٰ نے معاف کر دیتا ہے۔

۱۶ تفسیر بعض لوگ اس آیت کے یہ معنے کرتے ہیں کہ خبیث عورتیں خبیث مردوں کے لئے ہیں اور خبیث مرد خبیث عورتوں کے لئے ہیں۔ اور پاک عورتیں پاک مردوں کے لئے ہیں اور پاک مرد پاک عورتوں کے لئے ہیں۔ لیکن یہ معنے واقعات کے بھی خلاف ہیں اور عقل کے بھی خلاف ہیں - قرآن کریم نے حضرت لوطؑ اور حضرت نوحؑ علیہم السلام کی بیویوں کو مجرم قرار دیا ہے - تو کیا حضرت لوطؑ اور حضرت نوحؑ کو بھی مجرم قرار دیا جائیگا؟ اصل بات یہ ہے کہ پہلی آیت کو مدّ نظر رکھتے ہوئے اس آیت کا یہ مفہوم ہے کہ بُری باتیں بُرے مردوں کیلئے ہیں اور بُرے مرد بُری باتوں کیلئے ہیں - اور پاک باتیں پاک مردوں کے لئے ہیں اور پاک مرد پاک باتوں کے لئے ہیں چنانچہ آیت کا آخری حصّہ اِن معنوں کی تائید کرتا ہے جس میں فرمایا ہے کہ پاک مرد اور پاک عورتیں اُن الزاموں سے جو اُن پر لگائے جاتے ہیں پاک ہیں - اسی طرح ضمنی طور پر اِس آیت سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ اَلَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ والی آیت بھی مرد و عورت دونوں کیلئے ہے کیونکہ مضمون کے خاتمہ پر جو نتیجہ نکالا گیا ہے جس میں

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتًا غَيْرَ بُيُوْتِكُمْ

اے مومنو! اپنے گھروں کے سوا دوسرے گھروں میں نہ داخل ہوا کرو۔

حَتّٰى تَسْتَاْنِسُوْا وَتُسَلِّمُوْا عَلٰٓى اَهْلِهَا ؕ ذٰلِكُمْ

جب تک کہ اجازت نہ لے لو۔ اور داخل ہونے سے پہلے اُن گھروں میں بسنے والوں کو سلام کرو۔ یہ تمہارے لئے

خَيْرٌ لَّكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ﴿۲۸﴾ فَاِنْ لَّمْ تَجِدُوْا

اچھا ہوگا اور اس (فعل) کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تم (نیک باتوں کو ہمیشہ) یاد رکھوگے۔ اور اگر تم اُن گھروں میں کسی کو

فِيْهَآ اَحَدًا فَلَا تَدْخُلُوْهَا حَتّٰى يُؤْذَنَ لَكُمْ ۚ وَاِنْ

نہ پاؤ تب بھی اُن میں داخل نہ ہو جب تک کہ تمہیں (گھر والوں کی طرف سے) اجازت نہ مل گئی ہو۔ اور اگر

قِيْلَ لَكُمُ ارْجِعُوْا فَارْجِعُوْا هُوَ اَزْكٰى لَكُمْ ؕ

(کوئی گھر میں ہو اور) تم سے کہا جائے کہ اس وقت چلے جاؤ۔ تو تم چلے آؤ۔ یہ تمہارے لئے زیادہ پاکیزہ ہوگا

اللہ تعالیٰ نے مردوں اور عورتوں دونوں کو شامل کیا ہے۔

یہ آیت درحقیقت ایک عام قانون پر مشتمل ہے اور اس میں بتلایا گیا ہے کہ الزام قبول کرنے سے پہلے ملزم کی عام حیثیت کو دیکھ لو۔ اگر وہ عام طور پر نیک سمجھا جاتا ہے تو بادی النظر میں الزام کو فوراً جھوٹا قرار دے دو اسی طرح یہ بھی دیکھ لو کہ الزام لگانے والے کن اخلاق کے آدمی ہیں۔ اور آیا وہ گواہ عادل ہیں یا نہیں۔ اگر وہ راستباز نہ ہوں یا اُن کی دماغی کیفیت قابل تسلی نہ ہو تو ان کی گواہی کو کسی صورت میں بھی قابلِ قبول نہیں سمجھا جائیگا۔

تاریخ قضاء میں لکھا ہے کہ ایک شخص نے امام ابن تیمیہؒ کے خلاف ایک دعویٰ کیا۔ قاضی نے آپ کے خلاف سمن جاری کر دیا۔ اتفاقاً آپ اُسے ملنے چلے گئے۔ قاضی نے اُن سے ذکر کیا کہ ایسا ایسا دعویٰ آپ کے خلاف ہوا ہے اور مَیں نے سمن جاری کر دیا ہے۔ امام ابن تیمیہؒ نے کہا کہ آپ نے قرآن و حدیث کے حکم کے خلاف کیا ہے۔ آپ کو سمن جاری کرنے سے پہلے معاملہ کی تحقیق کرنی چاہیئے تھی۔ کیونکہ میری شہرت اِس الزام کے خلاف ہے۔ پس چاہیئے تھا کہ آپ مدعی سے ثبوت طلب کرتے اور اگر کوئی معقول ثبوت اس کے پاس ہوتا تو پھر بے شک مجھے اپنی برأت پیش کرنے کے لئے بلاتے۔ قاضی نے انکی اس دلیل کو قبول کر لیا اور انکے سمن کو منسوخ کر دیا۔

وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ ﴿۲۹﴾

اور اللہ تمہارے کاموں کو خوب جانتا ہے۔ ۵ۓ

تَسْتَاْنِسُوْا

ۓ۱ حل لغات:۔ تَسْتَاْنِسُوْا۔ اٰنَسْتُ مِنْهُ كَذَا کے معنے ہوتے ہیں عَلِمْتُ۔ مَیں نے معلوم کیا اورجب اِسْتَاْنَسْتُ کہیں تو اس کے معنے ہوں گے اِسْتَعْلَمْتُ۔ مَیں نے یہ کوشش کی کہ کسی بات کے متعلق علم حاصل کروں۔ زجاج جو لُغت کے امام ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ آیت لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتًا غَيْرَ بُيُوْتِكُمْ حَتّٰى تَسْتَاْنِسُوْا میں تَسْتَاْنِسُوْا کے معنے ہیں تَسْتَاْذِنُوْا یعنی تم کسی کے گھر میں داخل نہ ہو جب تک کہ تم اجازت حاصل نہ کرلو۔ وَلِذٰلِكَ جَآءَ فِي التَّفْسِيْرِ تَسْتَاْنِسُوْا فَتَعْلَمُوْا اَيُرِيْدُ اَهْلُهَا اَنْ تَدْخُلُوْا اَمْ لَا۔ اسی واسطے تَسْتَاْنِسُوْا کی تشریح میں یہ آیا ہے کہ اصل معنے اس کے یہ ہیں کہ تم معلوم کرو کہ کیا گھر والے یہ چاہتے ہیں کہ تم اندر آؤ یا نہیں۔ (لسان العرب)

تفسیر:۔ قرآن کریم کا طریق ہے کہ وہ اصلاحِ خلق کے لئے ایسی ہدایات دیتا ہے جو بدی کی جڑ کو کاٹنے والی ہوتی ہیں۔ چونکہ بعض لوگ بدظنی کی طرف بہت جلد مائل ہو جاتے ہیں اس لئے اُس نے حکم دے دیا کہ اپنے گھروں کے سوا دوسرے گھروں میں بغیر اجازت اور بغیر گھروالوں کو سلام کرنے کے داخل نہ ہُوا کرو۔ تاکہ کوئی شخص تم پر چوری یا بدکاری کی بدظنّی نہ کرے۔ اگر تم اجازت لے لوگے۔ یا سلام کہہ لوگے تو پھر ہر ایک شخص کو پتہ لگ جائیگا کہ گھر کے تمام مردوں اور عورتوں کو تمہارے اندر داخل ہونے کا علم ہے اور اس صورت میں نہ تم پر کوئی چوری کا الزام لگا سکیگا اور نہ بدکاری کا۔ اور اگر یہ سوال ہو کہ گھر میں کوئی ہو ہی نہ۔ تو پھر کیا کیا جائے۔ تو اس کا جواب یہ دیا کہ اس صورت میں گھر میں داخل ہی نہ ہو۔ جب تک کہ تمہیں اجازت نہ دی جائے۔ یعنی اُس وقت تک انتظار کرو جب تک کہ خاندان کے مرد و زن واپس نہ آجائیں تاکہ تم پر چوری کا الزام نہ لگ سکے۔ اور گھر کے افراد کے واپس آنے کے بعد اگر اجازت مل گئی تو تم بدکاری کے الزام سے بھی محفوظ ہو جاؤ گے۔ پھر سوال ہو سکتا تھا کہ اگر گھر کے افراد تو موجود ہوں مگر وہ اجازت نہ دیں تو پھر کیا کریں۔ اس کا جواب یہ دیا کہ گھر والے اپنے گھر کے مالک ہیں اگر وہ اجازت نہ دیں تو اپنے گھروں کو واپس لوٹ جاؤ۔

انگریز اپنی زبان کے اس محاورہ پر بڑا فخر کیا کرتے ہیں کہ "انگریز کا گھر اس کا قلعہ ہوتا ہے۔" یعنی اس میں کوئی شخص بلا اجازت داخل نہیں ہو سکتا۔ لیکن ان میں تو یہ بات آج آئی ہے۔ اور قرآن نے اُس وقت یہ قانون بنایا جب انگریز ابھی ننگے پھرا کرتے تھے اور درندوں سے زیادہ اُن کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔

یہ آیات جو تمدنی زندگی سے تعلق رکھنے والے بعض نہایت ہی لطیف احکام پر مشتمل ہیں۔ ان میں اللہ تعالےٰ نے یہ ہدایت دی ہے کہ کسی دوسرے کے گھر میں داخل ہونے سے پہلے اجازت حاصل کرلیا کرو۔ اِستیناس کے معنے جیسا کہ حل لغات میں بتایا جاچکا ہے۔ اس بات کا علم حاصل کرنے کی کوشش کے ہیں کہ آیا گھر والے ملاقات کرنا پسند کرتے ہیں یا نہیں کرتے (بحر محیط) اسی طرح اس کے ایک معنے اجازت حاصل کرنے کے بھی ہیں۔ چنانچہ حضرت ابن عباسؓ سے یہی معنے مروی ہیں اور انہوں نے تَسْتَاْنِسُوْا کے معنے تَسْتَاْذِنُوْا یعنی اجازت مانگنے کے ہی کئے ہیں۔ (بحر محیط) اگر اس قرآنی ہدایت پر عمل کیا جائے تو دُنیا کے

بہت سے فسادات اور جھگڑے مٹ جائیں۔ بعض لوگ بڑی
سادگی سے کہہ دیا کرتے ہیں کہ یونہی ہماری نظر پڑ گئی تھی اور
اِس بنا پر وہ دوسرے پر اتہام لگا دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اِس
حکم کے ذریعہ اِس قسم کی خرابیوں کو بھی دُور کر دیا۔ اگر کوئی شخص
کہے گا۔ کہ جھانک کر دیکھنے سے مَیں نے فلاں کو اس حالت میں
دیکھا تھا۔ تو قاضی کہیگا کہ تُو جھانکا کیوں تھا؟ تیری گواہی
قابلِ قبول نہیں کیونکہ تُو نے خود شریعت کے حکم کو توڑا ہے۔
دوسرے اِس ہدایت پر عمل کرنے سے خود انسان بہت سے
ایسے مواقع سے بچ جاتا ہے جنکی وجہ سے وہ اتہام کا نشانہ
بن سکتا ہے۔ تیسرے آپس کے تعلقات میں بھی کشیدگی
پیدا نہیں ہوتی۔ اگر دوسروں کے گھروں میں آنے جانے
کے لئے اجازت کی شرط نہ ہو تو ایسی صورت میں جبکہ میاں
بیوی بے تکلفی کی حالت میں بیٹھے ہوں اُن کو شرمندگی اٹھانی
پڑے گی۔ پھر اگر اجازت لینا ضروری نہ ہوتا تو چوریوں
کی وارداتیں بھی بڑھ جاتیں۔ ایک شخص چوری کی نیت سے
اندر داخل ہو جاتا اور جب پکڑا جاتا تو کہتا۔ مَیں تو ملنے
آیا تھا۔ غرض اِن احکام میں بیسیوں فوائد مخفی ہیں مگر
آجکل جہاں دوسروں کے گھروں میں داخل ہونے سے پہلے
لوگ عموماً اجازت لے لینے کے عادی ہیں وہاں استیناس
کرتے وقت السلام علیکم کہنے کا بہت کم رواج ہے۔
وہ صرف زور زور سے دستک دینا اور شور مچانا شروع
کر دیتے ہیں۔ یا باہر کھڑے کھڑے بلند آواز سے گھر والے
کا نام لے کر بلانا شروع کر دیتے ہیں۔ حالانکہ استیناس کے
ساتھ سلام کہنا بھی ضروری ہوتا ہے۔ چنانچہ احادیث
میں آتا ہے کہ ایک دفعہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم
اپنے گھر تشریف رکھتے تھے کہ ایک شخص آیا اور اُس نے
کہا۔ یا رسول اللہ! مَیں اندر آ جاؤں۔ رسول کریم صلی اللہ
علیہ وسلم نے اپنے ایک خادم کو بلایا۔ اور اُسے فرمایا کہ
جاؤ اور اِسے اجازت حاصل کرنے کا طریق بتاؤ۔ جو
یہ ہے کہ پہلے السلام علیکم کہے۔ اور پھر دریافت کرے
کہ کیا مجھے اندر آنے کی اجازت ہے (فتح البیان) اِس
سے ثابت ہوتا ہے کہ پہلے سلام کہنا چاہیئے اور پھر
اجازت لینی چاہیئے۔ اِسی طرح یہ بھی ثابت ہے کہ اگر
ایک دفعہ جواب نہ ملے تو وقفہ وقفہ کے بعد تین دفعہ سلام علیکم
کہنا چاہیئے۔ لیکن بعض لوگ اِس سے اختلاف کرتے ہیں
اور کہتے ہیں کہ پہلے اجازت لینی چاہیئے اور پھر سلام کہنا
چاہیئے کیونکہ قرآن کریم کے الفاظ یہ ہیں کہ تَسْتَأْنِسُوْا
وَتُسَلِّمُوْا عَلٰٓى اَهْلِهَا یعنی استیناس کا پہلے ذکر آتا
ہے اور سلام کا بعد میں مگر ان کا یہ استدلال درست نہیں
بیشک اسجگہ استیناس کا پہلے ذکر آتا ہے۔ مگر استیناس
کے معنے استعلام اور استکشاف کے ہیں۔ یعنی اس بات
کا علم حاصل کرنے کی کوشش کے ہیں کہ آیا گھر والے ملاقات
کرنا پسند کرتے ہیں یا نہیں کرتے۔ گویا اس کے معنے اپنا تعارف
کروانے کے ہیں اور یہ اُسی صورت میں ہو سکتا ہے جب کہ
پہلے گھر والوں کی توجہ اپنی طرف پھیر لی جائے۔ اب سوال
یہ ہے کہ گھر والوں کی توجہ کو کس طرح پھیرا جائے سو اِس
کے لئے ایک طریق تو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے بیان
فرما دیا کہ پہلے السلام علیکم کہو اور پھر اندر آنے کی اجازت
حاصل کرو۔ اور ایک عام طریق جو لوگوں کا اپنا ایجاد کردہ
ہے وہ یہ ہے کہ وہ دروازہ کو زور زور سے کھٹکھٹانا
یا زنجیر ہلانا شروع کر دیتے ہیں مگر السلام علیکم نہیں کہتے
چونکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سلام کہنا ضروری
قرار دیا ہے اس لئے خواہ دستک دی جائے یا زنجیر
ہلائی جائے تب بھی اس حکم کے ماتحت ضروری ہوگا کہ
دستک کے ساتھ السلام علیکم کہا جائے۔ لیکن جہاں
امراء کوٹھیوں کے اندر رہتے ہوں۔ وہاں اُن کی ملاقات
کے لئے اگر تعارفی کارڈ اندر بھجوا دیا جائے یا رقعہ
لکھ کر کسی خادم کے ذریعہ اپنے آنے کی اطلاع دیدی جائے

لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَدْخُلُوْا بُيُوْتًا غَيْرَ

تمہارے لئے گناہ کا موجب نہیں اُن گھروں میں داخل ہونا جن میں کوئی

مَسْكُوْنَةٍ فِيْهَا مَتَاعٌ لَّكُمْ ۚ وَ اللّٰهُ يَعْلَمُ مَا

رہتا نہیں اور تمہارا سامان اُس میں پڑا ہے۔ اور اللہ (تعالیٰ) اُسے بھی جانتا ہے جسے

تُبْدُوْنَ وَ مَا تَكْتُمُوْنَ ﴿۳۰﴾

تم ظاہر کرتے ہو اور اُسے بھی جسے تم چھپاتے ہو۔ ۱۸ھ

تو یہ طریق بھی استیناس میں ہی شامل ہوگا کیونکہ اِس ذریعہ سے وہ اپنا تعارف کروا دیتا ہے۔ اِس کے بعد جب انسان اندر داخل ہو تو پھر تُسَلِّمُوْا عَلٰٓى اَهْلِهَا کے ماتحت اسکا فرض ہوگا کہ وہ دوبارہ سلام کرے۔ گویا ایک سلام تو استیناس کے وقت ہوگا اور ایک سلام اُس وقت ہوگا جب وہ ملاقات کے لئے اندر داخل ہوگا۔

استیناس کی شرط علاوہ اور حکمتوں کے اس لئے بھی رکھی گئی ہے کہ بعض دفعہ ایسا آدمی ملاقات کیلئے آجاتا ہے جس سے ملنا ضروری نہیں ہوتا۔ پس جب وہ استیناس کے ذریعہ گھر والوں کو اپنی طرف متوجہ کریگا تو گھر والے دیکھ لیں گے کہ وہ کون ہے اور آیا اُس سے ملنا ضروری ہے یا غیر ضروری۔ اگر ضروری ہوگا تو وہ بُلا لیں گے اور اگر ضروری نہیں ہوگا تو اُسے جواب دیدینگے۔

پھر فرماتا ہے فَاِنْ لَّمْ تَجِدُوْا فِيْهَآ اَحَدًا فَلَا تَدْخُلُوْهَا حَتّٰى يُؤْذَنَ لَكُمْ اگر گھر میں کوئی شخص موجود نہ ہو اور وہ کہیں باہر گئے ہوئے ہوں تو تم اُن کی واپسی کا انتظار کرو اور اُن کی اجازت کے بغیر مکان میں مت داخل ہو۔ وَاِنْ قِيْلَ لَكُمُ ارْجِعُوْا فَارْجِعُوْا هُوَ اَزْكٰى لَكُمْ اور اگر تم کو کہہ دیا جائے کہ جاؤ ہم مل نہیں سکتے۔ ہمیں اِس وقت فرصت نہیں تو پھر تمہارا فرض ہے کہ واپس چلے جاؤ۔ یہ نہیں کہ دھرنا مار کر بیٹھ جاؤ۔ کہ ہمیں ضرور ملنے کی اجازت دی جائے۔ صحابہؓ میں احکامِ شریعت کو پُورا کرنے کی اسقدر تڑپ پائی جاتی تھی کہ ایک صحابیؓ کہتے ہیں۔ مجھے سالہا سال یہ خواہش رہی کہ مَیں کسی کے ہاں جاؤں اور وہ مجھے کہے کہ واپس چلے جاؤ تاکہ هُوَ اَزْكٰى لَكُمْ کے ماتحت میں ثواب حاصل کرسکوں مگر مجھے کبھی ایسا موقعہ نہیں ملا (فتح البیان جلد ۶) اِس سے صحابہؓ کی اُس محبت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے جو انہیں ایک دوسرے کے ساتھ تھی۔ ایک شخص سالہا سال اِس موقعہ کی تلاش میں رہتا ہے کہ مجھے کبھی یہ سُننے کا موقعہ ملے کہ واپس چلے جاؤ مگر ایک صحابیؓ بھی یہ جواب نہیں دیتا۔ اور دوسری طرف اس صحابیؓ میں بھی کس قدر اخلاص تھا کہ سالہا سال اُس نے ایسا موقعہ تلاش کرنے میں لگا دیئے۔

۱۸ھ تفسیر: - اِس آیت میں ایک نئی حالت کا ذکر کیا کہ اگر کوئی گھر ہو تو کسی غیر کا لیکن اس میں کوئی خاندان رہتا نہ ہو بلکہ تم نے اپنا زائد سامان رکھنے کیلئے اُسے کرایہ پر لیا ہُوا ہو یا مانگا ہُوا ہو۔ تو اُس کے متعلق یہ قانون ہے کہ اُس میں بغیر اجازت کے داخل ہونا تمہارے لئے جائز ہے۔ کیونکہ اگر وہ مکان تم نے کرایہ پر لیا ہُوا ہے تو عملاً وہ تمہارا ہی ہے۔ اور اگر مانگا ہُوا ہے تو پھر بھی مالک کی اجازت سے وہ مکان تمہارا ہی سمجھا جائیگا۔

قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوْا

تو مومنوں سے کہہ دے کہ وہ اپنی آنکھیں نیچی رکھا کریں اور اپنی شرمگاہوں کی

فُرُوْجَهُمْ ذٰلِكَ اَزْكٰى لَهُمْ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌ بِمَا

حفاظت کیا کریں - یہ اُن کے لئے بہت پاکیزگی کا موجب ہوگا۔ جو کچھ وہ کرتے ہیں اللہ (تعالیٰ)

يَصْنَعُوْنَ ﴿۳۱﴾ وَقُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ يَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ

اُس سے اچھی طرح خبردار ہے - اور مومن عورتوں سے کہدے کہ وہ بھی اپنی آنکھیں نیچی رکھا کریں -

وَيَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا مَا ظَهَرَ

اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کیا کریں - اور اپنی زینت کو ظاہر نہ کیا کریں سوائے اس کے جو آپ ہی آپ

مِنْهَا وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُيُوْبِهِنَّ وَلَا يُبْدِيْنَ

بے اختیار ظاہر ہوتی ہو - اور اپنی اوڑھنیوں کو اپنے سینہ پر سے گذار کر اسکو ڈھانک کر پہنا کریں - اور اپنی زینتوں کو صرف

زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا لِبُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اٰبَآئِهِنَّ اَوْ اٰبَآءِ بُعُوْلَتِهِنَّ

اپنے خاوندوں یا اپنے باپوں یا اپنے خاوندوں کے باپوں

اَوْ اَبْنَآئِهِنَّ اَوْ اَبْنَآءِ بُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اِخْوَانِهِنَّ اَوْ بَنِيْٓ

یا اپنے بیٹوں یا اپنے خاوندوں کے بیٹوں یا اپنے بھائیوں یا اپنے بھائیوں

اِخْوَانِهِنَّ اَوْ بَنِيْٓ اَخَوٰتِهِنَّ اَوْ نِسَآئِهِنَّ اَوْ مَا مَلَكَتْ

کے بیٹوں یا اپنی بہنوں کے بیٹوں یا اپنی (ہم کفو) عورتوں یا جن کے مالک اُن کے

اَيْمَانُهُنَّ اَوِ التّٰبِعِيْنَ غَيْرِ اُولِي الْاِرْبَةِ مِنَ الرِّجَالِ

داہنے ہاتھ ہوئے ہیں ان کے سوا کسی پر ظاہر نہ کیا کریں - یا ایسے ماتحت مردوں پر جو ابھی جوان نہیں ہوئے -

وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا تَكْتُمُوْنَ میں پہلے حکم کے نتیجہ میں جو وساوس پیدا ہو سکتے تھے اُن کا رد کیا ہے اور بتایا ہے کہ اگر تمہارے دل میں یہ خیال گذرے کہ ایسی قیدوں سے تو تمدن خراب ہو جائیگا۔ تو تمہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ یہ وساوس درست نہیں -

أَوِ الطِّفْلِ الَّذِيْنَ لَمْ يَظْهَرُوْا عَلٰى عَوْرٰتِ النِّسَآءِ

یا ایسے بچوں پر جن کو ابھی عورتوں کے خاص تعلقات کا علم حاصل نہیں ہوا -

وَلَا يَضْرِبْنَ بِاَرْجُلِهِنَّ لِيُعْلَمَ مَا يُخْفِيْنَ مِنْ زِيْنَتِهِنَّ

اور اپنے پاؤں (زور سے زمین پر) اس لئے نہ مارا کریں کہ وہ چیز ظاہر ہو جائے جس کو وہ اپنی زینت کی چھپا رہی ہیں

وَتُوْبُوْٓا اِلَى اللّٰهِ جَمِيْعًا اَيُّهَ الْمُؤْمِنُوْنَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۳۲﴾

اور اے مومنو! سب کے سب اللہ کی طرف رجوع کرو - تاکہ تم کامیاب ہو جاؤ- ۱۹ٖ

یہ قیدیں تمہاری بھلائی کیلئے ہیں تم کو تکلیف میں ڈالنے کے لئے نہیں - صرف اس لئے ہیں کہ تم ہوشیار ہو جاؤ اور پہلے سی احتیاطیں اختیار کر لو تاکہ نقصان اٹھانے سی محفوظ ہو جاؤ-

يَغُضُّوْا

۱۹ٖ حل لغات :- يَغُضُّوْا : غَضَّ سے جمع مذکر غائب کا صیغہ ہے اور غَضَّ بَصَرَهٗ کے معنے ہیں مَنَعَهٗ مِمَّا لَا يَحِلُّ لَهٗ رُؤْيَتُهٗ یعنی اپنی آنکھ کو اس چیز سے روکا جس کا دیکھنا اس کے لئے ممنوع تھا - (اقرب)

خُمُر

خُمُر : خِمَار کی جمع ہے اور اَلْخِمَارُ کے معنے ہیں هُوَ مَا تُغَطِّيْ بِهِ الْمَرْاَةُ رَاْسَهَا - وہ کپڑا جس سے عورت اپنا سر ڈھانپتی ہے (اقرب)

جُيُوْبِهِنَّ

جُيُوْبِهِنَّ - اَلْجُيُوْبُ : اَلْجَيْبُ کی جمع ہے اور اَلْجَيْبُ کے معنے ہیں اَلْقَلْبُ وَالصَّدْرُ - سینہ (اقرب)

اَلْاِرْبَةُ

اَلْاِرْبَةُ : اَلْحَاجَةُ - یعنی اربۃ کے معنے عربی زبان میں حاجت کے ہوتے ہیں - (اقرب) پس غَيْرُ اُولِي الْاِرْبَةِ کے معنے ہونگے جن کو کوئی حاجت اور ضرورت نہ ہو -

تفسیر :- یہاں بدی سے بچنے کا ایک اور طریق بتایا - اور وہ یہ کہ مومن مرد اور مومن عورتیں اپنی نگاہیں نیچی رکھا کریں - کیونکہ اس سے بدی کا امکان بہت کم ہو جائیگا اور برائی پھیلنے کا راستہ مسدود ہو جائے گا - گویا باوجود پردہ کے حکم کے جو الٰہی آیات میں بیان کیا گیا ہے - پھر بھی بعض مواقع ایسے نکل سکتے ہیں جبکہ مرد و عورت اکٹھے ہوں ایسی صورت میں یہ حکم دیا کہ مرد و عورت دونوں اپنی آنکھیں نیچی رکھا کریں تاکہ شیطان اُن پر حملہ آور نہ ہو اور ان کے دلوں کی پاکیزگی قائم رہے

یہ ایک عجیب بات ہے کہ حضرت مسیحؑ نے بھی انجیل میں غیر عورتوں پر نگاہ ڈالنے سے روکا ہے اور اسلام نے بھی اس کی ممانعت کی ہے - مگر حضرت مسیحؑ نے تو صرف یہ کہا ہے کہ

"جس کسی نے بُری خواہش سے کسی عورت پر نگاہ کی وہ اپنے دل میں اس کے ساتھ زنا کر چکا -" (متی باب ۵ آیت ۲۸)

لیکن اسلام یہ کہتا ہے کہ تُو کسی غیر عورت کے چہرہ پر نگاہ نہ ڈال - نہ اچھی نظر سے اور نہ بُری نظر سے کیونکہ اگر تُو نے دیکھا تو ہو سکتا ہے کہ شیطان تجھے ورغلائے اور تیرے دل میں بدی کا بیج بو دے -

پھر اسلام اگر ایک طرف مردوں کو غضِ بصر کی ہدایت دیتا ہے تو ساتھ ہی عورتوں کو بھی اسکی تاکید

کرتا ہے۔ مگر عیسائیت صرف مردوں کو اس تعلیم کا پابند قرار دیتی ہے اور وہ بھی اس شکل میں کہ وہ غیر محرم عورت کو تو کھلے بندوں دیکھنے کی اجازت دیتی ہے مگر اتنی احتیاط رکھنے کی ہدایت دیتی ہے کہ بُری نگاہ سے نہ دیکھو۔ مگر یہ تو ویسی ہی بات ہے جیسے کسی شاعر نے کہا ہے کہ ؎

درمیانِ قعرِ دریا تختہ بندم کردۂ
باز می گوئی کہ دامن تر مکن ہشیار باش

دریا کے وسط میں قید کر دینا اور پھر یہ کہ دیکھنا تمہارے کپڑے گیلے نہ ہوں عقل کے بالکل خلاف ہے۔ اِسی طرح یہ کہنا کہ عورتوں کو تو دیکھو مگر بُری نیت سے نہ دیکھو ایسی بات ہے جو کسی صورت میں بھی قابلِ عمل نہیں کہلا سکتی۔ کیونکہ بدی کی جڑ مرد و عورت کا آزادانہ اختلاط ہی ہے۔ اگر اس جڑ کو قائم رکھا جائے تو بدی کے رُکنے کا کوئی احتمال ہی نہیں ہو سکتا پس عیسائیت ایک ایسی تعلیم پیش کرتی ہے جو ناقابلِ عمل ہے مگر اسلام کہتا ہے کہ مردوں کو چاہیئے کہ نہ غیر محرم عورتوں کو نہ دیکھیں اور عورتوں کو چاہیئے کہ وہ غیر محرم مردوں کو نہ دیکھیں اور اس طرح اپنے ایمان اور تقویٰ کی حفاظت کریں۔

مگر بعض لوگوں نے جو حقیقت پر غور کرنے کے عادی نہیں غلطی سے اس حکم سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ غیر محرم عورت کے کسی حصّہ پر بھی نظر ڈالنا اسلامی احکام کی رُو سے جائز نہیں۔ حالانکہ یہ درست نہیں۔ اگر شریعت اسلامیہ کا یہی منشا ہوتا کہ عورت کے جسم کے کسی حصّہ پر بھی نظر نہ ڈالی جائے تو عورتوں کو چار دیواری سے باہر قدم رکھنے کی اجازت ہی نہ ہوتی اور مکان بھی بند دریچوں کے بنائے جاتے جس قسم کے ظالم بادشاہ پُرانے زمانہ میں قید خانے بنایا کرتے تھے حالانکہ عورت بھی اسی قسم کی انسان ہے جس قسم کا کہ مرد ہے اور اُس کی طبعی ضروریات بھی مرد ہی کی طرح ہیں اور خدا تعالیٰ کا طبعی قانون بھی دونوں پر یکساں اثر کر رہا ہے۔ اور وہ قانون صحت کی درستی اور جسم کی مضبوطی کے لئے اس امر کا مقتضی ہے کہ انسان کھلی ہوا میں پھرے اور محدود دائرہ میں بند ہونے کا خیال اس کے اعصاب میں کمزوری پیدا نہ کرے اور جبکہ شریعت عورت کو باہر پھرنے کی اجازت دیتی ہے تو لازماً جب وہ باہر نکلیگی اس کی نظر مردوں کے جسم کے بہت سے حصّوں پر اُسی طرح پڑے گی جس طرح عورت کے بعض حصّوں پر مرد کی پڑتی ہے۔ خواہ وہ کپڑوں کے نیچے چھپے ہوئے ہوں۔ اور یہ چیز ممنوع نہیں۔ اصل چیز جو پردہ کی جان ہے اور جس کا اِس آیت میں حکم دیا گیا ہے وہ دونوں کی نظر کو ملنے سے بچانا ہے اور جسم کا وہ حصّہ جس پر نگاہ ڈالتے ہوئے آنکھیں ملنے سے رہ ہی نہیں سکتیں۔ یا اس امر کی احتیاط نہایت مشکل ہو جاتی ہے وہ چہرہ ہی ہے۔ بقیہ جسم کو جبکہ وہ مناسب کپڑوں سے ڈھکا ہُوا ہو نہ چھپانے کی ضرورت ہوتی ہے اور نہ اُسے چھپایا جا سکتا ہے جب تک کہ عورتیں بازاروں اور گلیوں میں پھرنا نہ چھوڑ دیں۔ یا قناتیں تان کر نہ ایک جگہ سے دوسری جگہ کا سفر نہ کریں۔ اور یہ ناممکن امر ہے۔ امراء کی عورتیں تو پھر بھی اپنے مکانوں کی وسیع چار دیواری میں پھر سکتی ہیں مگر غرباء اور اوسط طبقہ کی عورتیں کس طرح گذارہ کریں۔ مگر امراء کی عورتوں کو بھی میل ملاقات کے لئے ایک گھر سے دوسرے گھر کی طرف جانا پڑتا ہے اور اُن کی نظر بھی لازماً گلیوں اور سڑکوں پر پھرنے والے اور بازاروں اور اسٹیشنوں اور گاڑیوں پر بیٹھنے والے لوگوں کے بعض حصّہ جسم پر پڑیگی اور مردوں کی نظر اُن کے جسم کے بعض حصّوں پر پڑیگی سوائے اس صورت کے کہ گھر سے نکلتے ہی عورتوں اور مردوں کی آنکھوں پر پٹیاں باندھ دی جائیں تاکہ وہ ایک دوسرے کو دیکھ ہی نہ سکیں۔ مگر کوئی عقلمند اس کو جائز قرار نہیں دے سکتا۔ پس غضِ بصر کے حکم کا یہ منشاء نہیں کہ عورت کیلئے مرد کے جسم کے کسی حصّہ پر بھی نظر ڈالنا منع ہے یا مرد عورت کے جسم کے کسی حصّہ پر بھی نظر نہیں ڈال سکتا بلکہ صرف

دونوں کی نگاہوں کو آپس میں ملنے سے بچانا ہے ورنہ جو عورت بھی باہر نکلے گی اُس کے پاؤں اور اُس کی چال اور اس کا قد اور اس کے ہاتھوں کی حرکت اور ایسی ہی اور کئی چیزیں مردوں کو نظر آئیں گی۔ اِسی طرح مرد کے جسم کے کئی حصّے عورتوں کو نظر آئیں گے مگر یہ چیز ایسی ہے جس پر شریعت نے کوئی پابندی عائد نہیں کی لیکن عورت کا بلا حجاب مرد کے سامنے آنا اور اس کے ساتھ بے تکلّف ہونا چونکہ انسان کے حیوانی تقاضوں کو جوش دلاتا اور اسے جذبات کے گڑھے میں دھکیل دیتا ہے۔ اس لئے شریعت نے اِسپر پابندی عائد کر دی ہے اور عورت کو پردہ کا حکم دیدیا ہے۔

اسجگہ یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ قرآن کریم کا یہ طریق نہیں ہے کہ وہ عورتوں کو الگ مخاطب کر کے اُنکو وہ حکم دے جو مردوں کو دیا گیا ہو بلکہ جو حکم مردوں کے لئے ہو اُس میں عورتیں بھی شامل ہوتی ہیں مگر یہاں پہلے مومن مردوں کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ اپنی آنکھیں نیچی رکھیں اور اس طرح اپنے فروج کی حفاظت کریں۔ اور پھر قُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ کہہ کر مومن عورتوں کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ بھی اپنی نگاہیں نیچی رکھیں اور اپنے فروج کی حفاظت کریں۔ اِس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ اِس معاملہ میں ہمیشہ کے طور پر عورتوں میں ہی یہ بُرائی پائی جاتی ہے اس لئے ضروری تھا کہ عورتوں کو الگ بھی مخاطب کیا جاتا اور اُن کو اپنی نگاہیں نیچی رکھنے کا حکم دیا جاتا۔ لیکن اس کے علاوہ علم النفس کے ماتحت مرد و عورت کے باہمی تعلقات کی ابتدا ہمیشہ دونوں کی نظریں ملنے سے ہوتی ہے اور یہ قاعدہ ہے کہ جب کسی پر نظر پڑتی ہے تو خواہ دوسرے کی نظر نیچی ہی ہو تب بھی اس پر اثر پڑ جاتا ہے۔ اس لئے یہ حکم تبھی مفید ہو سکتا تھا جبکہ دونوں کو دیا جاتا اور دونوں کو اس امر کا پابند کر دیا جاتا کہ وہ ایک دوسرے کی طرف نہ دیکھیں۔ نہ مرد عورتوں کی طرف دیکھیں اور نہ عورتیں مردوں کی طرف دیکھیں۔

وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا میں فرماتا ہے۔ اچھے اچھے کپڑے اور زیور پہن کر لوگوں کو دکھاتی نہ پھرو۔ ہاں جو چیز خود بخود ظاہر ہو جائے۔ اُس کے ظاہر ہونے میں تم پر کوئی گناہ نہیں۔ مَا ظَهَرَ مِنْهَا کے متعلق مفسرین میں اختلاف پیدا ہوا ہے کہ اس کی مراد ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ اس سے کپڑے مراد ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ ایسے زیورات مراد ہیں جو عورتوں کے ہاتھوں اور پاؤں میں ہوتے ہیں۔ جیسے انگوٹھی اور کڑے اور پازیب وغیرہ۔ بعض نے کہا ہے کہ کہنیوں تک ہاتھ مراد ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ اوپر کا برقعہ یا چادر مراد ہے۔ بعض نے اس سے ہاتھوں کی مہندی مراد لی ہے۔ لیکن قرآن کریم نے جو الفاظ استعمال کئے ہیں وہ یہ ہیں کہ اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا یعنی سوائے اس کے جو آپ ہی آپ ظاہر ہو۔ یہ الفاظ دلالت کرتے ہیں کہ جو چیز خود بخود ظاہر ہو شریعت نے صرف اس کو جائز رکھا ہے۔ یہ نہیں کہ جس مقام کو کوئی عورت آپ ظاہر کرنا چاہے۔ اس کا ظاہر کرنا اس کے لئے جائز ہو۔ میرے نزدیک آپ ہی آپ ظاہر ہونے والی موٹی چیزیں دو ہیں یعنی قد اور جسم کی حرکات اور چال لیکن عقلاً یہ بات ظاہر ہے کہ عورت کے کام کے لحاظ سے یا مجبوری کے لحاظ سے جو چیز آپ ہی آپ ظاہر ہو وہ پردے میں داخل نہیں۔ چنانچہ اسی اجازت کے ماتحت طبیب عورتوں کی نبض دیکھتا ہے۔ کیونکہ بیماری مجبور کرتی ہے کہ اس چیز کو ظاہر کر دیا جائے۔ اگر مُنہ پر کوئی جلدی بیماری ہو تو طبیب مُونہہ بھی دیکھیگا۔ اگر اندرونی بیماری ہو تو زبان دیکھیگا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ایک جنگ میں ہم پانی لاتی تھیں اور ہماری پنڈلیاں

ننگی ہوجاتی تھیں۔ اُس وقت پنڈلیوں کا ننگا ہونا قرآن کریم کے خلاف نہ تھا بلکہ اس قرآنی حکم کے مطابق تھا۔ جنگی ضرورت کے لحاظ سے ضروری تھا کہ عورتیں کام کرتیں اور دوڑنے کی وجہ سے پنڈلیاں خود بخود ننگی ہوجاتی تھیں کیونکہ اُسوقت پاجامے کا نہیں بلکہ تہ بند کا رواج تھا۔ اسی اصل کے ماتحت اگر کسی گھرانے کے مشاغل ایسے ہوں کہ عورتوں کو باہر کھیتوں میں یا میدانوں میں کام کرنا پڑے تو اُن کے لئے آنکھوں سے لیکر ناک تک کا حصّہ کھلا رکھنا جائز ہوگا اور پردہ ٹوٹا ہُوا نہیں سمجھا جائیگا کیونکہ بغیر اس کے کھولنے کے وہ کام نہیں کرسکتیں۔ اور جو حصّہ ضروریاتِ زندگی کے لئے اور ضروریاتِ معیشت کے لئے کھولنا پڑتا ہے اس کا کھولنا پردے کے حکم میں ہی شامل ہے۔ اسی طرح جن عورتوں کو پانی میں کام کرنا پڑتا ہو اُن کے لئے یہ بھی جائز ہوگا کہ وہ پاجامہ اڑس لیں اور اُن کی پنڈلی ننگی ہوجائے لیکن جس عورت کے کام اسے مجبور نہیں کرتے کہ وہ کھلے میدانوں میں نکل کر کام کرے اُسپر اس اجازت کا اطلاق نہ ہوگا۔ غرض اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا کے ماتحت کسی مجبوری کی وجہ سے جتنا حصّہ ننگا کرنا پڑے ننگا کیا جاسکتا ہے۔ مثلاً ایک زمیندار عورت مونہہ پر نقاب ڈال کر گوڈی وغیرہ یا زمینداری سے تعلق رکھنے والے دوسرے کام نہیں کرسکتی اس کے لئے جائز ہوگا کہ ہاتھ اور آنکھوں سے لیکر ناک تک کا حصّہ ننگا رکھے تاکہ کام کرسکے۔ لیکن جن عورتوں کو اس قسم کے کام نہ کرنے پڑتے ہوں بلکہ انہوں نے صرف سیر وغیرہ کے لئے باہر نکلنا ہو۔ اُن کے لئے یہی حکم ہے کہ وہ اپنے مُنہ کو ڈھانکیں۔ غرض اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا کے یہ معنے ہیں کہ وہ حصّہ جو آپ ہی آپ ظاہر ہو اور جسے کسی مجبوری کی وجہ سے چھپایا نہ جاسکے خواہ یہ مجبوری بناوٹ کے لحاظ سے ہو۔ جیسے قد کہ یہ بھی ایک زینت ہے مگر اس کو چھپانا ناممکن ہے اس لئے اس کو ظاہر کرنے سے شریعت نہیں روکتی۔ یا بیماری کے لحاظ سے ہو کہ کوئی حصّہ جسم علاج کے لئے ڈاکٹر کو دکھانا پڑے بلکہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام تو یہاں تک فرمایا کرتے تھے کہ ہوسکتا ہے ڈاکٹر کسی عورت کے متعلق تجویز کرے کہ وہ مونہہ نہ ڈھانپے اگر ڈھانپے گی تو اس کی صحت خراب ہوجائیگی اور ادھر اُدھر چلنے پھرنے کے لئے کہے۔ تو ایسی صورت میں اگر وہ عورت مُنہ ننگا کرکے چلتی ہے تو بھی جائز ہے بلکہ بعض فقہاء کے نزدیک اگر کوئی عورت حاملہ ہو اور کوئی اچھی دایہ میسّر نہ ہو اور ڈاکٹر یہ کہے کہ اگر یہ کسی قابل ڈاکٹر سے اپنا بچّہ نہیں جنوائیگی تو اس کی جان خطرہ میں ہے تو ایسی صورت میں اگر وہ کسی مرد سے بچّہ جنوائے تو یہ بھی جائز ہوگا۔ بلکہ اگر کوئی عورت مرد ڈاکٹر سے بچّہ نہ جنوائے اور مرجائے تو خدا تعالیٰ کے حضور وہ ایسی ہی گنہگار سمجھی جائیگی جیسے اُس نے خودکشی کی ہے۔ پھر یہ مجبوری کام کے لحاظ سے بھی ہوسکتی ہے جیسے زمیندار گھرانوں کی عورتوں کی میں نے مثال دی ہے کہ اُن کے گذارے ہی نہیں ہوسکتے جب تک کہ وہ کاروبار میں اپنے مردوں کی امداد نہ کریں۔ یہ تمام چیزیں اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا میں ہی شامل ہیں۔

پھر فرماتا ہے۔ وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلَىٰ جُيُوبِهِنَّ اور چاہیئے کہ وہ اپنی اوڑھنیوں کو کھینچ کر اپنے گریبانوں تک لے آئیں۔ خمار کسی چادر یا دوپٹے کا نام نہیں ہے بلکہ اُس رومال کا نام ہے جو کام کرتے وقت عورتیں اپنے سر پر باندھ لیا کرتی ہیں۔ اور جَیب عربی زبان میں قمیص کے چاک کو کہتے ہیں۔ جیسے ہمارے ہاں گریبان کہتے ہیں۔ یہ گریبان مختلف طرق سے بنایا جاتا ہے بعض لوگوں میں پیچھے کی طرف ہوتا ہے بعض میں دائیں کندھے کی طرف ہوتا ہے بعض میں بائیں کندھے کی طرف ہوتا ہے بعض میں اگلی طرف ہوتا ہے۔ بعض میں دائیں بائیں دونوں طرف ہوتا ہے۔ عربوں میں چاک کا رواج سامنے یعنی سینہ کی طرف تھا۔ اور عرب کی عورتوں میں رواج تھا کہ وہ پیٹھ اور کندھے پر کپڑا ڈال لیتیں اور سینہ ننگا رکھتیں جس طرح آجکل یورپین عورتیں کرتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلَىٰ جُيُوبِهِنَّ چاہیئے کہ وہ اپنے خُمر کو

جیوب پر ڈال لیں۔ اور چونکہ اُن کے جیوب اگلی طرف ہوتے تھے اس لئے اس کے معنے یہ ہوئے کہ سر پر سے کپڑے کو کھینچ کر نیچے جیوب تک لے آئیں یعنی گھونگھٹ نکال لیں۔ یہ معنے نہیں کہ دوپٹے کی آنچل کو اپنے سینوں پر ڈال لیا کریں۔ کیونکہ خمار کی آنچل نہیں ہوتی وہ چھوٹا ہوتا ہے۔ اس کے معنے یہی ہیں کہ سر سے رومال کو اتنا نیچا کرو کہ وہ سینہ تک آجائے اور سامنے سے آنے والے آدمی کو مُنہ نہ نظر آئے۔ یہ ہدایت بتا رہی ہے کہ عورت کا مُونہہ پردہ میں شامل ہے مگر بعض لوگ غلطی سے یہ سمجھتے ہیں کہ عورت کے لئے مُنہ کا پردہ نہیں حالانکہ دیکھنے والی بات یہ ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اِن آیات کے کیا معنے سمجھے اور پھر صحابہؓ اور صحابیاتؓ نے اس پر کس طرح عمل کیا؟ اس غرض کے لئے جب احادیث اور اسلامی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ اُسوقت مُنہ پردہ میں شامل تھا۔ چنانچہ لکھا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک رشتہ کے سلسلہ میں ایک صحابیہؓ اُمّ سلیمؓ کو بھیجا تھا کہ وہ جاکر دیکھ آئے کہ لڑکی کیسی ہے۔ (مسند احمد بن حنبل جلد ۳ ص۲۳۱) اگر اُس وقت چہرہ کو چھپایا نہ جاتا تھا تو ایک عورت کو بھیجکر لڑکی کا رنگ وغیرہ معلوم کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ اِسی طرح حدیثوں میں آتا ہے۔ کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ایک نوجوان نے اپنے رشتہ کے لئے ایک جگہ پسند کی اور اُس نے لڑکی کے باپ سے درخواست کی کہ مجھے اور تو سب باتیں پسند ہیں۔ میں صرف اتنا چاہتا ہوں کہ آپ مجھے ایک دفعہ لڑکی دیکھنے کی اجازت دیدیں تاکہ میرے دل کو اطمینان ہو جائے۔ چونکہ اسوقت پردہ کا حکم نازل ہو چکا تھا۔ اِس لئے لڑکی کے باپ نے اس کو اپنی ہتک سمجھا اور خفا ہو گیا۔ وہ نوجوان رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہُوا۔ اور اُس نے یہ تمام واقعہ بیان کیا رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ بیشک پردہ کا حکم نازل ہو چکا ہے مگر یہ غیر عورت کے لئے ہے جس لڑکی سے انسان شادی کرنا چاہے اور لڑکی کے ماں باپ بھی رشتہ دینے پر آمادہ ہو جائیں تو اُسے شادی سے پہلے اگر لڑکا دیکھنا چاہے تو ایک دفعہ دیکھ سکتا ہے۔ تم جاؤ اور لڑکی کے باپ کو میری یہ بات بتا دو۔ وہ گیا اور اُس نے رسول کریمؐ کا یہ پیغام اُسے پہنچا دیا۔ مگر معلوم ہوتا ہے اُس کا ایمان ابھی پختہ نہیں تھا۔ اُس نے پھر بھی یہی جواب دیا کہ میں ایسا بے غیرت نہیں کہ تمہیں اپنی لڑکی دکھا دوں۔ لڑکی اندر بیٹھی ہوئی یہ تمام باتیں سُن رہی تھی جب اُس نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بات سُن کر بھی اپنی لڑکی کی شکل دکھانے سے انکار کر دیا۔ تو وہ لڑکی فوراً اپنا مُنہ ننگا کرکے باہر آگئی اور اُس نے کہا جب رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ مُونہہ دیکھ لو تو میرے باپ کا کیا حق ہے کہ وہ اس کے خلاف چلے میں اب تمہارے سامنے کھڑی ہوں تم بے شک مجھے دیکھ لو۔ (ابن ماجہ کتاب النکاح و مسند احمد بن حنبل جلد ۴ ص۲۴۴) اگر وہ لڑکی کھلے مُنہ پھرا کرتی تو اُس نوجوان کو لڑکی کے باپ سے یہ کہنے کی کیا ضرورت تھی کہ مجھے اپنی لڑکی دکھا دیں۔ اور پھر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بارہ میں اجازت حاصل کرنے کا کیا مطلب تھا؟ اِسی طرح حدیثوں میں آتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایک دفعہ اپنی ایک بیوی کے ساتھ جن کا نام صفیہؓ تھا شام کے وقت گلی میں سے گذر رہے تھے کہ آپؐ نے دیکھا کہ ایک آدمی سامنے سے آ رہا ہے۔ آپؐ کو کسی وجہ سے شبہ ہُوا کہ اس کے دل میں شاید یہ خیال پیدا ہو کہ میرے ساتھ کوئی اور عورت ہے۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بیوی کے مُنہ پر سے نقاب اُلٹ دیا اور فرمایا کہ دیکھ لو یہ صفیہؓ ہے (بخاری ابواب الاعتکاف و مسند احمد بن حنبل جلد ۳ ص۱۵۶ و ص۲۸۵) اگر مونہہ کھلا رکھنے کا حکم ہوتا تو اِس قسم کے خطرہ کا کوئی احتمال ہی نہیں ہو سکتا تھا۔ اِسی طرح حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے متعلق آتا ہے کہ جب وہ جنگِ جمل میں فوج کو لڑا رہی تھیں اور اُنکی ہودج کی رسیوں کو کاٹ کر گرا دیا گیا۔ تو ایک خبیث الطبع خارجی نے اُن کے ہودج کا پردہ اُٹھا کر کہا کہ اوہو! یہ تو سُرخ و سفید

رنگ کی عورت ہے۔ اگر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویوں میں مُنہ کُھلا رکھنے کا طریق رائج ہوتا۔ تو جب حضرت عائشہؓ ہودج میں بیٹھی فوج کو لڑا رہی تھیں تو اُس وقت وہ انہیں دیکھ چکا ہوتا اور اس کے لئے کوئی تعجب کی بات نہ ہوتی۔

وہ لوگ جو یہ کہتے ہیں کہ اسلام میں مُنہ چھپانے کا حکم نہیں اُن سے ہم پُوچھتے ہیں کہ قرآن کریم تو کہتا ہے کہ زینت چھپاؤ۔ اور سب سے زیادہ زینت کی چیز چہرہ ہی ہے۔ اگر چہرہ چھپانے کا حکم نہیں تو پھر زینت کیا چیز ہے جس کو چھپانے کا حکم دیا گیا ہے۔ بیشک ہم اس حد تک قائل ہیں کہ چہرہ کو اس طرح چھپایا جائے کہ اس کا صحت پر کوئی بُرا اثر نہ پڑے۔ مثلاً باریک کپڑا ڈال لیا جائے۔ یا عرب عورتوں کی طرز کا نقاب بنا لیا جائے جس میں آنکھیں اور ناک کا نتھنا آزاد رہتا ہے۔ مگر چہرہ کو پردہ سے باہر نہیں رکھا جا سکتا۔

پھر فرماتا ہے:- وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا لِبُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اٰبَآئِهِنَّ الخ اس قسم کی زینت سوائے اپنے خاوندوں یا باپ دادوں کے یا اپنے خاوندوں کے باپ دادوں کے یا اپنے بیٹوں پوتوں کے یا اپنے خاوندوں کے بیٹوں پوتوں کے یا اپنے بھائیوں کے یا اپنے بھائیوں کے بیٹوں پوتوں کے یا اپنی بہنوں کے بیٹوں پوتوں کے یا اپنے طور طریق والی عورتوں کے یا جو اُن کے غلام ہیں اور کسی پر ظاہر نہ کریں۔ یا سوائے ایسے نوکروں کے جو شہوت کی عمر سے باہر ہیں یعنی بہت بوڑھے ہیں۔ یا سوائے ایسے بچوں کے جن میں ابھی احساسِ شہوت پیدا نہیں ہوا۔

اَوْ نِسَآئِهِنَّ سے پتہ لگتا ہے کہ بعض عورتوں سے بھی پردہ کرنا ضروری ہوتا ہے۔ ہر ملک میں یہ رواج ہے اور ہمارے ملک میں بھی تھا گو اب کم ہو گیا ہے کہ بدچلن لوگوں نے آوارہ عورتیں رکھی ہوئی ہوتی ہیں جو گھروں میں جا کر آہستہ آہستہ عورتوں کو ورغلاتی اور انہیں نکال کر لے جاتی ہیں۔ اس قسم کی عورتوں کو روکنے کیلئے شریعت نے حکم دیا ہے کہ ہر عورت کو گھر میں داخل ہونے کی اجازت نہیں دینی چاہیئے بلکہ وہی عورتیں آئیں جن کے متعلق اس قسم کا کوئی خطرہ نہ ہو۔ اور اُن کے حالات سے پوری واقفیت ہو۔ اگر کوئی شخص تاریخ کا مطالعہ کرے تو اُسے معلوم ہو گا کہ سپین اور ہندوستان میں عورتوں کی وجہ سے ہی تباہی آئی ہے سپین کے عیسائیوں نے جب مسلمانوں میں اپنی عورتیں پھیلائیں اور اُن سے طرح طرح کے گندے کام لئے اور انہیں اپنے مذہب کے پھیلانے کا ایک ذریعہ بنایا اور بہت سی مسلمان عورتوں کے خیالات کو بدل دیا تو اس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ مسلمانوں کی نسلوں میں عیسائیت کے خلاف کوئی جوش نہ رہا اور وہ اُن سے اِسقدر رل مِل گئے کہ عیسائیوں کو اُن پر اقتدار حاصل ہو گیا۔ دوسری طرف عیسائیوں نے اپنی عورتوں کے ذریعے مسلمانوں میں عیاشی اور آرام طلبی کی عادت ڈال دی جس سے اُن میں نہ غیرتِ اسلامی رہی اور نہ لڑنے کی طاقت رہی۔ آخر یہاں تک نوبت پہنچی کہ عیسائیوں نے مسلمانوں کے ملک پر قبضہ جمانا شروع کیا اور وہ بڑھتے بڑھتے غرناطہ کی دیواروں تک آ پہنچے مگر مسلمان پھر بھی بیدار نہ ہوئے اور وہ اپنے عیش میں اس طرح مست رہے کہ گویا شہر کے باہر فوج نہیں بلکہ برات پڑی ہے۔ آخر انہوں نے اپنا وطن ترک کرنے کی ٹھانی اور افریقہ جانا چاہا مگر عیسائی انہیں کب واپس جانے دیتے تھے۔ انہوں نے وہ جہاز ڈبو دیئے جن میں خود عیسائی بادشاہ کی اجازت سے مسلمانوں نے اسلامی لٹریچر کی کتابیں بھری تھیں اور اس طرح سپین سے اسلام اور مسلمانوں کا نام تک مٹا دیا۔ اِسی طرح ہندوستان میں بھی عیسائی مسوں نے مسلمانوں کے گھروں میں جا جا کر کئی عورتوں کو عیسائی بنا لیا تھا لیکن افسوس ہے کہ مسلمان اب بھی ایسے پادریوں کے سکولوں میں اپنی لڑکیاں داخل کرتے ہیں جہاں پڑھانے والی عیسائی عورتیں ہوتی ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ لڑکیاں خود مذہب سے بیزار ہو جاتی ہیں اور اسلام پر ہنسی اُڑاتی ہیں۔ اِلَّا مَاشَاءَ اللہ۔

پس اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ عورتوں کے متعلق بھی پہلے تحقیق کر لیا کرو کہ اُن کا چال چلن کیسا ہے۔ اور جب تمہیں اطمینان ہو جائے تو پھر انہیں گھر میں آنے کی اجازت دو۔ اور یہی نِسَآئِهِنَّ سے مراد ہے یعنی وہ عورتیں جو تمہارے گھروں میں آئیں ایسی دیکھی بھالی ہوں کہ گویا تمہاری اپنی ہی عزیز ہیں۔

پھر فرماتا ہے۔ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُنَّ۔ عورتوں کے لئے یہ بھی جائز ہے کہ وہ اپنی لونڈیوں کے سامنے اظہارِ زینت کر لیا کریں۔ کیونکہ لونڈیاں بھی گھر کے افراد کی طرح ہی سمجھی جاتی ہیں لیکن اس کے یہ معنے نہیں جیسا کہ بعض مفسرین نے غلطی سے سمجھا ہے کہ عورتوں کو اپنے غلاموں کے سامنے آنے میں کوئی حرج نہیں کیونکہ غلام صرف ایسی صورت میں پکڑنے جائز ہوتے ہیں جب دشمن قوم سے خونریز جنگ ہو اور جنگ بھی سیاسی بنیادوں پر نہیں بلکہ مذہبی بنیادوں پر لڑی گئی ہو۔ اور جب ایسی دشمن قوم کے برسرِجنگ افراد کو سزا کے طور پر پکڑا گیا ہو۔ تو یہ سوال ہی کس طرح پیدا ہو سکتا ہے کہ اُن سے اپنی عورتوں کا پردہ ہٹایا جائے یا نہ ہٹایا جائے۔ جب شریعت اپنی قوم کے شریف مردوں سے بھی عورتوں کو پردہ کرنیکا حکم دیتی ہے تو ایک دشمن قوم کے افراد سے پردہ اُتارنے کا خیال کسی ایسے شخص کے دماغ میں ہی آ سکتا ہے جو عقل اور فہم سے عاری ہو چکا ہو۔ پس اس جگہ غلاموں کا کوئی ذکر نہیں بلکہ صرف لونڈیوں کا ذکر ہے اور وہ بھی ایسی لونڈیوں کا جن پر انہیں پوری طرح اعتماد ہو۔ جس طرح نِسَآئِهِنَّ میں ہر قسم کی آوارہ گرد اور اخلاق باختہ عورتیں شامل نہیں بلکہ صرف ایسی ہی عورتیں شامل ہیں جو ہر طرح اعتماد کے قابل ہوں۔ اور جن کی شرافت اور دیانتداری بالکل بے داغ ہو۔

غَيْرِ اُولِي الْاِرْبَةِ مِنَ الرِّجَالِ۔ بعض نے اس آیت کے معنوں میں مخنّث کو بھی شامل کیا ہے۔ مگر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مخنّث سے پردہ کا حکم دیا ہے۔ چنانچہ آپ نے ایکدفعہ اپنی بیویوں سے فرمایا کہ اگر مخنّث آئے تو اُس سے بھی پردہ کرو۔ اسی طرح آپ نے فرمایا کہ یہ باہر جاکر دوسرے مردوں سے باتیں کرتے ہیں اور اِس طرح اشاعت فحش کا موجب ہوتے ہیں (ابوداؤد کتاب اللباس و ابن ماجہ کتاب النکاح و مسند احمد بن حنبل جلد ۶ صفحہ ۲۹۰) اس سے معلوم ہوا کہ یہاں غَيْرِ اُولِي الْاِرْبَةِ مِنَ الرِّجَالِ سے مخنّث مراد نہیں بلکہ ایسے ملازم مراد ہیں جو بوڑھے ہوں اور احساسِ شہوت سے اسقدر عاری ہو چکے ہوں کہ انہیں بدی کا کوئی خیال بھی نہ آسکے۔ مخنّث چونکہ جوان بھی ہو سکتے ہیں اور بوجہ ایک عارضی ذریعہ سے نامرد بنا دینے کے اُن کی شہوت اور اُن کا غصہ تیز ہو جاتا ہے اس لئے اُن کو اس میں شامل نہیں کیا جا سکتا۔ علاوہ ازیں چونکہ قرآن کریم سے ثابت ہے کہ انسانی شکل کو بگاڑنا شیطان کا کام ہے جیسا کہ قرآن کریم میں آتا ہے کہ شیطان نے کہا وَلَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَيُغَيِّرُنَّ خَلْقَ اللّٰهِ۔ (نساء ع۱۸) یعنی میرے کہنے پر لوگ خدا تعالیٰ کی بنائی ہوئی صورتوں میں بھی تبدیلی کر دیا کرینگے۔ اس لئے مخنّث بنانا اسلام میں جائز ہی نہیں ہو سکتا۔ اور جو چیز جائز ہی نہ ہو اس کے لئے احکام کس طرح بتلائے جا سکتے ہیں۔ پس یا تو ان الفاظ سے بوڑھے نوکر مراد ہیں یا پاگل اور نیم عقل رشتہ دار جو احساسِ شہوت سے عاری ہوں یا ایسے بچے جن میں ابھی احساسِ شہوت پیدا نہ ہوا ہو۔ اور مرد و عورت کے تعلقات سے ناواقف ہوں۔

وَلَا يَضْرِبْنَ بِاَرْجُلِهِنَّ لِيُعْلَمَ مَا يُخْفِيْنَ مِنْ زِيْنَتِهِنَّ۔ فرماتا ہے۔ زیورات چاہے پوشیدہ ہوں۔ عورتوں کو چاہیئے کہ وہ اِس طرح پیر نہ مارا کریں کہ اُنکی جھنکار لوگوں کو سُنائی دے اور انہیں معلوم ہو جائے کہ وہ مالدار عورتیں ہیں اور اُن سے تعلق پیدا کرنا ان کیلئے مفید ہوگا۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ناچ وغیرہ کو شریعت نے ناجائز رکھا ہے کیونکہ اس سے بے حیائی پیدا ہوتی ہے۔

یہ احکام ایسے باحکمت ہیں کہ اگر کوئی شخص تعصب کے بغیر ان پر غور کرے تو ان احکام کی خوبی کا اقرار کئے بغیر نہیں رہ سکتا کیونکہ ان سے بہت سی بدیوں کا قلع قمع کر دیا گیا ہے۔

اِس میں کوئی شبہ نہیں کہ بعض علاقوں میں پردہ کے متعلق ایسے تشدّد سے کام لیا جاتا تھا کہ وہ ڈولیوں کو بھی پردوں میں سے گذارتے تھے چنانچہ مَیں نے خود دیکھا کہ عورتوں کو ڈولی میں لاتے اور پھر ڈولی کے اردگرد پردہ تان کر انہیں گاڑی میں سوار کراتے۔ اور بعض قوموں میں اس سے بھی بڑھ کر یہ پردہ ہوتا تھا کہ وہ کہتے تھے عورت ڈولی میں آئے تو پھر اس کا جنازہ ہی گھر سے نکلے۔ مگر یہ لوگوں کے خود ساختہ پردے ہیں جو صریح ظلم ہیں اور اُن کا اثر عورتوں کی صحت اور اُن کے اخلاق اور ان کے علم اور اُن کے دین پر بہت ہی گندا پڑا ہے۔

قرآن اور حدیث سے اس قسم کے کسی پردے کا پتہ نہیں چلتا۔ بلکہ قرآن کریم سے صریح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ عورتوں کو باہر نکلنے کی اجازت ہے۔ اگر انہیں باہر نکلنے کی اجازت نہ ہوتی تو غضِ بصر کے حکم کی بھی ضرورت نہ ہوتی۔ پھر تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں خود آپؐ کی بیویاں اور آپؐ کی بیٹیاں باہر نکلتی تھیں اُن کا جنگوں پر جانا۔ کھیتوں وغیرہ پر کام کرنے کیلئے جانا حاجاتِ بشریہ پورا کرنے کے لئے جانا۔ علم سیکھنے اور سکھانے کے لئے جانا یہ نہایت ہی کثرت کے ساتھ ثابت ہے اور چھوٹی سے چھوٹی تاریخ سے بھی اس کے ثبوت مل سکتے ہیں پس اسلام ہرگز یہ حکم نہیں دیتا کہ عورتیں گھروں میں بند ہو کر بیٹھ جائیں۔ اور نہ ابتدائے اسلام میں مسلمان عورتیں ایسا کرتی تھیں۔ بلکہ وہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا وعظ سُننے آتی تھیں جنگوں میں شامل ہوتی تھیں۔ زخمیوں کی مرہم پٹیاں کرتی تھیں۔ سواری کرتی تھیں۔ مردوں سے علوم سیکھتی اور سکھاتی تھیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے متعلق تو یہاں تک ثابت ہے کہ آپ مردوں کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں سُنایا کرتی تھیں۔ بلکہ خود لڑائی کی بھی ایک دفعہ آپ نے کمان کی۔ غرض ان کو پوری عملی آزادی حاصل تھی صرف اس امر کا اُنکو حکم تھا کہ اپنے سر گردن اور مُنہ کے وہ حصّے جو سر اور گردن کے ساتھ وابستہ ہیں اُن کو ڈھانپے رکھیں تاکہ وہ راستے جو گناہ پیدا کرتے ہیں بند رہیں۔ اور اگر اِس سے زیادہ احتیاط کر سکیں تو نقاب اوڑھ لیں۔ لیکن یہ کہ گھروں میں بند رہیں اور تمام علمی اور تربیتی کاموں سے الگ رہیں۔ یہ نہ اسلام کی تعلیم ہے اور نہ اس پر پہلے کبھی عمل ہوا ہے۔ احادیث میں آتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ طریق تھا کہ آپ ان کے زمانہ میں صحابہ کرامؓ سے ہمیشہ دوستانہ مقابلے کروایا کرتے تھے۔ جن میں تیر اندازی اور دوسرے فنونِ حرب اور قوت و طاقت کے مظاہرے ہوتے تھے۔ ایک دفعہ اسی قسم کے کھیل آپ نے مسجد میں بھی کرائے اور حضرت عائشہؓ سے فرمایا۔ کہ اگر دیکھنا چاہو تو میرے پیچھے کھڑے ہو کر کندھوں کے اوپر سے دیکھ لو۔ چنانچہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا آپؐ کے پیچھے کھڑی ہو گئیں اور انہوں نے تمام جنگی کرتب دیکھے۔ (بخاری کتاب العیدین) اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اسلام عورت کو فنونِ حرب سے واقف رکھنا بھی ضروری قرار دیتا ہے تاکہ وقت پڑنے پر وہ اپنی اور اپنے ملک کی حفاظت کر سکے۔ اگر اس کا دل تلوار کی چمک سے کانپ جاتا ہے یا بندوق اور توپ کی آواز سُن کر اُس کا خون خشک ہو جاتا ہے تو وہ اپنے بچوں کو خوشی سے میدان جنگ میں جانے کی اجازت نہیں دے سکتی اور نہ دلیری سے خود ملک کے دفاع میں حصّہ لے سکتی ہے۔ ہندوستان میں مغلیہ حکومت کی تباہی صرف عورت کی بزدلی اور مرد کی بے حمیت کی وجہ سے ہوئی۔ غدر کے زمانہ میں انگریزوں کے ہمدردوں نے جب دیکھا کہ مغلیہ افواج نے ایک ایسے مقام پر توپیں رکھ دی ہیں جہاں سے انگریزی فوجوں پر زد پڑتی ہے تو انہوں نے زینت محل کو جو بادشاہ کی چہیتی بیوی تھی مگر در پردہ انگریزوں سے ساز باز رکھتی تھی اور چاہتی تھی کہ میرا بیٹا تخت نشین ہو جائے کہلا بھیجا کہ اگر کچھ فائدہ حاصل کرنا چاہتی ہو تو یہاں سے توپیں اٹھوا دو۔ چنانچہ زینت محل نے بیماری کا

بہانہ بنا کر بادشاہ سے کہا کہ میرا تو دل گھٹتا ہے اور میں بیہوش ہو جاؤں گی اِس لئے یا تو یہاں سے توپیں اٹھوا دو۔ یا پہلے مجھے مار دو۔ بادشاہ نے اس کے کہنے پر وہاں سے توپیں ہٹا دیں۔ مگر اس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ مسلمانوں کے ہاتھ سے حکومت نکل گئی اور شاہی خاندان اور دلّی کی حکومت کا تختہ اُلٹ گیا۔ اب اگر یہ واقعہ صحیح ہے تو بادشاہ پر زینت محل کے اس بہانہ کا اِسی وجہ سے اثر ہُوا کہ وہ جانتا تھا کہ یہ توپوں کی آوازیں سُننے کی عادی نہیں اگر اس کے سامنے پہلے بھی توپیں چلتی رہتیں اور وہ فنونِ جنگ کو دیکھنے کی عادی ہوتی تو وہ یہ بہانہ نہیں بنا سکتی تھی۔ بادشاہ کہہ سکتا تھا کہ جب پہلے بھی تم ان کی آوازیں سنتی رہی تو آج کس طرح بے ہوش ہو سکتی ہو۔ اِسی طرح اگر بادشاہ خود فنونِ جنگ کا ماہر ہوتا اور اُس کی عمر اس قسم کے کاموں میں بسر ہوئی ہوتی اور وہ جنگ اور اس کے نتائج سے آگاہ ہوتا تو وہ ایک عورت کی بات کو کیوں مانتا۔ مگر خود جنگی فنون سے ناواقف ہونے اور پھر عورتوں کو فنونِ حرب سے الگ رکھنے کا نتیجہ یہ ہُوا کہ زینت محل نے بادشاہ کو دھوکا دے دیا لیکن حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کوئی جنگی منظر دیکھ کر یہ ہرگز نہیں کہہ سکتی تھیں کہ میرا دل گھٹتا ہے کیونکہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے انہیں جنگی فنون دکھائے اور پھر جنگ میں ہمیشہ کسی نہ کسی بیوی کو بھی اپنے ساتھ رکھتے تھے تاکہ ان کے اندر بھی جرأت اور بہادری پیدا ہو۔

پس اسلامی تعلیم کے ماتحت پردے کے قواعد کو مدنظر رکھتے ہوئے عورت ہر قسم کے کاموں میں مردوں کی شریک حال ہو سکتی ہے۔ وہ مردوں سے پڑھ سکتی ہے اُن کا لیکچر سُن سکتی ہے۔ اور اگر کسی جلسہ میں کوئی ایسی تقریر کرنی پڑے جو مرد نہیں کرسکتا تو عورت تقریر بھی کر سکتی ہے۔ مجالس وعظ اور لیکچروں میں مردوں سے الگ ہو کر بیٹھ سکتی ہے۔ ضرورت کے موقعہ پر اپنی رائے بیان کر سکتی ہے اور بحث کر سکتی ہے کیونکہ ایسے امور جن میں عورتوں کا دخل ہو اُن امور میں عورتوں کا مشورہ لینا ضروری ہوتا ہے۔ اسی طرح عورت ضرورت کے ماتحت مرد کے ساتھ مل کر بھی بیٹھ سکتی ہے جیسا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک سفر میں ایک نوجوان لڑکی کو جو پیدل جا رہی تھی اونٹ پر اپنے پیچھے بٹھا لیا (مسند احمد بن حنبل جلد ۶ صفحہ ۳۸۰) ہمارے ملکی رواج کے مطابق تو اگر کوئی شخص ایسا کرے تو شاید ساری قوم اس کا بائیکاٹ کر دے لیکن شریعت کے احکام آج سے تیرہ سو سال پہلے مل چکے ہیں۔ ان میں کوئی تبدیلی نہیں کر سکتا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اِس عمل کو دیکھتے ہوئے میں سمجھتا ہوں کہ اگر عورتوں کی گاڑیوں میں کبھی کوئی خطرہ ہو تو مردوں کا فرض ہے کہ عورتوں کو اپنے پاس مردانہ گاڑیوں میں بٹھالیں۔ یا عورت اکیلی خود مردانہ گاڑی میں جا بیٹھے جہاں وہ شریف مردوں کی موجودگی میں اپنی عزت کو بہ نسبت اکیلے کمرہ میں بیٹھنے کے زیادہ محفوظ سمجھتی ہو۔ اسی طرح اگر کوئی خطرہ نہ ہو تو عورتیں خود سودا خریدنے کے لئے بازاروں میں بھی جا سکتی ہیں۔ عرب میں مَیں نے دیکھا ہے کہ وہاں عورتیں خود بازاروں میں جاتیں اور چیزیں خریدتی تھیں۔ بلکہ وہاں کے لوگوں نے بتایا کہ ہماری خریدی ہوئی چیزیں عورتوں کو پسند بھی نہیں آتیں۔ وہ کہتی ہیں کہ مرد کیا جانیں کہ کپڑا کیسا ہونا چاہیئے۔ یا اور چیزوں کے متعلق انہیں کیا واقفیت ہو سکتی ہے ہم خود جا کر خریدیں گی۔ جو چیز منع ہے وہ یہ ہے کہ عورت کھلے مُنہ پھرے اور مردوں سے اختلاط کرے ہاں اگر وہ گھونگھٹ نکال لے اور آنکھوں سے راستہ وغیرہ دیکھے تو یہ جائز ہے لیکن مُنہ سے کپڑا اُٹھا دینا یا مکسڈ پارٹیوں میں جانا جبکہ اِدھر بھی مرد بیٹھے ہوں اور اُدھر بھی مرد بیٹھے ہوں اور اُن کا مردوں سے بے تکلفی کے ساتھ غیر ضروری باتیں کرنا یہ ناجائز ہے۔ اسی طرح عورت کا مردوں کو شعر گا گا کر سُنانا بھی ناجائز ہے کیونکہ یہ ایک لغو فعل ہے۔ پھر فطرتِ انسانی بھی اس بات کو تسلیم نہیں کرتی

کہ مرد جو مضبوط ہے اُسے تو صحت کے درست رکھنے کیلئے باہر کی آب و ہوا کی ضرورت ہو اور عورت جو فطرتاً کمزور صحت لیکر آئی ہے اُسے کھلی ہوا سے محروم کر دیا جائے ۔ حدیثوں سے تو یہاں تک ثابت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ ایک دفعہ لوگوں کے سامنے مقابلۃً دوڑے اور حضرت عائشہؓ آگے بڑھ گئیں ۔ مگر دوسرے موقعہ پر پھر دوڑے تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم آگے نکل گئے ۔ پس وہ پردہ جس میں عورت کو مجبور کیا جاتا تھا کہ وہ ڈولی کے بغیر گھر سے باہر قدم بھی نہ رکھے نہایت ظالمانہ اور خلافِ اسلام پردہ تھا ۔ اس کے مقابلہ میں ایک اور پردہ ہمارے ملک میں یہ ہے کہ عورتیں برقعہ پہن کر باہر نکلتی ہیں اور ایک گھر سے دوسرے گھر تک چلی جاتی ہیں لیکن اس سے زیادہ ان کو باہر نکلنے کی اجازت نہیں ہوتی ۔ یہ پردہ گو اوپر کے پردہ کے برابر قابلِ اعتراض نہیں لیکن اس سے بھی عورتوں کے ذہنی ارتقاء اور اُن کی صحت کی ترقی میں ایسی مدد نہیں ملتی کہ اُسے قومی ترقی کے لئے کافی سمجھا جائے ۔ دوسرے ہمارا پُرانا برقعہ یا تو عورت کی صحت کو برباد کرنے والا ہے یا پردے کے نام سے بے پردگی کا موجب ہوتا ہے ۔ اس برقعہ میں اوپر سے لے کر نیچے تک ایک گنبد سا بنا ہُوا چلا جاتا ہے اور عورت کے ہاتھ بھی اندر بند ہوتے ہیں اگر وہ بچے کو اٹھائے تو سر سے پاؤں تک اس کا اگلا حصہ سارے کا سارا ننگا ہو جاتا ہے اور ایک ایسا حقارت پیدا کرنے والا نظارہ ہوتا ہے کہ ایسے پردے سے طبیعت خود بخود نفرت کرتی ہے ۔ اس سے بہت زیادہ بہتر وہ چادر کا طریق تھا جو برقعہ کی ایجاد سے پہلے تھا ۔ اور جس میں عورت اپنا کام بھی کر سکتی تھی اور اپنے آپ کو لپیٹ بھی سکتی تھی ۔ میرے نزدیک نیا برقعہ جسے ٹرکی برقعہ کہتے ہیں پردے کے لحاظ سے تمام برقعوں سے بہتر ہے بشرطیکہ وہ جسم کے اوپر لپٹا ہُوا نہ ہو بلکہ جیسا کہ ہماری جماعت کی عورتوں میں رواج ہے سیدھا کوٹ ہو جو کندھوں سے پاؤں تک آتا ہو ۔ ایسا کوٹ نہ ہو جو جسم کے اعضاء کو الگ الگ کر کے دکھاتا ہو ۔ اگر اس قسم کا کپڑا جائز ہوتا تو جسم کے کپڑے ہی کافی تھے اُن کے اوپر کسی اور کھلے کپڑے کے پہننے کا قرآن مجید حکم نہ دیتا ۔ اس برقعہ میں یہ بھی فائدہ ہے کہ چونکہ ہاتھ کھلے ہوتے ہیں عورت سب قسم کے کام اس برقعہ میں بخوبی کر سکتی ہے ۔ اس کی مثال ایسی ہی ہوگی جیسے ڈاکٹر اپریشن کے وقت ایک کھلا کوٹ پہن لیتے ہیں مگر اس کے ساتھ ہی میرے نزدیک یہ بھی ظلم کیا جاتا ہے کہ چھوٹی عمر میں ہی لڑکیوں کو برقعہ اوڑھا دیا جاتا ہے اس سے اُن کی صحت پر بھی بُرا اثر پڑتا ہے اور اُن کا قد بھی اچھی طرح نہیں بڑھ سکتا ۔ جب لڑکی میں نسائیت پیدا ہونے لگے اسوقت اُسے پردہ کرانا چاہیئے اس سے پہلے نہیں ۔ باقی رہا یہ سوال کہ عورت کو کیوں پردہ کے لئے کہا گیا ہے مرد کو کیوں نہیں کہا گیا ۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ پردہ مرد اور عورت دونوں کیلئے برابر ہے ۔ اگر عورت کو چادر اوڑھ کر باہر نکلنے کا حکم دیا گیا ہے تو اس کی یہ وجہ نہیں کہ پردہ کا حکم صرف اُسی کے لئے ہے بلکہ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ مرد کا دائرۂ عمل گھر سے باہر ہے اور عورت کا اصل دائرۂ عمل گھر کی چار دیواری ہے ۔ پس جب عورت مرد کے اصل دائرۂ عمل میں جاتی ہے وہ چادر اوڑھ لیتی ہے اور مرد چونکہ اپنے اصل دائرۂ عمل میں ہوتا ہے وہ کھلا پھرتا ہے ۔ اگر اس کو اپنے دائرۂ عمل میں چادر اوڑھنے کا حکم دیا جاتا تو چونکہ اس کا وہاں ہر وقت کام ہوتا ہے اُس کے لئے کام کرنا مشکل ہو جاتا جس طرح اگر عورت کو اُس کے دائرۂ عمل یعنی گھر کی چار دیواری میں چادر اوڑھ کر کام کرنے کا حکم دیا جائے تو وہ گھبرا جائے اور کام نہ کر سکے ۔ اس فرق کے مقابلہ میں مرد کو یہ حکم ہے کہ وہ عورت کے دائرۂ عمل میں بالکل ہی نہ جائے

وَاَنْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ وَالصّٰلِحِيْنَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَاِمَآئِكُمْ ؕ

اور اپنے میں سے جو بیوائیں ہیں اور جو اپنے غلاموں یا لونڈیوں میں سے نیک ہوں اُن کی شادیاں کردیا کرو۔

اِنْ يَّكُوْنُوْا فُقَرَآءَ يُغْنِهِمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۳۳﴾

اگر وہ غریب ہیں تو اللہ اپنے فضل سے انکو غنی بنا دیگا۔ اور اللہ (تعالیٰ) بہت وسعت رکھنے والا اور بہت جاننے والا ہے۔

اور انکو آزادی سے اپنا کام کرنے دے۔ اور اگر کسی کے گھر جائے تو پہلے اجازت لیلے لیکن عورت کو باہر نکلنے پر مرد کی اجازت لینے کا حکم نہیں کیونکہ مرد کے دائرہ عمل میں عورت کے بھی حقوق ہیں اور وہ سڑکوں اور بازاروں سے بے تعلق نہیں لیکن عورت کے دائرہ عمل سے عام مرد کے حقوق وابستہ نہیں پس عورت کیلئے اجازت لینے کی ضرورت نہیں رکھی بلکہ صرف اوٹ کرلینا اور اوڑھنی سے پردہ کرلینا کافی رکھا اور عورت کے دائرہ عمل میں مرد کے بلا اجازت داخلہ کو روک دیا پس پردہ میں ہتک یا غیر ہتک کا کوئی سوال نہیں بلکہ یہ مرد اور عورت کے دائرہ عمل کی الگ الگ تقسیم ہے اور اس کی مخالفت صرف عادات اور رسوم کی وجہ سے ہے۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ پردہ کی وجہ سے عورتیں ترقی نہیں کرسکتیں ان کی صحت خراب رہتی ہے۔ مگر یہ بالکل غلط ہے۔ وہ عورتیں جو بالکل بے پردہ پھرتی ہیں وہ کیا کر رہی ہیں جو پردہ کرنے والی نہیں کرسکتیں جس وقت عورتیں اسلام کے احکام کے مطابق پردہ کرتی تھیں اُس وقت اُن کی صحتیں بھی اچھی تھیں۔ اور وہ جنگوں میں بھی شامل ہوتی تھیں۔ اور دشمن کو مارتی بھی تھیں مگر اب بے نقاب پھرنے والی عورتیں کچھ بھی نہیں کر رہیں۔ دراصل صحت امید اور اُمنگ سے قائم رہتی ہے جب کسی میں اُمنگ ہی نہ ہو تو چاہے اُسے پہاڑ کی چوٹی پر کھڑا کردو وہ نیچے ہی گریگا اور اگر اُمنگ اور امید ہو تو خواہ لحاف اُڑھا دو پھر بھی وہ بلند ہوتا چلا جائیگا۔ چنانچہ میری کوشش ہمیشہ یہی رہی ہے کہ عورتوں کا پردہ شریعت کے مطابق ہو اور میرے زمانۂ خلافت میں قادیان میں بھی اور ربوہ میں بھی تعلیمیافتہ عورتوں کی تعداد ہمیشہ غیر تعلیمیافتہ عورتوں سے زیادہ رہی ہے لیکن تعلیمیافتہ مردوں کی تعداد غیر تعلیمیافتہ مردوں کے برابر کبھی نہیں ہوسکی۔ اسی طرح لجنہ کا کام وہ بڑی خوش اسلوبی سے سرانجام دے رہی ہیں۔ مختلف گھروں میں جاتی ہیں چندہ وصول کرتی ہیں۔ دیگر لوگوں میں جوش پیدا کرتی ہیں۔ بلکہ بعض دفعہ دوسرے شہروں میں بھی جاتی ہیں۔ پس یہ بالکل غلط ہے کہ پردہ عورتوں کی ترقی میں حائل ہے۔ عورتیں پردہ میں رہتے ہوئے بھی ہر قسم کی ترقی کرسکتی ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ عورتیں تعلیم یافتہ ہوں اور وہ خود شرعی پردہ پر عمل کریں اور دوسری عورتوں کو بھی بتائیں کہ پردہ کی پابندی کرتے ہوئے ہر قسم کی ترقی کی جاسکتی ہے۔ صرف مردوں کے کہنے کا زیادہ اثر نہیں ہوتا کیونکہ عورتیں کہدیتی ہیں کہ تم تو باہر پھرتے ہو تمہیں کیا معلوم ہے کہ پردہ کی کیا تکالیف ہیں۔

اَلْاَيَامٰى

۲۰ حل لغات:۔ اَلْاَيَامٰى اَيِّمٌ کی جمع ہے۔ اور اَيِّمٌ اس عورت کو کہتے ہیں جس کا کوئی خاوند نہ ہو۔ اسی طرح اس مرد کو بھی اَيِّمٌ کہتے ہیں جس کی کوئی بیوی نہ ہو (مفردات)

تفسیر:۔ اس آیت میں حکم دیا کہ بدی کو دُور کرنے کا ایک یہ بھی طریق ہے کہ بیواؤں کی شادی کرو۔ اسی طرح جو غلام بیویاں رکھنے کے قابل ہوں اُن کی بھی شادیاں کرو۔ تاکہ بے شادی غلام گھروں میں آکر خرابی نہ کریں اسی طرح اپنی لونڈیوں کی بھی شادی کرو۔ اور اگر تمہارے غلاموں میں سے بعض غریب ہوں تو اُن کا نکاح کرنے سے ڈرو نہیں

کیونکہ اگر وہ نیک نہیں گے تو اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے انہیں غنی
بنا دیگا کیونکہ اللہ تعالیٰ کے پاس رزق بھی ہے اور وہ اپنے
بندوں کے حالات کو بھی جانتا ہے۔

افسوس ہے کہ ہمارے ملک میں جہاں اور بہت سی خرابیاں
پائی جاتی ہیں وہاں ایک یہ خرابی بھی پائی جاتی ہے کہ لوگ بیوگان
کی شادی کرنا بڑا بھاری گناہ سمجھتے ہیں۔ اور اگر بعض لوگ گناہ
نہیں سمجھتے تو کم از کم اسے اپنی غیرت اور حمیّت کے منافی ضرور
سمجھتے ہیں گویا اُن کے نزدیک عورت ایک جانور سے بھی بدتر
ہے کہ جانور تو ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں جا سکتا ہے
مگر عورت ایک خاوند سے جُدا ہو کر دوسرے کے پاس نہیں جا
سکتی۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اگر کہیں بیوہ کی شادی ہو تو تمام
گھر ماتم کدہ بن جاتا ہے۔ اور اس کے خاندان کے ساتھ اظہارِ
ہمدردی کیا جاتا ہے اور اُن کو بڑا مظلوم سمجھا جاتا ہے۔ وہ
مرد کو تو اس بات کا حقدار سمجھتے ہیں کہ اپنی بیوی کے فوت
ہونے پر دوسری شادی کرے مگر عورت کو یہ حق دینے کیلئے
تیار نہیں ہوتے کہ وہ اپنے خاوند کے فوت ہونے پر دوسرا خاوند
کرے۔ حالانکہ قرآن کریم صاف الفاظ میں فرماتا ہے کہ هُوَ
الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّجَعَلَ مِنْهَا
زَوْجَهَا (اعراف ع ۲۴) یعنی وہی ہے جس نے تم کو ایک
جان سے پیدا کیا ہے اور اُسی کی قسم سے اُس کا جوڑا بنایا
گویا جیسے احساسات اور جذبات مردوں میں پائے جاتے ہیں۔
ویسے ہی جذبات اور احساسات عورتوں میں بھی پائے جاتے
ہیں اگر مرد اپنی بیوی کے فوت ہونے پر چاہتا ہے کہ وہ
دوسری شادی کرے تو بیوہ کی شادی میں روک بنتا ہے
کہ وہ عورت کو اپنے جیسا انسان نہیں سمجھتے اور اس کے جذبات
اور احساسات کو کچلنا چاہتے ہیں۔ پس بیوگان کی شادی بڑی
بھاری اہمیت رکھنے والی چیز ہے۔ اور قرآن کریم نے اسکو
اُن احکام میں شامل کیا ہے جن سے اخلاقی برائیوں کا انسداد
ہوتا ہے۔ اس لئے اس سے غفلت درحقیقت قومی اخلاق
کو بگاڑنا اور بدی کو فروغ دینا ہے

دوسری چیز جس کی طرف اس آیت میں توجہ دلائی گئی
ہے۔ وہ غلاموں کی شادی کا مسئلہ ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا
ہے کہ اگر تمہارے غلام شادی کے قابل ہوں اور جوان ہوں
تو تم اُن کی شادی کر دو۔ کیونکہ نہ معلوم وہ کب آزاد ہوں
اور کب انہیں ازدواجی زندگی بسر کرنے کا موقعہ ملے۔ یہ
اسلام کے اس حسنِ سلوک کا ایک واضح اور نمایاں ثبوت ہے
جو اُس نے غلاموں کے ساتھ کیا ہے۔ نادان مخالف اعتراض
کرتا ہے کہ اسلام نے غلامی کو روا رکھا ہے حالانکہ دنیا میں
اسلام ہی وہ مذہب ہے جس نے غلامی کو صفحۂ ارض سے
مٹانے میں ایک ایسا قابلِ فخر کردار ادا کیا ہے جس کی نظیر دنیا
کا کوئی اور مذہب پیش نہیں کر سکتا۔ رومی۔ یونانی مصری
اور ایرانی تاریخ پڑھ کر دیکھ لو۔ ان میں سے ہر ملک کی
ترقی کی بنیاد غلامی پر رکھی ہوئی نظر آئیگی۔ یہ غلام دو طرح
بنائے جاتے تھے۔ ایک طریق تو یہ تھا کہ جن سے جنگ
ہوا کرتی تھی ہمسایہ قومیں اُن کے افراد کو جہاں وہ اکا دکا
نظر آئیں پکڑ کر لے جاتے اور انہیں غلام بنا لیتے تھے۔
چنانچہ رومی لوگ ایرانیوں کو پکڑ کر لے جاتے۔ اور ایرانیوں
کو موقعہ ملتا تو وہ رومیوں کو پکڑ کر لے جاتے اور سمجھتے کہ
اس طرح ہم نے دوسرے ملک کو سیاسی لحاظ سے نقصان
پہنچا دیا ہے۔ دوسرا طریق یہ تھا کہ لوگ غیر مہذب ہمسایہ
اقوام کی عورتیں اور اُن کے بچے پکڑ کر لے جاتے اور انہیں
اپنی غلامی میں رکھتے۔ اوّل الذکر طریق جب موقعہ ملے اور
ثانی الذکر طریق بطور دستور اُن میں جاری تھا۔ بلکہ یہ طریق
اٹھارویں صدی تک دنیا میں رائج رہا ہے۔ چنانچہ مغربی
افریقہ سے لاکھوں غلام یونائیٹڈ سٹیٹس امریکہ میں لیجائے
گئے جو اب تک وہاں موجود ہیں۔ گو اب وہ آزاد ہو چکے
ہیں مگر دو تین کروڑ باشندے اب بھی امریکہ میں ایسے موجود
ہیں جو مغربی افریقہ سے بطور غلام وہاں پہنچائے گئے تھے۔

متمدن اقوام کی غرض اس سے یہ ہوتی تھی کہ وہ اپنے ملک کی دولت کو بڑھائیں۔ چنانچہ ان غلاموں سے کئی قسم کے کام لئے جاتے تھے کہیں اُن کو کارخانوں میں لگا دیا جاتا تھا کہیں جہازوں کا کام اُن کے سپرد کر دیا جاتا تھا کہیں جنگل کاٹنے کا کام اُنکے سپرد کر دیا جاتا تھا۔ اِسی طرح محنت و مشقت کے سب کام جو قومی ترقی کے لئے ضروری ہوتے تھے وہ اِن غلاموں سے لئے جاتے تھے۔ مثلاً سستی چیزیں پیدا کرنا اور زیادہ نفع کمانا مقصود ہوتا تو اِن غلاموں کو زمینوں کی آبپاشی اور فصلوں کی کاشت اور نگرانی پر مقرر کر دیا جاتا۔ اِسی طرح ملک کے غیر آباد علاقے بھی غلاموں کے ذریعہ ہی آباد کئے جاتے تھے۔ چنانچہ روس میں سائبیریا کی آبادی غلاموں یا سیاسی قیدیوں ہی کی رہینِ منت تھی۔ اسی طرح امریکہ کی آبادی غلاموں یا سیاسی قیدیوں کی ہی رہینِ منت تھی۔ وہ اپنے علاقوں کو کبھی خود آباد نہیں کر سکتے تھے۔ لاکھوں لاکھ غلام وہ مغربی افریقہ سے لائے اور وہ امریکہ کے بے آباد علاقوں کو آباد کر گئے۔ آج امریکہ اپنی دولت پر نازاں ہے اپنی تجارت اور اپنی صنعت پر نازاں ہے۔ مگر امریکہ کی یہ دولت اور امریکہ کی آبادی رہینِ منت ہے اُن حبشی غلاموں کی جن کو وہ مغربی افریقہ سے پکڑ کر لائے۔ اِسی طرح یونان اور روما کی تاریخ بتاتی ہے کہ اُن کی آبادی بھی غلاموں کی خدمات کی رہینِ منت ہے۔ مصر کی تاریخ بھی بتاتی ہے کہ اُسکی آبادی غلاموں کی خدمات کی وجہ سے ہوئی۔ فرانس اور سپین کی تاریخ بھی بتاتی ہے کہ اُن کی ترقی اُن خدمات کی رہینِ منت تھی جو آج سے دو تین سو سال پہلے اُن ممالک میں غلاموں نے سرانجام دیں اور جنہوں نے اُن کی اقتصادی حالت کو ترقی دے کر کہیں سے کہیں پہنچا دیا۔ غرض اس طریق سے ایک طرف تو بنی نوع انسان کے ایک حصہ کو مساوات سے محروم رکھا جاتا تھا اور دوسری طرف ملک کی دولت کو بڑھایا جاتا تھا۔ قرآن کریم نے اِن دونوں طریقوں کو قطعاً ممنوع قرار دے دیا اور فرمایا:۔

مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗۤ اَسْرٰى حَتّٰى يُثْخِنَ فِي الْاَرْضِ ؕ تُرِيْدُوْنَ عَرَضَ الدُّنْيَا ۖۗ وَاللّٰهُ يُرِيْدُ الْاٰخِرَةَ ؕ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ (انفال ع ۹) یعنی ہم نے کسی نبی کے لئے نہ پہلے یہ جائز رکھا تھا اور نہ تمہارے لئے یہ جائز ہے کہ بغیر اس کے کہ کسی حکومت سے باقاعدہ لڑائی ہو اُن افراد کو غلام بنا لیا جائے۔ اگر کسی حکومت سے جنگ ہو اور جنگ بھی سیاسی نہیں بلکہ مذہبی ہو تو عین میدانِ جنگ میں قیدی پکڑے جا سکتے ہیں۔ لیکن تمہیں یہ حق نہیں کہ بغیر کسی مذہبی جنگ کے دوسری اقوام کے افراد کو قیدی بناؤ۔ یا میدانِ جنگ میں تو نہ پکڑو۔ لیکن بعد میں اُن کو گرفتار کر کے قیدی بنا لو۔ قیدی بنانا صرف اس صورت میں جائز ہے جب کسی قوم سے باقاعدہ جنگ ہو اور عین میدانِ جنگ میں دشمن قوم کے افراد کو بطور جنگی قیدی گرفتار کر لیا جائے۔ گویا وہ قوم جس کے خلاف اعلانِ جنگ نہیں ہوا اُس کے افراد کو پکڑنا جائز نہیں ہے اِسی طرح وہ قوم جس سے جنگ ہو اس کے افراد کو بھی میدانِ جنگ کے علاوہ کسی اور جگہ سے بعد میں پکڑنا جائز نہیں ہے صرف لڑائی کے دوران میں لڑنے والے سپاہیوں کو یا اُن کو جو لڑنے والے سپاہیوں کی مدد کر رہے ہوں پکڑ لیا جائے تو یہ جائز ہوگا کیونکہ اگر اُن کو چھوڑ دیا جائے تو وہ بعد میں دوسرے لشکر میں شامل ہو کر مسلمانوں کو نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ لیکن اِس بارہ میں بھی اللہ تعالیٰ یہ ہدایت دیتا ہے کہ اِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَاِمَّا فِدَآءً (محمد ع ۱) یعنی بعد میں یا تو اُن کو احسان کے طور پر چھوڑ دو یا فدیہ لے کر چھوڑ دو۔ پس یہ صورت تو اسلام میں جائز ہی نہیں کہ باوجود اس کے کہ کوئی شخص اپنا فدیہ پیش کرتا ہو پھر بھی اسکو غلام رکھا جائے اُسے بہرصورت یا تو احسان کے طور پر رہا کرنا پڑیگا۔ یا فدیہ لیکر چھوڑنا پڑے گا۔ مگر یہ امر یاد رکھنا چاہیئے کہ موجود زمانہ میں یہ قاعدہ ہے کہ تاوانِ جنگ لڑنے والی قوم سے لیا جاتا ہے۔ لیکن اسلام نے یہ طریق رکھا ہے کہ خود جنگی قیدی یا اُس کا رشتہ دار اس کا فدیہ ادا کرے۔ بظاہر یہ عجیب بات معلوم ہوتی ہے لیکن اس کی وجہ یہ ہے

کہ اسلام کے زمانہ تک تنخواہ دار فوجیں نہیں ہوتی تھیں بلکہ دونوں طرف سے رضاکار لڑنے کے لئے آتے تھے پس چونکہ وہ لڑائی رضاکاروں کی لڑائی ہوتی تھی اس لئے فدیہ بھی رضاکاروں پر رکھا گیا۔ اب چونکہ جنگ قومی ہوتی ہے اس لئے فدیہ قوم پر رکھا گیا ہے۔

پس یہ بالکل جھوٹ ہے کہ اسلام نے غلامی کو قائم کیا ہے۔ درحقیقت اسلام ہی وہ مذہب ہے جس نے غلامی کو دنیا سے مٹایا۔ لیکن اگر بفرضِ محال تسلیم بھی کر لو کہ اسلام نے غلامی کو جائز قرار دیا ہے تو بتاؤ کہ کیا آجکل کا انٹرنیشنل قانون جنگی قیدیوں کے ساتھ اس سے زیادہ حسنِ سلوک سکھاتا ہے۔ آجکل تو انکی پہلی بیویوں کو بھی اُن کے پاس نہیں آنے دیتے کجا یہ کہ خود اُن کی شادی کا انتظام کریں۔ مگر اسلام کہتا ہے کہ جو کچھ خود کھاؤ وہی ان کو کھلاؤ۔ جو کچھ خود پہنو وہی ان کو پہناؤ۔ اور پھر ان میں سے جو شادی کے قابل ہوں ان کی شادی کر دو۔ تاکہ انہیں بھی سکونِ قلب حاصل ہو اور قوم میں بھی فواحش کا دروازہ بند رہے۔

اس آیت میں اِنْ يَّكُوْنُوْا فُقَرَآءَ يُغْنِهِمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ کہہ کر اس طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ محض غربت کے ڈر کی وجہ سے اُن کی شادی کرنے میں نہ ہچکچاؤ۔ کیونکہ فضل اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ اور وہ اس بات پر قادر ہے کہ اُن کے حالات کو بدل دے اور انہیں کشائشِ رزق سے حصہ دے دے۔

یہ آیت گو جنگی قیدیوں کے احکام کے ضمن میں بیان کی گئی ہے مگر اصولی رنگ میں اپنے اندر یہ بڑی بھاری ہدایت رکھتی ہے کہ شادی بیاہ کے معاملات میں روپیہ اور مال و دولت کی بجائے نیکی اور تقویٰ پر اپنے تعلقات کی بنیاد رکھنی چاہیئے اور ہمیشہ ایسے لڑکوں اور لڑکیوں کی تلاش کرنی چاہیئے جو اپنے اندر نیکی اور تقویٰ اور شرافت رکھتے ہوں۔ صرف مال اور جائیداد پر نظر نہیں رکھنی چاہیئے۔

اس آیت پر بعض لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ ہم تو دیکھتے ہیں کہ کئی لوگ شادیاں کرتے ہیں مگر ساری عمر انہیں کوئی دولت حاصل نہیں ہوتی۔ اور غربت میں ہی اُن کی زندگی کٹ جاتی ہے۔ پھر یہ خدائی وعدہ کیسا ہوا جس کے خلاف ہمیں دنیا میں کئی شواہد نظر آتے ہیں۔ اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ یہاں غناء سے مراد صرف مال کی کثرت ہی نہیں بلکہ اس سے دل کا آرام اور چین بھی مُراد ہے۔ اور اس سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا کہ اگر نیک اور ہمدرد بیوی میسر آ جائے تو انسان کو ایسا اطمینانِ قلب حاصل ہوتا ہے کہ خواہ اُسے فاقہ کرنا پڑے پھر بھی وہ آرام اور راحت سے کلیۃً بے گانہ نہیں ہوتا۔ وہ تکلیف کی گھڑیوں میں بھی ایک راحت کا سامان پاتا ہے جس سے اس کی ذہنی کوفت اور پریشانی کے دُور ہونے میں بڑی بھاری مدد ملتی ہے۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ یہاں اُن لوگوں کا ذکر ہے جو اللہ تعالیٰ پر کامل توکل رکھتے ہیں اور اس کے وعدوں پر انہیں ایسا یقین ہوتا ہے کہ وہ اس بات کو تو تسلیم کر سکتے ہیں کہ سورج مشرق کی بجائے مغرب سے نکل آئے مگر وہ اس بات کو کبھی تسلیم نہیں کر سکتے کہ خدا تعالیٰ ایک بات کہے اور وہ پوری نہ ہو۔ ایسے لوگ خدا تعالیٰ کے کنارِ عاطفت میں ہوتے ہیں اور خواہ اُن پر مصائب کی کتنی آندھیاں چلیں اُن کے پائے ثبات میں کوئی لغزش نہیں آتی اور وہ آگ میں پڑ کر بھی سلامتی کے ساتھ باہر نکل آتے ہیں اور نہ صرف روحانی نعماء

وَلْيَسْتَعْفِفِ الَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ نِكَاحًا حَتّٰى يُغْنِيَهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ

اور چاہیئے کہ وہ لوگ جن کو نکاح کی توفیق نہیں پاکیزگی اختیار کریں یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ انکو اپنے فضل سے غنی بنا دے ۱۲۵

متمتع ہوتے ہیں بلکہ اللہ تعالیٰ دنیوی نعماء بھی اُنکے قدموں میں ڈال دیتا ہے اور اُن کی غربت اور افلاس اور تنگدستی کو دُور فرما دیتا ہے۔

وَلْيَسْتَعْفِفْ

۱۲۵ حل لغات:- وَلْيَسْتَعْفِفْ عربی زبان میں عِفَّةٌ کے معنے ہوتے ہیں تَرْكُ الشَّهْوَاتِ یعنی شہوات کا چھوڑ دینا (اقرب) اور اِسْتِعْفَافٌ کے معنے ہیں عفت اختیار کرنا (مفردات) پس وَلْيَسْتَعْفِفْ کے معنے ہونگے۔ چاہیئے کہ شہوات کو ترک کرکے پاکیزگی اختیار کریں۔

تفسیر اب اس سوال کا جواب دیتا ہے کہ وہ لوگ جن کے لئے شادی کا انتظام نہ ہو سکتا ہو وہ کیا کریں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَلْيَسْتَعْفِفِ الَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ نِكَاحًا یعنی چاہیئے کہ وہ لوگ جن کو نکاح کا موقع میسّر نہیں اپنی طاقتوں کو دبا دیں یعنی ایسی احتیاطوں سے جو شہوات کو کم کرتی ہیں اپنے جوشوں کو کم کریں مگر زنا نہ کریں اور نہ یہ کریں کہ اپنی اُن طاقتوں کو بالکل ضائع کر دیں جن کے ذریعہ سے بقائے نسل کا تقاضا پورا ہوتا ہے کیونکہ اس صورت میں وہ اپنی فطرت کو مسخ کر دینگے اور اللہ تعالیٰ اس بات کو ناپسند کرتا ہے کہ فطرتی تقاضوں کو کچل دیا جائے۔

اس آیت کے متعلق مفسّرین کو بہت مشکل پیش آئی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ پہلی آیت میں تو یہ بتایا تھا کہ نکاح کرنے سے فقر غناء سے بدل جائیگا مگر اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسا نہیں ہوتا کیونکہ اگر ہوتا تو یہ حکم دیا جاتا کہ ضرور نکاح کر لو۔ مگر یہاں یہ کہا گیا ہے کہ اُس وقت تک انتظار کرو کہ اللہ تعالیٰ تمہیں غنی کر دے۔ پس مفسّرین اس آیت سے یہ استدلال کرتے ہیں کہ نکاح لازماً انسان کو غنی نہیں بناتا۔ ورنہ یہ آیت بے معنے ہو جاتی ہے۔ لیکن میرے نزدیک اُن کا یہ استدلال صحیح نہیں کیونکہ غنی بنانا تو ایک الٰہی وعدہ ہے ممکن ہے کہ باوجود اس وعدہ کے کہ اِنْ يَّكُوْنُوْا فُقَرَآءَ يُغْنِهِمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ایک شخص اپنی لڑکی یا ایک مالک اپنی لونڈی اس غلام کو دینے کے لئے تیار نہ ہو جو غریب ہو۔ ایسی صورت میں بہرحال وہ شخص بغیر بیوی کے رہیگا۔ سو اللہ تعالیٰ نے ایسے لوگوں کو نصیحت کی کہ اگر کسی طرح بیوی نہ ملے تو صبر کرو اور پاکدامنی اختیار کرو یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ تمہیں غنی کر دے یعنی تمہارے رشتہ کا انتظام ہو جائے۔

مَیں سمجھتا ہوں کہ مفسّرین کو یہ مشکل زیادہ تر اس لئے پیش آئی ہے کہ انہوں نے لَا يَجِدُوْنَ نِكَاحًا حَتّٰى يُغْنِيَهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ کے معنے صحیح طور پر نہیں سمجھے۔ اس آیت کے یہ معنے کرنا کہ جب تک مال حاصل نہ ہو جائے اس وقت تک نکاح نہیں کرنا چاہیئے درست نہیں۔ کیونکہ اس آیت میں اُس شخص کا ذکر نہیں جو غریب ہو اور نکاح نہ کرے۔ بلکہ اس شخص کا ذکر ہے جو غریب ہو اور جسے غربت کی وجہ سے کوئی دوسرا شخص رشتہ دینے کے لئے تیار نہ ہو پہلے تو یہ بتایا تھا کہ اگر کسی غریب کا نکاح ہوتا ہو اور وہ اپنی غربت کی وجہ سے نکاح نہ کرے تو یہ درست نہیں وہ نکاح کرلے۔ اللہ تعالیٰ اُسے غنی کر دیگا اور یہاں یہ بتایا ہے کہ اگر کسی کو غربت کی وجہ سے رشتہ نہ ملے تو اس وقت تک وہ عفت سے کام لے جب تک کہ خدا اس کے لئے رشتہ کا انتظام نہ کر دے۔

وَالَّذِيْنَ يَبْتَغُوْنَ الْكِتٰبَ مِمَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ فَكَاتِبُوْهُمْ

اور تمہارے غلاموں میں سے جو لوگ مکاتبت کا مطالبہ کریں۔ اگر تم اُن میں

اِنْ عَلِمْتُمْ فِيْهِمْ خَيْرًا ۖ وَّاٰتُوْهُمْ مِّنْ مَّالِ اللّٰهِ الَّذِيْۤ اٰتٰىكُمْ ؕ

بھلائی دیکھو تو اُن سے مکاتبت کر لو۔ اور (اگر اُن کے پاس پورا مال نہ ہو تو) جو اللہ نے تم کو مال دیا ہے اس میں سے کچھ مال دے کر اُن کی

پس یہ دو الگ الگ حکم ہیں۔ پہلی آیت کے تو یہ معنے ہیں کہ جو شخص خدا تعالیٰ پر کامل توکل کرکے شادی کرتا ہے خدا اُسے کشائش دے دیتا ہے۔ اور وہ مشکلات میں گرفتار نہیں ہوتا اور دوسری آیت کا مفہوم یہ ہے کہ جن لوگوں کو غربت کی وجہ سے رشتہ ملنے میں دقتیں ہوں وہ ایسی احتیاطوں سے کام لیں جو شہوات کو کم کرنے والی ہوں اور پاکیزہ زندگی بسر کریں اور اُس وقت تک انتظار کریں جب تک کہ خدا تعالیٰ اُن کیلئے شادی کا رستہ نہ کھول دے۔

۳۴ حل لغات :- اَلْكِتٰبُ: مفردات میں ہے کہ اَلْكِتَابَةُ اَلْعَبْدِ ابْتِيَاعُ نَفْسِهٖ مِنْ سَيِّدِهٖ بِمَا يُؤَدِّيْهِ مِنْ كَسْبِهٖ۔ یعنی جب غلام کیلئے کتابت کا لفظ بولا جائے تو اُس سے یہ مراد ہوتی ہے کہ اُس نے اپنے آقا کے ساتھ ایسا معاہدہ کر لیا ہے کہ وہ کچھ رقم اپنی کمائی سے بالاقساط ادا کرتا رہیگا حتّٰی کہ مقررہ رقم ادا کرکے آزاد ہو جائیگا (مفردات)

تفسیر :- چونکہ پچھلی آیات میں جنگی قیدیوں کا نکاح کرنے کے متعلق خدا تعالیٰ نے اپنے احکام بیان فرمائے تھے اس لئے اب یہ بتاتا ہے۔ کہ ہمارے ان احکام سے یہ نہ سمجھنا کہ ہم غلامی کو پسند کرتے اور اس کو دنیا میں قائم رکھنا چاہتے ہیں۔ یہ احکام انسانی مجبوری کی وجہ سے دیئے گئے ہیں ورنہ ہمارا اصل منشا یہی ہے کہ غلاموں کو آزاد کیا جائے خواہ احسان کے طور پر انہیں آزاد کر دیا جائے اور خواہ فدیہ لیکر۔ چنانچہ فرمایا۔ وَالَّذِيْنَ يَبْتَغُوْنَ الْكِتٰبَ مِمَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ فَكَاتِبُوْهُمْ اِنْ عَلِمْتُمْ فِيْهِمْ خَيْرًا۔ یعنی وہ لوگ جو تمہارے غلام مردوں یا عورتوں میں سے مکاتبت چاہتے ہیں۔ اگر تم اُن میں قابلیت دیکھو تو ان کو مشروط آزادی دے دو۔ "اگر اُن میں قابلیت دیکھو" کے یہ معنے نہیں کہ مالک خود فیصلہ کرے کہ غلام میں آزادی کی قابلیت ہے یا نہیں بلکہ غلام اس کا فیصلہ قاضی سے کروائیگا۔ اگر قاضی کہے گا کہ یہ مرد یا عورت اس قابل ہیں کہ مشروط آزادی حاصل کرکے اپنا گذارہ چلا سکیں گے تو وہ حکم دے دیگا کہ ان سے مکاتبت کر لی جائے۔ ورنہ اس سے روک دیگا تاکہ وہ تباہ نہ ہو جائیں۔ پھر مزید سہولت اس طرح پیدا کی کہ حکم دیدیا کہ تمہیں خدا کی راہ میں مال خرچ کرنے کے جو پہلے طریقے بتائے جا چکے ہیں اُن میں یہ زیادتی کی جاتی ہے کہ اپنے مالوں کا کچھ حصّہ مشروط آزادی حاصل کرنے والے غلاموں کو کامل آزادی دلانے میں بھی خرچ کرو۔

اَلْكِتٰبُ

حقیقت یہ ہے کہ قرآن کریم نے غلام کے لئے دو ہی صورتیں لکھی ہیں۔ جن کا ذکر اُس نے سورۃ محمدؐ میں ان الفاظ میں فرمایا ہے کہ اِمَّا مَنًّاۢ بَعْدُ وَاِمَّا فِدَآءً (سورۃ محمدؐ ع) یعنی مذہبی جنگ میں جب کوئی شخص قید ہو کر تمہارے پاس آئے تو یا تو اس کو بطور احسان چھوڑ دو اور یا پھر فدیہ لے کر چھوڑ دو۔ یہ صورت تمہارے لئے کسی طرح بھی جائز نہیں کہ باوجود اس کے کہ کوئی شخص اپنا فدیہ پیش کرتا ہو پھر بھی اس کو غلام رکھا جائے۔ مگر چونکہ ممکن تھا کہ ایک شخص غریب ہو اور وہ خود فدیہ ادا کرنے کی طاقت نہ رکھتا ہو

گورنمنٹ ظالم ہو اور اُسے رہا کرانے کا کوئی احساس نہ ہو۔ اُس کے رشتہ دار لاپرواہ یا بدمعاش ہوں اور وہ چاہتے ہوں کہ وہ قید ہی رہے تاکہ وہ اُس کی جائیداد پر قبضہ کئے رکھیں اور دوسری طرف مالک کی یہ حالت ہو کہ وہ بغیر فدیہ لینے کے اُسے آزاد کرنے کی طاقت ہی نہ رکھتا ہو۔ کیونکہ بالکل ممکن ہے کہ جو رقم اُس نے جنگ میں خرچ کی تھی اُس نے اُس کی مالی حالت کو خراب کر دیا ہو۔ تو ایسی صورت کے لئے اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ وہ لوگ جن کو اللہ تعالیٰ نے تمہارا غلام بنایا ہے اور تمہیں اُن پر قبضہ و تصرف حاصل ہے اگر وہ تم سے کہیں کہ صاحب ہمیں چھڑانے والا کوئی نہیں اور نہ ہمارے پاس دولت ہے کہ ہم فدیہ دے کر رہا ہو سکیں ہم غریب اور نادار ہیں۔ ہم آپ سے یہ شرط کر لیتے ہیں کہ آپ کی رقم دو سال یا تین سال یا چار سال میں ادا کر دیں گے اور اسقدر ماہوار یا سالانہ قسط آپ کو ادا کیا کریں گے آپ ہمیں آزاد کر دیں تو فَكَاتِبُوْهُمْ اِنْ عَلِمْتُمْ فِيْهِمْ خَيْرًا تم اس بات پر مجبور ہو کہ اُنکو آزاد کر دو۔ اور اُن کے فدیہ کی رقم کی قسطیں مقرر کر لو بشرطیکہ تمہیں معلوم ہو کہ وہ روپیہ ادا کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ بلکہ تمہیں چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے تم کو جو کچھ دیا ہے اُس میں سے ان کی مدد کرو۔ یعنی انہیں کچھ سرمایہ بھی دے دو تاکہ اس کے ذریعہ سے وہ روپیہ کما کر اپنا فدیہ ادا کر سکیں جب قسطیں مقرر ہو جائیں تو اس وقت سے وہ اپنے اعمال میں ویسا ہی آزاد ہو گا جیسے کوئی دوسرا آزاد شخص اور وہ اپنے مال کا مالک سمجھا جائیگا مگر جیسا کہ بتایا جا چکا ہے پہلے زمانوں میں چونکہ جنگ انفرادی ہوا کرتی تھی اس لئے افراد سے تاوانِ جنگ وصول کیا جاتا تھا۔ مگر اس زمانہ میں قومی جنگیں ہوتی ہیں اسلئے اب یہ طریق ہو گا کہ قوم تاوانِ جنگ ادا کرے۔ پہلے چونکہ باقاعدہ فوجیں نہیں ہوا کرتی تھیں اور قوم کے افراد پر جنگی اخراجات کی ذمہ داری فرداً فرداً پڑتی تھی اسلئے اُسوقت قیدی رکھنے کا بہترین طریق یہی تھا کہ اُن کو افراد میں تقسیم کر دیا جاتا تاکہ وہ اُن سے اپنے اپنے اخراجات جنگ وصول کریں۔ مگر جب حکومت کی باقاعدہ فوج ہو اور افراد پر جنگی اخراجات کا بار فرداً فرداً نہ پڑتا ہو۔ تو اُس وقت جنگی قیدی تقسیم نہیں ہونگے بلکہ حکومت کی تحویل میں رہیں گے اور جب دوسری قوم تاوانِ جنگ ادا کر دیگی تو پھر اُن سے کوئی خدمت نہیں لی جائے گی۔ اور انہیں رہا کر دیا جائیگا۔

بہرحال اسلامی تعلیم کے ماتحت غلام دنیوی جنگوں میں نہیں بنائے جاتے بلکہ صرف انہی جنگوں میں بنائے جاتے ہیں جو مذہبی ہوں۔ مگر ان غلاموں کے متعلق بھی حکم دیا کہ اول تو احسان کر کے انہیں چھوڑ دو اور اگر ایسا نہیں کر سکتے تو فدیہ لے کر رہا کر دو۔ یہ ضروری نہیں کہ وہ خود فدیہ دے اُس کے رشتہ دار بھی دے سکتے ہیں حکومت بھی دے سکتی ہے۔ اور اگر گورنمنٹ لاپرواہ ہو۔ رشتہ دار ظالم ہوں اور وہ خود غریب ہو تو وہ کہہ سکتا ہے کہ میرے ساتھ طے کر لو کہ مجھ پر کیا تاوانِ جنگ عاید ہوتا ہے اور پھر کہہ دے کہ مجھے اس تاوان کی ادائیگی کے لئے اتنی مہلت دے دو میں اس عرصہ میں اسقدر ماہوار روپیہ ادا کر کے تاوانِ جنگ دے دونگا۔ اس معاہدہ کے معاً بعد وہ آزاد ہو جائیگا اور مالک کا کوئی حق نہیں ہو گا کہ وہ کتابت میں کسی قسم کی روک پیدا کرے۔ کتابت کا روکنا صرف اُسی صورت میں جائز ہے جبکہ خیر نہ ہو یعنی جنگ کا خطرہ ہو۔ یا یہ کہ وہ پاگل اور کم عقل ہو۔ خود کما نہ سکتا ہو اور خطرہ ہو کہ وہ بجائے فائدہ کے نقصان اٹھائیگا۔ اور کتابت کی صورت میں اسلام اُسے سرمایہ مہیا کر دینے کا بھی حکم دیتا ہے خواہ وہ سرمایہ مالک دے یا حکومت۔

ممکن ہے یہاں کوئی شخص کہہ دے کہ اگر پاگل یا کم عقل والے کی مکاتبت کو روکنا جائز ہے تو پھر تو لوگ

وَلَا تُكْرِهُوْا فَتَيٰتِكُمْ عَلَى الْبِغَآءِ اِنْ اَرَدْنَ تَحَصُّنًا

اور تم اپنی لونڈیوں کو بدکاری پر مجبور نہ کرو اگر وہ نیک رہنا چاہتی ہوں

لِّتَبْتَغُوْا عَرَضَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۭ وَمَنْ يُّكْرِهْهُّنَّ فَاِنَّ

تاکہ تم اُن کے ذریعہ سے دنیوی زندگی کا سامان جمع کرو۔ اور جو کوئی اُن کو مجبور کرے ۔ تو اللہ (تعالیٰ)

اللّٰهَ مِنْۢ بَعْدِ اِكْرَاهِهِنَّ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝۳۴ وَلَقَدْ

اُن عورتوں کی مجبوری کے بعد بہت بخشنے والا (اور) بار بار رحم کرنے والا ہے (وہ ان پر گرفت نہیں کریگا)۔ اور ہم نے

اَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ اٰيٰتٍ مُّبَيِّنٰتٍ وَّمَثَلًا مِّنَ الَّذِيْنَ خَلَوْا

تم پر کھلے کھلے نشانات اتارے ہیں۔ اور جو لوگ تم سے پہلے گذر چکے ہیں اُن کے حالات بھی

اچھے بھلے سمجھدار لوگوں کو بے عقل قرار دے کر اپنا غلام بنائے رکھیں گے۔ آزاد تو وہ پھر بھی نہ ہوئے ساس کا جواب یہ ہے کہ اسلامی قانون یہ ہے کہ ایسی صورت میں وہ گورنمنٹ کے پاس درخواست کر سکتا ہے کہ میں صاحب عقل ہوں کما سکتا ہوں مگر میرا مالک مجھے جان بوجھ کر غلام بنائے ہوئے ہے اور قاضی فیصلہ کرکے اُسے آزادی کا حق دلا دے گا۔ غرض کوئی صورت بھی ایسی نہیں جس میں غلاموں کی آزادی کو مدنظر نہ رکھا گیا ہو اوّل مالک کو کہا کہ وہ احسان کرکے چھوڑ دے۔ دوم اگر مالک ایسا نہ کر سکے تو غلام کو اختیار دیا کہ وہ تاوانِ جنگ ادا کرکے آزادی حاصل کرلے اور اگر فدیہ ادا کرنے کی طاقت نہ رکھتا ہو تو مکاتبت کرلے اور کہہ دے کہ میں اتنی قسطوں میں روپیہ دے دوں گا۔ مجھے دو یا تین سال کی مہلت دے دو۔ ایسا معاہدہ کرتے ہی وہ آزاد سمجھا جائیگا۔ اگر اِن ساری سہولتوں کے باوجود کوئی شخص یہ کہے کہ میں آزاد ہونا نہیں چاہتا تو ماننا پڑے گا کہ اُسے اپنی غلامی آزادی سے اچھی معلوم ہوتی ہے۔ اور حقیقت بھی یہی ہے کہ صحابہ کرامؓ کے پاس جو غلام تھے وہ انہیں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے احکام کے ماتحت اس عمدگی اور آرام کے ساتھ رکھتے تھے کہ انہیں آزادی سے غلامی بہتر معلوم ہوتی تھی۔

اِس جگہ اللہ تعالےٰ نے وَاٰتُوْهُمْ مِّنْ مَّالِ اللّٰهِ الَّذِيْٓ اٰتٰىكُمْ کہہ کر بنی نوع انسان کو اِس لطیف نکتہ کی طرف بھی توجہ دلائی ہے کہ وہ اموال جو تمہارے قبضہ میں ہیں درحقیقت ایک امانت کے طور پر تمہارے پاس ہیں ورنہ اس مال میں دوسروں کا بھی حق شامل ہے اور تمہارا فرض ہے کہ اُن کے حقوق ادا کرو۔ تمہیں یہی خوشی اپنا سب سے بڑا انعام سمجھنا چاہیئے کہ تمہارے کئی بھائی جو تمہاری طرح اِس مال کے حصّہ دار ہیں تمہارے ذریعہ سے پرورش پا رہے ہیں۔ اور خدا تعالےٰ نے تم کو اِس درجہ پر پہنچایا ہے کہ اُس کی مخلوق کی ربوبیت میں تم بھی حصّہ لو۔

ع ۴ ۱۰

مِنْ قَبْلِكُمْ وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴿۳۵﴾ اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ

بیان کئے ہیں اور متقیوں کے لئے نصیحت کی باتیں بھی (بیان کی ہیں)۔ ۲۳؎ اللہ آسمانوں کا بھی نور ہے

وَالْاَرْضِ ؕ مَثَلُ نُوْرِهٖ كَمِشْكٰوةٍ فِيْهَا مِصْبَاحٌ ؕ اَلْمِصْبَاحُ

اور زمین کا بھی۔ اُس کے نور کی کیفیت یہ ہے جیسے کہ ایک طاق ہو جس میں ایک دیا پڑا ہو (اور وہ) دیا

فِيْ زُجَاجَةٍ ؕ اَلزُّجَاجَةُ كَاَنَّهَا كَوْكَبٌ دُرِّيٌّ يُّوْقَدُ مِنْ

ایک شیشے کے گلوب کے نیچے ہو (اور) وہ گلوب ایسا چمکدار ہو کہ گویا وہ ایک چمکتا ہوا ستارہ ہے (اور) وہ (چراغ)

شَجَرَةٍ مُّبٰرَكَةٍ زَيْتُوْنَةٍ لَّا شَرْقِيَّةٍ وَّلَا غَرْبِيَّةٍ ۙ يَّكَادُ

ایک ایسے برکت والے درخت (کے تیل) سے جلایا جا رہا ہو کہ وہ (درخت) نہ مشرقی ہو نہ مغربی۔ قریب ہے کہ اُس کا

زَيْتُهَا يُضِيْٓءُ وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ ؕ نُوْرٌ عَلٰى نُوْرٍ ؕ

تیل خواہ اُسے آگ نہ بھی چھوئی ہو بھڑک اُٹھے۔ (یہ چراغ) بہت سے نوروں کا مجموعہ (معلوم ہوتا) ہے

يَهْدِى اللّٰهُ لِنُوْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَيَضْرِبُ اللّٰهُ

اللہ (تعالیٰ) اپنے نور کے لئے جس کو چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے۔ اور اللہ (تعالیٰ) لوگوں کے لئے (تمام ضروری)

۲۳؎ **تفسیر:** پھر فرماتا ہے کہ اپنی لونڈیوں کو بدکاری پر مجبور نہ کرو۔ چونکہ اس جگہ مکاتبت یعنی مشروط آزادی حاصل کرنے والے غلاموں کا ذکر ہے اس لئے اِس جگہ وہی لونڈیاں مُراد لی جائیں گی جو مشروط آزادی حاصل کرنا چاہتی ہیں۔ اور اس آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ ایسی لونڈیوں کو جو کہ مشروط آزادی حاصل کرنا چاہتی ہیں دنیا کے حصول کی غرض سے اُن کے اس ارادہ میں روک ڈال کر بدکاری پر مجبور نہ کرو یعنی جو عورت مشروط آزادی حاصل کرکے جبری نکاح سے بچنا چاہتی ہے اور مکمل آزادی کے بعد اپنی مرضی کے خاوند سے نکاح کرنا چاہتی ہے اُس کو اِس ارادہ سے باز رکھنا ایسا ہی ہے جیسا کہ بدکاری پر مجبور کرنا۔

وَمَنْ يُّكْرِهْهُّنَّ فَاِنَّ اللّٰهَ مِنْ بَعْدِ اِكْرَاهِهِنَّ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ۔ اور جو شخص آزادی کی کوشش کرنے والی عورت کے راستہ میں روک ڈالتا ہے اور اس طرح اُسے جبری نکاح پر مجبور کرتا ہے تو اُس کے نتیجہ میں اس کے دل میں جو بغض پیدا ہوگا اُس کی وجہ سے عورت پر کوئی گناہ نہیں ہوگا۔ مرد کو ہوگا۔ کیونکہ عورت کے دل میں جو بے وفائی پیدا ہوگی وہ مرد کے جبر کی وجہ سے ہوگی۔

الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ ؕ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۙ﴿۳۶﴾

باتیں بیان کرتا ہے - اور اللہ (تعالیٰ) ہر ایک چیز کو خوب جانتا ہے ۲۴؎

۲۴؎ **حل لغات**: مِشْکٰوۃٌ: اَلْمِشْکٰوۃُ کے معنے ہیں کُلُّ کُوَّۃٍ غَیْرُ نَافِذَۃٍ - ہر وہ سوراخ جو دیوار میں کوئی چیز رکھنے کے لئے بنایا جائے اور وہ دوسری طرف نہ کھلے (اقرب)

اَلزُّجَاجَۃُ: اَلْقِطْعَۃُ مِنَ الزُّجَاجِ - زجاجہ کے معنے ہیں شیشے کا ٹکڑا (اقرب)

دُرِّیٌّ: کہتے ہیں کَوْکَبٌ دُرِّیٌّ اور اس کے معنے ہوتے ہیں اَیْ ثَاقِبٌ مُضِیْءٌ یعنی چمکنے والا روشن ستارہ (اقرب)

تفسیر:- اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ آسمانی نور بھی خدا کی طرف سے آتا ہے - اور زمینی نور بھی یعنی شریعت حقہ بھی آسمان سے آتی ہے اور اُس کی زمین پر اشاعت بھی اس کے فضل سے ہوتی ہے - اُس کے نور کی مثال ایسی ہی ہے جیساکہ ایک طاق ہو جس میں ایک تیز روشنی والا چراغ رکھا ہوا ہو اور چراغ پر ایک چمنی یا گلوب ہو - اور وہ چمنی یا گلاب ایسے صاف شیشے کا ہو کہ گویا وہ ایک چمکتا ہوا ستارہ ہے - انسانی تجربہ نے یہ بتایا ہے کہ لیمپ کی سب سے اچھی روشنی تبھی ہوتی ہے جب اس کے پیچھے کوئی ایسی روک ہو جو اُس کے نور کو چاروں طرف نہ پھیلنے دے بلکہ صرف آگے کی طرف پھینکے جس کی طرف مشکٰوۃ کے لفظ سے اشارہ کیا گیا ہے - یہ نور خصوصاً اُس وقت پھیلتا ہے جبکہ چراغ چمنی کے اندر ہو - اور چمنی بہت صاف شیشے کی بنی ہوئی ہو - اور تیل بھی اعلیٰ درجہ کا ہو - اس کی طرف اشارہ کرنے کے لئے فرماتا ہے کہ الٰہی نور کا چراغ ایک ایسے تیل سے جلتا ہے جو زیتون کے مبارک درخت سے نکلتا ہے -

مُبَارَکَۃٌ کا لفظ بَرَکَۃٌ سے نکلا ہے اور بَرَکَۃٌ اُس جگہ کو کہتے ہیں جہاں بارش ہونے پر اردگرد کا تمام پانی بہ کر جمع ہو جائے - پس مُبَارَکَۃٌ کے یہ معنے ہیں کہ وہ ایسا شجرہ ہے جس میں ساری خوبیاں اور کمالات جمع ہیں - اور پھر اُسے زیتون قرار دے کر اس طرف اشارہ کیا کہ وہ کلام جو اب دُنیا میں نازل کیا جا رہا ہے وہ نئے سے نئے علوم اور معارف کو دُنیا میں قائم کرنے کا ایک ذریعہ ہو گا - کیونکہ زیتون علاوہ اسکے کہ ایک پھل کا کام دیتا ہے اس کی لکڑی اور تیل جلانے کے کام آتا ہے اور اس کے پتوں اور چھال سے بُننے کا کام لیا جاتا ہے - اسی طرح اس کا روغن کثرت کے ساتھ مختلف مواقع پر استعمال کیا جاتا ہے اور اچار میں بھی ڈالا جاتا ہے جو اس کو دیر تک قائم رکھتا ہے -

اس طرح تمثیلی زبان میں اللہ تعالیٰ نے بتایا کہ موسوی اور عیسوی تعلیمیں تو سڑ جانے والی اور عملی لحاظ سے ایک دن ناکارہ ہونے والی تھیں مگر اسلام کے ذریعہ بنی نوع انسان کو وہ تعلیم دی جائیگی جو نہ صرف سڑنے اور خراب ہونے سے محفوظ ہو گی بلکہ انسانی ذہنوں میں وہ ایسا نور پیدا کرے گی کہ اس کے ذریعہ سے نئے سے نئے علوم اور نئے سے نئے معارف اُنکو حاصل ہوتے رہیں گے -

نور کے متعلق عام طور پر کہا جاتا ہے کہ یہ تو اُس مادی چیز کا نام ہے جو بعض مادی چیزوں کے رگڑ کھانے سے پیدا ہوتا ہے - پھر خدا تعالیٰ نور کیونکر ہوا؟ نحویوں نے تو اسے اس طرح حل کیا ہے کہ انہوں نے نور سے پہلے ایک محذوف نکالا ہے اور کہا ہے کہ

مِشْکٰوۃ

اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ کے معنے ہیں اَللّٰہُ صَاحِبُ نُوْرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (املاء مامن بہ الرحمٰن) یعنی آسمانوں اور زمین کے سب نُور خدا تعالیٰ کے قبضہ و تصرف میں ہیں اور جب سب نُور اس کے قبضہ میں ہیں تو جو انسان بھی ترقی کرنا چاہتا ہے اُس کے لئے ضروری ہے کہ وہ خدا تعالیٰ سے تعلق رکھے۔

معانی والے کہتے ہیں کہ اسجگہ نور کا لفظ مجاز اور استعارہ کے طور پر استعمال ہُوا ہے اور مراد یہ ہے کہ جس طرح نُور کے ذریعہ انسان کو بُری اور بھلی چیزوں میں امتیاز کرنے کا موقعہ ملتا ہے۔اسی طرح نیکی اور بدی میں امتیاز خدا تعالےٰ کی ہدایت سے ہی میسّر آتا ہے کیونکہ تمام آسمانی اور زمینی انوار کا منبع خدا تعالےٰ ہی ہے۔

لُغت والے کہتے ہیں کہ یہ ایک محاورہ ہے چنانچہ جس چیز پر کسی کا دار و مدار ہو اُسے نُور کہتے ہیں۔ مثلاً نُوْرُ الْبَلَدِ اس آدمی کو کہتے ہیں جس پر کسی شہر کے لوگوں کا انحصار ہو اور نُوْرُ الْقَبَائِلِ اس شخص کو کہتے ہیں جو قبائل کے لئے باعثِ فخر ہو چونکہ خدا تعالےٰ کے فضل کے بغیر انسان کو کسی کام میں بھی کامیابی حاصل نہیں ہوسکتی۔ اس لئے اُسے آسمانوں اور زمین کا نُور کہا گیا ہے۔

یہ سب باتیں اپنی اپنی جگہ درست ہیں لیکن میرے نزدیک یہاں اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ کہہ کر اس طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ زمین و آسمان میں تم جس چیز کو بھی روشن کرنا چاہو خدا تعالیٰ کا نور اُس میں داخل کردو۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا۔ کہ وہ چیز روشن ہو جائیگی۔ اگر وہ نور مکان میں نازل ہوگا تو وہ مکان روشن ہو جائیگا۔ اور اگر دل پر نازل ہوگا تو دل روشن ہو جائیگا۔ یہی نُور جب بیت اللہ پر نازل ہُوا تو وہ دنیا کی ہدایت کا مرکز بن گیا۔ پھر یہی نور مسجد نبوی پر نازل ہُوا تو تمام مساجد کے لئے وہ ایک نمونہ قرار پاگئی حالانکہ بظاہر اینٹوں اور گارے کی ایک عمارت سے زیادہ اُس کی کیا حیثیت تھی۔ پھر یہی نُور جب رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے قلبِ مطہر پر نازل ہُوا تو آپ عالمِ رُوحانی کے آفتاب بن گئے۔اسی طرح قرآن کیا ہے وہی حروف ہیں جن کو عربی زبان میں روزانہ استعمال کیا جاتا ہے۔ وہی کاغذ ہوتا ہے جس پر تمام اخبارات اور کتابیں چھپتی ہیں۔ وہی سیاہی ہوتی ہے جس سے گندے اور فحش اشعار بھی لکھے جاتے ہیں۔ مگر اسی سیاہی سے لکھا ہُوا اور اسی کاغذ پر چھپا ہُوا جب قرآن آتا ہے تو وہ دنیا کی ہدایت کا موجب بن جاتا ہے۔ یہ وہی خصوصیّت ہے جسے اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ میں بیان کیا گیا ہے۔ چونکہ خدا اس میں آگیا۔ اس لئے وہ دنیا کی ہدایت کا ذریعہ بن گیا۔ لیکن جہاں یہ نور نہ ہو وہاں ظلمت اور سیاہی کے سوا اور کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ پھر اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ کہہ کر اس طرف بھی توجہ دلائی گئی ہے کہ روشنی کبھی مقید نہیں رہتی۔ وہ ضرور باہر نکلتی اور پھیلتی ہے۔ سیاہی اور ظلمت کا دائرہ بیشک محدود ہوتا ہے مگر روشنی ہمیشہ پھیلنے کی کوشش کرتی ہے۔ چنانچہ دیکھ لو وہ کرمِ شب چراغ جو رات کے وقت چمکتا ہے کتنا چھوٹا سا ہوتا ہے مگر کس طرح دُور سے اس کی روشنی رات کے وقت نظر آتی ہے۔ مسافر جب گاؤں کے قریب آتا ہے تو کس طرح اُسے جھاڑیوں میں چمکتا ہُوا دیکھ کر کہہ اُٹھتا ہے کہ وہ گاؤں آگیا۔ اسی طرح جس شخص کے دل میں خدا تعالیٰ کی محبت کی چنگاری سُلگ اُٹھے اگر وہ اس کرمِ شب چراغ کے برابر بھی ہو۔ تب بھی وہ دوسروں کو روشنی پہنچائیگا۔ یہ ممکن ہی نہیں کہ کوئی خدا کا ہو جائے اور اپنے دائرۂ استعداد کے مطابق سورج یا چاند یا

ستارہ نہ بنے۔ جو شخص اللہ تعالےٰ سے سچا تعلق پیدا کر لیتا ہے وہ اس کے نُور کو اپنے اندر جذب کر لیتا ہے اور پھر دوسروں کو بھی اپنے انوار سے منوّر کر دیتا ہے۔ بانیٔ سلسلہ احمدیہ اِسی کیفیّت کا ذکر کرتے ہوئے اپنے متعلق تحریر فرماتے ہیں کہ

" میرے لئے یہ کافی تھا کہ وہ میرے پر خوش ہو مجھے اس بات کی ہرگز تمنّا نہ تھی (کہ میں مسیح موعود کہلاؤں یا مسیح ابن مریم سے اپنے تئیں بہتر ٹھہراؤں) مَیں پوشیدگی کے حجرہ میں تھا اور کوئی مجھے نہیں جانتا تھا۔ اور نہ مجھے یہ خواہش تھی کہ کوئی مجھے شناخت کرے۔ اُس نے گوشۂ تنہائی سے مجھے جبرًا نکالا۔ مَیں نے چاہا کہ مَیں پوشیدہ رہوں اور پوشیدہ مروں۔ مگر اُس نے کہا کہ مَیں تجھے تمام دنیا میں عزّت کے ساتھ شہرت دونگا۔" (حقیقۃ الوحی صفحہ ۱۴۸، ۱۴۹)

غرض نُور کا یہ خاصہ ہے کہ وہ ظاہر ہو۔ وہ کبھی چُھپ کر نہیں رہ سکتا۔ پس جب کوئی انسان اللہ تعالیٰ کی محبت اپنے اندر پیدا کرے تو نہ صرف اُس میں بلکہ اُس کے ملنے والوں میں بھی ایک پاک تبدیلی پیدا ہونی شروع ہو جاتی ہے۔ یہ تو ہو سکتا ہے کہ کئی لوگوں کے اندر وہ تبدیلی نامکمل ہو مگر پھر بھی نور ضرور ظاہر ہو کر رہتا ہے۔ جس طرح کالے کپڑے کی اوٹ میں بھی اگر بتّی جلائی جائے تب بھی کچھ نہ کچھ روشنی ضرور نکلتی ہے۔ اِسی طرح ممکن ہے کہ کسی کے دل میں محبّتِ الٰہی کی ایک ہلکی سی چنگاری تو مخفی ہو مگر گناہوں کی سیاہ چادر اُس پر پڑی ہوئی ہو لیکن یہ سیاہی اس کے نور کو صرف کم کر سکتی ہے مٹا نہیں سکتی۔ اور جب بھی اس کی سیاہ چادر ہٹے گی۔ الٰہی نور نہایت شان سے اس میں ظاہر ہونا شروع ہو جائیگا۔

پھر اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ کہکر اسلام نے دنیا کے سامنے یہ اصل بھی پیش کیا ہے کہ تمدّن کی بنیاد اللہ تعالےٰ کے نور یعنی اس کے الہام پر ہونی چاہیئے۔ اور تمدّنی قوانین صرف اُس ذات کی طرف سے ہونے چاہئیں جس کی نہ کسی سے رشتہ داری ہے اور نہ دوستی۔ عورتوں سے پوچھو تو وہ کہتی ہیں کہ مردوں کے ہاتھ میں چونکہ قانون بنانا ہے اس لئے وہ جس طرح چاہتے ہیں بنا لیتے ہیں۔ اِسی طرح پہلے زمانہ میں ہندوستانی کہا کرتے تھے کہ ملکی قوانین چونکہ انگریزوں نے اپنی قوم کو فائدہ پہنچانے کے لئے بنائے ہوئے ہیں اس لئے ہم سول نافرمانی کرتے ہیں۔ غرض کوئی قوم دوسری قوم کے بنائے ہوئے قوانین پر مطمئن نہیں ہو سکتی مگر خدا تعالےٰ کے بنائے ہوئے قوانین کے متعلق کوئی شخص نہیں کہہ سکتا کہ اس نے کسی قوم کی رعایت کی ہے۔ خدا تعالےٰ کو اس سے کوئی غرض نہیں کہ لنکا شائر کا کپڑا فروخت ہو یا نہ ہو اور ہندوستان کی روئی بکے یا نہ بکے اس کے نزدیک سب یکساں ہیں۔ پس صحیح قانون اُسی کی طرف سے جاری ہو سکتا ہے۔ اور اِسی کی طرف اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ میں اشارہ کیا گیا ہے یعنی آسمانوں اور زمینوں کا نور خدا ہی ہے اور سب چیزیں اسی سے طاقت پاتی ہیں۔ وہ جس قانون کو جاری کرتا ہے وہ ایسے سرچشمہ سے نکلتا ہے جو لَا شَرْقِيَّةٍ وَّلَا غَرْبِيَّةٍ کا مصداق ہوتا ہے۔ اُس میں نہ مشرقیوں کی رعایت مدّنظر ہوتی ہے اور نہ مغربیوں کی۔ نہ عورتوں کی رعایت ہوتی ہے۔ نہ مردوں کی۔ نہ کمزوروں کے حقوق کو تلف کیا جاتا ہے نہ طاقتوروں کی رعایت مدّنظر رکھی جاتی ہے۔ اور حقیقت یہی ہے کہ دنیا میں کبھی امن قائم نہیں ہو سکتا جب تک کہ تمدّن کی بنیاد

اللہ تعالیٰ کی طرف سے تسلیم نہ کی جائے۔ مزدور اور سرمایہ دار کے جھگڑے صرف اسی لئے پیدا ہوئے کہ دنیا نے کہا۔ ہم خود تمدنی قوانین بنائیں گے۔ بلکہ وہ اسلام پر اعتراض کرتے رہے کہ اس نے تمدنی امور میں کیوں دخل دیا ہے۔ لیکن اَب وہ لوگ بھی دھکے کھا کھا کر وہیں آرہے ہیں جہاں اسلام لانا چاہتا ہے اور تعلقاتِ مابین خواہ میاں بیوی کے ہوں یا ماں باپ کے۔ بھائی بھائی کے ہوں یا بہن بھائی کے۔ رعایا اور راعی کے ہوں یا مختلف حکومتوں کے۔ سب میں دنیا اسلام کی طرف آرہی ہے پس اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ میں اس طرف بھی اشارہ فرمایا گیا ہے۔ کہ تمدّن کی بنیاد الہام پر رکھو۔ ورنہ تمہارے آپس کے جھگڑے اور مناقشات کبھی ختم نہیں ہونگے اور دنیا میں کبھی پائیدار امن قائم نہیں ہوگا۔

اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ کے بعد اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ مَثَلُ نُوْرِہٖ کَمِشْکٰوۃٍ فِیْھَا مِصْبَاحٌ۔ اس کے نور کی مثال ایک طاقچے کی سی، جس میں ایک تیز روشنی والا چراغ رکھا ہوا ہو مشکوٰۃ اس طاقچے کو کہتے ہیں جو دیوار میں بنا ہوا ہو اور جسکے دوسری طرف سوراخ نہ ہو۔ دیوار میں دو طرح کے طاقچے بنائے جاتے ہیں۔ ایک کھڑکی کی طرح ہوتا ہے یعنی اس کے آرپار سوراخ ہوتا ہے۔ کیونکہ کھڑکی کی غرض باہر دیکھنا ہوتی ہے۔ یا تشوؔ روشن دان بنانے کیلئے جو خلا رکھا جاتا ہے اس کے بھی آرپار سوراخ ہوتا ہے کیونکہ روشن دان سے یہ غرض ہوتی ہے کہ ہوا اور روشنی کی آمد و رفت رہے۔ مگر پُرانے زمانے میں مساجد میں خصوصًا اس قسم کے طاقچے بنائے جایا کرتے تھے جن میں چراغ یا قرآن شریف رکھے جاتے تھے اور جن کے دوسری طرف سوراخ نہیں ہوتا تھا اور مشکوٰۃ ایسے ہی طاقچے کو کہتے ہیں جس کے دوسری طرف سوراخ نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ نے

اِن آیات میں اپنے نور کی کیفیت بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ اُس نُور کی مثال ایک طاقچے کی سی ہے جس میں ایک بتی رکھی ہوئی ہو۔ اَلْمِصْبَاحُ فِیْ زُجَاجَۃٍ۔ اور وہ بتی ایک چمنی یا گلوب میں ہو۔ اَلزُّجَاجَۃُ کَاَنَّھَا کَوْکَبٌ دُرِّیٌّ۔ اور وہ چمنی یا گلوب ایسے اعلیٰ درجہ کے شیشہ کا بنا ہوا ہو اور ایسا روشن ہو کہ گویا وہ ایک ستارہ ہے جو چمک رہا ہے۔ اس جگہ اللہ تعالیٰ کے نور کو تین چیزوں میں محصور قرار دیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ کمالِ نور ہمیشہ تین ذرائع سے ہوتا ہے۔ ایک مشکوٰۃ سے۔ ایک مصباح سے اور ایک زجاجہ سے۔

یہ ایک عجیب بات ہے کہ باوجودیکہ قرآن کریم ایسے زمانہ میں نازل ہوا جبکہ سائنس ابھی کمال کو نہیں پہنچی تھی اور ایسے ملک میں نازل ہوا جہاں کے لوگ تہذیب و تمدّن سے بھی ناآشنا سمجھے جاتے تھے اور ایسے انسان پر نازل ہوا جو اُمّی تھا۔ پھر بھی روشنی کے کمال کو جس عجیب طرز سے اِن آیات میں بیان کیا گیا ہے اس کو دیکھتے ہوئے یوں معلوم ہوتا ہے کہ کوئی بیسویں صدی کا سائنس دان روشنی کی حقیقت بیان کر رہا ہے مشکوٰۃ جس طرح اس طاقچے کو کہتے ہیں جو دیوار میں بنایا جاتا ہے اور جس کے دوسری طرف سوراخ نہیں ہوتا اسی طرح مصباح اُس شعلہ کو کہتے ہیں جو بتّی میں سے نکلتا ہے یا بلب کی وہ تاریں سمجھ لو جن سے بجلی کی روشنی پیدا ہوتی ہے بشرطیکہ وہ روشن ہوں۔ مصباح کے معنے دراصل صبح کر دینے والا آلہ کے ہیں اور اس لحاظ سے ہر وہ چیز جس سے بہت تیز روشنی ہوتی ہو اُسے مصباح کہا جاتا ہے اور چونکہ وہ بتی کا گُل ہی ہوتا ہے جو روشن ہوتا ہے یا بجلی کی وہ تاریں ہوتی ہیں جو بلب کے اندر ہوتی ہیں اور چمکتی ہیں اس لئے عربی زبان میں انہیں مصباح کہتے ہیں۔ گویا وہ شعلہ جو آگ لگنے کے بعد

بتّی میں سے نکلتا ہے یا بجلی کی وہ تار جہاں بجلی پہنچتی ہے تو وہ یکدم روشن ہو جاتا ہے وہ مصباح کہلاتی ہے اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اُس کے نور کی مثال ایک طاقچہ کی سی ہے جس میں ایک بتّی جل رہی ہو اور پھر وہ بتّی ایک زجاجہ میں ہو۔

ہر شخص جانتا ہے کہ ہری کین روشن کرنے کیلئے جب کوئی شخص دیا سلائی جلاتا اور بتی کو لگاتا ہے تو اس وقت بتّی کی روشنی کی کیا حالت ہوتی ہے ایک زرد سا شعلہ بتّی میں سے نکل رہا ہوتا ہے اور اُسکا دھوآں اُٹھ اُٹھ کر کمرہ میں پھیل رہا ہوتا ہے۔ نازک مزاج اشخاص کے دماغ میں وہ دھوآں چڑھتا ہے تو انہیں چھینکیں آنی شروع ہو جاتی ہیں بعض کو نزلہ ہو جاتا ہے۔ لیکن جونہی بتّی میں سے دھوآں نکلنا اور کمرے میں پھیلنے لگتا ہے انسان جلدی سے چمنی پر ہاتھ مارتا اور ہری کین کا ہینڈل دبا کر اُسے بتّی پر چڑھا دیتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اسی وقت دھوآں جاتا رہتا ہے اور اس شعلہ کا رنگ ہی بدل جاتا ہے۔ اور پہلی روشنی سے بعض دفعہ بیس گُنے بعض دفعہ تیس گُنے بعض دفعہ پچاس گُنے بعض دفعہ سو گُنے اور بعض دفعہ دُو دُو سو یا ہزار گُنے تیز روشنی پیدا ہو جاتی ہے۔ اور تمام کمرہ روشن ہو جاتا ہے۔ پھر زائد بات اس چمنی یا گلوب کی وجہ سے یہ پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ بتّی بجھتی نہیں۔ تیز بارشوں کے ایام میں رات کے وقت لوگ ہری کین لے کر باہر چلے جاتے ہیں۔ آندھی آ رہی ہوتی ہے طوفان اُٹھ رہا ہوتا ہے چھتیں ہل رہی ہوتی ہیں۔ عمارتیں کانپ رہی ہوتی ہیں۔ پیر لڑکھڑا رہے ہوتے ہیں مگر وہ روشنی جو انسان ہاتھ میں اُٹھائے ہوئے ہوتا ہے نہیں بجھتی۔ کیونکہ اس کی چمنی اس کے ماحول کو محفوظ کر دیتی ہے اور نہ صرف اس کی روشنی کو کئی گنا زیادہ کر دیتی ہے بلکہ اُسے بجھنے سے بھی محفوظ کر دیتی ہے۔ مگر بعض لمپ ہری کین سے بھی زیادہ طاقتور ہوتے ہیں۔ اور جو بڑے بڑے لمپ کمروں کو روشن کرنے کے لئے جلائے جاتے ہیں ان کو دیکھو تو تمہیں معلوم ہو گا کہ اُن کی روشنی تیز کرنے کے لئے اُن کے پیچھے ایک اس قسم کی چیز لگا دی جاتی ہے جو روشنی کو آگے کی طرف پھینکتی ہے۔ پُرانے زمانوں میں لوگ اس غرض کے لئے لمپ کو طاقچہ میں رکھ دیا کرتے تھے۔ اور اس زمانہ میں اس کی ایک مثال ٹارچ ہے۔ ٹارچ پیچھے سے لمبی چلی آتی ہے اور اس کے آگے اس پر ایک نسبتاً بڑا خول چڑھا دیتے ہیں جو بلب کے تین طرف دائرہ کی شکل میں پھیلا ہُوا ہوتا ہے اور اس میں ایک چمکدار دھات لگی ہوئی ہوتی ہے جس سے غرض یہ ہوتی ہے کہ وہ روشنی کو آگے کی طرف پھیلائے اگر اس خول کو اتار لیا جائے تو ٹارچ کی روشنی دس پندرہ گز تک رہ جاتی ہے لیکن اس خول کے ساتھ وہی روشنی بعض دفعہ پانچ سو گز بعض دفعہ ہزار گز اور بعض دفعہ دُو دُو ہزار گز تک پھیل جاتی ہے۔ یہ روشنی کو دُور پھینکنے والا جو خول ہوتا ہے اُسے انگریزی میں ری فلیکٹر کہتے ہیں اور بڑی بڑی طاقت کے لمپ تو ری فلیکٹر کی وجہ سے اس سے بھی زیادہ دُور تک روشنی پہنچا دیتے ہیں اس طرح روشنی مکمل ہو جاتی ہے اور لوگ اس سے پوری طرح فائدہ اٹھاتے ہیں۔

غرض یہ تین چیزیں ہیں جن سے نور مکمل ہوتا ہے اُن میں سے ایک تو شعلہ ہے جو اصل آگ ہے۔ اور جس کے بغیر کوئی نور ہو ہی نہیں سکتا۔ روحانی دنیا میں وہ شعلہ اللہ تعالےٰ کا نور ہے اور چمنی جس سے وہ نور روشن ہوتا ہے۔ وہ خدا تعالیٰ کے انبیاءؑ ہیں۔ یوں تو دُنیا کے ہر ذرہ سے خدا تعالیٰ کا نور ظاہر ہے مگر وہ نور لوگوں کو نظر نہیں آتا۔ ہاں جب خدا تعالیٰ کا نبی آتا ہے۔ اور

اُسے اپنے ہاتھوں میں لے کر دُنیا کے سامنے پیش کرتا ہے
تب ہر شخص کو وہ نور نظر آنے لگ جاتا ہے۔ بالکل اسی
طرح جس طرح بتی جلائی جائے تو ہوا کا ذرا سا جھونکا
بھی اُسے بُجھا دیتا ہے۔ مگر جونہی اس پر شیشہ رکھ دیا
جاتا ہے سب اندھیرا دُور ہو جاتا ہے تاریکی مٹ جاتی
ہے اور وہی نور آنکھوں کے کام آنے لگ جاتا ہے۔
اس کا یہ مطلب نہیں کہ اصل چیز شیشہ ہے اصل چیز تو
وہ نور ہی ہے جو بتی میں سے نکل رہا ہوتا ہے۔ مگر چونکہ
وہ نور دھوئیں کی شکل میں ضائع ہو رہا ہوتا ہے اسلئے
لوگ اس سے اس وقت تک فائدہ نہیں اٹھا سکتے
جب تک اس پر شیشہ نہیں چڑھایا جاتا۔ ہاں جب
شیشہ چڑھ جاتا ہے تو وہی نور جو پہلے ضائع ہو رہا ہوتا
ہے ضائع ہونے سے محفوظ ہو جاتا ہے پھر چمنی سے مکر
پہلے نور سے بیس گنے سو گنے دو سو گنے ہزار گنے بلکہ
دو ہزار گنے زیادہ تیز ہو جاتا ہے۔ یہ شیشے اور گلوب
دراصل انبیاء کے وجود ہوتے ہیں جو خدا تعالیٰ کے اس
نور کو جو قدرت میں ہر جگہ پایا جاتا ہے لیتے ہیں اور
اپنے گلوب اور چمنی کے نیچے رکھ کر اُس کا ہر حصہ انسانوں
کے استعمال کے قابل بنا دیتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ
ساری دنیا اس نور کو دیکھنے لگ جاتی ہے۔ اُس کی
آنکھیں روشن ہو جاتی ہیں اور وہ اس سے فائدہ حاصل
کرنے لگ جاتی ہے۔

اس مضمون کو اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں بعض اَور
مقامات پر بھی بیان فرمایا ہے۔ چنانچہ سورۃ طٰہٰ
میں اللہ تعالیٰ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ذکر میں فرماتا
ہے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے نور کو آگ کی شکل میں
دیکھا۔ اور فرمایا اِنِّیْٓ اٰنَسْتُ نَارًا۔ میں نے ایک
آگ دیکھی ہے۔ اس فقرہ سے صاف ظاہر ہے کہ دوسرے
لوگ اس آگ کو نہیں دیکھ رہے تھے۔ پس اٰنَسْتُ
نَارًا میں یہ بتایا گیا ہے کہ نبی کے وجود میں ظاہر ہونے
سے پہلے اللہ تعالیٰ کا ظہور اس دنیا میں بطور نار کے ہوتا
ہے۔ یعنی کوئی تیز نظر والا ہی اُسے دیکھ سکتا ہے لیکن جب
وہ نبی کے ذریعہ ظاہر ہوتا ہے تو پھر وہ نور ہو جاتا ہے۔
یعنی لیمپ کی طرح اس کی روشنی بہت تیز ہو جاتی ہے۔
پھر نبوت میں یہ نور آکر مکمل تو ہو جاتا ہے لیکن اس کا زمانہ
پھر بھی محدود ہوتا ہے کیونکہ نبی بھی موت سے محفوظ نہیں
ہوتے۔ پس اس روشنی کو دُور تک پہنچانے کے لئے اور
زیادہ دیر تک قائم رکھنے کے لئے ضروری تھا کہ کوئی اور
تدبیر کی جاتی سو اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے ایک ریفلیکٹر
بنایا جس کا نام خلافت ہے۔ جس طرح طاقچہ تین طرف
سے روشنی کو روک کر صرف اس جہت میں ڈالتا ہے
جدھر اس کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی طرح خلفاء نبی کی
قوتِ قدسیہ کو جو اس کی جماعت میں ظاہر ہو رہی ہوتی
ہے ضائع ہونے سے بچا کر ایک خاص پروگرام کے
ماتحت استعمال کرتے ہیں جس کے نتیجہ میں جماعت کی
طاقتیں پراگندہ نہیں ہوتیں اور تھوڑی سی طاقت سے
بہت سے کام نکل آتے ہیں کیونکہ طاقت کا کوئی
حصہ ضائع نہیں ہوتا۔ اگر خلافت نہ ہوتی تو بعض کاموں
پر تو زیادہ طاقت خرچ ہو جاتی اور بعض کام توجہ کے
بغیر رہ جاتے اور تفرقہ اور شقاق کی وجہ سے کسی نظام
کے ماتحت جماعت کا روپیہ اور اس کا علم اور اس کا
وقت خرچ نہ ہوتا۔ غرض خلافت کے ذریعہ سے الٰہی نور
کو جو نبوت کے ذریعہ سے مکمل ہوتا ہے ممتد اور لمبا کر
دیا جاتا ہے۔ چنانچہ دیکھ لو۔ الٰہی نور رسول کریم صلی اللہ
علیہ وسلم کی وفات کے ساتھ ختم نہیں ہو گیا بلکہ حضرت
ابوبکرؓ کی خلافت کے طاقچہ کے ذریعہ اس کی مدت کو
سوا دو سال اور بڑھا دیا گیا۔ پھر حضرت ابوبکرؓ کی وفات
کے بعد وہی نور خلافتِ عمرؓ کے طاق کے اندر رکھ دیا گیا

اور ساڑھے دس سال اس کی مدت کو اَور بڑھا دیا گیا۔ پھر حضرت عمرؓ کی وفات کے بعد وہی نور عثمانی طاقچہ میں رکھ دیا گیا اور بارہ سال اُس کی مدت کو اَور بڑھا دیا گیا۔ پھر حضرت عثمانؓ کی وفات کے بعد وہی نور علوی طاقچہ میں رکھ دیا گیا اَور چار سال نو ماہ اُس نور کو اور لمبا کر دیا گیا۔ گویا تیس سال الٰہی نور خلافت کے ذریعہ لمبا ہو گیا۔ پھر ناقص خلافتوں کے ذریعہ سے تو یہی نور چار سو سال تک سپین اور بغداد میں ظاہر ہوتا رہا۔ غرض جس طرح ٹارچوں کے اندر ری فلیکٹر ہوتا ہے اور اس کے ذریعہ بلب کی روشنی دُور دُور تک پھیل جاتی ہے یا چھوٹے چھوٹے ری فلیکٹر بعض دفعہ تھوڑا سا خم دیکر بنائے جاتے ہیں جیسے دیوارگیروں کے پیچھے ایک ٹین لگا ہوا ہوتا ہے جو دیوارگیر کا ری فلیکٹر کہلاتا ہے اور گو اس کے ذریعہ روشنی اتنی تیز نہیں ہوتی جتنی ٹارچ کے ری فلیکٹر کے ذریعہ تیز ہوتی ہے مگر پھر بھی دیوارگیر کی روشنی اس ری فلیکٹر کی وجہ سے پہلے سے بہت بڑھ جاتی ہے اسی طرح خلافت وہ ری فلیکٹر ہے جو نبوت اور الوہیت کے نور کو لمبا کر دیتا ہے اور اسے دُور تک پھیلا دیتا ہے۔ پس اس آیت میں اللہ تعالےٰ نے خلافت۔ نبوت اور الوہیت کا ذکر کیا ہے اور فرمایا ہے کہ ہمارے نور کی مثال ایسی ہی ہے جیسے بتّی کا شعلہ وہ ایک نور ہے جو دنیا کے ہر ذرہ سے ظاہر ہو رہا ہے مگر جب تک وہ نبوت کے شیشہ میں نہ آئے لوگ اُس سے فائدہ نہیں اُٹھا سکتے۔ جیسے نیچر پر غور کرکے اللہ تعالیٰ کی ہستی معلوم کرنیکا شوق رکھنے والے ہمیشہ ٹھوکریں کھاتے اور نقصان اٹھاتے ہیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَ اخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ (آلِ عمران ع۲۰) بالکل درست ہے اور زمین اور آسمان میں اللہ تعالےٰ کی بہت سی آیات پائی جاتی ہیں مگر یہی خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ یورپ کے فلاسفروں کو دہریہ بنا رہی ہے۔ گویا خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ میں اللہ تعالیٰ کا جو نور ہے اس کی مثال ایسی ہی ہے جیسے بتّی کا شعلہ۔ یہ شعلہ جب نکلتا ہے تو اس کے ساتھ دھوآں بھی اُٹھتا ہے جو بعض دفعہ نزلہ پیدا کر دیتا ہے اور آنکھوں کو بھی خراب کرتا ہے وہ دھوآں تب ہی دُور ہوتا ہے جب اُس پر نبوت کی چمنی یا گلوب رکھ کر اُسے روشنی کی صورت میں تبدیل کر دیا جائے اگر اس کے بغیر کوئی اس شعلہ سے نور کا کام لینا چاہے تو اُسے کچھ نور ملے گا اَور کچھ دھوآں ملیگا جو اسکی آنکھوں اور ناک کو تکلیف دے گا۔ چنانچہ اسی وجہ سے جو شخص نیچر پر غور کرکے خدا تعالیٰ کو پانا چاہتا ہے وہ کئی دفعہ ٹھوکریں کھاتا ہے اور بعض دفعہ تو خدا تعالیٰ کو پانے کی بجائے دہریہ ہو جاتا ہے۔ مگر جو شخص خدا تعالےٰ کے وجود کو نبوت کی چمنی کی مدد سے دیکھنا چاہتا ہے اس کی آنکھیں اور اس کا ناک دھوئیں کے ضرر سے بالکل محفوظ رہتے ہیں اور وہ ایک نہایت لطیف اور خوش کن روشنی پاتا ہے جو سب کثافتوں سے پاک ہوتی ہے۔ بانیٔ سلسلہ احمدیہ نے اس حقیقت کی طرف اپنے اِس شعر میں اشارہ فرمایا ہے ؎

فلسفی کز عقل مے جوید ترا دیوانہ است
دُور تر است از خرد ہا آں رہِ پنہانِ تو

غرض کائنات عالم پر غور کرکے خدا تعالیٰ کا وجود پانے والوں کے لئے خدا تعالیٰ نے کچھ ابتلاء رکھے ہیں۔ کچھ شکوک رکھے ہیں کچھ شبہات رکھے ہیں تا وہ مجبور ہو کر نبوت کی چمنی اُس نور پر رکھیں۔ چنانچہ جب بھی الٰہی نور پر نبوت کی چمنی رکھی جاتی ہے۔ اُس نور کی حالت یکدم بدل جاتی ہے۔ اور یا تو وہ بُو دینے والا دھوآں

نظر آ رہا ہوتا ہے اور یا یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ نور ہی نور ہے اور اس میں دھوئیں کا نشان تک نہیں۔ پھر جب اس روشنی کو اٹھا کر ہم طاقچہ میں رکھ دیتے ہیں تو پہلے سے بہت زیادہ دُور اس کی روشنی پھیل جاتی ہے۔

غرض اس آیت میں الوہیت۔ نبوت اور خلافت کا جوڑ بتایا گیا ہے۔ اگر کوئی کہے کہ آخر خلافت بھی تو ختم ہو جاتی ہے۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ خلافت کا ختم ہونا یا نہ ہونا انسانوں کے اختیار میں ہے اگر وہ پاک رہیں اور خلافت کی بے قدری نہ کریں تو یہ طاقچہ سینکڑوں بلکہ ہزاروں سال تک قائم رہ کر اُن کی طاقت کو بڑھانیکا موجب ہو سکتا ہے اور اگر وہ خود ہی اس انعام کو رد کر دیں تو اس کا علاج کسی شخص کے پاس نہیں۔

اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ والی آیت کا مضمون مختصراً بتانے کے بعد اَب میں یہ بتاتا ہوں کہ کس طرح یہ تمام سورۃ اسی ایک مضمون کے گرد چکر لگا رہی ہے۔ اس سورۃ کو اللہ تعالیٰ نے بدکاری اور بدکاری کے الزامات لگانیوالوں کے ذکر سے شروع کیا ہے اور اس کی تفصیلات بیان کرنے کے بعد حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر جو الزام لگا تھا اس کا ذکر کیا ہے۔ پھر اَور بہت سی باتیں اسی کے ساتھ تعلق رکھنے والی بیان فرماتا ہے اور مسلمانوں کو نصیحت کرتا ہے کہ انہیں ایسے مواقع پر کن کن باتوں پر عمل کرنا چاہیئے پھر وہ ذرائع بیان کرتا ہے جن پر عمل کرنے سے بدکاری دُنیا سے مٹ سکتی ہے۔ یہ تمام مضامین اللہ تعالیٰ نے پہلے دوسرے اور تیسرے رکوع میں بیان فرمائے ہیں کسی جگہ الزام لگانے والوں کے متعلق سزا کا ذکر ہے کسی جگہ الزامات کی تحقیق کے طریق کا ذکر ہے کسی جگہ شرعی ثبوت لانے کا ذکر ہے کسی جگہ ایسے الزامات لگنے کی وجوہ کا ذکر ہے کسی جگہ ان دروازوں کا ذکر ہے جن سے گناہ پیدا ہوتا ہے۔ غرض تمام آیتوں میں ایک ہی مضمون بیان کیا گیا ہے مگر اس کے معاً بعد فرماتا ہے اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے۔ اب انسان حیران رہ جاتا ہے کہ اسکا پہلے رکوعوں سے کیا تعلق ہے؟ ایک ایسا مفسّر جو یہ خیال کرتا ہے کہ قرآن کریم میں کوئی ترتیب نہیں وہ نعوذ باللہ ایک بے ربط کلام ہے۔ اس کی آیتیں اسی طرح متفرق مضامین پر مشتمل ہیں جس طرح دانے زمین پر گرائے جائیں تو کوئی کسی جگہ جا پڑتا ہے اور کوئی کسی جگہ۔ وہ تو کہہ دیگا کہ اس میں کیا حرج ہے۔ پہلے وہ مضمون بیان کیا گیا تھا اور اب یہ مضمون شروع کر دیا گیا ہے۔ مگر وہ شخص جو حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی تعلیم سے واقف ہے جو جانتا ہے کہ قرآن کریم کا ہر لفظ ایک ترتیب رکھتا ہے وہ یہ دیکھکر حیران ہو جاتا ہے کہ پہلے تو بدکاری کے الزامات اور اُن کو دُور کرنے کا ذکر تھا اور اس کے معاً بعد یہ ذکر شروع کر دیا گیا ہے کہ اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔ اِن دونوں کا آپس میں جوڑ کیا ہُوا۔ پھر انسان اور زیادہ حیران ہو جاتا ہے جب وہ یہ دیکھتا ہے کہ پانچویں رکوع میں تو یہ بیان کیا گیا ہے کہ اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اور اس سے دو رکوع بعد یعنی ساتویں رکوع میں اللہ تعالیٰ نے یہ ذکر شروع کر دیا ہے کہ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ یعنی اللہ تعالیٰ تم میں سے اُن لوگوں کے ساتھ جو ایمان لائے اور اعمال صالحہ بجا لائے یہ وعدہ کرتا ہے کہ وہ انہیں زمین میں اسی طرح خلیفہ بنائے گا جس طرح اس نے پہلے لوگوں کو خلیفہ بنایا۔ گویا پہلے تو زنا کے الزامات کا ذکر کیا۔ پھر حضرت عائشہؓ کا واقعہ بیان کیا۔ پھر اُن الزامات کے ازالہ کے طریقوں کا ذکر کیا پھر اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ کا مضمون بیان کیا اور پھر کہہ دیا کہ میرا یہ وعدہ ہے کہ جو مومن ہونگے انہیں میں اس اُمت میں اسی طرح خلیفہ بناؤں گا جس طرح پہلے لوگوں کو خلیفہ بنایا اور اُن کے دین کو دنیا میں قائم کرونگا اور اُن کے

خوف کو امن سے بدل دونگا ۔ وہ میری عبادت کرینگے میرے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہرائیں گے ۔ اور جو ان خلفاء کا منکر ہو گا ۔ وہ فاسق ہو گا ۔ پس لازماً یہ سوال ہر شخص کے دل میں پیدا ہوتا ہے کہ کیا وجہ ہے کہ پہلے زنا کے الزامات کا ذکر ہے پھر اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ کا ذکر کیا اور پھر خلافت کا ذکر کر دیا ۔ اِن تینوں باتوں کا آپس میں جوڑ ہونا چاہیئے ورنہ یہ سمجھا جائیگا کہ قرآن کریم نعوذ باللہ بے جوڑ باتوں کا مجموعہ ہے ۔ اور اس کے مضامین میں ایک عالم اور حکیم ہستی والا ربط اور رشتہ نہیں ہے ۔ اِس جگہ ضمنی طور پر یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ جہاں دوسروں پر الزام لگانے والوں کا ذکر ہے وہاں الزام لگانے والوں کے متعلق فرمایا ہے کہ وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَاْتُوْا بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ فَاجْلِدُوْهُمْ ثَمٰنِيْنَ جَلْدَةً وَّلَا تَقْبَلُوْا لَهُمْ شَهَادَةً اَبَدًا ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ کہ وہ لوگ جو بے گناہ عورتوں پر الزام لگاتے ہیں اور پھر ایک موقعہ کے چار گواہ نہیں لاتے تم اُن کو اسّی کوڑے مارو ۔ اور تم ان کی موت تک اُن کو جھوٹا سمجھو اور اُن کی شہادت کو کبھی قبول نہ کرو ۔ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۔ اور یہی وہ لوگ ہیں جو خدا تعالیٰ کے نزدیک فاسق ہیں ۔ پھر اسی سورۃ میں جہاں خلفاء کا ذکر کیا وہاں بھی یہی الفاظ رکھے اور فرمایا وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ کہ جو شخص خلفاء کا انکار کرے وہ فاسق ہے ۔ اب جو الفاظ زنا کا الزام لگانے والوں کے متعلق خدا تعالےٰ نے رکھے تھے اور جو نام اُن کا تجویز کیا تھا وہی نام خدا تعالےٰ نے خلافت کے منکرین کا رکھا اور قریباً اسی قسم کے الفاظ اس جگہ استعمال کئے وہاں یہ بھی فرمایا تھا کہ جو لوگ بدکاری کا الزام لگاتے اور پھر چار گواہ ایک موقعہ کے نہیں لاتے انہیں اسّی کوڑے مارو ۔ انہیں ساری عمر جھوٹا سمجھو اور سمجھ لو کہ یہ لوگ فاسق ہیں ۔ اور یہاں بھی یہ فرمایا کہ جو شخص خلفاء کا انکار کرتا ہے سمجھ لو کہ وہ فاسق ہے ۔ غرض جو شخص قرآن کریم کو ایک حکیم ہستی کی کتاب سمجھتا ہے اور اس کے اعلیٰ درجہ کے باربط اور باہم رشتہ مضمونوں کے کمالات دیکھنے کا اُسے موقعہ ملا ہے اُس کے دل میں لازماً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اِن تینوں باتوں کا آپس میں جوڑ کیا ہے ۔ اس مشکل کو حل کرنے کے لئے اگر اس مضمون پر غور کیا جائے جو مَیں نے اوپر بتایا ہے اور جو یہ ہے کہ اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ میں الوہیت ۔ نبوت اور خلافت کے تعلق پر روشنی ڈالی گئی ہے تو آخری دو مضمونوں کا تعلق پہلے مضامین سے بالکل واضح ہو جاتا ہے کیونکہ اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ میں خلافت کا اصولی ذکر تھا اور بتایا گیا تھا کہ خلافت کا وجود بھی نبوت کی طرح ضروری ہے کیونکہ اس کے ذریعہ سے جلال الٰہی کے ظہور کے زمانہ کو ممتد کیا جاتا ہے اور الٰہی نور کو ایک لمبے عرصہ تک دنیا کے فائدہ کے لئے محفوظ کر دیا جاتا ہے ۔ اِس مضمون کے معلوم ہونے پر طبعاً قرآن کریم پڑھنے والوں کے دلوں میں یہ خیال پیدا ہوتا تھا کہ خدا کرے ایسی نعمت ہم کو بھی ملے سو وَعَدَ اللّٰہُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ کی آیات میں اس خواہش کو پورا کرنے کا اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرما دیا اور بتا دیا اور بتا دیا کہ یہ نعمت تم کو بھی اُسی طرح ملے گی جس طرح پہلے انبیاء کی جماعتوں کو ملی تھی ۔ غرض ان بیان کردہ معنوں کی رُو سے اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ کی آیت اور اس کی متعلقہ آیتوں کا وَعَدَ اللّٰہُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ کی آیت اور انکی متعلقہ آیتوں سے ایک ایسا لطیف اور طبعی جوڑ قائم ہو جاتا ہے جو دل کو لذّت اور سرور سے بھر دیتا ہے اور ایمان کی زیادتی کا موجب ہوتا ہے لیکن یہ سوال پھر بھی قائم رہتا ہے کہ اس مضمون کا پہلی آیتوں سے

کیا تعلق ہوا۔ یعنی سورۃ نور کے پانچویں رکوع کا اس کے نویں رکوع تک تو خلافت سے جوڑ ہوا۔ لیکن جو پہلے چار رکوع ہیں جن میں بدکاری اور بدکاری کے الزامات کا ذکر آتا ہے اُن کا اس سے کیا تعلق ہے۔ جب تک یہ جوڑ بھی نہ ملے اس وقت تک قرآن کریم کی ترتیب پورے طور پر ثابت نہیں ہوسکتی۔

اَب میں یہ بتاتا ہوں کہ پہلے چار رکوعوں کا باقی پانچ رکوعوں سے جن میں خلافت کا ذکر آتا ہے کیا تعلق ہے۔ یہ بات ظاہر ہے کہ پہلے چار رکوعوں میں بدکاری کے الزامات کا ذکر اصل مقصود ہے اور اُن میں خصوصاً اس الزام کو ردّ کرنا مقصود ہے جو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر لگایا گیا تھا۔ اب ہمیں دیکھنا چاہیئے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر جو الزام لگایا گیا تو اُس کی اصل غرض کیا تھی۔ اس کا سبب یہ تو نہیں ہوسکتا کہ ان لوگوں کو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے کوئی دشمنی تھی۔ ایک گھر میں بیٹھی ہوئی عورت سے جس کا نہ سیاسیات سے کوئی تعلق ہو نہ قضاء سے۔ نہ عہدوں سے نہ اموال کی تقسیم سے نہ لڑائیوں سے۔ نہ مخالف اقوام پر چڑھائیوں سے نہ حکومت سے نہ اقتصادیات سے اُس سے کسی نے کیا بُغض رکھنا ہے۔ پس حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے براہ راست بُغض کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہوسکتی۔ اس الزام کے بارہ میں دو ہی صورتیں ہوسکتی ہیں۔ یا تو یہ کہ نعوذ باللہ یہ الزام سچا ہو جس کو کوئی مومن ایک لمحہ کے لئے بھی تسلیم نہیں کرسکتا۔ خصوصاً اس صورت میں کہ اللہ تعالیٰ نے عرش پر سے اس گندے خیال کو ردّ کیا ہے اور دوسری صورت یہ ہوسکتی ہے کہ حضرت عائشہؓ پر الزام بعض دوسرے وجودوں کو نقصان پہنچانے کے لئے لگایا گیا ہو۔ اب ہمیں غور کرنا چاہیئے کہ وہ کون کون لوگ تھے جن کو بدنام کرنا منافقوں کے لئے یا اُن کے سرداروں کے لئے فائدہ بخش ہوسکتا تھا اور کن کن لوگوں سے

اس ذریعہ سے منافق اپنی دشمنی نکال سکتے تھے۔ ایک ادنیٰ تدبیر سے بھی معلوم ہوسکتا ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر الزام لگا کر دو شخصوں سے دشمنی نکالی جاسکتی تھی۔ ایک رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے اور ایک حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے۔ کیونکہ ایک کی وہ بیوی تھیں اور ایک کی بیٹی تھیں۔ یہ دونوں وجود ایسے تھے کہ ان کی بدنامی سیاسی لحاظ سے یا دشمنیوں کے لحاظ سے بعض لوگوں کے لئے فائدہ بخش ہو سکتی تھی۔ یا بعض لوگوں کی اغراض اُن کو بدنام کرنے کے ساتھ وابستہ تھیں۔ ورنہ خود حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی بدنامی سے کسی شخص کو کوئی دلچسپی نہیں ہوسکتی تھی۔ زیادہ سے زیادہ آپ سے سوتوں کا تعلق ہوسکتا تھا اور یہ خیال ہوسکتا تھا کہ شاید حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی سوتوں نے حضرت عائشہؓ کو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی نظروں سے گرانے اور اپنی نیک نامی چاہنے کے لئے اس معاملہ میں کوئی حصّہ لیا ہو۔ مگر تاریخ شاہد ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی سوتوں نے اس معاملہ میں کوئی حصّہ نہیں لیا۔ بلکہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا اپنا بیان ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویوں میں سے جس بیوی کو مَیں اپنا رقیب اور مدِّ مقابل خیال کیا کرتی تھی وہ حضرت زینب بنت جحش رضؓ تھیں۔ ان کے علاوہ اور کسی بیوی کو مَیں اپنا رقیب خیال نہیں کرتی تھی مگر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ مَیں زینبؓ کے اس احسان کو کبھی بھول نہیں سکتی کہ جب مجھ پر الزام لگایا گیا تو سب سے زیادہ زور سے اگر کوئی اس الزام کی تردید کیا کرتی تھیں تو وہ حضرت زینبؓ ہی تھیں۔ (سیرۃ الحلبیہ جلد ۲ صفحہ ۳۱۰ و صفحہ ۳۱۶) پس حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے اگر کسی کو دشمنی ہوسکتی تھی تو ان کی سوتوں کو ہی ہوسکتی تھی اور وہ اگر چاہتیں تو اِس میں حصّہ لے سکتی تھیں تا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نظروں سے گر جائیں اور اُن کی عزت بڑھ جائے۔ مگر

تاریخ سے ثابت ہے کہ انہوں نے اس معاملہ میں کوئی دخل نہیں دیا اور اگر کسی سے پوچھا گیا تو اس نے حضرت عائشہؓ کی تعریف ہی کی - غرض مردوں کی عورتوں سے دشمنی کی کوئی وجہ نہیں ہوتی - پس آپ پر الزام یا تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بُغض کی وجہ سے لگایا گیا یا پھر حضرت ابوبکرؓ سے بُغض کی وجہ سے ایسا کیا گیا - رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو جو مقام حاصل تھا وہ تو الزام لگانے والے کسی طرح چھین نہیں سکتے تھے - انہیں جس بات کا خطرہ تھا وہ یہ تھا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بھی وہ اپنی اغراض کو پورا کرنے سے محروم نہ رہ جائیں - وہ دیکھ رہے تھے کہ آپ کے بعد خلیفہ ہونے کا اگر کوئی شخص اہل ہے تو وہ ابوبکرؓ ہی ہے - پس اس خطرہ کو بھانپتے ہوئے انہوں نے حضرت عائشہؓ پر الزام لگا دیا تا حضرت عائشہؓ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی نگاہ سے گر جائیں اور اُن کے گر جانے کی وجہ سے حضرت ابوبکرؓ کو مسلمانوں میں جو مقام حاصل ہے وہ بھی جاتا رہے اور مسلمان آپ سے بدظن ہو کر اس عقیدت کو ترک کر دیں جو انہیں آپ سے تھی - اور اس طرح رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے بعد حضرت ابوبکرؓ کے خلیفہ ہونے کا دروازہ بالکل بند ہو جائے - یہی وجہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے حضرت عائشہؓ پر الزام لگنے کے واقعہ کے بعد خلافت کا بھی ذکر کیا - حدیثوں میں صریح طور پر ذکر آتا ہے کہ صحابہؓ آپس میں باتیں کیا کرتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے بعد اگر کسی کا مقام ہے تو وہ ابوبکرؓ کا ہی مقام ہے - حدیثوں میں آتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ حضرت عائشہؓ سے کہا - اے عائشہؓ! مَیں چاہتا تھا کہ ابوبکرؓ کو اپنے بعد نامزد کر دوں مگر مَیں جانتا ہوں کہ اللہ اور مومن اسکے سوا اور کسی پر راضی نہیں ہونگے اس لئے مَیں کچھ نہیں کہتا - غرض صحابہؓ یہ یقینی طور پر سمجھتے تھے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے بعد اُن میں اگر کسی کا درجہ ہے تو ابوبکرؓ کا ہے اور وہی آپ کا خلیفہ بننے کے اہل ہیں - مکی زندگی تو ایسی تھی کہ اس میں حکومت اور اس کے نظام کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا لیکن مدینہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تشریف لانے کے بعد حکومت قائم ہو گئی اور طبعاً منافقوں کے دلوں میں یہ سوال پیدا ہونے لگا کہ آپ کے بعد کوئی خلیفہ ہو کر نظامِ اسلامی لمبا نہ ہو جائے اور ہم ہمیشہ کے لئے تباہ نہ ہو جائیں - کیونکہ آپ کے مدینہ میں تشریف لانے کی وجہ سے اُن کی کئی اُمیدیں باطل ہو گئی تھیں - تاریخوں سے ثابت ہے کہ مدینہ میں عربوں کے دو قبیلے اوس اور خزرج تھے اور یہ ہمیشہ آپس میں لڑتے رہتے تھے اور قتل و خون ریزی کا بازار گرم رہتا تھا - جب انہوں نے دیکھا کہ اس لڑائی کے نتیجہ میں ہمارے قبائل کا رعب مٹتا چلا جاتا ہے تو انہوں نے آپس میں صلح کی تجویز کی - اور قرار دیا کہ ہم ایک دوسرے سے اتحاد کریں اور کسی ایک شخص کو اپنا بادشاہ بنالیں - چنانچہ اوس اور خزرج نے آپس میں صلح کر لی اور فیصلہ ہوا کہ عبداللہ بن ابی ابن سلول کو مدینہ کا بادشاہ بنا دیا جائے - اس فیصلہ کے بعد انہوں نے تیاری بھی شروع کر دی اور عبداللہ بن ابی ابن سلول کے لئے تاج بننے کا حکم دیدیا گیا - اتنے میں مدینہ کے کچھ حاجی مکہ سے واپس آئے اور انہوں نے بیان کیا کہ آخری زمانہ کا نبی مکہ میں ظاہر ہو گیا ہے اور ہم اُس کی بیعت کر آئے ہیں - اس پر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے دعویٰ کے متعلق چہ میگوئیاں شروع ہو گئیں اور چند دنوں کے بعد اور لوگوں نے بھی مکہ جا کر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی بیعت کر لی - اور پھر انہوں نے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ آپ ہماری تربیت اور تبلیغ کے لئے کوئی معلّم ہمارے ساتھ بھیجیں - چنانچہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے ایک صحابیؓ کو مبلغ بنا کر بھیجا اور مدینہ کے بہت سے لوگ اسلام میں داخل ہو گئے - انہی دنوں چونکہ مکہ میں رسول کریم

صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ کو بہت تکالیف پہنچائی جا رہی تھیں اس لئے اہل مدینہ نے آپ سے درخواست کی کہ آپ مدینہ تشریف لے آئیں۔ چنانچہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم صحابہؓ سمیت مدینہ ہجرت کر کے آ گئے اور عبداللہ بن ابی ابن سلول کے لئے جو تاج تیار کر دیا جا رہا تھا وہ دھرے کا دھرا رہ گیا۔ کیونکہ جب انہیں دونوں جہانوں کا بادشاہ مل گیا تو انہیں کسی اور بادشاہ کی کیا ضرورت تھی۔ عبداللہ بن ابی ابن سلول نے جب یہ دیکھا کہ اس کی بادشاہت کے تمام امکانات جاتے رہے ہیں تو اسے سخت غصہ آیا اور گو وہ بظاہر مسلمانوں میں مل گیا مگر ہمیشہ اسلام میں رخنے ڈالتا رہتا تھا۔ اور چونکہ اب وہ اور کچھ نہیں کر سکتا تھا اس لئے اس کے دل میں اگر کوئی خواہش پیدا ہو سکتی تھی تو یہی کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم فوت ہوں تو میں مدینہ کا بادشاہ بنوں۔ لیکن خدا تعالیٰ نے اس کے اس ارادہ میں بھی اسے زک دی کیونکہ اس کا اپنا بیٹا بہت مخلص تھا جس کے معنے یہ تھے کہ اگر وہ بادشاہ ہو بھی جاتا تو اس کے بعد حکومت پھر اسلام کے پاس آ جاتی اس کے علاوہ خدا تعالیٰ نے اُسے اس رنگ میں بھی زک دی کہ مسلمانوں میں جونہی ایک نیا نظام قائم ہوا انہوں نے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے مختلف سوالات کرنے شروع کر دئے کہ اسلامی حکومت کا کیا طریق ہے۔ آپ کے بعد اسلام کا کیا بنے گا اور اس بارہ میں مسلمانوں کو کیا کرنا چاہیئے۔ عبداللہ بن ابی ابن سلول نے جب یہ حالت دیکھی تو اُسے خوف پیدا ہونے لگا کہ اب اسلام کی حکومت ایسے رنگ میں قائم ہو گی کہ اُس میں اس کا کوئی حصہ نہ ہو گا اور وہ ان حالات کو روکنا چاہتا تھا۔ چنانچہ اس کے لئے جب اس نے غور کیا تو اُسے نظر آیا کہ اگر اسلامی حکومت کو اسلامی اصول پر کوئی شخص قائم کر سکتا ہے تو وہ ابوبکرؓ ہے اور رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے بعد مسلمانوں کی نظریں انہی کی طرف اٹھتی ہیں اور وہ اُسے تمام لوگوں سے معزز سمجھتے ہیں۔ پس اُس نے اپنی خیر اسی میں دیکھی کہ انکو بدنام کر دیا جائے۔ اور لوگوں کی نظروں سے گرا دیا جائے بلکہ خود رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی نگاہ سے بھی آپکو گرا دیا جائے اور اس بدنیتی کے پورا کرنے کا موقع اُسے حضرت عائشہؓ کے ایک جنگ میں پیچھے رہ جانے کے واقعہ سے مل گیا اور اس خبیث نے آپ پر ایک نہایت گندا الزام لگا دیا جو قرآن کریم میں تو اشارۃً بیان کیا گیا ہے لیکن حدیثوں میں اس کی تفصیل آتی ہے۔ عبداللہ بن ابی ابن سلول کی اس سے غرض یہ تھی کہ اس طرح حضرت ابوبکرؓ ان لوگوں کی نظروں میں بھی ذلیل ہو جائیں گے اور آپ کے تعلقات رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی خراب ہو جائینگے اور اس نظام کے قائم ہونے میں رخنہ پڑ جائیگا جس کا قائم ہونا اُسے یقینی نظر آتا تھا اور جس کے قائم ہونے سے اسکی اُمیدیں برباد ہو جاتی تھیں۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے بعد حکومت کے خواب صرف عبداللہ بن ابی ابن سلول ہی نہیں دیکھ رہا تھا بلکہ بعض اور لوگ بھی اس مرض میں مبتلا تھے۔ چنانچہ مسیلمہ کذاب کی نسبت بھی حدیثوں میں آتا ہے کہ وہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور اُس نے عرض کیا کہ میرے ساتھ ایک لاکھ سپاہی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اپنی جماعت کے ساتھ آپ کی بیعت کر لوں۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اسلام میں چھوٹے اور بڑے کی کوئی تمیز نہیں۔ اگر تم پر حق کھل گیا ہے تو تم بیعت کر لو۔ وہ کہنے لگا۔ میں بیعت کرنے کے لئے تو تیار ہوں مگر میری ایک شرط ہے۔ آپ نے فرمایا۔ وہ کیا؟ وہ کہنے لگا میری شرط یہ ہے کہ آپ تو عرب کے بادشاہ بن ہی گئے ہیں لیکن چونکہ میری قوم عرب کی سب سے زیادہ زبردست قوم ہے اس لئے میں اس شرط پر آپ کی بیعت کرتا ہوں کہ آپ کے بعد میں عرب کا بادشاہ ہوں گا۔ رسول کریم

صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں اُس وقت کھجور کی ایک شاخ تھی۔ آپ نے مسیلمہ سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ تم تو یہ کہتے ہو کہ محمد رسول اللہ اگر اپنے بعد مجھے اپنا خلیفہ مقرر کر دیں تو مَیں ان کی بیعت کرنے کیلئے تیار ہوں لیکن مَیں تو خدا کے حکم کے خلاف یہ کھجور کی شاخ بھی تم کو دینے کے لئے تیار نہیں ہوں۔ اس پر وہ ناراض ہو کر چلا گیا۔ اور اپنی تمام قوم سمیت مخالفت پر آمادہ ہو گیا۔

تو مسیلمہ کذّاب نے بھی رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے بعد بادشاہت ملنے کی آرزو کی تھی۔ یہی حال عبد اللہ بن ابی ابن سلول کا تھا۔ چونکہ منافق اپنی موت کو ہمیشہ دُور سمجھتا ہے اور وہ دوسروں کی موت کے متعلق اندازے لگاتا رہتا ہے۔ اس لئے عبد اللہ بن ابی ابن سلول بھی اپنی موت کو دُور سمجھتا تھا اور وہ نہیں جانتا تھا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں ہی وہ ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرے گا۔ وہ یہ قیاس آرائیاں کرتا رہتا تھا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فوت ہوں تو میں عرب کا بادشاہ بنوں لیکن اب اُس نے دیکھا کہ ابوبکرؓ کی نیکی اور تقویٰ اور بڑائی مسلمانوں میں تسلیم کی جاتی ہے۔ جب رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نماز پڑھانے تشریف نہیں لاتے تو ابوبکرؓ آپ کی جگہ نماز پڑھاتے ہیں۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے کوئی فتویٰ پوچھنے کا موقعہ نہیں ملتا تو مسلمان ابوبکرؓ سے فتویٰ پوچھتے ہیں۔ یہ دیکھکر عبد اللہ بن ابی ابن سلول کو جو آئندہ کی بادشاہت ملنے کی اُمیدیں لگائے بیٹھا تھا سخت فکر لگا۔ اور اُس نے چاہا کہ اس کا ازالہ کرے۔ چنانچہ اسی امر کا ازالہ کرنے اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی شہرت اور آپ کی عظمت کو مسلمانوں کی نگاہوں سے گرانے کے لئے اُس نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر الزام لگا دیا تا حضرت عائشہؓ پر الزام لگنے کی وجہ سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت عائشہؓ سے نفرت پیدا ہو اور حضرت عائشہؓ سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نفرت کا یہ نتیجہ نکلے کہ حضرت ابوبکرؓ کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کی نگاہوں میں جو اعزاز حاصل ہے وہ کم ہو جائے اور اُن کے آئندہ خلیفہ بننے کا کوئی امکان نہ رہے۔ چنانچہ اسی امر کا اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں ذکر کرتا ہے اور فرماتا ہے اِنَّ الَّذِيْنَ جَآءُوْ بِالْاِفْكِ عُصْبَةٌ مِّنْكُمْ کہ وہ لوگ جنہوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر اتہام لگایا ہے وہ تم لوگوں میں سے ہی مسلمان کہلانے والا ایک جتھا ہے۔ مگر فرماتا ہے لَا تَحْسَبُوْهُ شَرًّا لَّكُمْ بَلْ هُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ تم یہ خیال مت کرو کہ یہ الزام کوئی بُرا نتیجہ پیدا کرے گا بلکہ یہ الزام بھی تمہاری بہتری اور ترقی کا موجب ہو جائیگا چنانچہ لو اب ہم خلافت کے متعلق اصول بھی بیان کر دیتے ہیں اور تم کو یہ بھی بتا دیتے ہیں کہ یہ منافق زور مار کر دیکھ لیں یہ ناکام رہیں گے۔ اور ہم خلافت کو قائم کر کے چھوڑینگے کیونکہ خلافت نبوت کا ایک جزو ہے اور الٰہی نور کے محفوظ رکھنے کا ایک ذریعہ ہے۔ پھر فرماتا ہے لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ مَّا اكْتَسَبَ مِنَ الْاِثْمِ۔ ان الزام لگانے والوں میں سے جیسی جیسی کسی نے کمائی کی ہے ویسا ہی عذاب اُسے مل جائیگا۔ چنانچہ جو لوگ الزام لگانے کی سازش میں شریک تھے انہیں اسّی اسّی کوڑے لگائے گئے۔ پھر فرمایا۔ وَالَّذِيْ تَوَلّٰى كِبْرَهٗ مِنْهُمْ لَهٗ عَذَابٌ عَظِيْمٌ۔ مگر ان میں سے ایک شخص جو سب سے بڑا شرارتی ہے اور جو اس تمام فتنہ کا بانی ہے یعنی عبد اللہ بن ابی ابن سلول اُسے نہ صرف ہم کوڑے لگوائیں گے بلکہ خود بھی عذاب دینگے۔ چنانچہ اس وعید کے مطابق اُسے کوڑوں کی سزا بھی دی گئی (سیرۃ الحلبیہ جلد ۲ صفحہ ۳۱۹) اور پھر اللہ تعالےٰ کی طرف سے بھی اُسے عذاب مل گیا۔ اور وہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں ہی ایڑیاں رگڑ رگڑ کر ہلاک ہو گیا اور حضرت ابوبکرؓ آپ کے بعد خلیفہ ہو گئے اس طرح یہ عذاب اُسے اس رنگ میں بھی ملا کہ غزوہ بنو مصطلق میں ایک معمولی سی بات پر جب انصار اور مہاجرین کا آپس میں جھگڑا ہو گیا تو عبد اللہ بن ابی ابن سلول جو ہمیشہ ایسے موقعوں

کی تاک میں رہتا تھا۔ اُس نے انصار کو بھڑکاتے ہوئے کہا کہ اے انصار! یہ تمہاری اپنی ہی غلطیوں کا نتیجہ ہے۔ تم نے مہاجرین کو پناہ دی اور اب وہ تمہارے سر چڑھ گئے ہیں۔ تم مجھے مدینہ پہنچنے دو۔ وہاں کا سب سے زیادہ معزز شخص یعنی وہ خود مدینہ کے سب سے زیادہ ذلیل آدمی یعنی (نعوذ باللہ) محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو وہاں سے نکال دیگا۔ عبداللہ بن ابی ابن سلول کا بیٹا ایک نہایت ہی مخلص نوجوان تھا۔ اُس نے یہ الفاظ سُنے تو وہ بےتاب ہوگیا اور وہ بھاگتے ہوئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچا اور کہنے لگا۔ یا رسول اللہ! میرے باپ نے ایسی ایسی بات کہی ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اِن الفاظ کی سزا موت کے سوا اور کوئی نہیں ہوسکتی۔ میں صرف اتنی درخواست کرنا چاہتا ہوں کہ اگر آپ میرے باپ کے قتل کا حکم دیں تو یہ حکم کسی اَور کو نہ دیں بلکہ خود مجھے دیں تا ایسا نہ ہو کہ کوئی اور شخص اُسے قتل کردے تو بعد میں کسی وقت اُسے دیکھکر مجھے جوش آجائے اور میں اُس پر حملہ کر بیٹھوں۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ہم اُسے کوئی سزا نہیں دینا چاہتے ہم تمہارے باپ سے نرمی اور احسان کا ہی معاملہ کرینگے۔ اب گو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے اُسے کوئی سزا نہ دی مگر اس کے بیٹے کا دل اِس غم سے کباب ہو رہا تھا کہ میرے باپ نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق ایسے گندے اور ناپاک الفاظ کیوں استعمال کئے۔ اور اُس نے فیصلہ کرلیا کہ وہ اپنے باپ سے اس کا انتقام لیگا۔ چنانچہ جب اسلامی لشکر مدینہ کے قریب پہنچا۔ تو اس کا بیٹا جلدی سے آگے بڑھا اور مدینہ کے دروازہ پر تلوار ہاتھ میں لے کر کھڑا ہوگیا اور اپنے باپ سے کہنے لگا کہ خدا کی قسم! میں تمہیں اُس وقت تک شہر میں داخل نہیں ہونے دوں گا جب تک تم اِس بات کا اقرار نہ کرو کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم مدینہ کے سب سے زیادہ معزز شخص ہیں اور میں مدینہ کا ذلیل ترین انسان ہوں۔ اور اگر تُونے اِس بات کا اقرار نہ کیا تو میں اسی تلوار سے تیرے ٹکڑے ٹکڑے کردونگا۔ عبداللہ بن ابی ابن سلول نے اپنے بیٹے کی زبان سے یہ بات سُنی تو وہ گھبرا گیا اور اُس نے مدینہ کے دروازہ میں کھڑے ہو کر کہا۔ کہ اے لوگو! سُن لو میں اس امر کا اقرار کرتا ہوں کہ میں مدینہ کا سب سے زیادہ ذلیل انسان ہوں اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ کے سب سے زیادہ معزز انسان ہیں جب اُس نے یہ بات کہی تب اس کے بیٹے نے اُسکا راستہ چھوڑا اور اُسے شہر میں داخل ہونے دیا۔ غرض یہ بھی ایک عذاب تھا جو خدا تعالیٰ نے خود اس کے بیٹے کے ذریعہ اُسے دیا۔

اس الزام کا ذکر کرنے اور عبداللہ بن ابی ابن سلول کی اِس شرارت کو بیان کرنے کے بعد کہ اُس نے خلافت میں رخنہ اندازی کرنے کے لئے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر الزام لگایا تھا اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ مَثَلُ نُوْرِهٖ كَمِشْكٰوةٍ فِيْهَا مِصْبَاحٌ اَلْمِصْبَاحُ فِيْ زُجَاجَةٍ اَلزُّجَاجَةُ كَاَنَّهَا كَوْكَبٌ دُرِّيٌّ۔ اللہ تعالیٰ آسمانوں اور زمین کا نور ہے مگر اُس کے نور کو مکمل کرنیکا ذریعہ نبوت ہے اور اُس کے بعد اس کو دنیا میں پھیلانے اور اُسے زیادہ سے زیادہ عرصہ تک قائم رکھنے کا اگر کوئی ذریعہ ہے تو وہ خلافت ہی ہے۔ گویا نبوت ایک چمنی ہے جو اس کو آندھیوں سے محفوظ رکھتی ہے اور خلافت ایک ری فلیکٹر ہے جو اس کے نور کو دُور تک پھیلاتا ہے۔ پس اِن منافقوں کی تدبیروں کی وجہ سے ہم اس عظیم الشان ذریعہ کو تباہ نہیں ہونے دیں گے بلکہ اپنے نور کو دیر تک دنیا میں قائم رکھنے کے لئے اس سامان کو مہیا کریں گے۔

اِس بات کا مزید ثبوت کہ اس آیت میں جس

نور کا ذکر ہے وہ نورِ خلافت ہی ہے۔ اس سے اگلی
آیتوں میں ملتا ہے جہاں اللہ تعالیٰ اس سوال کا جواب
دیتا ہے کہ یہ نور کہاں ہے۔ فرماتا ہے فِيْ بُيُوْتٍ
یہ نورِ خلافت چند گھروں میں پایا جاتا ہے۔ نورِ نبوت
تو صرف ایک گھر میں تھا مگر نورِ خلافت ایک گھر میں
نہیں بلکہ فِيْ بُيُوْتٍ چند گھروں میں ہے۔ پھر فرماتا
ہے اَذِنَ اللّٰهُ اَنْ تُرْفَعَ۔ وہ گھر ابھی چھوٹے
سمجھے جاتے ہیں مگر خدا تعالیٰ نے یہ فیصلہ کر دیا ہے کہ
وہ ان گھروں کو اونچا کرے کیونکہ نبوت کے بعد خلافت
اس خاندان کو بھی اونچا کر دیتی ہے جس میں سے کوئی
شخص منصب خلافت حاصل کرتا ہے۔ اس آیت نے
بتا دیا کہ اس جگہ اللہ تعالیٰ کا مقصد نورِ خلافت کو
بیان کرنا ہے اور یہ بتانا مدنظر ہے کہ نورِ خلافت نورِ نبوت
اور نورِ الوہیت کے ساتھ کلی طور پر وابستہ ہے اور
اس کو مٹانا دوسرے دونوں نوروں کو مٹانا ہے پس ہم
اسے مٹنے نہیں دیں گے اور اس نور کو ہم کئی گھروں کے
ذریعہ سے ظاہر کریں گے تا نورِ نبوت کا زمانہ اور اس کے ذریعہ
سے نورِ الٰہیہ کے ظہور کا زمانہ لمبا ہو جائے۔ چنانچہ خلافت
پہلے حضرت ابوبکرؓ کے پاس گئی پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ
کے پاس گئی پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس گئی
پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس گئی۔ کیونکہ خدا نے
یہ فیصلہ کر دیا تھا کہ ان بیوت کو اونچا کرے۔ تُرْفَعَ
کے لفظ نے یہ بھی بتا دیا کہ الزام لگانے والوں کی اصل
غرض یہ ہے کہ وہ ان لوگوں کو نیچا کریں اور انہیں لوگوں
کی نگاہ میں ذلیل کریں مگر خدا تعالیٰ کا یہ فیصلہ ہے کہ
وہ ان کو اونچا کرے۔ اور جب خدا انہیں عزت دینا
چاہتا ہے تو پھر کسی کے الزام لگانے سے کیا بنتا ہے۔
اب دیکھو سورۂ نور کے شروع سے لے کر
اس کے آخر تک کس طرح ایک ہی مضمون بیان کیا گیا
ہے۔ پہلے اس الزام کا ذکر کیا جو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا
پر لگایا گیا تھا اور چونکہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر
الزام لگانے کی اصل غرض یہ تھی کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ
کو رسوا کیا جائے اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے
ان کے جو تعلقات ہیں ان میں بگاڑ پیدا کیا جائے۔ اور
اس کے نتیجہ میں مسلمانوں کی نگاہ میں ان کی عزت کم
ہو جائے اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے
بعد وہ خلیفہ نہ ہو سکیں کیونکہ عبداللہ بن ابی ابن سلول
یہ بھانپ گیا تھا کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے بعد
مسلمانوں کی نگاہ اگر کسی پر اٹھتی ہے تو وہ ابوبکرؓ ہی ہے
اور اگر ابوبکرؓ کے ذریعہ سے خلافت قائم ہو گئی تو عبداللہ
بن ابی ابن سلول کی بادشاہی کے خواب کبھی پورے نہیں ہونگے
اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس الزام کے معًا بعد خلافت
کا ذکر کیا اور فرمایا کہ خلافت بادشاہت نہیں وہ تو
نورِ الٰہی کے قائم رکھنے کا ایک ذریعہ ہے اس لئے اسکا
قیام اللہ تعالیٰ نے اپنے ہاتھ میں رکھا ہے۔ اس کا
ضائع ہونا نورِ نبوت اور نورِ الوہیت کا ضائع ہونا
ہے۔ پس وہ اس نور کو ضرور قائم کرے گا۔ اور جسے
چاہے گا خلیفہ بنائے گا۔ بلکہ وہ وعدہ کرتا ہے کہ
مسلمانوں میں سے ایک نہیں بلکہ متعدد لوگوں کو خلافت
پر قائم کرکے اس نور کے زمانہ کو لمبا کر دے گا۔ تم اگر
الزام لگانا چاہتے ہو تو بے شک لگاؤ۔ نہ تم خلافت
کو مٹا سکتے ہو۔ نہ ابوبکرؓ کو خلافت سے محروم کر سکتے
ہو۔ کیونکہ خلافت ایک نور ہے جو نورُ اللہ کے ظہور
کا ایک ذریعہ ہے اس کو انسان اپنی تدبیروں سے کہاں
مٹا سکتا ہے۔

دیکھو اس تشریح کے ساتھ سورۂ نور کی تمام
آیتوں کا آپس میں کس طرح ربط قائم ہو جاتا ہے اور
کس طرح پہلے چار رکوعوں کے مضمون کا اَللّٰهُ نُوْرُ

فِيْ بُيُوْتٍ اَذِنَ اللّٰهُ اَنْ تُرْفَعَ وَيُذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ

یہ (دیئے) ایسے گھروں میں ہیں جن کے اونچا کئے جانے کا خدا نے حکم دیدیا ہے - اور اُن میں خدا کا نام لیا جاتا ہے

يُسَبِّحُ لَهٗ فِيْهَا بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ ۝۳۷ رِجَالٌ ۙ لَّا

(اور) اُن میں اس کی تسبیح کی جاتی ہے دن کے وقتوں میں بھی اور شام کے وقتوں میں بھی - (یہ ذکر کرنیوالے) کچھ مرد ہیں

تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَاِقَامِ

جن کو اللہ کے ذکر سے اور نماز کے قائم کرنے سے اور زکوٰۃ کے

الصَّلٰوةِ وَاِيْتَآءِ الزَّكٰوةِ ۙ يَخَافُوْنَ يَوْمًا تَتَقَلَّبُ فِيْهِ

دینے سے نہ تجارت اور نہ سودا بیچنا غافل کرتا ہے - وہ اس دن سے ڈرتے ہیں جس میں دل اُلٹ جائیں گے

السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اور اس کے بعد کی آیتوں کے ساتھ ربط قائم ہوجاتا ہے اور ساری سورۃ کے مطالب آئینہ کی طرح سامنے آجاتے ہیں۔

پس خلافت ایک الٰہی انعام ہے - کوئی نہیں جو اس میں روک بن سکے - وہ خدا تعالےٰ کے نور کے قیام کا ایک ذریعہ ہے - جو اس کو مٹانا چاہتا ہے وہ اللہ تعالےٰ کے نور کو مٹانا چاہتا ہے - ہاں وہ ایک وعدہ ہے جو پورا تو ضرور کیا جاتا ہے لیکن اس کے زمانہ کی لمبائی مومنوں کے اخلاص کے ساتھ وابستہ ہے۔

پھر فرماتا ہے - لَا شَرْقِيَّةٍ وَّلَا غَرْبِيَّةٍ ۔ وہ نہ شرقی ہے نہ غربی - شرقی درخت اس کو کہتے ہیں جس پر سورج صرف مشرق کی طرف سے پڑتا ہو اور مغرب کی طرف سے کسی دیوار یا درختوں کی اوٹ کی وجہ سے نہ پڑتا ہو - اور غربی اس کو کہتے ہیں جس پر سورج صرف مغرب کی طرف سے پڑتا ہو مشرق کی طرف سے نہ پڑتا ہو - اس میں ایک بات تو یہ بتائی کہ اسلامی شریعت ایک عالمگیر تعلیم کی حامل ہے - وہ نہ مشرقی لوگوں سے مخصوص ہے اور نہ مغربی لوگوں سے بلکہ ہر قوم اور ہر زمانہ کے لئے ہے اور تمام بنی نوع انسان کے لئے اس میں ترقیات کے دروازے کھلے ہیں - پس دنیا اسی صورت میں امن رہ سکتی ہے جب وہ قرآنی تعلیم پر عمل کرے - دوسرے اس میں اس طرف بھی اشارہ فرمایا کہ انتخابِ خلافت میں مشرق و مغرب کا خیال نہیں رکھنا چاہیئے - بلکہ مسلمانوں میں سے جو شخص لائق ہو اس کو خلیفہ بنانا چاہیئے۔

يَكَادُ زَيْتُهَا يُضِيْٓءُ وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ - پھر اس کا تیل ایسا بھڑکنے والا ہے کہ آگ کے بغیر بھی بھڑک سکتا ہے - مگر اس کو آگ دکھا دی جائے تو نُوْرٌ عَلٰى نُوْرٍ ہو جاتا ہے - یعنی وہ تعلیم ایسی کامل ہے کہ فطرتِ صحیحہ اسکو قبول کرنے کے لئے خود ہی اس کی طرف دوڑتی ہے لیکن اگر خدا تعالےٰ کا کوئی ہادی بھی ظاہر ہو جائے اور الہام الٰہی کی آگ بھی اُسے چھو جائے تو پھر تو فطرتِ صحیحہ اس شریعت کے ساتھ مل کر اور نبی کی صحبت کی گرمی پا کر دُنیا کو

الْقُلُوْبُ وَالْاَبْصَارُ ۙ لِيَجْزِيَهُمُ اللّٰهُ اَحْسَنَ مَا عَمِلُوْا

اور آنکھیں پلٹ جائینگی۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ اللہ (تعالیٰ) اُن کو ان کے اعمال کی بہتر سے بہتر جزا دے گا۔

وَيَزِيْدَهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ؕ وَاللّٰهُ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿۳۹﴾

اور انکو اپنے فضل سے (مال اور اولاد میں) بڑھا دیگا۔ اور اللہ (تعالیٰ) جس کو چاہتا ہے بغیر حساب کے رزق دیتا ہے ۲۵ع

روشن کر دیتی ہے۔ مگر فرماتا ہے۔ یہ نور انسانی محنت سے نہیں ملتا بلکہ خدا تعالیٰ کے فضل سے ملتا ہے اور وہ جس کو چاہتا ہے دیتا ہے اور اللہ تعالیٰ لوگوں کے فائدہ کے لئے ہمیشہ اپنے دین کی تفاصیل بیان کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ ہر ایک بات کو خوب جانتا ہے۔

۲۵ع حلِ لغات

:۔ اَلْغُدُوُّ: اَلْغُدْوَةُ کی جمع ہے اور اَلْغُدْوَةُ کے معنے ہیں اَلْبُكْرَةُ۔ صبح۔ اس طرح الغدُ مصدر بھی ہے جس کے معنے صبح کرنے کے ہیں۔ (اقرب)

اٰلْاٰصَال: اٰلْاَصِيْلُ کی جمع ہے اور اَلْاَصِيْلُ کے معنے ہیں۔ وَقْتٌ مَا بَعْدَ الْعَصْرِ اِلَى الْمَغْرِبِ وہ وقت جو عصر سے لیکر مغرب تک ہوتا ہے۔ (اقرب)

تفسیر:۔ فرماتا ہے۔ یہ نور اس وقت ایسے گھروں میں ہے (یعنی مسلمانوں کے گھروں میں) جن کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فیصلہ فرما دیا ہے کہ انکو بلند کیا جائے۔ بلند کرنے کے یہ معنے نہیں کہ اُن کو اُٹھا کر ہوا میں معلق کر دیا جائے گا۔ بلکہ اس کے یہ معنے ہیں کہ اُن کے درجات کو بلند کیا جائیگا اور انہیں غیر معمولی عزت اور لازوال شہرت عطا کی جائیگی۔ مگر تعجب ہے کہ جب رفع کا لفظ حضرت مسیح ناصریؑ کے متعلق آجائے تو اس کے یہ معنے کر لئے جاتے ہیں کہ خدا تعالیٰ نے انہیں زندہ بجسدِ عنصری آسمان پر اُٹھا لیا۔ حالانکہ یہاں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ کے گھروں کے متعلق وہی لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ مگر کوئی شخص نہیں کہتا کہ اُن کے گھروں کو اُٹھا کر آسمان پر لے جایا گیا تھا یا انہیں ہوا میں معلق کر دیا گیا تھا۔ ہر شخص مانتا ہے کہ یہاں درجات کی بلندی مراد ہے۔ اسی طرح حضرت مسیحؑ کے متعلق بھی یہی معنے لئے جائیں گے۔ کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں عزت دی اور اُس لعنتی موت سے انہیں بچا لیا جس کا یہود انہیں شکار بنانا چاہتے تھے۔

اَلْغُدُوّ

يُسَبِّحُ لَهٗ فِيْهَا بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ۔ اسجگہ غدوّ سے مراد وقت الغدو یعنی صبح کرنے کا وقت ہے اور چونکہ صبح کی نماز ایک ہی ہوتی ہے۔ اس لئے یہاں وقت الغدو کے معنے ہی چسپاں ہوتے ہیں۔ اسکے مقابلہ میں آصال کا لفظ رکھا گیا ہے۔

اٰلْاٰصَال

کیونکہ شام کی کئی نمازیں ہوتی ہیں۔ ظہر بھی زوال کے بعد پڑھی جاتی ہے اور عصر، مغرب اور عشاء کی نمازیں بھی شام ہی کے قریب ہوتی ہیں۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے شام کے لئے آصال کا لفظ رکھا۔

رِجَالٌ لَّا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَاِقَامِ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَآءِ الزَّكٰوةِ میں بتایا کہ ان لوگوں کے ذکر الٰہی میں مشغول رہنے کے یہ معنے نہیں کہ وہ زراعت نہیں کرتے یا کوئی اور دنیوی کام نہیں کرتے بلکہ مطلب یہ ہے کہ وہ تجارتیں تو کرتے ہیں مگر اُن کے دل خدا تعالیٰ کے ذکر میں مشغول ہوتے ہیں اور اُن کے کان خدا تعالیٰ کی آواز سُننے کے منتظر ہوتے ہیں۔ جونہی اُن کے کانوں میں مؤذن کی آواز آتی ہے وہ اپنی تجارت کو چھوڑ کر۔ اپنی زراعت کو چھوڑ کر اور اپنی صنعت و حرفت کو چھوڑ کر دوڑتے ہوئے مسجد میں حاضر ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح

جب رات آتی ہے تو یہ نہیں ہوتا کہ وہ اس خیال سے کہ دن
کو ہم نے ہل چلانا ہے یا کوئی اور مشقت کا کام کرنا ہے سوئے
ہی رہیں اور اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لئے نہ اٹھیں۔ بلکہ
جب تہجد کا وقت آتا ہے تو وہ فوراً بستر سے الگ ہو جاتے
ہیں اور اللہ تعالیٰ کے ذکر اور اس کی عبادت کیلئے کھڑے
ہو جاتے ہیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ دین کے لئے
ان لوگوں کی بھی ضرورت ہوتی ہے جو اپنے آپ کو کلیتہً
خدمت کے لئے وقف کر دیں مگر وہ شخص بھی ایک رنگ
میں واقفِ زندگی ہے جس کے تمام اوقات خدا تعالیٰ
کے منشاء کے ماتحت گذرتے ہیں اور وہ ہر آن اور ہر گھڑی
خدا تعالیٰ کے حکم پر لبیک کہنے کے لئے تیار رہتا ہے
اگر وہ تجارت کرتا ہے تو اس لئے کہ خدا نے کہا ہے تجارت
کرو۔ اگر وہ زراعت کرتا ہے تو اس لئے کہ خدا نے
کہا ہے زراعت کرو۔ اگر وہ کسی اور پیشہ کی طرف
توجہ کرتا ہے تو اس لئے کہ خدا نے کہا ہے کہ تم پیشوں
کی طرف متوجہ ہو۔ پس اس کی تجارت اُس کی زراعت
اور اُس کی صنعت لَا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ
ذِكْرِ اللّٰهِ کی مصداق ہوتی ہے جو خدا تعالیٰ کے ذکر سے
اُسے غافل نہیں کرتی۔ یہ نہیں کہ خدا تعالیٰ کی طرف سے
آواز آئے اور وہ کہنے لگ جائے کہ میں کیا کروں میری
تجارت کو نقصان پہنچیگا۔ میری زراعت میں حرج واقع
ہو گا۔ بلکہ اُسے اللہ تعالیٰ کی آواز پر لبیک کہنے کے سوا
اور کچھ سوجھتا ہی نہیں۔ وہ جانتا ہی نہیں کہ میں تاجر ہوں
وہ جانتا ہی نہیں کہ میں زمیندار ہوں۔ وہ جانتا ہی نہیں
کہ میں صناع ہوں بلکہ وہ سمجھتا ہے کہ میں ساری عمر ہی
خدا تعالیٰ کے سپاہیوں میں شامل رہا ہوں اور اسکی تنخواہ
کھاتا رہا ہوں اور اب وقت آگیا ہے کہ میں حاضر ہو
جاؤں۔ اور اپنی جان اس کی راہ میں قربان کر دوں پس باوجود
تجارت کرنے کے وہ واقفِ زندگی ہے۔ باوجود زراعت
کرنے کے وہ واقفِ زندگی ہے اور باوجود کوئی اور پیشہ
اختیار کرنے کے وہ واقفِ زندگی ہے۔ مگر جو شخص ایسا
نہیں کرتا۔ جس کے کانوں میں خدا تعالیٰ کی یا اُس کے مقرر کردہ
کسی نائب کی آواز آتی ہے اور بجائے اس کے کہ وہ اپنے
دل میں بشاشت محسوس کرے اور کہے کہ وہ وقت آگیا
ہے جس کا میں منتظر تھا وہ اپنے دل میں قبض محسوس کرتا
ہے اور قربانی کرنے سے ہچکچاتا ہے اور اسے اپنے لئے ایک
تکلیف اور دُکھ سمجھتا ہے تو ایسا انسان درحقیقت خدا
تعالیٰ کی فوج میں شامل نہیں۔ اس حقیقت کو انسان پر
ظاہر کرنے کے لئے خدا تعالیٰ نے پانچ نمازیں مقرر کی ہیں۔
ہر روز پانچ وقت خدا تعالیٰ تمہارا امتحان لیتا اور پانچوقت
تمہارے ایمان کی حقیقت تم پر آشکار کرتا ہے۔ پانچ وقت
جب مکبّر کھڑا ہوتا اور کہتا ہے حَيَّ عَلَى الصَّلٰوةِ
حَيَّ عَلَى الصَّلٰوةِ۔ اے لوگو آؤ نماز کی طرف۔ اے لوگو
آؤ نماز کی طرف۔ تو اگر تمہارے ہاتھوں پر اُس وقت لرزہ
طاری ہو جاتا ہے۔ تمہارے جسم میں کپکپی پیدا ہو جاتی ہے
اور تمہیں بھول جاتا ہے کہ تم تاجر ہو۔ تمہیں بھول جاتا ہے
کہ تم زمیندار ہو۔ تمہیں بھول جاتا ہے کہ تم صناع ہو۔
تمہیں بھول جاتا ہے کہ تم ملازم ہو۔ تمہیں بھول جاتا ہے
کہ تم نجار ہو۔ تمہیں بھول جاتا ہے کہ تم معمار ہو۔ تمہیں
بھول جاتا ہے کہ تم لوہار ہو۔ تمہیں صرف ایک ہی بات
یاد رہ جاتی ہے اور وہ یہ کہ تم خدا کے سپاہی ہو تب
اور صرف تب تم اپنے دعوئے ایمان میں سچے سمجھے جا سکتے
ہو۔ لیکن اگر تمہارے اندر یہ کیفیت پیدا نہیں ہوتی اور
خدا تعالیٰ کی آواز تو تمہیں یہ کہتی ہے کہ حَيَّ عَلَى الصَّلٰوةِ
اے میرے بندو میری عبادت کے لئے آؤ اور تمہارا نفس
تمہیں کہہ رہا ہوتا ہے کہ دو گاہک اور دیکھ لوں اور چند پیسے
کما لوں۔ اور بعض دفعہ تو یہ بھی کہنے لگ جاتا ہے کہ مسجد
میں جا کر نماز کیا پڑھنی ہے اسی جگہ پڑھ لیں گے۔ بلکہ

کئی دفعہ واقعہ میں تم مسجد میں نہیں آتے اور گھر پر یا دوکان پر ہی نماز پڑھ لیتے ہو تو تم سمجھ لو کہ پانچ وقت خدا نے تمہارا امتحان لیا اور پانچوں وقت تم فیل ہو گئے۔

صحابہؓ کرام ذکر الٰہی میں ترقی کرنے کی اتنی کوشش کیا کرتے تھے کہ اُن کی یہ جد و جہد وارفتگی کی حد تک پہنچی ہوئی تھی۔ احادیث میں آتا ہے کہ ایک دفعہ غرباء رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انہوں نے عرض کیا کہ جس طرح ہم نمازیں پڑھتے ہیں اسی طرح امراء نمازیں پڑھتے ہیں جس طرح ہم روزے رکھتے ہیں اسی طرح امراء روزے رکھتے ہیں جس طرح ہم حج کرتے ہیں اسی طرح امراء حج کرتے ہیں مگر یا رسول اللہ ہم زکوٰۃ اور صدقہ و خیرات اور چندے وغیرہ نہیں دے سکتے۔ اس وجہ سے وہ نیکی کے میدان میں ہم سے آگے بڑھے ہوئے ہیں۔ کوئی ایسی ترکیب بتائیں کہ امراء ہم سے آگے نہ بڑھ سکیں۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ بہت اچھا۔ میں تمہیں ایک ایسی ترکیب بتاتا ہوں کہ اگر تم اس پر عمل کرو تو تم پانچ سو سال پہلے جنت میں داخل ہو سکتے ہو انہوں نے عرض کیا کہ وہ کیا ہے۔ آپ نے فرمایا۔ وہ ترکیب یہ ہے کہ ہر فرض نماز کے بعد ۳۳ دفعہ سبحان اللہ ۳۳ دفعہ الحمد للہ اور ۳۴ دفعہ اللہ اکبر کہہ لیا کرو۔ وہ وہاں سے بڑے خوش خوش اُٹھے اور انہوں نے سمجھا کہ ہم نے میدان مار لیا۔ مگر کچھ دنوں کے بعد پھر وہی وفد رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور اُس نے عرض کیا کہ ہم پر بڑا ظلم ہوا ہے۔ آپ نے فرمایا۔ کس طرح؟ انہوں نے عرض کیا کہ آپ نے جو بات ہمیں اُس روز بتائی تھی وہ کسی طرح امیروں کو بھی پہنچ گئی ہے اور اب انہوں نے بھی یہ ذکر شروع کر دیا ہے۔ اب ہم کیا کریں۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر نیکی حاصل کرنے کا اُن کے دلوں میں اس قدر جوش پایا جاتا ہے تو میں انہیں کس طرح روک سکتا ہوں۔

یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ اس آیت میں تجارت اور بیع دونوں کا الگ الگ ذکر کیا گیا ہے۔ حالانکہ کوئی تجارت بغیر بیع کے نہیں ہو سکتی۔ درحقیقت اُس میں حکمت یہ ہے کہ بعض کاموں میں دونوں جہت یعنی خرید و فروخت سے انسان نفع کماتا ہے اور بعض کام ایسے ہوتے ہیں جن میں انسان کوئی چیز خریدتا نہیں صرف فروخت کرتا ہے۔ پس وہ چیز جس میں انسان خرید و فروخت سے نفع کماتا ہے اُسے تو تجارت کہا گیا ہے۔ اور جس میں انسان کوئی چیز خریدتا نہیں صرف فروخت کرتا ہے۔ اُسے بیع قرار دیا گیا ہے۔ جیسے زمیندار یا صنّاع ہے کہ جو چیز وہ فروخت کرتا ہے وہ اُس کی اپنی پیداوار ہوتی ہے پس اُس کا کام درحقیقت فروخت کا ہے خرید کا نہیں۔ اِس لئے اس کا تجارت سے الگ ذکر کیا گیا ہے۔ گویا بتایا کہ ہر قسم کی تجارت خواہ وہ ملکی ہو یا درآمد و برآمد سے تعلق رکھنے والی ہو۔ اسی طرح زمیندارہ و صنعت و حرفت کے کارخانے نہ انہیں نمازوں کی ادائیگی سے غافل کرتے ہیں اور نہ زکوٰۃ کی ادائیگی سے اُن کی توجہ پھراتے ہیں وہ دنیا میں رہ کر تجارت بھی کرتے ہیں زراعت بھی کرتے ہیں۔ ملازمت بھی کرتے ہیں۔ مگر پھر وہ آسمان پر بھی ہوتے ہیں۔ کیونکہ ان کا دل خدا تعالیٰ کی طرف لگا ہوا ہوتا ہے اور وہ اس دن سے ڈرتے ہیں جس دن اُن کے دل اور اُن کی آنکھیں پھری ہوئی ہونگی اور وہ گھبرائے ہوئے اِدھر اُدھر دوڑ رہے ہونگے۔ نادان انسان جب اُن کے پاس مال دیکھتا ہے تو سمجھتا ہے کہ شاید اُن کے دل میں مال کی بڑی محبت ہے مگر اُن کے آسمانی ہونے کی یہ دلیل ہوتی ہے کہ جب بھی انہیں خدا تعالیٰ کی طرف سے کوئی آواز آتی ہے وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اس کی طرف دوڑ پڑتے ہیں اور اس طرح اپنے عمل سے ثابت کر دیتے ہیں

کہ ان کا اصل مقصود خدا تعالیٰ کی ذات ہے اور اُن کی دُنیا دین کے راستہ میں روک نہیں بلکہ وہ دنیا اس لئے کماتے ہیں تاکہ وہ دین کی زیادہ دلجمعی اور اطمینان کے ساتھ خدمت کرسکیں۔

یہ امر بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ دنیا میں مختلف مذہبی جماعتیں اپنی ترقی کی نسبت تین قسم کے خیالات رکھتی ہیں۔

(۱) بعض جماعتوں کا یہ خیال ہے کہ مذہب نام اِس بات کا ہے کہ دنیا کو چھوڑ دیا جائے اور کلّی طور پر تمام افراد اپنے تمام اوقات دینی کاموں میں مشغول رکھیں۔ ایسی جماعتیں یا تو دنیا میں صرف تصوف کا ایک سلسلہ ہو کر رہ گئی ہیں اور یا پھر وہ اپنی بات پر عمل نہیں کرسکیں۔ بہت سے سادھو اور فقیر دنیا میں ایسے نظر آتے ہیں۔ جو اس قسم کی تعلیم دیتے ہیں کہ دنیا کمانی نہیں چاہیئے۔ کارخانوں کو جاری نہیں کرنا چاہیئے۔ تجارتوں میں مشغول نہیں ہونا چاہیئے۔ زمیندارہ کام کی طرف توجہ نہیں کرنی چاہیئے۔ بلکہ ان تمام کاموں کو چھوڑ کر صرف خدا کی یاد اور اُس کی محبت میں اپنی عمر گذار دینی چاہیئے۔ مگر ایسی جماعتیں ہزاروں اور لاکھوں سے آگے کبھی نہیں بڑھیں کیونکہ وہ فطرتِ انسانی کے خلاف تعلیم دیتی ہیں۔ اور اگر کوئی جماعت باوجود اس تعلیم کے بڑھی ہے تو وہ اِس تعلیم کو پس پشت پھینک کر بڑھی ہے۔ اس پر عمل کرکے نہیں بڑھی۔ مثلاً حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف یہ بات منسوب کی جاتی ہے کہ انہوں نے ایک شخص سے کہا کہ تُو اپنا تمام مال و اسباب بیچ کر غریبوں کو دے دے (متی باب ۱۹ آیت ۲۱) یا کہا جاتا ہے کہ انہوں نے اپنے حواریوں سے یہ بات کہی کہ "اونٹ کا سوئی کے ناکہ میں سے نکل جانا اس سے آسان ہے کہ دولت مند خدا کی بادشاہت میں داخل ہو۔" (متی باب ۱۹ آیت ۲۴) اسی طرح انہوں نے ایک موقعہ پر اپنے حواریوں کو یہ تعلیم دی کہ

"اپنے واسطے زمین پر مال جمع نہ کرو جہاں کیڑا اور زنگ خراب کرتا ہے اور جہاں چور نقب لگاتے اور چُراتے ہیں۔ بلکہ اپنے لئے آسمان پر مال جمع کرو۔ جہاں نہ کیڑا خراب کرتا ہے نہ زنگ اور نہ وہاں چور نقب لگاتے اور چُراتے ہیں۔" (متی باب ۶ آیت ۱۹ و ۲۰)

یہ تعلیم ہے جو حضرت مسیح علیہ السلام نے دی اور جس کا موجودہ اناجیل میں ذکر آتا ہے۔ اب دیکھنے والی بات یہ ہے کہ بیشک عیسائی بڑھے اور انہوں نے دنیا میں خوب ترقی کی۔ لیکن کیا عیسائیوں کی ترقی اِس تعلیم پر عمل کرنے کے نتیجہ میں ہوئی یا اس تعلیم کو ردّ کرنے اور اس کو اپنی پیٹھ کے پیچھے پھینک دینے کے نتیجہ میں ہوئی۔ ہر شخص جو ذرا بھی عقل و فہم سے کام لے سمجھ سکتا ہے کہ عیسائیوں کی ترقی اس تعلیم کا نتیجہ نہیں بلکہ اس تعلیم سے مونہہ پھیر لینے کا نتیجہ ہے۔ بیشک دنیا میں سب سے زیادہ مال آج عیسائیوں کے پاس ہے دنیا میں سب سے زیادہ کارخانے آج عیسائیوں کے قبضہ میں ہیں۔ دنیا کی تجارتوں کا اکثر حصہ یورپین اقوام کے ہاتھ میں ہے۔ اسی طرح زراعت پر اُن کا قبضہ ہے۔ مختلف پیشوں اور فنون پر ان کا تسلّط ہے اور ہم تسلیم کرتے ہیں کہ عیسائیت نے ترقی کی مگر حضرت مسیحؑ کی طرف جو تعلیم منسوب کی جاتی تھی اُسے توڑ کر اور اُس کی خلاف ورزی کرکے انہوں نے ترقی کی ہے۔ اُس تعلیم پر عمل کرکے ترقی نہیں کی۔

(۲) پھر بعض قومیں ایسی ہیں جو کہتی ہیں کہ مذہب کو دولت کمانے کے ذرائع سے کوئی واسطہ نہیں۔ دین اور مذہب عقیدہ سے تعلق رکھنے والی چیز ہے۔ مذہب کا اس بات سے کیا تعلق ہے کہ ہم کیا کماتے ہیں کس طرح کماتے ہیں اور کن ذرائع سے کماتے ہیں۔ ایسی جماعتوں نے بیشک دنیا میں ترقی کی۔ مگر ان کا مذہب ایک مرجھائی ہوئی جھاڑی کی طرح رہ گیا۔ وہ جماعتیں بے شک دنیا میں بڑھیں۔

اور انہوں نے خوب ترقی کی۔ مگر اس نظریہ کا نتیجہ یہ ہوا کہ صرف دنیا ہی دنیا اُن کے پاس رہ گئی۔ دین اور مذہب کے ساتھ اُن کا کوئی تعلق نہ رہا۔

(۳) ان دونوں اصولوں کے خلاف اسلام نے ایک اَور تعلیم بنی نوع انسان کے سامنے پیش کی ہے۔ اور وہ یہ کہ اسلام کہتا ہے۔ ہم دنیا کمانے سے تمہیں منع نہیں کرتے بلکہ قرآن کریم وہ کتاب ہے جس میں مال کا نام فضل اللہ رکھا گیا ہے (سورۃ جمعہ ع ۲) اور بتایا گیا ہے کہ مال و دولت کا میسّر آنا بھی اللہ تعالیٰ کے فضلوں میں سے ایک فضل اور اس کے انعامات میں سے ایک بہت بڑا انعام ہے۔

اگر اسلام تجارت اور صنعت و حرفت سے منع کرتا تو اس کے معنے یہ ہوتے کہ اسلام اس امر کو روا رکھتا ہے کہ دنیا کا ایک حصہ تو اسلام میں داخل ہو لیکن دوسرا حصہ بے شک داخل نہ ہو۔ مثلاً جہاز رانی دنیا کی تجارت کا ایک اہم ترین شعبہ ہے۔ اگر جہاز بنانے اور جہاز چلانے اسلام کے نزدیک منع ہوتے تو پھر دو صورتوں میں سے ایک صورت ضرور ہوتی۔ یا تو سفر منقطع ہو جاتے اور دنیا کی تہذیب اور ان کے تمدّن پر ایک کاری ضرب پڑتی۔ اور یا پھر اس بات کو تسلیم کرنا پڑتا کہ جو لوگ جہاز بناتے اور جہاز چلاتے ہیں وہ بیشک مسلمان نہ ہوں۔ ہندو یا عیسائی یا سکھ ہی رہیں کیونکہ اگر وہ اسلام میں داخل ہوئے تو انہیں اس کام سے دست بردار ہونا پڑے گا۔ مگر یہ بات بھی عقل کے خلاف ہے اور دیدہ و دانستہ دنیا کے ایک طبقہ کو اسلام سے محروم رکھنا ہے جس کی اسلام اجازت نہیں دیتا۔ یا مثلاً کان کنی ایک ایسی چیز ہے جس سے حکومت کو بہت بڑی طاقت حاصل ہوتی ہے۔ اگر اسلام روپیہ کمانے سے بنی نوع انسان کو منع کرتا تو وہ یہ حکم دے دیتا کہ تم نے کان کنی نہیں کرنی کیونکہ اگر کان کنی کروگے تو تمہیں روپیہ حاصل ہوگا۔ اور یا پھر یہ کہا جاتا کہ دنیا میں جس قدر کانوں کے مالک ہیں وہ بے شک مسلمان نہ ہوں اور یا پھر یہ حکم دیا جاتا کہ کانوں کا کھودنا ہی بند کر دیا جائے تاکہ دین کو کوئی نقصان نہ پہنچے۔ یا مثلاً غیر ملکوں سے مال کا لانا ہے۔ یہ ایک بڑی فائدہ بخش تجارت ہے اور کروڑوں روپیہ اس تجارت کے ذریعہ کمایا جا سکتا ہے مگر یہ کام بڑے بڑے تاجر ہی کر سکتے ہیں۔ دس بیس چالیس یا پچاس ہزار روپیہ سرمایہ بھی اگر کسی شخص کے پاس ہو تو وہ یہ کام نہیں کر سکتا اور نہ اتنے معمولی سرمایہ سے وہ انگلستان سے یا امریکہ سے یا فرانس سے یا چین سے یا جاپان سے بڑی مقدار میں مال منگوا سکتا ہے۔ کیونکہ غیر ملکوں سے تمام مال جہازوں کے ذریعہ سے آتا ہے اور کوئی معمولی تاجر اس قسم کی تجارت میں ہاتھ نہیں ڈال سکتا۔ لازماً ایسے ہی تاجر انگلستان سے مال منگوائیں گے یا امریکہ سے مال منگوائیں گے یا فرانس اور جاپان وغیرہ سے مال منگوائیں گے یا جرمنی سے مال منگوائیں گے جن کے پاس دس بیس چالیس پچاس لاکھ روپیہ ہوگا بلکہ اس سے بھی بڑھ کر ایسے ہی تاجر اس میں حصہ لے سکتے ہیں جن کے پاس کروڑ کروڑ روپیہ ہو پس اگر اسلام روپیہ کمانے کی اجازت نہ دیتا تو دو ہی صورتیں ہو سکتی تھیں۔ یا تو یہ اعلان کر دیا جاتا کہ اس قسم کی تجارت کرنے والے بیشک مسلمان نہ ہوں وہ تجارتیں کرتے رہیں مگر اسلام قبول نہ کریں کیونکہ اسلام اس قسم کی تجارتوں سے منع کرتا ہے اور یا پھر یہ کہہ دیا جاتا کہ لوگ مسلمان بیشک ہو جائیں مگر اپنی تجارتیں بند کر دیں۔ آئندہ وہ کوئی مال ایک جگہ سے دوسری جگہ نہیں لے جا سکتے کیونکہ ہمارے مذہب میں یہ بات ناجائز ہے۔ لیکن یہ دونوں باتیں عقل کے خلاف ہیں۔ نہ تجارتوں کو بند کیا جا سکتا ہے اور نہ ان تجارتوں میں حصہ لینے والوں کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ بیشک ہندو یا سکھ یا عیسائی ہی رہیں اسلام میں داخل نہ ہوں۔ بہر حال دو صورتوں میں سے کسی ایک صورت کو

اختیار کئے بغیر ہمارے لئے کوئی چارہ نہیں ہوگا۔ اگر کارخانوں کا کوئی مالک ہمارے پاس مسلمان ہونے کے لئے آتا ہے تو یا تو اُسے یہ کہنا پڑے گا کہ تم اپنے کارخانے کو بند کر دو اور یا پھر اُسے یہ کہنا پڑے گا کہ چونکہ کارخانے کو بند کرنا دنیا کی مشکلات کو بڑھا دیتا ہے اس لئے بیشک تم مسلمان نہ بنو۔ ہندو یا سکھ یا عیسائی ہی رہو۔ یا موٹر کے کارخانے کی مثال لے لو۔ ایک ایک موٹر چار چار دس دس بیس بیس ہزار روپیہ میں آتا ہے اور موٹر کا کارخانہ وہی شخص کھول سکتا ہے جس کے پاس دس بیس کروڑ روپیہ موجود ہو۔ اگر اسلام دنیا کمانے کی اجازت نہ دیتا اور موٹروں کے کارخانہ کا کوئی مالک ہمارے پاس اسلام قبول کرنے کیلئے آتا تو یا تو ہم اُسے یہ کہتے کہ تم مسلمان نہ بنو کیونکہ اگر تم مسلمان بنے تو دنیا کو نقصان پہنچے گا اور تمہیں اپنا کارخانہ بند کر دینا پڑے گا۔ اور یا پھر ہم اُسے یہ کہتے کہ تم آئندہ موٹریں بنانی چھوڑ دو اور کارخانہ بند کر دو۔ مگر یہ دونوں صورتیں ایسی ہیں جو ناجائز ہیں۔ نہ اسلام ایک کو جائز قرار دیتا ہے نہ دوسری صورت کو درست تسلیم کرتا ہے۔ ان مشکلات کو اپنے سامنے رکھتے ہوئے ہمیں تسلیم کرنا پڑیگا کہ صنعت و حرفت اور تجارت کو روکا نہیں جا سکتا اور دوسری طرف قبولِ اسلام میں بھی کسی قسم کی دیوار حائل نہیں کی جا سکتی۔ اس لئے ضروری ہے کہ ان دونوں حالتوں کے درمیان کوئی راستہ تلاش کیا جائے جس سے یہ دونوں مشکلات دُور ہو جائیں۔ نہ دنیا کے تمدّن اور اُس کی تہذیب کو نقصان پہنچے اور نہ اسلام میں داخل ہونے سے کسی شخص کو روکا جا سکے۔ اسلام نے اِسی نظریہ کے ماتحت بعض قواعد تجویز کئے ہیں اور بتایا ہے کہ ہم لوگوں کو دنیا کمانے سے منع نہیں کرتے۔ وہ بے شک تجارت کریں وہ بیشک صنعت و حرفت اختیار کریں مگر اُن کے لئے ضروری ہے کہ وہ بعض قواعد کی پابندی اپنے اوپر لازم کر لیں تا کہ دین کو بھی کوئی نقصان نہ ہو۔ اور دنیا کی مشکلات میں بھی کوئی اضافہ نہ ہو۔ وہ ہدایتیں جو اسلام دنیا کمانے کے متعلق دیتا ہے یا مال و دولت اپنے پاس رکھنے والوں کے متعلق دیتا ہے اُن میں سے بعض تجارت اور صنعت کے ساتھ خاص طور پر تعلق رکھتی ہیں۔ اور بعض ایسی ہیں جو ہر ایسے شخص کے متعلق ہیں جس کے پاس کسی قسم کا بھی مال ہو خواہ اُس نے کسی اور ذریعہ سے ہی کیوں نہ کمایا ہو۔ چنانچہ اِس بارہ میں **پہلا قاعدہ** قرآن کریم میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ اگر مسلمان رہتے ہوئے لوگ مال کمانا چاہیں تو اُنکی حالت لَا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ کی مصداق ہونی چاہیئے۔ یعنی وہ بیشک تجارت کریں وہ بیشک بیع کریں مگر یہ چیزیں دین کے راستہ میں روک نہیں ہونی چاہئیں۔ اگر ایک شخص صنعت و حرفت کے ذریعہ مال کمانا چاہتا ہے تو اسلام کہتا ہے بیشک تم مال کماؤ اور بیشک صنعت و حرفت اختیار کرو۔ مگر دیکھو اس کے ساتھ ہی تمہیں پانچوں وقت نماز کے لئے مسجد میں آنا پڑیگا یا اگر ایک شخص تجارت کرنا چاہے تو اسلام کہیگا بیشک تجارت کرو مگر تمہیں پانچوقت روزانہ اپنی دوکان بند کر کے مسجد میں آنا پڑے گا۔ اسی طرح اگر تجارت اور صنعت و حرفت کرتے ہوئے روزوں کے ایام آ جاتے ہیں تو تمہارا فرض ہے کہ تم روزے رکھو۔ یہ نہ کہو کہ تجارت یا صنعت و حرفت میں مشغول رہنے کی وجہ سے روزے رکھنے ہمارے لئے مشکل ہیں۔ اگر یہ چیزیں نماز کے راستہ میں روک بنتی ہیں اگر یہ چیزیں روزوں کے راستہ میں روک بنتی ہیں اگر یہ چیزیں دوسرے دین کے کاموں میں روک بنتی ہیں تو اُس وقت تمہارا فرض ہے کہ اِن کاموں کو چھوڑ دو۔ اور اپنے دین کو خراب ہونے سے محفوظ رکھو۔ لیکن اگر یہ چیزیں دین کے راستہ میں روک نہیں تو پھر بیشک دنیا کماؤ۔ اسلام تمہیں اس سے منع نہیں کرتا۔

اِسی طرح ذکرِ الٰہی ہے۔ اسلام کہتا ہے کہ پانچ

نمازوں کے علاوہ اپنے اوقات میں سے کچھ وقت نکالکر علیحدگی میں خدا تعالیٰ کو یاد کیا کرو۔ اُس کی حمد کرو اُس کی تسبیح کرو۔ اُسکی بڑائی بیان کرو۔ اس کی صفات پر غور کرو۔ اپنے نفس کو احکام الٰہی کے تابع کرنے کی کوشش کرو۔ اور اپنے قلب کو ہر قسم کی کدورتوں اور میل کچیل سے صاف کر کے ایک ایسا مصفّٰی اور روشن آئینہ بناؤ جس میں خدا تعالیٰ کا چہرہ منعکس ہو جائے اور خدا تعالیٰ کی صفات کا ظہور تمہارے ذریعہ سے ہونے لگے اور اگر تم ایسا کرتے ہو تو بیشک تم اچھے لوہار بنو تاجر بنو اچھے صنّاع بنو اچھے کارخانہ دار بنو اور خوب مال کماؤ ہماری طرف سے اس میں کسی قسم کی روک نہیں کیونکہ تمہارے یہ کام ہمارے دین اور ہمارے ذکر میں حائل نہیں ہیں۔ پس پہلی شرط جس کو اسلام پیش کرتا ہے وہ وہی ہے جس کا اس آیت میں ذکر آتا ہے کہ رِجَالٌ لَا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ مومن بے شک تجارت بھی کرتے ہیں۔ خرید و فروخت بھی کرتے ہیں صنعت و حرفت بھی کرتے ہیں مگر اس کو ہمیشہ مدّنظر رکھتے ہیں کہ یہ چیزیں خدا تعالیٰ کے ذکر اور اس کے دین کی مدد میں روک بن کر حائل نہ ہو جائیں۔ پس ایک مومن اور غیر مومن میں یہ فرق ہے کہ مومن بھی تجارت کرتا ہے اور غیر مومن بھی تجارت کرتا ہے مومن بھی صنعت و حرفت اختیار کرتا ہے اور غیر مومن بھی صنعت و حرفت اختیار کرتا ہے مگر غیر مومن جب ان کاموں میں مشغول ہوتا ہے تو خدا تعالیٰ کی طرف سے اس کی توجہ بالکل ہٹ جاتی ہے لیکن جب ایک مومن یہ کام اختیار کرتا ہے تو یہ چیزیں خدا تعالیٰ کے ذکر میں روک نہیں بنتیں ان مشاغل کے باوجود اس کی ذکر الٰہی کی عادت پھر بھی قائم رہتی ہے۔ نمازیں پھر بھی باقاعدگی سے ادا کرتا ہے زکوٰۃ پھر بھی بالشرح ادا کرتا ہے روزے پھر بھی پوری احتیاط سے رکھتا ہے۔ حج پھر بھی استطاعت پر کرتا ہے گویا اس کے دنیوی مشاغل دین کی خدمت کے راستہ میں روک نہیں بنتے۔ اور چونکہ دین کا پہلو مضبوط رہتا ہے۔ اس لئے اسلام کہتا ہے کہ ہمیں تمہارے دنیا کمانے پر کوئی اعتراض نہیں لیکن اگر مثلاً تبلیغ کا وقت آجائے اور یہ فیصلہ کیا جائے کہ جماعت کا ہر فرد تبلیغ کے لئے وقت دے اور اُس وقت کوئی شخص کہے کہ میں تبلیغ کے لئے کس طرح وقت دے سکتا ہوں۔ اگر میں وقت دوں تو میری دوکان کا نقصان ہوتا ہے تو اسلام کہیگا یہ تجارت تمہارے لئے جائز نہیں۔ یا اگر کوئی کارخانہ دار کہے کہ میں کس طرح تبلیغ کے لئے باہر جا سکتا ہوں۔ میں اگر باہر جاؤں تو کارخانے کا تمام کام درہم برہم ہو جائیگا۔ تو اسلام کہے گا۔ ایسا کارخانہ تمہارے لئے جائز نہیں۔ پس مومن وہی ہیں جو لَا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ۔ کے مصداق ہوتے ہیں یعنی تجارت اور بیع اُنکو اللہ تعالیٰ کے ذکر سے نہیں روکتی بلکہ جب بھی خدا تعالیٰ کی طرف سے آواز بلند ہوتی ہے ایک مومن تاجر۔ ایک مومن کارخانہ دار ایک مومن صنّاع اپنی تجارت اور اپنے کارخانہ اور اپنی صنعت کو چھوڑ کر اس آواز کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے احکام کو پورا کرنے کے لئے کھڑا ہو جاتا ہے۔

دوسری شرط اسلام نے یہ بیان فرمائی ہے کہ وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ (التوبہ ع ۵) یعنی وہ لوگ جو سونا اور چاندی جمع کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے راستہ میں اُسے خرچ نہیں کرتے ایسے لوگوں کو تو دردناک عذاب کی خبر دیدے۔ اس آیت سے ظاہر ہے کہ جو شخص روپیہ کماتا اور اُسے صندوق میں بند کر دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی راہ میں اسے خرچ کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔ ایسا شخص اسلامی نقطہ نگاہ سے مومن نہیں کہلا سکتا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مومن بھی اپنی تجارتوں کو بڑھاتا ہے اور اگر وہ اپنی تجارت

کو ترقی نہیں دیگا تو اس کے پاس روپیہ کہاں سے آئے گا۔
روپیہ کمانے کے لئے ضروری ہے کہ تجارت اور صنعت کو
فروغ دیا جائے لیکن اگر کسی تجارت یا صنعت کا یہ نتیجہ نکلے
کہ انسان روپیہ جمع کرنا شروع کر دے اور بخل کا مرض اس میں
اِس قدر ترقی کر جائے کہ خدا تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنا اُسپر
گراں گذرنے لگے تو اسلامی تعلیم کے لحاظ سے وہ تجارت اور
صنعت بالکل ناجائز ہوگی۔ وہی تجارت اور وہی صنعت
جائز ہے جس کے نتیجہ میں بے کار روپیہ جمع نہ کیا جائے۔
ہاں وہ روپیہ جس کا رکھنا کسی خاص غرض کے لئے ضروری ہو
مثلاً کام کے نقصان کو پورا کرنے کیلئے یا مکان وغیرہ بنانے
کے لئے یا روزانہ ضرورتوں کو پورا کرنے کیلئے یا بچوں کی
شادی بیاہ کے لئے۔ ایسا روپیہ ہر شخص اپنے پاس رکھ سکتا
ہے۔ یا مثلاً ایک شخص جس نے کارخانہ کھولا ہُوا ہو اُسے کارخانہ
کے لئے کبھی لوہا خریدنا پڑتا ہے کبھی کوئلہ خریدنا پڑتا ہے۔ کبھی
مٹی کا تیل خریدنا پڑتا ہے۔ کبھی آٹے یا سوجی کے لئے گیہوں خریدنا
پڑتا ہے۔ یا اگر بوٹ کا کارخانہ اُس نے جاری کیا ہُوا ہے
تو اُسے مشینیں خریدنی پڑتی ہیں کیل خریدنے پڑتے ہیں۔ چمڑا
خریدنا پڑتا ہے اور پھر بعض دفعہ کارخانوں میں کام کرتے کرتے
مشینوں کے پرزے ٹوٹ جاتے ہیں۔ بعض دفعہ کوئی مشین
ہی ناکارہ ہو جاتی ہے۔ اور اس وقت ضرورت ہوتی ہے
کہ اور مشین یا مشین کے اور پرزے خریدے جائیں۔ ان تمام
کاموں کے لئے جب تک روپیہ پاس نہ ہو کوئی کارخانہ دار
اپنے کارخانے کو چلا نہیں سکتا۔ اسلام کے نزدیک اس قسم کے
کاموں کو چلانے کے لئے جتنے روپے کی ضرورت ہو وہ انسان
اپنے پاس رکھ سکتا ہے۔ یا مثلاً ایک شخص مکان بنانے
کے لئے روپیہ جمع کرنا شروع کر دیتا ہے جس کے لئے اُس کی
روزانہ آمدنی کافی نہیں ہوسکتی تو یہ اسلام کے خلاف نہیں
ہوگا۔ اور نہ یہ اُس رنگ میں روپیہ کا جمع کرنا کہلائیگا
جس رنگ میں روپیہ کا جمع کرنا اسلام نے ناجائز قرار دیا ہے،

یہ صرف بعد میں آنے والے ضروری اخراجات کو مہیّا کرنے
کی ایک جائز صورت ہوگی یا دوسرے الفاظ میں یُوں کہہ لو
کہ بعد میں اُس نے جو کچھ خرچ کرنا ہے اس کے لئے یہ اسکی
تیاری ہوگی۔ پس چونکہ یہ روپیہ محض جمع رکھنے کے لئے نہیں
بلکہ کسی دوسرے وقت خرچ کرنے کیلئے ہے اس لئے اس قسم
کی ضروریات کے لئے روپیہ پس انداز کرنا اسلام کی رُو سے
بالکل جائز ہے۔ ہاں جن لوگوں کے پاس ضرورت سے زائد
روپیہ ہوتا ہے اور وہ اس روپیہ کو بند کرکے رکھ دیتے ہیں
اسلام اس کی اجازت نہیں دیتا۔ اسلام کے نزدیک اگر ایک
شخص دس لاکھ روپیہ سے ایک کارخانہ جاری کر دیتا ہے تو
یہ بالکل جائز ہے لیکن اگر کوئی شخص دس ہزار روپیہ غلّق میں
بند کرکے رکھ دیتا ہے تو یہ ناجائز ہے اور اس کی وجہ یہ ہے
کہ جب ایک شخص دس لاکھ روپیہ کسی کارخانے پر لگاتا ہے
تو اسے کئی ہزار روپیہ مشینوں کے خریدنے پر صرف کرنا پڑتا ہے
پھر ان مشینوں سے کام لینے والے مستریوں کی اُسے ضرورت
ہوتی ہے۔ نفروں کی اُسے ضرورت ہوتی ہے۔ مزدوروں کی
اُسے ضرورت ہوتی ہے اور اس طرح سینکڑوں لوگوں کیلئے
روزگار کی صورت پیدا ہو جاتی ہے۔ اسی طرح جب کوئی
کارخانہ جاری کیا جاتا ہے تو اس میں کچھ لوگوں کو افسر مقرر کرنا
پڑتا ہے کچھ ماتحت ہوتے ہیں۔ کچھ قلی ہوتے ہیں۔ کچھ نگران
ہوتے ہیں اس طرح دو دو سو چار چار سو پانچ پانچ سو
بلکہ ہزار ہزار آدمیوں کے لئے روزگار کی صورت پیدا ہو جاتی
ہے اور بڑے بڑے کارخانوں میں تو بعض دفعہ بیس بیس ہزار
آدمی ایک وقت میں کام کر رہے ہوتے ہیں اس طرح
اس کا روپیہ بند نہیں رہتا بلکہ بنی نوع انسان کے کام
آتا رہتا ہے یا اگر کوئی شخص اپنے روپیہ سے تجارت
کرتا ہے تب بھی وہ لوگوں کے کام آتا ہے لیکن اگر کوئی
شخص دس ہزار روپیہ بند کرکے رکھ دیتا ہے تو چونکہ لوگ
اس روپیہ سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے اس لئے اسلام کے نزدیک

اس قسم کا روپیہ جمع رکھنا ناجائز ہے۔

تیسری چیز جس پر خصوصیت سے اسلام نے زور دیا ہے اور جس کی طرف قرآن کریم میں بارہا توجہ دلائی گئی ہے وہ یہ ہے کہ روپیہ بیشک کماؤ مگر جو کچھ کماؤ اس پر زکوٰۃ ادا کرو۔ اسلام نے بیشک روپیہ کو بند رکھنا ناجائز قرار دیا ہے مگر روپیہ کمانا منع نہیں کیا۔ یہی فرماتا ہے۔ اگر تم روپیہ کماتے ہو اور کچھ روپیہ اپنی ضروریات کے لئے عارضی طور پر جمع کر لیتے ہو جس پر ایک سال گذر جاتا ہے تو اس پر زکوٰۃ ادا کرو۔ اگر کوئی شخص باقاعدگی سے زکوٰۃ ادا کرتا ہے تو یہ اس بات کا ثبوت ہوتا ہے کہ وہ دنیا کو دین کی خاطر کماتا ہے لیکن اگر کوئی شخص زکوٰۃ نہیں دیتا تو یہ اس بات کا ثبوت ہوتا ہے کہ وہ دنیا محض دنیا کی خاطر کما رہا ہے۔ خدا تعالیٰ کی رضا حاصل کرنیکا شوق اس کے دل میں نہیں۔ اگر واقعہ میں اس کے دل میں خدا تعالیٰ کے قرب اور اس کی محبت کو جذب کرنیکا احساس ہوتا اگر دنیا کو وہ دین کی خاطر کما رہا ہوتا تو اس کا فرض تھا کہ وہ اپنے مال میں سے خدا تعالیٰ کا حق ادا کرتا اور پوری دیانت داری کے ساتھ ادا کرتا لیکن جب وہ زکوٰۃ ادا نہیں کرتا تو یہ اس بات کا ثبوت ہوتا ہے کہ وہ شیطان کا تابع ہے خدا تعالیٰ کے احکام کا تابع نہیں۔ زکوٰۃ کے معاملہ میں مَیں دیکھتا ہوں کہ تاجروں میں بہت بڑی کوتاہی پائی جاتی ہے۔ پرانے زمانہ میں تو غیر احمدی تاجروں نے بالکل اندھیر مچا رکھا تھا حضرت خلیفۂ اوّل رضی اللہ عنہ سُنایا کرتے تھے کہ بھیرہ میں ایک بہت بڑا مسلمان تاجر تھا جو ہر سال باقاعدگی سے زکوٰۃ دیا کرتا تھا۔ مگر اُس کے زکوٰۃ دینے کا طریق یہ تھا کہ وہ زکوٰۃ کا تمام روپیہ ایک گھڑے میں بند کر دیتا۔ فرض کرو اس کے پاس ایک لاکھ روپیہ ہوتا جس میں سے اڑھائی ہزار روپیہ زکوٰۃ دینا اُس پر فرض ہوتا تو وہ اڑھائی ہزار روپیہ ایک گھڑے میں ڈال دیتا اور اُن روپوؤں کے اوپر دو چار سیر گیہوں ڈالکر کسی مُلّاں کو بلاتا اور اس کی خوب پُر تکلّف دعوت کرتا۔ جب وہ کھانے سے فارغ ہو جاتا تو اُسے کہتا مولوی صاحب اس گھڑے میں جو کچھ ہے وہ مَیں آپ کی ملک کرتا ہوں۔ لوگوں کو بھی اُس کے اِس طریق کا علم تھا اور وہ جانتے تھے کہ گھڑے میں اس نے زکوٰۃ کا روپیہ رکھا ہُوا ہے جو اڑھائی تین ہزار روپیہ ہے مگر اُسے کچھ کہہ نہیں سکتے تھے۔ تھوڑی دیر بعد وہ خود ہی کہتا کہ آپ اس گھڑے کو اُٹھا کر کہاں لے جائینگے اِسے میرے پاس ہی بیچ ڈالئے۔ بتائیے آپ اِس گھڑے کی کیا قیمت لیں گے۔ مُلّاں ڈرتے ڈرتے کہ نہ معلوم کس حد تک سودا ہو پانچ دس یا پندرہ روپے بتا دیتا اور وہ جھٹ اتنے روپے نکال کر اس کے سامنے رکھ دیتا اور کہتا کہ مولوی صاحب جو کچھ اس میں ہے وہ آپ نے پندرہ روپے میں مجھے دیدیا ہے یہ کہہ کر وہ گھڑا اٹھا کر اندر رکھ لیتا اور سمجھ لیتا کہ اس کی طرف سے زکوٰۃ ادا ہو گئی ہے۔ تو دنیا میں اس قسم کی دھوکا بازی کرنے والے لوگ بھی پائے جاتے ہیں جو خدا تعالیٰ کے احکام سے تمسخر کرتے ہیں اور پھر یہ سمجھتے ہیں کہ ان پر خدا تعالیٰ کی طرف سے جو فرض عائد ہوتا ہے اس کو انہوں نے ادا کر دیا ہے۔

ہماری جماعت میں خدا تعالیٰ کے فضل سے اس قسم کے لوگ تو نہیں مگر ابھی ہماری جماعت میں لوگ پوری احتیاط سے زکوٰۃ ادا نہیں کرتے۔ بالخصوص تاجروں میں زکوٰۃ کے معاملہ میں بہت بڑی کوتاہی پائی جاتی ہے حالانکہ زکوٰۃ کے متعلق اسلامی شریعت میں اتنے شدید احکام پائے جاتے ہیں کہ صحابہؓ کا فیصلہ یہ ہے کہ جو شخص زکوٰۃ ادا نہ کرے وہ مسلمان ہی نہیں رہتا اور

اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے یہ اصول بیان فرمایا ہے کہ تم جو کچھ مال کماتے ہو اُس میں دوسرے لوگوں کا بھی حصّہ ہے کیونکہ مال جن چیزوں سے کمایا جاتا ہے وہ ساری کی ساری ایسی ہیں جو کسی خاص شخص کی مِلک نہیں۔ بلکہ ساری دنیا اُن پر حق رکھتی ہے۔ مثلاً تجارت کو لے لو۔ تجارت لوہے کی ہوتی ہے یا لکڑی کی ہوتی ہے یا اور بعض چیزوں کی ہوتی ہے۔ مگر کیا لوہا اور لکڑی تاجر آپ بناتا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے لکڑی بنائی ہے سارے انسانوں کے لئے۔ اللہ تعالیٰ نے کوئلہ بنایا ہے سارے انسانوں کے لئے اللہ تعالیٰ نے مٹی کا تیل بنایا ہے سارے انسانوں کے لئے۔ اللہ تعالیٰ نے کپاس بنائی ہے سارے انسانوں کے لئے۔ اللہ تعالیٰ نے گندم بنائی ہے سارے انسانوں کے لئے۔ مگر جب ایک شخص ان چیزوں سے خاص طور پر نفع کماتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اب تمہارا فرض ہے کہ تم مالک کو اس کا ٹیکس ادا کرو۔ کیونکہ یہ وہ چیزیں ہیں جن کی ساری دنیا مالک ہے۔ پس جس طرح مزارع اپنے مالک کو ٹیکس ادا کرتا ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ ایسے شخص کو حکم دیتا ہے کہ وہ بھی ٹیکس ادا کرے۔ وہ فرماتا ہے چونکہ تم کسان بنے اور تم نے اس زمین میں زراعت کی جو ساری دنیا کی ہے اس لئے اب تمہارا فرض ہے کہ تم مالک کو اس کا حق دو۔ چنانچہ اڑھائی فیصدی ٹیکس اُس سے وصول کیا جاتا ہے اور پھر جو نظام مقرر ہوتا ہے وہ اس ٹیکس کو غرباء کی مدد کے لئے خرچ کرتا ہے لیکن اگر کوئی شخص خدا تعالیٰ کا مقرر کردہ ٹیکس ادا نہیں کرتا یا ادا تو کرتا ہے مگر پورے طور پر ادا نہیں کرتا کسی قدر حصّہ اپنے پاس رکھ لیتا ہے تو اسلامی نقطۂ نگاہ سے وہ ایک چور کی حیثیت رکھتا ہے۔ بظاہر ایک شخص کپڑے کا تاجر ہوگا لیکن درحقیقت وہ چور ہوگا کیونکہ کپڑا آخر کن چیزوں سے تیار ہوتا ہے۔ کپڑا تیار ہوتا ہے روئی سے اور روئی تیار ہوتی ہے زمین سے اور زمین کسی خاص شخص کے لئے نہیں بنائی گئی بلکہ اللہ تعالیٰ نے ساری دنیا کیلئے بنائی ہے پس جب زمین ساری دنیا کیلئے بنائی ہے اور اُسی زمین سے روئی کی فصل تیار کرکے ایک شخص کپڑے کی تجارت کرتا ہے تو اُسکا فرض ہے کہ وہ اس ٹیکس کو ادا کرے جو اس پر عائد ہوتا ہے کیونکہ اُس نے اس چیز سے فائدہ اٹھایا جس میں ساری دنیا کا حصّہ تھا اسی طرح زمینوں پر زکوٰۃ کا حکم ہے کیونکہ زمین کسی ایک شخص کی نہیں بلکہ ساری دنیا کی ہے۔ اگر بعض وجوہ سے کوئی ٹکڑا کسی شخص کے قبضہ میں چلا گیا ہے تو بہر حال اُسے غریبوں کو اُن کا حق دینا پڑے گا اور وہ یہ کہہ کر اس ٹیکس سے نہیں بچ سکتا کہ جب میں نے اپنی ذاتی کوشش سے یہ روپیہ کمایا ہے تو میں غریبوں کو اپنے مال کا ایک حصّہ کیوں دوں اس لئے کہ اُس نے ذاتی محنت سے روپیہ کمایا۔ مگر بہر حال اُس نے روپیہ ایک ایسی چیز سے کمایا ہے جو ساری دنیا کے لئے مشترک تھی اور جس میں غرباء کا حق بھی رکھا گیا تھا پس اسلام کی ہدایت کے مطابق اس شخص سے زکوٰۃ لی جائیگی اور غرباء پر خرچ کی جائیگی۔ اگر کوئی شخص زکوٰۃ نہیں دیتا تو وہ یقیناً چور ہے خواہ وہ یہ کہے کہ میں نے رات اور دن محنت کرکے کپڑے کی تجارت سے روپیہ کمایا ہے، خواہ وہ یہ کہے کہ میں نے رات اور دن محنت کرکے لوہے کے کارخانے سے روپیہ کمایا ہے، خواہ وہ یہ کہے کہ میں نے رات اور دن محنت کرکے مٹی کے تیل کی تجارت سے یہ روپیہ کمایا ہے۔ خواہ کسی چیز کی تجارت سے اُس نے روپیہ کمایا ہو اس میں ساری دنیا کا حصّہ ہے اور اس کا فرض ہے کہ وہ اُس حصّہ کو ادا کرے۔ اور اگر وہ بغیر اس ٹیکس کو ادا کرنے کے روپیہ اپنے گھر میں لے جاتا ہے تو اسلام اُسے قطعاً مومن کہنے کے لئے تیار نہیں۔ ہاں ایک بات یاد رکھنی چاہیئے اور وہ یہ ہے کہ اس زمانہ میں چونکہ ٹیکس دوہرا ہو گیا ہے یعنی گورنمنٹ بھی ٹیکس لیتی ہے اور اسلام بھی ایک ٹیکس لیتا ہے۔ اس لئے جس چیز پر گورنمنٹ کی طرف سے ٹیکس عائد ہوتا ہے اگر اس کے ٹیکس کی رقم زکوٰۃ کے برابر یا زکوٰۃ سے زیادہ ہو تو پھر زکوٰۃ دینا واجب نہیں ہوگا۔ مگر اُس کے ساتھ ہی یہ امر بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ گورنمنٹ جمع شدہ مال پر ٹیکس

نہیں لیتی بلکہ آمد پر ٹیکس وصول کرتی ہے لیکن اسلام اُس مال سے زکوٰۃ وصول کرتا ہے جو انسان کے پاس جمع ہو۔ اور جس پر ایک سال گذر گیا ہو۔ فرض کرو۔ ایک شخص دس ہزار روپیہ سالانہ کماتا ہے اور گورنمنٹ اُس سے ٹیکس لے لیتی ہے اور وہ ٹیکس زکوٰۃ سے زیادہ ہے تو ہم کہیں گے کہ اب ایسے شخص پر زکوٰۃ واجب نہیں۔ جیسے زمیندار سے بھی گورنمنٹ مالیہ وصول کر لیتی ہے تو اس کے بعد اگر وہ مالیہ زکوٰۃ کے برابر یا اس سے زیادہ ہوتا ہے تو اس پر زکوٰۃ واجب نہیں رہتی۔ لیکن اگر کوئی زمیندار معاملہ ادا کرنے کے بعد اپنے اخراجات میں کفایت سے کام لینا شروع کر دیتا ہے اور اس طرح وہ کچھ روپیہ پس انداز کر لیتا ہے جس پر ایک سال گذر جاتا ہے تو اس روپیہ پر زکوٰۃ کا حکم عائد ہو جائیگا۔ فرض کرو اُس نے کفایت کرتے کرتے پانچہزار روپیہ جمع کر لیا ہے اور اُس پانچ ہزار روپیہ پر ایک سال گذر گیا ہے تو اسلام کی طرف سے اس پر زکوٰۃ کا ٹیکس لگ جائے گا۔ پس جمع شدہ مال پر جب سال گذر جائے اور وہ مال زکوٰۃ کے نصاب کے اندر ہو تو شریعت کی طرف سے زکوٰۃ کا حکم انسان پر عائد ہو جاتا ہے خواہ وہ زمیندار کا مال ہو یا تاجر کا ہو یا کسی اور کا ہو۔ ہاں اس مال پر جس میں سے گورنمنٹ نے زکوٰۃ کے برابر یا اس سے زائد ٹیکس لے لیا ہو زکوٰۃ واجب نہیں۔ مگر کچھ نہ کچھ رقم ثواب میں شمولیت کے لئے اسے طوعی طور پر پھر بھی دینی چاہیئے ہاں اگر انکم ٹیکس یا مالیہ کم ہو اور زکوٰۃ یا عُشر اس پر زیادہ عائد ہوتا ہو تو پھر جتنی کمی رہ جائیگی اُس کو پورا کرنا اُس کا فرض ہو گا۔ فرض کرو زکوٰۃ کے بیس روپے کسی شخص کے ذمے تھے گورنمنٹ نے ٹیکس کے ذریعے پندرہ روپے وصول کر لئے تو باقی پانچ روپے اسلام کا قائم کردہ نظام اُس سے ضرور وصول کرے گا لیکن اگر گورنمنٹ نے اس سے ٹیکس اکیس روپے لئے ہیں تو پھر زکوٰۃ اس پر واجب نہیں ہوگی۔ زکوٰۃ کا حکم ایسے شخص پر اُس صورت میں عائد ہو گا جب وہ اپنی آمد کو جمع رکھے اور پھر اس جمع شدہ مال پر بشرطیکہ وہ نصاب کے مطابق ہو ایک سال گذر جائے۔

چوتھے زکوٰۃ کے علاوہ اسلام یہ بھی حکم دیتا ہے کہ سرّاء اور ضرّاء دونوں حالتوں میں انفاق فی سبیل اللہ سے کام لیا جائے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ مومنوں کی صفات بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ اَلَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ فِی السَّرَّآءِ وَالضَّرَّآءِ (آل عمران ع ۱۴) مومن کشائش کی حالت میں بھی غرباء اور مساکین کی امداد کے لئے اپنے اموال خرچ کرتے ہیں اور تنگی کی حالت میں بھی خرچ کرتے ہیں۔ یہ الفاظ بتاتے ہیں کہ اسجگہ اُس خرچ کا ذکر ہے جو زکوٰۃ کے علاوہ ہے کیونکہ اس میں کہا گیا ہے کہ مومن تنگی کی حالت میں بھی خرچ کرتے ہیں حالانکہ تنگدست پر زکوٰۃ فرض نہیں۔ پس اسجگہ طوعی صدقہ مراد ہے زکوٰۃ مراد نہیں۔

اصل بات یہ ہے کہ دنیا میں ہر انسان پر خواہ وہ کسقدر مالدار ہو بعض تنگی کی حالتیں آتی ہیں اور بعض کشائش کی حالتیں آتی ہیں۔ اسلام یہ تعلیم دیتا ہے کہ مومن کو چاہیئے کہ وہ اِن دونوں حالتوں میں خدا تعالیٰ کے راستہ میں اپنے اموال خرچ کرتا رہے مگر ضرّاء کے یہ معنے نہیں کہ انسان کے پاس کچھ نہ ہو تب بھی وہ خرچ کرے بلکہ ضرّاء کے لفظ کا استعمال اس غرض کے لئے کیا گیا ہے کہ بڑے بڑے تاجروں پر بھی بعض دفعہ تنگی کے اوقات آجاتے ہیں۔ دس بیس لاکھ کا کارخانہ ہوتا ہے مگر کسی وجہ سے مال کا فروخت ہونا رُک جاتا ہے۔ اُس وقت لوگ کہتے ہیں ہم پر بڑی مصیبت آگئی ہے۔ اب ہم کیا کریں پہلی سی حالت ہماری نہیں رہی۔ ہم بڑی تنگی میں مبتلا ہو گئے ہیں

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے جب ایسی حالتیں آئیں اُس وقت بھی
تمہارا فرض ہے کہ تم اپنا مال خرچ کرو۔ کیونکہ اگر یہ فرض
بھی کر لیا جائے کہ دس لاکھ روپیہ کے مالک کا کارخانہ دار
کا کام خراب ہو گیا ہے تب بھی چار پانچ لاکھ روپیہ اس کے
گھر میں ضرور موجود ہوگا۔ پس اُسے سمجھ لینا چاہیئے کہ اگر
دین کے لئے وہ شخص قربانی کر رہا ہے جس کی آمد پانچ
دس یا پندرہ بیس روپے ہے تو اس کے لئے دین کی خاطر
قربانی کرنے میں کونسی مشکل درپیش ہے جبکہ اس کے قبضہ میں
دیوالیہ ہونے کے باوجود چار پانچ لاکھ روپیہ کا مال ہے
پس اس آیت کے صرف یہ معنے نہیں کہ مومن عزت اور
امارت دونوں حالتوں میں خرچ کرتے ہیں بلکہ یہ مطلب بھی
ہے کہ امیر پر بھی بعض دفعہ تنگی کی گھڑیاں آجاتی ہیں پس
اِن تنگی کی گھڑیوں کے متعلق اسلام یہ حکم دیتا ہے کہ تم
اُس حالت میں بھی غرباء و مساکین پر اپنا روپیہ خرچ
کیا کرو۔ اور یہ نہ کہا کرو کہ ہم کس طرح خرچ کریں ہماری
آجکل بکری کم ہے۔ جب وہ شخص جس کے پاس تمہارے
مقابلہ میں کچھ بھی نہیں دین کی خاطر قربانی کرتا رہتا ہے تو
تمہارے پاس تو پھر بھی لاکھ دو لاکھ یا چار لاکھ روپے
موجود ہیں تمہارے لئے ہچکچاہٹ کی کوئی وجہ نہیں۔

اس بارہ میں اللہ تعالیٰ نے ایک اور مقام پر بھی
توجہ دلائی ہے فرماتا ہے۔ وَفِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ
وَالْمَحْرُوْمِ (الذاریات ع۱) یعنی مومنوں کے اموال میں
اُنکا بھی حق ہے جو سوال کرتے ہیں اور اُن کا بھی حق ہے
جو سوال نہیں کرتے۔ سوال نہ کرنا کئی طرح سے ہوتا ہے
مثلاً ایک شخص گونگا ہوتا ہے اور وہ بول ہی نہیں سکتا۔
یا جانور ہیں کہ جب وہ کسی مصیبت میں مبتلا ہوں تو
دوسرے سے کوئی سوال نہیں کر سکتے۔ دنیا میں عام
طور پر دیکھا جاتا ہے کہ جب کوئی جانور بوڑھا ہو کر
ناکارہ ہو جاتا ہے تو لوگ اُسے مار کر اپنے گھر سے
نکال دیتے ہیں۔ اور کوئی اس کا پُرسانِ حال نہیں رہتا
ایسے جانوروں کو پالنا مالک کا کام ہوتا ہے یا پھر حکومت
کا فرض ہوتا ہے کہ وہ مالک کو مجبور کرے کہ وہ اُس جانور
کو اپنے گھر میں رکھے۔ یہ کوئی انصاف نہیں کہ جب تک
کسی جانور سے کمائی کی جا سکتی ہو اُس وقت تک تو اُسے
کھلایا پلایا جائے اور جب وہ بوڑھا ہو کر کام کے قابل
نہ رہے تو اُسے مار کر اپنے گھر سے نکال دیا جائے گائے
اور بیل تو ایسے جانور ہیں جن کے بوڑھا یا ناکارہ ہونے
پر لوگ اُن کو ذبح کر لیتے ہیں مگر گھوڑا اور گدھا وغیرہ
ایسے جانور ہیں جن کو ذبح نہیں کیا جا سکتا۔ پس
اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَفِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ
وَالْمَحْرُوْمِ لوگوں کے اموال میں اُن کا بھی حق ہے
جو مانگ سکتے ہیں اور اُن کا بھی حق ہے جو محروم ہیں
اور بولنے کی طاقت اپنے اندر نہیں رکھتے۔ اس حکم کے
ماتحت بے زبان جانوروں کی غذا کا خیال رکھنا ان کی
طاقت کے مطابق اُن سے کام لینا اور جن جانوروں
سے کوئی کام نہ لیا جائے انکو بھی کھانا دینا پرندوں
وغیرہ کو دانہ ڈالنا۔ بے زبان جانوروں کی سردی گرمی
اور اُن کے شہوانی جذبات اور اُن کے بچوں کا خیال
رکھنا بھی مومن کے فرائض میں شامل ہے۔

پانچویں ہدایت جو اسلام نے اس سلسلہ میں
دی ہے وہ تمام لوگوں سے تعلق رکھتی ہے۔ اُن لوگوں سے
بھی جو تجارت اور صنعت و حرفت کرنے والے ہیں اور
اُن سے بھی جن کے پاس کسی اور ذریعہ سے مال آتا ہے
وہ یہ ہے کہ تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى
(المائدہ ع۱) یعنی جو شخص بھی کوئی کام کرتا ہو اُسکے
لئے ضروری ہے کہ وہ نیکی اور تقویٰ کے ساتھ ایک
دوسرے کی مدد کرے۔ پس وہی تجارت اور وہی صنعت
اسلامی نقطۂ نگاہ سے صحیح ہو سکتی ہے جو برّ اور تقویٰ

پر دوسروں سے تعاون کرتی ہو۔ تاجر اور صنّاع یہ دو گروہ ایسے ہیں کہ اُن کا تعاون بہت وسیع ہو سکتا ہے۔ مثلاً صنّاع اگر ایسی صورت میں اپنی صنعت و حرفت کو فروغ دیں کہ اُنکی صنعت سے مذہب کو شوکت حاصل ہونے لگ جائے۔ دین کی شہرت پھیلنے لگ جائے اور سلسلہ کی مضبوطی پہلے سے بڑھ جائے تو یقیناً اُن کی صنعت دین کا ایک حصّہ سمجھی جائیگی۔ یا اگر کوئی شخص دو کام کر سکتا ہو۔ اور اُن دونوں میں سے ایک کام ایسا ہو جس سے دین کی مدد ہوتی ہو اور دوسرا کام ایسا ہو جس سے دین کی مدد نہ ہوتی ہو تو اسے بہرحال وہ کام کرنا چاہیئے جس سے دین کی مدد ہوتی ہو خواہ اس میں تھوڑے بہت نفع کا فرق ہی کیوں نہ ہو۔ اگر ایسا شخص وہ کام اختیار کرتا ہے جس سے دین کی مدد ہوتی ہو تو وہ یقیناً ثواب کا مستحق ہوگا اور اُس کا دنیا کمانا محض دنیا نہیں بلکہ دین کا ایک حصّہ ہوگا۔ اسی طرح تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى میں جہاں یہ بات داخل ہے کہ ایسی تجارتیں اور ایسی صنعتیں اختیار کی جائیں جو دین کی تقویت کا موجب ہوں وہاں آپس میں ایک دوسرے سے تعاون کرنیکا بھی اس آیت میں حکم پایا جاتا ہے۔ آخر ایک شخص کی تجارت کیوں چل نکلتی ہے اور دوسرے شخص کی تجارت کیوں رہ جاتی ہے۔ اسی لئے کہ ایک شخص کو تجارت میں کامیابی حاصل کرنے کے گُر معلوم ہوتے ہیں اور دوسرا شخص تجارت کے اصول سے ناواقف ہوتا ہے ایک شخص جانتا ہے کہ سودا کہاں سے سستا ملتا ہے۔ سودا کس طرح فروخت کرنا چاہیئے۔ کس منڈی میں بیچنے سے زیادہ نفع حاصل ہوتا ہے اور کس منڈی میں بیچنے سے کم نفع حاصل ہوتا ہے۔ مگر دوسرا شخص ان باتوں کو نہیں جانتا۔ پس اگر تاجر اپنی تجارت کے ساتھ ساتھ کسی اور آدمی کو بھی تجارت کا کام سکھا دیں۔ اور اُسے بھی تجارت کے رازوں سے واقف کر دیں تو یہ بھی ایک قومی تعاون ہوگا اور اس کے نتیجہ میں بھی وہ بہت بڑے ثواب کے مستحق ہونگے۔ اسی طرح اگر کسی شخص کو کوئی پیشہ یا ہنر آتا ہے تو اُسے چاہیئے کہ اس پیشہ یا ہنر کو اپنے پاس ہی نہ رکھے بلکہ کسی دوسرے کو بھی سکھا دے۔ پُرانے زمانہ میں لوگوں کو یہ عادت تھی کہ وہ بعض ہنر مخفی رکھتے تھے جس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ وہ ہنر اُن کے ساتھ ہی چلے گئے۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام سُنایا کرتے تھے کہ ایک نائی تھا جسے زخموں کو اچھا کرنے کا ایک نہایت ہی اعلیٰ درجہ کا نسخہ معلوم تھا دُور دُور سے لوگ اس کے پاس علاج کے لئے آتے۔ اور فائدہ اٹھاتے۔ مگر وہ اتنا بخیل تھا کہ اپنے بیٹے کو بھی مرہم کا نسخہ نہ بتاتا اور کہتا کہ یہ اتنا بڑا ہنر ہے کہ اس کے جاننے والے دو آدمی ایک وقت میں نہیں ہو سکتے۔ بیٹے نے بہتیری منتیں کیں اور کہا کہ مجھے یہ نسخہ آپ بتا دیں مگر وہ یہی جواب دیتا کہ مرتے وقت تمہیں بتاؤں گا۔ اس سے پہلے نہیں بتا سکتا۔ بیٹا کہتا کہ موت کا کوئی پتہ نہیں۔ وہ کس وقت آ جائے۔ آپ مجھے ابھی یہ نسخہ بتا دیں مگر باپ آمادہ نہ ہُوا۔ آخر ایک دفعہ وہ بیمار ہُوا اور سخت نازک حالت ہوگئی۔ بیٹا کہنے لگا باپ مجھے اب تو نسخہ بتا دیں مگر وہ جواب دیتا کہ مَیں مرتا نہیں اچھا ہو جاؤں گا۔ پھر اور حالت خراب ہوئی۔ تو بیٹے نے پھر منتیں کیں مگر اُس نے پھر یہی جواب دیا کہ کیا تُو سمجھتا ہے مَیں مرنے لگا ہوں مَیں تو ابھی نہیں مرتا۔ غرض اسی طرح وہ جواب دیتا رہا یہاں تک کہ مر گیا۔ اور اُس کا بیٹا جاہل کا جاہل ہی رہا یہ چیز ایسی ہے جسے اسلام جائز قرار نہیں دیتا۔ اسلام کہتا ہے کہ تم علم کو صرف اپنی ذات تک محدود نہ رکھو بلکہ اُسے وسیع کرو اور دوسرے لوگوں میں بھی پھیلاؤ۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ بعض علم اور بعض پیشے ایسے ہیں جن میں ایک حد تک اور ایک وقت تک اخفاء جائز ہوتا ہے مگر ہمیشہ کے لئے اخفاء جائز نہیں ہوتا۔ یورپ میں

ادویہ کو پیٹنٹ کرانے کا ایک نہایت ہی مفید طریق جاری ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر کوئی شخص ایجاد کرے تو چالیس سال تک وہ اس سے فائدہ اٹھانے کا حق رکھتا ہے اِس دوران میں ہم کسی کو یہ اجازت نہیں دیں گے کہ وہ اس کی نقل کرے۔ لیکن چالیس سال کے بعد اجازت ہونی چاہیئے کہ سب لوگ اُس سے فائدہ اٹھائیں۔ یہ ایک بہت ہی اچھا طریق ہے جو یورپ والوں نے ایجاد کیا ہے کہ کچھ وقت موجد کو دے دیتے ہیں کہ وہ اُس میں اپنی ایجاد سے فائدہ اٹھائے اور پھر ساری دنیا میں اسکو پھیلا دیتے ہیں۔ تاکہ اور لوگ بھی اگر اس سے فائدہ اٹھانا چاہیں تو اٹھائیں۔ اِسی طرح صنّاع اور تاجر اگر اپنی صنعت اور تجارت کے ساتھ ساتھ دوسروں کو بھی یہ پیشے سکھادیں یا ان پیشوں کے سیکھنے میں اُن کی مدد کریں تاکہ دوسرے شہروں یا دوسرے ملکوں میں بھی صنعت و حرفت اور تجارت کو فروغ حاصل ہو تو یہ بھی ایک رنگ کی زکوٰۃ ہوگی۔ جو اُن کی تجارت اور صنعت کو پاک کرنیکا ذریعہ بن جائیگی۔ غرض تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى میں تجارتی کمپنیاں اور صنّاعوں کی کمپنیاں بھی شامل ہیں اور اُن کا فرض ہے کہ وہ ایک دوسرے کے مال فروخت کرنے میں مدد دیں اور ایک دوسرے کی تجارتوں کے فروغ میں مدد دیں۔ مسلمان عموماً تجارت میں اسلئے نقصان اٹھاتے ہیں کہ اُن کی تجارتوں کو نہ دوسرے تجّار سے مدد ملتی ہے اور نہ گاہکوں سے۔ اِسکے بالمقابل ہندو تاجروں کو دونوں طرف سے مدد ملتی ہے اور وہ کامیاب ہو جاتے ہیں۔

چھٹا اصل جو قرآن کریم میں بیان کیا گیا ہے اور جس کو مدّنظر رکھنا ہر وقت ضروری ہے وہ یہ ہے کہ

حَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ -

(بقرہ ع ۱۷) یعنی جس کام میں بھی تم لگے ہوئے ہو تمہارے سامنے صرف ایک ہی مقصد رہنا چاہیئے اور وہ یہ کہ دین کے غلبہ اور ترقی کے لئے تم نے کوشش کرنی ہے پس اگر کوئی شخص تجارت کرتا ہے یا صنعت و حرفت اختیار کرتا ہے تو اُسے ہر وقت یہ اصول اپنے سامنے رکھنا چاہیئے اِس اصول کے ماتحت اگر کوئی شخص اپنی تجارت یا اپنی صنعت کو اسلام کی شوکت اور اس کے غلبہ کا ذریعہ بناتا ہے تو وہ دنیا نہیں کماتا بلکہ دین کماتا ہے خواہ وہ اپنی تجارت اور صنعت کے ذریعہ لاکھوں روپے ہی کیوں نہ کما رہا ہو۔

ساتواں حکم قرآن کریم یہ دیتا ہے کہ ماپ تول اور وزن درست ہونا چاہیئے۔ تاجروں میں بالعموم یہ خرابی پائی جاتی ہے کہ جائز طور پر مال کمانے کے علاوہ وہ ماپ اور تول میں ضرور کچھ نہ کچھ کمی کر دیتے ہیں۔ پہلے تو وہ صرف ڈنڈی مارا کرتے تھے مگر اب کئی قسم کے بٹے بنائے گئے ہیں۔ پہلے بھی جب اسلام میں تجارت کا زور تھا لوگوں میں یہ نقص پیدا ہو گیا تھا۔ چنانچہ پُرانی کتب میں بھی ذکر آتا ہے کہ اُس زمانہ میں تین قسم کے بٹے ہُوا کرتے تھے۔ ایک لینے کے لئے۔ ایک دینے کے لئے اور ایک افسروں کو دکھانے کے لئے۔ پس پہلے بھی یہ نقص تھا مگر اِس زمانہ میں اس نقص نے بہت بڑی وسعت اختیار کر لی ہے۔ اسلام یہ ہدایت دیتا ہے کہ مومن کو چاہیئے کہ وہ تول اور ماپ میں کسی قسم کی کمی نہ کرے۔ جب کوئی چیز لے تو تول کر لے اور جب کوئی چیز دے تو تول کر دے کسی قسم کی دھوکا بازی اور فریب اسلام میں جائز نہیں اور اگر کوئی تاجر یا صنّاع ایسا کام کرتا ہے تو اس کا کام محض دنیاداری ہے اور وہ خدا تعالیٰ کی خوشنودی کا موجب نہیں بلکہ اس کی ناراضگی کو بھڑکانے کا موجب ہے جب وہ اس قسم کے دھوکا کے بعد کوئی مال کما کر اپنے گھر میں لاتا ہے تو وہ حرام مال ہوتا ہے اور وہ ایسا ہی ہوتا ہے جیسے چوری اور ڈاکہ سے حاصل کیا ہُوا مال۔ چاہے

اُس نے اپنی دوکان پر بیٹھ کر ہی وہ کیوں نہ کمایا ہو۔

آٹھواں حکم اسلام نے یہ دیا ہے کہ دھوکہ اور فریب اور ملاوٹ جائز نہیں۔ بے شک تم تجارت کرو۔ مگر تجارت میں یہ دھوکہ نہیں ہونا چاہیئے۔ یہ نقص بھی ایسا ہے جس کا ازالہ نہایت ضروری ہے۔ ہمارے ملک میں تو یہ مرض اس قدر پھیلا ہوا ہے کہ کوئی چیز دھوکہ اور ملاوٹ سے نہیں بچی۔ گھی فروخت کریں گے تو اس میں چربی یا تیل وغیرہ ملا کر تیل بیچیں گے تو وہ خالص نہیں ہوگا بلکہ اُس میں بعض اور تیلوں کی ملاوٹ ہوگی۔ یہی باقی چیزوں کا حال ہے۔ سب میں دھوکا اور فریب سے کام لیا جاتا ہے اور خالص چیز خریداروں کو مہیّا نہیں کی جاتی۔ یہ نقائص بھی صرف اِسی زمانہ میں نہیں بلکہ گذشتہ زمانہ میں بھی یہ نقص پائے جاتے تھے اور انہی کو دُور کرنے کے لئے اسلامی حکومت کی طرف سے محتسب مقرر ہوتے تھے۔ پس یہ بھی ایک بہت بڑا نقص ہے جس کو دُور کرنا چاہیئے۔

نواں حکم اسلام نے یہ دیا ہے کہ تم جو مال بناؤ یا دوسروں سے خرید و اُسے روک کر نہ رکھ لیا کرو کہ جب مال مہنگا ہوگا اُس وقت ہم فروخت کرینگے۔ اگر کوئی تاجر مال کو اِسلئے روک کر رکھ لیتا ہے کہ جب مال مہنگا ہوگا اس وقت وہ اُسے فروخت کرکے زیادہ نفع کمائیگا تو اسلام کی رُو سے وہ ایک ناجائز فعل کا ارتکاب کرتا ہے۔ حدیثوں میں صاف طور پر ذکر آتا ہے کہ اگر کوئی شخص غلّہ خرید کر اس لئے روک لیتا ہے کہ جب غلّہ مہنگا ہوگا تو اس وقت میں اُسے فروخت کرونگا۔ تو وہ گناہ کا مرتکب ہوتا ہے مگر بعض لوگوں نے غلطی سے اس حدیث سے یہ سمجھا ہے کہ یہ حکم صرف غلّہ کے متعلق ہے اور چیزوں کے متعلق نہیں حالانکہ تفقہ کے معنے ہی یہی ہوتے ہیں کہ جو حکم کسی خاص موقعہ پر دیا جائے اس کے متعلق دیکھا جائے کہ اس حکم کی غرض کیا تھی۔ اور پھر جہاں جہاں وہ غرض پائی جائے اس حکم کو چسپاں کر دیا جائے۔ پس گو احتکار کا حکم غلّہ کے متعلق ہے اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف غلّہ کے تاجروں کے متعلق یہ فرمایا ہے کہ اگر وہ غلّہ کو اس ارادہ اور نیّت سے روک لیتے ہیں کہ جب غلّہ مہنگا ہوگا تب فروخت کرینگے تو وہ ناجائز فعل کا ارتکاب کرتے ہیں۔ لیکن اس سے عام استدلال بھی کیا جا سکتا ہے کیونکہ اِس حکم کی اصل غرض یہ ہے کہ لوگ کسی چیز کو روک کر نہ رکھیں تاکہ لوگوں کو کسی قسم کی تکلیف نہ ہو۔ پس جس طرح غلّہ روک کر ایک شخص احتکار کرتا اور شریعت کے نزدیک مجرم قرار پاتا ہے۔ اِسی طرح اگر کوئی کپڑے کا تاجر کپڑے کو روک لے اور لوگوں میں فروخت نہ کرے تو وہ بھی ایسا ہی سمجھا جائیگا۔ یا اگر کوئی لکڑی کو روک لیتا ہے یا لوہے کو روک لیتا ہے اور سمجھتا ہے کہ جب یہ چیزیں مہنگی ہونگی تب میں ان کو فروخت کرونگا تو وہ یقیناً اسلام کے خلاف چلتا ہے۔ پس شریعت اسلامی کی رُو سے کوئی ایسی تجارت اور صنعت جائز نہیں جس میں احتکار سے کام لیا گیا ہو یعنی یہ مدِّ نظر رکھا گیا ہو کہ جب چیزیں مہنگی ہوں گی تب ان چیزوں کو ہم فروخت کریں گے۔ اِس سے پہلے ہم فروخت نہیں کریں گے۔ آج کل تاجروں میں خصوصیت سے احتکار پایا جاتا ہے۔ اُن کے پاس کپڑا موجود ہوتا ہے مگر وہ انکار کر دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمارے پاس کپڑا نہیں۔ جس سے اُن کی غرض یہ ہوتی ہے کہ جب کپڑا اور زیادہ مہنگا ہوا تب ہم فروخت کرینگے۔ اِسی طرح لکڑی موجود ہوتی ہے مگر جب کوئی لکڑی کا خریدار آتا ہے تو اُس کے سامنے انکار کر دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمارے پاس کوئی لکڑی نہیں۔ کوئلہ موجود ہوتا ہے مگر جب کوئی کوئلہ مانگنے کیلئے آتا ہے تو انکار کر دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمارے پاس کوئی کوئلہ نہیں۔ شریعت کی رُو سے یہ بالکل ناجائز ہے۔ اور ہر شخص جو احتکار کے نتیجہ میں روپیہ کماتا ہے اُسے اچھی طرح یاد رکھنا چاہیئے کہ وہ حرام خوری کا ارتکاب کرتا ہے اور

اللہ تعالیٰ کے غضب کو اپنے اوپر بھڑکاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے دنیا کمانے کے جو جائز ذرائع رکھے ہوئے ہیں صرف ان ذرائع سے کام لینا چاہیئے۔ ناجائز اور گندے اور ناپاک ذرائع جن کا اسلام دشمن ہے جن سے اس نے بڑی شدّت کے ساتھ منع کیا ہے اُن کو اختیار کرنا دین کی ہتک کرنا اور خدا تعالیٰ کی نگاہ میں موردِ غضب بننا ہے۔

دسواں حکم اسلام نے یہ دیا ہے کہ تم مزدور کو اُس کا پُورا حق دو۔ اور پھر وہ حق اپنے وقت پر ادا کرو۔ گویا مزدور کے متعلق اسلام دو حکم دیتا ہے۔ اوّل یہ کہ اس کی تنخواہ کام کے مطابق مقرر کرو۔ دوسرے یہ نہ کرو کہ وقت پر اُس کی مزدوری ادا کرنے میں لیت ولعل سے کام لینے لگ جاؤ۔ مَیں نے دیکھا ہے بالعموم لوگ اس حکم کی پرواہ نہیں کرتے۔ وہ مزدور سے پورا کام لیتے ہیں لیکن جب اُن کی تنخواہ یا اُجرت کی ادائیگی کا وقت آتا ہے تو اس میں تساہل سے کام لینے لگ جاتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اُن کے دروازہ پر بار بار آتا اور اپنی تنخواہ کا مطالبہ کرتا ہے۔ اِس پر بھی وہ اسے اس کا حق ادا نہیں کرتے۔ بلکہ کہتے ہیں آج نہیں کل آنا۔ کل آتا ہے تو کہتے ہیں پرسوں آنا۔ اِس طرح بار بار اُسے اپنے پاس آنے پر مجبور کرتے ہیں اور پھر اس کے بعد بھی کسی دن اُسے ایک روپیہ دے دیتے ہیں کسی دن دو روپے دے دیتے ہیں کسی دن چار روپے دے دیتے ہیں گویا اُسے خراب کر کر کے اُسکی مزدوری دیتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی مزدوری سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔ اگر اُسے اکٹھی اجرت مل جاتی تو وہ اپنی ضروریات اکٹھی خرید لیتا اور اِس طرح اُسے فائدہ رہتا۔ لیکن چونکہ اُسے ٹکڑے ٹکڑے کر کے اُجرت دی جاتی ہے۔ اس لئے اُسے تکلیف اُٹھانی پڑتی ہے اور پھر اکٹھی اُجرت ملنے سے جو فائدہ اُسے پہنچ سکتا تھا وہ بھی نہیں پہنچتا۔ پس اسلام یہ حکم دیتا ہے کہ مزدور کے ساتھ اس قسم کا سلوک نہ کیا جائے۔ اُسے اُس کا حق پورا ادا کرو۔ اور پھر عین وقت پر ادا کرو۔ یہ نہ ہو کہ وہ اپنے حق کے لئے تمہارے دروازے کھٹکھٹاتا پھرے اور تم اُسے بار بار ٹالتے رہو۔

گیارھواں حکم اسلام یہ دیتا ہے کہ بیشک تم مال کماؤ لیکن دیکھو اس کے نتیجہ میں تمہارے اندر کبر پیدا نہ ہو۔ تمہاری دولت امیر اور غریب میں فرق پیدا کرنے کا موجب نہ بن جائے۔ اگر کوئی دولت امیر اور غریب میں اتنا بُعد پیدا کر دیتی ہے کہ امیر اپنے غریب بھائی کے ساتھ مل کر بیٹھ نہیں سکتا۔ ایک دسترخوان پر اس کے ساتھ کھانا نہیں کھا سکتا۔ اگر وہ ملنے کے لئے آتا ہے تو امیر آدمی تکبّر سے پیٹھ موڑ لیتا ہے۔ یا غصہ اور جوش کی حالت میں اُس سے کہتا ہے۔ تم جانتے نہیں مَیں کون ہوں تو یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ وہ شخص دولت کمانے کے بعد انسان نہیں رہا بلکہ حیوان بن گیا ہے اور دولت صرف انسان کے لئے جائز ہے حیوان کے لئے نہیں۔ لیکن اگر کسی شخص کے پاس دولت تو آ جاتی ہے مگر اس کے باوجود اس میں اور دوسرے غریب بھائیوں میں مغائرت کی کوئی دیوار حائل نہیں ہوتی وہ اپنے آپ کو کوئی علیحدہ جنس سمجھنے نہیں لگتا۔ وہ دوسروں کو تحقیر اور تذلیل کی نگاہ سے نہیں دیکھتا وہ اُن کے ساتھ محبت سے بات چیت کرتا ہے اُن کے دُکھ سکھ میں شریک ہوتا ہے۔ اپنے آپ کو کوئی الگ قسم کا آدمی اور غریبوں کو کوئی الگ قسم کے آدمی نہیں سمجھتا تو ایسے شخص کے لئے دولت کمانا بالکل جائز ہے۔

بارھواں حکم اسلام یہ دیتا ہے کہ مالدار شخص کو چاہیئے کہ وہ اپنی موت کے وقت رشتہ داروں کو یہ وصیت کر جائے کہ وہ اس کے مال کا کچھ حصہ خدا تعالیٰ کی راہ میں اُس کے غریب بندوں کے فائدہ اور ترقی کے لئے خرچ کر دیں چنانچہ اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے۔ كُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ إِنْ تَرَكَ خَيْرًاۖ

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍۭ بِقِيْعَةٍ يَّحْسَبُهُ

اور وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا اُن کے اعمال سراب کی طرح ہیں جو ایک وسیع میدان میں نظر آتی ہو جس کو

الظَّمْاٰنُ مَآءً ؕ حَتّٰٓى اِذَا جَآءَهٗ لَمْ يَجِدْهُ شَيْـًٔا وَّوَجَدَ

پیاسا پانی سمجھتا ہے یہاں تک کہ جب وہ اُس کے پاس آجاتا ہے تو وہ اُسے کچھ بھی نہیں پاتا۔ اور اللہ (تعالیٰ)

اللّٰهَ عِنْدَهٗ فَوَفّٰىهُ حِسَابَهٗ ؕ وَاللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ﴿۴۰﴾

کو اُسکے پاس دیکھ لیتا ہے۔ تب اللہ (تعالیٰ) اُسے اُسکا پورا پورا حساب چکا دیتا ہے۔ اور اللہ (تعالیٰ) بہت جلد حساب چکانیوالوں میں سے ہے[۲۶]

اَلْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ بِالْمَعْرُوْفِ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ (البقرۃ ع۲۲) یعنی اگر کوئی شخص مرنے لگے اور مال و دولت اُس کے پاس ہو تو وہ کچھ روپیہ غرباء کی بہبودی اور دین کی خدمت کے لئے وقف کر دے اور اس کی اپنے رشتہ داروں کو تاکید کر جائے اور گو اس آیت کے ایک دوسرے معنے بھی ہیں کہ رشتہ داروں کو وصیت کر جائے کہ شریعت کے مطابق اس کی جائیداد تقسیم ہو لیکن اس آیت کے ایک یہ معنے بھی ہو سکتے ہیں کہ جب کسی شخص کے پاس ضرورت سے زیادہ مال ہو تو وہ موت کے وقت ایک حصہ کی غرباء کے لئے وصیت کر جائے اور جہاں کسی آیت کے دو معنے ہو سکتے ہوں وہاں دونوں لئے جائیں گے۔ یہ نہیں ہوگا کہ ایک معنے ترک کر دیئے جائیں اور دوسرے معنے لئے جائیں

یہ بارہ موٹے موٹے احکام ہیں جو قرآن کریم اور احادیث سے معلوم ہوتے ہیں۔ اگر کوئی تاجر اور صناع ان اصول کو مدنظر رکھتا ہے تو گو وہ بظاہر کپڑا یا دوا یا تیل یا کوئی اور چیز فروخت کر رہا ہوتا ہے مگر وہ ایسا ہی سمجھا جاتا ہے جیسے وہ دین کا کام کر رہا ہے اور وہ پیسے کر اپنے گھر واپس نہیں لوٹتا بلکہ خدا تعالیٰ کی رضا اور اس کی محبت کا تحفہ لیکر اپنے گھر میں آتا ہے۔

۲۶ حل لغات

سَرَاب :۔ سَرَاب : مَاتَرَاهُ نِصْفَ النَّهَارِ مِنِ اشْتِدَادِ الْحَرِّ كَاَنَّمَآءٍ يَلْصِقُ بِالْاَرْضِ۔ دوپہر کو شدت گرمی سے جو میدان میں زمین یوں معلوم ہوتی ہے جیسے پانی ہے اُسے سراب کہتے ہیں۔ اور سراب اس کو بھی کہتے ہیں جس کی کوئی حقیقت نہ ہو (اقرب)

قِيْعَة : قِيْعَةٌ : قَاعٌ کی جمع ہے اور قَاعٌ کے معنے ہوتے ہیں اَرْضٌ سَهْلَةٌ مُطْمَئِنَّةٌ قَدِ انْفَرَجَتْ عَنْهَا الْجِبَالُ وَالْاٰكَامُ۔ وہ ہموار زمین جس میں پہاڑ اور ٹیلے وغیرہ نہ ہوں (اقرب)

تفسیر:۔ فرماتا ہے۔ مومنوں کے مقابلہ میں کافروں کے اعمال سراب کی طرح ہیں جس کو بعض دفعہ انسان پانی سمجھ لیتا ہے لیکن جب وہ اس کے پاس آتا ہے تو وہاں کچھ بھی نہیں دیکھتا بلکہ اللہ تعالیٰ کو اس کے پاس کھڑا پاتا ہے اور وہ اس کا حساب پائی پائی چکا دیتا ہے اور اللہ تعالیٰ جلد جلد حساب چکانے والا ہے

سراب ریت کے اُس وسیع میدان کو کہتے ہیں جس پر سورج کی جب تیز شعاعیں پڑتی ہیں تو ایسی حرکت پیدا ہوتی ہے کہ یوں معلوم ہوتا ہے کہ کوئی دریا ٹھاٹھیں مار رہا ہے۔ عرب اور افریقہ کے ریتلے میدانوں میں کئی دفعہ ایسا ہوا ہے کہ جب لوگوں کے پاس پانی

نہ رہا تو وہ سراب کو دیکھ کر اُدھر چل پڑے مگر جتنا چلتے گئے وہ انہیں آگے ہی آگے نظر آتا گیا اور اس طرح وہ صحراء میں کئی میل دُور نکل گئے اور آخر تڑپ تڑپ کر مر گئے۔

فرماتا ہے۔ وہ لوگ جو خدا تعالےٰ کے نور کا انکار کرتے ہیں اُن کی مثال بالکل سراب کی طرح ہوتی ہے یعنی جس مذہب میں وہ شامل ہوتے ہیں اس کے مطابق وہ عمل کرتے ہیں اور خیال کرتے ہیں کہ اس طرح انہیں روحانیت حاصل ہو جائیگی مگر درحقیقت وہ ایک سراب ہوتا ہے جس میں روحانیت کا کوئی پانی نہیں ہوتا وہ ایک غلط اُمید کے ساتھ اس راستہ پر بڑھتے چلے جاتے ہیں مگر ان کا ہر قدم انہیں روحانی پانی سے اَور زیادہ دُور کرتا چلا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ اُن پر روحانی موت وارد ہو جاتی ہے اور وہ خدائی فیوض سے ہمیشہ کے لئے محروم ہو جاتے ہیں۔ گویا مومنوں کے متعلق تو یہ بتایا تھا کہ وہ الٰہی نور کو اپنے اندر جذب کرکے خود بھی نور بن جاتے ہیں۔ مگر کافر کے متعلق بتایا کہ وہ ایسے صحراؤں میں بھٹکتا پھرتا ہے جن سے اُسے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوتا۔ وہ اپنے دل میں تو فائدہ کی امید رکھتا ہے مگر انجام اس کا یہ ہوتا ہے کہ وہ خدا تک نہیں پہنچ سکتا۔ پھر سراب کی مثال دیکر اللہ تعالےٰ نے اس امر کی طرف بھی اشارہ فرمایا ہے کہ مومن جب اسلامی احکام پر عمل کرتا ہے تو وہ صرف خیالی طور پر یہ نہیں سمجھتا کہ وہ پانی کی طرف جا رہا ہے بلکہ اُسے نظر آ رہا ہوتا ہے کہ وہ پانی پی رہا ہے اور اللہ تعالےٰ کے فیوض اور اس کی برکات سے متمتع ہو رہا ہے لیکن وہ لوگ جو جھوٹے مذہب کے پیرو ہوتے ہیں اُن میں سے اگر کسی سے پُوچھا جائے کہ تمہیں کچھ ملا بھی ہے تو وہ یہی کہتا ہے کہ یہاں تو کچھ نہیں ممکن ہو اگلے جہان میں کچھ مل جائے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام کے سوا جسقدر مذاہب پائے جاتے ہیں اُن پر چلنے والے یہی کہتے ہیں کہ مرنے کے بعد پتہ لگے گا کہ ہمیں کیا ملتا ہے لیکن سچے مذہب کا پیرو اس دنیا میں بتا دیتا ہے کہ مجھے یہ کچھ ملا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالےٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے۔ اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَیْھِمُ الْمَلٰٓئِکَۃُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّۃِ الَّتِیْ کُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ۔ نَحْنُ اَوْلِیٰٓؤُکُمْ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَفِی الْاٰخِرَۃِ وَلَکُمْ فِیْھَا مَا تَشْتَھِیْٓ اَنْفُسُکُمْ وَلَکُمْ فِیْھَا مَا تَدَّعُوْنَ (حٰمٓ السجدۃ ع ۴)

یعنی وہ لوگ جنہوں نے یہ کہا کہ اللہ ہمارا رب ہے اور پھر وہ مضبوطی کے ساتھ اس عقیدہ پر قائم ہو گئے۔ اور حوادث کی آندھیاں اُن کے پائے استقلال میں کوئی جُنبش پیدا نہ کر سکیں ایسے لوگوں پر اللہ تعالیٰ کے ملائکہ نازل ہوتے ہیں اور وہ انہیں تسلّی دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ تم ڈرو نہیں اور نہ کسی پچھلی کوتاہی پر افسوس کرو بلکہ اُن اعلیٰ درجہ کی کامیابیوں پر خوش ہو جاؤ جو عنقریب تمہیں ملنے والی ہیں اور جن کا خدا تعالیٰ کی طرف سے تم سے وعدہ کیا گیا تھا۔ ہم اس دنیا میں بھی تمہارے دوست ہیں اور آخرت میں بھی تمہارے دوست رہیں گے اور اُس جنّت میں تمہیں وہی کچھ ملے گا جو تمہارے دلوں کی خواہش اور آرزو کے مطابق ہو گا بلکہ جو کچھ تم مانگو گے وہی کچھ تم کو مل جائیگا۔

اِس آیت سے ظاہر ہے کہ اسلام مومنوں کے ساتھ یہ وعدہ کرتا ہے کہ اگر وہ سچے دل سے اسلام پر ایمان لائیں اور اس کے احکام کے مطابق عمل کریں تو اللہ تعالیٰ اُن کو اپنی ہمکلامی کا شرف عطا فرماتا ہے اور مصائب کے اوقات میں اپنے ملائکہ کے ذریعہ اُن کے دلوں کو تسلّی دیتا اور آئندہ حاصل ہونے والی اعلیٰ درجہ کی

أَوْ كَظُلُمٰتٍ فِيْ بَحْرٍ لُّجِّيٍّ يَّغْشٰهُ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ

یا (اُن کافروں کے اعمال کی کیفیت) اُن تاریکیوں جیسی ہے، جو ایک گہرے سمندر پر چھائی ہوئی ہوتی ہیں جس پر لہریں اُٹھ رہی ہوتی ہیں

مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ سَحَابٌ ؕ ظُلُمٰتٌۢ بَعْضُهَا فَوْقَ

اور اُن لہروں پر اور لہریں اُٹھ رہی ہوتی ہیں اور اُن سب کے اوپر ایک بادل ہوتا ہے۔ یہ ایسی تاریکیاں ہوتی ہیں کہ اُن میں سے بعض بعض کے اوپر

بَعْضٍ ؕ إِذَآ أَخْرَجَ يَدَهٗ لَمْ يَكَدْ يَرٰىهَا ؕ وَمَنْ

چھائی ہوئی ہوتی ہیں۔ جب انسان اپنا ہاتھ نکالتا ہے تو باوجود کوشش کے اس کو دیکھ نہیں سکتا۔ اور جس کے لئے

لَّمْ يَجْعَلِ اللّٰهُ لَهٗ نُوْرًا فَمَا لَهٗ مِنْ نُّوْرٍ ﴿۴۱﴾ ع ۵ ۱۱

اللہ نور نہ بنائے اس کو کہیں سے نور نہیں ملتا ۵۲۷

کامیابیوں کی بشارات دیتا ہے۔ مگر دوسرے مذاہب والے صرف اگلے جہان کا وعدہ کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ مرنے کے بعد تمہیں نجات حاصل ہوگی گویا وہ صرف موہوم وعدوں پر انسان کو خوش کرنا چاہتے ہیں اور جس طرح سراب کو دیکھ کر ایک پیاس سے بے تاب انسان کے دل میں یہ غلط امید پیدا ہو جاتی ہے کہ میں دریا کی طرف جا رہا ہوں حالانکہ وہ اپنی ہلاکت اور بربادی کی قبر کی طرف بڑھ رہا ہوتا ہے۔ اسی طرح اسلام کے سوا دنیا میں جس قدر مذاہب پائے جاتے ہیں چونکہ وہ اس دنیا میں الٰہی برکات کا کوئی نمونہ دکھانے کی طاقت نہیں رکھتے۔ نہ خدا تعالیٰ کا الہام اُن پر نازل ہوتا ہے نہ معجزات و نشانات سے اُن کی تائید ہوتی ہے۔ نہ دعاؤں کی قبولیت کا کوئی نمونہ اُن سے ظاہر ہوتا ہے اس لئے وہ صرف اگلے جہان کے انعامات کا وعدہ کرتے رہتے ہیں اور اس طرح اُن کے ماننے والوں کا ہر قدم سراب کی طرف بڑھتا چلا جاتا ہے یہاں تک کہ ایک دن موت کا زبردست ہاتھ انہیں اس دنیا سے جُدا کر دیتا ہے۔ اور انہیں معلوم ہوتا ہے کہ وہ آسمانی آبِ حیات سے کتنے دُور رہے تھے اور غلط امیدوں نے انہیں کیسا تباہ کیا۔ غرض یہ اسلام اور دوسرے مذاہب میں ایک نمایاں فرق ہے جو اسلام کی فضیلت اور اس کے من جانب اللہ ہونیکا ایک زبردست ثبوت ہے۔

۵۲۷ حل لغات:۔ لُجِّيٌّ: اَللُّجُّ کے معنے ہیں معظم الماء۔ بہت پانی۔ اور لُجِّيٌّ کے معنے ہونگے بہت پانی والا (اقرب)

لُجِّيٌّ

تفسیر:۔ فرماتا ہے۔ کافروں کے اعمال کی کیفیت اُن تاریکیوں کی طرح ہے جو ایسے گہرے سمندر پر چھا جاتی ہیں جس پر موج پر موج چڑھی آتی ہے اور جس کے اوپر بادل چھائے ہوئے ہوتے ہیں۔ یہ ایسی تاریکیاں ہوتی ہیں کہ ایک تاریکی کے اوپر دوسری تاریکی چھائی ہوئی ہوتی ہے۔ اور جب انسان اپنا ہاتھ نکالتا ہے تو باوجود کوشش کے اس کو دیکھ نہیں سکتا کیونکہ خدا تعالیٰ ایسے لوگوں سے اپنا نور چھین لیتا ہے یعنی جب تک قوم میں خدا کی شریعت رہتی ہے اُس میں

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُسَبِّحُ لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ

کیا تُو دیکھتا نہیں کہ اللہ وہ ہے کہ جو آسمانوں اور زمین میں رہتے ہیں سب اُسی کی تسبیح کرتے ہیں -

وَالطَّيْرُ صٰٓفّٰتٍ ؕ كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهٗ وَتَسْبِيْحَهٗ ؕ

اور پرندے صف باندھے ہوئے اس کے سامنے حاضر ہیں۔ اُن میں سے ہر ایک (اپنی اپنی پیدائش کے مطابق) اپنی نماز اور اپنی تسبیح کو جانتا ہے

وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِمَا يَفْعَلُوْنَ ﴿۴۲﴾ وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ

اور اللہ (تعالیٰ) جو کچھ وہ کرتے ہیں اُسے خوب جانتا ہے - اور آسمانوں اور زمین کی بادشاہت

وَالْاَرْضِ ۚ وَاِلَى اللّٰهِ الْمَصِيْرُ ﴿۴۳﴾

اللہ ہی کی ہے - اور اللہ ہی کی طرف سب کو لوٹ کر جانا ہے ۲۸

نور قائم رہتا ہے۔ لیکن جب قوم خدا کی شریعت سے مُنہ موڑ لیتی ہے تو ایک طرف اُس کے نفس کی تاریکیاں جوش مارنے لگ جاتی ہیں اور دوسری طرف خدا تعالےٰ بھی اپنے نور کو اُس سے کھینچ لیتا ہے۔ اور لحظہ بہ لحظہ اس کے مصائب بڑھتے چلے جاتے ہیں اور اس کی ایسی حالت ہو جاتی ہے کہ وہ اپنے ہاتھ کو بھی نہیں دیکھ سکتا۔ یعنی اس کے کام کرنے کے ذرائع بھی اُس سے غائب ہو جاتے ہیں۔ اور جس کو خدا کا نور میسّر نہ ہو اُسکا یہ حال لازماً ہوتا ہے۔ کیونکہ خدا تعالیٰ کی شریعت کا اور کوئی قائم مقام نہیں۔

صَلٰوۃ

ان آیات میں سمندر اور خشکی پر ظلمت چھانے اور انسانوں پر تباہی آنے کا ذکر کرنے کے یہ معنے تھے کہ مسلمان یہ نہ سمجھیں کہ قرآنی نور اور محمدی نور کے بعد اُن کے اندر زوال یا اندھیرا نہیں آسکتا۔ اُن پر اندھیرے کا دَور بھی آتا رہیگا اور اس دَور کو دُور کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ کی وہی تدبیر کارگر ہوگی جو ہمیشہ سے کارگر ہوتی چلی آئی ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ آسمان سے کوئی مصلح بھیجیگا جو اس کو دُور کرے گا۔ پھر تاریکی ہوگی تو پھر خدا مصلح بھیجیگا۔ پھر تاریکی ہوگی تو پھر بھیجیگا اور اِس طرح اندھیروں کو دُور کرتا رہے گا۔

۲۸ حل لغات :- صَلٰوۃٌ : اَلصَّلٰوۃُ مِنَ اللّٰهِ الرَّحْمَةُ - جب اللہ تعالیٰ کے لئے صلوۃ کا لفظ استعمال ہو تو اُس کے معنے یہ ہوتے ہیں کہ اللہ تعالےٰ کی طرف سے رحمت کا نزول ہوگا۔ وَمِنَ الْمَلَائِكَةِ الْاِسْتِغْفَارُ اور جب ملائکہ کے لئے صلوۃ کا لفظ استعمال ہو تو یہ مراد ہوگی کہ ملائکہ استغفار طلب کرتے ہیں۔ وَمِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ الدُّعَآءُ اور جب مومنوں کے لئے یہ لفظ استعمال ہو تو اُس سے یہ مراد ہوتی ہے کہ مومن دعا مانگتے ہیں وَمِنَ الطَّيْرِ وَالْهَوَامِّ التَّسْبِيْحُ اور جب یہ لفظ کیڑوں مکوڑوں اور پرندوں کے لئے استعمال ہو تو اس کے معنے یہ ہوتے ہیں کہ یہ اشیاء خدا تعالیٰ کی بزبانِ حال پاکیزگی بیان کرتی ہیں (اقرب)

تفسیر :- فرماتا ہے۔ کیا تجھے معلوم نہیں کہ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ بھی ہے وہ اپنے وجود سے خدا کی تسبیح کر رہا ہے (یہ مراد نہیں کہ مُنہ سے کر رہا ہے) اور پرندے بھی اپنے پر کھولے ہوئے جوّ میں پھیر رہے ہیں۔

أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللّٰهَ يُزْجِي سَحَابًا ثُمَّ يُؤَلِّفُ بَيْنَهُ ثُمَّ

کیا تُو نے نہیں دیکھا کہ اللہ (تعالیٰ) بادلوں کو آہستہ آہستہ ہانک کر لاتا ہے۔ پھر ان کے درمیان اتصال پیدا کر دیتا ہے پھر انکو

يَجْعَلُهُ رُكَامًا فَتَرَى الْوَدْقَ يَخْرُجُ مِنْ خِلٰلِهِ ۚ وَيُنَزِّلُ

تہ بہ تہ بنا دیتا ہے۔ پھر تو دیکھتا ہے کہ ان کے اندر سے بارش ٹپکنے لگتی ہے۔ اور وہ بادل میں بہت بڑے حجم کی

مِنَ السَّمَآءِ مِنْ جِبَالٍ فِيهَا مِنْ بَرَدٍ فَيُصِيبُ بِهٖ مَنْ

چیزیں گراتا ہے۔ جن میں سے بعض اولوں کی قسم کی ہوتی ہیں پھر اس کو جس (قوم) تک

يَّشَآءُ وَيَصْرِفُهٗ عَنْ مَّنْ يَّشَآءُ ۚ يَكَادُ سَنَا بَرْقِهٖ يَذْهَبُ

چاہتا ہے پہنچا دیتا ہے جس سے چاہتا ہے اُسے روک لیتا ہے۔ قریب ہوتا ہے کہ اس کی بجلی کی روشنی بعض آنکھوں کو اندھا

بِالْأَبْصَارِ ﴿۴۴﴾ يُقَلِّبُ اللّٰهُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ ۚ إِنَّ فِي ذٰلِكَ

کر دے۔ اللہ (تعالیٰ) رات اور دن کو چکر دیتا رہتا ہے۔ اِس میں

لَعِبْرَةً لِّأُولِي الْأَبْصَارِ ﴿۴۵﴾

عقل والے لوگوں کے لئے بڑی عبرت ہے۔ **۲۹ھ**

ان میں سے ہر ایک اپنی نماز کا طریق بھی جانتا ہے اور تسبیح کا بھی اور جو کچھ وہ کرتے ہیں اللہ تعالیٰ اُسے جانتا ہے یعنی ہر ایک چیز اپنے وجود سے ثابت کر رہی ہے کہ اللہ تعالیٰ بے عیب ہے، کیونکہ اس کیلئے جس جس چیز کی ضرورت تھی وہ خدا تعالیٰ نے مہیا کی ہوئی ہے۔ مثلاً گوشت خور جانوروں کے لئے گوشت کھانیوالے دانتوں کی ضرورت تھی۔ سو خدا نے انہیں ایسے دانت مہیا کر دئے جن سے وہ گوشت کھا سکتے ہیں۔ پھر انہیں اتنی لمبی انتڑیوں کی ضرورت تھی جو گوشت کو ہضم کر سکتیں۔ سو خدا نے انہیں ایسی انتڑیاں بھی دیدیں۔ اسی طرح گھاس خور جانوروں کے لئے گھاس کھانے والے دانت اور گھاس ہضم کرنے والی انتڑیاں موجود ہیں۔ اور پرندوں کو بھی ایسا بنایا ہے کہ وہ اپنے پَر کھول کر اُڑ سکتے ہیں کیونکہ ان کے لئے اپنی رہائش اور غذا کیلئے جوّ میں اُڑنا ضروری ہے۔ پس وہ اپنی ہیئت سے خدا کی تسبیح کر رہے ہیں اور اُس کا فرض ادا کر رہے ہیں۔ جو پرندہ کے تعلق میں صلوٰۃ کے معنے ہیں۔ اور ان باتوں کو دیکھ کر انسان کو ماننا پڑتا ہے کہ آسمانوں اور زمین کی بادشاہت اللہ ہی کی ہے اور اس کی طرف انسان کو جواب دہی کیلئے لوٹنا پڑے گا۔

۲۹ھ حل لغات:۔ يُزْجِيْ اَزْجٰى سے مضارع کا صیغہ ہے۔ اور اَزْجَاهُ کے معنے ہوتے ہیں سَاقَهٗ۔ اس کو چلایا۔ دَفَعَهٗ بِرِفْقٍ۔ اُسے نرمی کے ساتھ آگے کیا۔ پس يُزْجِيْ کے معنے ہونگے۔ چلاتا ہے

يُزْجِيْ ۲

وَاللّٰهُ خَلَقَ كُلَّ دَآبَّةٍ مِّنْ مَّآءٍ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ

اور اللہ (تعالیٰ) نے ہر چلنے والے جانور کو پانی (یعنی نطفہ) سے پیدا کیا ہے۔ پس کچھ تو ایسے ہیں جو اپنے

يَّمْشِيْ عَلٰى بَطْنِهٖ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِيْ عَلٰى رِجْلَيْنِ ۚ

پیٹ پر چلتے ہیں۔ اور کچھ ایسے ہیں جو اپنے دو پاؤں پر چلتے ہیں۔

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِيْ عَلٰٓى اَرْبَعٍ ۭ يَخْلُقُ اللّٰهُ مَا

اور کچھ ایسے ہیں جو اپنے چار پاؤں پر چلتے ہیں۔ اللہ (تعالیٰ) جو چاہتا ہے پیدا کرتا

ہانکتا ہے (اقرب)

رُكَامًا — رُكَامًا: اَلرُّكَامُ۔ اَلشَّيْءُ الْمُتَرَاكِمُ بَعْضُهٗ فَوْقَ بَعْضٍ۔ یعنی رکام اس چیز کو کہتے ہیں جس کے کچھ حصے ایک دوسرے پر تہ بہ تہ ہوں (اقرب)

اَلْوَدْقُ — اَلْوَدْقُ۔ اَلْمَطَرُ۔ ودق کے معنے بارش کے ہیں۔ خواہ تھوڑی ہو یا بہت (اقرب)

سَنَا — سَنَا: اَلسَّنٰى۔ اَلْبَرْقُ۔ سنا کے معنے چمک کے ہوتے ہیں (اقرب)

تفسیر: فرماتا ہے۔ کیا تجھے معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ بادلوں کو آہستہ آہستہ چلاتا ہے یعنی پانی کے ذروں کی شکل میں۔ پھر ان کو آپس میں ملا دیتا ہے پھر ان کو تہ بہ تہ کر دیتا ہے۔ یعنی بادل گھنے ہو جاتے ہیں۔ اس کے بعد تُو دیکھتا ہے کہ تھوڑی یا بہت بارش (یہ ودق کے معنے ہیں) ان کے درمیان سے نکلتی ہے۔

اسی طرح خدا تعالیٰ اپنے نور کو بھی اٹھاتا ہے تو وہ پہلے پانی کے ذرہ کی طرح ہلکا سا غبار معلوم ہوتا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ اس کو طاقت بخشنا شروع کرتا ہے اور آخر وہ موسلا دھار بارش کی طرح انسانوں پر برس جاتا ہے۔

پھر فرماتا ہے کہ اللہ تعالیٰ آسمانوں میں سے پہاڑ اتارتا ہے۔ یہ عربی زبان کا ایک محاورہ ہے جو کثرت کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں فُلَانٌ يَمْلِكُ جِبَالًا مِّنْ فِضَّةٍ وَّذَهَبٍ۔ فلاں شخص کے پاس چاندی اور سونے کے پہاڑ ہیں۔ یعنی چاندی سونا کثرت سے ہے۔ یہاں بھی یہی مراد ہے کہ کبھی کبھی وہ بادلوں سے موسلا دھار بارش اتارتا ہے نہ کہ پہاڑ اتارتا ہے۔ اس بارش میں اولے بھی ہوتے ہیں اور وہ جس پر چاہتا ہے اولے گرا دیتا ہے اور جس سے چاہتا ہے اولے ہٹا دیتا ہے۔ یعنی خدا کی شریعت بعض لوگوں کے لئے ہدایت اور ترقی کا موجب ہو جاتی ہے اور بعض لوگوں کے لئے بربادی کے طور پر فصلیں تباہ کرنے کا موجب ہو جاتی ہے اور جس طرح کبھی کبھی بجلی کی روشنی آنکھوں کو اندھا کر دیتی ہے۔ اسی طرح الٰہی شریعت کا نور بھی کبھی کبھی نہ ماننے والوں کو اندھا کر دیتا ہے اور بجائے فائدہ کے نقصان کا موجب ہو جاتا ہے۔ پھر فرماتا ہے يُقَلِّبُ اللّٰهُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّاُولِي الْاَبْصَارِ۔ جس طرح خدا تعالیٰ رات اور دن کو ایک دوسرے سے بدلتا رہتا ہے عقلمند لوگ اس نظارہ سے یہ سمجھ سکتے ہیں کہ اسی طرح ہدایت اور کفر کے ادوار کا

يَشَآءُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ قَدِيۡرٌ ﴿۴۶﴾ لَقَدۡ اَنۡزَلۡنَاۤ

ہے - اور اللہ (تعالیٰ) ہر ایک چیز پر قادر ہے - ۱۳۰ ہم نے کھلے کھلے

اٰيٰتٍ مُّبَيِّنٰتٍ ؕ وَاللّٰهُ يَهۡدِىۡ مَنۡ يَّشَآءُ اِلٰى

نشانات آتارے ہیں اور اللہ (تعالیٰ) جسے چاہتا ہے سیدھے راستہ کی طرف

صِرَاطٍ مُّسۡتَقِيۡمٍ ﴿۴۷﴾

ہدایت دیتا ہے - ۱۳۱

بدلنا بھی ضروری ہے -

۱۳۰ تفسیر:- فرماتا ہے کہ ہر جانور کو اللہ تعالیٰ نے پانی سے پیدا کیا ہے - پھر ان جانوروں میں سے بعض اپنے پیٹ پر چلتے ہیں - اور بعض اپنے دو پیروں پر چلتے اور بعض اپنے چار پیروں پر - اللہ تعالیٰ جیسی مخلوق چاہتا ہے پیدا کرتا ہے - کیونکہ وہ ہر چیز پر قادر ہے -

اس میں بتایا کہ روحانی پانی سے بھی مختلف قسم کے لوگ اپنی استعدادوں کے مطابق طاقت حاصل کرتے ہیں - بعض تو اپنے پیٹوں پر چلتے ہیں یعنی جب تک اُن کے پیٹ بھرے جائیں اور انعامات ملتے رہیں وہ خدا تعالیٰ کے ساتھ رہتے ہیں اور بعض دو پائے یعنی انسانوں کی طرح اعلیٰ ترقیات حاصل کر جاتے ہیں اور بعض چوپایوں کی طرح کم عقل ہوتے ہیں - اور خدا کی طرف کم توجہ کرتے ہیں اور اپنے کھانے پینے کی طرف زیادہ متوجہ رہتے ہیں -

۱۳۱ تفسیر:- فرماتا ہے - ہم نے ایسی آیتیں آتاری ہیں جو حقیقت حال کو کھول کر رکھ دینے والی ہیں اور اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے سیدھے راستے کی طرف ہدایت دے دیتا ہے - مذہب چونکہ زیادہ تر ایسی باتوں کی طرف اشارہ کرتا ہے جو غیب میں ہوتی ہیں

اس لئے وہی مذہب انسان کو فائدہ پہنچا سکتا ہے اور وہی مذہب انسان کو ہدایت دے سکتا ہے جس میں آیات بیّنات بھی ہوں - یعنی ایسے نشانات ہوں جو غیب کو کھول کر رکھ دیں - اور چھپی ہوئی باتوں کو ظاہر کر دیں - اگر غیب غیب ہی رہے اور چھپی ہوئی باتیں ظاہر نہ ہوں تو پھر مذہب پر ایمان لانے کا کوئی محرک نہیں ہو سکتا - کیونکہ مذہب ظاہر ہوتا یا نہ ہوتا جو چیز غیب میں ہے وہ غیب ہی میں رہتی - مثلاً اللہ تعالیٰ کی ہستی غیب میں ہے - اگر مذہب نہ ہوتا تب بھی اللہ تعالیٰ کی ہستی غیب میں ہی رہتی - مذہب کا فائدہ تو تبھی ہو سکتا ہے جبکہ وہ اللہ تعالیٰ کی ہستی کو معجزات اور دلائل کے ذریعہ سے غیب سے نکال کر ہمارے سامنے رکھدے - اگر وہ ایسا کردے تب تو بیشک مذہب ہے لیکن اگر وہ ایسا نہ کرے تو وہ ایک بے فائدہ چیز ہے کہ جس کے آنے سے ہمیں کوئی فائدہ نہ پہنچا - اور جس کے نہ آنے سے ہم کو کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا تھا - اب ہم دیکھتے ہیں کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے لئے خدا تعالیٰ نے اس وعدہ کو کس طرح پورا کیا؟ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے شدید دشمنوں میں سے ایک ہندہ تھی - جو اتنی سخت مخالف تھی کہ جنگ اُحد کے موقعہ پر

لوگوں کو شعر پڑھ پڑھ کر بھڑکاتی تھی کہ جاؤ اور اسلامی لشکر پر حملہ کرو۔ اور جب ایک خطرناک موقعہ مسلمانوں کے لئے آیا تو اس نے کہا کہ جو شخص حضرت حمزہؓ کا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا تھے کلیجہ نکال کر میرے پاس لے آئیگا اور اسی طرح ان کا ناک اور ان کے کان کاٹ کر لے آئیگا میں اُسے انعام دونگی۔ چنانچہ حضرت حمزہؓ کی نعش کے ساتھ ایسا ہی سلوک کیا گیا۔ جنگ کے بعد جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ بات معلوم ہوئی کہ آپ کے چچا کی ایسی بے حرمتی کی گئی ہے تو طبعی طور پر آپ کو تکلیف ہوئی اور آپ نے فرمایا کہ جب دشمنوں نے اس قسم کے ظالمانہ سلوک کی ابتداء کر دی ہے تو میں بھی ان کے ساتھ ایسا ہی سلوک کرونگا۔ تب اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ پر وحی نازل ہوئی کہ ان کے اس ظالمانہ سلوک کے باوجود آپ کو ایسا کوئی اقدام نہیں کرنا چاہیئے اور عفو اور درگذر سے کام لینا چاہیئے۔ (آل عمران ع) اب دیکھو۔ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد کتنا حکمت والا تھا۔ ہندہ بے شک لڑائی کرنے والوں میں سے نہیں تھی وہ اُن پیچھے رہنے والی عورتوں میں سے تھی جو مردوں کو لڑائی کے لئے اکساتی تھیں۔ مگر اسلام پر حملہ آور لوگوں میں وہ بھی تھے جو بعد میں مسلمان ہوئے اور اسلامی لڑائیوں میں مارے گئے یا مارے جانے کے قریب پہنچے اگر ان کے ساتھ بھی وہی سلوک کیا جاتا جو ہندہ نے حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی لاش کے ساتھ کیا تھا تو بعد میں جو اللہ تعالیٰ کے نشانات ظاہر ہوئے وہ کیسے ظاہر ہوتے مثلاً اُنہی لوگوں میں ابوجہل کا بیٹا عکرمہؓ بھی تھا۔ اُنہی لوگوں میں خالد بن ولیدؓ بھی تھے۔ انہی لوگوں میں عمرو بن العاصؓ بھی تھے۔ فرض کرو یہ سب لوگ مارے جاتے اور اُن کے ساتھ وہی سلوک ہوتا جو ہندہ نے حضرت حمزہؓ کی لاش کے ساتھ کیا تھا تو بعد میں اُن کے ذریعہ سے جو نشان ظاہر ہوئے وہ کس طرح ظاہر ہوتے۔ اللہ تعالیٰ نے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو بتا دیا کہ آپ کو مستقبل کا علم نہیں لیکن ہمیں مستقبل کا علم ہے اور ہم جانتے ہیں کہ جن لوگوں پر آپ کو اس وقت غصہ آ رہا ہے ان میں سے بعض مستقبل میں اسلام کے لئے بڑی بھاری قربانیاں کرنیوالے ہونگے۔ اس لئے ہم ان کو زندہ رکھیں گے اور ان سے کام لیں گے۔ اور آپ کے انتقام کے جذبہ کو پورا نہیں ہونے دیں گے۔ چنانچہ حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ کی مثال ہی لیلو وہ ابوجہل کے بیٹے تھے۔ اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو رؤیا میں دکھایا گیا تھا کہ ایک فرشتہ انگوروں کا ایک خوشہ آپ کے پاس لایا ہے۔ آپ نے خواب میں ہی دریافت فرمایا کہ یہ خوشہ کس کے لئے لائے ہو۔ فرشتہ نے جواب دیا کہ میں یہ خوشہ ابوجہل کے لئے لایا ہوں۔ آپ گھبرا گئے اور اسی گھبراہٹ میں آپ کی آنکھ کھل گئی کہ کیا خدا تعالیٰ کا رسول اور اس کا دشمن ایک ہی صفت میں کھڑے ہیں کہ اُس کے لئے بھی جنت سے انگوروں کا خوشہ آ رہا ہے اور اس کے لئے بھی جنت سے انگوروں کا خوشہ آ رہا ہے۔ جب بعد میں عکرمہؓ مسلمان ہوئے تو آپ نے فرمایا اب میری خواب کی تعبیر مجھ پر کھل گئی ہے۔ ابوجہل سے مراد اس کا بیٹا عکرمہ تھا جو اسلام لایا۔ پھر عکرمہ اپنے اسلام میں اتنے ترقی کر گئے کہ جب بعد میں عیسائیوں سے جنگیں ہوئیں تو ایک موقعہ پر صحابہؓ نے فیصلہ کیا کہ یکدم دشمن کے قلب پر حملہ کیا جائے تاکہ وہ آئندہ مسلمانوں پر حملہ کرنے کی جرأت نہ کر سکے۔ جو لوگ اس غرض کے لئے چنے گئے ان میں عکرمہؓ بھی تھے۔ تاریخ میں آتا ہے کہ جس طرح عقاب چڑیا پر جھپٹا مارتا ہے اسی طرح یہ لوگ دشمن پر حملہ کر کے قلب لشکر میں پہنچ گئے۔ یہ لوگ صرف ساٹھ تھے اور دشمن کا لشکر ساٹھ ہزار کی تعداد میں تھا اور کمانڈر انچیف سے روم کے بادشاہ نے یہ وعدہ کیا تھا کہ اگر تم نے مسلمانوں پر فتح پائی تو میں اپنی آدھی سلطنت

تمہیں دے دونگا اور اپنی بیٹی کی تم سے شادی کردونگا مگر یہ ساٹھ آدمی صفوں کو چیرتے اور دشمنوں کو قتل کرتے ہوئے عین قلب لشکر میں پہنچ گئے۔ اور انہوں نے جرنیل کو مار ڈالا اور عیسائی فوج مرعوب ہو کر بھاگ گئی۔ مگر چونکہ یہ لوگ ساٹھ ہزار تلواروں میں سے گذرے تھے اس لئے زخمی ہو کر گر گئے۔ جب جنگ کے بعد مسلمان اُن لوگوں کی خبر لینے کے لئے گئے تو انہوں نے اُن میں سے چند زخمیوں کو میدان میں پڑے پایا۔ وہ گرم ملک تھا اور شائد وقت بھی گرمی کا تھا۔ پھر ہزاروں آدمیوں میں سے راستہ نکالنے اور تلواریں مارتے چلے جانے کی وجہ سے انکے جسموں سے پسینہ بھی کثرت سے نکلا جس کی وجہ سے انہیں بڑی شدت سے پیاس لگی ہوئی تھی۔ زبانیں اُن کی باہر نکلی ہوئی تھیں اور وہ پانی کے لئے تڑپ رہے تھے ایک مسلمان سپاہی نے عکرمہؓ کو پہچان لیا اور پانی کی چھاگل لے کر اُن کے پاس گیا اور کہا۔ آپ کو پیاس لگی ہوئی ہے پانی پی لیں۔ عکرمہؓ نے دوسری طرف نگاہ ڈالی تو ایک اور مسلمان بھی پیاس کی وجہ سے تڑپ رہا تھا۔ انہوں نے پانی کا کوئی قطرہ پیئے بغیر اُس سپاہی سے کہا۔ وہ دیکھو ایک اور پُرانا مسلمان پیاس کی وجہ سے تڑپ رہا ہے وہ مجھ سے زیادہ مستحق ہے تم اس کے پاس جاؤ اور اُسے پانی پلاؤ۔ چنانچہ وہ مسلمان سپاہی دوسرے زخمی مسلمان کے پاس گیا اور اُس سے پانی پینے کے لئے کہا۔ مگر اُس نے بھی انکار کر دیا اور کہا کہ پہلے میرے پہلو میں جو مسلمان ہے اُس کے پاس جاؤ اور اس کو پانی پلاؤ۔ کیونکہ وہ مجھ سے زیادہ مستحق ہے۔ چنانچہ وہ اگلے مسلمان کے پاس گیا۔ لیکن اُس نے بھی انکار کر دیا اور اگلے مسلمان کو پانی پلانے کے لئے کہا۔ غرض وہ مسلمان سپاہی چھاگل لے کر اُن میں سے ہر ایک کے پاس گیا لیکن اُن میں سے ہر ایک نے دوسرے کو پانی پلانے کے لئے کہا۔ جب وہ آخری مسلمان کے پاس پہنچا تو وہ فوت ہو چکا تھا۔ پھر وہ عکرمہؓ کی طرف لوٹا۔ تو اُن کی جان بھی نکل چکی تھی (الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب جلد ۲ صفحہ ۵۲۴) اب دیکھو یہ کتنی بڑی قربانی تھی جو عکرمہؓ نے کی۔ اور یہ دیکھنے والوں کے لئے کتنا بڑا نشان تھا۔ جب مسلمانوں نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مُنہ سے یہ سُنا ہوگا کہ میں نے رؤیا میں دیکھا کہ ایک فرشتہ انگوروں کا ایک خوشہ لایا ہے اور جب میں نے دریافت کیا کہ یہ خوشہ کس کیلئے ہے تو اُس نے جواب دیا ابوجہل کے لئے جس کی وجہ سے مَیں گھبرا گیا۔ اور اسی گھبراہٹ میں میری آنکھ کھل گئی۔ اور مَیں نے کہا۔ کیا خدا تعالیٰ کا دشمن اور اُس کا رسول برابر ہو سکتے ہیں۔ اور پھر بعد میں انہوں نے اپنی آنکھوں سے یہ واقعہ دیکھا ہوگا کہ کس طرح عکرمہؓ نے خطرناک حالات میں اپنی جان کی قربانی پیش کی۔ وہ پانی کے ایک قطرہ کے لئے تڑپتے ہوئے فوت ہو گئے لیکن پانی کو اسلئے نہ چھوا کہ جب تک میرے دوسرے مسلمان بھائی سیر نہ ہو جائیں میں پانی نہیں پیوں گا۔ تو اُن کا ایمان کس طرح بڑھا ہوگا۔ انہوں نے کہا ہوگا کہ اوّل تو عکرمہؓ کا اسلام لانا ہی ناممکن تھا۔ اور پھر اُن کا اسلام لانے کے بعد اتنا بڑا اخلاص پیدا کرنا اور اتنی بڑی قربانی کرنا ناممکن تھا مگر خدا تعالیٰ نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جو رؤیا دکھایا تھا اُس نے وہ پورا کر کے دکھا دیا۔ اس رؤیا کے یہی معنے تھے کہ انگور کے اندر چونکہ پانی ہوتا ہے اس لئے وہ پانی کی پیاس میں مرینگے اور اللہ تعالیٰ کے فرشتے انہیں جنت کے انگوروں کے خوشے چوسائینگے۔ بس یہ واقعہ یقیناً آیات مبیّنات میں سے تھا جسے دیکھ کر مسلمانوں کے ایمان خدا تعالیٰ پر اور اسلام کی سچائی پر اور زیادہ پختہ ہو گئے۔ اس قسم کے نشانات کے متعلق

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ لَقَدْ اَنْزَلْنَآ اٰیٰتٍ مُّبَیِّنٰتٍ ہم نے قرآن کریم کے ذریعہ ایسے نشانات نازل کئے ہیں جو خدا تعالیٰ کو بے نقاب کر کے انسان کے سامنے کھڑا کر دیتے ہیں۔ غیروں کیلئے تو خدا تعالیٰ ایک پوشیدہ چیز ہے مگر مسلمانوں کے لئے وہ پوشیدہ چیز نہیں کیونکہ وہ نشانات کے ذریعہ اُن کے سامنے آجاتا ہے۔

دوسری مثال رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں حضرت عمرو بن العاصؓ کی ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمروؓ ابتدائی صحابہؓ میں سے تھے اور اپنے باپ سے بہت پہلے مسلمان ہو گئے تھے۔ آپ نے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہی مدینہ کی طرف ہجرت کی تھی آپ کا طریق تھا کہ آپ مسجد میں بیٹھے رہتے تاکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم گھر سے باہر نکلیں اور کوئی بات کریں تو اسے لکھ لیں۔ چونکہ انکو لکھنا آتا تھا اس لئے وہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی احادیث لکھا کرتے تھے مگر بعد میں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے انہیں ایسا کرنے سے منع کر دیا اور فرمایا میں قرآن کریم لکھواتا ہوں ایسا نہ ہو کہ کوئی لکھی ہوئی چیز دیکھ کر لوگوں کو یہ شبہ پیدا ہو کہ وہ بھی قرآن کریم کا ہی حصہ ہے۔ جب انکے والد حضرت عمروؓ بن العاص فوت ہونے لگے تو یہ اُن کی خبر لینے کے لئے گئے موت کے وقت اُن کی حالت سخت کرب اور اضطراب کی تھی کبھی وہ دائیں کروٹ بدلتے اور کبھی بائیں اور کہتے یا اللہ مجھے معاف کر مجھے معلوم نہیں میں نے کیا کیا گناہ کئے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عمروؓ نے کہا۔ آپ اتنا گھبراتے کیوں ہیں۔ آپ کا انجام تو اچھا ہی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کی توفیق دی۔ اور اب تک اسلام پر قائم رکھا۔ پھر آپ کو فکر کرنے کی کیا ضرورت ہے حضرت عمروؓ بن العاص کہنے لگے میرے بیٹے تم ٹھیک کہتے ہو۔ خدا تعالیٰ نے فضل کیا اور مجھے محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کی توفیق عطا فرمائی۔ لیکن کاش میں اُسی وقت مارا جاتا اور مجھے شہادت نصیب ہوتی۔ میرے بیٹے! رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ میں لڑائیاں ہوئیں اور میں اُن جنگوں میں حضرت معاویہؓ کی طرف سے حصہ لیتا رہا مجھے معلوم نہیں کہ ان لڑائیوں میں مجھ سے کیا کیا غلطیاں ہوئیں۔ اس خیال کے آنے پر مجھے گھبراہٹ ہوتی ہے کہ معلوم نہیں خدا تعالیٰ مجھے معاف بھی کرے گا یا نہیں۔ پھر آپ نے فرمایا۔ میرے بیٹے! جب میں اسلام کا دشمن تھا تو میری دشمنی کا یہ حال تھا کہ اگر مجھے پتہ لگتا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سامنے گلی میں آرہے ہیں تو میں اپنی آنکھیں بند کر لیتا تاکہ مجھے آپ کی شکل نظر نہ آئے۔ اور اگر کوئی شخص اُس وقت مجھ سے پوچھتا کہ محمد رسول اللہ کا حلیہ کیا ہے تو میں آپ کا حلیہ نہیں بتا سکتا تھا کیونکہ جب آپ کی شکل سامنے آتی تھی میں آنکھیں بند کر لیتا تھا۔ پھر جب میں ایمان لایا تو خدا تعالیٰ نے مجھے ایسا ایمان بخشا کہ آپ کی محبت اور رُعب کی وجہ سے میں آپ کے چہرہ پر نظر نہیں ڈالتا تھا بلکہ آپ کے سامنے میں ہمیشہ اپنی آنکھیں نیچی رکھتا اور میں خیال کرتا کہ آپ اتنے معزز اور بلند مقام پر ہیں کہ میرے جیسے گنہگار آدمی کو آپ کا چہرہ دیکھنے کا کوئی حق نہیں۔ اے میرے بیٹے! کفر کی حالت میں بھی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرے سامنے آئے اور ایمان کی حالت میں بھی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرے سامنے آئے۔ لیکن اگر اب بھی مجھ سے کوئی

پوچھے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حلیہ کیا تھا تو میں نہیں بتا سکتا۔ کیونکہ کفر میں بغض کی وجہ سے میں نے آپ کی شکل نہیں دیکھی اور ایمان میں محبت اور رعب کی وجہ سے میں نے آپ کی شکل نہیں دیکھی۔ اب دیکھو عاصؔ جیسے شدید دشمنِ اسلام کا بیٹا جو ایمان لانے سے پہلے خود بھی محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے سخت بغض رکھتا تھا اللہ تعالیٰ نے اس کو ایمان لانے کی سعادت بخشی۔ اور اُسے ایسا مقام دیا کہ اُس نے اسلام کے لئے بڑی بڑی جنگیں لڑیں۔ اور مصر کو اسلام کے لئے فتح کیا مسلمان جب پڑھتے ہونگے کہ اسلام کے شدید دشمنوں ولید اور عاصؔ کی اولاد اسلام کی گود میں آگئی اور اُن کے بیٹوں نے اسلام لانے کے بعد بڑی بھاری قربانیاں کیں تو اُن کا ایمان کس قدر بڑھتا ہوگا۔

پھر میں نے ہندہ کا واقعہ بیان کیا ہے۔ اُس کے بغض کی یہ کیفیت تھی کہ اُس نے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت حمزہؓ کا کلیجہ نکلوایا اور آپ کا ناک اور کان کٹوائے۔ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ فتح کیا تو آپ نے جن لوگوں کے گرفتار کرنے اور قتل کرنے کا حکم دیا تھا۔ اُن میں ہندہ بھی شامل تھیں جب عورتوں کی بیعت کا وقت آیا تو ہندہ بھی مونہہ چھپائے اُن میں جا بیٹھی اور بیعت میں شامل ہوگئی جب قرآنی ہدایت کے مطابق رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے یہ اقرار لیا کہ ہم چوری نہیں کریں گی۔ زنا نہیں کرینگی۔ جھوٹ نہیں بولیں گی شرک نہیں کریں گی۔ تو اس آخری فقرہ پر کہ ہم شرک نہیں کریں گی۔ ہندہ بول اٹھی کہ یا رسول اللہ! آپ کیا کہتے ہیں۔ کیا ہم اب بھی شرک کریں گی۔ ہم مکہ والے متحد ہو کر آپ کے مقابلہ میں آئے۔ سارا عرب ہمارے ساتھ تھا اور آپ اکیلے تھے۔ ہم نے آپ کے ساتھ لڑائی کی مگر آپ نے کہا کہ خدا تعالیٰ میرے ساتھ ہے اور وہ میری مدد کرے گا۔ اور ہم نے کہا کہ آپ کا خدا جھوٹا ہے وہ آپ کی مدد نہیں کرے گا۔ ہمارے بُت آپ کے خدا سے زیادہ طاقتور ہیں وہ آپ کے خلاف ہماری مدد کریں گے۔ مگر ہُوا کیا۔ ہُوا یہ کہ آپ جیت گئے اور ہم ہار گئے۔ اگر ہمارے بتوں میں کوئی طاقت ہوتی اور آپ کا خدا جھوٹا ہوتا تو ہم یقیناً جیت جاتے۔ اتنے بڑے نشان کو دیکھنے کے بعد اب ہم کس طرح شرک کر سکتی ہیں۔ جب ہندہ کی آواز رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے سُنی تو آپ نے فرمایا۔ ہندہ ہے؟ وہ جھٹ بول اٹھی کہ ہوں تو ہندہ۔ مگر اب میں مسلمان ہوگئی ہوں اور خدا تعالیٰ نے اسلام لانے پر میرے سارے گناہ معاف کر دیئے ہیں۔ اب آپ مجھے کچھ نہیں کہہ سکتے۔ آپ نے فرمایا۔ ہندہ۔ تو ٹھیک کہتی ہے۔ جس طرح ہندہ کیلئے فتح مکہ آیاتِ مبیّنات میں سے تھی اسی طرح اُس کی یہ گفتگو ہمارے لئے آیاتِ مبیّنات میں سے ہے۔ ایسی شدید دشمنِ اسلام عورت کو خدا تعالیٰ نے ہدایت دیدی اور اُس کا دل کھل گیا۔ اور پھر ایسا دل کھلا کہ وہ بعد میں عیسائیوں کے مقابلہ میں لڑی جانے والی جنگوں میں شامل ہوئی۔ اس کا ایک لڑکا یزید جو حضرت معاویہؓ سے بڑا تھا اور بہت مخلص تھا اور اس کا خاوند ابو سفیانؓ جو اسلام لانے سے پہلے اسلام کا شدید دشمن تھا دونوں عیسائیوں کے ساتھ لڑنے کے لئے ایک جنگ میں شریک ہوئے۔ عیسائیوں کا لشکر بہت بڑا تھا اور مسلمانوں کی تعداد اس کے مقابلہ میں بہت کم تھی۔ اس جنگ میں ایک موقعہ پر اسلامی لشکر پیچھے کو بھاگا۔ بھاگنے والوں میں ابو سفیان اور اُن کے بیٹے یزید بھی تھے۔ پیچھے عورتیں کھڑی تھیں۔ اگر اُس وقت مسلمانوں کے قدم نہ جمتے تو مدینہ تک دشمن کے راستہ میں کوئی روک نہیں تھی۔ ہندہ نے مسلمان سپاہیوں کو بھاگتے ہوئے دیکھا۔ تو اس نے

عورتوں کو جمع کیا۔ اور کہا مردوں کے پاؤں اکھڑ گئے ہیں۔ آؤ ہم اسلام کے لئے لڑائی کریں۔ انہوں نے کہا کہ ہمارے پاس لڑنے کے لئے کیا سامان ہے؟ ہندہ نے کہا۔ سامان تو نہیں ہے لیکن ایک چیز ہے خیموں کی چوبیں اتار لو۔ اور ہاتھ میں لے لو۔ اور مسلمان سپاہی جو دوڑتے ہوئے آرہے ہیں۔ اُن کے اونٹوں کو اِن چوبوں سے مارو۔ اور کہو بے شرمو تم کافروں سے بھاگ رہے ہو۔ چنانچہ عورتوں نے چوبیں اتار لیں۔ ہندہ نے بھی ایک چوب اُتار لی۔ اور سب عورتوں کو لیکر بھاگتے ہوئے اسلامی لشکر کے آگے کھڑی ہوگئی۔ سب سے آگے اُس کا خاوند ابوسفیان اور اُس کا بیٹا یزید تھے۔ عورتوں نے اُن کے اونٹوں کے مونہوں پر چوبیں ماریں اور کہا بے شرمو! تمہیں شرم نہیں آتی کہ تم کافروں کے مقابلہ میں شکست کھا کر بھاگے چلے آرہے ہو۔ اس موقعہ پر ہندہ نے ابوسفیانؓ کو مخاطب کرکے کہا جب تُو کافر تھا تو بہادری کے ساتھ اونٹ پر سوار ہوکر تو محمد رسول اللہ کے لشکر پر حملہ کرنے جایا کرتا تھا۔ اب تُو مسلمان ہوگیا ہے تو تُو عیسائیوں کو پیٹھ دکھا رہا ہے۔ تجھے ایسا کرتے ہوئے شرم نہیں آتی۔ اس کا ابوسفیانؓ پر ایسا اثر ہُوا کہ اُس نے اپنے بیٹے کی طرف مڑکر دیکھا اور کہا۔ بیٹا! عورتوں کے سونٹے عیسائیوں کی تلواروں سے زیادہ خطرناک ہیں چلو واپس لوٹو اب خواہ ہم مریں یا جئیں اس کی پرواہ نہیں۔ چنانچہ دونوں واپس لوٹے اور پھر سارا اسلامی لشکر بھی واپس لوٹا اور اُن کی شکست فتح سے بدل گئی۔ یہ تھی وہ ہندہ جو ایک وقت اسلام کی اتنی شدید دشمن تھی کہ شعر پڑھ پڑھ کر کفار کو مسلمانوں کے خلاف جنگ کرنے کے لئے اُکسایا کرتی تھی۔ فتح مکہ کے بعد اُسی کے قتل کا فتویٰ جاری کیا گیا لیکن قبل اس کے کہ اُسے گرفتار کیا جاتا وہ عورتوں میں چھپ کر بیعت میں شامل ہوگئی۔ کیا اُس کے متعلق اس وقت کوئی انسان یہ خیال بھی کرسکتا تھا کہ کسی وقت یہ عورت اسلام میں داخل ہوگی اور پھر اسلام کے لئے شاندار قربانیاں کرنے والی ہوگی۔ لیکن وہی ہندہ جو اسلام کی شدید دشمن تھی اسلام لانے کے بعد اسلامی فتوحات میں حصہ دار بن گئی۔ غرض تاریخ اسلام کا ایک ایک واقعہ پڑھا جائے تو یُوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ لَقَدْ اَنْزَلْنَآ اٰيٰتٍ مُّبَيِّنٰتٍ کے مطابق ایک ایسا نشان ہے جو حقیقتِ حال کو کھول کر سامنے رکھ دیتا ہے اور بتاتا ہے کہ اے مسلمانو! تم پر اسلام میں داخل ہونا کوئی بوجھ نہیں کیونکہ دوسرے لوگوں کے لئے اُن کے مذہب غیب نہیں لیکن تمہارا مذہب وہ ہے جو خدا تعالےٰ کی غیبی طاقتوں کو ظاہر کر دیتا ہے اور اُس کے مقابلہ میں کوئی اور مذہب نہیں ٹھہر سکتا۔

پھر دیکھ لو یہ نمونہ آج تک چلا آرہا ہے۔ اسلام میں ہر زمانہ میں ایسے لوگ پیدا ہوئے جو لَقَدْ اَنْزَلْنَآ اٰيٰتٍ مُّبَيِّنٰتٍ کے ذریعہ اسلام کی روشنی کو ظاہر کرتے رہے۔ چنانچہ ابتدائی زمانہ میں حضرت جنید بغدادیؒ ہوئے۔ حضرت سید عبد القادر صاحب جیلانیؒ ہوئے۔ شبلیؒ ہوئے۔ ابراہیم ادھمؒ ہوئے۔ ابن تیمیہؒ ہوئے ابن قیمؒ ہوئے۔ امام غزالیؒ ہوئے۔ حضرت محی الدین صاحب ابن عربیؒ ہوئے۔ اور ان کے علاوہ ہزاروں اور بزرگ ہوئے۔ پھر آخری زمانہ میں حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ محدث دہلوی ہوئے۔ خواجہ باقی باللہؒ ہوئے۔ خواجہ معین الدین صاحب چشتیؒ ہوئے۔ شیخ شہاب الدین صاحب سہروردیؒ ہوئے۔ خواجہ بہاؤ الدین صاحب نقشبندیؒ ہوئے۔ نظام الدین صاحب اولیاءؒ ہوئے۔ خواجہ قطب الدین صاحب بختیار کاکیؒ ہوئے۔ فرید الدین صاحب شکر گنجؒ ہوئے۔ حضرت سید احمد صاحبؒ بریلوی ہوئے حضرت شیخ احمد صاحبؒ سرہندی مجدد الف ثانی ہوئے۔

وَ يَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَ بِالرَّسُوْلِ وَ اَطَعْنَا ثُمَّ يَتَوَلّٰى

اور وہ کہتے ہیں ہم اللہ اور اُس کے رسول پر ایمان لائے اور ہم نے اطاعت کا وعدہ کر لیا پھر اُن میں سے

فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ ؕ وَ مَاۤ اُولٰٓئِكَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۴۸﴾

ایک گروہ اس کے بعد (اپنے اقرار سے) پھر جاتا ہے۔ اور ایسے لوگ ہرگز مومن نہیں۔

وَ اِذَا دُعُوْۤا اِلَى اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ اِذَا

اور جب اُن کو اللہ اور اُس کے رسول کی طرف اسلئے بلایا جاتا ہے تاکہ وہ اُن کے درمیان فیصلہ کرے۔ تو

فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿۴۹﴾ وَ اِنْ يَّكُنْ لَّهُمُ الْحَقُّ

اُن میں سے ایک گروہ اعراض کرنے لگ جاتا ہے۔ اور اگر کوئی بات اُن کے حق میں ہو

یہ سب لوگ خدا تعالےٰ کا قرب پاکر اٰیٰتٍ مُّبَیِّنٰتٍ کا مقام حاصل کر گئے اور اِن میں سے ہر شخص کو دیکھ کر لوگ اپنا ایمان تازہ کرتے تھے۔ پھر جب اُن کا نور دھندلا ہؤا تو خدا تعالےٰ نے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کو ہمارے اندر پیدا کیا اور آپ کا وجود ہمارے لئے آیات مبیّنات بن گیا۔ جو شخص بھی آپ کے پاس بیٹھا اُسکو قرآن کریم اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سچائی نظر آ گئی اور کوئی چیز اسکو اسلام سے ہٹانے والی نہ رہی۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام پر جب کرم دین جہلمی والا مقدمہ ہؤا تو مجسٹریٹ ہندو تھا آریوں نے اسے ورغلایا اور کہا کہ وہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کو ضرور کچھ نہ کچھ سزا دے اور اُس نے ایسا کرنے کا وعدہ بھی کر لیا۔ خواجہ کمال الدین صاحب نے یہ بات سُنی تو ڈر گئے۔ وہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی خدمت میں گورداسپور حاضر ہوئے جہاں مقدمہ کے دوران میں آپ ٹھہرے ہوئے تھے اور کہنے لگے حضور بڑے فکر کی بات ہے۔ آریوں نے مجسٹریٹ سے کچھ نہ کچھ سزا دینے کا وعدہ لے لیا ہے اُس وقت حضرت مسیح موعود علیہ السلام لیٹے ہوئے تھے آپ فوراً اُٹھ کر بیٹھ گئے اور فرمایا۔ خواجہ صاحب خدا کے شیر پر کون ہاتھ ڈال سکتا ہے! میں خدا کا شیر ہوں وہ مجھ پر ہاتھ ڈال کر تو دیکھے۔ چنانچہ ایسا ہی ہؤا۔ دو مجسٹریٹ تھے جن کی عدالت میں یکے بعد دیگرے یہ مقدمہ پیش ہؤا اور اِن دونوں کو بڑی سخت سزا ملی اِن میں سے ایک تو معطّل ہؤا اور ایک کا بیٹا دریا میں ڈوب کر مر گیا اور وہ اس غم میں نیم پاگل ہو گیا۔ اِس پر اِس واقعہ کا اتنا اثر تھا کہ ایک دفعہ میں دہلی جا رہا تھا کہ وہ لدھیانہ کے سٹیشن پر مجھے ملا اور بڑے الحاح سے کہنے لگا کہ دُعا کریں اللہ تعالےٰ مجھے صبر کی توفیق دے مجھ سے بڑی بڑی غلطیاں ہوئی ہیں اور میری حالت ایسی ہے کہ میں ڈرتا ہوں کہ میں کہیں پاگل نہ ہو جاؤں۔ اب میرا ایک اور بیٹا ہے دُعا کریں کہ اللہ تعالیٰ اسے اور مجھے دونوں کو تباہی سے بچائے۔ غرض حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی وہ بات پوری ہوئی کہ خدا تعالےٰ کے شیر پر کون ہاتھ ڈال سکتا ہے اور آریوں کو اُن کے مقصد میں ناکامی ہوئی۔

يَأْتُوْٓا إِلَيْهِ مُذْعِنِيْنَ ﴿٥٠﴾ أَفِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ أَمِ ارْتَابُوْٓا

تو وہ فوراً اظہارِ اطاعت کرتے ہوئے آجاتے ہیں ۔ کیا اُن کے دلوں میں کوئی بیماری ہے؟ یا وہ شبہ میں پڑے ہوئے ہیں ۔

أَمْ يَخَافُوْنَ أَنْ يَّحِيْفَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَرَسُوْلُهٗ ؕ بَلْ

یا وہ ڈرتے ہیں کہ اللہ اور اُس کا رسول اُن پر ظلم کریگا ۔ ایسا ہرگز نہیں بلکہ

أُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿٥١﴾ إِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِيْنَ

ع ۶ ۱۲

وہ خود ظالم ہیں ۔ مومنوں کا جواب جب وہ

إِذَا دُعُوْٓا إِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ أَنْ

اللہ اور اُس کے رسول کی طرف بُلائے جائیں کہ وہ اُن کے درمیان فیصلہ کریں یہ ہوا کرتا ہے کہ

يَّقُوْلُوْا سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا ؕ وَأُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿٥٢﴾

ہم نے سُنا اور ہم نے مان لیا ۔ اور وہی لوگ کامیاب ہوا کرتے ہیں ۔

وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَخْشَ اللّٰهَ وَيَتَّقْهِ

اور جو لوگ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کریں اور اللہ سے ڈریں اور اس کا تقویٰ اختیار کریں

فَأُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ ﴿٥٣﴾

وہ بامراد ہو جاتے ہیں ۵۳

یہ آیات مبیّنات ہیں جن کے ذریعہ اللہ تعالیٰ دنیا میں اپنے انبیاء کی سچائی ظاہر کرتا رہتا ہے ۔ مگر فرماتا ہے وَاللّٰهُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ إِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۔ آیات مبیّنات کے ذریعہ اللہ تعالیٰ دنیا کو بیناچہرہ تو دکھا دیتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ صراط مستقیم اللہ تعالیٰ کے فضل کے بغیر میسر نہیں آسکتا اس لئے انسان کو چاہیئے کہ وہ ہمیشہ اللہ تعالیٰ کے حضور عاجزانہ طور پر دُعائیں کرتا رہے کہ وہ خود اسکی صراط مستقیم کی طرف راہنمائی فرمائے اور پھر اُسے صراط مستقیم پر ہمیشہ کے لئے قائم بھی رکھے کیونکہ سورۂ فاتحہ کی دُعا نے بتا دیا ہے کہ صراط مستقیم حاصل ہو جانے کے بعد بھی انسان کیلئے گرنے اور مغضوب یا ضال ہونیکا خطرہ ہوتا ہے اور اس خطرہ سے نجات کی طرف یہی صورت ہوتی ہے کہ انسان ہر وقت آستانۂ الوہیت پر گرا رہے اور دُعاؤں سے اس کی مدد حاصل کرتا رہے ۔

۵۳ حل لغات :- مُذْعِنِيْنَ ۔ أَذْعَنَ سے اسم فاعل کا صیغہ مُذْعِنٌ آتا ہے اور مُذْعِنِيْنَ جمع کا صیغہ ہے ۔ أَذْعَنَ الرَّجُلُ کے معنے ہوتے ہیں أَسْرَعَ الطَّاعَةَ اُس نے جلدی سے اطاعت کی ۔ خَضَعَ وَذَلَّ

مُذْعِنِيْنَ

وَانْقَادَ۔ اُس نے عاجزی کی اور اس کے سامنے جھک گیا (اقرب) پس مُذْعِنٌ کے معنے ہونگے جلدی اطاعت کرنیوالا اور مُذْعِنِیْنَ کے معنے ہونگے جلدی اطاعت کرنیوالے۔

یَحِیْفُ: حَافَ سے مضارع کا صیغہ ہے۔ اور حَافَ عَلَیْہِ کے معنے ہوتے ہیں جَارَ وَ ظَلَمَ۔ اُس پر ظلم کیا اور زیادتی کی (اقرب) پس یَحِیْفُ کے معنے ہونگے وہ ظلم اور زیادتی کریگا۔

تفسیر:۔ فرماتا ہے بعض لوگ اللہ اور رسول کے ساتھ ہونے کا دعویٰ تو کر دیتے ہیں لیکن جب آزمائش کا موقعہ آتا ہے تو وہ پیٹھ پھیر لیتے ہیں اور یہ اس بات کا ثبوت ہوتا ہے کہ وہ مومن نہیں اور وقت پر کچے دھاگے ثابت ہوتے ہیں۔ ہاں اگر اُن کو کچھ ملتا ہو تو دوڑے چلے آتے ہیں اور اگر نہ ملتا ہو تو بھاگ جاتے ہیں جو اس بات کا ثبوت ہوتا ہے کہ یا تو ان کے دلوں میں کوئی بیماری ہے یا اُن کو ایمان نصیب نہیں ہؤا۔ یا وہ اس بات سے ڈرتے ہیں کہ اللہ اور اس کے رسول کی بات کو مانا تو اُن کو نقصان پہنچیگا۔ اِس کے مقابل میں مومنوں کا رویہ یہ ہوتا ہے کہ جب اُن کو اللہ اور اس کے رسول کی طرف کسی فیصلہ کے لئے بلایا جاتا ہے تو وہ کہتے کہ ہم نے سُن لیا اور ہم سے اطاعت کرتے ہیں اور آخر اس کے نتیجہ میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ اللہ اور رسول کی اطاعت اور اللہ تعالےٰ سے ڈرنے اور اُس کا تقویٰ اختیار کرنے کے نتیجہ میں انسان ہمیشہ کامیاب ہی ہؤا کرتا ہے۔

یہ آیات قومی ترقی سے تعلق رکھنے والے ایک نہایت ہی اہم اصل پر مشتمل ہیں اور ان میں بتایا گیا ہے کہ آپس کے اختلافات میں جب تک خدا اور اس کے رسول کو حَکَم نہ بنایا جائے اُسوقت تک مسلمان بحیثیت مجموعی کبھی ترقی حاصل نہیں کر سکتے۔ یہ منافقت اور بے ایمانی کی علامت ہوتی ہے کہ جہاں اپنا فائدہ دیکھا وہاں تو خدا اور اُس کے رسول کی بات مان لی۔ اور جہاں یہ نظر آیا کہ اگر میں نے خدا اور اُس کے رسول کی بات مانی تو مجھے نقصان پہنچیگا وہاں ان کے فیصلہ کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ اسلام اس قسم کی منافقت کو جائز قرار نہیں دیتا۔ وہ کہتا ہے کہ تمہارے ایمان کی علامت یہ ہے کہ تم نہ صرف مذہبی امور میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتدا کرو بلکہ اپنے سیاسی اور معاشرتی امور میں بھی آپ کی اقتداء کرو اور آپ کو اپنا حَکَم تسلیم کرو۔ درحقیقت اسلام اُن مذاہب میں سے نہیں جو مذہب کا دائرہ عمل صرف چند عبادات اور افکار تک محدود رکھتے ہیں اور امورِ اعمالِ دنیوی کو ایک علیحدہ عمل قرار دیتے ہیں اور اُن میں کوئی دخل نہیں دیتے۔ ایسے مذہب یہ تو کہیں گے کہ نماز یوں پڑھو۔ روزے یوں رکھو۔ صدقہ وخیرات یوں کرو۔ لوگوں کے حقوق یوں بجا لاؤ مگر کوئی ایسا حکم نہیں دیں گے جس کا نظام کے ساتھ تعلق ہو یا اقتصادیات کے ساتھ تعلق ہو۔ یا بین الاقوامی حالات کے ساتھ تعلق ہو یا لین دین کے معاملات کے ساتھ تعلق ہو یا ورثہ کے ساتھ تعلق ہو۔ اسی قسم کے مذاہب میں سے ایک مسیحی مذہب ہے اور اس مذہب میں جو شریعت کو لعنت قرار دینے پر زور دیا گیا ہے۔ اس کی وجہ بھی زیادہ تر یہی ہے کہ وہ افراد کے اعمال کو مذہب کی پابندیوں سے الگ رکھنا چاہتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں مذہب کا کام صرف یہ ہے کہ وہ کہے تم عبادت کرو۔ تم روزے رکھو تم غریبوں کی خبرگیری کرو۔ تم عیسیٰ کو خدا سمجھو اسے اس بات سے کیا واسطہ ہے کہ قتل اور فساد

یَحِیْفُ

اور چوریوں اور ڈاکوں کے متعلق کیا احکام ہیں۔ یا یہ کہ قومیں آپس میں کس طرح معاہدات کریں۔ یا اقتصاد کو کس طرح حدود میں رکھا جا سکتا ہے۔ ان کے نزدیک شریعت کا ان امور سے کوئی واسطہ نہیں۔ چنانچہ اگر لڑکوں اور لڑکیوں کو ورثہ میں حصہ دینے کا سوال ہو تو وہ کہہ دیں گے کہ اس میں شریعت کا کیا دخل ہے۔ یہ ہمارے ملک کی پارلیمنٹ کا کام ہے کہ وہ جس امر میں قوم کا فائدہ دیکھے اسے بطور قانون نافذ کر دے۔ اسی طرح وہ کہتے ہیں اگر ہم فیصلہ کریں کہ ہم سود لیں گے چاہے روپیہ کی صورت میں ہو اور چاہے جنس کی صورت میں تو مذہب کو کیا حق ہے کہ وہ یہ کہے کہ روپیہ کے بدلہ میں سودی روپیہ لینا ناجائز ہے۔ غرض وہ مذہب کے ان احکام سے جو نظام کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں شدید نفرت کرتے ہیں۔ اسی لئے انہوں نے شریعت کو لعنت قرار دے رکھا ہے۔

اس کے بالمقابل بعض دوسرے مذاہب ایسے ہیں جنہوں نے مذہب کے دائرہ کو وسیع کیا ہے اور انسانی اعمال اور باہمی تعلقات اور نظامِ حکومت وغیرہ کے متعلق بھی قواعد بنائے ہیں۔ اور جو لوگ ایسے مذاہب کو مانتے ہیں لازماً انہیں یہ بھی ماننا پڑتا ہے کہ حکومت کے معاملات میں بھی مذہب کو دخل اندازی کا حق حاصل ہے اور نیز یہ کہ ان احکام کی پابندی افراد اور جماعتوں پر اسی طرح واجب ہے جس طرح عقائد اور انفرادی احکام۔ مثلاً نماز اور روزہ وغیرہ میں واجب ہے۔ اس کی مثال میں یہودی مذہب کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ اگر کوئی شخص موسوی شریعت کو پڑھے تو اُسے جا بجا یہ لکھا ہوا نظر آئیگا کہ اگر کوئی قتل کرے تو اُسے یہ سزا دی جائے چوری کرے تو یہ سزا دی جائے۔ جنگ ہو تو ان قواعد کو ملحوظ رکھا جائے۔ قربانی کرنی ہو تو ان اصول کے ماتحت کی جائے اسی طرح لین دین اور تجارت وغیرہ معاملات کے متعلق وہ ہدایات دیتا ہے۔ غرض وہ معاملات جو حکومت کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں یہودی مذہب اُن میں دخل دیتا ہے۔ اب ہمیں دیکھنا چاہیئے کہ اسلام کس قسم کے مذاہب سے مشابہت رکھتا ہے۔ آیا اول الذکر قسم سے یا دوسری قسم کے مذاہب سے اس غرض کے لئے جب قرآن کریم اور احادیث نبویہ کو دیکھا جاتا ہے تو اُن پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے ہی یہ امر ثابت ہو جاتا ہے کہ اسلام پہلی قسم کے مذاہب میں شامل نہیں بلکہ دوسری قسم کے مذاہب میں شامل ہے اُس نے صرف بعض عقائد اور انفرادی اعمال بتانے پر ہی اکتفا نہیں کیا۔ بلکہ اُس نے ان احکام کو بھی لیا ہے جو حکومت اور قانون سے تعلق رکھتے ہیں۔ چنانچہ وہ صرف یہی نہیں کہتا کہ نمازیں پڑھو۔ روزے رکھو۔ حج کرو زکوٰۃ دو بلکہ وہ ایسے احکام بھی دیتا ہے جن کا حکومت اور قانون سے تعلق ہوتا ہے۔ مثلاً وہ میاں بیوی کے تعلقات پر بحث کرتا ہے۔ وہ بتاتا ہے کہ مرد اور عورت کے درمیان اگر جھگڑا ہو جائے تو کیا کیا جائے۔ اور اُن کی باہمی مصالحت کے لئے کیا تدابیر عمل میں لائی جائیں اور اگر کبھی مرد کو اس بات کی ضرورت پیش آئے کہ وہ عورت کو بدنی سزا دے تو وہ کتنی اور کیسی ہو۔ اسی طرح وہ لین دین کے قواعد پر بھی بحث کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ قرض کے متعلق کتنے گواہ تسلیم کئے جا سکتے ہیں۔ قرضہ کی کونسی صورتیں جائز ہیں اور کونسی ناجائز۔ وہ تجارت اور فنانس کے اصول بھی بیان کرتا ہے جن پر قضاء کی بنیاد ہے۔ چنانچہ وہ بتاتا ہے کہ کیسے گواہ ہونے چاہئیں کتنے ہونے چاہئیں۔ انکی گواہی میں کن کن امور کو ملحوظ رکھنا چاہیئے اسی طرح وہ قضاء کے متعلق کئی قسم کے احکام دیتا ہے اور بتاتا ہے کہ قاضیوں کو کس طرح فیصلہ کرنا چاہیئے پھر ان مختلف انسانی افعال کی وہ جسمانی سزائیں بھی تجویز کرتا ہے جو عام طور پر قوم کے سپرد ہوتی ہیں مثلاً

قتل کی کیا سزا ہے یا چوری کی کیا سزا ہے۔ اسی طرح وہ وراثت کے قوانین بھی بیان کرتا ہے۔ حکومت کو ٹیکس کا جو حق حاصل ہے اس پر بھی پابندیاں لگاتا ہے اور ٹیکسوں کی تفصیل بیان کرتا ہے۔ حکومت کو ان ٹیکسوں کے خرچ کرنے کے متعلق جو اختیارات حاصل ہیں اُن کو بھی بیان کرتا ہے۔ فوجوں کے متعلق قواعد بیان کرتا ہے۔ معاہدات کے متعلق قواعد بیان کرتا ہے۔ وہ بتاتا ہے کہ دو قومیں جب آپس میں کوئی معاہدہ کرنا چاہیں تو کن اصول پر کریں اسی طرح بین الاقوامی تعلقات کے متعلق قواعد بیان کرتا ہے۔ مزدور اور ملازم رکھنے والوں کے متعلق قواعد بیان کرتا ہے۔ سڑکوں وغیرہ کے متعلق قواعد بیان کرتا ہے۔ چنانچہ اسی ہدایت کے ماتحت جب بغداد بنایا گیا۔ تو بڑی سڑکیں ساٹھ فٹ کی رکھی گئیں اور چھوٹی سڑکیں تیس فٹ کی رکھی گئیں۔ غرض وہ تمام امور جو حکومت سے تعلق رکھتے ہیں اُن سب کو اسلام بیان کرتا ہے۔ اور ساتھ ہی وہ تفقہ کا قانون بھی بیان کرتا ہے جس سے قوانین بنانے والوں کی راہنمائی ہو جاتی ہے۔

پس جو شخص اسلام کو مانتا ہے اور اس میں حکومت کے متعلق تمام احکام کو تفصیل سے بیان کیا ہوا دیکھتا ہے وہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ مذہب کو ان امور سے کیا واسطہ بلکہ اُسے تسلیم کرنا پڑیگا کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے وہ افعال جو حکومت سے تعلق رکھتے ہیں وہ بھی ویسے ہی قابلِ تقلید ہیں جیسے نماز اور روزہ وغیرہ کے متعلق احکام۔ کیونکہ جس خدا نے یہ کہا ہے کہ نماز پڑھو۔ جس خدا نے یہ کہا ہے کہ روزے رکھو جس خدا نے یہ کہا ہے کہ حج کرو جس خدا نے یہ کہا ہے کہ زکوٰۃ دو اُسی خدا نے امور سیاست اور تنظیم ملکی کے متعلق بھی احکام بیان کئے ہیں۔ اور فرمایا ہے۔ اِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذَا دُعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ اَنْ يَّقُوْلُوْا سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (نور ع ۷) کہ مومنوں کو جب خدا اور اس کا رسول بلاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ آؤ ہم تمہارے جھگڑے کا فیصلہ کر دیں تو وہ یہی کہتے ہیں کہ سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا۔ حضور کا حکم ہم نے سُن لیا۔ اور ہم ہمیشہ حضور کی اطاعت کرینگے۔ اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ یہی لوگ ہیں جو کامیاب ہونگے اور ہمیشہ مظفر و منصور رہیں گے۔ اب ایک طرف رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے فیصلوں کو تسلیم کرنے کے ساتھ ایمان کو وابستہ قرار دینا اور دوسری طرف انہی لوگوں کو کامیاب قرار دینا جو سَمِعْنَا اور اَطَعْنَا کہیں اور آپ کے کسی فیصلہ کے خلاف نہ چلیں بتاتا ہے کہ اگر کوئی شخص ان احکام کو نہ مانے تو وہ خدائی گرفت میں آجاتا ہے۔

اسی مضمون کی طرف سورۂ نساء میں بھی اللہ تعالیٰ نے ان الفاظ میں توجہ دلائی ہے کہ فَلَا وَ رَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا (نساء ع ۹) یعنی یہ لوگ کبھی مومن نہیں کہلا سکتے جب تک یہ اپنے جھگڑوں میں اے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تجھے حَکَم تسلیم نہ کریں اور پھر تیری قضاء پر دل و جان سے وہ راضی نہ ہوں۔ اس آیت کریمہ میں دو نہایت اہم باتیں بیان کی گئی ہیں اوّل یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو آخری قاضی قرار دیا ہے اور فرماتا ہے کہ آپ کے فیصلہ پر کسی اَور کے پاس کسی کو اپیل کا ہرگز حق حاصل نہیں ہوگا اور آخری فیصلہ کا حق رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دینا بتاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کو حکومت کے اختیارات حاصل تھے۔ دوسری بات جو اس سے ظاہر ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے ان

وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ لَئِنْ اَمَرْتَهُمْ

اور وہ لوگ اللہ (تعالیٰ) کی پکی قسمیں کھاتے ہیں۔ کہ اگر تو اُن کو حکم دے تو وہ فوراً

لَيَخْرُجُنَّ ؕ قُلْ لَّا تُقْسِمُوْا ۚ طَاعَةٌ مَّعْرُوْفَةٌ ؕ اِنَّ

گھروں سے نکل کھڑے ہونگے۔ کہو قسمیں نہ کھاؤ۔ ہمارا حکم تو یہیں صرف ایسی اطاعت کا ہے جو عرف عام میں اطاعت سمجھی جاتی ہے

اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۵۴﴾ قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا

اللہ (تعالیٰ) اُس سے جو تم کرتے ہو یقیناً خبردار ہے۔ تو کہہ اللہ کی اطاعت کرو اور اُس کے رسول کی

الرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْهِ مَا حُمِّلَ وَعَلَيْكُمْ

اطاعت کرو۔ پس اگر وہ پھر جائیں تو اس (رسول) پر صرف اسکی ذمہ واری ہے جو اُس کے ذمہ لگایا گیا ہے۔ اور تم پر

مَّا حُمِّلْتُمْ ؕ وَاِنْ تُطِيْعُوْهُ تَهْتَدُوْا ؕ وَمَا عَلَى

اُس کی ذمہ واری جو تمہارے ذمہ لگایا گیا ہے۔ اور اگر تم اس کی اطاعت کرو تو ہدایت پا جاؤ گے۔ اور رسول کے ذمہ

فیصلوں کے تسلیم کرنے کو ایمان کا جزو قرار دیتا ہے۔ چنانچہ فرماتا ہے۔ فَلَا وَ رَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ تیرے رب کی قسم وہ کبھی مومن نہیں ہو سکتے جب تک وہ تیرے فیصلوں کو تسلیم نہ کریں۔ گویا یہ بھی دین کا ایک حصّہ ہے اور ایسا ہی [illegible] ہے جیسے نماز دین کا حصّہ ہے جیسے روزہ دین کا حصّہ ہے۔ جیسے حج اور زکوٰۃ دین کا حصّہ ہے۔ فرض کرو زید اور بکر کا آپس میں جھگڑا ہو جاتا ہے۔ ایک کہتا ہے میں نے دوسرے سے دس روپے لینے ہیں اور دوسرا کہتا ہے کہ میں نے کوئی روپیہ نہیں دینا۔ دونوں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچتے ہیں۔ اور اپنے جھگڑے کو آپ کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایک کے حق میں فیصلہ کر دیتے ہیں تو دوسرا اس فیصلہ کو اگر نہیں مانتا تو اللہ تعالیٰ کہتا ہے

وہ مومن نہیں رہا۔ پس باوجودیکہ وہ نماز پڑھتا ہوگا وہ روزے رکھتا ہوگا وہ زکوٰۃ دیتا ہوگا۔ وہ حج کرتا ہوگا۔ اگر وہ [illegible] آ کر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی فیصلہ کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیتا ہے تو اللہ تعالیٰ کا فتویٰ اس کے متعلق یہی ہے کہ اس انکار کے بعد وہ مومن نہیں رہا۔ پس لَا يُؤْمِنُوْنَ کے الفاظ نے بتا دیا کہ خدا تعالیٰ نے اس حصہ کو بھی دین کا ایک جزو قرار دیا ہے علیحدہ نہیں رکھا۔ یہی مضمون اللہ تعالیٰ نے سورۂ نور کی ان زیر تفسیر آیات میں بیان فرمایا ہے اور مسلمانوں کو بتایا ہے کہ تمہارا صرف مُنہ سے خدا اور رسول پر ایمان لانے کا دعویٰ کرنا کوئی چیز نہیں تمہارا ایمان اسوقت [illegible] جا سکتا ہے جب تم اپنے ہر معاملہ میں خدا اور اس کے رسول کو حَکَم تسلیم کرو اور کسی بات میں بھی اُن کے احکام سے انحراف کرنے کی جرأت نہ کرو۔

الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ﴿۵۵﴾ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ

تو بات کو کھول کر پہنچا دینا ہے۔ ۳۳؎ اللہ (تعالیٰ) نے تم میں سے ایمان

اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ

لانے والوں اور مناسب حال عمل کرنے والوں سے وعدہ کیا ہے کہ وہ اُن کو زمین میں خلیفہ

فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۪ وَ

بنا دے گا جس طرح اُن سے پہلے لوگوں کو خلیفہ بنا دیا تھا۔ اور

لَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ

جو دین اُس نے اُن کے لئے پسند کیا ہے وہ اُن کے لئے اُسے مضبوطی سے قائم کر دیگا

وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ۭ يَعْبُدُوْنَنِيْ

اور اُن کی خوف کی حالت کے بعد وہ اُن کے لئے امن کی حالت تبدیل کر دیگا۔ وہ میری عبادت کریں گے

۳۳؎ **تفسیر:۔** فرماتا ہے۔ یہ لوگ پکی قسمیں کھاتے ہیں کہ اگر ہم کو لڑنے کا بھی حکم دیا گیا تو ہم ضرور لڑیں گے۔ تو اُن سے کہہ دے کہ قسمیں کھانے کا کوئی فائدہ نہیں مومنوں والی اطاعت کا نمونہ اصل چیز ہے قسمیں تو منافق سے منافق انسان بھی کھا لیتا ہے پس اللہ اور رسول کی اطاعت کرو اور بڑھ بڑھ کر باتیں نہ بناؤ۔ مومنانہ طریق تو یہ ہوتا ہے کہ اللہ اور اس کے رسول کی عملاً اطاعت کی جائے اور صرف زبانی دعووں پر اپنے ایمان کا انحصار نہ سمجھا جائے۔ لیکن اگر اس نصیحت کے باوجود یہ لوگ پیٹھ پھیر جائیں تو اس رسول پر اسکی کوئی ذمہ واری عائد نہیں ہوتی۔ اسپر صرف اس پیغام کی ذمہ داری ہے جس کا پہنچانا اس کے سپرد کیا گیا ہے اور تم پر ان احکام کے بجا لانے کی ذمہ واری ہے جو تمہارے ذمہ لگائے گئے ہیں۔ ہاں ہم اتنی بات تمہیں ضرور بتا دیتے ہیں کہ اگر تم اس بارہ میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کرو گے تو تمہیں کوئی نقصان نہیں ہوگا بلکہ تم کامیاب ہو جاؤ گے اور فتح پاؤ گے۔ مگر ہم پھر تمہیں کہتے ہیں کہ رسول کا کام صرف دنیا تک خدا تعالیٰ کا پیغام پہنچا دینا ہے۔ ورنہ عملی قدم اٹھانا تمہارا کام ہے۔ جدوجہد کرنا تمہارا کام ہے۔ قربانیاں کرنا تمہارا کام ہے تم صرف اس بات پر خوش نہ ہو جاؤ کہ خدا کا ایک رسول تم میں آیا اور تم نے اُس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا۔ اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال کو دیکھتا ہے اور اُس کے مطابق وہ تم سے سلوک کریگا اگر تم مونہہ سے تو یہ کہتے ہو کہ ہم رسول کے ساتھ ہر میدان میں دشمن سے جنگ کرنے کے لئے تیار ہیں لیکن وقت آنے پر تمہارے قدم لڑکھڑانے لگتے ہیں اور جان دینا تمہیں دوبھر معلوم ہوتا ہے تو تم سمجھ لو کہ تمہارا ایمان خدا تعالیٰ کی نگاہ میں ایک رائی کے برابر بھی قیمت نہیں رکھتا۔ موسیٰؑ کے

لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْـًٔا ۭ وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰۗىِٕكَ

(اور) کسی چیز کو میرا شریک نہیں بنائیں گے - اور جو لوگ اس کے بعد بھی انکار کرینگے وہ

هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝۵۶ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ

نافرمانوں میں سے قرار دئے جائیں گے - اور تم سب نمازوں کو قائم کرو - اور زکوٰۃ دو -

وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ۝۵۷ لَا تَحْسَبَنَّ

اور اس رسول کی اطاعت کرو تاکہ تم پر رحم کیا جائے - (اور اے مخاطب) کبھی خیال نہ کرکہ

الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مُعْجِزِيْنَ فِي الْاَرْضِ ۚ وَمَاْوٰىهُمُ

کفار زمین میں ہمیں اپنی تدبیروں سے عاجز کر دیں گے - اور اُن کا ٹھکانا

النَّارُ ۭ وَلَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ۝۵۸ ع ۱۳

تو دوزخ ہے اور وہ بہت بُرا ٹھکانا ہے ۳۴ ؎

ساتھیوں کی مثال تمہارے سامنے ہے - انہوں نے بھی موسیٰؑ کی اطاعت کا اقرار کیا تھا مگر جب موسیٰؑ نے کہا کہ اٹھو اور کنعان کی سرزمین پر حملہ کردو - تو انہوں نے کہہ دیا کہ اے موسیٰؑ - تو اور تیرا رب دونوں جاکر لڑتے رہو - ہم تو یہیں بیٹھے ہیں - مگر اس کا کیا نتیجہ نکلا - چالیس سال تک وہ قوم صحراؤں میں بھٹکتی پھری اور کنعان میں داخل نہ ہوسکی - اور اگر داخل ہوئی تو اس وقت جب وہ قربانیوں کے لئے تیار ہوگئی -

پس اصل چیز خدا اور اس کے رسول کی اطاعت ہے اور تمام کامیابیاں اسی رُوح کے ساتھ وابستہ ہیں جس قوم میں اطاعت کی رُوح ہوتی ہے وہ دوسروں کے مقابلہ میں کمزور ہوتے ہوئے بھی کامیاب ہوجاتی ہے - اور جس قوم میں سے اطاعت کی رُوح نکل جاتی ہے وہ زیادہ ہوتے ہوئے بھی ناکام رہتی ہے -

۳۴ ؎ تفسیر - ان آیات سے یہ مضمون شروع ہوتا ہے کہ اگر مسلمان قومی طور پر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کریں گے تو ان کو کیا انعام ملیگا چنانچہ فرماتا ہے کہ تم میں سے جو لوگ خلافت پر ایمان لائینگے اور خلافت کے استحقاق کے مطابق عمل کریں گے اور ایسے اعمال بجا لائیں گے جو انہیں خلافت کا مستحق بنا دیں اُن سے اللہ تعالیٰ کا یہ وعدہ ہے کہ وہ انہیں زمین میں اُسی طرح خلیفہ بنائیگا جس طرح اُن سے پہلے لوگوں کو اس نے خلیفہ بنایا اور اُن کی خاطر اُنکے دین کو جو اس نے اُن کے لئے پسند کیا ہے دنیا میں قائم کرے گا اور جب بھی ان پر خوف آئیگا اس کو امن سے بدل دیگا - اور ایسا ہوگا کہ وہ میری عبادت کرتے رہیں گے اور کسی کو میرا شریک قرار نہیں دیں گے لیکن جو لوگ مسئلہ خلافت پر ایمان لانا چھوڑ دیں گے

وہ اس انعام سے متمتع نہیں ہونگے بلکہ اطاعت سے خارج سمجھے جائیں گے۔

اِس آیت میں مسلمانوں کی قسمت کا آخری فیصلہ کیا گیا ہے اور ان سے یہ وعدہ کیا گیا ہے کہ اگر وہ خلافت کے قائل رہے اور اس غرض کے لئے مناسب کوشش اور جدوجہد بھی کرتے رہے تو جس طرح پہلی قوموں میں خدا تعالیٰ نے خلافت قائم کی ہے اسی طرح ان کے اندر بھی خدا تعالیٰ خلافت کو قائم کر دے گا اور خلافت کے ذریعہ سے اُن کو اُن کے دین پر قائم فرمائے گا جو خدا نے اُن کے لئے پسند کیا ہے اور اس دین کی جڑیں مضبوط کر دیگا اور خوف کے بعد امن کی حالت اُن پر لے آئیگا جس کے نتیجہ میں وہ خدائے واحد کے پرستار بنے رہیں گے اور شرک نہیں کرینگے۔

مگر یاد رکھنا چاہیئے کہ یہ ایک وعدہ ہے پیشگوئی نہیں۔ اگر مسلمان ایمان بالخلافت پر قائم نہیں رہیں گے اور اُن اعمال کو ترک کر دیں گے جو خلافت کے قیام کیلئے ضروری ہیں تو وہ اس انعام کے مستحق نہیں رہیں گے۔ اور خدا تعالیٰ پر وہ یہ الزام نہیں دے سکیں گے کہ اُس نے وعدہ پورا نہیں کیا۔

پھر خلافت کے ذکر کے ساتھ ہی اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو نصیحت کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ۔ یعنی جب خلافت کا نظام جاری کیا جائے تو اس وقت تمہارا فرض ہے کہ تم نمازیں قائم کرو اور زکوٰۃ دو اور اس طرح اللہ تعالیٰ کے رسول کی اطاعت کرو۔ گویا خلفاء کے ساتھ دین کی تمکین کر کے وہ اطاعتِ رسول کرنے والے ہی قرار پائیں گے۔ یہ وہی نکتہ ہے جو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے اِن الفاظ میں بیان فرمایا کہ مَنْ اَطَاعَ اَمِيْرِيْ فَقَدْ اَطَاعَنِيْ وَمَنْ عَصٰى اَمِيْرِيْ فَقَدْ عَصَانِيْ یعنی جس نے میرے مقرر کردہ امیر کی اطاعت کی اس نے میری اطاعت کی۔ اور جس نے میرے مقرر کردہ امیر کی نافرمانی کی۔ اُس نے میری نافرمانی کی۔ پس وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ فرما کر اس طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ اُس وقت رسول کی اطاعت اسی رنگ میں ہوگی کہ اشاعت و تمکین دین کے لئے نمازیں قائم کی جائیں۔ زکوٰتیں دی جائیں اور خلفاء کی پورے طور پر اطاعت کی جائے۔

اِس طرح اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو اس امر کی طرف توجہ دلائی ہے کہ اقامتِ صلوٰۃ اپنے صحیح معنوں میں خلافت کے بغیر نہیں ہوسکتی اور زکوٰۃ کی ادائیگی بھی خلافت کے بغیر نہیں ہوسکتی۔ چنانچہ دیکھ لو۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں زکوٰۃ کی وصولی کا باقاعدہ انتظام تھا۔ پھر جب آپ کی وفات ہوگئی اور حضرت ابو بکرؓ خلیفہ ہو گئے تو اہلِ عرب کے کثیر حصّہ نے زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیا اور کہا کہ یہ حکم صرف رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے مخصوص تھا۔ بعد کے خلفاء کے لئے نہیں مگر حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے اُن کے اس مطالبہ کو تسلیم نہ کیا بلکہ فرمایا کہ اگر یہ لوگ اونٹ کے گھٹنے کو باندھنے والی رسّی بھی زکوٰۃ میں دینے سے انکار کریں گے تو میں ان سے جنگ جاری رکھوں گا اور اُسوقت تک بس نہیں کرونگا جب تک اُن سے اُسی رنگ میں زکوٰۃ وصول نہ کر لوں جس رنگ میں وہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ادا کیا کرتے تھے۔ چنانچہ آپ اس مہم میں کامیاب ہوئے اور زکوٰۃ کا نظام پھر جاری ہوگیا۔ جو بعد کے خلفاء کے زمانوں میں بھی جاری رہا۔ مگر جب سے خلافت جاتی رہی مسلمانوں میں زکوٰۃ کی وصولی کا بھی کوئی انتظام نہ رہا اور یہی اللہ تعالےٰ نے اس آیت میں فرمایا تھا کہ اگر خلافت

کا نظام نہ ہو تو مسلمان زکوٰۃ کے حکم پر عمل ہی نہیں کر سکتے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ زکوٰۃ جیسا کہ اسلامی تعلیم کا منشاء ہے امراء سے لی جاتی ہے اور ایک نظام کے ماتحت غرباء کی ضروریات پر خرچ کی جاتی ہے۔ اب ایسا وہیں ہو سکتا ہے۔ جہاں ایک باقاعدہ نظام ہو۔ اکیلا آدمی اگرچہ غرباء میں زکوٰۃ کا روپیہ تقسیم بھی کر دے تو اُس کے وہ خوشگوار نتائج کہاں نکل سکتے ہیں جو اُس صورت میں نکل سکتے ہیں جبکہ زکوٰۃ ساری جماعت سے وصول کی جائے اور ساری جماعت کے غرباء میں تقسیم کی جائے۔

یہ مسئلہ اُن سارے اسلامی بادشاہوں کو مجرم قرار دیتا ہے جو سرکاری بیت المال کو اپنی ذات پر اور اپنے تعیش پر قربان کرتے تھے اور بڑے بڑے محل اور بڑی بڑی سیرگاہیں بناتے تھے۔ اگر پبلک اس کا آرڈر دیتی چونکہ اس کا روپیہ تھا جائز ہوتا بشرطیکہ اسراف نہ ہوتا لیکن پبلک نے کبھی آرڈر نہیں دیا اور پھر وہ اسراف کی حد سے بھی آگے نکلا ہوا تھا۔ اس لئے یہ سارے کام ناجائز تھے۔ اور ان لوگوں کو گنہگار بناتے تھے۔ نہ اسلام کو تختِ طاؤس کی ضرورت تھی۔ نہ تاج محل کی ضرورت تھی۔ نہ قصرِ زہرہ کی ضرورت تھی۔ نہ بغداد کے محلاتِ ہارون الرشید کی ضرورت تھی۔ یہ ساری کی ساری چیزیں اسلامی شوکت کی بجائے چند افراد کی شوکت ظاہر کرنے کے لئے بنائی گئی تھیں۔ اسی لئے آخر میں ان خاندانوں کی تباہی کا باعث بنیں۔

اسی طرح اقامتِ صلوٰۃ بھی اپنے صحیح معنوں میں خلافت کے بغیر نہیں ہو سکتی۔ اور اس کی وجہ یہ ہو کہ صلوٰۃ کا بہترین حصہ جمعہ ہے جس میں خطبہ پڑھا جاتا ہے اور قومی ضرورتوں کو لوگوں کے سامنے رکھا جاتا ہے۔ اب اگر خلافت کا نظام نہ ہو تو قومی ضروریات کا پتہ کس طرح لگ سکتا ہے۔ مثلاً پاکستان کی جماعتوں کو کیا علم ہو سکتا ہے کہ چین اور جاپان اور دیگر ممالک میں اشاعتِ اسلام کے سلسلہ میں کیا ہو رہا ہے اور اسلام اُن سے کن قربانیوں کا مطالبہ کر رہا ہے۔ اگر ایک مرکز ہوگا اور ایک خلیفہ ہوگا جو تمام مسلمانوں کے نزدیک واجب الاطاعت ہوگا تو اُسے تمام اکنافِ عالم سے رپورٹیں پہنچتی رہیں گی کہ یہاں یہ ہو رہا ہے اور وہاں وہ ہو رہا ہے اور اس طرح وہ لوگوں کو بتا سکیگا کہ آج فلاں قسم کی قربانیوں کی ضرورت ہے اور آج فلاں قسم کی خدمات کے لئے آپ کو پیش کرنے کی حاجت ہے۔ اسی لئے حنفیوں کا یہ فتویٰ ہے کہ جب تک مسلمانوں میں کوئی سلطان نہ ہو جمعہ پڑھنا جائز نہیں۔ اور اس کی تہ میں یہی حکمت ہے جو میں نے بیان کی ہے۔ اسی طرح عیدین کی نمازیں ہیں۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی سنت سے یہ امر ثابت ہے کہ آپ ہمیشہ قومی ضرورتوں کے مطابق خطبات پڑھا کرتے تھے۔ مگر جب خلافت کا نظام نہ رہے تو انفرادی رنگ میں کسی کو قومی ضرورتوں کا کیا علم ہو سکتا ہے۔ اور وہ ان کو کس طرح اپنے خطبات میں بیان کر سکتا ہے۔ بلکہ بالکل ممکن ہے کہ حالات سے ناواقفیت کی وجہ سے وہ خود بھی دھوکا میں مبتلا رہے اور دوسروں کو بھی دھوکہ میں مبتلا رکھے۔

میں نے ایک دفعہ کہیں پڑھا کہ آج سے ستّر اسّی سال پہلے ایک شخص بیکانیر کے علاقہ کی طرف سیر کرنے کے لئے نکل گیا۔ جمعہ کا دن تھا وہ ایک مسجد میں نماز پڑھنے کے لئے گیا تو اُس نے دیکھا کہ امام نے پہلے فارسی زبان میں مروّجہ خطبات میں سے کوئی ایک خطبہ پڑھا اور پھر ان لوگوں سے جو مسجد میں موجود تھے کہا کہ آؤ اب ہاتھ اٹھا کر دُعا کرو کہ اللہ تعالیٰ امیرالمومنین جہانگیر بادشاہ کو سلامت رکھے۔ اب اُس بیچارے کو

اتنا بھی معلوم نہ تھا کہ جہانگیر بادشاہ کو فوت ہوئے سینکڑوں سال گذر چکے ہیں اور اب جہانگیر نہیں بلکہ انگریز حکمران ہیں۔ غرض جمعہ جو نماز کا بہترین حصہ ہے اسی صورت میں احسن طریق پر ادا ہو سکتا ہے جب مسلمانوں میں خلافت کا نظام موجود ہو۔ چنانچہ دیکھ لو ہمارے اندر چونکہ ایک نظام ہے اس لئے میرے خطبات ہمیشہ اہم وقتی ضروریات کے متعلق ہوتے ہیں۔ اور یہ اللہ تعالیٰ کا احسان ہے کہ کئی غیر احمدی بھی ان سے متأثر ہوئے بغیر نہیں رہتے۔

درحقیقت لیڈر کا کام لوگوں کی رہنمائی کرنا ہوتا ہے مگر یہ رہنمائی وہی شخص کر سکتا ہے جس کے پاس دنیا کے اکثر حصوں سے خبریں آتی ہوں۔ اور وہ سمجھتا ہو کہ حالات کیا صورت اختیار کر رہے ہیں۔ صرف اخبارات سے اس قسم کے حالات کا علم نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اخبارات میں بہت کچھ جھوٹی خبریں درج ہوتی ہیں اس کے علاوہ اُن میں واقعات کو پورے طور پر بیان کرنیکا التزام نہیں ہوتا۔ لیکن ہمارے مبلغ چونکہ دنیا کے اکثر حصوں میں موجود ہیں اور پھر جماعت کے افراد بھی دنیا کے کونے کونے میں پھیلے ہوئے ہیں اس لئے اُن کے ذریعہ مجھے ہمیشہ سچی خبریں ملتی رہتی ہیں اور میں اُن سے فائدہ اٹھا کر جماعت کی صحیح رہنمائی کرتا رہتا ہوں پس درحقیقت اقامۃ الصلوٰۃ بھی بغیر خلیفہ کے نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح اطاعتِ رسول بھی جسکا اس آیت میں ذکر ہے خلیفہ کے بغیر نہیں ہو سکتی کیونکہ رسول کی اطاعت کی اصل غرض یہ ہوتی ہے کہ سب کو وحدت کے ایک رشتہ میں پرو دیا جائے۔ یُوں تو صحابہؓ بھی نمازیں پڑھتے تھے اور آجکل کے مسلمان بھی نمازیں پڑھتے ہیں صحابہؓ بھی حج کرتے تھے اور آجکل کے مسلمان بھی حج کرتے ہیں پھر صحابہؓ اور آجکل کے مسلمانوں میں فرق کیا ہے؟ یہی ہے کہ صحابہؓ میں ایک نظام کا تابع ہونے کی وجہ سے اطاعت کی رُوح حدِ کمال کو پہنچی ہوئی تھی چنانچہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم انہیں جب بھی کوئی حکم دیتے صحابہؓ اُسی وقت اُس پر عمل کرنے کے لئے کھڑے ہو جاتے تھے۔ لیکن یہ اطاعت کی رُوح آجکل کے مسلمانوں میں نہیں۔ مسلمان نمازیں بھی پڑھینگے۔ روزے بھی رکھینگے حج بھی کرینگے مگر ان کے اندر اطاعت کا مادہ نہیں ہوگا کیونکہ اطاعت کا مادہ نظام کے بغیر پیدا نہیں ہو سکتا۔ پس جب بھی خلافت ہوگی اطاعتِ رسول بھی ہو گی۔ کیونکہ اطاعتِ رسول یہ نہیں کہ نمازیں پڑھو یا روزے رکھو یا حج کرو۔ یہ تو خدا کے احکام کی اطاعت ہے۔ اطاعتِ رسول یہ ہے کہ جب وہ کہے کہ اب نمازوں پر زور دینے کا وقت ہے تو سب لوگ نمازوں پر زور دینا شروع کر دیں اور جب وہ کہے کہ اب زکوٰۃ اور چندوں کی ضرورت ہے تو وہ زکوٰۃ اور چندوں پر زور دینا شروع کر دیں۔ اور جب وہ کہے کہ اب جانی قربانی کی ضرورت ہے یا وطن کو قربان کرنے کی ضرورت ہے تو وہ جانیں اور اپنے وطن قربان کرنے کے لئے کھڑے ہو جائیں۔ غرض یہ تین باتیں ایسی ہیں جو خلافت کے ساتھ لازم و ملزوم ہیں۔ اگر خلافت نہ ہوگی تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ تمہاری نمازیں بھی جاتی رہیں گی۔ تمہاری زکوٰۃ بھی جاتی رہے گی۔ اور تمہارے دل سے اطاعتِ رسول کا مادہ بھی جاتا رہے گا۔ ہماری جماعت کو چونکہ ایک نظام کے ماتحت رہنے کی عادت ہے اور اس کے افراد اطاعت کا مادہ اپنے اندر رکھتے ہیں اس لئے اگر ہماری جماعت کے افراد کو آج اٹھا کر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں رکھ دیا جائے تو وہ اُسی طرح اطاعت کرنے لگ جائیں گے جس طرح صحابہؓ اطاعت کیا کرتے تھے لیکن اگر کسی غیر احمدی کو اپنی بصیرت کی آنکھ سے تم اس زمانہ میں لے جاؤ تو تمہیں قدم قدم پر وہ ٹھوکریں کھاتا ہوا دکھائی دیگا۔ اور وہ کہیگا ذرا ٹھہر جائیں۔ مجھے فلاں حکم کی سمجھ نہیں آئی۔ بلکہ جس طرح ایک پٹھان کے متعلق مشہور ہے کہ اُس نے کہدیا "خو۔ محمد صاحب کا نماز ٹوٹ گیا" کیونکہ قدوری میں لکھا ہے کہ حرکتِ کبیرہ سے نماز ٹوٹ جاتی ہے

اسی طرح وہ بعض باتوں کا انکار کرنے لگ جائیگا لیکن اگر ایک احمدی کو لے جاؤ تو اُس کو پتہ بھی نہیں لگیگا کہ وہ کسی غیر مانوس جگہ میں آگیا ہے۔ بلکہ جس طرح مشین کا پُرزہ فوراً اپنی جگہ پر لگ جاتا ہے اُسی طرح وہ وہاں پر فٹ آجائیگا اور جاتے ہی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا صحابی بن جائیگا اور آپ کے ہر حکم کی بلا چون و چرا اطاعت کرنے لگ جائیگا اور ائمہ اربعہ اس کے لئے کبھی ٹھوکر کا موجب نہیں بنیں گے کیونکہ وہ سمجھتا ہوگا کہ اصل حکم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے۔ ائمہ اربعہ تو محض آپ کے غلام بلکہ شاگردوں کے بھی شاگرد ہیں۔

یہ آیت جو آیتِ استخلاف کہلاتی ہے اِس میں مندرجہ ذیل امور بیان کئے گئے ہیں:۔

اوّل جس انعام کا یہاں ذکر کیا گیا ہے وہ ایک وعدہ ہے۔

دوّم یہ وعدہ امت سے ہے جب تک وہ ایمان اور عمل صالح پر کاربند رہے۔

سوّم اس وعدہ کی غرض یہ ہے کہ (الف) مسلمان بھی وہی انعام پائیں جو پہلی اُمتوں نے پائے تھے کیونکہ فرماتا ہے لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ (ب) اس وعدہ کی دوسری غرض تمکین دین ہے۔ (ج) اس کی تیسری غرض مسلمانوں کے خوف کو امن سے بدل دینا ہے (د) اس کی چوتھی غرض شرک کا دُور کرنا اور اللہ تعالیٰ کی عبادت کا قیام ہے۔

اِس آیت کے آخر میں وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَأُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُونَ کہہ کر اللہ تعالیٰ نے اس کے وعدہ ہونے پر زور دیا اور وَلَئِنْ كَفَرْتُمْ إِنَّ عَذَابِي لَشَدِيدٌ (ابراہیم ع ۲) کے وعید کی طرف توجہ دلائی کہ ہم جو انعامات تم پر نازل کرنے لگے ہیں اگر تم اُن کی ناقدری کرو گے تو ہم تمہیں سخت سزا دیں گے۔ خلافت بھی چونکہ ایک بھاری انعام ہے۔ اِس لئے یاد رکھو جو لوگ اِس نعمت کی ناشکری کریں گے وہ فاسق ہو جائیں گے۔

یہ آیت ایک زبردست شہادت خلافتِ راشدہ پر ہے اور اِس میں بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بطور احسان مسلمانوں میں خلافت کا نظام قائم کیا جائے گا جو مؤید من اللہ ہوگا۔ جیسا کہ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِينَ اٰمَنُوا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ اور وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِينَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ سے ظاہر ہے اور مسلمانوں کو پہلی قوموں کے انعامات میں سے وافر حصہ دلانے والا ہوگا۔ پھر اِس آیت میں خلفاء کی علامات بھی بتائی گئی ہیں جن سے سچے اور جھوٹے میں فرق کیا جا سکتا ہے اور وہ یہ ہیں:۔

اوّل۔ خلیفہ خدا بناتا ہے یعنی اس کے بنانے میں انسانی ہاتھ نہیں ہوتا۔ نہ وہ خود خواہش کرتا ہے اور نہ کسی منصوبہ کے ذریعہ وہ خلیفہ ہوتا ہے۔ بلکہ بعض دفعہ تو ایسے حالات میں وہ خلیفہ بنتا ہے جبکہ اس کا خلیفہ ہونا بظاہر ناممکن سمجھا جاتا ہے۔ چنانچہ یہ الفاظ کہ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِينَ اٰمَنُوا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ خود ظاہر کرتے ہیں کہ خلیفہ خدا ہی بناتا ہے کیونکہ جو وعدہ کرتا ہے وہی دیتا بھی ہے۔ نہ یہ کہ وعدہ تو وہ کرے اور اُسے پورا کوئی اَور کرے۔ پس اس آیت میں پہلی بات یہ بتائی گئی ہے کہ سچے خلفاء کی آمد خدا تعالیٰ کی طرف سے ہوگی۔ کوئی شخص خلافت کی خواہش کرکے خلیفہ نہیں بن سکتا اور نہ کسی منصوبہ کے ماتحت خلیفہ بن سکتا ہے۔ خلیفہ وہی ہوگا جسے خدا بنانا چاہیگا بلکہ بسا اوقات وہ ایسے حالات میں خلیفہ ہوگا جبکہ دنیا اُس کے خلیفہ ہونے کو ناممکن خیال کرتی ہوگی۔

دوسری علامت اللہ تعالیٰ نے سچے خلیفہ کی یہ بتائی ہے کہ وہ اُس کی مدد انبیاء کے مشابہ کرتا ہے کیونکہ فرماتا ہے كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ

کہ یہ خلفاء ہماری نصرت کے ایسے ہی مستحق ہونگے جیسے پہلے خلفاء اور جب پہلی خلافتوں کو دیکھا جاتا ہے تو وہ تین قسم کی نظر آتی ہیں ۔ اوّل خلافتِ نبوت ۔ جیسے آدم علیہ السلام کی خلافت تھی ۔ جن کے بارہ میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً (بقرہ ع۴) میں زمین میں اپنا ایک خلیفہ بنانے والا ہوں ۔ اب آدم علیہ السلام کا انتخاب نہیں کیا گیا تھا ۔ اور نہ وہ دنیوی بادشاہ تھے ۔ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے ایک وعدہ کیا اور انہیں اپنی طرف سے زمین میں آپ کھڑا کیا ۔ اور جنہوں نے ان کا انکار کیا انہیں سزا دی ۔ اِس میں کوئی شبہ نہیں کہ آدمؑ ان معنوں میں بھی خلیفہ تھے کہ ایک پہلی نسل کے تباہ ہونے پر انہوں نے اور اُن کی نسل نے پہلی قوم کی جگہ لے لی ۔ اور اِن معنوں میں بھی خلیفہ تھے کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کے ذریعہ ایک بڑی نسل جاری کی ۔ لیکن سب سے بڑی اہمیت جو انہیں حاصل تھی وہ نبوت اور ماموریت ہی کی تھی جس کی طرف اس آیت میں اشارہ کیا گیا ہے ۔ انہی معنوں میں حضرت داؤد علیہ السلام کو بھی خلیفہ کہا گیا ہے ۔ جیسے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے یَا دَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰکَ خَلِیْفَۃً فِی الْاَرْضِ فَاحْکُمْ بَیْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْھَوٰی فَیُضِلَّکَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اِنَّ الَّذِیْنَ یَضِلُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ لَھُمْ عَذَابٌ شَدِیْدٌۢ بِمَا نَسُوْا یَوْمَ الْحِسَابِ ۔ (ص ع۲) یعنی اے داؤد ہم نے تجھے زمین میں خلیفہ بنایا ہے (حضرت داؤد علیہ السلام چونکہ اللہ تعالیٰ کے نبی تھے اسلئے معلوم ہوا کہ یہاں خلافت سے مراد خلافتِ نبوت ہی ہے) پس تو لوگوں کے درمیان عدل و انصاف سے فیصلہ کر اور لوگوں کی خواہشات کی پیروی نہ کر ایسا نہ ہو کہ وہ تجھے سیدھے راستہ سے منحرف کر دیں ۔ یقیناً وہ لوگ جو گمراہ ہیں انہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے سخت عذاب ہوگا ۔ اس لئے ایسے لوگوں کے مشورہ کو قبول نہ کیا کر بلکہ وہی کر جس کی طرف خدا تعالیٰ تیری راہنمائی کرے ۔ اِن آیات میں وہی مضمون بیان ہوا ہے جو دوسری جگہ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَکَّلْ عَلَی اللّٰہِ (آل عمران ع۱۷) کے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے ۔ بعض لوگوں نے غلطی سے لَا تَتَّبِعِ الْھَوٰی فَیُضِلَّکَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ کے یہ معنے کئے ہیں کہ اے داؤد ! لوگوں کی ہوا و ہوس کے پیچھے نہ چلنا ۔ حالانکہ اس آیت کے یہ معنے ہی نہیں ۔ بلکہ اس میں اس امر کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ بعض دفعہ لوگوں کی اکثریت تجھے ایک بات کا مشورہ دے گی اور کہے گی کہ یوں کرنا چاہیئے مگر فرمایا تمہارا کام یہ ہے کہ تم محض اکثریت کو نہ دیکھو بلکہ یہ دیکھو کہ جو بات تمہارے سامنے پیش کی جا رہی ہے وہ مفید ہے یا نہیں ۔ اگر مفید ہو تو مان لو ۔ اور اگر مفید نہ ہو تو اُسے ردّ کر دو ۔ چاہے اُسے پیش کرنے والی اکثریت ہی کیوں نہ ہو ۔ بالخصوص ایسی حالت میں جبکہ وہ گناہ والی بات ہو ۔

پس پہلی خلافتیں اوّل خلافتِ نبوت تھیں جیسے حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت داؤد علیہ السلام کی خلافت تھی جن کو قرآن کریم نے خلیفہ قرار دیا ہے ۔ مگر اُن کو خلیفہ صرف نبی اور مامور ہونے کے معنوں میں کہا گیا ہے ۔ چونکہ وہ اپنے اپنے زمانہ کی ضرورت کے مطابق صفاتِ الٰہیہ کو دنیا میں ظاہر کرتے تھے اور اِس دنیا میں اللہ تعالیٰ کے ظلّ بن کر ظاہر ہوئے اسی لئے وہ اللہ تعالیٰ کے خلیفہ کہلائے ۔

دوسری خلافت جو قرآن کریم سے ثابت ہے وہ خلافتِ ملوکیت ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ حضرت ہود علیہ السلام کے متعلق فرماتا ہے کہ انہوں نے اپنی قوم سے کہا کہ وَاذْکُرُوْٓا اِذْ جَعَلَکُمْ خُلَفَآءَ مِنْۢ بَعْدِ قَوْمِ نُوْحٍ وَّزَادَکُمْ فِی الْخَلْقِ بَصْۜطَۃً فَاذْکُرُوْٓا اٰلَآءَ اللّٰہِ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ (اعراف ع۹)

یعنی اس وقت کو یاد کرو جبکہ قوم نوحؑ کے بعد خدا نے تمہیں خلیفہ بنایا اور اُس نے تم کو بناوٹ میں بھی فراخی بخشی یعنی تمہیں کثرت سے اولاد دی۔ پس تم اللہ تعالیٰ کی اس نعمت کو یاد کرو تاکہ تمہیں کامیابی حاصل ہو۔ اِسی طرح حضرت صالح علیہ السلام کی زبانی فرماتا ہے وَاذْكُرُوْٓا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنْۢ بَعْدِ عَادٍ (اعراف ع) یعنی اسوقت کو یاد کرو جبکہ تم کو خدا تعالیٰ نے عاد اولیٰ کی تباہی کے بعد اُن کا جانشین بنایا اور حکومت تمہارے ہاتھ میں آگئی۔ اس آیت میں خلفاء کا جو لفظ آیا ہے اس سے مراد صرف دنیوی بادشاہ ہیں اور نعمت سے مراد بھی نعمتِ حکومت ہی ہے اور اللہ تعالےٰ نے انہیں نصیحت کی ہے کہ تم زمین میں عدل وانصاف کو مدنظر رکھ کر تمام کام کرو۔ ورنہ ہم تمہیں سزا دیں گے۔ چنانچہ یہود کی نسبت اللہ تعالےٰ اسی انعام کا ذکر ان الفاظ میں فرماتا ہے کہ وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ جَعَلَ فِيْكُمْ اَنْۢبِيَآءَ وَجَعَلَكُمْ مُّلُوْكًا وَّاٰتٰكُمْ مَّا لَمْ يُؤْتِ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ (مائدہ ع) یعنی تم اس وقت کو یاد کرو جب موسیٰؑ نے اپنی قوم سے کہا۔ کہ اے میری قوم! تم اللہ تعالیٰ کے اس احسان پر غور کرو جو اس نے تم پر اُس وقت کیا تھا جب اُس نے تم میں نبی بھیجے اور تمہیں بادشاہ بنایا اور تمہیں وہ کچھ دیا جو دنیا کی معلوم قوموں میں سے کسی کو نہیں دیا تھا۔ اس آیت میں اللہ تعالےٰ نے بتایا ہے کہ یہود کو ہم نے دو طرح خلیفہ بنایا اِذْ جَعَلَ فِيْكُمْ اَنْۢبِيَآءَ کے ماتحت انہیں خلافتِ نبوت دی اور جَعَلَكُمْ مُّلُوْكًا کے ماتحت انہیں خلافتِ ملوکیت دی۔ چونکہ موسیٰؑ کے وقت تک تو اور کوئی بادشاہ اُن میں نہیں ہوا اس لئے اِس سے مراد یہ ہے کہ نبوتِ موسوی اور بادشاہتِ موسوی عطا کی جو دریائے نیل کو پار کرنے کے بعد سے انکو حاصل ہوگئی تھی۔ جیسا کہ فتح مکہ کے بعد رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نبی بھی تھے اور ایک لحاظ سے بادشاہ بھی تھے مگر آپکی بادشاہت خدا تعالےٰ کے احکام کے تابع تھی خودسر بادشاہوں والی بادشاہت نہ تھی۔

مگر ان دو قسم کی خلافتوں کے علاوہ نبی کے وہ جانشین بھی خلیفہ کہلاتے ہیں جو اس کے نقشِ قدم پر چلنے والے ہوں۔ یعنی اُس کی شریعت پر قوم کو چلانیوالے اور اُن میں اتحاد قائم رکھنے والے ہوں خواہ وہ نبی ہوں یا غیر نبی۔ جیسا کہ قرآن کریم میں آتا ہے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام موعود راتوں کے لئے طور پر گئے تو اپنے بعد انتظام کی غرض سے انہوں نے حضرت ہارونؑ کو کہا کہ اُخْلُفْنِيْ فِيْ قَوْمِيْ وَاَصْلِحْ وَلَا تَتَّبِعْ سَبِيْلَ الْمُفْسِدِيْنَ (اعراف ع) یعنی میرے بعد میری قوم میں میری جانشینی کرنا اور ان کی اصلاح کو مدنظر رکھنا اور مفسد لوگوں کی بات نہ ماننا۔ حضرت ہارون علیہ السلام چونکہ خود نبی تھے اور اس وقت سے پہلے نبی ہو چکے تھے اس لئے یہ خلافت جو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے انہیں دی تھی وہ خلافتِ نبوت نہیں ہو سکتی تھی۔ اس کے معنے صرف یہ تھے کہ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی غیر حاضری میں اُن کی قوم کا انتظام کریں۔ اور قوم کو اتحاد پر قائم رکھیں۔ اور فساد سے بچائیں۔ پس وہ ایک تابع نبی بھی تھے اور ایک حکمران نبی کے خلیفہ بھی تھے۔ اور یہ خلافت خلافتِ نبوت نہ تھی۔ بلکہ خلافتِ انتظامی تھی مگر اس قسم کی خلافت بعض دفعہ خلافتِ انتظامی کے علاوہ خلافتِ نبوت بھی ہوتی ہے۔ یعنی ایک سابق نبی کی امت کی درستی اور اصلاح کے لئے اللہ تعالیٰ بعض دفعہ ایک اور نبی مبعوث فرماتا ہے جو پہلے نبی کی شریعت کو ہی جاری کرتا ہے۔ کوئی نئی شریعت نہیں لاتا۔ گویا جہاں تک شریعت کا تعلق ہوتا ہے وہ پہلے نبی کے کام کو قائم رکھنے والا ہوتا ہے اور

اس لحاظ سے پہلے نبی کا خلیفہ ہوتا ہے۔ لیکن عہدہ کے لحاظ سے وہ براہ راست اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر کیا جاتا ہے۔ اس قسم کے خلفاء بنی اسرائیل میں بہت گذرے ہیں بلکہ جسقدر انبیاء حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد بنی اسرائیل میں آئے ہیں سب اسی قسم کے خلفاء تھے یعنی وہ نبی تو تھے مگر کسی جدید شریعت کے ساتھ نہیں آئے تھے بلکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت کو ہی دنیا میں جاری کرتے تھے۔ چنانچہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔ اِنَّآ اَنْزَلْنَا التَّوْرٰىةَ فِيْهَا هُدًى وَّ نُوْرٌ ۚ يَحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّوْنَ الَّذِيْنَ اَسْلَمُوْا لِلَّذِيْنَ هَادُوْا وَالرَّبّٰنِيُّوْنَ وَ الْاَحْبَارُ بِمَا اسْتُحْفِظُوْا مِنْ كِتٰبِ اللّٰهِ وَكَانُوْا عَلَيْهِ شُهَدَآءَ (مائدہ ع) یعنی ہم نے تورات کو یقیناً ہدایت اور نور سے بھرپور اتارا تھا۔ اس کے ذریعہ سے انبیاء جو (ہمارے) فرمانبردار تھے اور عارف اور ربانی علماء بسبب اس کے کہ ان سے اللہ تعالیٰ کی کتاب کی حفاظت چاہی گئی تھی اور وہ اس پر نگران تھے یہودیوں کے لئے فیصلے کیا کرتے تھے۔

اس آیت سے ظاہر ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد کئی انبیاء ایسے آئے تھے جن کا کام حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت کا قیام تھا۔ یا دوسرے لفظوں میں یوں کہہ لو کہ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خلیفہ تھے۔ لیکن ان انبیاء کے علاوہ کچھ اور لوگ بھی جن کو ربانی اور احبار کہنا چاہیئے اس کام پر مقرر تھے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء اور مجددین کا ایک لمبا سلسلہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد اُن کے خلفاء کے طور پر ظاہر ہوتا رہا جن کا کام حضرت موسیٰ علیہ السلام کے کام کی تکمیل تھا۔ اس سلسلہ کی آخری کڑی حضرت مسیح ناصری علیہ السلام تھے جن کو کئی مسلمان غلطی سے صاحب شریعت نبی سمجھتے ہیں اسی طرح اس زمانہ کے مسیحی بھی اُن کی نسبت یہ خیال کرنے لگے ہیں کہ وہ ایک نیا قانون لے کر آئے تھے اور اسی وجہ سے وہ اُن کی کتاب کو نیا عہد نامہ کہتے ہیں۔ حالانکہ قرآن کریم مسیح ناصری علیہ السلام کو حضرت موسیٰؑ کے دین کا قائم کرنے والا ایک خلیفہ قرار دیتا ہے۔ جیسا کہ مذکورہ بالا آیت سے چند آیات بعد اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَ قَفَّيْنَا عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ بِعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرٰىةِ (مائدہ رکوع ۷) یعنی ہم نے مذکورہ بالا نبیوں کے بعد جو تورات کی تعلیم کو جاری کرنے کے لئے آئے تھے عیسیٰ بن مریم کو بھیجا جو ان کے نقشِ قدم پر چلنے والے تھے اور تورات کی پیشگوئیوں کو پورا کرنے والے تھے۔ خود مسیح ناصری بھی فرماتے ہیں کہ

"یہ نہ سمجھو کہ میں تورات یا نبیوں
کی کتابوں کو منسوخ کرنے آیا ہوں۔ میں منسوخ
کرنے نہیں بلکہ پوری کرنے آیا ہوں۔
کیونکہ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ جب تک
آسمان اور زمین ٹل نہ جائیں ایک نقطہ یا ایک
شوشہ توریت سے ہرگز نہیں ٹلے گا جب
تک سب کچھ پورا نہ ہو جائے۔"
(متی باب ۵ آیت ۱۷ و ۱۸)

غرض یوشع سے لیکر جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات کے معاً بعد اُن کے خلیفہ ہوئے حضرت مسیح ناصریؑ تک سب انبیاء اور مجددین حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خلیفہ اور اُن کی شریعت کو جاری کرنے والے تھے۔

پس جب خدا تعالیٰ نے یہ وعدہ فرمایا کہ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ تو اس سے یہ استنباط ہوا کہ پہلی خلافتوں والی برکات مسلمانوں کو بھی ملیں گی اور انبیاء سابقین سے اللہ تعالیٰ نے جو کچھ سلوک کیا وہی سلوک وہ

امت محمدیہ کے خلفاء کے ساتھ بھی کرے گا۔ اگر کوئی کہے کہ پہلے تو خلافتِ ملوکیت کا بھی ذکر آتا ہے پھر خلافتِ ملوکیت کا ذکر چھوڑ کر صرف خلافتِ نبوت کے ساتھ اس کی مشابہت کو کیوں مخصوص کیا گیا ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ بیشک مسلمانوں کے ساتھ بادشاہتوں کا بھی وعدہ ہے مگر اس جگہ بادشاہت کا ذکر نہیں بلکہ صرف مذہبی نعمتوں کا ذکر ہے۔ چنانچہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِينَهُمُ الَّذِي ارْتَضَىٰ لَهُمْ کہ خدا تعالیٰ اپنے قائم کردہ خلفاء کے دین کو دنیا میں قائم کر کے رہیگا۔ اب یہ اصول دنیا کے بادشاہوں کے متعلق نہیں اور نہ اُن کے دین کو خدا تعالیٰ نے کبھی دنیا میں قائم کیا ہے۔ بلکہ یہ اصول روحانی خلفاء کے متعلق ہی ہے۔ پس یہ آیت ظاہر کر رہی ہے کہ اس جگہ جس خلافت سے مشابہت دی گئی ہے وہ خلافتِ نبوت ہے نہ کہ خلافتِ ملوکیت۔ اسی طرح فرماتا ہے۔ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ أَمْنًا کہ خدا اُن کے خوف کو امن سے بدل دیا کرتا ہے۔ یہ علامت بھی دنیوی بادشاہوں پر کسی صورت میں بھی چسپاں نہیں ہو سکتی کیونکہ دنیوی بادشاہ اگر آج تاج و تخت کے مالک ہوتے ہیں تو کل تخت سے علیحدہ ہو کر بھیک مانگتے ہوئے دیکھے جاتے ہیں۔ اسی طرح خدا تعالیٰ کی طرف سے اُن کے خوف کو امن سے بدل دینے کا کوئی وعدہ نہیں ہوتا بلکہ بسا اوقات جب کوئی سخت خطرہ پیدا ہوتا ہے تو وہ اس کے مقابلہ کی ہمت تک کھو بیٹھتے ہیں۔

پھر فرماتا ہے يَعْبُدُونَنِي لَا يُشْرِكُونَ بِي شَيْئًا کہ وہ خلفاء میری عبادت کرینگے اور میرے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرینگے گویا وہ خالص موحد اور شرک کے شدید ترین دشمن ہونگے مگر دنیا کے بادشاہ تو شرک بھی کر لیتے ہیں حتیٰ کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ان سے کبھی کفر بواح بھی صادر ہو جائے۔ پس وہ اس آیت کے مصداق کس طرح ہو سکتے ہیں۔

چوتھی دلیل جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ان خلفاء سے مراد دنیوی بادشاہ ہرگز نہیں یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے مَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذَٰلِكَ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ یعنی جو لوگ ان خلفاء کا انکار کریں گے وہ فاسق ہو جائینگے اب بتاؤ کہ کیا جو شخص کفر بواح کا بھی مرتکب ہو سکتا ہو آیا اس کی اطاعت سے خروج فسق ہو سکتا ہے یقیناً ایسے بادشاہوں کی اطاعت سے انکار کرنا انسان کو فاسق نہیں بنا سکتا۔ فسق کا فتویٰ انسان پر اسی صورت میں لگ سکتا ہے جب وہ روحانی خلفاء کی اطاعت سے انکار کرے۔

غرض یہ چاروں دلائل جن کا اس آیت میں ذکر ہے اس امر کا ثبوت ہیں کہ اس آیت میں جس خلافت کا ذکر کیا گیا ہے وہ خلافت ملوکیت نہیں۔ پس جب خدا نے یہ فرمایا کہ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ کہ ہم اُن خلفاء پر ویسے ہی انعامات نازل کریں گے جیسے ہم نے پہلے خلفاء پر انعامات نازل کئے تو اس سے مراد یہی ہے کہ جیسے پہلے انبیاء کی اللہ تعالیٰ کی طرف سے مدد ہوتی رہی ہے اُسی طرح اُن کی مدد ہو گی۔ پس اس آیت میں خلافتِ نبوت سے مشابہت مراد ہے نہ کہ خلافتِ ملوکیت سے۔

تیسری بات اس آیت سے یہ نکلتی ہے کہ یہ وعدہ امت سے اسوقت تک کیلئے ہے جب تک کہ امت مومن اور عمل صالح کرنے والی رہے۔ جب وہ مومن اور عمل صالح کرنے والی نہیں رہیگی تو اللہ تعالیٰ

بھی اپنے اس وعدہ کو واپس لے لیگا۔ گویا نبوت اور خلافت میں یہ عظیم الشان فرق بتایا کہ نبوت تو اس وقت آتی ہے جب دنیا خرابی اور فساد سے بھر جاتی ہے جیسے فرمایا ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ (روم ۴) یعنی جب بَر اور بحر میں فساد واقع ہو جاتا ہے۔ لوگ خدا تعالیٰ کو بھول جاتے ہیں۔ الٰہی احکام سے اپنا مُنہ موڑ لیتے ہیں۔ ضلالت اور گمراہی میں گرفتار ہو جاتے ہیں اور تاریکی زمین کے چپہ چپہ کا احاطہ کر لیتی ہے تو اسوقت لوگوں کی اصلاح کیلئے خدا تعالیٰ کسی نبی کو بھیجتا ہے جو پھر آسمان سے نور ایمان کو واپس لاتا اور ان کو سچے دین پر قائم کرتا ہے لیکن خلافت اس وقت آتی ہے جب قوم میں اکثریت مومنوں اور عمل صالح کرنے والوں کی ہوتی ہے اور خلیفہ لوگوں کو عقائد میں مضبوط کرنے کے لئے نہیں آتا بلکہ تنظیم کو مکمل کرنے کے لئے آتا ہے۔ گویا نبوت تو ایمان اور عمل صالح کے مٹ جانے پر آتی ہے۔ اور خلافت اس وقت آتی ہے۔ جب قریبًا تمام کے تمام لوگ ایمان اور عمل صالح پر قائم ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ خلافت اسی وقت شروع ہوتی ہے جب نبوت ختم ہوتی ہے کیونکہ نبوت کے ذریعہ ایمان اور عمل صالح قائم ہو چکا ہوتا ہے۔ اور چونکہ اکثریت ان لوگوں کی ہوتی ہے جو ایمان اور عمل صالح پر قائم ہوتے ہیں۔ اس لئے اللہ تعالیٰ اپنی خلافت کی نعمت عطا فرما دیتا ہے۔ اور درمیانی زمانہ جب کہ نہ تو دنیا نیکوکاروں سے خالی ہو اور نہ بدی سے پُر ہو دونوں سے محروم رہتا ہے کیونکہ نہ تو بیماری شدید ہوتی ہے کہ نبی آئے اور نہ تندرستی کامل ہوتی ہے کہ اُن سے کام لینے والا خلیفہ آئے۔

پس اس حکم سے معلوم ہوتا ہے کہ خلافت کا فقدان کسی خلیفہ کے نقص کی وجہ سے نہیں بلکہ جماعت کے نقص کی وجہ سے ہوتا ہے اور خلافت کا مٹنا خلیفہ کے گنہگار ہونے کی دلیل نہیں بلکہ اُمت کے گنہگار ہونے کی دلیل ہوتا ہے۔ کیونکہ خدا تعالیٰ کا یہ صریح وعدہ ہے کہ وہ اس وقت تک خلیفہ بناتا چلا جائیگا جب تک جماعت میں مومنوں اور عمل صالح کرنے والوں کی اکثریت رہے گی۔ جب اس میں فرق پڑ جائیگا اور اکثریت مومنوں اور عمل صالح کرنے والوں کی نہیں رہے گی تو اللہ تعالیٰ فرمائیگا۔ اب چونکہ تم خود بد عمل ہو گئے ہو اس لئے میں اپنی نعمت تم سے چھین لیتا ہوں (گو خدا چاہے تو بطور احسان ایک عرصہ تک پھر بھی جماعت میں خلفاء بھجواتا رہے) پس وہ شخص جو یہ کہتا ہے کہ خلیفہ خراب ہو گیا ہے وہ بالفاظ دیگر اس امر کا اعلان کرتا ہے کہ جماعت کی اکثریت ایمان اور عمل صالح سے محروم ہو چکی ہے کیونکہ خدا کا یہ وعدہ ہے کہ جب تک امت ایمان اور عمل صالح پر قائم رہے گی اس میں خلفاء آتے رہینگے اور جب وہ اس سے محروم ہو جائیگی تو خلفاء کا آنا بھی بند ہو جائیگا۔ پس خلیفہ کے بگڑنے کا کوئی امکان نہیں ہاں اس بات کا ہر وقت امکان ہو سکتا ہے کہ جماعت کی اکثریت ایمان اور عمل صالح سے محروم نہ ہو جائے۔

چوتھی علامت خلفاء کی اللہ تعالیٰ نے یہ بتائی ہے کہ اُن کے دینی احکام اور خیالات کو اللہ تعالیٰ دنیا میں پھیلائیگا۔ چنانچہ فرماتا ہے وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِينَهُمُ الَّذِي ارْتَضَىٰ لَهُمْ کہ اللہ تعالیٰ اُن کے دین کو تمکین دیگا اور باوجود مخالف حالات کے اُسے دُنیا میں قائم کرے گا۔ یہ ایک زبردست ثبوت خلافتِ حقہ کی تائید میں ہے اور جب اس پر غور کیا جاتا ہے تو خلفاء کی صداقت پر خدا تعالیٰ کا یہ ایک بہت بڑا نشان نظر آتا ہے۔

یہ ایک عجیب بات ہے کہ حضرت ابوبکرؓ اور

حضرت عمر رضی اللہ عنہما ایسے خاندانوں میں سے تھے جو عرب میں کوئی جتھہ نہیں رکھتے تھے لیکن حضرت عثمانؓ اور حضرت علی رضی اللہ عنہما ایسے خاندانوں میں سے تھے جو عرب میں جتھے رکھتے تھے۔ چنانچہ بنو عبد الشمس حضرت عثمانؓ کے حق میں تھے اور بنو عبد المطلب حضرت علیؓ کے حق میں۔ اور اِن دونوں کو عرب میں بڑی قوت حاصل تھی جب خلافت میں تنزل واقع ہوا اور مسلمانوں کی اکثریت میں سے ایمان اور عمل صالح جاتا رہا تو حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کی شہادت کے بعد بنو عبد الشمس نے مسلمانوں پر تسلّط جما لیا۔ اور یہ وہ لوگ تھے جو حضرت عثمانؓ سے تعلق رکھتے تھے۔ چنانچہ ان کی حکومت کے دوران میں حضرت علیؓ کی تو مذمت ہوتی رہی اور حضرت عثمانؓ کی خوبیاں بیان ہوتی رہیں۔ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے مدّاح اور اِن کی خوبیوں کا ذکر کرنیوالے اِس دور میں بہت ہی کم تھے۔ اِس کے بعد حالات میں پھر تغیر پیدا ہوا اور بنو عبد الشمس کی جگہ بنو عبد المطلب نے قبضہ کر لیا یعنی بغداد میں دولتِ عباسیہ قائم ہو گئی۔ اور یہ وہ لوگ تھے جو اہلِ بیت سے تعلق رکھتے تھے چنانچہ ان کا تمام زور حضرت علیؓ کی تعریف اور آپ کی خوبیاں بیان کرنے پر صرف ہونے لگ گیا۔ اِس طرح کئی سو سال تک مسلمانوں کا ایک حصّہ حضرت عثمانؓ کے اوصاف شمار کرتا رہا اور ایک حصّہ حضرت علیؓ کے اوصاف شمار کرتا رہا۔ مگر باوجود اس کے کہ خلفاء اربعہ کے بعد اسلامی حکومتوں کے یہ دو دَور آئے اور دونوں ایسے تھے کہ ان میں حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ سے تعلق رکھنے والے لوگ بہت کم تھے۔ پھر بھی دنیا میں جو عزّت اور رتبہ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے فتووں اور ارشادات کو حاصل ہے وہ اِن دونوں کو حاصل نہیں۔ گو ان سے اُتر کر انہیں بھی حاصل ہے اور یہ ثبوت ہے وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِينَهُمُ الَّذِي ارْتَضَىٰ لَهُمْ کا کہ خدا نے اُنکے دین کو قائم کیا۔ اور اُن کی عزّت کو لوگوں کے قلوب میں جاگزین کیا۔ چنانچہ آج کسی مسلمان سے پوچھ لو کہ اس کے دل میں خلفاء میں سے سب سے زیادہ کس کی عزت ہے تو وہ پہلے حضرت ابوبکرؓ کا نام لیگا۔ پھر حضرت عمرؓ کا نام لیگا۔ پھر حضرت عثمانؓ کا نام لیگا اور پھر حضرت علیؓ کا نام لیگا۔ حالانکہ کئی صدیاں ایسی گذری ہیں جن میں حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کا نام لینے والا کوئی نہیں تھا اور اتنے لمبے وقفہ میں بڑے بڑے لوگوں کے نام دنیا سے مٹ جایا کرتے ہیں لیکن خدا نے اُن کے نام کو قائم رکھا اور اُن کے فتووں اور ارشادات کو وہ مقام دیا جو حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کے فتووں اور ارشادات کو بھی حاصل نہیں۔

پھر بنو عبد الشمس کے زمانہ میں حضرت علیؓ کو بدنام کرنے کی بڑی کوششیں کی گئیں اور دولتِ عباسیہ کے زمانہ میں حضرت عثمانؓ پر بڑا لعن طعن کیا گیا۔ مگر باوجود اسکے کہ یہ کوششیں حکومت کی طرف سے ہوئیں اور انہوں نے اپنے اپنے زمانوں میں اُن کو بدنام کرنے اور اُن کے ناموں کو مٹانے کے لئے بڑی کوشش کی مگر پھر بھی یہ دونوں خلفاءؓ دُھلے دھلائے نکل آئے اور خدا نے تمام عالمِ اسلام میں اُن کی عزّت و توقیر کو قائم کر دیا۔

پھر دین کے ایک معنے سیاست اور حکومت کے بھی ہوتے ہیں۔ اس لحاظ سے سچے خلفاء کی اللہ تعالےٰ نے یہ علامت بتائی کہ جس سیاست اور پالیسی کو وہ چلائیں گے اللہ تعالےٰ اُسے دنیا میں قائم فرمائیگا۔ یہ تو ہو سکتا ہے کہ ذاتی معاملات میں خلیفۂ وقت سے کوئی غلطی ہو جائے لیکن ان معاملات میں جن پر جماعت کی روحانی اور جسمانی ترقی کا انحصار ہو اگر اُس سے کوئی غلطی سرزد بھی ہو تو اللہ تعالیٰ اپنی جماعت کی حفاظت فرماتا ہے اور کسی نہ کسی رنگ میں اُسے اس غلطی پر مطلع کر دیتا ہے۔ صوفیاء کی اصطلاح میں اِسے عصمتِ صغریٰ کہا جاتا

ہے۔ گویا انبیاء کو تو عصمتِ کبریٰ حاصل ہوتی ہے لیکن خلفاء کو عصمتِ صغریٰ حاصل ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ اُن سے کوئی ایسی اہم غلطی نہیں ہونے دیتا جو جماعت کے لئے تباہی کا موجب ہو۔ اُن کے فیصلوں میں جزئی اور معمولی غلطیاں ہوسکتی ہیں۔ مگر انجام کار نتیجہ یہی ہوگا کہ اسلام کو غلبہ حاصل ہوگا اور اُس کے مخالفوں کو شکست ہوگی۔ گویا بوجہ اس کے کہ انکو عصمتِ صغریٰ حاصل ہوگی۔ خدا تعالیٰ کی پالیسی بھی وہی ہوگی جو اُن کی ہوگی۔ بیشک بولنے والے وہ ہونگے۔ زبانیں انہی کی حرکت کرینگی۔ ہاتھ انہی کے چلیں گے۔ دماغ انہی کا کام کریگا۔ مگر ان سب کے پیچھے خدا تعالیٰ کا اپنا ہاتھ ہوگا اُن سے جزئیات میں معمولی غلطیاں ہوسکتی ہیں بعض دفعہ اُنکے مشیر بھی ان کو غلط مشورہ دے سکتے ہیں لیکن ان درمیانی روکوں سے گذر کر کامیابی انہی کو حاصل ہوگی۔ اور جب تمام کڑیاں مل کر زنجیر بنے گی تو وہ صحیح ہوگی اور ایسی مضبوط ہوگی کہ کوئی طاقت اُسے توڑ نہیں سکیگی۔

پانچویں علامت اللہ تعالیٰ نے یہ بتائی ہے کہ وَلَیُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا۔ یعنی جب بھی قومی طور پر اسلامی خلافت کے لئے کوئی خوف پیدا ہوگا اور لوگوں کے دلوں میں نورِ ایمان باقی ہوگا اللہ تعالیٰ اس خوف کے بعد ضرور ایسے سامان پیدا کر دیگا کہ جن سے مسلمانوں کا خوف امن سے بدل جائیگا۔ چنانچہ دیکھ لو۔ حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد جب افراتفری کی حالت پیدا ہوگئی تو اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے ایک بڑے گروہ کو حضرت علیؓ کے ہاتھ پر اکٹھا کر دیا۔ اور جب حضرت علیؓ کے مقابلہ میں حضرت معاویہؓ کھڑے ہوگئے تو اللہ تعالےٰ نے حضرت معاویہؓ کے دل میں اُس زمانہ کے مناسب حال خشیت اللہ پیدا کر دی اور جب روم کے عیسائی بادشاہ نے مسلمانوں کا انتشار دیکھ کر اسلامی ممالک پر حملہ کرنا چاہا تو حضرت معاویہؓ نے اُسے کہلا بھیجا کہ یہ نہ سمجھنا کہ مسلمانوں میں اختلاف ہے اگر تم نے اسلامی ملکوں پر حملہ کیا تو سب سے پہلا جرنیل جو حضرت علیؓ کی طرف سے تمہارے مقابلہ کیلئے نکلے گا وہ مَیں ہونگا۔ چنانچہ رومی بادشاہ ڈر گیا اور مسلمانوں کا خوف امن سے بدل گیا۔ یہ ایک جزوی ایمان تھا۔ اگر حضرت معاویہؓ اُس وقت کلّی طور پر ہتھیار ڈال دیتے اور حضرت علیؓ کے تابع ہوجاتے تو مسلمانوں کا اختلاف ہمیشہ کیلئے مٹ جاتا۔ اور ایسے خوش کن نتائج نکلتے کہ آج ہر مسلمان کی گردن فخر سے اونچی ہوتی مگر افسوس کہ حضرت معاویہؓ نے صرف وقتی اطاعت کا اعلان کیا کلّی اطاعت کا اعلان نہ کیا۔

بعض لوگ غلطی سے اس آیت کا یہ مفہوم سمجھتے ہیں کہ خلفاءِ راشدین ہر تخویف سے محفوظ رہتے ہیں۔ اور یہ خیال کرتے ہیں کہ حضرت عمرؓ۔ حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کو چونکہ خلافت کے بعد مختلف حوادث پیش آئے اور دشمنوں نے انہیں شہید کر دیا۔ اس لئے حضرت ابوبکرؓ کے سوا اور کسی کو خلیفۂ راشد تسلیم نہیں کیا جاسکتا۔ یہ غلطی انہیں اس لئے لگی ہے کہ انہوں نے قرآنی الفاظ پر غور نہیں کیا۔ بیشک خوف کا امن سے بدل جانا بھی بڑی نعمت ہے۔ لیکن اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ وَلَیُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ الْخَوْفِ اَمْنًا۔ کہ جو بھی خوف پیدا ہوگا اُسے امن سے بدل دیا جائیگا۔ بلکہ وَلَیُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا فرمایا ہے۔ کہ جو خوف اُن کے دل میں پیدا ہوگا اور جس چیز سے وہ ڈریں گے اللہ تعالےٰ اُسے دُور کر دیگا۔ اور اس کی جگہ امن پیدا کر دیگا۔ پس وعدہ یہ نہیں کہ زید اور بکر کے نزدیک جو بھی ڈرنے والی بات ہو وہ خلفاء کو پیش نہیں آئیگی۔ بلکہ وعدہ یہ ہے کہ جس چیز سے وہ ڈریں گے۔ اللہ تعالےٰ اُسے ضرور دُور کر دیگا۔ اور اُن کے خوف کو امن سے بدل دیگا۔ مثال کے طور پر یوں سمجھ لو کہ

سانپ بظاہر ایک بڑی خوفناک چیز ہے مگر کئی لوگ ہیں جو سانپ کو اپنے ہاتھ میں پکڑ لیتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے لئے سانپ کا خوف کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ اسی طرح فقر ایک بڑی خوف والی چیز ہے مگر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے نزدیک اس کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ چنانچہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں اَلْفَقْرُ فَخْرِیْ فقر میرے لئے ذلت کا موجب نہیں بلکہ فخر کا موجب ہے۔ اب اگر کسی کے ذہن میں یہ بات ہو کہ کھانے کے لئے اگر ایک وقت کی روٹی بھی نہ ملے تو یہ بڑی ذلت کی بات ہوتی ہے تو کیا اس کے اس خیال کی وجہ سے ہم یہ مان لیں گے کہ نعوذ باللہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بھی ذلت ہوئی؟ جو شخص فقر کو اپنی عزت کا موجب سمجھتا ہے۔ جو شخص چیتھڑوں کو قیمتی لباس سے زیادہ بہتر چیز سمجھتا ہے اور جو شخص دنیوی مال و متاع کو نجاست کی طرح حقیر سمجھتا ہے اس کے لئے فقر کا خوف بالکل بے معنے ہے۔ پس خدا تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْ بَعْدِ الْخَوْفِ اَمْنًا بلکہ فرمایا ہے وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا کہ کوئی ایسی خوف والی بات پیدا نہیں ہوگی جس سے وہ ڈرتے ہونگے۔ اس فرق کو مدنظر رکھ کر دیکھو تو معلوم ہوگا کہ خلفاء پر کوئی ایسی مصیبت نہیں آئی جس سے انہوں نے خوف کھایا ہو اور اگر آئی تو اللہ تعالیٰ نے اسے امن سے بدل دیا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ حضرت عمرؓ شہید ہوئے۔ مگر جب واقعات کو دیکھا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ کو اس شہادت سے کوئی خوف نہیں تھا۔ بلکہ وہ متواتر دعائیں کیا کرتے تھے کہ یا اللہ مجھے شہادت نصیب کر اور شہید بھی مجھے مدینہ میں کر۔ پس وہ شخص جس نے اپنی ساری عمر یہ دعائیں کرتے ہوئے گزاری ہو کہ یا اللہ مجھے مدینہ میں شہادت دے وہ اگر شہید ہو جائے تو ہم یہ کس طرح کہہ سکتے ہیں کہ اس پر ایک خوفناک وقت آیا مگر وہ خدا تعالیٰ کی طرف سے امن سے نہ بدلا گیا۔ بیشک اگر حضرت عمرؓ شہادت سے ڈرتے اور پھر وہ شہید ہو جاتے تو کہا جا سکتا تھا کہ ان کے خوف کو خدا تعالیٰ نے امن سے نہ بدلا۔ مگر وہ تو دعائیں کرتے رہتے تھے کہ یا اللہ! مجھے مدینہ میں شہادت دے۔ پس ان کی شہادت سے یہ کیونکر ثابت ہو گیا کہ وہ شہادت سے ڈرتے بھی تھے اور جب وہ شہادت سے نہیں ڈرتے تھے بلکہ اس کیلئے دعائیں کرتے تھے جن کو خدا تعالیٰ نے قبول فرما لیا تو معلوم ہوا کہ اس آیت کے ماتحت ان پر کوئی ایسا خوف نہیں آیا جو ان کے دل نے محسوس کیا ہو اور اس آیت میں جیسا کہ میں بیان کر چکا ہوں یہی ذکر ہے کہ خلفاء جس بات سے ڈرتے ہونگے وہ کبھی وقوع پذیر نہیں ہو سکتی اور اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ وہ ان کے خوف کو امن سے بدل دیگا مگر جب وہ ایک بات سے ڈرتے ہی نہ ہوں بلکہ اپنی عزت اور بلندئ درجات کا موجب سمجھتے ہوں تو اسے خوف کہنا اور پھر یہ کہنا کہ اسے امن سے کیوں نہ بدل دیا گیا بے معنی بات ہے۔ میں نے تو جب حضرت عمرؓ کی اس دعا کو پڑھا تو میں نے اپنے دل میں کہا کہ اس کا بظاہر یہ مطلب تھا کہ دشمن مدینہ پر حملہ کرے اور اس کا حملہ اتنی شدت سے ہو کہ تمام مسلمان تباہ ہو جائیں پھر وہ خلیفۂ وقت تک پہنچے اور اسے بھی شہید کر دے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے حضرت عمرؓ کی دعا بھی قبول کر لی۔ اور ایسے سامان بھی پیدا کر دئے جن سے اسلام کی عزت قائم رہی۔ چنانچہ بجائے اس کے کہ مدینہ پر کوئی بیرونی لشکر حملہ آور ہوتا اندر سے ہی ایک خبیث اٹھا اور اس نے خنجر سے آپ کو شہید کر دیا پھر حضرت عثمانؓ کے ساتھ جو واقعات پیش آئے ان سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان باتوں سے کبھی خائف نہیں ہوئے۔ تاریخ سے ثابت ہے کہ جب باغیوں نے مدینہ پر قبضہ کر لیا تو وہ نماز سے پہلے تمام مسجد میں پھیل جاتے۔

اور اہل مدینہ کو ایک دوسرے سے جدا جدا رکھتے تاکہ وہ اکٹھے ہو کر اُن کا مقابلہ نہ کر سکیں۔ مگر باوجود اس شورش اور فتنہ انگیزی اور فساد کے حضرت عثمانؓ نماز پڑھانے کے لئے اکیلے مسجد میں تشریف لاتے اور ذرا بھی خوف محسوس نہ کرتے اور اس وقت تک برابر آتے رہے جب تک لوگوں نے آپ کو منع نہ کر دیا۔ جب فتنہ بہت بڑھ گیا اور حضرت عثمانؓ کے گھر پر مفسدوں نے حملہ کر دیا۔ تو بجائے اس کے کہ آپ صحابہؓ کا اپنے مکان کے گرد پہرہ لگواتے۔ آپ نے انہیں قسم دے کر کہا کہ وہ آپ کی حفاظت کر کے اپنی جانوں کو خطرہ میں نہ ڈالیں اور اپنے اپنے گھروں کو چلے جائیں۔ کیا شہادت سے ڈرنے والا آدمی بھی ایسا ہی کیا کرتا ہے؟ اور وہ لوگوں سے کہا کرتا ہے کہ میرا فکر نہ کرو بلکہ اپنے اپنے گھروں کو چلے جاؤ؟ پھر اس بات کا کہ حضرت عثمانؓ ان واقعات سے کچھ بھی خائف نہیں تھے ایک اور زبردست ثبوت یہ ہے کہ اس فتنہ کے دوران میں ایک دفعہ حضرت معاویہؓ حج کرنے آئے جب وہ شام کو واپس جانے لگے تو مدینہ میں وہ حضرت عثمانؓ سے ملے اور عرض کیا کہ آپ میرے ساتھ شام میں چلیں۔ وہاں آپ تمام فتنوں سے محفوظ رہیں گے آپ نے فرمایا کہ معاویہ! میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہمسائیگی پر کسی چیز کو ترجیح نہیں دے سکتا۔ انہوں نے عرض کیا کہ اگر آپ کو یہ بات منظور نہیں تو میں شامی سپاہیوں کا ایک لشکر آپ کی حفاظت کے لئے بھیج دیتا ہوں۔ حضرت عثمانؓ نے فرمایا۔ میں اپنی حفاظت کے لئے ایک لشکر رکھ کر مسلمانوں کے رزق میں کمی کرنا نہیں چاہتا۔ حضرت معاویہؓ نے عرض کیا کہ امیرالمومنین لوگ آپ کو دھوکا سے قتل کر دینگے۔ یا ممکن ہے آپ کے خلاف وہ برسرپیکار ہو جائیں۔ حضرت عثمانؓ نے فرمایا مجھے اس کی پرواہ نہیں۔ میرے لئے میرا خدا کافی ہے۔

آخر انہوں نے کہا۔ اگر آپ اور کچھ منظور نہیں کرتے تو اتنا ہی کریں کہ شرارتی لوگوں کو بعض اکابر صحابہؓ کے متعلق گھمنڈ ہے اور وہ خیال کرتے ہیں کہ آپ کے بعد وہ کام سنبھال لیں گے۔ چنانچہ وہ ان کا نام لے لے کر لوگوں کو دھوکا دیتے ہیں۔ آپ ان سب کو مدینہ سے رخصت کر دیں۔ اور بیرونی ملکوں میں پھیلا دیں۔ اس سے شریروں کے ارادے پست ہو جائیں گے اور وہ خیال کرینگے کہ آپ سے تعرض کر کے انہوں نے کیا لینا ہے جبکہ مدینہ میں کوئی اور کام کو سنبھالنے والا ہی نہیں۔ مگر حضرت عثمانؓ نے یہ بات بھی نہ مانی اور کہا۔ یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ جن کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جمع کیا ہے۔ میں اُن کو جلاوطن کر دوں۔ حضرت معاویہؓ یہ سُن کر رو پڑے اور انہوں نے عرض کیا۔ اگر آپ اور کچھ نہیں کرتے تو اتنا ہی اعلان کر دیں کہ میرے خون کا بدلہ معاویہؓ لیگا۔ مگر آپ نے فرمایا۔ معاویہؓ! تمہاری طبیعت تیز ہے۔ میں ڈرتا ہوں کہ مسلمانوں پر تم کہیں سختی نہ کرو۔ اس لئے میں یہ اعلان بھی نہیں کر سکتا۔ اب کہنے کو تو یہ کہا جاتا ہے کہ حضرت عثمانؓ دل کے کمزور تھے مگر تم خود ہی بتاؤ کہ اس قسم کی جرأت کتنے لوگ دکھا سکتے ہیں۔ اور کیا ان واقعات کے ہوتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ اُن کے دل میں کچھ بھی خوف تھا۔ اگر خوف ہوتا تو وہ کہتے کہ تم اپنی فوج کا دستہ میری حفاظت کے لئے بھجوا دو۔ نہیں تنخواہیں میں دلواؤں گا۔ اور اگر خوف ہوتا تو آپ اعلان کر دیتے کہ مجھ پر کسی نے ہاتھ اٹھایا تو وہ سُن لے کہ میرا بدلہ معاویہؓ لے گا۔ مگر آپ نے سوائے اس کے کوئی جواب نہ دیا کہ معاویہؓ! تمہاری طبیعت تیز ہے۔ میں ڈرتا ہوں کہ اگر میں نے تم کو یہ اختیار دے دیا تو تم مسلمانوں پر سختی کرو گے۔ پھر جبکہ آخر میں دشمنوں نے دیوار پھاند کر آپ پر حملہ کیا تو کس دلیری سے آپ نے مقابلہ کیا۔

بغیر ڈر اور خوف کے اظہار کے آپ قرآن کریم کی تلاوت کرتے رہے یہاں تک کہ حضرت ابوبکرؓ کا ایک بیٹا محمد بن ابی بکرؓ جو ابن حنفیہ کہلاتا ہے (اللہ تعالیٰ اس پر رحم کرے) آگے بڑھا اور اُس نے حضرت عثمانؓ کی داڑھی پکڑ کر اُسے زور سے جھٹکا دیا۔ حضرت عثمانؓ نے اُس کی طرف آنکھ اٹھائی اور فرمایا میرے بھائی کے بیٹے! اگر تیرا باپ اسوقت ہوتا تو تجھے کبھی ایسا کرنے نہ دیتا۔ یہ سُنکر اس کا جسم کانپ گیا۔ اور وہ شرمندہ ہو کر واپس لوٹ گیا۔ اس کے بعد ایک اَور شخص آگے بڑھا اور اُس نے ایک لوہے کی سیخ حضرت عثمانؓ کے سر پر ماری اور پھر آپ کے سامنے جو قرآن کریم پڑا ہوا تھا اُسے اپنے پاؤں کی ٹھوکر سے الگ پھینک دیا۔ وہ ہٹا تو ایک اَور شخص آگے آگیا اور اُس نے تلوار سے آپ پر حملہ کیا جس سے آپ کا ہاتھ کٹ گیا پھر اُس نے دوسرا وار کیا۔ مگر آپ کی بیوی حضرت نائلہ درمیان میں آگئیں جس سے اُن کی انگلیاں کٹ گئیں۔ اس کے بعد اُس نے ایک اَور وار کیا جس سے آپ زخمی ہو کر گر گئے مگر پھر اُس نے یہ خیال کر کے کہ ابھی آپ کی جان نہیں نکلی ایسی حالت میں جبکہ زخموں کی شدت کی وجہ سے آپ بے ہوش ہو چکے تھے آپ کا گلا پکڑ کر گھونٹنا شروع کر دیا اور اس وقت تک آپ کو نہیں چھوڑا جب تک کہ آپ شہید نہیں ہو گئے۔

اِن واقعات کو دیکھکر کون کہہ سکتا ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ان واقعات سے خائف تھے۔ اور جب وہ اِن واقعات سے خائف ہی نہ تھے تو مِنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا کے خلاف یہ واقعات کیونکر ہو گئے۔ یہ لوگ تو اگر کسی امر سے خائف تھے تو اس سے کہ اسلام کی روشنی میں فرق نہ آئے۔ سو باوجود اِن واقعات کے وہی بات آخر قائم ہوئی جسے یہ لوگ قائم کرنا چاہتے تھے۔ اور اللہ تعالیٰ نے اُن کے خوف کو امن سے بدل دیا۔

یہی حال حضرت علیؓ کا ہے۔ اُن کے دل کا خوف بھی صرف صداقت اور روحانیت کی اشاعت کے بارہ میں تھا۔ سو اللہ تعالیٰ نے اس خوف کو امن سے بدل دیا یہ ڈر نہیں تھا کہ لوگ میرے ساتھ کیا سلوک کریں گے۔ چنانچہ باوجود اس کے کہ حضرت معاویہؓ کا لشکر بعض دفعہ حضرت علیؓ کے لشکر سے کئی کئی گنا زیادہ ہوتا تھا آپ اس کی ذرا بھی پرواہ نہیں کرتے تھے۔ اور یہی فرماتے تھے کہ جو کچھ قرآن کہتا ہے وہی مانوں گا۔ اس کے خلاف میں کوئی بات تسلیم نہیں کر سکتا۔

اگر محض لوگوں کی مخالفت کو ہی خوفناک امر قرار دے دیا جائے تب تو ماننا پڑے گا کہ انبیاء (نعوذ باللہ) ہمیشہ لوگوں سے ڈرتے رہے ہیں کیونکہ جتنی مخالفت لوگ اُن کی کرتے ہیں اتنی مخالفت اور کسی کی نہیں کرتے بہرحال دنیا کی مخالفت کوئی حقیقت نہیں رکھتی اور نہ خدا تعالیٰ نے یہ فرمایا ہے کہ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْ بَعْدِ الْخَوْفِ اَمْنًا بلکہ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا فرمایا ہے۔ کہ جس چیز سے وہ ڈرتے ہونگے اُسے اللہ تعالیٰ دُور کر دے گا اور اُن کے خوف کو امن سے بدل دیگا اور جیسا کہ میں بتا چکا ہوں وہ صرف اس بات سے ڈرتے تھے کہ امتِ محمدیہ میں گمراہی اور ضلالت نہ آجائے۔ سو امتِ محمدیہ کو اللہ تعالیٰ نے اُن کی اس توجہ اور دُعا کی برکت سے بحیثیت مجموعی ضلالت سے محفوظ رکھا اور اہل السنّت والجماعت کا مذہب ہی دنیا کے کثیر حصّہ پر ہمیشہ غالب رہا۔

مَیں نے اس آیت کے جو یہ معنے کئے ہیں کہ اسجگہ خوف سے مراد عام خوف نہیں بلکہ وہ خوف ہے جسے خلفاء کا دل محسوس کرتا ہو۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ انہیں عام خوف ضرور ہوتا ہے بلکہ عام خوف بھی

اللہ تعالیٰ ان سے دُور ہی رکھتا ہے۔ سوائے اس کے کہ اس میں کوئی مصلحت ہو۔ جیسے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں جب خوف پیدا ہوا تو اس کی وجہ یہ تھی کہ عام مسلمانوں کی حالت ایسی ہو چکی تھی کہ اب وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک خلافت کے انعام کے مستحق نہیں رہے تھے پس میرا یہ مطلب نہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کو عام خوفوں سے محفوظ نہیں رکھتا بلکہ مطلب یہ ہے کہ اصل وعدہ اس آیت میں اُسی خوف کے متعلق ہے جس کو وہ خوف قرار دیں اور وہ بجائے کسی اور بات کے ہمیشہ اس ایک بات سے ہی ڈرتے تھے کہ اُمتِ محمدیہ میں گمراہی اور ضلالت نہ آجائے سو خدا کے فضل سے امتِ محمدیہ ایسی ضلالت سے محفوظ رہی اور باوجود بڑے بڑے فتنوں کے اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُن کی وفات کے بعد اس کی ہدایت کے سامان ہوتے رہے۔ اصل معجزہ یہی ہوتا ہے کہ کسی کی وفات کے بعد اس کی خواہشات پوری ہوتی رہیں۔ زندگی میں اگر کسی کی خواہشیں پوری ہوں تو کہا جا سکتا ہے کہ اُس نے تدبیروں سے کام لے لیا تھا۔ مگر جس کی زندگی ختم ہو جائے اور پھر بھی اس کی خواہشیں پوری ہوتی رہیں اسکے متعلق نہیں کہا جا سکتا کہ اُس نے کسی ظاہری تدبیر سے کام لے لیا ہوگا۔ بلکہ یہ امر اس بات کا ثبوت ہوگا کہ وہ شخص خدا تعالیٰ کا محبوب اور پیارا تھا اور اللہ تعالیٰ کا اُس سے گہرا تعلق تھا جیسے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کشفی حالت میں سراقہ بن مالک کے ہاتھوں میں سونے کے کڑے دیکھے۔ اب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ صرف یہ نہیں کہ آپ نے اُس کے ہاتھ میں سونے کے کڑے دیکھے بلکہ معجزہ یہ ہے کہ باوجود اس کے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فوت ہو گئے ایک لمبا عرصہ گذرنے کے بعد مالِ غنیمت میں سونے کے کڑے آئے اور باوجود اس کے کہ شریعت میں مردوں کو سونے کے کڑے پہننے ممنوع ہیں اللہ تعالیٰ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دل میں یہ جذبہ پیدا کر دیا کہ وہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس کشف کو پورا کرنے کیلئے اُسے سونے کے کڑے پہنائیں۔ چنانچہ آپ نے اُسے پہنائے پس اس واقعہ میں معجزہ یہ ہے کہ باوجودیکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فوت ہو چکے تھے اللہ تعالیٰ نے حضرت عمرؓ کے دل میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک پیشگوئی کو پورا کرنے کا جذبہ پیدا کر دیا۔ پھر یہ بھی معجزہ ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ بات حضرت عمرؓ نے سُن لی۔ اور آپ کو اس کے پُورا کرنے کا موقع مل گیا۔ آخر حضرت عمرؓ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی ہر بات تو نہیں سُنا کرتے تھے۔ ممکن ہے یہ بات کسی اَور کے کان میں پڑتی اور وہ آگے کسی اَور کو بتانا بھول جاتا۔ مگر اس معجزہ کا یہ بھی ایک حصہ ہے کہ جس شخص کے پاس سونے کے کڑے پہنچے تھے اسے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ کشف بھی پہنچ چکا تھا۔ پھر اس معجزے کا یہ بھی حصہ ہے کہ حضرت عمرؓ کے دل میں اللہ تعالیٰ نے یہ تحریک پیدا کر دی کہ وہ اس صحابی کو سونے کے کڑے پہنائیں حالانکہ شریعت کے لحاظ سے مردوں کے لئے سونا پہننا ممنوع ہے مگر چونکہ اللہ تعالےٰ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس پیشگوئی کو پورا کرنا چاہتا تھا۔ اس لئے آپ کے دل کو اس نے اس طرف مائل کر دیا کہ مردوں کے سونا نہ پہننے میں جو حکمتیں ہیں وہ بھی بیشک اچھی ہیں مگر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی پیشگوئی کو پورا کرنے کے لئے کسی کو تھوڑی دیر کے لئے سونے کے کڑے پہنا دینا بھی کوئی بُری بات نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ انہوں نے اس صحابی کو اپنے سامنے سونے کے کڑے پہنائے۔

اسی طرح ہم دیکھتے ہیں کہ خلفاء راشدین فوت

ہوگئے تو ان کی وفات کے سالہا سال بعد خدا تعالیٰ نے اُن کے خوف کو امن سے بدلا۔ کبھی سو سال بعد کبھی دو سو سال بعد۔ کبھی تین سو سال بعد۔ کبھی چار سو سال کے بعد اور کبھی پانچ سو سال کے بعد اور اس طرح ظاہر کر دیا کہ خدا تعالیٰ اُن سے محبت رکھتا ہے اور وہ نہیں چاہتا کہ کہ ان کے ارادے رائیگاں جائیں۔ لیکن اگر اس ساری آیت کو ساری قوم کی طرف منسوب کر دیا جائے۔ تب بھی کوئی حرج نہیں کیونکہ اس صورت میں بھی وہی معنے کئے جائینگے جن کو میں نے بیان کیا ہے۔ یعنی اس صورت میں بھی ساری قوم کو اگر کوئی خوف ہو سکتا تھا تو وہ کفار کے اسلام پر غلبہ کا ہو سکتا تھا۔ فردی طور پر تو کسی کو یہ خوف ہو سکتا ہے کہ میرا بیٹا نہ مر جائے۔ کسی کو یہ خوف ہو سکتا ہے کہ مجھے تجارت میں نقصان نہ ہو جائے۔ مگر قوم کا خوف تو ایسا ہی ہو سکتا ہے جو اپنے اندر قومی رنگ رکھتا ہو اور وہ خوف بھی پھر یہی ماننا پڑتا ہے کہ ایسا نہ ہو اسلام پر کفار غالب آجائیں۔ سو قوم کا یہ خوف بھی اسلام کے ذریعہ ہی دُور ہوا۔ اور اسلام کو ایسا زبردست غلبہ حاصل ہوا جس کی اور کہیں مثال نہیں ملتی۔

خلفاء کی چھٹی علامت اللہ تعالیٰ نے یہ بتائی ہے کہ يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْئًا وہ خلفاء میری عبادت کریں گے اور میرے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرینگے۔ یعنی اُن کے دلوں میں خدا تعالیٰ جرأت اور دلیری پیدا کردیگا اور خدا تعالیٰ کے مقابلہ میں کسی کا خوف اُن کے دل میں پیدا نہیں ہوگا۔ وہ لوگوں کے ڈر سے کوئی کام نہیں کریں گے بلکہ اللہ تعالیٰ پر توکل رکھیں گے اور اُسی کی خوشنودی اور رضا کے لئے تمام کام کرینگے۔ یہ معنے نہیں کہ وہ بُت پرستی نہیں کریں گے۔ بُت پرستی تو عام مسلمان بھی نہیں کرتے کجا یہ کہ خلفاء کے متعلق یہ کہا جائے کہ وہ بُت پرستی نہیں کرینگے۔ پس یہاں بُت پرستی کا ذکر نہیں بلکہ اس امر کا ذکر ہے کہ وہ بندوں سے ڈر کر کسی مقام سے اپنا قدم پیچھے نہیں ہٹائیں گے بلکہ جو کچھ کرینگے خدا تعالیٰ کے منشاء اور اس کی رضا کو پورا کرنے کے لئے کرینگے اور اس امر کی ذرا بھی پرواہ نہیں کریں گے کہ اس راہ میں انہیں کن بلاؤں اور آفات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ دنیا میں بڑے سے بڑا دلیر آدمی بھی بعض دفعہ لوگوں کے ڈر سے ایسا پہلو اختیار کر لیتا ہے جس سے گو یہ مقصود نہیں ہوتا کہ وہ سچائی کو چھوڑ دے مگر دل میں یہ خواہش ضرور ہوتی ہے کہ میں ایسے رنگ میں کام کروں کہ کسی کو شکوہ پیدا نہ ہو۔

مولوی غلام علی صاحب ایک کٹر وہابی ہُوا کرتے تھے۔ وہابیوں کا یہ فتویٰ تھا کہ ہندوستان میں جمعہ کی نماز ہو سکتی ہے۔ لیکن حنفیوں کے نزدیک ہندوستان میں جمعہ کی نماز جائز نہیں تھی۔ کیونکہ وہ کہتے تھے کہ جمعہ پڑھنا تب جائز ہو سکتا ہے جب مسلمان سلطان ہو۔ جمعہ پڑھانے والا مسلمان قاضی ہو اور جہاں جمعہ پڑھا جائے۔ وہ شہر ہو ہندوستان میں انگریزی حکومت کی وجہ سے چونکہ نہ مسلمان سلطان رہا تھا۔ نہ قاضی اس لئے وہ جمعہ کی نماز پڑھنا جائز نہیں سمجھتے تھے ادھر چونکہ قرآن کریم میں وہ یہ لکھا ہُوا پاتے تھے کہ جب تمہیں جمعہ کے لئے بلا یا جائے تو فوراً تمام کام چھوڑتے ہوئے جمعہ کی نماز کے لئے چل پڑو۔ اس لئے ان کے دلوں کو اطمینان نہ تھا۔ ایک طرف ان کا جی چاہتا تھا کہ وہ جمعہ پڑھیں اور دوسری طرف وہ ڈرتے تھے کہ کہیں کوئی حنفی مولوی ہمارے خلاف فتویٰ نہ دیدے۔ اس مشکل کی وجہ سے ان کا یہ دستور تھا کہ جمعہ کے روز گاؤں میں پہلے جمعہ پڑھتے اور پھر ظہر کی نماز ادا کر لیتے۔ اور وہ خیال کرتے کہ اگر جمعہ والا مسئلہ درست ہے تب بھی ہم بچ گئے اگر ظہر پڑھنے والا مسئلہ صحیح ہے تب بھی ہم بچ گئے۔ اسی لئے

وہ ظہر کا نام ظہر کی بجائے "احتیاطی" رکھا کرتے تھے اور سمجھتے تھے کہ خدا نے اگر ہمارے جمعہ کی نماز کو الٹ پھینک دیا تو ہم ظہر کو اٹھا کر اس کے سامنے رکھدینگے اور اگر اُس نے ظہر کو ردّ کر دیا تو ہم جمعہ اس کے سامنے پیش کر دیں گے۔ اور اگر کوئی "احتیاطی" نہ پڑھتا تو سمجھا جاتا کہ وہ وہابی ہے۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام فرمایا کرتے تھے کہ ایک دفعہ ہم مولوی غلام علی صاحب کے ساتھ گورداسپور گئے۔ راستہ میں جمعہ کا وقت آ گیا۔ ہم نماز پڑھنے کے لئے ایک مسجد میں چلے گئے۔ آپ کا عام طریق وہابیوں سے ملتا جلتا تھا کیونکہ وہابی حدیثوں کے مطابق عمل کرنا اپنے لئے ضروری جانتے ہیں اور ان کا عقیدہ ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سُنت پر عمل کرنا ہی انسان کی نجات کے لئے ضروری ہے غرض آپ بھی مولوی غلام علی صاحب کے ساتھ گئے اور جمعہ کی نماز پڑھی۔ جب مولوی غلام علی صاحب جمعہ کی نماز سے فارغ ہوگئے تو انہوں نے چار رکعت ظہر کی نماز پڑھ لی۔ آپ فرماتے تھے کہ میں نے اُن سے کہا کہ مولوی صاحب یہ جمعہ کی نماز کے بعد چار رکعتیں کیسی ہیں۔ وہ کہنے لگے۔ یہ "احتیاطی" ہے۔ میں نے کہا۔ مولوی صاحب! آپ تو وہابی ہیں اور عقیدۃً اس کے مخالف ہیں۔ پھر "احتیاطی" کے کیا معنے ہوئے۔ وہ کہنے لگے یہ احتیاطی ان معنوں میں نہیں کہ خدا کے سامنے ہمارا جمعہ قبول ہوتا ہے یا ظہر۔ بلکہ یہ ان معنوں میں ہے کہ لوگ مخالفت نہ کریں۔ تو کئی لوگ اس طرح بھی کام کر لیتے ہیں جیسے مولوی غلام علی صاحب نے کیا کہ اپنے دل میں تو وہ اس بات پر خوش رہے کہ انہوں نے جمعہ پڑھا ہے اور اُدھر لوگوں کو خوش کرنے کیلئے چار رکعت ظہر کی نماز بھی پڑھ لی۔

اسی طرح ایک لطیفہ مشہور ہے۔ کہتے ہیں کہ کوئی سُنّی بزرگ تھے۔ جو شیعوں کے علاقہ میں رہتے تھے۔ ایک دفعہ غربت کی وجہ سے وہ بہت پریشان ہوگئے اور انہوں نے فیصلہ کیا کہ بادشاہ کے پاس پہنچ کر مدد کی درخواست کرنی چاہیئے۔ چنانچہ وہ اس کے پاس گئے اور مدد کی درخواست کی۔ وزیر نے اُن کی شکل کو دیکھ کر بادشاہ کو کہا کہ یہ شخص شیعہ نہیں سُنّی معلوم ہوتا ہے۔ بادشاہ نے کہا۔ تمہیں کس طرح معلوم ہُوا۔ وہ کہنے لگا بس شکل سے ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔ بادشاہ کہنے لگا یہ کوئی دلیل نہیں تم میرے سامنے اس کا امتحان لو۔ چنانچہ وزیر نے ان کے سامنے حضرت علیؓ کی بڑے زور سے تعریف شروع کر دی وہ بزرگ بھی حضرت علیؓ کی تعریف کرنے لگ گئے۔ بادشاہ نے یہ دیکھکر کہا کہ دیکھا تم جو کچھ کہتے تھے وہ غلط ثابت ہُوا یا نہیں۔ اگر یہ شیعہ نہ ہوتا تو کیا حضرت علیؓ کی ایسی ہی تعریف کرتا۔ وزیر کہنے لگا۔ بادشاہ سلامت آپ خواہ کچھ کہیں مجھے یہ سُنّی ہی معلوم ہوتا ہے۔ بادشاہ نے کہا اچھا امتحان کے لئے پھر کوئی اور بات کرو۔ چنانچہ وزیر کہنے لگا۔ کہو برہرسہ لعنت۔ یعنی ابوبکرؓ۔ عمرؓ اور عثمانؓ پر (نعوذ باللہ) لعنت۔ وہ بھی کہنے لگا۔ برہرسہ لعنت۔ بادشاہ نے کہا۔ اب تو یہ یقینی طور پر شیعہ ثابت ہوگیا ہے۔ وہ کہنے لگا۔ بظاہر تو ایسا ہی معلوم ہوتا ہے مگر میرا دل مطمئن نہیں۔ آخر وزیر انہیں الگ لے گیا۔ اور کہا۔ سچ سچ بتاؤ۔ تمہارا مذہب کیا ہے؟ اُس نے کہا۔ میں سُنّی ہوں۔ اُس نے کہا۔ پھر تم نے۔ برہرسہ لعنت کیوں کہا تھا۔ وہ بزرگ کہنے لگے۔ تمہاری اِن الفاظ سے تو یہ مراد تھی۔ کہ ابوبکرؓ۔ عمرؓ اور عثمانؓ پر لعنت ہو۔ مگر میری مراد یہ تھی کہ آپ دونوں اور مجھ پر لعنت ہو۔ آپ لوگوں پر اس لئے کہ آپ بزرگوں پر لعنت کرتے ہیں اور مجھ پر اس لئے کہ مجھے اپنی بدبختی سے تم جیسے لوگوں کے پاس آنا پڑا۔ غرض انسان کسی طریق پر وقت گذار لیتا ہے

اور سمجھتا ہے کہ اس طرح اُس نے کسی گناہ کا ارتکاب نہیں کیا۔ مگر فرمایا۔ يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْئًا۔ خلفاء انتہائی طور پر دلیر ہونگے اور خوف و ہراس اُن کے قریب بھی نہیں پھٹکے گا۔ وہ جو کچھ کریں گے خدا کی رضاء کے لئے کریں گے۔ کسی انسان سے ڈر کر اُن سے کوئی فعل صادر نہیں ہو گا۔

یہ علامت بھی خلفاء راشدین میں تمام و کمال پائی جاتی ہے۔ چنانچہ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے وفات پائی اور حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ خلیفہ مقرر ہوئے تو اس وقت سارا عرب مرتد ہو گیا۔ صرف دو جگہ نماز باجماعت ہوتی تھی۔ باقی تمام مقامات میں فتنہ اُٹھ کھڑا ہوا اور سوائے مکہ اور مدینہ اور ایک چھوٹے سے قصبہ کے تمام ملک نے زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیا اور کہا کہ اللہ تعالیٰ نے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے یہ فرمایا تھا کہ خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً (توبہ ع ۱۳) تو اُن کے مالوں سے صدقہ لے۔ کسی اور کو یہ اختیار نہیں کہ ہم سے زکوٰۃ وصول کرے۔ غرض سارا عرب مرتد ہو گیا اور وہ لڑائی کے لئے چل پڑا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں گو اسلام کمزور تھا مگر لوگ متفرق طور پر حملہ کرتے تھے۔ کبھی ایک گروہ نے حملہ کر دیا اور کبھی دوسرے نے۔ جب غزوۂ احزاب کے موقعہ پر کفار کے لشکر نے اجتماعی رنگ میں مسلمانوں پر حملہ کیا تو اُس وقت تک اسلام ایک حد تک طاقت پکڑ چکا تھا گو ابھی اتنی زیادہ طاقت حاصل نہیں ہوئی تھی کہ انہیں آئندہ کے لئے کسی حملہ کا ڈر ہی نہ رہتا۔ اس کے بعد جب رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم مکہ فتح کرنے کے لئے گئے تو اُس وقت عرب کے بعض قبائل بھی آپ کی مدد کے لئے کھڑے ہو گئے۔ اس طرح خدا تعالےٰ نے تدریجی طور پر دشمنوں میں جوش پیدا کیا تاکہ وہ اتنا زور نہ پکڑ لیں کہ سب ملک

پر چھا جائیں۔ لیکن حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں یکدم تمام عرب مرتد ہو گیا۔ صرف مکہ اور مدینہ اور ایک اور چھوٹا سا قصبہ رہ گئے۔ باقی سب مقامات کے لوگوں نے زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیا۔ اور وہ لشکر لیکر مقابلہ کے لئے نکل کھڑے ہوئے۔ بعض جگہ تو اُن کے پاس ایک ایک لاکھ کا بھی لشکر تھا۔ مگر ادھر صرف دس ہزار کا ایک لشکر تھا اور وہ بھی شام کو جا رہا تھا۔ اور یہ وہ لشکر تھا جسے اپنی وفات کے قریب رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے رومی علاقہ پر حملہ کرنے کے لئے تیار کیا تھا۔ اور اسامہؓ کو اس کا افسر مقرر کیا تھا۔ باقی جو لوگ تھے وہ یا تو کمزور اور بڈھے تھے اور یا پھر گنتی کے چند نوجوان تھے۔ یہ حالات دیکھ کر صحابہؓ نے سوچا کہ اگر ایسی بغاوت کے وقت اسامہؓ کا لشکر بھی روانہ ہو گیا تو مدینہ کی حفاظت کا کوئی سامان نہیں ہو سکیگا۔ چنانچہ اکابر صحابہؓ کا ایک وفد جن میں حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ بھی شامل تھے اور جو شجاعت اور دلیری میں مشہور تھے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور عرض کیا کہ کچھ عرصہ کیلئے اس لشکر کو روک لیا جائے۔ جب بغاوت فرو ہو جائے تو پھر بیشک اُسے بھجوا دیا جائے۔ مگر اب اس کا بھجوانا خطر سے خالی نہیں۔ مدینہ کی حفاظت کا کوئی سامان نہیں اور دشمن کا لشکر ہماری طرف بڑھتا چلا آ رہا ہے۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے نہایت غصہ کی حالت میں فرمایا کہ کیا تم یہ چاہتے ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ابو قحافہ کا بیٹا سب سے پہلا یہ کام کرے کہ جس لشکر کو روانہ کرنے کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا تھا اُسے روک لے۔ مَیں اس لشکر کو کسی صورت میں روک نہیں سکتا۔ اگر تمام عرب باغی ہو گیا ہے تو بیشک ہو جائے اور اگر مدینہ کی حفاظت کا کوئی سامان نہیں تو بے شک نہ رہے۔ خدا کی قسم اگر دشمن کی فوج مدینہ میں گھس آئے

اور ہمارے سامنے مسلمان عورتوں کی لاشیں کتے گھسیٹتے پھریں تب بھی میں اس لشکر کو ضرور روانہ کرونگا جس کو روانہ کرنے کا رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے۔ اگر تم دشمن کی فوجوں سے ڈرتے ہو تو بے شک میرا ساتھ چھوڑ دو۔ میں اکیلا تمام دشمنوں کا مقابلہ کرونگا۔ یہ یَعْبُدُوْنَنِیْ لَا یُشْرِکُوْنَ بِیْ شَیْئًا کی صداقت کا کتنا بڑا ثبوت ہے

دوسرا سوال زکوٰۃ کا تھا صحابہؓ نے عرض کیا کہ اگر آپ لشکر نہیں روک سکتے تو صرف اتنا کر لیجیئے کہ ان لوگوں سے عارضی صلح کریں اور انہیں کہہ دیں کہ ہم اس سال تم سے زکوٰۃ نہیں لیں گے۔ اس دوران میں ان کا جوش ٹھنڈا ہو جائیگا اور تفرقہ کے مٹنے کی کوئی صورت پیدا ہو جائیگی۔ موجودہ صورت میں جبکہ وہ جوش سے بھرے ہوئے ہیں اور جبکہ وہ لڑنے مرنے کے لئے تیار ہیں اُن سے زکوٰۃ وصول کرنا مناسب نہیں۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔ ایسا ہرگز نہیں ہوگا۔ اگر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں یہ لوگ اونٹ کا گھٹنا باندھنے والی ایک رسّی بھی زکوٰۃ میں دیا کرتے تھے اور اب نہیں دیں گے تو میں اُس وقت تک اُن سے جنگ جاری رکھونگا جب تک کہ وہ رسّی بھی اُن سے وصول نہ کر لوں۔ اس پر صحابہؓ نے کہا اگر جیشِ اسامہؓ بھی چلا گیا۔ اور ان لوگوں سے عارضی صلح بھی نہ کی گئی تو پھر دشمن کا کون مقابلہ کریگا۔ مدینہ میں تو بڈھے اور کمزور لوگ یا چند نوجوان ہیں وہ بھلا لاکھوں کا کہاں مقابلہ کر سکتے ہیں۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا۔ اے دوستو! اگر تم ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے تو ابوبکرؓ اکیلا ان کا مقابلہ کرنے کے لئے نکل کھڑا ہوگا۔ یہ دعویٰ اس شخص کا ہے جسے فنونِ جنگ سے کچھ زیادہ واقفیت نہ تھی اور جس کے متعلق عام طور پر یہ خیال کیا جاتا تھا کہ وہ دل کا کمزور ہے۔ پھر یہ جرأت۔ یہ دلیری یہ یقین اور یہ وثوق آپ میں کہاں سے آیا؟ اسی وجہ سے آیا کہ آپ نے یہ سمجھ لیا تھا کہ میں خلافت کے مقام پر خدا تعالیٰ کی طرف سے کھڑا ہوں اور مجھ پر ہی تمام کاموں کی ذمہ داری ہے۔ پس میرا فرض ہے کہ میں مقابلہ کیلئے تیار ہو جاؤں۔ کامیابی دینا یا نہ دینا خدا تعالیٰ کے اختیار میں ہے اگر وہ کامیابی دینا چاہیگا تو آپ دے دیگا اور اگر نہیں دینا چاہیگا تو سارے لشکر مل کر بھی کامیاب نہیں کر سکتے۔

اسی طرح حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی یہ جرأت دیکھو کہ انہوں نے اپنے عہد خلافت میں دنیا کی دو زبردست حکومتوں یعنی قیصر و کسریٰ سے بیک وقت جنگ شروع کر دی۔ حالانکہ اس زمانہ میں صرف قیصر کا مقابلہ کرنا بھی ایسا ہی تھا۔ جیسے آجکل افغانستان کی حکومت امریکہ یا انگلستان سے لڑائی شروع کر دے۔ مگر باوجود اتنی زبردست حکومت کے ساتھ جنگ جاری ہونے کے جب حضرت ابوبکرؓ کے سامنے یہ سوال پیش ہوا کہ کسریٰ کی فوجوں نے مسلمانوں کے مقابلہ میں سرگرمی دکھلانی شروع کر دی ہے اور اُن کے بہت سے علاقے جو مسلمانوں کے قبضہ میں تھے اُن میں بغاوت اور سرکشی کے آثار ظاہر ہو رہے ہیں تو آپ نے حکم دیا کہ فوراً ایران پر حملہ کر دو۔ صحابہؓ کہتے ہیں کہ ایک ہی وقت میں دو زبردست حکومتوں سے کس طرح مقابلہ ہوگا۔ مگر آپ فرماتے ہیں۔ کچھ پروہ نہیں جاؤ اور مقابلہ کرو۔ مسلمان چونکہ اس وقت رومی حکومت سے جنگ کرنے میں مشغول تھے اس لئے ایران پر مسلمانوں کا یہ حملہ اس قدر دُور از قیاس تھا کہ ایران کے بادشاہ کو جب یہ خبریں پہنچیں کہ مسلمان فوجیں بڑھتی چلی آ رہی ہیں تو اُس نے ان خبروں کو کوئی اہمیت نہ دی اور کہا کہ لوگ خواہ مخواہ جھوٹی افواہیں اُڑا رہے ہیں۔ مسلمان بھلا ایسی حالت میں جبکہ وہ پہلے ہی ایک خطرناک جنگ میں مبتلا ہیں ایران پر حملہ کرنے کا خیال بھی کر سکتے ہیں۔ چنانچہ کچھ عرصہ تک تو

ایرانیوں کی شکست کی بڑی وجہ یہی ہوئی کہ دارالخلافہ سے مسلمانوں کے مقابلہ میں کوئی فوج نہیں آئی۔ اور بادشاہ خیال کرتا رہا کہ لوگ جھوٹی خبریں اُڑا رہے ہیں۔ مگر جب کثرت اور تواتر کے ساتھ اسے اس قسم کی خبریں پہنچیں تو اُس نے اپنا ایک جرنیل بھیجا اور اُسے حکم دیا کہ میرے پاس صحیح حالات کی رپورٹ کرو۔ چنانچہ اُس نے جب رپورٹ کی کہ مسلمان واقعہ میں حملہ کر رہے ہیں اور وہ بہت سے حصوں پر قابض بھی ہو چکے ہیں۔ تب اُس نے ان کے مقابلہ کے لئے فوج بھیجی۔ اس سے تم اندازہ لگا لو کہ مسلمانوں کا اُس لڑائی میں کودنا بظاہر کتنا خطرناک تھا جبکہ اس کے ساتھ ہی وہ رومی لشکر کا بھی مقابلہ کر رہے تھے۔ مگر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو خدا تعالیٰ نے مقام خلافت پر کھڑا کرنے کے بعد جو قوت بخشی تھی اس کے آگے ان چیزوں کی کوئی حقیقت نہ تھی۔ انہوں نے یہ نہیں سوچا کہ اتنے مسلمان کہاں سے آئیں گے جو ایرانی لشکر کا مقابلہ کر سکیں۔ انہوں نے یہ نہیں سوچا کہ اتنا سامان اور اسلحہ کہاں سے آئیگا جو ایرانی فوجوں کے سامان اور اسلحہ کے مقابلہ میں کام آسکے۔ انہوں نے ایرانیوں کی سرکشی کی خبر سُنتے ہی فوراً اپنے سپاہیوں کو اس آگ میں کود جانے کا حکم دے دیا اور کسریٰ سے بھی جنگ شروع کر دی۔ اس کے بعد جب حضرت عمرؓ خلیفہ ہوئے تو یہی عمرؓ جو ابوبکرؓ کو یہ مشورہ دیتے تھے کہ اتنے بڑے لشکر کا ہم کہاں مقابلہ کر سکتے ہیں وہ بہت ہیں اور ہم تھوڑے جیشِ اسامہؓ کو روک لیا جائے تاکہ وہ ہماری مدد کر سکے۔ اُن میں بھی وہی توکل آگیا۔ اور انہوں نے بھی ایک ہی وقت میں قیصر و کسریٰ سے جنگ شروع کر دی اور آخر ان دونوں حکومتوں کا تختہ اُلٹ کر رکھ دیا۔ اسی جنگ کے نتیجہ میں جب ایران فتح ہوا اور کسریٰ کے خزائن حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچے تو مال غنیمت میں کسریٰ کا ایک رومال بھی آیا جو حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کو ملا۔ ایک دن انہیں کھانسی اُٹھی تو انہوں نے اپنی جیب میں سے کسریٰ شاہِ ایران کا رومال نکال کر اس میں تھوک دیا اور پھر کہا بَخٍ بَخٍ اَبُوْهُرَيْرَةَ۔ واہ وا ابوہریرہ! تیری بھی کیا شان ہے کہ تو آج کسریٰ شاہِ ایران کے رومال میں تھوک رہا ہے۔ لوگوں نے پوچھا۔ کہ آپ نے یہ کیا الفاظ استعمال کئے ہیں۔ انہوں نے کہا۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں بعض دفعہ مجھے اتنے فاقے ہوتے تھے کہ میں بھوک سے بیتاب ہو کر بے ہوش ہو جاتا اور لوگ یہ سمجھ کر کہ مجھے مرگی کا دورہ ہو گیا ہے میرے سر پر جوتیاں مارا کرتے مگر آج یہ حالت ہے کہ میں شاہی رومال میں تھوک رہا ہوں۔

تو يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْئًا کی علامت خدا تعالیٰ نے خلفائے راشدین کے ذریعہ نہایت واضح رنگ میں پوری فرمائی اور انہوں نے خدا تعالیٰ کے سوا کبھی کسی کا خوف اپنے دل میں نہیں آنے دیا۔ اسی طرح حضرت عثمانؓ جیسے باحیا اور رقیق القلب انسان نے اندرونی مخالفت کا مقابلہ جس یقین سے کیا ہے وہ انسانی عقل کو دنگ کر دیتا ہے حالانکہ وہ عام طور پر کمزور سمجھے جاتے تھے مگر جب اُن کا اپنا زمانہ آیا تو انہوں نے ایسی بہادری اور جرأت سے کام لیا کہ انسان ان واقعات کو پڑھ کر حیران رہ جاتا ہے۔ یہی حال حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ہے کسی مخالفت یا خطرے کی انہوں نے پرواہ نہیں کی حالانکہ اندرونی خطرے بھی تھے اور بیرونی بھی مگر ان کے مدّنظر صرف یہی امر رہا کہ خدا تعالیٰ کی مرضی پوری ہو اور ذرا بھی کسی سے خوف کھا کر اُس منشاءِ الٰہی میں جو انہوں نے سمجھا تھا فرق نہیں آنے دیا۔

غرض تمام خلفاء کے حالات میں ہمیں يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْئًا کا نہایت اعلیٰ درجہ کا نظارہ

نظر آتا ہے جو اس بات کا یقینی اور قطعی ثبوت ہے ۔ کہ
اللہ تعالیٰ نے انہیں خود مقامِ خلافت پر کھڑا کیا تھا ۔ اور
وہ آپ اُن کی تائید اور نصرت کا ذمہ وار رہا ۔

اَب میں اُن اعتراضات کو لیتا ہوں جو عام طور پر
اِس آیت پر کئے جاتے ہیں ۔ پہلا اعتراض اِس آیت
پر یہ کیا جاتا ہے کہ اس آیت میں امتِ مسلمہ سے وعدہ
ہے نہ کہ بعض افراد سے اور امت کو خلیفہ بنانے کا
وعدہ ہے نہ کہ بعض افراد کو ۔ پس اس سے مراد مسلمانوں
کو غلبہ اور حکومت کا میسر آجانا ہے نہ کہ بعض افراد
کا خلافت پر متمکن ہو جانا ۔ اس اعتراض کا جواب یہ ہے
بے شک یہ وعدہ قوم سے ہے مگر قوم سے کسی وعدہ کے
کئے جانے کے یہ معنے نہیں ہوتے کہ افراد کے ذریعہ وہ
وعدہ پورا نہ ہو بعض وعدے قوم سے ہوتے ہیں لیکن
افراد کے ذریعے پورے کئے جاتے ہیں ۔ اور کہا یہی جاتا ہے
کہ قوم سے جو وعدہ کیا گیا تھا وہ پورا ہو گیا ۔ اس کی
مثالیں دنیا کی ہر زبان میں ملتی ہیں ۔ مثلاً ہماری زبان میں
یہی کہا جاتا ہے کہ انگریز بادشاہ ہیں ۔ اب کیا اس کے
یہ معنے ہیں کہ ہر انگریز بادشاہ ہے ۔ ہر انگریز تو نہ بادشاہ
ہے اور نہ ہو سکتا ہے ۔ مگر کہا یہی جاتا ہے کہ انگریز
بادشاہ ہیں ۔ اِسی طرح کہا جاتا ہے کہ فلاں قوم حاکم
ہے ۔ حالانکہ ساری قوم کہاں حاکم ہوتی ہے چند افراد
کے سپرد حکومت کا نظم و نسق ہوتا ہے اور باقی سب
اس کے تابع ہوتے ہیں ۔ اسی طرح کہا جاتا ہے کہ فلاں
قوم بڑی دولت مند ہے مگر اس کے یہ معنے تو نہیں ہوتے
کہ اس قوم کا ہر فرد دولتمند ہے ۔ انگریزوں کے متعلق
عام طور پر کہا جاتا ہے کہ وہ بڑے دولتمند ہیں حالانکہ
اُن میں بڑے بڑے غریب بھی ہوتے ہیں ۔ ہمارے بڑے بھائی
مرزا سلطان احمد صاحب مرحوم نے ایک دفعہ سُنایا
کہ جب وہ لنڈن میں تھے تو ایک دن جس مکان میں
وہ رہتے تھے اس کا کوڑا کرکٹ اُٹھا کر خادمہ نے جب
باہر پھینکا تو ایک انگریز لڑکا جھپٹ کر آیا اور اُس نے
کوڑے کرکٹ کے انبار میں سے ڈبل روٹی کا ایک ٹکڑا
نکال کر کھا لیا ۔ اِسی طرح برنڈزی میں مَیں نے دیکھا کہ
عورتیں اپنے سر پر برتن رکھ کر پانی لینے جاتی تھیں اور ان کے
بچوں نے جو پتلونیں پہنی ہوئی تھیں اُن کا کچھ حصہ کسی کپڑے
کا ہوتا تھا اور کچھ حصہ کسی کپڑے کا ۔ مگر کہا یہی جاتا ہے
کہ یورپین بڑے دولتمند ہیں ۔ پس قوم سے وعدہ کے یہ
معنے نہیں ہوتے کہ افراد کے ذریعہ وہ وعدہ پورا نہ ہو ۔
کئی وعدے قوم سے ہی ہوتے ہیں لیکن پورے وہ افراد
کے ذریعہ کئے جاتے ہیں ۔ اس کی مثال بھی قرآن کریم
سے بھی ملتی ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ۔ وَ اِذْ قَالَ مُوْسٰی
لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ
جَعَلَ فِيْكُمْ اَنْۢبِيَآءَ وَ جَعَلَكُمْ مُّلُوْكًا ۔
(مائدہ ع ۴) یعنی موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا اے میری قوم!
اللہ تعالیٰ کی اس نعمت کو یاد کرو کہ اُس نے تم میں اپنے
انبیاء مبعوث کئے اور اُس نے تم کو بادشاہ بنایا ۔ اب
کیا کوئی ثابت کر سکتا ہے کہ سب بنی اسرائیل بادشاہ
بن گئے تھے ۔ یقیناً ان بنی اسرائیل میں بڑے بڑے غریب
بھی ہونگے مگر حضرت موسیٰ علیہ السلام ان سے یہی
فرماتے ہیں کہ جَعَلَكُمْ مُّلُوْكًا ۔ اُس نے تم سب
کو بادشاہ بنایا ۔ مراد یہی ہے کہ جب کسی قوم میں
سے بادشاہ ہو تو چونکہ وہ قوم ان انعامات اور فوائد
سے حصہ پاتی ہے جو بادشاہت سے تعلق رکھتے ہیں اسلئے بالفاظ دیگر ہم یہی
کہہ سکتے ہیں کہ وہ بادشاہ ہو گئی ۔ پس جب جَعَلَكُمْ
مُّلُوْكًا کی موجودگی کے باوجود اس آیت کے یہ معنے
نہیں کئے جاتے کہ ہر یہودی بادشاہ بنا ۔ تو وَعَدَ اللّٰهُ
الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ
فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ سے

یہ کیونکر نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ یہ وعدہ بعض افراد کے ذریعہ پورا نہیں ہونا چاہیئے۔ بلکہ امت کے ہر فرد کو خلافت کا انعام ملنا چاہیئے۔ پھر اگر اس سے قومی غلبہ بھی مراد لے لو تب بھی ہر مومن کو یہ غلبہ کہاں حاصل ہوتا ہے پھر بھی ایسا ہی ہوتا ہے کہ بعض افراد کو غلبہ ملتا ہے اور بعض کو نہیں ملتا۔ صحابہؓ میں سے بھی کئی ایسے تھے جو قومی غلبہ کے زمانہ میں بھی غریب ہی رہے اور ان کی مالی حالت کچھ زیادہ اچھی نہیں ہوئی۔ حضرت ابوہریرہؓ کا ہی لطیفہ ہے کہ جب حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کی آپس میں جنگ ہوئی اور صفین کے مقام پر دونوں لشکروں نے ڈیرے ڈال دیئے تو باوجود اس کے کہ حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کے کیمپوں میں ایک ایک میل کا فاصلہ تھا جب نماز کا وقت آتا تو حضرت ابوہریرہؓ حضرت علیؓ کے کیمپ میں آجاتے۔ اور جب کھانے کا وقت آتا تو حضرت معاویہؓ کے کیمپ میں چلے جاتے۔ کسی نے ان سے کہا کہ آپ بھی عجیب آدمی ہیں ادھر علیؓ کی مجلس میں چلے جاتے ہیں اور ادھر معاویہؓ کی مجلس میں شریک ہو جاتے ہیں۔ وہ کہنے لگے۔ نماز حضرت علیؓ کے ہاں اچھی ہوتی ہے اور کھانا حضرت معاویہؓ کے ہاں اچھا ملتا ہے۔ اس لئے جب نماز کا وقت ہوتا ہے میں ادھر چلا جاتا ہوں اور جب روٹی کا وقت آتا ہے ادھر آجاتا ہوں۔ غیر مبائعین کا بھی ایسا ہی حال ہے۔ بلکہ ان کا لطیفہ تو ابوہریرہؓ کے لطیفہ سے بھی بڑھ کر ہے۔ میں ایک دفعہ چوہدری ظفراللہ خان صاحب کے ہاں بیٹھا ہوا تھا کہ کسی دوست نے ایک غیر مبائع کے متعلق بتایا کہ وہ کہتے ہیں عقائد تو مولوی محمد علی صاحب کے درست ہیں مگر دعائیں میاں صاحب کی زیادہ قبول ہوتی ہیں۔ گویا جیسے ابوہریرہؓ نے کہا تھا کہ روٹی معاویہؓ کے ہاں اچھی ملتی ہے اور نماز علیؓ کے ہاں اچھی ہوتی ہے اسی طرح اس نے کہا کہ عقائد تو مولوی محمد علی صاحب کے درست ہیں مگر دعائیں ان کی قبول ہوتی ہیں۔ تو قوم میں بادشاہت آجانے کے باوجود پھر بھی کئی لوگ غریب ہی رہتے ہیں۔ مگر کہا یہی جاتا ہے کہ وہ قوم بادشاہ ہے کیونکہ جب کسی قوم میں سے کوئی بادشاہ ہو تو تمام قوم بادشاہت کے فوائد سے حصہ پاتی ہے۔ اسی طرح جب کسی قوم میں سے بعض افراد کو خلافت مل جائے تو یہی کہا جائیگا کہ اس قوم کو وہ انعام ملا ہے۔ یہ ضروری نہیں ہوگا کہ ہر فرد کو یہ انعام ملے۔ دوسری مثال اس کی یہ آیت ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ آمِنُوا بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ قَالُوا نُؤْمِنُ بِمَا أُنزِلَ عَلَيْنَا وَيَكْفُرُونَ بِمَا وَرَاءَهُ (بقرۃ ع) کہ جب یہود سے یہ کہا جاتا ہے کہ قرآن مجید میں جو کچھ اترا ہے اس پر ایمان لاؤ تو وہ کہتے ہیں نُؤْمِنُ بِمَا أُنزِلَ عَلَيْنَا ہم تو اسی پر ایمان لائیں گے جو ہم پر نازل ہوا ہے اور یہ امر صاف ظاہر ہے کہ وحی ان پر نہیں اتری تھی بلکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر اتری تھی۔ مگر وہ کہتے ہیں ہم پر اتری۔ گویا وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے کلام کے متعلق أُنزِلَ عَلَيْنَا کہتے ہیں۔ اسی طرح بعض افراد پر جو اس قسم کا انعام نازل ہو جس سے ساری قوم کو فائدہ پہنچتا ہو تو یہی کہا جاتا ہے کہ وہ ساری قوم کو ملا۔ چونکہ ملوکیت کے ذریعہ سے ساری قوم کی عزت ہوتی ہے اس وجہ سے جَعَلَكُمْ مُلُوكًا فرمایا۔ اور چونکہ خلافت سے سب قوم نے نفع اٹھانا تھا اس لئے خلافت کے بارہ میں بھی یہی کہا کہ تم کو خلیفہ بنایا جائیگا۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کے فعل نے اس امر پر شہادت دے دی ہے کہ اس کی اس آیت سے کیا مراد ہے۔ خدا تعالیٰ نے یہ کہا تھا کہ وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُم

فِی الْاَرْضِ کَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِہِمْ کہ وہ ایمان اور عمل صالح پر قائم رہنے والوں کو زمین میں اُسی طرح خلیفہ بنائیگا جس طرح اُس نے پہلوں کو خلیفہ بنایا اب اگر اللہ تعالےٰ کی اس سے جمہوریت مراد تھی تو ہمیں دیکھنا چاہیئے کہ آیا رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے بعد وہ جمہوریت قائم ہوئی یا نہیں - اور اگر خدا تعالیٰ کا یہ منشاء تھا کہ بعض افرادِ امت کو خلافت ملے گی اور اُن کی وجہ سے تمام قوم برکات خلافت کی مستحق قرار پاجائے گی تو ہمیں یہ دیکھنا چاہیئے کہ آیا اس رنگ میں مسلمانوں میں خلافت قائم ہوئی یا نہیں؟ اس نقطۂ نگاہ کے ماتحت جب ہم رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد کے حالات کو دیکھتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ بعض افرادِ امت کو ہی خلافت ملی تھی۔ سب کو خلافت نہیں ملی۔ پس یا تو یہ مانو کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد لوگ اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ کے مصداق نہیں رہے تھے - اور جس طرح شیعہ کہتے ہیں کہ امت میں صرف اڑھائی مومن تھے۔ اسی طرح نعوذ باللہ سب منافق ہی منافق رہ گئے تھے اس لئے خلافتِ قومی کا وعدہ اُن سے پُورا نہ ہُوا۔ اور یا یہ مانو کہ خلافت کا طریق وہی تھا جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد عملاً جاری ہُوا - بہر حال رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اللہ تعالےٰ نے مسلمانوں میں جس رنگ میں خلافت قائم کی وہ خدا تعالیٰ کی فعلی شہادت ہے - اور خدا تعالیٰ کی یہ فعلی شہادت بتا رہی ہے کہ قوم سے اس وعدہ کو بعض افراد کے ذریعہ ہی پورا کیا جائیگا -

دوسرا اعتراض اس آیت پر یہ کیا جاتا ہے کہ بہت اچھا ہم نے مان لیا کہ اس آیت میں افراد کی خلافت کا ذکر ہے مگر تم خود تسلیم کرتے ہو کہ پہلوں میں خلافت یا نبوت کے ذریعہ سے ہوئی یا ملوکیت کے ذریعہ سے مگر خلفاءِ اربعہ کو نہ تم نبی مانتے ہو - نہ ملوک - پھر یہ وعدہ کس طرح پُورا ہُوا - اور وہ اس آیت کے کس طرح مصداق ہوئے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ پہلوں کو خلافت یا نبوت کی شکل میں ملی یا ملوکیت کی صورت میں - مگر مشابہت کے یہ معنے نہیں ہوتے کہ ہر رنگ میں مشابہت ہو بلکہ صرف اصولی رنگ میں مشابہت دیکھی جاتی ہے - مثلاً کسی لمبے آدمی کا ہم ذکر کریں اور پھر کسی دوسرے کے متعلق کہیں کہ وہ بھی ویسا ہی لمبا ہے تو اب کوئی شخص ایسا نہیں ہوگا جو یہ کہے کہ جب تم نے دونوں کو لمبا قرار دیا ہے تو یہ مشابہت کس طرح درست ہوئی ان میں ایک چور ہے اور دوسرا نمازی۔ یا ایک عالم ہے اور دوسرا جاہل بلکہ صرف لمبائی میں مشابہت دیکھی جائیگی ہر بات اور ہر صورت میں مشابہت نہیں دیکھی جائیگی - اس کی مثال ہمیں قرآن کریم سے بھی ملتی ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے - اِنَّآ اَرْسَلْنَآ اِلَیْکُمْ رَسُوْلًا شَاھِدًا عَلَیْکُمْ کَمَآ اَرْسَلْنَآ اِلٰی فِرْعَوْنَ رَسُوْلًا (مزمل ع) کہ ہم نے تمہاری طرف اپنا ایک رسول بھیجا ہے جو تم پر نگران ہے اور وہ ویسا ہی رسول ہے جیسے ہم نے فرعون کی طرف رسول بھیجا تھا - اب دیکھو اللہ تعالےٰ نے یہاں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی آپس میں مشابہت بیان کی ہے حالانکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام فرعون کی طرف بھیجے گئے تھے اور رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کسی ایک بادشاہ کی طرف مبعوث نہیں ہوئے تھے بلکہ ساری دنیا کے بادشاہوں کی طرف مبعوث ہوئے تھے - اسی طرح حضرت موسےٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کی ہدایت کے لئے مبعوث ہوئے تھے مگر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ساری دنیا کی ہدایت کے لئے بھیجے گئے تھے - پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی رسالت کا زمانہ صرف انیس سو سال تک تھا مگر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا زمانہ قیامت تک کیلئے ہے - یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم

کے حالات میں اہم فرق ہیں۔ مگر باوجود ان اختلافات کے
مسلمان یہی کہتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت
موسیٰ علیہ السلام کے مثیل ہیں۔ پس اگر اس قسم کے اختلافات
کے باوجود آپ کی مشابہت میں فرق نہیں آتا تو اگر پہلوں
کی خلافت سے بعض جزوی امور میں خلفائے اسلام
مختلف ہوں تو اس میں اعتراض کی کونسی بات ہے؟
اصل بات جو اس آیت میں بتائی گئی تھی وہ یہ تھی کہ
جس طرح موسیٰ علیہ السلام کی قوم کو سنبھالنے کے لئے
اُن کی وفات کے بعد خدا تعالیٰ کی خاص حکمت نے بعض
وجودوں کو اُن کی امت کی خدمت کے لئے چن لیا تھا
اسی طرح رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد
بھی اللہ تعالیٰ بعض ایسے وجود کھڑے کریگا جو آپ کی
امت کو سنبھال لیں گے اور یہ مقصد بہ نسبت سابق
خلفاء کے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے خلفاء نے
زیادہ پورا کیا ہے۔ پھر جس طرح موسیٰ علیہ السلام کے
تیرہ سو سال کے بعد اللہ تعالےٰ نے مسیح ناصریؑ کو مبعوث
فرمایا جو موسوی شریعت کی خدمت کرنے والے ایک تابع
نبی تھے اسی طرح محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے
تیرہ سو سال کے بعد اللہ تعالےٰ نے مسیح موعود علیہ السلام کو
بھیجا اور اس طرح اُس تابع نبوت کا جو رسول کریم صلی اللہ
علیہ وسلم کی شان کے مناسب حال امتی نبوت ہے، دروازہ
کھول دیا۔ اور آپ کے ذریعہ اُس نے پھر آپ کے ماننے
والوں میں خلافت کو بھی زندہ کر دیا۔ چنانچہ یہ سلسلۂ خلافت
حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بعد شروع ہوا
اور خلافتِ ثانیہ تک ممتد رہا۔ اور اگر جماعت احمدیہ میں
ایمان بالخلافت قائم رہا اور وہ اس کو قائم رکھنے کے
لئے صحیح رنگ میں جدوجہد کرتی رہی تو انشاء اللہ تعالےٰ
یہ وعدہ لمبا ہوتا چلا جائیگا۔ مگر جماعت احمدیہ کو ایک
اشارہ جو اس آیت میں کیا گیا ہے کبھی نہیں بھولنا چاہئیے
اور وہ اشارہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے جس طرح ہم نے
پہلوں کو خلیفہ بنایا اُسی طرح تمہیں خلیفہ بنائیں گے یعنی
خلافت کو ممتاز کرنے کے لئے پہلوں کے طریق انتخاب کو
مدِّ نظر رکھو۔ اور پہلی قوموں میں سے یہودیوں کے علاوہ
ایک عیسائی قوم بھی تھی جس میں خلافت بادشاہت
کے ذریعہ سے نہیں آئی بلکہ اُن کے اندر خالص دینی خلافت
تھی۔ پس كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ میں
پہلوں کے طریق انتخاب کی طرف بھی توجہ دلائی گئی ہے
اور حضرت مسیح موعود علیہ السلام کا ایک الہام بھی اسکی
تصدیق کرتا ہے۔ آپ کا الہام ہے "کلیسیا کی طاقت
کا نسخہ" (تذکرہ ص۶۰۷) یعنی کلیسیا کی طاقت کی ایک
خاص وجہ ہے اس کو یاد رکھو۔ گویا قرآن کریم نے
كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ کے الفاظ
میں جس نسخہ کا ذکر کر دیا تھا۔ الہام میں اس کی طرف
اشارہ کر دیا گیا اور بتایا گیا کہ جس طرح وہ لوگ اپنا
خلیفہ منتخب کرتے ہیں اسی طرح یا اس کے قریب قریب
تم بھی اپنے لئے خلافت کے انتخاب کا طریقہ ایجاد کرو۔
چنانچہ اس طریق سے قریبًا انیس سو سال سے عیسائیوں
کی خلافت محفوظ چلی آتی ہے۔ عیسائیت کے خراب ہونے
کی وجہ سے بے شک انہیں وہ نور حاصل نہیں ہوتا جو
پہلے زمانوں میں حاصل ہوا کرتا تھا مگر جماعت احمدیہ اسلامی
تعلیم کے مطابق اس قانون کو ڈھال کر اپنی خلافت کو
سینکڑوں بلکہ ہزاروں سال تک کے لئے محفوظ کر سکتی
ہے۔ چنانچہ اسی کے مطابق مَیں نے آئندہ انتخاب خلافت
کے متعلق ایک قانون بنا دیا ہے اور مَیں سمجھتا ہوں کہ اگر
جماعت احمدیہ ایمان بالخلافت پر قائم رہی اور اس کے
قیام کے لئے صحیح جدوجہد کرتی رہی تو خدا تعالےٰ کے
فضل سے قیامت تک یہ سلسلہ خلافت قائم رہے گا
اور کوئی شیطان اس میں رخنہ اندازی نہیں کر سکیگا۔

ایک اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ اگر خلافت کا مسلمانوں سے وعدہ تھا تو حضرت علیؓ کے بعد خلافت کیوں بند ہوگئی؟ اسکا جواب یہ ہے کہ یہ وعدہ شرطی تھا۔ آیت کے الفاظ صاف بتاتے ہیں کہ یہ وعدہ ان لوگوں کے لئے تھا جو خلافت پر ایمان رکھتے ہونگے اور حصول خلافت کیلئے جو مناسب قومی اعمال ہونگے وہ کرتے رہیں گے۔ کیونکہ یہاں اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ کے الفاظ ہیں اور صَلُحَ کے معنے عربی زبان میں ایسے کام کے ہوتے ہیں جو مناسب حال ہو۔ چونکہ اس آیت میں خلافت کا ذکر ہے اس لئے اٰمَنُوْا سے مراد اٰمَنُوْا بِالْخِلَافَةِ ہے اور عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سے مراد عَمِلُوْا عَمَلًا مُنَاسِبًا لِحُصُوْلِ الْخِلَافَةِ ہے۔ اگر یہ شرط پوری نہ ہوگی تو خدا تعالیٰ کا وعدہ بھی پورا نہیں ہوگا حضرت علیؓ کے بعد صرف لفظ خلافت باقی رہ گیا تھا لیکن عملاً بادشاہت قائم ہوگئی اور خلافت کے لئے جو شرط ہے کہ تبلیغ دین اور تبلیغ اسلام کرے وہ مٹ گئی تھی پس شرط کے ضائع ہونے سے مشروط بھی ضائع ہوگیا۔ اور خدا تعالیٰ کا وعدہ ٹل گیا۔

ایک اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ جب خلیفہ انتخاب سے ہوتا ہے تو پھر امت کے لئے اُس کا عزل بھی جائز ہوا۔ اِس کا جواب یہ ہے کہ گو خلیفہ کا تقرر انتخاب کے ذریعہ سے ہوتا ہے لیکن یہ آیت نص صریح کے طور پر اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ امت کو اپنے فیصلہ کا اس امر میں ذریعہ بناتا ہے۔ اور اُس کے دماغ کو خاص طور پر روشنی بخشتا ہے لیکن مقرر اصل میں اللہ تعالیٰ ہی کرتا ہے چنانچہ فرماتا ہے لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ کہ وہ خود اُن کو خلیفہ بنائے گا پس گو خلفاء کا انتخاب مومنوں کے ذریعہ سے ہوتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ کا الہام لوگوں کے دلوں کو اصل حقدار کی طرف متوجہ کر دیتا ہے اور اللہ تعالیٰ بتاتا ہے کہ ایسے خلفاء میں مَیں فلاں فلاں خصوصیات پیدا کر دیتا ہوں اور یہ خلفاء ایک انعامِ الٰہی ہوتے ہیں۔ پس اِس صورت میں اس اعتراض کی تفصیل یہ ہوئی کہ کیا امت کو حق حاصل نہیں کہ وہ اُس شخص کو جو کامل موحد ہے جس کے دین کو اللہ تعالیٰ نے قائم کرنے کا فیصلہ کیا ہے جس کے لئے خدا نے تمام خطرات کو دُور کرنیکا وعدہ کیا ہے اور جس کے ذریعہ سے وہ شرک کو مٹانا چاہتا ہے اور جس کے ذریعہ سے وہ اسلام کو محفوظ کرنا چاہتا ہے معزول کر دے۔ ظاہر ہے کہ ایسے شخص کو امتِ اسلامیہ معزول نہیں کر سکتی ایسے شخص کو تو شیطان کے چیلے ہی معزول کرنے کا دعویٰ کر سکتے ہیں۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ اسجگہ وعدہ کا لفظ ہے اور وعدہ احسان پر دلالت کرتا ہے پس اِس اعتراض کے معنی یہ ہونگے کہ چونکہ اس انعام کا انتخاب اللہ تعالیٰ نے امت کے ہاتھ میں رکھا ہے اُسے کیوں حق نہیں کہ وہ اِس انعام کو ردّ کر دے۔ ہر عقلمند سمجھ سکتا ہے کہ یہ استنباط بدترین استنباط ہے جو انعام مُنہ مانگے ملے اُس کا ردّ کرنا تو انسان کو اور بھی مجرم بنا دیتا ہے اور اُس پر شدید حجت قائم کر دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ تو فرمائیگا کہ اے لوگو! مَیں نے تمہاری مرضی پر چھوڑا اور کہا کہ میرے انعام کو کس صورت میں لینا چاہتے ہو۔ تم نے کہا ہم اس انعام کو فلاں شخص کی صورت میں لینا چاہتے ہیں اور مَیں نے اپنے فضل اُس شخص کے ساتھ وابستہ کر دئے۔ جب مَیں نے تمہاری بات مان لی تو اب تم کہتے ہو کہ ہم اس انعام پر راضی نہیں اب اس نعمت کے ردّ کرنے پر مَیں اس کے سوا اور کیا کہہ سکتا ہوں کہ لَئِنْ كَفَرْتُمْ اِنَّ عَذَابِيْ لَشَدِيْدٌ (ابراہیم ع ۱) اِسی کی طرف اشارہ کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِيَسْتَاْذِنْكُمُ الَّذِيْنَ مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ

اے مومنو! چاہیئے کہ وہ لوگ جس کے مالک تمہارے دائیں ہاتھ ہیں

وَالَّذِيْنَ لَمْ يَبْلُغُوا الْحُلُمَ مِنْكُمْ ثَلٰثَ مَرّٰتٍ ؕ مِنْ

اور وہ لوگ جو ابھی بلوغت کو نہیں پہنچے وہ تین وقتوں میں اجازت لے کر اندر آیا کریں۔ صبح کی

قَبْلِ صَلٰوةِ الْفَجْرِ وَحِيْنَ تَضَعُوْنَ ثِيَابَكُمْ مِّنَ

نماز سے پہلے۔ اور جب تم دوپہر کے وقت اپنے کپڑے

الظَّهِيْرَةِ وَمِنْ بَعْدِ صَلٰوةِ الْعِشَآءِ ۛ ثَلٰثُ عَوْرٰتٍ

اتارتے ہو۔ اور عشاء کی نماز کے بعد۔ یہ تین وقت تمہارے

لَّكُمْ ؕ لَيْسَ عَلَيْكُمْ وَلَا عَلَيْهِمْ جُنَاحٌۢ بَعْدَهُنَّ ؕ

پردے کے وقت ہیں۔ ان وقتوں کے بعد اندر آنے جانے پر نہ تم پر کوئی گناہ ہے اور نہ ان پر کوئی گناہ ہے

فرماتا ہے کہ مَنْ کَفَرَ بَعْدَ ذٰلِکَ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْفٰسِقُوْنَ یعنی انتخاب کے وقت تو ہم نے امت کو اختیار دیا ہے مگر چونکہ اس انتخاب میں ہم امت کی رہبری کرتے ہیں اور چونکہ ہم اُس شخص کو اپنا بنالیتے ہیں اس لئے اس کے بعد امت کا کوئی اختیار باقی نہیں رہتا۔ اور جو شخص پھر بھی اختیار چلانا چاہے تو یاد رکھے کہ وہ خلیفہ کا مقابلہ نہیں کرتا بلکہ ہمارے انعام کی بے قدری کرتا ہے۔ پس اگر انتخاب کے وقت وہ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ میں شامل تھا تو اب اس اقدام کی وجہ سے ہماری درگاہ میں اس کا نام اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ کی فہرست سے کاٹا جائیگا اور فاسقوں کی فہرست میں لکھا جائیگا۔

پھر فرماتا ہے۔ وَ اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَ اٰتُوا الزَّکٰوۃَ وَ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ لَعَلَّکُمْ تُرْحَمُوْنَ۔ اس آیت میں وَ مَنْ کَفَرَ بَعْدَ ذٰلِکَ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْفٰسِقُوْنَ کے معًا بعد نماز اور زکوٰۃ اور اطاعت رسولؐ کا ذکر کرکے اس طرف بھی توجہ دلائی گئی ہے کہ اگر کسی وقت برکاتِ خلافت کے نزول میں کمی آجائے تو مسلمانوں کو بحیثیت قوم نمازوں میں لگ جانا چاہیئے اور زکوٰۃ دینے میں چُست ہو جانا چاہیئے۔ اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی کامل اطاعت اختیار کرنی چاہیئے۔ اگر وہ ایسا کرینگے تو اُن پر رحم کیا جائیگا اور پھر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی ایسا نائب کھڑا کر دیا جائے گا جو سب مسلمانوں کو اکٹھا کر دے گا۔ مگر بہرحال منکرین خلافت کبھی زمین پر غالب نہیں آئیں گے بلکہ اللہ تعالےٰ ایسے لوگ کھڑے کرتا رہیگا جو خلافت پر ایمان رکھتے ہوں۔ خواہ جزوی ہی ہو۔ چنانچہ خوارج

طَوّٰفُوْنَ عَلَيْكُمْ بَعْضُكُمْ عَلٰى بَعْضٍ ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ

کیونکہ بعض تم میں سے بعض کے پاس ضرورتاً اکثر آتے جاتے ہیں - اسی طرح اللہ (تعالےٰ)

اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۵۹﴾ وَاِذَا بَلَغَ

اپنے احکام کھول کر بیان کرتا ہے - اور اللہ (تعالیٰ) بہت علم والا (اور) حکمت والا ہے - اور جب تمہارے

الْاَطْفَالُ مِنْكُمُ الْحُلُمَ فَلْيَسْتَاْذِنُوْا كَمَا اسْتَاْذَنَ

بچے بلوغت کو پہنچ جائیں تو اسی طرح اجازت لیا کریں جس طرح اُن سے پہلے

الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ

(یعنی بڑے) لوگ اجازت لیا کرتے تھے - اسی طرح اللہ (تعالیٰ) اپنے احکام

اٰيٰتِهٖ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۶۰﴾

تمہارے لئے بیان کرتا ہے - اور اللہ (تعالیٰ) بہت جاننے والا (اور) حکمت والا ہے ۵۳۵

جو منکرین خلافت ہیں کبھی بھی دنیا پر حاکم نہیں ہوئے - بلکہ سُنّی جو مُنہ سے خلافت کے قائل ہیں لیکن حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کے زمانہ میں انہوں نے اپنی جانیں قربان کرکے خلافت کو قائم رکھنے کی کوشش نہیں کی وہی ہمیشہ غالب رہے ہیں -

۵۳۵ حل لغات:- اَلْحُلُمُ: مفردات امام راغبؒ میں ہے اِذَا بَلَغَ الْاَطْفَالُ مِنْكُمُ الْحُلُمَ اَیْ زَمَانَ الْبُلُوْغِ - یعنی آیت اِذَا بَلَغَ الْاَطْفَالُ مِنْكُمُ الْحُلُمَ میں اَلْحُلُمُ کے معنے زمانۂ بلوغت کے ہیں (مفردات)

اَلْحُلُمُ

تفسیر:- یہ آیت بظاہر ایک بے جوڑ آیت معلوم ہوتی ہے کیونکہ اس سے پہلے خلافت کا ذکر ہے اور اس آیت میں گھریلو معاملات کا ذکر شروع ہو گیا ہے لیکن اگر غور کیا جائے تو درحقیقت استعارۃً اس آیت میں بھی استحکام قومی کا ہی ذکر ہے - اس آیت میں کہا گیا ہے کہ غلام اور بچے تین وقتوں میں یعنی صبح کی نماز سے پہلے - دوپہر کے وقت اور عشاء کی نماز کے بعد اجازت لے کر گھر میں داخل ہوا کریں کیونکہ یہ تین وقت ایسے ہوتے ہیں جبکہ لوگ کپڑے اتار کر آرام کر رہے ہوتے ہیں ہاں اِن وقتوں کے آگے پیچھے یہ لوگ بغیر اجازت گھروں میں آجا سکتے ہیں - اس آیت میں یہ اشارہ کیا گیا ہے کہ کچھ وقت انسان پر غفلت کے بھی آتے ہیں ایسی غفلت کے اوقات میں بہت ہوشیار رہنا چاہیئے - اور غلاموں اور بچوں کو بھی بغیر اجازت گھر میں داخل نہیں ہونے دینا چاہیئے -

اسی طرح اس آیت میں یہ پیشگوئی بھی پائی جاتی ہے کہ جب مسلمانوں کو قومی طور پر غلبہ حاصل ہوگا

توغلاموں کا رواج اُن میں بڑھ جائیگا۔ چنانچہ اندلس اور بغداد میں زیادہ تر کام غلاموں سے ہی لیا گیا اور یہی مسلمانوں کی تباہی کا موجب ہوُا۔

مَیں سمجھتا ہوں کہ اگر اس آیت کے مضمون کو محض گھریلو مضمون نہ سمجھا جاتا بلکہ یہ سمجھا جاتا کہ یہ آیت چونکہ خلافت کے ذکر کے بعد آئی ہے اس لئے اس میں کوئی قومی مضمون بیان ہوُا ہے تو مسلمان اپنی کمزوری کے وقتوں میں اور زیادہ ہوشیار ہو جاتے۔ جیساکہ حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کے آخری ایام میں۔ اور کسی غیر کو خواہ وہ کتنا ہی بے ضرر نظر آتا اپنے نظام کے پاس تک نہ پھٹکنے دیتے۔ اگر وہ ایسا کرتے تو نہ حضرت عثمانؓ کی شہادت ہوتی اور نہ حضرت علیؓ کی۔ حضرت علیؓ کی شہادت صبح کی نماز کے وقت ہوئی تھی۔ اگر مسلمان اس آیت کے مضمون کے مطابق حضرت علیؓ کے گھر کا اُس وقت پہرہ دے رہے ہوتے تو ایک فاسق خارجی کی کیا مجال تھی کہ آپ پر حملہ کرتا۔ اُس نے مِنْ قَبْلِ صَلٰوةِ الْفَجْرِ کا وقت شاید اسی آیت سے نکالا ہو اور سمجھا ہو کہ خدا تعالیٰ نے اس وقت کو ننگا ہونے کا وقت قرار دیا ہے یعنی جب آدمی حفاظت سے محروم ہوتا ہے اس لئے بہتر ہے کہ اُسی وقت حملہ کرے۔ اِسی طرح دوپہر کا وقت حفاظتی نقطۂ نگاہ سے بڑی بھاری اہمیت رکھتا ہے۔ کیونکہ یہ وہ وقت ہوتا ہے جبکہ بالعموم لوگ غافل ہو جاتے ہیں اور حملہ آور ہمیشہ ایسے موقعوں کی تاک میں رہتے ہیں جبکہ لوگ غفلت کی نیند سو رہے ہوں صحابہؓ سے ایک دفعہ دوپہر کے وقت اسی قسم کی غلطی ہوئی تھی جس کا نتیجہ یہ ہوُا کہ حملہ آور تلوار لیکر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سر پر کھڑا ہو گیا۔ اور اُس نے چاہا کہ آپ کو قتل کر دے۔ مگر اللہ تعالیٰ کا فضل آپ کے شاملِ حال ہوُا اور اُس نے دشمن کو اپنے بد ارادہ میں ناکام کر دیا۔ یہ واقعہ غزوۂ ذات الرقاع سے واپسی کے وقت پیش آیا۔ دوپہر کے وقت صحابہؓ اِدھر اُدھر پھیل گئے اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی آرام فرمانے کے لئے ایک درخت کے نیچے لیٹ گئے۔ چونکہ مدینہ قریب آگیا تھا۔ اِس لئے انہوں نے سمجھا کہ اب کسی دشمن کے حملہ کا کوئی خطرہ نہیں ہو سکتا۔ مگر دشمن تاک میں تھا جب صحابہؓ اِدھر اُدھر پھیل گئے اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کوئی شخص حفاظت کے لئے نہ رہا تو ایک شخص آگے بڑھا اور اُس نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہی تلوار اٹھا کر آپ کو جگایا اور پوچھا کہ بتائیں اب آپ کو میرے ہاتھ سے کون بچا سکتا ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اُسی طرح لیٹے لیٹے نہایت اطمینان سے فرمایا کہ اللہ۔ آپ کا یہ جواب دینا تھا کہ اس کے جسم پر کپکپی طاری ہوئی اور تلوار اُس کے ہاتھ سے گر گئی۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فوراً وہی تلوار اپنے ہاتھ میں لے لی اور پھر اُس سے پوچھا کہ بتا اب تجھے میرے ہاتھ سے کون بچا سکتا ہے۔ وہ کہنے لگا۔ آپ ہی رحم کریں تو کریں۔ آپ نے فرمایا کمبخت تُو نے میرے مونہہ سے ہی اللہ کا نام سن کر کہہ دینا تھا کہ اللہ مجھے بچائیگا۔ مگر تجھ سے اتنا بھی نہ ہو سکا کہ میری نقل ہی کر لیتا۔ اِس کے بعد رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ کو بلایا اور فرمایا کہ یہ شخص مجھے قتل کرنے کے لئے آیا تھا مگر خدا نے مجھے اس کے حملہ سے بچا لیا (سیرت الحلبیہ جلد ۲ ص۲۲۵ و ص۲۸۵) اب دیکھو وہ بھی دوپہر ہی کا وقت تھا جب وہ شخص رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر حملہ کرنے کے لئے آیا۔

اِسی طرح مِنْ بَعْدِ صَلٰوةِ الْعِشَآءِ کے الفاظ میں رات کے وقت ہوشیار رہنے کی نصیحت کی گئی ہے۔

وَالْقَوَاعِدُ مِنَ النِّسَاۤءِ الّٰتِیْ لَا یَرْجُوْنَ نِكَاحًا

اور وہ عورتیں جوکہ بڑھیا ہوگئی ہیں (اور) نکاح کے قابل نہیں -

فَلَیْسَ عَلَیْهِنَّ جُنَاحٌ اَنْ یَّضَعْنَ ثِیَابَهُنَّ غَیْرَ

اُن پر کوئی گناہ نہیں کہ اپنے کپڑے اتار کر رکھ دیں اسی طرح کہ

مُتَبَرِّجٰتٍۭ بِزِیْنَةٍ ؕ وَ اَنْ یَّسْتَعْفِفْنَ خَیْرٌ لَّهُنَّ ؕ

زینت کو ظاہر نہ کیا کریں - اور اُن کا بچے رہنا اُن کے لئے بہتر ہوگا -

وَاللّٰهُ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ (۶۱)

اور اللہ (تعالیٰ) بہت سُننے والا (اور) جاننے والا ہے ۳۶

اسی وجہ سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں انصار اپنی مرضی سے رات کے وقت آپ کے گھر کا پہرہ دیا کرتے تھے - ایک دفعہ رات کے وقت آپکو باہر ہتھیاروں کے چھنکار کی آواز آئی - آپنے نکل کر دیکھا تو ایک انصاری سردار بولے کہ یا رسول اللہ! آپ اطمینان سے آرام فرمائیے۔ آجکل دشمنوں میں آپکے خلاف بڑا جوش پایا جاتا ہے میں نے اپنی قوم سے کہا کہ چلو ہتھیار لیکر آپ کا پہرہ دیں۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم بڑے خوش ہوئے اور آپنے انہیں دعا دی۔ پس یہ تین کمزوری کے اوقات ہیں جن میں اسلام مومنوں کو چوکس اور ہوشیار رہنے کی نصیحت فرماتا ہے -

اس کے بعد فرماتا ہے کہ جب بچے جوان ہو جائیں تو پھر ان تین کمزوریوں کے وقتوں کا سوال نہیں ہر وقت انکو اجازت لینی چاہیئے۔ یعنی جب مسلمانوں کو حکومت مل جائے تو انہیں ہر وقت اپنے ملک کی حفاظت کا فکر رکھنا چاہیئے اور کبھی بھی اس سے غافل نہیں ہونا چاہیئے۔ مگر افسوس ہے کہ مسلمانوں نے اپنی طاقت کے زمانہ میں اس ہدایت پر عمل نہ کیا اور وہ اپنی حفاظت سے ایسے غافل ہوئے کہ دشمن انہیں تباہ کرنے میں کامیاب ہوگیا چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے وقت تک بھی گھروں کے دروازے ہوتے تھے جن کے کھولے بغیر کوئی شخص اندر داخل نہیں ہوسکتا تھا لیکن خلافت عباسیہ اور خلافت اندلس اور خلافت فاطمیہ میں دروازے نہیں ہوتے تھے بلکہ صرف زینت کے طور پر پردے گرائے جاتے تھے گویا زینت اس وقت مقدم ہوگئی تھی اور حفاظت نفس مؤخر ہوگئی تھی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کئی خلفاء غلاموں کے ہاتھ سے ہی مارے گئے -

۳۶ حل لغات: اَلْقَوَاعِدُ: اَلْقَاعِدُ کی جمع ہے اور اَلْقَاعِدُ کے معنے ہیں اَلْمَرْاَةُ الَّتِیْ قَعَدَتْ عَنِ الْوَلَدِ وَعَنِ الزَّوْجِ وہ عورت جو بچے پیدا کرنے اپنے خاوند کے ساتھ تعلق قائم کرنے کا زمانہ ختم کر چکی ہو (اقرب)

ثِیَابٌ: ثَوْبٌ کی جمع ہے اور ثوب کے معنے کپڑے کے ہیں۔ لیکن محاورہ میں ثِیَابٌ دوستوں اور رشتہ داروں کو بھی کہتے ہیں -

مُتَبَرِّجٰتٌ: تَبَرَّجَ سے اسم فاعل مؤنث کا صیغہ مُتَبَرِّجَةٌ آتا ہے اور مُتَبَرِّجٰتٌ جمع کا صیغہ ہے - جب تَبَرَّجَتِ الْمَرْاَةُ کہیں تو عربی زبان میں

الْقَوَاعِدُ ۲

ثِیَابٌ ۲

مُتَبَرِّجٰتٌ ۲

لَيْسَ عَلَى الْاَعْمٰى حَرَجٌ وَّلَا عَلَى الْاَعْرَجِ حَرَجٌ

نہ اندھوں پر نہ لنگڑوں پر

وَّلَا عَلَى الْمَرِيْضِ حَرَجٌ وَّلَا عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ اَنْ

نہ مریض پر نہ تم پر

تَاْكُلُوْا مِنْۢ بُيُوْتِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اٰبَآئِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ

گھروں سے یا اپنے باپ دادوں کے گھر سے یا اپنی ماؤں

اُمَّهٰتِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اِخْوَانِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اَخَوٰتِكُمْ

(یا ننھیال) کے گھر سے یا اپنے بھائیوں کے گھر سے یا اپنی بہنوں کے گھر سے

اس کے معنے ہونگے اَظْهَرَتْ زِيْنَتَهَا لِلْاَجَانِبِ کہ عورت نے اپنی زینت کو نامحرم لوگوں کیلئے ظاہر کیا (اقرب) پس غَيْرَ مُتَبَرِّجٰتٍ کے معنے ہونگے۔ وہ عورتیں اپنی زینت کو غیروں کیلئے ظاہر نہ کریں۔

تفسیر:- اسجگہ یہ حکم دیا گیا ہے کہ جو عورتیں بڑھاپے کی وجہ سے کمزور ہو جائیں اور نکاح کے قابل نہ رہیں وہ اگر معروف پردہ چھوڑ دیں تو جائز ہے ہاں خواہ مخواہ زیور پہن کر اور بناؤ سنگار کرکے باہر نہ نکلیں یعنی پردہ ایک عمر تک ہے اس کے بعد پردہ کے احکام ساقط ہو جاتے ہیں۔ ہمارے ملک نے پردہ کے احکام کو ایسی بُری طرح استعمال کیا ہے کہ جوان عورتیں پردہ چھوڑ رہی ہیں۔ اور بوڑھی عورتوں کو جبراً گھروں میں بٹھایا جا رہا ہے۔

اس آیت میں بوڑھی عورتوں کیلئے قَوَاعِدُ کا لفظ استعمال ہوا ہے جو جمع ہے اور اسکا مفرد قَاعِدٌ بھی آتا ہے اور قَاعِدَةٌ بھی لیکن اس آیت میں قَوَاعِدُ قَاعِدٌ کی جمع ہے۔ اور اس میں یہ اشارہ ہے کہ عورت کے بیٹھنے سے مراد اس کا بڑھاپے کی وجہ سے بیٹھنا ہے۔ جبکہ وہ اولاد پیدا کرنے کے قابل نہیں رہتی۔ عربی قواعد کی رو سے قَاعِدٌ وہ صیغہ ہے جو مذکر کے لئے استعمال ہوتا ہے اور جب مؤنث کے لئے استعمال کریں تو ۃ زائد کر دیتے ہیں۔ لیکن جو چیز عورتوں کے ساتھ مخصوص ہو اور اس میں مردوں کے شامل ہونے کا کوئی اشتباہ واقعہ نہ ہوتا ہو وہاں تانیث کی علامت لگانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ جیسے عربی میں اس عورت کو جسے حمل ہو چکا ہو اِمْرَاَةٌ حَامِلٌ کہیں گے۔ پس نحویوں نے استدلال کیا ہے کہ اسجگہ قَوَاعِدُ کا لفظ چونکہ ایسے معنے رکھتا ہے۔ جو مرد پر چسپاں نہیں ہو سکتے اس لئے اس کے مفرد کے ساتھ بھی مؤنث کی علامت نہیں ہونی چاہیئے پس یہ قَاعِدَةٌ کی جمع نہیں بلکہ قَاعِدٌ کی جمع ہے۔

ضمنی طور پر اَنْ يَّضَعْنَ ثِيَابَهُنَّ سے معلوم ہوتا ہے کہ عورت کا چہرہ پردہ میں شامل ہے

اَوْ بُيُوْتِ اَعْمَامِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ عَمّٰتِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اَخْوَالِكُمْ

یا اپنے چچوں کے گھر سے یا اپنی پھوپھیوں کے گھر سے یا اپنے ماموؤں کے گھر سے

اَوْ بُيُوْتِ خٰلٰتِكُمْ اَوْ مَا مَلَكْتُمْ مَّفَاتِحَهٗٓ اَوْ صَدِيْقِكُمْ

یا اپنی خالاؤں کے گھر سے یا جن کے سامان کے انتظام پر تم مقرر ہو یا اپنے دوستوں کے گھروں سے کوئی چیز لے کر کھا لینے

لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَاْكُلُوْا جَمِيْعًا اَوْ اَشْتَاتًا ؕ فَاِذَا

میں کوئی حرج ہے (اسی طرح) تم پر کوئی گناہ نہیں کہ الگ کھاؤ یا سب مل کر کھاؤ۔ پس جب

دَخَلْتُمْ بُيُوْتًا فَسَلِّمُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ تَحِيَّةً مِّنْ

گھروں میں داخل ہونے لگو تو اپنے عزیزوں یا دوستوں پر سلام کہہ لیا کرو۔ یہ اللہ کی طرف سے

عِنْدِ اللّٰهِ مُبٰرَكَةً طَيِّبَةً ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ

ایک بڑی برکت والی اور پاکیزہ دُعا ہے۔ اِسی طرح (اللہ تعالیٰ) اپنے احکام

الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۶۲﴾ ع ۸ ۱۴

تمہیں کھول کر سناتا ہے۔ تاکہ تم عقل سے کام لو۔ ۵۳۷

ورنہ اَنْ يَّضَعْنَ ثِيَابَهُنَّ کے معنے کرنے پڑینگے کہ مونہہ اور ہاتھ تو پہلے ہی ننگے تھے اب سینہ اور بازو بھی بلکہ سارا بدن بھی ننگا کرنا جائز ہوگیا حالانکہ اسے کوئی بھی تسلیم نہیں کرتا۔

وَاَنْ يَّسْتَعْفِفْنَ خَيْرٌ لَّهُنَّ۔ بعض لوگوں نے اس آیت کے یہ معنے کئے ہیں کہ اگر وہ بچیں تو بہتر ہے لیکن یہ معنے درست نہیں کیونکہ اس آیت میں اِنْ کا لفظ استعمال نہیں ہوا بلکہ اَنْ کا لفظ استعمال ہوا ہے عربی میں اگر کا مفہوم ادا کرنے کیلئے اِنْ کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے اور اَنْ مصدری معنے دینے کیلئے آتا ہے پس اس آیت کے یہ معنے نہیں کہ اگر وہ اس سے بچیں تو بہتر ہے بلکہ یہ معنے ہیں کہ اس سے بچنا انکے لئے بہرحال بہتر ہے یعنی جائز ہے کہ پردہ چھوڑ دیں لیکن اگر وہ پردہ جاری رکھیں تو کئی لحاظ سے اِس میں بھی اُن کے لئے بہتری ہوگی۔ مثلاً اس سے نوجوان عورتوں میں بے پردگی کی تحریک پیدا نہیں ہوگی۔ ہمارے ملک کے لحاظ سے ساٹھ سالہ اور یورپ کے لحاظ سے ستر بہتر سالہ عورت پر اس اجازت کا اطلاق ہو سکتا ہے۔ کیونکہ اس عمر میں بوڑھی عورتوں کیلئے چلنا پھرنا مشکل ہوتا ہے اور پھر پردہ کے کپڑوں کو سنبھالنا تو اُن کی مشکل کو اور بھی بڑھا دیتا ہے۔ لیکن شریعت پھر بھی یہی کہتی ہے کہ اگر وہ پردہ کو قائم رکھیں تو نتائج کے لحاظ سے یہ زیادہ بہتر بات ہے۔

۵۳۷ تفسیر: مفسرین لکھتے ہیں کہ اس آیت کے نزول سے پہلے جب مسلمان جہاد کیلئے باہر جاتے تھے

تو چونکہ اُن میں سے بعض کے گھر بالکل خالی ہُوا کرتے تھے اِس لئے وہ ایسے لوگوں کو جو معذوری کی وجہ سے جہاد میں شریک نہیں ہو سکتے تھے اپنے گھروں کی کُنجیاں سپرد کر دیتے تھے اور کہتے تھے کہ ہمارے گھروں کا خیال رکھنا اور جو کچھ کھانے کی چیزیں ہمارے گھروں میں پڑی ہیں وہ استعمال کرتے رہنا مگر وہ لوگ اپنی نیکی اور تقوٰی کی وجہ سے دوسروں کے اموال کو استعمال کرنے سے احتراز کیا کرتے تھے - اور کہتے تھے کہ ہمارا کام صرف گھروں کی نگہداشت کرنا ہے ہمارے لئے اُن کی کھانے پینے کی چیزیں استعمال کرنا جائز نہیں - اِسپر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی - کہ جب انہوں نے خود تمہیں اپنے گھروں کی چابیاں دے دی ہیں اور وہ جہاد کے لئے باہر گئے ہوئے ہیں تو تمہیں اُن کے گھروں سے اور اسی طرح اپنے قریبی رشتہ داروں کے گھروں سے کھانا کھا لینے میں کوئی حرج نہیں -

حضرت ابن عباسؓ اور سعید بن جبیرؓ کہتے ہیں کہ جب یہ آیت نازل ہوئی کہ يَآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ (نساء ع) یعنی اے مومنو! تم آپس میں ناجائز طور پر اپنے مال نہ کھاؤ - تو انصار نے کہا - کہ اموال میں سے سب سے افضل چیز تو طعام ہی ہے پس جب خدا نے ہمیں حکم دیا ہے کہ ہم ایک دوسرے کے اموال کو ناجائز طور پر استعمال نہ کریں - تو اگر ہم اندھوں اور لنگڑوں اور بیماروں کے ساتھ مل کر کھانا کھائیں گے تو ہو سکتا کہ ہم ان کا حق کھا جائیں اور اس طرح خدا تعالےٰ کی نگاہ میں ہم مجرم ٹھہریں - کیونکہ اندھے کو تو پتہ ہی نہیں ہوتا کہ میرے سامنے کیا کیا چیزیں پڑی ہیں - اس لئے ہو سکتا ہے کہ اچھی چیزیں ہم خود کھا جائیں اور اندھا اُن سے محروم رہ جائے - اسی طرح لنگڑے کے متعلق بھی امکان ہو سکتا ہے کہ وہ اپنی معذوری کی وجہ سے کھانے کے لئے دیر سے پہنچے یا بہت پیچھے بیٹھے اور اس طرح کھانے کی تقسیم اور اس کے استعمال میں اُس سے ناانصافی ہو جائے - یہی حال بیمار کا ہو سکتا ہے کہ ممکن ہے وہ اپنی بیماری کی وجہ سے بعض کھانے نہ کھائے اور دوسرے لوگ کھا جائیں اس لئے اندھوں - لنگڑوں اور بیماروں کے ساتھ مل کر کھانا نہیں کھانا چاہیئے - اسی طرح انہوں نے اپنے رشتہ داروں کے ہاں بھی کھانا کھانا ترک کر دیا کہ مبادا کوئی گناہ ہو جائے اس پر یہ آیت نازل ہوئی کہ بے شک ان کے ساتھ مل کر کھانا کھا لیا کرو - اور بلا تکلف اپنے قریبی رشتہ داروں کے گھروں میں بھی آیا جایا کرو - اور اُن کے ساتھ مل کر یا علیحدہ علیحدہ جس طرح چاہو - اور اس قسم کے وساوس سے باہمی تعلقاتِ محبت کو منقطع نہ کرو -

اِس کے مقابلہ میں بعض لوگ کہتے ہیں کہ خود اندھے اور لنگڑے اور بیمار اپنی بیماری کی وجہ سے تندرستوں کے ساتھ مل کر کھانا کھانا پسند نہیں کرتے تھے تا ایسا نہ ہو کہ اُن کی معذوری اور بیماری کی وجہ سے لوگوں کو کوئی تکلیف محسوس ہو - اِسپر یہ آیت نازل ہوئی اور انہیں بھی تندرستوں کے ساتھ مل کر کھانا کھانے کی اجازت دے دی گئی -

بعض لوگ کہتے ہیں کہ وہ لوگ جن کی مالی حالت کمزور ہُوا کرتی تھی اور اُن کے لئے گھروں میں کھانے کا پورا سامان نہیں ہُوا کرتا تھا - اُن کا طریق تھا کہ وہ عموماً معذوروں کو اپنے رشتہ داروں کے گھر لے جا کر کھانا کھلا دیا کرتے تھے - لیکن جن کو ساتھ لے جا کر کھانا کھلاتے تھے وہ بُرا مناتے تھے اور سمجھتے تھے کہ ہمیں غیروں کے گھروں میں کھانے کے لئے کیوں لے جایا جاتا ہے - اس پر اللہ تعالےٰ نے یہ آیت نازل فرمائی - اور ہدایت فرمائی کہ اپنے قریبی رشتہ داروں کے گھروں

کھانا کھا لینے میں کوئی حرج نہیں۔

ضحاکؒ کہتے ہیں کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے اہلِ مدینہ اپنے کھانے میں اندھوں لنگڑوں اور بیماروں کو خصوصیت کے ساتھ شامل نہیں کیا کرتے تھے۔ اسپر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ اور اُن کے ساتھ مل کر کھانا کھانے کو جائز قرار دیدیا۔

مفسرین میں اِس بات پر بھی بحث ہوئی ہے کہ آیا یہ آیت منسوخ ہے یا محکم۔ بعض نے تو یہ کہا ہے کہ یہ آیت منسوخ ہے اور وہ اس کی وجہ یہ بتلاتے ہیں کہ ابتدائے اسلام میں مکانوں کے دروازے نہیں ہوا کرتے تھے۔ صرف پردے لٹکا دئے جاتے تھے۔ اس لئے جب کسی کو بھوک ستاتی تو وہ پردہ اٹھا کر اندر آ جاتا۔ حالانکہ بعض دفعہ گھر میں کوئی شخص بھی نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں اُن کے اس فعل کو جائز قرار دے دیا مگر بعد میں جب دروازے لگ گئے اور قرآن کریم نے بھی یہ ہدایت دے دی کہ گھروں میں بلا اجازت داخل نہ ہوا کرو تو اب کسی کے لئے یہ جائز نہ رہا کہ وہ بلا اجازت دوسرے کے گھر میں داخل ہو کر کھانے پینے کی چیزیں اٹھالے۔ اور چونکہ اس آیت میں اجازت پائی جاتی ہے اس لئے یہ آیت منسوخ ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ آیت منسوخ نہیں بلکہ ناسخ ہے۔ اور اس کی وجہ وہ یہ بتاتے ہیں کہ جب یہ آیت نازل ہوئی کہ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوْۤا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ (نساء ع) تو صحابہؓ نے ایک دوسرے کے ساتھ مل کر کھانا کھانا ترک کر دیا اور سمجھا کہ اسطرح ہم اندھوں لنگڑوں اور بیماروں کا حق ناجائز طور پر استعمال کر سکتے ہیں۔ اسپر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ پس ان کے نزدیک يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوْۤا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ والی آیت منسوخ ہے اور یہ آیت ناسخ ہے۔ لیکن ایک تیسرا گروہ یہ کہتا ہے کہ یہ آیت نہ ناسخ ہے نہ منسوخ بلکہ محکم آیات میں سے ہے اور اس کے ثبوت میں وہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی ایک روایت پیش کرتے ہیں جس میں یہ ذکر آتا ہے کہ صحابہؓ جہاد پر جاتے وقت بعض لوگوں کے سپرد اپنے مکانات کی حفاظت اور نگرانی کا کام کر جاتے مگر وہ اُن کے کھانے پینے کی چیزیں استعمال نہیں کرتے تھے۔ اسپر یہ آیت نازل ہوئی۔ پس یہ منسوخ نہیں بلکہ محکم آیت ہے۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ عرب اور مدینہ کے رہنے والے عموماً اندھوں لنگڑوں اور بیماروں کے ساتھ کھانا نہیں کھایا کرتے تھے کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ اندھا کھانے میں ہاتھ ڈالیگا تو چونکہ اُسے کچھ دکھائی نہیں دیتا اس لئے وہ اِدھر اُدھر ہاتھ ماریگا اور کھانا خراب ہو جائیگا۔ اور لنگڑے کی نشست دیکھ کر انہیں انقباض محسوس ہوتا اور بیمار کی بُو اور اس کی شکل اور بیماری کے مختلف عوارض سے انہیں تکلیف ہوتی۔ یہ طریقِ عمل چونکہ اُن کے کبر پر دلالت کرتا تھا اسلئے اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرما کر انہیں ہدایت دی کہ ایسے معذوروں اور قریبی رشتہ داروں کے ہاں سے کھانا کھا لینے میں کوئی حرج نہیں۔

مفسرین نے اس بات پر بھی بحث کی ہے کہ یہ ساری آیت آیا ایک ہی مضمون پر مشتمل ہے یا اس میں الگ الگ مضامین بیان کئے گئے ہیں۔ چنانچہ اس کے متعلق بھی دو گروہ پائے جاتے ہیں۔ بعض لوگ تو کہتے ہیں کہ یہ تمام آیت لَيْسَ عَلَى الْاَعْمٰى حَرَجٌ وَّلَا عَلَى الْاَعْرَجِ حَرَجٌ وَّلَا عَلَى الْمَرِيْضِ حَرَجٌ سے لے کر كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ تک معاشرتی آداب اور ایک دوسرے کے ہاں

کھانا کھانے کے مضمون کے ساتھ ہی تعلق رکھتی ہے۔ لیکن بعض لوگ کہتے ہیں کہ اَنْ تَأْكُلُوْا مِنْۢ بُيُوْتِكُمْ اور اس سے اگلی قیدیں عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ کے ساتھ ہیں۔ اور اس آیت کا پہلا ٹکڑا ایک الگ ٹکڑا ہے جس کا کھانا کھانے کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ ایسے لوگوں نے لَيْسَ عَلَى الْاَعْمٰى حَرَجٌ وَّلَا عَلَى الْاَعْرَجِ حَرَجٌ وَّلَا عَلَى الْمَرِيْضِ حَرَجٌ کے یہ معنے کئے ہیں کہ یہ لوگ چونکہ اپنی معذوری کی وجہ سے جہاد میں شریک نہیں ہو سکتے اس لئے ان پر کوئی الزام نہیں۔ علامہ قرطبیؒ نے اسی آخری توجیہ کو پسند کیا ہے اور وہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اندھوں اور لنگڑوں اور بیماروں پر سے اُن تمام احکام کی پابندی دُور کر دی ہے جن کو وہ اپنی معذوری کی وجہ سے سرانجام نہیں دے سکتے۔ یعنی وہ کام جس کے لئے بینائی کی ضرورت ہو اس کے نہ بجا لانے پر اندھوں پر کسی قسم کا الزام عائد نہیں کیا جا سکتا۔ اور وہ کام جس کیلئے صحیح سالم ٹانگوں کی ضرورت ہو اس کے سرانجام نہ دینے پر شریعت لنگڑوں کو کسی قسم کے الزام کے نیچے نہیں لاتی۔ اسی طرح ہر وہ کام جس کے لئے جسمانی طاقت کی ضرورت ہے اس کے سرانجام نہ دینے کی وجہ سے بیماروں پر کوئی گرفت نہیں کی جا سکتی۔ ابن عطیہؒ نے بھی اسی کی تائید کی ہے۔ اور انہوں نے کہا ہے کہ اسجگہ حَرَجٌ سے ہر وہ معذوری مراد ہے جو کسی اندھے یا لنگڑے یا بیمار کو لاحق ہو مثلاً بیمار آدمی روزہ نہیں رکھ سکتا۔ اندھا اور لنگڑا جہاد میں شریک نہیں ہو سکتا۔ یا اسی قسم کے اور کئی کاموں میں حصہ نہیں لے سکتا ایسی تمام معذوریاں اللہ تعالیٰ مدّنظر رکھیگا اور ان لوگوں کو ثواب سے محروم نہیں کریگا۔ ان کے نزدیک وَلَا عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ سے وہ مضمون شروع ہوتا ہے جس کا معاشرتی آداب کے ساتھ تعلق ہے۔

اوپر کی تشریح سے ظاہر ہے کہ مفسرین کو اس آیت کے معنے کرنے میں اچھی خاصی مشکل پیش آئی ہے یہاں تک کہ بعض لوگوں نے اس آیت کو ہی منسوخ قرار دے دیا ہے۔ مگر یہ عقیدہ کہ قرآن کریم میں کوئی منسوخ آیت بھی ہے نہایت گندہ اور خلافِ اسلام عقیدہ ہے جس کے نتیجہ میں قرآن کریم کی کسی آیت کا بھی اعتبار نہیں رہتا۔ اگر یہ تسلیم کیا جائے کہ قرآن کریم کے بعض حصے منسوخ ہیں اور دوسری طرف یہ دیکھا جائے کہ کہیں خدا نے یہ بتایا ہی نہیں کہ کونسا حصہ منسوخ ہے اور کونسا قابلِ عمل تو ہر آیت پر عمل کرتے وقت طبیعت میں یہ خلجان رہیگا کہ نہ معلوم جس آیت پر میں عمل کر رہا ہوں وہ منسوخ ہے یا غیر منسوخ اور اس طرح ساری کتاب پر سے ہی اعتبار اٹھ جاتا ہے۔ پس یہ تو قطعی طور پر غلط ہے کہ یہ آیت منسوخ ہے۔ قرآن کریم کی ایک آیت چھوڑ ایک حرف بلکہ ایک زیر اور زبر بھی منسوخ نہیں بلکہ بسم اللہ سے لیکر والناس تک ساری کتاب قابلِ عمل ہے۔ ہمارا کام یہ ہے کہ اگر ہمیں کسی آیت کے صحیح معنے معلوم نہ ہوں تو ہم اس پر غور کریں۔ یہ نہیں کہ اُسے منسوخ قرار دے دیں اور اس طرح خدا تعالیٰ کے کلام کی ہتک کریں۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ آیت اسلام اور یہودیت کے ایک بہت بڑے امتیاز پر دلالت کرتی ہے۔ اور اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اسلام خدا تعالیٰ کی طرف سے دنیا کے لئے رحمت کا ایک بادل بن کر آیا تھا جو دلوں کی مرجھائی ہوئی کھیتیوں پر اس شان سے برسا کہ اُس نے انہیں سرسبز و شاداب بنا دیا اور ستم رسیدہ انسانوں کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ کھیلنے لگی۔

اسلام سے پہلے دنیا میں صرف یہودی مذہب ہی

ایک ایسا مذہب تھا جو اپنے زمانہ کے لحاظ سے تفصیلی شریعت کا حامل تھا اور دنیا کا ایک مقبول طبقہ اسے اپنی نجات کا ذریعہ سمجھتا تھا۔ مگر یہودیت دنیا کو جو تعلیم دے رہی تھی اس کا ایک ہلکا سا اندازہ ان آیات سے لگایا جا سکتا ہے کہ

"پھر خداوند نے موسیٰ سے کہا کہ ہارون سے کہدے کہ تیری نسل میں پشت در پشت اگر کوئی کسی طرح کا عیب رکھتا ہو تو وہ اپنے خدا کی غذا گذراننے کو نزدیک نہ آئے خواہ کوئی ہو جس میں عیب ہو وہ نزدیک نہ آئے خواہ وہ اندھا ہو یا لنگڑا یا نک چپٹا ہو یا زائد الاعضاء۔ یا اس کا پاؤں ٹوٹا ہو یا ہاتھ ٹوٹا ہو یا وہ کبڑا یا بونا ہو یا اس کی آنکھ میں کچھ نقص ہو یا کھجلی بھرا ہو یا اس کے پپڑیاں ہوں یا اس کے خصیے پچکے ہوں۔ ہارون کاہن کی نسل میں سے کوئی جو عیب دار ہو۔ خداوند کی آتشین قربانیاں گذراننے کو نزدیک نہ آئے۔ وہ عیب دار ہے۔ وہ ہرگز اپنے خدا کی غذا گذراننے کو پاس نہ آئے وہ اپنی خدا کی نہایت ہی مقدس اور پاک دونوں طرح کی روٹی کھائے۔ لیکن پردہ کے اندر داخل نہ ہو۔ نہ مذبح کے پاس آئے اس لئے کہ وہ عیب دار ہے۔ تا ایسا نہ ہو کہ وہ میرے مقدس مقاموں کو بے حرمت کرے۔"

(احبار باب ۲۱ آیت ۱۶ تا ۲۳)

اس تعلیم پر غور کرو۔ اور دیکھو کہ اندھوں اور لنگڑوں اور بیماروں اور معذوروں کو کس حقارت کی نگاہ سے دیکھا گیا ہے۔ کس طرح انہیں مقدس مقامات سے دور رہنے کی ہدایت کی گئی ہے۔ کس طرح انہیں ناپاک قرار دے کر سوسائٹی کا ایک ناکارہ عضو قرار دیا گیا ہے کیا اس تعلیم کی موجودگی میں کوئی بھی بیمار اور معذور اس پر خوش ہو سکتا ہے؟ اور کیا وہ یہودیت کو اپنی نجات کا ضامن قرار دے سکتا ہے جو مذہب اس کے خلقی عیوب کی وجہ سے اُسے ناپاک قرار دیتا ہے وہ روحانیت میں اُسے کونسا درجہ دینے کے لئے تیار ہو سکتا ہے؟ یہ ستم ایک لمبے عرصہ تک جاری رہا۔ اُنیس سو سال تک بیماروں اور معذوروں کی آہیں آسمان کی طرف بلند ہوتی رہیں اور وہ خدا تعالیٰ کے رحم و کرم کے دروازہ کو کھٹکھٹاتی رہیں۔ آخر خدا نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو رحمۃ للعالمین بنا کر مبعوث فرمایا اور اُس نے آپ کے ذریعہ دنیا کو یہ تعلیم دی کہ لَيْسَ عَلَى الْأَعْمَىٰ حَرَجٌ وَّلَا عَلَى الْأَعْرَجِ حَرَجٌ وَّلَا عَلَى الْمَرِيضِ حَرَجٌ یعنی اندھوں اور لنگڑوں اور بیماروں کو حقارت کی نگاہ سے مت دیکھو وہ بھی تمہارے بھائی ہیں اور تمہاری سوسائٹی کا ایک اہم جزو ہیں اُن کو حقارت کی نگاہ سے دیکھنا اور انہیں اپنے تمدنی اور معاشرتی حلقہ سے منقطع کر دینا انسانیت کے شرف اور اس کی عظمت کی توہین کرنا ہے۔ اس لئے ہم تمہیں یہ تعلیم دیتے ہیں کہ ان معذوروں کو بھی اپنی سوسائٹی کا ایک حصہ سمجھو اور اُن سے چھوت چھات مت کرو اگر ایسا کرو گے۔ تو معذوروں اور ادنیٰ درجہ کے لوگوں اور امراء اور اعلیٰ خاندانوں میں ایک وسیع خلیج حائل ہو جائیگی۔ اور قوم کے ایک حصہ میں احساس کمتری پیدا ہو جائیگا جو انہیں کچل کر رکھ دیگا۔ اور تمہاری قوم کبھی ترقی حاصل نہیں کر سکے گی۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے وَفِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ (ذریات ع)

کی تعلیم دی اور بتایا کہ تمہارے اموال میں نہ صرف وہ لوگ
شریک ہیں جو مطالبہ کرکے تم سے اپنے حقوق حاصل کر سکتے ہیں
بلکہ وہ لوگ شریک ہیں جو بیمار اور کمزور اور معذور ہیں -
دنیا نے ایک لمبے عرصہ تک انسانیت کے ایک بڑے حصہ
کی توہین کی یہاں تک کہ ہندو مت نے برہمن۔ ویش، کھشتری
اور شودر کی تقسیم کرکے بنی نوع انسان کو الگ الگ ٹکڑوں
میں تقسیم کر دیا ۔ اور شودر کا یہ فرض قرار دیا کہ برہمن کی خدمت
کرے اور کبھی اپنے حقوق کا مطالبہ نہ کرے بلکہ منوجی نے
تو کہا کہ

" اگر شودر دھن جمع کرے تو راجہ کا فرض ہے
کہ وہ اس سے چھین لے کیونکہ شودر مالدار
ہوکر براہمنوں کو دکھ دیتا ہے ۔"

(منو ادھیائے ۹ شلوک ۶۷)

اسی طرح انہوں نے یہ تعلیم دی کہ

" برہمن شودر سے دولت لے لے۔ اس میں کوئی
دچار نہ کرے کیونکہ وہ دولت جو اس نے جمع
کی ہے وہ اس کی نہیں بلکہ برہمن کی ہے ۔"

(منو ادھیائے ۸ شلوک ۴۱۷)

گویا براہمنوں کو اجازت دے دی گئی کہ جب بھی تمہیں کسی شودر
کے پاس دولت دکھائی دے تم فوراً اس سے چھین لو ۔
اور یہ مت خیال کرو کہ ایسا کرنا گناہ ہوگا ۔ کیونکہ شودر
کا مال اس کا نہیں بلکہ تمہارا ہے ۔

یہودیت آئی تو اس نے بھی اندھوں اور لنگڑوں
اور بیماروں کو اپنی سوسائٹی سے الگ قرار دیدیا اور انہیں
ناپاک سمجھنے کا حکم دیا ۔ مدینہ اور اس کے نواحی میں بھی
چونکہ اسلام سے پہلے زیادہ تر یہود کی آبادی تھی
اس لئے ان میں بھی اندھوں اور لنگڑوں اور بیماروں
کے ساتھ علیحدہ سلوک کیا جاتا تھا ۔ اور وہ ان کے
ساتھ کھانا کھانے یا انہیں اپنی دعوتوں وغیرہ میں
شریک کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتے تھے ۔ یہ یہودی اثر
اتنا غالب تھا کہ جب حضرت مسیح آئے تو ان پر بھی یہ اعتراض
کیا گیا کہ یہ محصول لینے والوں کے ساتھ کھانا کھاتا ہے
چنانچہ انجیل میں لکھا ہے :۔

" جب وہ گھر میں کھانا کھانے بیٹھا تھا
تو ایسا ہوا کہ بہت سے محصول لینے والے
اور گنہگار آکر یسوع اور اس کے شاگردوں
کے ساتھ کھانا کھانے بیٹھے ۔ فریسیوں نے
یہ دیکھ کر اس کے شاگردوں سے کہا ۔ تمہارا
استاد محصول لینے والوں اور گنہگاروں کے
ساتھ کیوں کھاتا ہے ۔"

(متی باب ۹ آیت ۱۰ و ۱۱)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تنافر کے حلقہ کو یہودیوں
نے اتنا وسیع کر دیا تھا کہ وہ بیماروں اور اندھوں اور
لنگڑوں وغیرہ سے لے کر خاص خاص نوکریوں پر کام کرنے
والوں کے ساتھ بھی کھانا کھانا معیوب سمجھتے تھے مگر
محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ ایک ایسی تعلیم
لے کر آئے ۔ جو عالمگیر اخوت کو ترقی دینے والی اور
انسانیت کو اعلیٰ درجہ کی بنیادوں پر استوار کرنیوالی
تھی اس لئے آپ نے ان تمام طوقوں کو کاٹ کر رکھ
دیا جو پرانے مذاہب نے ان کے گلوں میں ڈال رکھے
تھے اور ان تمام زنجیروں کو قطع کر دیا جنہوں نے
رسم ورواج کی صورت میں انہیں جکڑ رکھا تھا ۔ اور
بتایا کہ چھوت چھات کو اپنے لئے لعنت سمجھو اور
اخوت کو ترقی دینے کے لئے تمام بنی نوع انسان کو
ایک سطح پر لاکر کھڑا کرو ۔ اور اپنے رشتہ داروں سے
تعلقاتِ محبت زیادہ سے زیادہ بڑھانے کی کوشش
کرو ۔

رشتہ داروں کا ذکر اس لئے بھی کیا گیا ہے کہ دنیا میں

ایک طبقہ اپنے قریبی رشتہ داروں کے ہاں کھانا کھانا بھی
معیوب سمجھتا ہے۔ ہندوؤں کو بھی دیکھ لو۔ وہ اپنی بیٹی
کے گھر سے پانی تک پینا گناہ سمجھتے ہیں اور چونکہ
ہندوستان میں ہندو اور مسلمان ایک لمبے عرصہ
تک مل جل کر رہے اس لئے بعض ہندوانہ رسوم
مسلمانوں میں داخل ہوگئیں اور ان کا بھی ایک حصّہ
اس قسم کی رسوم میں مبتلا ہو گیا بلکہ موجودہ
تہذیب کے دَور میں یورپین قوموں میں بھی یہ دستور
پایا جاتا ہے کہ اگر بیٹا بھی باپ کے ہاں چلا جائے
تو اُسے گھر کی بجائے ہوٹل میں ٹھہرنے کا مشورہ دیا جاتا
ہے۔ گویا باوجود اس کے کہ آجکل تہذیب عروج پر ہے
پھر بھی تمدنی اور معاشرتی معاملات میں ابھی دنیا کی
مہذب اقوام کو بھی قرآنی تعلیم سے ہزاروں سبق سیکھنے
کی ضرورت ہے۔ غرض یہ چیزیں چونکہ دلوں میں مغائرت کا
جذبہ پیدا کرتی ہیں۔ اور باہمی محبت کو قطع کرتی ہیں اسلئے
اسلام نے اپنے قریبی رشتہ داروں اور دوستوں کے ہاں
کھانا کھانے کی اجازت دی۔ تاکہ آپس کے تعلقات
بڑھیں اور مغائرت اور اجنبیت کا احساس دلوں پر غالب
نہ آنے پائے۔

غرض اِس آیت میں بتایا گیا ہے۔ کہ اندھے
اور لنگڑے یا بیمار کا بوجہ معذوری کے معروف حد تک
رہنے یا اپنے یا اپنے رشتہ داروں کے گھروں سے
بن بلائے کھانا کھا لینا یا تندرست کا اپنے نہایت
قریبی رشتہ داروں کے گھروں میں کھانا کھا لینا کوئی
معیوب امر نہیں۔ اسی طرح اگر کسی کے مال کا نگران ہو تو
کسی کے مال کو معروف طور پر کھا لے تو یہ کوئی الزام کی
بات نہیں۔ یہ عرفِ عام سے تعلق رکھنے والی ایک بات
ہے اور عرفِ عام پر کوئی اعتراض نہیں ہوتا۔

مگر یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ اسجگہ مریضوں کے ساتھ
مل کر کھانا کھانے سے یہ مراد نہیں کہ متعدی اور خطرناک
امراض میں مبتلا انسانوں کے ساتھ بھی کھانا کھا لو۔
تو حرج نہیں۔ اسلام نے اس قسم کے حالات کو بھی مدنظر
رکھا ہے اور متعدی امراض میں مبتلا انسانوں سے مناسب
حفاظت اور بچاؤ کی تاکید کی ہے۔ جیسے رسول کریم
صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں فرمایا۔ کہ
جذامی سے بچو تا ایسا نہ ہو کہ تم بھی اس مرض میں
مبتلا ہو جاؤ۔ اور قرآن کریم نے اصولی طور پر یہ ہدایت
دی ہے کہ لَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ
(بقرہ ع ۲۴) یعنی اپنے آپکو جان بوجھ کر ہلاکت میں
مت ڈالو۔ پس یہاں بیماری سے وہ معمولی عوارض مراد
ہیں جو عام طور پر ہوتے رہتے ہیں اور جن میں مبتلا
انسانوں کا تندرست انسانوں کے ساتھ مل کر بیٹھنا
کوئی نقصان دہ نہیں سمجھا جاتا۔ اور نہ دوسروں کی صحت
پر اس کا کوئی بُرا اثر پڑتا ہے۔ مثلاً سر درد ہے یا
گلے کی خرابی ہے یا اعصاب میں درد کی شکایت ہے یا
معمولی حرارت ہے یا اسی قسم کی اور کئی بیماریاں ہیں
اس قسم کا آدمی بیمار بھی ہوتا ہے اور کھانے میں اُس
کا شریک ہونا بھی طبائع پر گراں نہیں گذرتا۔

اَنْ تَاْكُلُوْا مِنْۢ بُيُوْتِكُمْ کے متعلق عام
طور پر یہ سوال کیا جاتا ہے کہ اپنے گھر سے تو ہر شخص
کھایا ہی کرتا ہے۔ پھر یہ کہنے کی کیا ضرورت تھی کہ
اگر تم اپنے گھروں سے کھا لیا کرو تو تم پر کوئی الزام
نہیں۔ کیا کوئی شخص ایسا بھی ہوتا ہے جو اپنے گھر سے
نہ کھاتا ہو اور اپنے گھر سے کھانا کھانے کے لئے بھی
اُسے کسی اجازت کی ضرورت ہو سو یاد رکھنا چاہیئے
کہ اس جگہ بُيُوْتِكُمْ سے اپنے بیٹوں اور بیویوں
کے گھر مراد ہیں۔ اور چونکہ بیٹا اپنے باپ سے الگ نہیں
ہوتا اور نہ بیوی اپنے خاوند سے جُدا ہوتی ہے اسلئے

اُن کے گھروں کو بُیُوْتِکُمْ کہا گیا۔ یعنی وہ ایسے ہی ہیں جیسے تمہارے اپنے گھر ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آگے جن بیوت کا ذکر کیا گیا ہے اُن میں اولاد اور بیویوں کے گھروں کا ذکر نہیں کیا گیا۔ کیونکہ انہیں بُیُوْتِکُمْ میں ہی شامل کر لیا گیا ہے۔

پھر فرماتا ہے لَیْسَ عَلَیْکُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَاْکُلُوْا جَمِیْعًا اَوْ اَشْتَاتًا۔ تم پر اس بارہ میں بھی خدا تعالیٰ کی طرف سے کوئی ناواجب قید نہیں کہ تم اکٹھے مل کر کھاؤ یا الگ الگ کھاؤ۔ تمہارا جی چاہے تو مل کر کھاؤ اور جی چاہے تو الگ الگ کھالو۔ الگ الگ کھانے کی اجازت بتاتی ہے کہ یہ خدا کی کتاب ہے جسکو ہندوستان کے اس رواج کا پتہ تھا کہ رشتہ دار بھی اکٹھے نہیں کھا سکتے بلکہ سب الگ الگ کھاتے ہیں۔ مگر اسکے علاوہ جَمِیْعًا اَوْ اَشْتَاتًا میں اس امر کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ تم اپنے اِن قریبی رشتہ داروں اور دوستوں کے ہاں اُن کی اجازت سے بھی کھانا کھا سکتے ہو۔ اور بن بلائے بھی اُن کے ہاں کھانا کھا سکتے ہو۔ اجازت کا استنباط تو جمیعًا کے لفظ سے ہوتا ہے۔ کیونکہ جب سب مل کر کھائینگے تو سمجھا جائیگا کہ گھر والوں نے سب کو کھانے میں شامل ہونے کی دعوت دی تھی۔ اور بن بلائے کھانا کھانے کا جواز اَشْتَاتًا سے نکلتا ہے۔ کیونکہ جب کوئی شخص اکیلا کھائیگا تو سمجھا جائیگا کہ وہ بن بلائے آکر کھا رہا ہے۔ غرض بتایا کہ اکٹھا کھانا کھانا بھی تمہارے لئے جائز ہے یعنی اجازت سے اور الگ الگ بھی۔ یعنی بغیر اجازت کے تاکہ تمہارے آپس کے تعلقات بڑھیں اور تم محبت اور پیار سے رہ سکو۔

پھر اس بارہ میں اللہ تعالیٰ ایک اور اہم ہدایت دیتا ہے اور فرماتا ہے۔ فَاِذَا دَخَلْتُمْ بُیُوْتًا فَسَلِّمُوْا عَلٰٓی اَنْفُسِکُمْ تَحِیَّةً مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُبٰرَکَةً طَیِّبَةً۔ یعنی جب تم گھروں میں داخل ہو۔ تو پہلے اپنے آپ کو سلام کر لیا کرو یعنی اپنے اُن رشتہ داروں اور دوستوں کو سلام کہو جو اُن مکانوں میں رہتے ہیں۔ اور یاد رکھو کہ یہ سلام تمہارے منہ کا سلام نہیں۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک بہت بڑا تحفہ ہے یعنی سلام کا لفظ بظاہر تو معمولی معلوم ہوتا ہے لیکن ہے بڑے عظیم الشان نتائج پیدا کرنے والا کیونکہ سلام کے لفظ کے پیچھے خدا تعالیٰ کی طرف سے سلامتی کا وعدہ ہے۔ پس جب تم کسی بھائی کو سلام کہتے ہو تو تم نہیں کہتے بلکہ خدا تعالیٰ کی دُعا اُسے پہنچاتے ہو۔ لیکن میں دیکھتا ہوں کہ ہمارے ملک میں لوگ عموماً اپنے گھروں میں داخل ہوتے وقت السلام علیکم نہیں کہتے گویا اُن کے نزدیک دوسروں کے لئے تو یہ دُعا ہے لیکن اپنے ماں باپ اور بیوی بچوں کیلئے نہیں۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے تمام مسلمانوں کو یہ حکم دیا ہے کہ وہ جب بھی اپنے گھروں میں جائیں السلام علیکم کہا کریں۔ بلکہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے تو یہاں تک فرمایا ہے کہ جب بھی ایک شخص دوسرے شخص سے ملے اُسے سلام کرے خواہ اس کو جانتا ہو یا نہ جانتا ہو۔ مگر افسوس ہے کہ اس زمانہ میں مسلمانوں کا ایک طبقہ سلام کو بالکل ترک کر بیٹھا ہے۔ ایسے لوگ سلام کہنے کی بجائے آداب وغیرہ الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ اور جو شخص اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ کہے اُس کے متعلق کہتے ہیں کہ اِس نے پتھر مار دیا حالانکہ وہ خود اسلام کے ایک حکم اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کا انکار کر کے اپنے اوپر پتھر گراتے ہیں اور جو مرہم ہے اُسے پتھر سمجھتے ہیں۔ السلام علیکم کے معنے یہ ہیں کہ تم پر خدا تعالیٰ کی سلامتی نازل ہو اور تمہارے زخم مندمل ہوں۔ مگر نادان کہتے ہیں کہ پتھر مار دیا اب بتاؤ کہ اس شخص سے زیادہ احمق اور کون ہو سکتا ہے جو مرہم کا نام پتھر رکھے۔ پس ایک طبقہ تو ایسا ہے جو

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَإِذَا كَانُوا

صرف وہی لوگ مومن کہلانے کے مستحق ہیں جو اللہ اور رسول پر ایمان لاتے ہیں اور جب کسی

مَعَهُ عَلَىٰ أَمْرٍ جَامِعٍ لَمْ يَذْهَبُوا حَتَّىٰ يَسْتَأْذِنُوهُ ط

قومی کام کے لئے اس (رسول) کے پاس بیٹھے ہوں تو اُٹھ کر نہیں جاتے جب تک اُس کی اجازت نہ لے لیں۔

إِنَّ الَّذِينَ يَسْتَأْذِنُونَكَ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ

وہ لوگ جو کہ اجازت لے کر جاتے ہیں وہی اللہ اور اس کے رسول پر ایمان

سلام کو بالکل ترک کر بیٹھا ہے۔ اور دوسرا ایسا ہے جو تارک تو نہیں لیکن اس کی حقیقت سے ناواقف ہے ایسے لوگ مجلس میں آئیں گے اور چُپ کر کے بیٹھ جائیں گے گھروں میں داخل ہونگے اور خاموشی کے ساتھ داخل ہو جائیں گے اور انہیں خیال بھی نہیں آئیگا کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا اس موقعہ کے لئے کوئی حکم ہے؟ اور اگر توجہ دلائی جائے تو بعض کہہ دیں گے کہ معمولی بات ہے اگر سلام نہ کہا تو کیا ہُوا بعض کہیں گے کہ حیا کی وجہ سے نہیں کہا۔ بعض کہیں گے کہ ہمیں عادت نہیں مگر یہ تینوں قسم کے لوگ نادان ہیں۔ حیا کے معنے ہیں رُکنا۔ اور رُکنا ایسی باتوں سے چاہیئے جو مضر ہوں۔ نہ کہ اُن سے جو فائدہ مند ہوں۔ پھر قرآن کریم میں اور کسی چیز کو اس رنگ میں تحفہ نہیں کہا گیا جیسے سلام کو تحفہ کہا گیا ہے حتّٰی کہ مرنے کے بعد بھی جو تحفہ خدا تعالیٰ کی طرف سے ملے گا وہ بھی یہی ہوگا کہ فرشتے آکر خدا تعالےٰ کی طرف سے سلام کہیں گے۔ اگر کوئی بڑے سے بڑا آدمی بھی یہ کہے کہ مجھے کیا ضرورت ہے کہ میں کسی کو سلام کہوں تو ہم کہیں گے کہ جب خدا تعالیٰ بھی اپنے مومن بندوں کو سلام پہنچائیگا تو اور کون ہے جو اپنے آپکو بڑا سمجھ کر اسکی ضرورت نہ سمجھے۔ سب سے پہلی چیز جو بندہ کو خدا تعالیٰ کی ملاقات کے وقت حاصل ہوگی وہ یہی سلام ہے۔ پھر احادیث میں لکھا ہے کہ جبریل علیہ السلام جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آتے تو آپ کو سلام کہتے۔ اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اُن کو دیکھ کر سلام کہتے۔ اب ان سے بڑا اور کون ہے جسے سلام کہنے کی ضرورت نہ ہو۔ لیکن بہت لوگ ہیں خصوصاً انگریزی تعلیمیافتہ جو سلام کو بہت حقیر چیز سمجھتے ہیں اور وہ اپنے عمل سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور جبریلؑ حتّٰی کہ خدا تعالےٰ سے بھی اپنے آپ کو بڑا قرار دیتے ہیں کیونکہ جس حکم کو بہت سی حکمتوں کے ماتحت خدا تعالےٰ نے فرض قرار دیا ہے بلکہ اپنی ذات کے لئے بھی دکھا کر اور جس کی تاکید رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے کی ہے۔ اس سے یہ لوگ اپنے آپکو مستغنی سمجھتے ہیں۔ اوّل تو صرف ہاتھ سے اشارہ کر دیتے ہیں۔ یا ایک دوسرے سے ملیں گے تو کہیں گے مولوی صاحب اور دوسرا اس کے جواب میں کہہ دیگا بھائی صاحب۔ یا کہہ دیں گے سُناؤ جی کیا حال ہے۔ لیکن شریعت کا یہ منشا نہیں۔ شریعت نے السلام علیکم کہنا ضروری قرار دیا ہے۔ اور رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے اس کو باہمی اتحاد کا ذریعہ قرار دیا ہے۔ صحابہؓ اسکے اسقدر پابند تھے کہ

وَرَسُوْلِهٖ ۚ فَاِذَا اسْتَاْذَنُوْكَ لِبَعْضِ شَاْنِهِمْ فَاْذَنْ

رکھتے ہیں ۔ پس جب وہ اپنے کسی اہم کام کے اجازت لیں تو اُن میں سے جن کے متعلق

لِّمَنْ شِئْتَ مِنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمُ اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ

تو چاہے انہیں اجازت دے دے اور اللہ (تعالیٰ) سے اُن کے لئے بخشش مانگ اور اللہ (تعالیٰ)

غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۶۳﴾

یقیناً بہت بخشنے والا (اور) بار بار رحم کرنیوالا ہے ۳۸ؔ

ایک دفعہ ایک صحابیؓ دوسرے صحابیؓ کے پاس آئے ۔ اور کہنے لگے ۔ آؤ بازار چلیں ۔ اُس صحابیؓ نے سمجھا کہ کوئی کام ہوگا لیکن وہ بازار میں سے گھوم کر یونہی چلے آئے ۔ نہ کوئی کام کیا اور نہ کوئی چیز خریدی ۔ دو تین دن کے بعد پھر آئے اور کہنے لگے ۔ آؤ بازار چلیں ۔ اُس صحابی نے کہا ۔ اُس دن تو آپ نے نہ کوئی چیز خریدی اور نہ کوئی اور کام کیا ۔ آج کوئی خاص کام ہے یا یونہی ساتھ لے چلے ہیں ۔ انہوں نے کہا ۔ مَیں بازار اس لئے جاتا ہوں کہ کئی دوست ملتے ہیں ۔ وہ ہم کو سلام کہتے ہیں اور ہم اُن کو سلام کہتے ہیں ۔ تو صحابہؓ بازاروں میں صرف سلام کہنے کے لئے بھی جاتے تھے ۔ تمہیں بھی چاہیئے کہ بازاروں میں محلّوں میں مجلسوں میں اور گھروں میں جہاں کسی کو ملو سلام کہو ۔ جاننے والوں کو بھی سلام کہو اور نہ جاننے والوں کو بھی سلام کہو ۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ سَلِّمْ عَلٰى مَنْ عَرَفْتَ وَمَنْ لَّمْ تَعْرِفْ یعنی سب کو سلام کہیں خواہ کوئی واقف ہو یا نہ ہو ۔

غرض سلام کہنا ایک بہت بڑی نیکی ہے ۔ اور رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے اخوتِ اسلامی کے قیام کے لئے اِسے ضروری قرار دیا ہے ۔ پس تم سلام کو چھوٹی اور معمولی بات سمجھ کر نہ چھوڑو بلکہ اس کی نگہداشت کرو ۔ کیونکہ شریعت نے اسے ایک اسلامی شعار قرار دیا ہے ۔ وہ لوگ جو بڑے درجوں پر ہیں انہیں چاہیئے کہ چھوٹوں کو سلام کیا کریں ۔ اور چھوٹوں کو چاہیئے کہ بڑوں کو سلام کیا کریں ۔ یہ نہ ہو کہ کوئی بھی سلام نہ کہے ۔ اور دونوں خاموشی سے گذر جائیں ۔ بلکہ میرے نزدیک بڑوں کو سلام کرنے میں سبقت اختیار کرنی چاہیئے ۔ تاکہ انہیں دیکھ کر دوسروں کو بھی توجہ پیدا ہو اور وہ بھی اس قومی شعار کو اختیار کریں ۔

۳۸ؔ تفسیر: ۔ اِس آیت میں قومی نظام کو درست رکھنے کے لئے یہ حکم دیا گیا ہے کہ جب مومن کسی قومی مشورہ کے لئے سردار قوم کے پاس جمع ہوں تو اسکی اجازت کے بغیر مجلس سے نہ جائیں ۔ اگر وہ ایسا کریں گے تو وہ مومن ہونگے ورنہ نہیں ۔ پھر سردارِ قوم کو بھی ہدایت دی کہ اگر مشاورت میں جمع ہونے والے لوگوں میں سے کوئی شخص اپنے کسی ضروری کام کے لئے اجازت مانگے تو اسے اجازت دے دیں لیکن قومی مشورہ کے وقت کسی ایسی ضرورت کا پیش آجانا جس کی وجہ سے مجلس شوریٰ کو چھوڑنا پڑے یہ بھی کسی شامتِ اعمال کا نتیجہ ہوتا ہے اس لئے اسے سردارِ جماعت تو ایسے موقع پر اجازت تو دے دیا کرے

مگر چونکہ وہ ضرورت جس کے لئے وہ اجازت مانگتے ہیں اُن
کی کسی شامتِ اعمال کا نتیجہ ہوگی یا قومی مجلس سے اُٹھ جانے
کی وجہ سے وہ لوگ سردارِ جماعت کی صحبت اور اس کے
مشورہ سے اور مل کر کام کرنے سے محروم رہیں گے اور
اس طرح اُن کے علم اور تجربہ میں کمی آجائے گی اس لئے
تُو اللہ تعالیٰ سے دعا بھی کر کہ یہ لوگ اس کے بداثرات
سے بچ جائیں ۔ اور اللہ تعالیٰ ان کی کوتاہی کا ازالہ فرما
دے ۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم اپنے صحابہؓ کو اِس
شدّت کے ساتھ اس ہدایت پر عمل کرنے کی تاکید فرمایا کرتے
تھے کہ انہیں طبعی ضروریات کے لئے بھی مجلس سے بلا اجازت
جانے کی اجازت نہیں ہوتی تھی ۔ ایسی حالت میں صحابہؓ بڑھ
کر سامنے آجاتے یا انگلی اُٹھا دیتے اور رسول کریم صلی اللہ
علیہ وسلم سمجھ جاتے کہ کوئی حاجت ہے اور ہاتھ کے اشارہ
سے اجازت دے دیتے مگر اس زمانہ میں عام طور پر اس کی
اہمیت کو نہیں سمجھا جاتا ۔

مجھے یاد ہے حضرت خلیفہ اوّل رضی اللہ عنہ ایک دفعہ
لاہور تشریف لے گئے ۔ جب آپ نے واپس قادیان آنے کا
ارادہ فرمایا تو چونکہ حضرت ام المومنین رضی اللہ عنہا نے
ابھی وہاں کچھ دن اور ٹھہرنا تھا اس لئے آپ نے مجھے
لاہور میں ہی ٹھہرنے کی ہدایت فرمائی اور ارشاد فرمایا
کہ تم اُن کے ساتھ آجانا ۔ جب مَیں آیا اور آپکے پاس آ
کر مَیں نے السلام علیکم کہا تو میرے سلام کا جواب
دینے سے بھی پہلے آپ نے فرمایا ۔ میاں تمہیں معلوم ہے
کہ ہمارے ساتھ کیا ہوا ۔ مَیں نے کہا مجھے تو معلوم
نہیں ۔ آپ نے فرمایا ہمارے ساتھ جتنے آدمی تھے
وہ سارے ہمیں بٹالہ چھوڑ کر آ گئے ۔ اس سے ظاہر ہے
کہ ان لوگوں نے امرِ جامع کے متعلق جو قرآنی حکم تھا
اس پر عمل نہ کیا ۔ خلیفۂ وقت کا وجود تو ایسی اہمیت
رکھتا ہے کہ اس کا اثر سارے عالمِ اسلام پر پڑتا ہے
اگر خدانخواستہ کوئی حادثہ ہو جائے تو اس کا اثر لازماً
سب جماعت پر پڑیگا ۔ اس لئے اِس بارہ میں بڑی
احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے ۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم
کے صحابہؓ تو اس سختی کے ساتھ اس پر عمل کرتے تھے کہ
رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا تھوڑی دیر کے لئے بھی
اِدھر اُدھر ہونا اُن کے لئے ناقابلِ برداشت ہو جاتا
تھا ۔ ایک دفعہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم بات کرتے
کرتے مجلس سے اُٹھے اور تھوڑی دیر تک واپس نہ آئے
تو سب صحابہؓ آپ کی تلاش میں بھاگ پڑے ۔ رسول کریم
صلے اللہ علیہ وسلم ایک باغ میں تشریف لے گئے تھے وہ
سب کے سب آپ کے پیچھے اُٹھ کر چلے گئے اور انہیں
اُسوقت ایسی گھبراہٹ اور بے چینی ہوئی کہ حضرت
ابوہریرہؓ کہتے ہیں گھبراہٹ میں مجھے باغ کے اندر جانے
کا راستہ بھی نظر نہ آیا اور مَیں گندے پانی کی نالی میں
سے گذر کر اندر داخل ہُوا حالانکہ عموماً انہیں کمزور دل
سمجھا جاتا تھا ۔ حقیقت یہ ہے کہ دینی کام دو قسم کے
ہوتے ہیں ۔ ایک وہ جو افراد سے تعلق رکھتے ہیں جیسے
نماز ۔ روزہ ۔ زکوٰۃ اور حج وغیرہ اور دوسرے ایسے
احکام جو تمام لوگوں سے تعلق رکھتے ہیں جیسے جہاد یا
مشورہ کیلئے قوم کا جمع ہونا یا کوئی ایسا حکم جو ساری
جماعت کی ضروریات کو مدّنظر رکھ کر دیا گیا ہو جو کام
ساری جماعت سے تعلق رکھتے ہوں افراد سے نہیں
اُن میں سب کو ایسا پرویا ہُوا ہونا چاہیئے جیسے تسبیح
کے دانے ایک تاگے میں پروئے ہوئے ہوتے ہیں ۔
کسی کو ذرا بھی اِدھر اُدھر نہیں ہونا چاہیئے ۔ اور
اگر کوئی ضروری کام کے لئے جانا چاہے تو امام کی اجازت
سے جائے ۔ اسی حقیقت کو تصویری زبان میں ظاہر
کرنے کے لئے لوگ جب تسبیح کے دانے پروتے ہیں تو
تاگے کے دونوں سرے اکٹھے کر کے ایک لمبا دانہ پرو دیتے ہیں

لَا تَجْعَلُوا دُعَاءَ الرَّسُوْلِ بَيْنَكُمْ كَدُعَاءِ بَعْضِكُمْ

(اے مومنو) یہ نہ سمجھو کہ رسول کا تم میں سے کسی کو بلانا ایسا ہی ہے جیسا کہ تم میں سے بعض کا

بَعْضًا ؕ قَدْ يَعْلَمُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ يَتَسَلَّلُوْنَ مِنْكُمْ

بعض کو بلانا۔ اللہ (تعالیٰ) اُن لوگوں کو جانتا ہے جو کہ تم میں سے پہلو بچا کر (مشورہ کی مجلس سے)

لِوَاذًا ۚ فَلْيَحْذَرِ الَّذِيْنَ يُخَالِفُوْنَ عَنْ اَمْرِهٖۤ اَنْ

بھاگ جاتے ہیں۔ پس چاہیئے کہ جو اس (رسول) کے حکم کی مخالفت کرتے ہیں اس سے ڈریں کہ

تُصِيْبَهُمْ فِتْنَةٌ اَوْ يُصِيْبَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۶۴﴾

ان کو خدا (تعالیٰ) کی طرف سے کوئی آفت نہ پہنچ جائے یا اُن کو دردناک عذاب نہ پہنچ جائے ۳۹ؔ

اور اُسے امام کہتے ہیں۔ درحقیقت اس سے قومی تنظیم کی اہمیت کی طرف ہی اشارہ ہوتا ہے اور یہ بتانا مقصود ہوتا ہے کہ جس طرح تسبیح کے دانوں کے لئے ایک امام کی ضرورت ہے اسی طرح تمہیں بھی ہمیشہ ایک امام کے پیچھے چلنا چاہیئے ورنہ تمہاری تسبیح وہ نتیجہ پیدا نہیں کرسکیگی جو اجتماعی تسبیح پیدا کیا کرتی ہے لیکن بہت کم ہیں جو اس گُر کو سمجھتے ہیں حالانکہ قرآن کریم کہتا ہے کہ وہ شخص مومن ہی نہیں ہو سکتا جو ایسے امور میں جو ساری جماعت سے تعلق رکھتے ہوں اپنی رائے اور منشاء کے ماتحت کام کرے اور امام کی کوئی پروا نہ کرے مومن کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ اگر کوئی دینی کام ہو تو اجازت لے لے اور اگر کوئی اہم دنیوی کام ہو جس کا اثر ساری جماعت پر پڑتا ہو تو امام سے مشورہ لے لے بہرحال امر جامع سے علیحدہ ہونے کے لئے استیذان ضروری ہوتا ہے۔ مگر چونکہ انسان کا امر جامع سے علیحدہ ہونا اس کی شامتِ اعمال کی وجہ سے ہوگا اسلئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اُسے اجازت تو دیدو مگر ساتھ ہی دُعا کیا کرو کہ خدا تعالیٰ اُسے معاف کرے اور اُس کی کمزوریوں کو دُور کرے۔

يَتَسَلَّلُوْنَ

لِوَاذًا

۳۹ؔ حل لغات:- يَتَسَلَّلُوْنَ تَسَلَّلَ مِنَ الزِّحَامِ کے معنے ہیں اِنْطَلَقَ فِيْ اسْتِخْفَاءٍ۔ اجتماع سے خاموشی سے پوشیدہ ہو کر نکل گیا (اقرب) يَتَسَلَّلُوْنَ تَسَلَّلَ سے مضارع جمع مذکر غائب کا صیغہ ہے پس اس کے معنے ہوں گے وہ پوشیدہ طور پر مجلس سے چلے جاتے ہیں۔

لِوَاذًا : لِوَاذٌ لَاذَ کا مصدر ہے اور لَاذَ لِوَاذًا کے معنے ہوتے ہیں اِسْتَتَرَ بِهٖ۔ وہ اس کے ذریعہ سے چھپا (اقرب)

تفسیر:- فرماتا ہے۔ امام کی آواز کے مقابلہ میں افراد کی آواز کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔ تمہارا فرض ہے کہ جب بھی تمہارے کانوں میں خدا تعالیٰ کے رسول کی آواز آئے۔ تم فوراً اُس پر لبیک کہو اور اس کی تعمیل کے لئے دوڑ پڑو کہ اسی میں تمہاری ترقی کا راز مضمر ہے۔ بلکہ اگر انسان اُسوقت نماز پڑھ رہا ہو تب بھی

اُس کا فرض ہوتا ہے کہ وہ نماز توڑ کر خدا تعالیٰ کے رسول کی آواز کا جواب دے۔ ہمارے ہاں خدا تعالیٰ کے فضل سے اس قسم کی مثالیں بھی پائی جاتی ہیں۔ چنانچہ حضرت خلیفۂ اوّل رضی اللہ عنہ نے ایک دفعہ ایسا ہی کیا۔ اور حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے آواز دینے پر فوراً نماز توڑ دی اور آپ کی خدمت میں حاضر ہوگئے اور غالباً میر مہدی حسین صاحبؓ اور میاں عبد اللہ صاحب سنوریؓ نے بھی ایسا ہی کیا تھا۔ بعض لوگوں نے اس پر اعتراض کیا تو حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے یہی آیت پڑھ کر انہیں جواب دیا تھا۔ بہرحال نبی کی آواز پر فوراً لبیک کہنا ایک ضروری امر ہے بلکہ ایمان کی علامتوں میں سے ایک بڑی بھاری علامت ہے۔ چونکہ پچھلی آیات سے خلافتِ اسلامیہ کے متعلق مضمون بیان کیا جا رہا ہے اور تمام احکام نظام اسلام کی مضبوطی کے متعلق دئے گئے ہیں اس لئے اس آیت میں بھی اسی مضمون کو جاری رکھا گیا ہے اور اللہ تعالیٰ مومنوں کو نصیحت کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ اے مومنو! اگر کبھی خدا تعالیٰ کا رسول تمہیں بلائے تو اس کے بلانے کو دوسروں کے بُلانے جیسا مت سمجھو۔ بلکہ فوراً اُس کی آواز پر لبیک کہا کرو۔ گویا بتایا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دو الگ الگ حیثیتیں ہیں۔ ایک افسرِ دنیوی ہونے کی اور ایک نبی ہونے کی۔ دنیوی رئیس ہونے کے لحاظ سے بھی اُس کے احکام کو ماننا ضروری ہے مگر رئیس دینی ہونے کے لحاظ سے تو اُسکی آواز پر لبیک کہنا اَور بھی مقدم ہے۔ یہی حکم اپنے درجہ کے مطابق خلیفۂ رسول اللہؐ پر بھی چسپاں ہوتا ہے اور اُسکی آواز پر جمع ہو جانا بھی ضروری ہوتا ہے اور اُس کی مجلس سے بھی چپکے سے نکل جانا بڑا بھاری گناہ ہوتا ہے۔ دیکھو تاریخ سے پتہ لگتا ہے کہ جنگِ حنین کے موقعہ پر جب مکّہ کے کافر لشکرِ اسلام میں یہ کہتے ہوئے شامل ہوگئے کہ آج ہم اپنی بہادری کے جوہر دکھائیں گے اور پھر بنو ثقیف کے حملہ کی تاب نہ لا کر میدانِ جنگ سے بھاگے تو ایک وقت ایسا آیا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارد گرد صرف بارہ صحابیؓ رہ گئے۔ اسلامی لشکر جو دس ہزار کی تعداد میں تھا اس میں بھاگڑ مچ گئی اور کفار کا لشکر جو تین ہزار تیر اندازوں پر مشتمل تھا آپ کے دائیں بائیں پہاڑیوں پر چڑھا ہوا آپ پر تیر برسا رہا تھا۔ مگر اُس وقت بھی آپ پیچھے نہیں ہٹنا چاہتے تھے بلکہ آگے جانا چاہتے تھے۔ حضرت ابوبکرؓ نے گھبرا کر آپ کی سواری کی لگام پکڑ لی اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ! میری جان آپ پر قربان ہو۔ یہ آگے بڑھنے کا وقت نہیں۔ ابھی لشکرِ اسلام جمع ہو جائیگا تو پھر ہم آگے بڑھیں گے۔ مگر آپ نے بڑے جوش سے فرمایا کہ میری سواری کی باگ چھوڑ دو اور پھر ایڑی لگاتے ہوئے آگے بڑھے اور یہ کہتے جاتے تھے کہ ؎

اَنَا النَّبِيُّ لَا كَذِبْ   اَنَا ابْنُ عَبْدِ الْمُطَّلِبْ

یعنی میں موعود نبی ہوں جس کی حفاظت کا دائمی وعدہ ہے جھوٹا نہیں ہوں۔ اِس لئے تم تین ہزار تیر انداز ہو یا تیس ہزار مجھے تمہاری کوئی پرواہ نہیں۔ اور اے مشرکو! میری اِس دلیری کو دیکھ کر کہیں مجھے خدا نہ سمجھ لینا۔ مَیں ایک انسان ہوں اور تمہارے سردار عبد المطلب کا بیٹا (یعنی پوتا) ہوں۔ آپ کے چچا حضرت عباسؓ کی آواز بہت اونچی تھی۔ آپنے اُن کی طرف دیکھا۔ اور فرمایا۔ عباسؓ! آگے آؤ اور آواز دو اور بلند آواز سے پکارو کہ اے سورۂ بقرہ کے صحابیو! (یعنی جنہوں نے سورۂ بقرہ یاد کی ہوئی ہے) اے حدیبیہ کے دن درخت کے نیچے بیعت کرنے والو! خدا کا رسول تم کو بلاتا ہے۔ ایک صحابیؓ کہتے ہیں کہ مکّہ کے تازہ نومسلموں کی بزدلی کی وجہ سے جب اسلامی لشکر کا اگلا حصّہ پیچھے کی طرف بھاگا تو ہماری سواریاں بھی دوڑ پڑیں اور جتنا ہم روکتے تھے اتنا ہی وہ پیچھے کی طرف بھاگتی تھیں۔ یہاں تک کہ عباسؓ کی آواز میدان میں

گونجنے لگی کہ "اے سورۂ بقرہ کے صحابیو! اے حدیبیہ کے دن درخت کے نیچے بیعت کرنے والو! خدا کا رسول تمہیں بلاتا ہے۔" یہ آواز جب میرے کان میں پڑی۔ تو مجھے یوں معلوم ہوا کہ مَیں زندہ نہیں بلکہ مُردہ ہوں - اور اسرافیل کا صور فضا میں گونج رہا - مَیں نے اپنے اونٹ کی لگام زور سے کھینچی اور اُس کا سر پیٹھ سے لگ گیا - لیکن وہ اتنا بھڑکا ہُوا تھا کہ جونہی مَیں نے لگام ڈھیلی کی وہ پھر پیچھے کی طرف دوڑا - اِس پر مَیں نے اور میرے بہت سے ساتھیوں نے تلواریں نکال لیں اور کئی تو اونٹوں پر سے کود گئے اور کئی نے اونٹوں کی گردنیں کاٹ دیں اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف دوڑنا شروع کر دیا - اور چند لمحوں میں ہی وہ دس ہزار صحابہؓ کا لشکر جو بے اختیار مکہ کی طرف بھاگا جا رہا تھا آپ کے گرد جمع ہو گیا اور تھوڑی دیر میں پہاڑیوں پر چڑھ کر اُس نے دشمن کا تہس نہس کر دیا - اور یہ خطرناک شکست ایک عظیم الشان فتح کی صورت میں بدل گئی -

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ اِس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے فرماتا ہے - لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ فِيْ مَوَاطِنَ كَثِيْرَةٍ وَّيَوْمَ حُنَيْنٍ اِذْ اَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ شَيْئًا وَّ ضَاقَتْ عَلَيْكُمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ ثُمَّ وَلَّيْتُمْ مُّدْبِرِيْنَ ○ ثُمَّ اَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَ اَنْزَلَ جُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا وَعَذَّبَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ؕ وَ ذٰلِكَ جَزَآءُ الْكٰفِرِيْنَ (توبہ ع ۴) یعنی اللہ تعالیٰ نے بہت سے مواقع پر تمہاری مدد کی ہے بخصوصاً حنین کی جنگ کے دن جبکہ تمہاری کثرت نے تم کو متکبر بنا دیا تھا۔ پھر وہ کثرت تمہارے کسی کام نہ آئی - اور زمین باوجود فراخی کے تم پر تنگ ہو گئی اور تم نے پیٹھ دکھاتے ہوئے منہ پھیر لیا - پھر اللہ تعالےٰ نے اپنی سکینت اپنے رسول اور مومنوں پر اُتاری اور ایسے لشکر آسمان سے نازل کئے جن کو تم نہیں دیکھ رہے تھے اور کفار کو عذاب دیا اور یہی کفار کی جزاء ہے - پھر اللہ تعالیٰ اِس کی اہمیت پر اَور زیادہ زور دیتا اور فرماتا ہے کہ فَلْيَحْذَرِ الَّذِيْنَ يُخَالِفُوْنَ عَنْ اَمْرِهٖۤ اَنْ تُصِيْبَهُمْ فِتْنَةٌ اَوْ يُصِيْبَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ - یعنی جو لوگ اِس رسول کے حکم کی مخالفت کرتے ہیں انہیں اِس بات سے ڈرنا چاہیئے کہ کہیں اُن کو خدا تعالیٰ کی طرف سے کوئی آفت نہ پہنچ جائے یا وہ کسی دردناک عذاب میں مبتلا نہ ہو جائیں - چنانچہ دیکھ لو جنگِ اُحد میں اِس حکم کی خلاف ورزی کی وجہ سے اسلامی لشکر کو کتنا نقصان پہنچا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک پہاڑی درّہ کی حفاظت کیلئے پچاس سپاہی مقرر فرمائے تھے اور یہ درّہ اتنا اہم تھا کہ آپ نے اُن کے افسر عبداللہ بن جبیرؓ انصاری کو بلا کر فرمایا کہ خواہ ہم مارے جائیں یا جیت جائیں تم نے اِس درّہ کو نہیں چھوڑنا - مگر جب کفار کو شکست ہوئی اور مسلمانوں نے اُنکا تعاقب شروع کر دیا تو اُس درّہ پر جو سپاہی مقرر تھے - اُنہوں نے اپنے افسر سے کہا کہ اَب تو فتح ہو چکی ہے - اَب ہمارا یہاں ٹھہرنا بے کار ہے ہمیں اجازت دیں کہ ہم بھی جہاد میں شامل ہونے کا ثواب لے لیں - اُن کے افسر نے انہیں سمجھایا کہ دیکھو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے حکم کی خلاف ورزی نہ کرو - رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ خواہ فتح ہو یا شکست تم نے اِس درّہ کو نہیں چھوڑنا اِس لئے مَیں تمہیں جانے کی اجازت نہیں دے سکتا - انہوں نے کہا - رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا یہ مطلب تو نہیں تھا کہ خواہ فتح ہو جائے پھر بھی تم نے نہیں ہلنا - آپ کا مقصد تو صرف تاکید کرنا تھا - اب جبکہ فتح ہو چکی ہے ہمارا یہاں کیا کام ہے - چنانچہ انہوں نے خدا کے رسول کے حکم پر اپنی رائے کو فوقیت دیتے ہوئے اُس

اَلَآ اِنَّ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ قَدْ يَعْلَمُ

سُنو! جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اللہ کا ہی ہے - جس (مقام) پر تم

درّہ کو چھوڑ دیا - صرف ان کا افسر اور چند سپاہی باقی رہ گئے جب کفار کا لشکر مکّہ کی طرف بھاگتا چلا جا رہا تھا تو اچانک خالدؓ بن ولیدؓ نے پیچھے کی طرف مڑ کر دیکھا تو درّہ کو خالی پایا - انہوں نے عمروؓ بن العاصؓ کو آواز دی یہ دونوں ابھی تک اسلام میں داخل نہیں ہوئے تھے اور کہا دیکھو کیسا اچھا موقعہ ہے آؤ ہم مڑ کر مسلمانوں پر حملہ کر دیں - چنانچہ دونوں جرنیلوں نے اپنے بھاگتے ہوئے دستوں کو سنبھالا اور اسلامی لشکر کا بازو کاٹتے ہوئے پہاڑ پر چڑھ گئے - چند مسلمان جو وہاں موجود تھے اور جو دشمن کا مقابلہ کرنے کی طاقت نہیں رکھتے تھے انکو انہوں نے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور اسلامی لشکر پر پشت پر سے حملہ کر دیا - کفار کا یہ حملہ ایسا اچانک تھا کہ مسلمان جو فتح کی خوشی میں اِدھر اُدھر پھیل چکے تھے اُن کے قدم جم نہ سکے - صرف چند صحابہؓ دوڑ کر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے گرد جمع ہو گئے جن کی تعداد زیادہ سے زیادہ بیس تھی - مگر یہ چند لوگ کب تک دشمن کا مقابلہ کر سکتے تھے - آخر کفار کے ایک ریلے کی وجہ سے مسلمان سپاہی بھی پیچھے کی طرف دھکیلے گئے اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم میدان جنگ میں تن تنہا رہ گئے - اسی حالت میں آپ کے خود پر ایک پتھر لگا جس کی وجہ سے خود کے کیل آپ کے سر میں چبھ گئے اور آپ بے ہوش ہو کر ایک گڑھے میں گر گئے جو بعض شریروں نے اسلامی لشکر کو نقصان پہنچانے کے لئے کھود کر ڈھانپ رکھے تھے - اس کے بعد کچھ اور صحابہؓ شہید ہوئے اور اُن کی لاشیں آپ کے جسم مبارک پر جا گریں اور لوگوں میں یہ مشہور ہو گیا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم شہید ہو گئے ہیں - مگر وہ صحابہؓ جو کفار کے ریلے کی وجہ سے پیچھے دھکیل دیئے گئے تھے کفار کے پیچھے ہٹتے ہی پھر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے گرد جمع ہو گئے اور انہوں نے آپ کو گڑھے میں سے باہر نکالا - تھوڑی دیر کے بعد رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو ہوش آ گیا - اور آپ نے چاروں طرف میدان میں آدمی دوڑا دیئے کہ مسلمان پھر اکٹھے ہو جائیں اور آپ انہیں ساتھ لیکر پہاڑ کے دامن میں چلے گئے -

اسلامی لشکر کو کفار پر فتح حاصل کرنے کے بعد ایک عارضی شکست کا چرکہ اس لئے لگا کہ اُن میں سے چند آدمیوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک حکم کی خلاف ورزی کی اور آپ کی ہدایت پر عمل کرنے کی بجائے اپنے اجتہاد سے کام لینا شروع کر دیا - اگر وہ لوگ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے اسی طرح چلتے جس طرح نبض حرکتِ قلب کے پیچھے چلتی ہے - اگر وہ سمجھتے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک حکم کے نتیجہ میں اگر ساری دنیا کو بھی اپنی جانیں قربان کرنی پڑتی ہیں تو وہ ایک بے حقیقت شے ہیں - اگر وہ ذاتی اجتہاد سے کام لے کر اس پہاڑی درّہ کو نہ چھوڑتے جس پر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے انہیں اس ہدایت کے ساتھ کھڑا کیا تھا کہ خواہ ہم فتح حاصل کریں یا مارے جائیں تم نے اس مقام سے نہیں ہلنا تو نہ دشمن کو دوبارہ حملہ کرنے کا موقع ملتا - اور نہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ کو کوئی نقصان پہنچتا - اللہ تعالیٰ اس آیت میں مسلمانوں کو اس امر کی طرف توجہ دلاتا ہے کہ وہ لوگ جو محمد رسول اللہ

مَآ اَنْتُمْ عَلَيْهِ ؕ وَيَوْمَ يُرْجَعُوْنَ اِلَيْهِ فَيُنَبِّئُهُمْ

(کھڑے) ہو اسکو بھی اللہ ہی جانتا ہے اور جس دن وہ لوگ اللہ کی طرف لوٹائے جائینگے تو وہ اُن کو انکے اعمال کا

بِمَا عَمِلُوْا ؕ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۶۵﴾ ع ۹ ۱۵

حال بتائیگا اور اللہ (تعالیٰ) ہر ایک چیز کو خوب جانتا ہے ۔ ۴۰

صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کی پوری اطاعت نہیں بجالاتے اور ذاتی اجتہادات کو آپ کے احکام پر مقدم سمجھتے ہیں۔ انہیں ڈرنا چاہیئے کہ اس کے نتیجہ میں کہیں اُن پر کوئی آفت نہ آجائے یا وہ کسی شدید عذاب میں مبتلا نہ ہوجائیں۔ گویا بتایا کہ اگر تم کامیابی حاصل کرنا چاہتے ہو تو تمہارا کام یہ ہے کہ تم ایک ہاتھ کے اٹھنے پر اٹھو اور ایک ہاتھ کے گرنے پر بیٹھ جاؤ۔ جب تک یہ روح زندہ رہے گی مسلمان بھی زندہ رہیں گے اور جس دن یہ روح مٹ جائیگی اُس دن اسلام تو پھر بھی زندہ رہے گا مگر خدا تعالیٰ کا ہاتھ اُن لوگوں کا گلا گھونٹ کر رکھ دے گا جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت سے انحراف کرنے والے ہونگے۔

۴۰ **تفسیر**:۔ فرماتا ہے۔ یہ مت خیال کرو۔ کہ تمہاری ترقیات خدا تعالیٰ کے احکام کو توڑ کر بھی ہو سکتی ہیں۔ مان لیا کہ عقلی طور پر دنیا میں ترقی کرنے کے اور بھی ذرائع ہیں۔ لیکن آسمان اور زمین میں جو کچھ ہے وہ خدا ہی کا ہے اگر تم اس کے ہو جاؤ گے تو وہ زمین و آسمان تمہارے حوالے کردیگا۔ لیکن اگر تم خدائی احکام کی اتباع نہیں کروگے تو تم خدا کا مقابلہ کرکے کبھی ترقی حاصل نہیں کرسکتے۔ اور یہ مت سمجھو کہ وہ بغیر کسی حکمت کے احکام دے دیتا ہے۔ وہ تمہارے حالات کو خوب جانتا ہے اور تمہاری ضروریات کو مدِّنظر رکھ کر ہی احکام نازل کرتا ہے۔ پس ان پر عمل کرنے سے تمہیں یقیناً ترقی اور کامیابی حاصل ہو سکتی ہے۔ اور اگر تمہیں یہ خیال ہو کہ اگر ہم نے خدائی احکام کو مانا تو ہمیں فلاں فلاں تکلیف پہنچے گی۔ ہمارے رشتہ دار ہمارے مخالف ہو جائیں گے۔ ہماری ملازمتیں جاتی رہیں گی۔ ہماری تجارتوں کو نقصان ہوگا۔ ہماری عزّت اور شہرت خطرہ میں پڑ جائیگی تو جب کہ خدا تعالیٰ نے جزاء و سزا کا ایک دن مقرر کیا ہوا ہے۔ تو تمہیں گھبراہٹ کس بات کی ہے۔ اللہ تعالیٰ تمہیں اعلیٰ درجہ کے انعامات سے نوازیگا اور تمہیں اپنے قرب سے حصّہ دیگا۔ ہاں اگر نافرمانی کروگے تو یاد رکھو کہ تم اُس کی سزا سے نہیں بچ سکو گے۔

سُوْرَةُ الْفُرْقَانِ مَكِّيَّةٌ

سورۃ فرقان - یہ سورۃ مکی ہے -

وَهِيَ مَعَ الْبَسْمَلَةِ ثَمَانٍ وَّسَبْعُوْنَ اٰيَةً وَّسِتَّةُ رُكُوْعَاتٍ

اور بسم اللہ سمیت اس کی اٹھتر (۷۸) آیات ہیں اور چھ رکوع ہیں[1]

[1] **زمانۂ نزول** یہ سورۃ اکثر مفسرین کے قول کے مطابق مکی ہے اور ہجرت سے پہلے نازل ہوئی ہے۔

تفسیر قرطبی میں لکھا ہے کہ حضرت ابن عباسؓ اور قتادہؓ کے نزدیک اس میں سے تین آیتیں مدنی ہیں اور وہ آیتیں والذین لایدعون مع اللّٰہِ اِلٰھًا اٰخَرَ سے لیکر وَکَانَ اللّٰہُ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا تک ہیں۔ یعنی آیات نمبر ۶۸ - ۶۹ - ۷۰ اور ہمارے نزدیک آیات نمبر ۶۹ - ۷۰ - ۷۱۔

جن لوگوں نے ان آیات کو مدنی قرار دیا ہے اُن کے اس قول کا موجب صرف اتنی بات معلوم ہوتی ہے کہ ان آیات میں قتل نفس اور بدکاری سے روکا گیا ہے اور ان لوگوں کا خیال ہے کہ چونکہ تمدن اور معاشرت اور سیاست کے متعلق تفصیلی ہدایات مدینہ منورہ میں ملی ہیں اس لئے یہ آیتیں مدنی ہیں مگر یہ کوئی دلیل نہیں۔ یہ تعلیم صحابہؓ کے اس وقت بھی زیر عمل تھی جب وہ مکہ میں رہتے تھے۔ صحابہؓ کا چال چلن اور اُن کا طریق صاف بتاتا ہے کہ یہ ہدایتیں اس وقت بھی اُنکے مدنظر رہتی تھیں پس محض اس لئے کہ ان آیتوں میں قتل اور بدکاری سے روکا گیا ہے انکو مدنی قرار دینا ہرگز معقول نہیں سمجھا جاسکتا۔

عیسائی مستشرقین نے بھی اس سورۃ کو مکی قرار دیا ہے لیکن اُن کے نزدیک یہ سورۃ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے دعویٰ کے بالکل ابتدائی وقت کی ہے۔ (ڈکشنری آف دی قرآن مصنفہ ریورنڈ وہیری جلد ۳ صفحہ ۲۰۷) مگر یہ بات بھی صحیح نہیں کیونکہ اُن کی بنیاد صرف اس خیال پر ہے کہ اس سورۃ میں کفار کی شدید مخالفت کا ذکر نہیں حالانکہ بعض مدنی سورتیں بھی ایسی ہیں جن میں کفار کا ذکر قریباً مفقود ہے تو کیا ہم اس سے یہ نتیجہ نکالیں کہ مدینہ میں کفار کے ساتھ کوئی جنگ ہوئی ہی نہیں؟ مضمون کے لحاظ سے بھی یہ سورۃ مکی ہی معلوم ہوتی ہے کیونکہ اس میں خاص طور پر یہ امر بیان کیا گیا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کفار کے مذہب کو قبول نہیں کرینگے جس کا مطلب یہ ہے کہ کفار سے جھگڑا شروع ہو چکا تھا (دیکھو آیت ۵۳) پس ہم کہہ سکتے ہیں کہ پہلے دو تین سال کی نازل شدہ سورتوں میں سے یہ سورۃ ہے۔

بخاریؒ اور مسلمؒ کی روایت ہے اور مالکؒ اور شافعیؒ اور ابن حبانؒ اور بیہقیؒ نے بھی حضرت عمر ابن خطابؓ سے روایت کی ہے کہ میں نے ایک دفعہ ہشام بن حکیم سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں سورۃ فرقان سُنی۔ مگر وہ اس سورۃ کو اس طرح نہیں پڑھتے تھے جس طرح میں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ سورۃ سُنی تھی۔ قریب تھا کہ میں نماز میں ہی اُن پر حملہ کر دیتا مگر میں نے صبر کیا۔ جب انہوں نے سلام پھیر دیا تو میں نے اُن کی چادر پکڑ لی اور میں نے کہا۔ آپ کو اس سورۃ کا پڑھنا کس نے سکھایا ہے۔ انہوں نے کہا رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے۔ میں نے جواب میں کہا کہ تم جھوٹ بولتے ہو۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے اس طرز پر نہیں پڑھایا جس طرز پر تم پڑھ رہے ہو۔ پھر میں اُنکو گھسیٹتا ہوا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لے گیا اور میں نے کہا۔ یا رسول اللہ! یہ اس طرح قرآن پڑھ رہے ہیں جس طرح آپ نے مجھے نہیں پڑھایا۔ اس پر رسول کریم

صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ہشامؓ ذرا پڑھ کر تو سناؤ۔ چنانچہ ہشامؓ نے اس طرح جس طرح مَیں نے اُن کو پڑھتے ہوئے سُنا تھا وہ سورۃ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو پڑھ کر سُنائی۔ اس پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ یہ سورۃ اسی طرح نازل ہوئی ہے۔ پھر آپؐ نے فرمایا۔ عمرؓ تم پڑھو تو مَیں نے یہ سورۃ اُس طرح پڑھی جس طرح مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پڑھنی سکھائی تھی۔ آپ نے فرمایا۔ یہ سورۃ اسی طرح نازل ہوئی ہے۔ پھر آپ نے فرمایا کہ قرآن سات طریق پر نازل ہُوا ہے جس طرح کسی کی زبان پر چڑھے وہ اُسی طرح پڑھ لیا کرے (تفسیر فتح البیان جلد ۹ صفحہ ۲۵۴) اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ قرأتیں جن پر مستشرقین اور پادریوں نے اپنے اعتراضات کی بڑی بھاری بنیاد رکھی ہے۔ وہ درحقیقت صرف عرب کی مختلف اقوام کے لہجوں کا فرق تھا۔ اور اس قسم کے فرق عربی زبان میں بہت زیادہ پائے جاتے ہیں۔ کیونکہ عرب قوم مختلف آزاد زبانوں کے اندر گھری ہوئی تھی۔ عرب کا ایک پہلو حبشہ کے ساتھ ملتا تھا۔ دوسرا پہلو ایران کے ساتھ ملتا تھا۔ تیسرا پہلو یہودیوں اور آرامیوں کے ساتھ ملتا تھا اور چوتھا پہلو ہندوستان کے ساتھ ملتا تھا۔ ایسے مختلف زبانوں میں گھرے ہوئے لوگوں کی زبان لازماً ان زبانوں سے متأثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی تھی۔ چنانچہ نتیجہ یہ ہُوا کہ بعض عرب بعض حروف کو ادا کرسکتے تھے اور بعض دوسرے ان حروف کو ادا نہیں کرسکتے تھے۔ مثلاً بعض "ر" ادا کر سکتے تھے اور بعض "ر" کی جگہ "ل" ادا کرتے تھے۔ اور بعض دفعہ کسی لفظ کے ادا کرنے میں مشکل محسوس کرکے اس کے ہم معنی کوئی دوسرا لفظ استعمال کرلیتے تھے۔ اگر ایک ادیب اپنی کتاب میں ان دونوں لفظوں کا پڑھنا جائز رکھے تو دونوں قوموں کے لئے اس کتاب کا پڑھنا آسان ہوجائیگا مگر دوسری صورت میں ایک حصّہ قوم کو اس کا پڑھنا آسان ہوگا اور دوسرے حصّہ قوم کو اس کا پڑھنا مشکل ہوگا اور اگر وہ اُسے پڑھے گی بھی تو اپنے اختیار سے پڑھے گی مصنّف کی اجازت سے نہیں پڑھے گی۔ قرآن کریم نے اس مشکل کو یوں حل کیا کہ جتنے اختلافات تھے ان کو مدّنظر رکھتے ہوئے قائم مقام حروف یا قائم مقام الفاظ تجویز کردیئے جس کی وجہ سے تمام اقوام عرب آسانی کے ساتھ قرآن کریم پڑھنے پر قادر ہوگئیں۔ یہ چونکہ ایک بالکل اچھوتا اور نیا طریق تھا اور قرآن کریم سے پہلے کسی کا ذہن اس طرف نہیں گیا تھا اسلئے لوگوں پر شروع شروع میں یہ بات شاق گذرتی تھی۔ اور ہر فریق سمجھتا تھا کہ قرآن میرے قبیلہ کی زبان میں نازل ہوا ہے۔ دوسرا قبیلہ اگر لہجہ بدل کر یا حرف بدلکر کسی آیت کو پڑھتا ہے تو وہ گویا قرآن کریم میں تحریف کرتا ہے۔ اس لئے شروع میں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو یہ بات بار بار سمجھانی پڑی۔ جب لوگ سمجھ گئے تو انکو معلوم ہُوا کہ یہ عیب نہیں۔ نہ معنوں میں اس سے کسی قسم کا تغیّر پیدا ہوتا ہے بلکہ بعض دفعہ تو معانی میں وسعت پیدا ہوجاتی ہے اور ہر قوم کے پڑھنے کے لئے اس میں آسانی ہوجاتی ہے۔

ایک مشہور عربی ادیب نے لکھا ہے کہ ایک بادشاہ تھا جس نے اپنے دربار میں ایک ایسے شخص کو وزارت کا عہدہ سپرد کیا ہُوا تھا جو اپنے لہجہ کے مختلف ہونے کی وجہ سے "ر" نہیں بول سکتا تھا۔ مگر بادشاہ کو اُس کے اِس نقص کا کوئی علم نہیں تھا۔ ایک دفعہ کسی نے بادشاہ کے پاس شکایت کی کہ آپ نے فلاں شخص کو اپنا وزیر مقرر کیا ہُوا ہے مگر اُس کی تو یہ حالت ہے کہ وہ "ر" بھی نہیں بول سکتا۔ اور اگر کوئی ایسا لفظ اُسے بولنا پڑے جس میں "ر" آتی ہو تو وہ "ر" کی جگہ

"ل" پڑھ دیا ہے۔ بادشاہ نے کہا کہ مجھے تو اس کے اس نقص کا کوئی علم نہیں۔ لیکن چونکہ تم نے شکایت کی ہے اس لئے اب میں اس کا مزید امتحان لونگا اور دیکھونگا کہ تمہاری بات کہاں تک درست ہے۔ چنانچہ اس نے وزیر کو بلوایا۔ اور اُسے حکم دیا کہ اپنے سکرٹری کو یہ آرڈر لکھواؤ کہ

اَمَرَ اَمِیْرُ الْاُمَرَاءِ اَنْ یُّحْفَرَ الْبِئْرُ فِی الطَّرِیْقِ لِیَشْرَبَ مِنْهُ السَّآئِرُ الصَّادِرُ وَالْوَارِدُ۔ یعنی شہنشاہ نے حکم دیا ہے کہ شاہی راستہ پر ایک کنواں کھودا جائے تاکہ سب آنے اور جانے والے اس سے فائدہ اٹھاسکیں۔

یہ فقرہ ایسا تھا جس میں اُس نے تمام ایسے الفاظ جمع کر دیئے تھے جن میں "ر" آتی ہے۔ لیکن وہ وزیر بڑا عالم اور ہوشیار تھا۔ اُس نے یہ حکم سنتے ہی فوڑا اپنے سیکرٹری سے کہا کہ لکھو

حَكَمَ حَاكِمُ الْحُكَّامِ اَنْ يُّقْلَبَ الْقَلِيْبُ فِي السَّبِيْلِ لِيَنْتَفِعَ مِنْهُ الصَّادِيْ وَالْبَادِيْ ۔ یعنی تمام حکام کے حاکم اور سردار نے حکم دیا ہے کہ سبیل میں جو طریق کا ہم معنے تھا اور اس میں "ر" نہیں آتی تھی۔ ایک قلیب کھودا جائے جو بیئر کا ہم معنے ہے اور اس میں بھی "ر" نہیں آتی بلکہ "ل" آتا ہے تاکہ اس سے صادی اور بادی یعنی شہر میں آنے والے اور شہر سے جانے والے سب فائدہ اٹھا سکیں۔ اسی جگہ بھی اس نے صادر اور وارد کی جگہ ایسے الفاظ استعمال کئے جو انہیں الفاظ کے ہم معنے تھے مگر ان میں بھی "ر" نہیں آتی تھی۔

بادشاہ اس کی اس ہوشیاری سے بہت متأثر ہوا اور اُس نے شکایت کرنیوالے سے کہا کہ تم نے تو اس لئے شکایت کی تھی کہ میں اسے اس عہدہ سے برطرف کردوں مگر میری نگاہ میں تو اس کا درجہ اور بھی بڑھ گیا ہے۔ کیونکہ میری زبان سے سنتے ہی اس نے میرے فقرہ کو فوڑا ایسے الفاظ میں بدل دیا جو مفہوم کے لحاظ سے میرے الفاظ کے عین مطابق تھے۔ اور ان میں "ر" بھی نہیں آتی تھی۔ اس بات نے تو ثابت کر دیا ہے کہ یہ شخص بڑا عالم ہے اور مجھے اس کی قدر کرنی چاہیئے۔

اس مثال سے یہ بات بآسانی سمجھی جاسکتی ہے کہ جس طرح وہ وزیر "ر" نہیں بول سکتا تھا بلکہ "ر" کی بجائے "ل" بولنے پر مجبور تھا اسی طرح عرب کے مختلف قبائل میں لب ولہجہ کا اختلاف پایا جاتا تھا جس کی وجہ سے بعض لوگ بعض حروف کو پوری طرح ادا نہیں کر سکتے تھے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے مختلف قرأتوں میں قرآن کریم کی تلاوت کی اجازت دیکر ان تمام اختلافات کو مٹا دیا۔ اس طرح قرآن کریم ایک عالمگیر کتاب بن گئی جس کو مختلف لہجہ رکھنے والے عرب بھی آسانی سے پڑھ سکتے تھے اور وہ کہہ سکتے تھے کہ یہ کتاب ہماری زبان میں ہی نازل ہوئی ہے۔ اسی وجہ سے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنْهُ یعنی جو طریق تم پر آسان ہو اس کے مطابق پڑھو۔ اگر ان حروف کے بدلنے یا زیر زبر کے بدلنے سے معانی میں فرق پڑتا تو آپ یہ کیوں فرماتے کہ جس طریق پر پڑھنا تمہیں آسان ہو۔ اس طریق پر پڑھ لو۔ یہ فقرہ صاف بتاتا ہے کہ قرأتوں کا تعلق صرف تلفظ کے ساتھ ہے معانی کے ساتھ نہیں اور اگر کسی جگہ تلفظ سے کوئی وسعت بھی پیدا ہوتی ہے تو اصل معنوں میں فرق نہیں پڑتا۔ اصل حکم وہی رہتا ہے جو قرآن کریم دینا چاہتا ہے۔

ترتیب سُور

اس سورۃ کا سورۂ نور سے قریبی تعلق یہ ہے کہ سورۂ نور کے آخر میں اسلامی تنظیم کا ذکر تھا اور بتایا گیا تھا کہ کچھ لوگ اس تنظیم کی حقیقت سے آگاہ نہیں اور کفر کے کھوکھلے نظام سے ڈرتے ہیں۔ لیکن ان کا یہ ڈر اور ان کی یہ کمزوری انہیں بچائے گی نہیں بلکہ انہیں اور زیادہ تباہی میں دھکیل دے گی۔ اب اس سورۃ میں بتایا ہے کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن کریم کا دعویٰ ہے کہ وہ سب جہانوں کے لئے بطور نذیر آیا ہے۔ اور یہ کہ جو لوگ اس کی تعلیم کے خلاف چلیں گے وہ نیچر اور اس کے منشاء کے خلاف چلیں گے کیونکہ اس کی تعلیم قانونِ فطرت اور قانونِ نیچر کے مطابق ہے پس اسکی خلاف ورزی ایک آسمانی حکم ہی کی خلاف ورزی نہیں ہے بلکہ خود نیچر اور اس کے قوانین کی بھی مخالفت ہے اس لئے دنیا کے کسی مذہب کے پیرو اور کسی ملک کے رہنے والے قرآن کریم کو ماننے اور اس پر عمل کرنے والوں کے سامنے نہیں ٹھہر سکتے۔ اور جب حالت یہ ہے تو یہ لوگ جو ڈر رہے ہیں صرف ایک خیالی اور وہمی بات سے ڈر رہے ہیں حقیقت پر اُن کے ڈر کی بنیاد نہیں ہے۔

یہ تو ان دونوں سورتوں کا قریبی تعلق ہے۔ ساری سورۃ کے مضمون کے لحاظ سے اس سورۃ کا گذشتہ سورۃ کے مضمون سے یہ تعلق ہے کہ سورۂ نور میں قوم کی اخلاقی حالت کی درستی اور عائلی اور قومی تنظیم کی اہمیت پر زور دیا گیا تھا اور بتایا گیا تھا کہ کامیابی کیلئے عقائد اور افکار اور اخلاق کی اصلاح کے ساتھ قومی تنظیم پر خاص طور پر زور دینا چاہیئے۔ اور افراد کے حقوق پر قوم کے حقوق کو مقدم رکھنا چاہیئے۔ اب اس سورۃ میں گو اسی مضمون کو جاری رکھا گیا ہے جو سورۂ نور میں بیان کیا گیا تھا۔ مگر زیادہ تر مضمون کے اس پہلو کی طرف توجہ کی گئی ہے کہ نیک اور بد کا مقابلہ دنیا میں کس طرح چلتا ہے۔ گویا ایمانی ترقی اور کفر کی ترقی کا آپس میں مقابلہ کیا گیا ہے اور ان دونوں کو مقابل پر بہنے والے دو دریا قرار دیا گیا ہے اور مسیح موعود کے زمانہ تک کی اسلامی ترقی اور تنزل کا حال بیان کیا گیا ہے۔ اس طرح مسلمانوں کی ترقی کی خبروں کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ نے ان کی زمانی ترقی کی خبروں کو بھی شامل کر دیا ہے۔

خلاصۂ مضمون

یہ قرآن دو پہلو رکھتا ہے۔ ماننے والوں کے لئے رحمت اور نہ ماننے والوں کیلئے تنبیہہ۔ کیونکہ اس کا نازل کرنیوالا زمین و آسمان کا مالک ہے۔ وہ اکیلا ہے۔ کوئی اس کا شریک نہیں اور کائنات کا ہر ذرّہ اس کی پیدائش ہے اس لئے اس کلام نیچر کے مطابق ہے اور اس کا انکار اور اقرار محض ایک شریعت کا اقرار یا انکار نہیں۔ بلکہ قانونِ نیچر کا اقرار و انکار بھی ہے کیونکہ جب دونوں کا خالق ایک ہے تو کلامِ الٰہی اور قانونِ نیچر دونوں مختلف نہیں ہو سکتے۔ (آیت ۱ تا ۴)

قرآن کے مخالف جب قرآنی تعلیم کی برتری کو دیکھتے ہیں تو مجبور ہو کر یہ کہنے لگ جاتے ہیں کہ یہ کلام ایک شخص کا نہیں بلکہ بہتوں نے ملکر یہ کلام اس شخص کو بنا دیا ہے۔ یا یہ کہہ دیتے ہیں کہ یہ پہلے صحائف کی چوری ہے۔ (آیت ۵ ، ۶)

لیکن ان کا یہ دعویٰ جھوٹا ہے کیونکہ انسانوں نے کلام بنایا ہو تو مافوق الانسانیت باتیں اس میں نہیں چاہئیں۔ اور اگر پہلی کتب کی نقل ہے تو ان کتب میں بھی وہ خوبیاں ہونی چاہئیں۔ (آیت ۷)

بعض مخالف کہتے ہیں کہ یہ تو ایک انسان ہے۔ ہماری طرح کھاتا پیتا۔ لوگوں میں ملتا جلتا۔ خدا نے بھجوانا تھا تو فرشتہ کیوں نہ اُتارا۔ یا پھر اس کے ساتھ خزانہ کیوں نہ اُترا۔ یا اللہ تعالیٰ اُسے ایسے باغات دیتا

جن میں سے یہ پھل کھاتا - اور بعض کہتے ہیں کہ ایک جھوٹے انسان کے پیچھے کیوں چل رہے ہو - ذرا دیکھو کس طرح بے جوڑ اعتراض کرتے جاتے ہیں اور کسی ایک امر پر قائم نہیں رہتے - (آیت ۸ تا ۱۰)

خدا تعالیٰ تو اس سے بہتر باغات تجھے دے سکتا ہے اور دیگا - مگر یہ لوگ اس گھڑی کا انتظار نہیں کرتے بلکہ اس کے منکر ہیں - لیکن جب وہ وقت آئیگا تو یہ پریشان ہو جائیں گے - (آیت ۱۱ تا ۱۵)

یہ جیسا باغ مانگتے ہیں کیا ان باغوں سے اچھا ہے جو مسلمانوں کو ملنے والا ہے - (آیت ۱۶، ۱۷)

جب مابعد الموت ان کے معبودوں سے سوال کیا جائیگا - تو وہ منکر ہو جائیں گے - (آیت ۱۸ تا ۲۰)

ان کے اعتراض کیا وزن رکھتے ہیں - آخر ہر ایک قوم نبیوں کی مدعی ہے - کیا وہ انسان نہ تھے - اور انسانی ضروریات ان کے ساتھ نہ تھیں - ان کو بس یہ فخر ہے کہ عوام ان کے مؤید ہیں - اور یہ انکو دھوکا دے سکتے ہیں - ورنہ ان کی باتیں محض بے سروپا ہیں - (آیت ۲۱)

پھر کچھ لوگ ان میں سے کہتے ہیں کہ خود ہم پر فرشتے کیوں نہ اُترے یا خدا ہم سے کیوں نہ بولا - معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ اپنی شان بہت بڑی سمجھتے ہیں حالانکہ ان کو فرشتے نظر آئیں گے تو ان کے اعمال کے مطابق عذاب ہی کے دن نظر آئیں گے لیکن مومن فرشتوں کو خوشی سے دیکھیں گے - (آیت ۲۲ تا ۲۵)

فرماتا ہے - ایک دن فرشتے ضرور اُتریں گے مگر وہ فیصلہ کا دن ہوگا - اور رسول لوگوں پر گواہی دے گا کہ قانونِ قدرت اور الٰہی تعلیم کا انہوں نے انکار کیا - (آیت ۲۶ تا ۳۱)

مگر یہ کوئی نئی بات نہیں سب نبیوں سے ایسا ہی ہوا - آیت ۳۲)

پھر بعض کہتے ہیں کہ یکدم قرآن کیوں نہ اُترا - یہ اعتراض جتنے چاہیں کریں ہمارے پاس ان کے جواب موجود ہیں بُری بات یہ نہیں کہ اعتراض ہوں - بُری بات تو یہ ہے کہ انسان خدا تعالیٰ کے سامنے شرمندہ ہو (آیت ۳۳ تا ۳۵)

تجھ سے پہلے کئی نبی آئے اور اُن کے دشمن ہلاک ہوئے - (آیت ۳۶ تا ۴۱)

تجھ سے بھی یہ لوگ ہنسی کرتے ہیں - مگر ایسا ہونا ہی چاہیئے - کیونکہ اُن کے دل انسانیت سے خالی ہو چکے ہیں - (آیت ۴۲، ۴۵)

کاش یہ دیکھتے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک قوم کو ترقی دیتا ہے - پھر اُس پر زوال آجاتا ہے اور رات کے بعد دن کی سی کیفیت بھی بعض قوموں پر آتی ہے پس کیوں نہیں سمجھتے کہ ان کے زوال اور مسلمانوں کی ترقی کا زمانہ آگیا ہے - (آیت ۴۶ تا ۵۰)

قرآن ان کے سامنے صرف نصیحت کی بات پیش کرتا ہے - کچھ ان سے مانگتا تو نہیں - پھر انکا رپر اصرار کیوں - (آیت ۵۱)

ان کو یہ صدمہ ہے کہ عرب میں کیوں نبی ہُوا! آخر نبی کہاں آتا؟ کہ جسے سب قومیں مان لیتیں - کیا ہر قوم اور ہر ملک میں الگ الگ نبی ایک وقت میں آجاتے - مگر اس سے تو اختلاف بڑھتا - بس تو ان کی باتوں کو نہ دیکھ - قرآن کی تبلیغ کئے جا - (آیت ۵۲، ۵۳)

کیا وہ دیکھتے نہیں کہ خدا نے دو دریا چلا رکھے ہیں - ایک میٹھا اور ایک کڑوا - پھر وہ آپس میں ملتے نہیں - اسی طرح یہ دو قسمیں متوازی چلتی چلی جائینگی - اور لوگ میٹھے اور کڑوے کا فرق محسوس کرتے رہیں گے (آیت ۵۴)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ①

(میں) اللہ (تعالیٰ) کا نام لے کر جو بے حد کرم کرنیوالا (اور) بار بار رحم کرنیوالا ہے (پڑھتا ہوں)

تَبٰرَكَ الَّذِيْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ

وہ ذات بڑی برکت والی ہے جس نے فرقان اپنے بندے پر اتارا ہے -

لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرًا ② الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ

تاکہ وہ سب جہانوں کے لئے ہوشیار کرنیوالا بنے - وہ (ذات) جس کے قبضہ میں آسمانوں

السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلَمْ يَتَّخِذْ وَلَدًا وَّلَمْ يَكُنْ لَّهٗ

اور زمین کی بادشاہت ہے اور جس نے کوئی بیٹا نہیں بنایا اور جس کی بادشاہت میں

شَرِيْكٌ فِي الْمُلْكِ وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَّرَهٗ تَقْدِيْرًا ③

کوئی شریک نہیں اور جس نے ہر چیز کو پیدا کیا ہے پھر اس کے لئے ایک اندازہ مقرر کیا ہے ۲؎

کیا دیکھتے نہیں کہ انسان کی جسمانی پیدائش بھی پانی سے ہے۔ اسی طرح رُوحانی پیدائش بھی وحی کے پانی کی محتاج ہے (آیت ۵۵)

یہ تو شرک کے عادی ہیں اور تیرا کام ان کو سمجھانا اور مفت تبلیغ کرنا اور صرف خدا پر نظر رکھنا ہے (آیت ۵۶ تا ۶۰)

جب ان سے کہا جاتا ہے کہ واحد خدا کی عبادت کرو جس کی وحدت پر کائنات گواہ ہے تو یہ انکار کرتے ہیں (آیت ۶۱)

حالانکہ دیکھتے نہیں کہ ایک جسمانی نظام ہے اور اس سے روشنی اور حیات ملتی ہے۔ اسی طرح نیکی اور بدی بھی آگے پیچھے آتی ہیں اور مومن دنیا میں ہمیشہ امن قائم کرتے آئے ہیں اور شرارتوں کا جواب دعا سے دیتے ہیں اور خدا تعالیٰ کے عبادت گذار رہتے ہیں اور راتوں کو اُٹھ اُٹھ کر اس سے دُعائیں کرتے ہیں اور دنیا کی اصلاح کے لئے مال خرچ کرتے ہیں لیکن نمائش نہیں کرتے۔ وہ شرک نہیں کرتے۔ قتل نہیں کرتے۔ زنا نہیں کرتے اور جو ایسا کریگا اپنے انجام کو دیکھے گا۔ ہاں اسلام کا خدا توبہ قبول کرتا ہے اور اس کا ثبوت نیکیوں کی توفیق ملنے سے ملتا ہے (آیت ۶۲ تا ۷۲)

اور مومن وہ ہوتے ہیں جو جھوٹ نہیں بولتے اور فضول باتوں کی طرف متوجہ نہیں ہوتے اور خدا تعالیٰ کی باتوں کو سن کر مرعوب ہوتے ہیں اور اپنے بیوی بچوں کی اصلاح کے لئے دُعائیں کرتے ہیں اور صرف لیڈری نہیں چاہتے بلکہ نیک لوگوں کی لیڈری چاہتے ہیں۔ انکو خدائی نعمتیں ملیں گی۔ جو دائمی ہونگی۔ (آیت ۷۳ تا ۷۷)

یاد رکھو۔ خدا نے تم کو ایک خاص مقصد کیلئے پیدا کیا ہے۔ اگر تم اس مقصد کو پورا نہیں کروگے تو تم پر خدا رحم نہیں کرے گا۔ (آیت ۷۸)

۲؎ حل لغات: - تَبَارَكَ اللّٰهُ تَعَالٰى: تَقَدَّسَ وَ تَنَزَّهَ - تبارک کا لفظ جب اللہ تعالیٰ کے لئے استعمال ہو تو اس کے معنے یہ ہوتے ہیں کہ

تَبٰرَكَ

خداتعالیٰ کی ذات تمام صفاتِ حسنہ کی جامع اور تمام کمزوریوں سے بالا ہے۔ (اقرب)

اَلْفُرْقَانُ: اَلْفُرْقَانُ کے معنے ہیں کُلُّ مَا فُرِّقَ بِهٖ بَيْنَ الْحَقِّ وَالْبَاطِلِ. ہر وہ امر جس کے ذریعہ سے حق اور باطل میں امتیاز ہو جائے (اقرب)

مفردات امام راغبؒ میں ہے کہ وَالْفُرْقَانُ۔ كَلَامُ اللّٰهِ تَعَالٰى لِفَرْقِهٖ بَيْنَ الْحَقِّ وَالْبَاطِلِ فِي الْاِعْتِقَادِ وَالصِّدْقِ وَالْكِذْبِ یعنی فرقان کا لفظ اللہ تعالیٰ کے کلام پر بولا جاتا ہے کیونکہ اس کے ذریعہ سے اعتقاداتِ حقّہ اور باطلہ کا علم ہو جاتا ہے اور اسی طرح یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ جھوٹی بات کونسی ہے اور سچی کونسی۔ (مفردات)

اَلْعَالَمِيْن: اَلْعَالَمُ کی جمع ہے اور اَلْعَالَمُ کے معنے ہیں اَلْخَلْقُ كُلُّهٗ۔ تمام مخلوق۔ وَكُلُّ صِنْفٍ مِنْ اَصْنَافِ الْخَلْقِ۔ نیز مخلوق کی ہر قسم پر عالَم کا لفظ اطلاق پاتا ہے۔ وَقِيْلَ يَخْتَصُّ بِمَنْ يَعْقِلُ. بعض لوگوں نے کہا ہے کہ یہ لفظ صرف ایسی مخلوق کے لئے بولا جاتا ہے جس میں عقل ہو جیسے انسان اور فرشتے وغیرہ جانوروں وغیرہ کے لئے۔ وَقَالَ بَعْضُهُمْ هُوَ اِسْمٌ لِمَا يُعْلَمُ بِهٖ شَيْءٌ ثُمَّ سُمِّيَ بِهٖ مَا يُعْلَمُ بِهِ الْخَالِقُ بعض نے کہا ہے کہ یہ تخصیص درست نہیں کہ یہ لفظ صرف ذوی العقول کے لئے بولا جاتا ہے۔ بلکہ یہ لفظ ہر اُس چیز کے لئے بولا جاتا ہے جس سے کسی دوسری چیز کا علم ہو جائے۔ پھر یہ لفظ ان چیزوں کے لئے مخصوص ہو گیا جن کے ذریعہ سے خدا تعالیٰ کی ذات کا علم حاصل ہوتا ہے (اَلْعَالَمِيْن کے متعلق مزید بحث کے لئے تفسیر کبیر جلد اوّل جزو اوّل صفحہ ۱۹، ۲۰ ملاحظہ فرمائیں)

نَذِيْرًا: نذیر کے معنے اَلْاِنْذَارُ یعنی ڈرانے کے ہیں۔ نیز اسکے معنے ہیں اَلْمُنْذِرُ۔ ڈرانے والا۔ اَلرَّسُوْلُ رسول (اقرب)

قَدَّرَهٗ: قَدَّرَهٗ عَلٰى شَيْءٍ کے معنے ہیں۔ جَعَلَهٗ قَادِرًا۔ اس کو کسی چیز پر قادر بنا دیا۔ اور قَدَّرَ الشَّيْءَ بِالشَّيْءِ کے معنے ہوتے ہیں قَاسَهٗ بِهٖ وَجَعَلَهٗ عَلٰى مِقْدَارِهٖ۔ کسی چیز کا صحیح اندازہ کیا اور اس کو اُس مقدار پر بنایا جو درست اور صحیح تھی۔ نیز کہتے ہیں قَدَّرَ فُلَانٌ اور معنے ہوتے ہیں رَوَّى وَفَكَّرَ فِيْ تَسْوِيَةِ اَمْرِهٖ کہ اس نے اپنے مجوزہ کام کے بارے میں غور و فکر کیا تاکہ اس کو مکمل طور پر بنا سکے۔ (اقرب)

تفسیر: ــــ اس آیت میں توجہ دلائی گئی ہے کہ قرآن کریم کو نازل کرنے والا خدا تمام خوبیوں کا جامع اور تمام عیبوں سے پاک ہے اور اس نے ایک ایسی کتاب نازل کی ہے جو حق و باطل میں تمیز کر کے رکھ دیتی ہے اور پھر اس نے یہ کتاب اپنے تمام بندوں کے لئے اتاری ہے خواہ وہ کسی درجۂ عقل کے مالک ہوں یا کسی قسم کا رجحان رکھنے والے ہوں۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ کی جگہ عَلٰى عِبَادِهٖ بھی پڑھا ہے (تفسیر بحر محیط جلد ۶ صفحہ ۴۸۰) جس میں انہی معنوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ خدائے پاک نے یہ فرقان جس سے حق و باطل میں فیصلہ کیا جاتا ہے اپنے مختلف طبیعتوں والے بندوں پر نازل کیا ہے۔ تاکہ یہ کتاب تمام مخلوق کے لئے ڈرانے والی ثابت ہو گویا یہ ایک ایسی کتاب ہے جس سے ہر فطرت کا آدمی فائدہ اٹھا سکتا اور ہر مذاق کا انسان نصیحت حاصل کر سکتا ہے۔ یہ بظاہر ایک مختصر سی آیت ہے جس سے سورۂ فرقان کا آغاز کیا گیا ہے۔ لیکن اگر

اَلْفُرْقَان

قَدَّرَهٗ

اَلْعَالَمِيْن

نَذِيْرًا

غور سے کام لیا جائے تو اس چھوٹی سی آیت میں ہی مسلمانوں کے لئے ایک وسیع اور مکمل لائحہ عمل بیان کر دیا گیا ہے۔ یوں تو کروڑوں مسلمان دنیا میں ایسے پائے جاتے ہیں جو اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں لیکن محض نام رکھ لینے سے کسی چیز کے اندر وہ حقیقت پیدا نہیں ہو جاتی جس حقیقت کا اصل چیز کے اندر پایا جانا ضروری ہوتا ہے۔ ہماری زبان کا یہ محاورہ تو نہیں مگر اردو زبان میں اِسے عام طور پر استعمال کیا جاتا ہے کہ ؎

برعکس نہند نام زنگی کافور

یعنی فلاں بات ایسی ہی حقیقت کے خلاف ہے جیسے کسی حبشی کا نام کافور رکھ دیا جائے۔ حالانکہ حبشی اپنی سیاہی میں بے مثل ہوتا ہے اور کافور اپنی سفیدی میں بے مثل ہوتا ہے۔ اِسی طرح ہمارے ملک کا ایک شاعر کہتا ہے کہ دنیا بھی عجیب مقام ہے جس میں ہر ایک بات اُلٹی نظر آتی ہے۔ وہ کہتا ہے ؎

رنگی کو نارنگی کہیں بنے دودھ کو کھویا
چلتی ہوئی کو گاڑی کہیں دیکھ کبیرا رویا

یعنی نارنگی جو ایک خوش رنگ رکھتی ہے لوگ اس کو نارنگی کہتے ہیں جس کے معنے یہ ہوتے ہیں کہ اس کا کوئی رنگ نہیں۔ اور دودھ جب اپنے کمال کو پہنچ جاتا ہے تو اُسے کھویا کہتے ہیں حالانکہ کھوئی ہوئی چیز وہ ہوتی ہے جو ضائع ہو جائے۔ اسی طرح جو چیز چلتی ہے لوگ اُس کو گاڑی کہتے ہیں۔ حالانکہ گڑی ہوئی چیز وہ ہوتی ہے جو چل نہ سکے۔ کبیر کہتا ہے کہ دنیا کی یہ اُلٹی باتیں دیکھ کر میرے دل کو بہت دُکھ ہوا کہ یہ دنیا کتنی غیر معقول ہے کہ ہر چیز کا الٹا نام رکھتی ہے۔ کیا اس کی آنکھیں بھینگی ہو گئی ہیں کہ اُسے سیدھی چیز بھی اُلٹی نظر آتی ہے۔

اِسی طرح جہاں تک نام کا سوال ہے کوئی نام رکھ لیا جائے خواہ وہ مسلمانوں والا ہو یا ہندوؤں والا ہو یا بدھوں والا ہو یا پارسیوں والا ہو اُس نام کی وجہ سے مذہب کی حقیقی رُوح انسان میں پیدا نہیں ہو جاتی۔ دنیا میں ہزاروں لوگ ایسے ہیں جو اپنے آپکو ہندو یا مسلمان یا بدھ یا پارسی کہتے ہیں لیکن اُن کی زندگی۔ اُن کے افکار۔ اُن کے رہنے سہنے کی عادات اور اُن کے لباس کو دیکھا جائے تو یُوں معلوم ہوتا ہے کہ وہ عیسائی ہیں۔ لیکن جب اُن کے نام معلوم ہوں تب پتہ لگتا ہے کہ فلاں شخص مسلمانوں کے گھر میں پیدا ہوا ہے۔ فلاں شخص ہندوؤں کے گھر میں پیدا ہوا ہے اور فلاں شخص بدھوں یا پارسیوں کے گھر میں پیدا ہوا ہے۔ پس صرف نام کوئی حقیقت نہیں رکھتا اصل خوبی جو کسی چیز کی اہمیت کو بڑھانے والی ہوتی ہے وہ اس کی صفات ہوتی ہیں۔ ورنہ مٹی کا بنا ہوا کیلا بھی نام کے لحاظ سے کیلا ہی ہوتا ہے۔ مٹی کا بنا ہوا سیب بھی نام کے لحاظ سے سیب ہی ہوتا ہے۔ مٹی کا بنا ہوا آم بھی نام کے لحاظ سے آم ہی ہوتا ہے ان چیزوں کو صرف پھلوں کا نام دے دینے کی وجہ سے ان کے اندر پھلوں کی خاصیت پیدا نہیں ہو جاتی اور نہ ان چیزوں سے اِس طرح فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے جس طرح حقیقی آم یا سیب یا کیلے سے فائدہ اُٹھایا جاتا ہے۔

غرض دنیا کو وہی چیز فائدہ پہنچا سکتی ہے جو اپنے نام کے مطابق اپنے اندر صفات بھی رکھتی ہو اگر اس کا نام تریاق ہو تو وہ اپنے اندر تریاقی خاصیت رکھتی ہو اور اگر اس کا نام شفا ہو تو وہ اپنے اندر شفائی اثرات رکھتی ہو۔ یہی حقیقت اللہ تعالیٰ نے

اس آیت میں بیان فرمائی ہے کہ تَبَارَكَ الَّذِیْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰی عَبْدِہٖ کہ بڑی برکتوں والا ہے وہ خدا جس نے حق اور باطل میں تمیز کرنے والا کلام اپنے بندے پر نازل کیا ہے۔ اسجگہ اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے اپنے پاک اور بے عیب ہونے کا دعوٰی دنیا کے سامنے پیش کیا ہے مگر ساتھ ہی بتا دیا کہ ہمارا یہ دعوٰی صرف منہ کا دعوٰی نہیں بلکہ اسکے اندر کامل صداقت پائی جاتی ہے اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ اس خدا نے فرقان نازل کیا ہے یعنی ایسا کلام نازل کیا ہے جس کا ایک ایک لفظ حق اور باطل میں تمیز کرکے دکھلا دیتا ہے اور بتا دیتا ہے کہ فلاں چیز مفید ہے اسے قبول کرو اور فلاں چیز مضر ہے اس سے بچو۔ عیسائیت کی تعلیم کو ہی دیکھ لو۔ وہ اپنی ظاہری شکل میں کتنی خوبصورت نظر آتی ہے مسیحؑ نے کہا ہے کہ اگر کوئی شخص تیرے ایک گال پر تھپڑ مارے تو تو اپنا دوسرا گال بھی اُس کی طرف پھیر دے (متی باب ۵ آیت ۳۹) جب عیسائی مشنری کسی چوک میں کھڑے ہو کر انجیل کی یہ تعلیم بیان کرتا ہے تو کئی کمزور مسلمان بھی یہ کہنے لگ جاتے ہیں کہ سبحان اللہ! کیسی اچھی تعلیم ہے۔ لیکن جب ان الفاظ پر عمل کرنے کا وقت آتا ہے تو یہ تعلیم بالکل بے کار ثابت ہوتی ہے۔ بلکہ ہم تو دیکھتے ہیں کہ خود مسیح بھی اپنی زندگی میں اس تعلیم پر عمل نہ کر سکا۔ چنانچہ وہی مسیحؑ جس نے یہ کہا تھا کہ اگر کوئی شخص تمہارے ایک گال پر تھپڑ مارے تو تم اپنا دوسرا گال بھی اس کی طرف پھیر دو۔ اُسی نے دوسرے موقعہ پر کہا کہ مَیں صلح کرانے نہیں آیا۔ مَیں تلوار چلانے آیا ہوں۔ (متی باب۱۰ آیت ۳۴) بلکہ اُس نے اپنے حواریوں سے کہا کہ اگر تمہارے پاس تلواریں خریدنے کے لئے روپے نہیں تو اپنے کپڑے بیچکر بھی تلواریں خرید لو (لوقا باب ۲۲ آیت ۳۶)

غرض عیسائی دنیا نے اس تعلیم پر کبھی عمل نہیں کیا لیکن قرآن کریم دعوٰی کرتا ہے کہ وہ سچ اور جھوٹ میں ایسا امتیاز کر دیتا ہے کہ انسان کے لئے اُس کے مناسب حال طریقِ عمل بالکل واضح ہو جاتا ہے اور ہدایت اور گمراہی کی راہیں اس کے لئے روشن ہو جاتی ہیں سورۂ بقرہ میں بھی قرآن کریم کی ایک امتیازی خصوصیت اس کا فرقان ہونا بیان کیا گیا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَ بَیِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَ الْفُرْقَانِ (بقرہ ع ۲۳) یعنی رمضان کا مہینہ وہ مقدس اور بابرکت مہینہ ہے جس کے بارہ میں قرآن کریم نازل کیا گیا ہے۔ وہ قرآن جو تمام انسانوں کے لئے ہدایت کا موجب ہے اور اپنے اندر ایسے کھلے دلائل رکھتا ہے جو ہدایت پیدا کرتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی قرآن کریم فرقان بھی ہے یعنی ایسے نشانات پر بھی مشتمل ہے جو حق و باطل میں امتیاز کر دیتے ہیں اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جب بھی کوئی نبی دنیا میں مبعوث ہوتا ہے اُسے فرقان عطا کیا جاتا ہے یعنی اُسے ایسے نشانات معجزات عطا کئے جاتے ہیں۔ جن کے ذریعہ حق و باطل میں امتیاز ہو جاتا ہے۔ مگر محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو دوسرے نبیوں پر یہ امتیاز حاصل ہے کہ دوسرے نبیوں کو کتاب اور اس کے علاوہ فرقان ملا تھا۔ لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جو کتاب نازل ہوئی وہی فرقان تھی۔ تورات اپنی سچائی کے لئے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دوسرے معجزات کی تائید کی محتاج تھی۔ حضرت عیسٰی علیہ السلام کے الہامات دوسرے معجزات کی تصدیق کے محتاج تھے

لیکن محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی کتاب اپنی ذات میں فرقان ہے یعنی وہ ایک زندہ اور کامل کتاب ہے اور اگر دوسرے معجزات لوگوں کو بھول بھی جائیں تب بھی وہ اپنی سچائی کا ثبوت اپنے اندر رکھتی ہے اور حق و باطل میں امتیاز کر دیتی ہے ۔

پھر فرماتا ہے ۔ وہ خدا اس لئے بھی برکتوں والا ہے کہ اُس نے اپنا کلام ایک عبد پر اتارا ہے یعنی اس ہستی پر جو اپنے آپ کو کامل طور پر اللہ تعالیٰ کے تابع کر دیتی اور رات دن اس کے احکام کے پورا کرنے میں لگی رہتی ہے ۔ یوں تو دنیا میں سینکڑوں لوگ قوم کی اصلاح کے مدعی ہوتے ہیں مگر جو باتیں وہ دوسروں سے کہتے ہیں اُن پر وہ خود عمل نہیں کرتے ۔ وہ کہلاتے تو لیڈر اور راہنما ہیں لیکن اُن کا عمل اُن کی تعلیم کے خلاف ہوتا ہے اور اس طرح وہ دوسروں کے لئے ٹھوکر کا موجب بنتے ہیں ۔ لوگ جب ان کی تعلیم کو دیکھتے ہیں تو اُسے قابلِ تعریف قرار دیتے ہیں لیکن جب اُن کے اعمال کو دیکھتے ہیں تو اُن سے نفرت کرنے لگ جاتے ہیں یا اُنکی منافقت اور بے ایمانی کو دیکھ کر یہ خیال کرنے لگتے ہیں کہ ہمیں بھی اس قسم کی منافقت اختیار کرنی چاہیئے لیکن خدا تعالیٰ کا نبی لوگوں کو جو تعلیم دیتا ہے اس کا نمونہ وہ اپنے وجود کے ذریعہ دنیا کے سامنے پیش کرتا ہے ۔ نبی کے آنے سے پہلے بہت حد تک صداقتیں دنیا میں موجود ہوتی ہیں لیکن لوگ اپنے کمزور ایمان کی وجہ سے ان صداقتوں کو پس پشت ڈال رہے ہوتے ہیں ۔ نبی آ کر کہتا ہے کہ سچ بولو اور دنیا کے لوگ بھی یہی کہتے ہیں کہ سچ بولو ۔ نبی آ کر کہتا ہے کہ چوری نہ کرو ۔ اور دنیا کے لوگ بھی یہی کہتے ہیں کہ چوری نہ کرو ۔ نبی آ کر کہتا ہے کہ ظلم نہ کرو ۔ اور دنیا کے لوگ بھی یہی کہتے ہیں کہ ظلم نہ کرو لیکن اس کے باوجود دنیا کو پھر بھی نبیوں کی ضرورت ہوتی ہے ۔ کیونکہ انبیاء اپنے نمونہ کے ذریعہ سے انہیں قابلِ عمل ثابت کرتے ہیں ۔ لوگ یہ تو کہتے ہیں کہ ظلم نہ کرو لیکن جب ظلم کی تعریف کی طرف آتے ہیں تو ہر فعل کو اپنے لئے جائز قرار دے دیتے ہیں ۔ لوگ مُنہ سے تو یہ کہتے ہیں کہ جھوٹ نہ بولو لیکن جب موقعہ آئے تو خود جھوٹ بول لیتے ہیں ۔ لوگ یہ تو کہتے ہیں کہ کسی کا مال غصب نہ کرو ۔ لیکن ضرورت پر خود دوسروں کا مال چھین کر کھا جاتے ہیں اور اُن کے نزدیک اِن گناہوں کی تعریفیں بہت محدود ہو جاتی ہیں ۔ نبی نہ صرف ان اعمال کی تعریفوں کو مکمل کرتے ہیں بلکہ اُن پر عمل کر کے بھی دکھا دیتے ہیں بیشک ان سے پہلے بھی لوگ تسلیم کرتے ہیں کہ سچ بولنا چاہیئے مگر اس کے باوجود وہ جھوٹ بولتے ہیں اور اگر ان کو توجہ دلائی جائے کہ تم جھوٹ کیوں بولتے ہو تو کہتے ہیں سچ بولنے سے اس دنیا میں کام نہیں چلتا اور باوجود اس کے کہ لوگ تسلیم کرتے ہیں کہ دھوکا بازی ایک بُری چیز ہے پھر بھی وہ دھوکا بازی کرتے ہیں ۔ اور اگر اُن سے کہا جائے کہ تم دھوکا بازی کیوں کرتے ہو تو وہ کہتے ہیں کہ اس کے بغیر دنیا میں گذارہ ہی نہیں ۔ اسی طرح وہ دنیا کے مال لوٹتے ہیں اور اگر اُن سے کہا جائے کہ تم لوگوں کے مال کیوں لوٹتے ہو ۔ تو وہ جواب دیتے ہیں کہ اس کے بغیر دنیا میں کام ہی نہیں چلتا ۔ دنیا میں ہر شخص بھیڑیا ہے ۔ اگر وہ بکری کا گوشت نہیں کھائیگا تو زندہ کس طرح رہے گا ۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کئی نسلیں یہ خیال کرنے لگ جاتی ہیں کہ نیک باتیں صرف کہنے سے تعلق رکھتی ہیں ان پر عمل نہیں کیا جا سکتا ۔ لیکن نبی دنیا کے لئے نمونہ بنتا ہے اور انہیں اُن سچائیوں اور اُن صداقتوں پر عمل کر کے دکھا دیتا ہے جن کو وہ ناقابلِ عمل تصوّر کر رہے ہوتے ہیں ۔ چنانچہ جو لوگ اس لئے جھوٹ بولتے ہیں کہ اُن کے خیال میں سچ بولا ہی نہیں جا سکتا.

اور جو لوگ اس لئے ظلم کرتے ہیں کہ اُن کے نزدیک رحم کیا ہی نہیں جا سکتا۔ انبیاء کے نمونہ کو دیکھ کر انکی آنکھیں کھل جاتی ہیں اور جب وہ دیکھتے ہیں کہ یہ بھی ہمارے جیسا ایک انسان ہے جو سچ بولتا ہے کسی پر ظلم نہیں کرتا کسی کا حق نہیں مارتا اور ہر قسم کی برائیوں سے اجتناب کرتا ہے تو ان کے حوصلے بلند ہو جاتے ہیں۔ اور وہ بھی نیکیوں پر عمل کرنے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔

پس انبیاء کی بعثت کی یہ دو اغراض ہوتی ہیں اوّل یہ کہ ان کے ذریعہ رُوحانی تعلیم کی علمی طور پر تکمیل ہوتی ہے۔ دوسرے وہ خود عمل کرکے اُس علم کی صحیح تشریح کر دیتے ہیں۔ بیشک لوگ نبی کی بعثت سے پہلے بھی یہی کہتے ہیں کہ سچ بولنا چاہیئے مگر سچ کی تعریف بہت ناقص کرتے ہیں۔ وہ بیشک کہتے ہیں کہ کسی دوسرے پر ظلم نہیں کرنا چاہیئے لیکن ظلم کی تعریف غلط کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کا عمل ان کی تعریف سے بھی ناقص ہوتا ہے جس چیز کو وہ سچ کہتے ہیں اس پر بھی وہ عمل نہیں کرتے اور جس امر کو وہ ظلم کہتے ہیں اس سے بھی وہ نہیں بچتے۔ جب نبی آتا ہے تو وہ ہر قسم کی نیکی اور بدی کی ایک جامع اور مکمل تعریف اُن کے سامنے پیش کرتا ہے۔ اور پھر تمام احکام پر خود عمل کرکے دکھاتا ہے اور اس طرح اپنا نمونہ پیش کرکے لوگوں کے حوصلوں کو بلند کر دیتا ہے

اللہ تعالےٰ اس بات کی طرف توجہ دلاتے ہوئے فرماتا ہے کہ بہت برکت والا وہ خدا ہے جس نے ایسا کلام بھیجا جو تمام قسم کی باریکیاں بیان کرتا ہے۔ اور حق و باطل میں امتیاز کرکے دکھاتا ہے۔ اور پھر برکت والا وہ خدا ہے جس نے وہ برکت کسی ایسے انسان کے سپرد نہیں کی جو بدعمل ہو اور بجائے دین کی طرف راغب کرنے کے لوگوں کو دین سے بیگانہ کرنے والا ہو۔ بلکہ اُس نے وہ کتاب ایسے شخص کو دی جس نے اپنی ذات اور اپنی دنیوی زندگی پر موت وارد کی اور اللہ تعالیٰ کی تمام صفات کو اپنے نفس کے اندر داخل کر لیا۔ اور اپنے نیک نمونہ سے دنیا کو نیکی کی طرف کھینچ لایا۔

پھر اگر اس روایت کو مدنظر رکھا جائے جس میں یہ ذکر آتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰی عَبْدِہٖ کی جگہ عَلٰی عِبَادِہٖ پڑھنے کی بھی اجازت دی تو اس کے معنے یہ ہونگے کہ بڑی برکت والا ہے وہ خدا جس نے یہ فرقان اپنے تمام بندوں کے لئے نازل کیا ہے۔ خواہ وہ کسی قسم کی طبیعت اور رجحان رکھنے والے ہوں۔ یہ امر بھی اسلام کی صداقت اور اس کے عالمگیر مذہب ہونے کا ایک بہت بڑا ثبوت ہے۔ اسلام کی تعلیم پر غور کرکے دیکھ لو۔ اُس نے اپنے تمام احکام میں ہر قسم کی طبائع کو مدنظر رکھا ہے تاکہ انسانی نفس پر کوئی ایسا بوجھ نہ پڑے جو اس کے لئے ملال کا موجب بن جائے۔ اُس نے روٹی کھانے میں بھی اعتدال کا حکم دیا ہے اور پانی پینے میں بھی اعتدال کا حکم دیا ہے بلکہ یہاں تک فرمایا ہے کہ اگر تم نماز پڑھو تو اس میں بھی اعتدال سے کام لو۔ روزہ رکھو تو اس میں بھی اعتدال سے کام لو۔ مال خرچ کرو تو اس میں بھی اعتدال سے کام لو۔ حدیثوں میں آتا ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم ایک دفعہ اپنے گھر تشریف لے گئے تو آپ نے دیکھا۔ کہ ام المومنین حضرت زینب رضی اللہ عنہا نے چھت کے ساتھ ایک رسّا لٹکایا ہُوا ہے۔ آپؐ نے دریافت فرمایا کہ یہ رسّہ کیسا ہے۔ آپؐ کو بتایا گیا کہ حضرت زینبؓ جب نماز پڑھتے پڑھتے تھک جاتی ہیں تو اس سے سہارا لے لیتی ہیں۔ آپ نے فرمایا۔ اِسے اتار دو۔ یہ کوئی نماز نہیں جب نماز پڑھتے پڑھتے انسان تھک جائے تو اُسے چاہیئے

کہ آرام کرے (بخاری کتاب التہجد باب ما یکرہ فی التشدید فی العبادۃ)

اسی طرح حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے متعلق احادیث میں آتا ہے کہ انہوں نے ایک دفعہ عہد کیا کہ مَیں ہر روز روزہ رکھا کرونگا۔ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ اطلاع ملی تو آپ نے انہیں اس سے منع کیا اور فرمایا یہ جائز نہیں۔ اگر تمہیں بہت ہی شوق ہے تو ایک دن روزہ رکھا کرو اور ایک دن نہ رکھا کرو۔ یہی اعتدال کا حکم باقی احکام میں بھی ہے۔ مثلاً اسلام اپنے مال کو خرچ کرنیکا بھی حکم دیتا ہے مگر ساتھ ہی یہ بھی کہتا ہے کہ وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُوْلَةً اِلٰى عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُوْمًا مَّحْسُوْرًا (بنی اسرائیل ۳۰) یعنی نہ تو اپنے ہاتھوں کو اپنی گردن سے باندھ دو یعنی بخل سے کام لو اور نہ اپنا ہاتھ ایسا کھول دو کہ سب مال ضائع ہو جائے اور لوگ تمہیں ملامت کریں اور تم آئندہ مال کمانے کے سامانوں سے بھی محروم ہو جاؤ۔ غرض اسلام نے کوئی تعلیم ایسی نہیں دی جس کا برداشت کرنا انسانی فطرت کے لئے مشکل ہو بلکہ وہ ایک بیمار اور کمزور کے لئے بھی اُسی طرح قابلِ عمل ہے جس طرح ایک مضبوط اور طاقتور انسان کے لئے اسی طرح اُس کی تعلیم عورتوں کے لئے بھی قابلِ عمل ہے اور مردوں کیلئے بھی۔ بچّوں کے لئے بھی قابلِ عمل ہے اور بوڑھوں کے لئے بھی۔ امیروں کیلئے بھی قابلِ عمل ہے اور غریبوں کے لئے بھی۔ اس کے دامنِ فیض سے دنیا کا کوئی متنفّس محروم نہیں اور اس کے دائرۂ ہدایت سے دنیا کا کوئی ملک اور کوئی قوم باہر نہیں جس طرح خدا تعالیٰ کا سورج ایک بادشاہ کے محلّات پر بھی چمکتا ہے اور ایک غریب کی جھونپڑی کو بھی اپنے نُور سے منوّر کرتا ہے اسی طرح اسلام کی رُوحانی تعلیم غریب اور امیر کو یکساں فوائد پہنچاتی اور ہر ایک کو خدا تعالیٰ کے قریب پہنچاتی ہے وہ چھوٹے اور بڑے اور غریب اور امیر اور عورت اور مرد اور مشرقی اور مغربی اور کمزور اور طاقتور اور حاکم اور رعایا اور آقا اور مزدور اور خاوند اور بیوی اور ماں باپ اور اولاد اور بائع اور مشتری اور ہمسائے اور مسافر سب کے لئے راحت اور امن اور ترقی کا پیغام ہے۔ وہ بنی نوع انسان میں سے کسی گروہ کو اپنے خطاب سے محروم نہیں کرتا۔ وہ اگلی اور پچھلی تمام اقوام کے لئے ایک ہدایت نامہ ہے۔ جس طرح عالم الغیب خدا کی نظر پتھروں کے نیچے پڑے ہوئے ذرّوں پر بھی پڑتی ہے اور آسمان میں چمکنے والے ستاروں پر بھی اسی طرح اسلام کی تعلیم غریب سے غریب اور کمزور سے کمزور انسانوں کی ضرورتوں کو بھی پُورا کرتی ہے۔ اور امیر سے امیر اور قوی سے قوی انسانوں کی احتیاجوں کا بھی خیال رکھتی ہے۔ وہ صرف گذشتہ مذاہب کی ایک نقل نہیں بلکہ وہ مذہب کی زنجیر کی آخری کڑی اور نظامِ روحانی کا سورج ہے۔

بیشک مذہب کے نام میں دنیا کے تمام مذاہب شریک ہیں اُسی طرح جس طرح کوئلہ اور ہیرا کاربن کے نام میں شریک ہیں۔ لیکن ہیرا ہیرا ہی ہے اور کوئلہ کوئلہ ہی ہے۔ جس طرح پتھر کا نام کنکریلے پتھر اور سنگِ مرمر دونوں پر بولا جاتا ہے لیکن کنکریلا پتھر کنکریلا پتھر ہی ہے اور سنگِ مرمر سنگِ مرمر ہی دونوں میں کوئی نسبت ہی نہیں ہوتی۔

پھر فرماتا ہے لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرًا

لِيَكُوْنَ میں چونکہ ضمیر تو ظاہر کی گئی ہے لیکن اس کا فاعل ظاہر نہیں کیا گیا۔ اس لئے ضمیر سے پہلے جتنی چیزوں کا ذکر کیا گیا ہے اُن سب کی طرف اس کی ضمیر پھر سکتی ہے۔ لِيَكُوْنَ سے پہلے اللہ تعالیٰ کا بھی ذکر ہے جیسا کہ فرمایا تَبٰرَكَ الَّذِيْ اور قرآن کریم کا بھی ذکر ہے جیسا کہ فرمایا نَزَّلَ الْفُرْقَانَ۔ پھر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی ذکر ہے جیسا کہ فرمایا عَلٰى عَبْدِهٖ۔ پس چونکہ ضمیر سے پہلے اِن تینوں وجودوں کا ذکر ہے اسلئے اِن تینوں کی

طرف یکون کی ضمیر پھر سکتی ہے اور معنے یہ بنتے ہیں کہ اُس
نے یہ فرقان اس لئے نازل کیا ہے تاکہ اللہ تعالیٰ ساری
دنیا کا نذیر بن جائے یا قرآن کریم ساری دنیا کا نذیر
بن جائے یا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ساری دنیا کے
نذیر بن جائیں - اور چونکہ ان میں سے کوئی معنے بھی اسجگہ
متعذر نہیں اس لئے یہ تینوں معنے ہی یہاں چسپاں ہو
سکتے ہیں -

قرآن کریم کی یہ خوبی ہے کہ وہ کئی مقامات پر
صرف ضمائر سے کام لیتا ہے اور اس طرح ایک وسیع
مضمون کو چند الفاظ میں بیان کر دیتا ہے اگر یہاں
لِيَكُوْنَ اللّٰهُ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرًا ہوتا تو دو تہائی
مضمون ضائع ہو جاتا اور ایک تہائی مضمون رہ جاتا
اور اگر اللہ تعالیٰ فرماتا لِيَكُوْنَ الْفُرْقَانُ لِلْعٰلَمِيْنَ
نَذِيْرًا تو پھر بھی دو تہائی مضمون ضائع ہو جاتا - اور
ایک تہائی مضمون رہ جاتا - اور اگر اللہ تعالیٰ لِيَكُوْنَ
عَبْدُهٗ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرًا فرماتا تو بھی دو تہائی مضمون
ضائع ہو جاتا اور ایک تہائی مضمون رہ جاتا - اور اگر
اللہ تعالیٰ یہ فرماتا کہ لِيَكُوْنَ اللّٰهُ وَالْفُرْقَانُ وَ
رَسُوْلُهٗ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرًا تو اس طرح عبارت
میں طوالت پیدا ہو جاتی اور پھر اگر یہی طریق ہر جگہ
اختیار کیا جاتا تو قرآن کریم موجودہ حجم سے کئی گنا بڑا
ہو جاتا - پس اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں ضمائر اور مصادر
کو لاکر مضمون کی وسعت کو بھی برقرار رکھا ہے اور
کلام میں اختصار بھی پیدا کر دیا ہے - ان ضمائر کو
مدنظر رکھتے ہوئے لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرًا
میں پہلا مضمون یہ بیان کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ چونکہ
ساری دنیا کا خدا ہے - اس لئے ضروری تھا کہ اس کی
مشیت ساری دنیا کے لئے ہو اور وہ ساری دنیا کے
لئے ہدایت اور رُشد کا سامان پیدا کرے - رسول کریم
صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے دنیا میں مختلف علاقوں کی
طرف علیحدہ علیحدہ انبیاء مبعوث ہوتے تھے - اور
چونکہ اُن کی تعلیم میں خاص خاص قوموں کو مخاطب کیا
جاتا تھا - اس لئے جہاں اُن قوموں نے اس تعلیم کی
راہنمائی میں خدا تعالیٰ کا قرب حاصل کیا وہاں اُن میں
آہستہ آہستہ یہ خیال بھی پیدا ہو گیا کہ خدا تعالیٰ
صرف ہمارا ہی خدا ہے دوسری قوموں کا نہیں - ہاں
قرآن کریم نے بائیبل کو اس الزام سے بچانے کی کوشش
کی ہے - چنانچہ سورۃ شعراء میں جہاں موسیٰ علیہ السلام اور
فرعون کا ذکر آتا ہے وہاں بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ
نے حضرت موسیٰ اور ہارون علیہما السلام سے یہی کہا
کہ فَأْتِيَا فِرْعَوْنَ فَقُوْلَآ اِنَّا رَسُوْلُ
رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (شعراء ع ۲) یعنی فرعون کے پاس
جاؤ اور اُسے کہو کہ ہم رب العالمین خدا کے فرستادہ
ہیں جو تمہاری اصلاح کے لئے بھیجے گئے ہیں - اس پر
فرعون نے سوال کیا کہ یہ رب العالمین کون ہے؟
جس کی طرف سے مبعوث کئے جانے کا تم دعوےٰ
کر رہے ہو - حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا رَبُّ
السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا اِنْ
كُنْتُمْ مُّوْقِنِيْنَ رب العالمین خدا وہی ہے
جو آسمانوں اور زمین کا اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان
پایا جاتا ہے اُن سب کا رب ہے بشرطیکہ تم
اس پر ایمان اور یقین پیدا کرنے کی کوشش کرو -
ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی
زبان سے رَبُّ العالمین کے الفاظ ہی نکلوائے
ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام
یہی تعلیم دیتے تھے کہ خدا صرف بنی اسرائیل کا خدا نہیں
بلکہ ساری دنیا کا خدا ہے - مگر افسوس کہ باوجود اسکے
کہ قرآن کریم نے یہ نکتہ بیان کر دیا تھا - پھر بھی

یہودیوں اور عیسائیوں نے خدا تعالیٰ کو رب العالمین قرار نہیں دیا۔ بلکہ مخصوص قوموں کا رب قرار دے دیا چنانچہ بائیبل کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اُسمیں بار بار "اسرائیل کا خدا" کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں۔ جو بتاتے ہیں کہ یہودیوں کے دل و دماغ پر یہی خیال غالب رہا کہ وہ خدا جسے بائیبل پیش کرتی ہے۔ کسی اور قوم کا خدا نہیں بلکہ صرف بنی اسرائیل کا خدا ہے۔ چنانچہ لکھا ہے:۔

"خداوند اسرائیل کا خدا مبارک ہو جس نے تجھے آج کے دن مجھ سے ملنے کو بھیجا۔"
(۱۔سموئیل باب ۲۵ آیت ۳۲)

"خداوند اسرائیل کا خدا مبارک ہو جس نے ایک وارث بخشا کہ وہ میری ہی آنکھوں کے دیکھتے ہوئے آج میرے تخت پر بیٹھے۔" (۱۔سلاطین باب ۱ آیت ۴۸)

"خداوند اسرائیل کا خدا ازل سے ابد تک مبارک ہو۔" (۱۔تواریخ باب ۱۶ آیت ۳۶)

"خداوند اسرائیل کا خدا مبارک ہو جس نے اپنے مونہہ سے میرے باپ داؤد سے کلام کیا۔" (۲۔تواریخ ۶/۴)

"خداوند اسرائیل کا خدا مبارک ہو۔"
(زبور ۷۲/۱۸)

غرض بائیبل صرف بنی اسرائیل کے خدا کو پیش کرتی ہے لیکن قرآن کریم پڑھکر دیکھو تو اس میں ہر جگہ یہی لکھا ہُوا نظر آئیگا کہ مَیں ساری دنیا کا خدا ہوں۔ مَیں جنّ و انس کا خدا ہوں اور مَیں تمام مخلوق کا رب ہوں خواہ کوئی مسلمان ہو یا ہندو ہو یا عیسائی ہو یا یہودی وغیرہ ہو۔ اس تعلیم کو پڑھکر ایک یہودی کا دل بھی یہ محسوس کرنے لگے گا کہ اس کلام کا اتارنے والا خدا اُسی طرح میرا خدا ہے جس طرح وہ مسلمانوں کا خدا ہے۔ اگر ایک عیسائی قرآن کریم پڑھے گا تو اس کا دل بھی یہی محسوس کرے گا کہ قرآن کریم کو بھیجنے والا خدا اُسی طرح میرا خدا ہے جس طرح وہ ایک مسلمان کا خدا ہے۔ اگر ایک ہندو قرآن کریم کو پڑھیگا تو اس کا دل بھی یہ محسوس کرے گا کہ اس کتاب کو بھیجنے والا خدا اسی طرح میرا خدا ہے جس طرح ایک مسلمان کا خدا ہے لیکن یہ بات کسی اور کتاب میں نظر نہیں آتی۔

اسی طرح قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے كُلًّا نُّمِدُّ هٰٓؤُلَآءِ وَ هٰٓؤُلَآءِ (بنی اسرائیل ع ۲) یعنی یہ خیال کر لینا کہ اللہ تعالیٰ صرف مسلمانوں کی مدد کرتا ہے۔ غلط ہے بلکہ وہ اس قوم کی بھی مدد کرتا ہے اور اس قوم کی بھی مدد کرتا ہے۔ یعنی ساری اقوام کی مدد کرتا ہے۔ اور اس کی رحمت کسی خاص قوم سے مخصوص نہیں۔ بلکہ خواہ کوئی مومن ہو یا غیر مومن۔ جو بھی اللہ تعالےٰ کے قوانین پر عمل کرکے ان سے فائدہ اٹھائیگا ترقی کر جائیگا۔ چنانچہ دنیا میں ہمیں عملی رنگ میں یہی نظر آتا ہے کہ خدا تعالیٰ کا فضل دنیوی فوائد اور ترقیات کے رنگ میں عیسائیوں کو بھی پہنچ رہا ہے ہندوؤں کو بھی پہنچ رہا ہے۔ بدھوں کو بھی پہنچ رہا ہے۔ پارسیوں کو بھی پہنچ رہا ہے۔ یہودیوں کو بھی پہنچ رہا ہے۔ اور مسلمانوں کو بھی پہنچ رہا ہے۔

ہاں روحانی فیضان صرف اس قوم کو ملتا ہے جو روحانی طور پر اللہ تعالےٰ سے منسلک ہوتی ہے۔ لیکن دنیوی کوشش جو بھی کرے اُس کو فائدہ پہنچ جاتا ہے خواہ وہ مومن ہو یا غیر مومن۔ اس کے لئے مذہب اور ایمان کوئی شرط نہیں۔

اسی طرح ویدوں کو پڑھا جائے تو ان کے مطالعہ سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے نازل کرنیوالا خدا

صرف ہندو قوم سے تعلق رکھتا ہے دوسری قوموں سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ بلکہ وید کے ماننے والوں میں تو ویدوں کو اس حد تک ہندوستان کی اونچی ذاتوں کے ساتھ مخصوص کیا گیا تھا کہ منو جو تمام ہندو قوم آریہ اور سناتن دھرم کا تسلیم شدہ شارح قانون ہے لکھتا ہے کہ

"شودر اگر وید کو سن لے تو راجہ سیسہ
اور لاکھ سے اس کے کان بھر دے۔ وید
منتروں کا اچارن (تلاوت) کرنے پر اسکی
زبان کٹوا دے۔ اور اگر وید کو پڑھ لے
تو اس کا جسم ہی کاٹ دے"
(گوتم سمرتی ادھیاے ۱۲)

اسی طرح خود وید میں غیر قوموں کے لئے جو تعلیم موجود ہے۔ وہ نہایت ہی خطرناک ہے۔ رگ وید میں ویدک دھرم کے مخالفین کو کتا قرار دیتے ہوئے یہ بددعا کی گئی ہے کہ

"اے آگ دیوتا تو ان برے کتوں (یعنی
مخالفین) کو دور لے جاکر باندھ دے"

اتھروید میں یہ تعلیم دی گئی ہے کہ غیر ویدک دھرمی لوگوں کو پکڑ کر ان کے گھروں کو لوٹ لینا چاہیئے۔ لکھا ہے کہ

"اے ویدک دھرمی لوگو: تم چیتے جیسے بن کر
اپنے مخالفین کو پھاڑ دو اور پھر ان کے
کھانے تک کی چیزیں زبردستی اٹھا لو"
(اتھروید کانڈ ۴ سوکت ۲۲ منتر ۷)

اسی طرح وید میں چاند۔ سورج۔ آگ۔ پانی اور اندر سے یہاں تک کہ گھاس سے بھی یہ دعائیں کی گئی ہیں کہ غیر ویدک دھرمی لوگوں کو تباہ و برباد کر دیا جائے۔ چنانچہ لکھا ہے:-

"اے آگ تو ہمارے مخالفوں کو جلا کر
راکھ کر دے۔" (یجروید)

"اے اندر: تو ہمارے مخالفوں کو چیر
پھاڑ ڈال اور جو ہم سے نفرت رکھتے ہیں
انہیں تتر بتر کر دے۔"
(سام وید پارٹ دوم کانڈ ۹ سوکت ۲ منتر ۹)

"اے مخالفو: تم سر کٹے ہوئے سانپوں کی طرح
بے سر اور اندھے ہو جاؤ۔ اس کے بعد پھر
اندر دیوتا تمہارے چیدہ چیدہ لوگوں کو
تباہ کر دے۔"
(سام وید پارٹ دوم کانڈ ۹ سوکت ۲ منتر ۹)

"اے دبھ گھاس: تو ہمارے مخالفوں کو
جلا دے اور تباہ کر۔ اور جس طرح تو پیدا
ہوتے وقت زمین کو چیر کر باہر نکل آتا ہے
ویسے ہی تو ہمارے مخالفوں کے سروں کو
چیرتا ہوا اوپر کو نکل کر ان کو تباہ کر کے
زمین پر گرا دے۔"
(اتھروید کانڈ ۱۹ سوکت ۲۸ منتر ۴)

پھر ہندو دھرم میں یہ بھی تعلیم موجود ہے۔ کہ غیر ویدک دھرمی لوگوں کے ساتھ بات چیت بھی نہ کرو (گوتم دھرم سوترا دھیائے ۵) اور اگر کوئی ویدوں پر اعتراض کرے تو اسے ملک سے باہر نکال دو۔ یعنی اسے حبس دوام کی سزا دو (منو دھرم شاستر)

اس تعلیم کے پڑھنے سے کسی انسان کے دل میں ویدک دھرم کے متعلق محبت کے جذبات پیدا نہیں ہو سکتے۔ اور نہ کوئی انسان ایسے مذہب کو اپنی نجات کا ضامن قرار دے سکتا ہے۔ یہی حال کنفیوشس ازم اور زرتشتی مذہب کا ہے۔ انہوں نے بھی کبھی ساری دنیا کو اپنا مخاطب نہیں سمجھا اور نہ ساری دنیا کو تبلیغ کرنے کی کوشش کی۔ بلکہ جس طرح ہندو مذہب کے مطابق

ہندوستان خدا تعالیٰ کے خاص بندوں کا ملک تھا۔ اسی طرح کنفیوشسں ازم کے مطابق صرف چین آسمانی بادشاہت کا مظہر تھا۔ اور زرتشتیوں کے نزدیک صرف ایران آسمانی بادشاہت کا مظہر تھا۔ غرض تمام مذاہب خدا تعالیٰ کو صرف اپنی اپنی قوم کا خدا قرار دے رہے تھے اور وہ خدا جس کی ربوبیّت کے فیضان سے ساری دنیا فائدہ اٹھا رہی ہے اس کی ربوبیّت عالمین سے وہ ایک رنگ میں انکار کر رہے تھے پس ضروری تھا کہ اللہ تعالیٰ کا وجود اپنے حقیقی حسن کے ساتھ دنیا کے سامنے پیش کیا جاتا اور خدا تعالیٰ کو رب العالمین کی شکل میں ظاہر کیا جاتا اور بتایا جاتا کہ تمہارا خدا کسی ایک قوم یا ملک کا خدا نہیں بلکہ ساری دنیا کا خدا ہے۔ اسی مضمون کو اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں بیان فرمایا ہے کہ میں وہ خدا ہوں جو ہندوؤں، عیسائیوں، آریوں، دہریوں، ایرانیوں اور یونانیوں سب کا خدا ہوں۔ میں ہر ملک میں رہنے والوں کا خدا ہوں اور ہر زبان بولنے والوں کا خدا ہوں۔ میں گوروں کا بھی خدا ہوں اور کالوں کا بھی خدا ہوں۔ دنیا میں جسقدر اقوام ہیں ان سب کا خدا ہوں اور سارے ہی میرے بندے ہیں۔ اور میں نے سب کو بیدار اور ہوشیار کرنے کے لئے یہ کلام اتارا ہے یہ تعلیم جو قرآن کریم نے پیش کی ہے کتنی اچھی اور فطرت کے مطابق ہے۔ اس تعلیم کے پڑھنے سے انسان کے دل میں اللہ تعالیٰ کی محبت کے نہایت گہرے جذبات پیدا ہو جاتے ہیں لیکن پہلی تعلیموں کو پڑھ کر دل میں نفرت کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ جب تک دنیا اکٹھی نہیں ہوئی تھی اور ایک ملک کے لوگ دوسرے ملک کے لوگوں سے جُدا تھے۔ اگر اس وقت ایسی تعلیم بھیجی جاتی جو تمام دنیا کے لئے ہوتی تو بہت سے ملک اس تعلیم سے محروم رہ جاتے اس لئے اللہ تعالیٰ نے مختلف وقتوں میں مختلف تعلیمیں نازل کیں۔ وہ تعلیمیں اپنے اپنے وقت میں کامل تھیں اور اُن کے ذریعے مختلف قومیں ہدایت پاتی رہیں۔ لیکن بعد میں جب کہ میل جول کے ذرائع وسیع ہو گئے اور رسل و رسائل کے راستے کھل گئے اللہ تعالیٰ نے ایک ایسی تعلیم نازل فرمائی جو تمام دنیا کے لئے تھی اور تمام دنیا کی ضرورتوں کا علاج اس میں موجود تھا۔ تمام مؤرخ اس بات پر متفق ہیں کہ پری ہسٹارک PRE HISTORIC زمانہ سے مراد رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ سے پہلے کا زمانہ ہے اور ہسٹارک HISTORIC زمانہ سے مراد رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب کا زمانہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اِن رسل و رسائل کے ذرائع کو وسیع کر کے بتا دیا کہ اب لِيَكُونَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرًا کا زمانہ آگیا ہے جس میں تمام دنیا کا نقطۂ مرکزی پر جمع ہونا ضروری ہے۔ غرض اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں بہت برکتوں والا خدا ہوں۔ اور پھر اس کا ثبوت یہ ہے کہ میں نے ایسی کتاب نازل کی ہے جو تمام دنیا کو ہدایت دینے والی ہے اور حق و باطل میں فرق کر کے دکھانے والی ہے اور جو کلام ایک زمانہ میں نازل ہو کر ہر زمانہ کے لوگوں کے لئے ہدایت کا موجب ہو وہ یقیناً اُس کلام کے بھیجنے والے کی بڑائی اور عظمت پر دلالت کرتا ہے۔ چونکہ اس کتاب کے ذریعہ ہر زمانہ کے لوگوں نے ہدایت پانی تھی اسلئے ہر زمانہ کا نام عالم رکھا گیا اور بتایا گیا کہ یہ کتاب قیامت تک آنے والی تمام نسلوں کی ہدایت کا ایک یقینی اور قطعی ذریعہ ہے۔ پہلی کتابیں بے شک اپنے اپنے وقت میں ہدایت کا موجب تھیں لیکن وہ اپنے اندر عالمگیر تعلیم نہیں رکھتی تھیں۔ یعنی نہ تو تمام قوموں کے لئے تھیں نہ تمام زمانوں کے لئے تھیں۔ مگر اب دنیا ایسے مقام پر پہنچ گئی تھی کہ اس کے لئے ایک ہی نذیر کی ضرورت تھی۔ پس برکت والے خدا نے ایک بادلیل کتاب

اپنے فرمانبردار اور اعلیٰ نمونہ پیش کرنے والے بندہ پر اسلئے
نازل کی ہے تاکہ وہ گورے اور کالے اور مغربی اور مشرقی
سب کو ہوشیار کردے اور ہر زمانہ میں ہوشیار کرتا چلا جائے
یہی دعویٰ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں بھی فرمایا ہے ۔ کہ
وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّ
نَذِيْرًا وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝
(سبا ع ۳) یعنی اے ہمارے رسول! ہم نے تجھے ساری
دنیا کی طرف بشیر و نذیر بنا کر بھیجا ہے لیکن اکثر لوگ اس
بات کو سمجھتے نہیں۔ کیونکہ پہلے ہر نبی اپنی اپنی قوم کی طرف
بھیجا جاتا تھا اور جو تعلیم وہ لاتا تھا صرف اپنی قوم کے
لئے لاتا تھا۔ چنانچہ ہندوستان میں اگر رام اور کرشن اور
بدھ حکومت کر رہے تھے تو ایران میں زرتشت حکومت
کر رہے تھے۔ چین میں کنفیوشس حکومت کر رہے تھے۔
اسی طرح کوئی موسیٰؑ کی امت تھا کوئی عیسیٰؑ کی ۔ مگر خدا
نے کہا اب دنیا میں ایک ہی مذہب کی حکومت ہوگی
اور ظاہری اور باطنی طور پر تمام دنیا ایک ہی جھنڈے
کے نیچے ہوگی۔ گویا لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرًا فرما کر
مسلمانوں کو توجہ دلائی گئی ہے کہ اسلام کے ظہور کی اصل
غرض یہ ہے کہ دنیا کے سارے لوگوں کو خواہ وہ ہندو
ہوں۔ عیسائی ہوں، یہودی ہوں۔ پارسی ہوں۔ مجوسی
ہوں یا کسی اور مذہب سے تعلق رکھتے ہوں بتایا جائے
کہ اس دنیا کا پیدا کرنے والا ایسا خدا ہے جو تمام دنیا
کو اب ایک ہی کتاب اور ایک ہی رسول پر اکٹھا کرنا
چاہتا ہے اور اس طرح مسلمانوں کو نصیحت کی گئی ہے
کہ ان کا ایک ہی وقت میں ان سب مذاہب پر تبلیغی
حملہ ہونا چاہیئے۔ کیونکہ وہ برکتوں والا اسی وقت ثابت
ہو سکتا ہے جبکہ مسلمان بھی اپنے عمل سے ثابت کر دیں کہ
وہ برکتوں والا ہے اور اس کی خوبیوں اور کمالات کو
تمام دنیا میں روشن کر دیں۔ آخر دین کے کاموں کے لئے
اللہ تعالیٰ خود تو آسمان سے نہیں اترتا اس کے بندے ہی کام
کیا کرتے ہیں۔ پس لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرًا تب
ہی صحیح ثابت ہو سکتا ہے جب کہ تمام دنیا کو اس کا
پیغام پہنچ جائے۔ اور وہ لوگ جو اللہ تعالیٰ سے بہت
دور جا چکے ہیں پھر اس کے اطاعت گذار بندے بن
جائیں۔ دیکھو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ
نے جب یہ کہا کہ قرآن کریم تمام دنیا کے لئے ہے اور
رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم تمام قوموں کی طرف آئے
ہیں تو انہوں نے اپنے عمل سے بھی اس بات کو سچا
ثابت کر کے دکھا دیا اور ساری دنیا میں اسلام پھیلا دیا
لیکن اب ہر قوم کا اور ہر جماعت کو اور ہر زبان بولنے والے کو اور ہر
ملک کے رہنے والے کو تبلیغ نہیں پہنچے گی تو اس کی
ذمہ داری ہماری جماعت پر ہوگی۔ کیونکہ خدا تعالیٰ
نے ہمیں اسی غرض کے لئے کھڑا کیا ہے کہ ہم اسلام کو
تمام دنیا پر غالب کریں اور اللہ تعالیٰ کا نام دنیا
کے کونے کونے میں پہنچا دیں۔ پس لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ
نَذِيْرًا میں جہاں قرآن کریم کی افضلیت کا ذکر کیا گیا
ہے وہاں اس میں مسلمانوں کو تبلیغ اسلام کی طرف بھی
توجہ دلائی گئی ہے جس پر ان کی تمام کامیابیوں کا دارومدار ہے۔
لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرًا کی دوسری ضمیر
قرآن کریم کی طرف پھرتی ہے اور اس لحاظ سے اس آیت
کے یہ معنے ہیں کہ قرآن کریم اس لئے نازل کیا گیا ہے تاکہ
ساری دنیا کے لئے نذیر ہو۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ
نذیر بننا ہمارا کام نہیں بلکہ قرآن کریم کا کام ہے۔
اور وہی لوگوں کے لئے نذیر بن سکتا ہے یا دوسرے
الفاظ میں یوں سمجھ لو کہ ہم دنیا کو ہدایت نہیں دے سکتے
بلکہ قرآن کریم ہی دنیا کو ہدایت دے سکتا ہے۔ اگر
ہمارے ذریعہ سے یا دوسرے لوگوں کے ذریعہ سے دنیا
کو ہدایت ملتی ہوتی تو اللہ تعالیٰ یہ فرماتا کہ

لِیَکُوْنَ لِلْعٰلَمِیْنَ نَذِیْرًا تاکہ تم تمام دنیا کے لئے نذیر بن جاؤ۔ لیکن اللہ تعالٰے نے یہ نہیں کہا۔ بلکہ اللہ تعالیٰ یہ فرماتا ہے۔ کہ ہم نے قرآن کریم کو اس لئے نازل فرمایا ہے تاکہ یہ قرآن تمام دنیا کے لئے نذیر ہو۔ پس اگر کوئی چیز دنیا کو بیدار کرسکتی ہے اور اگر کوئی کلام دنیا کو ڈرا سکتا ہے۔ تو وہ صرف قرآن کریم ہی ہے۔ اور جب قرآن کریم ہی دنیا کو بیدار کرسکتا ہے اور وہی دنیا کی ہدایت کا موجب بن سکتا ہے تو سوال یہ ہے کہ کیا ہم میں سے ہر ایک نے قرآن کریم پڑھا ہے یا کیا اُسے سمجھنے اور پھیلانے کی کوشش کی ہے؟ اگر ہم نے قرآن کریم نہیں پڑھا اور اُسے سمجھنے اور پھیلانے کی کوشش نہیں کی تو اس کے معنے یہ ہیں کہ ہم اسلام کے سپاہی نہیں۔ کیونکہ ہم نے اس ہتھیار کی طرف توجہ نہیں کی جس کے ذریعہ سے یہ دنیا فتح ہوسکتی ہے۔ پس قرآن کریم کو نذیر قرار دے کر اس طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ تم قرآن کریم کو بار بار پڑھو اور اُسے سمجھنے اور پھیلانے کی کوشش کرو۔ یہاں تک کہ جب تم بولو تو تمہاری زبانوں سے قرآن کریم جاری ہو۔ اور جب تم لکھو تو تمہاری قلموں سے قرآن کریم جاری ہو۔ اور تمہارے خیالات اور تمہارے جذبات اور تمہاری خواہشات سب کی سب قرآن کریم کے تابع ہوں۔ جب تک تمہاری زبانوں سے قرآن کریم نہیں بہے گا اور جب تک تمہاری قلموں سے قرآن کریم نہیں نکلے گا اسوقت تک دنیا تمہارے ذریعہ سے ہدایت نہیں پاسکتی۔

لِیَکُوْنَ لِلْعٰلَمِیْنَ نَذِیْرًا کی تلبیسی ضمیر جیسا کہ میں نے بتایا ہے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف پھرتی ہے۔ پس اس لحاظ سے اس آیت کے یہ معنے ہونگے کہ بہت برکتوں والا وہ خدا ہے جس نے فرقان کے نازل کرنے کے لئے ایسے انسان کو چُنا جس کا ظاہر اور باطن ایک ہے اور تمام دنیا کے لئے مثال اور نمونہ کے طور پر ہے اور اللہ تعالٰے نے اسے اس لئے چُنا ہے تاکہ وہ تمام دُنیا کیلئے نذیر بن جائے۔ چونکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے مادی جسم کے ساتھ ہمیشہ زندہ نہیں رہ سکتے تھے۔ اس لئے آپ کو قیامت تک آنے والے لوگوں کے لئے نذیر قرار دیکر مسلمانوں کو اس طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ جب تک تم میں سے ہر شخص چھوٹا محمدؐ نہیں بن جاتا اور جب تک تم میں سے ہر فرد اس مقام پر کھڑا نہیں ہوجاتا کہ جب تم کو کوئی دیکھے تو وہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تصویر دیکھ لے اُسوقت تک تم دنیا کے انذار میں کامیاب نہیں ہوسکتے۔ تصویر کو دیکھ کر انسان دوسرے شخص کے معائب بھی معلوم کرسکتا ہے اور محاسن بھی۔ وہ دیکھ سکتا ہے کہ اس کی آنکھیں چھوٹی ہیں یا بڑی۔ اس کا چہرہ کیسا ہے۔ اُس کا سر چھوٹا ہے یا بڑا۔ اس کے اعضاء کا تناسب کیسا ہے؟ اگر کوئی شخص تصویر کو دیکھ کر یہ کہے کہ اس کا سر چھوٹا ہے تو تم یہ نہیں کہوگے کہ یہ تو تصویر ہے اصل نہیں۔ اگر تم یہ جواب دوگے تو ہر شخص تمہیں پاگل سمجھے گا۔ کیونکہ تصویر اصل انسان کا انعکاس ہوتا ہے۔ اسی طرح اگر تم صحیح طور پر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی تصویر نہیں بنتے تو تم باقی دنیا کو اعتراض کرنیکا موقعہ دیتے ہو لیکن اگر تم اپنی زندگیاں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی طرح بنالو تو تم تمام دنیا کے لئے نذیر بن جاؤ گے اُس وقت یہ سوال ہی نہیں ہوگا کہ تم پڑھے ہوئے ہو یا اَن پڑھ ہو۔ لائق ہو یا نالائق ہو۔ بلکہ ہر حالت میں تم دنیا پر غالب آؤ گے کیونکہ تمہارے وجود میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا نمونہ لوگوں کو نظر آرہا ہوگا۔

پس اس آیت میں تین چیزیں بیان کی گئی ہیں جن کو مدّنظر رکھے بغیر کبھی کامیابی حاصل نہیں ہوسکتی۔ اوّل یہ کہ اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ تمہارا انذار ہر قوم کی طرف ہو۔ اور ہر عیسائی یہودی ہندو سکھ بدھ اور زرتشتی تمہارا مخاطب ہو۔ اور تم اللہ تعالیٰ کے اُن بندوں کو جو ہدایت کا راستہ بھول چکے ہیں اللہ تعالیٰ کی طرف لے آؤ۔ اگر ایک ماں کے تین بچے گم ہو جائیں اور اُن میں سے دو کو تم واپس لے آؤ اور تیسرے کو دھتکار دو تو اُن دو کے لانے سے وہ تم پر پوری طرح خوش نہیں ہوگی بلکہ وہ کہے گی کہ وہ تیسرا بچہ بھی مجھے اسی طرح پیارا ہے جس طرح یہ دونوں پیارے ہیں۔ اس لئے جاؤ اور اُسے بھی ڈھونڈنے کی کوشش کرو۔ اسی طرح اگر تم دنیا کی دو ارب آبادی میں سے ایک ارب ننانوے کروڑ، ننانوے لاکھ، ننانوے ہزار، نو سو ننانوے کو بھی واپس لے آتے ہو لیکن ایک آدمی کو چھوڑ دیتے ہو اور اس کی طرف توجہ نہیں کرتے تو خدا تعالیٰ تم کو اس کے چھوڑنے پر یہ کہیگا کہ وہ بھی تو میرا بندہ تھا تم نے اُسے واپس لانے کی کیوں کوشش نہیں کی۔

دوسری بات جس کی طرف اس آیت میں توجہ دلائی گئی ہے وہ یہ ہے کہ قرآن کریم تمہارے دلوں اور دماغوں پر حاوی ہونا چاہیئے کیونکہ قرآن کریم کے لئے فتح مقدّر ہے۔ جب تم اپنے وجود کو قرآن کریم کے ساتھ وابستہ کر دوگے تو اللہ تعالیٰ تمہیں بھی فتح عطا فرمائیگا۔

تیسری بات اس میں یہ بتائی گئی ہے کہ جب تک تم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نقل نہیں کرتے اور آپ کے نقشِ قدم پر نہیں چلتے اور جب تک تم اپنے اپنے دائرہ میں چھوٹے محمدؐ بننے کی کوشش نہیں کرتے اُس وقت تک تم دنیا میں کامیاب نہیں ہوسکتے۔

پھر فرماتا ہے اَلَّذِیْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلَمْ يَتَّخِذْ وَلَدًا وَّلَمْ يَكُنْ لَّهٗ شَرِيْكٌ فِي الْمُلْكِ وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَّرَهٗ تَقْدِيْرًا۔ یعنی لوگوں کی نجات اور اُن کی اُخروی فلاح و بہبود کے لئے یہ عظیم الشان کتاب نازل کرنے والا وہ خدا ہے جس کے قبضہ و تصرّف میں آسمانوں اور زمین کی بادشاہت ہے جس نے نہ کوئی بیٹا بنایا ہے اور نہ اُس کی بادشاہت میں کوئی شریک ہے۔ اُس نے ہر ایک چیز کو پیدا کیا ہے اور پھر ہر چیز کے لئے اُس نے ایک اندازہ بھی مقرر کیا ہے جو زبانِ حال سے پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ خدا بڑی برکت والا ہے اور وہ ہر عیب اور نقص سے پاک ہے۔

چونکہ اسلام ایک ایسا مذہب تھا جس نے لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرًا کے ماتحت دنیا کے ہر مذہب اور ہر قوم کو مخاطب کرنا تھا اسلئے لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ فرما کر اللہ تعالیٰ نے اس طرف اشارہ فرمایا کہ اسلامی علماء کو دنیا کی تمام زبانیں سیکھنی چاہئیں۔ لیکن افسوس کہ سوائے کالجوں کے طالب علموں کے کوئی غیر زبان نہیں سیکھتا۔ اور وہ بھی صرف انگریزی سیکھتے ہیں جو ساری دنیا کی زبان نہیں۔ چاہیئے کہ ہمارے علماء۔ انگریزی۔ فرانسیسی جرمنی۔ روسی۔ پرتگیزی۔ ہسپانوی۔ لاطینی اور ولندیزی وغیرہ سب زبانیں جانتے ہوں۔ اسی طرح سیام کی زبان اور جاپان کی زبان اور فلپائن کی زبان اور دوسرے تمام ممالک کی زبانیں اُن کو آتی ہوں تاکہ ہر جگہ وہ قرآن کریم کو پھیلا سکیں۔ ہمارے احمدی مبلغین کو بھی اس طرف خاص طور پر توجہ کرنی چاہیئے۔ بعض مبلغ دس دس سال سے مغربی افریقہ میں کام کر رہے ہیں لیکن ابھی تک انہیں وہاں کی زبان پوری طرح نہیں آئی۔ زبان کا سیکھنا قرآن کریم کے پھیلانے کیلئے نہایت

ضروری ہے۔ جو مبلغ اس طرف توجہ نہیں کرتا وہ مبلغ کہلانے کا مستحق ہی نہیں۔ وہ اسلام کا ایک غدار سپاہی ہے عرب لوگ اسلام کی ترقی کے زمانہ میں دنیا کی ہر زبان جانتے تھے۔

پھر دنیا کے تمام مذاہب پر تبلیغی حملہ کرنے کے نتیجہ میں چونکہ لازمی طور پر مخالفت کا ایک طوفان اُمنڈ آنا تھا اس لئے اللہ تعالیٰ نے لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ کہکر مخالفوں کو بھی بتا دیا کہ دیکھو تم اپنی طاقت پر گھمنڈ مت کرو۔ بیشک تمہارے ساتھ بڑے بڑے جتھے ہیں۔ بڑے بڑے ملک تمہارے ساتھ ہیں بڑی بڑی حکومتیں تمہاری تائید میں ہیں لیکن آسمانوں اور زمین کی اصل حکومت خدا تعالیٰ کے قبضہ اور تصرف میں ہے۔ تمہارے پاس تو یہ حکومتیں محض ایک امانت کے طور پر ہیں اس لئے اگر تم نے اس امانت میں خیانت کی اور ہمارے اس پیغام کو ٹھکرا دیا تو یاد رکھو کہ زمین و آسمان کا خدا تمہارے اس انکار کو دیکھ کر خاموش نہیں رہیگا۔ بلکہ اس کی غیرت بھڑکیگی اور وہ تمہیں اس کی سزا دے گا۔ اور پھر اس کے ساتھ ہی اللہ تعالیٰ نے قرآن اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے والوں کو لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ کہہ کر یہ خوشخبری بھی دی ہے کہ ان کفار کے مظالم سے پریشان نہ ہونا۔ بیشک یہ تمہیں اپنے وطنوں سے بے وطن کردینگے تمہاری جائیدادیں چھین لیں گے تمہارے مال اور املاک کو اپنے قبضہ میں لے لیں گے مگر تمہاری یہ قربانیاں رائیگاں نہیں جائینگی بلکہ زمین و آسمان کا خدا تمہیں تخت و تاج کا وارث بنا دیگا اور اس طرح ساری دنیا پر ثابت ہو جائیگا کہ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ خدا تعالیٰ کے قبضہ و تصرف میں ہی ہے جس نے اس عالمگیر انذار سے فائدہ اٹھانیوالوں کو بادشاہ بنا دیا اور بادشاہوں کو ان کے انکار کی سزا میں گدا بنا دیا۔

پھر اَلَّذِیْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ فرما کر اللہ تعالیٰ نے اس طرف بھی اشارہ فرمایا کہ جسطرح خدا تعالیٰ کی ملکیت اور اس کا فیضان کسی ایک قوم یا ملک کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ زمین و آسمان کے ذرہ ذرہ پر اس کی حکومت ہے اسی طرح ضروری تھا کہ کسی وقت تمام قوموں اور افراد کو ایک نقطۂ مرکزی پر جمع کرنے کا بھی سامان پیدا کیا جاتا تاکہ جس طرح زمین و آسمان کا خدا ایک ہے اسی طرح وہ ساری دنیا کو ایک رُوحانی نقطہ پر بھی جمع کر دے۔ اگر قرآن کریم دنیا میں نہ آتا اور وہ ساری دنیا کو مخاطب نہ کرتا تو ایک عالمگیر رُوحانی بادشاہت کا کبھی قیام نہ ہو سکتا۔ بیشک ابتدائی زمانوں میں جب آمد و رفت کے ذرائع محدود تھے اور ایک ملک کی آواز دوسرے ملک میں نہیں پہنچ سکتی تھی ضروری تھا کہ مختلف ممالک اور مختلف اقوام میں اُس کے ہادی اور رہنما آتے تاکہ دُنیا کا کوئی خطّہ اُسکی ہدایت سے محروم نہ رہتا مگر جب ممالک آباد ہونے شروع ہوئے اور آبادیوں کے فاصلے کم ہوتے چلے گئے اور نسلِ انسانی نے دماغی لحاظ سے بھی ارتقاء شروع کیا اور ذرائع آمد و رفت میں بھی ترقی ہونے لگی بیلوں کی جگہ گدھوں نے لے لی اور موٹروں اور ریلوں کی جگہ ہوائی جہازوں نے لے لی اور زمین کی طنابیں بالکل کھچ گئیں اور پھر ہوائی جہازوں نے ترقی کرتے کرتے ایسا مقام حاصل کر لیا کہ بارہ گھنٹہ میں ساری دنیا کا چکّر لگ سکتا ہے۔ بلکہ تازہ اطلاع تو یہ ہے کہ اب ایک ایسا ہوائی جہاز بھی نکل آیا ہے جو ایک سیکنڈ میں پندرہ میل چل سکتا ہے گویا ایک منٹ میں نوسو میل اور ایک گھنٹہ میں ۵۴ ہزار میل اور بارہ گھنٹہ میں چھ لاکھ اڑتالیس ہزار میل۔ جس کے معنے یہ ہیں کہ

بارہ گھنٹے میں وہ کئی دفعہ دنیا کا چکر لگا سکتا ہے تو ایسی صورت میں اللہ تعالیٰ نے ایک عالمگیر بادشاہت کا قیام محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ فرما دیا۔ اگر قرآن نازل نہ ہوتا تو دنیا پر خدا تعالیٰ کی ملکیت اپنی پوری شان سے ظاہر نہ ہوسکتی۔ دریا کی شان اُسی صورت میں ظاہر ہوتی ہے جب پہاڑی نالے اُس میں گر کر اُسے ایک بحرِ ذخار کی صورت میں تبدیل کر دیں۔ موسیٰؑ اور عیسیٰؑ اور زرتشت اور کرشن اور دوسرے تمام انبیاء چھوٹی چھوٹی نہریں تھیں جن میں سے کوئی نہر بنی اسرائیل کی سیرابی کے لئے جاری کی گئی تو کوئی ایران کی پیاس بجھانے کے لئے جاری کی گئی۔ کوئی ہندوستان کے لوگوں کی تشنہ لبی فرو کرنے کے لئے اُن کے ملک میں جاری کی گئی۔ تو کوئی چین کی سرزمین میں وہاں کے باشندوں کی روحانی پیاس بجھانے کے لئے جاری کی گئی مگر ان تمام نالوں اور نہروں کا ایک عظیم الشان دریا میں مل جانا ضروری تھا تاکہ جس طرح زمین و آسمان کی بادشاہت خدا تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے اسی طرح ایک عالمگیر روحانی بادشاہت کا بھی نظارہ نظر آتا اور لوگوں کو رب العالمین خدا کے آستانہ کی طرف کھینچ جاتا۔ پس اَلَّذِیْ لَہٗ مُلْکُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ درحقیقت لِیَکُوْنَ لِلْعٰلَمِیْنَ نَذِیْرًا کی اور اس میں بتایا گیا ہے کہ قرآن کریم کا نزول بلا وجہ نہیں بلکہ یہ الٰہی سکیم کا ایک اہم حصّہ ہے جسے کسی صورت میں بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ خدا تعالیٰ چاہتا تھا کہ وہ تمام سابق شرائع کو منسوخ کر کے اب ایک ایسی شریعت نازل کرے جو تمام عالم کو ایک نقطۂ مرکزی پر جمع کرنے والی ہو اور اس کے لئے ضروری تھا کہ ایسی سواریاں ایجاد ہو جائیں جو ساری دنیا کی طنابیں کھینچ لیں۔ چنانچہ قرآن کریم نے گھوڑوں اور خچروں اور گدھوں کا ذکر کر کے فرما دیا تھا کہ وَیَخْلُقُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ (نحل ع ۱) یعنی اللہ تعالیٰ آئندہ زمانہ میں ایسی سواریاں پیدا کرنے والا ہے جو تمہارے وہم و گمان میں بھی نہیں ہیں اور اس طرح دنیا کو ایک نقطۂ مرکزی پر جمع کرنے والا ہے مگر چونکہ یہ عالمگیر مذہب کا تصوّر اور خدائے واحد کی زمین و آسمان کے ذرّہ ذرّہ پر حکومت کا عقیدہ اُن مذاہب میں کھلبلی ڈالنے والا تھا جو ابنیّت کے قائل تھے یا نبیوں کو خدا تعالیٰ کا شریک قرار دیتے تھے اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس کے ساتھ ہی ان باطل مذاہب کے خیالات کی بھی تردید کی اور فرمایا وَلَمْ یَتَّخِذْ وَلَدًا۔ خدا تعالیٰ کی آسمان اور زمین کے ذرّہ ذرّہ پر حکومت تو ہے مگر یہ خیال درست نہیں کہ اُس کا کوئی بیٹا ہے جو اُس کی مدد کرتا ہے۔ بلکہ بیٹا ہونا تو الگ رہا وہ بیٹے کے مقام پر بھی کسی کو کھڑا نہیں کرتا یعنی اس حد تک بھی اس کو اپنے ساتھ مشابہت نہیں دیتا جسقدر کہ بیٹے کو اپنے باپ سے مشابہت ہوتی ہے۔

اِس میں کوئی شبہ نہیں کہ عیسائی حضرت مسیحؑ کو خدا تعالیٰ کے بیٹے کی شکل میں پیش کرتے ہیں لیکن حضرت مسیحؑ کی تاریخ اتنی مبہم ہے اور اس پر اتنے حجاب پڑے ہوئے ہیں کہ مسیحیت کی تعلیم کی صداقت عقلی طور پر قیاس میں بھی نہیں آسکتی سوائے اس کے کہ اس تعلیم کے مطابق عیسائیوں میں ایسے لوگ موجود ہوں جن کو دیکھ کر اس تعلیم کی سچائی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہو لیکن ایسے نمونے نہ عیسائی دنیا میں موجود ہیں اور نہ آئندہ پیدا ہو سکتے ہیں۔ مثلاً حضرت مسیحؑ نے کہا تھا کہ

"اگر تم میں رائی کے دانے کے برابر بھی ایمان ہوگا تو اس پہاڑ سے کہہ سکو گے کہ

پھر کہ کہ وہاں چلا جا۔ اور وہ چلا جائیگا
اور کوئی بات تمہارے لئے ناممکن نہ ہوگی"
(متی باب ۱۷ آیت ۲۰)

اب اگر عیسائیوں کے قول کے مطابق حضرت مسیحؑ مُردے زندہ کیا کرتے تھے (یوحنا باب ۱۱ آیت ۴۳ و ۴۴) اور اُن کے دلوں میں مسیحؑ پر ایک رائی کے برابر بھی ایمان پایا جاتا ہے تو اُن کا فرض ہے کہ وہ مسیحؑ کی ابنیت ثابت کرنے کے لئے مُردے زندہ کر کے دکھائیں۔ اور اگر مسیحؑ بغیر کشتی اور جہاز کے پانی پر چلتے تھے (متی باب ۱۴ آیت ۲۵) تو عیسائی بھی جہازوں کے بغیر سمندروں پر چل کر دکھائیں۔ مگر وہ ایسا کبھی نہیں کر سکتے جس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ نہ تو اُن کے دلوں میں حضرت مسیحؑ پر کوئی ایمان ہے اور نہ وہ انجیلی تعلیم کی صداقت کا دنیا کے سامنے کوئی نمونہ پیش کر سکتے ہیں۔ بس اُن کا یہ کہنا کہ مسیحؑ خدا کا بیٹا تھا ایک زبانی دعوے سے زیادہ کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ لیکن اس کے علاوہ یہ امر خدا تعالیٰ کی عظمت اور اس کی شان کے بھی بالکل منافی ہے کیونکہ بیٹے کی ضرورت اُسی وقت تسلیم کی جا سکتی ہے جب خدا تعالیٰ کے لئے فنا کا امکان ہو لیکن اگر اس کے لئے فنا ہی نہیں تو ابنیت کا مسئلہ کس طرح درست ہو سکتا ہے اس مادی عالم میں دیکھ لو کہ سورج اور چاند اور پہاڑ اور دریا وغیرہ کے ساتھ بیٹوں کا سلسلہ جاری نہیں کیا گیا۔ کیونکہ انہوں نے اپنی ضرورت کے پورا ہونے تک خود قائم رہنا ہے لیکن انسان چونکہ فانی وجود ہے اس لئے اُسے بیوی کی بھی ضرورت ہوتی ہے اور بچوں کی خواہش بھی اس کے دل میں پائی جاتی ہے۔ اور جب کسی کے ہاں بچہ پیدا ہوتا ہے تو لوگ اُسے مبارک باد دیتے ہیں کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ اُس کے نام کو قائم رکھنے کا اللہ تعالیٰ نے سامان پیدا فرما دیا ہے لیکن خدا تعالیٰ کے متعلق اس قسم کی کوئی بات تسلیم نہیں کی جا سکتی اسلئے ایک زندہ اور حیّ و قیّوم خدا کو تسلیم کرتے ہوئے کسی کو خدا کا بیٹا قرار دینا ایک نہایت ہی جاہلانہ اور خدا تعالیٰ کی ہتک کرنیوالا عقیدہ ہے۔

پھر فرماتا ہے وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ شَرِيْكٌ فِي الْمُلْكِ ایک اور امتیاز اس کے اندر یہ پایا جاتا ہے کہ اس کی بادشاہت میں اَور کوئی شریک نہیں۔ دنیوی بادشاہوں کا تو یہ حال ہوتا ہے کہ کہیں بادشاہوں کے خلاف اُن کی بیگمات جوڑ توڑ کر رہی ہوتی ہیں۔ کہیں شہزادے اپنے باپ کا تخت حاصل کرنے کے لئے اُسے قتل کرنے کے منصوبے سوچ رہے ہوتے ہیں۔ کہیں وزراء اور امراء اس کے خلاف سازشیں کر رہے ہوتے ہیں اور موقعہ ملتے ہی وہ اُن کی حکومت کا تختہ اُلٹ دیتے ہیں مگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے جو فرقان نازل کیا اُس میں اس نے بنی نوع انسان کو یہ خوشخبری دی کہ دیکھو کہ تمہارا خدا وہ ہے کہ جس کے قبضہ و تصرف میں زمین آسمان کا ذرہ ذرہ ہے اور پھر نہ اس کا کوئی بیٹا ہے اور نہ اس کی مملکت میں کوئی اور شریک ہے کہ تمہیں اُدھر بیٹے کی چاپلوسی کرنی پڑتی اُدھر بیگمات کی خوشامدیں کرنی پڑتیں۔ اُدھر وزراء اور امراء کو خوش کرنے کیلئے کئی قسم کے پاپڑ بیلنے پڑتے۔ تمہارا خدا وحدہٗ لاشریک ہے اور اسکی محبت کسی اَور کے ساتھ بٹی ہوئی نہیں نہ کوئی جابر حاکم اس کی بادشاہت میں شریک ہے کہ تمہیں اس کو خوش کرنے کا فکر ہو۔ تمہیں اکیلے اور واحد خدا کی پرستش کا حکم دیا گیا ہے۔ پس تمہارا سر ہر حالت میں اُس کے آستانہ پر جھکا رہنا چاہیئے اور اُسی کی آواز پر لبیک کہنا تمہارا شعار ہونا چاہیئے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ اپنی واحدانیت کے ثبوت میں اس قانون کو پیش کرتا ہے۔ جو ساری دنیا میں جاری ہے اور فرماتا ہے۔ وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَّرَهٗ تَقْدِيْرًا۔ اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کو پیدا کیا ہے۔ اور پھر اس کے لئے ایک اندازہ مقرر کر دیا ہے جس کے ماتحت وہ ترقی کرتی جاتی ہے۔ چنانچہ دیکھ لو

اگر ہر چیز کا اللہ تعالیٰ پہلے سے ایک اندازہ مقرر نہ کرتا تو انسان کو نہ دنیا میں کوئی ترقی حاصل ہو سکتی اور نہ دینی معاملات میں وہ سکھ پا سکتا۔ ایک زمیندار جو گھر سے دانہ لے جا کر زمین میں ڈالتا ہے صرف اس لئے ڈالتا ہے کہ خدا نے یہ قانون مقرر کر دیا ہے کہ جب دانہ زمین میں ڈالا جائے تو اُس کے اُگنے سے کئی دانے پیدا ہو جائیں۔ لیکن اگر یہ قاعدہ مقرر نہ ہوتا۔ بلکہ اس طرح ہوتا کہ زمیندار کو گندم کی ضرورت ہوتی اور وہ گندم بوتا تو کبھی تو گندم نکل آتی کبھی کیکر اُگ آتا اور کبھی انگور کی بیل نکل آتی۔ تو کچھ مدت کے بعد زمیندار اس بونے کے فعل کو لغو سمجھ کر بالکل چھوڑ دیتا اور اپنی محنت کو ضائع خیال کرتا۔ اسی طرح اب تو سنار کو یقین ہے کہ سونا جب آگ میں ڈالوں گا تو پگھل جائیگا اور پھر جس طرح چاہونگا زیور بنا لوں گا۔ لیکن اگر ایسا نہ ہوتا بلکہ یہ ہوتا کہ سنار کو کوئی شخص کڑے بنانے کیلئے سونا دیتا اور جب وہ اسے پگھلاتا تو چاندی نکل آتی یا کوئی چاندی دیتا تو وہ پیتل نکل آتی کیونکہ کوئی قاعدہ مقرر نہ ہوتا تو کیا حالت ہوتی؟ یہی کہ وہ اس کام سے آئندہ کیلئے توبہ کر لیتا۔ اسی طرح اگر لوہار لوہے کو گرم کر کے اس پر ہتھوڑا مارتا کہ اسے لمبا کرے۔ تو وہ کبھی تو خود بن جاتا کبھی ہاون کی شکل اختیار کر لیتا۔ یا وہ کدال بناتا تو تلوار بن جاتی اور اُسے پولیس پکڑ لیتی کہ ہتھیار بنانیکی اجازت تم کو کس نے دی ہے۔ یا اسی طرح ڈاکٹر بخار اتارنے کی دوائی دیتا اور اُس سے کھانسی ہو جاتی۔ تو ڈاکٹروں کی کون سنتا۔ اب تو کسی کو کھانسی ہو تو ایک زمیندار بھی کہتا ہے کہ اسے بنفشہ پلا دو کیونکہ تجربہ نے بتا دیا ہے کہ اس سے کھانسی کو فائدہ ہوتا ہے۔ لیکن اگر کوئی قانون مقرر نہ ہوتا بلکہ یہ ہوتا کہ کبھی بنفشہ پلانے سے کھانسی ہو جاتی اور کبھی بخار چڑھ جاتا کبھی قبض ہو جاتی اور کبھی دست آ جاتے کبھی بھوک بند ہو جاتی اور کبھی زیادہ ہو جاتی تو کون بنفشہ پلاتا۔ بنفشہ تب ہی پلایا جاتا ہے کہ خدا تعالیٰ نے یہ قانون مقرر کر دیا ہے کہ اس سے فلاں قسم کی کھانسی کو فائدہ ہوگا۔ اسی طرح زمیندار تب ہی غلہ گھر سے لا کر زمین میں ڈالتا ہے کہ اُسے یقین ہوتا ہے کہ گیہوں سے گیہوں پیدا ہوگا۔ اگر اسے یہ یقین نہ ہوتا تو کبھی نہ ڈالتا۔ وہ کہتا نہ معلوم کیا پیدا ہو جائیگا میں کیوں اس غلہ کو ضائع کروں لیکن اب وہ اسی لئے مٹی کے نیچے بیسیوں من گندم کے دانوں کو دبا دیتا ہے کہ خدا تعالیٰ نے یہ تقدیر مقرر کی ہوئی ہے کہ گندم سے گندم پیدا ہو اور ایک دانے سے سو دانے تک پیدا ہوں۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ۔ اسی طرح روٹی کھانے سے پیٹ بھرتا ہے۔ لیکن اگر ایسا ہوتا کہ کبھی ایک لقمہ سے پیٹ بھر جاتا اور کبھی انسان سارا دن روٹی کھاتا رہتا تب بھی پیٹ نہ بھرتا تو پھر کس کو ضرورت تھی کہ کھانا کھاتا۔ اور کیوں روپیہ ضائع کرتا۔ یا گھر میں آگ جلانے سے کھانا پکایا جاتا ہے لیکن اگر یہ ہوتا کہ کبھی سارا دن پھلکا توے پر پڑا رہتا اور آگ جلتی رہتی لیکن وہ پھلکے کا گیلا ہی رہتا۔ اور کبھی آٹا ڈالتے ہی جل جاتا۔ اور کبھی سینک لگنے سے پھلکا پکنے لگتا اور کبھی موٹا ہو کر ڈبل روٹی بن جاتا تو کون پھلکے پکانے کی جرأت کرتا۔ اسی طرح کبھی ساگ کچا رہتا اور کبھی پک جاتا تو کون پکاتا۔ یا اب تو ہر شخص جانتا ہے کہ کھانڈ ڈالنے سے چیز میٹھی ہو جاتی ہے۔ لیکن اگر ایسا ہوتا کہ کبھی کھانڈ ڈالنے سے چیز میٹھی ہو جاتی کبھی کڑوی ہو جاتی کبھی نمکین ہو جاتی اور کبھی کھٹی یا کسیلی ہو جاتی اور کبھی کسی اور مزے کی ہو جاتی تو کیا کوئی کھانڈ استعمال کر سکتا۔ غرض جس قدر کارخانہ عالم چل رہا

اس کی ایک ہی وجہ ہے اور وہ مسئلہ تقدیر ہے۔ خدا تعالیٰ نے قانون مقرر کر دیا ہے کہ میٹھا میٹھے کا مزا دے۔ تُرش تُرش کا مزا دے۔ آگ سے کھانا پکے۔ روٹی سے پیٹ بھرے۔ اور لوگوں نے تجربہ کر لیا ہے کہ یہ درست ہے۔ اس لئے وہ ان باتوں کے لئے روپیہ صرف کرتے اور محنت برداشت کرتے ہیں۔ اگر خواص الاشیاء پر انسان کا یقین نہ ہو تو وہ سب کوششیں چھوڑ دے اور تمام کارخانۂ عالم باطل ہو جائے۔

پھر یہی تقدیر ہستیٔ باری تعالیٰ کا بھی ایک زبردست ثبوت ہے۔ کیونکہ کوئی صنعت صانع کے بغیر نہیں بن سکتی ایک عمدہ تصویر کو دیکھکر فوراً خیال ہوتا ہے کہ یہ کسی بڑے مصوّر نے بنائی ہے۔ ایک عمدہ تحریر کو دیکھ کر فوراً سمجھا جاتا ہے کہ کسی مشہور کاتب نے لکھی ہے اور جسقدر ربط بڑھتا چلا جائے اسی قدر اس کے بنانے یا لکھنے والے کی خوبی اور بڑائی ذہن نشین ہوتی جاتی ہے پھر کیونکر تصوّر کیا جا سکتا ہے کہ ایسی منظم دنیا خود بخود اور یونہی پیدا ہو گئی ہے۔ چنانچہ دیکھ لو۔ جہاں انسان میں ترقی کرنے کے قویٰ موجود ہیں۔ وہاں اُسے اپنے خیالات کو عملی صورت میں لانے کے لئے عقل دی گئی ہے اور اس کا جسم بھی اُس کے مطابق بنایا گیا ہے۔ چونکہ اُس نے محنت سے رزق کمانا تھا اس لئے اللہ تعالیٰ نے اُسے ایسے قویٰ دیئے کہ جن سے چل پھر کر وہ اپنا رزق پیدا کر لے۔ درخت کا رزق اگر زمین میں رکھا تو اُسے جڑیں دیں کہ وہ اس کے اندر سے اپنا پیٹ بھرے۔ اگر شیر کی خوراک گوشت رکھی تو اُسے شکار مارنے کے لئے ناخن دیئے اور اگر گھوڑے اور بیل کے لئے گھاس کھانا مقدّر کیا تو اُن کو ایسی گردن دی جو جھک کر گھاس پکڑ سکے۔ اور اگر اونٹ کیلئے درختوں کے پتّے اور کانٹے مقرر کئے تو اس کی گردن بھی اونچی بنائی کیا یہ سب کارخانہ اتفاق سے ہُوا ہے؟ کیا اتفاق نے اس بات کو معلوم کر لیا تھا کہ اونٹ کو گردن لمبی دوں؟ اور شیر کو پنجے اور درخت کو جڑیں اور انسان کو ٹانگیں دوں؟ کیا یہ سمجھ میں آسکتا ہے کہ جو کام خود بخود ہو گیا اس میں اس قدر انتظام رکھا گیا ہو؟ پھر اگر انسان کیلئے پھیپھڑا بنایا تو اس کے لئے ہوا بھی پیدا کی۔ اگر پانی پر اس کی زندگی کا مدار رکھا تو سورج کے ذریعے بادلوں کی معرفت اُسے پانی پہنچایا اور اگر آنکھیں دیں۔ تو اُن کے کارآمد بنانے کے لئے سورج کی روشنی بھی رکھی تاکہ وہ اس کے ذریعہ دیکھ سکے۔ کان دیئے تو ساتھ اس کے خوبصورت آوازیں بھی پیدا کیں۔ زبان کے ساتھ ذائقہ دار چیزیں بھی عطا فرمائیں۔ ناک پیدا کیا تو خوشبو بھی مہیّا کر دی۔ ممکن تھا کہ اتفاق انسان میں پھیپھڑا پیدا کر دیتا۔ لیکن اس کے لئے ہوا کا سامان کیونکر پیدا ہو گیا۔ اور ممکن تھا کہ انسان کی آنکھیں پیدا ہو جاتیں لیکن یہ عجیب اتفاق تھا کہ جس نے کروڑوں میلوں پر جا کر ایک سورج بھی پیدا کر دیا تاکہ وہ اپنا کام کر سکیں۔ اگر ایک طرف اتفاق نے کان پیدا کر دیئے تھے تو کونسی طاقت تھی جس نے دوسری طرف آواز بھی پیدا کر دی۔ برفانی ممالک میں مان لیا کہ کتّے یا ریچھ کو اتفاق نے پیدا کر دیا لیکن اس کا کیا سبب ہے کہ اُن کتّوں یا ریچھوں کے بال اتنے لمبے بن گئے کہ وہ سردی سے محفوظ رہ سکیں۔ اتفاق ہی نے ہزاروں بیماریاں پیدا کیں۔ اتفاق ہی نے اُن کے علاج بنا دیئے۔ اتفاق ہی نے بچھو بوٹی بنائی جس کے چھونے سے خارش ہونے لگ جاتی ہے اور اُسی نے اس کے ساتھ پالک کا پودا اُگا دیا کہ اس کا علاج ہو جائے دہریوں کا اتفاق بھی عجیب ہے کہ جن چیزوں کیلئے موت تجویز کی اُن کے ساتھ توالد تناسل کا سلسلہ بھی قائم کر دیا۔ اور جن چیزوں کے ساتھ موت نہ تھی

وَاتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اٰلِهَةً لَّا يَخْلُقُوْنَ شَيْـًٔا وَّهُمْ

اور ان لوگوں نے اس (یعنی خدا) کے سوا معبود بنا چھوڑے ہیں جو کچھ (بھی) پیدا نہیں کرتے حالانکہ وہ خود

يُخْلَقُوْنَ وَلَا يَمْلِكُوْنَ لِاَنْفُسِهِمْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا

پیدا کئے جاتے ہیں اور جو اپنی ذات کے لئے نہ کسی ضرر پر قادر ہیں نہ نفع پر

وَّلَا يَمْلِكُوْنَ مَوْتًا وَّلَا حَيٰوةً وَّلَا نُشُوْرًا ④

نہ موت کے مالک ہیں اور نہ زندگی کے اور نہ پھر جی اُٹھنے کے ۵۳

وہاں یہ سلسلہ ہی نہ رکھا۔ انسان نے چونکہ مرنا تھا اسلئے اس کے ساتھ توالد اور تناسل کا سلسلہ لگا دیا لیکن سورج اور چاند اور زمین نہ نئے پیدا ہوتے اور نہ اگلے فنا ہوتے ہیں اس لئے اُن کے ساتھ یہ سلسلہ نہ رکھا۔ پھر کیا یہ انتظام کچھ کم تعجب انگیز ہے کہ زمین اور سورج میں چونکہ کشش ہے اس لئے ان کو ایک دوسرے سے اتنی دُور رکھا کہ آپس میں ٹکرا نہ جائیں۔ کیا یہ باتیں اس بات پر دلالت نہیں کرتیں کہ ان سب چیزوں کا ایک خالق ہے جو نہ صرف علیم ہے بلکہ غیر محدود علم والا ہے اور اس کے قواعد ایسے منضبط ہیں کہ اُن میں کہیں بھی رخنہ نظر نہیں آتا۔

سلطنتوں میں ہزاروں مدبر اُن کی درستی کے لئے دن رات لگے رہتے ہیں لیکن پھر بھی ہم دیکھتے ہیں کہ اُن سے ایسی غلطیاں سرزد ہوتی ہیں کہ جن سے سلطنتوں کو خطرناک نقصان پہنچ جاتا ہے۔ بلکہ بعض اوقات تو وہ بالکل تباہ ہو جاتی ہیں۔ لیکن اگر اس دنیا کا کاروبار صرف اتفاق پر ہے تو تعجب ہے کہ ہزاروں دانا دماغ تو غلطی کرتے ہیں لیکن یہ اتفاق غلطی نہیں کرتا۔ مگر سچی بات وہی ہے جو قرآن کریم نے بیان کی ہے کہ اس کائنات کا ایک خالق ہے جس نے یہ تمام نظام جاری کیا ہوا ہے۔ چنانچہ جس طرف نظر دوڑا کر دیکھو تمہیں معلوم ہوگا کہ ہر ایک چیز اپنا مفوضہ کام کر رہی ہے اور یہی تقدیر ہے جو خدا تعالیٰ کی ہستی کا ایک زبردست ثبوت ہے۔

نُشُوْرًا

۵۳ حل لغات۔ نُشُوْرًا : نَشَرَ کا مصدر ہے اور نَشَرَ اللّٰهُ الْمَوْتٰى کے معنے ہیں۔ اَحْيَاهُمْ۔ اللہ تعالیٰ نے مردوں کو زندہ کیا۔ پس نُشُوْرًا کے معنے ہونگے موت کے بعد زندہ ہونا (اقرب)

تفسیر:۔ فرماتا ہے کفار کی عقل تو ایسی ماری گئی ہے کہ انہوں نے خدا کے سوا اور معبود بنا لئے ہیں۔ جو پیدا تو کچھ نہیں کرتے ہاں آپ پیدا کئے جاتے ہیں اور خود اپنی ذات کے لئے بھی ضرر اور نفع کی کوئی طاقت نہیں رکھتے اور نہ موت اور زندگی اور دوبارہ جی اُٹھنا اُن کے ہاتھ میں ہے۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے معبودانِ باطلہ کی تردید میں بعض اور دلائل دیئے ہیں۔ فرماتا ہے کہ نہیں پہلی بات تو یہ سمجھنی چاہیئے کہ خدا تعالیٰ کے لئے خالق ہونا ضروری ہے۔ مگر یہ لوگ جن کو معبود قرار دیتے ہیں اُن میں سے کسی کے متعلق بھی ثابت نہیں کرسکتے کہ وہ خالق تھا۔ عیسائیوں نے

حضرت مسیحؑ کی طرف اِس قسم کے معجزات تو منسوب کر دیئے ہیں کہ وہ مُردے زندہ کر دیا کرتے تھے لیکن انہیں خالق قرار دینے کی عیسائیوں کو بھی جرأت نہیں ہوئی البتہ مسلمانوں میں سے بعض نادانوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ حضرت مسیحؑ پرندے پیدا کیا کرتے تھے حالانکہ اگر وہ پرندے پیدا کیا کرتے تھے تو پھر وہ پرندے ہیں کہاں؟ اور آیا اُن کی نسل بھی چلی تھی یا نہیں؟ اور اگر چلی تھی تو یہ کیونکر پتہ لگ سکتا ہے کہ فلاں پرندے مسیحؑ کے پیدا کردہ ہیں اور فلاں خدا کے۔ بہرحال خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ سب ڈھکوسلے ہیں۔ اِن معبودانِ باطلہ میں سے کوئی بھی ایسا نہیں جس نے کوئی چیز پیدا کی ہو پس انہیں معبود قرار دینا اپنی حماقت اور نادانی کا ثبوت پیش کرنا ہے۔

دوسری دلیل اللہ تعالیٰ نے یہ دی کہ وہ نہ صرف خالق نہیں بلکہ مخلوق ہیں۔ یعنی وہ خود پیدا کئے گئے ہیں اور جن میں اس قدر احتیاج الی الغیر پائی جاتی ہو کہ جب تک کوئی اور ہستی انہیں پیدا نہ کرتی وہ اس دنیا میں آبھی نہیں سکتے تھے۔ انہوں نے خدائی کیا کرنی ہے کیا خدا تعالیٰ کو بھی کوئی پیدا کیا کرتا ہے؟ اور جب ہمیں نظر آتا ہے کہ جن ہستیوں کو یہ لوگ خدا تعالیٰ کا شریک قرار دیتے ہیں۔ وہ سب کی سب مخلوق ہیں۔ حضرت مسیحؑ بھی مریم کے پیٹ سے پیدا ہوئے۔ اور بہاء اللہ جن کو مدعی اُلوہیت قرار دیا جاتا ہے۔ وہ بھی ماں کے پیٹ سے پیدا ہوئے۔ اسی طرح وہ تمام پیر اور فقیر اور سجادہ نشین جن کی قبروں پر سجدہ کیا جاتا ہے وہ بھی اپنی اپنی ماؤں کے پیٹ سے ہی پیدا ہوئے تو وہ خدا کس طرح ہوئے؟ یا اُن کی قبروں پر سجدہ کرنا کس طرح جائز ہو گیا؟

پھر ایک اور دلیل اللہ تعالیٰ اُن کے خلاف دیتا ہے اور فرماتا ہے کہ یہ لوگ جن کو تم معبود قرار دیتے ہو ان کی تو یہ حالت ہے کہ زندگی بھر نہ تو اُن میں یہ طاقت تھی کہ کسی دُکھ اور تکلیف سے اپنی خدائی کی وجہ سے بچ سکتے اور نہ اُن میں یہ طاقت تھی کہ بغیر خارجی ذرائع کی امداد کے کوئی نفع حاصل کر سکتے۔ اگر یہ دُکھوں سے بچتے تھے تو بیرونی ذرائع کی امداد سے اور اگر نفع حاصل کرتے تھے تو بیرونی اسباب کے ذریعہ۔ پھر جو لوگ اِس قدر کمزور تھے کہ وہ بات بات میں دوسرے ذرائع اور اسباب کے محتاج تھے اُنکو خدا قرار دینا کتنی کوتاہ عقلی اور نادانی کا ثبوت پیش کرنا ہے۔ حضرت مسیح ناصری کو ہی دیکھ لو۔ اگر صلیب سے بچنے کی اُن میں طاقت ہوتی تو دشمن انہیں صلیب پر کیوں چڑھاتا۔ اور کیوں انہیں کہنا پڑتا کہ

"ایلی ایلی لما سبقتنی یعنی اے میرے خدا اے میرے خدا: تُو نے مجھے کیوں چھوڑ دیا۔" (متی باب ۲۷ آیت ۴۶)

اور اگر اپنے لئے وہ ہر قسم کا آرام اور فائدہ اپنے زورِ بازو سے حاصل کر سکتے تھے تو جب شیطان انہیں جنگل میں آزمانے کے لئے لے گیا تو وہ چالیس دن بھوکے کیوں رہے اور کیوں انہوں نے یہ کہا کہ

"آدمی صرف روٹی ہی سے جیتا نہ رہیگا بلکہ بات سے جو خدا کے مُنہ سے نکلتی ہے۔" (متی باب ۴ آیت ۴)

اگر اُن میں یہ طاقت تھی کہ وہ اپنے آپ کو فائدہ پہنچا سکتے تو چالیس دن کا فاقہ انہیں کیوں برداشت کرنا پڑتا؟ حقیقت تو یہ ہے کہ یہ ایک کشف تھا جس کو عیسائیوں نے ظاہر پر محمول کر لیا۔ ورنہ اگر وہ حضرت مسیحؑ کو واقعہ میں پہاڑ پر لے جاتا تو لوگوں کو شیطان بھی نظر آتا اور اُن کا پہاڑ پر جانا بھی نظر آتا اور پھر حواری انکو اکیلا کس طرح چھوڑ دیتے لازماً وہ بھی ساتھ جاتے۔ پس درحقیقت یہ ایک کشف یا خواب کا نظارہ تھا جس کو ظاہر پر محمول کر کے مضحکہ خیز

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اِفْكُ ِۨ افْتَرٰىهُ وَ

اور کافر کہتے ہیں کہ یہ تو صرف ایک جھوٹ ہے جو اس نے بنا لیا ہے اور

اَعَانَهٗ عَلَيْهِ قَوْمٌ اٰخَرُوْنَ ۚۛ فَقَدْ جَآءُوْ ظُلْمًا

اس کے بنانے پر ایک اور قوم نے اس کی مدد کی ہے۔ پس ان لوگوں نے (یہ بات کہہ کر) بہت بڑا ظلم کیا ہے

وَّ زُوْرًا ۝۵ وَقَالُوْٓا اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ اكْتَتَبَهَا

اور بہت بڑا جھوٹ بولا ہے۔ اور وہ کہتے ہیں کہ یہ (قرآن) تو پہلوں کی باتیں ہیں جو اس نے کسی سے لکھوا لی ہیں

فَهِيَ تُمْلٰى عَلَيْهِ بُكْرَةً وَّ اَصِيْلًا ۝۶ قُلْ اَنْزَلَهُ

اور اب وہ صبح شام اس کے سامنے پڑھ کر سنائی جاتی ہیں (تاکہ وہ قرآن اچھی طرح لکھ لے) تو کہدے کہ اس (قرآن) کو تو

بنا دیا گیا ہے۔

اسی طرح حضرت مسیح نے ایک موقعہ پر کہا کہ

"لومڑیوں کے بھٹ ہوتے ہیں اور ہوا کے پرندوں کے گھونسلے مگر ابن آدم کے لئے سر دھرنے کی بھی جگہ نہیں۔"

(متی باب ۸ آیت ۲۰)

اس فقرہ میں بھی حضرت مسیح نے اپنے عجز اور بیچارگی کا اقرار کیا ہے اور بتایا ہے کہ میرے لئے تو دنیا میں سر چھپانے کی بھی جگہ نہیں اور جس شخص کی یہ کیفیت ہو۔ اس کے متعلق یہ کس طرح تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے اندر خدائی صفات رکھتا تھا۔

پھر فرماتا ہے وَلَا يَمْلِكُوْنَ مَوْتًا وَّلَا حَيٰوةً وَّلَا نُشُوْرًا۔ یہ لوگ نہ تو موت کے مالک ہیں نہ زندگی کے اور نہ پھر جی اٹھنے کے۔ موت و حیاۃ کے لحاظ سے اشیاء کے تین درجے ہی ہوتے ہیں (۱) عدم حیات یعنی موت۔ (۲) حیات بالقوۃ یعنی حیات۔ (۳) حیات بالفعل یعنی نشور۔ مگر چونکہ یہاں معبودان باطلہ کا رد کیا جا رہا ہے اس لئے وَلَا يَمْلِكُوْنَ مَوْتًا میں اس طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ اگر یہ لوگ اپنے اندر خدائی طاقتیں رکھتے تو کم از کم موت سے ہی بچ جاتے مگر ان میں سے ہر معبود کہلانے والا موت کا شکار ہوا اور عیسائیوں نے تو اپنے بنیادی عقیدوں میں ہی شامل کر لیا کہ مسیح تین دن مرکر جہنم میں رہا (۲۔ پطرس باب ۳ آیت ۱۸، ۲۰ و تفسیر بائبل مصنفہ میتھیو پول جلد ۳ صفحہ ۹۱۱) پس جب موت کے زبردست ہاتھ سے بھی ان کی روحیں آزاد نہیں تھیں تو وہ خدا کس طرح ہوئے۔ پھر انکی زندگیوں کو دیکھو تو قدم قدم پر معلوم ہو گا کہ وہ ایک بالا قانون کے تابع تھے اور تمام بنی نوع انسان کی طرح کھانے پینے کے محتاج تھے۔ بیماریوں کا شکار ہوتے تھے مشکلات میں مبتلا ہوتے تھے اور جب ان کی زندگیاں بتا رہی ہیں کہ انہوں نے اپنی تمام عمر احتیاج میں گذاری تو ان کو خدا قرار دینا کس طرح درست ہو سکتا ہے۔

اس کے بعد فرماتا ہے کہ انہیں تو یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ کب اٹھائے جائیں گے۔ یعنی نہ تو نفع کے حصول اور ضرر سے اجتناب پر انکو کوئی قدرت حاصل تھی۔

الَّذِیْ یَعْلَمُ السِّرَّ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ اِنَّهٗ

اُس (خدا) نے اتارا ہے جو آسمانوں اور زمین کے رازوں سے واقف ہے - وہ بہت

كَانَ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا ﴿۷﴾

بخشنے والا اور بار بار رحم کرنے والا ہے - ۵۴

نہ موت کے پنجہ سے وہ چھوٹ سکا نہ زندگی کے ایک ایک لمحہ اور ثانیہ میں وہ لوگ خدا تعالیٰ کے مقرر کردہ قانون سے آزاد ہوئے بلکہ انہیں تو یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ کب اُٹھائے جائیں گے یعنی غیب پر بھی اُن کو کوئی دسترس حاصل نہیں جیسا کہ حضرت مسیحؑ نے کہا کہ

"اُس دن یا اُس گھڑی کی بابت کوئی نہیں جانتا۔ نہ آسمان کے فرشتے نہ بیٹا مگر باپ۔"

(مرقس باب ۱۳ آیت ۳۲، ۳۳)

پس جب کہ کوئی ایک بات بھی اُن میں خدائی کی نہیں پائی جاتی تو انہیں خدا تعالیٰ کی وحدانیت کے مقابلہ میں کھڑا کرنا کیسے جائز ہوسکتا ہے ؟

۵۴ حل لغات

اِفْكٌ - اِفْكٌ - اَلْاِفْكُ: اَلْكَذِبُ یعنی افک کے معنے کذب اور جھوٹ کے ہیں (اقرب)

زُوْرٌ - زُوْرٌ: اَلزُّوْرُ: اَلْكَذِبُ - جھوٹ۔ اَلْبَاطِلُ باطل۔ (اقرب)

اَسَاطِیْرُ - اَسَاطِیْرُ - اُسْطُوْرَةٌ کی جمع ہے اور اُسْطُوْرَةٌ کے معنے ہیں مَا یُسْطَرُ جو چیز لکھی جاتی ہے۔ وَ تُسْتَعْمَلُ فِی الْحَدِیْثِ لَا نِظَامَ لَهٗ وَالْحِكَایَاتِ نیز اساطیر اُن باتوں کو بھی کہتے ہیں جو بے ترتیب ہوں اور قصے کہانیوں کو بھی کہتے ہیں (اقرب)

اِكْتَتَبَهَا - اِكْتَتَبَهَا - اِكْتَتَبَ الْكِتَابَ کے معنے ہیں خَطَّهٗ کتاب کو لکھا۔ وَ قِیْلَ اِسْتَمْلَاهُ بعض ماہرین لغت نے کہا ہے کہ اِكْتَتَبَ کے معنے ہیں کسی سے کتاب کو لکھوایا۔ نیز اس کے معنے ہیں اَمَرَ اَنْ یُّكْتَبَ لَهٗ - کسی کو حکم دیا کہ وہ اس کے لئے فلاں بات لکھدے (اقرب) پس اِكْتَتَبَهَا کے معنے ہونگے اُس نے لکھ لیا ہے یا کسی سے لکھوا لیا ہے۔

تفسیر: فرماتا ہے۔ کفار کہتے ہیں کہ قرآن ایک جھوٹی کتاب ہے اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) کو اس کے بنانے میں دوسرے لوگ امداد دیتے ہیں۔ ان کفار نے یہ اعتراض کرکے سخت ظلم کیا ہے اور جھوٹ بولا ہے۔ اور وہ اس اعتراض کو پکا کرنے کے لئے یوں دلیل دیتے ہیں کہ قرآن میں ہے کیا بس پُرانے لوگوں کی باتیں نقل کردی گئی ہیں۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وہ باتیں دوسروں سے لکھوا لیتے ہیں اور وہ صبح و شام اُن کے سامنے پڑھ کر سُنائی جاتی ہیں۔ تاکہ اُن کو اچھی طرح یاد رہیں۔ تُو اُن سے کہہ کہ قرآن کو تو اس خدا نے اتارا ہے جو آسمان اور زمین کے رازوں کو جانتا ہے اور وہ بہت بخشنے والا اور مہربان ہے

اس آیت کے الفاظ سے مترشح ہوتا ہے۔ کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ چونکہ صبح و شام نماز کے لئے اور قرآن سیکھنے کے لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اکٹھے ہوتے تھے۔ وہ نادان یہ خیال کرتے تھے کہ شاید اسجگہ جمع ہوکر بعض مسیحی غلام اپنی کتب کی باتیں ان کو بتاتے ہیں یا اُن سے لکھ کر صحابہؓ لے آتے ہیں اور پھر وہ صبح و شام حفظ کی جاتی ہیں۔ ان جاہلوں کی عقل میں صبح شام کی نمازیں تو آ ہی نہیں سکتی تھیں وہ اس

اجتماع کو منصوبہ بازی کا وقت سمجھتے تھے ۔ خود مجھے بھی اس
بارہ میں ایک تجربہ ہو چکا ہے جس سے اس قسم کی بدگمانی کی
حقیقت خوب معلوم ہو جاتی ہے کئی سال کی بات ہے
مَیں ایک دفعہ لاہور گیا ۔ تو مجھ سے آریوں کے مشہور لیڈر
لالہ رام بھجدت صاحب ملنے کے لئے آئے ۔ اُن کے
ساتھ کچھ اور صاحبان بھی تھے ۔ جن میں "شیرِ پنجاب" جو
سکھوں کا مشہور اخبار تھا اس کے ایڈیٹر صاحب بھی
شامل تھے اتفاق سے اُسی دن میرا لیکچر تھا ۔ وہ لیکچر
سُننے کے لئے ٹھہر گئے ۔ مجھے سارا دن مختلف کاموں کی
وجہ سے حوالے نکالنے کا موقعہ نہیں ملا تھا ۔ اس لئے مَیں
نے حافظ روشن علیؓ صاحب مرحوم کو سٹیج پر بٹھا لیا اور
کہا کہ مَیں آپ کو مضمون بتاتا جاؤں گا ۔ آپ مجھے آیت
کے الفاظ بتاتے جایا کریں ۔ چنانچہ مَیں نے لیکچر شروع کیا
اور جہاں کسی آیت سے استدلال کی ضرورت ہوتی ۔ مَیں
آہستہ سے ایک دو لفظ آیت کے پڑھ دیتا یا مضمون
بتا دیتا اور وہ ساری آیت پڑھ دیتے مَیں اُسے پڑھ کر
جو استدلال کرنا ہوتا تھا اُسے بیان کر دیتا ۔ دوسرے دن
"شیرِ پنجاب" میں ایک مضمون نکلا کہ کل ہم بھی امام جماعت احمدیہ
کے لیکچر میں تھے ۔ لیکچر اچھا تھا ۔ مگر ہم نے ذرا تجسس کیا
اور سٹیج کے پچھلی طرف گئے تو معلوم ہوا کہ انہوں نے
اپنے پیچھے ایک عالم چھپایا ہوا تھا ۔ وہ مضمون بتاتا
جاتا تھا اور مرزا صاحب اُسے دوہراتے جاتے تھے ۔
واقف کار لوگوں میں کئی دن اس پر خوب ہنسی اڑتی رہی
اور سردار صاحب سے بھی کسی نے جا کر ذکر کر دیا ۔ وہ بہت
شرمندہ ہوئے اور انہوں نے کہا کہ مَیں تو سمجھتا تھا کہ مَیں
نے اپنی ہوشیاری سے اصل راز معلوم کر لیا ہے ۔

ایسی ہی ہوشیاری مکّہ والوں نے دکھائی تھی ۔ کام
والے لوگوں کو صبح و شام ہی فرصت مل سکتی تھی وہ صبح
اور شام کی نمازیں ادا کرنے کے لئے اور قرآن کریم پڑھنے
کے لئے دارِ ارقم میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس
جمع ہو جاتے تھے ۔ کفار کے بعض زیادہ عقلمند لوگ
خیال کرتے تھے کہ ہم نے راز معلوم کر لیا ہے ۔ یہ قرآن
کی تصنیف کے لئے جمع ہوتے ہیں ۔

عقلمند انسان کے لئے اس میں بھی ایک بڑا
بھاری نشان ہے ۔ کیونکہ اس میں یہ اعتراف پایا جاتا
ہے کہ قرآن کریم کوئی ایک شخص نہیں بنا سکتا ۔ تبھی
انہوں نے اس کے بنانے میں مدد دینے والی ایک جماعت
قرار دی جن میں سے اُن کے نزدیک بعض عقلی باتیں
جمع کرتے تھے اور بعض پُرانی کتب کی تعلیم جمع کرتے تھے ۔

اب مَیں اس اعتراض کے وہ جواب بیان کرتا
ہوں جو اس آیت میں بیان کئے گئے ہیں ۔ کفار کے اس
اعتراض کا جواب دیتے ہوئے اس کے دو پہلوؤں کو
مدِّنظر رکھنا ضروری ہے ۔ (۱) اوّل یہ کہ جن غلاموں
کی نسبت کہا جاتا ہے کہ وہ قرآن کریم کے بنانے میں مدد
دیتے ہیں ۔ کیا وہ ایسا کر سکتے تھے ؟ (۲) دوسرے
یہ کہ جس چیز کی نسبت کہا جاتا ہے کہ بعض غلاموں نے
لکھوائی ہے کیا وہ انسانوں کی لکھوائی ہوئی ہو سکتی ہے ؟

پہلے سوال کا جواب قرآن کریم نے یہ دیا ہے کہ فَقَدْ
جَآءُوْ ظُلْمًا وَّ زُوْرًا یعنی یہ اعتراض نہایت ظالمانہ
اور جھوٹا ہے ۔ اس جواب میں ظُلْمًا وَّ زُوْرًا کہہ کر
اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ ان کفار کا
یہ دعویٰ کہ قرآن کریم کے بنانے میں بعض اور لوگ مدد دے
رہے ہیں خود اپنے آپ کو باطل ثابت کر رہا ہے کیونکہ
جس مذہب کے لوگوں کی طرف بھی سکھانے والوں کو منسوب
کیا جائے اُسی مذہب کی قرآن کریم تردید کر رہا ہے ۔ اگر
وہ یہ کہیں کہ سکھانے والے عیسائی غلام تھے تو قرآن تو
وہ کتاب ہے جو عیسائیت کی دھجیاں بکھیر رہی ہے ۔
پھر یہ کس طرح مانا جا سکتا ہے کہ جس مذہب کے

مانے والوں نے آپ کو قرآن بناکر دیا وہ خود اپنے مذہب
کے خلاف آپ کو باتیں بتاتے رہے تھے۔

اسی طرح اگر کہو کہ یہودیوں نے آپ کو سکھا دیا
تو یہودی مذہب کی تردید بھی قرآن کریم میں مکمل طور پر موجود
ہے۔ غرض جس مذہب کی طرف بھی سکھانے والوں کو منسوب
کیا جائے اُسی مذہب کی تردید قرآن کریم میں پائی جاتی ہے
پس یہ دعویٰ خود اپنی ذات میں اپنے جھوٹا ہونے کا ایک
کھلا اور نمایاں ثبوت ہے اس کو باطل ثابت کرنے کے لئے
کسی خارجی دلیل کی ضرورت ہی نہیں۔

حضرت مسیحؑ نے بھی انجیل میں اس دلیل کو استعمال
کیا ہے۔ چنانچہ جب یہودیوں نے آپ پر اعتراض کرتے
ہوئے کہا کہ یہ شخص بدروحوں کے سردار بعلزبول کی مدد
سے بدروحوں کو نکالتا ہے تو حضرت مسیحؑ نے انہیں جواب
دیا کہ

"اگر شیطان ہی نے شیطان کو نکالا
تو وہ آپ اپنا مخالف ہو گیا۔ پھر اُسکی
بادشاہی کیونکر قائم رہے گی؟"

(متی باب ۱۲ آیت ۲۶)

یعنی اگر میں شیطان کی مدد سے یہ کام کر رہا ہوں تو
کیا شیطان نے مجھے اپنے خلاف ہی مدد دینی تھی؟
اگر وہ مجھے کچھ سکھاتا تو کم از کم اُسے چاہیئے تھا کہ
اپنے خلاف نہ سکھاتا۔ مگر تمہارے نزدیک تو شیطان
نے مجھے وہ کام سکھلا دیا جو خود اس کو تباہ کرنیوالا
ہے۔ گویا شیطان آپ ہی اپنا دشمن ہو گیا۔

اسی طرح اگر عیسائی غلام رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم
کو قرآن کریم بنا کر دیا کرتے تھے تو کیا انہوں نے اپنے
مذہب پر ہی تبر رکھنا تھا۔ اور اسی کے خلاف تعلیم
بنا بنا کر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دینی تھی؟ پس
یہ اعتراض خود اپنی ذات میں اپنے باطل ہونے کا اعلان
کر رہا ہے اور بتا رہا ہے کہ اس اعتراض کی بنیاد محض جھوٹ
اور افتراء پر ہے۔

اسی طرح ظُلْمًا وَّ زُوْرًا کہہ کر اس طرف بھی
توجہ دلائی گئی ہے کہ کہ اگر کوئی اور جماعت ایسی کتاب
بنا سکتی تھی تو اُس نے یہ کتاب محمد رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم کو بنا کر کیوں دی۔ اُس نے یہ کتاب خود اپنی طرف
کیوں نہ منسوب کر لی۔ پس دوسرے لوگوں پر ایسا اتہام
لگانا بہت بڑا ظلم ہے۔ یعنی یہ اس بات کا اظہار
کرتا ہے کہ باوجود کامل ہونے کے انہوں نے اپنا کمال
ایک گھٹیا قسم کے آدمی کو دے دیا۔

پھر ظُلْمًا وَّ زُوْرًا کہہ کر اس بات کی طرف
بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ جن غلاموں کی نسبت یہ کہا
جاتا ہے کہ وہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن
سکھایا کرتے تھے وہ تو رات اور دن اسلام کی خاطر
تکلیفیں اٹھاتے رہے بلکہ اُن میں سے کئی کفار کے مظالم
سہتے سہتے شہید ہو گئے۔ پھر اُن کی نسبت یہ کیونکر
تصور کیا جا سکتا ہے کہ وہ خود قرآن بنا بنا کر محمد رسول
صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا کرتے تھے۔ جو لوگ خود ایک
جھوٹی تعلیم بنا کر پیش کرتے ہوں کیا وہ اس مفتریانہ کلام
کی خاطر اس قدر قربانیاں کر سکتے ہیں؟ جسقدر صحابہؓ اور
صحابیاتؓ نے کیں۔ پس یہ کتنا بڑا ظلم ہے کہ جن غلاموں
نے اپنے خونوں سے اسلام کے درخت کی آبیاری
کی اُنہی پر کفار یہ اعتراض کرتے ہیں کہ انہوں نے
محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو قرآن بنا کر دیا۔ ان
غلاموں نے اسلام کی خاطر جو جو تکالیف اٹھائیں اُن
کا تو تصور کر کے بھی رونا آتا ہے۔ عرب میں غلاموں کو
کوئی پوزیشن حاصل نہیں تھی۔ کوئی شہری حقوق انہیں
حاصل نہیں تھے۔ آقا اُن کو مار ڈالتے تو اُن کو کوئی پوچھنے
والا نہیں تھا۔ کیونکہ وہ اپنے آقاؤں کی ملکیت

سمجھے جاتے تھے۔ اُس وقت کوئی قانون نہیں تھا۔ جو اُن کی حفاظت کر سکتا جب بعض غلام رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے تو تپتی ریتوں پر انہیں لٹایا جاتا۔ اُنکو پتھروں پر گھسیٹا جاتا۔ یہاں تک کہ اُن کے جسم چھل جاتے اور وہ شدید زخمی ہو جاتے۔ جب کچھ عرصہ کے بعد اُن کے زخم مندمل ہو جاتے تو پھر دوبارہ اُن کو پتھروں پر گھسیٹتے اور یہ سلوک اُن سے متواتر جاری رکھا جاتا۔

حضرت بلالؓ کے متعلق تاریخوں میں آتا ہے کہ آپ کا آقا آپ کو پیٹھ کے بل لٹا کر جوتیوں سمیت آپکے سینہ پر کودا کرتا۔ اور کہتا کہو خدا کے سوا اور بھی بہت سے خدا ہیں اور اسپر بار بار اصرار کرتا۔ حضرت بلالؓ حبشی تھے اور اس وجہ سے عربی اچھی طرح بول نہیں سکتے تھے جب کفار زیادہ ظلم کرتے اور اصرار کرتے کہ آپ توحید کے خلاف کوئی بات کہیں تو آپ بڑے جوش سے کہتے اَحَدٌ اَحَدٌ خدا ایک ہی ہے۔ اسپر کفار اُن پر اور بھی مظالم کرنے لگ جاتے۔ خبابؓ بن الارت بھی ایک غلام تھے۔ جو آہنگری کا کام کیا کرتے تھے وہ نہایت ابتدائی ایام میں آپ پر ایمان لائے۔ لوگ انہیں سخت تکالیف دیتے تھے۔ حتیٰ کہ انہی کی بھٹی کے کوئلے نکال کر اُن پر انہیں لٹا دیتے اور اوپر سے چھاتی پر پتھر رکھ دیتے تاکہ آپ کمر نہ ہلا سکیں۔ اُن کی مزدوری کا روپیہ جن لوگوں کے ذمہ تھا وہ روپیہ ادا کرنے سے منکر ہو گئے۔ مگر باوجود اِن مالی اور جانی نقصانوں کے وہ ایک منٹ کے لئے بھی متذبذب نہ ہوئے۔ اور ایمان پر ثابت قدم رہے۔ آپ کی پیٹھ کے نشان آخر عمر تک قائم رہے۔ چنانچہ حضرت عمرؓ کی خلافت کے ایام میں انہوں نے اپنے گذشتہ مصائب کا ذکر کیا تو انہوں نے اُسے پیٹھ دکھانے کو کہا۔ جب انہوں نے اپنی پیٹھ پر سے کپڑا اٹھایا تو تمام پیٹھ پر ایسے سفید داغ تھے جیسا کہ برص کے داغ ہوتے ہیں۔

حضرت سمیہؓ ایک لونڈی تھیں۔ ابوجہل ان کو سخت دُکھ دیا کرتا تھا تاکہ وہ ایمان چھوڑ دیں لیکن جب اُن کے پائے ثبات میں لغزش پیدا نہ ہوئی تو ایک دن ناراض ہو کر ابوجہل نے انکی شرمگاہ میں نیزہ مارا اور انہیں شہید کر دیا۔

حضرت عمارؓ جو سمیہؓ کے بیٹے تھے انہیں بھی تپتی ریت پر لٹایا جاتا اور انہیں سخت دُکھ دیا جاتا۔ ایک غلام صہیبؓ تھے جو روم سے پکڑے ہوئے آئے تھے یہ عبداللہ بن جدعان کے غلام تھے جنہوں نے اُن کو آزاد کر دیا تھا۔ یہ بھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے اور آپؐ کے لئے انہوں نے کئی قسم کی تکالیف اٹھائیں۔ پھر ابوفکیہہؓ ایک غلام تھے وہ بھی رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم پر ابتدائی ایام میں ایمان لائے۔ انہیں بھی گرم ریت پر لٹایا جاتا۔ ایک دفعہ رسّی باندھ کر انہیں کھینچا جا رہا تھا کہ پاس سے کوئی جانور گزرا۔ اُن کے آقا نے اس کی طرف اشارہ کر کے انہیں کہا۔ یہ تمہارا خدا جا رہا ہے۔ انہوں نے کہا۔ میرا اور تمہارا خدا ایک ہی ہے۔ اِس پر اس ظالم نے اُن کا گلا گھونٹا اور پھر ایک بھاری پتھر اُن کے سینہ پر رکھدیا جس سے اُن کی زبان باہر نکل آئی اور وہ بے ہوش ہو گئے۔ لوگوں نے سمجھا کہ وہ مر گئے ہیں اور وہ انہیں چھوڑ کر چلے گئے۔ آخر بہت دیر کے بعد انہیں ہوش آئی۔

حضرت لبینہؓ ایک لونڈی تھیں وہ بھی نہایت ابتدائی ایام میں اسلام لائیں۔ حضرت عمرؓ اپنے اسلام لانے سے پہلے انہیں اسلام کی وجہ سے بڑی تکالیف دیا کرتے تھے۔ مگر وہ بڑی مضبوطی سے اپنے ایمان پر قائم رہیں۔

زنیرہؓ بھی ایک لونڈی تھیں اور ابتدائی ایام میں ہی ایمان لائی تھیں ۔ ابوجہل نے مار مار کر اُن کی آنکھیں پھوڑ دیں ۔ مگر انہوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت سے انکار نہ کیا ۔ ابوجہل انہیں دیکھ کر غصہ سے کہا کرتا تھا کہ کیا ہم اتنے حقیر ہو گئے ہیں کہ زنیرہؓ نے تو سچا دین مان لیا اور ہم نے نہ مانا ۔

اسی طرح نہدیہؓ اور ام عبیسؓ دو کنیزیں تھیں ۔ جو مکی زندگی میں اسلام لائیں ۔ اور دونوں نے اسلام لانے کی وجہ سے بہت سخت مصائب برداشت کئے ۔

عامر بن فہیرہؓ بھی ایک غلام تھے جنہیں حضرت ابوبکرؓ نے آزاد کر دیا تھا ۔ انہیں بھی اسلام لانے کی وجہ سے سخت تکالیف دی گئیں ۔

حمامہؓ حضرت بلالؓ کی والدہ تھیں ۔ یہ بھی اسلام لائیں اور انہوں نے اسلام کی خاطر بڑی تکالیف اٹھائیں ۔ پھر بعض غلاموں کو مکہ والوں نے اس طرح بھی قتل کیا کہ اُن کی دونوں ٹانگیں دو اونٹوں سے باندھ دیتے اور پھر ان اونٹوں کو مخالف اطراف میں دوڑا دیتے اور وہ کٹ کر ہلاک ہو جاتے ۔ اگر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نعوذ باللہ خدا تعالیٰ پر افترا کرنے والے ہوتے اور یہ غلام آپ کو قرآن بنا بنا کر دیا کرتے تو یہ لوگ یقیناً آپ کے دشمن ہوتے کہ آپ پر ایمان لا کر آپ کیلئے اپنی جانیں قربان کرتے ۔

کفار کے اس اعتراض کے ضمن میں دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ کیا یہ کلام ان غلاموں کا سکھایا ہوا ہو سکتا ہے ؟ اس کا جواب اللہ تعالیٰ نے یہ دیا ہے ۔ کہ جنہیں تم قصے کہتے ہو وہ قصے ہے ہی نہیں بلکہ پیشگوئیاں ہیں ۔ اور ان کو بیان کرنے والا آسمانوں اور زمین کے غیبوں کو جاننے والا خدا ہے ۔ جس نے اپنے غفور اور رحیم ہونے کے سبب سے تمہارے علاج کا سامان کیا ہے یعنی اسرارِ آسمانی اور اسرارِ زمینی دونوں کو اس کتاب میں کھول کر بیان کر دیا گیا ہے ۔ اور خدا تعالیٰ کا معاملہ جو بندوں سے ہوتا ہے اس پر بھی اس میں پوری تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے اور مختلف مواقع پر بندے جن خیالات اور جذبات کا اظہار کیا کرتے ہیں اُن کا بھی اس میں مکمل ذکر ہے ۔ پھر جس تعلیم میں تمام قسم کی فطرتوں کے راز بیان کر دیئے گئے ہیں خواہ وہ عرب میں ہوں یا ہندوستان میں ہوں ۔ یا امریکہ میں ہوں یا یورپ میں ہوں اور ہر قسم کی فطری ضروریات کا سامان اس میں موجود ہے ۔ ادھر خدا تعالیٰ کے وہ تمام قسم کے سلوک جو اس کے بندوں سے ہوتے ہیں چاہے وہ پہلے ہوئے ہوں یا آئندہ ہونگے ۔ ان سب کو اس میں بیان کیا گیا ہے ۔ اس تعلیم کو ان تعلیمات کی نقل کس طرح قرار دیا جا سکتا ہے ۔ آخر کونسی سابق تعلیم ایسی ہے جس میں یہ سب باتیں پائی جاتی ہیں ۔ پہلی کتابیں تو وہ تھیں جنکا دائرۂ ہدایت بہت محدود تھا ۔ وہ محدود الزمان اور محدود الاوقات تعلیمات تھیں اور پھر صرف ایک ایک علاقہ کے لئے تھیں ۔ ساری دنیا کے لئے نہیں تھیں اس لئے ان کتب میں ہر فطرت کا لحاظ نہیں رکھا گیا ۔ تورات میں صرف یہودی قوم کی اصلاح کو مدنظر رکھا گیا ہے باقی قوموں کو مدنظر نہیں رکھا گیا ۔ اسی طرح اس میں سارے زمانوں کو مدنظر نہیں رکھا گیا ۔ مگر قرآن وہ کتاب ہے جو ساری قوموں اور سارے زمانوں کے لئے ہے ۔ وہ یہودیوں کے لئے بھی ہے ۔ وہ عیسائیوں کے لئے بھی ہے ۔ وہ مسلمانوں کے لئے بھی ہے ۔ وہ ہندوؤں کے لئے بھی ہے ۔ وہ یورپین لوگوں کے لئے بھی ہے ۔ وہ چینیوں کے لئے بھی ہے وہ جاپانیوں کے لئے بھی ہے ۔ وہ وحشیوں کے لئے بھی ہے ۔ اور غیر وحشیوں کے لئے بھی ہے ۔ غرض کوئی قوم ایسی نہیں

جس کی ہدایت کے لئے قرآن نہ آیا ہو - اور کوئی زمانہ ایسا نہیں جس میں قرآن کی ضرورت سے انکار کیا جا سکتا ہو پھر جب قرآن کریم کی یہ شان ہے تو یہ لوگ کس طرح کہتے ہیں کہ یہ قرآن پہلی کتابوں کی نقل ہے - پُرانے لوگوں کے حالات تو تاریخ سے ہر ایک کو معلوم ہو جاتے ہیں - لیکن اس کتاب میں تو وہ اسرار اور پیشگوئیاں بھری ہوئی ہیں جن کو کوئی بندہ جان ہی نہیں سکتا - پھر اس علم غیب کو پُرانے لوگوں کے واقعات کہنا کس طرح درست ہو سکتا ہے - چنانچہ دیکھ لو - اس زمانہ میں جبکہ اسلام ابھی مکہ کی چار دیواری میں محدود تھا اور اسلام قبول کرنے کی وجہ سے مسلمانوں کو بڑی بڑی تکالیف دی جا رہی تھیں اُن کو قتل کیا جاتا تھا - ان کو مارا پیٹا جاتا تھا - اُن کا بائیکاٹ کیا جاتا تھا - اُن کی جائیدادیں اور مکان چھینے جاتے تھے اور جبکہ مکّہ والوں کے ذہن کے کسی گوشہ میں بھی یہ خیال نہیں آ سکتا تھا کہ وہ تباہ ہو جائیں گے اور عنانِ حکومت مسلمانوں کے ہاتھ آ جائے گی اللہ تعالیٰ نے خبر دیتے ہوئے فرمایا کہ :- وَلَقَدْ جَآءَ اٰلَ فِرْعَوْنَ النُّذُرُ ۚ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا كُلِّهَا فَاَخَذْنٰهُمْ اَخْذَ عَزِيْزٍ مُّقْتَدِرٍ ۔ اَكُفَّارُكُمْ خَيْرٌ مِّنْ اُولٰٓئِكُمْ اَمْ لَكُمْ بَرَآءَةٌ فِى الزُّبُرِ ۔ اَمْ يَقُوْلُوْنَ نَحْنُ جَمِيْعٌ مُّنْتَصِرٌ ۔ سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَيُوَلُّوْنَ الدُّبُرَ ۔ بَلِ السَّاعَةُ مَوْعِدُهُمْ وَالسَّاعَةُ اَدْهٰى وَاَمَرُّ (قمرع ۳) یعنی ہم نے موسیٰ کے ذریعہ فرعون کو جو مصر کا بادشاہ تھا اور بنی اسرائیل پر ظلم کیا کرتا تھا ڈرایا کہ دیکھو ہمارے بندے کا مقابلہ نہ کرو ورنہ نقصان اٹھاؤ گے - مگر اُس نے پرواہ نہ کی نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی بے اعتنائی اور تکذیب کی وجہ سے ہم نے اُس کو پکڑ لیا - اور پھر معمولی طور پر نہیں پکڑا بلکہ ایک غالب اور قادر کی حیثیت سے پکڑا - بعض لوگ گرفت تو کرتے ہیں مگر دشمن ان کی گرفت سے نکل جاتا ہے - لیکن فرماتا ہے - ہماری گرفت ایسی تھی کہ ایک تو اس گرفت سے کوئی نکل نہیں سکتا تھا اور دوسرے ہماری سزا ایسی تھی جس سے کوئی بچ نہیں سکتا تھا - اور پھر اس میں رحم کا جزو بھی پایا جاتا تھا کیونکہ مقتدر آدمی جو جانتا ہے کہ میں ہر وقت سزا دے سکتا ہوں کبھی ایسی سختی نہیں کرتا جو ناقابلِ برداشت ہو کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ میں پھر بھی عذاب دے سکتا ہوں - گورنمنٹیں سزا دیتی ہیں تو بعض لوگ ان سزاؤں سے بچ بھی جاتے ہیں وہ پھانسی کی سزا دیتی ہیں تو بعض لوگ جیل والوں سے مل جاتے ہیں اور وہ انہیں زہر مہیّا کر دیتے ہیں یا اپنے رشتہ داروں کے ذریعہ سے زہر منگوا لیتے ہیں اور وقت سے پہلے زہر کھا کر مر جاتے ہیں - دوسری جنگِ عظیم کے بعد جب جرمنی کو شکست ہوئی اور گوئرنگ پکڑا گیا تو بڑی شان سے اعلان کیا گیا کہ ہم فلاں دن گوئرنگ کو پھانسی پر لٹکائیں گے اور سمجھا گیا کہ اس کا لوگوں پر بڑا اثر ہو گا - اور وہ سمجھیں گے کہ جرمن بڑے ذلیل ہوئے ہیں - لیکن جب پھانسی دینے کے لئے وہ اس کے کمرہ میں گئے تو دیکھا کہ وہ مرا پڑا تھا - معلوم ہوا کہ کسی نہ کسی طرح جرمنوں نے اندر زہر پہنچا دیا - اور وہ کھا کر مر گیا تو انہوں نے پکڑا تو سہی مگر جو ارادہ تھا کہ ہم اُسے سزا دیں گے اس میں وہ کامیاب نہ ہوئے گویا یہ اَخْذَ عَزِيْزٍ تو تھا مگر اَخْذَ عَزِيْزٍ مُّقْتَدِرٍ نہیں تھا یعنی پکڑ تو لیا مگر جس قسم کی سزا دینا چاہتے تھے اُس میں ناکام ہو گئے - پھر بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ لوگ سزا سے بھی پہلے نکل جاتے ہیں - جیل خانوں سے لوگ بھاگ جاتے ہیں - ہتھکڑیاں لگنے سے پہلے فرار

اختیار کر لیتے ہیں۔ اور پھر بعض دفعہ قریباً ساری عمر نہیں پکڑے جاتے۔ پس اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ دنیوی حکومتوں میں یہ دو باتیں ہوا کرتی ہیں کبھی ایسا ہوتا ہے کہ مجرم بھاگ جاتا ہے لیکن ہم ایسا پکڑتے ہیں کہ وہ بھاگ نہیں سکتا۔ پھر کبھی ایسا ہوتا ہے کہ گورنمنٹ پکڑ تو لیتی ہے مگر اُسے سزا نہیں دے سکتی۔ وہ پھانسی کی سزا تجویز کرتی ہے اور خدا تعالیٰ کی طرف سے اس کا ہارٹ فیل ہو جاتا ہے اور وہ پھانسی دینے میں کامیاب نہیں ہو سکتی لیکن ہم نے اُسے اس طرح پکڑا کہ وہ بھاگ نہ سکا اور پھر جو سزا تجویز کی وہ اُسے مل کر رہی۔

اس ذکر کے بعد اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ اَكُفَّارُكُمْ خَيْرٌ مِّنْ اُولٰٓئِكُمْ اَمْ لَكُمْ بَرَآءَةٌ فِي الزُّبُرِ اے مکّہ والو! تم بتاؤ تو سہی کہ وہ جو موسیٰؑ کے منکر تھے کیا تم اُن سے بہتر ہو۔ اگر موسیٰؑ کے منکروں کو سزائیں ملی تھیں تو تم کیا سمجھتے ہو۔ آیا یہ کہ تمہیں سزا نہیں دی جا سکتی یا یہ کہ خدائی کتابوں میں تمہارے متعلق کوئی ضمانت آئی ہوئی ہے۔ کہ ہم مکّہ والوں کو کچھ نہیں کہیں گے۔ بیشک خدا تعالیٰ نے یہ وعدہ تو کیا ہے کہ وہ خانہ کعبہ کی حفاظت کریگا۔ مگر اس نے یہ کہیں نہیں کہا کہ وہ تم کو بھی سزا نہیں دے گا۔ اَمْ يَقُوْلُوْنَ نَحْنُ جَمِيْعٌ مُّنْتَصِرٌ کیا وہ یہ کہتے ہیں کہ ہم بڑا جتھا رکھتے ہیں۔ اور ہم ان مسلمانوں کو تباہ کر دیں گے۔ سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَ يُوَلُّوْنَ الدُّبُرَ بیشک اِن کفار کی طرف سے حملے ہونگے اور قوموں کی قومیں اکٹھی ہو جائیں گی اور وہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپکے صحابہؓ پر حملہ کریں گی۔ لیکن سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ اُن کے لشکر جو اکٹھے ہونگے اُن کو شکست دی جائیگی وَيُوَلُّوْنَ الدُّبُرَ اور وہ پیٹھ دکھاتے ہوئے بھاگ جائیں گے۔

پھر فرماتا ہے بَلِ السَّاعَةُ اَدْهٰى وَاَمَرُّ.

یہ جو تم پر تباہی کی گھڑی آئے گی یہ فرعون کی گھڑی سے بھی زیادہ خطرناک ہوگی۔ اب بظاہر یہ نظر آتا ہے کہ فرعون کی گھڑی سب سے زیادہ خطرناک تھی کیونکہ وہ ڈوب گیا اور اس کی فوج تباہ ہو گئی۔ لیکن فرماتا ہے کہ تمہاری تباہی فرعون کی تباہی سے بھی زیادہ خوفناک ہوگی۔ چنانچہ اگر غور کر کے دیکھا جائے تو واقعہ میں کفارِ مکہ کو فرعونیوں سے زیادہ سخت سزا ملی۔ موسیٰؑ کو اپنی زندگی میں مصر کا قبضہ نہیں ملا۔ کیونکہ اُن کے پیروؤں نے کنعان پر حملہ کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جو دشمن تھا۔ اس کو صرف شکست ہی نہیں ہوئی بلکہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ پر قابض ہو گئے پس مکہ والوں کو موسیٰؑ کے دشمنوں سے زیادہ سخت سزا ملی کیونکہ وہ قومی طور پر محمد رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ماتحت آ گئے۔ اب بتاؤ۔ کیا یہ خبر ایسی تھی جسے کوئی انسان اپنی طرف سے بنا کر پیش کر سکتا تھا۔ یا اسے پورا کرنے کی طاقت رکھتا تھا۔ یہ خبر ایسے وقت میں دی گئی تھی جبکہ مسلمان انتہائی کمزوری اور کسمپرسی کی حالت میں تھے اور ان پر عرب کے متحدہ حملہ کا کوئی خیال بھی نہیں کر سکتا تھا۔ مگر کئی سال پہلے عالم الغیب خدا کی طرف سے خبر دی گئی کہ ایک دن مسلمان اتنی طاقت پکڑ جائیں گے کہ کفار متحدہ طور پر اُن کو مٹانے کے لئے جمع ہو جائیں گے لیکن اِدھر وہ جمع ہو رہے ہونگے اور اُدھر خدا اپنے رسول کی مدد کے لئے دوڑا چلا آ رہا ہوگا۔ اور جب دشمن وہاں پہنچے گا تو وہاں خدا موجود ہوگا۔ جسے دیکھ کر وہ حواس باختہ ہو جائیگا۔ چنانچہ جنگِ احزاب میں دشمن کی چوبیس ہزار فوج مدینہ پر حملہ کرنے کے لئے جمع ہوئی جبکہ مسلمان صرف بارہ سو تھے۔ اور پھر ان بارہ سو میں سے بھی پانچسو سپاہی عورتوں کی حفاظت کے لئے الگ کر لئے گئے تھے۔ اور باقی صرف سات سو سپاہی رہ گئے تھے

وَقَالُوْا مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَأْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِيْ

اور وہ کہتے ہیں کہ اس رسول کو کیا ہوگیا ہے کہ وہ کھانا بھی کھاتا ہے اور بازاروں میں بھی چلتا

فِي الْاَسْوَاقِ ؕ لَوْلَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مَلَكٌ فَيَكُوْنَ مَعَهٗ

پھرتا ہے۔ کیوں نہ اس پر فرشتہ اتارا گیا جو اس کے ساتھ کھڑا ہوکر لوگوں کو

نَذِيْرًا ۙ اَوْ يُلْقٰۤى اِلَيْهِ كَنْزٌ اَوْ تَكُوْنُ لَهٗ جَنَّةٌ

ہوشیار کرتا۔ یا اس پر کوئی خزانہ اتارا جاتا یا اس کے پاس کوئی باغ ہوتا۔

مگر اللہ تعالیٰ نے ایسی مدد کی کہ یہ چوبیس ہزار کا لشکر صرف سو کے مقابلہ میں بھاگ گیا۔ اور خدا نے اپنے رسول کو فتح دی۔ اللہ تعالیٰ اسی قسم کے آسمانی اسرار اور پیشگوئیوں کو کفار کے اعتراض کے جواب میں پیش کرتا ہے اور فرماتا ہے تمہارا یہ کہنا کہ یہ کتاب خدا نے نازل نہیں کی۔ بلکہ بعض لوگوں نے مل کر بنالی ہے بالکل جھوٹ ہے۔ کیونکہ اس کتاب میں ایسی پیشگوئیاں ہیں جن کو کوئی انسانی دماغ وضع نہیں کرسکتا اور جن سے اس کا منجانب اللہ ہونا روز روشن کی طرح ثابت ہوتا ہے۔

پھر تعجب ہے کہ کفار نے یہ اعتراض تو کر دیا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سابق انبیاء اور اُن کی قوموں کے حالات عیسائی غلاموں سے لکھوا لیتے ہیں اور پھر وہ واقعات صبح شام اُن کے سامنے پڑھے جاتے ہیں تاکہ یاد رہیں۔ مگر وہ یہ ثابت نہیں کرسکتے کہ اس زمانہ میں تورات اور انجیل کا کوئی عربی نسخہ بھی موجود تھا جس کی مدد سے یہ قرآن تیار کیا گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس زمانہ میں بائیبل کے عربی ترجمہ کی طرف ابھی عیسائیوں کو کوئی توجہ ہی پیدا نہیں ہوئی تھی۔ یہاں تک کہ مدینہ اور اس کے ارد گرد جو یہودی قبائل آباد تھے اُن کے پاس بھی بائیبل کا کوئی عربی نسخہ نہیں تھا۔ بلکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اگر کبھی کسی حوالہ کی ضرورت محسوس ہوتی تو آپ حضرت عبداللہ بن سلامؓ سے دریافت فرمایا کرتے تھے جو عبرانی زبان جانتے تھے اور وہ عبرانی تورات کو دیکھ کر آپ کو جواب دیتے۔ یہ حقیقت ایسی روشن ہے کہ خود مسیحی مصنفوں نے اس بات کا اقرار کیا ہے۔ چنانچہ ایک مشہور مسیحی مصنف ڈاکٹر الیگزینڈر سوٹر لکھتے ہیں کہ بائیبل کا پرانے سے پرانا عربی ترجمہ آٹھویں صدی سے اوپر نہیں جاتا (حالانکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم چھٹی صدی میں پیدا ہوئے تھے)

THE TEXT & CANNON OF
THE NEW TESTAMENT BY
DR. ALEXANDER SOOTER,
PAGE 74.

پس جبکہ اس وقت تک تورات اور انجیل کا کوئی عربی ترجمہ ہی نہیں ہوا تھا تو یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ عیسائی غلام بائیبل سے پرانے واقعات آپ کو سُناتے تھے اور آپ انہیں یاد کر لیتے تھے۔

یہ تو اس اعتراض کا وہ جواب ہے جو قرآن کریم نے اِن آیات میں بیان فرمایا لیکن اس کے علاوہ اصولی طور پر بھی قرآن کریم نے اس سوال کا جواب دیا ہے

يَأْكُلُ مِنْهَا ۖ وَقَالَ الظّٰلِمُوْنَ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا رَجُلًا

جس کے پھل وہ کھاتا ۔ اور ظالم کہتے ہیں کہ تم تو ایک ایسے آدمی کے پیچھے چل رہے ہو

مَّسْحُوْرًا ⑨ اُنْظُرْ كَيْفَ ضَرَبُوْا لَكَ الْاَمْثَالَ فَضَلُّوْا

جس کو کھانا کھلایا جاتا ہے ۔ دیکھ! یہ تیرے متعلق کیسی کیسی باتیں بناتے ہیں ۔ اور وہ گمراہ ہو چکے ہیں

فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ سَبِيْلًا ⑩ ع

پس ان کو کوئی (صحیح بات کہنے کا) رستہ نہیں ملتا ۵۵

ع ۱ / ۱۶

اور فرمایا ہے کہ اگر ان کفار کا یہ خیال درست ہے کہ کئی لوگوں نے مل کر یہ کتاب بنالی ہے تو وہ ایسی ہی خوبیاں رکھنے والی کوئی اور کتاب بنا کر دکھا دیں ۔ پھر دنیا پر خود بخود ظاہر ہو جائیگا کہ ان کا یہ دعویٰ درست ہے یا غلط کیونکہ جو کام چند آدمی مل کر کر سکتے ہیں ویسا ہی کام سو یا ہزار آدمی بھی مل کر کر سکتے ہیں ۔ لیکن اگر وہ اس کتاب کی کوئی مثل تیار نہ کر سکیں تو ثابت ہو جائیگا کہ ان کا یہ دعوےٰ بالکل غلط ہے ۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ سورۂ بنی اسرائیل میں اس جواب کا ذکر کرتے ہوئے فرماتا ہے ۔ قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰۤى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا (بنی اسرائیل ع) یعنی تو انہیں کہدے کہ اگر تمہارے چھوٹے بھی اور بڑے بھی اور عالم بھی اور جاہل بھی اور امیر بھی اور غریب بھی سب مل کر اس قرآن کی کوئی نظیر لانا چاہیں تو وہ اس کی نظیر کبھی تیار نہیں کر سکیں گے خواہ وہ ایک دوسرے کے مددگار ہی کیوں نہ ہو جائیں ۔ اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ اگر یہ لوگ قرآن کریم کو انسانی کلام سمجھتے ہیں تو پھر کیوں وہ الٰہی خوبیوں جیسا کوئی اور کلام تیار کر کے نہیں دکھا دیتے جس طرح قرآن کریم میں ہر ضروری دینی مسئلہ پر روشنی ڈالی گئی ہے اسی طرح وہ بھی کوئی اور ایسا کلام تیار کر دا دیں جس میں عبادات اور معاملات اور اخلاق اور اقتصاد اور سیاسیات وغیرہ کے متعلق بنی نوع انسان کے سامنے ایک جامع تعلیم پیش کی گئی ہو اور جس میں کسی ایک قوم یا طبقہ کا فائدہ ملحوظ نہ رکھا گیا ہو بلکہ تمام دنیا کی ضروریات اور اُن کے فوائد پر نظر رکھتے ہوئے اُن کی دینی اور دنیوی بہبودی کے لئے ایک کامل اور بے عیب قانون پیش کیا گیا ہو ۔ اگر وہ ایسا کر دیں تو پھر اُنکا یہ دعویٰ ثابت ہو جائیگا کہ اس قرآن کی تیاری میں اور لوگوں کا ہاتھ ہے لیکن اگر وہ ایسا نہ کر سکیں اور قیامت تک نہیں کر سکیں گے تو پھر ثابت ہو جائیگا کہ انہوں نے جو کچھ کہا تھا غلط کہا تھا ۔ چنانچہ دیکھ لو باوجود اس کے کہ قرآن کریم کے اس دعویٰ پر چودہ سو سال گذر چکے ہیں اور دنیا نے قرآن کریم کی مخالفت میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی پھر بھی وہ آج تک اس قرآنی چیلنج کو قبول نہیں کر سکی اور اس طرح اپنے عجز اور بے چارگی سے وہ ثابت کر چکی ہے کہ یہ کلام انسانوں کا بنایا ہوا نہیں بلکہ خدا تعالیٰ کا نازل کردہ ہے جس کا مقابلہ کرنے کی کوئی انسان طاقت نہیں رکھتا ۔

اَلْكَنْزُ

۵۵ حل لغات :- اَلْكَنْزُ: اَلْمَالُ الْمَدْفُوْنُ فِي الْاَرْضِ ۔ کَنْز اس مال کو کہتے ہیں جو زمین میں مدفون ہو ۔ وَقِيْلَ اِسْمٌ لِلْمَالِ اِذَا اُحْرِزَ فِيْ وِعَاءٍ اور بعض ماہرین لغت کہتے ہیں کہ

کنز اُس مال کو کہتے ہیں جو کسی تھیلے وغیرہ میں جمع کیا گیا ہو۔ نیز اس کے معنے ہیں اَلذَّھَبُ: سونا۔ اَلْفِضَّۃُ: چاندی۔ مَا یُحْرَزُ فِیْہِ الْمَالُ کَالْمَخْزَنِ وَالصَّنْدُوْقِ صندوق یا اور ایسی اشیاء جن میں روپیہ وغیرہ محفوظ کیا جاتا ہے۔ (اقرب)

مَسْحُوْر

مَسْحُوْر: مسحور سَحَرَ سے اسم مفعول کا صیغہ ہے۔ اور سَحَرَہٗ کے معنے ہیں عَمِلَ لَہُ السِّحْرَ وَخَدَعَہٗ۔ اُس پر جادو کیا اور اُس کو دھوکا دیا۔ اور سَحَرَ عَنْہُ کے معنے ہیں تَبَاعَدَ۔ دُور ہو گیا۔ اور جب سَحَرَ فُلَانًا عَنِ الْاَمْرِ کہیں تو اس کے معنے ہونگے صَرَفَہٗ اُس کو کسی بات سے روک کے رکھا۔ (اقرب)

مفردات میں ہے کہ سِحْر غذا کو بھی کہتے ہیں (مفردات) پس مَسْحُوْر کے معنے ہونگے (۱) جادو کیا ہوا (۲) دُور کیا ہوا (۳) وہ شخص جس کو رشوت اور کھانے کیلئے غذا دی گئی ہو۔

تفسیر: فرماتا ہے۔ وہ لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ اس رسول کو کیا ہو گیا کہ یہ کھانا بھی کھاتا ہے اور بازاروں میں بھی چلتا پھرتا ہے۔ کیوں نہ اس پر کوئی فرشتہ اُترا۔ جو اس کے ساتھ مل کر لوگوں کو ہوشیار کرتا پھرتا۔ یہ اکیلا کیوں ہے۔ یا اس پر کوئی خزانہ کیوں نہ اُترا۔ یا اس کے ساتھ کوئی باغ کیوں نہ ہوا جس میں سے یہ پھل کھاتا۔ اور ظالم کہتے ہیں کہ اے مسلمانو۔ تم تو ایک ایسے انسان کے پیچھے چلتے ہو جس کو کھانا کھلایا جاتا ہے۔

فرماتا ہے۔ دیکھو یہ تیرے متعلق کیسی ہلکی ہلکی باتیں کرتے ہیں یعنی کبھی تو یہ اعتراض کرتے ہیں کہ یہ کیسا رسول ہے جو ہماری طرح کھانا کھاتا اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے اور کبھی یہ کہتے ہیں کہ اگر یہ سچا رسول ہوتا تو کسی بہت بڑے باغ کا مالک ہوتا اور اس میں سے خوب پھل کھاتا پھر بے شک ہم ایمان لے آتے۔ حالانکہ اگر کھانا کھانا نبوت کے منافی ہے تو پھل اور میوے کھانا کسی نبی کی صداقت کا ثبوت کس طرح ہو گیا؟ مگر چونکہ وہ کسی معقول بنیاد پر اعتراض نہیں کرتے اس لئے کبھی کچھ کہہ دیتے ہیں اور کبھی کچھ۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر کفارِ مکہ کا یہ اعتراض کرنا کہ یہ کیسا رسول ہے جو کھانا بھی کھاتا ہے بتا رہا ہے کہ مذہب اور رُوحانیت سے کلی بے گانگی کی وجہ سے ان کے دلوں میں یہ خیال پیدا ہو چکا تھا کہ جن لوگوں کا خدا تعالیٰ سے تعلق پیدا ہو جاتا ہے وہ کھانے پینے کی ضروریات سے مستغنی ہو کر رات دن اللہ تعالیٰ کی عبادت میں ہی مشغول رہتے ہیں۔ ہندو قوم میں بھی یہی تخیل نظر آتا ہے چنانچہ اُن میں حضرت بُدھ کے متعلق مشہور ہے کہ وہ گیا کے پاس ایک بانس کے درخت کے نیچے بیٹھے اور سالہا سال بیٹھے رہے یہاں تک کہ ایک بانس کا درخت اُن کے نیچے سے نکلا اور اُنکے سر سے پار ہو گیا۔ مگر محویت کی وجہ سے اُن کو یہ پتہ ہی نہ چلا کہ یہ کیا ہو گیا ہے۔ گویا اُن کے نزدیک حضرت بدھؑ نے سالہا سال بغیر کچھ کھائے پیئے کے گذار دیئے۔ اسی قسم کے خیالات بدقسمتی سے مسلمانوں کے ایک طبقہ میں بھی پیدا ہو گئے ہیں۔ اور وہ بھی یہ سمجھنے لگ گئے ہیں کہ بزرگ وہی ہوتا ہے جو حد درجہ غلیظ اور گندہ ہو۔ پاکیزہ اور طیب چیزیں استعمال نہ کرے۔ پلاؤ کھانے لگے تو تھوڑا سا پاخانہ بھی اُس میں ملا لے۔ بال کبھی نہ کٹوائے۔ دانتوں کی کبھی صفائی نہ کرے۔ اور یہ توہم اُن میں اس قدر بڑھ گیا ہے کہ وہ مادر زاد ننگے فقیروں اور فاتر العقل انسانوں کو بھی بزرگ سمجھنا شروع کر دیتے ہیں۔ آج بھی ہزاروں مسلمان ایسے ہیں جو اس قسم کے دیوانوں کو خدا رسیدہ سمجھتے اور اکل حلال اور نظافت کو بزرگی کے منافی سمجھتے ہیں۔ کہتے ہیں فلاں بزرگ ایک جگہ بیٹھے تو چالیس سال تک انہوں نے اپنا سر نہ اٹھایا۔

اور زمین پر بیٹھے بیٹھے گڑھا پڑ گیا۔

بانیٔ سلسلہ احمدیہ بھی چونکہ نبوت کے مدعی تھے اس لئے آپ پر بھی کھانوں کے متعلق اعتراض کیا گیا۔ آپ بعض امراض کی وجہ سے مشک اور عنبر اور بادام روغن وغیرہ کا استعمال فرمایا کرتے تھے۔ اور یہ بات اُن لوگوں کو عجیب معلوم ہوتی تھی جو ان چیزوں کا استعمال رُوحانیت کے منافی سمجھا کرتے ہیں۔ حضرت خلیفۃ اوّل رضی اللہ عنہ ایک دفعہ درس دے کر مسجد اقصیٰ سے واپس تشریف لا رہے تھے کہ راستہ میں ایک ہندو جو ریٹائرڈ ڈپٹی تھا اور جس کا مکان بعد میں صدر انجمن احمدیہ کے دفاتر کے لئے خرید لیا گیا تھا۔ بڑے ادب کے ساتھ کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا۔ مولوی صاحب مَیں نے ایک بات پوچھنی ہے۔ آپ خفا تو نہیں ہونگے۔ آپ نے فرمایا۔ مجھے خفا ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ آپ شوق سے دریافت فرمائیں۔ وہ کہنے لگا۔ مَیں نے سُنا ہے کہ مرزا صاحب مشک اور عنبر اور بادام روغن اور پلاؤ وغیرہ بھی کھالیتے ہیں۔ کیا یہ ٹھیک ہے؟ آپ نے فرمایا۔ ہاں ٹھیک ہے۔ وہ یہ غیر متوقع جواب سُن کر سخت حیران ہوا۔ اور کہنے لگا۔ کیا فقیروں کے لئے بھی یہ چیزیں جائز ہیں؟ آپ نے فرمایا۔ ہاں ہمارے مذہب میں فقراء کے لئے بھی پاک چیزیں کھانے کا حکم ہے۔ اس جواب سے وہ سخت حیران ہوا اور اچھا کہہ کر چلا گیا۔ یہ تو حضرت خلیفۃ اوّل رضی اللہ عنہ کا واقعہ ہے جو تہذیب اور شرافت سے بات کرنے کے عادی تھے۔ ہمارے ایک دوست جو تیز زبان تھے اور امرتسر کے رہنے والے تھے اُن کو کوئی ہندو مجسٹریٹ مل گیا۔ اور کہنے لگا۔ کیا ہے تمہارا مرزا! تم کہتے ہو۔ وہ خدا کا مامور ہے اور یہ ہے اور وہ ہے۔ ہم نے تو سُنا ہے کہ وہ بادام اور پستہ اور مرغ سب چیزیں کھا لیتا ہے۔ وہ کہنے لگے۔ آپ مرزا صاحب کو چڑانے کیلئے پاخانہ کھایا کریں۔ مجھے اس پر کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ غرض جس طرح موجودہ زمانہ میں اعلیٰ درجہ کی چیزوں کا کھانا پینا پہننا اور عطر وغیرہ لگانا بزرگی کے منافی سمجھا جاتا ہے۔ اسی طرح اس زمانہ میں کفار نے یہ اعتراض کیا کہ یہ عجیب رسول ہے جو کھانا بھی کھاتا ہے اور بازاروں میں بھی چلتا پھرتا ہے۔ اُن نادانوں نے یہ نہ سمجھا کہ رسول تو اپنی قوم کا راہنما ہوتا ہے۔ اگر وہ کھانا نہیں کھائیگا تو اُسکی اُمت کو یہ کیونکر پتہ لگیگا کہ کس طرح کھانا چاہیئے اور کیا کیا کھانا چاہیئے۔ اور کن کن چیزوں کو حرام سمجھنا چاہیئے۔ کھانا انسانی تمدن اور معاشرت کا ایک اہم جزو ہے۔ اور اس کے متعلق ایک جامع تعلیم اور کامل نمونہ کا موجود ہونا ضروری تھا۔ سو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے دنیا کے لئے اِس بارہ میں بھی نمونہ بنایا اور آپؐ کے ذریعہ اُس نے وہ تعلیم دی جو آج بھی کھانے پینے کے معاملات میں بنی نوع انسان کے لئے ایک اعلیٰ درجہ کے دستور العمل کی حیثیت رکھتی ہے اور جس سے اغماض کرکے کوئی انسان سوسائٹی میں عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھا جا سکتا۔

بازاروں میں چلنے پھرنے کا اعتراض بھی بتاتا ہے کہ وہ سمجھتے تھے کہ اگر کوئی شخص خدا رسیدہ ہونے کا مدعی ہو تو اس کی ضروریات کا خدا تعالیٰ کو خود متکفل ہونا چاہیئے اور عام لوگوں کی طرح اُسے سامانِ معیشت کی بہم رسانی کے لئے مادی اسباب اور وسائل کا محتاج نہیں ہونا چاہیئے۔ یہ خیال بھی ایسا ہے جو بدقسمتی سے آجکل مسلمانوں کے ایک طبقہ کے اندر پایا جاتا ہے اور وہ کہا کرتے ہیں کہ فلاں بزرگ نے جنّات اپنے قابو میں کئے ہوئے تھے اور وہ جب چاہتے تھے اُن کے ذریعہ بے موسم کے پھل منگوا لیتے تھے۔ گویا انہیں خود کوئی جدوجہد اور کوشش نہیں کرنی پڑتی تھی بلکہ کسی غیر مرئی مخلوق سے ہی وہ سب کام لے لیا کرتے تھے۔ پھر انہی خیالات کا

تَبٰرَكَ الَّذِيْٓ اِنْ شَآءَ جَعَلَ لَكَ خَيْرًا مِّنْ

بہت برکت والا ہے وہ خدا جو چاہے تو تیرے لئے (اُن کے تجویز کردہ) اُس باغ

ذٰلِكَ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ

سے بہت بہتر باغات پیدا کر دے جن (کے سایہ) میں نہریں بہتی ہوں۔

ایک نتیجہ توکّل کا وہ غلط مفہوم بھی ہے جو مسلمانوں میں پیدا ہوگیا ہے اور وہ یہ سمجھنے لگ گئے ہیں کہ توکّل اس بات کا نام ہے کہ انسان اسباب سے کام نہ لے اور خدا تعالےٰ پر کامل انحصار رکھے۔ غرض ایک رنگ میں یہ بھی وہی نظریّہ ہے جو کفّارِ مکّہ کا تھا کہ خدا رسیدہ وہی ہوتا ہے جو کھانے پینے کی ضروریات اور سامانِ معیشت کی فراہمی سے مستغنی ہو اور اس کے لئے غیب سے رزق مہیّا ہو جاتا ہو۔

پھر کفار نے ایک قدم اور آگے بڑھایا۔ اور کہا کہ اگر خدا نے اسے دنیا کی ہدایت کے لئے بھجوایا تھا تو وہ اُس کے ساتھ کوئی فرشتہ تو اتارتا۔ جس طرح مسلمان کہتے ہیں کہ مسیحؑ جب آسمان سے نازل ہوگا تو فرشتوں کے کندھوں پر اُس نے ہاتھ رکھا ہُوا ہوگا اور اُسے دیکھتے ہی سب دنیا سمجھ جائے گی کہ مسیحؑ آگیا اور اُس پر ایمان لے آئیگی۔

پھر کہتے ہیں اگر فرشتہ نہیں اُترا تھا تو کم از کم اس کے ساتھ کوئی خزانہ تو ہونا چاہیئے تھا جسے دیکھ کر ہم بھی اس کے ساتھ شامل ہو جاتے۔ مگر یہ تو دوسروں کو کچھ دینے کی بجائے اُن سے چندے مانگتا پھرتا ہے۔ ایسے رسول کو ہم کس طرح مان لیں۔ افسوس ہے کہ باوجود اس کے کہ کفّار کے مُنہ سے اللہ تعالےٰ نے یہ باتیں نکلوا کر اُن کی غلطی واضح کی تھی پھر بھی مسلمانوں نے نہ سمجھا اور انہوں نے بھی آنے والے مسیحؑ اور مہدی کے متعلق یہ نظریّہ قائم کر لیا کہ وہ آتے ہی اسقدر مال لُٹائے گا کہ کوئی شخص غریب نہیں رہے گا۔ گویا زمین کے سب خزائن اُس کے قبضہ میں ہونگے اور وہ مال و دولت کے انبار لوگوں میں تقسیم کرتا چلا جائے گا۔

پھر کفّار نے کہا کہ اگر کوئی خزانہ اِس پر نہیں اُترا تھا تو کم از کم اِسے کوئی باغ تو ملتا جس کے یہ پھل کھایا کرتا مگر اس کی تو یہ حالت ہے کہ مکّہ اور طائف کے وہ سردار جو اس کے دشمن ہیں اُن کے پاس تو بڑے بڑے باغات ہیں اور اس کے پاس کوئی چھوٹا سا باغ بھی نہیں۔ یہ دلائل اُن لوگوں کے نزدیک اتنے وزنی تھے کہ وہ ان کا ذکر کرکے کہتے ہیں کہ جب اِن میں سے کوئی چیز بھی اس کے پاس نہیں تو یہ شخص سچّا کس طرح ہوگیا اور اس کے پیچھے چلنے والے ہدایت یافتہ کس طرح ہوگئے۔ یہ تو اس بات کا ثبوت ہے کہ جو لوگ اسے مان رہے ہیں وہ نعوذ باللہ اس کے دھوکا اور فریب میں آگئے ہیں اُن کے اِن اعتراضات کا اگلی آیت میں جواب دیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ تم اِن اعتراضات سے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے غلبہ کو روک نہیں سکتے۔ ایک دن آنے والا ہے جب تمہارے یہ تمام اعتراضات دھرے کے دھرے رہ جائینگے

وَيَجْعَلْ لَّكَ قُصُوْرًا ⑪

اور تیرے لئے بڑے بڑے محل تیار کر دے ؎۵۶

اور محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم تم پر غالب آجائیں گے۔

؎۵۶ **تفسیر:۔** فرماتا ہے۔ بڑی برکت والا وہ خدا ہے جو اگر چاہے تو تجھے اِن کے مُنہ مانگے باغ سے بہت بہتر باغات دے دے جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں۔ اور تجھے بڑے بڑے محلّات کا مالک بنا دے۔ یعنی یہ تو تجھ سے ایک باغ مانگتے ہیں مگر اِن نادانوں کو کیا معلوم کہ ہم نے تیرے لئے کیسے کیسے عظیم الشان باغات اور محلّات مقدّر کئے ہوئے ہیں۔ یہ مسلمانوں کی آج کی بے بسی اور ان کی کمزوری کو دیکھکر طعنہ زنی کر رہے ہیں مگر مستقبل اُن کی نظروں سے پوشیدہ ہے۔ اور وہ یہ نہیں جانتے کہ جن باغات پر اُن کا قبضہ ہے اور جن خزانوں پر انہیں ناز ہے۔ ایک دن آنے والا ہے کہ وہ اُن کے ہاتھوں سے چھینے جائیں گے اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اُنکے ساتھیوں کو دے دیئے جائیں گے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اپنے اس وعدہ کو پُورا کیا اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کی برکت سے اُس نے مسلمانوں کو بڑے بڑے باغات اور محلّات عطا فرمائے۔ وہ طائف اور نخلہ کے باغوں کے بھی مالک ہوئے اور قیصر و کسریٰ کے خزانوں کے بھی مالک ہوئے اور اُن ہیروں اور جواہرات کے ڈھیر اُن کے قبضہ میں آئے۔ اور یہ سب کچھ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشگوئیوں کے مطابق ہُوا۔ چنانچہ غزوۂ احزاب میں جب مدینہ کی حفاظت کے لئے خندق کھودی جا رہی تھی۔ تو اچانک ایک پتھر ایسا آگیا۔ جو باوجود کوشش کے صحابہؓ سے ٹوٹ نہ سکا۔ انہوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع دی تو آپ خود وہاں تشریف لیگئے اور کدال ہاتھ میں لی اور زور سے اس پتھر پر ماری۔ پتھر میں سے روشنی کی ایک شعاع نکلی اور آپ نے بلند آواز سے فرمایا اَللّٰهُ اَکْبَرُ۔ آپؐ کے نعرۂ تکبیر بلند کرنے پر صحابہؓ نے بھی زور سے نعرۂ تکبیر بلند کیا۔ پھر دوسری دفعہ آپؐ نے کدال ماری تو پھر اُس میں سے روشنی کی شعاع نکلی اور آپؐ نے پھر فرمایا اَللّٰهُ اَکْبَرُ۔ اور صحابہؓ نے بھی بڑے جوش سے کہا اَللّٰهُ اَکْبَرُ۔ اِس کے بعد تیسری دفعہ آپؐ نے کدال ماری تو پھر اُس میں سے ایک شعاع نکلی اور آپؐ نے فرمایا اَللّٰهُ اَکْبَرُ۔ اور صحابہؓ نے بھی کہا اَللّٰهُ اَکْبَرُ۔ اور وہ پتھر ریزہ ریزہ ہوگیا۔ جب پتھر ٹوٹ چکا تو صحابہؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! آپؐ نے کدال مارتے وقت تین دفعہ اللہ اکبر کیوں کہا تھا۔ آپؐ نے فرمایا۔ جب پہلی دفعہ پتھر میں سے روشنی نکلی تو مجھے کشفی حالت میں قیصر روم کے محلّات دکھائے گئے اور اُن کی کنجیاں میرے سپرد کی گئیں۔ پھر دوسری دفعہ مَیں نے کدال ماری تو مجھے مدائن کے سفید محلّات دکھائے گئے اور مملکتِ فارس کی کنجیاں مجھے دی گئیں۔ اس کے بعد تیسری دفعہ مَیں نے کدال ماری تو مجھے صنعاء کے دروازے دکھائے گئے اور مملکتِ یمن کی کنجیاں مجھے دی گئیں۔ پس تم ان خدائی وعدوں پر ایمان لاؤ اور یقین رکھو کہ دشمن تمہارا کچھ بگاڑ نہیں سکتا۔ وہ یقیناً مغلوب ہوگا اور خدا تعالیٰ تمہیں کامیابی و کامرانی عطا فرمائیگا۔ انہی وعدوں کے مطابق اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو اسقدر فتوحات عطا فرمائیں کہ قیصر و کسریٰ جیسی عظیم الشان سلطنتوں کی انہوں نے اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ اور اُن کے بڑے بڑے محلّات اور باغات اور جواہرات اور

بیش قیمت نوادرات مسلمانوں کے قبضہ میں آ گئے۔ انہی فتوحات
کے نتیجہ میں ایک دفعہ کسریٰ شہنشاہ ایران کا وہ رومال جو وہ
تخت پر بیٹھتے وقت اپنے ہاتھ میں رکھا کرتا تھا حضرت
ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے حصہ میں آیا۔ حضرت ابوہریرہؓ
کو ایک دفعہ نزلہ کی شکایت تھی۔ انہیں کھانسی اٹھی تو
انہوں نے کسریٰ شہنشاہِ ایران کا رومال اپنی جیب سے
نکال کر اُس میں تھوک دیا اور پھر بے اختیار کہنے لگے۔
بَخٍ بَخٍ ابوھریرۃ! یعنی واہ وا ابوہریرہ تیری بھی کیا شان
ہے۔ پاس بیٹھنے والوں نے جب اُن کا یہ فقرہ سُنا تو
چونکہ وہ لوگ حدیث العہد تھے انہوں نے دریافت کیا
کہ آپ نے یہ کیا بات کہی ہے۔ انہوں نے کہا۔ ایک ما:
مجھ پر ایسا گذرا ہے جب مجھے سات سات وقت کا فاقہ
آجاتا تھا اور مَیں شدتِ بھوک کی وجہ سے بیہوش ہو جایا کرتا
تھا۔ مگر لوگ غلطی سے یہ سمجھتے کہ مجھے مرگی کا دورہ ہو
گیا ہے اور وہ اس کے علاج کے طور پر عرب کے رسم و رواج
کے مطابق میرے سر پر جوتیاں مارا کرتے تھے حالانکہ مجھے
بھوک کی شدت کی وجہ سے غشی ہوا کرتی تھی نہ کہ کسی بیماری
کی وجہ سے۔ مگر آج محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی غلامی
کی برکت سے میری یہ حالت ہے کہ مَیں کسریٰ شہنشاہِ ایران
کے رومال میں تھوک رہا ہوں۔

اسی طرح ہجرت کے موقعہ پر جب رسول کریم صلی اللہ علیہ
وسلم اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ مدینہ کی طرف تشریف لے
جا رہے تھے تو چونکہ مکہ والوں نے یہ اعلان کر دیا تھا کہ
جو شخص محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو گرفتار کر کے لے
آئیگا اُسے سو اونٹنیاں انعام دی جائینگی۔ اِس لئے کئی
لوگ آپ کی تلاش میں اِدھر اُدھر نکل کھڑے ہوئے۔ اُنہی
لوگوں میں سُراقہ بن مالک ایک بدوی رئیس بھی تھا جو انعام
کے لالچ میں آپؐ کے پیچھے روانہ ہُوا۔ اور جب اُس نے
آپؐ کو دیکھ لیا تو وہ خوشی سے پُھولا نہ سمایا اور اُس نے
سمجھا کہ اب مَیں آپؐ کو گرفتار کرنے میں کامیاب ہو جاؤنگا
مگر اللہ تعالیٰ اُسے اپنا نشان دکھانا چاہتا تھا۔ جب وہ
آگے بڑھا تو اچانک اُس کے گھوڑے نے ٹھوکر کھائی۔
اور وہ زمین پر گر گیا۔ سُراقہؓ جو بعد میں مسلمان ہو گیا تھا
وہ خود اپنا واقعہ اس طرح بیان کرتا ہے کہ جب مَیں گھوڑے
سے گرا تو عرب کے قدیم دستور کے مطابق مَیں نے اپنے تیروں سے
فال لی کہ مجھے آگے بڑھنا چاہیئے یا نہیں۔ اور فال یہ نکلی کہ
آگے نہیں بڑھنا چاہیئے۔ مگر انعام کی لالچ کی وجہ سے مَیں
پھر گھوڑے پر سوار ہو کر آپ کے پیچھے دوڑا۔ جب مَیں
آپ کے اَور قریب پہنچا تو پھر میرے گھوڑے نے ٹھوکر کھائی
اور مَیں نیچے گر گیا۔ اُس وقت مَیں نے دیکھا کہ ریت میں گھوڑے
کے پاؤں اتنے دھنس گئے تھے کہ اُن کا نکالنا میرے لئے
مشکل ہو گیا۔ آخر مَیں نے سمجھ لیا کہ خدا اس شخص کے ساتھ
ہے۔ چنانچہ مَیں یا تو آپؐ کو گرفتار کرنے کیلئے آیا تھا
اور یا خود آپؐ کا عقیدت مند اور شکار بن کر نہایت ادب
کے ساتھ آپ کی خدمت میں حاضر ہُوا۔ اور مَیں نے عرض
کیا کہ مَیں اس ارادہ کے ساتھ آیا تھا مگر اب مَیں نے اپنا
ارادہ تبدیل کر لیا ہے اور واپس جا رہا ہوں کیونکہ مجھے
یقین ہو گیا ہے کہ خدا آپؐ کے ساتھ ہے۔ جب سُراقہ
لَوٹنے لگا تو معًا اللہ تعالیٰ نے سُراقہ کے آئندہ حالاتِ
زندگی آپؐ پر غیب سے ظاہر فرما دیئے۔ اور آپؐ نے اُسے
فرمایا۔ سُراقہ! اُس وقت تیرا کیا حال ہو گا جب شہنشاہِ ایران
کے سونے کے کنگن تیرے ہاتھ میں ہونگے۔ سُراقہ نے حیران
ہو کر کہا۔ کسریٰ بن ہرمز شہنشاہِ ایران کے۔ آپؐ نے فرمایا
ہاں! وہ حیرت و استعجاب کا مجسمہ بن کر واپس چلا آیا۔
مگر اللہ تعالیٰ کی شان دیکھو کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ
میں کسریٰ کا دارالامارۃ مسلمانوں کے گھوڑوں کی ٹاپوں سے
پامال کیا گیا۔ اور ایران کے خزانے مسلمانوں کے قبضہ میں
آئے جن میں وہ کڑے بھی تھے جو شہنشاہِ ایران تخت پر

بیٹھتے وقت اپنے ہاتھوں میں پہنا کرتا تھا - اور جو ہیروں اور جواہرات سے لدے ہوئے تھے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سامنے جب یہ کڑے رکھے گئے تو آپ کو فوراً رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ پیشگوئی یاد آگئی - اور آپ نے فرمایا سراقہ کو بلاؤ - سراقہ آیا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ کسریٰ کے کنگن لو اور اپنے ہاتھوں میں پہنو - سراقہ نے کہا - اے امیر المومنین! سونا پہننا تو مردوں کے لئے منع ہے - آپ نے فرمایا - ٹھیک ہے - مگر اس موقعہ کے لئے نہیں - خدا نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تمہارے ہاتھوں میں سونے کے کنگن دکھائے تھے - اس لئے تمہیں کم سے کم ایک منٹ کے لئے یہ سونے کے کنگن پہننے پڑیں گے تاکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشگوئی پوری ہو ورنہ میں تمہیں سزا دونگا - چنانچہ سراقہ نے وہ کنگن لے کر اپنے ہاتھوں میں ڈالے اور اس طرح مسلمانوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس عظیم الشان پیشگوئی کو اپنی آنکھوں سے پورا ہوتے دیکھا -

غرض اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو ظاہری رنگ میں بھی عرب اور عراق اور شام اور ایران کے باغات اور اُن کے محلات کا مالک بنایا اور اس طرح یہ پیشگوئی پوری ہوئی کہ تَبَارَكَ الَّذِیْٓ اِنْ شَآءَ جَعَلَ لَكَ خَیْرًا مِّنْ ذٰلِكَ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ وَ یَجْعَلْ لَّكَ قُصُوْرًا - مگر چونکہ ہر ظاہر اپنے ساتھ ایک باطن بھی رکھتا ہے اس لئے جہاں اس آیت میں ظاہری باغات اور محلات کے عطا کئے جانے کی پیشگوئی تھی جو مسلمانوں کے عہدِ حکومت میں بڑی شان سے پوری ہوئی اور انہوں نے خود بھی اپنی ترقی کے دَور میں بڑے بڑے باغات اور محلات بنائے جو اُن کی یادگار کے طور پر آج بھی دنیا میں پائے جاتے ہیں - وہاں اس میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو روحانی باغ عطا کئے جانے کا بھی وعدہ کیا گیا تھا - اور بتایا گیا تھا کہ یہ تو تجھ سے وہ باغ مانگتے ہیں جو آج سرسبز و شاداب ہوتا ہے تو کل گل سڑ جاتا ہے - کبھی زمین کی خرابی کی وجہ سے وہ پھل نہیں دیتا - کبھی پانی کی کمی اسے خشک کر دیتی ہے - کبھی بیماریاں اس کے پھلوں کو تباہ کر دیتی ہیں - کبھی ہوائیں اس کے پھولوں کو گرا دیتی ہیں - لیکن ہم تجھے وہ باغات دینے والے ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہونگی - یعنی وہ باغ کبھی خشک نہیں ہونگے بلکہ ہمیشہ ہرے بھرے اور سرسبز و شاداب رہیں گے اور دیکھنے والوں کی آنکھوں کو طراوت اور اُن کے دلوں کو راحت پہنچائیں گے - اور دنیا پر ہمیشہ کے لئے اسلام اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت اور آپ کی حقانیت کو ظاہر کرتے رہیں گے - چنانچہ اس بارہ میں جب قرآن کریم پر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کا مثیل قرار دیا ہے - جیساکہ وہ سورۂ مزمل میں فرماتا ہے کہ اِنَّآ اَرْسَلْنَآ اِلَیْكُمْ رَسُوْلًا ۙ شَاهِدًا عَلَیْكُمْ كَمَآ اَرْسَلْنَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ رَسُوْلًا (مزمل ع) یعنی اے مکہ والو! ہم نے تمہاری طرف اسی طرح ایک رسول تم پر نگران بنا کر بھیجا ہے جس طرح ہم نے موسیٰؑ کو فرعون کی طرف رسول بنا کر بھیجا تھا - پس محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مثیل تھے اور امتِ محمدیہ امتِ موسویہ کی مثیل ہے اور قرآن کریم کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو دو باغ عطا فرمائے تھے جن میں سے ایک تو موسوی باغ تھا اور ایک عیسوی - موسوی قوم کو جو باغات ملے اُن کا ذکر اللہ تعالےٰ نے اس آیت میں فرمایا ہے کہ وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلًا رَّجُلَیْنِ جَعَلْنَا لِاَحَدِهِمَا جَنَّتَیْنِ مِنْ اَعْنَابٍ وَّحَفَفْنٰهُمَا بِنَخْلٍ وَّجَعَلْنَا بَیْنَهُمَا زَرْعًا ۚ كِلْتَا الْجَنَّتَیْنِ اٰتَتْ اُكُلَهَا وَلَمْ تَظْلِمْ مِّنْهُ شَیْـًٔا ۙ وَّفَجَّرْنَا خِلٰلَهُمَا نَهَرًا (کہف ع) یعنی تم ان لوگوں کے سامنے

دو آدمیوں (یعنی مسلمانوں اور مسیحی اقوام) کی حالت بیان کرو جن میں سے ایک یعنی موسیٰؑ کو ہم نے انگوروں کے دو باغ عطا فرمائے - اور انہیں ہم نے کھجوروں کے درختوں سے چاروں طرف سے گھیر لیا - نیز ان دو باغات کے درمیان ہم نے کچھ کھیتی بھی پیدا کی تھی - چنانچہ موسوی باغ بھی خوب پھولا پھلا - اور عیسوی باغ بھی خوب پھولا اور پھلا - لیکن درمیانی عرصہ میں جب کہ بخت نصر نے یہودیوں کو تباہ کر دیا اور اُن کے معابد گرا دیئے اور وہ انہیں قید کر کے اپنے ساتھ لے گیا - اُن کی مثال ایک کھیتی کی سی ہو گئی جو غنم القوم کے چر جانے کے خطرہ میں ہوتی ہے یعنی دشمن قومیں حملہ کر کے اسے لُوٹ کھسوٹ سکتی ہیں - یہی سلسلہ امتِ محمدیہ میں بھی دہرانے کا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے وعدہ کیا گیا تھا - چنانچہ آپ کو موسیٰؑ کا مثیل قرار دے کر اسی طرف اشارہ کیا گیا تھا کہ موسوی قوم کے حالات ایک رنگ میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی پیش آنے والے ہیں یعنی آپؐ کو بھی دو باغ ملیں گے - ایک باغ تو وہ ہو گا جس میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت بغیر کسی اور مامور کی مدد کے دنیا کو اپنا فیض پہنچائے گی - لیکن آخر میں جب مسلمان کمزور ہو جائیں گے اللہ تعالیٰ موسوی سلسلہ کی طرح ایک محمدی مسیح ان میں بھیجے گا جس کی جماعت ایک دوسرے باغ کی حیثیت رکھے گی لیکن ہو گی وہ بھی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت اور اُس کا باغ بھی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا باغ ہی کہلائے گا لیکن اس فرق سے کہ موسوی سلسلہ کے دوسرے حصہ کی بنیاد جس مسیح سے پڑی تھی وہ مستقل نبی تھا مگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ موسیٰؑ سے افضل ہیں اس لئے آپؐ کے دوسرے باغ کی بنیاد جس مسیح سے پڑے گی - وہ امتی نبی ہو گا - یعنی وہ خود بھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت میں سے ہو گا اور اُس کے ماننے والے بھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی امت میں ہی ہوں گے - چنانچہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دو باغ عطا کئے گئے - ایک باغ مسیح موعود کے ظہور سے پہلے زمانہ میں اور ایک باغ مسیح موعود کے ظہور کے بعد کے زمانہ میں - پھر پہلے زمانہ میں دنیوی لحاظ سے بھی وہی باغ آپ کو ملا جو موسیٰؑ کی امت کو ملا تھا - یعنی فلسطین اور کشمیر کا علاقہ - اور یہ دونوں علاقے ایسے ہیں جو باغات کی کثرت کی وجہ سے مشہور ہیں - چنانچہ ۱۹۲۴ء میں جب میں یورپ گیا تو فلسطین میں بھی گیا تھا - میں ریل میں دمشق سے بیروت آیا - جب ہم بیروت کے قریب پہنچے تو میں نے دیکھا کہ ریل شہر کے اندر سے گذر رہی ہے اور ہر گھر میں باغیچے لگے ہوئے ہیں - اسی طرح دمشق میں میں نے دیکھا کہ گھر گھر میں نہریں جاری تھیں - اور ہر گھر میں باغ لگا ہوا تھا - یہی حال کشمیر کا ہے کہ وہاں چپّے چپّے پر باغ ہیں کچھ تو خود رو ہیں - اور کچھ مغل بادشاہوں نے لگائے ہیں - اس میں کوئی شبہ نہیں کہ محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا مادی باغ کشمیر اس وقت ہندوؤں کے قبضہ میں ہے اور فلسطین یہودیوں کے قبضہ میں ہے مگر اللہ تعالیٰ یہ دونوں باغ اپنے فضل سے پھر محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو واپس دلائے گا - اسی طرح اللہ تعالیٰ نے چاہا تو یہ دونوں باغات رُوحانی طور پر بھی محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو مل جائیں گے - یعنی اللہ تعالیٰ یہودی قوم کو بھی مسلمان بنا دیگا اور وہ محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے حلقہ بگوش ہو جائیں گے - اور بجائے اس کے کہ مسلمانوں کو توپیں اور بندوقیں لے کر فلسطین پر حملہ کرنا پڑے یہودی خود آگے بڑھ کر بیت المقدس کے دروازے کھول دیں گے اور کہیں گے کہ اے مسلمانو! ہم بھی تمہارے مسلمان بھائی ہیں - تم خوشی سے ہمارے پاس آؤ اور مسیح موعود کی امت بھی

دوبارہ فتح کی جائیگی - اور اسلام لائیگی - پھر محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے باغ کا ایک حصہ بن جائے گی لطیفہ یہ ہے کہ دنیا میں اور لوگ باغ لگاتے رہے لیکن وہ باغ محمد رسول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) کو مل گئے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بڑی کوشش اور جد و جہد سے یہودی بنائے اور اُن کو فلسطین میں بسایا۔ لیکن خدا نے محمد رسول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) کو بنا بنایا فلسطین دے دیا۔ پھر موسیٰ علیہ السلام کی قوم ہجرت کر کے کشمیر آئی اور خدا تعالیٰ نے بنا بنایا کشمیر محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو دے دیا۔ اور اب حضرت مسیح موعود علیہ السلام کا لگا لگایا باغ بھی محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو ہی مل گیا۔ چنانچہ دنیا کے کناروں تک احمدی مبلّغ تبلیغ کرتے اور لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ پڑھوا کر لوگوں کو اپنے ساتھ ملاتے ہیں۔ اُن میں سے کوئی بھی یہ نہیں کہتا کہ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مَسِيْحٌ مَوْعُوْدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ کیونکہ وہ جانتا ہے کہ مسیح موعودؑ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے امتی ہیں۔ کوئی مستقل نبی نہیں بلکہ آپ کو مستقل نبی قرار دینا کفر ہے۔ گویا جو درخت بھی اُنکو ملتا ہے وہ لا کر محمد رسول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) کے چمن میں لگا دیتے ہیں۔ موسیٰؑ کے باغ میں تو صرف ایک بڑا درخت پیدا ہوا تھا جس کا نام داؤد تھا۔ مگر محمد رسول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) کے چمن کا ایک درخت یعنی مسیح موعودؑ دعویٰ کرتا ہے کہ مَیں ہی محمد رسول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) کے چمن کا داؤد نامی درخت نہیں بلکہ مجھ سے اور بھی کئی بیج نکلنے والے ہیں جن سے بہت سے داؤد پیدا ہونگے اور اس طرح محمد رسول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) کے چمن میں ہزاروں داؤدی شجر پیدا ہو جائیں گے۔ چنانچہ آپ نے فرمایا ؎

اِک شجر ہوں جس کو داؤدی صفت کے پھل لگے
مَیں ہُوا داؤد اور جالوت ہے میرا شکار

یعنی مَیں محمد رسول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) کے باغ کا ایک درخت ہوں۔ جو خود ہی داؤد نہیں بلکہ میرے اندر جو پھل لگ رہے ہیں وہ بھی داؤدی صفت کے ہیں۔ یعنی مَیں ہی داؤد نہیں بلکہ میرے ماننے والے مریدوں میں سے بھی ہزاروں داؤد پیدا ہونگے۔ اِسی طرح فرمایا ؎

میں کبھی آدمؑ کبھی موسیٰؑ کبھی یعقوبؑ ہوں
نیز ابراہیمؑ ہوں نسلیں ہیں میری بے شمار

اگر موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کو بنی اسرائیل کی تعداد پر فخر ہے تو میرے ذریعے سے اللہ تعالیٰ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بے شمار نسلیں عطا فرمائیگا۔ اور محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا باغ دنیا کے چپّہ چپّہ پر پھیل جائیگا۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں بھی یہی نمونہ اللہ تعالےٰ نے دکھلایا اور اس نے لوگوں کے لگائے ہوئے درخت آپؐ کے چمن میں لا کر لگا دیئے۔ چنانچہ ابوجہل کے باغ کا درخت عکرمہؓ وہاں سے اکھیڑ کر آپ کے باغ میں لگا دیا گیا۔ اِسی طرح رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مشہور دشمن ولید اور عاص بن وائل تھے۔ ولید کا بیٹا خالد تھا جو ولید کے چمن سے کاٹ کر محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے چمن میں لگا دیا گیا۔ اور آج عالم اسلام خالدؓ بن ولید جیسے بہادر جرنیل کے کارناموں پر فخر کرتا ہے وہ بوٹا تھا محمد رسول اللہ کے ایک شدید دشمن کا۔ لیکن اُس نے پھل محمد رسول اللہ کے باغ میں آکر دینا شروع کیا۔ اس سے پہلے وہ مکّہ کے ایک نمبردار کا بیٹا تھا۔ لیکن محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے باغ میں لگنے کے بعد روم اور کسریٰ کے بادشاہ اس کے سائے میں بیٹھنے لگ گئے۔ پھر اس کے علاوہ آپؐ کے باغ کے کچھ درخت وہ تھے جو براہِ راست آپؐ نے لگائے۔ جیسے ابوبکرؓ۔ عمرؓ۔ عثمانؓ اور علیؓ۔ حضرت ابوبکرؓ یہ لوگ ایک کچی کوٹھری میں مدینہ میں بیٹھے ہوتے تھے لیکن

قیصر اپنے محل میں ان کے نام سے کانپتا تھا۔ اور کسریٰ اپنے محل میں ہزاروں میل پر بیٹھا ہوا اُن سے لرزہ براندام رہتا تھا۔ اسی طرح محمدی باغ میں ایک پودا حضرت حسن بصریؒ کا لگا۔ ایک پودا حضرت جنیدؒ بغدادی کا لگا۔ ایک پودا حضرت سید عبدالقادر صاحب جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کا لگا۔ ایک شبلی رحمۃ اللہ علیہ کا لگا۔ ایک حضرت محی الدین صاحب ابن عربی کا لگا۔ ایک امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کا لگا ایک ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ کا لگا۔ ایک حضرت شہاب الدین صاحب سہروردی رحمۃ اللہ علیہ کا لگا۔ ایک حضرت بہاؤ الدین صاحب نقشبندی رحمۃ اللہ علیہ کا لگا۔ ایک حضرت معین الدین صاحب چشتی رحمۃ اللہ علیہ کا لگا۔ ایک حضرت سلیم چشتی رحمۃ اللہ علیہ کا لگا۔ ایک حضرت قطب الدین صاحب بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ کا لگا۔ ایک حضرت فرید الدین صاحب شکر گنج رحمۃ اللہ علیہ کا لگا۔ ایک حضرت نظام الدین صاحب اولیاء رحمۃ اللہ علیہ کا لگا۔ ایک حضرت باقی باللہ رحمۃ اللہ علیہ کا لگا۔ ایک حضرت داتا گنج بخش صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا لگا۔ ایک حضرت مجدد صاحب سرہندی رحمۃ اللہ علیہ کا لگا۔ ایک حضرت شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کا لگا۔ ایک حضرت خواجہ میر محمد ناصر رحمۃ اللہ علیہ کا لگا۔ ایک حضرت سید احمد صاحب بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کا لگا۔ اور سب سے آخر میں باغ محمدی کی حفاظت کرنے والے درخت مسیح موعود علیہ السلام کا پودا لگا جس کو خود مسلمانوں نے بدقسمتی سے کاٹنا چاہا۔ تاکہ محمدی باغ میں دشمن گھس جائے اور اُسے تباہ کر دے۔ مگر وہ پودا اس شان کا تھا کہ اُس نے کہا ؎

اے آنکہ سوئے من بدویدی بصد تبر
از باغباں بترس کہ من شاخ مثمرم

یعنی اے وہ شخص جو سو سو کلہاڑے لے کر میرے کاٹنے کے لئے دوڑا چلا آرہا ہے تو میرے باغبان خدا سے ڈر کہ میں وہ شاخ ہوں جس کو پھل لگے ہوئے ہیں۔ اگر تو مجھے کاٹے گا تو محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا پھل کٹ جائیگا اور نتیجہ یہ ہوگا کہ محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا باغ باڑ کے بغیر رہ جائے گا۔ پس تو مجھے نہیں کاٹ رہا تو محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے باغ کو اجاڑ رہا ہے اور خدا کبھی برداشت نہیں کرے گا کہ محمد رسول اللہ کا باغ اُجڑے وہ ضرور اس کی حفاظت کریگا۔ چنانچہ آسمان سے اللہ تعالیٰ مسیح موعودؑ کی حفاظت کے لئے اُترا اور باوجود اس کے کہ سب مولویوں نے اکٹھے ہو کر حملہ کیا۔ اللہ تعالیٰ سینہ سپر ہو کر کھڑا ہو گیا۔ اور اُس نے کہا کہ میں محمد رسول اللہ کے باغ کو نہیں اُجڑنے دونگا۔ چنانچہ اُس نے تمام مخالفین کے حملوں کو ناکام کر دیا۔ غرض بڑی برکت والا ہے وہ خدا جس نے مسیح موعودؑ جیسا غلام محمد رسول اللہ کو دیا جس نے محمد رسول اللہ کا باغ جب اُجڑ کے کھیتی بننے لگا تھا تو پھر اُس کو ایک ہرے بھرے باغ کی شکل میں تبدیل کر دیا اور اس کے رکھوالوں کو دُنیا کے کناروں تک پھیلا دیا۔ تاکہ وہ ہر ملک میں جائیں۔ ہر قوم میں جائیں اور ہر جگہ پر جا کر وہاں سے عیسیٰؑ کے باغ کے پودوں کو نکال نکال کر محمد رسول اللہ کے باغ میں لگائیں۔ اسی طرح موسیٰؑ کے پودوں کو اکھیڑ اکھیڑ کے محمد رسول اللہ کے باغ میں لگائیں۔ یہاں تک کہ دُنیا کے چپے چپے میں محمد رسول اللہ کے باغ لگ جائیں اور اس کا نتیجہ یہ ہو کہ بنی اسرائیل جو پہلے زمانہ میں مسلمان نہیں ہوئے اس آخری موعود کے ذریعہ اسلام میں داخل ہو جائیں اور یہودیت اور عیسائیت کا جھگڑا ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے اور صرف اسلام یا محمدیت ہی باقی رہے۔

پھر فرماتا ہے۔ وَيَجْعَلْ لَّكَ قُصُوْرًا۔ اللہ تعالیٰ تجھے ایک نہیں بلکہ بہت سے قصر عطا فرمائیگا۔

یعنی ایسے شاگرد تجھے ملیں گے جو اسلام کو دشمنوں کے حملوں سے بچاتے رہیں گے - اور اُس کے حُسن کو دنیا پر ظاہر کرتے رہینگے تاریخ میں لکھا ہے کہ جب حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ فوت ہوئے تو ایک مجذوب اُن کے جنازہ پر آیا - اور یہ شعر پڑھ کر رونے لگ گیا کہ ؎

واأسفاعلى فراق قوم ؛ هُم المصابيح والحصون
والمدن والمزن والرواسي ؛ والخير والامن والسكون
لم يتغير لنا الليالي ؛ حتى توفاهم المنون
فكل جمر لنا قلوب ؛ وكل ماءٍ لنا عيون

یعنی افسوس ہے کہ موت نے ہم سے وہ لوگ جُدا کر دیئے جو تاریکیوں میں ہمارے لئے شمعِ ہدایت تھے اور مصیبتوں میں ہمارے لئے قلعوں کا کام دیتے تھے - جو فیوض اور برکات کے جامع ہونے کے لحاظ سے ایک شہر کی حیثیت رکھتے تھے اور خدا تعالیٰ کے انوار اور اس کے روحانی انعامات کی ایک بارش تھے - وہ عزائم کی بلندی اور حوادث کے تھپیڑوں کا مقابلہ کرنے میں ایک پہاڑ کی طرح تھے - اور دنیا کے لئے سراسر خیر اور امن اور سکون کا موجب تھے - زمانہ نے ہمیں اسی وقت اپنے انقلاب کا شکار بنایا جب موت نے ان بابرکت وجودوں کو ہم سے جُدا کر دیا - اب ہمارا یہ حال ہے کہ دل اُن کی جدائی میں غم واندوہ سے انگارے کی طرح جل رہے ہیں اور آنکھیں اُن کی یاد میں پانی بن کر بہ رہی ہیں -

یہ اشعار بتاتے ہیں کہ مردِ کامل کو بھی ایک قلعہ یا محل کہا جاتا ہے - کیونکہ اس کے ذریعہ سے دنیا کی حفاظت ہوتی ہے - بس اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ تو تجھ سے دنیوی خزانے اور مادی محلات اور ظاہری شان و شوکت کے آثار طلب کرتے ہیں اور ہم نے تو تیرے لئے بڑے بڑے عالی شان محل تیار کر چھوڑے ہیں جو ان کے واہمہ اور گمان میں بھی نہیں - یعنی اعلیٰ درجہ کے روحانی شاگرد اور اولیاء اللہ تیار کئے ہیں جن کی حفاظت میں مسلمان ہمیشہ ترقی کرتے چلے جائیں گے - چنانچہ اللہ تعالےٰ نے اس وعدہ کے مطابق ہر صدی میں ایسے صلحاء اور اولیاء اور ابدال اور اقطاب اور مجدد دین کھڑے کئے جنہوں نے اسلام کو ہر قسم کے اندرونی اور بیرونی دشمنوں کے حملوں سے بچایا اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لگائے ہوئے باغ کی ایک ادنیٰ چاکر اور غلام بن کر خدمت کی اور اُس کے پھولوں اور پھلوں کی حفاظت میں اپنی عمریں بسر کر دیں - آج بھی ہر شہر اور ہر گاؤں جس میں مسلمانوں کی آبادی ہے اس کے قبرستانوں میں کوئی نہ کوئی قبر کسی ایسے بزرگ یا ولی کی ضرور پائی جاتی ہے جس نے اسلام اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت اپنے علاقہ میں قائم کی اور اسلامی برکات سے لوگوں کو روشناس کیا - اور یقیناً ایسے لوگوں کو اگر شمار کیا جائے تو اُن کی تعداد لاکھوں سے بھی متجاوز ہو جائیگی -

اِس کے مقابلہ میں دنیا کا اور کوئی مذہب ایسا نہیں، جس کے ماننے والے کسی ایسے شخص کو پیش کر سکیں جس نے اُن کے مذہب پر چل کر خدا تعالیٰ کا قرب حاصل کیا ہو - یا وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اپنے مذہب کی تجدید اور اس کی اشاعت کے لئے مبعوث ہُوا ہو - یہ عملی نظارہ اس بات کا ثبوت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے باقی تمام مذاہب کو ترک کر دیا ہے اور صرف اسلام سے ہی اپنی محبت اور تعلق کو مخصوص کر لیا ہے - اب وہی شخص اللہ تعالےٰ کا قرب حاصل کر سکتا ہے جو محمدی باغ کا خوشہ چین بنے اور اُسی شخص کے سپرد اصلاحِ خلق کا کام ہوتا ہے جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک ادنیٰ غلام بن کر آپؐ کے مقدس باغ کی رکھوالی کا کام کرے کیونکہ اب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لگائے ہوئے باغ کے سوا باقی تمام باغ خشک ہو چکے ہیں جن کی حفاظت اور نگرانی کے لئے کسی باغبان کی ضرورت نہیں - ہرا بھرا باغ اور ہر قسم کے پھولوں اور پھلوں سے لدے ہوئے درخت

بَلْ كَذَّبُوْا بِالسَّاعَةِ ۫ وَاَعْتَدْنَا لِمَنْ كَذَّبَ بِالسَّاعَةِ

حق یہ ہے کہ یہ لوگ قیامت کا انکار کر رہے ہیں - اور ہم نے اُس کے لئے جو قیامت کا منکر ہو بھڑکنے والے عذاب

سَعِيْرًا ﴿۱۲﴾ اِذَا رَاَتْهُمْ مِّنْ مَّكَانٍۢ بَعِيْدٍ سَمِعُوْا لَهَا

کا انتظام کر چھوڑا ہے - جب وہ (یعنی جہنم) اُن کو دُور سے دیکھے گی تو وہ اُس کے جوش کی اور (آنیوالی) مصیبت کی

تَغَيُّظًا وَّزَفِيْرًا ﴿۱۳﴾ وَاِذَآ اُلْقُوْا مِنْهَا مَكَانًا ضَيِّقًا مُّقَرَّنِيْنَ

آواز کو سنیں گے - اور جب وہ اُس (یعنی دوزخ) کے ایک تنگ حصہ میں شکیں باندھے ہوئے پھینکے جائیں گے

دَعَوْا هُنَالِكَ ثُبُوْرًا ﴿۱۴﴾ لَا تَدْعُوا الْيَوْمَ ثُبُوْرًا وَّاحِدًا

اور وہ اُسوقت موت کی آرزو کریں گے - (تب خدا کے فرشتے اُن سے کہیں گے) آج ایک موت کی آرزو نہ کرو بلکہ

وَّادْعُوْا ثُبُوْرًا كَثِيْرًا ﴿۱۵﴾

بار بار موت کی خواہش کرو (کیونکہ تم پر بار بار عذاب آنیوالے ہیں) ۔

صرف محمدی باغ میں ہی پلئے جاتے ہیں جس کے متعلق یہ الٰہی فیصلہ ہے کہ وہ ہمیشہ سرسبز و شاداب رہے اور قیامت تک اس کی حفاظت کے لئے خدا تعالیٰ کی طرف سے نگرانوں اور محافظوں کا سلسلہ جاری رہے ۔

حل لغات

زَفِيْرٌ : اَلزَّفِيْرُ: تَرَدُّدُ النَّفَسِ حَتّٰى تَنْتَفِخَ الضُّلُوْعُ مِنْهُ یعنی سانس کے اندر جانے اور اُس سے پسلیوں کے پھولنے کو زفیر کہتے ہیں (مفردات)

اَلزَّفِيْرُ : اَلدَّاهِيَةُ - مصیبت - اَوَّلُ صَوْتِ الْحِمَارِ وَالشَّهِيْقُ اٰخِرُهٗ - نیز گدھے کی آواز کے ابتدائی حصہ کو زفیر کہتے ہیں اور آخری آواز کو شہیق کہتے ہیں (اقرب)

مُقَرَّنِيْنَ : قَرَّنَ سے اسم مفعول کا جمع کا صیغہ ہے - اور جب قُرِّنَتِ الْاُسَارٰى فِى الْحِبَالِ کا فقرہ کہیں تو معنے یہ ہوتے ہیں کہ جُمِعَتْ رسیوں میں قیدیوں کو باندھا گیا (اقرب) پس مُقَرَّنِيْنَ کے معنے ہونگے رسیوں میں باندھے ہوئے ۔

ثُبُوْرًا : ثَبَرَ کا مصدر ہے اور ثَبَرَ ثُبُوْرًا کے معنے ہیں هَلَكَ - وہ ہلاک ہوگیا - اور جب ثَبَرَ اللّٰهُ زَيْدًا کہیں تو اس کے معنے ہونگے اَهْلَكَهٗ اِهْلَاكًا دَائِمًا لَا يَنْتَعِشُ بَعْدَهٗ کہ اللہ تعالیٰ نے زید کو اِس طرح تباہ کیا کہ جس کے بعد اُس کے لئے اُٹھنے کا کوئی امکان نہ رہا - وَالنَّصْبُ فِىْ قَوْلِهٖ وَ دَعَوْا هُنَالِكَ ثُبُوْرًا عَلَى الْمَصْدَرِ كَاَنَّهُمْ قَالُوْا ثَبَرْنَا ثُبُوْرًا - اور آیت دَعَوْا هُنَالِكَ ثُبُوْرًا میں ثُبُوْرًا پر نصب آئی ہے گویا اس سے پہلے فعل محذوف ہے اور مُراد یہ ہے کہ وہ پکاریں گے کہ ہم پوری طرح ہلاک ہوگئے ہیں (اقرب)

ثُبُوْرًا

زَفِيْرٌ

مُقَرَّنِيْنَ

تفسیر: فرماتا ہے۔ ان لوگوں کو تو جزاء و سزا پر ایمان ہی نہیں۔ ورنہ یہ لوگ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات دیکھ کر آپ کی ترقی میں کسی قسم کا شبہ نہ کرتے۔ اب یہ لوگ آپؐ کی ترقی دیکھیں گے تو اُن کے دل جلتے چلے جائیں گے۔ وہ دوزخ جو اللہ تعالیٰ نے اُن کے دلوں میں تیار کی ہے جب وہ ان کو دُور سے دیکھیگی تو ان لوگوں کو نظر آ جائیگا کہ اب اس دوزخ سے بھاگنے کا کوئی راستہ نہیں۔ اس جگہ کہا تو یہ گیا ہے کہ جب دوزخ انہیں دُور سے دیکھے گی۔ مگر مراد یہ ہے کہ جب یہ لوگ اسے دُور سے دیکھیں گے۔ اس قسم کی زبان کو عربی میں تقلیبِ نسبت کہتے ہیں۔ یہ ایسی ہی بات ہے جیسے ہماری زبان میں کہتے ہیں کہ پرنالہ چلتا ہے حالانکہ پرنالہ نہیں چلتا بلکہ پانی چلتا ہے۔ یا کہتے ہیں کہ سورج زمین کے گرد چکر کھا رہا ہے حالانکہ سورج زمین کے گرد چکر نہیں کھا رہا بلکہ زمین سورج کے گرد چکر کھا رہی ہے۔ اسی طرح یہاں بھی تقلیبِ نسبت سے کام لیتے ہوئے کہا تو یہ گیا ہے کہ جب دوزخ اُن کو دُور سے دیکھیگی لیکن مُراد یہ ہے کہ جب وہ لوگ دوزخ کو دُور سے دیکھیں گے۔ یعنی جونہی اِس دوزخ کے سامان پیدا ہونگے تو اُن کو نظر آ جائے گا کہ اب اس دوزخ سے بھاگنے کی کوئی جگہ نہیں۔ اور جب وہ اِس دوزخ میں ڈالے جائیں گے یعنی مسلمانوں کی ترقی کو دیکھ کر رنج و غم اور حسرت و افسوس کے دوزخ میں گرینگے تو اُس وقت اُن کے ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے ہوں گے یعنی اُن کی مقابلہ کی طاقت بالکل زائل ہو چکی ہوگی۔ اور وہ ملک کو اپنے لئے تنگ پائیں گے اور کوشش کرینگے کہ کسی دوسرے ملک میں بھاگ جائیں۔ جیسے فتح مکہ کے بعد عکرمہؓ نے چاہا کہ وہ بھاگ کر حبشہ چلا جائے لیکن فرماتا ہے۔ انہیں بھاگنے کی بھی کوئی جگہ نہیں ملے گی۔ کیونکہ وہ جہاں جائیں گے مسلمانوں کو غلبہ میسر آ جائیگا۔ اُس وقت یہ لوگ دعائیں کرینگے کہ یا اللہ ہم کو موت دے دے تاکہ ہم مسلمانوں کی یہ ترقی نہ دیکھیں۔ تب آسمان کے فرشتے کہیں گے کہ ایک موت کا تو سوال ہی نہیں تم پر تو ہلاکت پر ہلاکت آنیوالی ہے۔ یعنی ابھی تو تم پر اور بھی عذاب آئیں گے اور تم انکو دیکھ کر اور بھی گھبراؤ گے کیونکہ اب الٰہی فیصلہ یہی ہے کہ مسلمان بڑھتے چلے جائیں گے اور تم کمزور ہی کمزور ہوتے چلے جاؤ گے۔

اِن آیات میں ساعۃ کا لفظ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے غلبہ اور آپؐ کی کامیابی کے معنوں میں استعمال کیا گیا ہے۔ کیونکہ تمام اولوالعزم انبیاء دنیا کے لئے ایک قیامت ہوتے ہیں جو پُرانے نظام کی جگہ ایک نیا نظام قائم کرتے ہیں اور سابق عمارات کو گرا کر ایک نئی روحانی عمارت کھڑی کرتے ہیں۔ اُن کے زمانہ میں یوم القیامۃ کی یہ دونوں خصوصیات یعنی اہلِ زمانہ کی موت اور پھر ان کا دوبارہ احیاء اپنی پوری شان کے ساتھ جلوہ گر ہوتی ہیں۔ چنانچہ ایک قیامت تو اُن کے ذریعہ یہ ظاہر ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اُن کی جماعت کو ترقی دیتا اُسے دُنیا میں غلبہ عطا کرتا اور اُسے نئے سرے سے زندگی بخشتا ہے۔ اور ایک قیامت اُن کے ذریعہ یہ ظاہر ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اُن کے دشمنوں کو تباہ و برباد کر دیتا ہے۔ گویا ایک طرف اگر اُن کے ذریعہ دنیا میں حشر برپا ہو جاتا ہے اور مُردے زندہ ہونے لگتے ہیں تو دوسری طرف ہلاکت کا عذاب دنیا کے ایک حصے پر وارد ہو جاتا ہے۔ اور قیامت بھی دو ہی طرح وارد ہوگی۔ ایک حشر کے ذریعہ اور ایک ہلاکت کے ذریعہ۔ قیامت اسی کا نام ہے کہ ایک زمانہ میں سب لوگ مر جائیں گے اور قیامت اسی کا نام ہے کہ ایک زمانہ میں سب لوگ زندہ ہو جائیں گے۔ پس قیامت کے دو حصے ہیں ایک لوگوں کا مر جانا اور ایک لوگوں کا زندہ ہو جانا۔ جب کبھی دنیا میں اللہ تعالیٰ کا کوئی نبی آیا ہے۔ یہ

دونوں باتیں ظاہر ہوئی ہیں - اس کے ذریعہ کچھ لوگ مر بھی گئے ہیں اور اس کے ذریعہ کچھ لوگ زندہ بھی ہوئے ہیں - جو لوگ اس کے دشمن تھے وہ بحیثیت قوم تباہ کر دیئے گئے اور جو لوگ اس کے ساتھی تھے وہ بحیثیت قوم ترقی پا گئے - پس اس آیت میں ساعۃ سے مراد وہ دن ہے جس دن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فتح حاصل ہوئی اور کفار کو شکست جس دن دنیا نے یہ عجیب نظارہ دیکھا کہ وہ جو مکہ کی گلیوں میں بے یار و مددگار اور یکہ و تنہا پھرا کرتا تھا وہ تو بادشاہ ہو گیا اور وہ جو ملک کے بادشاہ تھے اس کے محکوم اور غلام بن گئے -

پھر فرماتا ہے وَاَعْتَدْنَا لِمَنْ كَذَّبَ بِالسَّاعَةِ سَعِيْرًا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی کامیابی کا انکار کرنے والوں کے لئے ہم نے ایک آگ تیار کی ہے جس کے شعلے انہیں ہر وقت بھسم کرتے رہیں گے - چنانچہ ایک آگ تو خدا تعالےٰ نے ان کے لئے اس طرح تیار کی کہ وہ رات اور دن جس مذہب کو مٹانے کے لئے کمربستہ رہتے تھے اس مذہب کو ان کے بیٹوں اور بیٹیوں اور بھائیوں اور بہنوں نے قبول کرنا شروع کر دیا یہاں تک کہ اسلام مکہ کی چار دیواری سے نکل کر عرب کے اکناف میں پھیل گیا - اور پھر عرب سے نکل کر ساری دنیا کو اس نے اپنے تسلط میں لے لیا - جب کفار کے اپنے بیٹے اور پوتے اسلام کی آغوش میں آکر لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ پڑھتے ہونگے - تو ان کے دل غم و غصہ کے جذبات سے کس طرح جل جل کر خاکستر ہوتے ہونگے اور وہ کتنا بڑا عذاب محسوس کرتے ہونگے -

پھر دوسری آگ خدا تعالیٰ نے ان کے لئے اس طرح بھڑکائی کہ وہ ان کے بڑے بڑے لیڈروں کو اپنی قدرت کے زبردست ہاتھ سے ان کے گھروں سے نکال کر بدر کے میدان میں لایا اور انہیں گنتی کے چند ناتجربہ کار اور غیر مسلح مسلمانوں کے ہاتھوں سے اس طرح مروایا کہ مکہ کے گھر گھر میں صفِ ماتم بچھ گئی اور ان کی ریڑھ کی ہڈی ٹوٹ گئی - ابوجہل ان کا بڑا مشہور جرنیل تھا مگر بدر کے میدان میں دو نوعمر انصاری لڑکوں نے اس پر ایسا تاک کر حملہ کیا کہ وہ زخموں سے نڈھال ہو کر گر گیا اور کفار ایسے سراسیمہ ہوئے کہ وہ اپنے اس مشہور جرنیل کو خاک و خون میں تڑپتا چھوڑ کر مکہ کو بھاگ کھڑے ہوئے -

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کہتے ہیں کہ جنگ کے بعد میں نے دیکھا کہ ابوجہل ایک جگہ زخموں کی شدت کی وجہ سے کراہ رہا ہے - میں اس کے پاس گیا اور میں نے کہا - سناؤ کیا حال ہے ؟ اس نے کہا - مجھے اپنی موت کا کوئی غم نہیں - سپاہی آخر مرا ہی کرتے ہیں - مجھے تو یہ غم ہے کہ مدینہ کے دو انصاری لڑکوں کے ہاتھوں سے میں مارا گیا اب تم صرف اتنا احسان کرو کہ تلوار سے میری گردن کاٹ دو تاکہ میری یہ تکلیف ختم ہو جائے - مگر دیکھنا میری گردن ذرا لمبی کاٹنا - کیونکہ جرنیلوں کی گردن ہمیشہ لمبی کاٹی جاتی ہے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے کہا - میں تیری اس آخری حسرت کو بھی کبھی پورا نہیں ہونے دونگا اور ٹھوڑی کے قریب سے تیری گردن کاٹوں گا - چنانچہ انہوں نے ٹھوڑی کے قریب تلوار رکھ کر اس کا سر تن سے جدا کر دیا - اب دیکھو یہ کتنی بڑی آگ تھی جو ابوجہل کو جلا کر راکھ کر رہی تھی کہ وہ مدینہ کے دو ناتجربہ کار اور نوعمر لڑکوں کے ہاتھوں مارا گیا - اور پھر مرتے وقت اس نے جو آخری خواہش کی تھی وہ بھی پوری نہ ہوئی - اور ٹھوڑی کے پاس سے اس کی گردن کاٹی گئی -

پھر اس آگ نے صرف ابوجہل کو ہی خاکستر نہیں کیا بلکہ اس کے شعلے مکہ کے گھر گھر پہنچے اور انہوں نے ہر کافر اور بت پرست کو اس آگ کا شکار بنا دیا - چنانچہ تاریخ میں لکھا ہے کہ شکست کھانے کے بعد

مکہ والوں کی ایسی دردناک کیفیت ہوگئی کہ انہوں نے سمجھا کہ اگر آج ماتم کیا گیا تو مکہ کی تمام عزت خاک میں مل جائیگی پس عرب کے اُن لیڈروں نے جو زندہ تھے آپس میں مشورہ کرکے فیصلہ کیا کہ کوئی شخص بدر کے مقتولین کا ماتم نہ کرے اور اگر کوئی شخص ماتم کرے تو اسے قوم میں سے نکال دیا جائے اُس کا بائیکاٹ کیا جائے اور اُس پر جرمانہ کیا جائے۔ عرب ایک قبائلی قوم تھی اور جو قبائلی قومیں ہوتی ہیں اُن میں قومی رُوح انتہا درجہ کی شدید ہوتی ہے پس اس حکم کی خلاف ورزی اُن کے لئے ناممکن تھی۔ مائیں اپنے کلیجوں پر سل رکھ کر۔ باپ اپنے دلوں کو مسوس کر اور بچے اپنی زبانوں کو دانتوں تلے دبا کر بیٹھ گئے۔ اور اُن کے منہ سے آہ بھی نہیں نکلتی تھی۔ کیونکہ اُن کی قوم کا یہ فیصلہ تھا کہ آج رونا نہیں تا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھی خوش نہ ہوں۔ اور وہ یہ نہ کہیں کہ دیکھا ہم نے مکہ والوں کو کیسی شکست دی۔ مگر دل تو جل رہے تھے سینوں میں سے شعلے تو نکل رہے تھے۔ جگر تو ٹکڑے ٹکڑے ہو رہے تھے۔ وہ دروازے بند کرکے تاریک گوشوں میں بیٹھتے اور دبی ہوئی آوازوں کے ساتھ روتے تا کسی کو یہ پتہ نہ لگے کہ وہ رو رہا ہے۔ مگر یہ رونا اُنکی تسلّی کا موجب نہیں تھا۔ کیونکہ انسان غم کے وقت دوسرے سے تسلّی چاہتا ہے۔ بیوی چاہتی ہے کہ خاوند میرے دکھ پر افسوس کرے۔ باپ چاہتا ہے کہ بیٹا میرے غم میں حصّہ لے اور بیٹا چاہتا ہے کہ باپ میرے غم میں حصّہ لے۔ اِسی طرح ہمسایہ چاہتا ہے کہ ہمسایہ والے میرا غم بٹائیں اور اگر کوئی ایسا ماتم ہو جائے جس کا اثر سینکڑوں اور ہزاروں لوگوں پر ہو تو اُسوقت سب لوگ چاہتے ہیں کہ ایک دوسرے کے ساتھ ہمدردی کریں اور اس طرح اپنے دُکھ درد کو کم کریں۔ پس تنہائی کے گوشوں میں ان کا بیٹھ کر رونا اُن کی تسلّی کا موجب نہیں تھا۔ مہینہ گذر گیا اور برابر یہ حکم نافذ رہا۔ اِس عرصہ میں وہ آگ جو انہوں نے اپنے سینوں میں دبا رکھی تھی سلگتی رہی۔ آخر مہینہ کے بعد ایک دن ایک مسافر وہاں سے گذرا۔ اُس کی ایک اونٹنی تھی جو راہ میں ہی مرگئی وہ اُس اونٹنی کے غم میں چیخیں مار مار کر روتا جا رہا تھا۔ اور کہتا جا رہا تھا کہ ہائے میری اونٹنی مرگئی۔ ہائے میری اونٹنی مرگئی۔ تب مکہ کا ایک بوڑھا شخص جو اپنے مکان کے دروازے بند کرکے اندر بیٹھا ہوا تھا۔ اُس نے اپنے مکان کے دروازے کھول دئے اور بازار میں آکر اُس نے زور زور سے پیٹنا اور چلّا چلّا کر یہ کہنا شروع کر دیا کہ اس شخص کو اپنی اونٹنی پر رونے کی تو اجازت ہے مگر میرے دو نوجوان بیٹے مارے گئے اور مجھے اُن پر رونے کی اجازت نہیں دی جاتی۔ یہ ایک نعرہ تھا جو اُس نے لگایا اور جس نے مکہ میں ایک شعلہ کا کام دیا۔ اِس کے بعد نہ کسی کو قانون کا خیال رہا۔ نہ قوم اور برادری سے اخراج کی دھمکی کا خیال رہا۔ معًا مکہ کے گھروں کے تمام دروازے کھل گئے۔ اور چوکوں اور بازاروں میں عورتیں اور بچے پیٹنے لگ گئے۔ یہ کتنی بڑی آگ تھی جس نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے منکرین کو اپنی لپیٹ میں لے لیا اور اُس نے اُنکی تمام شوکت اور رُعب اور دبدبہ کو خاک میں ملا دیا

پھر یہ آگ خدا تعالےٰ نے کفّار کے لئے اس طرح بھی تیار کی کہ اُس نے اسلام کو ایک کامل اور جامع تعلیم دیکر بھیجا جس سے کفّار بالکل محروم تھے۔ وہ جب اسلام کا اپنے مذاہب سے مقابلہ کرتے تو اُن کے دل جلتے۔ اور وہ کہتے کہ ہمارے مذہب میں کیا رکھا ہے۔ کاش یہی باتیں ہمارے مذہب میں بھی ہوتیں اور ہم بھی فخر سے اپنی گردن اونچی کرسکتے۔ چنانچہ ایک دفعہ ایک یہودی حضرت عمرؓ کے پاس آیا اور کہنے لگا کہ اگر اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ والی آیت

قُلْ اَذٰلِكَ خَيْرٌ اَمْ جَنَّةُ الْخُلْدِ الَّتِيْ وُعِدَ

تو اُن سے کہدے کہ یہ (انجام) بہتر ہے یا دائمی جنّت جس کا متقیوں سے وعدہ

الْمُتَّقُوْنَ ۭ كَانَتْ لَهُمْ جَزَاۗءً وَّمَصِيْرًا ⑯ لَهُمْ

کیا گیا ہے۔ وہ اُن کا (صحیح صحیح) بدلہ اور آخری ٹھکانہ ہوگی - انہیں

ہماری کتاب میں موجود ہوتی تو ہم اس آیت کے نزول کے دن کو اپنے لئے عید کا دن مقرر کرتے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا۔ تم تو ایک دن عید مناتے لیکن ہمارے لئے تو جس دن یہ آیت نازل ہوئی تھی دو عیدیں جمع تھیں۔ ایک جمعہ کا دن تھا اور دوسرے حج کا دن تھا (ترمذی جلد ۲ کتاب التفسیر) اسی طرح حضرت عباسؓ کے متعلق روایت آتی ہے کہ اُن سے بھی کسی یہودی نے کہا کہ اگر یہ آیت ہم پر اُترتی تو ہم اُس روز عید مناتے - حضرت ابن عباسؓ نے بھی اُس کو یہی جواب دیا کہ ہمارے لئے تو اس دن دو عیدیں جمع تھیں (ترمذی جلد ۲ کتاب التفسیر زیر آیت الیوم اکملت لکم دینکم)

غرض اسلامی تعلیم کی جامعیت کو دیکھ کر بھی اُن کے دل بغض وحسد کی آگ سے جل جاتے اور وہ سوائے آہیں بھرنے اور حسرت واندوہ کا شکار ہونے کے اور کوئی راہ نہ پاتے۔ یہی آگ اس زمانہ کے مخالفین اسلام کو بھی جلاتی رہتی ہے۔ آج بھی ایک عیسائی کو اگر کوئی یہودی کہہ دے کہ کیا تیرا خدا وہی ہے جس کو ہم نے کانٹوں کا تاج پہنایا اور اُسے ذلّت کے ساتھ صلیب پر لٹکایا تو تم خود ہی اندازہ لگاؤ کہ اس کے دل میں کسقدر جلن پیدا ہوگی اور وہ کیسے دکھ اور عذاب میں گرفتار ہو جائیگا - اسی طرح جب بُت پرستوں پر اُن کے بتوں کی بے چارگی ظاہر ہوتی ہے تو وہ اپنے آپ پر لعنتیں ڈالتے ہیں کہ ہم اشرف المخلوق ہو کر بے جان بُتوں کے آگے سر جھکا رہے ہیں۔ اسی طرح ایک مسلمان جب قرآن کریم پڑھتا ہے کہ وہ لوگ جو خدا تعالیٰ پر ایمان لاتے ہیں اُن پر فرشتوں کا نزول ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ اُن کو اپنے کلام سے فیضیاب فرماتا ہے تو اس کا دل اس خوشی سے اچھلنے لگتا ہے کہ اسلام پر چلنے سے میرا خدا تعالےٰ سے تعلق پیدا ہو جائیگا۔ مگر ویدوں کا ماننے والا جب وید پڑھتا ہے اور اُسے معلوم ہوتا ہے کہ میرا خدا اب مجھ سے ہمکلام نہیں ہو سکتا تو اس کا دل اس صدمہ سے کڑھنے لگتا ہے اور وہ حیران ہوتا ہے کہ وہ خدا جو وید کے رشیوں سے کلام کیا کرتا تھا اب مجھ سے کیوں کلام نہیں کرتا۔ کیا مَیں اس کا سوتیلا بیٹا ہوں کہ وہ رشیوں کے ساتھ تو بولا مگر میرے ساتھ نہیں بولتا - اسی طرح عیسائیوں میں کفارہ اور آریوں میں نیوگ کا مسئلہ بھی ایسے ہی مسائل میں سے ہیں جن پر بحث کے دوران میں وہ خود اپنے دلوں میں ایک ندامت اور شرمندگی محسوس کرتے ہیں اور خواہ وہ زبان سے اقرار کریں یا نہ کریں اُن کے دل اسلامی تعلیم کی برتری کو تسلیم کرتے ہیں۔ قرآن کریم نے ان کی انہی دلی کیفیات کا اِن الفاظ میں ذکر فرمایا ہے کہ رُبَمَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ كَانُوْا مُسْلِمِيْنَ (الحجر ع) یعنی بہت دفعہ کفار بھی بڑی حسرت کے ساتھ کہا کرتے ہیں کہ کاش وہ بھی ان مسائل کو ماننے والے ہوتے اور انہیں اس شرمندگی سے نجات ملتی جو اب اُن کے گلے کا ہار بنی رہتی ہے۔ طلاق، خلع، نکاحِ بیوگان اور ورثہ وغیرہ مسائل میں جب مشکلات اُن کا احاطہ کرتی ہیں اور تمدنی خرابیاں اُن کو اُلجھنوں میں ڈالتی

فِيهَا مَا يَشَآءُونَ خٰلِدِيْنَ ۭ كَانَ عَلٰى رَبِّكَ وَعْدًا مَّسْـُٔوْلًا ﴿۱۷﴾

اس میں جو کچھ چاہیں گے ملیگا۔ وہ اس میں ہمیشہ کیلئے بستے چلے جائیں گے - یہ ایک ایسا وعدہ ہے جس کا پورا کرنا تیرے رب پر واجب ہے ۵۸

ہیں تو وہ اسلامی تعلیم کی فوقیت کا اقرار کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ میور اسلام کا شدید ترین دشمن ہے مگر وہ بھی قرآن کریم اور بائبل کا مقابلہ کرتے ہوئے "لائف آف محمد" میں ایک جگہ بڑی حسرت کے ساتھ لکھتا ہے کہ

"مسلمانوں کی بالکل پاک اور غیر تبدیل شدہ کتاب اور ہماری کتب کے مختلف نسخوں کے باہمی اختلاف کا آپس میں مقابلہ کرنا بالکل ایسا ہی ہے جیسا کہ دو ایسی چیزوں کا مقابلہ کیا جائے جن میں باہم کوئی بھی مشابہت نہ ہو۔"

("لائف آف محمد" مصنفہ سر ولیم میور)

غرض محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کا انکار کرنے والوں کے لئے خدا تعالیٰ نے آگ کا عذاب تیار کیا ہوا ہے جس کے شعلے اُن کو ہر وقت جلاتے رہتے ہیں اور جب اسلام کو کوئی ترقی نصیب ہوتی ہے اُن کے دلوں کی یہ آگ اور بھی تیز ہو جاتی ہے۔

۵۸ تفسیر:- فرماتا ہے تو اِن کفار سے کہدے کہ کیا تمہارا یہ انجام بہتر ہے یا وہ جنّت بہتر ہے جس کا ان متقیوں سے وعدہ کیا گیا ہے۔ یہ جنّت اُن کی پوری جزا اور ٹھکانا ہوگی اور اِس جنت میں وہ جو کچھ چاہیں گے اُن کو ملے گا اور وہ اُس میں رہتے چلے جائیں گے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا ایک ایسا وعدہ ہے جو کبھی ٹل نہیں سکتا۔ ہر شخص جو تاریخ اسلام سے معمولی واقفیت بھی رکھتا ہے جانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا یہ وعدہ کس شان سے پورا ہوا اور کس طرح چند سالوں میں ہی عرب اور ایران اور روم اور مصر اور شام وغیرہ اسلامی ضرب کی تاب نہ لا کر سرنگوں ہو گئے اور فاقہ کش مزدور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی غلامی کی برکت سے دنیا کے بادشاہ بن گئے اور پھر انہوں نے وہ نظام قائم کر کے دکھلا دیا جو اسلام دنیا میں قائم کرنا چاہتا ہے۔ ابتدائی ایام میں تو مکہ کے بت پرست مسلمانوں کو کھلے بندوں اللہ تعالیٰ کی عبادت بھی نہیں کرنے دیتے تھے۔ انہیں چھپ چھپ کر نمازیں پڑھنی پڑتی تھیں اور مخفی طور پر ایک دوسرے سے تعلقات رکھنے پڑتے تھے۔ اسی طرح تعلیم اور تبلیغ کی انہیں کوئی آزادی میسر نہیں تھی۔ بلکہ اگر کوئی ہدایت کا طالب کبھی مکہ میں آ جاتا تو اُسے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مکان تلاش کرنے میں بھی بڑی دقت پیش آتی اور لوگ اُسے آپ کے گھر کا پتہ بھی نہ بتاتے۔ مگر پھر وہ وقت آیا کہ مسلمان دنیا کا حاکم اور بادشاہ بن گیا اور اُس کی طاقت سے بڑی بڑی حکومتیں لرزنے لگیں۔ اُس وقت جو کچھ وہ کرنا چاہتا تھا کسی کی مجال نہیں تھی کہ اُس میں رخنہ اندازی کر سکتا کیونکہ اُس زمانہ میں مسلمان ہی قوتِ فعال تھا اور مسلمان کی مٹھی میں ہی دنیا کی طنابیں تھیں۔ مگر افسوس کہ بعد میں مسلمانوں نے اپنی بداعمالی سے اس جنّت کو کھو دیا اور وہ ذلیل اور رسوا ہو گئے۔ انہوں نے سمجھا کہ محض مسلمان کہلانے کی وجہ سے یہ جنّت انہیں دائمی طور پر دے دی گئی ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں سے جہاں بھی جنّت کا وعدہ کیا تھا وہاں ایمان اور عمل صالح کے ساتھ اُسے مشروط کیا تھا۔ بلکہ یہاں بھی اُس نے كَانَ عَلٰى رَبِّكَ وَعْدًا مَّسْـُٔوْلًا فرما کر اس کے وعدہ ہونے پر پھر زور دیا ہے اور بتایا ہے کہ ہمارا یہ وعدہ تمہارے ایمان اور عمل کے ساتھ وابستہ ہے۔ اگر تمہارے اندر ایمان نہ رہا اور عمل صالح پر تم قائم نہ رہے تو یہ وعدہ بھی قائم نہیں رہے گا۔ سچی کی طرف

وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ وَمَا يَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَقُوْلُ

اور جب وہ انکو اور اُن کے جھوٹے معبودوں کو اپنے حضور میں کھڑا کرے گا - اور پھر اُن سے کہیگا

ءَاَنْتُمْ اَضْلَلْتُمْ عِبَادِيْ هٰٓؤُلَآءِ اَمْ هُمْ ضَلُّوا السَّبِيْلَ ﴿۱۸﴾

کیا تم نے میرے ان بندوں کو گمراہ کیا تھا ؟ یا وہ آپ ہی سیدھے راستہ سے بھٹک گئے تھے -

قَالُوْا سُبْحٰنَكَ مَا كَانَ يَنْۢبَغِيْ لَنَآ اَنْ نَّتَّخِذَ مِنْ

(تب) وہ جواب دیں گے تو پاک ہے - ہمیں کوئی حق نہ تھا کہ ہم تیرے سوا اور ہستیوں کو اپنا

دُوْنِكَ مِنْ اَوْلِيَآءَ وَلٰكِنْ مَّتَّعْتَهُمْ وَاٰبَآءَهُمْ حَتّٰى

کارساز بناتے لیکن تُو نے اُن لوگوں کو اور ان کے باپ دادوں کو دنیوی متاع بخشے یہانتک کہ

نَسُوا الذِّكْرَ ۚ وَكَانُوْا قَوْمًۢا بُوْرًا ﴿۱۹﴾ فَقَدْ كَذَّبُوْكُمْ

انہوں نے تیری یاد کو ترک کر دیا - اور ہلاک ہونیوالی قوم بن گئے - پس (کفار سے کہا جائیگا کہ دیکھ لو) ان جھوٹے

بِمَا تَقُوْلُوْنَ ۙ فَمَا تَسْتَطِيْعُوْنَ صَرْفًا وَّلَا نَصْرًا ۚ

معبودوں نے تمہاری باتوں کو جھٹلا دیا ہے پس آج تم نہ تو عذاب کو ہٹا سکتے ہو اور نہ کوئی مدد حاصل کر سکتے ہو

تَبٰرَكَ الَّذِيْٓ اِنْ شَآءَ جَعَلَ لَكَ خَيْرًا مِّنْ ذٰلِكَ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ میں اِنْ شَآءَ کے الفاظ رکھ کر اشارہ کیا گیا تھا اور مسلمانوں کو توجہ دلائی گئی تھی کہ بے شک یہ جنّت تمہیں ملے گی۔ مگر اس میں تمہارے کسی استحقاق یا زورِ بازو کا دخل نہیں ہوگا بلکہ اللہ تعالیٰ کی مشیّت کا دخل ہوگا - یعنی اگر اس نے تمہارے اعمال کو اس انعام کے قابل سمجھا تو وہ تمہیں اس انعام سے سرفراز فرما دے گا اور اگر اُس نے تمہارے اعمال کو اس انعام کے قابل نہ سمجھا تو وہ یہ نعمت تم سے واپس لے لے گا - چنانچہ جب تک مسلمان ایمان اور عمل صالح پر قائم رہے اللہ تعالیٰ نے انہیں بڑی بڑی نعمتوں سے نوازا - اور وہ صدیوں دنیا پر حکمرانی کرتے رہے لیکن جب انہوں نے اللہ تعالیٰ کی محبت کو بُھلا دیا اور عیش و عشرت میں مشغول ہوگئے اللہ تعالیٰ نے بھی اُن سے اپنا تعلق منقطع کر لیا اور انہیں ان جنّات سے محروم کر دیا -

پس اصل چیز جس کی طرف توجہ کرنے کی ضرورت ہے وہ ایمان اور عمل صالح ہے - آج بھی اگر مسلمان اپنے اندر تغیّر پیدا کریں اور خدا اور اس کے رسول کی سچے دل سے پیروی کریں تو اللہ تعالیٰ انہیں اِن نعمتوں کا وارث کر دیگا جن کے پہلے مسلمان وارث ہوئے - اور انہیں اس جنّت میں داخل کر دیگا جس سے وہ

وَمَنْ يَّظْلِمْ مِّنْكُمْ نُذِقْهُ عَذَابًا كَبِيْرًا ﴿۲۰﴾

اور جو کوئی تم میں سے ظالم ہے ہم اُسے بڑا عذاب پہنچائیں گے ۹؎

بُوْرًا

اپنی نافرمانیوں کی وجہ سے نکالے گئے تھے۔

۹؎ حل لغات: بُوْرًا - اَلْبُوْرُ: اَلرَّجُلُ الْفَاسِدُ وَالْهَالِكُ لَا خَيْرَ مِنْهُ۔ ایسا آدمی جو خراب وخستہ ہو اور ہلاک ہونے والا ہو۔ یہ لفظ جمع اور مفرد دونوں کے ساتھ استعمال ہو سکتا ہے۔ یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ اِمْرَأَةٌ بُوْرٌ وَ قَوْمٌ بُوْرٌ یعنی ہلاک ہونے والی عورت اور ہلاک ہونے والی قوم (اقرب)

تفسیر: فرماتا ہے۔ کفار کو جب اُن کے معبودوں سمیت اٹھایا جائے گا تو ان معبودوں سے پوچھا جائیگا کہ کیا تم نے میرے اِن بندوں کو گمراہ کیا تھا یا وہ خود ہی گمراہ ہو گئے تھے؟ وہ جواب میں کہیں گے کہ اے خدا تُو پاک ہے۔ ہماری کیا مجال تھی کہ ہم تیرے سوا اَور معبود بنا لیتے۔ بات یہ ہے کہ تُو نے اِن لوگوں کو اور ان کے باپ دادوں کو دنیا کی نعماء سے متمتع کیا اور انہیں مال و دولت کی اسقدر فراوانی بخشی کہ انہوں نے تیری ہدایت بُھلا دی اور برباد ہونے والی قوم بن گئے۔ پھر کہا جائیگا کہ اے مشرکو! جو کچھ تم کہتے تھے اُس کو خود تمہارے معبودوں نے جھٹلا دیا ہے۔ پس آج نہ تو تم اس عذاب سے بچ سکتے ہو اور نہ کسی قسم کی مدد حاصل کر سکتے ہو۔ اور ہمارے اس قاعدہ کو یاد رکھو کہ جو ظلم کرتا ہے اُسے سخت عذاب پہنچتا ہے۔

اِن آیات میں جن معبودانِ باطلہ کا ذکر کیا گیا ہے اُن سے مُراد خدا تعالیٰ کے وہ فرستادے ہیں جن کو اُن کی اُمتوں نے بعد میں اپنی نادانی سے خدا تعالیٰ کا شریک قرار دے دیا اور وہ اُن کی پرستش کرنے لگ گئے۔ جیسے حضرت مسیح ناصری ہیں کہ وہ ساری عمر اپنے آپ کو ابن آدم کہتے رہے مگر عیسائیوں نے اُن کو خدا کا بیٹا بنا لیا۔ اور اُن کی الوہیت کا عقیدہ دنیا کے سامنے پیش کرنا شروع کر دیا۔ اِسی طرح ہندو حضرت رام اور کرشن کی پرستش کرتے ہیں۔ حالانکہ یہ دونوں بزرگ اللہ تعالیٰ کے مقدس فرستادے تھے جو ہندو قوم کی ہدایت کے لئے بھارت میں مبعوث ہوئے تھے۔ اِسی گروہ میں حضرت سید عبدالقادر صاحب جیلانی رحمۃ اللہ علیہ بھی شامل ہیں جن سے قادری طریق کے پیرو دُعائیں مانگتے اور اُن کو مُردوں کو زندہ کرنے والا قرار دیتے ہیں۔ اور اُن کے متعلق عجیب وغریب قصے اور حکایات جُہلاء میں مشہور کرتے رہتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ اُنکے کسی مرید نے ایک دفعہ اُن کی دعوت کی اور مرغ پکا کر سامنے رکھا۔ جب وہ کھا چکے تو ایک ہمسائی آئی۔ اور کہنے لگی حضور یہ تو میرا مرغ تھا جو اس طرف کو آ گیا تھا اور اس شخص نے ذبح کر کے آپ کو کھلا دیا۔ اَب مَیں کیا کروں۔ انہوں نے کہا۔ گھبرانے کی کیا بات ہے۔ مرغ کی تمام ہڈیاں جمع کرو۔ چنانچہ اُس کی ہڈیاں جمع کی گئیں اور انہوں نے ہاتھ میں پکڑ کر اُن کو دبایا تو وہ کُڑ کُڑ کرتا ہوا مرغ بن گیا اور وہ عورت اُسے اٹھا کر اپنے گھر لے گئی۔ اِسی طرح کہتے ہیں کہ ایک دفعہ سید عبدالقادر صاحب جیلانیؒ کے پاس اُن کا ایک مرید آیا اور کہنے لگا حضور میرا بیٹا بیمار ہے۔ دُعا کریں کہ وہ اچھا ہو جائے۔ انہوں نے کہا بہت اچھا! ہم دُعا کرینگے وہ ٹھیک ہو جائیگا۔ مگر وہ مر گیا۔ اس پر وہ پھر آپ کے پاس آیا اور کہنے لگا۔ حضور میرا بیٹا تو مر گیا۔ کہنے لگے۔ ہیں مر گیا! اب عزرائیل میں بھی اتنی جرأت ہو گئی ہے کہ وہ میرے حکم کی خلاف ورزی کرے۔ انہوں نے اُسوقت ڈنڈا اٹھایا اور آسمان کی طرف چڑھنا شروع کر دیا۔ عزرائیل

آگے آگے بھاگا جا رہا تھا اور وہ ڈنڈا اٹھائے اُس کے پیچھے
پیچھے دوڑ رہے تھے۔ وہ آسمان میں داخل ہی ہونے لگا تھا کہ
یہ اس کے پاس پہنچ گئے اور زور سے اُسے ڈنڈا مارا۔
جس سے وہ لنگڑا ہو گیا۔ اور رُوحوں کی تھیلی اس کے ہاتھ سے
چھین کر اُس کا مُنہ کھول دیا۔ جس کے نتیجہ میں وہ تمام لوگ
زندہ ہو گئے جن کی روحیں اس روز عزرائیل قبض کر کے لے
آیا تھا۔ وہ روتا روتا خدا تعالیٰ کے پاس گیا۔ اور کہنے
لگا۔ خدایا! میں تو تیرے کام کے لئے گیا تھا مگر عبدالقادر
جیلانی نے مجھے ڈنڈا مارا اور میرے ہاتھ سے رُوحوں کی تھیلی
چھین کر اُس نے ساری رُوحوں کو آزاد کر دیا۔ اب میرا کام
کیا رہ گیا ہے۔ میری جگہ کسی اَور کو مقرر کر دیجئے۔ پھر انہوں نے
صرف وہی رُوح نہیں نکالی جو اُن کے مرید کے لڑکے کی تھی
بلکہ جتنی روحیں میں نے آج نکالی تھیں وہ سب کی سب انہوں
نے آزاد کر دی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے جب یہ بات سُنی۔ تو
فرشتہ سے کہنے لگا۔ چُپ چُپ۔ اگر عبدالقادر جیلانی نے
یہ بات سُن لی اور اُس نے اگلی پچھلی ساری رُوحیں آزاد کر
دیں تب بھی میں نے کیا کر لینا ہے۔

اِس قسم کے تمام شرکاء اور ان کی عبادت کرنیوالوں
کو اللہ تعالیٰ اپنے سامنے حاضر کریگا۔ اور مجرموں پر حجت تمام
کرنے کے لئے اُن سے سوال کرے گا کہ کیا تم نے لوگوں کو
اِس شرک کی تعلیم دی تھی۔ وہ کہیں گے خدایا! ایسا کس طرح
ہو سکتا ہے کہ ہم اُن سے وہ بات کہتے جس کے کہنے کا ہمیں
کوئی حق نہیں تھا۔ ہم تو ان لوگوں کو صرف تیری پرستش کی تعلیم
ہی دیتے رہے مگر جب ایک لمبا زمانہ گذر گیا۔ تو یہ اس تعلیم
کو بھول گئے اور انہوں نے ہمیں تیرا شریک قرار دے دیا۔
پس ہم ان کے عقائد سے بیزار ہیں۔ یہی بات انجیل میں
حضرت مسیح ناصری نے بھی اِن الفاظ میں بیان فرمائی ہے کہ

"اُس دن بہتیرے مجھ سے کہیں گے کہ
اے خداوند! اے خداوند! کیا ہم نے
تیرے نام سے نبوت نہیں کی اور تیرے نام
سے بدرُوحوں کو نہیں نکالا۔ اور تیرے نام سے
بہت سے معجزے نہیں دکھائے؟ اُسوقت
میں اُن سے صاف کہدوں گا کہ میری کبھی
تم سے واقفیت نہ تھی۔ اے بدکارو! میرے
پاس سے چلے جاؤ۔"

(متی باب ۷، آیت ۲۲و۲۳)

اِسی طرح لکھا ہے:۔

" وہ شہر شہر اور گاؤں گاؤں تعلیم دیتا
ہُوا یروشلم کا سفر کر رہا تھا۔ اور کسی شخص نے
اُس سے پوچھا کہ اے خداوند! کیا نجات
پانے والے تھوڑے ہیں؟ اُس نے اُن سے
کہا۔ جانفشانی کرو کہ تنگ دروازہ سے
داخل ہو۔ کیونکہ میں تم سے کہتا ہوں۔ کہ
بہتیرے داخل ہونے کی کوشش کرینگے اور
نہ ہو سکیں گے۔ جب گھر کا مالک اُٹھ کر
دروازہ بند کر چکا ہو اور تم باہر کھڑے دروازہ
کھٹکھٹا کر یہ کہنا شروع کرو کہ اے خداوند!
ہمارے لئے کھول دے اور وہ جواب دے
کہ میں تم کو نہیں جانتا کہ کہاں کے ہو۔ اُس
وقت تم کہنا شروع کرو گے کہ ہم نے تو
تیرے رُو برو کھایا پیا اور تُو نے ہمارے
بازاروں میں تعلیم دی۔ مگر وہ کہیگا۔ میں تم
کہتا ہوں کہ میں نہیں جانتا تم کہاں کے ہو۔
اے بدکارو! تم سب مجھ سے دُور ہو۔ وہاں
رونا اور دانت پیسنا ہوگا۔"

(لوقا باب ۱۳ آیت ۲۲ تا ۲۸)

ان حوالہ جات میں حضرت مسیح نے اس طرف اشارہ
فرمایا ہے کہ میرے نام کے پیچھے چلنے والے تو بہت لوگ

وَمَآ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّآ اِنَّهُمْ لَيَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ

اور تجھ سے پہلے ہم نے جتنے بھی رسول بھیجے تھے وہ سب کے سب کھانا کھاتے تھے۔ اور

وَيَمْشُوْنَ فِي الْاَسْوَاقِ ؕ وَجَعَلْنَا بَعْضَكُمْ لِبَعْضٍ فِتْنَةً ؕ

بازاروں میں چلتے تھے۔ اور ہم نے تم میں سے بعض کو بعض کیلئے آزمائش کا ذریعہ بنایا ہے

اَتَصْبِرُوْنَ ج وَكَانَ رَبُّكَ بَصِيْرًا ﴿۲۱﴾ ع

(یہ دیکھنے کے لئے) کہ کیا تم (مسلمان) صبر کرتے ہو (یا نہیں) اور (اے مسلمان) تیرا رب (حالات کو) بہت دیکھنے والا ہے۔ ۱۵

ع ۲ ۱۷

ہیں مگر نجات حاصل کرنے والے تھوڑے ہیں۔ جب قیامت کا دن آئیگا اُس دن مَیں اُن سے صاف کہدونگا کہ اے بدکارو! تم سب مجھ سے دُور ہو جاؤ۔ مَیں نہیں جانتا کہ تم کون ہو۔ غرض جب مشرکین کے سامنے اُن کے معبود حقیقت حال کو ظاہر کر دیں گے تو اُن پر اُن کے عقائد کا بطلان واضح ہو جائیگا اور وہ سمجھ لینگے کہ انہوں نے اِن ہستیوں کو خدا تعالیٰ کا شریک قرار دے کر بڑے بھاری گناہ کا ارتکاب کیا ہے۔

اِن آیات سے یہ بھی ظاہر ہے کہ قوموں پر جب ایک لمبا زمانہ گذر جاتا ہے۔ اور زمانۂ نبوت سے اُن کا بُعد ہو جاتا ہے اور دنیوی نعماء اور مادی لذّات میں اُن کا انہماک ہو جاتا ہے تو رفتہ رفتہ اُن میں کئی قسم کی خرابیاں پیدا ہونی شروع ہو جاتی ہیں۔ جن میں سے سب سے بڑی خرابی اعتقادی رنگ میں یہ پیدا ہوتی ہے کہ وہ غلوّ سے کام لیکر اللہ تعالیٰ کے اُن فرستادوں کو جو دنیا کی ہدایت کے لئے مبعوث ہوتے ہیں اس کا شریک قرار دینے لگ جاتے ہیں یہ شریک قرار دینا بعض دفعہ تو علانیہ طور پر ہوتا ہے۔ جیسے عیسائیوں نے حضرت مسیحؑ کو خدا قرار دیکر یہ کہنا شروع کر دیا کہ باپ بھی ازلی ہے اور بیٹا بھی ازلی ہے۔ اور رُوح القدس بھی ازلی ہے۔ اور بعض دفعہ وہ اپنے بزرگوں کی قبروں کو سجدہ گاہ بنا لیتے اور اُن سے دُعائیں کرنا اپنا معمول بنا لیتے ہیں۔ اور اس طرح اُن بزرگوں کو شریکِ باریؔ قرار دے دیتے ہیں۔ جیسے آجکل مسلمانوں میں بڑے بڑے بزرگوں کے مقابر پر ہر سال میلے لگتے اور ہزاروں مسلمان وہاں قبروں پر سجدے کرتے اور مُرادیں مانگتے ہیں۔ یہ تمام امور شرک میں داخل ہیں جو خدا تعالیٰ کے غضب کو بھڑکانے والے ہیں۔ مومن کامل وہی ہوتا ہے جو خدا تعالیٰ کی سچی توحید پر ایمان رکھے اور ہر قسم کے مشرکانہ خیالات اور اعمال سے بچتا رہے۔

۱۵ تفسیر:۔ فرماتا ہے۔ ہم نے تجھ سے پہلے جتنے بھی رسول بھیجے تھے وہ سب کے سب کھانا کھاتے تھے اور بازاروں میں بھی چلتے پھرتے تھے۔ اور ہم نے تم میں سے بعض کو بعض کے لئے آزمائش کا موجب بنایا ہے۔ تاکہ اللہ تعالیٰ دیکھے کہ کیا تم صبر سے کام لیتے ہو یا نہیں۔ اور اے رسول! تیرا رب اپنے بندوں کے حالات کو خوب جانچ رہا ہے۔

اِس آیت میں اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے کہ خدا تعالیٰ کے وہ انبیاء جن کو یہ لوگ اپنی نادانی سے اس کا شریک قرار دے رہے ہیں اُن کی اپنی حالت تو یہ تھی کہ وہ حوائج بشریہ سے مستغنی نہیں تھے۔ وہ اسی طرح کھانے پینے کے محتاج تھے جس طرح یہ لوگ محتاج ہیں اور وہ

اسی طرح بازاروں میں چلتے پھرتے اور اپنی ضروریات کی چیزیں وہاں سے خریدتے تھے جس طرح یہ لوگ خریدتے ہیں۔ پھر انہیں کیا ہوگیا ہے کہ انہوں نے اپنے جیسے انسانوں کو خدا بنا لیا اور اُن سے دُعائیں کرنا اپنا معمول بنا لیا۔ گویا بتایا کہ اللہ تعالیٰ کے اندر صمدیت کا پایا جانا ضروری ہے اور صمد اُس ہستی کو کہتے ہیں جو خود تو کسی کی محتاج نہ ہو مگر باقی سب اس کی محتاج ہوں لیکن ان معبودانِ باطلہ کو دیکھ لو کہ یہ سب کے سب کھانے پینے کے محتاج تھے اور سب کے سب اپنے سامانِ معیشت کی فراہمی کے لئے دوسروں کے تعاون کے حاجتمند تھے۔ پھر ایسے لوگ جو خود ایک فانی جسم لے کر آئے اور موت کا شکار ہوگئے اور جن کی زندگیاں بتا رہی ہیں کہ وہ ایسے ہی ایک انسان تھے جیسے تم انسان ہو۔ ان کو خدا تعالیٰ کا شریک قرار دے دینا کہاں کی دانائی ہے۔ یہ لوگ بے شک خدا تعالیٰ کے فرستادہ تھے مگر ان کو شریکِ باری قرار دینا بڑا بھاری گناہ ہے۔ اِس زمانہ میں سب سے بڑا فتنہ عیسائیت کا فتنہ ہے جس نے حضرت مسیحؑ کو خدا قرار دے کر دنیا کے ایک بڑے حصّہ کو شرک میں مبتلا کر رکھا ہے لیکن اگر اناجیل کو دیکھا جائے تو اُن سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مسیحؑ بھی اُسی طرح کھانے پینے کے محتاج تھے جس طرح دوسرے لوگ محتاج تھے چنانچہ انجیل میں لکھا ہے کہ

"یسوع رُوح القدس سے بھرا ہوا یردن سے لوٹا اور چالیس دن تک رُوح کی ہدایت سے بیابان میں پھرتا رہا اور ابلیس اُسے آزماتا رہا۔ اِن دنوں میں اُس نے کچھ نہ کھایا اور جب وہ دن پورے ہوگئے تو اُسے بھوک لگی۔" (لوقا باب ۴ آیت ۱ و ۲)

اسجگہ عیسائیوں نے گو مبالغہ سے کام لیتے ہوئے یہ لکھدیا ہے کہ یسوع مسیح نے چالیس دن تک کچھ نہ کھایا مگر بہرحال اتنی بات انہیں بھی تسلیم کرنی پڑی کہ چالیس دن کے بعد مسیح کو بھوک لگی اور اُس نے چاہا کہ اُسے کچھ کھانے کو ملے جس سے اس کی احتیاج ظاہر ہے پھر لکھا ہے:-

"دوسرے دن جب وہ بیت عنیا سے نکلے تو اُسے بھوک لگی اور وہ دُور سے انجیر کا درخت جس میں پتے تھے دیکھ کر گیا کہ شاید اُس میں کچھ پائے مگر جب اُس کے پاس پہنچا تو پتوں کے سوا کچھ نہ پایا کیونکہ انجیر کا موسم نہ تھا۔ اُس نے اُس سے کہا۔ آئندہ کوئی تجھ سے کبھی پھل نہ کھائے اور اُس کے شاگردوں نے سُنا۔"

(مرقس باب ۱۱ آیت ۱۲ تا ۱۴)

اس حوالہ سے بھی ثابت ہے کہ حضرت مسیح کو اسی طرح بھوک محسوس ہوتی تھی جس طرح دوسرے لوگوں کو محسوس ہوا کرتی ہے۔ بلکہ ایک دفعہ جب انہیں کھانے کے لئے کوئی چیز نہ ملی تو وہ انجیر کے ایک درخت کی طرف گئے کہ شائد مجھے انجیر ہی کھانے کے لئے مل جائیں۔ مگر بدقسمتی سے وہ یہ بات بھول گئے کہ آجکل انجیر کا موسم ہی نہیں اور وہاں سے وہ ناکام واپس گئے۔ مگر چونکہ بھوک کی وجہ سے انہیں تکلیف ہو رہی تھی۔ انہیں اس ناکامی پر غصّہ آگیا۔ اور انہوں نے اس درخت کو یہ بد دعا دے دی کہ آئندہ کوئی شخص تجھ سے کبھی پھل نہ کھائے۔ یہ واقعہ بھی حضرت مسیح کی الوہیت کو باطل ثابت کرتا ہے۔ کیونکہ اس سے نہ صرف اُن کا عام انسانوں کی طرح بھوک محسوس کرنا ثابت ہوتا ہے بلکہ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ علم غیب تو الگ رہا اتنی بات بھی نہیں جانتے تھے کہ کون سے

موسم میں انجیر کا درخت پھل دیا کرتا ہے۔ اگر جانتے تو وہ ایسے موسم میں جب کہ انجیر کا درخت پھل ہی نہیں دیا کرتا ایک درخت کی طرف کیوں دوڑے جاتے ؟ پھر جب انہوں نے خود ایک غلطی کی تو اُس کے نتیجہ میں اُن کا درخت کو بد دعا دینا بھی اپنے اندر کوئی معقولیت نہیں رکھتا۔ عیسائی تو خدا تعالیٰ کے عادل ہونے پر بڑا زور دیا کرتے ہیں مگر یہ عجیب انصاف ہے کہ غلطی تو انہوں نے خود کی اور بد دعا ایک درخت کو دے دی۔

پھر لکھا ہے :۔

"جب وہ گھر میں کھانا کھانے بیٹھا تھا تو ایسا ہُوا کہ بہت سے محصول لینے والے اور گنہگار آکر یسوع اور اُس کے شاگردوں کے ساتھ کھانا کھانے بیٹھے۔ فریسیوں نے یہ دیکھ کر اس کے شاگردوں سے کہا۔ تمہارا استاد محصول لینے والوں اور گنہگاروں کے ساتھ کیوں کھاتا ہے ؟"

(متی باب ۹ آیت ۱۰ و ۱۱)

اس عبارت میں بھی حضرت مسیح کے کھانا کھانے کا وضاحتاً ذکر آتا ہے۔

پھر حضرت مسیح خود اپنے متعلق فرماتے ہیں :۔

"ابن آدم کھاتا پیتا آیا۔ اور وہ کہتے ہیں دیکھو کھاؤ اور شرابی آدمی محصول لینے والوں اور گنہگاروں کا یار۔ مگر حکمت اپنے کاموں سے راست ثابت ہوئی۔"

(متی باب ۱۱ آیت ۱۹)

اسی طرح لکھا ہے :۔

"جب شام ہوئی تو وہ بارہ شاگردوں کے ساتھ کھانا کھانے بیٹھا تھا۔ اور جب وہ کھا رہے تھے تو اُس نے کہا۔ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ تم میں سے ایک مجھے پکڑوائیگا۔ وہ بہت ہی دلگیر ہوئے۔ اور ہر ایک اُس سے کہنے لگا۔ اے خداوند! کیا میں ہوں۔ اُس نے جواب میں کہا جس نے میرے ساتھ طباق میں ہاتھ ڈالا ہے وہی مجھے پکڑوائیگا۔ ابن آدم تو جیسا اُس کے حق میں لکھا ہے جاتا ہی ہے۔ لیکن اُس آدمی پر افسوس جس کے وسیلہ سے ابن آدم پکڑوایا جاتا ہے۔ اگر وہ آدمی پیدا نہ ہوتا تو اس کے لئے اچھا ہوتا۔ اس کے پکڑوانے والے یہوداہ نے جواب میں کہا۔ اے ربی! کیا میں ہوں؟ اُس نے اُس سے کہا۔ تُو نے خود کہہ دیا۔ جب وہ کھا رہے تھے تو یسوع نے روٹی لی اور برکت دے کر توڑی اور شاگردوں کو دے کر کہا۔ لو کھاؤ یہ میرا بدن ہے۔ پھر پیالہ لے کر شکر کیا اور اُن کو دے کر کہا۔ تم سب اس میں سے پیو کیونکہ یہ میرا وہ عہد کا خون ہے جو بہتیروں کے لئے گنا ہوں کی معافی کے واسطے بہایا جاتا ہے۔ میں تم سے کہتا ہوں کہ انگور کا یہ شیرہ پھر کبھی نہ پیونگا اُس دن تک کہ تمہارے ساتھ اپنے باپ کی بادشاہی میں نیا نہ پیوں۔"

(متی باب ۲۶ آیت ۲۰ تا ۲۹)

یہ حوالہ بھی بتا رہا ہے کہ حضرت مسیح اپنے حواریوں کے ساتھ مل کر کھانا کھایا کرتے تھے۔ بلکہ بعض دفعہ تو سالن کا ایک ہی پیالہ ہوتا جس میں وہ اور اُن کے شاگرد سب شریک ہوتے۔

اسی طرح واقعہ صلیب کے بعد جب حضرت مسیح

اپنے شاگردوں پر ظاہر ہوئے تو لکھا ہے :۔

"اُس نے ان سے کہا۔ کیا یہاں تمہارے پاس کچھ کھانے کو ہے؟ انہوں نے اُسے بھُنی ہوئی مچھلی کا قتلہ دیا۔ اُس نے لیکر اُنکے روبرو کھایا۔"

(لوقا باب ۲۴۔ آیت ۴۲، ۴۳)

اِن حوالہ جات سے ظاہر ہے کہ حضرت مسیحؑ اسی طرح بھوک محسوس کرتے تھے جس طرح دوسرے لوگ بھوک محسوس کرتے ہیں۔ اور وہ اسی طرح کھانا کھاتے تھے جس طرح اُنکے شاگرد اور دوسرے تمام لوگ کھانا کھاتے تھے۔ بلکہ واقعہ صلیب کے بعد انہوں نے خود شاگردوں سے پوچھا کہ کیا تمہارے پاس کچھ کھانے کیلئے موجود ہے۔ اور جب انہوں نے بھنی ہوئی مچھلی کا قتلہ پیش کیا تو انہوں نے سب شاگردوں کے سامنے وہ مچھلی کا قتلہ لے کر کھالیا۔ پھر انجیل یہ بھی بتاتی ہے۔ کہ حضرت مسیحؑ بازاروں میں بھی جاتے تھے اور لوگوں کو دینی تعلیم دیتے تھے۔ چنانچہ ایک مقام پر وہ لوگوں کو اس امر کی طرف توجہ دلاتے ہوئے کہ نجات قربانیوں اور عمل کے ساتھ وابستہ ہے فرماتے ہیں :۔

"اُس وقت تم کہنا شروع کرو گے کہ ہم نے تو تیرے روبرو کھایا پیا اور تو نے ہمارے بازاروں میں تعلیم دی مگر وہ کہے گا۔ میں تم سے کہتا ہوں کہ میں نہیں جانتا تم کہاں کے ہو۔ اَے بدکارو! تم سب مجھ سے دُور ہو۔"

(لوقا باب ۱۳ آیت ۲۶، ۲۷)

اسی طرح لکھا ہے کہ

"وہ خواہ گاؤں، خواہ شہروں، خواہ بستیوں میں جہاں کہیں جاتا تھا لوگ بیماروں کو بازاروں میں رکھ کر اُس کی منت کرتے تھے کہ وہ صرف اُس کی پوشاک کا کنارہ چھوئیں۔ اور جتنے چھوتے تھے شفا پاتے تھے۔"

(مرقس باب ۶ آیت ۵۶)

غرض حضرت مسیح ناصریؑ جن کو الوہیت میں خدا تعالیٰ کا شریک قرار دیا جاتا ہے اُن کے متعلق اناجیل سے ثابت ہے کہ وہ اُسی طرح کھانے پینے کے محتاج تھے جس طرح دوسرے لوگ محتاج تھے اور وہ بھی اُسی طرح بازاروں میں چلتے پھرتے تھے جس طرح دوسرے لوگ چلتے پھرتے تھے اور یہی حال دوسرے تمام انبیاء کا تھا۔ آدمؑ سے لے کر آج تک کوئی نبی بھی ایسا مبعوث نہیں ہوا جو کھانے پینے کا محتاج نہ ہو۔ پھر انہیں خدا قرار دینا کس طرح جائز ہو سکتا ہے۔

اِس کے علاوہ اِن آیات میں کفار کے اُس اعتراض کا بھی جواب دیا گیا ہے جو انہوں نے محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر کیا تھا کہ یہ کیسا رسول ہے جو ہماری طرح کھاتا پیتا اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جب پہلے انبیاء بھی کھانے پینے کے محتاج تھے اور وہ بھی بازاروں میں چلتے پھرتے تھے تو محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر تمہارا یہ اعتراض کرنا درست نہیں ہو سکتا۔ اعتراض تب ہوتا جب دوسرے انبیاء و رُسل کے خلاف کوئی نئی بات آپ میں پائی جاتی۔ لیکن جب آپ کا قدم اُسی نہج پر ہے جس پر پہلے انبیاء مبعوث ہوئے اور اُسی طریق پر آپ قدم زن ہیں جس طریق پر پہلے انبیاء چلے تو آپ پر اعتراض کرنا درحقیقت اس امر کا اظہار کرنا ہے کہ انہیں سلسلۂ نبوت پر ایمان ہی نہیں۔ مگر فرماتا ہے وَجَعَلْنَا بَعْضَكُمْ لِبَعْضٍ فِتْنَةً۔ تمہیں دشمنوں کی مخالفت اور اُن کے اعتراضات سے گھبرانا نہیں چاہیئے کیونکہ ہم نے ابتلاؤں اور امتحانات کا سلسلہ بھی جاری کیا ہوا ہے جن کے ذریعہ ہم کھوٹے اور کھرے میں امتیاز کر دیتے ہیں۔ اور انبیاء کے زمانہ میں یہ امتحانات زیادہ تر

وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا

اور انہوں نے جو ہماری ملاقات کی امید نہیں کرتے کہدیا کہ کیوں ہم پر فرشتے نہیں

الْمَلٰٓئِكَةُ اَوْ نَرٰى رَبَّنَا ۭ لَقَدِ اسْتَكْبَرُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ

اتارے گئے ؟ یا ہم اپنے رب کو اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھتے ؟ انہوں نے اپنے دلوں میں اپنے آپکو بہت بڑا

وَعَتَوْ عُتُوًّا كَبِيْرًا ﴿۲۲﴾ يَوْمَ يَرَوْنَ الْمَلٰٓئِكَةَ لَا بُشْرٰى

سمجھا ہے اور سرکشی میں بہت آگے نکل گئے ہیں۔ (کیا یہ لوگ نہیں جانتے کہ) جس دن فرشتوں کو دیکھیں گے اسدن مجرموں کو

اسی رنگ میں ہوتے ہیں کہ باپ کو بیٹے سے اور بیٹے کو باپ سے۔ خاوند کو بیوی سے اور بیوی کو خاوند سے بھائی کو بہن سے اور بہن کو بھائی سے جُدا ہونا پڑتا ہے۔ اور اس طرح وہ ایک دوسرے کی ایمانی آزمائش کا ذریعہ بن جاتے ہیں۔ پھر یہ آزمائش صرف خاندانوں تک ہی محدود نہیں رہتی بلکہ قوم کی قوم کو اس دَور میں سے گذرنا پڑتا ہے اور کفار مومنوں کے لئے اور مومن کفار کے لئے ابتلاء اور آزمائش کا ایک ذریعہ بن جاتے ہیں۔ چنانچہ دیکھ لو جب رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے تو آپ پر ایمان لانے سے اِدھر صحابہؓ کو آزمائشوں کی ایک آگ میں سے گذرنا پڑا اور اُدھر اُن کی مخالفت نے دشمنوں کی اندرونی خرابیوں کو بھی بے نقاب کر دیا۔ اگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث نہ ہوتے تو نہ ابوبکرؓ اور عمرؓ اور عثمانؓ اور علیؓ کی خوبیاں دنیا پر ظاہر ہوتیں اور نہ ابوجہل اور عتبہ اور شیبہ کی بدکرداریاں دنیا پر عیاں ہوتیں۔ یہ اسی ایمانی آزمائش کا نتیجہ تھا کہ اُس نے ایک طرف تو صحابہؓ کے اندرونی حسن کو ظاہر کر دیا اور دوسری طرف کفار کا مخفی کوڑھ لوگوں پر ظاہر ہو گیا اگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث نہ ہوتے تو دنیا میں یہی سمجھا جاتا کہ ابوالحکم مکہ کا ایک بہت بڑا

مدبّر اور سمجھدار رئیس تھا اور ابوبکرؓ وہاں کا ایک دیانتدار اور با اخلاق تاجر تھا۔ جب مخالفت کی آگ بھڑکی۔ تو اُس نے صحابہؓ کو کندن بنا دیا۔ اور کفار کا ملمع اتار کر ان کا پیتل ہونا لوگوں پر ظاہر کر دیا۔ غرض صحابہؓ کفار کیلئے اور کفار صحابہؓ کے لئے آزمائش کا ایک ذریعہ بن گئے۔ مگر فرماتا ہے ان آزمائشوں میں تمہارا صبر اور استقامت سے اپنے ایمان پر قائم رہنا ضروری ہے تاکہ تمہاری عظمت لوگوں پر ظاہر ہو اور یہ کبھی خیال نہ کرو کہ اگر ابتلاء اسی طرح بڑھتے چلے گئے تو شائد تمہاری ہلاکت کا باعث بن جائیں کیونکہ اللہ تعالیٰ تمام حالات کو دیکھ رہا ہے۔ اس میں یہ اشارہ کیا گیا ہے کہ تم تو ان ابتلاؤں سے گھبراتے ہو لیکن اللہ تعالیٰ جو بصیر ہے وہ جانتا ہے کہ یہ ابتلاء تمہاری طاقت کو کچلنے کا باعث نہیں بلکہ تمہیں اَور بھی ترقی کی طرف لے جانے والے ہیں۔ یہی نکتہ مولانا رومؒ نے اپنے اس شعر میں بیان فرمایا ہے کہ ؎

ہر بلا کیں قوم را حق دادہ است
زیر آں گنج کرم بنہادہ است

یعنی ہر ابتلاء جو اللہ تعالیٰ کے قائم کردہ سلسلوں پر آتا ہے اُس کے نیچے رحمتِ الٰہی کا ایک بہت بڑا خزانہ مخفی ہوتا ہے جو اُس کی ترقی کا باعث ہوتا ہے چنانچہ

يَوْمَئِذٍ لِّلْمُجْرِمِيْنَ وَيَقُوْلُوْنَ حِجْرًا مَّحْجُوْرًا ﴿۲۳﴾

کوئی خوشخبری نہیں ملے گی اور (وہ گھبرا کر) کہیں گے (ہم سے) پرے ہی رہو۔

وَقَدِمْنَآ اِلٰى مَا عَمِلُوْا مِنْ عَمَلٍ فَجَعَلْنٰهُ هَبَآءً مَّنْثُوْرًا ﴿۲۴﴾

اور ہم نے اُن کے ہر قسم کے عمل کی طرف توجہ کی جو انہوں نے کیا تھا اور اُسکو ہوا میں بکھیر کر اُڑائے ہوئے ذرّات کی طرح کر دیا

اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ يَوْمَئِذٍ خَيْرٌ مُّسْتَقَرًّا وَّاَحْسَنُ مَقِيْلًا ﴿۲۵﴾

جنتی لوگ اُس دن ٹھکانہ کے لحاظ سے بھی اچھے ہونگے اور خواب گاہوں کے لحاظ سے بھی وہ اعلیٰ مقام پر ہونگے ۱۱؎

دیکھ لو۔ مکہ کے بڑے بڑے رؤساء نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کیسی کیسی اذیتیں پہنچائیں مگر یہی اذیتیں تھیں جنہوں نے سعید الفطرت لوگوں کی طبائع میں ہلچل مچا دی۔ اور وہ خون کے دریاؤں میں گذرتے ہوئے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دروازہ تک آپہنچے اور انہوں نے آپؐ کے آستانہ پر اپنے سر جھکا دیئے۔ اگر ابتلاء نہ آتے تو شاید اسلام کی آواز مکہ کی چار دیواری سے بھی باہر نہ نکلتی۔ مگر ان ابتلاؤں کی وجہ سے اُس کی آواز عرب کے کونہ کونہ میں گونجنے لگی اور پھر عرب سے نکل کر دنیا کے کناروں تک جا پہنچی پس ابتلاء قومی ترقی کا ایک اہم ذریعہ ہوتے ہیں۔ آج تک کوئی نبی بھی دنیا میں ایسا نہیں آیا جس کی جماعت کو ابتلاؤں اور آزمائشوں کے دَور میں سے نہ گذرنا پڑا ہو بلکہ قرآن کریم ان کا ذکر کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَآءُ وَالضَّرَّآءُ وَزُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ (بقرہ ع ۲۶) یعنی ان لوگوں کو اس قدر تکالیف پہنچیں کہ وہ سر سے پیر تک ہلا دیئے گئے۔ یہاں تک کہ وقت کا رسول اور مومن بندے سب کے سب اللہ تعالیٰ کے حضور گر گئے اور انہوں نے دعائیں کرنی شروع کر دیں کہ الٰہی تیری مدد کب نازل ہو گی۔ آخر خدا نے اُن کی پکار سُنی اور آسمان سے اُس کی مدد آگئی۔ جس نے اُن کو غالب کر دیا۔

پس ابتلاؤں سے گھبرانا نہیں چاہیئے بلکہ انہیں جماعتی ترقی کا ایک اہم ذریعہ سمجھنا چاہیئے اور دعاؤں سے اور گریہ و زاری سے اور نیک اور پاک اعمال سے اللہ تعالیٰ کی مدد اور اس کی نصرت کو جذب کرنا چاہیئے۔

۱۱؎ حل لغات

حِجْرًا مَّحْجُوْرًا ۔ حِجْرًا مَّحْجُوْرًا۔ حَجَرَهٗ کے معنے ہیں مَنَعَهٗ۔ اُس کو روک دیا (اقرب)

مفردات میں ہے کہ وَيَقُوْلُوْنَ حِجْرًا مَّحْجُوْرًا۔ كَانَ الرَّجُلُ اِذَا تَلَقّٰى مَنْ يَّخَافُ يَقُوْلُ ذٰلِكَ۔ یعنی حِجْرًا مَّحْجُوْرًا کا فقرہ اس وقت استعمال کیا جاتا ہے جب کوئی آدمی کسی سے ڈرتا ہو اور وہ سمجھتا ہو کہ وہ اُسے نقصان پہنچائے گا۔ تو اس وقت وہ یہ فقرہ کہا کرتا تھا۔ جس کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ کاش اُس کے اور اُس کو نقصان پہنچانے والے کے درمیان کوئی روک حائل ہو جائے۔ اسی طرح کفار بھی جب عذاب کے فرشتوں کو دیکھیں گے۔ تو وہ یہ فقرہ کہیں گے۔ اس خیال سے کہ شاید کوئی روک پیدا ہو جائے اور وہ عذاب سے بچ جائیں (مفردات)

هَبَآءً ۔ اَلْهَبَاءُ: اَلْغُبَارُ غبار۔ اَوْ يُشْبِهُ الدُّخَانَ وَهُوَ مَا يَنْبَثُّ فِيْ ضَوْءِ الشَّمْسِ یا وہ چیز جو

دھوئیں کی طرح سورج کی شعاعوں میں اُڑتی نظر آتی ہے۔ اسی طرح ھَبَاءً کے معنے ہیں وَ دَقَاقُ التُّرَابِ سَاطِعَةً وَ مَنْثُوْرَةً عَلٰی وَجْهِ الْاَرْضِ۔ وہ باریک مٹی جو زمین پر فضا میں بکھری ہوئی اُڑ رہی ہوتی ہے (اقرب)

مَقِیْلٌ

مَقِیْلٌ ۔ قَالَ (یَقِیْلُ) کا مصدر ہے۔ اور قَالَ کے معنے ہیں نَامَ فِی الْقَائِلَةِ اَیْ نِصْفَ النَّهَارِ دوپہر کے وقت سویا اور اُس نے آرام کیا۔ اسی طرح قَالَ کے معنے ہیں شَرِبَ فِیْ نِصْفِ النَّهَارِ دوپہر کے وقت تسکین نفس کے لئے کچھ پینے کی چیز استعمال کی (اقرب) یَقِیْلُ قَالَ سے ظرفِ مکان بھی ہو سکتا ہے۔ اس صورت میں اس کے معنے دوپہر کے وقت آرام کرنے کی جگہ کے ہونگے۔ (مفردات و اقرب)

تفسیر ان آیات میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ کہ وہ لوگ جو ہماری ملاقات کی کوئی اُمید نہیں رکھتے یا جنکے دلوں میں ہماری سزا اور عذاب کا کوئی خوف نہیں اُنکی بھی عجیب حالت ہے کبھی تو وہ یہ کہتے ہیں کہ ہم پر فرشتے کیوں نہیں اُترتے اور کبھی یہ کہنے لگ جاتے ہیں کہ ہم کو خدا کیوں نظر نہیں آتا۔ یہ بیوقوف اپنے آپ کو دیکھتے نہیں کہ کیسے گندے اور ناپاک ہیں۔ آخر انہوں نے اپنے آپ کو کیا سمجھ رکھا ہے کہ ایسے مطالبات کرتے رہتے ہیں۔

رِجَاءٌ کے معنے عام طور پر امید کے ہوتے ہیں مگر رِجَاءٌ کے ایک معنے ڈر اور خوف کے بھی ہوتے ہیں (اقرب) اسی طرح لِقَاءٌ کا لفظ جہاں ملاقات کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے وہاں اس کے ایک معنے جنگ کے بھی ہوتے ہیں۔ پس لَا یَرْجُوْنَ لِقَاءَنَا کے دونوں معنے ہو سکتے ہیں۔ یہ بھی کہ وہ لوگ جو ہماری ملاقات کی اُمید نہیں رکھتے اور یہ بھی کہ جو لوگ ہماری سزا سے خوف نہیں کھاتے۔ چونکہ دنیا میں بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کو اگر کوئی امید دلائی جائے تو وہ بڑے شوق سے کام کرنے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔ اور بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کو سزا کا خوف دلایا جائے تب وہ کام کرنے پر آمادہ ہوتے ہیں۔ اسلئے لَا یَرْجُوْنَ لِقَاءَنَا فرما کر اللہ تعالیٰ نے ان دونوں قسم کی طبائع کو ملحوظ رکھ لیا اور فرمایا کہ ان لوگوں نے ہمارے انعام اور برکات کے وعدوں سے کوئی فائدہ اٹھایا اور نہ عذاب کی خبروں سے اپنے اندر کوئی تبدیلی پیدا کی بلکہ برابر یہ لوگ اعتراض کرتے رہتے ہیں کہ اگر یہ رسول سچا ہے تو ہم پر خدا تعالیٰ کے فرشتے کیوں نہیں اُترتے۔ یا ہمیں خدا تعالیٰ کی رؤیت کیوں نصیب نہیں ہوتی۔

اسجگہ جو لِقَاء کا لفظ استعمال کیا گیا ہے مفسرین نے اس کے مختلف معنے کئے ہیں۔ بعض نے تو یہ کہا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ وہ خدا تعالیٰ کے عذاب کی پرواہ نہیں کرتے۔ اور بعض نے اس کے یہ معنے کئے ہیں کہ وہ خدا تعالیٰ کی رؤیت کی اُمید نہیں رکھتے یا یہ کہ جزائے خیر کی اُمید نہیں رکھتے۔ لیکن درحقیقت لقاء ایک روحانی مقام ہے جو اسلام پر چلنے والوں کو حاصل ہوتا ہے۔ رؤیت کے معنے تو صرف اتنے ہوتے ہیں کہ خدا تعالیٰ کا جلوہ دیکھ لیا جو ایک عارضی چیز ہے لیکن لقاء کے معنے یہ ہوتے ہیں کہ خدا مل گیا اور ایک مستقل مقام کا نام ہے۔ اس لئے صوفیاء کی اصطلاح کے مطابق رؤیت حال ہے اور لقاء ایک مستقل مقام ہے۔ اور یہی ایک چیز ہے جو اسلام اور دوسرے مذاہب میں مابہ الامتیاز ہے۔ دوسرے مذاہب اپنے پیروؤں سے اللہ تعالیٰ کے وصال کا صرف وعدہ کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ وصال قیامت کے دن ہوگا۔ مگر قرآن کریم اس نظریہ کو ردّ کرتا ہے اور فرماتا ہے کہ لقاء الٰہی کا مرتبہ اسی دُنیا میں انسان کو حاصل ہو سکتا ہے بلکہ وہ

اِس پر اتنا زور دیتا ہے کہ فرماتا ہے۔ مَنْ کَانَ فِیْ هٰذِهٖۤ اَعْمٰی فَهُوَ فِی الْاٰخِرَةِ اَعْمٰی وَ اَضَلُّ سَبِیْلًا۔ (بنی اسرائیل ع) یعنی جو شخص اِس دنیا میں خدا تعالیٰ کا عرفان نہیں رکھتا اور اُس کو اپنے دل کی آنکھوں سے نہیں دیکھتا وہ آخرت میں بھی اُسے نہیں دیکھ سکیگا اور سب سے بڑھ کر بھٹکا ہؤا ہوگا۔ اِسی طرح فرماتا ہے۔ کَلَّاۤ اِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ یَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَ (تطفیف ع) یعنی کفار قیامت کے دن اپنے رب کے سامنے آنے سے روکے جائیں گے جس کے معنے یہ ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کی رؤیت حاصل نہیں کر سکیں گے کیونکہ وہ دنیا میں اِس سے محروم رہے تھے۔ اس کے مقابلہ میں مومنوں کے متعلق فرماتا ہے کہ وُجُوْهٌ یَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ (سورۂ قیامتہ ع) اُس دن خدا تعالیٰ کے حضور میں حاضر ہونے والے مومن بندوں کے مونہہ بڑے ہشاش بشاش اور خوبصورت ہونگے اس لئے کہ وہ اپنے رب کو دیکھ رہے ہونگے۔

اِسی طرح قرآن کریم لقائے الٰہی کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے فرماتا ہے کہ اِنَّ الَّذِیْنَ لَا یَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا وَ رَضُوْا بِالْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَ اطْمَاَنُّوْا بِهَا وَ الَّذِیْنَ هُمْ عَنْ اٰیٰتِنَا غٰفِلُوْنَ اُولٰٓئِكَ مَاْوٰىهُمُ النَّارُ بِمَا كَانُوْا یَكْسِبُوْنَ (یونس ع) یعنی وہ لوگ جو ہم سے ملنے کی تڑپ اپنے دلوں میں نہیں رکھتے اور دنیا پر ہی راضی ہو کر بیٹھ گئے ہیں اور اس پر اُن کو اطمینان اور سکون حاصل ہو گیا ہے اور وہ لوگ جو ہمارے نشانوں سے غافل ہیں اُن کا ٹھکانہ اُن کے اعمال کے سبب سے جہنم ہوگا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام لقاء الٰہی کو روحانیت کی جان اور اسلام کا مغز قرار دیتا ہے اور فرماتا ہے کہ جو لوگ اس کا انکار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اب لقاء الٰہی کا دروازہ بند ہو چکا ہے۔ انہیں ہم سزا دینگے اور انہیں جہنم میں ڈالینگے افسوس ہے کہ اس زمانہ میں مسلمانوں نے بھی یہ کہنا شروع کر دیا ہے کہ اب خدا تعالےٰ کے کلام اور الہام کا دروازہ بند ہو چکا ہے اور کوئی شخص اُمّت محمدیہ میں ایسا نہیں ہو سکتا جو اللہ تعالےٰ کے حضور ایسا مقام حاصل کر سکے کہ خدا اُس سے بولنے لگ جائے۔ حالانکہ یہی ایک مسئلہ ہے جو اسلام کی دوسرے مذاہب پر فوقیت ثابت کرنے والا ہے۔ باقی مسائل کے مقابلہ میں دوسرے مذاہب والے بھی کچھ نہ کچھ پیش کر دیتے ہیں جس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ساحروں سے مقابلہ ہؤا تو جادوگروں نے بھی مقابل میں رسیاں ڈال دیں اور گو اس میں اُن کو ناکامی ہوئی مگر بہر حال انہوں نے مقابلہ کے لئے کچھ نہ کچھ تو پیش کر دیا۔ اِسی طرح باقی مسائل کے مقابلہ میں دوسرے مذاہب والے کچھ نہ کچھ باتیں پیش کر دیتے ہیں خواہ وہ غلط ہی ہوں مگر لقاء الٰہی ایک ایسی چیز ہے جس کے مقابل میں دوسرا کوئی مذہب کھڑا نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اگر وہ اس کا دعویٰ کریں تو اُن کو ماننا پڑتا ہے کہ لقاء الٰہی اِس دنیا میں بھی ہو سکتا ہے جس کا ثبوت وہ اپنے مذہب سے پیش نہیں کر سکتے اس صورت میں اُن کو لازماً اسلام کی برتری تسلیم کرنی پڑتی ہے۔ کیونکہ اسلام صرف لقاء الٰہی کا دعوےٰ ہی نہیں کرتا بلکہ وہ اس کا ثبوت بھی پیش کرتا ہے پس وہ اس سے بچنے کے لئے لقاء الٰہی کے سرے سے ہی منکر ہو جاتے ہیں اور اسلام کے اس مسئلہ کے مقابل میں اپنی طرف سے لقاء الٰہی کا جھوٹا دعویٰ بھی پیش کرنے کی جرأت نہیں کر سکتے۔ بلکہ کہہ دیتے ہیں کہ لقائے الٰہی نہ تمہارے ہاں ہے نہ ہمارے ہاں ہے۔ وہ یہ نہیں کہتے کہ لقائے الٰہی تمہارے مذہب میں نہیں اور ہمارے مذہب میں ہے۔ کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ اگر انہوں نے ایسا دعویٰ

کیا تو وہ اُسے ثابت نہیں کر سکیں گے ۔

یہ لقائے الٰہی کس طرح حاصل ہوتا ہے اس کے لئے اللہ تعالیٰ نے اصولی رنگ میں قرآن کریم میں یہ ہدایت دی ہے کہ يَا أَيُّهَا الْإِنسَانُ إِنَّكَ كَادِحٌ إِلَىٰ رَبِّكَ كَدْحًا فَمُلَاقِيهِ (انشقاق ع) یعنی اے انسان تیرے لئے اپنے رب سے ملنے کا راستہ تو ہر وقت کھلا ہے مگر شرط یہ ہے کہ تیری طرف سے کدح ہونا چاہیئے ۔ اور کدح اُس کام کو کہتے ہیں جو اتنی محنت سے کیا جائے جس کا اثر انسان کے جسم پر بھی محسوس ہونے لگے ۔ اس میں اللہ تعالیٰ نے یہ بتایا ہے کہ انسان کو اس غلط فہمی میں نہیں رہنا چاہیئے کہ اِدھر وہ ایمان لایا تو اُدھر اُسے روحانیت میں کمال حاصل ہو جائیگا بلکہ اس کے لئے اُسے متواتر محنت اور جد وجہد کرنی پڑے گی ۔ اور قربانیوں کی ایک آگ میں سے اُسے گذرنا پڑے گا تب اُسے لقائے الٰہی کی نعمت میسر آئے گی ۔

غرض ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے کفار کی بے باکی کی بڑی وجہ یہ بتائی ہے کہ وہ لقاء الٰہی کے منکر ہیں جس کی وجہ سے نہ تو اُن کے دلوں میں اللہ تعالیٰ کی محبت پائی جاتی ہے اور نہ اُس کے عذاب کا خوف پایا جاتا ہے اور پھر اُن کے ان مطالبات کا ذکر فرمایا ہے کہ اگر یہ سچا رسول ہے تو ہم پر فرشتے کیوں نہیں اُترتے یا ہم خدا تعالیٰ کو اپنی آنکھوں سے کیوں نہیں دیکھ لیتے ۔ اس سے پہلے وہ یہ اعتراض بھی کر چکے تھے کہ اگر یہ سچا رسول تھا تو چاہیئے تھا کہ اس کے پاس کوئی بہت بڑا باغ ہوتا جس کے پھلوں اور میووں سے لدے ہوئے درخت اس کے دعویٰ کا ثبوت ہوتے ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کفار کے نزدیک صداقت کے دو ہی ثبوت ہُوا کرتے ہیں ۔ اول مادی غلبہ ۔ دوم سُنت اللہ کے خلاف محیر العقول کارنامے ۔ چونکہ انہیں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم میں یہ دونوں باتیں نظر نہیں آتی تھیں نہ مال و دولت اور خزانوں کے ڈھیر انہیں آپ کے پاس دکھائی دیتے تھے اور نہ سنت اللہ کے خلاف کوئی مافوق الانسانیت بات آپ میں دکھائی دیتی تھی اسلئے وہ آپ کے دعویٰ پر ہنسی اُڑاتے تھے ۔ اللہ تعالیٰ اُن کے ان اعتراضات کا ذکر کرتے ہوئے فرماتا ہے لَقَدِ اسْتَكْبَرُوا فِي أَنفُسِهِمْ وَعَتَوْا عُتُوًّا كَبِيرًا ۔ ان اعتراضات کا اصل باعث یہ ہے کہ یہ لوگ اپنے دلوں میں ان دونوں باتوں کو بہت بڑا اور ناممکن سمجھتے ہیں اور شرارتوں میں حد سے بڑھ گئے ہیں ۔ یعنی منہ سے تو وہ یہ کہتے ہیں کہ محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) جھوٹ بول رہے ہیں اور قوم کے دشمن ہیں ۔ لیکن اپنے دلوں میں یہ خیال کرتے ہیں کہ قوم کو جس مقام تک پہنچانے کا یہ شخص مدعی ہے اُسے حاصل نہیں کیا جا سکتا ۔ گویا بظاہر تو مخالفت کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ اس شخص نے قوم سے غداری کی ہے اور بتوں کی پرستش کو چھوڑ کر خدائے واحد کی عبادت کا ڈھونگ رچا دیا ہے مگر مخالفت کی اصل وجہ اُن کے دلوں کی یہ کیفیت ہے کہ وہ ان دعووں کو ناقابلِ حصول سمجھتے ہیں اور اس مایوسی کی وجہ سے ان قربانیوں کے لئے جو آپ کے ساتھ مل کر کرنی پڑتی ہیں اپنے نفوس میں جرأت نہیں پاتے اور مخالفت پر آمادہ رہتے ہیں ۔

پھر فرماتا ہے کہ فرشتوں کا یہ مطالبہ تو کرتے ہیں مگر ہمارے فرشتے یا تو الہام لایا کرتے ہیں ۔ یا کفار پر عذاب نازل کیا کرتے ہیں ۔ الہام کے تو یہ قابل نہیں اور جب عذاب آیا تو اس وقت یہی کہیں گے کہ خدایا اسے ٹلا دے اور اس سے دُور بھاگنے کی کوشش کریںگے گویا اُس وقت فرشتوں کا آنا اُن کے لئے کسی برکت

وَيَوْمَ تَشَقَّقُ السَّمَآءُ بِالْغَمَامِ وَنُزِّلَ الْمَلٰٓئِكَةُ تَنْزِيْلًا ﴿۲۶﴾

اور اُس دن (کو یاد کرو) جب آسمان پھٹ جائیگا اور بادل سر پر منڈلا رہے ہونگے اور ملائکہ بار بار اُتارے جائیں گے۔

اَلْمُلْكُ يَوْمَئِذِ ٟ الْحَقُّ لِلرَّحْمٰنِ ؕ وَكَانَ يَوْمًا عَلَى الْكٰفِرِيْنَ

اُس دن بادشاہت سچ مچ رحمٰن (خدا) کے قبضہ میں نظر آئے گی۔ اور (یہ) دن کافروں پر بڑا

عَسِيْرًا ﴿۲۷﴾ وَيَوْمَ يَعَضُّ الظَّالِمُ عَلٰى يَدَيْهِ يَقُوْلُ

سخت ہوگا۔ اور اُس دن ظالم اپنے ہاتھوں کو کاٹے گا (اور) کہے گا۔

يٰلَيْتَنِى اتَّخَذْتُ مَعَ الرَّسُوْلِ سَبِيْلًا ﴿۲۸﴾ يٰوَيْلَتٰى لَيْتَنِىْ

اے کاش! میں رسول کے ساتھ چل پڑتا۔ وائے بدبختی! کاش!

لَمْ اَتَّخِذْ فُلَانًا خَلِيْلًا ﴿۲۹﴾ لَقَدْ اَضَلَّنِىْ عَنِ الذِّكْرِ بَعْدَ

میں فلاں شخص کو دوست نہ بناتا۔ اُس نے مجھے خدا کے ذکر سے غافل کر دیا جبکہ وہ

اِذْ جَآءَنِىْ ؕ وَكَانَ الشَّيْطٰنُ لِلْاِنْسَانِ خَذُوْلًا ﴿۳۰﴾

(رسول کے ذریعہ سے) میرے پاس آیا تھا۔ اور شیطان آخر انسان کو اکیلا چھوڑ کر چلا جاتا ہے [۱۲]

کاموجب نہیں ہوگا بلکہ تباہی اور بربادی کا موجب ہوگا اور ہمارا یہ عذاب بلا وجہ نہیں ہوگا۔ بلکہ اِس لئے ہوگا کہ یہ لوگ صداقت کو دنیا سے مٹانا چاہتے ہیں جس میں ہم اُن کو کبھی کامیاب نہیں ہونے دیں گے۔ چنانچہ جب بھی یہ لوگ صداقت پر حملہ کرنے کی طرف توجہ کریں گے ہم ان کو تباہ کر دینگے اور انہیں ہوا میں بکھرے ہوئے ذرّات کی طرح منتشر اور پراگندہ کر دیں گے اور انہیں ایسا پیسیں گے کہ اُن کے دوست اور مددگار بھی اُنکو اکٹھا نہیں کر سکیں گے۔ اِس کے مقابلہ میں مومنوں کو ہماری طرف سے اعلیٰ سے اعلیٰ ٹھکانے ملیں گے اور اُن کے قیلولہ کی جگہ بھی بڑی اچھی ہوگی یعنی اُن کے صبح کے کام اُن کے دوپہر کے آرام کو بڑا خوشگوار بنا دیں گے اور اُن کی قربانیاں انہیں اور اُن کی آئندہ نسلوں کو ایک لمبے عرصہ تک اللہ تعالیٰ کی برکات اور نعماء سے متمتع کرتی رہیں گی۔

[۱۲] **حل لغات:**۔ خَذُوْلٌ۔ خَذَلَ سے ہے اور خَذَلَهٗ کے معنے ہیں تَرَكَ نُصْرَتَهٗ وَاِعَانَتَهٗ اُس کی اعانت اور مدد چھوڑ دی پس خَذُوْلٌ کے معنے ہونگے مدد اور نصرت کو چھوڑ دینے والا (اقرب)

خَذُوْلٌ

تفسیر:۔ فرماتا ہے۔ تم اُس دن کو یاد کرو۔ جبکہ آسمان پھٹ جائیگا اور بادل ہی بادل ظاہر ہو جائیں گے۔ اور کفار کو عذاب دینے کے لئے کثرت سے فرشتے نازل کئے جائیں گے۔ اُس دن بادشاہت کا فرون

چھین کر خدا اپنے ہاتھ میں لے لیگا - اور وہ دن کافروں کے لئے بڑا سخت ہوگا - اور کافر اپنے ہاتھ کاٹ کاٹ کر کہیگا کہ کاش میں محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ ہوتا - کاش! میں فلاں شخص کو جو دشمن رسول تھا اپنا دوست نہ بناتا - اس کم بخت دوست نے خدا تعالٰے کا پیغام آنے کے بعد مجھے اور بھی گمراہی میں دھکیل دیا - اور میرے لئے شیطان بن گیا - اور شیطان ہمیشہ وقت پر ساتھ چھوڑ دیا کرتا ہے -

ان آیات میں اللہ تعالٰے نے اُس عذاب کی تفصیلات بیان فرمائی ہیں جو کفار کے لئے آسمان پر مقدر ہو چکا تھا چونکہ اُن کا مطالبہ تھا کہ اگر یہ رسول سچا ہے تو ہم پر فرشتے کیوں نہیں اُتارے گئے - اس لئے اللہ تعالٰے نے بتایا کہ ایک دن آنے والا ہے جبکہ فرشتے تمہاری سرکوبی کے لئے آسمان سے اتارے جائیں گے - مگر وہ دن تمہارے لئے خوشی کا موجب نہیں ہوگا بلکہ حسرت اور افسوس کا موجب ہوگا - آج تو تم بڑی بے باکی کے ساتھ کہتے ہو کہ وہ فرشتے کہاں ہیں جن کا روزانہ ذکر کیا جاتا ہے - ہم پر بھی اُتریں تو ہم جانیں کہ تم سچ کہتے ہو - مگر جب وہ نازل ہوئے - تو اُس دن تم کہو گے کہ کاش! ہم پر یہ دن نہ چڑھتا اور ہم اس کی آفات سے محفوظ رہتے - چنانچہ فرماتا ہے - یَوْمَ تَشَقَّقُ السَّمَآءُ - ایک دن آنے والا ہے جبکہ آسمان پھٹ جائیگا - آسمان کے پھٹنے کے یہ معنے بھی ہوتے ہیں کہ عذاب نازل ہو جائے - گویا رحمت اور عذاب دونوں کے لئے آسمان پھٹ جانے کے الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں - چنانچہ دیکھو - ایک جگہ اللہ تعالٰی فرماتا ہے :- اَوَ لَمْ یَرَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْٓا اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ کَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰھُمَا وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ کُلَّ شَیْءٍ حَیٍّ (انبیاء ع۳) یعنی کیا کفار اس امر پر غور نہیں کرتے کہ آسمان اور زمین دونوں بند تھے - نہ آسمان سے برکاتِ الٰہیہ کا نزول ہو رہا تھا اور نہ زمین اپنی مخفی طاقتوں کو ظاہر کر رہی تھی مگر پھر ہم نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھیج کر اِن دونوں کو پھاڑ دیا - اور کلامِ الٰہی سے ہم نے ہر چیز کو زندہ کر دیا - اسجگہ آسمان کے پھٹنے سے رحمتِ الٰہی کی بارش برسنا مراد ہے - لیکن دوسری جگہ اللہ تعالٰے فرماتا ہے - تَکَادُ السَّمٰوٰتُ یَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ وَ تَنْشَقُّ الْاَرْضُ وَ تَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا اَنْ دَعَوْا لِلرَّحْمٰنِ وَلَدًا (مریم ع۶) یعنی قریب ہے کہ آسمان پھٹ جائیں اور زمین شق ہو جائے اور پہاڑ ریزہ ریزہ ہو کر گر جائیں اس لئے کہ عیسائیوں نے خدائے رحمٰن کا ایک بیٹا بنا لیا ہے - اسجگہ آسمان کے پھٹنے سے مراد آسمان سے بلاؤں اور آفات کا نزول ہے یعنی قریب ہے کہ آسمان اپنی بلاؤں اور آفات کا مُنہ ان کے لئے کھول دے اور انہیں خطرناک عذابوں سے گھیر لے اس لئے کہ انہوں نے ایک انسان کو خدائے رحمٰن کا بیٹا قرار دے دیا ہے - زیرِ تفسیر آیات میں بھی یَوْمَ تَشَقَّقُ السَّمَآءُ سے مراد عذاب الٰہی کا نزول ہے کیونکہ اس کے معًا بعد اللہ تعالٰی فرماتا ہے کہ وَکَانَ یَوْمًا عَلَی الْکٰفِرِیْنَ عَسِیْرًا وہ دن کافروں کیلئے بڑا سخت ہوگا - اگر یہاں آسمان کے پھٹنے سے رحمتِ الٰہی کا نزول مُراد ہوتا تو کفار کی ناکامیوں اور اُن کی حسرتوں کا ذکر نہ کیا جاتا -

اُس دن کی ایک بڑی علامت اللہ تعالٰی نے یہ بتائی کہ اُس دن بادل ہی بادل ظاہر ہو جائیں گے - یعنی آسمان سے خوب بارش برسے گی - اور دوسری علامت یہ بتائی کہ اُس دن اللہ تعالٰی کے ملائکہ کفار کو عذاب دینے کے لئے بڑی کثرت کے ساتھ اُتارے جائیں گے اسی طرح یہ بھی بتایا کہ اُس دن خدائے رحمٰن کی حکومت قائم ہو جائیگی اور کفار اپنی ہلاکت اور بربادی سے چیخ اٹھینگے

یہ عذاب جیسا کہ تاریخی واقعات سے ظاہر ہے
کفارِ مکہ پر جنگِ بدر کی صورت میں آیا - جسے قرآن کریم نے
یوم الفرقان بھی قرار دیا ہے (انفال ع ۵) یہی وہ دن تھا
جس میں اللہ تعالیٰ کفار کے بڑے بڑے عمائد کو مکہ سے نکال
کر بدر کے میدان میں لایا - اور انہیں چند کمزور اور بے سامان
مسلمانوں کے ہاتھوں لقمۂ اجل بنا دیا - چنانچہ رسول کریم
صلے اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہوا کہ عتبہ اور شیبہ اور ابوجہل
اور عقبہ بن ابی معیط اور امیہ بن خلف اور نضر بن حارث
اور دوسرے تمام سردار ایک ایک کر کے بدر کے میدان
میں آچکے ہیں تو آپ نے صحابہؓ سے مخاطب ہو کر فرمایا
کہ ھٰذِہٖ مَکَّۃُ قَدْ اَلْقَتْ اِلَیْکُمْ اَفْلَاذَ کَبِدِھَا
یعنی لو مکہ نے اپنے جگر کے ٹکڑے نکال کر تمہاری طرف
پھینک دئے ہیں - مگر چونکہ کفار کا لشکر وادیٔ بدر
میں مسلمانوں کے لشکر سے پہلے پہنچ چکا تھا - اس لئے
اُس نے اپنے لئے ایسی جگہ منتخب کر لی جہاں پانی اور
گھاس کی کثرت تھی اور جس کی زمین پکی اور ہموار تھی اور
مسلمانوں کو ریت کے ایک ٹیلے پر اُترنا پڑا - جہاں نہ تو
پانی بافراط مل سکتا تھا اور نہ جانوروں کے لئے گھاس کا
کوئی انتظام تھا - کفار نے پختہ زمین کا انتخاب اپنے لئے
اس لئے کیا تھا کہ لڑائی کی صورت میں جنگی حرکات اُن
میں آسانی سے ہو سکیں گی - اور مسلمانوں کے لئے ریتلا میدان
اس لئے چھوڑا گیا تھا کہ جنگ کے وقت اُن کے پاؤں
ریت میں دھنس دھنس جائیں گے اور اُن کے لئے لڑنا مشکل
ہو جائیگا - مگر وہ خدا جس نے یہ خبر دے رکھی تھی کہ
یَوْمَ تَشَقَّقُ السَّمَآءُ بِالْغَمَامِ اُس نے راتوں رات
جنگ کا اس طرح پانسہ پلٹا کہ خوب بارش ہوئی - جس کے
نتیجہ میں ایک تو مسلمانوں نے حوض بنا بنا کر پانی جمع کر لیا
اور پھر اُس کا بڑا فائدہ یہ ہوا کہ بارش کی وجہ سے ریتلا
میدان ایک جما ہوا پختہ میدان بن گیا اور کفار کا پختہ میدان
پھسلویں زمین بن گیا - اور اُس کے سپاہیوں اور گھوڑوں
کے لئے مسلمانوں کا جم کر مقابلہ کرنا مشکل ہو گیا - پھر
اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی تائید کے لئے اپنے ملائکہ بھی
نازل فرمائے جس کی خبر اللہ تعالیٰ نے محمد رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم کو الہاماً بھی دے دی تھی جیسا کہ
اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اِذْ تَسْتَغِیْثُوْنَ رَبَّکُمْ
فَاسْتَجَابَ لَکُمْ اَنِّیْ مُمِدُّکُمْ بِاَلْفٍ مِّنَ
الْمَلٰٓئِکَۃِ مُرْدِفِیْنَ (انفال ع ۱) یعنی اُس وقت
کو یاد کرو جبکہ تم اپنے رب سے التجائیں کرتے تھے کہ
وہ تمہاری مدد کیلئے آسمان سے اُترے - چنانچہ اللہ تعالیٰ نے
تمہاری دُعاؤں کو سُنا اور اُس نے تمہیں بشارت دیتے ہوئے
کہا کہ میں تمہاری ایک ہزار فرشتوں سے مدد کرونگا جن کا
لشکر کے بعد لشکر بڑھ رہا ہو گا - چنانچہ مسلمانوں کے
مقابلہ میں آنے والے لشکر کی تعداد بھی ایک ہزار تھی اور
مسلمان صرف ۳۱۴ تھے اس لئے اللہ تعالیٰ نے بھی انہیں
ایک ہزار فرشتوں کے نزول کی خبر دی - اس سے معلوم
ہوتا ہے کہ یہ وہی فرشتے تھے جو ہر انسان کے ساتھ
مقرر ہوتے ہیں - جب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور
آپ کے لشکر کا کفار سے مقابلہ ہوا تو باوجود اس کے
کہ صحابہؓ ۳۱۳ تھے اور بے سرو • نہتے اور ناتجربہ کار تھے
اللہ تعالیٰ نے ہر کافر کے دل میں اُس فرشتے کے ذریعہ
جو اُس پر مقرر تھا رعب ڈالنا شروع کیا کہ مقابلہ کیا
تو مارے جاؤ گے - بلکہ بعض کفار کو جیسا کہ روایات سے
ثابت ہے کشفی حالت میں یہ فرشتے نظر بھی آئے -
چنانچہ جب بدر کی جنگ میں کفار مسلمانوں کے مقابلہ
میں بھاگ نکلے تو بعض لوگوں نے انہیں طعنہ دیا کہ تم
نے کیسی بزدلی دکھائی ہے - انہوں نے کہا نہیں کیا پتہ
اس جنگ میں سفید ابلق گھوڑوں پر کوئی عجیب قسم کی
مخلوق سوار تھی - تلواریں اُن کے ہاتھ میں تھیں اور وہ

جس پر بھی تلوار چلاتے تھے وہ فوراً کٹ کر دو ٹکڑے ہو جاتا تھا پس ہمارا مقابلہ آدمیوں سے نہیں تھا بلکہ جنات سے تھا۔ چنانچہ باوجود کثرت اور ساز و سامان کے وہ اس تائیدِ الٰہی کی وجہ سے شکست کھا گئے۔ پھر فرشتوں کا نزول اس رنگ میں بھی ہُوا کہ اِدھر لڑائی ہو رہی تھی اور اُدھر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم خدا کے حضور سجدہ میں گِر کر دُعائیں فرما رہے تھے۔ بہت دیر کے بعد آپؐ نے سجدہ سے اپنا سر اُٹھایا اور پھر خیمہ سے باہر تشریف لا کر آپؐ نے ریت اور کنکروں کی ایک مٹھی اُٹھائی اور انہیں زور سے کفار کی طرف پھینکا اور بڑے جوش سے فرمایا شَاهَتِ الْوُجُوْهُ یعنی دشمنوں کے مُنہ کالے ہو گئے اور ساتھ ہی آپؐ نے مسلمانوں سے فرمایا کہ یکدم حملہ کر دو۔ آپؐ کا اُنکی طرف مٹھی بھر کنکر پھینکنا تھا کہ خدا تعالےٰ نے اِس زور سے آندھی چلائی کہ کفار کی آنکھیں اور مُنہ ریت اور کنکروں سے بھر گئے۔ اور کفار کے لشکر میں بھاگڑ مچ گئی اور آن کی آن میں میدان صاف ہو گیا۔ آپؐ نے اُن کو بھاگتے ہوئے دیکھ کر فرمایا۔ یہ فرشتوں کی فوج تھی جو خدا نے ہماری مدد کے لئے نازل فرمائی تھی۔ خود قرآن کریم نے بھی ایک مقام پر اس نشان کا اِن الفاظ میں ذکر فرمایا ہے کہ مَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى۔ (انفال ع۲) یعنی اے محمد رسول اللہ! جب بدر کے میدان میں کفار کی طرف تُو نے مٹھی بھر کنکر پھینکے تھے تو اُس وقت تُو نے وہ کنکر نہیں پھینکے بلکہ ہم نے پھینکے تھے اور صحابہؓ کے متعلق فرماتا ہے کہ فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ (انفال ع۲) یعنی تم نے ان کفار کو قتل نہیں کیا بلکہ اللہ تعالےٰ نے خود ان کو قتل کیا ہے یعنی ظاہر میں تو تمہارے ہاتھوں نے تلوار چلائی اور ظاہر میں تمہارے ہاتھوں سے کفار اپنے کیفر کردار کو پہنچے مگر تم بھی جانتے ہو اور دنیا بھی جانتی ہے کہ تمہاری تلواروں میں یہ طاقت نہیں تھی کہ تم اتنے بڑے لشکر کا مقابلہ کر سکتے۔ تمہارا تجربہ ان سے کم تھا۔ تمہاری طاقت اِن سے کم تھی۔ تمہارے سامان اِن سے کم تھے۔ مگر اس کے باوجود جو تمہیں غلبہ نصیب ہُوا اور تم نے کفار کے بڑے بڑے سرداروں کو خاک و خون میں لوٹا دیا تو اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ تمہاری پشت پر خدائی ہاتھ تھا اور اُس کے فرشتوں کی فوج تمہاری تائید میں نازل ہو رہی تھی۔ پھر فرماتا ہے۔ اَلْمُلْكُ يَوْمَئِذٍ الْحَقُّ لِلرَّحْمٰنِ اُس دن بادشاہت سچ مچ خدائے رحمٰن کے قبضہ میں نظر آئیگی۔ کیونکہ اُس دن خدائے رحمٰن کی وہ بات پوری ہوئی جو اُس نے سالہا سال پہلے مکہ میں سُنا دی تھی کہ لَئِنْ لَّمْ يَنْتَهِ لَنَسْفَعًا بِالنَّاصِيَةِ نَاصِيَةٍ كَاذِبَةٍ خَاطِئَةٍ (سورۃ العلق ع۱) اگر یہ کفار اسلام کی مخالفت سے باز نہ آئے اور وہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ کو جن کی پیشانی ہمیشہ خدائے واحد کے آستانہ پر جھکی رہتی ہے اسی طرح مکہ کی گلیوں میں گھسیٹتے رہے تو وہ یاد رکھیں کہ ہم بھی ایک دن اُن کی جھوٹی اور خطا کار پیشانی کے بالوں کو پکڑ کر نہایت سختی کے ساتھ گھسیٹینگے۔ چنانچہ جب بدر کی جنگ ختم ہوئی تو ابوجہل اور دوسرے سردارانِ قریش کو جو مسلمانوں کے ہاتھوں نہایت ذلت کے ساتھ ہلاک ہوئے تھے۔ سر کے بالوں سے گھسیٹ کر ایک گڑھے میں ڈال دیا گیا اور لات و مناۃ اور ہبل کے پجاری خدائے واحد کی قہری تلوار کا نشانہ بن گئے۔

پھر فرماتا ہے۔ وَكَانَ يَوْمًا عَلَى الْكٰفِرِيْنَ عَسِيْرًا۔ یہ دن کفار کے لئے بڑا سخت اور عبرت ناک ہوگا۔ چنانچہ دیکھ لو۔ ابھی جنگ شروع بھی نہیں ہوئی تھی کہ عتبہ اور شیبہ اور ولید حضرت حمزہؓ اور حضرت علیؓ کے ہاتھوں خاک و خون میں تڑپنے لگے۔ اور پھر جنگ ختم ہوئی اور کفار میدان چھوڑ کر بھاگے تو ابوجہل نے مرتے وقت

بڑی حسرت سے کہا کہ لَوْ غَیْرَ اَکَّارٍ قَتَلَنِیْ یعنی اے کاش میں کسی کسان کے ہاتھ سے قتل نہ ہوتا۔ اِن الفاظ سے اُس کا اشارہ مدینہ کے اُن دو نوجوان لڑکوں کی طرف تھا جنہوں نے باز کی طرح اُس پر حملہ کیا اور جنگ کے شروع ہوتے ہی اُسے زخمی کر کے گرا دیا۔ چونکہ مکّہ والے انصار کو بہت ذلیل سمجھتے تھے کیونکہ ان کا کام صرف زراعت کرنا اور سبزی ترکاری بیچنا تھا۔ اِس لئے جب ابوجہل دو انصاری لڑکوں کے ہاتھ سے مارا گیا تو اُس نے بڑی حسرت سے کہا کہ کاش کسی معزز آدمی کے ہاتھ سے میری موت ہوتی۔ مجھے صدمہ ہے کہ دو کسان لڑکوں نے مجھے مار ڈالا غرض کفار کے لئے یہ ایک ایسا سانحہ تھا جس نے اُن کے تمام کبر و غرور کو خاک میں ملا دیا۔ اور یسعیاہ نبی کی اُس پیشگوئی کو بھی روزِ روشن کی طرح سچا ثابت کر دیا کہ

"عرب کے صحرا میں تم رات کو کاٹو گے۔
اے ددانیوں کے قافلو! پانی لے کے پیاسے کا استقبال کرنے آؤ۔ اے تیما کی سرزمین کے باشندو! روٹی لے کے بھاگنے والے کے ملنے کو نکلو۔ کیونکہ وے تلواروں کے سامنے سے ننگی تلوار سے اور کھینچی ہوئی کمان سے اور جنگ کی شدّت سے بھاگے ہیں۔ کیونکہ خداوند نے مجھ کو یوں فرمایا کہ ہنوز ایک برس ہاں مزدور کے سے ایک ٹھیک برس میں قیدار کی ساری حشمت جاتی رہے گی اور تیر اندازوں کے جو باقی رہے قیدار کے بہادر لوگ گھٹ جائیں گے کہ خداوند اسرائیل کے خدا نے یوں فرمایا۔" (یسعیاہ باب ۲۱ آیت ۱۳ تا ۱۷)

اِس پیشگوئی میں یسعیاہ نبی نے جنگِ بدر کی خبر دیتے ہوئے بتایا تھا کہ ہجرت مدینہ پر ٹھیک ایک سال گذرنے پر عرب میں ایک ایسی جنگ ہوگی جس سے قیدار کی ساری حشمت جاتی رہے گی اور وہ پیٹھ دکھاتے ہوئے میدان جنگ سے بھاگ کھڑے ہونگے۔ چنانچہ ایسا ہی ہُوا۔ کفار اپنے بڑے بڑے جرنیلوں کی لاشیں میدان جنگ میں چھوڑ کر بھاگ گئے اور مسلمانوں کی تمام عرب پر دھاک بیٹھ گئی۔

اِس کے بعد اللہ تعالیٰ اِن تباہیوں کے اسباب اور بواعث کا ذکر کرتا ہے۔ اور فرماتا ہے کہ انسان ہمیشہ اپنے گندے جلیسوں کی وجہ سے تباہی کے گڑھے میں گرا کرتا ہے۔ وہ پہلے تو اپنے دوستوں کی مصاحبت پر فخر کرتا ہے۔ مگر جب اسے کسی مصیبت کا سامنا کرنا پڑتا ہے تو وہ بے اختیار کہہ اٹھتا ہے کہ يٰلَيْتَنِیْ لَمْ اَتَّخِذْ فُلَانًا خَلِيْلًا اے کاش! میں فلاں کو اپنا دوست نہ بناتا۔ اُس نے تو مجھے گمراہ کر دیا۔ اِسی وجہ سے قرآن کریم نے مومنوں کو یہ خاص طور پر نصیحت فرمائی ہے کہ كُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ (توبہ ۱۵ع) یعنی اے مومنو! تم ہمیشہ صادقوں کی معیّت اختیار کیا کرو۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان اپنے گردوپیش کی اشیاء سے متأثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اگر وہ اپنی دوستی اور ہم نشینی کے لئے اُن لوگوں کا انتخاب کرے گا جو اعلیٰ اخلاق کے مالک ہونگے اور جن کا مطمحِ نظر بلند ہوگا تو لازماً وہ بھی اپنی کمزوریوں کو دُور کرنے کی کوشش کریگا اور رفتہ رفتہ اس کی یہ کوشش اُس کے قدم کو اخلاقی بلندیوں کی طرف بڑھانے والی ثابت ہوگی۔ لیکن اگر وہ بُرے ساتھیوں کا انتخاب کرے گا تو وہ اُسے کبھی راہِ راست کی طرف نہیں لے جائیں گے بلکہ اُسے اخلاقی پستی میں دھکیلنے والے ثابت ہونگے۔

حضرت مسیح موعود علیہ السلام کو ایک دفعہ ایک سکھ طالب علم نے جو گورنمنٹ کالج لاہور میں پڑھتا تھا اور آپ سے عقیدت اور اخلاص رکھتا تھا کہلا بھیجا کہ پہلے تو مجھے خدا تعالیٰ کی ہستی پر بڑا یقین تھا مگر اب

کچھ عرصہ سے مجھے شکوک پیدا ہونے شروع ہو گئے ہیں آپ دُعا کریں کہ اللہ تعالےٰ میرے ان شکوک کو دُور فرمائے۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اُسے کہلا بھیجا کہ معلوم ہوتا ہے تمہارے ساتھیوں میں سے کوئی شخص دہریت کے خیالات اپنے اندر رکھتا ہے جس کا تم پر اثر پڑ رہا ہے۔ تم کالج میں جس جگہ بیٹھا کرتے ہو اُس جگہ کو بدل لو چنانچہ اُس نے اپنی سیٹ بدل لی اور کچھ دنوں کے بعد اُس کے خیالات کی خود بخود اصلاح ہو گئی۔ اِس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ بُرے ساتھیوں کا انسان پر کتنا بُرا اثر پڑتا ہے۔ یہی حکمت ہے جس کے ماتحت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم جس کسی مجلس میں تشریف رکھتے تھے تو بڑی کثرت سے استغفار فرمایا کرتے تھے تاکہ کوئی بُری تحریک آپ کے قلبِ مطہر پر اثر انداز نہ ہو۔

لَقَدْ اَضَلَّنِيْ عَنِ الذِّكْرِ بَعْدَ اِذْ جَآءَنِيْ میں اَلذِّكْرِ سے مُراد قرآن کریم ہے کیونکہ قرآن کریم کو اللہ تعالےٰ نے عمل کے لئے نازل فرمایا ہے اور اس کا ایک نام الذکر بھی رکھا ہے۔ جیسا کہ وہ فرماتا ہے:-

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ (حجر ع۱) ہم نے ہی اس ذکر یعنی قرآن کریم کو اُتارا ہے اور ہم ہی اسکی حفاظت کریں گے۔ اِسی طرح فرماتا ہے وَهٰذَا ذِكْرٌ مُّبٰرَكٌ اَنْزَلْنٰهُ اَفَاَنْتُمْ لَهٗ مُنْكِرُوْنَ (انبیاء ع۴) یہ قرآن ایک ایسا نصیحت نامہ ہے جس میں تمام آسمانی کتابوں کی خوبیاں جمع کر دی گئی ہیں اور جس کو ہم نے اپنی خاص حکمتوں کے ماتحت نازل کیا ہے۔ کیا تم اِس عظیم الشان کتاب کے منکر ہو؟ پھر فرماتا ہے:- وَاِنَّهٗ لَذِكْرٌ لَّكَ وَلِقَوْمِكَ (زخرف ع۴) یہ قرآن تیرے اور تیری تمام قوم کے لئے شرف کا موجب ہے۔ یعنی جو لوگ اس کتاب پر عمل کرینگے اللہ تعالےٰ انہیں بڑی عظمت اور بزرگی عطا فرمائیگا۔

اِسی طرح ایک اور مقام پر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِالذِّكْرِ لَمَّا جَآءَهُمْ وَاِنَّهٗ لَكِتٰبٌ عَزِيْزٌ۔ لَّا يَاْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ تَنْزِيْلٌ مِّنْ حَكِيْمٍ حَمِيْدٍ (حٰمٓ السجدہ ع۵) وہ لوگ جنہوں نے اِس ذکر یعنی قرآن کریم کا انکار کیا جبکہ وہ اُن کے پاس آیا حالانکہ وہ بڑی عزت والی کتاب ہے وہ اپنی تباہی کا اپنے ہاتھوں سامان کر رہے ہیں۔ یہ کتاب وہ ہے کہ نہ باطل اس کے آگے سے آسکتا ہے اور نہ اس کے پیچھے سے اور بڑی حکمتوں اور تعریفوں والے خدا کی طرف سے نازل ہوئی ہے۔ ایسی عظیم الشان اور بابرکت کتاب جو انسانیت کے لئے شرف کا باعث ہے اور جس کی پیشکردہ سچائیوں کو نہ سابق علوم غلط ثابت کر سکے ہیں اور نہ موجودہ زمانہ کے علوم اس کی کسی بات کو غلط قرار دے سکے ہیں۔ اس سے اگر کوئی شخص اعراض کرتا ہے تو وہ یقیناً اپنی ہلاکت اور بربادی اپنے ہاتھوں مول لیتا ہے۔ یہ کتاب خدا تعالیٰ نے اس لئے نازل کی ہے کہ بنی نوع انسان اِسے پڑھیں۔ اِس کے علوم کو سیکھیں۔ اپنے اہل و عیال کو سکھائیں۔ اور پھر تمام دنیا میں اُسے پھیلاتے چلے جائیں۔ یہاں تک کہ دنیا کے چپہ چپہ پر خدائے واحد کی حکومت قائم ہو جائے اور اسود و احمر تک خدا تعالےٰ کا نام اور اس کا پیغام پہنچ جائے۔ جو لوگ اس کتاب کو اپنا دستور العمل بنا لیں گے وہ دنیا میں بھی سربلند ہوں گے اور آخرت میں بھی اللہ تعالےٰ کے انعامات کے وارث ہونگے۔ مگر وہ لوگ جو اُسے پس پشت پھینک دیں گے وہ عذاب کے وقت اپنے بُرے ساتھیوں اور ہمنشینوں پر لعنتیں ڈالیں گے جو اُن کی گمراہی کا باعث ہے مگر اُسوقت نہ اُن کا افسوس اُن کے کسی کام آئے گا

وَقَالَ الرَّسُوْلُ يٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا ﴿۳۱﴾

اور رسول نے کہا۔ اے میرے ربّ! میری قوم نے تو اِس قرآن کو پیٹھ کے پیچھے پھینک دیا ہے۔ ۵۱۳

اور نہ ان کا اپنے ساتھیوں پر لعنتیں ڈالنا انہیں کسی عذاب سے بچا سکیگا۔ کیونکہ اس کے نتیجہ کی ذمہ واری خود اُن پر ہوگی۔ کسی اَور پر نہیں۔

۵۱۳ حل لغات: ۔ مَهْجُوْرًا هَجَرَ سے اسم مفعول کا صیغہ ہے اور هَجَرَهٗ کے معنے ہیں تَرَكَهٗ وَ اَعْرَضَ عَنْهُ اسکو چھوڑ دیا اور اس سے مُنہ موڑ لیا (اقرب) مفردات میں ہے۔ اَلْهَجْرُ وَ الْهِجْرَانُ مُفَارَقَةُ الْاِنْسَانِ غَيْرَهٗ اِمَّا بِالْبَدَنِ اَوِ اللِّسَانِ اَوْ بِالْقَلْبِ کہ کسی سے انسان بدنی لحاظ سے علیحدہ ہو جائے اور مفارقت اختیار کرے یا اس سے کلام نہ کرے یا دلی لگاؤ اس کے ساتھ نہ رکھے تو اس وقت هَجْر کا لفظ بولتے ہیں۔ وَقَوْلُهٗ تَعَالٰى اِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا فَهٰذَا هَجْرٌ بِالْقَلْبِ اور آیت قرآنیہ میں جو آیا ہے کہ رسول اللہ فرمائینگے کہ میری قوم نے قرآن مجید کو چھوڑ دیا ہے تو اس سے مراد یہ ہے کہ مسلمانوں کا دلی لگاؤ اس کے ساتھ نہیں رہیگا (مفردات)

تفسیر: ۔ فرماتا ہے۔ قیامت کے دن رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم خدا تعالیٰ کے حضور افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہیں گے کہ خدایا میری قوم نے تیرے اس قرآن کو بالکل چھوڑ دیا۔ اور اپنی پیٹھ کے پیچھے ڈال دیا۔ یہ ایک نہایت مختصر سا فقرہ ہے مگر اس میں ایسا درد بھرا ہوا ہے کہ یہ میرے سامنے کبھی نہیں آیا کہ میرا دل اس کو پڑھکر کانپ نہ گیا ہو۔ دیکھو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم یہ نہیں فرماتے کہ اے میرے رب! میری قوم نے قرآن کو بالکل ترک کر دیا حالانکہ یہ کہنا بھی کافی تھا۔ بلکہ فرماتے ہیں۔ اے میرے رب! میری قوم نے اس قرآن کو چھوڑ دیا۔ یہاں هٰذَا کا لفظ بہت ہی درد اور افسوس کو ظاہر کر رہا ہے فرماتے ہیں۔ خدایا تُو نے میری قوم کو یہ ایک ایسی اعلیٰ درجہ کی نعمت دی تھی۔ اور ایسی بابرکت کتاب بخشی تھی کہ جس کی دنیا میں اور کوئی مثال نہ تھی۔ مگر میری قوم نے اس کو بھی چھوڑ دیا۔ دنیا میں دھیلے دمڑی کی چیز کو تو کوئی چھوڑتا نہیں لیکن ایسے قرآن کو جس کے مقابل میں ساری دنیا کا مال و متاع بھی کچھ حقیقت نہیں رکھتا چھوڑ دیا گیا اور اسے پیٹھ کے پیچھے پھینک دیا گیا۔

اسجگہ قوم کے مصداق رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کے وہ لوگ بھی ہیں جنہوں نے آپ کو نہ مانا۔ مگر آجکل کے مسلمان بھی اس کے مخاطب ہیں جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے امتی کہلانے کے باوجود قرآن کریم کو بالکل چھوڑ بیٹھے ہیں۔ وہ قرآن جو اُن کی ہدایت کے لئے آیا تھا اور جس کے متعلق خدا تعالےٰ فرماتا ہے کہ وہ انسان کو اعلیٰ سے اعلیٰ درجہ تک پہنچانے کے لئے آیا ہے اُس کو آجکل اس طرح استعمال کیا جاتا ہے کہ زندگی بھر تو قرآن کا ایک لفظ بھی اُن کے کانوں میں نہیں پڑتا لیکن جب کوئی مرجائے تو اُس کو قرآن سُنایا جاتا ہے حالانکہ مرنے پر سوال تو یہ ہوتا ہے کہ بتاؤ تم نے اِس پر کیا عمل کیا نہ یہ کہ مرنے کے بعد تمہاری قبر پر کتنی بار قرآن ختم کیا گیا۔ پھر ایک استعمال اس کا یہ ہے کہ ضرورت پڑے تو اٹھا لانے لے کر اُس کی جھوٹی قسم کھائی جاتی ہے اور اس طرح اسے دوسروں کے حقوق دبانے کا ایک آلہ بنایا جاتا ہے۔ تیسرے اس طرح کہ مُلّاں اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ جب کوئی مرجاتا ہے تو اُس کے وارث قرآن لاتے ہیں کہ اِس ذریعہ سے

مَهْجُوْرًا

اس کے گناہ بخشوائیں۔ اور مُلّا نے ایک حلقہ سا بنا کر بیٹھ جاتے ہیں اور قرآن ایک دوسرے کو پکڑاتے ہوئے کہتے ہیں کہ میں نے یہ تیری مِلک کی۔ اس طرح وہ سمجھتے ہیں کہ مُردہ کے گناہوں کا اسقاط ہو گیا۔ مگر مردہ کے گناہوں کا کیا اسقاط ہوتا ہے اُن مُلّاؤں اور اس مُردہ کے وارثوں کے ایمانوں کا اسقاط ہو جاتا ہے۔ پھر ایک استعمال اس کا یہ ہے کہ مُلا نے آٹھ آٹھ آنے کے قرآن لے آتے ہیں اور جب کسی کے ہاں کوئی مر جاتا ہے اور وہ قرآن لینے آتا ہے تو اُسے بہت سی قیمت بتا دی جاتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ تو ایک روپیہ سے بھی کم قیمت کا ہے تو مُلّاں صاحب کہتے ہیں۔ قرآن کیا سستے داموں بک سکتا ہے۔ تھوڑی قیمت پر تو اس کا بیچنا منع ہے خود قرآن میں آتا ہے لَا تَشْتَرُوْا بِاٰیٰتِیْ ثَمَنًا قَلِیْلًا (بقرہ ع) کہ میری آیتوں کے بدلے میں تھوڑی قیمت مت لو۔ اس لئے اس کی تھوڑی قیمت نہیں لی جا سکتی۔ مگر وہ نادان نہیں جانتے کہ قرآن نے تو یہ بھی فرمایا ہے کہ مَتَاعُ الدُّنْیَا قَلِیْلٌ (نساء ع) کہ دنیا کا سب مال و متاع ایک حقیر چیز ہے۔ پھر کسی دنیوی چیز کے بدلہ میں اسے بیچنا کس طرح جائز ہوا؛ دراصل اس آیت میں ثَمَنًا قَلِیْلًا کے یہ معنے ہیں کہ دنیا کے بدلے اسے نہ بیچو۔ نہ یہ کہ تھوڑی قیمت نہ لو۔ پھر ایک استعمال اس کا یہ رہ گیا ہے کہ اسے عمدہ غلاف میں لپیٹ کر دیوار سے لٹکا دیتے ہیں پھر ایک استعمال اس کا یہ ہے کہ جُزدان میں ڈال کر گلے میں لٹکا لیتے ہیں تاکہ عوام سمجھیں کہ بڑے بزرگ اور پارسا ہیں ہر وقت قرآن پاس رکھتے ہیں۔ غرض آج "مسلمانان در گور و مسلمانی در کتاب" والی بات نظر آتی ہے۔ اسلام کا نشان صرف قرآن کریم اور احادیث صحیحہ اور کتب ائمہ میں ملتا ہے اس کا نشان لوگوں کی زندگیوں میں کہیں نہیں ملتا۔ پچھتر فیصدی مسلمان نماز کے تارک ہیں۔ زکوٰۃ اوّل تو دیتے ہی نہیں اور جو دیتے ہیں اُن میں سے جو اپنی خوشی سے دیتے ہیں وہ شاید سَو میں سے دو نکلیں۔ حج جن پر فرض ہے وہ اس کا نام نہیں لیتے اور جن کے لئے نہ صرف یہ کہ فرض نہیں بلکہ بعض حالات میں ناجائز ہے وہ اپنی رسوائی اور اسلام کی بدنامی کرتے ہوئے حج کے لئے پہنچ جاتے ہیں۔ نماز کا ترجمہ تو عربی بولنے والے ممالک کے سوا شاید مسلمانوں میں دو چار فیصدی ہی جانتے ہوں مگر وہ بے معنی نماز بھی جو لوگ پڑھتے ہیں اُسے اس طرح چٹی سمجھ کر پڑھتے ہیں کہ رکوع اور سجدے میں فرق کرنا مشکل ہو جاتا ہے اور نماز میں اپنی زبان میں دعا مانگنا تو کفر ہی سمجھا جانے لگا ہے۔ روزہ اوّل تو کئی لوگ رکھتے ہی نہیں اور جو لوگ رکھتے ہیں وہ جھوٹ اور غیبت سے اُسے موجبِ ثواب بنانے کی بجائے موجبِ عذاب بنا لیتے ہیں۔ ورثہ کے احکام پس پُشت ڈالے جاتے ہیں۔ سُود جس کا لینا خدا سے جنگ کرنے کے مترادف قرار دیا گیا ہے علماء کی مدد سے ہزاروں حیلوں اور بہانوں کے ساتھ اس کی وہ تعریف کی گئی ہے کہ اب شاید ہی کوئی سود کی لعنت سے محفوظ ہو۔ اخلاقِ فاضلہ جو کسی وقت مسلمان کا ورثہ اور اُس کا حق سمجھے جاتے تھے اب مسلمانوں سے اس قدر دُور ہیں جس قدر کفر اسلام سے۔ کسی زمانے میں مسلمان کا قول نہ ٹلنے والی تحریر سمجھا جاتا تھا۔ اور اس کا وعدہ ایک نہ بدلنے والا قانون مگر آجکل مسلمان کی بات سے زیادہ اَور کوئی غیر معتبر قول نہیں، اور اسکے وعدے سے زیادہ اَور کوئی بے حقیقت شے نظر نہیں آتی۔ یہ تباہی جو عملی اور اعتقادی لحاظ سے مسلمانوں پر آئی اس کی وجہ صرف یہی ہے کہ انہوں نے قرآن کریم کو چھوڑ دیا اور اس پر عمل کرنا ترک کر دیا۔ اگر وہ قرآن کریم پر عمل کرتے تو جس طرح صحابہؓ ساری دنیا پر غالب آ گئے تھے۔ اسی طرح وہ بھی غالب آ جاتے اور کفر اور شیطنت کا نشان تک دنیا سے مٹ جاتا۔ میں نے اپنی جماعت کے دوستوں کو بھی بارہا

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا مِّنَ الْمُجْرِمِيْنَ ؕ

اور ہم نے اسی طرح مجرموں میں سے سب نبیوں کے دشمن بنائے ہیں۔

وَكَفٰى بِرَبِّكَ هَادِيًا وَّنَصِيْرًا ﴿۳۲﴾

اور تیرا رب ہدایت دینے اور مدد کرنے کے لحاظ سے (بالکل) کافی ہے ۴۱۵

توجہ دلائی ہے کہ وہ اپنی اپنی جماعتوں میں قرآن کریم کے درس کا باقاعدہ انتظام کریں۔ لیکن مجھے افسوس ہے کہ ابھی تک جماعتوں نے اس طرف پوری توجہ نہیں کی حالانکہ قرآن کریم اپنے اندر اتنی برکات رکھتا ہے کہ قیامت کے دن رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم خدا تعالیٰ کے حضور کھڑے ہو کر کہیں گے کہ اے میرے خدا مجھے اپنی قوم کے افراد پر انتہائی افسوس ہے کہ میں نے تیرا محبت بھرا پیغام اُن تک پہنچایا مگر بجائے اس کے کہ وہ تیرے پیغام کو سُن کر شادیٔ مرگ ہو جاتے۔ بجائے اس کے کہ وہ اُسے سُن کر ممنون ہوتے۔ بجائے اس کے کہ اسے سُنکر ان کے جسم کا ہر ذرّہ اور اُن کے دل کی ہر تار کانپنے لگ جاتی۔ بجائے اِس کے کہ وہ اس مژدۂ جانفزا کو سُنکر عقیدت اور اخلاص سے اپنے سر جھکا دیتے اِتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا انہوں نے تیرے پیغام کو اپنی پیٹھوں کے پیچھے پھینک دیا اور کہا کہ جاؤ ہم اس کی پرواہ نہیں کرتے۔ بیشک اندھی دُنیا خدا تعالیٰ کے پیغام کے ساتھ یہی سلوک کرتی چلی آئی ہے مگر وہ دنیا جو یہ جانتی نہیں کہ خدا تعالیٰ کیا ہے اور اس کا رسول کتنی بڑی شان رکھتا ہے وہ جو کچھ کرتی ہے اُسے کرنے دو۔ میں اس مومن سے پوچھتا ہوں جو کہتا ہے کہ خدا ہے جو جانتا ہے کہ خدا تعالیٰ کے کلام کی کیا عظمت ہے۔ جو سمجھتا ہے کہ خدا تعالیٰ کا بندے کو مخاطب کرنا خواہ وہ بالواسطہ ہو یا بلاواسطہ ایک عظیم الشان انعام ہے کہ یہ کیسی عجیب بات ہے کہ وہ خدا تعالیٰ کے کلام کو سُنتا اور پھر اس کا جواب نہیں دیتا۔ اور اس پر عمل کرنے کے لئے اس کے دل میں کوئی ولولہ پیدا نہیں ہوتا۔ حالانکہ بسم اللہ کی ب سے لے کر والنّاس کے س تک قرآن کریم کا ایک ایک کلمہ۔ اس کا ایک ایک لفظ اور اس کا ایک ایک حرف خدا تعالیٰ کی طرف سے بندے کیلئے سلام کا پیغام لے کر آیا ہے اور اپنے اندر اتنی طاقت رکھتا ہے کہ اگر اب بھی مسلمان خدا تعالیٰ کے پیغام کے جواب کے لئے تیار ہو جائیں اور اس کی اطاعت کے لئے اپنے دلوں کے دروازے کھول دیں تو یقیناً اُن کی دنیا بدل سکتی ہے۔

۴۱۵ تفسیر۔ اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کوئی عجیب بات نہیں۔ آج تک دنیا میں کوئی بھی نبی ایسا نہیں آیا جس کی مخالفت نہ کی گئی ہو اور جس کو تباہ کرنے کے لئے دشمنانِ انبیاء نے ایڑی چوٹی کا زور نہ لگایا ہو۔ مگر تاریخ شاہد ہے کہ ہر قسم کی مخالفت کے باوجود آخر یہی نتیجہ نکلا کہ نبی اور اس کے ماننے والے جیتے اور مخالفت کرنے والے خواہ وہ کتنی بڑی طاقتوں کے مالک تھے تباہ اور برباد ہوئے۔ یہ ایک ایسا کلیہ ہے جس کے خلاف ہمیں دنیا میں کوئی نظیر نظر نہیں آتی۔ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ آدمؑ اپنے دشمنوں پر غالب نہ آیا ہو یا نوحؑ نے اپنے دشمنوں کے مقابلہ میں کامیابی حاصل نہ کی ہو۔ یا ابراہیمؑ اپنے مشن میں کامیاب نہ ہوا ہو۔ یا موسیٰؑ نے فرعون پر غلبہ نہ پایا ہو۔ یا عیسیٰؑ نے یہود پر فتح حاصل نہ کی ہو

یا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شدید مخالفت کے باوجود فتح و ظفر نے آپ کے قدموں کو نہ چوما ہو۔ ان تمام انبیاء کے زمانہ میں شیطان نے اپنے پورے سازوسامان کے ساتھ خدائی جماعتوں پر حملہ کیا اور ہر قسم کے ذلیل ہتھیاروں سے اُس نے صداقت کو مٹانا چاہا مگر ایک دفعہ بھی ایسا نہیں ہوا کہ خدا تعالیٰ کا کوئی نبی ہارا ہو اور شیطان جیتا ہو۔ بیشک نبیوں کو کہا گیا کہ لَنُخْرِجَنَّكُمْ مِّنْ اَرْضِنَآ اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِيْ مِلَّتِنَا (ابراہیم ع ۲) ہم یقیناً تمہیں اپنے ملک سے نکال دیں گے یا تم ہمارے مذہب کی طرف لوٹ آؤ گے۔ بلکہ انہیں یہاں تک دھمکی دی گئی کہ لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهُوْا لَنَرْجُمَنَّكُمْ وَلَيَمَسَّنَّكُمْ مِّنَّا عَذَابٌ اَلِيْمٌ (یٰس ع ۲) اگر تم نے اپنی تعلیم کو ترک نہ کیا تو ہم تمہیں سنگسار کر دیں گے۔ اور تمہیں دردناک عذاب پہنچائیں گے۔ مگر ان تمام دھمکیوں کے باوجود بلکہ ان دھمکیوں کو عملی جامہ پہنانے کے باوجود جب نتیجہ نکلا تو یہی دکھائی دیا کہ کفر زمین پر اوندھے مُنہ گرا ہوا ہے اور صداقت اپنی کامیابی پر مُسکرا رہی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ انبیاء کی مخالفت خدا تعالیٰ کی اُن مخفی تدابیر میں سے ایک بڑی اہم تدبیر ہے جس کے ذریعہ وہ اپنے پیغام کو وسعت دیتا اور اس کے حلقۂ اثر کو وسیع کرتا ہے۔ جب مخالفت کا طوفان اُمڈ آتا ہے تو لوگوں میں ایک تہلکہ مچ جاتا ہے اور سعید طبع لوگ غور کرنے لگ جاتے ہیں کہ آخر یہ شخص کیا کہتا ہے اور اس کی کیوں مخالفت کی جاتی ہے۔ اور جب وہ تحقیق کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ اُن کے سینوں کو کھول دیتا ہے اور وہ بھی صداقت کا شکار ہو جاتے ہیں۔ پس مخالفتِ انبیاء کی آواز لوگوں کے کانوں تک پہنچانے کا ایک زبردست ذریعہ ہے جس سے جھوٹے مدعیانِ ماموریت قطعی طور پر محروم ہوتے ہیں۔ یُوں تو وہ بھی عجیب و غریب دعوے دنیا کے سامنے پیش کرتے ہیں مگر لوگ اُن کی طرف کوئی توجہ نہیں کرتے۔ بلکہ وہ اُن کے دعووں کو ایک مجنونانہ بَڑ سے زیادہ کوئی وقعت نہیں دیتے۔ وہ بسا اوقات خود بھی چاہتے ہیں کہ لوگ اُن کی مخالفت کریں تاکہ ہر کہ و مہ کی زبان پر اُن کا نام ہو اور لوگوں میں اُن کا چرچا ہو۔ مگر کوئی اُن کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا۔ اور وہ گوشۂ گمنامی میں کس مپرسی کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ اور کس مپرسی کی حالت میں ہی گمنامی کی موت مر جاتے ہیں۔ لیکن خدا تعالیٰ کی طرف سے جب کوئی مامور مبعوث ہوتا ہے تو بڑے کیا اور چھوٹے کیا اور عالم کیا اور جاہل کیا اور مرد کیا اور عورتیں کیا اور طاقتور کیا اور کمزور کیا سب کے سب مخالفت کے لئے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اور ہر شخص جو اس پر تیر چلاتا ہے وہ سمجھتا ہے کہ اُس نے بڑے ثواب کا کام کیا ہے مگر یہی مخالفت ایک دن سعید الفطرت انسانوں کو جھنجھوڑ کر انہیں کشاں کشاں اللہ تعالیٰ کے دروازہ کی طرف لے آتی ہے۔ چنانچہ دیکھ لو مکہ والوں کی شدید مخالفت ہی تھی جس نے حبشہ میں اسلام کا نام پہنچایا۔ اور پھر مکہ والوں کی شدید مخالفت ہی تھی جس نے مدینہ منورہ میں اسلام کا نام پہنچایا۔ پھر یہی مخالفت تھی جس کے نتیجہ میں خود مکہ کے بڑے بڑے معاندین کے اپنے بیٹے اور بھائی اور رشتہ دار اسلام کی آغوش میں آگئے اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اپنی جانیں قربان کرنے لگ گئے۔ باوجود اس کے کہ مکہ والوں نے انہیں ہر قسم کی اذیتوں کا تختۂ مشق بنایا انہیں پتھروں پر گھسیٹا گیا۔ انہیں تپتی ریت پر لٹایا گیا اُن کی عورتوں کی شرمگاہوں میں نیزے مار مار کر انہیں مارا گیا۔ اُن کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں اور پاؤں میں بیڑیاں ڈالی گئیں۔ انہیں اپنے وطن سے بے وطن کیا گیا۔ اُن کی ٹانگوں کو اونٹوں سے باندھ کر اور پھر اونٹوں کو مخالف

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْاٰنُ جُمْلَةً

اور کافروں نے کہا کیوں نہ قرآن اِس (نبی) پر ایک ہی دفعہ نازل کر دیا گیا۔ اُن کا کہنا بھی ایک

وَّاحِدَةً ۚ كَذٰلِكَ ۚ لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ وَرَتَّلْنٰهُ تَرْتِيْلًا ﴿۳۳﴾

طرح ٹھیک ہی لیکن ہم نے اسکو مختلف سورتوں اور وقتوں میں اس لئے اُتارا کہ ہم اس (قرآن) کے ذریعہ سے تیرے دل کو مضبوط کرتے رہیں اور ہم نے

اطراف میں دوڑا کر انہیں ٹکڑے ٹکڑے کیا گیا۔ لیکن ان تمام تکالیف کے باوجود وہ پروانوں کی طرح محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گرد چکر لگاتے رہے اور آپ پر اپنی جانیں نچھاور کرتے رہے۔ پس گو شیطان صداقت کا ازلی دشمن ہے اور اُس کی کوشش ہمیشہ یہی ہوتی ہے کہ صداقت کا نشان تک دنیا سے مٹ جائے۔ مگر آخر شیطان ہی صداقت کی اشاعت کا ایک ہتھیار بن جاتا ہے۔ اور بھولے بھٹکے انسانوں کو آستانۂ الوہیت کی طرف کھینچ لاتا ہے اِس لئے جَعَلْنَا کہہ کر اللہ تعالیٰ نے اس تدبیر کو اپنی طرف منسوب کیا ہے اور بتایا ہے کہ یہ لمتہ الشر ہم نے اپنی حکمتِ کاملہ سے خود پیدا کیا ہے اور چونکہ یہ اعتراض پیدا ہوتا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے ایسا کیوں کیا کہ ایک طرف تو وہ اپنے پیاروں کو مبعوث فرماتا ہے اور دوسری طرف دشمنوں کو اُن پر کتّوں کی طرح مسلّط کر دیتا ہے۔ اِس لئے اس کا جواب یہ دیا کہ وَكَفٰى بِرَبِّكَ هَادِيًا وَّنَصِيْرًا. تیرا رب لوگوں کو ہدایت دینے اور اپنے ماموریں کی معجزانہ مدد کرنے کے لحاظ سے بڑا کافی ہے۔ یعنی بظاہر تو یہ مخالفتیں تمہیں قابلِ اعتراض نظر آتی ہیں لیکن انہی مخالفتوں کے نتیجہ میں خدا تعالیٰ کا ہادی اور اُس کا نصیر ہونا ظاہر ہوتا ہے۔ جب مخالفت ترقی کرتی ہے تو جماعت کو بھی ترقی حاصل ہوتی ہے اور جب مخالفت بڑھتی ہے تو اللہ تعالیٰ کی معجزانہ تائیدات اور نصرتیں بھی بڑھ جاتی ہیں۔ اِسی لئے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام

کی خدمت میں جب کوئی دوست یہ ذکر کرتے کہ ہمارے ہاں بڑی مخالفت ہے تو آپ فرماتے یہ تمہاری ترقی کی علامت ہے۔ جہاں مخالفت ہوتی ہے وہاں جماعت بھی بڑھتی ہے کیونکہ مخالفت کے نتیجہ میں کئی ناواقف لوگوں کو بھی سلسلہ سے واقفیت ہو جاتی ہے۔ اور پھر رفتہ رفتہ اُن کے دل میں سلسلہ کی کتابیں پڑھنے کا شوق پیدا ہو جاتا ہے اور جب وہ کتابیں پڑھتے ہیں تو صداقت اُن کے دلوں کو موہ لیتی ہے۔

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی خدمت میں ایک دفعہ ایک دوست حاضر ہوئے اور انہوں نے آپ کی بیعت کی۔ بیعت لینے کے بعد حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اُن سے دریافت فرمایا کہ آپ کو کس نے تبلیغ کی تھی وہ بے ساختہ کہنے لگے۔ مجھے تو مولوی ثناء اللہ صاحب نے تبلیغ کی ہے۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے حیرت سے فرمایا وہ کس طرح؟ وہ کہنے لگے میں مولوی صاحب کا اخبار اور اُن کی کتابیں پڑھا کرتا تھا۔ اور میں ہمیشہ دیکھتا کہ اُن میں جماعت احمدیہ کی شدید مخالفت ہوتی تھی۔ ایک دن مجھے خیال آیا کہ میں خود بھی تو اس سلسلہ کی کتابیں دیکھوں کہ ان میں کیا لکھا ہے اور جب میں نے ان کتابوں کو پڑھنا شروع کیا تو میرا سینہ کھل گیا اور میں بیعت کے لئے تیار ہو گیا۔ تو مخالفت کا پہلا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ اس سے الٰہی سلسلہ کو ترقی حاصل ہوتی ہے اور کئی لوگوں کو ہدایت میسر آ جاتی ہے۔

وَلَا يَأْتُونَكَ بِمَثَلٍ اِلَّا جِئْنٰكَ بِالْحَقِّ وَاَحْسَنَ تَفْسِيْرًا ﴿۳۴﴾

اور (تیری تردید کیلئے) وہ کوئی بات نہیں کہتے کہ ہم اس کے جواب میں ایک پختہ بات بیان نہیں کر دیتے اور اسکی اچھی سے اچھی توجیہہ نہیں کر دیتے ہیں ۵۱

پھر دوسرا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی معجزانہ تائید اور نصرت کے نشانات ظاہر ہونے لگ جاتے ہیں۔ جب مخالفت اپنے انتہاء کو پہنچ جاتی ہے تو مومنوں کی عاجزانہ دُعائیں اللہ تعالیٰ کی نصرت کو آسمان سے کھینچ لاتی ہیں۔ اور اُس کی قہری تجلّی بڑے بڑے دشمنوں کو ہلاک کر دیتی ہے۔ فرعون جب اپنے لاؤ لشکر کے ساتھ بنی اسرائیل کے تعاقب میں چلا آرہا تھا تو صرف چند منٹ پہلے وہ سمجھتا تھا کہ میں کامیاب ہو گیا۔ اور بنی اسرائیل یہ سمجھتے تھے کہ ہم مارے گئے بلکہ خود انہوں نے چلّا چلّا کر یہ کہنا شروع کر دیا تھا کہ اِنَّا لَمُدْرَكُوْنَ اے موسیٰ! ہم تو پکڑے گئے۔ مگر موسیٰؑ جس کا اپنے خدا پر کامل ایمان تھا اُس نے کہا كَلَّا ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا اِنَّ مَعِيَ رَبِّيْ سَيَهْدِيْنِ (شعراء ع۴) میرا رب میرے ساتھ ہے اور وہ میرے لئے اس بلائے عظیم سے نجات کا کوئی نہ کوئی راستہ ضرور پیدا کر دیگا۔ چنانچہ تھوڑی ہی دیر کے بعد موسیٰؑ تو سمندر کے پار پہنچ چکے تھے اور فرعون اور اس کی فوجیں سمندر کی لہروں میں غوطے کھا رہی تھیں۔ غرض مخالفت بھی اشاعتِ ہدایت کا ایک بہت بڑا ذریعہ ہے اور اس کے نتیجہ میں خدا تعالیٰ کا ہادی اور اُس کا نصیر ہونا بڑی شان سے ظاہر ہوتا ہے۔

رَتَّلْنٰهُ

۱۵ حل لغات : رَتَّلْنٰهُ : رَتَّلَ الْكَلَامَ کے معنے ہیں اَحْسَنَ تَأْلِيْفَهٗ اُس نے اپنے کلام یا مضمون کو نہایت عمدگی سے مرتب کیا اور رَتَّلَ الْقُرْاٰنَ کے معنے ہیں اُس نے قرآن کریم کی خوش آوازی سے تلاوت کی پس رَتَّلْنٰهُ کے معنے ہونگے ہم نے قرآن کریم کی ترتیب نہایت اعلیٰ درجہ کی رکھی ہے۔

تفسیر۔ اِن آیات میں کفار کے اس اعتراض کا جواب دیا گیا ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر سارا قرآن ایک ہی دفعہ کیوں نازل نہیں ہو گیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خدا کا کلام نہیں بلکہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسے حسب موقع خود تصنیف کر لیتے ہیں۔ فرماتا ہے۔ یہ درست ہے واقعہ میں یہ قرآن ایک ہی دفعہ نہیں اُترا بلکہ آہستہ آہستہ ایک لمبی مدت میں نازل ہُوا ہے۔ مگر اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم اس طریق سے تیرے دل کو ثبات بخشنا چاہتے ہیں۔ اور پھر ہم نے اس کی ترتیب بھی نہایت اعلیٰ درجہ کی رکھی ہے۔ اسی طرح قرآن کریم کو آہستہ آہستہ نازل کرنے کا ایک یہ بھی فائدہ ہے کہ کوئی بات جو اعتراض کے طور پر یہ لوگ بیان کر دیتے ہیں تو ہم اس کے مقابلہ میں حق اور بہتر تفسیر قرآن کریم میں بیان کر دیتے ہیں۔

تعجب ہے کہ عیسائی مستشرقین اب بھی یہی اعتراض کرتے رہتے ہیں کہ قرآن کریم کا ٹکڑے ٹکڑے نازل ہونا بتاتا ہے کہ یہ خدا کا کلام نہیں بلکہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اپنی تصنیف ہے۔ آخر خدا کو کیا ضرورت تھی کہ اپنا کلام ٹکڑے ٹکڑے کر کے نازل کرتا اُسے تو اگلا پچھلا سب حال معلوم ہوتا ہے اور وہ اپنا کلام یکدم بھی نازل کر سکتا ہے۔ اس کا آہستہ آہستہ ایک کتاب کی صورت میں مرتب ہونا بتاتا ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جیسے جیسے حالات پیش آتے جاتے تھے ویسا ہی وہ اُن کا قرآن کریم میں ذکر کر دیتے تھے۔ اللہ تعالیٰ اس سوال کا جواب دیتے ہوئے فرماتا ہے کہ ہم نے اپنے کلام کے نزول کیلئے یہ طریق

اس لئے اختیار کیا ہے کہ ہم اس کے ذریعہ تیرے دل کو مضبوط کرنا چاہتے ہیں۔ گویا قرآن کریم کا ٹکڑے ٹکڑے نازل ہونا خدا تعالیٰ کی کسی کمزوری کی وجہ سے نہیں بلکہ اس وجہ سے ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دل کو ثبات اور طاقت حاصل ہو۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ قرآن کریم کے آہستہ آہستہ نازل ہونے سے آپؐ کے دل کی مضبوطی کس طرح ہو سکتی تھی سو اس کے متعلق چند امور کا بیان کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

(۱) پہلی بات تو یہ ہے کہ اگر ایک ہی دفعہ سارا قرآن نازل ہو جاتا اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس سے استدلال کرتے رہتے تو آپؐ کے دل کو ایسی تقویت حاصل نہیں ہو سکتی تھی۔ جیسے کسی امر کے متعلق فوراً کلام الٰہی کے اترنے سے ہو سکتی ہے۔ چنانچہ دیکھ لو۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جو لطف اس میں آتا ہوگا کہ آپؐ کوئی کام کرتے اور اس کے متعلق اُسی وقت وحی نازل ہو جاتی اور خدا تعالیٰ اپنی مرضی اور منشاء کا اظہار کر دیتا۔ وہ لطف ہمیں اجتہاد سے کہاں حاصل ہو سکتا ہے۔ آپ کو تو جب بھی کوئی اہم واقعہ پیش آتا اُس کے متعلق آپؐ پر کلام الٰہی نازل ہو جاتا اور اس طرح آپ کو معلوم ہو جاتا کہ اس بارہ میں خدا تعالیٰ کا کیا منشاء ہے۔ اگر اجتہاد سے ہی آپؐ آیاتِ قرآنیہ کو کسی واقعہ پر چسپاں کرتے تو اس سے آپؐ کو وہ لطف نہ آتا جو اس صورت میں آتا تھا۔

(۲) قرآن کریم کا آہستہ آہستہ نزول تثبیتِ فؤاد کا اس طرح بھی موجب بنا کہ جو کتاب ساری دنیا کے عمل کے لئے آئی ہو اُسے محفوظ رکھنا بھی ضروری تھا۔ اگر قرآن ایک ہی دفعہ سارے کا سارا نازل ہو جاتا تو اُسے وہی شخص حفظ کر سکتا جو اس کے لئے اپنی زندگی وقف کر دیتا۔ لیکن آہستہ آہستہ اُترنے کے نتیجہ میں سینکڑوں لوگ اس کو یاد کرنے کے لئے تیار ہو گئے اور اپنے دوسرے کاروبار کے ساتھ ساتھ بھی حفظ کرتے گئے۔ اسطرح رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دل اس یقین سے لبریز ہو گیا کہ یہ کتاب ضائع نہیں ہوگی بلکہ قیامت تک محفوظ رہے گی۔ یہی وجہ تھی کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے وقت بہت کثرت سے ایسے لوگ پائے جاتے تھے۔ جنہیں قرآن کریم حفظ تھا۔ مگر اب اُس نسبت کے لحاظ سے کم ہوتے ہیں۔ اس لئے کہ تھوڑا تھوڑا نازل ہونے کی وجہ سے بہت لوگ اُسے ساتھ ساتھ یاد کرتے جاتے تھے۔

(۳) تیسری حکمت تھوڑا تھوڑا نازل ہونے میں یہ ہے کہ ایک ہی دفعہ سارا قرآن نازل ہونے کی وجہ سے وہ لوگوں کے قلوب میں اچھی طرح راسخ نہیں ہو سکتا تھا۔ اب ایک ہندو جب مسلمان ہوتا ہے تو اُسے اسلامی احکام پر عمل کرنے والے مسلمان نظر آتے ہیں اسلئے وہ گھبراتا نہیں اور ان احکام پر عمل کرنا بوجھ نہیں سمجھتا لیکن اگر کسی کو کوئی کتاب لکھ کر دے دی جائے کہ اس پر عمل کرو اور کوئی نمونہ اس کے سامنے موجود نہ ہو تو وہ سو سال میں بھی اس پر عمل کرنا نہیں سیکھ سکتا پس قرآن کریم کی تعلیم کو قلوب میں راسخ کرنے کے لئے ضروری تھا کہ اُسے آہستہ آہستہ نازل کیا جاتا۔ ایک حکم پر جب لوگ عمل کرنا سیکھ جاتے تو دوسرا نازل ہوتا دوسرے حکم پر عمل کرنا سیکھ جاتے تو تیسرا نازل ہوتا اور اس طرح سارے احکام پر عمل کرایا جاتا۔

(۴) اگر ایک ہی وقت میں سارا قرآن نازل ہوتا تو اس کی ترتیب وہی رکھنی پڑتی جو اب ہے۔ لیکن یہ ترتیب اس وقت رکھی جاتی خطرناک ہوتی۔ جس طرح ہمارے لئے اب وہ ترتیب خطرناک ہے جس کے مطابق قرآن نازل ہوا تھا۔ اگر نمازوں اور روزوں وغیرہ کے

احکام شروع میں ہوتے اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت ثابت نہ ہو چکی ہوتی تو وہ سمجھ میں ہی نہ آتے اس کے لئے پہلے اللہ تعالیٰ کی الوہیت اور اُس کی توحید اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت ثابت کرنے کی ضرورت تھی اور یہ بتانا ضروری تھا کہ خدا تعالیٰ موجود ہے اور وہ ایک ہی ہے اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے سچے رسول ہیں۔ اس کے بعد عمل کی دعوت کا موقعہ تھا۔ جس کے لئے احکام سکھائے جاتے مگر اب یہ ترتیب ضروری نہیں ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی توحید اور رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی صداقت کو ماننے والی ایک بڑی بھاری جماعت موجود ہے۔ اب جو شخص بھی اسلام میں داخل ہوتا ہے وہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت اور اسلام کی خوبیوں سے واقف ہو کر آتا ہے اس لئے اُس کے لئے قرآن کریم کی اُسی ترتیب کی ضرورت ہے جو اب ہے۔ پس قرآن کے ایک ہی دفعہ نازل ہونے سے یہ نقص پیش آتا کہ اُس کی موجودہ ترتیب اس زمانہ کے لوگوں کو سمجھ میں ہی نہ آسکتی۔ مثلاً اگر سورۂ بقرہ شروع میں ہی نازل ہو جاتی تو ذٰلِكَ الْكِتَابُ کو کون مسلمان سمجھ سکتا۔ وہ تو یہ الفاظ سنکر حیران ہو جاتا اور کہتا کہ کتاب تو کوئی ہے ہی نہیں پھر اس میں کس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ لیکن قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ کو ہر مسلمان اس وقت سمجھ سکتا تھا جس طرح آج ذٰلِكَ الْكِتَابُ کو ہر مسلمان سمجھتا ہے۔ کیونکہ خدا تعالیٰ کی ایک کامل کتاب اُس کے سامنے موجود ہے۔

(۵) اگر ایک ہی دفعہ سارا قرآن نازل ہو جاتا تو ایک حصہ میں دوسرے حصہ کی طرف اشارہ نہیں ہو سکتا تھا۔ مثلاً قرآن کریم میں یہ پیشگوئی تھی کہ ہم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دشمنوں کے نرغہ سے نکال کر صحیح و سلامت لے جائیں گے۔ اگر ایک ہی دفعہ سارا قرآن نازل ہو جاتا تو جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مدینہ لے جایا گیا تھا اُسوقت یہ نہ کہا جا سکتا کہ دیکھو اسے ہم دشمنوں کے نرغہ سے بچا کر لے آئے ہیں۔ یہ اُسی صورت میں کہا جا سکتا تھا جب پہلے ایک حصہ نازل ہوتا جس میں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو صحیح و سلامت لے جانے کی پیشگوئی ہوتی اور جب یہ پیشگوئی پوری ہو جاتی۔ تو اُسوقت وہ حصّہ اُترتا جس میں اس کے پورا ہونے کی طرف اشارہ ہوتا۔

(۶) میرے نزدیک ایک اور اہم بات یہ ہے کہ اگر قرآن کریم اکٹھا نازل ہو جاتا تو مخالفین یہ کہہ سکتے تھے کہ کسی نے بنا کر یہ کتاب دے دی ہے۔ اب کچھ حصّہ مکّہ میں نازل ہُوا۔ کچھ مدینہ میں۔ مکّہ والے اگر کہیں کہ کوئی شخص بنا کر دیتا ہے تو مدینہ میں کون بنا کر دیتا تھا۔ پھر قرآن سفر میں بھی نازل ہُوا اور حضر میں بھی نازل ہُوا۔ مجلس میں بھی نازل ہُوا اور علیحدگی میں بھی نازل ہُوا۔ دن کے اوقات میں بھی نازل ہُوا اور رات کی تاریکیوں میں بھی نازل ہُوا۔ اور اس طرح اللہ تعالیٰ نے دشمنوں کے اس اعتراض کو باطل کر دیا کہ قرآن کریم کے بنانے میں دوسرے لوگوں کا ہاتھ ہے۔ اگر اکٹھی کتاب نازل ہوتی تو کہا جا سکتا تھا کہ کوئی شخص کتاب بنا کر دے گیا ہے جسے سُنا دیا جاتا ہے۔ مگر جب ہر موقعہ اور محل کے مطابق آیات اُترتی رہیں تو کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ ہر موقعہ پر کوئی نئی آیت بنا کر آپؐ کو دیدیتا ہے۔ پس قرآن کریم کا آہستہ آہستہ نازل ہونا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے تثبیتِ فؤاد کا موجب ہُوا اور ہر دن جو آپؐ پر چڑھا اُس نے آپکے ایمان اور عرفان کو اَور بھی بڑھا دیا۔

پھر فرماتا ہے وَرَتَّلْنٰهُ تَرْتِيْلًا ہم نے اِس قرآن کی ترتیب بھی نہایت اعلیٰ درجہ کی رکھی ہے۔

یعنی نزولِ قرآن تو اس رنگ میں ہوا ہے جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کے لوگوں کے لئے ضروری تھا لیکن بعد کی دائمی ترتیب ہم نے اَور طرح رکھی ہے تاکہ آنے والے لوگ اپنے حالات کے مطابق اس سے فائدہ اٹھائیں۔ یہ ترتیب بھی اپنی ذات میں اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ قرآن کسی انسان نے نہیں بنایا بلکہ اللہ تعالیٰ نے اِسے خود نازل کیا ہے۔ اگر اس کتاب کی تصنیف میں کسی انسان کا دخل ہوتا تو وہ اس کی ایک ہی ترتیب رکھتا اور جس قسم کے حالات اُسے پیش آتے۔ اُن کے مطابق وہ ایک کتاب تصنیف کرتا چلا جاتا مگر قرآن کریم چونکہ عالم الغیب خدا کی طرف سے نازل ہوا تھا اور قیامت تک آنے والے تمام لوگوں کے لئے ایک مستقل ہدایت نامہ تھا۔ اِس لئے اُس نے اپنی حکمتِ کاملہ کے ماتحت اس کے نزول کی ترتیب اَور رنگ میں رکھی۔ اور اس کی تحریر کی ترتیب اَور رنگ میں رکھی۔ نزول کی ترتیب تو اُس زمانہ کے اوّلین مخاطبوں کے وساوس و شبہات کے ازالہ اور اُن کے مسائل کو حل کرنے کے لئے رکھی گئی۔ اور بعد کی ترتیب اُن لوگوں کے لئے رکھی گئی جنہوں نے مسلمانوں کے گھروں میں پیدا ہونے کی وجہ سے مذہب سے بہت حد تک واقف ہونا تھا یا جن کے لئے مسلمانوں کی ایک قائم شدہ جماعت کو دیکھتے ہوئے وہ مسائل کوئی اہمیت نہیں رکھتے تھے جن مسائل پر شروع میں بحث کرنا ضروری تھا مثلاً تمام محدّث اور مؤرخ اس بات پر متفق ہیں کہ پہلی آیت جو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی وہ اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ کی تھی۔ حالانکہ موجودہ قرآن میں وہ سب سے آخری پارہ میں ہے اور آخری پارہ کے بھی آخری حصہ میں ہے اَب گویا سب سے پہلے نازل ہونے والی آیت اور گویا قرآن کے سب سے آخری پارہ میں اور آخری پارہ کے بھی آخری حصہ میں اس کا رکھا جانا یہ بتاتا ہے کہ الٰہی حکمت کے ماتحت قرآن کریم کی دو ترتیبیں ضروری تھیں۔ ایک ترتیب تو وہ تھی جو ابتدائی مسلمانوں کے لحاظ سے اُن کے مناسب حال تھی۔ اور ایک ترتیب وہ تھی جو آئندہ آنے والے مسلمانوں کے لحاظ سے جب قرآن مکمل ہو چکا تھا مناسب حال تھی۔ اِسی لئے اللہ تعالےٰ نے اِس سورۃ میں صرف اِقْرَأْ کہا۔ اِقْرَأِ الْكِتَابَ نہیں کہا کیونکہ جس وقت اللہ تعالےٰ نے اِقْرَأْ فرمایا تھا اُس وقت کوئی کتاب موجود نہیں تھی مگر جب سورۂ بقرہ نازل ہوئی تو اُس وقت تک کتاب نازل ہو چکی تھی۔ اور بہت سی سورتیں مکہ مکرمہ میں مکمل ہو چکی تھیں۔ خود اِقْرَأْ والی سورۃ بھی نازل ہو چکی تھی۔ اور سورۃ بنی اسرائیل بھی نازل ہو چکی تھی اور سورۃ کہف۔ مریم اور طٰهٰ وغیرہ بھی نازل ہو چکی تھیں۔ پس اُس وقت ذٰلِكَ الْكِتَابُ کہنا بالکل درست تھا اور لوگوں کی سمجھ میں آسکتا تھا اس ترتیب کی دنیوی مثال یوں سمجھ لو کہ جیسے کھانا پکانے کے لئے باورچی کام شروع کرتے ہیں تو بعض دفعہ کھانے کی ترتیب کے لحاظ سے ایک چیز بعد میں آتی ہے۔ لیکن پکانے کے لحاظ سے باورچی اُس کو پہلے پکاتا ہے۔ اور کوئی چیز کھانے میں پہلے آتی ہے لیکن وہ اسکو بعد میں پکاتا ہے۔ اور اگر کوئی اعتراض کرے کہ یہ چیز جو پہلے کھانی تھی تم نے بعد میں کیوں پکائی تو وہ جواب دیگا کہ یہ کھانی بے شک پہلے تھی لیکن اِس کے پکانے میں پندرہ منٹ لگتے ہیں۔ اگر اسے پہلے ہی پکا لیا جاتا تو اسوقت تک یہ خراب اور باسی ہو جاتی۔ اور جو چیز بعد میں کھانی تھی بیشک وہ کھانی بعد تھی مگر اسکے پکانے میں اڑھائی تین گھنٹے لگتے ہیں۔ اگر اسکو پہلے نہ پکایا جاتا تو وہ کچی رہتی پس اسکی ترتیب حکمت کے ماتحت ہوتی ہے۔ پکانے کی اَور ترتیب ہوتی ہے اور کھانے کی اَور ترتیب ہوتی ہے جب وہ پکاتا ہے تو اس امر کو نہیں دیکھتا کہ پہلے کونسی چیز کھانی ہے بلکہ وہ یہ دیکھتا ہے کہ جلدی

کونسی چیز پکے گی۔ جو جلدی پک جاتی ہے اُسے وہ بعد میں
تیار کر لیتا ہے۔ اور جو دیر میں پکتی ہے اُسے وہ پہلے تیار
کرنا شروع کرتا ہے۔ جو چیز دیر میں پکتی ہے اگر وہ اُسے
دیر سے چڑھائیگا تو کھاتے وقت وہ چیز کچی ہوگی۔ پس
وہ دیر سے پکنے والی چیز کو چولھے پر پہلے رکھ لیگا خواہ
وہ آخر میں کھائی جانے والی ہو اور جلدی پکنے والی چیز کو
بعد میں تیار کریگا خواہ وہ پہلے کھائی جانے والی ہو۔
اس مثال سے ظاہر ہے کہ بعض چیزوں کی استعمال میں
اَور ترتیب ہوتی ہے اور اُن کی تیاری میں اَور ترتیب
ہوتی ہے۔ یہی طریق دنیا کے ہر کام میں نظر آتا ہے۔
حکومتیں فوجیں تیار کرتی ہیں۔ ملک کی تنظیم کرتی ہیں۔
لوگوں کو تعلیم دیتی ہیں۔ اُن کو مختلف فنون سکھلاتی
ہیں تو بعض لوگ جنہوں نے پیچھے کام کرنا ہوتا ہے۔ اُن
کی تیاری پہلے شروع کر دیتے ہیں۔ اور بعض لوگ جنہوں نے
پہلے کام کرنا ہوتا ہے اُن کی تیاری بعد میں ہوتی ہے۔
مثلاً کسی کام کی ٹریننگ چھ ماہ میں مکمل ہو جاتی ہے اور
کسی کام کی ٹریننگ میں چار سال صرف ہوتے ہیں۔ اب
خواہ ایک ہی وقت میں کام شروع ہونے والے ہوں
تب بھی چار سال والے کی ٹریننگ پہلے رکھی جائیگی اور
چھ ماہ والے کی بعد میں۔ یا مثلاً عمارتیں اور پُل بنانے میں
دیر لگتی ہے اُن کو پہلے بنایا جائیگا اور ریل کی سڑکیں جو
جلدی تیار کر لی جاتی ہیں اُن کو بعد میں رکھا جائیگا۔ فوجیں
بعض دفعہ دس دس بیس بیس میل لمبی لائن ایک ہی دن
میں بچھا دیتی ہیں۔ لیکن پُل بنانے پر بڑا وقت صرف ہوتا
ہے اس لئے پُلوں کا انتظام اَور رنگ میں ہوگا اور ریلوں
کا انتظام اَور رنگ میں۔ یہی قرآن کریم کی ترتیب کا
حال ہے۔ قرآن کریم میں جو مضامین اُس وقت کے لحاظ
سے ضروری تھے جب وہ نازل ہو رہا تھا اُن کو خدا تعالیٰ
نے پہلے رکھا کیونکہ اس وقت قرآن کریم ابھی اپنی مکمل
صورت میں اُن کے سامنے نہیں تھا۔ انہیں کچھ معلوم
نہیں تھا کہ قرآن کیا ہوتا ہے۔ اسلام کیا ہوتا ہے۔
رسول کیا ہوتا ہے۔ وحی کیا ہوتی ہے۔ الہام کیا ہوتا
ہے۔ خدا تعالیٰ سے تعلق کیا ہوتا ہے۔ بلکہ انہیں یہ بھی
پتہ نہیں تھا کہ خدا کیا ہوتا ہے۔ اِس لئے اُس وقت
پہلے ایسے مسائل بیان کئے گئے جو بنیادی حیثیت رکھتے
تھے۔ مگر جب وہ مسائل زیرِ بحث آ گئے اور پندرہ بیس
سال تک وہ لوگ قرآن کریم کی آیات اور اُس کی تعلیم
سنتے رہے تو اُس کے بعد اُن کے ہاں جو اولاد پیدا ہوئی
اُس نے اپنے ماں باپ سے یہ باتیں سُننی شروع کر دیں
اور بچپن سے ہی اُس کے کانوں میں یہ ڈالا جانے لگا کہ
خدا کیا ہوتا ہے۔ رسول کیا ہوتا ہے۔ الہام کیا ہوتا ہے
اسلام ہم سے کیا چاہتا ہے۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ
وسلم کو خدا نے کیوں مبعوث فرمایا۔ پس جب وہ بڑے
ہوئے تو اُن کی ذہنیت اَور قسم کی تھی۔ قرآن کریم جب
نازل ہوا تو اُس وقت قرآن کریم کی بہت سی باتیں
لوگوں کے لئے بالکل نئی تھیں۔ لیکن آئندہ اولاد کے لئے
وہ باتیں پُرانی ہو چکی تھیں۔ مثلاً ایک مسلمان کے گھر میں
جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو جاہل سے جاہل مسلمان بھی اپنے
بچے کو یہ ضرور سکھاتے ہیں کہ اگر کوئی تم سے پُوچھے کہ تمہیں
کس نے پیدا کیا ہے تو تم کہو۔ خدا نے۔ لیکن یہی سوال مکّہ
کے بڑے سے بڑے آدمی سے بھی کیا جاتا تو وہ حیرت
میں پڑ جاتا کہ میں اس کا کیا جواب دوں کہ مجھے لات نے
پیدا کیا ہے یا منات نے پیدا کیا ہے یا عزّیٰ نے پیدا
کیا ہے یا ھُبل نے پیدا کیا ہے۔ آخر میں کیا کہوں
کہ مجھے کس نے پیدا کیا ہے۔ لیکن ایک مسلمان بچے کے
لئے یہ بالکل معمولی بات ہے۔ اِسی طرح قضاء و قدر
کا مسئلہ ہے۔ اِس کے تفصیلی مسائل اَور چیز ہیں لیکن
ایک مسلمان بچے کے لئے تقدیر کا سوال بالکل معمولی ہے

اور وہ جانتا ہے کہ جو کچھ کرتا ہے خدا تعالیٰ کرتا ہے۔ پس جہاں تک ایمان کا تعلق ہے یقیناً ہمارا بچہ اس سے زیادہ جانتا ہے جتنا ابوجہل۔ عتبہ۔ شیبہ اور وائل جانتے تھے کیونکہ وہ یہ بحث کرتے تھے کہ بتاؤ تقدیر کیا ہے اور ہمارا بچہ چاہے جانے یا نہ جانے کہ تقدیر کیا ہوتی ہے بڑی دلیری سے کہتا ہے کہ وہی ہوتا ہے جو خدا کی مرضی ہوتی ہے۔ گویا تقدیر پر اس کا ایمان ہوتا ہے چاہے تفصیلات سے وہ ناواقف ہو لیکن ابوجہل اور اُس کے ساتھیوں کو تو تقدیر کا لفظ بھی عجیب لگتا تھا وہ تو یہی سمجھتے تھے کہ سارے کام ہمارے بُت کرتے ہیں یا ہم کرتے ہیں یا دیوی دیوتا اور جن بھوت اور پریت کام کرتے ہیں۔ وہ سمجھتے تھے کہ قرعہ ڈال کر بکرا کسی دیوی کے نام چڑھا دیا تو سب کام ہو گئے۔ لیکن ہمارا بچہ کہتا ہے کہ سب کام خدا تعالیٰ کرتا ہے۔ وہ اپنی ماں کے پاس جاتا ہے اور کہتا ہے اماں! مجھے فلاں چیز لے دو تو وہ کہتی ہے بیٹا! اللہ دے گا تو لے دونگی۔ اور اس جواب سے اس کی تسلی ہو جاتی ہے کیونکہ اس کے نزدیک تقدیر ایک یقینی چیز ہے۔ لیکن جب قرآن کریم نازل ہوا اُس وقت یہ ایک بڑا پیچیدہ مسئلہ تھا۔ اور لوگ حیران ہوتے تھے کہ قرآن نے یہ کیا بات کہدی۔ اسی طرح توحید کو لے لو۔ توحید کے مسئلہ پر بڑا زور دیا گیا ہے۔ لیکن جب ابتداء میں یہ تعلیم نازل ہوئی تو مکہ کے لوگ حیران ہوتے تھے کہ یہ توحید کیا چیز ہے۔ قرآن کریم میں اُن کے خیالات کا عجیب نقشہ کھینچا گیا ہے۔ فرماتا ہے۔ کافر کہتے تھے کہ یہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی عجیب انسان ہیں کہ انہوں نے سب معبودوں کو کوٹ کاٹ کر ایک معبود بنا دیا ہے۔ گویا اُن کے نزدیک لاتؔ۔ مناتؔ اور عزیٰ وغیرہ کا قیمہ بنا کر ایک خدا بنا دیا گیا تھا۔ اُن کے ذہن میں یہ آ ہی نہیں سکتا تھا کہ لاتؔ اور مناتؔ اور عزیٰ معبود ہیں ہی نہیں۔ وہ ایک خدا کے یہ معنے سمجھتے تھے کہ ان سب کو ملا کر ایک بنا دیا گیا ہے۔ چنانچہ وہ کہتے تھے اَجَعَلَ الْاٰلِهَةَ اِلٰهًا وَّاحِدًا (سورۂ ص ع ۱) ہمارے بہت سے معبود تھے مگر اس نے ان سب کو ایک بنا دیا ہے۔ وہ یہ نہیں کہتے کہ یہ ایک خدا پیش کرتا ہے یا کہتا ہے کہ دنیا کا ایک ہی پیدا کرنے والا ہے بلکہ وہ یہ سمجھتے تھے کہ اس نے سارے معبودوں کو اکٹھا کر کے ایک بنا دیا ہے۔ گویا اُن کے نزدیک توحید کا پیغام لاتؔ۔ مناتؔ اور عزیٰ کو کوٹ کاٹ کر ایک کر دینا تھا وہ حیران ہوتے تھے کہ یہ کیا تعلیم ہے۔ لیکن آج ہمارا چھوٹے سے چھوٹا بچہ بھی سمجھتا ہے کہ توحید کیا چیز ہے کیونکہ وہ لات منات اور عزیٰ کو جانتا ہی نہیں۔ وہ پیدائش سے ہی سمجھتا ہے کہ خدا ایک ہے۔ اور ایک چھوٹے بچے کے لئے بھی یہ اتنا حل شدہ مسئلہ ہے کہ اگر اُسے کہو کہ ایک نہیں بلکہ کئی خدا ہیں تو وہ ہنس پڑے گا کہ مجھے بیوقوف بناتے ہو لیکن ابوجہل کے سامنے جب یہ بات پیش کی جاتی تھی کہ خدا ایک ہے تو وہ بھی ہنس پڑتا تھا۔ اور کہتا تھا کہ مجھے بیوقوف بنایا جا رہا ہے۔ گویا ہمارے بچے کے نزدیک یہ کہنا کہ ایک سے زیادہ خدا ہیں اُسے بیوقوف بنانا ہے اور ابوجہل کے نزدیک یہ کہنا کہ زیادہ معبود نہیں بلکہ ایک ہی معبود ہے اسے بیوقوف بنانا تھا۔ تو بعد میں آنے والوں کے لئے ایک نئی ترتیب کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں پہلے سورۂ فاتحہ رکھی۔ پھر سورۃ بقرہ رکھی پھر سورۃ آل عمران رکھی۔ پھر سورۃ النساء رکھی۔

غرض ترتیب قرآن نہایت اہم حکمتوں پر مبنی ہے نزول کی ترتیب اُن لوگوں کے مطابق تھی جو اُس زمانہ

میں تھے ۔ اور موجودہ ترتیب آئندہ آنے والی نسلوں کی ضرورت کے مطابق ہے اور یہ اِس کلام کے منجانب اللہ ہونے کا ایک بڑا بھاری ثبوت ہے ۔ مگر یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ موجودہ ترتیب بھی خدا تعالےٰ کے حکم سے خود رسولِ کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے قائم کی ہے ۔ کسی اور شخص نے آپ کے سوا قائم نہیں کی ۔

لَوْلَا نُزِّلَ عَلَیْهِ الْقُرْاٰنُ جُمْلَةً وَّاحِدَةً

سے مسلمان مفسرین کو ایک یہ خیال بھی پیدا ہوا ہے کہ شاید پہلے سب نبیوں پر جُمْلَةً وَّاحِدَةً کلام نازل ہوتا تھا ۔ تبھی دشمنوں نے یہ اعتراض کیا ہے مگر انہوں نے اس بات پر غور نہیں کیا کہ قرآن کریم میں یہ اعتراض کفارِ مکہ کی طرف سے نقل کیا گیا ہے اور کفار مکہ تو کسی کتاب کے قائل ہی نہ تھے کجا یہ کہ وہ اس بات کے قائل ہوں کہ سب پہلے کلام یکدم نازل ہوئے تھے ۔ اگر یہود و نصاریٰ کی طرف سے یہ اعتراض بیان کیا جاتا تب تو یہ شبہ پیدا بھی ہو سکتا تھا ۔ لیکن انہوں نے یہ اعتراض نہیں کیا ۔ اِس لئے اس اعتراض کی وجہ سے یہ قیاس کرنا کہ پہلے چونکہ یکدم کلام نازل ہوتا تھا اس لئے قرآن کریم پر یہ اعتراض کیا گیا کہ کیوں یہ ایک ہی دفعہ نازل نہیں ہوا درست نہیں ۔ اصل بات یہ ہے کہ اُن کے اعتراض کی بنا محض عقلی تھی ۔ وہ سمجھتے تھے کہ اگر خدا تعالےٰ نے کلام نازل کیا ہوتا تو یکدم کر دیتا کیونکہ وہ عالم الغیب ہے ۔ کلام کے آہستہ آہستہ نازل ہونے کے یہ معنے ہیں کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نعوذ باللہ نئے اور بدلے ہوئے حالات کے مطابق خود ایک نیا کلام دنیا کے سامنے پیش کر دیتے ہیں ۔ اور چونکہ اُن کے اس اعتراض کی بنا محض عقلی تھی ۔ اس لئے اس سے یہ نتیجہ نہیں نکل سکتا کہ پہلے نبیوں پر اکٹھا کلام نازل ہو جاتا تھا ۔ لیکن بفرضِ محال اگر اسے تسلیم بھی کر لیا جائے کہ کفار مکہ ایسا کہتے تھے تو کیا اُن کے اس خیال کو ہم کوئی اہمیت دے سکتے ہیں ۔ کیا وہ علومِ آسمانی کے ماہر تھے یا مذہبی تاریخ کا اُن کو کوئی علم تھا کہ ہم اُن کے اس اعتراض کو تاریخِ مذہب کے لحاظ سے کوئی اہمیت دیں ؟ اگر انہوں نے ایسا کہا تب بھی تاریخی لحاظ سے یہ بالکل غلط بات تھی جسے کوئی باخبر انسان درست نہیں سمجھ سکتا ۔ میرے نزدیک اس غلطی کے پیدا ہونے کی ایک اور وجہ بھی ہے اور وہ یہ کہ قرآن کریم میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نسبت آتا ہے کہ انہیں طور پر الواح ملی تھیں (اعراف ع ۱۷) مسلمان مفسرین چونکہ اسرائیلی کتب سے واقف نہ تھے انہوں نے یہ سمجھ لیا کہ الواح اور تورات ایک ہی شئے ہیں ۔ حالانکہ الواح صرف اُن احکام کا نام ہے جن کا خروج باب ۲۰ تا ۲۱ میں ذکر آتا ہے اور تورات اُن احکام کے علاوہ اور بھی بہت سے احکام پر مشتمل ہے ۔ اور پھر قرآن کریم نے یہ کہیں ذکر نہیں کیا کہ یہ احکام موسیٰؑ پر ایک ہی وقت میں نازل ہوئے تھے پس اوّل تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو طور پر مکمل تورات نہیں ملی اور پھر جو کچھ آپ پر نازل ہوا وہ بھی یکدم نازل نہیں ہوا بلکہ چالیس راتوں میں نازل ہوا ۔ لیکن الواحِ موسیٰؑ کے علاوہ دوسرے نبیوں کی وحی کی نسبت تو کوئی ضعیف روایت بھی ایسی نہیں جس سے معلوم ہو کہ پہلے نبیوں پر کلامِ الٰہی یکدم نازل ہو جاتا تھا اور اگر بالفرض کوئی ایسی روایت بھی ہوتی تو ہم اُسے خلافِ عقل کہہ کے رد کر دیتے ۔ کیونکہ مکالمہ و مخاطبۂ الٰہیہ انبیاء اور خدا تعالےٰ کے تعلق کو روشن کرتا ہے ۔ کیا ہم یہ خیال کر سکتے ہیں کہ کسی نبی پر ایک ہی رات میں سب کلام نازل کر کے خدا تعالےٰ اُس سے دائمی طور پر اپنے کلام کا سلسلہ منقطع کر سکتا تھے ؟ اور اگر ایسا ہو تو کیا وہ نبی زندہ رہ سکتا ہے ؟ مَیں تو سمجھتا ہوں اگر ایک دن کلام کر کے خدا تعالےٰ

اپنے انبیاء سے کلام کرنا بالکل بند کر دیتا تو دشمن تو انکو مارنے میں پھر بھی ناکام رہتے لیکن یہ خدائی فعل اُن کو مارنے میں ضرور کامیاب ہو جاتا۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر نبی کا کلام اُس کی زندگی کے مختلف حالات پر روشنی ڈالتا ہُوا ایک لمبے عرصہ میں ختم ہُوا کرتا ہے۔ وہ کلام ایک طرف تو خدا تعالیٰ کی صفات کے تازہ ظہور پر روشنی ڈالتا ہے اور دوسری طرف اُس کی تائید اور نصرت کا ثبوت ہوتا ہے۔ پھر تیسری طرف خود اُس نبی کے ایمان اور اس کے یقین کے مختلف نمونوں کو پیش کر کے اُس کے رُوحانی کمالات کو دنیا کے سامنے پیش کرتا ہے۔ اگر شروع میں ہی یکدم سارا کلام نازل ہو جائے تو اُس میں یہ باتیں جمع نہیں ہو سکتیں۔ اور اگر یہ باتیں کسی کلام میں جمع نہ ہوں تو وہ دنیا کی ہدایت اور رشد کا ذریعہ بھی نہیں بن سکتا۔ پس ضروری ہے کہ خدا تعالیٰ کے انبیاء پر آہستہ آہستہ کلام نازل ہو تاکہ اُن کا تعلق باللہ زندگی کے ہر دور میں ظاہر ہوتا رہے۔ پھر علاوہ اِن حکمتوں کے قرآن کریم کا آہستہ آہستہ نزول اس لحاظ سے بھی اس کی صداقت کا ایک بہت بڑا ثبوت ہے کہ یسعیاہ نبی کے کلام میں یہ پیشگوئی پائی جاتی تھی کہ آخری زمانہ کے نبی پر جو کلام نازل ہوگا وہ آہستہ آہستہ مختلف ٹکڑوں کی صورت میں نازل ہوگا۔ چنانچہ انہوں نے پیشگوئی کرتے ہوئے فرمایا :-

"وہ کس کو دانش سکھائیگا۔ کس کو وعظ کر کے سمجھائیگا۔ کیا اُن کو جن کا دودھ چھڑایا گیا۔ جو چھاتیوں سے جدا کئے گئے کیونکہ حکم پر حکم۔ حکم پر حکم۔ قانون پر قانون۔ قانون پر قانون ہے۔ تھوڑا یہاں تھوڑا وہاں لیکن وہ بیگانہ لبوں اور اجنبی زبان سے لوگوں سے کلام کریگا جن کو اس نے فرمایا یہ آرام ہے تم تھکے ماندوں کو آرام دو۔ اور یہ تازگی ہے پر وہ شنوا نہ ہوئے۔ پس خداوند کا کلام اُن کیلئے حکم پر حکم۔ حکم پر حکم۔ قانون پر قانون قانون پر قانون۔ تھوڑا یہاں تھوڑا وہاں ہوگا تاکہ وہ چلے جائیں اور پیچھے گریں۔ اور شکست کھائیں۔ اور دام میں پھنسیں اور گرفتار ہوں۔"

(یسعیاہ باب ۲۸ آیت ۹ تا ۱۳)

اِس پیشگوئی میں بتایا گیا تھا کہ خدا تعالیٰ کا کلام ایک زمانہ میں اس قوم کے پاس آئے گا جو الہام کے دودھ سے محروم ہوگی۔ چنانچہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اُسی وقت مبعوث ہوئے جب زمانۂ نبوت پر ایک لمبا عرصہ گذر چکا تھا۔ اور بنی اسرائیل بھی جو اہل کتاب تھے الہام کے دودھ سے محروم ہو چکے تھے۔ چنانچہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ اُن کی اس روحانی پیاس کا ذکر کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ يَآ اَهْلَ الْكِتَابِ قَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ عَلٰى فَتْرَةٍ مِّنَ الرُّسُلِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا جَآءَنَا مِنْ بَشِيْرٍ وَّلَا نَذِيْرٍ۔ فَقَدْ جَآءَكُمْ بَشِيْرٌ وَّنَذِيْرٌ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (مائدہ ع ۳) یعنی اے اہل کتاب تمہارے پاس ہمارا رسول آچکا ہے جو رسولوں کے ایک لمبے انقطاع کے بعد تم سے ہماری باتیں بیان کرتا ہے۔ تاکہ تم یہ نہ کہو کہ ہمارے پاس نہ کوئی بشارت دینے والا آیا ہے نہ ڈرانے والا۔ سو تمہارے پاس ایک بشارت دینے والا اور ڈرانے والا آگیا ہے۔ اور اللہ ہر ایک بات پر قادر ہے۔ اِسی سلسلہ میں ایک بڑی علامت اس پیشگوئی میں یہ بتائی گئی تھی کہ وہ کلام جو اس نبی پر نازل ہوگا یکدم نازل نہیں ہوگا۔ نہ کسی ایک

اَلَّذِیْنَ یُحْشَرُوْنَ عَلٰی وُجُوْهِهِمْ اِلٰی جَهَنَّمَ ۙ اُولٰٓئِكَ

جو لوگ اپنے سرداروں سمیت لے جائے جائیں گے جہنم کی طرف اُن کا مقام

شَرٌّ مَّكَانًا وَّ اَضَلُّ سَبِیْلًا ﴿۳۵﴾ ع

بہت بُرا ہوگا اور اُن کا رستہ بڑی گمراہی کا ہوگا ۱۶؎

شہر یا گاؤں میں نازل ہوگا بلکہ حکم پر حکم اور قانون پر قانون مختلف مقامات پر اُتریں گے ۔ چنانچہ قرآن کریم بعینہٖ اسی طرح اُترا ۔ کچھ مکہ میں نازل ہوا اور کچھ مدینہ میں کچھ سفر میں نازل ہوا اور کچھ حضر میں ۔ یہاں تک کہ دشمنوں نے بھی یہ اعتراض کر دیا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر سارا قرآن ایک ہی دفعہ کیوں نازل نہیں ہوا ۔

تعجب ہے کہ یسعیاہ نبی کی اس پیشگوئی کے باوجود مسیحی بھی آج تک قرآن کریم پر یہ اعتراض کرتے چلے جاتے ہیں اور اس طرح اپنی قلموں سے اس امر کا ثبوت مہیا کرتے رہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یسعیاہ نبی کی پیشگوئی کے مصداق تھے ۔

۱۶؎ حل لغات :- وُجُوْهِهِمْ : اَلْوَجْهُ کے معنے ہیں نَفْسُ الشَّیْءِ یعنی کسی چیز کا اپنا وجود ۔ اور جب اَلْوَجْهُ مِنَ الدَّهْرِ کہیں تو اس کے معنے ہوتے ہیں اَوَّلُهٗ زمانہ کا ابتدائی حصہ ۔ اسی طرح وَجْهٌ کے ایک معنے سَیِّدُ الْقَوْمِ یعنی قوم کے سردار کے بھی ہیں اور اس کے معنے اَلْجَاهُ یعنی عزت اَلْجِهَةُ : جانب ۔ مَایَتَوَجَّهُ اِلَیْهِ الْاِنْسَانُ مِنْ عَمَلٍ وَغَیْرِہٖ : انسانی مطمح نظر اور عمل ۔ اَلْقَصْدُ وَالنِّیَّةُ : قصد اور نیت اور اَلْمَرْضَاةُ یعنی رضامندی کے بھی ہیں (اقرب)

تفسیر :- وَجْهٌ کے ایک معنے جیسا کہ حل لغات میں بتایا جا چکا ہے سردار قوم کے بھی ہوتے ہیں

پس یُحْشَرُوْنَ عَلٰی وُجُوْهِهِمْ اِلٰی جَهَنَّمَ کے یہ معنے ہیں کہ قیامت کے دن کفار جہنم میں تو جائیں گے مگر اپنے سرداروں پر لعنتیں ڈالتے ہوئے اور انہیں بُرا بھلا کہتے ہوئے جائیں گے اور وہی لوگ جن کے لئے وہ اپنی جانیں قربان کیا کرتے تھے اور جن کے اشاروں پر وہ اپنا دین اور مذہب بھی فروخت کرنے کے لئے تیار رہتے تھے انہی سے وہ نفرت اور بے زاری کا اظہار کرنے لگ جائیں گے ۔ کیونکہ اُس وقت اُن پر حقیقت روشن ہو چکی ہوگی اور انہیں معلوم ہو جائیگا کہ انہوں نے اپنے لیڈروں کی اندھی تقلید کے نتیجہ میں کیا نقصان اٹھایا ہے ۔

قرآن کریم نے اُن کی اس نفرت اور بیزاری کا ایک اور جگہ ان الفاظ میں نقشہ کھینچا ہے ۔ کہ وَقَالَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا رَبَّنَآ اَرِنَا الَّذَیْنِ اَضَلّٰنَا مِنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ نَجْعَلْهُمَا تَحْتَ اَقْدَامِنَا لِیَكُوْنَا مِنَ الْاَسْفَلِیْنَ (حٰمٓ السجدہ ع ۴) یعنی اُس دن کفار کہیں گے کہ اے ہمارے رب ! تو ہمیں جن و انس میں سے وہ لوگ دکھا جو ہمیں گمراہ کیا کرتے تھے تاکہ ہم اُن کو اپنے پیروں تلے مسلیں اور اس کے نتیجہ میں وہ ذلیل ترین وجود بن جائیں ۔

اسی طرح ایک اور مقام پر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ وَقَالُوْا رَبَّنَآ اِنَّآ اَطَعْنَا سَادَتَنَا وَكُبَرَآءَنَا فَاَضَلُّوْنَا السَّبِیْلَا ۔ رَبَّنَآ اٰتِهِمْ ضِعْفَیْنِ مِنَ الْعَذَابِ وَالْعَنْهُمْ لَعْنًا كَبِیْرًا (احزاب ع ۸)

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَجَعَلْنَا مَعَهٗٓ اَخَاهُ

اور ہم نے موسیٰؑ کو (ایک معلوم) کتاب دی تھی اور ہم نے اُس کے ساتھ اسکے بھائی

هٰرُوْنَ وَزِيْرًا ﴿۳۶﴾ فَقُلْنَا اذْهَبَآ اِلَى الْقَوْمِ الَّذِيْنَ

ہارونؑ کو بھی نائب بنا کر بھیج دیا تھا ۔ اور ہم نے اُن سے کہا تھا کہ تم دونوں اُس قوم کی طرف جاؤ جنہوں نے

كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۭ فَدَمَّرْنٰهُمْ تَدْمِيْرًا ﴿۳۷﴾ وَ

ہماری آیتوں کا انکار کر دیا ہے ۔ پھر (جب وہ تبلیغ کر چکے) ہم نے اُن جھٹلانے والوں کو بالکل تباہ کر دیا ۔ اور

قَوْمَ نُوْحٍ لَّمَّا كَذَّبُوا الرُّسُلَ اَغْرَقْنٰهُمْ وَ

قومِ نوحؑ کو بھی جب انہوں نے رسولوں کا انکار کیا ہم نے غرق کر دیا اور

جَعَلْنٰهُمْ لِلنَّاسِ اٰيَةً ۭ وَاَعْتَدْنَا لِلظّٰلِمِيْنَ

ہم نے انہیں لوگوں کیلئے ایک نشان بنا دیا ۔ اور ہم نے ظالموں کیلئے دردناک عذاب

عَذَابًا اَلِيْمًا ﴿۳۸﴾ وَّعَادًا وَّثَمُوْدَا۟ وَاَصْحٰبَ الرَّسِّ

تیار کر چھوڑا ہے ۔ اور عاد کو بھی اور ثمود کو بھی اور کنوئیں والے لوگوں کو بھی

یعنی عوام جو لیڈروں کے پیچھے چلتے رہے وہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ سے کہیں گے کہ اے ہمارے ربّ ہم سے بڑی غلطی ہوئی کہ ہم نے اپنے سرداروں اور بڑے لوگوں کی اتباع کی ۔جس کے نتیجہ میں انہوں نے ہمیں سیدھے راستہ سے منحرف کر دیا اے ہمارے ربّ اب تو اُن کو جہنّم میں دُگنا عذاب دے اور انہیں اپنی بہت بڑی لعنت کا نشانہ بنا ۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ جس تعلق کی بنیاد کفر اور بے ایمانی پر ہو وہ کیسا ناپائیدار ہوتا ہے اور اس کا انجام کتنا حسرتناک ہوتا ہے ۔ دنیا میں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ جو خود غرض لیڈر محض اپنی لیڈری قائم رکھنے کے لئے عوام کو سبز باغ دکھانے کے عادی ہوتے ہیں جب کسی غلط راستہ پر قوم کو چلا کر اُسے تباہی کے گڑھے میں دھکیل دیتے ہیں ۔ اور عوام اُن کی دھوکا دہی سے آگاہ ہو جاتے ہیں تو وہی لوگ جو پہلے اُن کے لئے "زندہ باد" کے نعرے بلند کیا کرتے ہیں "مُردہ باد" کے نعرے بلند کرنے لگتے ہیں اور اُنہیں قوم کا غدّار اور چھپا دشمن قرار دیا جاتا ہے ۔ یہی حال عالمِ معاد میں بھی ہوگا جب کفار کو جہنّم کی طرف دھکیلا جائیگا تو وہ اس تباہی کا اپنے لیڈروں کو ذمہ وار قرار دیں گے اور انہیں بُرا بھلا کہیں گے ۔ مگر اُس وقت اُن کو بُرا بھلا کہنا انہیں

وَّ قُرُوْنًا بَیْنَ ذٰلِكَ كَثِیْرًا ﴿۳۹﴾ وَ كُلًّا ضَرَبْنَا لَهُ

اور اُن کے درمیان اَور بہت سی قوموں کو بھی (ہم نے تباہ کر دیا) - اور اُن میں سے ہر قوم کے لئے ہم نے

الْاَمْثَالَ ز وَ كُلًّا تَبَّرْنَا تَتْبِیْرًا ﴿۴۰﴾

حقیقت بیان کر دی اور (جب نہ سمجھے تو) سب کو ہلاک کر دیا ۵۱۷

کوئی فائدہ نہیں دے گا - کیونکہ عمل کا وقت گذر چکا ہوگا اور جزائے خیر اور شر کا زمانہ ظاہر ہو چکا ہوگا۔

۵۱۷ حل لغات :- دَمَّرْنَاهُمْ. دَمَّرَ سے جمع متکلم کا صیغہ ہے اور دَمَّرَ عَلَیْهِمْ کے معنے ہیں اَهْلَكَهُمْ. ان کو ہلاک کر دیا (اقرب) پس دَمَّرْنَاهُمْ کے معنے ہونگے. ہم نے اُن کو ہلاک کر دیا۔

دَمَّرْنَاهُمْ

اَصْحَابَ الرَّسِّ :- اَلرَّسُّ کے معنے ہیں اَلْبِئْرُ الْقَدِیْمَةُ. پُرانا کنواں (اقرب) مفردات میں ہے اَصْلُ الرَّسِّ الْاَثَرُ الْقَلِیْلُ الْمَوْجُوْدُ فِی الشَّیْءِ کسی چیز میں اگر کوئی بڑا نشان ہو اور پھر مٹتا مٹتا تھوڑا سا رہ جائے تو اس تھوڑے سے نشان کو رسّ کہتے ہیں (مفردات) اَصْحٰبُ الرَّسِّ قِیْلَ هُوَ وَادٍ بعض لوگوں کے نزدیک رسّ ایک وادی کا نام ہے (مفردات) پس اَصْحٰبُ الرَّسِّ کے معنے ہوں گے (۱) کنوئیں والے (۲) ایسی قوم جن کے نشان مٹتے مٹتے کچھ بقایا رہ گئے ہوں - (۳) وادی والے -

اَصْحٰبَ الرَّسِّ

تَبَّرْنَا : تَبَّرَ سے جمع متکلم کا صیغہ ہے اور تَبَّرَهٗ کے معنے ہیں اَهْلَكَهٗ وَ دَمَّرَهٗ. اس کو ہلاک و برباد کر دیا - كُلُّ شَیْءٍ كَسَّرْتَهٗ وَ فَتَّتَّهٗ فَقَدْ تَبَّرْتَهٗ . ہر وہ چیز جسے توڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیا جائے اس کے متعلق تَبَّرَ کا لفظ بولتے ہیں (اقرب) پس تَبَّرْنَا کے معنے ہونگے . ہم نے اُن کو کلیتہً تباہ و برباد کر دیا -

تَبَّرْنَا

تفسیر :- اب بتاتا ہے کہ قیامت کے دن اپنے گناہوں کی دوسروں پر ذمہ واری ڈالنے سے کوئی انسان اپنے جرم کی سزا سے نہیں بچ سکتا کیونکہ ابتدائے آفرینش سے ہم لوگوں کی ہدایت کے لئے اپنے انبیاء مبعوث کرتے رہے ہیں اور اُن کی تائید میں اپنے نشانات بھی دکھاتے رہے ہیں اگر اس سلسلۂ رسالت سے لوگ فائدہ نہیں اٹھاتے تو اُن کا یہ کہنا کہ ہمیں تو اپنے لیڈروں نے بہکا دیا تھا اُن کے جرم کو ہلکا نہیں کر سکتا - چنانچہ اس سلسلہ میں اللہ تعالیٰ سب سے پہلے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ذکر فرماتا ہے جن کی شریعت یہود کے لئے قریباً دو ہزار سال تک قابل عمل رہی - اور فرماتا ہے کہ دیکھو ہم نے موسیٰؑ کو تورات دی اور اس کے ساتھ اس کے بھائی ہارونؑ کو اس کا نائب بنایا - اور پھر ہم نے اُن دونوں کو کہا کہ تم فرعون اور اس کی قوم کے پاس جاؤ اور انہیں ہمارا پیغام پہنچاؤ - مگر فرعون اور اس کی قوم نے ہماری آیات کا انکار کر دیا جس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ ہم نے انہیں تباہ کر دیا اور موسیٰؑ کو غلبہ عطا کیا -

اسجگہ وَجَعَلْنَا مَعَهٗۤ اَخَاهُ هٰرُوْنَ وَزِیْرًا سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ہارون علیہ السلام کی حیثیت حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ایک تابع کی تھی مگر بعض لوگ جو حقائق پر پوری طرح غور کرنے کے عادی نہیں اور صرف سطحی نظر سے قرآنی آیات کو دیکھتے ہیں انہوں نے قرآن کریم کی بعض آیات سے یہ دھوکہ کھایا ہے کہ موسیٰؑ اور ہارونؑ

دونوں صاحب کتاب اور صاحب اُمت نبی تھے۔ اُن کا صاحب اُمت ہونا تو وہ اس آیت سے ثابت کرتے ہیں جس میں جالوت کے متعلق اُن کے زمانہ کے نبی نے خبر دیتے ہوئے فرمایا تھا کہ اِنَّ اٰیَةَ مُلْكِهٖٓ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ التَّابُوْتُ فِيْهِ سَكِيْنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَبَقِيَّةٌ مِّمَّا تَرَكَ اٰلُ مُوْسٰى وَاٰلُ هٰرُوْنَ (بقرہ ع ۳۲) یعنی اُس کی حکومت کا نشان یہ ہے کہ تمہیں ایک تابوت ملے گا جس میں تمہارے رب کی طرف سے تسکین ہوگی اور اُس چیز کا بقیہ ہوگا جو موسیٰؑ اور ہارونؑ کی آل نے اپنے پیچھے چھوڑا اور دونوں کا صاحب کتاب ہونا وہ اس آیت سے ثابت کرتے ہیں کہ وَاٰتَيْنٰهُمَا الْكِتٰبَ الْمُسْتَبِيْنَ (الصافات ع ۳) یعنی ہم نے ان دونوں کو ایک کامل کتاب دی جو تمام احکام کو کھول کھول کر بیان کرتی تھی۔ حالانکہ آل موسیٰؑ و آل ہارونؑ کہنا دونوں کی الگ الگ جماعتوں کا کوئی ثبوت نہیں۔ ایک ہی جماعت آل موسیٰؑ بھی کہلا سکتی ہے اور آل ہارونؑ بھی اور پھر آل سے مراد متعلقین بھی ہو سکتے ہیں۔ باقی رہا کتاب کا ذکر۔ سو کتاب تو یقیناً ہارونؑ کو بھی ملی۔ لیکن کتاب ملنے کے یہ معنے نہیں کہ اُن کو کوئی مستقل کتاب ملی تھی بلکہ جو کتاب حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ملی وہی حضرت ہارونؑ کے لئے بھی تھی جیسے وہ کتاب جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ملی وہ ہمارے لئے بھی ہے۔ مگر اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ ہم پر یہ کتاب نازل ہوئی ہے۔ اس سے صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ ہم اہل کتاب ہیں۔ اسی طرح ہارونؑ بھی اہل کتاب تھے مگر اُن پر کتاب نازل نہیں ہوئی۔

حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ کے باہمی تعلقات کا علم قرآن کریم کی مندرجہ ذیل آیات سے واضح ہو جاتا ہے

اوّل۔ قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ہارونؑ کو نبوت کے مقام پر فائز کرنے کے متعلق خود حضرت موسیٰ علیہ السلام نے درخواست کی تھی اور ان الفاظ میں کی تھی کہ وَاجْعَلْ لِّيْ وَزِيْرًا مِّنْ اَهْلِيْ هٰرُوْنَ اَخِي اشْدُدْ بِهٖٓ اَزْرِيْ وَاَشْرِكْهُ فِيْٓ اَمْرِيْ (طٰہٰ ع ۲) یعنی اے میرے خدا! میرے اہل میں سے ایک میرا نائب مقرر کر۔ یعنی میرے بھائی ہارون کو اور اُس کے ذریعہ سے میری قوت بڑھا اور اُسے میرے امر میں شریک کر۔

اِن آیات سے ظاہر ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام ایک ایسے نبی کے لئے دُعا کر رہے ہیں جو اُن کا وزیر ہو اور جو اُن کی طاقت بڑھانے والا ہو۔ اور پھر صاف فرماتے ہیں کہ میرے امر میں اسے شریک کر۔ یعنی سلسلہ تو میرا ہی ہوگا اس کا نہیں ہوگا بس صرف یہ چاہتا ہوں کہ وہ اس کام کو چلانے میں میرا مددگار اور شریک کار ہو۔ کہا جا سکتا ہے کہ یہ تو موسیٰؑ کی دُعا ہے۔ خدا تعالیٰ نے نہ معلوم اس کو قبول کیا یا نہ کیا۔ سو اس کا جواب بھی اسی سورۃ میں موجود ہے۔ کیونکہ ایک دو آیات چھوڑ کر اللہ تعالیٰ نے کا جواب بھی نقل ہے۔ جو یہ ہے کہ قَدْ اُوْتِيْتَ سُؤْلَكَ يٰمُوْسٰى۔ یعنی اے موسیٰ! تیری التجا قبول کی جاتی ہے۔ جس سے معلوم ہوا کہ حضرت موسیٰؑ نے جو کچھ مانگا تھا وہی کچھ خدا نے انکو دیا۔ اور حضرت ہارونؑ کو وہی مقام ملا جو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے طلب کیا تھا۔ پس حضرت ہارون کی حیثیت باوجود ایک نبی ہونے کے اُن کے نائب اور اُن کے کام میں مددگار کی تھی نہ کہ کچھ اور۔ اور یہ امر ظاہر ہے کہ ایک شخص ایک ہی وقت میں مستقل نبی اور دوسرے نبی کا تابع نہیں ہو سکتا۔ یہ دونوں عہدے قطعی طور پر ایک دوسرے کے مخالف ہیں

اس مضمون پر ان تعلقات کی تفصیل سے بھی خوب روشنی پڑتی ہے جو حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ کے درمیان تھے اور جن کا ذکر قرآن کریم میں موجود ہے مثلاً سورہ اعراف ع ۱۷ میں ہے وَقَالَ مُوْسٰى لِاَخِيْهِ هٰرُوْنَ اخْلُفْنِيْ فِيْ قَوْمِيْ وَاَصْلِحْ وَلَا

تَتَّبِعْ سَبِيْلَ الْمُفْسِدِيْنَ۔ یعنی موسیٰؑ نے اپنے بھائی سے پہاڑ پر جاتے ہوئے کہا کہ تم میرے بعد میری قوم میں میرے نائب کی حیثیت سے کام کرو۔ اور اصلاح کو ہمیشہ مدنظر رکھو۔ اور شریروں کی باتیں نہ ماننا۔ اس آیت سے ظاہر ہے کہ امت کو حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی اُمت قرار دیتے ہیں اور سرداری اپنی طرف منسوب کرتے ہوئے حضرت ہارونؑ کو اپنا خلیفہ مقرر کرتے ہیں۔ شاید یہ کہا جائے کہ حضرت ہارونؑ اپنی قوم پر تو حاکم تھے ہی حضرت موسیٰؑ نے مزید یہ درخواست اُن سے کی ہے کہ میری قوم کے کام بھی میرے پیچھے تم کر دینا۔ لیکن اوّل تو اس پر یہ اعتراض ہوتا ہے کہ جب یہ الگ الگ قوموں کی طرف نبی تھے تو اکٹھے کیوں رہتے تھے؟ دوسرے یہ اعتراض ہوتا ہے کہ ان کی قومیں کس اصول پر مقرر تھیں۔ اگر تو ہارونؑ کسی اَور خاندان سے ہوتے تو کہا جا سکتا تھا کہ اپنی اپنی قوم اُن پر ایمان لائی تھی لیکن یہ دونوں تو بھائی تھے پھر موسیٰؑ کی قوم الگ کس اصول پر تھی اور حضرت ہارونؑ کی کس اصول پر۔ کیا دن مقرر تھے کہ فلاں دن بیعت کرنیوالا موسیٰؑ کی کتاب پر ایمان لائے اور فلاں دن بیعت کو آنیوالا ہارونؑ کی کتاب پر ایمان لائے؟ یا قومیں الگ الگ بانٹی ہوئی تھیں۔ یا یہ تھا کہ جو چاہے موسیٰؑ کی بیعت کرے اور جو چاہے ہارونؑ کی بیعت کرے۔ آخر ایک ماں کے دو بیٹے جو اکٹھے رہتے تھے اُن کی الگ الگ اُمتیں کس اصول پر بنائی گئی تھیں؟ پھر یہ بھی سوال ہے کہ قرآن کریم یہ فرماتا ہے وَاتَّخَذَ قَوْمُ مُوْسٰى مِنْۢ بَعْدِهٖ مِنْ حُلِيِّهِمْ عِجْلًا جَسَدًا لَّهٗ خُوَارٌ (اعراف ع) یعنی موسیٰؑ کے بعد موسیٰؑ کی اُمت نے بچھڑا بنا لیا تھا۔ کیا اس سے یہ سمجھا جائے کہ حضرت ہارون کی اُمت نے بچھڑا نہیں بنایا تھا۔ کیونکہ قرآن صرف قومِ موسیٰؑ کے بگڑنے کا ذکر کرتا ہے ہارونؑ کی اُمت کے بگڑنے کا ذکر نہیں کرتا۔ اور اگر یہ درست ہے تو پھر ماننا پڑے گا کہ حضرت ہارونؑ نے اپنی قوم کا زیادہ خیال رکھا اور موسیٰؑ کی قوم کا چنداں خیال نہ کیا۔ پھر اس کے آگے ذکر ہے کہ حضرت موسیٰؑ حضرت ہارونؑ پر ناراض ہوئے اور انہوں نے کہا کہ قَالَ ابْنَ اُمَّ اِنَّ الْقَوْمَ اسْتَضْعَفُوْنِيْ وَكَادُوْا يَقْتُلُوْنَنِيْ (اعراف ع) اے میری ماں کے بیٹے۔ قوم نے مجھے کمزور سمجھا اور مجھے قتل کرنے لگے تھے۔ اگر حضرت ہارونؑ کی الگ اُمت تھی تو سوال یہ ہے کہ وہ اُمت کہاں گئی ہوئی تھی اور کیوں اس نے ہارونؑ کی اس موقعہ پر مدد نہ کی۔ کیونکہ اگر ہارونی امت الگ تھی تو قرآن کے الفاظ کے مطابق وہ نہیں بگڑی تھی بلکہ اپنے ایمان پر قائم رہی تھی۔

اس قابلِ اعتراض عقیدہ کی وجہ سے ایک اَور مشکل بھی پیش آتی ہے جو یہ ہے کہ دوسری جگہ حضرت ہارونؑ کا یہ قول نقل ہے کہ قَالَ لَهُمْ هٰرُوْنُ مِنْ قَبْلُ يٰقَوْمِ اِنَّمَا فُتِنْتُمْ بِهٖ وَاِنَّ رَبَّكُمُ الرَّحْمٰنُ فَاتَّبِعُوْنِيْ وَاَطِيْعُوْۤا اَمْرِيْ۔ قَالُوْا لَنْ نَّبْرَحَ عَلَيْهِ عٰكِفِيْنَ حَتّٰى يَرْجِعَ اِلَيْنَا مُوْسٰى (طٰہٰ ع) یعنی حضرت ہارونؑ نے حضرت موسیٰؑ کے واپس آنے سے بھی پہلے اُن سے کہہ دیا تھا کہ اے میری قوم! تم کو اس بچھڑے کے ذریعہ آزمائش میں ڈالا گیا ہے اور تمہارا رب تو رحمٰن خدا ہے۔ پس میری اتباع کرو اور میرے حکم کو مانو۔ مگر قوم نے کہا کہ جب تک موسیٰؑ ہماری طرف واپس نہ آئے ہم برابر اس کی عبادت کرتے رہیں گے۔ ان آیات میں حضرت ہارونؑ بگڑنے والی قوم کو اپنی قوم کہتے ہیں۔ اگر کہا جائے کہ یہ قول انہوں نے اپنی امت سے کہا تھا۔ تو پھر یہ مشکل پیش آتی ہے کہ اُن کا جواب یہ ہے کہ موسیٰؑ کے آنے تک ہم اس کام کو نہیں چھوڑینگے

توکیا اس سے یہ سمجھا جائے کہ امت تو وہ ہارونؑ کی تھی لیکن بات موسیٰؑ کی مانا کرتی تھی۔

غرض اس عقیدہ کو قرآن کریم کی متعدد آیات رد کر رہی ہیں اور حق یہی ہے کہ حضرت ہارونؑ حضرت موسیٰؑ کے تابع نبی تھے۔ حضرت موسیٰ کی قوم ہی ان کی قوم تھی اور اُن کی کوئی الگ جماعت نہ تھی نہ الگ احکام تھے نہ کم نہ زیادہ۔ حضرت موسیٰؑ کی مدد کے لئے انہیں مقرر کیا گیا تھا اور آلِ ہارونؑ سے یا تو اُن کے وہ رشتہ دار مُراد ہیں جو حضرت موسیٰؑ کے رشتہ دار نہ تھے مثلاً بیویوں یا بہوؤں کی طرف سے رشتہ دار۔ یا ایک ہی قوم مراد ہے۔ صرف دونوں کی اصلاحِ خلق کی خدمات کے اظہار کے لئے دونوں کا ذکر کر دیا گیا ہے۔

موسیٰؑ کے ذکر کے بعد اللہ تعالیٰ نے حضرت نوحؑ کا ذکر کیا اور فرمایا کہ موسیٰؑ سے اوپر چلو تو نوحؑ کی قوم کی مثال دیکھ لو۔ وہ بھی موسیٰؑ کی طرح ہمارا ایک شرعی رسول تھا۔ مگر جب اس کی قوم نے ہمارے رسولوں کا انکار کیا توہم نے اس کو غرق کر دیا۔ اور اُسے لوگوں کیلئے ایک نشان بنا دیا۔ اسجگہ نوحؑ کے لئے رُسُل کا لفظ استعمال کیا گیا ہے حالانکہ وہ صرف ایک رسول تھے اس میں یہ اشارہ کیا گیا ہے کہ اگر کسی ایک رسول کا بھی انکار کیا جائے تو چونکہ تمام انبیاء منہاجِ نبوت کے لحاظ سے ایک جیسے ہوتے ہیں اور جو دلائل کسی ایک نبی کی صداقت ثابت کرتے ہیں وہی دلائل دوسرے نبی کی صداقت بھی ثابت کرتے ہیں اس لئے ایک نبی کا انکار سب نبیوں کا انکار ہوتا ہے۔ اس کی ایسی ہی مثال ہے جیسے وہ شخص جس نے آم کھایا ہوا ہو وہ آم دیکھ کر نہیں کہہ سکتا کہ یہ آم نہیں ہے بلکہ خربوزہ ہے۔ مگر جس نے آم نہ دیکھا ہو وہ اُسے دیکھ کر نہیں کہہ سکتا کہ یہ آم ہے۔ اسی طرح جو شخص انبیاء کی صداقت کو صحیح طور پر پہچانتا ہو اور اُن کے دلائل اور نشاناتِ صداقت سے آگاہ ہو۔ وہ جب بھی کسی سچے نبی کو دیکھیگا اُسے پہچان لیگا اور اُس پر ایمان لے آئیگا۔ لیکن جو شخص کہتا تو یہ ہے کہ مَیں سب نبیوں کو مانتا ہوں لیکن بعد میں آنے والے وہ کسی رسول کا انکار کر دیتا ہے وہ اپنے عمل سے اِس بات کا اعلان کرتا ہے کہ اُس نے کسی نبی کو بھی نہیں پہچانا تھا۔ پس اُس کا انکار کسی ایک رسول کا نہیں بلکہ تمام رسولوں کا انکار کہلاتا ہے۔

اِس کے بعد اللہ تعالیٰ بعض اور قوموں کی ہلاکت کا ذکر کرتا ہے اور فرماتا ہے۔ ہم نے عادؔ اور ثمودؔ اور اصحاب الرس کو بھی ہلاک کیا اور اُن کے درمیان اَور بھی بہت سی قومیں ہمارے عذاب کا نشانہ بنیں۔ اِن میں سے ہر ایک کے لئے ہم نے اپنے انبیاء کے ذریعہ حقیقتِ حال کو کھول کر بیان کر دیا تھا مگر جب انہوں نے سچائی کو مٹانا چاہا تو پہلی قوموں کی طرح ہم نے انہیں بھی تباہ کر دیا۔ عادؔ ایک بہت بڑی قوم تھی جو تمام شمالی اور جنوبی عرب پر قابض تھی۔ قرآن کریم نے عاد کا زمانہ قومِ نوحؑ کے بعد بتایا ہے (اعراف ع ۹) اور اُس کی طاقت کو لَمْ یُخْلَقْ مِثْلُهَا فِی الْبِلَادِ (سورۃ الفجر) کے الفاظ میں بیان فرمایا، کہ اُن بلاد میں اُس جیسی طاقتور اور کوئی قوم نہیں تھی مگر اُس قوم نے بھی جب ھودؑ کا مقابلہ کیا تو اللہ تعالیٰ نے اُسے تباہ کر دیا۔ یہی حال ثمودؔ کا ہوا جس نے قوم عادؔ کی جگہ لی تھی۔ اس قوم کا مرکزی مقام حِجر تھا جو مدینہ منورہ اور تبوک کے درمیان تھا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب غزوۂ تبوک پر تشریف لے گئے تو آپ تھوڑی دیر کے لئے اس مقام پر بھی ٹھہرے تھے مگر آپ نے صحابہؓ کو حکم دے دیا کہ کوئی شخص اس جگہ سے کنوؤں کا پانی استعمال نہ کرے۔ بعض صحابہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ! ہم تو اس پانی سے اپنے آٹے گوندھ چکے ہیں

وَلَقَدْ اَتَوْا عَلَى الْقَرْيَةِ الَّتِيْٓ اُمْطِرَتْ مَطَرَ السَّوْءِ ۭ اَفَلَمْ

اور یہ (مکہ کے کفار) اس بستی کے پاس سے گذر چکے ہیں جس پر ہم نے ایک تکلیف دہ بارش نازل کی تھی۔ کیا یہ اس (بستی کے

يَكُوْنُوْا يَرَوْنَهَا ۚ بَلْ كَانُوْا لَا يَرْجُوْنَ نُشُوْرًا ﴿۴۱﴾ وَاِذَا رَاَوْكَ

نشانوں) کو نہیں دیکھتے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ دوبارہ اُٹھنے کی اُمید ہی نہیں رکھتے تھے۔ اور جب وہ تجھے دیکھتے ہیں تو

اِنْ يَّتَّخِذُوْنَكَ اِلَّا هُزُوًا ۭ اَهٰذَا الَّذِيْ بَعَثَ اللّٰهُ رَسُوْلًا ﴿۴۲﴾

تجھے فقط ہنسی ٹھٹھے کی چیز سمجھتے ہیں۔ (اور کہتے ہیں) کیا اللہ (تعالیٰ) نے اِس شخص کو رسول بنا کر بھیجا ہے!

اِنْ كَادَ لَيُضِلُّنَا عَنْ اٰلِهَتِنَا لَوْلَآ اَنْ صَبَرْنَا عَلَيْهَا ۭ وَ

اگر ہم اپنے معبودوں پر قائم نہ رہتے تو یہ (شخص) تو ہم کو ان سے گمراہ کرنے ہی لگا تھا۔ اور جب یہ

سَوْفَ يَعْلَمُوْنَ حِيْنَ يَرَوْنَ الْعَذَابَ مَنْ اَضَلُّ سَبِيْلًا ﴿۴۳﴾

عذاب کو دیکھینگے تو اُن کو ضرور حقیقت معلوم ہو جائے گی کہ کون اپنے طور و طریق میں زیادہ گمراہ تھا۔ ۱۸ھ

آپ نے فرمایا۔ وہ آٹا نہیں پھینک دو کیونکہ یہ وہ مقام ہے جہاں خدا تعالیٰ کا عذاب نازل ہو چکا ہے (بخاری کتاب الانبیاء)

پھر فرماتا ہے کہ ہم نے اصحاب الرس کو بھی ہلاک کیا۔

اصحاب الرّس کے بارہ میں مفسرین میں بہت اختلاف پایا جاتا ہے۔ لیکن اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ قوم ثمود کے بعد ہوئی ہے کیونکہ وَقُرُوْنًا بَيْنَ ذٰلِكَ سے معلوم ہوتا ہے کہ اسجگہ ترتیب مدنظر ہے اور بحر محیط نے بھی اسی کی تائید کی ہے۔ کیونکہ اُس میں حضرت ابن عباسؓ کا یہ قول لکھا ہے کہ یہ قوم ثمود کا حصہ تھی (تفسیر بحر محیط جلد ۶ صفحہ ۴۹۸) اور چونکہ ثمود عاد کا آخری حصہ تھے اس لئے معلوم ہوتا ہے کہ یہ قوم ثمود کی قائم مقام تھی۔ اور نسل اسمٰعیلؑ کے عرب میں پھیلنے سے پہلے یہ لوگ ہوئے ہیں۔ جب نسل اسماعیلؑ عرب میں پھیل گئی تو پھر یہ لوگ فلسطین کی طرف چلے گئے جیسا کہ قدیم آثار سے پتہ چلتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان گذشتہ اقوام کی مثالیں پیش کر کے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب کے بد نتائج سے لوگوں کو ڈرایا ہے اور انہیں بتایا ہے کہ اگر تم نے اصلاح نہ کی تو جو حال موسیٰؑ اور نوحؑ اور ہودؑ اور صالحؑ کے جھٹلانے والوں کا ہوا وہی حال تمہارا ہوگا اور تم بھی اس صفحۂ ہستی سے معدوم کر دیئے جاؤ گے۔

۱۸ھ تفسیر:۔ اب فرماتا ہے کہ یہ مشرک اپنے سفروں میں اس بستی کے پاس سے گذرتے ہیں جس پر ہم نے تکلیف دہ بارش نازل کی تھی مگر پھر بھی وہ اس کو دیکھکر عبرت حاصل نہیں کرتے۔

اسجگہ قریہ سے مُراد قوم لوطؑ کی بستی ہے اور اُمْطِرَتْ مَطَرَ السَّوْءِ سے یہ مُراد ہے کہ زلزلے کے ذریعہ خدا تعالیٰ نے اُن کی زمین کو تہ و بالا کر دیا۔ جیسا کہ ایک دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ فَجَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ حِجَارَةً مِّنْ سِجِّيْلٍ (سورۃ حجر ع ۵)

أَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلٰهَهٗ هَوٰىهُ ۚ أَفَأَنْتَ تَكُوْنُ عَلَيْهِ

(اے رسول) کیا تُو نے اس شخص کا حال بھی معلوم کر لیا ہے جس نے اپنی خواہشاتِ نفسانی کو اپنا معبود بنا لیا۔ کیا تُو اُس شخص پر نگران ہے (کہ تُو

وَكِيْلًا ﴿۴۴﴾ أَمْ تَحْسَبُ أَنَّ أَكْثَرَهُمْ يَسْمَعُوْنَ أَوْ

اُسے جبرًا گمراہی سے روکے)۔ کیا تُو سمجھتا ہے کہ اُن میں سے اکثر سُنتے یا

یعنی ہم نے اُس کی اوپر والی سطح کو نچلی سطح بنا دیا اور اُن پر سنگریزوں سے بنے ہوئے پتھروں کی بارش برسائی۔

أَتَوْا عَلَى الْقَرْيَةِ سے یہ مراد ہے کہ جب یہ لوگ اپنی تجارتی اغراض کے لئے حجاز سے شام جاتے ہیں تو عین راستہ پر انہیں قومِ لوطؑ کی بستی دکھائی دیتی ہے۔ اس بستی کی عبرتناک تباہی کو دیکھ کر چاہیئے تھا کہ اُن کے دل لرز جاتے اور یہ اللہ تعالیٰ کے پیغام کو قبول کر لیتے۔ مگر یہ ایسے سخت دل لوگ ہیں کہ ان کھنڈرات کو دیکھنے کے باوجود کوئی عبرت حاصل نہیں کرتے اور اللہ تعالیٰ کے رسول کی تکذیب کرتے چلے جاتے ہیں۔

اِسکے بعد اللہ تعالیٰ اُنکے اس انکار کی وجہ بیان کرتا ہے اور فرماتا ہے۔ بَلْ كَانُوْا لَا يَرْجُوْنَ نُشُوْرًا۔ اس انکار کی اصل وجہ یہ ہے کہ اِن لوگوں کو جزا و سزا پر کوئی ایمان نہیں اور اسو جہ سے یہ لوگ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دعویٰ پر غور ہی نہیں کرتے۔ اگر اِن کے دلوں میں آئندہ زندگی کا کوئی خوف پایا جاتا تو یہ لوگ تکبّر اور سرکشی میں نہ بڑھتے۔ رجاء کے ایک معنے امید کے ہوتے ہیں لیکن اِس کے ایک معنے ڈر کے بھی ہوتے ہیں (اقرب) بلکہ بحرِ محیط والوں نے تو لکھا ہے کہ تہامہ کے علاقہ میں یہ لفظ صرف ڈر کے معنوں میں ہی استعمال ہوتا ہے (تفسیر بحرِ محیط جلد ۶ صفحہ ۵۰۰) اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ نیکیوں کے حصول میں اللہ تعالیٰ کی خشیت اور بعث بعد الموت کے عقیدے کا بھی بڑا دخل ہے اگر کسی کا دل اللہ تعالیٰ کے خوف سے خالی ہو جائے اور حیات بعد الموت کا ڈر اُس کے دل سے نکل جائے تو اُس کے اندر لامذہبیت اور سرکشی پیدا ہو جاتی ہے جو اس کے قدم کو ہدایت سے دُور لے جاتی ہے اور آخر اُسے جہنم میں پہنچا کر رہتی ہے۔

فرماتا ہے۔ یہی بے باکی اور سرکشی ہے جس کی بناء پر یہ لوگ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے برابر ہنسی اور مذاق کرتے چلے جاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ کیا اللہ تعالیٰ نے اس شخص کو اپنا رسول بنا کر بھیجا ہے؟ اگر رسول بنا کر بھیجنا تھا تو کسی اَور کو بھیجتا۔ مگر پھر جب وہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مقبولیت اور آپؐ کی کشش اور جاذبیت کو دیکھتے تو کہہ اُٹھتے کہ یہ جھوٹا تو ہے مگر ہے بڑا چالاک۔ کیونکہ قریب تھا کہ اگر ہم بھی صبر سے کام نہ لیتے یعنی اپنے عقائد پر مضبوطی سے نہ ڈٹے رہتے تو یہ ہمیں ہمارے معبودوں سے منحرف کر دیتا۔

اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دلائل میں اتنا زور تھا کہ بڑے بڑے کفار بھی محسوس کرتے تھے کہ اُن کے پاؤں کے نیچے سے زمین نکلی جا رہی ہے۔ اور اب بُتوں کی حقانیت ثابت کرنا اُن کے بس کا روگ نہیں رہا۔ مگر پھر کبر اُن کے راستہ میں حائل ہو جاتا اور وہ مخالفت پر کمربستہ ہو جاتے اور لوگوں سے کہتے کہ یہ بڑا چالاک ہے اِس کے پیچھے مت چلو۔ مگر فرماتا ہے جب اِن پر عذاب آئیگا تب اِنکو پتہ لگے گا کہ ہمارا رسول سچ کہتا تھا یا لوگوں کو دھوکا

ع ۴/۲

يَعْقِلُوْنَ ۭ اِنْ هُمْ اِلَّا كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ سَبِيْلًا (۴۵) ع

سمجھتے ہیں؟ وہ تو فقط جانوروں کی طرح ہیں بلکہ روّیہ کے لحاظ سے اُن سے بھی بدتر۔ ۱۹ـــه

دے رہا تھا۔ چنانچہ جس طرح موسیٰؑ اور نوحؑ اور ھودؑ اور صالحؑ اور لُوطؑ کی قومیں تباہ ہوئیں اسی طرح محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قوم کے ایک حصہ کو بھی مختلف جنگوں میں تباہ کر دیا گیا۔ اور جو باقی بچے وہ اُسی وقت اللہ تعالیٰ کے عذاب سے محفوظ ہوئے جب وہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لا کر خدا تعالیٰ کی پناہ میں آ گئے اور انہوں نے لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ کہنا شروع کر دیا۔

اَلْهَوٰى

۱۹ـــه حل لغات:- اَلْهَوٰى کے معنے ہیں۔ اَلْعِشْقُ يَكُوْنُ فِي الْخَيْرِ وَالشَّرِّ۔ کسی چیز کے حصول کی شدید تڑپ خواہ وہ چیز اچھی ہو یا بُری۔ اِرَادَةُ النَّفْسِ نفس کی خواہش۔ اَلْمَهْوِيُّ مَحْمُوْدًا كَانَ اَوْ مَذْمُوْمًا ثُمَّ غَلَبَ عَلٰى غَيْرِ الْمَحْمُوْدِ۔ مطلوب و مقصود خواہ وہ اچھا ہو یا بُرا۔ لیکن عام طور پر ھَوٰی کا لفظ ناپسندیدہ مقصد کے لئے بولا جاتا ہے۔ (اقرب)

تفسیر:- اس آیت کے متعلق مفسرین لکھتے ہیں کہ اس میں قلب واقعہ ہوا ہے۔ یعنی اِتَّخَذَ کا مفعولِ اوّل جو اِلٰهَهٗ ہے یہ دراصل مفعولِ ثانی ہے اور هَوَاهُ جو مفعولِ ثانی ہے یہ مفعولِ اوّل ہے اور اس کے معنے یہ ہیں کہ کیا تُو نے اُس شخص کو دیکھا جس نے اپنی خواہشاتِ نفسانی کو اپنا معبود بنا لیا ہے۔ ان معنوں کو مدّنظر رکھتے ہوئے اُن کے نزدیک اس آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ کفار کی یہ حالت ہے کہ جو کچھ اُن کا نفس انہیں کہتا ہے اُسکے پیچھے چل پڑتے ہیں۔ انہیں اس سے کوئی غرض نہیں کہ خدا اور اس کے رسول کے کیا احکام ہیں وہ صرف اپنی نفسانی خواہشات کے غلام ہیں۔ یعنی انہوں نے اپنی ہوا و ہوس کو ہی اپنا معبود بنایا ہوا ہے۔ لیکن میرے نزدیک یہاں قلب نہیں بلکہ اسی طرح کلام ہے اور اس کے معنے یہ ہیں کہ اے رسول! بتا تو سہی کہ جو شخص اپنے معبود کو اپنی خواہشات نفس کا درجہ دیتا ہو۔ یعنی جس طرح خواہشات پر انسان حکومت کرتا ہے اسی طرح وہ خدا پر حکومت کرنا چاہے تو ایسے شخص کو کون فائدہ پہنچا سکتا ہے۔ گویا اِتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ کا یہ مفہوم ہے۔ کہ انہوں نے اپنے معبود کو وہی مقام دیا ہے جو ھَوٰی کو دیا جاتا ہے۔ اور اِلٰهَهٗ کو ھَوٰی انہوں نے اس طرح بنا لیا کہ جس طرح ھَوٰی پر انسان اقتدار رکھتا ہے اور جو بات اُس کی عقل میں آتی ہے یا اس کو مفید سمجھتا ہے اُسے قبول کر لیتا ہے اور جس بات کو وہ مضر سمجھتا ہے اُسے ردّ کر دیتا ہے۔ اسی طرح یہ لوگ خدا تعالیٰ پر بھی حکومت کرنا چاہتے ہیں اور اپنے آپ کو اس کا کلّی طور پر تابع فرمان نہیں سمجھتے۔ بلکہ اگر خدا تعالیٰ کی کوئی بات اُن کی سمجھ میں نہ آئے تو وہ برملا کہہ دیتے ہیں کہ خواہ یہ بات خدا نے کہی ہو ہم اسے ماننے کے لئے تیار نہیں کیونکہ ہماری عقل اور سمجھ میں نہیں آتی۔

یہ ایک ایسا نقص ہے جس میں آجکل کے مغرب زدہ نوجوان بڑی کثرت سے مبتلا ہیں۔ وہ بجائے اس کے کہ خدا تعالیٰ کے احکام کے تابع چلیں اور اپنے دلوں میں اُنکی عظمت محسوس کریں وہ خدا تعالیٰ پر بھی اپنی حکومت جتاتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ وہ کوئی ایسا حکم دینے کا مجاز نہیں جسے وہ خود اپنے لئے مفید نہ سمجھتے ہوں۔ چنانچہ اس بارہ میں مجھے ایک لطیف مثال یاد آئی۔ ۱۹۴۷ء یا ۱۹۴۸ء میں میں پشاور گیا۔ وہاں ایک دوست نے میری دعوت کی

اَلَمْ تَرَ اِلٰى رَبِّكَ كَيْفَ مَدَّ الظِّلَّ ۚ وَلَوْ شَآءَ

(اے قرآن کے مخاطب) کیا تجھے معلوم نہیں کہ تیرے رب نے کس طرح سایہ کو لمبا کیا ہے۔ اور اگر وہ چاہتا تو

لَجَعَلَهٗ سَاكِنًا ۚ ثُمَّ جَعَلْنَا الشَّمْسَ عَلَيْهِ دَلِيْلًا ﴿۴۶﴾

اسے ایک جگہ ٹھہرا ہوا بنا دیتا۔ پھر ہم نے سورج کو اس پر ایک گواہ بنا دیا۔

ثُمَّ قَبَضْنٰهُ اِلَيْنَا قَبْضًا يَّسِيْرًا ﴿۴۷﴾

پھر ہم اس کو آہستہ آہستہ اپنی طرف کھینچنا شروع کرتے ہیں ۵۲۰

جس میں بعض غیر احمدی فوجی افسر بھی مدعو تھے۔ میں نے دوران گفتگو میں ایک آیت پیش کی۔ اس پر ایک بڑے فوجی افسر نے اعتراض کیا کہ یہ بات تو غلط ہے۔ میں نے کہا۔ پہلے آپ کو یہ فیصلہ کرنا چاہیئے کہ یہ آیت قرآن میں ہے یا نہیں۔ پھر یہ فیصلہ کرنا چاہیئے کہ قرآن خدا کا کلام ہے یا نہیں اور اس آیت سے یہی معنے نکلتے ہیں جو میں نے کئے ہیں یا اور معنے نکلتے ہیں۔ انہوں نے کہا۔ یہ آیت بھی قرآن میں ہے اور قرآن خدا تعالیٰ کا کلام بھی ہے اور معنے بھی اس کے وہی ہیں جو آپ نے کئے ہیں۔ اس پر میں نے کہا۔ تب یہ سوال نہیں کہ یہ آیت درست ہے یا نہیں۔ بلکہ سوال یہ رہ جاتا ہے کہ خدا زیادہ جانتا ہے یا آپ زیادہ جانتے ہیں۔ اس بات کو سنکر وہ خاموش ہوگئے اور ایک دو منٹ تک اُن کا چہرہ سُرخ رہا۔ اور خاموش بیٹھے رہے مگر چونکہ آدمی دیانتدار تھے وہ سچی بات کہنا پسند کرتے تھے اسلئے تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد انہوں نے سر اُٹھایا۔ اور کہنے لگے کہ معلوم تو ایسا ہی ہوتا ہے کہ میں خدا سے زیادہ جانتا ہوں۔ اس پر سب مجلس کے لوگ ہنس پڑے اور وہ آپ بھی شرمندہ ہوئے۔

غرض کئی لوگ خدا تعالیٰ کو بھی اپنا تابع قرار دیتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اُسے ہمارے ذاتی یا قومی یا سیاسی معاملات میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں۔ فرماتا ہے جو شخص اپنے سر میں یہاں تک ترقی کر جائے اور اپنے معبود کو وہی مقام دینا شروع کر دے جو ہوا و ہوس کو دیا جاتا ہے تو ایسے انسان کو کون فائدہ پہنچا سکتا ہے۔ فائدہ تو صرف ایسے لوگ ہی اُٹھاتے ہیں جو خدا تعالیٰ کو اپنا حاکم تصور کرتے اور انانیت کو ہر پہلو سے کچل دیتے ہیں۔ جب وہ ایسا کرتے ہیں تب اُن میں خدا تعالیٰ کا وہ نور ظاہر ہوتا ہے جو انہیں دوسرے لوگوں سے ممتاز کر دیتا ہے۔ پھر فرماتا ہے۔ تمہیں ظاہر میں تو یہی نظر آتا ہے کہ یہ لوگ بھی دین کی باتیں سُنتے اور سمجھتے ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ جانوروں کی طرح ہیں۔ بلکہ جانوروں سے بھی بدتر ہیں۔ کیونکہ جانور بھی اپنے محسن کی طرف رجوع کرتا ہے اور اپنے آقا اور مالک کا تابع فرمان رہتا ہے مگر یہ لوگ تو اپنے محسن کو چھوڑ کر بھاگے جا رہے ہیں اور اُس کی عظمت سے ان کے دل خالی ہو چکے ہیں۔ ایسے لوگوں نے خدا تعالیٰ کی رحمت اور اُس کے قرب سے کیا حصہ لینا ہے۔

۵۲۰ حل لغات:۔ دَلِیْلٌ۔ اَلدَّلِیْلُ کے معنے ہیں اَلْمُرْشِدُ۔ راستہ دکھانے والا۔ مَا بِهٖ يُسْتَدَلُّ الدلیل ماخذ۔ جس کے ذریعہ سے راہنمائی حاصل کی جاتی ہے۔ اردو میں نشان بھی کہتے ہیں (اقرب)

دَلِیْلٌ

تفسیر:۔ فرماتا ہے کیا تُو نے اپنے ربّ کے

اس احسان کو نہیں دیکھا کہ اُس نے کس طرح سائے کو لمبا کر دیا ہے۔ وَلَوْ شَآءَ لَجَعَلَهٗ سَاكِنًا اور اگر وہ چاہتا تو وہ اس کو ساکن بنا دیتا۔ ثُمَّ جَعَلْنَا الشَّمْسَ عَلَيْهِ دَلِيْلًا پھر ہم نے سورج کو اس پر ایک دلیل بنایا ہے۔

یہ آیت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت اور قرآن کریم کے منجانب اللہ ہونے پر ایک زبردست دلیل ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ جب سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا میں ظہور فرمایا ہے اُس وقت سے لے کر آج تک برابر آپؐ کا سایہ کسی نہ کسی شکل میں ممتد ہوتا چلا جاتا ہے۔ آپؐ کی زندگی میں ایک ساعت بھی تو ایسی نہیں آئی کہ آپؐ نے ترقی کی طرف قدم نہ اٹھایا ہو۔ پہلے ہی دن جب آپؐ پر الہام نازل ہوا اور آپؐ اس بات سے گھبرائے کہ یہ کام میں کیونکر سرانجام دے سکونگا۔ دلوں کو فتح کرنا کوئی معمولی بات نہیں تو آپ اُسی گھبراہٹ میں اپنے گھر تشریف لائے اور اپنی بیوی حضرت خدیجہؓ سے اِس خدشہ کا اظہار فرمایا کہ اتنی بڑی ذمہ داری خدا تعالیٰ نے مجھ پر ڈال دی ہے۔ اب میں کیا کروں۔ اس پر پہلا ہی جواب جو آپؐ کی بیوی نے آپ کو دیا وہ یہ تھا کہ كَلَّا وَاللّٰهِ لَا يُخْزِيْكَ اللّٰهُ اَبَدًا۔ آپ کسی قسم کا وہم اپنے دل میں پیدا نہ کریں۔ خدا کی قسم! اللہ تعالیٰ آپ کو کبھی ذلیل یعنی ناکام نہیں کرے گا۔ گویا جس وقت آپؐ نے اپنے خدشات کا اظہار فرمایا خدا تعالیٰ نے معًا آپؐ کے سایہ کو بڑھا دیا اور آپ کی بیوی آپؐ کے مذہب میں شامل ہوگئی۔

عورتیں بظاہر تردد کرنے والی اور متشکک طبیعت کی ہوتی ہیں مگر حضرت خدیجہؓ نے آپؐ کی بات کو سنتے ہی کہا کہ پہلا سایہ تو میں آپؐ کا بنتی ہوں۔ پس فرماتا ہے اَلَمْ تَرَ اِلٰى رَبِّكَ كَيْفَ مَدَّ الظِّلَّ۔ کیا دیکھتے نہیں کہ ہم کس طرح تیرے سایہ کو بڑھاتے چلے جاتے ہیں۔ پھر حضرت خدیجہؓ آپ کو ورقہ بن نوفل کے پاس لے گئیں۔ وہ عربوں میں سے یہودی اور اسرائیلی علوم کے ماہر تھے جب حضرت خدیجہؓ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اُن کے سامنے پیش کیا اور سارا واقعہ سُنایا تو انہوں نے کہا هٰذَا النَّامُوْسُ الَّذِيْ نَزَّلَ اللّٰهُ عَلٰى مُوْسٰى۔ (بخاری جلد ۱ باب کیف کان بدء الوحی) ان پر تو وہی فرشتہ اُترا ہے جو خدا تعالیٰ نے موسیٰؑ پر نازل کیا تھا۔ اس طرح ورقہ نے بھی بزبانِ حال کہا کہ میں بھی آپ کے سایہ میں شامل ہوتا ہوں۔ یہی حقیقت اللہ تعالیٰ اس آیت میں بیان فرماتا ہے کہ اَلَمْ تَرَ اِلٰى رَبِّكَ كَيْفَ مَدَّ الظِّلَّ تم دیکھتے نہیں کہ ہم تمہارے سایہ کو کس طرح بڑھاتے چلے جاتے ہیں۔ پہلے ہی دن جب آپؐ دوسرے آدمی کے پاس پہنچے تو آپؐ کا سایہ اور لمبا ہوگیا۔ پھر جب گھر میں آکر اس بات کا ذکر میاں بیوی نے کیا تو ایک آزاد کردہ غلام کھڑا ہوگیا اور اُس نے کہا۔ کہ مجھے بھی اپنے سایوں میں شامل کر لیجیئے۔ جوانی کے قریب پہنچے ہوئے علیؓ کھڑے ہوئے اور انہوں نے کہا کہ میں بھی آپ کا سایہ بنتا ہوں۔ آپؐ کے بچپن کے دوست حضرت ابوبکرؓ نے جب یہ واقعہ سُنا تو وہ دوڑتے ہوئے آئے اور انہوں نے کہا کہ یا رسول اللہ! میں بھی آپ پر ایمان لاتا ہوں۔ یہی وہ حقیقت ہے جو اس آیت میں بیان کی گئی ہے کہ اَلَمْ تَرَ اِلٰى رَبِّكَ كَيْفَ مَدَّ الظِّلَّ۔

دُنیا میں نبیوں کی مخالفتیں تو ہوا ہی کرتی ہیں اور آپ کی بھی سخت مخالفت ہوئی۔ لیکن رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق ہم دیکھتے ہیں کہ ابتدائی ایام میں ہی وہ لوگ جو آپؐ کے اردگرد رہتے تھے یا جن کی رائے کوئی اہمیت رکھتی تھی آپؐ کے ساتھ شامل ہوگئے۔ اور اس طرح آپؐ کا سایہ فوراً ہی ممتد ہوگیا۔ ایک دن بھی

تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایسا نہیں گذرا کہ آپ کا سایہ لمبا نہ ہوا ہو۔ یہ نہیں ہوا کہ آپ کے دعویٰ پر ایک دن گذر گیا ہو اور آپ کا کوئی تابع نہ ہوا ہو۔ دو دن گذر گئے ہوں اور آپ کا کوئی تابع نہ ہوا ہو۔ یا مہینہ دو مہینے گذر گئے ہوں اور آپ کا کوئی تابع نہ ہوا ہو۔ بلکہ پہلے ہی دن جب آپ اللہ تعالیٰ کے الہام کا ذکر فرماتے ہیں تو فوراً آپ کا سایہ لمبا ہو جاتا ہے۔ اور حضرت خدیجہؓ آپ پر ایمان لے آتی ہیں۔ پھر اُسی دن جب آپؐ چل کر باہر ورقہ بن نوفل کے پاس پہنچتے ہیں تو ورقہ بن نوفل آپؐ پر ایمان لے آتا ہے۔ گھر میں آپ نے بات کی تو حضرت علیؓ اور زیدؓ ایمان لے آئے۔ اور پھر اُسی شام یا دوسری شام حضرت ابوبکرؓ بھی آپ پر ایمان لانے والوں میں شامل ہو گئے۔ گویا نہ صرف خدا تعالیٰ نے فوراً آپؐ کا سایہ پیدا کر دیا بلکہ وہ اس سایہ کو لمبا کرتا چلا گیا۔ پھر بڑھتے بڑھتے اور بھی کئی جماعتیں اس سایہ میں شامل ہونی شروع ہوئیں۔ مدینہ میں خبر پہنچی تو وہاں کے کئی افراد دوڑتے ہوئے آئے اور آپ پر ایمان لے آئے۔ حبشہ میں مسلمان گئے تو نجاشی نے اسلام قبول کر لیا۔ غرض قدم قدم پر آپؐ کا سایہ بڑھتا اور ترقی کرتا چلا گیا۔

پھر فرماتا ہے۔ وَلَوْ شَآءَ لَجَعَلَهٗ سَاكِنًا اگر خدا تعالیٰ کی تائید اور اُس کی نصرت تیرے شامل حال نہ ہوتی اور تُو خدا تعالیٰ کا سچا رسول نہ ہوتا تو چاہیئے تھا کہ تیرے سایہ کو بڑھانے اور اس کو ترقی دینے کی بجائے خدا تعالیٰ تیرے سایہ کو چھوٹا کر دیتا۔ پس کیا تُو خدا تعالیٰ کی اس مدد کو نہیں دیکھتا کہ وہ تیرے سایہ کو لمبا کرتا چلا جاتا ہے اور کیا تیرے منکروں اور دشمنوں کو یہ دکھائی نہیں دیتا کہ ہم کس طرح تیرے سایہ کو لمبا کرتے چلے جا رہے ہیں۔ پھر بعض سائے ایسے ہوتے ہیں جو اتفاقی حادثہ کے رنگ میں ظاہر ہوتے ہیں اور گو وہ سائے بھی بڑھتے اور ترقی کرتے ہیں لیکن جسقدر وہ سائے ممتد ہوتے چلے جاتے ہیں صاف ظاہر ہوتا جاتا ہے کہ دنیوی ذرائع اور مادی سامان ان کو لمبا کرنے میں کام کر رہے ہیں۔ الٰہی تائید اور نصرت کا اُن میں ہاتھ نہیں۔ مگر فرماتا ہے ثُمَّ جَعَلْنَا الشَّمْسَ عَلَيْهِ دَلِيْلًا تمہارا سایہ صرف لمبا ہی نہیں ہوا بلکہ ہم سورج کو بھی اس پر دلیل بنا رہے ہیں۔ یعنی ہر شخص کو نظر آ رہا ہے کہ یہ سایہ مصنوعی ذرائع سے پیدا نہیں ہوا۔ دنیا میں سایہ لیمپوں سے بھی بنایا جا سکتا ہے۔ ایک درخت کے پیچھے لمپ رکھ دو تو اس کا سایہ بن جائیگا۔ موم بتی جلا دو تب بھی سایہ بن جائیگا۔ مگر موم بتی اور لیمپ خدائی ذرائع نہیں انسانی ذرائع ہیں لیکن سورج ایک ایسی چیز ہے جو محض خدائی ذریعہ ہے۔ پس فرماتا ہے ثُمَّ جَعَلْنَا الشَّمْسَ عَلَيْهِ دَلِيْلًا۔ تیری ترقی الٰہی سامانوں اور نصرتوں کی وجہ سے ہے نہ کہ انسانی سامانوں اور مادی ذرائع کی وجہ سے۔ کیا دشمن اس بات کو دیکھتا نہیں کہ ایک طرف تیری ترقی پر ترقی ہو رہی ہے اور دوسری طرف تیری ترقی مادی سامانوں اور انسانی ہاتھوں سے نہیں بلکہ خدائی ہاتھ تجھ کو بڑھاتا چلا جا رہا ہے۔ یہ ثبوت ہے اس بات کا کہ تُو ہمارا سچا رسول ہے۔ اس کے بعد فرماتا ہے کہ ہم اس سایہ کو کھینچ لیں گے اور تین سو سال بعد اسلام پر رات آنے لگے گی۔ مگر اس کے بعد پھر دن چڑھیگا جس کی وَجَعَلَ النَّهَارَ نُشُوْرًا میں خبر دی گئی ہے۔ اور مسلمان سورج کے نئے طلوع کے ذریعہ سے بیدار ہونے لگیں گے۔ اس آیت کے ماتحت ہم دیکھتے ہیں کہ اس زمانہ میں احمدیت بھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک سایہ ہے۔ ہر شخص جو احمدیت میں داخل ہوتا ہے اور ہر شخص جو حضرت مسیح موعود علیہ السلام پر ایمان لاتا ہے وہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے

سایہ کو اَور زیادہ ممتد کر دیتا ہے۔ اِسی طرح ہر تائیدِ سماوی اور ہر الٰہی نصرت جو ہمیں حاصل ہوتی ہے وہ صاف طور پر اِس حقیقت کو واضح کر رہی ہے کہ ثُمَّ جَعَلْنَا الشَّمْسَ عَلَيْهِ دَلِيْلًا ۔ یہ سب کچھ خدائی نصرت اور تائید سے ہو رہا ہے۔ انسانی سامانوں سے نہیں ہو رہا۔ آخر وہ کونسی چیز ہے جس میں حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے دنیا کی اتباع کی ہے۔ یا کونسا مسئلہ ہے جس کے متعلق رائج الوقت خیالات کی اصلاح کرنے کی آپ نے کوشش نہیں کی۔ بیسیوں مسائل ہیں جن کے متعلق قرآنی تعلیم کی تشریح کرتے ہوئے آپ نے موجودہ زمانہ کی رَو کے بالکل خلاف اپنے خیالات کا اظہار فرمایا ہے۔ اور لوگوں کے پیچھے چلنے کی بجائے دنیا کو اپنے پیچھے چلایا ہے۔ موجودہ زمانہ میں اقتصادیات کی طرف لوگوں کا بہت بڑا رجحان ہے۔ چنانچہ کئی لوگ کہا کرتے ہیں کہ مذاہب کی آپس کی جنگ درحقیقت یونہی ہے اصل جھگڑا روٹی کا ہے اِس جھگڑے کا فیصلہ ہو جائے تو مذاہب کی جنگ بالکل ختم ہو جائے لیکن حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے انشورنس اور سود کو منع کر کے بظاہر لوگوں کے لئے روٹی کے سامان بالکل بند کر دیئے ہیں۔ اگر دنیا میں روٹی کا ہی جھگڑا ہوتا تو چاہیئے تھا کہ اس تعلیم کی وجہ سے لوگ حضرت مرزا صاحب سے دُور بھاگتے اور کہتے کہ یہ شخص ہماری روٹی بند کرتا ہے۔ ہمیں سود سے منع کرتا ہے ہمیں انشورنس سے روکتا ہے۔ ہمیں ہر قسم کی ٹھگیوں اور دھوکا بازیوں سے مجتنب رہنے کی تعلیم دیتا ہے اور یہ چیز ایسی ہے جسے ہم برداشت نہیں کر سکتے۔ مگر ہوا یہ کہ اس تعلیم کے باوجود لاکھوں لوگ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی طرف کھنچے چلے آئے۔

دوسرے نمبر پر یہ زمانہ مذہبی آزادی کا ہے مسلمانوں کے قدیم سے قدیم خاندان بھی اسلامی ثقافت کو چھوڑتے چلے جاتے ہیں اور مذہب کے خلاف دنیا میں ایک عام رَو چل رہی ہے لیکن حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنے متبعین کو مذہب کی طرف توجہ دلائی۔ چنانچہ خدا تعالیٰ کے فضل سے باوجود اس کے کہ ہماری جماعت میں دوسروں سے زیادہ تعلیم ہے پھر بھی وہ لوگ مذہب کی طرف دوسروں سے زیادہ توجہ کر رہے ہیں اور جماعت کے لیڈر اُن کو اِس میں زیادہ سے زیادہ پختہ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

پھر یہ زمانہ سٹرائیکوں کا ہے۔ جتھے بنا بنا کر حکومتوں کے خلاف کھڑے ہو جانا یا مالکوں اور کارخانہ داروں اور اُستادوں وغیرہ سے اپنے مطالبات منوانے کے لئے سٹرائیک کر دینا ایک عام بات ہے۔ اور اسے اپنے مطالبات منوانے کے لئے ایک ضروری حربہ تصوّر کیا جاتا ہے۔ لیکن حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے سٹرائیک سے بھی منع فرما دیا۔ مگر باوجود اس کے ہماری جماعت میں کثرت سے طلباء اور گورنمنٹ سروس کے نوجوان داخل ہوتے ہیں۔ حالانکہ سٹرائیکوں میں طلباء اور نوجوانوں کا ہی زیادہ تر دخل ہوتا ہے۔ اِسی طرح مزدور پیشہ لوگ بھی ہماری جماعت میں داخل ہوتے ہیں۔ حالانکہ بظاہر اُن کے مفاد کے خلاف حکم دیا گیا تھا۔

غرض فرماتا ہے ثُمَّ جَعَلْنَا الشَّمْسَ عَلَيْهِ دَلِيْلًا تمہاری ترقیات جسقدر ہونگی انسانی تدابیر سے باہر ہونگی اس کا یہ مطلب نہیں کہ مادی تدابیر نہیں کی جائیں گی بلکہ مطلب یہ ہے کہ مادی تدابیر کے سامان بھی خدا تعالیٰ خود مہیا کرے گا تم نہیں کرو گے۔

پس محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا تعالیٰ نے ایک سایہ دار درخت بنایا ہے جو قرآن کریم کی اس پیشگوئی کے ماتحت کہ اَلَمْ تَرَ اِلٰى رَبِّكَ كَيْفَ مَدَّ الظِّلَّ دنیا میں روز بروز بڑھتا چلا جائے گا۔

اگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خدا تعالیٰ کی طرف سے نہ ہوتے
تو کیا خدا تعالیٰ میں یہ طاقت نہیں تھی کہ وہ اس کو ساکن
کر دیتا۔ اگر اس سایہ کے بڑھانے میں انسانی تدابیر کام کر
رہی ہوتیں خدا تعالیٰ کا اس سلسلہ میں کوئی دخل نہیں تھا
تو چاہیئے تھا کہ خدا تعالیٰ اس کو ترقی سے محروم کر دیتا۔ مگر
فرماتا ہے۔ بجائے اس کے کہ وہ اس کو ساکن کرتا۔ وہ
اس پر دلیل بن گیا ہے اور اپنی نصرتوں اور تائیدات سے
اس کو بڑھاتا چلا جا رہا ہے۔ اور جس سلسلہ کو خدا تعالیٰ
مٹاتا نہیں بلکہ بڑھا رہا ہے اُس کے سچا اور خدائی ہونے
میں کیا شبہ ہو سکتا ہے۔

رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے جب مکہ فتح کیا
تو جن شدید ترین دشمنوں نے مسلمانوں کو قتل کیا تھا۔ یا
جنہوں نے مسلمان شہداء کی ہتک کی تھی یا جنہوں نے
انگیخت کر کے مسلمانوں کو شہید کیا تھا یا شہید کروایا تھا
اُن میں سے بعض افراد کے متعلق اس موقعہ پر رسول کریم
صلے اللہ علیہ وسلم نے یہ حکم دے دیا کہ وہ جہاں بھی مل
جائیں اُن کو قتل کر دیا جائے۔ انہی میں سے ایک ہندہ
بھی تھی۔ جب اُسے معلوم ہوا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم
نے مجھے قتل کرنے کا حکم دیدیا ہے تو وہ عورتوں میں چھپی چھپی
آپ کے پاس پہنچ گئی۔ جب عورتوں کی بیعت ہونے لگی
تو وہ بھی اُن عورتوں کے ساتھ مل کر الفاظ بیعت دوہراتی
چلی گئی۔ یہاں تک کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا
تم اقرار کرو کہ ہم شرک نہیں کریں گی۔ اُس وقت ہندہ اپنی
جوشیلی فطرت کے ابھار کو روک نہ سکی اور جھٹ بول اُٹھی
کہ یا رسول اللہ کیا اب بھی ہم شرک کریں گی؟ آپ اکیلے تھے
اور ہم ایک زبردست قوم تھے۔ آپ اکیلے نے توحید کی آواز
بلند کی اور ہماری ساری قوم نے ملکر آپ کے مقابلہ میں بتوں
کی عظمت قائم کرنے کا تہیّہ کیا۔ ہمارا اور آپ کا مقابلہ
ہوا۔ اور اس مقابلہ میں ہم نے اپنا سارا زور صرف کر دیا مگر
اس کے باوجود ہم گھٹتے چلے گئے اور آپ بڑھتے چلے گئے۔ ہم
ہارتے چلے گئے اور آپ جیتتے چلے گئے۔ اگر ہمارے بتوں
میں کچھ بھی طاقت ہوتی تو کیا یہ ہو سکتا تھا کہ آپ
ہمارے مقابلہ میں جیت جاتے۔ آپ کا ہمارے مقابلہ میں
اکیلے ہوتے ہوئے جیت جانا ثبوت ہے اس بات کا کہ
ہمارے بُت بالکل بیکار ہیں اور خدائے واحد کی ہی اس
دنیا پر حکومت ہے جس نے آپ کی مدد کی اور ہم سب کو
آپ کے مقابلہ میں شکست دی۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم
نے فرمایا۔ ہندہ ہے؟ ہندہ بھی جانتی تھی کہ اسلام کی
حکومت صرف مجھ پر ہی نہیں بلکہ خود محمد رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم پر بھی ہے۔ اُس نے کہا۔ ہاں ہندہ ہوں۔ مگر
مسلمان ہندہ۔ اب آپ کا وہ زور مجھ پر نہیں چل سکتا جو
پہلے چل سکتا تھا۔ کیونکہ اسلام سب گناہوں کو مٹا دیتا ہے۔
تو الٰہی مدد کا ہونا ثبوت ہوتا ہے اس بات کا کہ وہ شخص
راستباز ہے۔ اور الٰہی مدد کا ثبوت یہ ہوتا ہے کہ
باوجود دنیوی مخالفت کے ایک قوم بڑھتی چلی جاتی ہے اور
کوئی روک اُس کی ترقی میں حائل نہیں ہو سکتی کیونکہ اللہ
تعالیٰ مومن قوم کی پُشت پر آ جاتا ہے اور اس کے سایہ
یعنی تصرف کو لمبا کر دیتا ہے۔ اور اگر وہ ایسا نہ کرتا تو
سایہ ایک جگہ ٹکا رہتا۔ یعنی مومن دنیا میں کوئی ترقی نہ
کرتے۔ پھر جس طرح سورج کے مقام کو دیکھ کر پتہ لگ
جاتا ہے کہ سایہ کدھر جائیگا۔ اِسی طرح خدا تعالیٰ کی
تائیدات کو دیکھ کر یہ پتہ لگایا جا سکتا ہے کہ کونسی قوم
ترقی کرے گی۔ ہاں یہ الٰہی مدد ہمیشہ ایک سی نہیں رہتی۔
ایک مدت کے بعد جب قوم خراب ہو جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ
اُس کی پُشت پناہی چھوڑ دیتا ہے اور وہ سایہ غائب
ہو جاتا ہے۔ پس کوشش کرو کہ تمہارا خدا تمہیں اور تمہاری
اولادوں کو محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا ممد سایہ
بنا دے اور تمہیں ایسی توفیق عطا فرمائے کہ تم محمد رسول اللہ

وَهُوَ الَّذِىْ جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ لِبَاسًا وَّ النَّوْمَ سُبَاتًا

اور وہی (خدا) ہے جس نے رات کو تمہارے لئے لباس بنایا اور نیند کو آرام کا موجب

وَّجَعَلَ النَّهَارَ نُشُوْرًا ﴿۴۸﴾ وَهُوَ الَّذِىْٓ اَرْسَلَ الرِّيٰحَ

اور دن کو پھیلنے اور ترقی کا ذریعہ ۵۲۱ اور وہ (خدا) ہی ہے جس نے ہواؤں کو اپنی رحمت سے

بُشْرًاۢ بَيْنَ يَدَىْ رَحْمَتِهٖ ۚ وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ

پہلے بشارت دینے کے لئے بھیجا۔ اور ہم نے بادل سے پاک (و صاف)

صلی اللہ علیہ وسلم کے سایہ کو ہمیشہ قائم رکھنے اور اُس کو آگے سے آگے بڑھانے کا موجب بنو۔ تاکہ شمس والی لیل ہمیشہ قائم رہے اور تمہارے لئے الٰہی نصرتیں ظاہر ہوتی رہیں اور انسانی تدابیر تمہارے مقابلہ میں ہمیشہ ناکام رہیں۔

۵۲۱ حل لغات :۔ اَلسُّبَاتُ کے معنے ہیں اَلدَّهْرُ۔ زمانہ۔ نیز اس کے معنے ہیں اَلنَّوْمُ۔ نیند۔ وَقِيْلَ اِبْتِدَاءُهٗ فِى الرَّاْسِ حَتّٰى يَبْلُغَ الْقَلْبَ یعنی بعض ماہرین لغت کہتے ہیں کہ سبات کا لفظ نیند کی ابتدائی حالت کے متعلق استعمال کرتے ہیں جبکہ وہ دماغ پر حاوی ہوکر سارے جسم پر مستولی ہو جاتی ہے۔ وَقِيْلَ اَصْلُهٗ اَلرَّاحَةُ۔ اور بعض ماہرین لغت یہ کہتے ہیں کہ سبات کے اصل معنے راحت اور آرام کے ہیں (اقرب)

اَلسُّبَاتُ

تفسیر :۔ اس میں بتایا کہ رات اور دن کا تسلسل اور انسانی نیند بھی خدا تعالیٰ کے احسانات کا ایک ظہور ہیں۔ رات تو انسان کے لئے لباس کا کام دیتی ہے۔ اور اُس کے بہت سے عیوب کو ڈھانپ لیتی ہے چنانچہ سوتے وقت کی کئی حالتیں ایسی ہوتی ہیں جو اگر دن کے وقت ظاہر ہوں تو لوگوں کو بہت معیوب دکھائی دیں۔ مگر رات کی تاریکی کی وجہ سے وہ دوسروں کی نظر سے اوجھل رہتی ہیں۔ کیونکہ وہ خود بھی اُس وقت سو رہے ہوتے ہیں۔ اور اِس طرح انسان کے کئی نقائص پر پردہ پڑا رہتا ہے۔ اِسی طرح نیند انسانی راحت اور آرام کا موجب بنتی ہے۔ اور جسم نئے سرے سے طاقتیں حاصل کر لیتا ہے۔ اگر نیند نہ آئے تو انسان چند دنوں میں ہی پاگل ہو جائے یہ نیند ہی ہے جس کی وجہ سے انسان کی تمام طاقتیں برقرار رہتی ہیں اور وہ ہر صبح تازہ دم ہو کر اپنا کام شروع کر دیتا ہے۔

پھر فرماتا ہے وَجَعَلَ النَّهَارَ نُشُوْرًا اُس نے دن کو انسانوں کے اِدھر اُدھر پھیلانے کا ذریعہ بنایا ہے۔ چنانچہ وہ اس کی روشنی میں چاروں طرف دوڑے پھرتے اور اپنی معیشت کا سامان مہیا کرتے ہیں۔ یہی رات اور دن کا تسلسل ہمیں قومی زندگی میں بھی دکھائی دیتا ہے۔ کبھی قوموں پر لیل کا زمانہ آتا ہے اور کبھی نہار کا۔ زمانۂ لیل میں اُن کے تمام عیوب مخفی رہتے ہیں لیکن جب خدا تعالیٰ کا کوئی مامور اور مصلح کھڑا ہوتا ہے اور اسکے ذریعہ ایک نیا دن چڑھتا ہے تو صرف دوسرے لوگوں کو ہی اُن کے عیوب نظر نہیں آتے بلکہ خود انہیں بھی اپنی خامیاں محسوس ہونے لگتی ہیں اور اُن کے اندر اصلاح کا ایک نیا جذبہ پیدا ہونے لگتا ہے۔ اور

مَآءً طَهُوْرًا ﴿۴۹﴾ لِّنُحْیِۦَ بِهٖ بَلْدَةً مَّیْتًا وَّ نُسْقِیَهٗ

پانی اُتارا ہے ۔ تاکہ اس کے ذریعہ سے مُردہ ملک کو زندہ کریں اور اسی طرح اُس (پانی) میں

مِمَّا خَلَقْنَآ اَنْعَامًا وَّ اَنَاسِیَّ كَثِیْرًا ﴿۵۰﴾ وَلَقَدْ صَرَّفْنٰهُ

اپنے پیدا کئے ہوئے چار پایوں اور بہت سے انسانوں کو سیراب کریں ۔ اور ہم نے اُس (پانی) کو اُن (یعنی انسانوں)

بَیْنَهُمْ لِیَذَّكَّرُوْا ۖ فَاَبٰۤی اَكْثَرُ النَّاسِ اِلَّا كُفُوْرًا ﴿۵۱﴾

میں خوب پھیلا دیا تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں ۔ لیکن لوگوں میں سے اکثر لوگ کفر کے سوا کسی بات پر راضی نہیں ہوتے ۔

وَلَوْ شِئْنَا لَبَعَثْنَا فِیْ كُلِّ قَرْیَةٍ نَّذِیْرًا ﴿۵۲﴾ ۖ

اور اگر ہم چاہتے تو ہر بستی میں ایک ہوشیار کرنے والا (نبی یا مامور) بھیج دیتے ۔

فَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِیْنَ وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِیْرًا ﴿۵۳﴾

پس تُو کافروں کی بات نہ مان ۔ اور اِس (یعنی قرآن) کے ذریعہ سے ان سے بڑا جہاد کر ۲۲ ع

رفتہ رفتہ وہ بھی ترقی کر جاتے ہیں ۔

ع ۲۲ **تفسیر**:۔ فرماتا ہے وہ خدا ہی ہے جو بارشوں سے پہلے لوگوں کو بشارت دینے کے لئے ہوائیں بھیجتا ہے اور بادلوں سے پاک کرنے والا پانی نازل کرتا ہے ۔ جس کے نتیجہ میں مُردہ بستیاں بھی زندہ ہو جاتی ہیں ۔ اور ہم اس پاکیزہ پانی سے جانوروں اور بہت سے انسانوں کو سیراب کرتے ہیں ۔ اور یہ سب نصیحت کی باتیں ہیں جن کو ہم انسانوں کے سامنے رکھتے ہیں تاکہ وہ ہدایت حاصل کریں ۔ یعنی جسمانی پانی کو دیکھ کر وہ سمجھ لیں کہ خدا تعالیٰ نے رُوحانی پانی بھی اُتارا ہوگا ۔ لیکن لوگ جسمانی پانی کی تو قدر کرتے ہیں مگر روحانی پانی سے انکار کر دیتے ہیں ۔ اور اگر ہم چاہتے تو ہر بستی میں اپنا رسول بھیج دیتے مگر ہم رسول صرف ایک ہی بستی میں بھیجتے ہیں جہاں سے وہ سارے علاقہ میں تبلیغ کرتا ہے ۔ پس اے ہمارے رسول! تو کافروں کی بات نہ مان اور اس قرآن کے ذریعہ اُن سے جہادِ کبیر کر۔

اِن آیات میں کلام الٰہی سے تشبیہ دینے کے لئے پہلے پانی کا ذکر کیا گیا ہے ۔ اور بتایا گیا ہے کہ جس طرح جسمانی پانی کو لوگوں میں پھیلا دیتے ہیں اور مُردہ بستیوں کو اس کے ذریعہ زندہ کر دیتے ہیں ۔ اِسی طرح ہم نے قرآن کریم کو اُن کے سامنے پیش کر دیا ہے مگر اکثر لوگ کفرانِ نعمت کرتے ہیں وہ پانی کی نعمت تو قبول کر لیتے ہیں مگر کلامِ الٰہی کی نعمت جو اس سے بہت زیادہ بہتر ہے اُسے رد کر دیتے ہیں ۔ گویا وہ کوڑیوں پر تو جان دیتے ہیں مگر اشرفیاں قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتے اور یہ بالکل بچوں والی بات ہے ۔ میں ایک دفعہ بمبئی گیا ۔ تو وہاں اُن دنوں عدالت میں ایک تازہ کیس چل رہا تھا جو اس طرح ہوا کہ کسی جوہری کے ساتھ ہیرے جو کئی لاکھ روپیہ کی مالیت کے تھے کہیں گر گئے ۔ اُس نے

پولیس میں رپورٹ کردی۔ پولیس نے تحقیقات کرتے ہوئے ایک آدمی کو پکڑ لیا جس سے کچھ ہیرے بھی برآمد ہوگئے۔ جب اس سے پوچھا گیا کہ اُس نے یہ ہیرے کہاں سے لئے تھے تو اُس نے بتایا کہ مَیں بازار میں سے گذر رہا تھا کہ چند لڑکے ان ہیروں سے گولیاں کھیل رہے تھے۔ مَیں نے انہیں دو چار پیسے دیکر ہیرے لے لئے۔ بعد میں معلوم ہُوا کہ اُس جوہری نے کسی موقعہ پر اپنی جیب میں سے رومال نکالا تو یہ ہیرے جو ایک پڑیہ میں تھے اُس کے ساتھ ہی نکل کر زمین پر گر گئے۔ اور بچوں نے یہ سمجھا کہ یہ کھیلنے کی گولیاں ہیں حالانکہ وہ کئی لاکھ روپے کا مال تھا۔ یہی حال لوگوں کا ہے۔ وہ اُس پانی کی تو قدر کرینگے جو سڑ جاتا اور تھوڑے ہی عرصہ کے بعد ناکارہ ہوجاتا ہے۔ مگر جو پانی اُن کے اور اُن کی آئندہ نسلوں کے کام آنے والا ہے اور جو نہ صرف اِس زندگی میں بلکہ اگلے جہان میں بھی کام آتا اور انسان کی کایا پلٹ دیتا ہے اُس کو ردّ کر دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم اِس کو نہیں پیتے۔ لوگوں کی اِسی کیفیت کا اللہ تعالیٰ اِن زیرِ تفسیر آیات میں ذکر کرتا اور فرماتا ہے کہ فَاَبٰٓى اَكْثَرُ النَّاسِ اِلَّا كُفُوْرًا۔ اکثر لوگ ہماری اس عظیم الشان نعمت کا کفر ہی کرتے ہیں۔ حالانکہ اگر ہم چاہتے تو دنیا کی ہر بستی میں نذیر بھیج دیتے۔ یعنی اگر ہم لوگوں پر جلدی حجت تمام کرنا چاہتے تو بجائے اس کے کہ ایک رسول بھیجتے اور اُس کی تعلیم آہستہ آہستہ پھیلتی ہر بستی میں ایک ایک نذیر بھیجدیتے مگر ہم نے ایسا کیوں نہیں کیا اس لئے کہ اگر سب لوگ کفر کرتے تو دنیا کی تمام بستیوں پر یکدم عذاب آجاتا اور سب لوگ ہلاک ہو جاتے۔ مگر اب ایسا نہیں ہوتا بلکہ اب پہلے عرب پر اتمامِ حجت ہوتی ہے اور اُس پر عذاب آتا ہے۔ پھر کچھ اَور عرصہ گذرتا ہے تو ایران پر اتمامِ حجت کے بعد عذاب آجاتا ہے۔ اگر ہر بستی اور ہر گاؤں میں اللہ تعالیٰ کے نبی مبعوث ہوتے تو ہر بستی اور ہر گاؤں پر وہ عذاب نازل ہوتا جو اَب براہ راست ایک حصّۂ زمین کے مخالفوں پر نازل ہوتا ہے۔ پس فرماتا ہے تو اِن کافروں کی باتیں نہ مان۔ بلکہ قرآن کریم کے ذریعہ سب دنیا کے ساتھ جہاد کر جو سب سے بڑا جہاد ہے یعنی تبلیغ کا جہاد جس کے قریب جانے سے بھی آجکل کے مسلمان کا دم گھٹتا ہے۔ وہ اس جہاد سے تو اس بہانہ سے بھاگتا ہے کہ اصل جہاد تلوار کا ہے۔ اور تلوار کے جہاد سے اس لئے بھاگتا ہے کہ دشمن بہت طاقتور ہے مولوی فتویٰ دیتا ہے کہ اے مسلمانو! بڑھو اور لڑو۔ اور مسلمان کہتے ہیں کہ اے علمارِ کرام آپ آگے بڑھیں اور لڑیں کیونکہ آپ ہمارے لیڈر اور راہنما ہیں۔ اور پھر دونوں اپنے اپنے گھروں کی طرف بھاگتے ہیں۔ حالانکہ خدا نے ہمیں وہ تلوار دی ہے جسے کبھی زنگ نہیں لگ سکتا۔ اور جو کسی لڑائی میں بھی نہیں ٹوٹ سکتی۔ تیرہ سو سال گذر گئے اور دنیا کی سخت سے سخت قوموں نے چاہا کہ اس تلوار کو توڑ دیں۔ اِس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیں اور اِسے ہمیشہ کے لئے ناکارہ بنا دیں مگر یہ تلوار اُن سے نہ ٹوٹ سکی۔ یہ وہ قرآن ہے جو خدا نے ہم کو دیا ہے اور یہ وہ تلوار ہے جس سے ہم ساری دنیا کو فتح کر سکتے ہیں۔ فرماتا ہے جَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا۔ تلوار کا جہاد اور نفس کے ساتھ جہاد اور دوسرے اَور جہاد سب چھوٹے ہیں۔ صرف قرآن کا جہاد ہی ہے جو سب سے بڑا اور عظیم الشان جہاد ہے۔ یہ وہ تلوار ہے کہ جو شخص اس پر پڑے گا اس کا سر کاٹا جائیگا اور جس پر یہ پڑے گی وہ بھی مارا جائیگا یا اسلام کی غلامی اختیار کرکے زندہ جاوید ہو جائیگا۔ اگر تیرہ سو سال میں بھی ساری دنیا میں اسلام نہیں پھیلا تو اس کی وجہ یہ نہیں کہ یہ تلوار کُند تھی بلکہ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ مسلمانوں نے اِس تلوار سے کام لینا چھوڑ دیا۔ آج خدا نے پھر احمدیت کو یہ تلوار دے کر کھڑا کیا ہے اور پھر اپنے دین کو دنیا کے تمام ادیان پر غالب کرنے کا ارادہ کیا ہے۔ مگر کئی نادان

مسلمان احمدیت پر حملہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ احمدی جہاد کے قائل نہیں۔ اُن کی مثال بالکل ایسی ہی ہے جیسے کوئی شخص غلیلے لے کر قلعے پر حملہ کر رہا ہو تو یہ دیکھ کر کہ غلیلوں سے قلعہ کب فتح ہو سکتا ہے کچھ اَور لوگ توپ خانہ لے کر آ جائیں۔ مگر غلیلے چلانے والا بجائے اس کے کہ اُن کا شکریہ ادا کرے اُن پر اعتراض کرنا شروع کر دے کہ یہ لوگ غلیلے کیوں نہیں چلاتے یہ نادان بھی اپنی نادانی کی وجہ سے اُس شخص کو جہاد کا منکر قرار دیتے ہیں جس نے اسلام کو دنیا کے کونے کونے تک پہنچایا اور اپنے آپ کو صفِ اوّل کے مجاہدین میں شمار کرتے ہیں حالانکہ انہوں نے عمر بھر میں کسی ایک شخص کو بھی اسلام میں داخل نہیں کیا ہوتا۔ نہ انہیں قرآن کریم کا کوئی علم ہوتا ہے۔ وہ ہوش سنبھالنے سے لیکر بڈھے ہونے تک صرف اور نحو پڑھتے رہتے ہیں اور یہی دو علم پڑھ پڑھ کر اُن کے دماغ خالی ہو جاتے ہیں۔ انہوں نے ساری عمر کبھی قرآن کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا ہوتا۔ اور نہ اس کے مطالب اور معانی پر کبھی غور کیا ہوتا ہے مگر اعتراض وہ اُس شخص پر کرتے ہیں جس کے نام سے بھی عیسائی پادریوں کا خون خشک ہوتا ہے۔ اور جس کے ادنیٰ اور معمولی درجہ کے غلاموں سے بھی وہ بحث کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتے حقیقت یہ ہے کہ جس زمانہ میں حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے دعویٰ کیا مسلمانوں کی عملی سُستی اور بے چارگی حد سے بڑھی ہوئی تھی۔ عوام الناس کی قوتیں مفلوج ہو رہی تھیں اور خواص عیسائیت کے حملہ سے بچنے کے لئے اُسکی طرف صلح کا ہاتھ بڑھا رہے تھے۔ اسلام کے خلاف یا لوگ پس کی صفوں میں کھڑے اُن اسلامی عقائد کے لئے جنہیں یورپ ناقابلِ قبول سمجھتا تھا معذرتیں پیش کر رہے تھے۔ اُس وقت بانئ سلسلۂ احمدیہ نے اِن طریقوں کے خلاف احتجاج کیا۔ اُس وقت انہوں نے اپنی تنہا آواز کو دلیرانہ بلند کیا کہ اسلام کو معذرتوں کی ضرورت نہیں اُسکا ہر حکم حکمتوں سے پُر اور اُس کا ہر ارشاد صداقتوں سے معمور ہے۔ اگر یورپ کو اس کی خوبی نظر نہیں آتی تو یا وہ اندھا ہے۔ یا ہم شمع اُس کے قریب نہیں لے گئے۔ پس اسلام کی حفاظت کا ذریعہ معذرتیں نہیں بلکہ اسلام کی حقیقی تعلیم کو یورپ تک پہنچانا ہے۔

اُس وقت جبکہ یورپ کے اسلام لانے کا خیال بھی نہیں آ سکتا تھا حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے انگریزی میں اپنے مضامین ترجمہ کرا کے یورپ میں تقسیم کرائے۔ اور جب خدا تعالیٰ نے آپ کو جماعت عطا فرمائی تو آپ نے انہیں ہدایت کی کہ جہاد اسلام کا ایک اہم جزو ہے جو کسی وقت بھی چھوڑا نہیں جا سکتا جس طرح نماز اور روزہ اور حج اور زکوٰۃ اسلام کے ایسے احکام ہیں جن پر عمل کرنا ہر زمانہ میں ضروری ہے اسی طرح جہاد بھی ایسے اعمال میں سے ہے جن پر ہر زمانہ میں عمل کرنا ضروری ہے۔

پہلے علماء نے عام طور پر یہ لکھا ہے کہ نماز اور روزہ اور زکوٰۃ مقدم ہیں۔ اس کے بعد حج ہے اور پھر جہاد ہے۔ لیکن علامہ ابن رُشدؒ لکھتے ہیں کہ نماز اور روزہ اور زکوٰۃ کے بعد جہاد ہے اور پھر حج ہے۔ لیکن اگر غور کیا جائے تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ پہلے علماء کی بات زیادہ درست ہے کیونکہ جو شخص نماز اور روزہ اور حج اور زکوٰۃ کا پابند نہیں اُس کے اندر جہاد کی رُوح بھی پیدا نہیں ہو سکتی۔ اور جس کے اندر جہاد کی رُوح پیدا نہ ہو اُس نے جہاد کیا کرنا ہے۔ پس حقیقت یہی ہے کہ ہر مومن کے لئے نماز اور روزہ اور حج اور زکوٰۃ نہایت اہم چیزیں ہیں اور جب تک وہ ان کو پورا نہ کرے اس کے اندر اسلام کی رُوح پیدا نہیں ہو سکتی۔ اور اسلام کی رُوح پیدا ہونے کے بعد اُس کا فرض ہے کہ قرآن ہاتھ میں لے کر تمام غیر مسلم دنیا کے مقابلہ میں نکل کھڑا ہو۔ یہی وجہ،

کہ قرآن کریم نے جہاد کے متعلق انفرادی طور پر مسلمانوں کو
مخاطب کیا ہے نہ کہ جماعتی طور پر۔ اور ہر مسلمان پر
جہاد فرض کیا ہے۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ جہاد
سے مراد جہاد بالقرآن ہے جہاد بالسیف نہیں کیونکہ
جہاد بالسیف طاقت کے ساتھ ہو سکتا ہے اور طاقت
جتھے کے ساتھ ہو سکتی ہے لیکن اگر ایک فرد بھی ایمان
کامل رکھتا ہو تو اسلام اس کا فرض قرار دیتا ہے کہ وہ
قرآن کے ساتھ جہاد کے لئے نکل کھڑا ہو۔ باقی لوگ اس
کے ساتھ آہستہ آہستہ آملیں گے۔ مگر اُسے اُن کا انتظار
نہیں کرنا چاہیئے۔ جیسے حضرت مسیح موعود علیہ السلام
نے کیا۔ وہ اکیلے عیسائیوں اور پنڈتوں وغیرہ کے ساتھ
جہاد کے لئے نکل کھڑے ہوئے پھر آہستہ آہستہ اللہ
تعالیٰ نے آپ کو جماعت بھی عطا فرما دی۔

اسی طرح آپ نے لوگوں کو یہ بھی بتایا کہ اللہ تعالیٰ
نے جہاد کی دو صورتیں مقرر کی ہیں۔ ایک جنگ کے ایام کے لئے
اور ایک صلح کے ایام کے لئے۔ جب مسلمانوں پر کوئی قوم
اس وجہ سے حملہ آور ہو کہ کیوں انہوں نے اسلام قبول
کیا ہے اور انہیں بزور اسلام سے منحرف کرنا چاہے جیسا
کہ مکہ کے لوگوں نے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ
میں کیا۔ تو اس وقت اُن کے لئے یہ حکم ہے کہ تلوار کا
مقابلہ تلوار سے کریں۔ اور جب غیر مسلم لوگ تلوار کے
ذریعہ سے لوگوں کو اسلام میں داخل ہونے سے نہ روکیں
تو اُس وقت بھی جہاد کا سلسلہ ختم نہیں ہو جاتا۔ اُس
وقت دلیل اور تبلیغ کی تلوار چلانے کا مسلمانوں کو حکم ہے
تاکہ اسلام جس طرح جنگ کے ایام میں ترقی کرے صلح
کے ایام میں بھی ترقی کرے۔ اور دونوں زمانے اُس کی
روشنی پھیلانے کا موجب ہوں اور مسلمانوں کی قوت عملیہ
کمزور نہ ہو۔ مگر مسلمانوں کی عملی طاقتیں چونکہ مفلوج ہو
گئی تھیں اُن کے لیڈروں نے اس مسئلہ میں بھی حضرت
مسیح موعود علیہ السلام کی مخالفت کی اور چونکہ وہ کام نہیں
کرنا چاہتے تھے اور یہ اقرار بھی نہیں کرنا چاہتے تھے کہ وہ
کام سے جی چُراتے ہیں انہوں نے یہ عجیب چال چلی کہ
لوگوں میں شور مچانا شروع کر دیا کہ بانی سلسلہ احمدیہ
جہاد کے منکر ہیں۔ حالانکہ یہ سراسر بہتان اور جھوٹ تھا
بانی سلسلہ احمدیہ جہاد کے منکر نہیں تھے بلکہ اُن کا یہ
دعویٰ تھا کہ جہاد باقی ارکانِ اسلام کی طرح ہر زمانہ
میں ضروری ہے اور چونکہ تلوار کا جہاد ہر زمانہ میں نہیں
ہو سکتا اور چونکہ جماعت کا شکست ہو جانا اُس کی ہلاکت
کا موجب ہوتا ہے اس لئے اللہ تعالیٰ نے جہاد کی دو
قسمیں مقرر کی ہیں۔ جب تلوار سے اسلام پر حملہ ہو تو
تلوار کا جہاد فرض ہوتا ہے اور جب لوہے کی تلوار کا حملہ
ختم ہو تو قرآن کریم کی تلوار لے کر کافروں پر حملہ کرنا ہمارا
فرض ہے۔ غرض جہاد کسی وقت چھوڑا نہیں جا سکتا کبھی
مسلمانوں کو تلوار کے ذریعہ جہاد کرنا پڑیگا اور کبھی قرآن
کے ذریعہ۔ یہ ایک عجیب اور پُرلطف جنگ تھی کہ جو شخص
جہاد کے لئے مسلمانوں کو بُلا رہا تھا اور جہاد کو ہر زمانہ میں
فرض قرار دے رہا تھا اُسے تو جہاد کا منکر کہا جاتا ہے
اور جو لوگ نہ تلوار اُٹھاتے تھے اور نہ قرآن کریم کے ذریعہ
جہاد کرتے تھے انہیں جہاد کا ماننے والا قرار دیا جاتا تھا۔
مگر ہر عقلمند سمجھ سکتا ہے کہ اس جنگ سے سلسلہ احمدیہ کے
کے راستہ میں روکیں تو پیدا کی جا سکتی تھیں مگر اسلام کو کیا
فائدہ تھا۔ اسلام حضرت زین العابدینؓ کی طرح میدانِ کربلا
میں بے یار و مددگار پڑا تھا۔ مسلمان جہاد کی تائید کا
دعویٰ کرتے ہوئے اسلام کے لئے جہاد کرنے والوں کا مقابلہ
کر رہے تھے اور دشمنانِ اسلام کے لئے انہوں نے میدان
خالی چھوڑ رکھا تھا۔ مگر آج اسقدر لمبے عرصہ کے تجربہ
کے بعد سب دنیا دیکھ رہی ہے کہ عملی پروگرام جو بانی سلسلہ احمدیہ
نے تجویز کیا تھا وہی درست تھا۔ ستر سال تک شور مچانے

کے باوجود مسلمان آج تک تلوار کا جہاد نہیں کر سکے۔ کفر کا فتویٰ لگانے والے مولویوں میں سے کسی ایک کو بھی آج تک تلوار پکڑنے کی توفیق نہیں ملی۔ لیکن قرآن کریم کے ذریعہ جہاد کرنے والے احمدیوں کو خدا تعالےٰ نے ہر میدان میں فتح عطا فرمائی ہے۔ وہ لاکھوں آدمی اِن مولویوں کی مخالفت کے باوجود غیر مذاہب والوں سے چھین کر لے آئے ہیں اور یورپ اور امریکہ اور افریقہ میں ہزارہا آدمیوں کو جو پہلے ہمارے آقا اور مولیٰ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو گالیاں دیتے تھے حلقہ بگوشانِ اسلام بنا چکے ہیں۔ اور وہ جو ایک زمانہ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے شدید دشمن تھے آج آپ پر درود اور سلام بھیج رہے ہیں۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ تغیر جماعت احمدیہ کی تنظیم کا نتیجہ ہے لیکن سوال یہ ہے کہ یہ تنظیم ہم میں کیوں پیدا ہوئی اور کیوں دوسروں سے تنظیم کی توفیق چھین لی گئی۔ اِس کی وجہ یہی ہے کہ قوتِ عملیہ پیدا کرنے کا صحیح نسخہ استعمال نہیں کیا گیا۔ جس فوج کو مشق نہ کرائی جائے وہ وقت پر لڑ نہیں سکتی۔ جس قوم کو ہر وقت جہاد میں نہ لگایا جائے وہ خاص مواقع پر بھی جہاد نہیں کر سکتی۔ پس اس معاملہ میں بھی فتح حضرت مسیح موعود علیہ السلام کو ہی حاصل ہوئی۔ اور ثابت ہو گیا کہ جس نکتہ تک آپ کا دماغ پہنچا تھا دوسروں کا نہیں پہنچا۔ دنیا نے آپ کا مقابلہ کیا اور شکست کھائی۔ مگر آپ نے دنیا کے چیلنج کو قبول کیا اور فتح حاصل کی۔

اسجگہ یہ ذکر کر دینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے۔ کہ بانیٔ سلسلہ احمدیہ نے جہاد کے متعلق اپنے جس عقیدہ کا اعلان فرمایا ہے اُس میں بانیٔ سلسلہ احمدیہ منفرد نہیں بلکہ دیگر علماءِ اسلام بھی اِسی قسم کا مذہب رکھتے تھے۔ چنانچہ امام راغبؒ اصفہانی اپنی کتاب مفرداتِ راغب میں لکھتے ہیں:۔ "اَلْجِهَادُ ثَلَاثَةُ اَضْرُبٍ مُجَاهَدَةُ الْعَدُوِّ الظَّاهِرِ وَمُجَاهَدَةُ الشَّيْطَانِ وَمُجَاهَدَةُ النَّفْسِ" (مفرداتِ امام راغب صفحہ۱۰۱) یعنی جہاد تین قسم کا ہوتا ہے۔ ایک وہ جہاد ہے جو اُس کھلے دشمن سے کیا جائے جو مسلمانوں سے لڑائی کرے اور ایک وہ جہاد ہے جو شیطان سے کیا جائے اور ایک وہ جہاد ہے جو اپنے نفس سے کیا جائے۔

مولوی نذیر حسین صاحب دہلوی امیر جماعت اہلِ حدیث کے متعلق روایت ہے کہ انہوں نے بھی ۱۸۵۷ء کے غدر کو جس میں مسلمانوں نے انگریزوں کے خلاف تلوار چلائی تھی شرعی جہاد نہیں سمجھا بلکہ اس کو بے ایمانی، عہد شکنی و فساد و عناد خیال کر کے اُس میں شمولیت اور اُس کی معاونت کو معصیت قرار دیا (رسالہ اشاعۃ السنہ جلد۶ نمبر۱۰ صفحہ ۲۸۸)۔

سر سید احمد خان صاحب بھی لکھتے ہیں:۔ "مسلمانوں کا بہت زوروں سے آپس میں سازش اور مشورہ کرنا اِس ارادے سے کہ ہم باہم متفق ہو کر غیر مذہب کے لوگوں پر جہاد کریں اور اُن کی حکومت سے آزاد ہو جائیں نہایت بے بنیاد بات ہے جب کہ مسلمان ہماری گورنمنٹ کے مستامن تھے کسی طرح گورنمنٹ کی عملداری میں جہاد نہیں کر سکتے تھے۔ بیس تیس برس پیشتر ایک بہت بڑے نامی مولوی محمد اسمٰعیل صاحب نے ہندوستان میں جہاد کا وعظ کیا اور آدمیوں کو جہاد کی ترغیب دی۔ اُس وقت انہوں نے صاف بیان کیا کہ ہندوستان کے رہنے والے جو سرکار انگریزی کے امن میں رہتے ہیں ہندوستان میں جہاد نہیں کر سکتے۔ اِس لئے ہزاروں آدمی جہادی ہر ایک ضلع ہندوستان میں جمع ہوئے اور سرکار کی عملداری میں کسی طرح فساد نہیں کیا اور غربی سرحد پنجاب پر جا کر لڑائی کی"۔ (اسباب بغاوتِ ہند صفحہ۱۰۴ مصنفہ سر سید احمد خان)

علامہ رشید رضا صاحب اپنی تفسیر المنار جلد۱۰ مطبوعہ قاہرہ مصر صفحہ ۳۰۷ پر لکھتے ہیں:۔ "یوروپین لوگ اور مشرقی عیسائیوں میں سے اُن کے مقلد اور شاگرد یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ جہاد کے معنے یہ ہیں کہ مسلمان ہر

اُس شخص سے لڑے جو مسلمان نہیں۔ تاکہ اس کو مجبور کر کے اسلام میں داخل کیا جائے خواہ غیر مسلموں نے اُس پر زیادتی نہ کی ہو اور اُن سے کسی قسم کی دشمنی نہ کی ہو۔ اور اُسے پڑھنے والے تجھ پر ان دلیلوں سے جو ہم پہلے بیان کر چکے ہیں روشن ہو چکا ہوگا۔ اور ان دلیلوں سے جو ہم آئندہ بیان کریں گے تو بھی روشن ہو جائیگا کہ اسلام پر غیر مسلموں کا یہ الزام سراسر جھوٹ اور افتراء ہے۔" اسی طرح لکھتے ہیں:۔ "وہ تفصیل جو ہم نے اوپر لکھی ہے اس سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ جہاد بالسیف کے مسئلہ میں مسلمانوں کا اجماع صرف اس بات پر ہے کہ جب مسلمانوں پر کوئی قوم حملہ کرے تو اُسوقت یہ جہاد فرض ہوتا ہے۔ اور اُسوقت بھی اُسی صورت میں فرض ہوتا ہے جبکہ امام واجب الاطاعت جنگِ عام کا حکم دے۔ لیکن اگر وہ صرف کچھ لوگوں کو اس لڑائی کا حکم دے تو صرف انہی لوگوں پر یہ لڑائی فرض ہوگی باقی لوگوں پر فرض نہیں ہوگی۔" (تفسیر المنار جلد ۱۰ صفحہ ۳۰۹)

آجکل مودودی صاحب جہاد پر بہت زور دے رہے ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ علماء کے فتوٰی کے مطابق وہ کن لوگوں کو جہاد کی تلقین کر سکتے ہیں۔ اگر وہ واجب الاطاعت امام ہیں تو یقیناً اُن کا فتوٰی صرف مودودیوں کے لئے ہی قابلِ عمل ہو سکتا ہے دوسرے لوگوں کیلئے نہیں مگر کوئی مودودی بتائے کہ کتنے مودودی تلوار لیکر غیر مسلموں سے لڑ رہے ہیں۔ اور اگر کوئی مودودی بھی ایسا نہیں کر رہا تو اس کے معنے یہ ہیں کہ مودودیوں میں کوئی بھی صالح نہیں پس مودودیوں کو صالح جماعت کہنا نادانی اور حماقت ہے۔ جو جماعت اپنے امیر کی بات بھی نہیں مانتی اور قرآن کی بات بھی نہیں مانتی اُسے صالح کون کہہ سکتا ہے۔ اور جو امیر باوجود واجب الاطاعت ہونے کے اور جہاد کو ضروری سمجھنے کے اپنے پیروؤں کو جہاد کا حکم نہیں دیتا اُس امیر کو بھی کوئی صالح نہیں کہہ سکتا۔ غرض بانی سلسلہ احمدیہ نے جہاد کے متعلق وہی تعلیم دی ہے جو پچھلے علماء بھی تسلیم کرتے چلے آئے ہیں اور اگر آپ نے کسی جگہ اس کے متعلق نسخ یا حرام کا لفظ استعمال کیا ہے جیسا کہ آپ فرماتے ہیں ؎

دیں کے لئے حرام ہے اب جنگ اور قتال

تو اس کے معنے محض اتنے ہی ہیں کہ وہ جہاد جو اس زمانہ میں جائز نہیں وہ حرام ہے۔ یہ معنے نہیں کہ جہاد ہر صورت میں حرام ہے۔ یہ امر کہ جہاں کہیں حرام یا منسوخ کا لفظ بانیٔ سلسلہ احمدیہ نے لکھا ہے اس کے معنے حقیقی نسخ یعنی واقعی اور دائمی نسخ کے نہیں ہو سکتے اسی بات سے ثابت ہے کہ آپ اپنے آپ کو اُمتی کہتے ہیں اور اگر جہاد خدا اور اُس کے رسولؐ کا مقرر کیا ہُوا ہے تو کسی اُمتی کو کیا حق ہے کہ وہ خدا اور اُس کے رسولؐ کے کسی حکم کو منسوخ کرے۔ آپ نے اپنی کُتب میں بارہا یہ عقیدہ بیان فرمایا ہے کہ قرآن کریم ایک دائمی شریعت ہے جس کا ایک ایک لفظ قابلِ عمل ہے اور اُس کا کوئی حکم قیامت تک نہیں بدل سکتا چنانچہ آپ تحریر فرماتے ہیں:۔

"میری گردن اُس جُوئے کے نیچے ہے جو
قرآن شریف نے پیش کیا ہے اور کسی کو مجال
نہیں کہ ایک نقطہ یا ایک شعشہ قرآن شریف
کا منسوخ کر سکے۔"

(اخبار عام لاہور ۲۶ مئی ۱۹۰۸ء)

اور نسخ کے یہ محدود معنے کہ عارضی طور پر کسی شئے کو روک دیا جائے عربی زبان میں عام مستعمل ہیں۔ چنانچہ مفرداتِ راغب جیسی زبردست لُغتِ قرآن میں لکھا ہے کہ:۔ اَلنَّسْخُ اِزَالَةُ شَیْءٍ بِشَیْءٍ یَتَعَقَّبُهٗ کَنَسْخِ الشَّمْسِ الظِّلَّ وَالظِّلِّ الشَّمْسَ وَالشَّیْبِ الشَّبَابَ۔ یعنی نسخ کا لفظ سورج کیلئے بھی استعمال ہوتا ہے جبکہ وہ سائے کو دُور کر دیتا ہے اور سائے کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے۔

جبکہ وہ سورج کو چھپا دیتا ہے۔ اور بڑھاپے کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے جب کہ وہ جوانی کو دُور کر دیتا ہے یعنی کبھی تو نسخ عارضی ازالہ کے لئے استعمال کیا جاتا ہے جیسا کہ سورج کے سایہ کو مٹا دینے کے متعلق جو عارضی ہوتا ہے اور کبھی مستقل ازالہ کے لئے اس کا استعمال کیا جاتا ہے جیسے بڑھاپے کے جوانی کو مٹا دینے کے متعلق جو کہ مستقل ہوتا ہے۔ چونکہ قرآن کریم ایک دائمی شریعت ہے اسلئے اس کے کسی حکم کے متعلق نسخ کے لفظ کا استعمال صرف التواء کے معنوں میں ہی ہے جیسا کہ بانیٔ سلسلہ احمدیہ نے صاف لکھا ہے کہ ؎

"فرما چکا ہے سیّد کونین مصطفےٰ
عیسیٰ مسیح جنگوں کا کر دے گا التواء"

آپ کے اِس شعر سے پتہ لگتا ہے کہ آپ نے جو کچھ بھی اِس بارہ میں لکھا ہے وہ صرف التواء کے معنوں میں ہے مستقل طور پر اس حکم کو منسوخ کرنے کے معنوں میں نہیں۔ اور اس عارضی التواء کے متعلق بھی آپ نے یہی تشریح فرمائی ہے کہ جہاد کے التواء کے متعلق میں نہیں کہہ رہا بلکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا فرمایا ہے چنانچہ آپ کی ایک تحریر سے صاف ظاہر ہے کہ ہو سکتا ہے آئندہ کسی زمانہ میں مسلمانوں کے لئے تلوار کی جنگ کی بھی ضرورت پیدا ہو جائے۔ چنانچہ آپ تحریر فرماتے ہیں :-

"ممکن ہے اور بالکل ممکن ہے کہ کسی زمانہ میں کوئی ایسا مسیح بھی آجائے جس پر حدیثوں کے بعض ظاہری الفاظ صادق آ سکیں۔ کیونکہ یہ عاجز اِس دنیا کی حکومت اور بادشاہت کے ساتھ نہیں آیا درویشی اور غربت کے لباس میں آیا ہے اور جبکہ یہ حال ہے تو پھر علماء کے لئے اشکال ہی کیا ہے ممکن ہے کہ کسی وقت اُن کی یہ مُراد بھی پوری ہو جائے۔"

(ازالہ اوہام جلد اوّل طبع اوّل صفحہ ۲۰۰)

پس بانیٔ سلسلہ احمدیہ نے جہاد کے متعلق وہی تعلیم دی ہے جو قرآن کریم نے دی ہے۔ اور آپ کے زمانہ میں جس جہاد کو ملتوی کیا گیا ہے وہ جہاد بالسیف ہے کیونکہ موجودہ زمانہ میں وہ حالات نہیں ہیں جن میں جہاد بالسیف ضروری ہوتا ہے۔ لیکن جہاد بالسیف سے زیادہ تاکیدی حکم جہاد بالقرآن کا ہے جس میں آپ ساری عمر مشغول رہے اور جس کی طرف اس آیت میں توجہ دلاتے ہوئے اللہ تعالےٰ فرماتا ہے کہ جَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا یعنی قرآن کریم کے ساتھ تم غیر مسلموں کا مقابلہ کرو اور یہی بڑا جہاد ہے۔

چنانچہ اس آیت کے ماتحت تفسیر رُوح المعانی جلد ۶ صفحہ ۱۹۲ پر لکھا ہے۔ "اَیْ بِالْقُرْاٰنِ وَذٰلِكَ بِتِلَاوَةِ مَا فِيْهِ مِنَ الْبَرَاهِيْنِ وَالْقَوَارِعِ وَالزَّوَاجِرِ وَالْمَوَاعِظِ وَتَذْكِيْرِ اَحْوَالِ الْاُمَمِ الْمُكَذِّبَةِ فَاِنَّ دَعْوَةَ كُلِّ الْعَالَمِيْنَ عَلَى الْوَجْهِ الْمَذْكُوْرِ جِهَادٌ كَبِيْرٌ۔" یعنی اسجگہ جہاد سے مراد قرآن کریم کے ذریعہ جہاد کرنا ہے اور یہ اس طرح ہوتا ہے کہ قرآن کریم میں جو براہین اور کفر کے خلاف باتیں ہیں۔ اِسی طرح جن خلافِ اخلاق امور پر زجر کیا گیا ہے اور جو جو نصائح کی گئی ہیں اُن سب کو پڑھا جائے اور نبیوں کی منکر اُمتوں کے احوال بیان کر کر کے لوگوں کو نصیحت کی جائے کیونکہ دنیا کے تمام انسانوں کو اِسی طریق سے اسلام کی طرف بلانا ہی سب سے بڑا جہاد ہے۔

غرض جہاد کا لفظ جس کو عیسائیوں نے ہوّا سمجھ رکھا ہے اصل میں تبلیغ کا ہی ایک نام ہے۔ اور اصل جہاد تلوار کا جہاد نہیں بلکہ اصل جہاد وہ ہے جو قرآن کریم

وَهُوَ الَّذِیْ مَرَجَ الْبَحْرَیْنِ هٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ

اور وہی ہے جس نے دو سمندروں کو چلایا ہے - جن میں سے ایک تو بہت میٹھا ہے -

کے ذریعہ کیا جائے۔ یعنی جس جہاد میں دلائل استعمال کئے جائیں اور آسمانی نشانات و معجزات کے ذریعہ دلوں کو فتح کیا جائے۔ مگر افسوس کہ مسلمان صرف تلوار چلانے کا نام جہاد سمجھتے رہے جس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ جب انہیں غلبہ حاصل ہوگیا تو وہ مطمئن ہو کر بیٹھ گئے اور کفر دنیا میں موجود رہا۔ اگر مسلمان جہاد کی وہ تعریف جانتے جو حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے کی ہے۔ کہ جہاد ہر اُس فعل کا نام ہے جو نیکی اور تقوےٰ کے قیام کے لئے کیا جائے۔ اور جہاد جس طرح تلوار سے ہوتا ہے اُسی طرح اصلاحِ نفس سے بھی ہوتا ہے اور اسی طرح تبلیغ اسلام سے بھی ہوتا ہے اور اسی طرح مال و دولت کی قربانی سے بھی ہوتا ہے۔ اور ہر قسم کے جہاد کا الگ الگ موقعہ ہے تو آج کا روزِ بد انہیں نہ دیکھنا پڑتا۔ اگر مسلمان اس تعریف کو سمجھتے تو اسلام کے ظاہری غلبہ کے موقعہ پر وہ جہاد کے حکم کو ختم نہ سمجھتے بلکہ انہیں خیال رہتا کہ صرف ایک قسم کا جہاد ختم ہُوا ہے دوسری اقسام کے جہاد ابھی باقی ہیں۔ اور تبلیغ کا جہاد شروع کر دیتے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ نہ صرف اسلام مشرقی ممالک میں پھیل جاتا بلکہ یورپ بھی آج مسلمان ہوتا اور اس کی ترقی کے ساتھ ساتھ اسلام کو زوال نہ آتا۔

غرض حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے جہاد کے مواقع بتائے ہیں۔ آپ نے یہ نہیں فرمایا کہ تلوار کا جہاد دائمی طور پر ممنوع ہے بلکہ یہ فرمایا ہے کہ اس زمانہ میں شریعت کے مطابق کس جہاد کا موقع ہے اور خود بڑے زور سے اس جہاد کو شروع کر دیا اور تمام دنیا میں تبلیغ جاری کر دی۔ اگر تلوار کا جہاد ہی ضروری تھا تو سوال یہ ہے کہ کیا ہر مسلمان نے تلوار اُٹھا کر کفار کا مقابلہ کیا؟ اگر نہیں کیا تو احمدی تو خدا تعالیٰ کو یہ جواب دے دیں گے کہ ہمارے نزدیک یہ جہاد بالسیف کا وقت نہیں تھا اگر ہم نے غلطی کی تو ہماری غلطی اجتہادی تھی لیکن اُن کے مخالف مولوی کیا جواب دیں گے۔ کیا وہ یہ کہیں گے کہ اے خدا! جہاد کا تو وقت تھا اور ہم یقین رکھتے تھے کہ یہ جہاد کا وقت ہے اور ہم سمجھتے تھے کہ جہاد فرض ہوگیا ہے لیکن اے ہمارے خدا! ہم نے جہاد نہیں کیا۔ کیونکہ ہمارے دل ڈرتے تھے۔ اور نہ ہم نے اُن لوگوں کو جہاد کیلئے آگے بھجوایا جنکے دل نہیں ڈرتے تھے کیونکہ ہم ڈرتے تھے کہ ایسا کرنے سے بھی کفار ہم کو پکڑ لینگے۔ اب اِس امر کا فیصلہ ہر منصف مزاج انسان خود کر سکتا ہے اور سمجھ سکتا ہے کہ ان دونوں جوابوں میں سے کونسا جواب خدا تعالیٰ کے نزدیک قابلِ قبول ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ بانیٔ سلسلہ احمدیہ نے جہاد کی اِس تعریف سے نہ صرف آئندہ کے لیے مسلمانوں کو بیدار کر دیا اور اُن کے لئے ترقی کا ایک عظیم الشان راستہ کھول دیا بلکہ مسلمانوں کو ایک بہت بڑے گناہ سے بھی بچا لیا ہے۔ کیونکہ گو مسلمان یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ یہ زمانہ تلوار کے جہاد کا ہے لیکن اُسے فرض سمجھ کر اس پر عمل نہیں کرتے تھے اور اس طرح اِس احساسِ گناہ کی وجہ سے گنہگار بن رہے تھے۔ اب آپ کی تشریح کو جُوں جُوں مسلمان تسلیم کرتے جائینگے اُنکے دلوں پر سے احساسِ گناہ کا زنگ اُترتا جائے گا اور وہ محسوس کرینگے کہ انہوں نے تلوار کا جہاد نہ کرکے خدا اور اُس کے رسول سے غدّاری نہیں کی اور یہ کہ بانیٔ سلسلہ احمدیہ نے انہیں تبلیغ کی طرف توجہ دلا کر اُن پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔

وَّ هٰذَا مِلْحٌ اُجَاجٌ ۚ وَجَعَلَ بَیْنَهُمَا بَرْزَخًا

اور دوسرا نمکین (اور) کڑوا ہے - اور اُس نے (یعنی اللہ تعالیٰ نے) ان دونوں کے درمیان ایک روک بنادی ہے

وَّ حِجْرًا مَّحْجُوْرًا ﴿۵۴﴾

اور ایسا سامان بنایا ہے کہ وہ ایک دوسرے کو پرے رکھتے ہیں ملنے نہیں دیتے ۵۲۳

۵۲۳ **حل لغات**:- مَرَجَ : مَرَجَ اللّٰهُ الْبَحْرَیْنِ الْعَذْبَ وَالْمِلْحَ کے معنے ہیں خَلَطَهُمَا حَتّٰی الْتَقَیَا - دو سمندروں کو آپس میں ملایا - وَقِیْلَ خَلَّاهُمَا لَایَلْتَبِسُ اَحَدُهُمَا بِالْاٰخِرِ - اور بعض عربی زبان کے ائمہ کہتے ہیں کہ مَرَجَ الْبَحْرَیْنِ کے معنے ہیں کہ دو سمندروں کو اس طور پر چلایا کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ مل نہیں سکتے - (اقرب)

فُرَاتٌ : اَلْفُرَاتُ الْمَآءُ الْعَذْبُ جِدًّا - فُرات کے معنے نہایت شیریں پانی کے ہیں - اَوِ الَّذِیْ یَکْسِرُ الْعَطَشَ بِفَرْطِ عُذُوْبَتِهٖ - یا اُس پانی پر فرات کا لفظ استعمال کرتے ہیں جو اپنی مٹھاس کی تیزی کی وجہ سے پیاس کی شدّت اور تلخی کو ختم کرکے سکون دے دے (اقرب)

تفسیر:- مَرَجَ کے معنے جیسا کہ اوپر بتایا جا چکا ہے ملا دینے کے ہوتے ہیں - پس هُوَ الَّذِیْ مَرَجَ الْبَحْرَیْنِ کے یہ معنے ہوئے کہ وہ خدا ہی ہے جس نے دو سمندر دنیا میں ملا دیئے ہیں - جن میں سے ایک تو اپنی خاصیّت کے لحاظ سے انتہائی میٹھا ہے اور اس کا پانی انسان کے لئے تسکین بخش ہے اور دوسرا نمکین اور کڑوا ہے - مگر باوجود اس کے کہ دونوں سمندر ملا دئے گئے ہیں پھر بھی اُن دونوں کے درمیان ایک فاصلہ پایا جاتا ہے جو اُن دونوں کو جُدا جُدا رکھتا ہے - دنیا میں قاعدہ ہے کہ جب میٹھی اور نمکین چیز ملائی جائے تو ایک تیسری چیز پیدا ہوجاتی ہے جو اُن دونوں سے مختلف ہوتی ہے - جیسے بعض لوگ میٹھی چائے میں نمک ملا لیا کرتے ہیں - مَیں ایسی چائے کو ہمیشہ منافق چائے کہا کرتا ہوں اور مجھے اس سے بڑی نفرت ہے - لیکن اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ وہ پانی منافق نہیں ہونگے بلکہ باوجود اس کے کہ وہ دونوں ملے ہوئے ہونگے اور بظاہر جب دو چیزیں مل جائیں تو دونوں کا ذائقہ بدل کر کچھ اور ہو جاتا ہے مگر ہماری طرف سے یہ اعلان ہو رہا ہوگا کہ حِجْرًا مَّحْجُوْرًا - اے ملنے والو! تمہارے ملنے کے یہ معنے نہیں کہ تم ایک دوسرے میں جذب ہو جاؤ بلکہ باوجود ملنے کے الگ الگ رہو -

مَرَجَ

فُرَاتٌ

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اس امر کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ خدا تعالیٰ نے اپنی حکمتِ کاملہ کے ماتحت جس طرح مادی پانی کے دو قسم کے ذخیرے بنائے ہیں - ایک ذخیرہ سمندر کے پانی کا بنایا ہے جو نمکین ہوتا ہے اور ایک ذخیرہ دریا کے پانی کا بنایا ہے جو میٹھا ہوتا ہے اور ان دونوں کے درمیان اُس نے ایسی حدود قائم کر دی ہیں جن کی وجہ سے وہ ایک دوسرے کو خراب نہیں کرسکتے - نہ کڑوا سمندر میٹھے دریاؤں کو خراب کرسکتا ہے اور نہ میٹھے دریا کڑوے سمندر کی تلخی کو دُور کرسکتے ہیں - اسی طرح اسلامی تعلیم جو میٹھے پانی کے مشابہ ہوتی ہے اور کفر کی تعلیم جو نمکین پانی سے مشابہت رکھتی ہے ان دونوں میں ایک نمایاں اور بیّن امتیاز موجود ہوتا ہے اور ایک حدِّ فاصل ان دونوں کو جُدا جُدا رکھتی ہے - اس کے یہ معنے نہیں کہ کافر مومن نہیں بن سکتا یا مومن کافر نہیں بن سکتا - بلکہ

اِس کے معنے یہ ہیں کہ کفر ایمان کی شکل اختیار نہیں کر سکتا اور ایمان کفر کی شکل اختیار نہیں کر سکتا۔ اور ان دونوں میں اتنا نمایاں اور بیّن اختلاف ہوتا ہے کہ باوجود اس کے کہ ایک ملک ایک شہر بلکہ ایک محلّہ میں مومن بھی رہتے ہیں اور کافر بھی۔ وہ ایک دوسرے سے تعلقات بھی رکھتے ہیں اُن سے مل کر کام بھی کرتے ہیں اُن کی خوشی اور غمی میں شریک بھی ہوتے ہیں مگر ان تمام تعلقات کے باوجود رُوحانی نقطۂ نگاہ سے وہ آپس میں کُلّی مغایرت رکھتے ہیں۔ اور جو میٹھے ثمرات ایک سچے مذہب پر چلنے والے انسان کو حاصل ہو رہے ہوتے ہیں دوسرا شخص اُن سے بالکل محروم ہوتا ہے۔ گویا ایک برزخ ہے جو اُن دونوں کو جُدا رکھتی ہے۔ ایک سچے مذہب کا پیرو اللہ تعالیٰ کے کلام اور اُس کے الہام سے مشرف ہوتا ہے۔ اُس کی دُعائیں قبول ہوتی ہیں۔ اُس پر آسمانی علوم اور معارف کا انکشاف ہوتا ہے۔ مگر اُس کے پہلو میں بیٹھا ہُوا ایک کافر انسان اِس دُنیا میں اندھوں کی طرح آتا اور اندھوں کی طرح ہی چلا جاتا ہے اور آبِ حیات کو زہر سمجھتے ہوئے اُس سے دُور رہتا ہے اور زہر کو تریاق سمجھتے ہوئے اُسے اپنے مُنہ سے لگائے رکھتا ہے۔

غرض کفر اور ایمان کا اِس دنیا میں موجود رہنا خدا تعالےٰ کی حکمت کے ماتحت ہے۔ لیکن ان دونوں کے درمیان ایک حدِّ فاصل قائم کر دی گئی ہے جو کفر اور ایمان کے امتیاز کو نمایاں کرتی رہتی ہے۔ مگر کفر اور ایمان کے مقابلہ کے علاوہ اِس میں مغربیت اور دجالیّت کے متعلق بھی پیشگوئی پائی جاتی ہے۔ چنانچہ دیکھ لو قرآن کریم نے اپنے الفاظ میں ہی اِس طرف اشارہ کر دیا ہے۔ فرماتا ہے هٰذَا مِلْحٌ اُجَاجٌ اور اُجَاجٌ سے یاجوج اور ماجوج دونوں قوموں کی طرف اشارہ ہے اس کے مقابلہ میں عَذْبٌ فُرَاتٌ رکھا ہے۔ اور حِجْرًا مَّحْجُوْرًا میں بتا دیا کہ گو تمہیں اِن دونوں اقوام سے مل کر رہنا پڑیگا مگر ایسی حالت میں بھی تمہیں یاد رکھنا چاہیئے کہ تم میٹھے پانی کا سمندر ہو اور وہ کڑوے پانی کا سمندر ہیں۔ تم مغربیت کی کبھی نقل نہ کرو اور باوجود اُن میں ملے ہونے کے ایسے امور کے متعلق صاف طور پر کہہ دیا کرو کہ تم اَور ہو اور ہم اَور ہیں۔ جیسے قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ مومنوں کو ہدایت دیتے ہوئے فرماتا ہے کہ تم کفار سے صاف طور پر کہہ دو کہ لَآ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ (سورة الکافرون ع) گویا ایک برزخ تمہارے اور اُن کے درمیان ہمیشہ حائل رہنی چاہیئے۔ خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ جب سے دنیا پیدا ہوئی ہے اُس وقت سے لیکر قیامت تک دجّالی فتنہ سے بڑا فتنہ اَور کوئی نہیں ہوگا۔
(مشکوٰة باب العلامات بین یدی الساعة و ذکر الدجال)

چنانچہ اِس کی صداقت اِس سے ظاہر ہے کہ پہلے زمانوں میں جو فتنے پیدا ہوئے تھے وہ صرف مقامی ہوتے تھے مثلاً ہندوستان کا فتنہ مستقل ہوتا تھا اور وہ ایرانی فتنہ سے متاثر نہیں ہوتا تھا اور ایرانی فتنہ مستقل ہوتا تھا اور وہ یونانی فتنہ سے متاثر نہیں ہوتا تھا۔ اِسی طرح مصری فتنہ مستقل ہوتا تھا جو یونانی اور ایرانی فتنوں سے متاثر نہیں ہوتا تھا۔ اِسوجہ سے اِن فتنوں کا دین پر متفقہ حملہ نہیں ہوتا تھا بلکہ اُن کی مثال بالکل ایسی ہی تھی جیسے ایک ملک میں ڈاکو لُوٹ مار کر رہے ہوں تو کچھ ایک طرف سے حملہ آور ہوں اور کچھ دوسری طرف سے۔ ڈاکوؤں سے ملک کا امن بیشک خطرہ میں پڑ جائیگا مگر حکومت تباہ نہیں ہوگی حکومت ہمیشہ منظّم طاقتوں سے تباہ ہُوا کرتی ہے لیکن موجودہ فتنہ کے زمانہ میں ریل اور تار اور فون اور پریس کی ایجاد کی وجہ سے ایشیا افریقہ پر اثر انداز ہو رہا ہے اور افریقہ ایشیا پر اثر انداز ہو رہا ہے۔ یورپ امریکہ پر اثر ڈال رہا ہے اور امریکہ یورپ پر اثر ڈال رہا ہے۔ اس لئے مختلف ممالک میں جو مذہبی بے چینی پائی جاتی ہے وہ ساری دنیا میں یکساں طور پر

پھیلی ہوئی ہے۔ پس پہلے فتنوں اور موجودہ فتنہ میں یہ فرق ہے کہ یہ فتنہ ایک عالمگیر فتنہ ہے۔ جاپان گو عیسائی نہیں مگر اسکے خیالات کی رو یورپ کے تابع ہے۔ چین گو عیسائی نہیں مگر اسکے خیالات یورپ کے تابع ہیں۔ اسی طرح ایران، ترکستان اور عرب عیسائی نہیں ظاہراً مسلمان ممالک ہیں مگر اُن کے خیالات کی رو بھی یورپ کے تابع ہے۔ غرض موجودہ زمانہ میں تمام تحریکات ایک سلک میں پروئی ہوئی اور ایک نظام کے ماتحت نظر آتی ہیں جس سے اس فتنہ کی ہیبت بہت بڑھ گئی ہے۔ پہلے انسان یہ خیال کرتا تھا کہ ایرانی یا یونانی یوں کہتا ہے مگر اب یہ کہا جاتا ہے کہ دنیا کا ہر معقول پسند انسان یوں کہتا ہے۔ پہلے اگر کسی کے سامنے یہ کہا جاتا تھا کہ ایرانیوں کا یہ عقیدہ ہے تو سننے والا دل میں کہہ سکتا تھا کہ شاید باقی دنیا کا عقیدہ اس کے خلاف ہو اس لئے وہ مرعوب نہیں ہوتا تھا اور عملاً بھی ایسا ہی تھا۔ یعنی ایک وقت میں ایک ہی بدی سارے عالم میں پھیلی ہوئی نہ تھی۔ کسی ملک میں کوئی بدی ہوتی تھی اور کسی ملک میں کوئی۔ اگر ہندوستان میں دہریت کی رَو تھی تو ایران میں بدعملی کی رو تھی۔ یونان میں فلسفہ کی رو تھی تو مصر میں مشرکانہ خیالات کی رو تھی۔ پس اُن کے اعتراضات میں یکسانیت نہیں تھی اور مخالفت میں تنظیم نہیں پائی جاتی تھی۔ لیکن اس زمانہ میں تمام خیالات ایک رو اور ایک ہی سلک کے ماتحت ہیں۔ جہاں سے بھی کوئی تحریک اٹھتی ہے اس کا مقصد ایک ہی ہوتا ہے اور وہ یہ کہ دنیا کو خدا سے دُور کر دیا جائے۔ اور مادیت کی طرف اُسے مائل کیا جائے چین، جاپان، سائبیریا، ایران، افغانستان جہاں جاؤ وہاں یہی مرض دکھائی دیگا ہر شخص دنیا کو دین پر مقدم کر رہا ہوگا۔ اور ہر شخص کی یہ کوشش ہوگی کہ دنیا سے خدا تعالیٰ کی محبت کو مٹا دیا جائے۔ یہ چیز پہلے کبھی ساری دنیا میں ایک وقت میں نہیں پائی جاتی تھی

دوسری چیز جو امتیازی رنگ رکھتی ہے وہ یہ ہے کہ پہلے جتنے حملے ہوتے تھے وہ فلسفیانہ ہوتے تھے۔ اور فلسفہ کی بنیاد واہمہ اور خیال پر ہے۔ مگر اس وقت جتنے حملے ہوتے ہیں وہ سائنس کی بناء پر ہوتے ہیں اور سائنس کی بنیاد مشاہدہ پر ہے۔ فلسفیانہ اعتراضات کے جواب میں تو انسان بڑی دلیری سے کہہ سکتا ہے کہ یہ تمہارے ڈھکوسلے ہیں لیکن مشاہدہ پر بنیاد رکھتے ہوئے جب کوئی سوال پیش کیا جائے تو اس کا جواب دینا مشکل ہو جاتا ہے۔ یہ کہنا کہ اس دنیا کی زندگی ہی اصل زندگی ہے مرنے کے بعد جو کچھ ہوتا ہے وہ کس نے دیکھا کہ وہاں آرام و آسائش میسر آسکے گی۔ ایک فلسفیانہ خیال ہے اور اسے سنکر ایک انسان متأثر تو ہو سکتا ہے مگر دوسرا شخص یہ بھی تو کہہ سکتا ہے کہ یہ تو درست ہے کہ اگلے جہان کا ثواب اور عذاب کسی نے نہیں دیکھا لیکن اگلے جہان میں ثواب اور عذاب کا نہ ملنا بھی تو تم نے نہیں دیکھا۔ اس لئے دونوں نظریات سائنس کے لحاظ سے برابر حیثیت رکھتے ہیں۔ لیکن ذراتِ عالم کی بناوٹ پر اپنے خیالات کی بنیاد رکھتے ہوئے اور یہ ثابت کرتے ہوئے کہ دنیا کا ذرہ ذرہ ایک ایسی تنظیم کی صورت رکھتا ہے۔ کہ کارخانۂ عالم خود بخود چلتا چلا جاتا ہے۔ جب کہا جائے کہ اس دنیا کو چلانے کے لئے کسی بیرونی ہستی کی ضرورت نہیں تو یہ سوال ایک نیا رنگ اختیار کر لیتا ہے جو پہلے وسوسہ میں نہیں تھا۔ پھر پہلے خدا تعالیٰ کے وجود کے خلاف صرف فلسفی کھڑے ہوا کرتے تھے۔ مگر اب علم النفس والے بھی کھڑے ہیں۔ علم طبقات الارض والے بھی کھڑے ہیں علم ہیئت والے بھی کھڑے ہیں۔ غرض تمام علوم مشترکہ طور پر اسلام کے خلاف پیش کئے جاتے ہیں اور یہ حملہ پہلے سے بہت زیادہ سخت ہے۔ پہلے یہ سمجھ لیا جاتا تھا کہ ایک فلسفی نے خدا تعالیٰ کی ہستی کا انکار کیا ہے۔ نہ معلوم اُس کے قول میں سچائی بھی ہے یا نہیں۔ مگر اب یہ کہا جاتا ہے کہ جس رنگ میں بھی دیکھو یہی نتیجہ نکلیگا کہ نعوذ باللہ خدا نہیں۔ غرض آج کفر اپنے تمام ہتھیار استعمال کر رہا ہے۔ اور یہ حملہ اپنی کمیت اور

کیفیت کے لحاظ سے بے مثال ہے پہلے حملوں میں آدمی کم ہوتے تھے اور پھر وہ متفرق طور پر حملہ کرتے تھے۔ ایرانی اَور رنگ میں حملہ کرتا تھا اور جاپانی اَور رنگ میں۔ مگر اب تمام دنیا متفقہ طور پر حملہ کرتی اور ایک ہی محاذ پر جنگ لڑتی ہے۔ پھر پہلے حملے فلسفہ تک محدود تھے مگر اب جتنے رائج الوقت علوم ہیں اُن سب کو استعمال کیا جاتا ہے۔ پس اِس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس فتنہ کے برابر دنیا کا اَور کوئی فتنہ نہیں۔ آج دجالی فتنہ جس رنگ میں دنیا پر غالب ہے اس کی وجہ سے کوئی چیز بھی اسلام کی باقی نہیں رہی۔ نہ اس کے تمدنی احکام قائم ہیں۔ نہ سیاسی احکام قائم ہیں نہ اقتصادی احکام قائم ہیں اور نہ شخصی احکام قائم ہیں۔ ہر چیز میں آج تبدیلی کر دی گئی ہے۔ پس جبتک اِسے مٹانے کے لئے ہمارے اندر دیوانگی نہ ہوگی جب تک ہمیں اس تہذیبِ مغربی سے بُغض نہ ہوگا۔ اتنا بُغض اس سے بڑھ کر ہمیں کسی اَور چیز سے بُغض نہ ہو اُسوقت تک ہم کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے۔ ہم میں سے جو شخص بھی مغربی تہذیب کا دلدادہ ہے وہ روحانی میدان کا اہل نہیں۔ جس تہذیب نے ہمارے مقدس آقا کی تصویر کو دنیا کے سامنے بھیانک رنگ میں پیش کیا ہے۔ جس تہذیب نے اسلامی تمدن کی شکل کو بدل دیا ہے جبتک اُس کی ایک ایک اینٹ کو ہم ریزہ ریزہ نہ کر دیں کبھی چین اور اطمینان کی نیند نہیں سو سکتے۔ وہ لوگ جو یورپ کی نقالی کرتے اور مغربیت کی رَو میں بہتے چلے جاتے ہیں وہ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے۔ ہمارے تن بدن میں تو اُنکی ایک ایک چیز کو دیکھ کر آگ لگ جانی چاہیئے کیونکہ اسلام اور مغربیت ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے۔ یا اسلامی ثقافت زندہ رہیگی یا مغربیت زندہ رہے گی۔ دونوں کی بنیادیں متضاد اصول پر ہیں اور اُن کا ایک ہی جگہ جمع ہونا ناممکن ہے۔ مغربیت کی بنیاد ساری کی ساری دنیادی لذّات اور عیش پرستی پر ہے اور اسلام کی بنیاد کلّی طور پر اللہ تعالیٰ کی رضامندی، رُوحانیت اور اخلاق کی درستی پر ہے۔ اسلئے اِن دونوں کا اجتماع ناممکن ہے۔ مگر یہ امر یاد رکھو کہ انگریز اور مغربیت میں فرق ہے۔ انگریز انسان ہیں اور ویسے ہی انسان ہیں جیسے ہم اور اس لحاظ سے انگریز ہدایت پا سکتے ہیں لیکن مغربیت ہدایت نہیں پا سکتی۔ وہ شیطان کا ہتھیار ہے اور جب تک اُسے توڑا نہیں جائیگا دنیا میں حقیقی امن قائم نہیں ہو سکتا۔ یہی وہ برزخ ہے جس کو قائم رکھنے کے لئے میں تحریک جدید کے ذریعہ جماعت کے دوستوں کو توجہ دِلا رہا ہوں کہ وہ مغربی اثرات کو کبھی قبول نہ کریں جو احمدی میٹھے پانی کا طلبگار ہے وہ ضرور اُن سے الگ رہے گا اور یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ کڑوا اور میٹھا پانی ایک دوسرے میں جذب ہو جائیں۔ اِسی طرح مَیں سمجھتا ہوں کہ جو غیر احمدی ہیں وہ خواہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام پر ایمان نہ لائیں پھر بھی اُن کا فرض ہے کہ وہ مغربیت کی کبھی نقل نہ کریں۔ کیونکہ یہ مسیح موعودؑ کی تعلیم نہیں یہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بلکہ اُن کے بھیجنے والے خدا کی تعلیم ہے۔ مگر مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ مسلمانوں کا ایک طبقہ ایسا ہے جو کھانے پینے پہننے اور تمدن و معاشرت سے تعلق رکھنے والے کئی امور میں مغربیت کی نقل کرتا اور اِس نقل میں خوشی اور فخر محسوس کرتا ہے۔ اِسی طرح بعض احمدی نوجوان باوجود سمجھانے کے اس طرف جا رہے ہیں۔ یہ لوگ صرف نام کے احمدی ہیں حقیقی احمدی نہیں۔ مجھے یاد ہے۔ ایک دفعہ بعض غیر احمدیوں نے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام سے سوال کیا کہ شادی بیاہ اور دوسرے معاملات میں آپ اپنی جماعت کے لوگوں کو کیوں اجازت نہیں دیتے کہ وہ ہمارے ساتھ تعلقات قائم کریں۔ آپ نے فرمایا۔ اگر ایک مٹکا دودھ کا بھرا ہُوا ہو اور اُس میں کھٹی لسّی کے تین چار قطرے بھی ڈال دیئے جائیں

وَهُوَ الَّذِیْ خَلَقَ مِنَ الْمَآءِ بَشَرًا فَجَعَلَهٗ نَسَبًا

اور وہ (خدا) ہی ہے جس نے پانی سے انسان بنایا پس اسکو کبھی تو نسب بنایا ہے (یعنی شجرۂ آباء)

تو سارا دودھ خراب ہو جاتا ہے ۔ مگر لوگ اس حکمت کو نہیں سمجھتے کہ قوم کی قوتِ عملیہ کو قائم رکھنے کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ اُسے دوسروں سے الگ رکھا جائے ۔ اور ان کے بد اثرات سے اُسے بچایا جائے ۔ آخر ہم نے دشمنانِ اسلام سے رُوحانی جنگ لڑنی ہے اگر اُن سے مغلوب اور اُن کی نقل کرنے والے لوگوں سے ہم مل جُل کر رہیں تو نتیجہ یہ ہوگا کہ ہم بھی یورپ کے نقّال ہو جائیں گے اور ہم بھی جہادِ قرآنی سے غافل ہو جائیں گے ۔ پس خود اسلام اور مسلمانوں کے فائدہ کے لئے ہمیں دوسری جماعتوں سے نہیں ملنا چاہیئے ۔ تاکہ ہم غافل ہو کر اپنا فرض جو تبلیغ اسلام کا ہے بُھول نہ جائیں جس طرح دوسرے مسلمان بُھول گئے ہیں ۔ اسلام میں پہلے ہی سپاہیوں کی کمی ہے ۔ اگر تھوڑے بہت سپاہی جو اُسے میسّر ہیں وہ بھی سُست ہو جائیں تو انہوں نے اسلام کی طرف سے دشمنوں کا کیا مقابلہ کرنا ہے ۔

جن دنوں اُمّ طاہرؓ کی بیماری کے سلسلہ میں مَیں لاہور میں ٹھہرا ہُوا تھا ایک روز رات کے دس بجے ایک غیر احمدی مولوی مجھ سے ملنے کے لئے آیا اور کہنے لگا کہ آپ کی جماعت بڑی اچھی ہے اور اسلام کی بڑی بھاری خدمت کر رہی ہے ۔ لیکن صرف ایک خرابی ہے جو نہیں ہونی چاہیئے اور وہ یہ کہ آپ ہم سے نہیں ملتے نہ ہمارے پیچھے نمازیں پڑھتے ہیں اور نہ ہمیں رشتے دیتے ہیں ۔ اگر یہ خرابی دُور ہو جائے تو پھر آپکی جماعت سے بہتر اور کوئی جماعت نہیں ۔ مَیں نے کہا ۔ مولوی صاحب یہ لوگ جن کی آپ تعریف کر رہے ہیں ۔ یہ آپ لوگوں میں سے ہی نکل کر آئے ہیں یا کہیں اور سے آئے ہیں جب یہ آپ لوگوں میں سے ہی نکل کر آئے ہیں اور مرزا صاحب کی تعلیم نے ان میں اتنی بڑی تبدیلی پیدا کر دی ہے تو کیا آپ چاہتے ہیں کہ پھر یہ دوسرے مسلمانوں کے ساتھ مل کر ویسے ہی بے عمل ہو جائیں ۔ جیسے وہ ہیں ۔ وہ آدمی سمجھدار تھا ۔ کہنے لگا ۔ اب مَیں سمجھ گیا ہوں ۔ آپ مسلمانوں سے بالکل نہ ملیئے اور علیحدہ ہی رہیئے ۔ اگر آپ کی جماعت کے لوگ پھر اُن سے جا ملے تو اسلام اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نام کو پھیلانے کی جو جدوجہد آپ کی جماعت کر رہی ہے وہ بھی جاتی رہے گی ۔ اور اسلام کی تبلیغ ختم ہو جائے گی ۔ اب کم از کم کوئی جماعت تو ہے جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام پھیلا رہی ہے ۔ تو حق یہی ہے کہ یہ میٹھا پانی کڑوے پانی سے الگ رہیگا اور ایک برزخ ان دونوں کو جدا رکھیگا ۔

قرآن کریم میں بیان کیا گیا ہے کہ ذوالقرنین سے بعض قوموں نے درخواست کی کہ یاجوج و ماجوج نے ہمارے علاقوں میں بڑا فساد برپا کر رکھا ہے آپ ہمارے اور ان کے درمیان ایک روک بنا دیں تاکہ وہ ہم میں داخل ہو کر کوئی خرابی پیدا نہ کر سکیں ۔ چونکہ اس زمانہ کے ذوالقرنین بانیٔ سلسلہ احمدیہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام ہیں اس لئے بالکل ممکن ہے کہ ذوالقرنین کے دیوار حائل کرنے سے مُراد اِس زمانہ میں مغربیت اور اسلام میں ہی دیوار حائل کرنا ہو اور دو قوموں سے مُراد دو قسم کے جذبات اور قومی خیالات افکار ہوں بہرحال ہمارا فرض ہے کہ ہم مغربیت اور اسلام کے درمیان

وَّصِهْرًا ۭ وَكَانَ رَبُّكَ قَدِيْرًا ۝۵۵

اور کبھی صِہر بنایا ہے (یعنی شجرۂ سسرال) اور تیرا رب ہر چیز پر قادر ہے ۵۲۴

ایک ایسی دیوار حائل کر دیں جس کے بعد مغربیت کیلئے ہمارے اندر داخل ہونے کا راستہ کھلا نہ رہے۔ اور اسلامی فوج ایک ایسے قلعہ میں محفوظ ہو جائے جس پر شیطان کا کوئی حملہ کارگر نہ ہو سکے۔

۵۲۴ تفسیر:- فرماتا ہے۔ وہ خدا ہی ہے جس نے انسان کو پانی یعنی نطفہ سے پیدا کیا اور پھر اُسے ددھیال اور سسرال والا بنایا۔ اِس آیت میں اللہ تعالیٰ نے انسانی تمدن کی ترقی کا ایک بڑا بھاری ذریعہ آپس کے ازدواجی تعلقات کو قرار دیا ہے اور بتایا ہے کہ یہی ایک ذریعہ ہے جس سے خاندانوں اور قوموں کے آپس میں گہرے روابط اور مضبوط تعلقات قائم ہوتے ہیں۔ ہمارے ملک میں یہ مقولہ مشہور ہے کہ فلاں شیر و شکر ہو گئے یعنی جسطرح کھانڈ دودھ میں ملا دی جائے تو دونوں چیزیں یکجان ہو جاتی ہیں اِسی طرح انسان بھی آپس میں مل جاتے اور شیر و شکر ہو جاتے ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ وہ کونسی چیز ہے جو انسانوں کو آپس میں ملانے والی ہے۔ اِس سوال کا جواب اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں دیا ہے اور بتایا ہے کہ وہ ذریعہ مرد و عورت کی شادی ہے۔ اس کے ذریعہ ایک انسان دوسرے انسان سے مل جاتا ہے ایک قوم دوسری قوم سے مل جاتی ہے بلکہ ایک ملک دوسرے ملک سے مل جاتا ہے۔ اور پھر اللہ تعالیٰ اِس تعلق کے ذریعہ ایک نئی نسل جاری کر دیتا ہے۔ ایک خاندان کے وہ پوتے پوتیاں ہوتے ہیں اور ایک خاندان کے وہ نواسے نواسیاں ہوتی ہیں۔ اور دونوں اُس میں اپنی اپنی شکل دیکھ رہے ہوتے ہیں۔ ددھیال اور ننھیال میں تعلقات پیدا ہو جاتے ہیں۔ اُن میں محبت پیدا ہو جاتی ہے اور گہرے روابط قائم ہو جاتے ہیں۔ غرض اللہ تعالیٰ نے شادی کے ذریعہ قوموں اور ملکوں کو آپس میں ملا دیا ہے۔ اور اسی کے ذریعہ دنیا کو ترقی حاصل ہوتی ہے۔ دو مختلف خاندانوں کو اللہ تعالےٰ ایک وجود میں اکٹھا کر دیتا ہے۔ ایک خاندان جو بالکل علیحدہ ہوتا ہے دوسرے خاندان سے مل جاتا ہے اور اس تعلق کو اللہ تعالیٰ اسقدر مضبوط کر دیتا ہے کہ بچّہ کے نانا نانی اُسے نواسہ کہکر اس پر جان دیتے ہیں۔ اور دوسرے خاندان کے دادا دادی اسے پوتا۔ پوتی کہہ کر اس پر جان دیتے ہیں۔ غرض ایک ہی وجود کے ذریعہ دو الگ الگ خاندان مل جاتے ہیں۔ بلکہ قومیں اور ملک بھی مل جاتے ہیں۔

اسلام کی رُو سے ایک ہندو اور ایک یہودی لڑکی کے ساتھ بھی نکاح ہو سکتا ہے اور گو یہ رواج آجکل نہیں ہے۔ لیکن اب بھی اگر ایک مسلمان مرد ہندو لڑکی سے یا یہودی لڑکی سے شادی کرے تو ایک ہی وجود پر ایک طرف مسلمان اُسے پوتا کہہ کر جان دیگا تو دوسری طرف ایک ہندو اُسے نواسہ کہہ کر جان دیگا۔ اور آپس کے اختلافات بہت حد تک دُور ہو جائیں گے۔ لیکن یہ بات تبھی کامیاب ہو سکتی ہے جب اسے کثرت سے رائج کیا جائے۔ اور پھر بچوں کی تربیت کا خاص خیال رکھا جائے۔ مسلمانوں میں سے صرف اکبر نے اِس پر عمل کیا۔ لیکن جب باقی مسلمانوں نے اس پر عمل نہ کیا تو اکبر کا کام بھی بیکار ہو کر رہ گیا اور بجائے فائدہ رساں ہونے کے مضر ہو گیا۔

غرض اللہ تعالیٰ اس ذریعہ سے ایک طرف تو خاندانوں میں وسعت پیدا کرتا ہے اور دوسری طرف

وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُهُمْ وَلَا

اور وہ لوگ (یعنی کافر) اللہ (تعالیٰ) کے سوا اُن کی عبادت کرتے ہیں جو نہ انہیں نفع دے سکتے ہیں اور نہ

يَضُرُّهُمْ ۗ وَكَانَ الْكَافِرُ عَلٰى رَبِّهٖ ظَهِيْرًا ﴿۵۶﴾ وَ

تکلیف پہنچا سکتے ہیں۔ اور کافر ہمیشہ اپنے رب کے (جاری کردہ سلسلوں کے) خلاف ہوتا ہے۔ اور

مَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا مُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا ﴿۵۷﴾

ہم نے تو تجھے صرف بشارت دینے والا اور ہوشیار کرنیوالا بنایا ہے۔ ۵۲

اُن کو جوڑ کر محدود کرتا ہے۔ پہلے شادی کے ذریعہ ایک نئی نسل پیدا ہوتی ہے لیکن جب وہ نسل پھیل جاتی ہے تو ایک دوسرے سے اجنبی ہونے لگ جاتی ہے۔ پھر اسکو محدود کرنے کے لئے اور شادیاں کی جاتی ہیں اور وہ جو اجنبی ہونے لگ جاتے ہیں پھر قریبی رشتہ دار بن جاتے ہیں۔

گویا شادی کے ذریعہ ایک طرف تو وسعت پیدا ہوتی ہے اور دوسری طرف تقیید پیدا ہوتی ہے اور یہ تعلق ایسا ہے جو شیر و شکر سے بڑھ کر ہے کیونکہ دودھ اور کھانڈ کے ملانے سے ایک طرف وُسعت اور دوسری طرف تقیید پیدا نہیں ہوتی۔ یہ وسعت اور تقیید اللہ تعالیٰ نے صرف شادی میں ہی رکھی ہے۔ اور اس احسان کی طرف اُس نے اس آیت میں توجہ دلائی ہے۔

اس کے بعد فرماتا ہے۔ وَكَانَ رَبُّكَ قَدِيْرًا۔ اور تیرا رب بڑی طاقتیں اور قوتیں رکھنے والا ہے۔ لیکن جس طرح اُس نے مادی دنیا میں نطفہ کے ذریعے اربوں ارب انسان پیدا کر دیئے ہیں اسی طرح خدا تعالیٰ جب کسی مقدس انسان پر اپنا کلام نازل کر کے اُسے دُنیا کی ہدایت کے لئے مبعوث فرماتا ہے تو گو وہ بظاہر ایک حقیر وجود نظر آتا ہے اُسی طرح جس طرح نطفہ حقیر دکھائی دیتا ہے اور دنیا اُس کی ترقی کو ناممکن تصور کرتی ہے۔ مگر خدا تعالیٰ اسے اسقدر عظمت دیتا ہے کہ تھوڑے عرصہ میں ہی کروڑوں انسان اُس کے دامن سے وابستہ ہو جاتے ہیں اور اس کے ذریعہ ایک نئی روحانی نسل دنیا میں پھیلنی شروع ہو جاتی ہے اور پھر رفتہ رفتہ شاخ در شاخ ہو کر مختلف ممالک اور اکناف میں پھیل جاتی ہے۔ یہی سلوک اللہ تعالیٰ نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی فرمائیگا اور آپ کی تعلیم کو بھی ساری دنیا میں پھیلا دیگا۔

۵۵ حل لغات: ظَهِيْرٌ کے معنے ہیں اَلْمُعِيْنُ مددگار و معاون (اقرب)

ظَهِيْرٌ

تفسیر: اس میں بتایا کہ بیشک آج محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی توحید کی تعلیم سُنکر لوگ آپ کو تعجب اور انکار کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ مگر دلوں کو فتح کرنے والی تعلیم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ہی ہے۔ کیونکہ یہ لوگ ایسے بتوں کے آگے اپنے سر جھکا رہے ہیں جو نہ ان کو نفع پہنچا سکتے ہیں نہ نقصان اور انسانی عقل ایسے فعل سے بغاوت کرتی ہے جس کا نہ تو کوئی عملی زندگی میں فائدہ ہو اور نہ اُسے چھوڑنے سے نقصان ہو۔ اس لئے لازماً جب یہ لوگ سوچیں گے انہیں بتوں کی پرستش کو ترک کرنا پڑیگا اور اس وقت

قُلْ مَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ اِلَّا مَنْ شَآءَ

تو اُن سے کہدے کہ مَیں تم سے اس (یعنی خدا تعالیٰ کا پیغام پہنچانے) کا کوئی اجر نہیں مانگتا ہاں اگر کوئی شخص اپنی مرضی سے چاہے

اَنْ يَّتَّخِذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا ﴿۵۸﴾

تو اپنے رب کی طرف جانے والی راہ کو اختیار کرلے (وہی میرا بدلہ ہوگا) ۵۲۶

جو یہ لوگ اپنے پیدا کرنے والے خدا سے روگردان ہو کر اُسکے خلاف باتیں بنا رہے ہیں تو محض شرارتاً ایسا کر رہے ہیں۔ ورنہ اُن کے دل بھی محسوس کرتے ہیں کہ وہ اندھی تقلید کا شکار ہو چکے ہیں۔ اس کے مقابلہ میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے مبشّر اور نذیر بنا کر بھیجا ہے یعنی اس لئے مبعوث کیا ہے کہ جو لوگ آپ پر ایمان لائیں وہ ترقی کر جائیں اور جو انکار کریں وہ تباہ ہو جائیں۔ ایسے شخص کا یہ مشرک کیا مقابلہ کر سکتے ہیں جن کے بت نہ انہیں نفع پہنچانے کی طاقت رکھتے ہیں اور نہ مخالفین کو نقصان پہنچانے کی طاقت رکھتے ہیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہُوا۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے والے دنیا کے بادشاہ بن گئے اور بتوں کے پرستار جنہوں نے آپ کا انکار کیا تھا اپنے بتوں کی عبادت سے نہ کوئی نفع حاصل کر سکے اور نہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مشن کو کوئی نقصان پہنچا سکے۔

۵۲۶ تفسیر:۔ فرماتا ہے۔ تُو ان لوگوں سے کہہ دے کہ مَیں تم سے خدا تعالیٰ کا پیغام پہنچانے کے بدلہ میں کسی اجر کا طالب نہیں۔ میرا اجر تو صرف اتنا ہی ہے کہ اگر کسی شخص کا دل اسلام کی صداقت قبول کرنے کے لئے کھل جائے اور وہ اپنی مرضی سے اس راہ کو اختیار کرے جو اُسے خدا تعالیٰ تک پہنچانے والی ہے تو وہ اسلام میں داخل ہو جائے اور اپنے رب کی رضا حاصل کرے۔

یہ آیت اسلام کے اس بلند ترین نظریّہ کو دنیا کے سامنے پیش کرتی ہے کہ قبول مذہب کے بارہ میں ہر شخص کو آزادیٔ رائے کا حق حاصل ہے اور اسے اختیار ہے کہ وہ جس مذہب کو چاہے قبول کرے۔ اس بارہ میں کسی پر جبر و تشدّد کا روا رکھنا جائز نہیں۔ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں مبعوث ہوئے اُس وقت عرب اور دوسرے ممالک کے لوگ مذہبی معاملات میں جبر و تشدّد کو روا رکھنا بالکل جائز سمجھتے تھے۔ لیکن قرآن کریم نے اس طریق عمل کو غلط قرار دیتے ہوئے اعلان کیا کہ لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ (بقرۃ ع ۳۴) یعنی دین کے معاملہ میں کوئی جبر نہیں ہونا چاہیئے کیونکہ ہدایت اور گمراہی میں خدا تعالیٰ نے نمایاں فرق کر کے دکھا دیا ہے پس جو سمجھنا چاہے وہ دلیل سے سمجھ سکتا ہے اس پر جبر نہیں کرنا چاہیئے۔

اس آیت سے ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ اسلام غیر مذاہب سے کسقدر رواداری کی تعلیم دیتا ہے اور مذہبی معاملات میں نہیں کس قدر آزادی عطا کرتا ہے۔ مگر افسوس ہے کہ اسلام کی اس روشن تعلیم کے ہوتے ہوئے یورپین مستشرقین نے انتہائی ظلم سے کام لیتے ہوئے بانیٔ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ اعتراض کیا ہے کہ آپ کا غیر مذاہب سے سلوک جبر و تشدّد پر مبنی تھا اور آپ کا مذہب تلوار کا مذہب تھا۔ حالانکہ مذہبی رواداری پر اسلام نے اس قدر زور دیا ہے کہ جس کی نظیر کسی اور جگہ نہیں پائی جاتی۔ (۱) آپ کی بعثت سے پہلے دنیا میں عام طور پر یہ سمجھا جاتا تھا کہ جب تک

غیر مذاہب والوں کو کلّی طور پر جھوٹا ثابت نہ کر لیا جائے اپنے مذہب کی سچائی ثابت نہیں ہو سکتی۔ مگر اسلام نے اس نظریہ کو غلط قرار دیا۔ چنانچہ اسلام جہاں اپنی خوبیوں کو پیش کرنیکا حکم دیتا ہے وہاں رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے نہایت واضح طور پر یہ بھی تعلیم دی ہے کہ کسی دوسرے کی خوبی کا انکار نہیں کرنا چاہیئے۔ اور یہ بھی کہ ہر مذہب میں کچھ نہ کچھ خوبیاں ہیں جن کا انکار کرنا سراسر ظلم ہے۔ چنانچہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ لَيْسَتِ النَّصٰرٰى عَلٰى شَيْءٍ وَّقَالَتِ النَّصٰرٰى لَيْسَتِ الْيَهُوْدُ عَلٰى شَيْءٍ وَّهُمْ يَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ (بقرۃ ع۱۴) یعنی یہ کیسے ظلم کی بات ہے کہ عیسائی کہتے ہیں یہودیوں میں کوئی خوبی نہیں اور یہودی کہتے ہیں عیسائیوں میں کوئی خوبی نہیں حالانکہ وہ دونوں ایک ہی کتاب پڑھنے والے ہیں۔ اور دونوں میں کچھ نہ کچھ خوبیاں پائی جاتی ہیں۔ یعنی چاہیئے تو یہ تھا کہ یہودی عیسائیوں کی خوبیوں کو تسلیم کرتے اور عیسائی یہودیوں کی خوبیوں کو تسلیم کرتے۔ نہ یہ کہ یہودی عیسائیوں کے متعلق کہنا شروع کر دیتے کہ اُن میں کوئی خوبی نہیں اور عیسائی یہودیوں کے متعلق کہنا شروع کر دیتے کہ اُن میں کوئی خوبی نہیں بالخصوص ایسی صورت میں جبکہ وہ دونوں ایک ہی کتاب کے حامل ہیں۔ غرض رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا کو یہ تعلیم دی کہ دوسروں کی خوبیوں کو تسلیم کرنا چاہیئے۔ جو شخص یہ کہتا ہے کہ دوسرے مذاہب میں کوئی خوبی ہی نہیں وہ اپنی نابینائی کا مظاہرہ کرتا ہے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ایسی اعلیٰ درجہ کی تعلیم دی ہے کہ اس کے ذریعہ آپ نے تمام اقوام کے دل رکھ لئے ہیں۔ کسی کے مذہب کے متعلق یہ کہنا کہ اس میں کوئی بھی خوبی نہیں اس مذہب کے پیروؤں کے لئے سخت تکلیف دہ بات ہوتی ہے پس اس کے متعلق رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ اصل پیش فرمایا کہ ہر قوم کی خوبی کو تسلیم کرو۔ اور اس طرح آپ نے دنیا کی تمام اقوام اور مذاہب پر بہت بڑا احسان کیا۔

(۲) پھر آپ نے فرمایا کہ کسی مذہب کے پیروؤں کے متعلق یہ نہ کہو کہ وہ اپنے مذہب کو دھوکا اور فریب مانتے ہیں بلکہ باوجود اس کے کہ پہلے مذاہب بگڑ چکے ہیں۔ اُن کے ماننے والوں میں سے اکثر انہیں دل سے سچا سمجھ کر ہی مانتے ہیں۔ چنانچہ قرآن کریم میں یہودیوں کے متعلق آتا ہے کہ اُن میں سے بعض ایسے ہیں کہ اگر اُنکے پاس ڈھیروں ڈھیر مال بھی امانت رکھوا دیا جائے تو وہ اس میں خیانت نہیں کرینگے (آل عمران ع۸) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہودیوں میں ایسے لوگ موجود تھے جو اپنے مذہب کو سچا سمجھ کر مانتے تھے۔ اسی طرح عیسائیوں کے متعلق قرآن کریم میں آتا ہے کہ اُن میں ایسے لوگ پائے جاتے ہیں جو خدا تعالیٰ کا ذکر سُنکر رونے لگ جاتے ہیں اور خشیت سے اُن کے دل بھر جاتے ہیں (مائدہ ع۱۱) کیا ایسے لوگ اپنے مذہب کو فریب سے ماننے والے ہو سکتے ہیں؟ حقیقت یہ ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ تعلیم دے کر اپنی امت کو بتایا ہے کہ انہیں دوسرے مذاہب کے پیروؤں کے احساسات کا ہمیشہ احترام کرنا چاہیئے۔ کیونکہ خواہ وہ جھوٹے مذاہب کے پیرو ہوں مگر بہرحال وہ انہیں سچا سمجھ کر اُنکے پیچھے چل رہے ہیں۔

(۳) تیسرے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے دنیا کی تمام اقوام کے متعلق اصولی طور پر یہ تعلیم دی کہ اُن میں اللہ تعالیٰ کے انبیاء مبعوث ہوتے رہے ہیں۔ چنانچہ آپنے فرمایا۔ وَاِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ۔ (فاطر ع۳) یعنی دنیا کی کوئی قوم ایسی نہیں جس میں خدا تعالیٰ کا کوئی نبی نہ آیا ہو۔ اس تعلیم کے ذریعہ چونکہ سب اقوام کے نبیوں کے تقدس کو قبول کر لیا گیا ہے اس لئے وہ منافرت جو دائرہ ہدایت کو محدود کرنے کی وجہ سے پیدا

ہوتی ہے دل سے دُور ہو جاتی ہے اور انسان عقیدۃً اِس امر کو تسلیم کر لیتا ہے کہ سب مذاہب کی اصل سچائی پر مبنی ہے۔ اور مختلف مدارج میں ہدایت دوسرے مذاہب میں بھی پائی جاتی ہے۔ کیونکہ اُن کی ابتداء خدا تعالیٰ کی طرف سے ہوئی تھی۔ پس بندوں نے ان مذاہب کو خواہ کتنا بھی بگاڑ دیا ہو پھر بھی خدا تعالیٰ کی ہدایت میں سے کچھ نہ کچھ اُنکے پاس ضرور موجود ہے۔ اس لئے باوجود اختلاف کے مجھے اُن سے اتحاد رکھنا چاہیئے اور انہیں محبت اور پیار کی نگاہ سے دیکھنا چاہیئے۔

(۴) چوتھی تعلیم آپؐ نے یہ دی کہ جب کسی قسم کی مذہبی بحث ہو تو جوش میں آکر گالیوں پر نہ اُتر آؤ۔ چنانچہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَلَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ۔ (انعام ع ۱۳) یعنی جب تمہاری دوسری قوموں سے بحث ہو تو وہ ہستیاں جنہیں تم نہیں مانتے خواہ انہیں خدا کے مقابلہ میں پیش کیا جاتا ہو۔ پھر بھی انہیں بُرا بھلا نہ کہو ورنہ وہ بھی اس خدا کو گالیاں دینے لگیں گے جسے تم مانتے ہو۔ اور اس طرح تم خدا تعالیٰ کو گالیاں دلوانے کا موجب ہو جاؤ گے جیسے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم میں سے کوئی شخص اپنے باپ کو گالی نہ دے۔ صحابہؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! کیا کوئی شخص ایسا بھی ہو سکتا ہے جو اپنے باپ کو گالیاں دے۔ آپ نے فرمایا جب تم کسی کے باپ کو گالیاں دو گے تو وہ تمہارے باپ کو گالیاں دے گا اور اس طرح تم خود اپنے باپ کو گالیاں دلوانے والے سمجھے جاؤ گے۔

(۵) پانچویں ہدایت آپؐ نے یہ فرمائی کہ صرف مذہب کے اختلاف کی وجہ سے کسی قوم پر حملہ نہیں کرنا چاہیئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے عام طور پر یہ سمجھا جاتا تھا کہ جس قوم سے مذہبی اختلاف ہو اُس پر حملہ کر کے اس کو تباہ کرنا جائز ہوتا ہے لیکن رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے اس کے بالکل خلاف حکم دیا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کے ذریعہ اعلان فرمایا کہ وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا (بقرہ ع ۲۴) یعنی تم جنگ تو کر سکتے ہو مگر صرف انہی سے جو تم پر حملہ آور ہوں۔ مذہب کے اختلاف کی وجہ سے کبھی کسی پر حملہ نہ کرنا اِس طرح رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حربی غیر مسلموں کو بھی حریت ضمیر عطا کی اور بتایا کہ خواہ کسی کا کوئی مذہب ہو۔ اُس کی وجہ سے کسی دوسرے کو یہ حق حاصل نہیں کہ اُسے مارے یا نقصان پہنچائے۔

(۶) چھٹا حق آپؐ نے غیر مسلم اقوام کا یہ قرار دیا کہ فرمایا خواہ کسی قوم سے عہد ہو تمہارا فرض ہے کہ تم اُسے قائم رکھو۔ لوگوں کو یہ بہت بڑی غلطی لگی ہوئی ہے اور اس غلطی میں وہ مسلمان بھی مبتلا ہیں جو قرآن کریم پر تدبّر نہیں کرتے کہ غیروں سے جو عہد ہو اُسے توڑ دینا کوئی حرج کی بات نہیں ہوتی۔ حالانکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے خلاف حکم دیا ہے۔ چنانچہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَاِمَّا تَخَافَنَّ مِنْ قَوْمٍ خِيَانَةً فَانْبِذْ اِلَيْهِمْ عَلٰى سَوَآءٍ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْخَآئِنِيْنَ۔ (انفال ع ۷) کہ اگر کوئی قوم عہد توڑ دے تو اُسے بتا دینا چاہیئے کہ تم نے عہد توڑ دیا ہے اب ہم پر بھی عہد کی پابندی نہیں یونہی اس پر حملہ نہیں کر دینا چاہیئے۔ چنانچہ ابوسفیان جب صلح حدیبیہ کے بعد مکّہ میں آیا اور اُس نے کہا کہ اب مَیں نئے سرے سے معاہدہ کرتا ہوں تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ابوسفیان تم نے یہ اعلان اپنی طرف سے کیا ہے۔ مَیں نے نہیں کیا۔ اور اِس طرح اُسے بتا دیا کہ اب ہم تم پر حملہ کریں گے۔ اس کے مقابلہ میں آجکل جب کسی ملک پر حملہ کرنا ہوتا ہے تو اس قسم کے اعلان کئے جاتے ہیں کہ فلاں حکومت سے ہمارے بڑے اچھے تعلقات ہیں

چنانچہ اٹلی نے جب ٹرکی پر حملہ کیا۔ تو اس حملہ سے تین دن پہلے یہ اعلان کیا گیا کہ ٹرکی کے ساتھ ہمارے آجکل ایسے اچھے تعلقات ہیں کہ اس قسم کے تعلقات پہلے کبھی نہیں ہوئے۔ یہ اعلان صرف اس لئے کیا گیا کہ ٹرکی غافل رہے اور اس پر اچانک حملہ کر دیا جائے۔ مگر ابوسفیان نے جب اعلان کیا تو اُس وقت رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم اگر خاموش بھی رہتے تب بھی آپ پر کوئی ذمہ واری عائد نہ ہوتی۔ کیونکہ مکہ والے معاہدہ توڑ چکے تھے۔ مگر آپ خاموش نہ رہے بلکہ فرمایا کہ یہ تمہارا اپنا اعلان ہے۔ ہمارا نہیں۔ اس طرح اُسے اشارۃً بتا دیا کہ اب ہم حملہ کرنے والے ہیں۔

ساتویں۔ پھر آپ نے مسلم اور غیر مسلم کے تمدنی حقوق ایک جیسے قرار دیئے اور یہ بات ایسی ہے جو صرف رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے قائم کی ہے۔ آپ سے پہلے یہودیوں میں یہ حکم تھا کہ تم اپنے بھائیوں یعنی یہودیوں سے سود نہ لو۔ دوسروں سے لے لیا کرو (استثناء باب ۲۳ آیت ۱۹ و ۲۰ و احبار باب ۲۵ آیت ۳۵ تا ۳۷) مگر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سود نہ یہودیوں سے لو نہ عیسائیوں سے نہ مسلمانوں سے۔ غرض کسی سے بھی سود نہ لو۔ گویا سب سے ایک سا سلوک کرنیکا حکم دیا (بقرہ ع ۳۸) اس طرح رسول کریم نے تمدنی سلوک کے بارہ میں مسلم اور غیر مسلم کے امتیاز کو اُڑا دیا۔

(۸) **آٹھویں تعلیم** آپ نے یہ دی کہ غلاموں کی آزادی میں بھی مسلم اور غیر مسلم کا کوئی امتیاز روا نہ رکھا جائے۔ چنانچہ جنگ حنین کے موقعہ پر سینکڑوں غلام جو پکڑے آئے۔ باوجود اس کے کہ وہ دشمن تھے آپ نے انہیں آزاد کر دیا۔

(۹) **نویں تعلیم** غیر مسلموں کے متعلق آپ نے یہ دی کہ جہاں اسلامی حکومت ہو وہاں مسلمانوں پر زیادہ بوجھ رکھا جائے اور دوسروں پر کم۔ چنانچہ اسلامی احکام کے ماتحت ضروری ہے کہ (۱) مسلمان لڑائی میں شامل ہوں (۲) عشر یعنی دسواں حصہ پیداوار کا دیں (۳) زکوٰۃ دیں۔ لیکن غیر مسلموں کے لئے صرف ۲ ½ روپیہ کے قریب فی کس ٹیکس رکھا گیا ہے جو مسلمانوں کے مقابلہ میں بہت کم ہے۔ اور پھر لڑائی میں انہیں آزادی دی گئی ہے۔ سوائے اس کے کہ مسلمانوں سے اجازت لیکر اپنی خوشی سے وہ لڑائی میں شامل ہو جائیں۔ غرض رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے غیر مسلموں کے متعلق ایسی روادارانہ تعلیم دی ہے جس کی مثال دنیا کا کوئی اور مذہب پیش نہیں کر سکتا۔

اب میں یہ بتاتا ہوں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے غیر مذاہب کے پیرووں کے متعلق عملی رنگ میں کیا نمونہ پیش کیا۔ سو اس بارہ میں جب ہم تاریخ پر غور کرتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ

(۱) رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے غیر اقوام کے نیک انسانوں کا عملاً احترام کیا ہے۔ چنانچہ لکھا ہے کہ جب طے قبیلہ سے جنگ ہوئی تو کچھ مشرک بطور قیدی پکڑے آئے۔ اُن میں حاتم طائی کی بیٹی بھی تھی۔ اُس نے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ آپ جانتے ہیں میں کس کی بیٹی ہوں۔ آپ نے فرمایا کس کی بیٹی ہو۔ اُس نے کہا میں اس شخص کی بیٹی ہوں جو مصیبتوں کے وقت لوگوں کے کام آیا کرتا تھا یعنی حاتم کی۔ وہ مسلمان نہ تھا لیکن چونکہ لوگوں سے اچھا سلوک کرتا تھا۔ اس لئے اسکی وجہ سے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے اُس کی بیٹی کو آزاد کر دیا۔ اس کا بھائی گرفتاری کے خوف سے بھاگا پھرتا تھا۔ آپ نے اُسی وقت اُسے روپیہ اور سواری دے کر کہا کہ جا کر اپنے بھائی کو بھی لے آؤ۔ چنانچہ وہ گئی اور اُسے لے آئی۔ اُس پر اس سلوک کا ایسا اثر ہوا کہ وہ مسلمان ہو گیا۔ اس طرح آپ نے اس کی سفارش پر اُس کی ساری قوم کی سزا کو بھی معاف کر دیا (السیرۃ الحلبیہ جلد ۳

اِس سے ظاہر ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے عملی طور پر نہ صرف غیر مذاہب کے لوگوں کی خوبیوں کا اعتراف کیا۔ بلکہ اُن سے تعلق رکھنے والوں سے بھی حسنِ سلوک کیا۔ اور انہیں اپنے احسانات سے نوازا۔ چنانچہ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حضرت ابوبکرؓ کے زمانہ میں جب کہ قبیلہ بعض لوگوں کے اکسانے سے بغاوت میں شامل ہو گیا تو حاتم طائی کے بیٹے نے جو خود اسلام سے بھاگا پھر رہا تھا آکر اپنی قوم کو سمجھایا اور دوبارہ اُنکی بیعت کرائی۔

(۲) دوسری مثال نصارائے نجران کا واقعہ ہے ۔

نجران کے نصارائے کا ایک وفد رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس الوہیتِ مسیحؑ کی تائید میں بحث کرنے کے لئے آیا مگر باوجود اس کے کہ وہ لوگ شرک کی تائید کے لئے آئے تھے جب اُن کی عبادت کا وقت آیا تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں مسجد نبوی میں ہی اپنے طریق پر عبادت کرنے کی اجازت دے دی اور انہوں نے سب کے سامنے مشرق کی طرف مُنہ کر کے نماز ادا کی (زاد المعاد جلد ۲ ص ۲۵ وسیرۃ ابن ہشام جلد اوّل ص ۲۰۹) اس سلوک کو دیکھتے ہوئے کون کہہ سکتا ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم لوگوں کی جانیں لینے کے لئے اور اُن پر ظلم کرنے کے لئے آئے تھے۔ جو جانیں لینے کے لئے آیا کرتا ہے کیا وہ اپنی آنکھوں کے سامنے اپنی مسجد میں غیر مذاہب والوں کو عبادت کی اجازت دے سکتا ہے اور مسجد بھی وہ جس کے متعلق آپؐ نے آخر المساجد فرمایا ہے ۔ اور جس میں نماز پڑھنا دوسری مساجد کی نسبت بہت زیادہ قابلِ ثواب قرار دیا ہے ۔ اس مسجد میں خدا تعالیٰ کے نبیؐ کی موجودگی میں اور اُس نبیؐ کی موجودگی میں جو خدا تعالیٰ کی توحید قائم کرنے کے لئے آیا تھا۔ نصارائے صلیبیں رکھکر عبادت کرنا چاہتے ہیں اور آپ فرماتے ہیں کیا ہرج ہے بیشک کرلو۔ آج بڑے بڑے رواداری کا دعویٰ کرنے والوں کو بھی اتنی جرأت نہیں ہوتی کہ اپنی عبادت گاہوں میں غیر مذاہب کے لوگوں کو عبادت کرنے دیں صرف ہماری جماعت کی ایک مثال ہے جس نے یہ نمونہ قائم کیا اور مسجد لنڈن کی بنیاد رکھتے ہوئے ہی اعلان کر دیا کہ " یہ مسجد صرف اور صرف خدا تعالیٰ کی عبادت کیلئے بنائی جاتی ہے تاکہ دنیا میں خدا تعالیٰ کی محبت قائم ہو اور لوگ مذہب کی طرف جس کے بغیر حقیقی امن اور حقیقی ترقی نہیں متوجہ ہوں۔ اور ہم کسی شخص کو جو خدا تعالیٰ کی عبادت کرنا چاہے ہرگز اِس میں عبادت کرنے سے نہیں روکیں گے بشرطیکہ وہ اُن قواعد کی پابندی کرے جو اس کے منتظم اس کے انتظام کے لئے مقرر کریں۔ اور بشرطیکہ وہ اُن لوگوں کی عبادت میں مخل نہ ہوں جو اپنی مذہبی ضروریات کو پُورا کرنے کیلئے اس مسجد کو بناتے ہیں " (الفضل مؤرخہ ۲۰ نومبر ۱۹۲۳ء ص ۵)

مجھے یاد ہے ایک دفعہ قادیان میں آریوں کا جلسہ ہوا جس میں انہوں نے ہمارے خلاف بہت شور مچایا ۔ جلسہ کے بعد اُن کے لیکچرار مجھ سے ملنے آئے ۔ مَیں نے اُن سے کہا کہ مَیں نے سُنا ہے آپ کو جگہ کے متعلق تکلیف ہوئی ۔ آپ میرے پاس آتے مَیں اپنی مسجد میں انتظام کروا دیتا ۔ وہ کہنے لگے ۔ کیا آپ اپنی مسجد میں اس کی اجازت دے دیتے ؟ مَیں نے کہا ۔ کیوں نہیں ۔ اگر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عیسائیوں کو اپنے طریق پر عبادت کرنے کی اجازت دے دی تھی تو مَیں آپ کو مسجد میں لیکچر کی اجازت کیوں نہیں دے سکتا ۔ اِس پر اُن میں سے ایک نے کہا کہ اگر آپ اجازت دیں تو مَیں آج لیکچر دے سکتا ہوں ۔ مَیں نے کہا اجازت ہے ۔ چنانچہ مسجد اقصیٰ میں اس کا لیکچر ہوا جس میں مَیں بھی شامل ہوا ۔ اس کے بعد آریہ صاحبان کی موجودگی میں حافظ روشن علی صاحب مرحوم نے اُن کے اعتراضات کے جواب دئے ۔ اِس کا ایسا اثر ہوا کہ اُن کا جلسہ ہی بند ہو گیا اور شائد بارہ تیرہ سال کے بعد اُنکا دوبارہ جلسہ ہوا۔

غرض اسلام غیر مذاہب کے متعلق جس روادارانہ تعلیم کا حامل ہے۔ اُس کی نظیر دنیا کا کوئی مذہب پیش نہیں کر سکتا۔

(۳) غیر مذاہب سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سلوک کی **تیسری مثال** یہ ہے کہ آپؐ اپنے ہمسائیوں سے خواہ وہ کسی مذہب و ملت سے تعلق رکھتے ہوں اچھا سلوک کرنے کا حکم دیتے تھے اور اس کے متعلق اتنا زور دیتے تھے کہ صحابہؓ ہر وقت اس کی پابندی ملحوظ رکھتے تھے۔ چنانچہ لکھا ہے کہ حضرت ابن عباسؓ ایک دفعہ گھر میں آئے تو انہوں نے دیکھا کہ کہیں سے اُن کے ہاں گوشت آیا ہوا ہے۔ انہوں نے گھر والوں سے پوچھا کہ کیا یہودی ہمسائے کو گوشت بھیجا ہے یا نہیں۔ اور پھر آپ نے اس بات کو اتنی دفعہ دوہرایا کہ گھر والوں نے کہا۔ آپ اس طرح کیوں کہتے ہیں۔ انہوں نے کہا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے میں نے سُنا ہے کہ جبرائیل نے اتنی دفعہ مجھے ہمسایہ کے حق کی تاکید کی کہ میں نے سمجھا شائد اسے وراثت میں شریک کر دیا جائیگا۔

یہ عملی سلوک تھا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا جو آپ نے غیر مذاہب کے لوگوں سے روا رکھا۔ آپ غیر مذاہب والوں کے احساسات کا بھی بے حد خیال رکھتے تھے۔ ایک دفعہ حضرت ابوبکرؓ کے سامنے کسی یہودی نے کہہ دیا کہ مجھے موسیٰؑ کی قسم جسے خدا نے سب نبیوں پر فضیلت دی ہے۔ اس پر حضرت ابوبکرؓ نے اُسے تھپیڑ مار دیا۔ جب اس واقعہ کی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر ملی تو آپؐ نے حضرت ابوبکرؓ جیسے انسان کو زجر کی۔ غور کرو مسلمانوں کی حکومت ہے۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم پر حضرت موسیٰؑ کو ایک یہودی فضیلت دیتا ہے اور ایسی طرز سے کلام کرتا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ جیسے نرم دل انسان کو بھی غصہ آجاتا ہے اور آپ اسے طمانچہ مار بیٹھتے ہیں۔ مگر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم انہیں ڈانٹتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ تم نے ایسا کیوں کیا۔ اُسے حق ہے کہ جو چاہے عقیدہ رکھے۔

(۴) آپؐ کے حسن سلوک کی چوتھی مثال یہ ہے کہ فتح خیبر کے موقعہ پر ایک یہودی عورت نے آپ کی دعوت کی اور اُس نے گوشت میں زہر ملا دیا۔ آپ نے صرف ایک ہی لقمہ کھایا تھا کہ آپ پر وحی نازل ہوئی کہ اس میں زہر ہے اور آپ نے کھانے سے ہاتھ اُٹھا لیا۔ اس کے بعد آپ نے اس عورت کو بلایا اور فرمایا کہ اس کھانے میں تو زہر ہے۔ اُس نے کہا۔ آپ کو کس نے بتلایا۔ آپ کے ہاتھ میں اُس وقت بکری کا دست تھا۔ آپ نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ اس ہاتھ نے مجھے بتایا ہے۔ یہودن نے کہا۔ مَیں نے یہ زہر اس لئے ملایا تھا کہ اگر آپ واقعہ میں خدا تعالےٰ کے سچے نبی ہیں تو آپ کو یہ بات معلوم ہوجائیگی اور اگر جھوٹے ہیں تو دُنیا کو آپ کے وجود سے نجات حاصل ہوجائیگی۔ مگر باوجود اس کے کہ اُس نے آپ کو زہر سے ہلاک کرنے کی کوشش کی اور باوجود اس کے کہ ایک صحابیؓ اس زہر کی وجہ سے بعد میں فوت ہوگئے آپ نے اسے کوئی سزا نہ دی۔ یہ کتنا بڑا نیک سلوک ہے جو آپ نے ایک ایسی دشمن عورت سے کیا جس نے آپکی اور آپ کے جاں نثار صحابہؓ کی جان لینے کی کوشش کی اور اس طرح اسلام کو بیخ و بن سے اکھیڑنا چاہا۔

(۵) آپؐ کے سلوک کی پانچویں مثال یہ ہے کہ جب آپ جنگ کے لئے جاتے تو سپاہیوں کو خاص طور پر حکم دیتے کہ کسی قوم کی عبادتگاہیں نہ گرائی جائیں۔ اُنکے مذہبی پیشواؤں کو نہ مارا جائے۔ عورتوں پر اور بوڑھوں پر اور بچوں پر حملہ نہ کیا جائے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ سے پہلے یہ رواج تھا کہ پادریوں اور راہبوں کو مار ڈالا جاتا تھا۔ مگر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے قطعی طور پر روک دیا۔ اگر آپ دوسرے مذاہب کے ایسے ہی دشمن ہوتے جیسے مخالفین آپ کو قرار دیتے ہیں تو

کیا آپؐ یہ حکم دیتے کہ ان مذاہب کے رہنماؤں کو چھوڑ دیا جائے آپ تو یہ کہتے کہ سب سے پہلے ان کو مارا جائے۔ مگر آپؐ نے فرمایا۔ جو تلوار لے کر حملہ کرتا ہے اُسے تو بے شک مارو۔ لیکن جو لوگ مذہبی کاموں میں مصروف رہتے ہوں اُنکو کچھ نہ کہو۔

(۶) پھر دنیا میں یہ طریق ہے کہ جن لوگوں سے جنگ ہوتی ہے اُن کے احساسات کا خیال نہیں رکھا جاتا اور مفتوح اقوام کو ہر طرح دبانے اور اُن کے جذبات کو کچلنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ مگر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان دیکھو۔ مکّہ والوں نے آپ پر کس قدر ظلم کئے تھے۔ متواتر ۱۳ سال مکہ والے آپ پر اور آپ کے ساتھیوں پر مظالم کرتے رہے عورتوں کی شرمگاہوں میں نیزے مار مار کر ہلاک کیا گیا صحابہؓ کو رسیوں سے باندھ کر انہیں تپتی ریت پر گھسیٹا گیا بھٹیوں سے کوئلے نکال کر اُن پر مسلمانوں کو لٹایا گیا بعض مردوں اور عورتوں کی آنکھیں نکال دی گئیں اور یہاں تک ظلم کئے گئے کہ آخر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا وطن چھوڑنا پڑا اور جب مکّہ چھوڑ کر آپ مدینہ تشریف لے گئے تو وہاں بھی ان لوگوں نے آپ کو چین نہ لینے دیا اور وہاں کے لوگوں کو آپ کے خلاف اکسایا قیصر اور کسریٰ کی حکومتوں کو اشتعال دلایا مگر جب ایسی قوم کے خلاف آپ دس ہزار قدوسیوں کے ساتھ چڑھائی کر کے گئے تو مکّہ کے قریب پہنچکر فوج کے ایک حصّہ کے کمانڈر کی زبان سے یہ فقرہ نکل گیا کہ آج مکّہ والوں کی خیر نہیں۔ آج ہم اُن کے ظلموں کا اُن سے انتقام لیں گے۔ اس پر ابوسفیان نے آگے بڑھ کر شکایت کی کہ اس شخص نے ہمارا دل دُکھایا ہے۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُس وقت اس شخص کو بلوایا اور فرمایا تمہیں معزول کیا جاتا ہے۔ کیونکہ تم نے کفّار مکّہ کے احساسات کا خیال نہیں رکھا۔ دیکھو ابھی معلوم نہیں کہ مکّہ والے کیا رویّہ اختیار کریں گے اور لڑائی کا کیا نتیجہ رونما ہوگا مگر مکّہ والوں کے ایک

ایسے سردار کے کہنے پر جو ساری عمر مسلمانوں سے لڑتا رہا تھا اور کفار کے لشکر کا کمانڈر رہا تھا آپؐ نے ایک اسلامی کمانڈر کو معزول کر دیا۔ کیا دنیا کی تمام جنگوں کی تاریخ میں کوئی ایک بھی ایسی مثال پیش کی جاسکتی ہے۔ کمانڈر چھوڑنا تک اور لیس نائک کی مثال بھی نہیں دکھائی جاسکتی کہ اُسے اس لئے سزا دی گئی ہو کہ اُس نے میدان جنگ میں کھڑے ہو کر کہا ہو کہ آج ہم دشمن کی خبر لیں گے۔ اور اُسے اپنے کئے کا مزہ چکھائیں گے۔ مغربی تاریخوں میں ایک مشہور شخص ابراہیم لنکن کا ذکر آتا ہے کہ اُس کے زمانہ میں دو گروہوں میں لڑائی ہوئی۔ ایک کہتا تھا غلامی قائم رہنی چاہیئے اور دوسرا گروہ اسے ظلم قرار دیکر مٹانا چاہتا تھا۔ ابراہیم لنکن مٹانے والوں میں سے تھا۔ اُس کی بڑی خوبی یہ بیان کی جاتی ہے کہ جب دوسرے فریق کو شکست ہوئی اور اُسے فتح تو وہ سر نیچے کئے ہوئے دشمن جرنیل کے گھر پر گیا۔ کہتے ہیں وہ اُسوقت دُعا کر رہا تھا۔ افسروں نے اُسے کہا کہ ہمیں بینڈ بجاتے ہوئے جانا چاہیئے مگر اُس نے کہا نہیں۔ اِس طرح دوسروں کا دل دُکھے گا۔ یہ ابراہیم لنکن کی ایک خاص خوبی بیان کی جاتی ہے مگر وہ ایسا شخص تھا جسے ان لوگوں نے کوئی ذاتی دُکھ نہیں دیا تھا۔ لیکن رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب مکہ پر حملہ آور ہوئے تو اُن لوگوں کی غدّاری کی وجہ سے حملہ آور ہوئے تھے اور اُن دشمنوں پر حملہ کرنے گئے تھے جنہوں نے قریباً ربع صدی تک مسلمانوں پر ظلم کئے تھے۔ جنہوں نے آپ کو اور آپ کے ساتھیوں کو مکی زندگی کے تیرہ سال سے ہر منٹ بلکہ ہر سیکنڈ میں مارنے اور ہلاک کرنے کی کوشش کی تھی اور اس کے بعد سات سال تک دو سو میل دُور جا کر وہ آپ کی تباہی کی کوشش کرتے رہے تھے مگر اِن تمام مظالم کے باوجود جب آپؐ مکّہ میں داخل ہوئے تو آپؐ نے اپنے عفو و کرم کا وہ نمونہ دکھایا جسکے مقابلہ

میں ابراہیم لنکن کا نمونہ کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ آپ نے مکہ والوں کو جمع کیا اور اُن سے پوچھا کہ بتاؤ اب تمہارے ساتھ کیا سلوک کیا جائے۔ اگر اُسوقت اُن کے جسموں کا قیمہ بھی کر دیا جاتا۔ تو میں سمجھتا ہوں یہ اُن کے جرموں کے مقابلہ میں کافی سزا نہ تھی۔ مگر جب انہوں نے کہا کہ ہم سے وہی سلوک کیا جائے جو یوسفؑ نے اپنے بھائیوں کے ساتھ کیا تھا تو آپ نے فرمایا لَا تَثْرِيبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ جاؤ تمہیں معاف کیا جاتا ہے اور تمہیں کوئی ملامت نہیں کی جاتی۔ یہ وہ خاتمہ ہے جو اس عظیم الشان جنگ کا ہوا۔ جو آپ کے اور آپ کے دشمنوں کے درمیان بیس سال تک جاری رہی کیا اس نمونہ کے ہوتے ہوئے کوئی شخص کہہ سکتا ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غیر مسلموں پر ظلم کیا اور انہیں تلوار کے زور سے اپنے مذہب میں داخل کرنے کی کوشش کی۔ تعصب یا جہالت سے اعتراض کرنا اور بات ہے ورنہ جو شخص حقائق پر غور کرنے کا عادی ہو وہ یہ تسلیم کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر دنیا میں اپنے دشمنوں سے نیک سلوک کرنے والا اور کوئی شخص نہیں گذرا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ حضرت یوسفؑ نے بھی اپنے بھائیوں کو لَا تَثْرِيبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ کہا تھا۔ مگر یوسفؑ کے سامنے اُن کے اپنے بھائی کھڑے تھے۔ جنکی سفارش کرنے والے اُن کے ماں باپ موجود تھے۔ مگر وہ لوگ جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش ہوئے آپ کے عزیزوں اور بھائیوں کے قاتل تھے۔ حضرت حمزہؓ کو قتل کرنے والے کون لوگ تھے۔ حضرت خدیجہؓ کی وفات کا باعث کون لوگ تھے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بھتیجی بیٹی کو مارنے والے کون لوگ تھے جبکہ وہ حاملہ تھیں۔ اور خاوند نے اس خیال سے کہ اسلام کی عداوت کی وجہ سے لوگ انہیں مکہ میں تنگ کرتے ہیں مدینہ روانہ کر دیا تھا مگر کفار نے راستہ میں انہیں سواری سے گرا دیا جس سے اسقاط ہو گیا۔ اور اسی وجہ سے بعد میں آپ کی وفات ہو گئی۔ حضرت یوسفؑ کے سامنے کون سے جذبات تھے۔ سوائے اِس کے کہ اُن کے بھائیوں نے ان کو وطن سے نکال دیا تھا۔ مگر یہاں تو یہ حالت تھی کہ ابو طالب کی رُوح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کہہ رہی تھی کہ یہ لوگ میرے قاتل ہیں جس نے تیری خاطر سالہا سال اپنی قوم کا مقابلہ کیا۔ عالم خیال میں حضرت خدیجہؓ آپ کے سامنے کھڑی کہہ رہی تھیں کہ میں نے اپنا مال و دولت اور اپنا آرام و آسائش سب کچھ آپ کے لئے قربان کر دیا تھا۔ اب یہ لوگ جو میرے قاتل ہیں آپ کے سامنے کھڑے ہیں۔ حضرت حمزہؓ کھڑے کہہ رہے تھے کہ انہی میں سے وہ لوگ ہیں جنہوں نے میری لاش کی بے حرمتی کی اور میرے جگر اور کلیجہ کو باہر نکال کر پھینک دیا تھا۔ آپ کی بیٹی آپ کے سامنے کھڑی کہہ رہی تھیں کہ یہ وہ لوگ ہیں کہ جنہیں ایک عورت پر ہاتھ اُٹھاتے ہوئے شرم نہ آئی اور ایسی حالت میں مجھ پر حملہ کیا جبکہ میں حاملہ تھی اور مجھے ایسا نقصان پہنچایا جس کے بعد میری وفات ہو گئی۔ پھر وہ سینکڑوں صحابہؓ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے بچوں سے بھی زیادہ عزیز تھے اور جن میں سے ایسے لوگ بھی تھے کہ جب اُن میں سے ایک کو کفار نے پکڑا اور قتل کرنے لگے تو انہوں نے پوچھا کہ کیا تم یہ پسند نہ کرو گے کہ اس وقت تمہاری جگہ محمدؐ (صلی اللہ علیہ وسلم) ہوں۔ اور تم آرام سے اپنے بیوی بچوں میں بیٹھے ہو۔ اُس نے جواب دیا کہ میں تو یہ بھی پسند نہیں کرتا کہ میں آرام سے اپنے گھر میں بیٹھا ہوں۔ اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاؤں میں مدینہ میں چلتے ہوئے کانٹا تک چبھے۔ ایسے عزیز صحابہؓ کو دُکھ دے دے کر مارا گیا۔ اُن کی روحیں اس وقت عالم خیال میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کھڑی کہہ رہی تھیں کہ یہ لوگ ہمارے قاتل ہیں۔ اب ان سے ہمارا انتقام لیجئے۔

مگر باوجود ان سب جذبات کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا تو یہی کہا کہ لَا تَثْرِیْبَ عَلَیْکُمُ الْیَوْمَ۔ جاؤ آج تم سے کوئی باز پرس نہیں کی جائیگی۔ اتنے بڑے نمونہ کو دیکھتے ہوئے بھی اگر کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ اسلام اپنے دشمنوں سے رواداری کی تعلیم نہیں دیتا تو اُس سے زیادہ نابینا اور کوئی شخص نہیں ہو سکتا۔

اسلام کی ایسی روادارانہ تعلیم کا ہی یہ اثر تھا کہ اسلامی ملکوں میں اسلامی حکومتوں کے ماتحت غیر اقوام کے لوگ بڑے بڑے اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں اور آپ کے خلفاء کے زمانہ میں اسلام ایک جنگی انتشار کی حالت میں سے گذر رہا تھا اور ابھی ایسی حکومت قائم نہیں ہوئی تھی جس میں تمام اقوام مل کر بس جانے کا فیصلہ کرتیں اس لئے بعض سیاسی حقوق کامل طور پر غیر مسلموں کو نہیں دیئے جاسکتے تھے مگر باوجود اسکے جہاں جہاں ممکن تھا اُن کو سرداری کے حقوق دیئے گئے ہیں چنانچہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے اہل مقنا کو جو خط لکھا اُس میں صاف طور پر یہ الفاظ پائے جاتے ہیں کہ لَیْسَ عَلَیْکُمْ اَمِیْرٌ اِلَّا مِنْ اَنْفُسِکُمْ اَوْ مِنْ اَھْلِ رَسُوْلِ اللّٰہِ (مجموعۃ الوثائق السیاسیہ ص۳۶) یعنی تمہاری قوم میں گورنر یا تم میں سے ہو گا یا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان میں سے ہو گا۔ اس میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم تسلیم فرماتے ہیں کہ کسی علاقہ کا گورنر غیر مسلم بھی ہو سکتا ہے۔

اسی طرح رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خلفاء کے زمانہ میں بھی حالانکہ ابھی ملک میں پُر امن طور پر ساری قومیں نہیں بسی تھیں ان حقوق کو تسلیم کیا جاتا تھا۔ چنانچہ علامہ شبلی اس کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"حضرت عمرؓ نے صیغۂ جنگ کو جو وسعت دی تھی اس کے لئے کسی قوم اور کسی ملک کی تخصیص نہ تھی۔ یہاں تک کہ مذہب و ملت کی بھی کچھ قید نہ تھی۔ والنٹیر فوج میں تو ہزاروں مجوسی شامل تھے جن کو مسلمانوں کے برابر مشاہرے ملتے تھے۔ فوجی نظام میں بھی مجوسیوں کا پتہ ملتا ہے"

(الفاروق حصّہ دوم زیر عنوان صیغۂ فوج ص۱۰۱)

اسی طرح لکھتے ہیں:۔

"یونانی اور رومی بہادر بھی فوج میں شامل تھے۔ چنانچہ فتح مصر میں ان میں سے پانسو آدمی شریک جنگ تھے۔ اور جب عمرو بن العاص نے فسطاط آباد کیا تو یہ جداگانہ محلّے میں آباد کئے گئے۔ یہودیوں سے بھی یہ سلسلہ خالی نہ تھا چنانچہ مصر کی فتح میں ان میں سے ایک ہزار آدمی اسلامی فوج میں شریک تھے۔"

(الفاروق حصّہ دوم ص۱۰۶)

اسی طرح تاریخ سے ثابت ہے کہ غیر اقوام کے افراد کو جنگی افسر بھی مقرر کیا جاتا تھا۔ چنانچہ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں ایرانیوں کو بھی فوجی افسر مقرر کیا گیا۔ اُن میں سے بعض کے نام بھی تاریخ میں موجود ہیں۔ علامہ شبلی نے چھ فوجی افسروں کے نام یہ لکھے ہیں۔

"سیاہ۔ خسرو۔ شہریار۔ شیرویہ۔ شہرویہ۔ افرودین۔" (الفاروق حصہ دوم ص۱۰۶)

ان افسروں کو تنخواہیں بھی سرکاری خزانہ سے ملتی تھیں PAY ROLL میں اُن کا نام تھا۔ چاروں خلفاء کے بعد حضرت معاویہؓ کے متعلق تاریخ سے ثابت ہے کہ اُنکے زمانہ میں ایک عیسائی ابن آثال نامی وزیر خزانہ تھا۔

(تاریخ عرب مصنفہ پروفیسر ہٹی ایڈیشن پنجم ص۲۳۴)

عباسی خلافت کے زمانہ میں باقاعدہ منظم حکومت قائم کی گئی

اور مختلف قوموں اور علاقوں کے نمائندوں کی ایک کونسل
آف سٹیٹس مقرر کی گئی۔ اس کونسل آف سٹیٹ میں عیسائی یہودی
صابی اور زرتشتی بھی شامل تھے A SHORT
HISTORY OF THE SARACENS
BY AMIR ALI P. 274-275
اس زمانہ میں ایک عیسائی وزیر جنگ بھی مقرر کیا گیا۔ چنانچہ
عباسی خلیفہ معتضد کا وزیر جنگ ایک عیسائی تھا جس کا نام
صابی تھا (تاریخ عرب مصنفہ پروفیسر ہٹی ایڈیشن پنجم ص ۳۵۵)
عباسی خلیفہ المتقی کا بھی ایک عیسائی وزیر تنوخی نام کا تھا
(تاریخ عرب مصنفہ پروفیسر ہٹی ایڈیشن پنجم ص ۳۵۵) بوئیہہ
خاندان کے ایک بادشاہ عضد الدولہ کا بھی ایک عیسائی وزیر
نصر بن ہارون تھا (تاریخ عرب مصنفہ پروفیسر ہٹی ص ۳۵۵)
سپین کی حکومت کے متعلق بھی تاریخ سے ثابت ہے
کہ اُس میں قاضی القضاۃ تک کا عہدہ بھی غیر مذہب والوں کو
دیا جاتا تھا۔ چنانچہ عبدالرحمن ثالث بادشاہ سپین کے بیٹے
الحکم ثانی کے زمانہ میں ایک عیسائی ولید بن خیزران کو
قرطبہ میں حکومت کا جج مقرر کیا گیا (تاریخ عرب مصنفہ پروفیسر
ہٹی ایڈیشن پنجم ص ۵۳۱) اسی طرح عبدالرحمن ثالث بادشاہ
سپین کا ایک یہودی وزیر تھا جس کا نام ربی حسدی بن شپروط
تھا (تاریخ عرب مصنفہ پروفیسر ہٹی ص ۵۷۷) اسی طرح تاریخ
سے معلوم ہوتا ہے کہ سپین میں بھی ایک کونسل آف سٹیٹ
مقرر کی گئی تھی جس کے ممبر غیر مسلم بھی ہوتے تھے۔ چنانچہ
ایک عیسائی GOMEZ SON OF ANTONY
بھی اس کونسل آف سٹیٹ کا ممبر تھا اور بادشاہ عبدالرحمن ثالث
نے ایک بڑی سیاسی میٹنگ میں جس کے لئے تمام سپینش
بشپ بلائے گئے تھے اپنی بیماری کی وجہ سے اس کو اپنا
قائم مقام بنا کر بھیجا اور اُسے ریذیڈنٹ مقرر کیا۔
A SHORT HISTORY OF THE
SARACENS BY AMIR ALI P. 448
اسی طرح سموئل بن عارف ایک عیسائی اسلامی حکومت غرناطہ
میں وزیر مقرر کیا گیا (اخبار اندلس جلد سوم ص ۴۶)
سکاٹس کی "تاریخ اندلس" میں یہ بھی لکھا ہے کہ
جب بادشاہوں کو کوئی اہم سفارت بھیجنی ہوتی تھی تو وہ
معتمد یہودیوں کو بھیجا کرتے تھے (اخبار اندلس جلد سوم ترجمہ
از خلیل الرحمن صاحب ص ۱۴۵)
مصر کی فاطمی حکومت میں بھی غیر مسلموں کو بڑے بڑے
درجے دیئے جاتے تھے۔ چنانچہ فاطمی بادشاہ العزیز کے زمانہ
میں ایک عیسائی عیسیٰ بن نسطور کو وزیر بنایا گیا (تاریخ عرب
مصنفہ پروفیسر ہٹی ایڈیشن پنجم ص ۶۲۰) اسی طرح تاریخ
سے یہ بھی ثابت ہے کہ بہت سے فاطمی بادشاہوں کے
وزراء عیسائی اور یہودی ہوا کرتے تھے A SHORT
HISTORY OF THE SARACENS BY
AMIR ALI P. 413
ہندوستان میں سب سے زیادہ بدنام اورنگ زیب
ہے لیکن اورنگ زیب کے متعلق تاریخ سے ثابت ہے کہ
وہ سیاسی معاملات میں کسی قسم کا امتیاز اور فرق کرنا جائز
نہیں سمجھتا تھا۔ اور دلیل یہی دیا کرتا تھا کہ قرآن کریم میں
صاف حکم ہے کہ لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ۔ چنانچہ
ایک دفعہ اس کے پاس درخواست کی گئی کہ ذمیوں کو
کلیدی عہدوں سے الگ کیا جائے۔ اس پر اُس نے جواب
دیا کہ مذہب کا دنیوی معاملات سے کوئی تعلق نہیں اور
اس قسم کے معاملات میں تعصب کو کوئی دخل نہیں ہونا
چاہیئے۔ پھر اُس نے یہ آیت پڑھی کہ لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَ
لِيَ دِيْنِ۔ پھر اُس نے کہا کہ اگر ہم اس درخواست کو
تسلیم کریں تو پھر ہمیں تمام راجوں اور اُن کی رعایا کو
قتل کر دینا چاہیئے۔ PREACHING OF
ISLAM BY SIR THOMAS
ARNOLD P. 214
ANECDOTES OF AURANG ZEB
BY SIR JADHNAND CIRCAR.
P. 97-100

اسی طرح عالمگیر کے ایک فرمان کا یہ فقرہ ہے کہ
" حکومت کے عہدے قابلیت کے اصول
پر دئے جائیں۔ کسی اور خیال کے ماتحت
نہ دئے جائیں۔"

PREACHING OF ISLAM BY
SIR THOMAS ARNOLD P. 214.

پھر مغلیہ حکومت کے متعلق ایک اور مصنف لکھتا ہے کہ
" بنگال کا حکومتی مذہب اسلام ہے۔
لیکن ملازمتوں کا یہ حال ہے کہ ایک مسلمان
کے مقابلہ میں سَو ہندو ہے اور تمام سرکاری
عہدے اور اعتبار کی جگہیں دونوں قوموں
سے چُنی جاتی ہیں۔"

A NEW ACCOUNT OF THE EAST
INDIES VOL. 2 PAGE 14.

اور یہ تو ہر شخص جانتا ہے کہ مغلیہ حکومت نے ہندو
کمانڈر انچیف تک مقرر کئے۔ چنانچہ جرنیل مان سنگھ۔
جسونت سنگھ اور جے سنگھ مشہور مثالیں ہیں مسلمانوں
کا غیر مسلموں سے یہ روادارانہ سلوک اتنا نمایاں تھا کہ خود
غیر مسلموں نے بھی اس کا اعتراف کیا ہے۔ چنانچہ مشہور
عیسائی مؤرخ جرجی زیدان لکھتا ہے :۔

" مسلمانوں کے نہایت تیزی کے ساتھ علمی
ترقی کرنے کا ایک زبردست سبب یہ بھی
تھا کہ خلفاء اسلام ہر قوم اور ہر مذہب کے
علماء کے بہت بڑے قدر دان تھے اور
ہمیشہ اُن کو انعام و اکرام سے مالا مال کرتے
رہتے تھے۔ اُن کے مذہب، اُن کی قومیت
اور اُن کے نسب کا کچھ خیال نہیں کرتے تھے
اُن میں نصرانی۔ یہودی۔ صابی۔ سامری
اور مجوسی غرض ہر مذہب و ملت کے لوگ تھے
خلفاء ان کے ساتھ نہایت عزت اور عظمت
کا برتاؤ کرتے تھے۔ اور غیر مسلموں کو وہی اُونچی
اور درجہ حاصل تھا جو مسلمان امراء یا حکام
کو حاصل ہوتا تھا۔"

(تاریخ التمدن الاسلامی جلد ۳ صفحہ ۱۴۴)

ان حوالہ جات سے یہ امر واضح ہے کہ اسلام
غیر مسلموں کے ساتھ کسی قسم کی ناواجب سختی کی تعلیم نہیں
دیتا بلکہ وہ اُن کے تمام حقوق کا خیال رکھتا اور اُن پر
ہر قسم کے ظلم کو ناجائز قرار دیتا ہے۔ تاریخ میں لکھا
ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ایک
دفعہ ایک مسلمان نے ایک ذمی کافر کو قتل کر دیا۔ اس پر
رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ اس مسلمان کو
قصاص کے طور پر قتل کر دیا جائے اور فرمایا ذمیوں کے
حقوق کی حفاظت میرا سب سے اہم فرض ہے۔
(نصب الرایہ فی تخریج احادیث الہدایہ جلد ۴ صفحہ ۳۳۶)
اسی بناء پر امام یوسفؒ نے کتاب الخراج میں اس امر
کو تسلیم کیا ہے کہ عہد نبویؐ اور زمانۂ خلافتِ راشدہ میں
ایک مسلمان اور ذمی کا درجہ تعزیرات اور دیوانی قانون کے
لحاظ سے بالکل یکساں تھا۔ اور دونوں میں کوئی امتیاز
نہیں کیا جاتا تھا۔ (کتاب الخراج صفحہ ۱۰۸) ایک دفعہ
خیبر کے یہودیوں کی شرارتوں سے تنگ آ کر بعض مسلمانوں نے
اُن کے کچھ جانور لوٹ لئے۔ اور اُن کے باغوں کے پھل توڑ
لئے۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو اس بات کا علم ہُوا تو
آپ سخت ناراض ہوئے اور فرمایا۔ اللہ تعالیٰ نے تمہیں
یہ اجازت نہیں دی کہ تم رضامندی حاصل کئے بغیر اہلِ
کتاب کے گھروں میں گھس جاؤ۔ اسی طرح تمہارے لئے
یہ بھی جائز نہیں کہ تم اُن کی عورتوں کو مارو یا اُن کے
باغوں کے پھل توڑو (ابوداؤد جلد ۲ صفحہ ۴۲۴)
ایک دفعہ بعض صحابہؓ نے سفر کی حالت میں جبکہ

انہیں بھوک کی تکلیف تھی کفار کی چند بکریاں پکڑ لیں ۔ اور ذبح کرکے اُن کا گوشت پکانا شروع کر دیا ۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہُوا تو آپ نے ہانڈیاں اُلٹ دیں اور فرمایا کہ لوٹ کی ہر چیز مُردار سے بدتر ہے ۔ (ابن ہشام جلد ۲ صفحہ ۱۸۸) ایک دفعہ مشرکین کے چند بچے لشکر کی لپیٹ میں آکر ہلاک ہو گئے ۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کا بڑا صدمہ ہُوا ۔ اور آپ نے فرمایا مشرکین کے بچے بھی تمہاری طرح کے انسان ہیں ۔ اس لئے خبردار بچوں کو قتل مت کرو ۔ خبردار بچوں کو قتل مت کرو (مسند احمد بن حنبل جلد ۴ صفحہ ۲۴)

ممکن ہے اس موقعہ پر کسی شخص کے دل میں سوال پیدا ہو کہ اگر اسلام غیر مذاہب کے متعلق ایسی ہی رواداری کی تعلیم کا حامل ہے تو پھر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنی مدنی زندگی میں کفار کے مقابلہ میں تلوار کیوں اٹھائی؟ سو اس کے متعلق یہ امر یاد رکھنا چاہیئے کہ بیشک رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو کفار کے مقابلہ میں تلوار اٹھانی پڑی مگر آپ کا یہ تلوار اٹھانا محض دفاعی طور پر تھا ۔ جب عرب کے کفار نے تلوار کے زور سے اسلام کو مٹانا چاہا اور برابر تیرہ سال تک وہ ہر قسم کے مظالم سے کام لے کر مسلمانوں کو اُن کے دین اور مذہب سے منحرف کرنے کی کوشش کرتے رہے تو آخر اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو اجازت دی کہ اب ان کفار کے مظالم کا جنہوں نے تلوار سے اسلام کو مٹانا چاہا ہے تلوار سے ہی جواب دیا جائے تاکہ دین اور مذہب کی اشاعت کے راستہ میں انہوں نے جو روکیں پیدا کر رکھی ہیں وہ دُور ہوں ۔ پس یہ جنگیں محض دفاعی اور دشمن کے ظالمانہ حملوں کے جواب میں تھیں ۔ چنانچہ اسلام نے صاف طور پر کہہ دیا کہ تم صرف اُن لوگوں سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں اور اُسوقت تک لڑو جب تک وہ تم سے لڑتے ہیں (بقرہ ع ۲۵) اور دفاع کے طور پر تلوار چلانا ہرگز ناپسندیدہ نہیں ہوسکتا ۔ اگر اسلام تلوار سے پھیلا تھا تو تلوار چلانے والے اُس کے پاس کہاں سے آگئے تھے ۔ اور جس مذہب نے ایسے تلوار چلانے والے پیدا کر لئے تھے کہ جنہوں نے اپنا سب کچھ قربان کرکے سارے ملک کی مخالفت کے باوجود اس کو دنیا میں قائم کر دیا اُس مذہب کیلئے کیا یہ مشکل تھا کہ وہ دلائل کے زور سے دوسرے لوگوں سے بھی اپنی صداقت منوا لیتا ۔ مگر سوال تو یہ ہے کہ وہ عیسائی مستشرق جو اسلام کو تلوار کا مذہب قرار دیتے ہیں خود اُن کی اپنی کتابوں میں کیا تعلیم دی گئی ہے اور اُن کے مسلّمہ انبیاء اس اصل کے ماتحت کہاں تک راستباز اور صادق سمجھے جا سکتے ہیں ۔ تورات جس کے متعلق مسیحؑ نے کہا تھا کہ اس کا ایک شوشہ تک نہیں بدل سکتا (متی باب ۵ آیت ۱۸) اُس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یہ تعلیم دی گئی تھی کہ اگر کسی شہر کے باشندے تجھ سے لڑائی کریں تو

"تو اُس کا محاصرہ کر اور جب خداوند تیرا خدا اُسے تیرے قبضہ میں کر دے ۔ تو وہاں کے ہر ایک مرد کو تلوار کی دھار سے قتل کر ۔ مگر عورتوں اور لڑکوں اور مواشی کو اور جو کچھ اُس شہر میں ہو اُس کا سارا لُوٹ اپنے لئے لے اور تُو اپنے دشمنوں کی اس لوٹ کو جو خداوند تیرے خدا نے تجھے دی ہے کھائیو ۔ اِسی طرح سے تُو اُن سب شہروں سے جو تجھ سے بہت دُور ہیں اور ان قوموں کے شہروں میں سے نہیں ہیں یہی حال کیجیو ۔ لیکن ان قوموں کے شہروں میں جنہیں خداوند تیرا خدا تیری میراث کر دیتا ہے کسی چیز کو جو سانس لیتی ہے جیتا نہ چھوڑیو ۔ بلکہ تو

اُن کو حرم کیجیو - حِتّی اور اموری اور کنعانی اور فرزّی اور حوّی اور یبوسی کو جیسا کہ خداوند تیرے خدا نے حکم کیا ہے تاکہ وے اپنے سارے کریہہ کاموں کے مطابق جو انہوں نے اپنے معبودوں سے کئے تم کو عمل کرنا نہ سکھائیں اور کہ تم خداوند اپنے خدا کے گنہگار ہو جاؤ۔"
(استثنا باب ۲۰ آیت ۱۰ تا ۱۸)

مگر باوجود اس کے کہ موسیٰ نے یہ تعلیم دی اور باوجود اس کے کہ یشوع اور داؤد اور دوسرے انبیاء نے اس تعلیم پر متواتر عمل کیا - یہودی اور عیسائی ان کو خدا کا نبی سمجھتے ہیں اور تورات کو خدا کی کتاب سمجھتے ہیں - موسوی سلسلہ کے آخر میں حضرت مسیحؑ ظاہر ہوئے - اُن کی یہ تعلیم تھی کہ ظالم کا مقابلہ نہ کرنا - بلکہ جو تیرے داہنے گال پر طمانچہ مارے دوسرا بھی اُس کی طرف پھیر دے (متی باب ۵ آیت ۳۹) اس سے استنباط کرتے ہوئے عیسائی قوم یہ دعویٰ کیا کرتی ہے کہ مسیحؑ نے لڑائی سے قوموں کو منع کیا ہے - لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ انجیل میں اس تعلیم کے خلاف اور تعلیمیں بھی آئی ہیں - مثلاً انجیل میں لکھا ہے :-

"یہ مت سمجھو کہ مَیں زمین پر صلح کروانے آیا ہوں - صلح کروانے نہیں بلکہ تلوار چلانے آیا ہوں - " (متی باب ۱۰ آیت ۳۴)

اسی طرح لکھا ہے کہ اُس نے کہا :-

"جس کے پاس تلوار نہیں اپنے کپڑے بیچ کر تلوار خریدے -"
(لوقا باب ۲۲ آیت ۳۶)

یہ آخری دو تعلیمیں پہلی تعلیم کے بالکل متضاد ہیں اگر مسیح جنگ کروانے کے لئے آیا تھا تو پھر ایک گال پر تھپّڑ کھا کر دوسرا گال پھیر دینے کے کیا معنے تھے ؟

پس یا تو یہ دونوں قسم کی تعلیمیں متضاد ہیں یا ان دونوں تعلیموں میں سے کسی ایک کو اس کے ظاہر سے پھیر کر اُس کی کوئی تاویل کرنی پڑے گی - ہم اس بحث میں نہیں پڑتے کہ ایک گال پر تھپّڑ کھا کر دوسرا گال پھیر دینے کی تعلیم قابلِ عمل ہے یا نہیں - سوال یہ ہے کہ عیسائی دنیا نے اپنی ساری تاریخ میں جنگ سے دریغ نہیں کیا - جب عیسائیت شروع شروع میں رُوما میں غالب تھی تب بھی اُس نے غیر قوموں سے جنگیں کیں - دفاعی ہی نہیں بلکہ جارحانہ بھی - اور اب جبکہ عیسائیت دنیا میں غالب آگئی ہے اب بھی وہ جنگیں کرتی ہے - دفاعی ہی نہیں بلکہ جارحانہ بھی - صرف فرق یہ ہے کہ جنگ کرنیوالوں میں سے جو فریق جیت جاتا ہے - اس کے متعلق کہہ دیا جاتا ہے کہ وہ کرسچن سولیزیشن کا پابند تھا - کرسچن سولیزیشن بھی زمانہ میں صرف غالب اور فاتح کے طریقِ کار کا نام ہے ورنہ اس لفظ کے حقیقی معنے اب کوئی باقی نہیں رہے - جب دو قومیں آپس میں لڑتی ہیں تو ہر قوم اس بات کی مدعی ہوتی ہے کہ وہ کرسچن سولیزیشن کی تائید کر رہی ہے اور جب کوئی قوم جیت جاتی ہے تو کہا جاتا ہے کہ اس جیتی ہوئی قوم کا طریقِ کار ہی کرسچن سولیزیشن ہے - حالانکہ کرسچن سولیزیشن کوئی چیز ہی نہیں ایک غلط لفظ ہے جس کے کوئی بھی معنے نہیں - مگر بہر حال مسیح کے زمانہ سے آج تک عیسائی دنیا جنگ کرتی چلی آ رہی ہے اور قرائن بتاتے ہیں کہ جنگ کرتی چلی جائیگی - پس جہاں تک مسیحی دنیا کے فیصلہ کا تعلق ہے یہی معلوم ہوتا ہے کہ "تم اپنے کپڑے بیچ کر تلوار خریدو -" اور یہ کہ "مَیں صلح کرانے کے لئے نہیں بلکہ تلوار چلانے کے لئے آیا ہوں" یہ اصل قانون ہے اور "تو ایک گال پر تھپّڑ کھا کر دوسرا بھی پھیر دے" یہ قانون یا تو ابتدائی عیسائی دنیا کی کمزوری کے وقت مصلحتاً اختیار کیا گیا تھا اور یا پھر

عیسائی افراد کے باہمی تعلقات کی حد تک یہ قانون محدود ہے حکومتوں اور قوموں پر یہ قانون چسپاں نہیں ہوتا۔ چنانچہ بعض پادری اس کی یہی تاویل کرتے ہیں۔ دوسرے اگر یہ بھی سمجھ لیا جائے کہ مسیحؑ کی اصل تعلیم جنگ کی نہیں تھی بلکہ صلح ہی کی تھی تب بھی اس تعلیم سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ جو شخص اس تعلیم کے خلاف عمل کرتا ہے وہ خدا کا برگزیدہ نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ عیسائی دنیا آج تک موسیٰ اور یشوع اور داؤد کو خدا کا برگزیدہ قرار دیتی ہے۔ بلکہ خود عیسائیت کے زمانہ کے بعض قومی ہیرو جنہوں نے اپنی قوم کے لئے جان کو خطرہ میں ڈال کر دشمنوں سے جنگیں کی تھیں انہیں مختلف زمانہ کے پوپوں کے فتویٰ کے مطابق آج سینٹ کہا جاتا ہے۔

لیکن اسلام ان دونوں قسم کی تعلیموں کے درمیان درمیان تعلیم دیتا ہے۔ وہ نہ تو موسیٰ کی طرح یہ کہتا ہے کہ تُو جارحانہ طور پر کسی ملک میں گھس جا اور اس قوم کو تہ تیغ کر دے اور نہ وہ اِس زمانہ کی بگڑی ہوئی مسیحیت کی طرح ببانگِ بلند تو یہ کہتا ہے کہ "اگر کوئی تیرے ایک گال پر تھپڑ مارے تو تُو اپنا دوسرا گال بھی اُس کی طرف پھیر دے" اور اپنے ساتھیوں کے کان میں یہ کہتا ہے کہ تم اپنے کپڑے بیچ کر بھی تلوار خرید لو۔ بلکہ اسلام وہ تعلیم پیش کرتا ہے جو فطرت کے عین مطابق ہے اور جو امن اور صلح کے قیام کا ایک ہی ذریعہ ہے اور وہ یہ کہ تُو کسی پر حملہ نہ کر۔ لیکن اگر کوئی شخص تجھ پر حملہ کرے اور اُس کا مقابلہ نہ کرنا فتنہ کے بڑھانے کا موجب نظر آئے اور راستی اور امن اُس سے مٹتا ہو۔ تب تُو اُس حملے کا جواب دے۔ اب بتاؤ کہ کیا یہ ظالمانہ تعلیم ہے یا یہی وہ تعلیم ہے جس پر عمل کرکے دنیا میں امن اور صلح قائم ہو سکتی ہے۔ اس تعلیم پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عمل کیا۔ آپ مکہ میں برابر تکلیفیں اُٹھاتے رہے لیکن آپ نے لڑائی کی طرح نہ ڈالی۔ جب مدینہ میں آپؐ ہجرت کرکے تشریف لے گئے اور دشمن نے وہاں بھی آپؐ کا پیچھا کیا تب خدا تعالیٰ نے آپ کو حکم دیا کہ چونکہ دشمن جارحانہ کارروائی کر رہا ہے اور اسلام کو مٹانا چاہتا ہے۔ اسلئے راستی اور صداقت کے قیام کے لئے آپ اس کا مقابلہ کریں۔ مگر ساتھ ہی اللہ تعالیٰ نے وضاحتاً ہدایت دیدی کہ وَ قَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَکُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الْمُعْتَدِیْنَ۔ (بقرہ ع ۲۴) یعنی اُن لوگوں سے جو تم سے جنگ کرتے ہیں محض اللہ تعالیٰ کی خاطر جس میں تمہارے اپنے نفس کا غصہ اور نفس کی ملونی شامل نہ ہو جنگ کرو۔ اور یاد رکھو کہ جنگ میں بھی کوئی ظالمانہ فعل نہ کرنا کیونکہ اللہ تعالیٰ ظالموں کو پسند نہیں کرتا۔ پھر فرمایا:۔ قُلْ لِّلَّذِیْنَ کَفَرُوْٓا اِنْ یَّنْتَھُوْا یُغْفَرْ لَھُمْ مَّا قَدْ سَلَفَ۔ وَاِنْ یَّعُوْدُوْا فَقَدْ مَضَتْ سُنَّتُ الْاَوَّلِیْنَ۔ وَقَاتِلُوْھُمْ حَتّٰی لَا تَکُوْنَ فِتْنَۃٌ وَّیَکُوْنَ الدِّیْنُ کُلُّہٗ لِلّٰہِ۔ فَاِنِ انْتَھَوْا فَاِنَّ اللّٰہَ بِمَا یَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ۔ (انفال ع ۵) یعنی اے محمد رسول اللہ اگر یہ لوگ اب بھی لڑائی سے باز آجائیں تو جو کچھ وہ پہلے کر چکے ہیں انہیں معاف کر دیا جائیگا۔ لیکن اگر وہ لڑائی سے باز نہ آئیں اور بار بار حملے کریں تو پہلے انبیاء کے دشمنوں کے انجام ان کے سامنے ہیں۔ ان کا انجام بھی وہی ہوگا اور اے مسلمانو۔ تم اس وقت تک جنگ جاری رکھو جب تک کہ دنیا سے مذہب کی خاطر دُکھ دینا مٹ نہ جائے۔ اور دین کو کُلّی طور پر خدا تعالیٰ کے سپرد نہ کر دیا جائے۔ پھر اگر یہ لوگ ان باتوں سے باز آجائیں تو محض اِس وجہ سے اُن سے جنگ نہ کرو کہ وہ ایک غلط دین کے پیرو ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ اُن کے عمل کو جانتا ہے وہ خود جیسا چاہے گا ان سے معاملہ

وَ تَوَكَّلْ عَلَى الْحَيِّ الَّذِيْ لَا يَمُوْتُ وَ سَبِّحْ بِحَمْدِهٖ ؕ

اور تُو اُس پر توکل کر جو زندہ ہے (اور سب کو زندہ رکھتا ہے) کبھی نہیں مرتا ۔ اور اُس کی تعریف کے ساتھ اُس کی تسبیح بھی کر

مۃ وَ كَفٰى بِهٖ بِذُنُوْبِ عِبَادِهٖ خَبِيْرَا ۝۵۹ ۚۛ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ

اور وہ اپنے بندوں کے گناہوں سے خوب واقف ہے ۔ وہ (خدا) جس نے آسمانوں اور

کرے گا ۔ تمہیں اُن کے غلط دین کی وجہ سے اُن کے کاموں میں دخل دینے کی اجازت نہیں ہو سکتی ۔ پھر فرمایا ۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا ضَرَبْتُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَتَبَيَّنُوْا وَ لَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ اَلْقٰٓى اِلَيْكُمُ السَّلٰمَ لَسْتَ مُؤْمِنًا ۚ تَبْتَغُوْنَ عَرَضَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۫ فَعِنْدَ اللّٰهِ مَغَانِمُ كَثِيْرَةٌ ؕ كَذٰلِكَ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلُ فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ فَتَبَيَّنُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ۝ (نساء ع۱۳) یعنی اے مومنو! جب تم خدا کی خاطر لڑائی کرنے کے لئے باہر نکلو تو اس بات کی اچھی طرح تحقیقات کر لیا کرو ۔ کہ تمہارے دشمن پر حجت تمام ہو چکی ہے اور وہ بہر حال لڑائی پر آمادہ ہے ۔ اور اگر کوئی شخص تمہیں کہے کہ میں تو صلح کرتا ہوں تو یہ مت کہو کہ تُو دھوکا دیتا ہے ۔ اور ہمیں امید نہیں کہ ہم تجھ سے امن میں رہیں گے ۔ اگر تم ایسا کرو گے تو پھر تم خدا کی راہ میں لڑنے والے نہیں سمجھے جاؤ گے ۔ بلکہ تم دنیا طلب قرار پاؤ گے ۔ پس ایسا مت کرو کیونکہ جس طرح خدا کے پاس دین ہے اسی طرح خدا کے پاس دنیا کا بھی بہت سا سامان ہے ۔ تمہیں یاد رکھنا چاہیئے کہ کسی شخص کا مار دینا اصل مقصود نہیں ۔ تمہیں کیا معلوم ہے کہ کل کو وہ ہدایت پا جائے ۔ تم بھی تو پہلے دین اسلام سے باہر تھے ۔ پھر اللہ تعالیٰ نے احسان کر کے تمہیں اس دین کے اختیار کرنے کی توفیق دی ۔ پس مارنے میں جلدی مت کرو ۔ بلکہ حقیقتِ حال کی تحقیق کیا کرو ۔ اور یاد رکھو جو کچھ تم کرتے ہو اللہ تعالیٰ اس سے خوب واقف ہے ۔

اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ جب لڑائی شروع ہو جائے تب بھی اس بات کی اچھی طرح تحقیق کرنی چاہیئے کہ دشمن کا ارادہ جارحانہ لڑائی کا ہے یا نہیں ۔ کیونکہ ممکن ہے کہ دشمن جارحانہ لڑائی کا ارادہ نہ کرتا ہو بلکہ وہ خود کسی خوف کے ماتحت فوجی تیاری کر رہا ہو ۔ پس پہلے اچھی طرح تحقیقات کر لیا کرو ۔ کہ دشمن کا ارادہ جارحانہ جنگ کا تھا تب اس کے سامنے مقابلہ کے لئے آؤ ۔ اور اگر وہ یہ کہے کہ میرا ارادہ تو جنگ کرنے کا نہیں تھا میں تو صرف خوف کی وجہ سے تیاری کر رہا تھا تو تمہیں یہ نہیں کہنا چاہیئے کہ نہیں تمہاری جنگی تیاری بتاتی ہے کہ تم ہم پر حملہ کرنا چاہتے تھے ۔ ہم کس طرح سمجھیں کہ ہم تم سے مامون اور محفوظ ہیں ۔ بلکہ اس کی بات کو قبول کر لو اور یہ سمجھو کہ اگر پہلے اس کا ایسا ارادہ بھی تھا تو ممکن ہے بعد میں اُس میں تبدیلی پیدا ہو گئی ہو ۔ کیونکہ تم خود اس بات کے زندہ گواہ ہو کہ دلوں میں تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے ۔ تم بھی پہلے اسلام کے دشمن تھے مگر اب تم اسلام کے سپاہی ہو ۔

اس قسم کے واضح احکام کی موجودگی میں اسلام پر یہ الزام لگانا کہ وہ غیر مسلموں سے روا دارانہ سلوک کا حامی نہیں اور یہ کہ وہ تلوار کے زور سے دوسروں کو اپنے مذہب میں داخل کرنا جائز سمجھتا ہے دشمنانِ اسلام کی انتہائی جسارت اور اُنکی ناانصافی کا بدترین مظاہرہ ہے ۔

وَالۡاَرۡضَ وَمَا بَیۡنَہُمَا فِیۡ سِتَّۃِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسۡتَوٰی

اور زمین اور جو کچھ اُن کے درمیان ہے اِن سب کو چھ اوقات میں پیدا کیا ہے پھر وہ مضبوطی سے

عَلَی الۡعَرۡشِ ۚۛ اَلرَّحۡمٰنُ فَسۡـَٔلۡ بِہٖ خَبِیۡرًا ﴿۶۰﴾

عرش پر قائم ہوگیا۔ وہ رحمٰن ہے۔ پس جب بھی (اے انسان) تو اُس کے متعلق کوئی سوال کرے تو خبیر سے سوال کر جو بہت باخبر ہے

۲۷ تفسیر: فرماتا ہے تمہیں چاہیئے کہ تم صرف اُس خدا پر توکّل کرو جو زندہ ہے اور جس پر کبھی موت وارد نہیں ہوسکتی۔ اور اُس کی تعریف کے ساتھ ساتھ اُسکی تسبیح کرو۔ اور اس امر کو اچھی طرح سمجھ لو کہ تمہارا خدا اپنے بندوں کی کمزوریوں کو خوب جانتا ہے۔

افسوس ہے کہ ہمارے ملک میں توکّل کے لفظ کا بڑا غلط استعمال ہو رہا ہے۔ توکّل کے معنے ہوتے ہیں انسان اپنے معاملہ کو کلّی طور پر خدا تعالےٰ کے سپرد کردے۔ اور خدا تعالیٰ کے سپرد کرنے کے یہ معنے ہیں کہ انسان خدا تعالےٰ کے بنائے ہوئے قواعد کے مطابق چلے جس کی طرف سَبِّحۡ بِحَمۡدِہٖ میں اشارہ کیا گیا ہے۔ اور لوگوں کو سمجھایا گیا ہے کہ توکّل کے یہ معنے نہیں کہ انسان اُن ذرائع کو استعمال نہ کرے جو خدا تعالےٰ نے کسی کام کی کامیابی کے لئے مقرر کئے ہوئے ہیں کیونکہ اگر وہ ایسا کریگا تو وہ قانونِ قدرت کو لغو قرار دینے والا ہوگا۔ اُس کی تعریف کرنے والا نہیں ہوگا۔ اور اگر وہ اُن اسباب پر کلّی انحصار کرے گا جو اس عالم میں پائے جاتے ہیں تب بھی وہ توکّل کے خلاف چلیگا کیونکہ اُس کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ حمد کے ساتھ ساتھ اللہ تعالےٰ کی تسبیح کرے اور اللہ تعالیٰ کو ہی ہر قسم کے نقائص اور کمزوریوں سے منزّہ سمجھے۔ اپنے متعلق یہ کبھی تصوّر بھی نہ کرے کہ وہ کسی چیز پر کامل اقتدار رکھتا ہے اور جو چاہے کرسکتا ہے ہر قسم کی کمزوریوں سے پاک صرف اللہ تعالیٰ ہی کی ذات ہے اور ہر قسم کی تعریف اور تحمید کا بھی وہی مستحق ہے۔ پس انسان کا کام یہ ہے کہ وہ توکّل کے ساتھ ساتھ اللہ تعالےٰ کے بنائے ہوئے قوانین سے بھی کام لے اور اُن کے مطابق چلے۔ مثلاً اللہ تعالےٰ نے ہم کو ہاتھ دیئے ہیں پاؤں دیئے ہیں دماغ دیا ہے اور دنیوی سامان بھی عطا فرمائے ہیں ایسی صورت میں اپنے آپ کو خدا کے سپرد کرنے کے یہ معنے ہیں کہ جو کچھ خدا نے جس کام کے لئے پیدا کیا ہے اُسکو ہم استعمال کریں۔ پس توکّل کا پہلا مقام یہ ہے کہ جو کچھ خدا تعالےٰ نے ہم کو دیا ہے اس کو ہم زیادہ سے زیادہ استعمال کریں اور پھر جو کمی رہ جائے وہ خدا تعالیٰ کے سپرد کردیں اور یقین رکھیں کہ خدا اس کمی کو آپ پورا کرے گا۔ جیسے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بدر کے مقام پر صحابہؓ کی ایک ترتیب قائم کی اُن کو اپنی اپنی جگہوں پر کھڑا کیا۔ انہیں نصیحتیں کیں کہ یوں لڑنا ہے اور اس کے بعد ایک عرشہ پر بیٹھ کر دُعائیں کرنے لگ گئے۔ یہ نہیں کیا کہ صحابہؓ کو مدینہ میں چھوڑ جاتے اور آپ اکیلے وہاں بیٹھ کر دُعائیں کرنے لگ جاتے بلکہ پہلے آپ صحابہؓ کو لے کر مقامِ جنگ پر پہنچے۔ پھر اُن کو ترتیب دی اور ان کو نصیحتیں فرمائیں اس کے بعد عرشہ پر بیٹھ گئے اور دُعائیں کرنی شروع کردیں یہ توکّل ہے جو اختیار کرنا چاہیئے۔ ہر وہ شخص جو اُن سامانوں سے کام نہیں لیتا جو خدا تعالےٰ نے اس کو بخشے ہیں اور کہتا ہے کہ میں اپنا کام خدا پر چھوڑتا ہوں وہ جھوٹا ہے وہ خدا سے مسخر کرتا ہے اور ہر وہ شخص جو سامانوں سے کام لیتا ہے اور کہتا ہے کہ اب فلاں کام میں ہی کرونگا

وہ بھی جھوٹا ہے کیونکہ وہ اپنے کاموں میں خدا تعالیٰ کا دخل تسلیم نہیں کرتا۔ کام آسان ہوں یا مشکل آخر اُن کی کنجی خدا تعالیٰ کے اختیار میں ہی ہے۔

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام سے ایک بات مَیں نے بارہا سُنی ہے۔ آپ ترکیہ کے سلطان عبدالحمید خان کا جو معزول ہوگئے تھے ذکر کرتے ہوئے فرمایا کرتے تھے کہ سلطان عبدالحمید خان کی ایک بات مجھے بڑی ہی پسند ہے۔ جب یونان سے جنگ کا سوال اُٹھا تو وزراء نے بہت سے عذرات پیش کر دیئے۔ دراصل سلطان عبدالحمید کا منشاء تھا کہ جنگ ہو مگر وزراء کا منشاء نہیں تھا۔ اسلئے انہوں نے بہت سے عذرات پیش کئے۔ آخر انہوں نے کہا۔ جنگ کیلئے یہ چیز بھی تیار ہے اور وہ چیز بھی تیار ہے لیکن کسی اہم چیز کا ذکر کرکے کہہ دیا کہ فلاں امر کا انتظام نہیں ہے۔ مثلاً یوں سمجھ لو کہ انہوں نے کہا (اور غالباً یہی کہا ہوگا) کہ تمام یورپین طاقتیں اسوقت اس بات پر متحد ہیں کہ یونان کی امداد کریں اور اس کا ہمارے پاس کوئی علاج نہیں۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام فرمایا کرتے تھے کہ جب وزراء نے اپنا مشورہ پیش کیا اور مشکلات بتائیں اور کہا کہ فلاں چیز کا انتظام نہیں تو سلطان عبدالحمید نے جواب دیا کہ کوئی خانہ تو خدا کیلئے بھی چھوڑنا چاہیئے۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام سلطان عبدالحمید کے اِس فقرہ سے بہت ہی لطف اُٹھاتے تھے۔ اور فرمایا کرتے تھے کہ مجھے اس کی یہ بات بہت ہی پسند ہے۔ تو مومن کیلئے اپنی کوششوں میں سے ایک خانہ خدا تعالیٰ کے لئے چھوڑنا ضروری ہوتا ہے۔ درحقیقت سچی بات یہ ہے کہ مومن کبھی بھی ایسے مقام پر نہیں پہنچتا بلکہ دراصل کوئی شخص بھی ایسے مقام پر نہیں پہنچتا جب وہ کہہ سکے کہ اب کوئی رستہ کمزوری کا باقی نہیں رہا۔ اور اگر کوئی انسان کہے کہ مَیں اپنا کام ایسا مکمل کروں کہ اس میں کوئی رخنہ اور سوراخ باقی نہ رہے تو یہ حماقت ہوگی۔ مگر اُسی طرح یہ بھی حماقت ہے کہ انسان اسباب کو بالکل نظر انداز کر دے۔ اِس وقت یورپین قومیں پہلی حماقت میں مبتلا ہیں اور مسلمان دوسری حماقت میں۔ وہ ایک مکان بناتی ہیں اُس کو دروازے لگاتی ہیں۔ اُس پر چھت ڈالتی ہیں اور اُسے پوری طرح مضبوط کرنے کے بعد کہہ دیتی ہیں کہ اب اسے آگ بھی نہیں لگ سکتی۔ اسے زلزلہ بھی نہیں گرا سکتا۔ اور مسلمان اپنے مکان کے لئے صرف آٹھ فٹ کی ایک دیوار کھڑی کرتا ہے۔ نہ اس کی چار دیواری مکمل کرتا ہے نہ اُس پر چھت ڈالتا ہے۔ نہ دروازے اور کھڑکیاں لگاتا ہے اور اُسے چھوڑ کر چلا آتا ہے اور جب پوچھو تو کہہ دیتا ہے کہ بس خدا کے توکل پر مَیں نے ایک دیوار کھڑی کر دی ہے۔ مگر یہ توکل نہیں یہ سستی اور غفلت کی علامت ہے۔ کیونکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ پہلے اپنے اونٹ کا گھٹنا باندھو اور پھر خدا تعالیٰ پر توکل کرو۔ یعنی جہاں تک تم کام کر سکتے ہو کرو۔ لیکن جب تمہارے ہاتھ شل ہو جائیں اور تمہارے تمام سامان ختم ہو جائیں۔ اس وقت تم سجدے میں گر جاؤ اور اللہ تعالیٰ کی مدد مانگو اور اُس پر توکل کرو۔ گویا جب تم ساری تدابیر اختیار کر لو اور تمہاری عقل کہتی ہو کہ اب کوئی چیز باقی نہیں رہی اور دنیا کے علوم کہتے ہوں کہ جتنے علاج ممکن تھے وہ سب ہو چکے۔ جب فراست کہتی ہو کہ اب کوئی رخنہ باقی نہیں رہا اور جب تجربہ کہتا ہو کہ اب کوئی سقم نہیں رہا۔ اُس وقت تم کہو کہ اس کام میں ضرور کوئی نہ کوئی رخنہ ہے جسے خدا پورا کرے گا۔ گویا ایک توکل علمی ہوتا ہے اور ایک عملی۔ علمی توکل وہ ہے جب تمہاری عقل اور دنیا کی عقل۔ اور تمہارا تجربہ اور دنیا کا تجربہ متفقہ طور پر یہ فتویٰ دیتا ہو کہ اب کام مکمل ہوگیا۔ اُسوقت تم کہو کہ یہ ممکن نہیں ضرور اس میں کوئی رخنہ ہے جسے خدا تعالیٰ پورا کرے گا۔ اور عملی توکل یہ ہے کہ جتنے ذرائع حصولِ مقصد کے خدا تعالیٰ نے مقرر کئے ہیں

تم اُن سب ذرائع کو اختیار کرو۔ جتنی قربانی ممکن ہے وہ سب قربانی پیش کرو۔ لیکن اگر اُس کام کی تکمیل کیلئے بعض اور سامانوں کی بھی ضرورت ہو جن کا مہیا کرنا تمہاری استطاعت میں نہو اور دنیا سمجھے کہ تم رہ گئے ہو۔ اُس وقت تمہارا دل مطمئن ہو اور مایوسی تمہارے قریب بھی نہ پھٹکے۔ تم اپنی قلیل پونجی خرچ کرتے جاؤ اور اپنے خون کا آخری قطرہ بہاتے جاؤ اور یقین رکھو کہ خدا تعالیٰ تم کو کبھی نہیں چھوڑیگا اور تم اُس کے فضل سے کامیاب ہو کر رہو گے۔ غرض ایک وہ توکّل ہے جب تمہارا علم اور تجربہ یہ کہتا ہو کہ اب کوئی رخنہ باقی نہیں رہا اور تم یہ کہو کہ رخنہ ہے اور ضرور ہے۔ اور ایک وہ توکّل ہے جب تم سمجھو کہ کامیابی کی کوئی صورت نہیں اور رخنے ہی رخنے نظر آرہے ہیں لیکن اس کے باوجود خدا تعالیٰ اِس کام کو کرکے رہے گا۔ خواہ چھت بھی نہ رہے اور دیواریں بھی گر پڑیں،

غرض ایک توکّل کمزوری کی حالت میں ہوتا ہے اور ایک توکّل قوت کی حالت میں ہوتا ہے۔ جو توکّل قوت کی حالت میں ہوتا ہے اگر وہ صحیح ہو تو وہی اصل توکّل ہے مگر دنیا میں عام طور پر جب لوگ کسی کام کو شروع کرتے ہیں تو کہتے ہیں۔ ہم نے ہی یہ کام کرنا ہے اور ہم اِس کو کرکے رہینگے صرف سامان چاہیئے۔ اور جب سامانوں کے حصول کے لئے انہیں جدوجہد کرنی پڑتی ہے تو ہمتیں ہار کر بیٹھ جاتے ہیں اور کہتے ہیں ہم یہ کام خدا پر چھوڑتے ہیں۔ حالانکہ توکّل ہی دونوں حالتوں میں انسان کو اُلٹ راستے پر چلاتا ہے جب کام مکمل ہو جائے تو توکّل کہتا ہے یہ مکمل نہیں۔ اور جب ہر قسم کی کوششوں اور تمام ذرائع کو استعمال کرنے کے بعد بھی کوئی کام مکمل نہ ہو۔ تو توکّل کہتا ہے۔ تم سمجھو کہ اللہ تعالیٰ کے فضل سے یہ مکمل ہو جائیگا۔ گویا توکّل ہماری عقل کے بالکل خلاف فتویٰ دیتا ہے۔ جب عقل کہتی ہے کہ سامان مکمل نہیں تباہی کے سامان بڑی سرعت سے ہو رہے ہیں تو توکّل کہتا ہے کہ تم خدا کی طرف دیکھو ہمارا خدا مُحیی بھی ہے اور جب عقل کہتی ہے کہ اب تباہی کی کوئی صورت نہیں کامیابی کے سب سامان ہمیں حاصل ہیں تو توکّل کہتا ہے کہ تم ڈرو کیونکہ خدا صرف مُحیی نہیں بلکہ مُمیت بھی ہے۔ گویا عقل جب سب کام کر لیتی ہے تو توکّل کہتا ہے خدا تعالیٰ کی صفتِ مُمیت کو نہ بھولو۔ اور جب ہمارے سب سامان رہ جاتے ہیں اور ہم سمجھتے ہیں کہ اب موت اور تباہی آگئی اور مایوسی ہی مایوسی چاروں طرف دکھائی دیتی ہے تو توکّل کہتا ہے کیا خدا مُحیی نہیں!

پس توکّل کا مفہوم یہ ہے کہ جہاں تک خدا نے تم کو طاقتیں دی ہیں اُن کو پورا استعمال کرو اور اس کے بعد صوفی سے زیادہ خدا پر اعتبار کرو اور کہو کہ جو کمی رہ گئی ہے وہ خدا آپ پوری کرے گا۔ اور پھر خواہ انتہائی مایوسی کا عالم ہو تم ڈٹ کر بیٹھ جاؤ اور کہو کہ ہمارا خدا ہمیں کبھی نہیں چھوڑے گا جیسے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے غارِ ثور میں حضرت ابوبکرؓ سے فرمایا کہ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا (توبہ ع ۶) ہمارا کام یہ تھا کہ دشمن سے بچ کر نکل آتے سو نکل آئے۔ اب دشمن ہمارے سر پر آپہنچا ہے تو یہ خدا کا کام ہے کہ وہ ہمیں بچائے۔ سو ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ خدا ہمارے ساتھ ہے۔ یہ وہ توکّل ہے جس کی اسلام ہمیں تعلیم دیتا ہے یعنی پورے سامان استعمال کرو اور اُس کے بعد خدا تعالیٰ پر کامل یقین رکھو اور چاہے کچھ ہو جائے یہ سمجھ لو کہ خدا ہمیں نہیں چھوڑیگا مگر ہمارے ہاں بدقسمتی سے یہ طریق رائج ہے کہ جب ہمارے کسی کام کا صحیح نتیجہ نہیں نکلتا تو ہم اسے اپنی طرف منسوب نہیں کرتے بلکہ اُسے خدا تعالیٰ کی طرف منسوب کر دیتے ہیں اور کہتے ہیں ہم نے تو محنت کی تھی لیکن اُس کا نتیجہ نکالنا خدا تعالیٰ کے اختیار میں تھا۔ اگر اُس نے نہیں نکالا تو اُس میں ہمارا کیا اختیار ہے۔ اِس طرح ہم اپنی کمزوریوں کو خدا تعالیٰ

کی طرف منسوب کر دیتے ہیں۔ حضرت خلیفۂ اوّل رضی اللہ عنہ ہمیشہ فرمایا کرتے تھے کہ مسلمانوں نے خدا تعالیٰ کا نام اتنا غلط استعمال کیا ہے کہ انہوں نے دین کی کوئی چیز باقی نہیں چھوڑی کسی زمانہ میں جب مسلمان کہتے تھے کہ اس گھر میں خدا ہی خدا ہے تو اسکا مطلب یہ ہوتا تھا کہ اس گھر میں خدا تعالیٰ کی برکت پائی جاتی ہے۔ خدا تعالیٰ کی حکومت اس گھر میں ہے۔ لیکن آجکل جب لوگ کہتے ہیں کہ اس گھر میں اللہ ہی اللہ ہے تو اس کے یہ معنے ہوتے ہیں کہ اس گھر میں کوئی چیز نہیں۔ گویا جن الفاظ کو خدا تعالیٰ کی حکومت اور اس کی طاقت اور قوت کیلئے استعمال کیا جاتا تھا انہیں اب نفی اور صفر کے معنوں میں استعمال کیاجاتا ہے۔ یہی معاملہ ہم نے توکّل سے کیا ہے۔ ہم ایک کام کرتے ہیں اور جب اس کے لئے غلط طریق اختیار کرتے ہیں۔ اُس کے لئے کمزور محنت کرتے ہیں یا اُس سے قطعی غفلت کا معاملہ کرتے ہیں اور لازماً اُس کا نتیجہ صفر نکلتا ہے تو اس کا الزام خدا تعالیٰ کو دے دیتے ہیں۔ اور کہتے ہیں اس کا موجب خدا ہے۔ ہم نے تو اپنا پورا زور لگا دیا تھا اور مقدور بھر محنت بھی کی تھی۔ لیکن خدا تعالیٰ نے ہمارا بیڑہ غرق کر دیا۔ گویا نعوذ باللہ ہر اچھا کام ہم سے سرزد ہوتا ہے اور بیڑہ غرق کرنا خدا تعالیٰ کے ذمے ہے۔ اور اگر وہ بیڑہ غرق کرنیوالا نہیں بلکہ بیڑہ تیرانے والا ہے تو بیڑہ غرق ہم کرتے ہیں اور اپنی نادانیوں اور غفلتوں پر پردہ ڈالنے کیلئے اُسے خدا تعالیٰ کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ اگر واقعہ میں ہم محنت کریں۔ اور قربانی سے کام لیں اور خدا تعالیٰ پر توکّل بھی رکھیں تو ممکن نہیں کہ اس کا اعلیٰ نتیجہ پیدا نہ ہو۔ اور اگر ہمارے کسی کام کا اعلیٰ نتیجہ نہیں نکلتا تو ہمارا بیڑہ خدا تعالیٰ نے غرق نہیں کیا بلکہ ہم نے خود کیا ہے۔ اگر مسلمان اس نکتہ کو سمجھ لیں اور جن کے اعمال کے جو اچھے نتائج نکلیں وہ انہیں اپنی طرف نہیں بلکہ خدا تعالیٰ کی طرف منسوب کریں اور ناکامی کو اپنی طرف منسوب کریں تو انکی کایا پلٹ جائے۔ جیسے حضرت ابراہیم علیہ السلام فرماتے ہیں کہ وَ اِذَا مَرِضْتُ فَھُوَ یَشْفِیْنِ (شعراء ع ۵) کہ جب میں بیمار ہو جاتا ہوں تو خدا تعالیٰ مجھے شفا دیتا ہے یعنی بیماری میری طرف سے آتی ہے اور شفاء خدا تعالیٰ کی طرف سے آتی ہے۔ اِس میں یہی نکتہ بیان کیا گیا ہے کہ ہر نیک بات خدا تعالیٰ کی طرف منسوب کیا کرو۔ اور ہر بُری بات اپنی طرف منسوب کیا کرو۔ جب تک تمہارے اندر ابراہیمؑ والا ایمان پیدا نہیں ہوتا اور جب تک تمہارے اندر وَاِذَا مَرِضْتُ فَھُوَ یَشْفِیْنِ والا احساس پیدا نہیں ہوتا۔ جب تک تم یہ نہیں سمجھتے کہ جب بھی کوئی کمزوری آئے گی وہ ہماری طرف سے ہوگی۔ اور جب ہم میں قوت اور طاقت پیدا ہوگی تو وہ خدا تعالیٰ کی طرف سے ہوگی اُسوقت تک تم کامیاب نہیں ہو سکتے۔ لیکن جب تم اپنے اندر یہ تغیر پیدا کر لوگے تو تمہارے اندر کام کا ایک زبردست میلان پیدا ہو جائیگا اور تمہیں کامیابی ہی کامیابی حاصل ہوتی چلی جائیگی۔ اگر حضرت ابراہیم علیہ السلام صرف اِذَا مَرِضْتُ کہہ دیتے تو پھر مایوسی ہی مایوسی ہوتی۔ اور اگر فَھُوَ یَشْفِیْنِ کہہ دیتے تو اُمید ہی امید ہوتی اور یہ دونوں باتیں درست نہیں ہیں۔ جب تک کسی کا ایمان خوف اور رجاء کے درمیان نہ ہو۔ اُسکے کسی کام کا صحیح نتیجہ نہیں نکلتا۔ اِسی لئے آپ نے فرمایا کہ خدا تعالیٰ نے مجھے اٹھنے کا موقع بھی دیا ہے اور گرنے کا موقع بھی دیا ہے۔ اگر میں پوری محنت نہیں کرونگا تو میں گر دوں گا اور اگر میں پوری محنت کرونگا اور اس کے ساتھ ہی خدا تعالیٰ پر توکّل کرونگا۔ تو میں جیتوں گا۔ پس آپ نے یہ دونوں باتیں بیان کرکے واضح کر دیا کہ انسان کے لئے محنت اور توکّل دونوں چیزیں ضروری ہیں۔ اگر ہم محنت نہیں کرینگے تو ہمارے کام خراب ہونگے۔ اور اگر ہم توکّل نہیں کریں گے تب بھی ہم کامیاب نہیں ہونگے۔ گویا خدا تعالیٰ انسان کی محنت کی تکمیل کرتا ہے۔ اُس کا قائم مقام نہیں ہوتا۔ اگر وہ انسان کی محنت کا قائم مقام ہوتا تو حضرت ابراہیم علیہ السلام

کی یہ بات کہ وَاِذَا مَرِضْتُ فَھُوَ یَشْفِیْنِ غلط ہوتی۔ مگر آپ نے اِذَا مَرِضْتُ کہہ کر بتایا ہے کہ اگر میں بیمار ہونے والے افعال کروں تو خدا تعالیٰ مجھے بیمار ہونے سے نہیں روکتا۔ اور ھُوَ یَشْفِیْنِ کہہ کر بتایا کہ میں خود بخود کامل شفا حاصل نہیں کر سکتا۔ کامل شفا دینے والی خدا تعالیٰ کی ہی ذات ہے۔ اور یہی ترقی اور کامیابی کی کلید ہے۔ جب تک کوئی قوم اس گُر کو نہیں سمجھتی وہ کامیابی حاصل نہیں کر سکتی۔ یورپ اور امریکہ کیوں ترقی کر رہے ہیں۔ وہ اسی لئے ترقی کر رہے ہیں کہ انہوں نے اس اصول کا ایک حصہ پورا کر دیا ہے۔ اور ہم ناکام اس لئے ہو رہے ہیں کہ ہم نے اس کے دونوں حصوں کو گرا دیا ہے۔ اگر کسی زمیندار کے پاس ایک بیل ہو تو وہ ہل چلا لیتا ہے۔ لیکن دونوں بیل ہی نہ ہوں تو ہل نہیں چلا سکتا۔ اسی طرح اگر کسی کے پاس ایک ہی گھوڑا ہو تو فٹن نہ سہی وہ ایکہ چلا سکتا ہے۔ لیکن جس کے پاس ایک گھوڑا بھی نہ ہو تو وہ ایکہ بھی نہیں چلا سکتا۔ اسی طرح یورپ نے توکّل کرنا بیشک چھوڑ دیا ہے۔ لیکن چونکہ اُس نے محنت والا حصّہ پورا کر دیا ہے اس لئے وہ ترقی کر رہا ہے اور ہم نے دونوں حصوں کو ترک کر دیا ہے اس لئے ہم ناکام رہتے ہیں۔ پھر جب ہم کوئی کام کرتے ہیں اور اُس میں ناکام ہوتے ہیں تو اس ناکامی کو ہم اپنی طرف منسوب نہیں کرتے بلکہ یہ کہتے ہیں کہ ہم نے تو محنت کی تھی مگر خدا تعالیٰ نے کامیاب نہیں کیا۔ اور اگر کچھ مل جاتا ہے تو ہم اس کامیابی کو اپنی طرف منسوب کر لیتے ہیں۔ جیسے قرآن کریم میں خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ بعض بیوقوف انسان ایسے بھی ہوتے ہیں کہ جب انہیں کوئی ترقی حاصل ہوتی ہے تو کہتے ہیں کہ یہ ہمارے علم اور طاقت کی وجہ سے حاصل ہوئی ہے۔ اگر ہم علم اور سمجھ والے نہ ہوتے تو یہ ترقی کس طرح حاصل ہوتی (زمر ع۵) اور جب کوئی ناکامی ہوتی ہے تو اُسے خدا تعالیٰ کی طرف منسوب کر دیتے ہیں (سورۂ فجر ع۱) گویا وہ ہر عیب خدا تعالیٰ کی طرف منسوب کرتے ہیں اور ہر خوبی اپنی طرف منسوب کرتے ہیں۔ لیکن اگر وہ اپنا رویّہ بدل لیں تو اُن میں کام کی رغبت اور محنت کی عادت اور چستی پیدا ہو جائے گی۔ اور انہیں صحیح توکّل نصیب ہو جائیگا اور جسے صحیح توکّل نصیب ہو جاتا ہے اُس کی کامیابی میں کوئی شبہ نہیں رہتا۔

اِس کے بعد اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اَلَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَیْنَھُمَا فِیْ سِتَّۃِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ یعنی تمہارا خدا وہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے چھ وقتوں میں پیدا کیا۔ اور پھر وہ عرش پر قرار فرما ہوا۔

عرش جیسا کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے کوئی مادی شئے نہیں ہے۔ اور نہ ہی وہ کوئی رُوحانی شئے ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ پھر وہ عرش پر قائم ہو گیا۔ اور چونکہ اللہ تعالیٰ لَیْسَ کَمِثْلِہٖ شَیْءٌ (شوریٰ ع۲) کا مصداق ہے یعنی اس کے سوا جو کچھ ہے۔ وہ اس کی مانند نہیں۔ بلکہ اَور قسم کا ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ کا کسی مادی بلکہ رُوحانی شئے پر قائم ہونا بھی اُسکی شان کے خلاف ہے۔ بلکہ قائم ہونے کا لفظ بھی اُس کی نسبت تمثیلی طور پر ہی استعمال کیا جا سکتا ہے۔ نہ کہ عام معنوں کے لحاظ سے۔ پس جبکہ مادی یا رُوحانی اشیاء پر اس کا قرار پانا ممکن نہیں تو عرش بھی کوئی مادی یا رُوحانی شئے نہیں ہو سکتا۔ بلکہ اس سے مراد کوئی ایسی ہی شئے ہو سکتی ہے جو اللہ تعالیٰ کی ذات سے تعلق رکھتی ہو اور چونکہ ذاتِ باری سے تعلق رکھنے والی شئے صفاتِ الٰہیّہ ہی ہیں۔ اس لئے عرش سے مُراد صفاتِ الٰہیہ کا کوئی

خاص ظہور ہی ہو سکتا ہے نہ کہ کچھ اور - اور جب قرآن کریم خدا تعالیٰ کی طرف کسی تجسّم کی نسبت کو جائز ہی قرار نہیں دیتا تو یہ کس طرح ممکن ہے کہ وہ اس کی طرف یہ امر منسوب کرے کہ وہ ایک مجسّم عرش پر بیٹھا ہے - حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفات دو طرح ظاہر ہوتی ہیں - ایک تنزیہی طور پر جس پر عرش کا لفظ دلالت کرتا ہے اور ایک تشبیہی طور پر جس پر خدا تعالیٰ کی ربوبیت - رحمانیت - رحیمیت اور مالکیت یوم الدین کا تفصیلی ظہور دلالت کرتا ہے - تنزیہی صفات خدا تعالیٰ کی اصل صفات ہیں اور تشبیہی صفات اُن سے بطور تنزل جاری ہوتی ہیں - یہی وجہ ہے کہ تشبیہی صفات سے ناواقف آدمیوں کو اللہ تعالیٰ کی ذات کے متعلق کئی شبہات پیدا ہوتے رہتے ہیں - مثلاً ربّ کی صفت پر یہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا اللہ تعالیٰ محتاج ہے کہ بندوں کو اُس نے پیدا کیا ہے اور اُن کی ایسی تربیت کرتا ہے کہ وہ اس کی عبادت کر سکیں - یہ اعتراض آجکل کے نوتعلیمیافتہ لوگوں کی طرف سے اور پُرانے ہندو فلسفہ دانوں کی طرف سے بہت اٹھایا جاتا ہے - اسی طرح صفت ربّ کے گرد گھومنے والی دوسری صفات پر بھی لوگوں کو شبہات پیدا ہوتے ہیں - اس کی وجہ یہی ہے کہ ان تشبیہی صفات سے جو جلوہ انسان کو نظر آتا ہے وہ خدا تعالیٰ کی اصل شان کو ظاہر کرنے والا نہیں ہوتا - بلکہ انسان کی قابلیت کے مطابق وہ صفات ڈھل جاتی ہیں جس طرح ایک کمزور آنکھ والا جو تیز روشنی کو نہیں دیکھ سکتا رنگدار شیشے کی عینک لگا لیتا ہے اور اُس رنگدار شیشے کے لگانے سے اُسے روشنی بہت ہلکی نظر آنے لگتی ہے - اسی طرح اللہ تعالیٰ کی صفاتِ تنزیہیہ کو تشبیہیہ کے رنگدار شیشہ میں سے انسان کو دکھایا جاتا ہے تاکہ اُس کی آنکھیں اُس کو دیکھ سکیں - اور صفاتِ الٰہیہ کے جلوہ کی شدّت اُس کی روحانی بینائی کو ضائع نہ کر دے - مگر جس طرح عقلمند انسان روشنی کی قوت کا اندازہ اُس روشنی پر نہیں کرتا جو رنگدار شیشہ میں سے نظر آتی ہے - اسی طرح سمجھدار انسان اللہ تعالیٰ کی صفات کے اس ظہور پر معترض نہیں ہو سکتا جو انسانی کمزوری کو مدّنظر رکھتے ہوئے تنزل اور تشبیہہ کی صورت اختیار کرتا ہے - یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ایسے ظہور کی ضرورت کیا ہے - کیونکہ ایسا ظہور یقیناً انسان کو اللہ تعالیٰ کے قریب کر دیتا ہے - رنگدار عینک گو روشنی کو کمزور کر کے دکھاتی ہے مگر بہرحال روشنی کے فوائد سے انسان کو متمتع کرتی ہے اور اُس کی ضرورت یا اس کے فائدہ کا انکار نہیں کیا جا سکتا - اگر اسے پھینک دیا جائے تو یقیناً یا تو آنکھیں جاتی رہیں گی اور یا آنکھوں کو بند رکھ کر انسان روشنی کے فوائد سے محروم ہو جائیگا - غرض انسان کو اللہ تعالیٰ کے جلوہ سے آشنا کرنے کے لئے اور صفاتِ الٰہیہ سے اس کی قابلیت کے مطابق اُسے واقف کرانے کے لئے اُس کی آنکھ پر تشبیہہ کی عینک لگا دی جاتی ہے جس میں سے وہ اللہ تعالیٰ کی صفات کا عرفان بھی حاصل کرتا ہے اور اُس کی روحانی آنکھ اُس صدمہ سے بھی محفوظ ہو جاتی ہے جو اس جلوہ کی وجہ سے ہوتا ہے جو آنکھ کی بینائی کو پراگندہ تو کر دیتا ہے لیکن اُسے کوئی علم نہیں بخشتا - ہاں چونکہ تشبیہہ کی عینک سے انسان کو حقیقت کے متعلق بعض غلط فہمیاں پیدا ہو سکتی تھیں اس لئے لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ (شوریٰ ع ۲) فرما کر اللہ تعالیٰ کی اصل شان کی طرف بھی اشارہ کر دیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ اب وہ رحمٰن وغیرہ کے الفاظ سے جو تم کو دھوکا لگ سکتا ہے اُس سے بچنا چاہیئے - کیونکہ وہ خالی ربّ نہیں بلکہ وہ رَبُّ الْعَرْشِ ہے - اُس کی ربوبیت وہ ہے جس کا ایک نقطہ مخلوق سے ملتا ہے اور دوسرا نقطہ عرش سے وابستہ ہے پس اُس کی ربوبیت کو انسانی ربوبیت پر قیاس نہیں

کرنا چاہیئے اور ماں باپ کی طرح احتیاج اور ضرورت کی جستجو میں اُس کی ربوبیت کو نہیں الجھانا چاہیئے۔ جو بات تم کو دیکھنی چاہیئے وہ صرف یہ ہے کہ آیا واقعہ میں اس عالم کا کوئی ربّ ہے یا نہیں۔ اور اگر یہ ثابت ہو جائے کہ ہے تو پھر اُس کی کُنہ معلوم کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ عرش سے آنے والی حقیقت کو فرش کا انسان کس طرح معلوم کر سکتا ہے۔ جب ایک سچائی ثابت ہو جائے تو پھر اُس کا مان لینا ہی انسان کا کام ہے۔ اُس کا یہ حق نہیں کہ وہ اس امر کا مطالبہ کرے کہ مجھے یہ بھی سمجھایا جائے کہ ربوبیت اور رحمانیت اور رحیمیت اور مالکیت کہاں سے پیدا ہوئی اور کس طرح پیدا ہوئی؟ غرض عرش خدا تعالیٰ کی صفاتِ تنزیہیہ کا نام ہے جو ازلی اور غیر متبدل ہیں اور جن میں کوئی مخلوق اس سے ایک ذرہ بھر بھی مشابہت نہیں رکھتی سوائے اسکے کہ صفاتِ تشبیہیہ کے ذریعہ سے اُن کا علم حاصل کیا جائے اگر صفاتِ تشبیہیہ نہ ہوتیں تو اللہ تعالیٰ کے کامل الصفات ہونے کا کسی قسم کا ادراک بھی خواہ وہ کتنا ہی معمولی ہوتا ہمیں حاصل نہ ہو سکتا۔

عرش کی اس حقیقت کو ملحوظ رکھتے ہوئے کہ اس سے مُراد صفاتِ تنزیہیہ کا مجموعی نظام ہے جس کیلئے صفاتِ تشبیہیہ بطور حامل کے ہوتی ہیں ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ کے یہ معنے ہوئے کہ جب اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین کی تخلیق مکمل کر لی تو اس کی صفاتِ تنزیہیہ کامل طور پر ظاہر ہونے لگ گئیں اور چونکہ صفاتِ تنزیہیہ صفاتِ تشبیہیہ کے رنگ میں ظاہر ہوتی ہیں اسلئے ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ کا یہ مطلب ہُوا کہ عرش یعنی صفاتِ تنزیہیہ کے مرکز کے تابع جس قدر صفاتِ تشبیہیہ ہیں وہ سب اپنے اپنے کام میں لگ گئیں۔ اس میں روحانی طور پر اس امر کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ اسلام کے ذریعہ چونکہ ایک نیا آسمان اور نئی زمین پیدا کر دی گئی ہے اس لئے اب خدا بھی عرش پر قرار فرما ہو گیا ہے یعنی وہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تائید کسی ایک صفت کے ذریعہ نہیں کریگا بلکہ اُس کی وہ تمام صفات جو صفاتِ تنزیہیہ کے تابع ہیں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تائید میں کام کرنے لگیں گی۔ کیونکہ اُس نے اپنے خدا پر سچا توکّل کیا ہے اور اُس کا پیش کردہ خدا زندہ ہے جس پر کسی زمانہ میں بھی موت وارد نہیں ہو سکتی۔ اس لئے محمد رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی بھی ہر زمانہ میں تائید ہوتی چلی جائیگی اور ہر زمانہ میں اللہ تعالیٰ کی صفات اس کی سچائی کو ظاہر کرتی رہیں گی۔

پھر فرماتا ہے اَلرَّحْمٰنُ فَسْئَلْ بِهٖ خَبِيْرًا وہ رحمٰن خدا ہے جس نے اپنی صفتِ رحمانیت کے ماتحت تمہیں اپنی بے شمار نعمتوں سے نوازا اور تمہارے لئے اُس نے زمین و آسمان اور سورج اور چاند وغیرہ پیدا کر دیئے اور اگر ان تمام نعمتوں کے باوجود اس کی صفتِ رحمٰن کے متعلق تمہارے دلوں میں پھر بھی کوئی سوال پیدا ہو تو اُس سے پوچھو جو خبیر ہے۔ یہ فَسْئَلْ بِهٖ خَبِيْرًا اپنی بناوٹ کے لحاظ سے ایسا ہی فقرہ ہے جیسے عربی زبان میں کہتے ہیں کہ لَقِيْتُ بِزَيْدٍ اَسَدًا میں زید کی شکل میں ایک شیر سے ملا یعنی زید اپنی شجاعت اور دلیری کے لحاظ سے ایک شیر تھا۔ یا کہتے ہیں لَقِيْتُ بِزَيْدِ الْبَحْرَ۔ میں نے زید کی شکل میں ایک سمندر پایا۔ یعنی زید اپنے جود و کرم میں ایک سمندر تھا۔ اسی طرح فَسْئَلْ بِهٖ خَبِيْرًا میں ہ کی ضمیر لفظِ رحمٰن کی طرف جاتی ہے اور اس کے معنے یہ ہیں کہ تو رحمٰن سے سوال کر وہ رحمٰن جو بڑا خبیر ہے اور تمام حقائق کو جاننے والا ہے۔ یعنی اگر تم اللہ تعالیٰ کے اس وسیع نظامِ کائنات کو دیکھ کر بھی جو مادی دنیا میں جاری ہے اور خدا تعالیٰ کے رحمٰن ہونے پر شاہد ہے یہ بات نہیں سمجھتے کہ جس طرح اُس نے مادی دنیا میں اپنی صفتِ رحمانیت کا اتنا بڑا کرشمہ

دکھایا ہے اسی طرح اُس نے رُوحانی دنیا میں بھی اپنے بندوں کی اصلاح کے لئے کوئی انتظام جاری کیا ہوگا۔ اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت تم پر منکشف نہیں ہوتی تو پھر تم اُسی خدا سے پوچھو جو خبیر ہے یعنی اسکے دروازہ کو کھٹکھٹاؤ اور اس کے حضور گڑگڑاؤ اور دُعائیں کرو۔ وہ تمہارے حالِ زار پر رحم کریگا اور تم پر اپنے فضل سے اصل حقیقت کا کسی نہ کسی رنگ میں انکشاف فرما دے گا لیکن بعض لوگ کہتے ہیں کہ اسجگہ فَسْئَلْ بِهٖ میں ب عن کے معنوں میں استعمال ہوئی ہے۔ جیساکہ قرآن کریم کی آیت سَاَلَ سَآئِلٌۢ بِعَذَابٍ وَّاقِعٍ میں ب عن کے معنوں میں استعمال کی گئی ہے اور فَسْئَلْ بِهٖ خَبِيْرًا کے وہ یہ معنے لیتے ہیں کہ فَسْئَلْ عَنْهُ خَبِيْرًا۔ یعنی اس کے بارہ میں خبیر سے دریافت کر۔ انہوں نے کہا ہے کہ چونکہ اس سے پہلے خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ اور اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ کا ذکر آتا ہے اور زمین و آسمان کی پیدائش اور استوار علی العرش کی تفاصیل اللہ تعالیٰ کے سوا اور کوئی نہیں جانتا اس لئے فَسْئَلْ بِهٖ خَبِيْرًا کے یہ معنے ہیں کہ ان امور کی تفاصیل کے بارہ میں اللہ تعالیٰ سے ہی دریافت کرو اس کے سوا ان باتوں کو اور کوئی نہیں جانتا۔ لیکن بعض نے کہا ہے کہ اسجگہ خبیر سے ایسا شخص مُراد ہے جو اللہ تعالیٰ کے اسماء اور اُس کی صفات کا پورا پورا علم رکھنے والا ہو اور انہوں نے اس سے جبرائیل اور اہل کتاب اور علماء وغیرہ مُراد لئے ہیں۔ میرے نزدیک اگر عن کے معنوں کو تسلیم کرتے ہوئے اسجگہ خبیر سے کوئی اور شخص مراد لیا جائے تو پھر خبیر سے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مُراد ہیں جن کو خدا تعالیٰ نے اپنی صفاتِ کاملہ کا وحی کے ذریعہ سے علم دیا تھا۔ چونکہ کفارِ مکہ کلامِ الٰہی کے منکر تھے اور کلامِ الٰہی وہ نعمت ہے جو بغیر کسی عمل کے ملتی ہے اور صفتِ رحمٰن کے تابع ہے اس لئے وہ خدا تعالیٰ کو ان معنوں میں

رحمٰن تسلیم نہیں کرتے تھے جن معنوں میں اسلام اسے رحمٰن قرار دیتا ہے اور چونکہ صفتِ رحمٰن اُن کے عقائد کے ردّ میں استعمال کی جاتی تھی اور انہیں بار بار کہا جاتا تھا کہ تمہیں خدا نے پتھروں کا مالک بنایا تھا۔ تمہیں خدا نے کائناتِ عالم کے ذرّہ ذرّہ پر حکمران بنایا تھا اور یہ تمام چیزیں وہ ہیں جو خدا تعالیٰ نے محض اپنی صفتِ رحمانیت کے ماتحت تمہارے لئے مہیا کیں مگر تم نے انہی پتھروں سے بنے ہوئے بتوں کے آگے اپنے سر جھکانے شروع کر دیئے اور خدا تعالیٰ کے رحمٰن ہونے کا انکار کر دیا اس لئے طبعی طور پر اُنکے دلوں میں یہ سوال پیدا ہوتا تھا کہ رحمٰن کیا چیز ہے۔ سو اللہ تعالیٰ نے انہیں نصیحت فرمائی کہ اگر تم خدا تعالیٰ کے ان عظیم الشان احسانات سے آنکھیں بند کر رہے ہو جو صفتِ رحمانیت کے ماتحت اُس نے ساری دنیا پر کئے ہیں اور کلامِ الٰہی کی ضرورت بھی تسلیم نہیں کرتے جو صفتِ رحمانیت کے ماتحت نازل ہُوا ہے تو اُس کا ایک علاج تو یہ ہے کہ تم خدا تعالیٰ کے حضور جھکو اور اُس سے دُعائیں کرو کہ وہ تم پر اسلام اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حقانیت روشن کر دے۔ اور توحید کی عظمت تم پر ظاہر کر دے۔ اور اگر تم خلوصِ دل سے اُس کی طرف رجوع کرو گے اور دعاؤں سے اُسکی رحمت کو جذب کرنے کی کوشش کرو گے تو خدا تعالیٰ کسی نہ کسی ذریعہ سے تمہارے دل کے تاریک گوشوں کو بھی اپنے نور سے منوّر کر دیگا اور تم پر اس روحانی سورج کی حقیقت کو واضح کر دیگا جو اُس نے اِس مادی دنیا کی تاریکیوں کو دُور کرنے کیلئے روشن کیا ہے۔ اور دوسرا علاج یہ ہے کہ تم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جاؤ اور اُنہی سے اپنی عقدہ کشائی چاہو۔ اگر تم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جاؤ گے تو تمہیں معلوم ہوگا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنا وجود خدا تعالیٰ کی صفتِ رحمانیت کے ظہور کا ایک زندہ ثبوت ہے اور آپ کی پیدائش سے لیکر جوانی تک

اور جوانی سے لیکر دعوئے نبوت تک اور پھر دعوئے نبوت سے لیکر آپ کے یوم وصال تک خدا تعالیٰ نے آپ پر اسقدر احسانات کئے ہیں کہ اُن کو دیکھ کر ایک شدید سے شدید مخالف کے لئے بھی خدا تعالیٰ کے رحمٰن ہونے کا اقرار کئے بغیر کوئی چارہ نہیں رہتا۔ قرآن کریم نے اپنے ان بے شمار انعامات کا ایک مقام پر چند نہایت ہی مختصر الفاظ میں اِس طرح ذکر فرمایا ہے کہ اَلَمْ یَجِدْكَ یَتِیْمًا فَاٰوٰی وَ وَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰی وَ وَجَدَكَ عَآئِلًا فَاَغْنٰی (سورۃ الضحیٰ ع ۱) یعنی اے محمد رسول اللہ کیا خدا نے تجھے یتیم پاکر اپنے زیر سایہ جگہ نہیں دی اور کیا ایسا نہیں ہؤا کہ جب اُس نے تجھے خدا تعالیٰ کی محبت اور اپنی قوم کی اصلاح کے غم میں سرگرداں پایا تو اُس نے تجھے صحیح راستہ بتا دیا۔ اور جب اُس نے تجھے کثیر العیال پایا تو اپنے فضل سے تجھے غنی کر دیا۔ اِن آیات میں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ کا نہایت ہی خوبصورتی کے ساتھ اجمالی رنگ میں نقشہ کھینچا گیا ہے۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ابھی رحم مادر میں ہی تھے کہ آپ کے والد محترم فوت ہو گئے اور آپ پیدائش سے پہلے ہی یتیم ہو گئے۔ مگر اللہ تعالیٰ کی رحمانیت نے آپ کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور آپکے پیدا ہوتے ہی آپ کے دادا حضرت عبد المطلب کے دل میں اُس نے آپ کی ایسی محبت پیدا کر دی کہ وہ ایک لمحہ کے لئے بھی آپ کا اپنی آنکھوں سے اوجھل ہونا برداشت نہیں کر سکتے تھے اور بڑے ناز اور محبت کے ساتھ آپ کی پرورش فرماتے رہے۔ اِسی طرح جب آپ کے لئے دودھ پلانے والی دایہ کی تلاش ہوئی تو پھر اللہ تعالیٰ کی رحمانیت آگے بڑھی اور وہ حلیمہ کو آپ کے دروازہ پر کھینچ لائی۔ حلیمہ ایک غریب عورت تھی جسے مکہ کا کوئی خاندان اپنا بچہ سپرد کرنے کے لئے تیار نہ تھا۔ مگر اللہ تعالیٰ نے اُس کی غربت اور بے بسی کو دیکھکر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جیسا لعل بے بہا اُس کی گود میں ڈال دیا۔ اور پھر اسکے دل میں بھی آپ کی ایسی محبت پیدا کر دی کہ اگر آپ ذرا بھی اِدھر اُدھر ہو جاتے تو وہ اپنے بچوں کو ڈانٹتی کہ تم اسے کیوں چھوڑ آئے ہو۔ پھر عبد المطلب فوت ہوئے تو خدا تعالیٰ کی رحمانیت نے ابو طالب جیسا چچا آپ کو دے دیا جس نے انتہائی تکلیف دہ گھڑیوں میں بھی آپ کا ساتھ دیا اور قوم کی دھمکیوں کے باوجود آپ کو نہ چھوڑا۔ جوان ہوئے تو خدا تعالیٰ کی صفتِ رحمانیت نے حضرت خدیجہؓ کے دل میں آپ کی نیکیوں کو دیکھ کر آپ کی محبت پیدا کر دی اور انہوں نے خود آپ کو شادی کا پیغام بھجوایا۔ دوستوں کی ضرورت محسوس ہوئی تو خدا تعالیٰ کی صفتِ رحمانیت نے ابوبکرؓ جیسے وفا شعار دوست آپ کو مہیا کر دیئے۔ پھر جب قوم کی بگڑی ہوئی حالت کو دیکھ کر آپ کا دل بیتاب ہؤا اور حرا میں آپ نے اپنی سجدہ گاہ کو آنسوؤں سے تر کر دیا تو خدائے رحمٰن کی نگاہِ انتخاب نے آپ کو چنا اور اُس نے دنیا کی ڈوبتی ناؤ کو بچانے کے لئے آپ کو آسمانی کشتی بان مقرر کر دیا۔ اِسی طرح جب آپ کو قومی امور کی سرانجام دہی کے لئے مال کی ضرورت محسوس ہوئی تو خدائے رحمٰن نے حضرت خدیجہؓ کے دل میں تحریک کی اور انہوں نے اپنی تمام جائیداد آپ کے سپرد فرما دی اور پھر روحانی اور جسمانی طور پر خدا تعالیٰ نے اپنی صفتِ رحمانیت کے ماتحت آپ کے دائرہ فیوض کو اتنا وسیع کیا کہ لاکھوں لوگوں نے آپ کے چشمۂ فیض سے اپنی روحانی پیاس بجھائی اور لاکھوں لوگ آپ کی غلامی کی برکت سے شتربانی سے جہانبانی تک جا پہنچے۔ اِسی طرح قرآن کریم کا نزول جو ایک دائمی شریعت ہے خود اپنی ذات میں اللہ تعالےٰ کے رحمٰن ہونے کا ایک زبردست ثبوت ہے۔ کیونکہ کلام الٰہی بندوں کی کسی

وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ اسْجُدُوا لِلرَّحْمٰنِ قَالُوا وَمَا

اور جب اُن سے کہا جاتا ہے کہ رحمٰن کے سامنے سجدہ میں گر جاؤ تو کہتے ہیں رحمٰن کیا چیز ہے؟

الرَّحْمٰنُ أَنَسْجُدُ لِمَا تَأْمُرُنَا وَزَادَهُمْ نُفُورًا ﴿۶۱﴾ السجدة ۵ ع ۳

کیا ہم اُس کے آگے سجدہ کریں جس (کے آگے سجدہ کرنے) کا تو حکم دیتا ہے؟ اور یہ بات اُنکو نفرت میں اور بھی بڑھا دیتی ہے ۲۸

نیکی کے بدلہ میں نازل نہیں ہوتا بلکہ اللہ تعالیٰ کی صفتِ رحمانیت کے نتیجہ میں بطور احسان نازل ہوتا ہے۔ اسی لئے قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ اَلرَّحْمٰنُ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ (رحمٰن ع۱) یعنی قرآن سکھلانے والا خدا رحمانیت کی صفت رکھتا ہے۔ اگر وہ رحمٰن نہ ہوتا تو قرآن جیسی نعمت ایک جسمانی بندے پر کبھی نازل نہ ہوتی غرض محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی بھی اللہ تعالیٰ کی صفتِ رحمانیت کے ظہور کا ایک زندہ گواہ ہے اور آپؐ پر نازل ہونے والا کلام بھی خدا تعالیٰ کے رحمٰن ہونے پر شاہد ہے پس اگر خدائے رحمٰن کی رحمانیت کے بارہ میں کسی کے دل میں کوئی سوال پیدا ہو تو اُسے محمد رسول اللہ صلے اللہ وسلم کی زندگی اور آپ پر نازل ہونے والے کلام پر تدبر کرنا چاہیئے۔ اگر وہ غور کریگا تو جس طرح کائناتِ عالم کا ایک ایک ذرہ خدا تعالیٰ کی صفتِ رحمانیت پر شاہد ہے۔ اسی طرح اُسے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا ہر ورق اور آپؐ پر نازل ہونوالے کلام کی ایک ایک آیت خدا تعالیٰ کی رحمانیت کا ایک زندہ گواہ نظر آئیگی۔ پھر اُمّتِ محمدیہ کے وہ تمام صلحاء اور اولیاء اور ابدال اور اقطاب اور مجددین و مصلحین وغیرہ جنہوں نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی غلامی میں اللہ تعالیٰ کی بیشمار برکات اور اُسکے تفضلات کا مشاہدہ کیا اور جو اپنے اپنے دائرہ میں ایک چھوٹے محمدؐ بن گئے۔ اُن کا اپنا وجود بھی خدا تعالیٰ کے رحمٰن ہونیکا ایک بہت بڑا ثبوت ہے کیونکہ انہوں نے جو کچھ پایا اپنے زور بازو سے نہیں پایا بلکہ محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی غلامی میں اُس بحرِ ناپیدا کنار سے پایا جسے خدا نے اِس پیاسی دنیا کی سیرابی کے لئے محض اپنے فضل سے جاری کیا ہے۔ اِسی حقیقت کو بانیٔ سلسلۂ احمدیہ نے اپنے اس شعر میں نہایت لطیف پیرایہ میں بیان فرمایا ہے کہ ؎

ایں چشمۂ رواں کہ بخلقِ خدا دہم
یک قطرۂ ز بحرِ کمالِ محمدؐ است

یعنی یہ چشمۂ فیض جس سے میں لاکھوں بندگانِ خدا کو سیراب کر رہا ہوں یہ میرا چشمہ نہیں بلکہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کمالات کے سمندر کا ایک حقیر قطرہ ہے جسے میں پیاسی دنیا کے سامنے پیش کر رہا ہوں۔ پس وہ رُوحانی وجود جن کے ذریعہ دنیا میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کو چلتے پھرتے دکھائی دیتے ہیں وہ بھی فَسْئَلْ بِهٖ خَبِيْرًا میں ہی شامل ہیں۔ کیونکہ اُن کو دیکھکر بھی خدا تعالیٰ کی رحمانیت کو بھولنے والے اُس کے رحمٰن ہونے کا اقرار کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

۲۸ حلِ لغات: نُفُوْرًا۔ نَفَرَ کا مصدر ہے اور نَفَرَتِ الدَّابَّةُ کے معنے ہیں جَزِعَتْ وَتَبَاعَدَتْ۔ گھبرا کر اور ڈر کر جانور دُور بھاگ گیا۔ اور جب نَفَرَ الْقَوْمُ کہیں تو معنے ہونگے لوگ بکھر گئے۔ اور جب نَفَرَ الْقَوْمُ عَنْ كَذَا کا فقرہ استعمال کریں تو اُس کے معنے یہ ہوتے ہیں کہ اَعْرَضُوْا وَصَدُّوْا۔ لوگوں نے کسی بات سے اعراض کیا۔ اور وہ اُس کو قبول کرنے سے رُک گئے (اقرب)

تفسیر:۔ اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے رحمٰن

نُفُوْرًا

اُس کی ایک مشہور صفت ہے جس کا قرآن کریم میں بار بار ذکر آتا ہے۔ اور رحمٰن اُس ہستی کو کہا جاتا ہے جو بلا مبادلہ اور ہماری کوشش اور سعی کے بغیر ہم پر احسان کرتی ہے جیسے اللہ تعالیٰ نے سورج چاند اور تمام نظامِ شمسی و قمری وغیرہ پیدا کئے ہیں جن کی پیدائش میں ہمارے کسی عمل کا دخل نہیں اسی طرح شریعت کے ذریعے ہمیں جو ہدایت میسّر آتی ہے یہ بھی صفتِ رحمانیت سے ہی تعلق رکھتی ہے۔ ہمارے کسی عمل کے بدلہ میں ہمیں نہیں ملی۔ بلکہ شریعت آتی ہی اُس وقت ہے جب دنیا بدعمل ہو جاتی ہے اور خدا تعالیٰ کو چھوڑ بیٹھتی ہے۔

رحمٰن کے اِن معنوں کی صداقت کا ثبوت یہ ہے کہ

(۱) اہلِ عرب نے کبھی بھی سوائے اللہ کے رحمٰن کا لفظ بطور صفت بغیر قید کے کسی پر استعمال نہیں کیا۔ دوسروں کے لئے اوّل تو اس لفظ کا استعمال ہی نہیں کیا گیا اور اگر کیا گیا ہے تو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے دعوے کے بعد جس سے صاف ظاہر ہے کہ ضد سے ایسا کیا گیا ہے۔ مگر اُس وقت بھی مطلقاً اس لفظ کا استعمال نہیں کیا گیا۔ بلکہ اضافت کے ذریعہ سے اُسے مقید کر دیا گیا ہے۔ جیسا کہ مسیلمہ کذاب کے ماننے والے اُسے رحمٰنِ یمامہ کہتے تھے۔ مگر ان لوگوں کو بھی یہ جرأت نہیں ہوئی کہ خالی رحمٰن کا لفظ بغیر اضافت کے اس کے لئے استعمال کریں۔ یا رحمٰن کا لفظ اس کے لئے استعمال کریں جس کے معنے ہیں سب مخلوق کا رحمٰن۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ عربی زبان اس کی کسی صورت میں بھی اجازت نہیں دے سکتی (لسان العرب)

عربی زبان کی یہ خصوصیت بتاتی ہے کہ اِس لفظ میں ایک ایسی رحمت کی طرف اشارہ ہے جو اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کی طرف سے ظاہر نہیں ہو سکتی اور وہ قسم بلا مبادلہ رحم کرنا ہی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے سوا باقی مخلوق کا رحم یا ماضی کا احسان اتارنے کیلئے ہوتا ہے یا حاضر یا مستقبل کی امیدوں پر مبنی ہوتا ہے۔ اور اگر احسان کرنے والے کی نیّت بدلہ کی نہ بھی ہو تب بھی بدلہ اُسے ضرور مل جاتا ہے۔ چنانچہ انسان جسقدر رحم کرتے ہیں وہ دو صورتوں سے خالی نہیں ہوتا۔ یا تو اس میں رضاءِ الٰہی مدّنظر ہوتی ہے اور اس میں بھی بدلہ کی صورت موجود ہوتی ہے اور یا پھر تمدّن کے قیام کا خیال غالب ہوتا ہے اور وہ بھی بدلہ کے خیال پر مشتمل ہے۔ اور اگر یہ خیال نہ بھی ہو تب بھی انسان اپنی نیکی کا بدلہ کسی نہ کسی شکل میں حاصل کر لیتا ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کا احسان خالص احسان ہوتا ہے۔

(۲) عربی زبان کے ماہروں کے کلام میں بھی اِن معنوں کی طرف اشارات ملتے ہیں۔ چنانچہ ابو علی فارسی جو امام نحو کہلاتے ہیں اور عربی زبان کے بہت بڑے ماہر گذرے ہیں وہ کہتے ہیں۔ اَلرَّحْمٰنُ اِسْمٌ عَامٌّ فِيْ جَمِيْعِ اَنْوَاعِ الرَّحْمَةِ يَخْتَصُّ بِهِ اللّٰهُ تَعَالٰى. وَالرَّحِيْمُ اِنَّمَا هُوَ فِيْ جِهَةِ الْمُؤْمِنِيْنَ كَمَا قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى وَكَانَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَحِيْمًا (فتح البیان جلد اوّل ص۲۵) یعنی رحمٰن عام ہے اور سب قسم کی رحمتیں اُس میں شامل ہیں لیکن رحیم کی صفت کا ظہور مومنوں کے بارے میں ہوتا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ وہ مومنوں کے بارہ میں رحیم ہے۔

(۳) احادیث سے بھی اِن معنوں کی صداقت کا ثبوت ملتا ہے۔ چنانچہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ فرماتے ہیں۔ کہ میں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنا آپ فرماتے تھے۔ اَنَا الرَّحْمٰنُ خَلَقْتُ الرَّحِمَ وَشَقَقْتُ لَهَا اِسْمًا مِنْ اِسْمِيْ فَمَنْ وَصَلَهَا وَصَلْتُهٗ وَمَنْ قَطَعَهَا قَطَعْتُهٗ (ترمذی جلد ۲ باب ما جاء فی قطیعۃ الرحم) یعنی خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔ میں رحمٰن ہوں۔ میں نے رحم پیدا کیا ہے اور اپنے نام سے اس کا نام نکالا ہے

پس جو رحم کے تعلقات کو جوڑے وہ مجھ سے تعلقات کو جوڑتا ہے اور جو اُسے قطع کرے وہ میرے تعلق کو قطع کرتا ہے۔ اِس حدیث سے بھی رحمٰن کے معنوں کی وضاحت ہوتی ہے کیونکہ رحمی تعلقات سب سے زیادہ رحمانیت سے مشابہت رکھتے ہیں۔ جیسے ماں کی اپنے بچّہ سے محبت بالکل طبعی ہوتی ہے۔ اور گو وہ بعض رنگ میں بچّہ سے فائدہ بھی اُٹھاتی ہے مگر اس کے بچّہ سے سلوک میں کسی بدلہ کا کوئی احساس نہیں ہوتا۔ پس ماں اور بچّہ کے تعلقات کا رحمانیت سے نکلا ہُوا ہونا بتاتا ہے کہ رحمانیت بلا مبادلہ سلوک کا نام ہے۔

(۴) پھر قواعدِ زبان سے بھی یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ رحمٰن فعلان کے وزن پر ہے اور عربی زبان میں جو لفظ اس وزن پر آتے ہیں وہ پھیلاؤ۔ وسعت اور غلبہ پر دلالت کرتے ہیں۔ اور رحیم فَعِیْلٌ کے وزن پر ہے۔ اور فعیل کا لفظ بار بار وقوع پر دلالت کرتا ہے۔ پس رحمٰن کے معنے ہیں۔ نہایت ہی وسیع رحمت والا جس کی رحمت میں لاتعداد افراد شامل ہیں اور جس کی رحمت سے دنیا کی کوئی چیز باہر نہیں۔ اُسکی رحمت صرف عمل کرنے والے کے ساتھ ہی تعلق نہیں رکھتی۔ بلکہ اس کا تعلق سب مخلوقات سے ہے۔ مومن، کافر جاندار، غیر جاندار سب اسکی رحمانیت سے فائدہ اُٹھا رہے ہیں۔ رحمانیت کی صفت کی اہمیت اُس سے ظاہر ہے کہ انسان جب بھی کسی نئے مقام پر پہنچتا ہے اُسے بعض نئی چیزوں کی ضرورت پیش آتی ہے بلکہ انسان کے سوا دوسری تمام چیزوں کی ترقی بھی تدریجی ہے اور ہر مرحلہ پر بعض نئے سامانوں کی احتیاج ہوتی ہے۔ پہاڑوں کے سلسلہ کو ہی دیکھ لو کہ وہ یکدم اونچے نہیں ہوتے بلکہ آہستہ آہستہ بلند ہوتے جاتے ہیں۔ پہلے زمین پر صرف نشیب و فراز نظر آتا ہے پھر معمولی پتھر آتے ہیں۔ اس کے بعد چھوٹے چھوٹے ٹیلے۔ پھر چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں۔ ان کے بعد اُن سے اونچی پہاڑیاں اور پھر پہاڑ آجاتے ہیں۔ یہی حال سبزیوں اور ترکاریوں کا ہے۔ اگر دیکھا جائے تو اُن کی ترقی میں بھی کئی مدارج نظر آئیں گے۔ پہلے بیج بویا جاتا ہے۔ پھر وہ پھوٹتا ہے اور روئیدگی ظاہر ہوتی ہے۔ اس کے بعد وہ جڑ پکڑتا ہے اور بڑھتا ہے حتّٰی کہ کونپل نکل آتی ہے۔ گویا اسکے بڑھنے کے بھی مختلف مدارج ہیں۔ غرض تمام چیزوں کے مختلف مدارج ہوتے ہیں اور ہر درجے پر اس چیز کو نئے سامانوں کی ضرورت ہوتی ہے۔

انسان کی بھی یہی حالت ہے کہ وہ ترقی کے ایک درجہ کو حاصل کر لیتا ہے تو اُسے اُس سے اگلے مقام کیلئے نئے سامانوں کی حاجت ہوتی ہے۔ بچّہ پیدا ہوتا ہے تو اُسے نرم غذا کی ضرورت ہوتی ہے اور وہ اُسے ماں کی چھاتیوں سے ملتی ہے۔ جب ذرا طاقت پکڑ جاتا ہے اور ٹھوس غذا کا محتاج ہوتا ہے تو اس کے دانت نکل آتے ہیں۔ پھر وہ بڑا ہوتا ہے اور نسل کے پیدا کرنے کے قابل ہوتا ہے تو اُس کے لئے خدا تعالیٰ نے جوڑا مہیّا کیا ہُوا ہوتا ہے۔ اسی طرح آنکھ کھلتی ہے تو سورج موجود ہوتا ہے تاکہ اس کی روشنی میں وہ تمام چیزوں کو دیکھ سکے۔ پھر آنکھ کے لئے ضروری تھا کہ خوبصورت اشیاء ہوں تاکہ اُس میں طراوت پیدا ہو۔ اِس کے لئے اُس نے حسین مناظر۔ خوبصورت انسان۔ رنگ رنگ کے پھول مختلف قسم کی سبزیاں عجیب و غریب درخت ہزاروں قسم کی جڑی بوٹیاں اور سینکڑوں چرند اور پرند پیدا کر دئیے۔ پھر اُس نے کان دیئے تو ساتھ ہی آوازیں بھی پیدا کر دیں۔ مگر ان آوازوں میں بھی بے شمار فرق رکھ دیئے۔ اگر سب کی آواز ایک جیسی ہوتی تو امتیاز کرنا مشکل ہوتا۔ مگر گھوڑے اور گدھے کی آواز سُنکر انسان فوراً امتیاز کر لیتا ہے کہ گھوڑا ہنہنا رہا ہے یا گدھا رینگتا ہے۔ پھر ہر انسان کی آواز میں کچھ نہ کچھ فرق رکھدیا جس سے ہر شخص دوسرے کی آواز سے ہی اُسے پہچان لیتا

ہے۔اسی طرح اُس نے چھُونے کی طاقت دی تو ساتھ ہی
چھُونے کے لئے چیزیں بھی پیدا کر دیں۔پھر ان چیزوں میں سے
بھی کسی کو نرم بنایا اور کسی کو سخت۔کوئی پھسلنی بنائی
اور کوئی کھُردری۔پھر نرمی اور سختی میں ہزاروں قسم کے
فرق رکھ دیئے۔ہم ریشم پر ہاتھ رکھتے ہیں تو اُس میں اور
قسم کی ملائمت ہوتی ہے۔ربڑ پر ہاتھ رکھتے ہیں تو اُس میں
اَور قسم کی ملائمت ہوتی ہے اور ہماری چھونے کی طاقت
دونوں میں فوراً ایک امتیاز قائم کر لیتی ہے۔غرض جس چیز
پر بھی نگاہ ڈالی جائے اُس کی صرف ایک کڑی معلوم نہیں
ہوتی بلکہ کڑیوں کا ایک لمبا سلسلہ نظر آتا ہے۔اور
ہر کڑی کے مکمل ہونے پر ایک نئی ضرورت پیش آتی ہے
جس کے لئے پہلے سے سامان تیار ہوتا ہے۔اور اَلرَّحْمٰن
کے معنوں میں یہی مفہوم شامل ہے کہ وہ ہر چیز کی ترقی کے
سلسلہ میں ہر کڑی پر جن سامانوں کی ضرورت ہوتی ہے
پہلے سے مہیا کر دیتا ہے۔ہر نئی منزل پر جو ضرورتیں ہوتی
ہیں خواہ وہ مادیات کی قسم کی ہوں یا روحانیات کی
قسم کی۔خواہ علمی ہوں سب کے لئے ضرورت کے مطابق
پہلے سے سامان تیار کر دیتا ہے۔

سائنس کے ذریعہ اب یہ ایک نئی بات معلوم ہوئی
ہے کہ دماغ ایک کوٹھڑی کی طرح ہے جس میں تمام باتیں
جو انسان اپنے حواس سے معلوم کرتا ہے جمع رہتی ہیں۔
یہ کوٹھڑیاں یعنی سیلز اگر کسی وقت ختم ہو جائیں تو دماغ
میں اَور زیادتی ہو جاتی ہے۔یہ نئی تحقیق نہایت لطیف
مثال رحمانیت کی مہیا کرتی ہے۔کیونکہ اس سے معلوم
ہوتا ہے کہ ترقی کی ہر منزل پر آئندہ ترقی کے لئے سامان
اللہ تعالیٰ پیدا کر دیتا ہے اور ممکن نہیں کہ صحیح ضرورت
ہو اور سامان موجود نہ ہو۔

بعض لوگوں نے غلطی سے یہ سمجھا ہے کہ رَحْمٰن
کا لفظ معرب ہے یعنی کسی دوسری زبان سے عربی میں
منتقل کیا گیا ہے اور مبرّد جیسے ادیب نے بھی اِس
غلطی کا ارتکاب کیا ہے۔چنانچہ ابن الانباری نے
زاھر میں مبرّد کا یہ قول نقل کیا ہے کہ رحمٰن عبرانی
لفظ ہے عربی نہیں۔مگر یہ قول بالبداہت غلط ہے۔
کیونکہ رحمٰن عبرانی کا لفظ نہیں بلکہ عربی میں قبل از
بعثت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم عرب کے شعراء کے
کلام میں بھی اس لفظ کا استعمال پایا جاتا تھا۔چنانچہ
سلامت بن جندب الطہوی کا شعر ہے ؎

عَجِلْتُمْ عَلَيْنَا اِذْ عَجِلْنَا عَلَيْكُمْ
وَمَا يَشَاءِ الرَّحْمٰنُ يَعْقِدْ وَيُطْلِقِ

یعنی جب ہم نے تمہاری طرف جلدی کی تو تم نے ہماری طرف
جلدی کی اور جو کچھ رحمٰن چاہے وہ ہو کر ہی رہتا ہے۔
(تفسیر ابن کثیر برحاشیہ فتح البیان جلد اول ص۲۷)

اصل بات یہ ہے کہ لفظ رحمٰن کی نسبت یہ شبہ کہ
یہ لفظ عربی نہیں قرآن کریم کی ہی اس آیت کو نہ سمجھنے سے
پیدا ہوا ہے کہ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اسْجُدُوْا لِلرَّحْمٰنِ
قَالُوْا وَمَا الرَّحْمٰنُ ۗ اَنَسْجُدُ لِمَا تَاْمُرُنَا
وَزَادَهُمْ نُفُوْرًا۔یعنی جب اُن سے کہا جاتا ہے کہ
رحمٰن کو سجدہ کرو تو وہ کہتے ہیں کہ یہ رحمٰن کون ہے؟ کیا تم
جسے حکم دو ہم اُسے سجدہ کرنے لگ جائیں گے؟ اور یہ بات
انہیں نفرت میں اَور بھی بڑھا دیتی ہے۔

اِس آیت سے بعض لوگوں نے دھوکا کھایا ہے کہ
شاید لفظ رحمٰن عربی نہیں۔اس لئے عرب کے لوگ
رحمٰن کا لفظ نہ سمجھ سکے۔اس غلط فہمی کو بخاری کی
اِس روایت سے مزید تقویت ہوئی کہ جب صلح حدیبیہ
کے موقعہ پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ کو
بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ لکھنے کا حکم دیا۔تو
کفار کے نمائندوں نے کہا کہ لَا نَعْرِفُ الرَّحْمٰنَ وَلَا
الرَّحِيْمَ۔یعنی ہم نہ رحمٰن کو پہچانتے ہیں اور نہ رحیم کو۔

پس یہ نہ لکھو لیکن اِس حدیث کے الفاظ ہی بتاتے ہیں کہ کفار کو رحمٰن کا لفظ جاننے سے انکار نہ تھا۔ کیونکہ وہ کہتے ہیں کہ ہم رحیم کو بھی نہیں جانتے۔ حالانکہ رَحِیْم کا لفظ تو سب کے نزدیک عربی ہے۔ پس رحیم کے انکار سے صاف ظاہر ہے کہ اُن کو اِن لفظوں کے عربی ہونے سے انکار نہیں تھا بلکہ اس امر پر اعتراض تھا کہ معاہدہ کو بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ سے کیوں شروع کیا گیا ہے۔ عرب لوگ صرف بِسْمِ اللّٰهِ کہتے تھے اور رحمٰن رحیم کی زیادتی کو اسلامی بدعت سمجھتے تھے۔ اِس وجہ سے انہوں نے اِن دونوں لفظوں کے اضافہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو روکنا چاہا کہ اس طرح ہم پر اسلام کو ہماری غفلت میں مسلّط کر رہے ہیں۔

اب رہا یہ سوال کہ سورۂ فرقان کی اس آیت میں جو اِن لوگوں نے رحمٰن کے نہ جاننے کا ذکر کیا ہے تو اسکا کیا مطلب ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ امر قرآن کریم سے ثابت ہے کہ عرب لوگ اس لفظ سے واقف تھے۔ چنانچہ سورۂ زخرف میں کفار کا یہ قول نقل کیا گیا ہے کہ لَوْ شَآءَ الرَّحْمٰنُ مَا عَبَدْنٰهُمْ (زخرف ع آیت ۲۱) اگر رحمٰن چاہتا تو ہم بُت پرستی نہ کرتے۔ اِس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ کفار یہ لفظ استعمال کیا کرتے تھے۔ اور اس سے واقف تھے۔ پس اس کی موجودگی میں سورۂ فرقان کی اِس آیت کا صرف یہ مطلب ہے کہ گو کفار رحمٰن کے لفظ سے آگاہ تھے مگر بوجہ آسمانی علم سے عدم واقفیت کے وہ اس کے باریک معنوں سے ناواقف تھے جو اسلام نے پیش کئے ہیں۔ یعنی بلا مبادلہ رحم کرنے والا۔ اور چونکہ یہ معنے اُن کے عقائد کے خلاف تھے اِس لئے وہ چڑ کر کہہ دیتے تھے کہ ہم نہیں جانتے کہ رحمٰن کیا ہوتا ہے۔ اور اس سے اُن کی یہ مراد نہیں ہوتی تھی کہ ہم اس لفظ کو نہیں جانتے بلکہ یہ مراد ہوتی تھی کہ ہم اِن معنوں کے مطابق کسی کو رحمٰن ماننے کیلئے تیار نہیں ہیں۔ غرض کفار کا اعتراض لفظ رحمٰن پر نہیں تھا بلکہ اُس اصطلاح پر تھا جو قرآن کریم نے رحمٰن کے ذریعہ پیش کی تھی۔ جو عربوں میں رائج نہ تھی۔ جیسے صلوٰۃ عربی زبان کا لفظ ہے مگر اصطلاحی صلوٰۃ قرآن کریم نے ہی پیش کی ہے۔ اس کے متعلق بھی کفار کہہ سکتے تھے کہ ہم نہیں جانتے کہ صلوٰۃ کیا ہوتی ہے۔ پس ان لوگوں کا اعتراض درحقیقت اِصطلاح پر تھا اور انہوں نے یہ کہا کہ اس کا جو مطلب قرآن پیش کرتا ہے اُس کو ہم نہیں مانتے۔ یہ ایسی ہی بات ہے جیسے قرآن کریم میں آتا ہے کہ وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ (ابراہیم ع) یعنی ہم نے ہر رسول کو اس کی قوم کی زبان میں ہی وحی دے کر بھیجا ہے۔ مگر سورۂ ھود میں آتا ہے۔ یٰشُعَیْبُ مَا نَفْقَهُ كَثِیْرًا مِّمَّا تَقُوْلُ (ھود ع) یعنی کفار نے کہا کہ اے شعیبؑ ہماری سمجھ میں تیری اکثر باتیں نہیں آتیں۔ اب اس کا یہ مطلب نہیں کہ حضرت شعیبؑ کسی ایسی زبان میں باتیں کرتے تھے جسے وہ لوگ نہیں جانتے تھے بلکہ مطلب یہ ہے کہ جو دینی باتیں وہ بیان کرتے تھے انہیں وہ لوگ نہیں سمجھتے تھے۔ اِسی طرح رحمٰن کا لفظ تو وہ بولا کرتے تھے مگر قرآن کریم نے رحمٰن اس ہستی کو قرار دیا ہے جو بغیر محنت کے انعام دیتی ہے اور یہ بات وہ لوگ نہیں مانتے تھے کیونکہ اس کے ماننے سے اُن کا شرک باطل ہو جاتا تھا۔

اب بھی عیسائی رحمٰن کا لفظ استعمال نہیں کرتے کیونکہ اس کے جو معنے قرآن کریم نے پیش کئے ہیں اُن سے عیسائیت کا کفارہ ردّ ہو جاتا ہے۔ اور ظاہر ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ انسان کی کمزوریوں کو بخش دیتا ہے اور یہ کفارہ کے خلاف ہے۔ لیکن اس کے یہ معنے نہیں کہ عیسائی رحمٰن کا لفظ نہیں جانتے بلکہ یہ ہیں کہ وہ اس اصطلاح کے قائل نہیں جو قرآن نے پیش کی ہے۔ چنانچہ وہ اپنی کتابوں کے پہلے کبھی بسم اللہ الرحمٰن الرحیم نہیں لکھتے بلکہ بسم اللہ الرحیم یا بسم اللہ الہادی الجواد وغیرہ الفاظ لکھتے ہیں

تَبٰرَكَ الَّذِیْ جَعَلَ فِی السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّجَعَلَ

برکت والی ہے وہ ہستی جس نے آسمان میں ستاروں کے ٹھہرنے کے مقام بنائے ہیں اور اُس میں چمکتا ہوا

فِیْهَا سِرٰجًا وَّقَمَرًا مُّنِیْرًا ﴿٦٢﴾ وَهُوَ الَّذِیْ

چراغ بنایا ہے اور نور دینے والا چاند بنایا ہے۔ وہی ہے جس نے

جَعَلَ الَّیْلَ وَالنَّهَارَ خِلْفَةً لِّمَنْ اَرَادَ اَنْ

رات کو اور دن کو ایک دوسرے کے پیچھے آنے والا بنایا اُس شخص کے (فائدہ کے) لئے جو

یَّذَّكَّرَ اَوْ اَرَادَ شُكُوْرًا ﴿٦٣﴾

نصیحت حاصل کرنا چاہے یا شکرگزار بندہ بننا چاہے۔ ۲۹ع

۲۹ حل لغات:- اَلْبُرُوْجُ - اَلْبُرْجُ کی جمع ہے اور اَلْبُرْجُ کے معنے ہیں اَلرُّكْنُ وَالْحِصْنُ قلعہ۔ نیز محل کو بُرج کہتے ہیں (اقرب) اسی طرح آسمان میں ستاروں کی منازل مختصہ کو بھی بروج کہتے ہیں۔ (مفردات) صاحب بحر محیط مشہور لغوی ابو صالح کا یہ قول نقل کرتے ہیں کہ بُرج کے معنے بڑے ستارہ کے بھی ہوتے ہیں۔ اس لحاظ سے اس آیت کے یہ معنے ہونگے کہ اُس نے آسمان میں بڑے بڑے ستارے بنائے ہیں۔

اَلسِّرَاجُ دیئے کو کہتے ہیں جو رات کو جلایا جاتا ہے۔ نیز سورج کو سراج کہتے ہیں۔ کیونکہ وہ دن کو روشن کرتا ہے (اقرب)

خِلْفَةٌ:- اَلْخِلْفَةُ یُقَالُ فِیْ اَنْ یَّخْلِفَ كُلَّ وَاحِدٍ الْاٰخَرَ۔ یعنی خِلْفَةٌ کے معنے ایک دوسرے کے پیچھے آنے کے ہیں (مفردات) نیز عرب کہتے ہیں۔ لَهٗ وَلَدَانِ خِلْفَتَانِ اور اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ اَحَدُهُمَا طَوِیْلٌ وَّالْاٰخَرُ قَصِیْرٌ اَوْ اَحَدُهُمَا اَبْیَضُ وَّالْاٰخَرُ اَسْوَدُ۔ یعنی اس کے دو بچے ہیں جن میں سے ایک لمبے قد کا اور دوسرا چھوٹے قد کا ہے یا یہ کہ ایک سفید ہے اور دوسرا سیاہ۔ پس خِلْفَةٌ کے معنے ہونگے (۱) ایک دوسرے کے بعد آنے والے (۲) بڑا چھوٹا یا سفید و سیاہ۔

تفسیر:- فرماتا ہے تم کہتے ہو رحمٰن کیا چیز ہے رحمٰن تو وہ ہے جس نے آسمانوں میں ستاروں کے ٹھہرنے کے مقام بنائے ہیں اور اُس میں چمکتا ہوا سورج اور روشن چاند بنایا ہے۔ اور وہی ہے جس نے رات اور دن کو ان لوگوں کے فائدہ کے لئے جو نصیحت حاصل کرنا چاہیں یا اللہ تعالیٰ کے شکرگزار بندے بننا چاہیں آگے پیچھے آنے والا بنایا ہے۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے کفار کو اس امر کی طرف توجہ دلائی ہے کہ جس خدا نے انسانی جسم کی پرورش کے لئے سورج اور چاند اور ستارے، اور ہوا اور پانی اور آگ اور خاک اور ہزاروں قسم کی غذائیں تیار کی ہیں یہ کس طرح ممکن ہے کہ اُس نے انسان کی ہدایت کے لئے کوئی آسمانی ہدایت نامہ نہ اتارا ہو۔ کیونکہ یہ تو معمولی عقل

بُرُوْجٌ

اَلسِّرَاجُ

خِلْفَةٌ

کے آدمی کا بھی کام نہیں کہ ادنیٰ ضرورت کو پورا کرے اور اعلیٰ ضرورتوں کو نظر انداز کر دے پھر اللہ تعالیٰ کب ایسا فعل کر سکتا ہے۔ جب اس کی رحمانیت نے انسانی آنکھ کے لئے روشنی اور کان کے لئے آواز اور ناک کے لئے خوشبو اور زبان کے لئے مختلف ذائقے پیدا کئے ہیں تو یقیناً اُس نے عقل کے لئے بھی ایک ہدایت نامہ ارسال کیا ہوگا۔ تاکہ انسانی عقل حیرت اور شبہ میں ہی عمر نہ گذار دے بلکہ یقین اور اطمینان کے مقام پر کھڑی ہو کر زندگی کو بہتر سے بہتر بنانے کی کوشش کر سکے۔

حقیقت یہ ہے کہ جس طرح دنیوی زندگی کیلئے سورج اور چاند کی ضرورت ہے اسی طرح روحانی زندگی کیلئے ایک روحانی سورج اور چاند کی ضرورت ہے۔ اگر وہ نہ ہوں تو انسان پر روحانی موت آ جائے۔ اور وہ باوجود کھانے اور پینے کے بھوکا اور پیاسا ہو اور باوجود بصارت کے اندھا ہو اور باوجود قوتِ شنوائی کے بہرہ ہو اور باوجود زندہ ہونے کے اس پر ایک موت طاری ہو۔ اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيْكُمْ (انفال ع۳) یعنی اے مومنو! خدا اور رسول کی آواز کو سنو اور قبول کرو۔ جبکہ وہ تم کو زندہ کرنے کے لئے بلائے۔ گویا باوجود اِس کے کہ صحابہؓ کرام زندہ تھے اور کھاتے پیتے اور چلتے پھرتے تھے پھر بھی خدا نے اُن کو حکم دیا کہ جب تم کو زندہ کرنے کے لئے بلایا جائے تو تم سرتابی نہ کرو جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ موت دو قسم کی ہوتی ہے۔ ایک جسمانی اور ایک روحانی۔ جسمانی موت تو وہ ہے جس میں انسان کی روح جسمِ خاکی سے جدا ہو جاتی ہے۔ اور روحانی موت وہ ہے جب کہ انسان خدا تعالیٰ سے تعلق توڑ بیٹھتا ہے۔ پس جس طرح اِس جسمانی زندگی کو قائم رکھنے کیلئے کنوئیں کھودے جاتے ہیں اور نہریں نکالی جاتی ہیں اور مختلف قسم کے اناج بوئے جاتے ہیں اور باغ لگائے جاتے ہیں۔ ویسے ہی روحانی زندگی کو قائم رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ روحانی پانی اور روحانی غذا سے اس کو قائم رکھا جائے۔ اور جیسا کہ ایک کسان اپنی کھیتی کو پکانے کے لئے اس کو پانی دیتا ہے اور سورج اور چاند کی روشنی سے اُس کو فائدہ پہنچاتا ہے ویسے ہی انسانوں کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ کلامِ الٰہی کے پانی سے اپنے دل کی کھیتی کو سیراب کریں اور خدا تعالیٰ کے جلوے اور اس کے نبیوں کی روشنی کے پرتو سے اُس کو پکائیں تاکہ اُن کی روحانی زندگی قائم رہ سکے۔ غرض انسان کو ظاہری سورج اور چاند کی مثال دے کر اُس باطنی انتظام کی طرف متوجہ کیا گیا ہے جس سے اُس کی روحانی زندگی قائم رہتی ہے۔

اسی طرح رات اور دن کے آگے پیچھے آنے کی مثال سے بھی یہی سکھایا گیا ہے کہ جیسے ظاہری سورج ایک وقت چڑھتا ہے اور دن کی روشنی تمام دنیا میں پھیلا دیتا اور تاریکی کو نور سے بدل دیتا ہے اور تمام پوشیدہ چیزوں کو ظاہر کر دیتا ہے اور اس کے چڑھنے کے بعد بُری اور بھلی اور پاک اور ناپاک چیزوں میں فرق کرنا آسان ہو جاتا ہے اور انسان اطمینانِ قلب کے ساتھ اپنے دنیاوی کاموں میں مشغول ہو جاتا ہے اور اپنی آئندہ زندگی کے لئے سامان مہیا کرنے کی فکر میں لگ جاتا ہے اور حتی الوسع اُس کو بہتر بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ اسی طرح جب روحانی آفتاب اپنا جلوہ دکھاتا ہے اور قلوب کی سرزمین پر روشنی پھیلا دیتا ہے اور بدیوں کی ظلمت کو نیکیوں کے نور سے بدل دیتا ہے اور وہ گناہ جو انسان میں چھپے ہوئے ہوتے ہیں اُن کو ظاہر کر دیتا ہے۔ اور طرح طرح کی بُرائیاں اور خُبث اور گند اور بیماریاں جو انسان کے روحانی وجود کے ساتھ پیوستہ ہوتی ہیں

اُن سے اُس کو پاک کرتا ہے اور شفا دیتا ہے تو اُس وقت اُس میں بُرے بھلے کے پرکھنے کی قوت پیدا ہو جاتی ہے ۔ اور وہ اپنے خلوصِ دل اور صحتِ نیّت کے ساتھ اپنی رُوحانی زندگی کی بہتری کے لئے کوشاں ہوتا ہے اور خدا تعالیٰ سے سچا تعلق پیدا کر لیتا ہے ۔ پس وہ کام جو کہ مادی سورج اس زمین پر طلوع ہو کر کرتا ہے اُس سے بڑھ کر روحانی سورج سے ظہور میں آتا ہے کیونکہ یہ تو صرف اِس چند روزہ زندگی کے لئے سامان مہیا کرتا ہے اور وہ دائمی زندگی کے لئے توشہ جمع کر دیتا ہے اور انسان کو خدا سے ملا دیتا ہے ۔ اِسی طرح جب رات پڑتی ہے تو تمام دنیا میں اندھیرا چھا جاتا ہے اور اُس وقت انسان اپنے سب دنیوی کاروبار کو چھوڑ کر آرام کرنے کیلئے لیٹ جاتا ہے اور ایسی غفلت کی نیند اُس پر طاری ہو جاتی ہے کہ اس کو دنیا و مافیہا کی کچھ بھی خبر نہیں رہتی ۔ اِسی طرح جب روحانی زندگی پر رات کا تاریک زمانہ آتا ہے تو اکثر انسان دین کو چھوڑ کر دُنیا کی غفلت میں مبتلا ہو جاتے ہیں ۔ اور وہ لوگ جو کچھ کام کرنا چاہتے ہیں وہ ماموریں اللہ سے استفادہ کرنے والے لوگوں سے جو کہ چاند اور ستاروں کی مانند ہوتے ہیں فائدہ اُٹھاتے اور اس روشنی کے منتظر رہتے ہیں جو کہ رات کے بعد پیدا ہونے والی ہوتی ہے اور يَبِيْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّ قِيَامًا کے مطابق دُعاؤں اور گریہ وزاری سے اللہ تعالیٰ کی رحیمیت کو جذب کرنے کی کوشش کرتے ہیں ۔ پس اِن آیات میں انسان کو یہ تعلیم دی گئی ہے کہ وہ اس ظاہری نظام کو دیکھ کر اُس روحانی نظام کی طرف توجہ کرے جس سے دائمی زندگی وابستہ ہے ۔ چنانچہ اِسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ لِمَنْ اَرَادَ اَنْ يَّذَّكَّرَ اَوْ اَرَادَ شُكُوْرًا ۔ یعنی یہ باتیں اِس لئے بیان کی گئی ہیں تاکہ انسان اُن سے نصیحت حاصل کرے اور خدا تعالیٰ کا شکر ادا کرے کہ اُس نے صرف جسمانی طور پر ہی اُس کی دستگیری نہیں کی ۔ بلکہ روحانی طور پر بھی اُس کے لئے امن و آسائش کے سامان مہیا کئے ہیں ۔

لِمَنْ اَرَادَ اَنْ يَّذَّكَّرَ اَوْ اَرَادَ شُكُوْرًا میں اللہ تعالیٰ نے یہ بھی بتایا ہے کہ دنیا میں دو قسم کے لوگ ہوتے ہیں ۔ ایک تو وہ ہوتے ہیں جن کی نیکی کا پہلو اتنا کمزور ہوتا ہے کہ وہ شیطانی راہوں پر چلتے چلے جاتے ہیں اور اس بات کے مستحق ہوتے ہیں کہ انہیں انتباہ کیا جائے اور بُرے افعال سے بچنے کی نصیحت کی جائے اور دوسرے وہ لوگ ہوتے ہیں جو گو اس روشنی اور نُور سے محروم ہوتے ہیں جو مذہب کی اتباع میں انسان کو حاصل ہوتا ہے ۔ مگر اُن کے اندر جذبۂ شکرگذاری پایا جاتا ہے وہ خدا تعالیٰ کی نعماء اور اُس کی عطا کردہ قوتوں کا غلط استعمال نہیں کرتے بلکہ اُن سے خود بھی فائدہ اٹھاتے اور دوسروں کو بھی فائدہ پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں ۔ گویا ایک تو وہ لوگ ہوتے ہیں جو نیکی اور اخلاق سے حصّہ نہیں رکھتے اور ایک وہ لوگ ہوتے ہیں جو نیکی اور اخلاق سے حصّہ رکھتے ہیں اور چونکہ لیل و نہار کے آنے جانے میں اللہ تعالیٰ نے اس طرف اشارہ فرمایا تھا کہ کبھی خدا کے نبی اور رسول دنیا کی اصلاح کے لئے آتے ہیں اور کبھی تاریکی اور ظلمت کا دَور دَورہ ہوتا ہے ۔ اسلئے لِمَنْ اَرَادَ اَنْ يَّذَّكَّرَ اَوْ اَرَادَ شُكُوْرًا میں بتایا کہ روحانی رات اور دن کے یکے بعد دیگرے آنے جانے میں کیا حکمت ہے ۔ ہم کیوں رات کے بعد دن لاتے ہیں اور کیوں روحانی تاریکی کے بعد آفتاب ہدایت روشن کرتے ہیں ۔ فرماتا ہے ۔ ہماری غرض اس سے یہ ہوتی ہے کہ دنیا میں جو لوگ گنہگار ہوں ۔ اُن کو اس سلسلۂ رسالت کے ذریعہ نیک بنا دیا جائے ۔ اور جو لوگ فطری نیکی کے مقام پر کھڑے ہوں انہیں خدا کا کلام اور الہام اُس کے بھی

وَ عِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا

اور رحمٰن کے سچے بندے وہ ہوتے ہیں جو زمین پر آرام سے چلتے ہیں (یعنی تکبر کے ساتھ نہیں چلتے)

وَّ اِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا ﴿۶۴﴾ وَ الَّذِيْنَ

اور جب جاہل لوگ اُن سے مخاطب ہوتے ہیں (یعنی جہالت کی باتیں کرتے ہیں) تو وہ (لڑتے نہیں بلکہ) کہتے ہیں کہ ہم تو تمہارے لئے سلامتی کی دُعا کرتے ہیں۔ اور وہ لوگ

يَبِيْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّ قِيَامًا ﴿۶۵﴾ وَ الَّذِيْنَ

بھی جو اپنے رب کے لئے راتیں سجدوں میں کھڑے ہو کر گذار دیتے ہیں۔ اور وہ (یعنی رحمٰن کے بندے)

يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اصْرِفْ عَنَّا عَذَابَ جَهَنَّمَ ۖۗ اِنَّ

کہتے ہیں۔ اے ہمارے رب! ہم سے جہنم کا عذاب ٹلا دے۔ اُس کا

عَذَابَهَا كَانَ غَرَامًا ۖۗ ﴿۶۶﴾ اِنَّهَا سَآءَتْ مُسْتَقَرًّا

عذاب۔ ایک بہت بڑی تباہی ہے۔ وہ (دوزخ) عارضی ٹھکانہ کے طور پر بھی بُری ہے

اعلیٰ مقام یعنی مقامِ شکر کی طرف لے جائے۔ گویا لِمَنْ اَرَادَ اَنْ يَّذَّكَّرَ اَوْ اَرَادَ شُكُوْرًا میں دو قسم کے مدارج رکھنے والے لوگوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ ایک تو اُن کا جو نصیحت کی بات سُنکر اپنے نقائص دُور کر لیتے ہیں اور دوسرے ان کا جو صرف اِسی پر اکتفاء نہیں کرتے بلکہ ترقی کرتے کرتے اللہ تعالیٰ کے احسانات اور اُس کے انعامات کو دیکھ کر ہر وقت اُس کے ثناء خواں اور اُس کے انعامات کے شکرگذار رہتے ہیں۔

لِمَنْ اَرَادَ اَنْ يَّذَّكَّرَ سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ دُنیا میں ہر شخص کی اصلاح ہو سکتی ہے۔ پس عیسائیوں کا یہ نظریہ کہ انسان فطرتی طور پر گنہگار ہے غلط ہے۔ اگر پیدائشی لحاظ سے ہر انسان ناپاک ہوتا تو بدوں کو نیکی کی طرف اور نیکوں کو اعلیٰ درجے رُوحانی مقام کی طرف نہ لایا جا سکتا۔

اِسجگہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ نظامِ عالم کا قیام تو ایک ایسی چیز ہے جس سے کفار بھی فائدہ اٹھاتے ہیں پھر لِمَنْ اَرَادَ اَنْ يَّذَّكَّرَ اَوْ اَرَادَ شُكُوْرًا میں صرف دو گروہوں کی تخصیص کیوں کی گئی ہے۔ سو اِس کے متعلق یہ امر یاد رکھنا چاہیئے کہ جیسا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق بعض احادیث میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو فرمایا لَوْلَاكَ لَمَا خَلَقْتُ الْاَفْلَاكَ یعنی اگر تُو نے نہ آنا ہوتا تو میں زمین و آسمان بھی پیدا نہ کرتا۔ اِسی طرح یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ دنیا کی تمام چیزیں جو اللہ تعالیٰ نے پیدا کی ہیں یہ کفار کے لئے نہیں بلکہ اصل مقصود وہ مومن ہیں جو خدا تعالیٰ کے احکام پر عمل کرتے ہیں۔ کفار صرف ضمنی طور پر ان اشیاء سے فائدہ اٹھا رہے ہیں

وَّ مُقَامًا ﴿۶۶﴾ وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا

اور مستقل ٹھکانہ کے طور پر بھی (بُری ہے)۔ ۵۳ اور وہ (اللہ کے بندے) ایسے ہوتے ہیں کہ جب خرچ کرتے ہیں تو فضول خرچی سے کام نہیں لیتے

اس کی ایسی ہی مثال ہے جیسے ہم کسی دوست کی دعوت کریں تو نوکر کو بھی اس دعوت سے حصہ مل جاتا ہے۔ اسی طرح یہ نظام ارضی اور سماوی سب مومنوں کیلئے بنایا گیا ہے مگر چونکہ بنی نوع انسان میں سے ہی کچھ کافر بن جاتے ہیں اس لئے توابع کے طور پر وہ بھی فائدہ اٹھا لیتے ہیں۔ ورنہ انکی حیثیت ایسی ہی ہوتی ہے جیسے قرآن کریم میں آتا ہے کہ اِنْ هُمْ اِلَّا كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ سَبِيْلًا (فرقان ع۴) وہ لوگ چوپایوں کی طرح ہیں بلکہ چوپایوں سے بھی بدتر ہیں۔ پس وہ اگر فائدہ اٹھاتے ہیں تو اُس کی مثال ایسی ہی ہوتی ہے۔ جیسے آقا گھوڑے پر کہیں جاتا ہے تو اُس کا گھوڑا بھی چارہ کھا لیتا ہے۔ ورنہ زمین و آسمان کی اصل پیدائش اسی کے لئے ہے جو اَرَادَ اَنْ يَّذَّكَّرَ اَوْ اَرَادَ شُكُوْرًا کا مصداق ہے۔

۵۳ حل لغات:- هَوْنًا: هَانَ کا مصدر ہے اور هَانَ عَلَيْهِ الْاَمْرُ کے معنے ہیں لَانَ وَ سَهُلَ کسی کے لئے کوئی امر آسان ہو گیا اور اَلْهَوْنُ کے معنے ہیں اَلسَّكِيْنَةُ وَالْوَقَارُ سکینت اور وقار (اقرب)

يَبِيْتُوْنَ: يَبِيْتُ سے جمع مذکر غائب کا صیغہ ہے اور بَاتَ (يَبِيْتُ) کے معنے ہیں اَدْرَكَهُ اللَّيْلُ نَامَ اَوْ لَمْ يَنَمْ۔ اُس پر رات آگئی اور اُس نے وہ وقت گذارا خواہ سوتے ہوئے خواہ جاگتے ہوئے۔ وَ قَالَ الْفَرَّاءُ سَهِرَ اللَّيْلَ كُلَّهٗ فِيْ طَاعَةٍ وَ مَعْصِيَةٍ فراء جو عربی لغت کے ماہر گذرے ہیں وہ کہتے ہیں کہ بَاتَ کے معنے ہیں۔ اُس نے ساری رات خدا تعالیٰ کی اطاعت یا معصیت میں جاگ کر گذاری وَمِنْهُ هٰذِهِ الْاٰيَةُ اور قرآن مجید کی آیت يَبِيْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ میں یہی معنے مراد ہیں۔ کہ مومن خدا تعالیٰ کی عبادت میں رات جاگ کر گذارتے ہیں (اقرب)

غَرَامًا: اَلْغَرَامُ۔ اَلشَّرُّ الدَّائِمُ۔ یعنی غرام کے معنے دائمی تکلیف اور مصیبت کے ہیں۔ نیز اس کے معنے ہیں اَلْهَلَاكُ۔ ہلاکت۔ اَلْعَذَابُ۔ دُکھ تکلیف (اقرب)

غَرَامًا

هَوْنًا

يَبِيْتُوْنَ

تفسیر:- ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے عِبَادُ الرَّحْمٰنِ کی تعریف بیان فرمائی ہے اور بتایا ہے کہ ان میں کیا کیا صفات پائی جاتی ہیں۔ یوں تو بہت لوگ ہیں جو بڑے شوق سے اپنے لڑکوں کا نام عبدالرحمٰن رکھتے ہیں اور بہت ہیں کہ جب اُن سے پوچھا جائے کہ کون ہو تو بڑے فخر کے ساتھ کہتے ہیں کہ ہم اللہ کے بندے ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ کیا وہ صرف نام کے لحاظ سے اللہ تعالیٰ کے بندے ہیں یا حقیقت اور اصلیت کے لحاظ سے بھی اُس کے بندے ہیں۔ آخر اللہ تعالیٰ کا بندہ ہونے کے لحاظ سے تو تمام کافر اور منافق بھی خدا تعالیٰ کے بندے ہی ہیں۔ مگر پھر اُنہی بندوں کو خدا تعالیٰ نے اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ (اعراف ع۲۲) قرار دے کر چوپایوں سے بھی بدتر قرار دیا ہے۔ انہی بندوں میں بعض کے متعلق فرماتا ہے کہ وہ بندر اور سؤر بن گئے۔ (مائدہ ع۹) پھر انہی بندوں میں سے بعض کے متعلق فرماتا ہے کہ وہ شَرُّ الْبَرِيَّةِ یعنی تمام مخلوق سے بدتر ہیں۔ (بَيِّنَة ع۱) اس سے معلوم ہوا کہ صرف نام کے لحاظ سے اللہ تعالیٰ کا بندہ کہلانا کسی انسان کے لئے باعث فخر نہیں ہو سکتا۔ اگر صرف بندہ کہلانے سے کوئی انسان اللہ تعالیٰ کا مقرب بن سکتا تو خدا تعالیٰ نفس مطمئنہ رکھنے والے

کو کیوں فرمایا کہ فَادْخُلِیْ فِیْ عِبَادِیْ وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ
یعنی آ اور میرے بندوں میں داخل ہو جا۔ آ اور میری جنّت
میں داخل ہو جا۔ اِس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ
کے عباد میں داخل ہونا ایک بہت بلند مقام ہے جو نفسِ
مطمئنہ رکھنے والوں کو حاصل ہوتا ہے۔ ورنہ جہاں تک
اُن کی پیدائش کا سوال ہے وہ پہلے بھی اللہ تعالیٰ ہی کے
بندے تھے اور خدا تعالیٰ ہی اُن کا رازق اور مالک تھا۔
پھر فَادْخُلِیْ فِیْ عِبَادِیْ جو فرمایا تو معلوم ہُوا کہ خدا
کا بندہ ہونا دَو رنگ میں ہوتا ہے۔ ایک لحاظ سے تو تمام
انسان خدا تعالیٰ ہی کے بندے ہیں۔ لیکن ایک لحاظ سے
بعض اُس کے بندے ہوتے ہیں اور بعض نہیں ہوتے۔ جو
لوگ اس کے احکام کی اطاعت کرتے ہیں وہ تو اُس کے
بندے کہلاتے ہیں اور جو نہیں کرتے وہ خدا کے بندے
نہیں کہلاتے بلکہ شیطان کے یا اپنے نفس کے بندے ہوتے
ہیں۔ اِن آیات میں خدا تعالیٰ نے کچھ صفات بیان فرمائی
ہیں اور بتایا ہے کہ خدا تعالیٰ کے پاک نفس بندے کن صفات
کے حامل ہوتے ہیں۔ مگر اسجگہ بجائے عِبَادُ اللّٰہِ کہنے کے
اللہ تعالیٰ نے عِبَادُ الرَّحْمٰنِ کے الفاظ استعمال فرمائے
ہیں کیونکہ کفار کی طرف سے بار بار یہ سوال ہوتا تھا کہ
رحمٰن کون ہے؟ سو اللہ تعالیٰ نے پہلے تو انہیں اپنی صفتِ
رحمانیت کے ثبوت میں زمین و آسمان اور سورج اور چاند
اور ستاروں وغیرہ کی طرف توجہ دلائی اور پھر محمد رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنا وجود اُن کے سامنے پیش کیا جو
صفتِ رحمانیت کے ایک کامل مظہر تھے۔ اب اللہ تعالیٰ
انہیں بتاتا ہے کہ اگر یہ شواہد بھی تمہاری آنکھیں کھولنے
کے لئے کافی نہیں اور تمہیں خدا تعالیٰ کی رحمانیت کا جلوہ
نظر نہیں آتا تو تم خدا تعالیٰ کے اُن بندوں کو دیکھ لو
جو اس کی رحمانیت کے چلتے پھرتے مجسمہ ہیں یعنی جس طرح
سورج زمین کو اپنی شعاعوں سے منوّر کرتا اور ہر قسم کی
تاریکیوں کو دُور کرتا ہے اِسی طرح وہ لوگ جو محمد رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے ہیں وہ آپ کے فیضِ صحبت
کی برکت سے دنیا کو ہر قسم کی علمی اور عقلی روشنی بہم پہنچا
رہے ہیں اور انہیں اخلاق اور مذہب اور روحانیت کے
میدان میں ہلاکت اور بربادی کے گڑھوں سے بچاتے ہوئے
ترقی اور کامیابی کی راہیں دکھا رہے ہیں اور جس طرح چاند
سورج سے نور اخذ کرتا اور زمین پر اپنی فرحت بخش روشنی
پھیلا دیتا ہے۔ اِسی طرح یہ لوگ خدا تعالیٰ سے وحی والہام
کا نور پاکر دنیا کو اپنی اُن برکات سے متمتع کر رہے ہیں
جن کا منبع انسانی عقل نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کا تازہ الہام
ہے۔ اور جس طرح رات لوگوں کے لئے آرام اور سکون کا
موجب ہوتی ہے اِسی طرح یہ لوگ غریبوں کے ہمدرد۔
مسکینوں کے ملجاء اور بیواؤں اور یتامیٰ کے ماویٰ ہیں اور
دنیا سے ہر قسم کے جھگڑوں اور فسادات کو مٹا کر ایک
عالمگیر امن کی بنیاد رکھ رہے ہیں اور جس طرح آسمان
سے اِس مادی دُنیا پر بارشیں نازل ہوتی اور پیاسی زمینیں
سیراب ہو جاتی ہیں اِسی طرح یہ لوگ علم و عرفان کی
ایک بارش ہیں جس سے دنیا میں ایک نیا انقلاب پیدا ہو رہا
ہے اور جس طرح بارش سے پھل اور پھول اور میوے اور
طرح طرح کی غذائیں پیدا ہوتی ہیں۔ اِسی طرح اُن کے
ذریعہ نئے نئے علوم دنیا میں ایجاد ہو رہے ہیں۔ اور جسطرح
زمین ہر ایک کے لئے فرش کا کام دیتی ہے۔ اِسی طرح ان کا
دامنِ فیض بھی دنیا کی ہر قوم کے لئے وسیع ہے اور ہر
مشرقی اور مغربی اور عربی اور عجمی کے لئے اُن کی محبت
بھری گود کھلی ہے۔ غرض یہ لوگ خدائے رحمٰن کی صفتِ
رحمانیت کا ایک زندہ ثبوت ہیں۔ یہ پانی کی طرح
خدا تعالیٰ کی طرف بہتے اور ہواؤں کی طرح اُسکی طرف
اُڑتے اور مشکلات اور حوادث میں زمین کی طرح ثابت قدم
رہتے اور آگ کی طرح ہر قسم کی شیطنت کو جلاتے اور

پہاڑوں کی طرح دُنیا کی حفاظت کے فرائض سرانجام دیتے ہیں پس اُن کو دیکھ کر بھی خدائے رحمٰن کی رحمانیت انسان کی آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اِن عبادِ رحمٰن کی علامات بیان کرتے ہوئے سب سے پہلی **علامت** یہ بیان فرماتا ہے کہ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا وہ زمین پر بڑے سکون اور وقار کے ساتھ چلتے ہیں۔ اِس کے ایک معنے تو یہ ہیں کہ وہ اپنی دنیوی زندگی بڑے اعتدال کے ساتھ بسر کرتے ہیں۔ یعنی نہ تو بے جا غضب اور تیزی سے کام لے کر لوگوں پر ظلم کرتے ہیں اور نہ سُستی اور جمود کا شکار ہو کر اپنے مفوضہ فرائض کی ادائیگی سے غافل ہو جاتے ہیں بلکہ جس طرح آسمان کا وجود زمینی قوتوں کے نشو و نما کیلئے ضروری ہوتا ہے اسی طرح اُنکا وجود لوگوں کی ترقی اور اُن کی فلاح و بہبود کا موجب بنتا ہے اُنکی تباہی اور بربادی کا موجب نہیں بنتا۔ وَاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا اور جب جاہل لوگ چاہتے ہیں کہ انہیں اپنی حرکات سے جوش دلائیں اور کوئی جھگڑا اور فساد کھڑا کریں تو وہ طیش میں آکر ناجائز اور اوچھے ہتھیاروں پر نہیں اُتر آتے بلکہ ایسی حالت میں بھی اُن کی سلامتی ہی چاہتے ہیں یعنی ایسے ذرائع استعمال میں لاتے ہیں جن سے اُن کی اصلاح ہو جائے۔ اور دنیا میں امن اور سلامتی کا دَور دَورہ ہو۔

مگر اِن معنوں کے علاوہ اِس میں ایک اَور مضمون بھی بیان کیا گیا ہے جس کی طرف عام طور پر بہت کم توجہ کی جاتی ہے اور وہ یہ کہ اِس میں یہ بتایا گیا ہے کہ مسلمانوں کو جب غلبہ و اقتدار حاصل ہو گا تو اُس وقت اُن میں کیا کیا صفات پائی جائیں گی۔ یہی حکمت ہے جس کی بناء پر خدا تعالیٰ نے اسجگہ يَمْشُوْنَ فِي الْاَرْضِ نہیں فرمایا بلکہ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ فرمایا ہے۔ اگر صرف چلنے کا ذکر ہوتا تو يَمْشُوْنَ فِي الْاَرْضِ کافی تھا مگر اِس جگہ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ کہکر عَلٰی کو استعلاء کے معنوں میں استعمال کیا گیا ہے اور اِس طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ انہیں دنیا پر غلبہ حاصل ہو گا اور وہ پورے اقتدار کے ساتھ ایک غالب اور فاتح قوم کے افراد کی طرح چلیں گے گویا اُن کا چلنا عام لوگوں کی طرح نہیں ہو گا بلکہ اقتدار اور غلبہ اُن کے ساتھ ہو گا۔ اور وہ ایسے مقام پر کھڑے ہونگے کہ لوگوں کو اپنی طاقت سے کچل سکیں۔ یہ ایسا ہی فقرہ ہے جیسے حضرت سلیمان علیہ السلام کے متعلق ایک نملہ نے کہا کہ يٰٓاَيُّهَا النَّمْلُ ادْخُلُوْا مَسٰكِنَكُمْ لَا يَحْطِمَنَّكُمْ سُلَيْمٰنُ وَجُنُوْدُهٗ وَهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ (نمل ع ۲) یعنی اے نملہ قوم سے تعلق رکھنے والو۔ اپنے اپنے گھروں میں چلے جاؤ۔ ایسا نہ ہو کہ سلیمانؑ اور اُس کے طوفانی لشکر تمہارے حالات سے بے خبر ہونے کی وجہ سے تمہیں اپنے پیروں کے نیچے مَسل دیں۔ اگر خالی چلنے کا یہاں ذکر ہوتا تو يَمْشُوْنَ فِي الْاَرْضِ کہنا کافی تھا۔ لیکن عَلٰی کا صلہ لا کر ایک دوسرا مفہوم پیدا کر دیا گیا ہے کہ وہ ایسی طاقت رکھیں گے کہ دنیا کو اپنے پاؤں کے نیچے روند سکیں۔ مگر جس طرح حضرت سلیمان علیہ السلام کے متعلق ذکر آتا ہے کہ وہ نہایت احتیاط کے ساتھ چلتے تھے تا ایسا نہ ہو کہ کوئی قوم اُن کے ذریعہ کچلی جائے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ اِن آیات میں مسلمانوں کے متعلق بیان فرماتا ہے کہ جب وہ دنیا پر غالب آئیں گے تو اِس امر کی خاص احتیاط رکھیں گے کہ کوئی قوم اُن کے پاؤں کے نیچے روندی نہ جائے۔ گویا اُن کے اندر یہ طاقت تو ہو گی کہ وہ دنیا کو روند ڈالیں مگر چونکہ وہ نیک اور پارسا ہونگے اس لئے يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا کا مصداق ہونگے۔ یعنی وہ اِس طرز پر چلیں گے کہ ہر وقت یہ امر اُن کے مدِّنظر رہیگا کہ کسی فرد یا قوم کو اُن کے ہاتھوں کوئی ناجائز تکلیف نہ پہنچے۔

اِس کے بعد وَاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا کہکر اِس طرف اشارہ فرمایا گیا ہے کہ

حاکم انسان دوسرے کو دُکھ دے سکتا ہے۔ اور بالعموم
حکّام کی عادت میں یہ بات داخل ہوتی ہے کہ جب اُن
کے سامنے کوئی گستاخانہ کلام کرے تو وہ کہتے ہیں ہم
تمہاری اچھی طرح خبریں گے اور تمہیں بتائیں گے کہ تمہاری
اس گستاخی کی کیا سزا ہے۔ مگر مسلمانوں کی یہ حالت ہوگی
کہ حکومت اور طاقت اور غلبہ اور رعب کے باوجود جب
اُن سے کوئی خطاب جہالت کرے گا تو وہ مسکراتے ہوئے
کہہ دیں گے کہ ہم کچھ بُرا نہیں مناتے۔

حدیثوں میں آتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم
کے پاس ایک دفعہ ایک یہودی آیا اور اُس نے آپ سے
کسی قرض کا نہایت سختی سے مطالبہ کیا۔ صحابہؓ یہ حالت دیکھ
کر غصہ سے بیتاب ہوگئے اور انہوں نے اپنی تلواریں سونت
لیں مگر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن سے فرمایا جانے دو
جس کا حق ہوتا ہے وہ دوسرے پر سختی کر ہی بیٹھتا ہے۔
اسی طرح ایک اَور شخص نے ایک دفعہ رسول کریم صلی اللہ
علیہ وسلم سے کہہ دیا کہ آپ نے جو اموال کی تقسیم کی ہے
اُس میں انصاف سے کام نہیں لیا۔ حضرت عمرؓ تلوار
لے کر کھڑے ہوگئے تاکہ اس کا سر اُڑا دیں مگر رسول کریم
صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جانے دو اور اسے کچھ
نہ کہو۔ غرض وَإِذَا خَاطَبَهُمُ الْجَاهِلُونَ قَالُوا
سَلَامًا میں اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ مومنوں کو
جب غلبہ حاصل ہوگا تو ایسی حالت میں بھی وہ کسی کے
خطابِ جہالت پر بُرا نہیں منائیں گے بلکہ اُن کی سلامتی
اور تحفظ حقوق کو مدّنظر رکھیں گے۔ اور درحقیقت غلبہ
کے وقت ہی انسان کے اعلیٰ اخلاق کا پتہ چلتا ہے ورنہ
کمزوری کی حالت میں کسی کا مار کھا لینا تو ستر بی بی از
بےچادری والی بات ہوتی ہے۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ مار
نہ کھائے تو کیا کرے اُس کے اندر مقابلہ کی طاقت تو
ہے ہی نہیں۔ لیکن جب کوئی شخص طاقت رکھتے ہوئے
عفو سے کام لیتا ہے اور سزا دینے کی طاقت رکھتے
ہوئے کچھ نہیں کہتا تو اُس وقت ظاہر ہو جاتا ہے کہ
فی الواقعہ وہ اعلیٰ درجہ کے اخلاق کا مالک ہے۔

پھر فرماتا ہے۔ وَالَّذِينَ يَبِيتُونَ لِرَبِّهِمْ
سُجَّدًا وَقِيَامًا۔ وہ لوگ اپنی راتیں خدا تعالیٰ کے
حضور سجدہ و قیام کرتے ہوئے گذار دیتے ہیں۔ اس میں
جہاں عباد الرحمٰن کی یہ خصوصیت بتائی گئی ہے کہ وہ
مصائب اور مشکلات کے اوقات میں جو رات کی تاریکیوں
سے مشابہت رکھتے ہیں دعاؤں اور گریہ و زاری سے کام
لیتے اور خدا تعالیٰ کے آستانہ پر جھکے رہتے ہیں۔ وہاں
اس میں تہجد کی ادائیگی بھی عباد الرحمٰن کا شعار قرار
دیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ اُن کی راتیں خراٹے بھرتے
ہوئے نہیں گذرتیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی یاد اور اُس کی محبت
اور عبادت میں گذرتی ہیں۔ وہ جسمانی تاریکی کو دیکھ کر
ڈرتے ہیں کہ کہیں اُن پر روحانی تاریکی بھی نہ آجائے اور
وہ دعاؤں اور استغفار اور انابت سے خدا تعالیٰ کی
رحمت کو جذب کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایک اور مقام
پر اللہ تعالیٰ نے نمازِ تہجد کی اہمیت اِن الفاظ میں
بیان فرمائی ہے کہ إِنَّ نَاشِئَةَ اللَّيْلِ هِيَ أَشَدُّ
وَطْأً وَأَقْوَمُ قِيلًا (مزمل ع ۱) یعنی رات کا اٹھنا
انسانی نفس کو کچلنے میں سب سے زیادہ کامیاب نسخہ ہے
اور رات کو خدا تعالیٰ کے حضور سجدہ میں گرے رہنے والوں
کی روحانیت ایسی کامل ہو جاتی ہے کہ وہ ہمیشہ سچ کے
عادی ہو جاتے ہیں۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز تہجد
کا اسقدر خیال رہتا تھا کہ آپ بعض دفعہ رات کو اٹھ
کر چکر لگاتے اور دیکھتے کہ کون کون تہجد پڑھ رہا ہے۔
ایک دفعہ مجلس میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا ذکر آگیا کہ
وہ بڑی خوبیوں کے مالک ہیں۔ آپ نے فرمایا۔ ہاں بڑا
اچھا ہے بشرطیکہ تہجد بھی پڑھے۔ معلوم ہوتا ہے۔

اُن دنوں حضرت عبداللہ بن عمرؓ تہجد پڑھنے میں سُستی کرتے ہونگے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اِس ذریعہ سے انہیں توجہ دلائی کہ وہ اپنی اِس سُستی کو دُور کریں۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے اُسی دن سے تہجد کی نماز میں باقاعدگی اختیار کرلی۔

ایک دفعہ رات کے وقت آپ اپنے داماد حضرت علیؓ اور اپنی بیٹی حضرت فاطمہؓ کے گھر گئے اور باتوں باتوں میں دریافت فرمایا کہ کیا تم تہجد بھی پڑھا کرتے ہو۔ حضرت علیؓ نے کہا۔ یارسول اللہ! پڑھنے کی کوشش تو کرتے ہیں لیکن جب خدا تعالیٰ کے منشاء کے ماتحت کسی وقت آنکھ نہیں کھلتی تو نماز رہ جاتی ہے۔ آپ اُسی وقت اُٹھ کر اپنے گھر کی طرف چل پڑے اور بار بار فرماتے وَكَانَ الْإِنْسَانُ اَكْثَرَ شَيْءٍ جَدَلًا (بخاری کتاب الکسوف باب التہجد فی اللیل) یعنی انسان اپنی غلطی تسلیم کرنے کی بجائے مختلف قسم کی تاویلیں کرکرکے اپنے قصور پر پردہ ڈالنے کی کوشش کرتا ہے۔ آپ کا مطلب یہ تھا کہ بجائے اِس کے کہ وہ اپنی غلطی کا اعتراف کرتے انہوں نے یہ کیوں کہا کہ جب خدا کا منشاء ہوتا ہے کہ ہم نہ جاگیں تو ہم سوئے رہتے ہیں اور اس طرح اپنی غلطی کو اللہ تعالیٰ کی طرف کیوں منسوب کیا۔ آپ فرمایا کرتے تھے کہ اگر رات کو میاں کی آنکھ کھلے اور وہ تہجد کے لئے اُٹھے تو اپنی بیوی کو بھی تہجد کے لئے جگائے۔ اور اگر وہ نہ اُٹھے تو اُس کے مُنہ پر پانی کا ہلکا سا چھینٹا دے۔ اور اگر بیوی کی آنکھ کھل جائے اور اُس کا میاں جگانے کے باوجود نہ اُٹھے تو اُسکے مُنہ پر پانی کا ہلکا سا چھینٹا دے آپؐ تہجد کی اہمیت پر اسقدر زور دیا کرتے تھے کہ آپؐ نے فرمایا۔ اللہ تعالیٰ رات کے آخری حصہ میں اپنے بندوں کے قریب آجاتا ہے اور اُنکی دعاؤں کو دن کی نسبت بہت زیادہ قبول فرماتا ہے۔

آپؐ نے ایک دفعہ فرمایا۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے بتایا ہے کہ انسان نوافل کے ذریعہ مجھ سے اتنا قریب ہوجاتا ہے کہ مَیں اُس کے کان ہوجاتا ہوں جن سے وہ سُنتا ہے اُس کی آنکھیں ہوجاتا ہوں جن سے وہ دیکھتا ہے۔ اُس کے ہاتھ ہوجاتا ہوں جن سے وہ پکڑتا ہے اور اُس کے پاؤں ہوجاتا ہوں جن سے وہ چلتا ہے۔ اِس سے معلوم ہوسکتا ہے کہ رات کا اُٹھنا انسان کو اللہ تعالیٰ کے کسقدر قریب کردیتا ہے۔ مگر افسوس ہے کہ اس زمانہ میں تہجد پڑھنے کی عادت بہت کم ہوگئی ہے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے عباد الرحمٰن کی یہ ایک خاص خوبی بیان کی ہے کہ وہ اپنی راتیں خدا تعالیٰ کے حضور سجدہ و قیام میں گذار دیتے ہیں۔ مگر چونکہ یہ آیات مسلمانوں کے دَورِ حکومت کی امتیازی خصوصیات کی بھی حامل ہیں اس لئے يَبِيتُونَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّقِيَامًا میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ مسلمانوں کو جب دنیا پر غلبہ حاصل ہوگا تو وہ عیش و عشرت میں منہمک نہیں ہونگے بلکہ اُن کی راتیں خدا تعالیٰ کے حضور سجدہ و قیام کرتے ہوئے گذریں گی۔ چنانچہ جب تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو ہمیں مسلمانوں کی اِس امتیازی خصوصیت کا بھی نہایت واضح طور پر علم حاصل ہوتا ہے۔ تاریخوں میں لکھا ہے کہ جب روم کے ساتھ مسلمانوں کی لڑائی ہوئی تو رومی جرنیل نے اپنا ایک وفد مسلمانوں کے حالات کا جائزہ لینے کے لئے بھیجا اور اُس نے کہا کہ تم مسلمانوں کے لشکر کو جاکر دیکھو اور پھر واپس آکر بتاؤ کہ اُن کی کیا کیفیت ہے جب وہ وفد اسلامی لشکر کا جائزہ لے کر واپس گیا تو اُس نے کہا ہم مسلمانوں کو دیکھ آئے ہیں۔ وہ ہمارے مقابلہ میں بہت تھوڑے ہیں مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ کوئی جن ہیں کیونکہ ہم نے دیکھا کہ وہ دن کو لڑتے ہیں اور رات کو تہجد پڑھنے کے لئے کھڑے ہوجاتے ہیں۔ ہمارے سپاہی جو دن بھر کے تھکے ماندے ہوتے ہیں وہ تو رات کو شرابیں پیتے اور ناچ گانے میں مشغول ہوجاتے ہیں اور جب اِن کاموں سے فارغ ہوتے ہیں تو آرام سے سوجاتے ہیں۔ مگر وہ لوگ

کوئی عجیب مخلوق ہیں کہ دن کو لڑتے ہیں اور راتوں کو اُٹھ اُٹھ کر خدا تعالیٰ کی عبادت کرتے اور اُس کا ذکر کرتے ہیں ایسے لوگوں سے لڑنا بے فائدہ ہے۔ چنانچہ دیکھ لو۔ اس ذکرِ الٰہی کے نتیجہ میں خدا تعالیٰ بھی آسمان سے اُن کی مدد کیلئے اُترا اور اُس نے انہیں بڑی بڑی طاقتور حکومتوں پر غالب کر دیا۔ عرب کی ساری آبادی ایک لاکھ اسّی ہزار تھی۔ مگر انہوں نے روم جیسے ملک سے ٹکر لے لی جس کی بیس کروڑ آبادی تھی۔ پھر انہوں نے کسریٰ کے ملک پر حملہ کر دیا اور اس کی آبادی بھی بیس تیس کروڑ تھی۔ گویا پچاس کروڑ کی آبادی رکھنے والے ممالک پر ایک لاکھ اسّی ہزار کی آبادی رکھنے والے ملک کا ایک حصہ حملہ آور ہوا۔ اور پھر یہ ملک اتنے طاقتور تھے کہ ہندوستان بھی اُن کے ماتحت تھا چین بھی اُن کے ماتحت تھا۔ اسی طرح ٹرکی آرمینیا۔ عراق اور عرب کے اوپر کے ممالک یعنی فلسطین اور مصر وغیرہ بھی اُن کے ماتحت تھے۔ مگر باوجود اتنی کثرت کے مٹھی بھر مسلمان نکلے تو انہوں نے اِن لوگوں کا صفایا کر دیا اور بارہ سال کے عرصہ میں اُن کی فوجیں قسطنطنیہ کی دیواروں سے جا ٹکرائیں۔ یہ فتوحات جو مسلمانوں کو حاصل ہوئیں صرف ذکرِ الٰہی اور يَبِيْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّقِيَامًا کا نتیجہ تھیں۔ لیکن جب مسلمان بگڑ گئے اور انہوں نے ذکرِ الٰہی میں اپنی راتیں بسر کرنے کی بجائے رنگ رلیوں اور ناچ گانوں میں راتیں بسر کرنی شروع کر دیں۔ جب انہوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ اسحاق موصلی بڑا اچھا گانے والا ہے۔ فلاں کنچنی خوب ناچتی ہے تو اللہ تعالیٰ نے اُن کی تباہی کیلئے ہلاکو خاں کو بغداد پر مسلط کر دیا اور اُس نے ایک دن میں اٹھارہ لاکھ مسلمانوں کو قتل کر دیا اور شاہی خاندان کی کوئی عورت ایسی نہ چھوڑی جس کے ساتھ بدکاری نہ کی گئی ہو۔ اُس وقت مسلمان ایک بزرگ کے پاس گئے اور انہیں کہا کہ دُعا کریں بغداد تباہی سے بچ جائے۔ انہوں نے کہا۔ مَیں کیا دُعا کروں۔ مَیں تو جب بھی ہاتھ اٹھاتا ہوں اللہ تعالیٰ کے فرشتے مجھے یہ آوازیں دیتے سُنائی دیتے ہیں کہ اَيُّهَا الْكُفَّارُ اُقْتُلُوا الْفُجَّارَ یعنی اے کافرو اِن فاجر و فاسق مسلمانوں کو خوب مارو۔ چنانچہ بغداد تباہ ہو گیا۔ اور عباسی حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔ حالانکہ ایک زمانہ میں اُن کی طاقت کا یہ عالم تھا کہ رومی حکومت کے لشکر کو جو ساٹھ ہزار کی تعداد میں تھا مسلمانوں کے صرف ساٹھ آدمیوں نے شکست دے دی تھی اور اُن کے ساٹھ میں سے بھی صرف بارہ تیرہ شہید ہوئے اور بیس کے قریب خطرناک زخمی ہوئے باقی سب خیریت کے ساتھ واپس آ گئے۔ یہ تائید مسلمانوں کو صرف اسلئے حاصل ہوئی کہ وہ طاقت اور غلبہ کو اپنی عیاشی کا ذریعہ نہیں بناتے تھے بلکہ ہر قسم کی طاقت اور ہر قسم کا غلبہ حاصل کرنے کے باوجود اُن کی زبانیں ذکرِ الٰہی سے تر رہتی تھیں اور اُن کی راتیں خدا تعالیٰ کے حضور قیام اور سجود میں گذر جاتی تھیں۔ دنیا میں بڑی بڑی فاتح اقوام گذری ہیں مگر ہمیں کسی قوم کی تاریخ میں یہ مثال نظر نہیں آئیگی کہ وہ اتنے خدا ترس ہوں کہ اُن کی تلوار کسی عورت کسی بچے کسی بوڑھے اور کسی دینی شغف رکھنے والے انسان پر نہ اُٹھتی ہو۔ اُن کی تلوار کسی ایک انسان کا بھی ناجائز طور پر خون نہ بہاتی ہو اور راتوں کو وہ خدا تعالیٰ کے حضور روتے اور گڑگڑاتے ہوں۔ یہ عظیم الشان خوبی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ میں ہی پائی جاتی تھی جن کے اعلیٰ درجہ کے اخلاق اور بلند کردار کا ذکر کر کے اللہ تعالیٰ نے کفار کو بتایا ہے کہ دیکھو یہ لوگ تمہارے ہی ملک اور تمہارے ہی شہر کے رہنے والے تھے اور تمہارے ہی ساتھ انہوں نے اپنی عمروں کا بیشتر حصہ بسر کیا مگر تم بھی جانتے ہو اور باقی سب لوگ بھی اِس بات کے گواہ ہیں کہ نہ اُن میں يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا والی بات پائی جاتی تھی اور نہ اُن میں

يَبِيْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّ قِيَامًا والی کیفیت پائی جاتی تھی بلکہ اس کے برعکس ظلم و ستم اُن کا شیوہ تھا۔ اور شراب خوری اور عیاشی میں انہماک اُن کا رات دن کا شغل تھا مگر جب انہوں نے خدائے رحمٰن کے کلام کو قبول کیا اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نقشِ قدم پر چلے تو اُنکی دُنیا بھی بدل گئی اور اُن کی اخلاقی اور روحانی حالت میں بھی ایک تغیرِ عظیم واقع ہو گیا۔ اگر یہ خدائے رحمٰن کے کلام کو قبول کرنے کی برکت نہیں تو بتاؤ اُن میں یہ خوبیاں کہاں سے پیدا ہوئیں اور کس چیز نے انہیں ان اعلیٰ درجہ کے اخلاق کا مالک بنا دیا۔

پھر عباد الرحمٰن کی ایک اَور علامت یہ بتائی کہ وَ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اصْرِفْ عَنَّا عَذَابَ جَهَنَّمَ اِنَّ عَذَابَهَا كَانَ غَرَامًا۔ اِنَّهَا سَآءَتْ مُسْتَقَرًّا وَّ مُقَامًا۔ یعنی وہ لوگ اللہ تعالیٰ سے یہ دُعائیں کرتے رہتے ہیں کہ اے ہمارے رب! عذابِ جہنم کو ہم سے دُور رکھ۔ کیونکہ اُس کا عذاب ایک بہت بڑی تباہی ہے اور جہنم بہت بُرا ٹھکانا ہے۔ خواہ وہ عارضی وقت کے لئے ہو یا مستقل وقت کے لئے۔

اسجگہ جہنم سے گو اخروی جہنم بھی مراد ہے جس سے ہر سچا مومن اللہ تعالیٰ کی پناہ چاہتا ہے مگر دنیوی نقطۂ نگاہ سے ہر وہ امر جو انسان کے لئے دُکھ اور تکلیف کا موجب ہو اور جس سے اس کی جان و مال یا عزت و آبرو کو خطرہ ہو اور جو اُسے قوم اور ملک کی نظروں میں گرانے اور ذلیل کرنے والا ہو وہ بھی اس کے لئے جہنم کا ہی رنگ رکھتا ہے۔ دراصل جہنم جَهْنَّ اور جَهَمَ سے مرکب ہے۔ جہن کے معنے کسی چیز کے قریب ہونے کے ہوتے ہیں اور جہم کے معنے مُنہ کے بگڑ جانے کے ہیں۔ پس جہنم کے لفظ کا اطلاق ہر ایسی چیز پر ہو سکتا ہے جسکی طرف انسان پہلے تو بڑے شوق اور حرص کے ساتھ بڑھے مگر جب وہ اس کے قریب پہنچے تو اُسکا مُنہ بگڑ جائے اور وہ گھبرانے لگ جائے اس نام میں درحقیقت جہنمی افعال کی حقیقت پر روشنی ڈالی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ انسان پہلے تو عیاشیوں اور بدکاریوں کو بڑا اچھا فعل سمجھتا اور اُن کے قریب پہنچنے کی کوشش کرتا ہے مگر جب وہ اُن بدیوں میں ملوّث ہو جاتا ہے اور اُن کا بُرا انجام آنکھوں کے سامنے آتا ہے تو اس کا مونہہ بگڑ جاتا ہے اور وہ رونے اور چیخیں مارنے لگ جاتا ہے۔ اور کہتا ہے کہ مَیں نے تو بڑی غلطی کی۔ اِن معنوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس آیت میں عباد الرحمٰن کی یہ علامت بتائی گئی ہے کہ وہ اُٹھتے بیٹھتے اللہ تعالیٰ سے یہ دُعائیں کرتے رہتے ہیں کہ الٰہی ہمیں ہر ایسے کام سے بچائیو جو ہمیں دنیا و آخرت میں ذلیل کرنے والا ہو۔ تو ہمیں افلاس اور تنگدستی کے جہنم سے بچا۔ ہمیں جہالت اور کم علمی کے جہنم سے بچا۔ ہمیں بد اخلاقی اور عیاشی کے جہنم سے بچا۔ ہمیں دنیا داری اور ہوس پرستی کے جہنم سے بچا۔ ہمیں اپنی آئندہ نسلوں کی خرابی کے جہنم سے بچا۔ ہمیں کفر اور شیطنت کے جہنم سے بچا۔ ہمیں لامذہبیت اور اباحت کے جہنم سے بچا۔ ہمیں منافقت اور بے ایمانی کے جہنم سے بچا۔ ہمیں خود سری اور جھوٹ اور ظلم اور تعدّی کے جہنم سے بچا۔ ہمیں اپنی محبت اور رضا سے دُوری کے جہنم سے بچا۔ کیونکہ خواہ یہ بُرائیاں ہم میں عارضی طور پر پیدا ہوں یا مستقل طور پر بہرحال ان کا پیدا ہونا ہمارے لئے تباہی اور رسوائی کا باعث ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ مستقل طور پر ان خرابیوں کا پیدا ہونا تو الگ رہا ہم میں عارضی اور وقتی طور پر بھی یہ خرابیاں پیدا نہ ہوں اور ہمیشہ ہمارا قدم صراطِ مستقیم پر قائم رہے۔ گویا وہی دُعا جو سورۃ فاتحہ میں غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ کے الفاظ میں سکھائی گئی ہے اس جگہ رَبَّنَا اصْرِفْ عَنَّا عَذَابَ جَهَنَّمَ کے الفاظ میں دُہرا دی گئی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے

برگزیدہ بندوں کی یہ علامت بتائی گئی ہے کہ باوجود اسکے کہ انہیں دنیا پر غلبہ حاصل ہوتا ہے پھر بھی قومی تنزل کا خوف ہر وقت اُن کو آستانۂ ایزدی پر جھکائے رکھتا ہے اور وہ رات دن دعائیں کرتے رہتے ہیں کہ الٰہی ہم میں اور ہماری آئندہ نسلوں میں کسی قسم کی خرابی پیدا نہ ہو تاکہ وہ جنت جو تُو نے محض اپنے فضل سے ہمیں عطا فرمائی ہے وہ ہمیشہ قائم رہے اور کوئی ابلیس سانپ کی شکل اختیار کر کے ہماری ایڑی کو نہ کاٹ لے۔ اگر مسلمان اپنے غلبہ کے اوقات میں اس قرآنی دعا کو ہمیشہ یاد رکھتے اور ہر کامیابی کے حصول پر قومی تنزل کے خطرات سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگتے تو اللہ تعالیٰ اُن پر دائمی طور پر اپنا فضل نازل کرتا اور ہمیشہ اُن کا قدم ترقی کے میدان میں آگے ہی آگے بڑھتا رہتا۔

مگر ان معنوں کے علاوہ اس آیت میں اُخروی جہنم کے عذاب سے بھی بچنے کی دعا سکھلائی گئی ہے اور کہا گیا ہے کہ جہنم عارضی رہائش کے لحاظ سے بھی بہت بُرا ٹھکانا ہے اور مستقل رہائش کے لحاظ سے بھی بہت بُرا ٹھکانا ہے۔ ان الفاظ میں قرآن کریم کی یہ تعلیم بیان کی گئی ہے کہ دوزخ غیر محدود نہیں ہوگی کیونکہ دوزخ کو مستقر قرار دیا گیا ہے جس کے معنے عارضی قرارگاہ کے ہوتے ہیں اور چونکہ اس جگہ یہ کہا گیا ہے۔ کہ دوزخ خواہ عارضی ہو یا مستقل بڑی تکلیف دہ جگہ ہے اسلئے ان الفاظ میں اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ دوزخ کا تھوڑا عذاب بھی سزا دینے کیلئے کافی ہے اسلئے کوئی وجہ نہیں کہ اُسے لمبا کیا جائے یا اُسے مستقل بنا دیا جائے۔

قرآن کریم نے اس مضمون کو بعض اور مقامات پر بھی نہایت واضح الفاظ میں بیان فرمایا ہے۔ مثلاً فرماتا ہے وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ (ذاریات ع ۳) یعنی میں نے جنّ و انس کو صرف اس غرض کے لئے پیدا کیا ہے کہ وہ میرے عبد بن جائیں۔ اور جب انسان کو پیدا ہی اس غرض کے لئے کیا گیا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا عبد بنے تو اگر وہ دائمی طور پر دوزخ میں رکھا جائے تو وہ اس غرض کو پورا ہی نہیں کر سکتا اور پیدائش عالم کا مقصد بالکل فوت ہو جاتا ہے اس مضمون کی مزید تشریح اس آیت سے ہوتی ہے کہ فَادْخُلِي فِي عِبَادِي وَادْخُلِي جَنَّتِي (فجر ع ۱) یعنی اللہ تعالیٰ نفسِ مطمئنہ رکھنے والوں سے فرمائیگا کہ آؤ اور میرے بندوں میں شامل ہو جاؤ۔ آؤ اور میری جنت میں داخل ہو جاؤ۔ اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے حقیقی عبد کا مقام جنت ہے۔ اور جب ہر انسان عبد بننے کے لئے پیدا کیا گیا ہے تو لازماً ہر انسان کے متعلق ہمیں تسلیم کرنا پڑیگا کہ وہ جنت میں جائیگا۔ پس دوزخ ایک عارضی قرارگاہ ہے مستقل مقام نہیں۔ پھر فرماتا ہے وَنَضَعُ الْمَوَازِينَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيَامَةِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْئًا وَإِنْ كَانَ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِنْ خَرْدَلٍ أَتَيْنَا بِهَا وَكَفَى بِنَا حَاسِبِينَ (انبیاء ع ۴) یعنی قیامت کے دن ہم ایسے تول کے سامان پیدا کرینگے کہ جن کی وجہ سے کسی جان پر ذرا سا بھی ظلم نہیں کیا جائے گا۔ اور اگر کسی نے رائی کے دانہ کے برابر بھی کوئی نیکی یا بدی کی ہوگی تو ہم اُس کو بھی لے آئیں گے۔ اور ہم حساب لینے میں کافی ہیں۔ اب اگر کوئی شخص بدیوں کی کثرت کی وجہ سے جہنم میں چلا جائے اور پھر ابدالآباد تک اُسی میں رہے تو اُسے اپنی نیکیوں کا بدلہ نہیں مل سکتا۔ پس ضروری ہے کہ اس کی سزا ایک دن ختم ہو تاکہ اس کی نیکیوں کی اُسے جزا دی جائے۔ ایک اور مقام پر اللہ تعالیٰ اسی مضمون کو ان الفاظ میں بیان فرماتا ہے کہ فَأَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِينُهُ فَأُمُّهُ هَاوِيَةٌ (القارعہ ع ۱) یعنی جسکی نیکیاں کم ہونگی اُس کی ماں ہاویہ ہوگی یعنی جس طرح بچہ رحم مادر میں ایک معین عرصہ تک رہتا ہے اور پھر اُس کے

پیٹ سے باہر آجاتا ہے۔ اِسی طرح جب دوزخیوں کی سزا کی میعاد ختم ہو جائے گی۔ تو اللہ تعالےٰ انہیں باہر لے آئیگا۔ اور اپنی جنّت میں داخل کر دے گا۔

اِسی طرح فرماتا ہے۔ فَاَمَّا الَّذِيْنَ شَقُوْا فَفِي النَّارِ لَهُمْ فِيْهَا زَفِيْرٌ وَّ شَهِيْقٌ۝ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَ الْاَرْضُ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ ؕ اِنَّ رَبَّكَ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ۝ وَ اَمَّا الَّذِيْنَ سُعِدُوْا فَفِي الْجَنَّةِ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَ الْاَرْضُ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ ؕ عَطَآءً غَيْرَ مَجْذُوْذٍ۝ (ھود ع) یعنی جو لوگ بدبخت ثابت ہوں گے وہ آگ میں داخل کئے جائیں گے۔ اُس میں کسی وقت تو اُن کے غم سے لمبے لمبے سانس نکل رہے ہونگے اور کسی وقت رو رو کر ہچکی بندھ جائے گی۔ وہ اُس میں اُس وقت تک رہتے چلے جائیں گے جب تک کہ آسمان اور زمین قائم ہیں سوائے اس کے کہ تیرا رب کچھ اَور ارادہ کرے اور تیرا رب اپنے ارادہ کو پورا کرنے والا ہے۔ اور جو لوگ خوش نصیب ہوں گے وہ جنّت میں داخل کئے جائیں گے۔ اور وہ اُس وقت تک اُس میں رہتے چلے جائیں گے جب تک کہ آسمان اور زمین قائم ہیں۔ سوائے اِس کے کہ تیرا رب کچھ اَور چاہے۔ مگر یہ ایسی عطا ہو گی جو کبھی کاٹی نہیں جائیگی۔

اِس آیت میں جہنمیوں کے متعلق تو اللہ تعالےٰ نے فرمایا کہ ہم اُن کو جہنم سے نکال سکتے ہیں اور ہمارے ارادہ میں کون حائل ہو سکتا ہے۔ لیکن مومنوں کے متعلق فرماتا ہے کہ ہم اگر چاہیں تو اُن کو بھی جنّت سے نکال سکتے ہیں مگر ہم نے یہی چاہا ہے کہ اُن کے انعام کو کبھی ختم نہ کیا جائے۔ اِس مقابلہ سے معلوم ہوتا ہے کہ دوزخ کا عذاب ایک دن منقطع ہونے والا ہے کیونکہ دوزخیوں کو جہنم سے نکلنے کی امید دلائی گئی ہے۔ لیکن جنّتیوں کو کہا گیا ہے کہ انہیں غیر مقطوع یعنی نہ ختم ہونے والے انعام سے نوازا جائیگا۔

پھر فرماتا ہے عَذَابِيْٓ اُصِيْبُ بِهٖ مَنْ اَشَآءُ ۚ وَ رَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ (اعراف ع ۱۹) میں اپنا عذاب جس کو چاہتا ہوں پہنچاتا ہوں مگر میری رحمت ہر ایک چیز پر حاوی ہے اور جب اس کی رحمت ہر ایک چیز پر حاوی ہے تو ضروری ہے کہ دوزخ بھی ایک دن اُس کی رحمت کے سایہ تلے آ جائے اور دوزخیوں کو اُس میں سے نکال کر جنّت میں داخل کر دیا جائے۔

حدیثوں میں بھی آتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا يَاْتِيْ عَلٰى جَهَنَّمَ زَمَانٌ لَيْسَ فِيْهَا اَحَدٌ وَّ نَسِيْمُ الصَّبَا تُحَرِّكُ اَبْوَابَهَا (تفسیر معالم التنزیل سورۂ ہود ع) یعنی جہنم پر ایک ایسا زمانہ آئیگا کہ اُس میں کوئی شخص نہیں ہو گا اور ہوا اُس کے دروازے کھٹکھٹائیگی۔ یعنی وہ کھلے ہونگے اور دوزخ کے اندر کوئی قیدی نہیں رہے گا۔

غرض اسلامی تعلیم کے ماتحت جزائے نیک تو دائمی ہو گی مگر دوزخ کا عذاب دائمی نہیں۔ وہ بیشک ایک بھیانک اور تکلیف دہ چیز ہے مگر آخر خدا تعالےٰ کی محبت جوش میں آئے گی اور وہ گنہگاروں کو بھی اپنے سایۂ رحمت میں لے آئے گی۔

اسجگہ ایک شبہ کا ازالہ کر دینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے اور وہ یہ کہ قرآن کریم میں ایک دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ وَ مَا هُمْ بِخٰرِجِيْنَ مِنَ النَّارِ (بقرہ ع ۲۰) یعنی دوزخی دوزخ کی آگ سے ہرگز نہیں نکل سکیں گے۔ اِس آیت سے یہ دھوکا ہرگز نہیں کھانا چاہیئے کہ اِس میں تو لکھا ہے کہ دوزخ میں سے

وَلَمْ يَقْتُرُوْا وَكَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا ﴿۶۸﴾

اور نہ بخل کرتے ہیں اور اُن کا (خرچ) اِن دونوں حالتوں کے درمیان درمیان ہوتا ہے ۱۳۵

کوئی نہیں نکلیگا۔ کیونکہ اِس میں اُن کے اپنے زور سے نکلنے کی نفی کی گئی ہے خدا تعالیٰ کے فضل کی نفی نہیں کی گئی۔ پس اِس آیت کا صرف یہ مطلب ہے کہ دوزخی اپنے زور سے اُس میں سے نہیں نکل سکیں گے۔ ہاں اللہ تعالیٰ کے فضل سے وہ ایک دن نکال دیئے جائینگے۔

۱۳۵ حل لغات:۔ لَمْ يُسْرِفُوْا: اَسْرَفَ سے مضارع يُسْرِفُ بنتا ہے اور لَمْ يُسْرِفُوْا اس سے جمع مذکر غائب منفی کا صیغہ ہے اور اَسْرَفَ مَالَهٗ کے معنے ہوتے ہیں۔ بَذَّرَهٗ وَقِيْلَ اَنْفَقَهٗ فِيْ غَيْرِ طَاعَةٍ۔ اُس نے مال کو خرچ کیا۔ اور ماہرینِ لغت کہتے ہیں کہ اسراف کا لفظ اُس وقت بولیں گے جب اللہ تعالیٰ کے احکام اور اس کی اطاعت کے خلاف مال خرچ کیا جائے نیز اُس کے معنے ہیں جَاوَزَ الْحَدَّ فِيْهِ وَاَفْرَطَ مال کے خرچ کرنے میں حد سے بڑھ گیا۔ اَخْطَاءَ۔ اُس نے مال کے خرچ کرنے میں غلطی کی یعنی غلط جگہ پر خرچ کیا۔ جَهِلَ یا مال کے خرچ میں نادانی سے کام لیا (اقرب) پس لَمْ يُسْرِفُوْا کے معنے ہونگے (۱) وہ اپنے اموال خدا تعالیٰ کی اطاعت کے خلاف خرچ نہیں کرتے (۲) یا جہاں جہاں جتنا خرچ کرنا چاہیئے اتنا خرچ کرنے میں جائز حد سے زیادہ خرچ نہیں کرتے (۳) یا مال غلط جگہ خرچ نہیں کرتے۔

لَمْ يَقْتُرُوْا:۔ قَتَرَ يَقْتُرُ عَلٰى عِيَالِهٖ کے معنے ہیں ضَيَّقَ عَلَيْهِمْ فِي النَّفَقَةِ۔ اُس نے اہل وعیال کو خرچ دینے میں تنگی اور بخل سے کام لیا اور جب قَتَرَ الشَّيْءَ کہیں تو معنے ہونگے ضَمَّ بَعْضَهٗ اِلٰى بَعْضٍ کہ کسی چیز کے مختلف حصوں کو ایک دوسرے پر رکھ کر جمع کیا۔ اور جب قَتَرَ الْاَمْرَ کہیں تو مطلب یہ ہوگا کہ لَازَمَهٗ یعنی اس معاملہ سے چمٹا رہا۔ اور قَتَرَ مَا بَيْنَ الْاَمْرَيْنِ کے معنے ہوتے ہیں قَدَّرَهٗ وَخَمَّنَهٗ دو معاملوں کا اندازہ اور تخمینہ کیا (اقرب)

لَمْ يَقْتُرُوْا۔ يَقْتُرُ سے نفی کا صیغہ ہے اِس لئے اِس کے معنے ہونگے (۱) وہ اپنے رشتہ داروں اور اقارب پر اپنے مال خرچ کرنے میں تنگی نہیں کرتے۔ (۲) وہ مال جمع نہیں کرتے بلکہ موقعہ اور محل پر خرچ کرتے ہیں (۳) وہ مالوں کے ساتھ چمٹے نہیں رہتے۔

قَوَامًا: اَلْقَوَامُ: اَلْاِعْتِدَالُ یعنی قوام کے معنے میانہ روی کے ہیں۔ نیز اس کے معنے ہیں مَا يُعَاشُ بِهٖ۔ وہ چیز جس کے ذریعہ سے زندگی گذاری جائے (اقرب)

تفسیر:۔ فرماتا ہے رحمٰن کے بندوں کا ایک یہ بھی نشان ہے کہ جب وہ خرچ کرتے ہیں تو دو باتیں اُن کے مدّنظر رہتی ہیں۔ اوّل یہ کہ وہ اسراف سے کام نہیں لیتے اور دوسرے وہ بخل نہیں کرتے۔ اسراف کا مرض اس زمانہ میں اس قدر بڑھا ہوا ہے کہ آجکل مسلمان کی تعریف اور علامت ہی یہی سمجھی گئی ہے کہ جو کچھ اُس کے پاس ہو وہ سب خرچ کردے اور اپنے پاس کچھ بھی نہ رکھے۔ گویا قرآن کریم تو کہتا ہے کہ سچا مسلمان وہ ہے جو اسراف نہ کرے اور آجکل کے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ سچا مسلمان وہ ہوتا ہے جو سب کچھ بیچ کر کھا جائے۔ حضرت خلیفۃ اوّل رضی اللہ عنہ سُنایا کرتے تھے کہ ایک شخص کو اپنے باپ کی بہت سی دولت

مل گئی۔ اُس نے اپنے دوستوں اور آشناؤں کو بُلا کر
پُوچھا کہ مجھے دولت خرچ کرنے کا کوئی طریق بتاؤ کسی نے
کچھ بتایا اور کسی نے کچھ لیکن اسے کوئی پسند نہ آیا۔ ایک
دن وہ بازار سے گذر رہا تھا کہ بزاز کی دکان سے کپڑے
پھاڑنے کی آواز آئی جو اُسے پسند آگئی اور اُس نے
اپنے نوکروں کو حکم دیا کہ میرے سامنے روزانہ کپڑے کے
تھان لا لا کر پھاڑا کرو۔ چنانچہ روزانہ اُس نے کپڑوں کے
تھان پھڑوانے شروع کر دیئے اور صبح سے شام تک اُس
کا یہی شغل رہتا کہ لوگ بیٹھے تھان پھاڑ رہے ہیں اور
وہ چرچر کی آواز سُن کر خوش ہو رہا ہے۔ اب خرچ کرنے
کو تو اُس نے بھی اپنا روپیہ خرچ کیا مگر یہ کیسا نامعقول
خرچ تھا۔ اس طرح تو اگر کسی کے پاس کروڑوں روپیہ
بھی ہو تو وہ سب کچھ خرچ کرکے کنگال اور نادار بن
سکتا ہے۔ قرآن کریم نے وَ تَاْكُلُوْنَ التُّرَاثَ اَكْلًا
لَّمًّا (فجر ع ۱) میں کفار کو اُن کے اِس نقص کی طرف توجہ
دلائی ہے کہ تمہیں اپنے باپ دادا سے مال ملا۔ مگر بجائے
اِس کے کہ تم اُسے ترقی دیتے تم نے اس دولت کو اپنے
ذاتی عیش و آرام کے لئے تباہ کرنا شروع کر دیا جس کی
وجہ سے تمہاری عملی قوتیں بیکار ہوگئیں اور تم تنزل
اور انحطاط کا شکار ہوگئے۔

حضرت خلیفہ اوّل رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ
روپیہ کمانا آسان ہوتا ہے مگر اُسے خرچ کرنا بہت مشکل
ہوتا ہے اور حقیقتاً یہ بالکل درست ہے۔ دنیا میں
بہت لوگ ہیں جو روپیہ کماتے ہیں لیکن چونکہ انہیں خرچ
کرنا نہیں آتا اس لئے وہ ہمیشہ مالی مشکلات میں مبتلا
رہتے ہیں۔ اور بہت ہیں جو کم کماتے ہیں مگر چونکہ انہیں روپیہ
خرچ کرنا آتا ہے۔ اس لئے وہ تھوڑے روپیہ میں بھی
آسانی سے اپنا گذارہ کر لیتے ہیں۔

بہرحال اسلام نے عباد الرحمٰن کی یہ علامت بیان
فرمائی ہے کہ جب اللہ تعالیٰ انہیں زمین پر غلبہ عطا فرماتا
ہے تو وہ خزائن الارض کی تقسیم میں کسی قسم کے اسراف
یا بخل سے کام نہیں لیتے۔ یعنی نہ تو قومی روپیہ کو اس
طرح غلق میں بند کرکے رکھتے ہیں کہ قومی و ملکی ترقیات
میں روک واقعہ ہو جائے اور عوام کو شکایت کا موقعہ
پیدا ہو جائے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم
نے اپنی عملی زندگی میں ایسا ہی نمونہ دکھایا۔ آپ کو اللہ
تعالیٰ نے بادشاہ بھی بنایا اور لاکھوں روپیہ کے اموال
آپ کے قبضہ میں آئے۔ مگر آپ نے کبھی اُن کے خرچ
کرنے میں اسراف سے کام نہیں لیا اور نہ ہی کسی جگہ
بخل سے کام لے کر حقدار کو اس کے حق سے محروم کیا۔
آپ قومی اموال کی تقسیم اور اُن کے خرچ کرنے میں
اس قدر محتاط واقعہ ہوئے تھے کہ حدیثوں میں آتا ہے
کہ ایک دفعہ بعض جنگی قیدی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم
کے پاس آئے تو حضرت فاطمہؓ کو اس کا علم ہوا۔ تو وہ
رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تشریف لے گئیں۔
مگر انہوں نے آپ کو گھر پر نہ پایا۔ چونکہ وہ اُس وقت
زیادہ انتظار نہیں کر سکتی تھیں اس لئے انہوں نے حضرت
عائشہؓ سے کہا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف
لائیں تو میری طرف سے آپ کو عرض کیا جائے کہ چکی
پیستے پیستے میرے ہاتھوں پر آبلے اُٹھ آئے ہیں۔ اگر
جنگی قیدیوں میں سے کوئی قیدی مجھے بھی عطا فرما دیا جائے
اور وہ آٹا پیس دیا کرے تو مجھے سہولت ہو جائے گی۔
رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم گھر میں تشریف لائے تو
حضرت عائشہؓ نے یہ تمام واقعہ آپ کی خدمت میں
عرض کر دیا۔ رات کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی بیٹی
کے ہاں تشریف لے گئے۔ اور فرمایا۔ بیٹی کیا میں تمہیں
ایک ایسی بات نہ بتاؤں جو اُس چیز سے جو آج تم نے
مانگی ہے بہت بہتر اور بڑی برکت والی ہے۔ انہوں نے کہا

یا رسول اللہ! ضرور بتایئے ۔ آپ نے فرمایا جب تم سونے لگو تو ۳۳ دفعہ سبحان اللہ ۔ ۳۳ دفعہ الحمد للہ اور ۳۴ دفعہ اللہ اکبر کہہ لیا کرو ۔

یہ واقعہ جو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے اُس دَور سے تعلق رکھتا ہے جبکہ آپ بادشاہ بن چکے تھے بتاتا ہے کہ گو آپ اپنی بیٹی کو جنگی قیدی عطا فرما سکتے تھے کیونکہ آپ نے بہرحال اُن کو صحابہؓ میں ہی تقسیم کرنا تھا اور حضرت علیؓ کا ویسا ہی حق تھا جیسے باقی صحابہؓ کا مگر آپ نے یہ پسند نہ فرمایا کہ کوئی جنگی قیدی اپنے خاندان میں تقسیم کریں تا ایسا نہ ہو کہ آنے والے بادشاہ آپ کے اِس نمونہ سے غلط نتائج اخذ کرکے دوسروں کے اموال اپنے لئے جائز سمجھ لیں ۔ بیشک وہ اموال جن میں خدا تعالیٰ نے آپ کا اور آپ کے رشتہ داروں کا حق مقرر فرمایا تھا اُن میں سے آپ ضرورت پر خود بھی خرچ فرما لیتے تھے اور اپنے متعلقین کو بھی دے دیتے تھے ۔ مگر جب تک کوئی چیز آپ کے حصہ میں نہ آجائے اُسوقت تک باوجود ایک با اقتدار بادشاہ ہونے کے ایک جَو کے دانہ کے برابر بھی کوئی چیز آپ اپنے عزیز سے عزیز رشتہ دار کو بھی نہیں دیتے تھے ۔ اور ایک لمحہ کے لئے بھی یہ پسند نہیں فرماتے تھے کہ قومی روپیہ ضائع ہو یا کسی ایسی جگہ خرچ ہو جو ناجائز ہو ۔

ایک دفعہ صدقہ کی کچھ کھجوریں آئیں اور حضرت حسنؓ اور حسینؓ جو اُسوقت چھوٹے بچے تھے اُن کھجوروں سے کھیلنے لگے ۔ کھیلتے کھیلتے اُن میں سے کسی نے ایک کھجور اپنے مُنہ میں ڈال لی ۔ اچانک رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بھی نظر جا پڑی ۔ آپ نے فوراً اُس کے مُنہ سے انگلی ڈالکر کھجور نکال لی اور فرمایا تمہیں معلوم نہیں کہ یہ غرباء کا حق ہے ۔ آلِ محمد غرباء کا مال نہیں کھایا کرتی ۔ اِس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم قومی اموال کی کس سختی کے ساتھ محافظت فرمایا کرتے تھے اور اُس کے خرچ میں کتنی احتیاط ملحوظ رکھتے تھے ۔

یہی کیفیت خلفاء راشدین کے زمانہ میں بھی جاری رہی اور انہوں نے بھی قیصر و کسریٰ سے زیادہ طاقت رکھنے کے باوجود سرکاری اموال کو کبھی بے جا خرچ نہیں کیا ۔ بلکہ ایک ایک پیسہ اور ایک ایک پائی کی حفاظت کی اور اگر کسی جگہ انہوں نے روپیہ کا بے جا خرچ دیکھا تو بڑی سختی سے اُس کو روکا اور افسروں کو معزول کرنے سے بھی دریغ نہیں کیا ۔ تاریخوں میں لکھا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جب اپنے زمانۂ خلافت میں بیت المقدس تشریف لے گئے تو آپ نے دیکھا کہ بعض صحابہؓ نے ریشمی کپڑے پہنے ہوئے ہیں ۔ ریشمی کپڑوں سے مراد وہ کپڑے ہیں جن میں کسی قدر ریشم ہوتا ہے ۔ ورنہ خالص ریشم کے کپڑے تو سوائے کسی بیماری کے مردوں کو پہننے ممنوع ہیں ۔ آپ اُن لوگوں پر سخت ناراض ہوئے اور فرمایا کہ کیا تم اب ایسے آسائش پسند ہو گئے ہو کہ ریشمی کپڑے پہنتے ہو ۔ اِس پر اُن میں سے ایک شخص نے اپنی قمیص اُٹھا کر دکھائی تو معلوم ہُوا کہ اُس نے نیچے موٹی اون کا سخت کُرتہ پہنا ہُوا تھا ۔ اُس نے حضرت عمرؓ سے عرض کیا کہ ہم نے ریشمی کپڑے اِس لئے نہیں پہنے کہ ہم ان کو پسند کرتے ہیں بلکہ اِس لئے پہنے ہیں کہ اِس ملک کے لوگ بچپن سے ایسے امراء دیکھنے کے عادی ہیں جو نہایت شان و شوکت سے رہتے تھے ۔ پس ہم نے بھی اپنے لباسوں کو صرف ملکی سیاست کے طور پر بدلا ہے ورنہ ہم پر اِس کا کوئی اثر نہیں ۔ صحابہؓ کے اِس عمل سے پتہ لگتا ہے کہ انہوں نے اپنے غلبہ کے زمانہ میں بھی کبھی اسراف سے کام نہیں لیا اور اگر کسی مقام پر اُن سے کوئی لغزش بھی ہوئی تو خلفاء نے اُنکو ڈانٹا اور انہیں نصیحت کی کہ وہ اموال کے خرچ میں افراط و تفریط سے بچیں اور سادگی اختیار کریں ۔

اِس زمانہ میں زیادہ تر شادی بیاہ کے موقعہ پر لوگ اپنی ناک رکھنے کیلئے زیورات وغیرہ پر طاقت سے زیادہ روپیہ خرچ کر دیتے ہیں۔ جو انجام کار اُن کے لئے کسی خوشی کا موجب نہیں ہوتا۔ کیونکہ انہیں دوسروں سے قرض لینا پڑتا ہے جس کی ادائیگی انہیں مشکلات میں مبتلا کر دیتی ہے۔ اگر کسی کے پاس وافر روپیہ موجود ہو تو اُس کے لئے شادی بیاہ پر مناسب حد تک خرچ کرنا منع نہیں لیکن جس کے پاس نقد روپیہ موجود نہیں وہ اگر ناک رکھنے کیلئے قرض لے کر روپیہ خرچ کریگا تو اس کا یہ فعل اسراف میں شامل ہوگا۔ مگر یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ اسراف کی شکلیں ہمیشہ بدلتی رہتی ہیں۔ مثلاً اگر ایک شخص کی آمد دو چار ہزار روپیہ ماہوار ہے اور وہ پندرہ بیس روپے گز کا کپڑا پہنتا ہے یا پانچ سات سوٹ تیار کرا لیتا ہے تو اُس کے مالی حالات کے مطابق اسے ہم اسراف نہیں کہیں گے لیکن اگر خدانخواستہ اُس کے بیوی بچے بیمار ہو جائیں اور وہ ایسے ڈاکٹروں سے علاج کروائے جو قیمتی ادویات استعمال کروائیں اور ہزار میں سے پانچ سات سو روپیہ اس کا دواؤں پر ہی خرچ ہو جائے اور اس کے باوجود وہ اپنے کھانے پینے اور پہننے کے اخراجات میں کوئی کمی نہ کرے تو پھر اس کا یہی فعل اسراف بن جائیگا حالانکہ عام حالات میں یہ اسراف میں شامل نہیں تھا۔ اِسی طرح جب بھی کسی خرچ کے مقابلہ میں دوسری ضروریات بڑھ جائیں تو اُس وقت پہلے خرچ کو اُسی شکل میں قائم رکھنا جس شکل میں پہلے تھا اسراف میں شامل ہو جائیگا۔ مثلاً اِس زمانہ میں اِسلام کی اشاعت کے لئے ہمیں کروڑوں روپیہ کی ضرورت ہے۔ مختلف ممالک اور اکناف سے آوازیں آ رہی ہیں کہ ہماری طرف ایسے لوگ بھیجے جائیں جو ہمیں اسلام کی تعلیم سکھائیں۔ ایسا لٹریچر بھیجا جائے جو ہمارے شبہات کا ازالہ کرے۔ اگر اس وقت ہماری جماعت کا کوئی فرد اپنے کھانے اور پینے اور پہننے کے اخراجات میں تخفیف نہیں کرتا اور زیادہ سے زیادہ روپیہ اسلام کی اشاعت کے لئے نہیں دیتا تو گو عام حالات میں اُس کا اچھا کھانا پینا اور پہننا اسراف میں شامل نہ ہو مگر موجودہ زمانہ میں اس کا اپنے کھانے پینے اور پہننے پر زیادہ خرچ کرنا یقیناً اسراف میں شامل ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ مَیں نے جماعت میں تحریک جدید جاری کی اور اسے ہدایت کی کہ وہ ایک کھانا کھائے جن لوگوں کے پاس کپڑوں کے چند جوڑے موجود ہوں وہ اُن کے خراب ہونے تک محض شوق پورا کرنے کے لئے نئے جوڑے نہ بنوایا کریں۔ جو لوگ نئے کپڑے زیادہ بنوایا کرتے ہوں وہ نصف یا تین چوتھائی یا ۱/۴ پر آ جائیں۔ عورتیں اپنے اوپر یہ پابندی عائد کریں کہ وہ محض پسند پر کپڑا نہیں خریدیں گی بلکہ ضرورت پر کپڑا لیں گی۔ اور گوٹہ کناری اور فیتہ وغیرہ نہیں خریدیں گی نہ نئے نئے زیورات پر اپنا روپیہ برباد کریں گی۔ اِسی طرح مَیں نے ڈاکٹروں سے کہا ہے کہ وہ اپنا سارا زور لگائیں کہ روپوؤں کا کام پیسوں میں ہو اور جب تک وہ یہ نہ سمجھیں کہ بغیر قیمتی دوا کے استعمال کے مریض کی جان کو نقصان پہنچنے کا احتمال ہے اُس وقت تک قیمتی ادویات پر روپیہ خرچ نہ کروائیں۔ وہ اپنے دماغ پر زور دے کر ایسے نسخے لکھیں جو سستے داموں تیار ہو سکیں۔ اور پیٹنٹ ادویہ استعمال کرا کے نئی نئی دواؤں کے تجربہ پر اپنے ملک کا روپیہ ضائع نہ کریں لیکن افسوس ہے کہ ڈاکٹروں نے میری یہ بات نہیں مانی اور مجھے اپنی ساری خلافت کی زندگی میں تلخ ترین تجربہ احمدی ڈاکٹروں کا ہؤا ہے۔ ولیمہ کے متعلق بھی مَیں نے ہدایت دی کہ اِس موقعہ پر صرف چند دوستوں کو بُلا لینا کافی ہوتا ہے زیادہ لوگوں کو بُلا کر اپنا روپیہ ضائع نہیں کرنا چاہیئے بلکہ یہ بھی کافی ہے کہ لوگ اپنا اپنا کھانا لا کر ولیمہ والے

گھر میں بیٹھ کر کھالیں اور ایک آدمی کا کھانا اُس گھر والے کی طرف سے بھی ہو جائے ۔ یہ ہدایات میں نے اسی لئے دیں کہ اِس زمانہ میں اسلام کو مالی قربانیوں کی ضرورت ہے ۔ اگر کھانے پینے پہننے اور آسائش و زیبائش کے کاموں پر ہی سارا روپیہ خرچ کر دیا جائیگا تو اسلام کی ضروریات کہاں سے پوری ہونگی ۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلام ہر وقت ایک قسم کی قربانی کا مطالبہ نہیں کرتا بلکہ مختلف حالات میں مختلف قسم کی قربانیوں کا تقاضا کرتا ہے ۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو حضرت ابوبکرؓ ایک خاص جنگ کے وقت اپنا سارا اور حضرت عمرؓ اپنا آدھا مال پیش نہ کرتے ۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں بیسیوں جنگیں ہوئی ہیں مگر حضرت ابوبکرؓ نے ہر جنگ کے موقعہ پر اپنا سارا مال اور حضرت عمرؓ نے اپنا آدھا مال نہیں دیا ۔ صرف ایک جنگ کے موقعہ پر حضرت عمرؓ کو یہ خیال آیا کہ آج زیادہ قربانی کا موقعہ ہے ۔ میں حضرت ابوبکرؓ سے بڑھ جاؤں اور اِس خیال کے آنے پر وہ اپنا آدھا مال لے کر آ گئے اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے اِس سے پہلے کبھی اپنا آدھا مال بھی نہیں دیا تھا ۔ ورنہ حضرت عمرؓ کو یہ کس طرح خیال آ سکتا تھا کہ میں اپنا آدھا مال دے کر حضرت ابوبکرؓ سے بڑھ جاؤنگا لیکن حضرت ابوبکرؓ اِس موقعہ کی نزاکت کو دیکھکر اپنا سارا مال دینے کا فیصلہ کر چکے تھے ۔ چنانچہ جب وہ اپنا سارا مال لیکر گئے تو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم جو اُن کے گھر کی حالت سے واقف تھے اسے دیکھتے ہی فرمانے لگے کہ ابوبکرؓ اپنے گھر میں کیا چھوڑا ۔ حضرت ابوبکرؓ نے عرض کیا کہ خدا اور اُس کے رسول کا نام (ترمذی جلد دوم ابواب المناقب باب مناقب ابی بکرؓ) حضرت عمرؓ نے یہ بات سُنی تو انہوں نے سمجھ لیا کہ میں ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا ۔ اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کو کبھی زیادہ قربانیوں کی ضرورت ہوتی ہے اور کبھی کم ۔ لیکن بہرحال ایک مومن کیلئے ضروری ہے کہ وہ اپنے اخراجات کو ایک حد کے اندر رکھے تاکہ جب بھی قربانی کی آواز آئے وہ لبیک کہتے ہوئے اُسکی طرف دوڑ پڑے اور اسراف کی عادت اُس کی راہ میں حائل نہ ہو ۔

پھر فرماتا ہے وَلَمْ یَقْتُرُوْا ۔ عباد الرحمٰن کی ایک یہ بھی علامت ہے کہ وہ بُخل سے بھی کام نہیں لیتے ۔ جیسا کہ حلِّ لغات میں بتایا جا چکا ہے قاتِر کے ایک معنے اُس شخص کے ہوتے ہیں جو مال کو جمع کرتا رہتا ہے اور اسکے بُخل کے معنے نکالے گئے ہیں ۔ کیونکہ انسان تبھی مال جمع کر سکتا ہے جبکہ وہ خرچ نہ کرے ۔ اور اُسی کو بخیل کہتے ہیں جو روپیہ کے ہوتے ہوئے اُسے اپنے جائز مصرف میں نہ لائے ۔ پس قاتر کے اصل معنے یہ ہیں کہ جو مال جمع کرے اور اُن لوگوں پر خرچ نہ کرے جن پر خرچ کرنا اُس کے لئے ضروری ہو ۔

یہ ایک عجیب بات ہے کہ اِس آیت میں اللہ تعالےٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ جو شخص اپنے رشتہ داروں اور محتاجوں وغیرہ پر روپیہ خرچ نہیں کرتا وہ بُرا ہے کیونکہ جس کے پاس مال نہ ہو وہ بھی تو خرچ نہیں کرتا ۔ پھر کیا وہ خدا تعالےٰ کے نیک بندوں میں سے نکل جائیگا ؟ مثلاً ایک شخص خود بھوکا ہے اُس سے کوئی محتاج آ کر مانگتا ہے کہ مجھے کھانے کو دو ۔ لیکن وہ کچھ نہیں دیتا تو ایسا آدمی خدا تعالیٰ کے حضور بخیل نہیں ٹھہرایا جا سکتا ۔ ہاں ایسا شخص جس کے پاس دوسرے کو دینے کے لئے موجود ہے مگر وہ پھر بھی نہیں دیتا ۔ وہ بے شک اللہ تعالیٰ کے نزدیک گنہگار ہوگا ۔ تو یہاں اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ خدائے رحمٰن کا وہ بندہ ہے جو خرچ نہیں کرتا ۔ بلکہ لَمْ یَقْتُرُوْا فرمایا ہے ۔ اور قاتر اُسکو کہتے ہیں جو

وَالَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ وَلَا

اور وہ لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ اللہ (تعالیٰ) کے سوا کسی اَور معبود کو نہیں پکارتے۔ اور نہ

يَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا

کسی جان کو جسے اللہ (تعالیٰ) نے حفاظت بخشی ہو قتل کرتے ہیں سوائے (شرعی) حق کے - اور نہ

يَزْنُوْنَ ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ يَلْقَ اَثَامًا ﴿۶۹﴾ يُّضٰعَفْ

زنا کرتے ہیں اور جو کوئی ایسا کام کریگا وہ اپنے گناہ کی جزا کو دیکھ لیگا - قیامت کے دن

لَهُ الْعَذَابُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَيَخْلُدْ فِيْهٖ مُهَانًا ﴿۷۰﴾

اُس کے لئے عذاب زیادہ کیا جائیگا اور وہ اُس میں ذلّت کے ساتھ رہتا چلا جائیگا۔

مال جمع رکھے اور اپنے رشتہ داروں مسکینوں اور محتاجوں وغیرہ پر خرچ نہ کرے۔ پس ایک ہی لفظ میں اللہ تعالیٰ نے یہ بھی بتا دیا کہ جس کے پاس مال نہ ہو اُس پر کوئی اعتراض نہیں۔ اعتراض صرف اس پر ہے جس کے پاس مال ہو اور وہ بجائے حاجتمندوں پر خرچ کرنے کے اُسے جمع کرتا رہے اور پھر اس لفظ کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے یہ بھی بتا دیا کہ خالی مال جمع کرنا بُرا نہیں بلکہ مال کے ساتھ چمٹے رہنا اور اُسے اُن لوگوں پر خرچ نہ کرنا جنکی نگرانی یا خورد و نوش کے اخراجات اُس کے ذمہ ہوں۔ یہ بُرا ہے اور اس سے ہر مومن کو اجتناب اختیار کرنا چاہیئے۔

بُخل ایک ایسا خطرناک عیب ہے جسے دنیا کی تمام قوموں کے ضابطۂ اخلاق میں بُرا قرار دیا گیا ہے چنانچہ اگر کسی کو بخیل کہہ دیا جائے تو وہ سمجھتا ہے کہ مجھے گالی دی گئی ہے۔ لوگ جب کسی کی مذمت کرنا چاہیں تو کہتے ہیں "کنجوس مکھی چُوس" جس کے معنے یہ ہوتے ہیں کہ یہ شخص ایسا بخیل ہے کہ اگر مکھی بھی اُس کے کھانے میں گر پڑے تو یہ اُس کو بھی چُوس لیتا ہے۔ لیکن کنجوسی بعض نہایت معمولی اور چھوٹے چھوٹے امور کو نظر انداز کرنے کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ اگر ماں باپ بچپن میں ہی کوشش کریں تو وہ اپنی آئندہ نسل کو بُخل کے مرض سے بچا سکتے ہیں۔ بُخل کا مرض ایک تو اِس طرح پیدا ہوتا ہے کہ جب کوئی فقیر دروازہ پر آتا ہے اور وہ خیرات مانگتا ہے تو بجائے اِس کے کہ اُسے ملاطفت کے ساتھ کچھ دے کر رخصت کر دیا جائے بعض لوگ غصہ سے کہنا شروع کر دیتے ہیں کہ اِسے کچھ نہ دیا جائے - یہ خود کمائے اور کھائے۔ چھوٹے بچے اُن کی بات سُنتے ہیں تو اُن میں بھی بُخل کی عادت پیدا ہو جاتی ہے۔ اِسی طرح جن بچوں کو بچپن میں اجابت روکنے کی عادت ہوتی ہے اُن میں بھی بڑے ہو کر بُخل کا مرض پیدا ہو جاتا ہے جب وہ سمجھدار ہو جاتے ہیں تو گو وہ اس عادت کو لغو سمجھ کر چھوڑ دیتے ہیں مگر بچپن کی اس عادت کا اُن کے اخلاق پر یہ اثر پڑتا ہے کہ وہ بڑے ہو کر جائز مصارف میں بھی اپنا مال خرچ نہیں کرتے اور اُسے روک کر بیٹھ جاتے ہیں جس کی وجہ سے

اِلَّا مَنۡ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ

سوائے اس کے جس نے توبہ کر لی اور ایمان لایا اور ایمان کے مطابق عمل کئے ۔ پس یہ لوگ ایسے ہوں گے کہ

یُبَدِّلُ اللّٰهُ سَیِّاٰتِهِمۡ حَسَنٰتٍ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوۡرًا

اللہ (تعالیٰ) اُن کی بدیوں کو نیکیوں سے بدل دے گا ۔ اور اللہ (تعالیٰ) بڑا بخشنے والا

رَّحِیۡمًا ﴿۷۱﴾ وَمَنۡ تَابَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَاِنَّهٗ

مہربان ہے ۔ اور جو توبہ کرے اور اُس کے مطابق عمل کرے تو وہ شخص حقیقی طور پر

یَتُوۡبُ اِلَی اللّٰهِ مَتَابًا ﴿۷۲﴾

اللہ (تعالیٰ) کی طرف جھکتا ہے ۔ ۳۲ھ

وہ خود بھی ہر قسم کی سہولتوں سے محروم رہتے ہیں اور اپنوں اور بیگانوں کی نگاہ میں بھی انہیں کوئی عزت حاصل نہیں ہوتی۔ چنانچہ قرآن کریم نے بخل کا ایک بہت بڑا نقصان یہی بیان کیا ہے کہ وَ مَنۡ یَّبۡخَلۡ فَاِنَّمَا یَبۡخَلُ عَنۡ نَّفۡسِهٖ (محمد ع) یعنی جو شخص بخل کرتا ہے اُس کا نقصان خود اُسی کو ہوتا ہے۔ کیونکہ بخل کی وجہ سے نہ تو وہ اچھا کھانا کھاتا ہے۔ نہ اچھا لباس پہنتا ہے ۔ نہ رہائش کے لئے کوئی مکان بنانے پر آمادہ ہوتا ہے۔ نہ بیمار ہونے پر دواؤں کے لئے روپیہ خرچ کرتا ہے ۔ نہ مصیبت میں اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں کے کام آتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ خود بھی تکلیف میں زندگی بسر کرتا ہے اور اپنے دوستوں اور رشتہ داروں کے حلقہ میں بھی اُسے کسی عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا۔ اسی طرح جب وہ قومی کاموں کے لئے روپیہ صرف نہیں کرتا تو قوم بھی اُسے ذلیل سمجھنے لگ جاتی ہے ۔ لیکن خدائے رحمٰن کے بندے اِن تمام عیوب سے پاک ہوتے ہیں ۔ وہ نہ تو اپنے روپیہ کو معصیت کے کاموں میں خرچ کرتے ہیں۔ نہ غلط طور پر خرچ کرتے ہیں اور نہ خرچ میں جائز حدود سے تجاوز اختیار کرتے ہیں جو اسراف کی مختلف شکلیں ہیں اور نہ اپنے مالوں کو اس طرح روک کر بیٹھ جاتے ہیں کہ دولت کی ہوس میں اپنے فرائض اور واجبات کو بھی ترک کر دیں۔ بلکہ اُن کا رویہ ہمیشہ میانہ روی کا ہوتا ہے اور افراط و تفریط کا عیب اُن میں نہیں پایا جاتا ۔

۳۲ھ حل لغات :- اَلۡاَثَامُ: جَزَاءُ الۡاِثۡمِ یعنی اثام کے معنے گناہ کی سزا کے ہوتے ہیں۔ (اقرب)

اَلۡاَثَامُ

تفسیر:- فرماتا ہے ۔ رحمٰن کے بندوں کی ایک یہ بھی علامت ہے کہ وہ شرک نہیں کرتے ۔ اور کسی ایسی جان کو قتل نہیں کرتے جس کا قتل کرنا اللہ تعالیٰ نے حرام کیا ہوا ہے ۔ ہاں خدا تعالیٰ کے مقرر کردہ طریق پر قتل کرنا پڑے تو ایسا کر دیتے ہیں۔ جیسے جہاد میں یا قاتل کو اُس کے قتل کی سزا دینے کے لئے ۔ یہ علامات بھی ہمیں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ کی زندگیوں میں نہایت نمایاں طور پر دکھائی دیتی ہیں ۔ انہوں نے

توحید کی اشاعت کے لئے وہ وہ قربانیاں پیش کیں کہ آج بھی تاریخ کے صفحات میں ان کا ذکر پڑھ کر انسانی قلب لرز جاتا ہے۔ وہ خدائے واحد و یگانہ پر ایمان لانے کی وجہ سے قتل کئے گئے۔ اُن کے اموال چھین لئے گئے۔ اُن کی عورتوں کی آبرو ریزی کی گئی۔ انہیں اپنے وطن سے بے وطن کیا گیا۔ انہیں تپتی ریت پر لٹایا گیا۔ اُن کے سینوں پر بڑے بڑے بھاری پتھر رکھ کر اُن پر جوتوں سمیت کودا گیا اور انہیں لات، منات اور عزّٰی کی پرستش پر مجبور کیا گیا مگر وہ لوگ خدا تعالیٰ کے عشق میں کچھ ایسے سرشار تھے کہ اُن کی زبانوں سے اگر کوئی فقرہ نکلا تو صرف یہی کہ خدا ایک ہے۔ خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو کفارِ مکہ نے یہاں تک پیشکش کی کہ ہم آپ کو اپنا بادشاہ تسلیم کرنے کیلئے تیار ہیں صرف اتنا مطالبہ آپ منظور کرلیں کہ ہمارے بتوں کو بُرا بھلا نہ کہیں۔ مگر اتنی بڑی پیشکش کے باوجود رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے اُن کے مطالبہ کو نہایت حقارت کے ساتھ ٹھکرا دیا اور ایک لمحہ کیلئے بھی یہ برداشت نہ کیا کہ خدائے واحد کی توحید میں کوئی خلل واقع ہو۔ بلکہ ایک موقعہ پر آپ نے فرمایا کہ اگر یہ لوگ سورج کو میرے دائیں اور چاند کو میرے بائیں بھی لاکر کھڑا کر دیں تب بھی میں خدا تعالیٰ کی توحید کے اعلان سے باز نہیں رہ سکتا۔ پھر آپ کی آنکھوں کے سامنے محض توحید کو تسلیم کرنے کے جُرم میں آپ کے عزیز ترین صحابہؓ پر بڑے بڑے مظالم توڑے گئے خود آپ کو اور آپ کے خاندان کو اُن کے مبہم مظالم کا تختۂ مشق بننا پڑا۔ مگر آپ نے ان تمام تکالیف کے باوجود دُنیا کی ہر اُس قوم سے لڑائی کی جو توحید کی دشمن تھی۔ آپ نے مشرکین مکّہ کا بھی مقابلہ کیا جو سینکڑوں بتوں کے پجاری تھے۔ آپ نے عیسائیوں کا بھی مقابلہ کیا جو مسیح ناصری کو ابن اللہ کہتے تھے۔ آپ نے یہود کا بھی مقابلہ کیا جو عزیر کو خدا تعالیٰ کا بیٹا قرار دیتے تھے آپ نے مجوسیوں کا بھی مقابلہ کیا جو آگ کے پجاری تھے اور آخر عرب میں ہی نہیں بلکہ ساری دنیا میں توحید کو غالب کر کے دکھا دیا اور بتوں کے پرستاروں کو خدائے واحد کے آستانہ پر لاڈالا۔ پھر جب آپ کی وفات کا وقت آیا تو حدیثوں میں آتا ہے کہ آپؐ کرب و اضطراب کے ساتھ کبھی ایک کروٹ بدلتے اور کبھی دوسری اور بار بار فرماتے خدا تعالیٰ یہود اور نصاریٰ پر لعنت کرے کہ انہوں نے اپنے نبیوں کی قبروں کو سجدہ گاہ بنا لیا اِس طرح آپؐ نے صحابہؓ کو نصیحت فرمائی کہ دیکھنا میری قبر کو کبھی سجدہ گاہ نہ بنانا۔ دیکھنا میرے بشر ہونے کے مقام کو کبھی فراموش نہ کرنا۔ چنانچہ آپکی اِسی تعلیم اور تعہّد کا یہ نتیجہ ہے کہ آج دنیا کے ہر شہر اور ہر گاؤں اور ہر قریہ میں دن کی روشنی اور رات کی تاریکیوں میں پانچ مرتبہ یہ آواز بلند ہوتی سُنائی دیتی ہے کہ اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ۔ مَیں گواہی دیتا ہوں کہ خدا تعالیٰ کے سوا اَور کوئی معبود نہیں اور مَیں گواہی دیتا ہوں کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے سچے رسول ہیں۔ غرض رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ نے توحید کا جھنڈا اتنی مضبوطی سے بلند کیا کہ وہ آج تک اپنی پوری شان کے ساتھ دنیا میں لہرا رہا اور کفار کے سینوں میں ناسور ڈال رہا ہے۔ پس عباد الرحمٰن کی ایک بڑی علامت یہ ہے کہ وہ شرک کے کبھی قریب نہیں جاتے اور خدا تعالیٰ کی توحید کو زمین پر پھیلانے کےلئے ہر قسم کی جائز کوششیں عمل میں لاتے رہتے ہیں۔ کیونکہ شرک خدا تعالیٰ کی صفتِ رحمانیت کے بالکل منافی ہے۔

اِسی طرح عباد الرحمٰن کی ایک اَور علامت

یہ بتائی کہ وہ کسی کو ناجائز طور پر قتل نہیں کرتے۔ یہ علامت بھی اپنی پوری شان کے ساتھ ہمیں صحابہؓ کے مقدس وجود میں جلوہ گر دکھائی دیتی ہے۔ وہ اس حکم پر اتنی سختی سے عمل کرتے تھے کہ باوجود اس کے کہ وہ ایسی اقوام سے برسرپیکار رہے جو بزورِ شمشیر اُن سے اپنا مذہب بدلوانا چاہتی تھیں۔ پھر بھی اُن کی تلوار صرف اُن افراد پر اُٹھتی تھی جو عملاً جنگ میں شامل ہوں کسی عورت کسی بچے کسی بوڑھے کسی راہب اور کسی پنڈت یا پادری پر نہیں اٹھتی تھی۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ اسلام صرف لڑنے والے افراد سے جنگ کرنا جائز قرار دیتا ہے دوسرے افراد کو قتل کرنا خواہ وہ دشمن قوم سے ہی کیوں نہ تعلق رکھتے ہوں جائز قرار نہیں دیتا۔ آج دنیا کی بڑی بڑی حکومتیں جو اپنے آپ کو عدل و انصاف کا علمبردار قرار دیتی ہیں اور جن کا وجود امنِ عالم کے قیام کی ضمانت سمجھا جاتا ہے اُن کی یہ کیفیت ہے کہ وہ دشمن اقوام کو ہمیشہ ایٹمی ہتھیاروں سے ہلاک کرنے کی دھمکی دیتی رہتی ہیں بلکہ عملاً گذشتہ جنگِ عظیم میں ہیروشیما اور ناگاساکی پر ایٹم بم گرا کر لاکھوں بے گناہ جاپانی مردوں اور عورتوں اور بچوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا اور اسے امنِ عالم کے قیام کے لئے ایک بڑا بھاری کارنامہ قرار دیکر اسے سراہا گیا لیکن رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم اور خلفاءِ راشدین کے زمانہ میں کہیں ایسا ظلم دکھائی نہیں دیتا کہ برسرپیکار ہونے کی حالت میں بھی انہوں نے بے گناہ مردوں اور عورتوں اور بچوں کو تہ تیغ کیا ہو۔ مگر یہ لاکھوں افراد کے ناجائز خون سے اپنے ہاتھ رنگنے والے تو عدل و انصاف کے مجسمہ کہلاتے ہیں اور وہ مسلمان جنہوں نے اپنے پاؤں تلے کبھی ایک چیونٹی کو بھی نہیں مسلا تھا انہیں یہ لوگ ڈاکو اور لٹیرا قرار دیتے ہیں۔

ع ببیں تفاوتِ راہ از کجا است تا بہ کجا

پھر فرماتا ہے عباد الرحمٰن کی ایک یہ بھی علامت ہے کہ وہ زنا نہیں کرتے۔ اور جو کوئی ایسا کرے وہ اپنے وبال کو اس دنیا میں طرح طرح کی بیماریوں یا بدنامیوں کے ذریعہ دیکھ لیگا۔ اور اگلے جہان میں جو اس کو عذاب ملیگا وہ بہت زیادہ ہوگا۔ اور پھر وہاں بھی عذاب کے علاوہ بڑی بھاری رسوائی ہوگی۔ ایک دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ نے زنا کی حرمت ان الفاظ میں بیان فرمائی ہے کہ وَ لَا تَقْرَبُوا الزِّنٰٓى اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً ؕ وَ سَآءَ سَبِيْلًا (بنی اسرائیل ۴ع) یعنی تم زنا کے قریب بھی نہ جاؤ۔ کیونکہ وہ یقیناً ایک کھلی بے حیائی اور نہایت بُرا راستہ ہے یعنی اوّل تو اس سے دل میں ناپاکی پیدا ہوتی ہے۔ کیونکہ جرم کا احساس اور چوری کا خیال دل میں پیدا ہوتا ہے اور دوسرے یہ اُس مقصود کے حصول کے لئے جس کے لئے عورت اور مرد کے تعلقات قائم کئے جاتے ہیں ایک غلط راستہ ہے۔ کیونکہ شہوت کی اصل غرض بقائے نسل کی غرض کو پورا کرنا ہے۔ اور ناجائز تعلقات سے اصل غرض برباد ہو جاتی ہے کیونکہ نسل محفوظ نہیں رہتی یا مشتبہ ہو جاتی ہے۔ پس اس راستہ سے اصل مقصد حاصل نہیں ہو سکتا۔ اور اگر کبھی حاصل بھی ہو جائے تو سیدھے راستہ کو ترک کرکے ٹیڑھا راستہ اختیار کرنا کونسی عقلمندی ہے ہاں جو توبہ کرینگے اور رسمی ایمان کی بجائے حقیقی ایمان اپنے اندر پیدا کریں گے اور ایمان کے مناسبِ حال عمل کریں گے تو اللہ تعالیٰ اُن کی بدنامیوں کو نیک نامیوں سے اُن کی ذلت کو عزت سے اور اُن کے دکھوں کو انعام سے بدل دیگا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ بڑا بخشنے والا اور رحم کرنیوالا ہے۔ اور جو شخص توبہ کرے اور اس کے مناسبِ حال عمل کرے تو اس کی یہ علامت نہیں کہ وہ صرف مُنہ سے توبہ کرے بلکہ اسکی علامت یہ ہے کہ اس شخص کا دل خدا تعالیٰ کی طرف جھکتا چلا جائے۔

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے گناہوں کی مغفرت

کے لئے توبہ پر زور دیا ہے ۔ اور ایمان اور عمل صالح کا حصول
اس کے بغیر ناممکن قرار دیا ہے ۔ مگر دنیا میں بہت لوگ
ہیں جو توبہ کی حقیقت سے ناواقف ہوتے ہیں ۔ وہ
سمجھتے ہیں کہ صرف مُنہ سے یہ کہہ دینے سے کہ "میری توبہ"
توبہ مکمل ہو جاتی ہے ۔ حالانکہ اس کے لئے سات امور
کا ہونا ضروری ہے اور جب تک وہ سارے کے سارے
موجود نہ ہوں اُس وقت تک توبہ کبھی بھی صحیح معنوں میں
توبہ نہیں کہلا سکتی چنانچہ توبہ کے لئے **پہلی شرط** تو
یہ ہے کہ انسان اپنے گذشتہ گناہوں کو یاد کرکے اور
اُن کو اپنے سامنے لاکر اسقدر نادم ہو کہ گویا پسینہ پسینہ
ہو جائے ۔ **دوسری شرط** یہ ہے کہ پچھلے فرائض جسقدر
رہ چکے ہیں اُن میں سے جن کو ادا کیا جا سکے اُن کو ادا کرنے
کی کوشش کرے ۔ مثلاً اگر صاحب استطاعت ہونے کے
باوجود اُس نے حج نہیں کیا تھا تو اب حج کرے یا اگر زکوٰۃ
نہیں دی تھی تو ساری عمر کو جانے دے اُسی سال کی زکوٰۃ
دے دے ۔ **تیسری شرط** یہ ہے کہ پچھلے گناہوں میں سے
جن کا ازالہ ممکن ہو اُن کا ازالہ کرنے کی کوشش کرے ۔
مثلاً اگر کسی کی بھینس چُرا کر اُس نے اپنے گھر رکھی ہوئی ہو
تو اُسے واپس کر دے ۔ **چوتھی شرط** یہ ہے کہ جس شخص
کو کوئی دکھ پہنچایا ہو اُس کے دُکھ کا ازالہ کرنے کے علاوہ
اُس سے معافی طلب کرے ۔ یہ ایک باریک رُوحانی مسئلہ
ہے کہ خدا تعالیٰ نے بندوں کے گناہوں کی معافی کے لئے
یہ شرط رکھی ہے کہ اُن کے متعلق بندوں سے ہی معافی
طلب کی جائے اور اگر وہ معاف کر دیں تو پھر خدا تعالیٰ
اُن کا مؤاخذہ نہیں کرتا ۔ شبلیؒ ایک بہت بڑے بزرگ
گزرے ہیں وہ خلافتِ عباسیہ کے دور میں کسی علاقہ کے
گورنر تھے ۔ ایک دفعہ وہ کسی کام کے سلسلہ میں بادشاہ
سے مشورہ کرنے کے لئے بغداد آئے ۔ انہی دنوں ایک
بہت بڑا جرنیل ایران کی مہم میں کامیابی حاصل کرکے واپس
آیا اور بادشاہ نے اُس کے اعزاز میں دربار خاص منعقد
کیا اور فیصلہ کیا کہ بھرے دربار میں اُسے خلعتِ فاخرہ
دی جائے اور اُس کی عزت افزائی کی جائے ۔ اتفاق
سے اس روز اُسے نزلہ کی شکایت تھی ۔ جب اُسے
خلعت دیا گیا اور دربار میں چاروں طرف سے اُس پر
پھول برسائے جانے لگے تو اُسے چھینک آگئی ۔ اور
ناک سے پانی بہ پڑا ۔ اُس نے جلدی سے اپنی جیب میں
ہاتھ ڈالا ۔ مگر رومال موجود نہیں تھا ۔ یہ دیکھ کر اُس نے
گھبراہٹ میں اُسی خلعت سے اپنی ناک پونچھ لی ۔ بادشاہ
نے اُسے دیکھ لیا اور اُس نے سخت غضبناک ہو کر
حکم دیا کہ اس شخص نے ہمارے خلعت کی ناقدری کی ہے
اُس کا خلعت اتار لو اور اسے دربار سے نکال دو ۔
چنانچہ اُس کا خلعت اُتار لیا گیا اور اُسے ذلت کے ساتھ
دربار سے نکال دیا گیا ۔ شبلیؒ جو یہ تمام نظارہ دیکھ
رہے تھے یکدم اُن کی چیخ نکلی اور انہوں نے زار و
قطار رونا شروع کر دیا ۔ بادشاہ نے حیران ہو کر پوچھا
کہ یہ رونے کا کونسا مقام ہے ناراض تو میں جرنیل پر
ہوا ہوں تم خواہ مخواہ کیوں روتے ہو ۔ وہ کھڑے ہوئے
اور کہنے لگے ۔ حضور میرا استعفیٰ منظور فرمائیں ۔ بادشاہ
نے پھر کہا ۔ یہ استعفیٰ کا کونسا موقعہ ہے ۔ انہوں نے
کہا ۔ بادشاہ سلامت یہ شخص آج سے دو سال پہلے ایک
خطرناک مہم پر روانہ کیا گیا تھا ۔ یہ رات اور دن دشمن
کے مقابلہ میں رہا ۔ ہر روز موت اس کے سر پر منڈلاتی
تھی اور ہر رات اس کی بیوی بیوگی کا خطرہ محسوس کرتے
ہوئے سوتی تھی ۔ یہ گھر سے بے گھر اور وطن سے بے وطن
رہا جنگلوں میں دھکے کھاتا رہا ۔ مصائب اور آلام برداشت
کرتا رہا اور آخر فتح یاب ہو کر واپس آیا ۔ آپ نے اس کی
آمد کی خوشی میں یہ دربار منعقد کیا اور اُسے چند گز کپڑا
خلعت کے طور پر عطا فرمایا ۔ مگر صرف اس لئے کہ

اُس نے اُس خلعت سے اپنی ناک پونچھ لی آپ اتنے غضبناک ہوئے کہ آپ نے اُسے دربار سے باہر نکال دیا۔ اور اُس کا خلعت چھین لیا۔ مَیں اس نظارہ کو دیکھ کر سوچتا ہوں کہ جب چند گز کپڑے کی آپ ہتک برداشت نہیں کر سکے تو میرا خدا جس نے مجھے کروڑوں کروڑ نعمتیں عطا فرمائی ہوئی ہیں اور جس کی نعمتوں کی مَیں روزانہ ہتک کرتا ہوں وہ قیامت کے دن مجھ سے کیا سلوک کریگا۔ مَیں اَب اس ملازمت سے باز آیا۔ میرا استعفیٰ قبول کیجیئے۔ مَیں اب اپنی بقیہ عمر اللہ تعالیٰ کی عبادت میں ہی بسر کرونگا۔ چنانچہ وہ استعفیٰ دے کر چلے گئے۔ اور پھر اپنے گناہوں کی معافی کے لئے مختلف بزرگوں کے پاس گئے مگر وہ اتنے ظالم مشہور تھے کہ کسی نے اُن کی بیعت لینے کی جرأت نہ کی۔ آخر وہ حضرت جنیدؒ کے پاس پہنچے۔ انہوں نے فرمایا۔ تمہاری توبہ قبول ہو سکتی ہے مگر شرط یہ ہے کہ پہلے تم اُس شہر میں واپس جاؤ جہاں تم گورنر رہے تھے اور ایک ایک دروازہ پر پہنچ کر لوگوں سے اپنے گناہوں کی معافی مانگو اور جب سب لوگوں سے معافی لے چکو تو پھر میرے پاس آؤ۔ چنانچہ وہ اس علاقہ میں گئے اور انہوں نے گھر گھر پھر کر لوگوں سے معافیاں لینی شروع کیں۔ پہلے تو لوگ سمجھے کہ یہ رسمی طور پر معافی مانگ رہے ہیں۔ مگر جب انہوں نے دیکھا کہ شبلیؒ معافی بھی مانگتے ہیں اور اپنے گناہوں پر ندامت کے آنسو بھی بہاتے ہیں تو انہوں نے سمجھ لیا کہ آج اس شخص کے دل پر بھی خدائے رحمٰن کی حکومت قائم ہو گئی ہے۔ چنانچہ پھر تو یہ کیفیت ہوئی کہ جب وہ معافی مانگتے تو لوگ کہتے آپ ہمیں کیوں شرمندہ کرتے ہیں آپ تو ہمارے قابلِ احترام بزرگ ہیں۔ غرض اس طرح انہوں نے گھر گھر پھر کر معافی حاصل کی اور پھر وہ حضرت جنیدؒ کے پاس آئے۔

حضرت جنیدؒ نے جب دیکھا کہ انہوں نے سچے طور پر توبہ کر لی ہے تو انہوں نے اُس کی بیعت قبول کی اور پھر اُن کی تربیت میں انہوں نے اتنی بڑی ترقی کی کہ آج شبلیؒ بھی اولیاء اُمت میں سے سمجھے جاتے ہیں۔

پس توبہ کی ایک ضروری شرط یہ ہے کہ جن لوگوں کو کوئی دُکھ پہنچایا ہو اور اُنکی رضا حاصل کرنا ممکن ہو اُن سے معافی طلب کی جائے۔ مگر یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ خدا تعالےٰ بڑا ستار ہے وہ انسان کی بڑی بڑی برائیوں پر پردہ ڈالے رکھتا ہے۔ اِس لئے انسان کو چاہیئے کہ اپنی ستاری آپ بھی کرے اور وہ گناہ جن کو خدا تعالےٰ نے چھپا رکھا ہو اُن کو خود ظاہر نہ کرے مثلاً کسی کی چوری کی ہو تو اُسے یہ نہیں چاہیئے کہ خود جاکر اُسے بتلائے کہ مَیں نے تمہاری چوری کی تھی۔ ایسا کرنا بجائے خود گناہ ہوگا۔ ہاں بعض گناہ ایسے ہوتے ہیں جو اَور لوگوں کو بھی معلوم ہوتے ہیں۔ مثلاً اگر وہ کسی کو گالی دیتا ہے یا کسی کو پیٹنے لگ جاتا ہے تو اُس کا اُوروں کو بھی علم ہوتا ہے۔ ایسے گناہوں کا ازالہ کرنا چاہیئے۔ اور جن لوگوں کو دُکھ پہنچایا گیا ہو اُن سے معافی طلب کرنی چاہیئے۔

پانچویں شرط یہ ہے کہ جن لوگوں کو اُس نے نقصان پہنچایا ہو اُن سے مقدور بھر احسان کرے اور اگر کچھ نہیں کر سکتا تو اُن کیلئے دُعا ہی کرے۔ اولیاء کرامؒ نے بھی لکھا ہے کہ اگر کسی نے دوسرے کا مال ناجائز طور پر لیا ہو اور اُس کے ادا کرنے کی طاقت نہ ہو۔ تو وہ خدا تعالےٰ سے دُعا کرے کہ الٰہی مجھے تو اس کا مال دینے کی طاقت نہیں تو اپنے پاس سے ہی اسے دیدے اور اس کمی کو پورا فرما دے۔

چھٹی شرط یہ ہے کہ وہ اپنے دل میں آئندہ گناہ نہ کرنے کا پختہ عہد کرے اور فیصلہ کرے کہ

اَب میں کوئی گناہ نہیں کرونگا۔

ساتویں شرط یہ ہے کہ انسان اپنے نفس کو نیکی کی طرف رغبت دلانا شروع کر دے۔ اور اپنے دل کو پاکیزہ بنانے کی کوشش کرے۔ تاکہ آئندہ ہر قسم کے نیک کاموں میں وہ دلی شوق سے حصہ لے سکے۔

یہ سات باتیں توبہ کے لئے ضروری ہیں۔ جب تک یہ تمام شرائط نہ پائی جائیں کوئی توبہ مکمل نہیں کہلا سکتی۔

بعض لوگ توبہ کے مسئلہ کے متعلق اپنی نادانی سے یہ خیال کرتے ہیں کہ توبہ کا دروازہ کھولنے سے بدی کا دروازہ بھی ساتھ ہی کھل جاتا ہے۔ اور بجائے اخلاق میں ترقی کرنے کے انسان بداخلاقی کے ارتکاب پر اَور بھی دلیر ہو جاتا ہے۔ کیونکہ وہ جانتا ہے کہ میں جب چاہوں گا۔ توبہ کر لونگا اور خدا سے صلح کر لونگا۔ لیکن یہ خیال بالکل غلط اور توبہ کی حقیقت کو نہ سمجھنے کا نتیجہ ہے۔ "جب چاہوں گا توبہ کر لونگا" کا خیال کبھی ایک عقلمند انسان کے دل میں پیدا ہی نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اُسے کیا معلوم ہے کہ مَیں کب مرونگا۔ اگر اچانک موت آجائے تو توبہ کس وقت کرے گا۔

علاوہ ازیں توبہ کی حقیقت کو یہ لوگ نہیں سمجھتے۔ توبہ کوئی آسان امر نہیں اور نہ انسان کے اختیار میں ہے کہ وہ جب چاہے اپنی مرضی سے توبہ کرلے۔ کیونکہ توبہ اُس عظیم الشان تغیّر کا نام ہے جو انسان کے قلب کے اندر پیدا ہو کر اس کو بالکل گداز کر دیتا اور اُس کی ماہیت کو ہی بدل ڈالتا ہے۔

توبہ کے معنے جیسا کہ اوپر بتایا جا چکا ہے اپنے پچھلے گناہوں پر شدید ندامت کا اظہار کرنے اور آئندہ کے لئے پورے طور پر خدا تعالیٰ سے صلح کر لینے اور اپنی اصلاح کا پختہ عہد کر لینے کے ہیں۔

اب یہ حالت یکدم کس طرح پیدا ہو سکتی ہے۔ یہ حالت تو ایک لمبی کوشش اور محنت کے نتیجہ میں پیدا ہوگی۔ ہاں شاذ و نادر کے طور پر یکدم بھی پیدا ہو سکتی ہے۔ مگر جب بھی ایسا ہوگا کسی عظیم الشان تغیّر کی وجہ سے ہوگا جو آتش فشاں مادہ کی طرح اُس کی ہستی کو ہی بالکل بدل دے۔ اور ایسے تغیرات بھی انسان کے اپنے اختیار میں نہیں ہیں۔ پس توبہ کی وجہ سے کوئی شخص گناہ پر دلیر نہیں ہو سکتا۔ بلکہ توبہ اصلاح کا حقیقی علاج اور مایوسی کو دُور کرنے کا ایک زبردست ذریعہ ہے جو انسان کو کوشش اور ہمت پر اکساتا ہے۔ اور یہ دھوکا کہ توبہ گناہ پر اکساتی ہے محض عربی زبان کی ناواقفیت اور اس خیال کے نتیجہ میں پیدا ہوا ہے کہ توبہ اس امر کا نام ہے کہ انسان کہہ دے کہ یا اللہ میرے گناہ معاف کر حالانکہ گناہوں کی معافی طلب کرنے کا نام توبہ نہیں بلکہ استغفار ہے۔ توبہ گناہوں کی معافی طلب کرنے کو نہیں کہتے۔ بلکہ گناہوں کی معافی سچی توبہ کا صحیح نتیجہ ہوتا ہے۔ اور اس دروازہ کو کھول کر اسلام نے انسانی رُوح کو مایوسی کا شکار ہونے سے بچا لیا ہے بلکہ اُس کیلئے لامتناہی ترقیات کا دروازہ کھول دیا ہے کیونکہ جب انسان کو معلوم ہو جائے کہ اُس کے لئے ترقی کا دروازہ کھلا ہے اور وہ بھی پاکیزگی حاصل کر سکتا اور خدا تعالیٰ کا مقرب بن سکتا ہے تو وہ ہمت نہیں ہارتا اور اپنی اصلاح کی فکر میں لگا رہتا ہے اور آخر وہ اس مقصد میں کامیاب ہو جاتا ہے اور اُس کی رُوح ہر قسم کی سفلی آلائشوں سے پاک ہو کر عالمِ بالا کی طرف پرواز کرنے لگتی ہے۔

وَالَّذِيْنَ لَا يَشْهَدُوْنَ الزُّوْرَ ۙ وَاِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا ﴿۷۳﴾

اور وہ لوگ بھی (اللہ کے بندے ہیں) جو جھوٹی گواہیاں نہیں دیتے اور جب بیہودہ باتوں کے پاس سے گذرتے ہیں تو بزرگانہ طور پر (بغیر ان میں شامل ہونے کے) گذر جاتے ہیں ۳۳؎

۳۳؎ **حل لغات** :- اَلزُّوْرُ : اَلْكِذْبُ۔ زُور کے معنے جُھوٹ کے ہیں۔ نیز اس کے معنے ہیں اَلشِّرْكُ بِاللّٰهِ اللہ تعالےٰ کے ساتھ شرک کرنا۔ مَجْلِسُ الْغِنَاءِ گانے کی مجلس مَا يُعْبَدُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ۔ اللہ کے سوا معبودانِ باطلہ جنکی عبادت کی جاتی ہے۔ اَلْقُوَّةُ۔ طاقت۔ لِيْنُ الثَّوْبِ۔ کپڑے کی نرمی۔ اسی طرح زُور کے ایک معنے عقل کے بھی ہیں (اقرب)

كِرَامٌ : كَرِيْمٌ کی جمع ہے اور اَلْكَرِيْمُ کے معنے ہیں ذُو الْكَرَمِ۔ عزت والا۔ قِيْلَ اَلْكَرِيْمُ قَدْ يُطْلَقُ عَلَى الْجَوَادِ الْكَثِيْرِ النَّفْعِ۔ بعض ائمۂ لغت کہتے ہیں کہ کریم کا لفظ سخی اور نفع رساں شخص کیلئے بولا جاتا ہے۔ وَقَدْ يُطْلَقُ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ عَلٰى اَحْسَنِهٖ كَمَا قِيْلَ اَلْكَرِيْمُ صِفَةٌ مَا يُرْضِيْ وَيُحْمَدُ فِيْ بَابِهٖ۔ نیز کریم کا لفظ ہر اس وجود کیلئے بولا جاتا ہے جو کسی نوع میں سے اعلیٰ درجہ کا ہو۔ اِسی طرح کریم کا لفظ ہر اُس چیز کی صفت کے طور پر استعمال ہوتا ہے جو اپنی نوع میں اعلیٰ درجہ کی ہو اور ہر شخص کو پسند آئے۔ چنانچہ کہتے ہیں رِزْقٌ كَرِيْمٌ یعنی اعلیٰ درجہ کا اور اتنا کثیر رزق جو پسند کیا جائے۔ نیز کہتے ہیں قَوْلٌ كَرِيْمٌ اور اِس سے یہ مراد ہوتی ہے کہ نرم اور عمدہ بات۔ اِسی طرح کہتے ہیں كِتَابٌ كَرِيْمٌ اور مطلب یہ ہوتا ہے کہ ایسی کتاب جو اپنے الفاظ، معانی اور فوائد میں بے نظیر اور اعلیٰ درجہ کی ہو۔ (اقرب)

تفسیر :- فرماتا ہے۔ رحمٰن کے بندوں کی ایک یہ بھی علامت ہے کہ وہ زُور کے ساتھ گواہی نہیں دیتے زُور کے ایک معنے جیسا کہ حل لغات میں بتایا جا چکا ہے جُھوٹ کے بھی ہیں۔ پس اِس لحاظ سے لَا يَشْهَدُوْنَ الزُّوْرَ کے معنے یہ ہیں کہ لَا يَشْهَدُوْنَ بِالزُّوْرِ یا لَا يَشْهَدُوْنَ شَهَادَةَ الزُّوْرِ۔ یعنی عباد الرحمٰن کی ایک یہ علامت ہے کہ وہ جھوٹی گواہی نہیں دیتے۔

حقیقت یہ ہے کہ توحید کے بعد سب سے بڑی نیکی اور سب سے بڑا مشکل کام جو اس دنیا میں انسان کے سامنے پیش آتا ہے وہ سچائی ہی ہے۔ ہزاروں انسان ایسے دیکھے جاتے ہیں جو رحم کرنے والے بھی ہوتے ہیں۔ انصاف کرنے والے بھی ہوتے ہیں لیکن جب انہیں گواہی دینی پڑے اور وہ یہ دیکھیں کہ اُس کے نتیجہ میں اُن کی اپنی ذات کو یا اُن کے کسی رشتہ دار اور دوست کو نقصان پہنچیگا تو وہ اس میں کچھ نہ کچھ ضرور تبدیلی کر دینگے۔ اور یہ مرض اس قدر پھیل گیا ہے کہ ہمارے ملک میں لوگ بڑی دلیری کے ساتھ قسمیں کھا کھا کر جھوٹ بولتے ہیں اور ساتھ ہی اس بات پر ناراض بھی ہوتے ہیں کہ اُن کے جھوٹ کو سچ کیوں نہیں مانا جاتا۔ عدالتوں میں پہلے یہ رواج تھا کہ گواہ کے ہاتھ میں قرآن کریم دے کر اُس سے قسم لیتے تھے اور اس کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ قرآن کریم میں جو وعید نازل ہوئے ہیں انہیں مدّ نظر رکھتے ہوئے مَیں قسم کھاتا ہوں۔ اور اگر میری قسم جھوٹی ہو تو مذکورہ وعید اور سزائیں مجھے ملیں۔ لیکن اُن گواہوں میں سے کئی ایسے ہوتے تھے جو قسم کھا کر بھی جھوٹ بولتے تھے۔ مرزا سلطان احمد صاحب مرحوم جو ہمارے بڑے بھائی تھے اور ای۔اے۔سی تھے۔ وہ اپنا تجربہ سُنایا کرتے تھے کہ جتنے جوش سے کوئی شخص قرآن کریم ہاتھ میں لے کر میرے سامنے گواہی دیتا تھا۔ میرے تجربہ میں اُتنا ہی وہ جھوٹا ہوتا تھا۔ وہ ایک لطیفہ سُنایا کرتے تھے کہ ایک شخص جو میرا اچھا واقف تھا اُس کا مقدمہ میرے سامنے پیش ہُوا۔ وہ کہنے لگا۔ مجھے کوئی

اَور تاریخ دی جائے۔ کیونکہ جو گواہ مَیں نے پیش کرنے
تھے وہ فلاں فلاں وجہ سے حاضر نہیں ہو سکتے۔ مَیں
نے ہنس کر کہا۔ مَیں تو تمہیں بڑا عقلمند اور ہوشیار آدمی
سمجھا کرتا تھا۔ لیکن اب میری طبیعت پر یہ اثر ہُوا ہے
کہ تم بڑے بیوقوف ہو۔ وہ کہنے لگا۔ کیوں۔ مَیں نے
کہا۔ گواہوں کیلئے جگہ اور وقت کی کیا ضرورت ہے۔
اگر تمہارے پاس کچھ ہے تو روپیہ اٹھنی دے کر بعض
آدمی گواہی کے لئے لے آؤ۔ چنانچہ وہ باہر چلا گیا اور
عملی طور پر تھوڑی دیر کے بعد ہی کچھ گواہ لے آیا۔ گواہی
لیتے وقت میں ہنستا بھی جاؤں اور اُن سے مذاق بھی
کرتا جاؤں۔ وہ لوگ قرآن کریم سر پر رکھ کر اور قسمیں
کھا کھا کر کہتے تھے کہ واقعہ یوں ہُوا ہے حالانکہ تھوڑی
دیر ہوئی۔ مَیں نے خود مدعی کو اس غرض کے لئے باہر بھیجا تھا
کہ وہ کچھ دے دلا کر چند گواہ لے آئے جب وہ گواہی
دے چکے تو مَیں نے انہیں پکڑا اور اُن سے کہا کہ تم
بڑے کذاب ہو تمہیں واقعہ کا کچھ بھی علم نہیں لیکن محض
چند ٹکوں کی وجہ سے تم اتنا جھوٹ بول رہے ہو کہ قرآن کریم
کی بھی پرواہ نہیں کرتے جس قوم کے افراد کی یہ حالت ہو
اُس کا یہ شور مچانا کہ ہم جیتتے کیوں نہیں بالکل غلط بات
ہے۔ دنیا میں وہی قومیں جیتا کرتی ہیں جن میں صداقت
اور راستبازی ہوتی ہے۔ مَیں عیسائی دنیا کو دیکھتا ہوں
کہ انہوں نے مشق کے ساتھ اپنے اندر سچائی کی اتنی عادت
پیدا کرلی ہے کہ جہاں حکومت کی خاطر وہ ہر قسم کا جھوٹ
بول لیتے ہیں وہاں جب ذاتیات کا سوال آتا ہے تو
وہ جھوٹ نہیں بولتے۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ یورپ اور امریکہ
کی ترقی سائنس کی وجہ سے ہوئی ہے حالانکہ اُنکی ترقی
نہ سائنس کی وجہ سے ہوئی ہے اور نہ گولہ بارود کی وجہ
سے ہوئی ہے بلکہ اُن کی ترقی محض اخلاق کی وجہ سے ہوئی
ہے۔ انگریزی عدالتوں میں چلے جاؤ اور وہاں اُن کے
واقعات دیکھو۔ جج پوچھتا ہے۔ تم نے یہ جرم کیا ہے۔
وہ کہتا ہے ہاں کیا ہے۔ پھر پوچھتا ہے تم فلاں جگہ
پر تھے۔ وہ کہتا ہے۔ جی ہاں تھا۔ ہماری عدالت میں
چلے جاؤ۔ چور کو پولیس والے عین سیندھ کے اوپر سے
پکڑ کر لاتے ہیں اور جج پوچھتا ہے۔ تم وہاں تھے تو وہ
کہتا ہے۔ مَیں تو اس محلہ میں تھا ہی نہیں۔ وہ پوچھتا ہے
تم کہاں تھے۔ وہ کہتا ہے۔ مَیں تو فلاں شہر میں تھا۔ پھر
وہ پوچھتا ہے۔ اسے پولیس نے تم کو وہاں سے نہیں پکڑا۔
وہ کہتا ہے جھوٹ ہے۔ ان کو مجھ سے فلاں پُرانی عداوت
تھی اس کی وجہ سے یہ مجھے پکڑ کر لے آئے ہیں۔ غرض
شروع سے لیکر آخر تک جھوٹ ہی جھوٹ چلتا ہے اور
وہاں گو مجرم اپنے بچاؤ کی بھی کوشش کرتا ہے۔ ٹرک
TRICK بھی کرتا ہے۔ لیکن غیر ضروری ٹرک TRICK
نہیں کرتا۔ اور یہاں غیر ضروری جھوٹ بولا جاتا ہے مثلاً
چوری کے ساتھ اس امر کا کوئی تعلق نہیں کہ اُس نے اُس
وقت کالا کوٹ پہنا ہُوا تھا یا لال۔ لیکن اگر وہ کہینگے
کہ کالا کوٹ پہنا ہُوا تھا تو یہ کہیگا نہیں مَیں نے تو لال
پہنا ہُوا تھا۔ یا مثلاً وہ کہہ دیں گے کہ تمہارے ہاتھ میں
چھڑی تھی۔ اب اس کا چوری کے ساتھ کوئی تعلق نہیں
لیکن یہ کہے گا۔ نہیں میرے ہاتھ میں چھڑی نہیں تھی۔ میرے
ہاتھ میں قرآن تھا۔ غرض یہ غیر ضروری جھوٹ جس کا مقدمہ
کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہوتا وہ بھی یہ بولتا ہے اور
ہر بات میں اُن کی تردید کرتا چلا جائیگا اور کہے گا یہ نہیں
تھا وہ تھا۔ لیکن یورپ میں چلے جاؤ تو سو میں سے ننانوے
باتیں ملزم مان لیگا۔ کوئی ایک اپنی جان بچانے کیلئے ٹرک
TRICK بھی کر جائیگا۔ لیکن باقی سب باتوں کے متعلق
کہے گا کہ ٹھیک ہیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس کا
کچھ نہ کچھ باعث آجکل کی اخلاقی حالت بھی ہے۔ جن
لوگوں کے سامنے آجکل مقدمات پیش ہوتے ہیں وہ بیچ کی

قیمت نہیں سمجھتے وہ خیال کرتے ہیں کہ اس نے جتنا سچ بولا ہے مجبوراً بولا ہے ورنہ اَور سچ ابھی اس کے پیچھے ہے۔ مثلاً ایک شخص نے دوسرے کو تھپڑ مار دیا۔ وہ کہتا ہے مَیں نے تھپڑ اس لئے مارا تھا کہ مجھے اشتعال آگیا تھا۔ لیکن اب بجائے اس کے کہ جج اس کی قدر کرے اور کہے کہ اس نے سچ بولا ہے وہ کہتا ہے کہ اس نے ضرور پانچ تھپڑ مارے ہونگے۔ صرف ایک تھپڑ کا اس نے اقرار کیا ہے۔ غرض جھوٹ دنیا میں اتنا سرایت کر گیا ہے کہ کیا جج اور کیا وکیل اور کیا دوسرے لوگ یہ نہیں سمجھتے کہ کوئی شخص سو فیصدی بھی سچ بول سکتا ہے۔ چونکہ اُن کا اپنا ماحول ایسا ہوتا ہے کہ اُن کے دوست اور رشتہ دار جھوٹ بولتے ہیں اس لئے اگر اُن کے سامنے کوئی سچ بولے تو اس کی بھی قدر نہیں کی جاتی۔ وہ سمجھتے ہیں کہ جھوٹ لوگ ضرور بولتے ہیں اس لئے اس نے بھی کچھ نہ کچھ جھوٹ ضرور بولا ہوگا۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے۔ کہ سچ بولنے والا گھبرا جاتا ہے اور گھبرا کر وہ خود بھی جھوٹ بولنے لگ جاتا ہے۔ لیکن مومن کو یہ نہیں دیکھنا چاہیئے کہ اُس کے گرد و پیش کے لوگ کیا کہتے ہیں۔ بلکہ اُسے یہ دیکھنا چاہیئے کہ خدا کیا کہتا ہے۔ آخر ایمان کے کچھ نہ کچھ معنے تو ہونے چاہئیں۔ جب ایک شخص ایمان کی وجہ سے ساری دُنیا سے لڑائی جھگڑا کرتا ہے فساد مول لیتا ہے تو اس کے کچھ معنے تو ہونے چاہئیں۔ اور ایمان کے کم سے کم معنے یہ ہیں کہ ایک انسان یہ فیصلہ کرتا ہے کہ اُسے خدا دوسری چیزوں سے مقدم ہے۔ اب جن چیزوں کو وہ مؤخر قرار دیتا ہے اگر اُن کو مقدم کرنے لگ جائے تو اس کا ایمان کہاں باقی رہا۔ ایک طرف خدا کہتا ہے کہ سچ بولو۔ اور دوسری طرف اس کے ساتھی کہتے ہیں کہ جھوٹ بولو۔ چاہے وہ مُنہ سے کہیں یا عمل سے دنیا میں دونوں طریق ہوتے ہیں۔ کبھی انسان دوسرے کو کہتا ہے کہ جھوٹ بولو اور کبھی دوسرا جھوٹ بولتا ہے تو اُسے منع نہیں کرتا۔ اور اس طرح جھوٹ کی تائید کرنے والا بن جاتا ہے۔ بہرحال خدا کا منشاء یہ ہے کہ ہم سچ بولیں۔ اب اگر ہم جھوٹ بولیں اور سچائی کو چھپائیں تو ہماری نگاہ میں خدا کی کوئی قدر نہ رہی۔ یا یوں کہو کہ ہم خدا کی بادشاہت کو قائم کرنے کی بجائے شیطان کی بادشاہت کو دنیا میں قائم کرنے والے بن جائیں گے۔ خدا کی بادشاہت تو اسی صورت میں قائم ہو سکتی ہے جب سچی گواہی دیتے وقت انسان نہ اپنے باپ سے ڈرے نہ اپنے بیٹے سے ڈرے۔ نہ ماں سے ڈرے نہ بھائی سے ڈرے نہ دوست سے ڈرے اور نہ کسی اَور رشتہ دار سے ڈرے۔ ایک باپ اگر جھوٹ کی جرأت کرتا ہے تو اسی لئے کہ وہ سمجھتا ہے میرا بیٹا میری تائید کریگا یا میری بیوی میری تائید کرے گی۔ لیکن اگر عدالت میں معاملہ پیش ہو اور بیٹا کہے کہ یہ ہیں تو میرے باپ لیکن انہوں نے یہ بات کی ہے۔ بیوی کہے کہ یہ ہیں تو میرے خاوند لیکن انہوں نے یہ بات کی ہے۔ تو دوسرے ہی دن وہ جھوٹ چھوڑ دیگا۔ وہ اگر جھوٹ بولتا ہے تو اس لئے کہ وہ سمجھتا ہے اس کے افعال پر پردہ پڑا رہیگا۔ بھائی اس لئے جھوٹ بولتا ہے کہ دوسرا بھائی اُس کی ہاں میں ہاں ملا دیگا۔ بیٹا اس لئے جھوٹ بولتا ہے کہ وہ سمجھتا ہے میرا باپ میری تائید کرے گا۔ خاوند اس لئے جھوٹ بولتا ہے کہ وہ سمجھتا ہے میری بیوی میرے عیب کو چھپائیگی۔ اور میری تصدیق کریگی بیوی اگر جھوٹ بولتی ہے تو اس لئے کہ وہ سمجھتی ہے میرا خاوند میرا ساتھ دیگا۔ لیکن اگر وہ سچے مسلمان ہوں تو باپ کے خلاف بیٹا گواہی دینے کے لئے کھڑا ہو جائیگا۔ اور خاوند کے خلاف بیوی گواہی دینے کیلئے کھڑی ہو جائیگی اور وہ بالکل گھبرا جائیگا۔ اور کہیگا ایسی حالت میں میرا جھوٹ بولنا بے فائدہ ہے اور اس رُوح کا اپنے اندر قائم کرنا کوئی بڑی بات نہیں۔ اگر ہر بچہ ہر بوڑھا ہر جوان ہر مرد اور ہر عورت یہ عہد کرلے کہ مَیں نے سچ بولنا ہے چاہے

اس کے نتیجہ میں میں کسی مقدمہ میں پھنس جاؤں یا پھانسی پر چڑھ جاؤں تو تھوڑے دنوں میں ہی تم اپنے اندر ایک عظیم الشان تغیر محسوس کرنے لگو گے - یہ مت خیال کرو کہ سچ بولنے پر پھانسی ملتی ہے - جو شخص سچ بولنے والا ہو وہ ایسے کام ہی نہیں کرتا جن کے نتیجہ میں اُسے پھانسی ملے لیکن جھوٹ بولنے والا سمجھتا ہے کہ اگر میں نے جھوٹ بولا تو شائد بچ جاؤں، اس لئے وہ دلیری سے ایسے افعال میں مبتلا ہو جاتا ہے جن کا نتیجہ بعض دفعہ نہایت خطرناک ہوتا ہے اور یا پھر سچ بولنے والا اُس وقت پھانسی چڑھتا ہے جب وہ سمجھتا ہے کہ اب میرا مذہبی فرض ہے کہ میں اپنی جان پیش کر دوں - پھر وہ دلیری کے ساتھ جاتا ہے اور کہتا ہے کہ مجھے بے شک پھانسی دے دو -

غرض سچائی ایک بڑی اہمیت رکھنے والی چیز ہے - انبیاء نے اس پر خاص زور دیا ہے اور انسانی اخلاق کا یہ ایک بنیادی حصہ ہے - مگر آجکل سیاسی اور قومی مفاد کی خاطر جھوٹ کو جھوٹ سمجھا ہی نہیں جاتا - بلکہ اُسے ایک نہایت ضروری چیز قرار دیا جاتا ہے - حالانکہ جھوٹ فطرت کے خلاف ہے جھوٹ اس چیز کا نام ہے کہ کان نے جو کچھ سُنا ہو اس کے متعلق کہہ دیا جائے کہ میں نے نہیں سُنا - آنکھ نے جو کچھ دیکھا ہو اُس کے متعلق کہہ دیا جائے کہ میں نے نہیں دیکھا - ہاتھ نے ایک چیز اٹھائی ہو لیکن انسان یہ کہدے کہ میرے ہاتھ نے فلاں چیز نہیں اٹھائی - ایک شخص کے پاؤں ایک طرف چلیں لیکن وہ کہدے کہ میرے پاؤں اس طرف نہیں چلے - گویا انسان غیر کی نہیں اپنی تردید کرتا ہے - اور اس سے زیادہ فطرت کے خلاف اور کیا چیز ہو گی - شُبہ اس چیز میں ہو سکتا ہے جس میں قیاس کا دخل ہو - حواس خمسہ کے افعال پر شبہ نہیں کیا جا سکتا - اور حواس خمسہ کے افعال کے خلاف بات کہنے کو جھوٹ کہتے ہیں - جو شخص حواس خمسہ کی تردید کرتا ہے وہ گویا اپنی زبان - ہاتھ - پاؤں ناک اور کان کی تردید کرتا ہے اور پھر وہ اس میں سب سے زیادہ لذت محسوس کرتا ہے کہ وہ اپنے خلاف آپ گواہی دے رہا ہے - ایک انسان کے ہاتھ ایک چیز کو پکڑتے ہیں اور وہ کہتا ہے میں نے فلاں چیز نہیں پکڑی تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے ہاتھوں کو کہتا ہے تم نے فلاں چیز نہیں پکڑی - ایک چیز اس کی زبان چکھتی ہے لیکن وہ کہتا ہے - میں نے فلاں چیز نہیں چکھی - تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی زبان سے کہتا ہے کہ تم نے فلاں چیز نہیں چکھی یا اس کے کان ایک بات سُنتے ہیں اور وہ اس کا انکار کر دیتا ہے - تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے کانوں سے کہتا ہے کہ تم نے فلاں بات نہیں سُنی - اب یہ کتنی مضحکہ خیز اور عجیب بات ہے - مگر لوگ اس کی پرواہ نہیں کرتے اور موقعہ آنے پر جھوٹ بول دیتے ہیں - اور اگر ایک جھوٹ بولے تو دوسرا اسکی تائید کرنے لگ جاتا ہے - قاضی کے سامنے معاملہ جائیگا تو بیٹا کہیگا کہ میرا باپ تو وہاں تھا ہی نہیں وہ تو فلاں جگہ تھا - حالانکہ یہ بالکل جھوٹ ہوتا ہے - اسی طرح عورتوں میں بھی جھوٹ کا مرض زیادہ پایا جاتا ہے - بلکہ اُن میں جھوٹ کی عادت مردوں سے بھی زیادہ ہوتی ہے اسی لئے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم بیعت لیتے وقت عورتوں سے یہ عہد لیا کرتے تھے کہ ہم جھوٹے اتہام نہیں باندھینگی (ممتحنہ ع ۲) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عرب عورتوں میں اتہام لگانے کی عام عادت تھی - پھر اُن کے جھوٹ بولنے کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ بچوں کو بھی اس کی عادت پڑ جاتی ہے - وہ سمجھتے ہیں کہ جب ہماری ماں جھوٹ بولتی ہے تو ہم کیوں نہ بولیں - اور پھر وہ ایسے ایسے جھوٹ بولتے ہیں کہ زمین و آسمان کے قلابے ملا دیتے ہیں - کہتے ہیں دو دوست آپس میں اکٹھے ہوئے تو اُن میں سے ایک نے کہا کہ اپنے اپنے خاندان کی کوئی بات سُناؤ -

اِس پر ایک کہنے لگا۔ کہ اب تو وہ بات نہیں رہی۔ ہم تو بڑے رئیس ہؤا کرتے تھے۔ چنانچہ ہمارے نانا کا اتنا بڑا طویلہ تھا کہ جب قحط پڑا کرتا تو سارے شہر کے جانور اُس کے ایک کونے میں سما جاتے تھے۔ دوسرا کہنے لگا ہمارے ناناجان کے پاس ایک ایسا بانس تھا کہ جب کبھی بارش نہ ہوتی تو وہ بانس سے بادلوں کو چھید کر بارش برسا لیتے۔ دوسرے کو غصہ آگیا۔ کہنے لگا تمہارے ناناجان یہ بانس رکھا کہاں کرتے تھے وہ کہنے لگا۔ تمہارے ناناجان کے طویلہ میں۔ آور کہاں؟ اب دیکھو۔ یہ کتنا بڑا جھوٹ ہے جو اُن دونوں نے بولا۔ اِسی طرح مَیں نے ایک دفعہ قصہ پڑھا کہ ایک انگریز کی لڑکی سکول میں داخل ہوئی۔ اُدھر سے ایک حلوائی کی لڑکی بھی داخل ہوئی۔ ایک نے دوسری سے پوچھا کہ تم کون ہو۔ تو حلوائی کی لڑکی کہنے لگی کہ میرے ابا ڈپٹی ہیں۔ دوسری کہنے لگی کہ میرے ابا بڑے بینکر ہیں بساہوکارہ کام ہے اور بیسیوں ہمارے مکان ہیں ایک دفعہ اُس نے اپنی سہیلی کی دعوت کر دی۔ اب بینکر کی لڑکی کے ہاں نوکر تو تھے نہیں۔ اُس نے اپنے بھائی بہنوں کو نوکر بنایا۔ چپڑاسی رکھی۔ بازار سے چائے کے برتن منگوائے اور جب ڈپٹی کی لڑکی آئی تو دونوں طرف سے باتیں ہونے لگیں۔ ابھی یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ ایک ہمسائی آئی۔ جب اس کی نظر دوسری لڑکی پر پڑی تو کہنے لگی۔ یہ تو ہمارے انگریز بھائی کی لڑکی ہے۔ حلوائی کی لڑکی کہنے لگی۔ یہ تو بینکر کی لڑکی ہے۔ وہ کہنے لگی۔ بالکل غلط ہے۔ یہ تو ہمارے محلہ کی فلاں انگریز کی لڑکی ہے اب یہ پاکھنڈ صرف اسلئے بنایا گیا کہ وہ اس کو امیر سمجھے اور یہ اُسکو۔ مگر یاد رکھو۔ سچ کے یہ معنے بھی نہیں کہ آنکھ نے جو کچھ دیکھا ہے وہ تم لوگوں میں بیان کرتے پھرو قرآن کریم نے بعض باتوں کے بیان کرنے سے انسان کو روکا ہے۔ پس اگر کوئی شخص اُن اُمور کو بیان کرتا ہے تو وہ سچ نہیں بولتا بلکہ فتنہ و فساد پھیلاتا ہے۔ سچ کے معنے صرف یہ ہیں کہ اگر تم کوئی بات کہو تو ضرور سچ کہو۔ یہ نہیں کہ تم وہ بات ضرور کہو۔ مثلاً اگر کوئی چور تمہارے پاس راز لینے کے لئے آتا ہے تو تم اس سے کہہ سکتے ہو کہ مَیں نہیں بتاتا۔ جاؤ نکل جاؤ۔ یہ جھوٹ نہیں ہوگا لیکن یہ ضرور جھوٹ ہوگا کہ تم اُسے اصل جگہ چھپا کر دوسری جگہ بتا دو۔ اسی طرح اگر کوئی شخص کسی کا عیب دیکھتا اور اُسے ہر جگہ بیان کرتا پھرتا ہے تو یہ بھی سچ نہیں بلکہ اپنے بغض و کینہ کا اظہار اور غیبت ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک دفعہ صحابہؓ نے پوچھا کہ یارسول اللہ کیا کسی کے متعلق سچی بات کا بیان کرنا بھی غیبت ہے؟ آپؐ نے فرمایا۔ یہی تو غیبت ہے۔ ورنہ اگر وہ سچی بات نہ ہو تو اس کا بیان کرنا غیبت نہیں بلکہ جھوٹ ہے۔ پس سچ بولنے کے یہ معنے نہیں کہ دوسروں کی کمزوریوں کو ہر جگہ بیان کرتے پھرو۔ بلکہ سچ بولنے کے یہ معنے ہیں کہ جب قاضی کے سامنے شہادت کا موقعہ آئے تو بغیر اس بات کا خیال کئے کہ سچا واقعہ بیان کرنے سے تمہارے دوست یا بھائی یا باپ یا بیوی پر کوئی الزام آئیگا۔ تم ہر سوال کا جواب سچ سچ دیدو یہی وجہ ہے کہ شریعت نے حکم دیا ہے کہ گواہی صرف قاضی لے کیونکہ بعض جگہیں ایسی ہوتی ہیں جہاں شریعت کہتی ہے کہ گواہی نہ لو۔ اب اگر گواہی لینے والا قاضی نہ ہو۔ تو ہو سکتا ہے کہ وہ کوئی ایسی بات پوچھ لے جس کے پوچھنے کی شریعت نے اُسے اجازت نہیں دی اور اِس طرح فتنہ پھیل جائے۔ پس سچ کے یہ معنے نہیں کہ جو کچھ تم دیکھو اُسے ضرور بیان کرو اور نہ سچ کے یہ معنے ہیں کہ تم جو کچھ دیکھو اُسے ہر ایک کے سامنے بیان کرو۔ اگر غیر قاضی تم سے سوال کرتا ہے تو تم کہدو۔ مَیں نہیں بتاتا۔ اِسی طرح اگر تم کسی شخص کو کوئی جرم کرتے دیکھتے ہو تو تمہارا اُس پر پردہ ڈال دینا سچ کے خلاف نہیں تمہارا سچ کے خلاف فعل اسوقت متصوّر ہوگا۔ جب

قاضی یا قائم مقام قاضی جسے شریعت نے اپنے دائرہ میں گواہی لینے کا حق دیا ہے۔ تم سے دریافت کرے اور تم سچ نہ بولو۔ لیکن اگر وہ تمہیں گواہی کے لئے نہ بلائے تو خواہ وہ بات درست ہی ہو اُس کا چھپانا سچ کے خلاف نہیں۔ بلکہ اس طرح تم صلح پسند بنتے ہو۔ اور فتنہ و فساد سے اپنے آپ کو اور اپنی قوم کو محفوظ رکھتے ہو۔

(۲) زُور کے دوسرے معنے جیسا کہ اوپر بتایا جا چکا ہے عقل کے ہیں۔ اس لحاظ سے اس آیت کا یہ مفہوم ہوگا۔ کہ رحمٰن کے بندے عقل سے گواہی نہیں دیتے۔ اسکا یہ مطلب نہیں کہ وہ بے عقلی سے گواہی دیتے ہیں۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ واقعات کے مطابق گواہی دیتے ہیں قیاسی گواہی نہیں دیتے۔

(۳) زُور کے تیسرے معنے طاقت کے ہیں۔ اس لحاظ سے اس آیت کے یہ معنے ہونگے کہ رحمٰن کے بندے اپنی طاقت کے گھمنڈ میں غریب آدمی کو ذلیل کرنے کے لئے گواہی نہیں دیتے۔

(۴) زُور کے چوتھے معنے شرک کے ہیں۔ اس لحاظ سے وَالَّذِيْنَ لَا يَشْهَدُوْنَ الزُّوْرَ کے یہ معنے ہونگے کہ رحمٰن کے بندے شرک کی مجالس میں نہیں جاتے۔

(۵) زُور کے پانچویں معنے مَجْلِسُ الْغِنَاءِ یعنی گانے بجانے کی مجلس کے ہیں۔ اس لحاظ سے اس آیت کے یہ معنے ہیں کہ رحمٰن کے بندے گانے بجانے کی مجلس میں نہیں جاتے تاکہ اُس کے زہریلے اثرات سے وہ محفوظ رہیں اور خدا تعالیٰ سے غافل ہوکر ہوا و ہوس کے پیچھے نہ چل پڑیں اسی بناء پر مَیں نے اپنی جماعت کو یہ ہدایت کی ہے کہ وہ سینما نہ دیکھا کرے۔ کیونکہ اس میں بھی گانا بجانا ہوتا ہے جو انسانی قلب کو خدا تعالیٰ کی طرف سے غافل کر دیتا ہے پہلے یہ چیز تھیئٹر میں ہُوا کرتی تھی۔ لیکن جب سے ٹاکی نکل آئی ہے سینما میں بھی یہ چیزیں آگئی ہیں بلکہ تھیئٹر سے زیادہ وسیع پیمانہ پر آئی ہیں۔ کیونکہ تھیئٹر کا ہر ایک شو ہوتا تھا۔ جس میں بڑے بڑے ماہرِ فن گویّوں کو بلانا بہت بڑے اخراجات کا متقاضی ہوتا تھا جس کو وہ برداشت نہیں کر سکتے تھے اور پھر ایک شو صرف ایک جگہ ہی دکھایا جا سکتا تھا۔ مگر اب ایک شو سے ہزاروں فلمیں تیار کرکے سارے ملک میں پھیلا دی جاتی ہیں اور بڑے بڑے ماہرِ فن گویّوں اور موسیقاروں کو بلایا جاتا ہے۔ اس لئے تھیئٹر سے سینما کا ضرر بہت زیادہ ہوتا ہے۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے بھی فرمایا ہے کہ گانا بجانا اور باجے وغیرہ یہ سب شیطان کے ہتھیار ہیں۔ جن سے وہ لوگوں کو بہکاتا ہے۔ مگر افسوس ہے کہ مسلمانوں نے اللہ تعالیٰ کی اس واضح ہدایت کو بھلا دیا اور وہ اپنی طاقت کے زمانہ میں ملک لیوں میں مشغول ہو گئے۔ جس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ آخر انہیں اپنی حکومت سے ہاتھ دھونا پڑا۔ خلافتِ عباسیہ تباہ ہوئی تو محض گانے بجانے کی وجہ سے۔ ہلاکو خاں اپنے لاؤ لشکر کے ساتھ منزلوں پر منزلیں طے کرتا ہُوا بغداد کی طرف بڑھا چلا آ رہا تھا اور معتصم باللہ ناچ گانے میں مشغول تھا اور بار بار کہتا تھا کہ تم گانے والیوں کو بلاؤ۔ بغداد پر کوئی حملہ نہیں کر سکتا۔ جو حملہ کریگا وہ خود تباہ ہو جائیگا۔ لیکن ہلاکو خاں نے پہنچتے ہی سب سے پہلے بادشاہ کو قتل کروایا پھر اُس کے ولیعہد کو قتل کیا اور پھر بغداد پر حملہ کرکے اُس کی اینٹ سے اینٹ بجا دی اور اٹھارہ لاکھ آدمی قتل کر دئے۔ اسی طرح مغلیہ حکومت کی تباہی بھی گانے بجانے کی وجہ سے ہی ہوئی۔ محمد شاہ رنگیلے کو رنگیلا اسی لئے کہا جاتا ہے کہ وہ گانے بجانے کا بہت شوقین تھا۔ بہادر شاہ جو ہندوستان کا آخری مغل بادشاہ تھا۔ وہ بھی اسی گانے بجانے کی وجہ سے تباہ ہُوا۔ انگریزوں کی فوجیں کلکتہ سے بڑھ رہی تھیں۔ الٰہ آباد سے بڑھ رہی تھیں۔ کانپور سے بڑھ رہی تھیں۔ میرٹھ سے بڑھ رہی تھیں۔ سہارنپور سے بڑھ رہی تھیں اور

بادشاہ کے دربار میں گانا بجانا ہو رہا تھا - آخر انگریزوں نے اُس کے بارہ بیٹوں کے سر کاٹ کر اور خوان میں لگا کر اُس کی طرف بھیجے اور کہا کہ یہ آپ کا تحفہ ہے - اندلس کی حکومت بھی گانے بجانے کی وجہ سے تباہ ہوئی - مصر کی حکومت بھی گانے بجانے کی وجہ سے تباہ ہوئی - مصر پر صلاح الدین ایوبی نے حملہ کیا تو فاطمی بادشاہ اُسوقت گانے بجانے میں ہی مشغول تھا مگر اتنی بڑی تباہی دیکھنے کے باوجود مسلمانوں کو اب بھی یہی شوق ہے کہ سینما دیکھیں اور گانا بجانا سُنیں اور وہ اپنی تاریخ سے کوئی عبرت حاصل نہیں کرتے - حالانکہ قرآن کریم نے وَالَّذِيْنَ لَا يَشْهَدُوْنَ الزُّوْرَ میں بتا دیا ہے کہ اگر مسلمان عباد الرحمٰن بننا چاہتے ہیں تو اُن کا اوّلین فرض یہ ہے کہ وہ گانے بجانے کی مجالس کو ترک کریں - اور خدائے واحد سے لَو لگائیں - اگر وہ ایسا کریں گے تو کامیاب ہو جائیں گے - اور اگر نہیں کرینگے تو اس کے تباہ کن نتائج سے وہ محفوظ نہیں رہ سکیں گے -

پھر فرماتا ہے - وَاِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا - عباد الرحمٰن کی ایک یہ بھی علامت ہے کہ جب وہ لغو باتوں کے پاس سے گذرتے ہیں تو دنیوی لذات سے متأثر ہو کر اُن میں شامل نہیں ہو جاتے - جیسے مسیح کی امت ذکر الٰہی کو بھول کر ناچ گانے اور موسیقی میں مشغول ہو گئی بلکہ وہ اپنے نفس پر قابو رکھتے ہوئے اُن میں شامل ہوئے بغیر بزرگانہ طور پر وہاں سے گذر جاتے ہیں اور دنیوی لذات پر رضاء الٰہی کو مقدم رکھتے ہیں -

میرے نزدیک موجودہ زمانہ میں جو لغویات پائی جاتی ہیں اُن میں سب سے مقدم سینما ہے جو قومی اخلاق کے لئے ایک نہایت ہی مہلک اور تباہ کن چیز ہے اور تمدنی لحاظ سے بھی ملکی امن کیلئے خطرہ کا موجب ہے - مَیں نے کچھ عرصہ ہوا فرانس کے متعلق پڑھا کہ وہاں کئی گاؤں صرف اس لئے ویران ہو گئے کہ لوگ سینما کے شوق میں گاؤں چھوڑ چھوڑ کر شہروں میں آ کر آباد ہو گئے تھے - اور گورنمنٹ کو فکر پڑ گئی کہ اِس رَو کو کِس طرح روکا جائے - اِس میں کوئی شبہ نہیں کہ سینما اپنی ذات میں بُرا نہیں مگر اِس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ اس کا بُرے طور پر استعمال کر کے اِس زمانہ میں اسے انتہائی طور پر نقصان رساں اور تباہ کن بنا دیا گیا ہے - ورنہ اگر کوئی شخص ہمالیہ پہاڑ کے نظاروں کی فلم تیار کرے اور وہاں کی برف اور درخت اور چشمے وغیرہ لوگوں کو دکھائے جائیں - اُس کی چٹانوں اور غاروں اور چوٹیوں کا نظارہ پیش کیا جائے اور اس میں کسی قسم کا باجا یا گانا نہ ہو - تو چونکہ یہ چیز علمی ترقی کا موجب ہوگی اس لئے یہ جائز ہوگی - اِسی طرح اگر کوئی فلم کلی طور پر تبلیغی ہو یا تعلیمی ہو اور اُس میں گانے بجانے یا تماشہ کا شائبہ تک نہ ہو تو اس کے دیکھنے کی بھی ہم اجازت دے دینگے - اِسی طرح تربیتی یا جنگی اداروں کی طرف سے جو خالص علمی تصاویر آتی ہیں جن میں جنگلوں دریاؤں کے نظارے یا کارخانوں کے نقشے یا لڑائی کے مختلف مناظر ہوتے ہیں وہ بھی دیکھے جا سکتے ہیں - کیونکہ اُن کے دیکھنے سے علمی ترقی ہوتی ہے یا بعض صنعتی یا زرعی تصویریں ہوتی ہیں جن میں کسانوں کو کھیتی باڑی کے طریق سکھائے جاتے ہیں فصلوں کو تباہ کرنے والی بیماریوں کے علاج بتائے جاتے ہیں - زراعت کے نئے نئے آلات سے روشناس کیا جاتا ہے عمدہ بیج اور اُن کی پیداوار دکھائی جاتی ہے - ایسی چیزیں لغو میں شامل نہیں کیونکہ اُن کے دیکھنے سے علمی لحاظ سے انسان کو ایک نئی روشنی حاصل ہوتی ہے اور اس کا تجربہ ترقی کرتا ہے اور وہ بھی اپنی تجارت یا صنعت یا زراعت کو زمانہ کی دوڑ کے ساتھ ساتھ بڑھانے اور ترقی دینے کے وسائل اختیار کر سکتا ہے - لیکن جھوٹی فلم خواہ جغرافیائی ہو خواہ تاریخی ناجائز ہے - مثلاً نپولین کی جنگوں کی کوئی شخص فلم بنائے تو یہ جھوٹی ہوگی اور باوجود نام نہاد تاریخی فلم ہونے کے ناجائز ہوگی - جغرافیائی اور تاریخی فلم سے مراد محض

سچی فلم ہے جھوٹی فلم مُراد نہیں۔ بہرحال سنیما کی وہ فلمیں جو آجکل تمام بڑے بڑے شہروں میں دکھائی جاتی ہیں اور جن میں ناچ بھی ہوتا ہے اور گانا بجانا بھی ہوتا ہے یہ ایک بدترین لعنت ہے جس نے سینکڑوں شریف گھرانوں کے لوگوں کو گویا اور سینکڑوں شریف خاندانوں کی عورتوں کو ناچنے والی بنا دیا ہے۔ میں چونکہ ادبی رسائل وغیرہ دیکھتا رہتا ہوں میں نے دیکھا ہے کہ سنیما کے شوقین اور اس سے تعلق رکھنے والے نوجوانوں کے مضامین میں عموماً ایک تمسخر ہوتا ہے اور اُن کے اخلاق اور اُن کا مذاق ایسا گندہ ہوتا ہے کہ حیرت آتی ہے سینما والوں کی غرض تو محض روپیہ کمانا ہوتی ہے نہ کہ لوگوں کو اخلاق سکھانا۔ اور وہ روپیہ کمانے کے لئے ایسے لغو اور بے ہودہ افسانے اور گانے پیش کرتے ہیں کہ جو اخلاق کو سخت خراب کرنے والے ہوتے ہیں اور شرفاء جب انکو دیکھنے جاتے ہیں تو اُن کا اپنا مذاق بھی بگڑتا ہے اور اُن کے بچوں اور عورتوں کا بھی مذاق بگڑ جاتا ہے جن کو وہ سنیما دکھانے کیلئے ساتھ لے جاتے ہیں۔ یا جن کو واپس آکر وہاں کے نقشے سناتے ہیں۔ غرض سنیما ملک کے اخلاق پر ایسا تباہ کن اثر ڈال رہے ہیں کہ میں سمجھتا ہوں اگر میری طرف سے ممانعت نہ ہوتی تب بھی ہر سچے اور مخلص مومن کی رُوح اس سے اجتناب کرتی۔ بعض احمدی پوچھتے ہیں کہ انگریزی فلموں میں تو کوئی لغو بات نہیں ہوتی۔ اُن کو دیکھنے کی اجازت دی جائے۔ حالانکہ کوئی انگریزی فلم ایسی نہیں ہوتی جس میں گانا بجانا نہ ہو اور گانا بجانا اسلام میں سخت منع ہے اور قرآن کریم کی اس آیت سے پتہ لگتا ہے کہ انسان خدا تعالیٰ کا بندہ ہی نہیں بن سکتا جب تک وہ گانے بجانے کی مجلسوں سے الگ نہ ہو۔

دوسری چیز جو لغویات میں امتیازی مقام رکھتی ہے قمار بازی ہے۔ آجکل قمار بازی یورپ اور امریکہ کے لوگوں کا نہ صرف محبوب مشغلہ ہے بلکہ اُن کے تمدّن کا ایک جزو لاینفک ہوگیا ہے۔ زندگی کے ہر شعبہ میں جوئے کا کسی نہ کسی صورت میں دخل ہے۔ معمولی طریق کا جوا تو بعد طعام کے بعد اُن کا ایک معمول ہے۔ لیکن اس کے علاوہ لاٹریوں کی وہ کثرت ہے کہ یوں کہنا چاہیئے کہ تجارت کا کام بھی ایک چوتھائی حصہ جوئے کی نذر ہو رہا ہے۔ ادنیٰ سے لیکر اعلیٰ تک سب لوگ جوا کھیلتے ہیں۔ اور کبھی کبھی نہیں قریباً روزانہ اور جوئے کی کلبیں شاید سب کلبوں سے زیادہ امیر ہیں۔ اٹلی کی کلب مانٹی کارلو میں جو امراء کے جوئے کا مقام ہے بعض اوقات ایک ایک دن میں کروڑوں روپیہ بعض لوگوں کے ہاتھوں سے نکل کر بعض دوسرے ہاتھوں میں چلا جاتا ہے۔ غرض اس قدر جوئے کی کثرت ہے کہ یہ کہنا نادرست نہ ہوگا کہ تمدّنِ جدید میں سے جوئے کو نکال کر اس قدر عظیم الشان خلاء پیدا ہو جاتا ہے کہ اُسے کسی اور چیز سے پُر نہیں کیا جا سکتا۔ حالانکہ جُوا ایسی خطرناک چیز ہے کہ اس کا عادی انسان بعض دفعہ آدھ گھنٹہ کے جُوا کی خاطر اپنی ساری جائیداد برباد کر دیتا ہے۔ اور اگر جیتتا ہے تو اور ہزاروں گھروں کی بربادی کا موجب بن کر۔ پھر جوئے باز میں روپیہ کو لٹانے کی عادت لازمی طور پر پیدا ہو جاتی ہے۔ شاید ہی کوئی جوئے باز ایسا ہوگا جو اپنے روپیہ کو سنبھال کر رکھتا ہو۔ بالعموم سارے جوئے باز بے پرواہی سے اپنا مال لٹا دیتے ہیں کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ روپیہ کمانے کے لئے انہیں زیادہ جدوجہد نہیں کرنی پڑے گی۔ گویا ایک طرف تو وہ دوسرے لوگوں کو برباد کرتے ہیں اور دوسری طرف خود اپنے مال سے بھی صحیح رنگ میں فائدہ نہیں اٹھاتے۔ کیونکہ روپیہ کمانے کے لئے انہیں کوئی محنت نہیں کرنی پڑتی۔ پھر جُوا عقل اور فکر کو بھی کمزور کر دیتا ہے اور جوئے باز ہار جیت کے خیال سے ایسی چیزوں کے برباد کرنے کے لئے بھی تیار ہو جاتا ہے جنہیں کوئی دوسرا

عقلمند تباہ کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔ پُرانے زمانہ کی ہندو تاریخ سے پتہ لگتا ہے کہ حضرت کرشنؑ کے پھوپھی زاد بھائی یدھشٹر نے اپنی بیوی تک جُوئے میں ہار دی تھی۔ پس یہ ایک لغو چیز ہے جس سے اجتناب کرنا چاہیئے۔

تیسری چیز جو موجودہ زمانہ کے لحاظ سے لغو میں شامل ہے وہ ناچ ہے۔ انگریزوں میں کسی زمانہ میں ناچ بہت بُرا سمجھا جاتا تھا۔ مگر آہستہ آہستہ لوگوں نے اسے اختیار کرنا شروع کر دیا۔ پہلے عورت اور مرد صرف ہاتھ پکڑ کر ناچتے تھے۔ پھر سینہ کی طرف سینہ کرکے ناچنے لگے پھر یہ سلسلہ اَور بڑھا اور درمیانی فاصلہ تین انگشت تک آگیا۔ اب بہت جگہ پر یہ بھی اڑ گیا ہے۔ قرآن کریم نے وَلَا يَضْرِبْنَ بِأَرْجُلِهِنَّ لِيُعْلَمَ مَا يُخْفِينَ مِنْ زِينَتِهِنَّ (نور ع ۴) میں عورتوں کے لئے اپنے پیروں کو اس طرح زمین پر مار کر چلنے سے بھی منع فرمایا ہے جس سے اُن کی زینت کا اظہار ہو۔ اور ناچ میں تو زینت کے اخفاء کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ پس ناچ بھی مال اور اخلاق کو تباہ کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔ دنیا میں ایسے ایسے لوگ پائے جاتے ہیں جو کنچنیوں کے ایک ایک ناچ پر اپنی ساری جائیدادیں دے دیتے ہیں۔ ایسے لوگ پائے جاتے ہیں جو ڈوموں کے لطیفوں پر اپنے قیمتی اموال لٹا دیتے ہیں۔ پس گانے کی طرح ہر قسم کا ناچ بھی ایک لعنت ہے۔ جس سے نوجوانوں کے اخلاق بگڑتے اور قوم کے اموال تباہ ہوتے ہیں۔

چوتھی چیز جو لغویات میں شامل ہے اور جس کا ترک کرنا نہایت ضروری ہے وہ حُقّہ ہے۔ لوگ پہلے تو اسکو اِس لئے شروع کرتے ہیں کہ اس سے قبض کھل جاتی ہے۔ مگر پھر اُن کی ایسی حالت ہو جاتی ہے کہ پاخانہ میں بیٹھ کر تین تین دفعہ چلمیں بھرواتے ہیں تب انہیں اجابت ہوتی ہے۔ پھر حقّہ پینے والوں کو ہمیشہ گلے اور سینہ کی خرابی اور کھانسی کا عارضہ لاحق رہتا ہے۔ کیونکہ جو چیز جسم کو سُن کر دیتی ہے وہ آخر میں اعصاب کو ڈھیلا اور کمزور کر دیتی ہے اور کئی امراض کا موجب بن جاتی ہے مگر اس زمانہ میں حُقّہ اور سگریٹ کا اسقدر رواج ہے کہ اکثر نوجوان بلکہ بچے بھی اس میں مبتلا دیکھے جاتے ہیں۔ مگر چونکہ یہ ایک نشہ آور چیز ہے اس لئے رفتہ رفتہ وہ اس کے اسقدر عادی ہو جاتے ہیں کہ اگر ضرورت محسوس ہونے پر انہیں حقّہ یا سگریٹ یا نسوار وغیرہ نہ ملے تو وہ پاگلوں کی طرح دوڑے پھرتے ہیں۔

مجھے یاد ہے۔ ہم ایک دفعہ پہاڑ پر جا رہے تھے تو میرے ساتھیوں میں ایک احمدی پٹھان بھی تھے جنہیں نسوار کھانے کی عادت تھی مگر بدقسمتی سے وہ اپنی ڈبیا گھر میں بھول آئے تھے۔ راستہ میں ایک کشمیری مزدور آ رہا تھا جس نے اپنے کندھے پر لکڑیاں اٹھائی ہوئی تھیں وہ اُسے دیکھتے ہی نہایت لجاجت کے ساتھ کہنے لگے اے بھائی کشمیری۔ اے بھائی کشمیری جی۔ اے بھائی جی۔ آپ کے پاس نسوار ہے۔ مجھے یہ بات سُن کر بے اختیار ہنسی آگئی۔ کہ جو شخص تکبّر کی وجہ سے اپنی گردن بھی نیچی نہیں کرتا تھا آج نشہ پُورا نہ ہونے کی وجہ سے کس قدر لجاجت پر اُتر آیا ہے۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زمانہ میں جو دوست باہر سے آپ کی ملاقات کے لئے آتے تھے اُن میں سے بعض لوگ حُقّہ کے بھی عادی ہوتے تھے۔ اُن دنوں قادیان میں اَور تو کسی جگہ حُقّہ نہیں ہوتا تھا صرف ہمارے ایک تایا کے پاس ہُوا کرتا تھا جو سخت دہریہ اور دین سے بے تعلق تھے۔ مگر حقّہ کی عادت کی وجہ سے وہ اُن کے پاس بھی چلے جاتے اور انہیں مجبوراً اُن کی باتیں سُننی پڑتیں۔ ہمارے یہ تایا دین سے ایسے بے تعلق تھے کہ ایک دفعہ حضرت خلیفۃ اوّل رضی اللہ عنہ نے اُن سے پُوچھا کہ آپ نے کبھی نماز بھی پڑھی ہے۔ وہ کہنے لگے میں تو بچپن ہی

بڑا سلیم الطبع واقعہ ہُوا ہوں ۔ مَیں چھوٹی عمر میں ہی جب دیکھتا کہ لوگوں نے سر نیچے اور سرین اوپر کئے ہوئے ہیں ۔ تو مَیں ہنستا کہ یہ کیسے بے وقوف لوگ ہیں ۔ اور اَب تو مَیں بہت سمجھدار ہوں ۔ مَیں نے نماز کیا پڑھنی ہے ۔ ایک دوست نے سُنایا کہ ایک دفعہ ایک احمدی وہاں حُقّہ پینے کے لئے چلا گیا اور تھوڑی دیر کے بعد اپنے آپ کو گالیاں دیتے ہوئے واپس آ گیا ۔ کسی دوست نے پوچھا کہ کیا بات ہے ۔ وہ کہنے لگا کہ مَیں اپنے آپ کو اِس لئے بُرا بھلا کہہ رہا ہوں کہ محض حُقّہ کی عادت کی وجہ سے مجھے اِس کے پاس جانا پڑا اور حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے خلاف باتیں سُننی پڑیں ۔ اگر مجھے یہ بُری عادت نہ ہوتی تو مَیں اِس کے پاس کیوں جاتا اور اپنے آقا کے خلاف اس کے مُنہ سے کیوں باتیں سُنتا ۔

غرض حُقّہ بھی لغویات میں شامل ہے جس کو چھوڑنے کی کوشش کرنی چاہیئے ۔ اور اگر کوئی شخص خود نہ چھوڑ سکے تو اُسے کم از کم یہ کوشش ضرور کرنی چاہیئے کہ اُسکی اگلی نسل اس بدی سے محفوظ رہے اور اُس کی عمر کے خاتمہ کے ساتھ اِس لغو فعل کا بھی اُس کے خاندان میں خاتمہ ہو جائے ۔

پھر لغویات میں بے کار بیٹھ کر گپیں ہانکنا اور دوسروں سے بے تعلق باتیں پُوچھتے رہنا بھی شامل ہے ۔ ہمارے ملک میں یہ ایک عام نقص ہے کہ مرد بھی اور عورتیں بھی دوسروں سے ایسی باتیں پُوچھتے ہیں جن کا اُن کی ذات کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہوتا ۔ مثلاً عورت بلا وجہ دوسری سے پوچھتی رہتی ہے ۔ کہ یہ کپڑا کتنے کا لیا ۔ یہ زیور کہاں سے بنوایا اور جب تک اُس کی ساری ہسٹری معلوم نہ کر لے اُسے چین ہی نہیں آتا ۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام سُنایا کرتے تھے کہ ایک عورت نے انگوٹھی بنوائی ۔ لیکن کسی اَور عورت نے اُس کی طرف توجہ نہ کی ۔ اُس نے تنگ آ کر اپنے گھر کو آگ لگا دی ۔ لوگوں نے پُوچھا کہ کچھ بچا بھی ہے ۔ اُس نے انگوٹھی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ سوائے اس انگوٹھی کے اَور کچھ نہیں بچا ۔ ایک عورت نے کہا ۔ بہن تم نے یہ انگوٹھی کب بنوائی تھی ۔ یہ تو بہت خوبصورت ہے ۔ وہ کہنے لگی ۔ اگر یہی بات تم پہلے پُوچھ لیتیں تو میرا گھر کیوں جلتا ۔ اِسی طرح مرد السلام علیکم کہنے کے بعد ہی پوچھنے لگ جاتے ہیں کہ کہاں سے آئے ہو؟ کہاں جاؤ گے؟ کیا کام ہے؟ آمدنی کیا ہے؟ کتنے بچے ہیں؟ شادی شدہ ہیں یا غیر شادی شدہ؟ حالانکہ اُسکا اِن معاملات سے کوئی تعلق نہیں ہوتا ۔ انگریزوں میں یہ کبھی نہیں ہوتا کہ وہ ایک دوسرے سے بلا وجہ پُوچھیں کہ کہاں ملازم ہو؟ تعلیم کتنی ہے؟ تنخواہ کیا ملتی ہے؟ وہ کبھی کُرید کُرید کر دوسرے کے غیر متعلق حالات معلوم کرنے کی کوشش نہیں کرتے ۔ مگر ہمارے ہاں اِسکو بڑا کارنامہ سمجھا جاتا ہے ۔ حالانکہ جن لوگوں کو بڑی بڑی باتوں کا خیال ہوتا ہے اُنہیں چھوٹی باتوں کی طرف توجہ کرنے کی فرصت ہی نہیں ملتی ۔ اگر لوگوں کو دین کا فکر ہو اور انہیں معلوم ہو کہ اسلام آج کن مصیبتوں میں گھرا ہُوا ہے اور اُسکی اشاعت کے لئے کتنی بڑی قربانیوں کی ضرورت ہے تو اُنہیں لغو کاموں اور لغو باتوں کا خیال بھی پیدا نہ ہو ۔ اگر کسی کے گھر میں آگ لگ جائے تو وہ بیٹھ کر گپیں مارنے نہیں لگ جاتا بلکہ دیوانہ وار دوڑتا اور آگ کو بجھانے کی کوشش کرتا ہے ۔ اِسی طرح اگر مسلمان غور کریں اور اُن کی روحانی آنکھ کھلی ہو تو انہیں معلوم ہو کہ آج کفر اور ایمان کی ایک بڑی بھاری جنگ لڑی جا رہی ہے ۔ شیطان اپنے تمام ہتھیاروں سمیت میدان میں اُترا ہُوا ہے اور رحمٰن خدا کا لشکر بھی کفر کی سرکوبی کے لئے کھڑا ہے ۔ اور دونوں لشکروں میں آخری جنگ جاری ہے جس میں ابلیس کا سر ہمیشہ کیلئے کچلا جائیگا

وَالَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوْا

اور وہ لوگ بھی کہ اُن کے رب کی آیات جب انہیں یاد دلائی جائیں تو اُن سے

عَلَيْهَا صُمًّا وَّعُمْيَانًا ﴿۷۴﴾

بہروں اور اندھوں کا معاملہ نہیں کرتے ۳۴؎

اگر ایسے نازک وقت میں بھی انہوں نے لغویات کو ترک نہ کیا اور اپنے فرائض کو سمجھنے کی کوشش نہ کی تو اُن سے زیادہ بدقسمت اور کون ہوگا۔

۳۴؎ **حل لغات**:- يَخِرُّوْا: خَرَّ کے معنے ہوتے ہیں سَقَطَ سُقُوْطًا بِمَا يُسْمَعُ مِنْهُ خَرِيْرٌ۔ ایسے طور پر گرنا کہ اُس سے آواز سُنائی دے وَالْخَرِيْرُ يُقَالُ بِصَوْتِ الْمَاءِ وَالرِّيْحِ وَغَيْرِ ذٰلِكَ مِمَّا يَسْقُطُ مِنْ عُلُوٍّ اور خریر اُس آواز کو کہتے ہیں جو کسی چیز کے اوپر سے گرنے سے یا ہوا اور پانی کے چلنے سے پیدا ہو۔ وَقَوْلُهٗ خَرُّوْا سُجَّدًا فَاسْتِعْمَالُ الْخَرِّ تَنْبِيْهٌ عَلٰى اِجْتِمَاعِ اَمْرَيْنِ۔ اَلسُّقُوْطُ وَحُصُوْلُ الصَّوْتِ مِنْهُمْ بِالتَّسْبِيْحِ۔ اور قرآن کریم میں جو خَرُّوْا سُجَّدًا کے الفاظ آتے ہیں تو اِس سے دو باتوں کی طرف اشارہ ہے۔ اوّل گرنا دوم تسبیح کرنے کی وجہ سے آواز کا پیدا ہونا (مفردات) اور خَرَّ قَوْمٌ مِنْ بَنِیْ فُلَانٍ کے معنے ہوتے ہیں هَجَمُوْا عَلَيْهَا مِنْ مَكَانٍ لَا يُعْرَفُ قوم نے کسی نامعلوم جگہ کی طرف سے حملہ کر دیا ہے (اقرب)

عُمْيَانًا: عُمْيَانٌ اَعْمٰى کی جمع ہے اور اَعْمٰی کے معنے اندھے کے ہیں (اقرب)

تفسیر:- فرماتا ہے رحمٰن کے بندوں کی ایک یہ بھی علامت ہے کہ جب اُن کے سامنے اُن کے رب کی آیات کا ذکر کیا جائے تو وہ اُن کی طرف بہرے اور اندھے ہو کر توجہ نہیں کرتے بلکہ کان اور آنکھیں کھول کر آیات الٰہیہ کو سُنتے اور روحانی بصیرت کے ساتھ اُن سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔

اِس آیت کے متعلق علامہ ابوحیان صاحب بحرِ محیط لکھتے ہیں کہ لَمْ يَخِرُّوْا میں جو نفی استعمال کی گئی ہے اُس کا تعلق صُمًّا وَّعُمْيَانًا کے ساتھ ہے يَخِرُّوْا کے ساتھ نہیں ہے۔ اور یہ طریق کلامِ عربی زبان میں عام مستعمل ہے مثلاً کہتے ہیں لَمْ يَخْرُجْ زَيْدٌ اِلَى الْحَرْبِ جَزِعًا یعنی زید جنگ کے لئے جزع فزع کرتے اور بزدلی کا اظہار کرتے ہوئے نہیں نکلا۔ اور مراد یہ ہوتی ہے کہ اِنَّمَا خَرَجَ جَرِيْئًا وہ بڑی دلیری اور بہادری کے ساتھ نکلا ہے۔ اِسی طرح اِس آیت کے یہ معنے نہیں کہ عباد الرحمٰن کو جب اللہ تعالیٰ کی آیات یاد دلائی جاتی ہیں تو وہ اُس کے حضور عاجزی اور مسکنت کے ساتھ نہیں گرتے۔ بلکہ صرف بہرے اور اندھے ہونے کی حالت میں گرنے کی نفی کی گئی ہے اور مراد یہ ہے کہ اِذَا ذُكِّرُوْا بِهَا اَكَبُّوْا عَلَيْهَا حِرْصًا عَلَى اسْتِمَاعِهَا وَاَقْبَلُوْا عَلَى الْمُذَكِّرِ بِهَا بِاٰذَانٍ وَّاعِيَةٍ وَّاَعْيُنٍ رَّاعِيَةٍ بِخِلَافِ غَيْرِهِمْ مِنَ الْمُنَافِقِيْنَ وَاَشْبَاهِهِمْ۔ یعنی جب انہیں خدا تعالیٰ کی آیات یاد دلائی جائیں تو وہ اُن کے سُننے کے شوق میں اُن کی طرف جُھکے چلے جاتے ہیں اور اُن نشانات کی طرف جن کے ذریعہ انہیں نصیحت کی جاتی ہے کان کھول کر اور اپنی آنکھوں کو کھلا رکھ کر توجہ کرتے ہیں بخلاف کافروں اور منافقوں کے طریق کے جو بہرے کان اور اندھی آنکھیں رکھتے ہیں یعنی نہ تو وہ کسی نصیحت کی کسی بات سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور نہ کوئی نشان اُنکی بند آنکھوں کو

کھولنے کا موجب بنتا ہے ۔ یہ عباد الرحمٰن کی وہی خوبی ہے جو قرآن کریم کی اس آیت میں بیان کی گئی ہے ۔ کہ اِنَّمَا یُؤْمِنُ بِاٰیٰتِنَا الَّذِیْنَ اِذَا ذُکِّرُوْا بِهَا خَرُّوْا سُجَّدًا وَّ سَبَّحُوْا بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَ هُمْ لَا یَسْتَکْبِرُوْنَ (سجدہ ع ۲) یعنی ہماری آیتوں پر وہی لوگ سچا ایمان رکھتے ہیں کہ جب انہیں آیاتِ الٰہیہ کے متعلق توجہ دلائی جائے تو وہ سجدہ کرتے ہوئے زمین پر گر جاتے ہیں ۔ اور اپنے رب کی تعریف اور تسبیح کرتے ہیں اور تکبّر سے کام نہیں لیتے ۔ اسکے مقابلہ میں کفار کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ۔ وَ اِذَا ذُکِّرُوْا لَا یَذْکُرُوْنَ وَ اِذَا رَاَوْا اٰیَةً یَّسْتَسْخِرُوْنَ (صافات ع) کہ جب انہیں کوئی نصیحت کی جاتی ہے تو وہ نصیحت حاصل نہیں کرتے اور جب کوئی نشان دیکھتے ہیں تو اُس کی ہنسی اُڑاتے ہیں ۔ گویا وہ کانوں سے بھی بہرے ہوتے ہیں اور آنکھوں سے بھی اندھے ہوتے ہیں ۔ نہ نصیحت کی بات سنکر وہ کوئی فائدہ اٹھاتے ہیں اور نہ اللہ تعالیٰ کا نشان دیکھ کر کوئی عبرت حاصل کرتے ہیں غرض سچے مومنوں کی آنکھیں بھی کھلی ہوتی ہیں اور اُن کے کان بھی کھلے ہوتے ہیں ۔ وہ خدا تعالیٰ کی باتوں کو پوری توجہ سے سُنتے ہیں اور پھر اُن سے فائدہ اٹھانے کے لئے اُسی وقت عمل پر آمادہ ہو جاتے ہیں ۔ مگر ان معنوں کے علاوہ قرآن کریم کی اس آیت میں اس طرف بھی توجہ دلائی گئی ہے کہ عباد الرحمٰن کے سامنے جب اُن کے ربّ کی آیات بیان کی جاتی ہیں تو وہ انہیں اندھا دھند نہیں مانتے بلکہ سوچ سمجھکر اور دلائل کے ساتھ مانتے ہیں ۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ ایک اور مقام پر اسی حقیقت کا ذکر کرتے ہوئے فرماتا ہے ۔ اَدْعُوْٓا اِلَی اللّٰهِ عَلٰی بَصِیْرَةٍ اَنَا وَ مَنِ اتَّبَعَنِیْ (یوسف ع ۱۲) یعنی اے ہمارے رسول اپنے منکروں سے کہدو کہ میں اللہ تعالیٰ کی طرف علیٰ وجہ البصیرت بُلاتا ہوں اور میں اور میرے متبع کسی بے دلیل بات کو نہیں مانتے بلکہ سوچ سمجھ کر اور دلائلِ قطعیہ کی بنا پر جو شک و شبہ سے بالا ہوتے ہیں ایمان لاتے ہیں ۔ اسی وجہ سے قرآن کریم نے بے دلیل ماننے والوں کو بار بار ملزم قرار دیا ہے جیسے سورۂ نجم میں فرماتا ہے ۔ اِنْ هِیَ اِلَّآ اَسْمَآءٌ سَمَّیْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَ اٰبَآؤُکُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطَانٍ اِنْ یَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَ مَا تَهْوَی الْاَنْفُسُ (نجم ع ۱) یعنی یہ تو صرف چند نام ہیں جو تم لوگوں نے اور تمہارے باپ دادوں نے خود ہی رکھ لئے ہیں خدا تعالےٰ نے اِس کی کوئی دلیل بیان نہیں کی ۔ یہ لوگ صرف اپنے اوہام کی یا اپنی نفسانی خواہشات کی پیروی کر رہے ہیں ۔ اِس آیت سے ظاہر ہے کہ قرآن کریم دشمنانِ اسلام پر یہ اعتراض کرتا ہے کہ وہ اُن بے دلیل باتوں کو جن کے لئے نہ آسمانی شہادت ہوتی ہے نہ عقلی مانتے ہیں اور اپنی نفسانی خواہشات کی پیروی کرتے ہیں ۔ اور وہمی باتوں کے پیچھے چلتے ہیں ۔

اِسی طرح قرآن کریم کی متعدد آیات میں اس امر پر زور دیا گیا ہے کہ ایمان دلائل اور براہین پر مبنی ہونا چاہیئے نہ کہ وہم اور گمان پر ۔ چنانچہ سورۂ احقاف میں اللہ تعالےٰ فرماتا ہے ۔ قُلْ اَرَءَیْتُمْ مَّا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَرُوْنِیْ مَاذَا خَلَقُوْا مِنَ الْاَرْضِ اَمْ لَهُمْ شِرْکٌ فِی السَّمٰوٰتِ ط اِیْتُوْنِیْ بِکِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ هٰذَآ اَوْ اَثٰرَةٍ مِّنْ عِلْمٍ اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ (احقاف ع ۱) یعنی مجھے بتاؤ تو سہی کہ خدا کے سوا جن وجودوں کو تم پکارتے ہو کیا اُن میں کوئی حقیقت بھی ہے ؟ اگر ہے تو مجھے بتاؤ کہ انہوں نے زمین میں سے کس چیز کو پیدا کیا ہے ؟ یا یہ ثابت کرو کہ آسمانی بادشاہت میں اِن کا کوئی حصّہ ہے ۔ اگر تم سچے ہو تو اِس کے لئے یا تو قرآن سے پہلے کسی آسمانی کتاب سے دلیل پیش کرو یا اپنے باپ دادا کی بتائی ہوئی کسی علمی بات کو ہی

پیش کرو۔ یعنی تمہارے شرکیہ مسائل نہ تو کسی آسمانی کتاب سے ثابت ہیں نہ کسی علمی دلیل سے ثابت ہوسکتے ہیں۔ پھر ان پر ایمان لانا کس طرح جائز ہوسکتا ہے؟ اسی طرح فرماتا ہے اَمْ اَنْزَلْنَا عَلَيْهِمْ سُلْطَانًا فَهُوَ يَتَكَلَّمُ بِمَا كَانُوْا بِهٖ يُشْرِكُوْنَ (روم ع۴) یعنی کیا اللہ تعالیٰ کے شریک قرار دینے کی کوئی دلیل بھی ہے جو اللہ تعالیٰ نے مہیا کی ہو۔ اور وہ مشرک کی صداقت پر گواہ ہو۔ اگر ایسا نہیں تو پھر بے دلیل بات کو یہ لوگ کس طرح مان رہے ہیں۔ اسی طرح فرماتا ہے۔ قُلْ هَلْ عِنْدَكُمْ مِّنْ عِلْمٍ فَتُخْرِجُوْهُ لَنَا اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ اَنْتُمْ اِلَّا تَخْرُصُوْنَ ۝ قُلْ فَلِلّٰهِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ۔ (انعام ع۱۸) یعنی کفار سے کہہ دو کہ کیا تمہارے پاس اپنے دعاوی کی کوئی دلیل بھی ہے جسے تم ہمارے سامنے پیش کرسکو۔ تمہارے پاس ہرگز کوئی دلیل نہیں بلکہ تم صرف وہم کی پیروی کرتے ہو اور ڈھکوسلے مار رہے ہو۔ پھر فرماتا ہے کہ اے ہمارے رسول ان سے یہ بھی کہو کہ اللہ تو وہ باتیں اپنے بندوں سے منواتا ہے جن کے دلائل مکمل طور پر موجود ہوتے ہیں۔ پس جو بات بلا ثبوت ہو وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہیں ہوسکتی۔ اسی طرح ایک اور مقام پر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ قَدْ جَآءَكُمْ بَصَآئِرُ مِنْ رَّبِّكُمْ فَمَنْ اَبْصَرَ فَلِنَفْسِهٖ وَمَنْ عَمِيَ فَعَلَيْهَا (انعام ع۱۳) یعنی تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے کھلے کھلے دلائل آچکے ہیں۔ اب جو شخص ان دلائل کو دیکھے گا وہ فائدہ اٹھالیگا۔ اور جو نہیں دیکھے گا وہ نقصان اٹھائیگا۔

ان آیات سے ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسی ایمان کو حقیقی ایمان قرار دیا ہے جس کی بصیرت پر بنیاد ہو اور جسے کھلی آنکھوں اور کھلے کانوں کے ساتھ اختیار کیا گیا ہو۔ اگر کوئی شخص بغیر تحقیق کے کسی بات کو مان لیتا ہے اور حقیقی شعور اسے حاصل نہیں ہوتا۔ تو قرآنی اصطلاح میں وہ ایمان کا دعویٰ کرنے کے باوجود بھی اندھا اور بہرہ ہوتا ہے کیونکہ نہ تو اُسے دین پر ثبات حاصل ہوتا ہے اور نہ خدا تعالیٰ کے قرب کی برکات سے اُسے کوئی حصّہ ملتا ہے۔

اسی طرح لَمْ يَخِرُّوْا عَلَيْهَا صُمًّا وَّعُمْيَانًا کے ایک یہ بھی معنے ہیں کہ جب انہیں خدا تعالیٰ کی آیات یاد دلائی جائیں تو وہ اس کلام کے ذریعہ اُس طرح ٹھوکریں نہیں کھاتے جس طرح منافق اور کافر ٹھوکریں کھاتے ہیں۔ منافقوں کی تو یہ کیفیت ہوتی ہے کہ جب غزوۂ احزاب کے موقعہ پر عرب کے تمام قبائل مدینہ پر لشکر لے کر آگئے تو انہوں نے یہ کہنا شروع کردیا کہ مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اِلَّا غُرُوْرًا (احزاب ع۲) یعنی خدا اور اس کے رسول نے ہم سے کامیابی کا ایک جھوٹا وعدہ کیا تھا۔ لیکن جب مومنوں نے حملہ آور لشکروں کو دیکھا تو وہ اپنے ایمان اور یقین میں اَور بھی بڑھ گئے اور انہوں نے کہا کہ هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَصَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ (احزاب ع۳) یعنی یہ تو وہ لشکر ہیں جن کا اللہ اور اُس کے رسول نے ہم سے وعدہ کیا تھا اور اللہ اور اُس کے رسول نے بالکل سچ کہا تھا۔ گویا خدا تعالیٰ کی ایک عظیم الشان پیشگوئی کے پورا ہونے پر منافق تو ٹھوکر کھا گئے اور مومن اپنے ایمان اور اطاعت میں اور بھی بڑھ گئے۔ اسی طرح جب بھی کوئی نشان خدا تعالیٰ اپنے دین کی تائید کے لئے ظاہر کرتا ہے تو منافق جو اپنے دلوں میں بغض و حسد کی آگ لئے ہوئے ہوتے ہیں وہ تو اُن نشانات سے فائدہ اٹھانے کی بجائے ہنسی اور تمسخر میں مشغول ہوجاتے ہیں۔ اور اُن نشانات کی قدر وقیمت کو کم کرنے کے لئے ہاتھ پاؤں مارتے ہیں۔ لیکن مومنوں کی یہ کیفیت ہوتی ہے

کہ وہ خدائی نشانات کے ظہور پر اپنے دل کے کانوں کو اِس طرح کھول دیتے ہیں کہ الٰہی نور اُن میں پہلے سے بھی زیادہ زور سے داخل ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ اور اپنی روحانی بینائی میں ایسی تیزی پیدا کرتے ہیں کہ خدا تعالیٰ کی معرفت اور اُس کی محبت کے میدان میں وہ پہلے سے بھی آگے نکل جاتے ہیں۔ منافقوں کے متعلق اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں ایک اَور مقام پر وضاحتاً فرمایا ہے کہ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ فَاَصَمَّهُمْ وَاَعْمٰٓى اَبْصَارَهُمْ (سورۂ محمد ع ۳) یہی وہ لوگ ہیں جن پر اللہ نے لعنت کی ہے اور اُس نے اُن کے کانوں کو بہرہ اور ان کی آنکھوں کو اندھا کر دیا ہے۔ یعنی باوجود اس کے کہ خدا تعالیٰ کے نشانات بارش کی طرح برس رہے ہیں اور قرآن کریم کے ذریعہ دُنیا کو زندہ کیا جا رہا ہے۔ بدی کی جگہ نیکی نے اور فسق و فجور کی جگہ تقوٰی و طہارت نے اور ظلم و ستم کی جگہ عدالت و انصاف نے اور بے مروّتی کی جگہ وفا اور اخلاص نے لے لی ہے پھر بھی یہ منافق اپنی شرارتوں سے باز نہیں آتے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کی روحانی آنکھیں بند ہیں اور ان کے روحانی کان بھی بند ہیں۔ اگر ان کے کان کھلے ہوتے تو اللہ تعالیٰ کی آیات پر تدبّر کر کے یہ لوگ ہدایت پا سکتے تھے۔ اور اگر ان کی آنکھیں کھلی ہوتیں تو یہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات اور نشانات دیکھ کر اپنی شرارتوں سے توبہ کر سکتے تھے۔ مگر ان لوگوں نے ہدایت کے ان دونوں رستوں کو بند کر رکھا ہے۔ اس لئے مسلمانوں میں شامل ہونے کے باوجود ان لوگوں پر خدا تعالیٰ کی لعنت برس رہی ہے بڑے سے بڑا نشان بھی ان کے سامنے ظاہر ہو تو وہ اس طرح پیٹھ پھیر کر چلے جاتے ہیں کہ گویا کوئی بات ہی نہیں ہوئی اور اپنی منافقت میں اَور بھی بڑھ جاتے ہیں۔ مگر مومنوں کی یہ کیفیت نہیں ہوتی۔ اُن کی آنکھیں

خدا تعالیٰ کے حضور اُس کے نشانات دیکھ کر جھک جاتی ہیں اور اُن کے کان خدا تعالیٰ کی باتیں سُننے کیلئے ہمہ تن تیار رہتے ہیں۔ اسلام کی طرف سے جب بھی کوئی آواز اُٹھتی ہے وہ اُسے بہرے کانوں کے ساتھ نہیں سُنتے بلکہ یوں معلوم ہوتا ہے کہ وہ پہلے سے ہی بیتابی سے خدائی ہدایت کے منتظر تھے۔ اور جب ان کی آنکھیں کسی نشان کو دیکھتی ہیں تو وہ اس سے مونہہ نہیں پھیرتے بلکہ اس نشان کو اپنے دل میں جگہ دیتے اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہیں جس نے انہیں اپنے نشانات کے ذریعہ اپنی ہستی کا ثبوت دیا۔ غرض سچا مومن خدا تعالیٰ کی آیات کے ظہور پر اَور بھی خدا تعالیٰ کے قریب ہو جاتا ہے۔ مگر کافر اور منافق اپنے کفر اور نفاق میں ترقی کر جاتا اور اس کا پچھلا حال پہلے سے بھی بدتر ہو جاتا ہے۔

مگر یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ اسجگہ آیات الٰہیہ سے صرف قرآنی آیات یا اللہ تعالیٰ کے نشانات ہی مراد نہیں بلکہ وہ تمام ربّانی علماء اور مصلحین اُمت جن کا کام خدا تعالیٰ کی بھولی بھٹکی مخلوق کو راہِ راست پر لانا اور انہیں صراطِ مستقیم پر قائم کرنا ہے اُن کا وجود بھی آیاتِ الٰہیہ میں ہی شامل ہے۔ جیسے قرآن کریم نے حضرت مسیحؑ ناصری اور اُن کی والدہ حضرت مریم صدیقہؑ کے متعلق فرمایا۔ وَجَعَلْنَا ابْنَ مَرْيَمَ وَاُمَّهٗٓ اٰيَةً (سورۂ مومنون ع ۳) کہ ہم نے مسیحؑ ناصری اور اُن کی والدہ کو دنیا کے لئے ایک آیت بنا دیا تھا۔ اور يَخِرُّوْا کے معنے جیسا کہ حل لغات میں بتایا جا چکا ہے صرف جھکنے اور گرنے کے نہیں بلکہ حملہ کرنے کے بھی ہیں۔ پس وَالَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوْا عَلَيْهَا صُمًّا وَّعُمْيَانًا میں اس طرف بھی توجہ دلائی گئی ہے کہ غلبہ اور اقتدار کی حالت میں بھی عباد الرحمٰن کو جب اللہ تعالیٰ کے کسی مامور یا مصلح یا مجدد کے ذریعہ

وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَ

اور وہ لوگ بھی (رحمٰن کے بندے ہیں) جو یہ کہتے رہتے ہیں کہ اے ہمارے رب ہم کو ہماری بیویوں کی طرف سے اور

ذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْيُنٍ وَّ اجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا ﴿٧٥﴾

اولاد کی طرف سے آنکھوں کی ٹھنڈک عطا فرما اور ہمیں متقیوں کا امام بنا -

اُولٰٓئِكَ يُجْزَوْنَ الْغُرْفَةَ بِمَا صَبَرُوْا وَيُلَقَّوْنَ

یہ وہ لوگ ہیں جن کو اُن کے نیکی پر قائم رہنے کی وجہ سے (بہشت میں) بالا خانے دیئے جائیں گے اور انکو

فِيْهَا تَحِيَّةً وَّ سَلٰمًا ﴿٧٦﴾ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا حَسُنَتْ

اُس میں دُعائیں دی جائیں گی اور سلامتی کے پیغام پہنچائے جائیں گے - وہ اُن میں رہتے چلے جائیں گے -

مُسْتَقَرًّا وَّ مُقَامًا ﴿٧٧﴾

وہ (یعنی جنت) عارضی قرار گاہ کے طور پر بھی بڑی اچھی ہے اور مستقل قرار گاہ کے طور پر بھی (بڑی اچھی ہے) ٣٥ھ

الْاِمَامُ ١ الْغُرْفَةُ ٢ صَبَرُوْا ٣

اُن کی خامیوں کی طرف توجہ دلائی جائے تو وہ اپنی طاقت کے گھمنڈ میں اندھے اور بہرے ہو کر اُن پر حملہ نہیں کر دیتے جیسے بدقسمتی سے بعض مسلمان بادشاہوں نے اولیاء اُمت سے ناروا سلوک کیا اور اُن پر بڑے بڑے مظالم توڑے بلکہ وہ فوراً اپنی اصلاح کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں اور اپنی خامیوں کو دُور کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ یہ نہیں دیکھتے کہ فوج اور طاقت ہمارے ہاتھ میں ہے۔ اور یہ ہمیں نصیحت کرنے والا ایک معمولی فرد ہے - بلکہ وہ اس نقطۂ نگاہ سے اُس کی آواز پر کان دھرتے ہیں کہ یہ ہمارے خدا کا ایلچی ہے اور اگر ہم نے اس کی آواز پر کان نہ دھرا تو ہماری دنیا بھی تباہ ہو گی اور ہماری عاقبت بھی برباد ہو گی۔ گویا دنیا کے بادشاہ ہونے کے باوجود خدا تعالیٰ کے پاک بندے اُس کے در کے بھکاری اور اُس کی آواز پر لبیک کہنے والے ہوتے ہیں اور کبر اور رعونت کا کوئی شائبہ تک اُن کے دلوں میں نہیں پایا جاتا -

٣٥ھ حل لغات :- اَلْاِمَامُ - مَنْ يُؤْتَمُّ بِهٖ اَیْ يُقْتَدٰى بِهٖ - یعنی امام اس شخص کو کہتے ہیں جس کی پیروی کی جائے - (اقرب)

اَلْغُرْفَةُ : اَلْعُلِّيَّةُ - غرفہ کے معنے عمارت کے اوپر کے حصّہ یعنی بالا خانہ کے ہوتے ہیں (اقرب)۔ نیز اس کے معنے ہیں اَلسَّمَاوٰتُ السَّابِعَةُ - ساتواں آسمان (اقرب)

صَبَرُوْا - صَبْرٌ کے معنے ہیں تركُ الشكوٰى من الم البلاء لغير الله لا الى الله - یعنی مصیبت کا شکوہ خدا تعالیٰ کے سوا کسی اور کے پاس نہ کرنا - فَاِذَا دَعَا اللّٰهَ الْعَبْدُ فِیْ كَشْفِ الضُّرِّ لَا يُقْدَحُ فِیْ صَبْرِهٖ - اگر بندہ اپنی رفع مصیبت کے لئے خدا تعالیٰ کے پاس فریاد کرے تو یہ امر اسکے صبر کے منافی نہیں سمجھا جا سکتا

کلیات ابی البقاء میں لکھا ہے۔ کہ اَلصَّبْرُ فِی الْمُصِیْبَۃِ۔ صبر مصیبت کے وقت ہوتا ہے۔ وَصَبْرُ الرَّجُلِ عَلَی الْاَمْرِ نَقِیْضُ جَزَعٍ ای جَرَءَ وَشَجُعَ وَتَجَلَّدَ اور صبر جزع فزع کرنے کے مقابل کا لفظ ہے اور صبر کے معنے ہوتے ہیں جرأت اور ہمت دکھائی۔ اور صَبَرَ عَنِ الشَّیْءِ کے معنے ہیں اَمْسَکَ عَنْہُ کسی چیز سے رُکا رہا۔ اور جب صَبَرَ کا مفعول دَآبَّۃ کا لفظ ہو تو اس کے معنے ہوتے ہیں حَبَسَھَا بِلَا عَلَفٍ جانور کو چارہ نہ دیا۔ اور صَبَرْتُ نَفْسِیْ عَنْ کَذَا کے معنے ہوتے ہیں حَبَسْتُھَا میں نے فلاں بات پر ثابت قدمی دکھائی۔ گویا جب صبر کا صلہ علیٰ آئے تو اس کے معنے کسی امر پر ثابت قدم رہنے کے ہوتے ہیں۔ اور جب اس کا صلہ عن ہو تو اس کے معنے کسی چیز سے رُکنے یا کسی کو اُس سے روک دینے کے ہوتے ہیں (اقرب) تاج العروس میں لکھا ہے۔ کہ مصنف بصائر کے نزدیک صَبْرٌ کے لغوی معنے روکنے اور رُکنے کے ہیں۔ اور جب ہم کہتے ہیں کہ فلاں نے صبر کیا تو اس کے معنے ہوتے ہیں حَبَسَ النَّفْسَ عَنِ الْجَزَعِ وَحَبَسَ اللِّسَانَ عَنِ الشَّکْوٰی وَحَبَسَ الْجَوَارِحَ عَنِ التَّشْوِیْشِ۔ یعنی جزع فزع سے رُکنا۔ زبان سے شکوہ نہ کرنا اور اپنے اعضاء سے کسی قسم کی گھبراہٹ کا اظہار نہ ہونے دینا۔ پس صبر کے معنے برائیوں سے رُکے رہنے اور نیکیوں پر مضبوطی سے قائم رہنے کے ہیں۔ اسی طرح صبر کے یہ معنے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں کسی تکلیف پر جزع فزع کا اظہار نہ کیا جائے۔ نہ زبان سے نہ اعضاء وجوارح سے اور نہ کسی اَور طریق سے۔

تفسیر:۔ پھر فرماتا ہے۔ رحمٰن کے بندوں کی ایک یہ بھی علامت ہے کہ وہ دُعا کرتے رہتے ہیں کہ اے ہمارے رب ہمیں اپنی بیویوں اور اولادوں کی طرف سے آنکھوں کی ٹھنڈک عطا فرما۔ اور ہمیں متقیوں کا امام بنا۔ افسوس ہے کہ مسلمانوں نے اپنے دورِ اقتدار میں اِس دُعا کو بھی نظر انداز کر دیا اور وہ اپنی آئندہ نسلوں کی تربیت سے غافل ہو گئے۔ جس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ ایک ایک کرکے تمام حکومتیں اُن کے قبضہ سے نکل گئیں اور اغیار نے اُن کے ملکوں پر قبضہ کر لیا۔ اگر مسلمان اپنے دورِ حکومت میں اُن بلند اخلاق کے حامل رہتے جن کا اِس سورۃ میں ذکر کیا گیا ہے اور وہ رات اور دن اللہ تعالیٰ سے یہ دعائیں کرتے رہتے کہ خدایا ہمیں ایسی اولاد عطا فرما جو ہماری آنکھوں کے لئے ٹھنڈک کا موجب ہو۔ اور وہ اپنی آئندہ نسلوں کی نیک تربیت سے کبھی غافل نہ ہوتے تو وہ نالائق بادشاہ اُمّتِ محمدیہ میں کیوں پیدا ہوتے جنہوں نے تخت وتاج کو اپنی عیاشیوں کی نذر کر دیا۔ اور وہ حکومتیں جو اُن کے آباؤ اجداد نے بڑی بڑی قربانیوں کے بعد حاصل کی تھیں اُن کو اپنی بدکرداریوں سے ضائع کر دیا۔ یہ تنزل مسلمانوں پر اس لئے آیا کہ وہ عباد الرحمٰن کے فرائض بھولتے چلے گئے اور جب انہوں نے خدا تعالیٰ کو بُھلا دیا تو خدا بھی انہیں بُھول گیا۔ اور اُس نے انہیں تاج وتخت سے محروم کر دیا۔ بیشک یہ جو کچھ ہُوا نہایت افسوسناک ہے لیکن اگر آئندہ کے لئے ہی مسلمان عبرت حاصل کریں اور اپنی آئندہ نسلوں کی تربیت کی طرف توجّہ کریں اور خدا تعالیٰ سے دُعائیں کرتے رہیں کہ وہ ان کی زندگی میں بھی اور اُن کی موت کے بعد بھی اُن کی نسلوں کو نیکی پر قائم رکھے اور ہمیشہ اُن کا وجود اُن کے لئے آنکھوں کی ٹھنڈک کا موجب بنے تو اب بھی وہ اپنی کھوئی ہوئی متاع کو دوبارہ حاصل کر سکتے ہیں۔ پس انہیں اپنی ہمتوں کو بلند کرنا چاہیئے اور مایوسی کو اپنے قریب بھی نہیں آنے دینا چاہیئے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں بتایا ہے کہ مومن چھوٹی چھوٹی باتوں پر راضی نہیں ہوتا بلکہ وہ لیڈر

اور امام بننے کی دُعا کرتا ہے ۔ مگر کن کا امام المتقیوں کا
امام، غیر متقیوں کا نہیں ۔ ممکن ہے بعض لوگوں کے دلوں
میں یہ خیال پیدا ہو کہ ہر شخص کس طرح لیڈر اور امام
بن سکتا ہے ۔ سو انہیں یاد رکھنا چاہیئے کہ اگر مرد
کوشش کرے کہ میری بیوی دین سے واقف ہو ۔ نماز
روزہ کی پابند ہو ۔ دینی کاموں میں حصّہ لینے والی ہو
بچوں کی نیک تربیت کرنے والی ہو تو مرد امام ہوگا اور
بیوی ماموم ۔ اِسی طرح اگر ماں اپنی اولاد کی اعلےٰ
تربیت کرے تو وہ امام ہوگی اور اولاد ماموم ۔
اور اولاد کے نیک کام بھی اس کی طرف منسوب کئے
جائیں گے ۔ عورت قبر میں سو رہی ہوگی مگر جب اس کے
بچے صبح کی نماز پڑھیں گے تو فرشتے لکھ رہے ہونگے
کہ اس بی بی نے صبح کی نماز پڑھی ۔ اِسی طرح اگر اُس نے
اپنی اولاد کو تہجّد کی عادت ڈالی ہوگی تو فرشتے لکھ
رہے ہونگے کہ اُس نے تہجد کی نماز پڑھی ۔ یہی حال
مردوں کا ہے وہ بھی جتنے لوگوں کی ہدایت کا موجب
بنیں گے ۔ اُن سب کے نیک اعمال کے ثواب میں وہ
بھی شریک ہونگے ۔ اِس طرح وہ امام ہونگے اور
دوسرے لوگ ماموم ۔

غرض اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے
پاک بندے ہمیشہ اپنی آئندہ نسل کی دینی و دنیوی
ترقیات کے لئے دُعائیں کرتے رہتے ہیں تاکہ وہ نورِ ایمان
جو اُن کے دلوں میں پایا جاتا ہے صرف اُن کی ذات تک
محدود نہ رہے بلکہ قیامت تک چلتا چلا جائے اور کوئی
زمانہ بھی ایسا نہ آئے جس میں اُن کی اولاد یا اُن کے متبع
اور شاگرد دنیا داری کی طرف مائل ہو جائیں اور خدا
اور رسول کے احکام پر دنیا کو مقدم کرلیں ۔ قرآن کریم
نے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی ایک بڑی خوبی یہ بیان
فرمائی ہے کہ كَانَ يَأْمُرُ أَهْلَهُ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ
(مریم ع ۴) یعنی وہ اپنے بیوی بچوں اور رشتہ داروں کو
نماز اور زکوٰۃ کی تاکید کیا کرتے تھے تاکہ خدائے واحد
کی حکومت دنیا میں ہمیشہ قائم رہے ۔ اور ہمیشہ کے لئے
نماز اور زکوٰۃ کا سلسلہ جاری رہے ۔ اور یہی ہر مومن
کا کام ہے اور اس کا فرض ہے کہ جہاں وہ اپنی اولاد
کی نیک تربیت سے کبھی غافل نہ ہو وہاں وہ اللہ تعالیٰ
سے دُعائیں بھی کرتا رہے اور خود اُن کا معلّم بنے اور
انہیں اس قابل بنائے کہ وہ ہمیشہ اسلام کا جھنڈا
اونچا رکھیں ۔ اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام
بلند کرتے رہیں ۔

فرماتا ہے أُولٰئِكَ يُجْزَوْنَ الْغُرْفَةَ بِمَا
صَبَرُوْا جو لوگ خدا تعالیٰ کے لئے اس قسم کے نیک
کام کرینگے اور کوشش کرینگے کہ اُن کی آئندہ نسل نیک
ہو ۔ اور وہ رات دن اُن کے لئے دعائیں کرتے رہیں گے
قیامت کے دن ہم اُن کو اُن کے صبر کرنے کی وجہ سے
یعنی اس وجہ سے کہ انہوں نے اپنے نفس کو بدیوں سے
روکا اور اپنی اولاد کی اعلیٰ تربیت کی اور آئندہ نسل
کو نیکی پر قائم کیا اونچے سے اونچے مقامات دیں گے اور
خدا تعالیٰ کی طرف سے انہیں سلامتی کے پیغام پہنچینگے
اور یہ پیغام صرف ایک دفعہ پہنچ کر ختم نہیں ہوجائینگے
بلکہ دائمی طور پر پہنچتے چلے جائیں گے ۔ گویا جس طرح
دنیا میں انہوں نے اپنے بچوں کو جھوٹ سے اور فریب سے
اور گالیوں سے اور چغلخوری سے اور خیانت سے اور
ظلم سے اور فساد سے اور خونریزی سے اور چوری سے
اور بہتان سے اور استہزاء سے اور سُستی سے اور
ناواجب طرفداری سے اور لغویات میں حصّہ لینے
سے اور اسی طرح اور ہزاروں قسم کی بدیوں سے روکا
اور سلامتی پھیلائی اسی طرح جب وہ جنّت میں
جائینگے تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ یہ وہ بندے ہیں

جن سے میرے بندے دنیا میں امن میں رہے۔ اس لئے جاؤ اور انہیں دارالسلام میں داخل کر دو جہاں سلامتی ہی سلامتی ہے۔

پھر غُرْفَة کے ایک معنے جیسا کہ حل لغات میں بتایا جا چکا ہے ساتویں آسمان کے بھی ہیں۔ اس لحاظ سے اس آیت کے یہ معنے ہونگے کہ وہ عباد الرحمٰن جنہوں نے دنیا میں انکسار اور عدل و انصاف کے ساتھ اپنی عمر بسر کی۔ جو دن کے اوقات میں بھی احکام الٰہی کے تابع رہے اور رات کی تاریکیوں میں بھی سجدہ و قیام میں اللہ تعالیٰ کے حضور گڑگڑاتے اور دعائیں کرتے رہے قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اُن کے درجات کو بلند کرتے ہوئے انہیں ساتویں آسمان پر جگہ عنایت فرمائیگا یعنی وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ رکھے جائینگے کیونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام ساتویں آسمان پر ہی ہیں (مسند احمد بن حنبل جلد ۴ صفحہ ۲۰۸ و صفحہ ۲۰۹) اسکی طرف رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں بھی اشارہ فرمایا ہے کہ اِذَا تَوَاضَعَ الْعَبْدُ رَفَعَهُ اللّٰهُ اِلَى السَّمَآءِ السَّابِعَةِ (کنز العمال جلد ۲ صفحہ ۲۵) کہ جب کوئی شخص اللہ تعالیٰ کے لئے تواضع اختیار کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اُسے ساتویں آسمان میں جگہ دیتا ہے چونکہ ان لوگوں نے خدا کے لئے ہون اور تذلّل اختیار کیا ہوگا اس لئے خدا تعالیٰ بھی انہیں سب سے اونچا مقامِ رفعت عطا فرمائیگا اور انہیں منازلِ قرب میں سے سب سے اونچی منزل عطا کی جائیگی۔ مگر چونکہ ان آیات کا تعلق مسلمانوں کے اُس دَور کے ساتھ ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے انہیں دنیا پر حکومت اور غلبہ عطا فرمانا تھا اس لئے اُولٰٓئِكَ يُجْزَوْنَ الْغُرْفَةَ بِمَا صَبَرُوْا فرما کر اللہ تعالیٰ نے اس طرف بھی اشارہ فرمایا ہے کہ خدائے رحمٰن کے وہ پاک بندے جو دنیا پر حکمرانی کرتے وقت اخلاقِ فاضلہ کا ایک مجسّم نمونہ ہونگے۔ جو اپنے نشۂ حکومت میں کمزور اور ناطاقت ممالک پر حملہ نہیں کرینگے۔ اُن کے حقوق کو سلب نہیں کرینگے اور اپنی راتیں بجائے شراب اور ناچ گانے میں بسر کرنے کے عبادت اور ذکرِ الٰہی اور دعاؤں میں بسر کرینگے اور ہمیشہ اللہ تعالیٰ سے یہ دعائیں کرتے رہیں گے کہ وہ انہیں تنزل کا شکار ہونے سے محفوظ رکھے۔ انہیں بداعمالیوں کے جہنم سے بچائے۔ انہیں دین سے غفلت اور لاپرواہی اور خدا تعالیٰ سے دُوری اور اُس سے بے تعلقی کے جہنم سے بچائے۔ اور جو اپنی حکومت کے دوران میں کسی قسم کے اسراف سے کام نہیں لینگے اور قوم کا روپیہ اپنی عیاشیوں میں صرف نہیں کرینگے۔ نہ قومی روپیہ کے خرچ کرنے میں کسی قسم کے بخل سے کام لیں گے۔ یعنی نہ تو وہ روپیہ کا بے محل استعمال کرینگے اور نہ ایسا ہوگا کہ وہ روپیہ تو جمع کرتے رہیں اور قوم بھوک اور افلاس کا شکار رہے اور وہ اس کی ترقی کے لئے سکول اور کالج اور کنوئیں اور شفاخانے اور کارخانے اور ڈاکخانے وغیرہ جاری نہ کریں۔ اسی طرح وہ لوگ جو اپنے دورِ حکومت میں اس بات کی سختی سے نگرانی رکھیں گے کہ توحید کا قیام ہو اور اسلام کی تبلیغ اور اُس کی اشاعت کا کام وسیع پیمانہ پر جاری رہے اور وہ لوگ جو اپنی حکومت کے بل بوتے پر ناجائز خون نہیں بہائیں گے۔ نہ زناکاری کے قریب جائیں گے نہ بالا افسروں کی خوشامد اور اُن کی چاپلوسی کے لئے جھوٹی گواہیاں دیں۔ نہ سینما اور شراب اور جُوا اور حقّہ اور دوسری منشّیات اور لغویات کے قریب جائیں گے۔ اسی طرح وہ لوگ جو اپنی طاقت کے زمانہ میں خدا تعالیٰ کا نام آنے پر لرز جائیں گے۔

قُلْ مَا یَعْبَؤُا بِکُمْ رَبِّیْ لَوْ لَا دُعَآؤُکُمْ ۚ فَقَدْ

(اے رسول) تو ان سے کہدے کہ میرا رب تمہاری پرواہ ہی کیا کرتا ہے اگر تمہاری طرف سے دعا (اور استغفار) نہ ہو پس

کَذَّبْتُمْ فَسَوْفَ یَکُوْنُ لِزَامًا ﴿۷۷﴾ ع

جبکہ تم نے پیغام الٰہی کو جھٹلا دیا تو (اب) اس کا عذاب (تم سے) چمٹا چلا جائیگا ۵۳۶

اور انہیں جب بھی خدا تعالیٰ کا نام لے کر کوئی نصیحت کی جائیگی تو وہ اُسے توجہ سے سُنیں گے اور اپنی کمزوریوں کو دُور کرنے کی کوشش کریں گے ۔ اور وہ لوگ جو ہمیشہ یہ دُعائیں کرتے رہیں گے کہ الٰہی تو نے ہمیں اپنے فضل سے حکومت تو عطا فرما دی ہے ۔ اب ایسا فضل فرما کہ ہماری آئندہ نسل بھی حکومت کی اہل رہے اور وہ بھی تیرے نام کو بلند کرنے والی اور ہماری آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچانے والی ہو ۔ تو اللہ تعالیٰ ایسے پاکباز لوگوں کی اِن اعلیٰ درجہ کی نیکیوں اور دعاؤں کو کبھی ضائع نہیں کریگا ۔ بلکہ انہیں اپنے فضل سے ایسا غلبہ عطا فرمائیگا کہ ساری دنیا اُن کے زیرنگیں ہوجائیگی اور دنیا کا کونہ کونہ خدا تعالیٰ اور اُس کے رسول کے نام سے گونج اُٹھیگا ۔

۵۳۶ حل لغات :- مَا یَعْبَؤُا ۔ عَبَأَ سے منفی کا صیغہ ہے اور عَبَأَ لَهٗ کے معنے ہیں قَصَدَ لَهٗ ۔ اُس کا قصد کیا ۔ اِسی طرح کہتے ہیں مَا عَبَأْتُ بِهٖ شَیْئًا اور مطلب یہ ہوتا ہے کہ لَمْ اَعُدَّہٗ شَیْئًا مَیں اُس کو کسی گنتی میں نہیں لاتا ۔ نیز کہتے ہیں ۔ مَا اَعْبَأُ بِهٖ اور اُس کے معنے ہوتے ہیں ۔ مَا کَانَ لَهٗ عِنْدِیْ وَزْنٌ وَ لَا قَدْرٌ کہ اُس کی میرے ہاں کوئی قدر اور عزت نہیں ۔ اِسی طرح اس کے معنے ہیں مَا اُبَالِیْ ۔ یعنی مَیں اُس کی پرواہ نہیں کرتا (اقرب)

لِزَامًا کے معنے ہیں اَلْمَوْتُ ۔ موت ۔ اَلْحِسَابُ حساب ۔ اَلْمُلَازِمُ جِدًّا ۔ سختی سے چمٹ جانیوالا ۔ اَلْفَصْلُ فِی الْقَضِیَّةِ ۔ مقدمہ کا فیصلہ (اقرب)

تفسیر :- عباد الرحمٰن کی علامات بیان کرنے کے بعد اب اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اے ہمارے رسول تُو ان لوگوں کو میری طرف سے سُنا دے کہ اگر تم میرے ایسے بندے بنو جن کا مَیں نے اوپر ذکر کیا ہے تب تو خدا تعالیٰ کی نگاہ میں تم عزت کے مستحق سمجھے جاؤگے لیکن اگر تمہاری طرف سے دعا اور استغفار کا سلسلہ جاری نہ رہے اور تم خدا تعالیٰ کے حضور جھکنا اور عجز و انکسار اختیار کرنا اپنا شعار نہ بناؤ تو تمہارا رب تمہاری کیا پرواہ کرتا ہے ۔

مَا یَعْبَؤُا بِکُمْ میں مَا نافیہ بھی ہو سکتا ہے اور استفہامیہ بھی ۔ مفہوم دونوں کا ایک ہی رہیگا ۔ گو طرزِ کلام بدل جائیگی ۔ اگر مَا نافیہ ہو تو آیت کے یہ معنے ہوں گے کہ اے ہمارے رسول کہہ دے کہ اگر تم دُعا سے کام نہیں لوگے اور خشوع و خضوع اختیار نہیں کروگے تو اللہ تعالیٰ تمہاری کوئی پرواہ نہیں کریگا اور اگر مَا استفہامیہ قرار دیا جائے تو اس آیت کے معنے یوں ہونگے کہ اے ہمارے رسول ! تو اِن لوگوں سے کہدے کہ اگر تم دعائیں نہیں کروگے اور تضرع سے کام نہیں لوگے تو یاد رکھو کہ اللہ تعالیٰ تمہاری پرواہ ہی کیا کرتا ہے ۔ یعنی اُس کو تمہاری ضرورت ہی کیا ہے ۔ وہ تو خود مستغنی ہے اور سب کی ضرورتیں پوری کرنے

ہے ۔ یعنی صمد ہے ۔

حقیقت یہ ہے کہ انسان اگر اپنی ہستی پر غور کرے تو وہ آسانی سے سمجھ سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اُس کی کوئی احتیاج نہیں بلکہ خود اُسے اللہ تعالیٰ کی ہر آن اور ہر لحظہ احتیاج ہے۔ لیکن بعض لوگ اپنی نادانی سے یہ خیال کر لیتے ہیں کہ ہمارا نماز پڑھنا یا ہمارا صدقہ دینا یا ہمارا زکوٰۃ ادا کرنا یا ہمارا حج کرنا نعوذ باللہ خدا تعالیٰ پر کوئی احسان ہے۔ اِسی وجہ سے جب وہ کسی مصیبت میں گرفتار ہوتے ہیں تو کہتے ہیں۔ معلوم نہیں، خدا نے ہمیں کیوں مصیبت میں ڈالا۔ ہم تو نمازیں بھی پڑھتے ہیں اور روزے بھی رکھتے ہیں اور حج بھی کرتے ہیں اور زکوٰۃ بھی دیتے ہیں اور اسی طرح دوسرے مذہبی احکام پر بھی عمل کرتے ہیں۔ گویا وہ اپنے دل میں یہ محسوس کرتے ہیں کہ خدا تعالیٰ نے اُن سے بدسلوکی کی ہے۔

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام فرمایا کرتے تھے کہ کسی شخص کا بیٹا مر گیا اور اُس کا ایک دوست تعزیت کے لئے اُس کے پاس گیا تو وہ چیخ مار کر رو پڑا۔ اور کہنے لگا خدا نے مجھ پر بڑا بھاری ظلم کیا ہے گویا نعوذ باللہ اُس کا کوئی حق خدا تعالیٰ نے مار لیا تھا جس کا اُسے شکوہ پیدا ہوا۔ مگر سوچنا چاہیئے کہ وہ کونسا حق ہے جو بندہ نے خدا تعالیٰ پر قائم کیا ہے۔ مجھے ہمیشہ تعجب آتا ہے کہ وہ لوگ جو اپنی نماز اور روزہ اور زکوٰۃ اور حج اور تقوٰی وطہارت پر فخر کیا کرتے ہیں وہ تو کسی تکلیف کے موقعہ پر چلّا اُٹھتے ہیں کہ خدا تعالیٰ نے ہم پر ظلم کیا۔ لیکن ہندوستان کا وہ مشہور شاعر جو دین سے بالکل ناواقف تھا ایک سچائی کی گھڑی میں باوجود شراب کا عادی ہونے کے کہہ اٹھا کہ ؎

جان دی ۔ دی ہوئی اُسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

غور کرنا چاہیئے کہ جو چیز بھی انسان کے پاس سے جاتی ہے وہ آئی کہاں سے تھی؟ ذرا اپنی حیثیت کو تو دیکھو۔ وہ کونسی چیز ہے جسے اپنی کہہ سکتے ہو۔ انسان کہتا ہے میری بیوی ہے۔ مگر وہ کہاں سے آئی؟ بچے جنہیں اپنا کہا جاتا ہے کہاں سے آئے ہیں۔ اِسی طرح مکان زمین اور سب ضروری اشیاء جنہیں اپنی سمجھا جاتا ہے کہاں سے آتی ہیں۔ اگر ان چیزوں کی حقیقت پر غور کیا جائے تو بآسانی معلوم ہو جائیگا۔ کہ یہ چیزیں انسان کی نہیں بلکہ خدا تعالیٰ کی طرف سے موہبت اور عطیّہ ہیں اور عطیّہ دینے والے کا حق ہے کہ وہ جب چاہے واپس لے لے بلکہ عطیّہ بھی اُسے کہتے ہیں جو کبھی واپس نہ لیا جائے۔ مگر دنیا میں انسان کو جو کچھ ملتا ہے وہ آخر اُس سے لیا جاتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ دنیا میں انسان کو حقیقی عطیّہ بھی نہیں ملتا۔ بلکہ تمام اشیاء عاریتاً استعمال کیلئے دی جاتی ہیں۔ اور اس طرح چیز دینے والے کا حق ہوتا ہے کہ وہ جب چاہے واپس لے لے۔

اِسی حقیقت کو بیان کرنے کیلئے ایک عرب شاعر کہتا ہے ؎

انت الذی ولدتك اُمّك باكیًا
والنّاس حولك یضحكون سرورا
فاحرص علی عمل تكون اذا بكوا
فی وقتِ موتك ضاحكًا مسرورا

یعنی تو وہی تو ہے کہ جب تو پیدا ہوا تھا تو تو رو رہا تھا کیونکہ ہر بچہ پیدا ہونے کے بعد روتا ہے اور تیرے اردگرد بیٹھے ہوئے لوگ ہنس رہے تھے کہ لڑکا پیدا ہوا ہے۔ پس اب تو ایسے اعمال کے لئے جدوجہد کر کہ جب تو مرنے لگے تو تو ہنس رہا ہو کہ میں اپنے خدا سے نیک بدلے لینے کے لئے جا رہا ہوں اور تیرے اردگرد بیٹھے ہوئے لوگ رو رہے ہوں کہ ایسا اچھا انسان ہم سے

چھینا جا رہا ہے۔

تو خدا تعالیٰ فرماتا ہے مَا یَعْبَؤُا بِکُمْ رَبِّیْ لَوْلَا دُعَآؤُکُمْ۔ تم اپنی ہستی کو کیا سمجھتے ہو؟ آخر انسان ہے کیا چیز کہ خدا تعالیٰ اُس کی پرواہ کرے۔ اگر خدا تعالیٰ نے انسان کو خود ہی بطور احسان اپنی طرف بلانے کا سامان نہ کرتا اور اُسے فرش سے اٹھا کر عرش تک نہ پہنچا دیتا تو اپنی ذات میں وہ کیا حقیقت رکھتا تھا کہ اُسکی طرف توجہ کی جاتی۔ یہ خدا تعالیٰ کا احسان ہی ہے جس نے انسان کو اٹھایا اور اُسے ترقی عطا فرمائی۔ چنانچہ لَوْلَا دُعَآؤُکُمْ کے ایک معنے یہی ہیں کہ لَوْلَا دُعَآؤُہٗ اِیَّاکُمْ اِلٰی طَاعَتِہٖ یعنی اگر اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف سے یہ لازم نہ کر لیا ہوتا۔ کہ مَیں اپنے بندوں کو پکاروں گا اور اُن کی ترقی کے سامان کرونگا تو تم ایک مشتِ خاک سے زیادہ کوئی حقیقت نہ رکھتے تھے یہ محض خدا تعالیٰ کا احسان ہی ہے کہ وہ دنیا کی گمراہی پر اپنا کوئی مامور اور مصلح کھڑا کرتا اور بھٹکتی ہوئی مخلوق کو پھر راہِ راست کی طرف لے آتا ہے۔ وہ اُس کے ذریعہ گری ہوئی قوموں کو عزت دیتا اور گمنامی میں زندگی بسر کرنے والوں کو دنیا کا معلّم اور بادشاہ بنا دیتا ہے۔ اگر اُس نے تمہارے لئے اپنا کلام نازل نہ کرنا ہوتا تو وہ تمہاری اس قدر خاطر و مدارات کیوں کرتا اور تمہارے لئے زمین و آسمان کیوں بناتا۔ پھر تو تمہاری طرف اُسے اسقدر توجہ کرنے کی کوئی ضرورت ہی نہیں تھی۔ یہ محض اُس کا احسان ہے کہ وہ تمہیں اپنی طرف بلا کر تمہارے لئے عزت کے سامان پیدا کرتا ہے۔ چنانچہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو ہی دیکھ لو۔ آپ تمام جہان سے منقطع ہو کر ایک گوشۂ گمنامی میں پڑے تھے اور غارِ حرا میں عبادتیں کیا کرتے تھے۔ آپ نے وہ تمام ذرائع جو دنیوی ترقی کے حصول کے ہیں ترک کر رکھے تھے مگر آپ کے پاس خدا تعالیٰ کا فرشتہ آیا اور اُس نے کہا۔ اُٹھ خدا تجھے بلاتا ہے۔ اور پھر اُس گوشۂ گمنامی سے نکال کر اللہ تعالیٰ نے آپ کو دنیا کا بادشاہ بنا دیا اور ایسی ترقی عطا کی کہ مذہب اور سیاست اور تمدّن اور معاشرت سب پر آپ کا رنگ چھا گیا۔ حتّٰی کہ آپ کے غلام یونیورسٹیوں میں تعلیم حاصل کئے بغیر اور لیباریٹریز میں تجربات کرنے کے بغیر ہی ہر فن میں دنیا کے استاد بن گئے اور جس میدان میں بھی انہوں نے قدم رکھا تمام دنیا سے آگے بڑھ گئے۔ اگر یہ خدا کی موہبت نہیں تو اَور کیا چیز ہے؟

ایک صحابیؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے ایک دفعہ ایک اشرفی دی اور فرمایا کہ قربانی کے لئے بکری لے آؤ۔ مَیں نے سوچا کہ مدینہ میں تو اس قیمت میں ایک ہی بکری ملے گی مگر کسی گاؤں سے دو مل جائینگی اس لئے مَیں نے ایک گاؤں سے ایک اشرفی میں دو بکریاں خریدلیں۔ جب واپس آیا تو مدینہ میں کسی نے پوچھا کہ کیا بکری فروخت کروگے مَیں نے کہا۔ ہاں! اور ایک بکری ایک اشرفی میں اُس کے پاس فروخت کر دی۔ پھر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جا کر مَیں نے بکری بھی پیش کر دی اور اشرفی بھی۔ اور آپکے دریافت فرمانے پر مَیں نے یہ تمام واقعہ عرض کر دیا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم خوش ہوئے اور آپ نے مجھے دُعا دی آپ کی اس دُعا کا یہ نتیجہ ہوُا کہ باوجودیکہ عرب ایرانیوں اور رومیوں جیسے تاجر نہ تھے پھر بھی وہ صحابیؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی اُس دُعا کے طفیل میری یہ کیفیت ہوگئی کہ اگر مَیں نے مٹی بھی خریدی تو وہ سونے کے بھاؤ بِک گئی۔ لوگ زبردستی اپنا روپیہ میرے پاس تجارت کیلئے چھوڑ جاتے تھے اور مَیں لینے سے انکار کرتا رہتا تھا۔

یہ لَوْلَا دُعَآؤُكُمْ کی صداقت ہی کا ایک کرشمہ تھا ورنہ اس میں اپنے کسی ہنر یا محنت کا دخل نہ تھا۔ یہ خدا تعالیٰ کی اپنی آواز تھی جس کے ذریعہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم آگے بڑھے اور آپ کے ساتھ ہی آپ کے وابستگانِ دامن بھی بڑھتے چلے گئے۔ جیسے اگر کوئی شخص گھوڑے پر سوار ہو تو اُس کا کوٹ اور پاجامہ اور دوسرے کپڑے بھی ساتھ ہی سوار ہو جاتے ہیں۔ پھر صحابہؓ نے یہاں تک ترقی کی کہ قیصر و کسریٰ کے خزائن مسلمانوں کے قبضہ میں آئے اور وہ بڑے بڑے ملکوں کے بادشاہ بن گئے۔ یہ بھی لَوْلَا دُعَآؤُكُمْ کی صداقت کا ہی ظہور تھا کیونکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت خدا تعالیٰ کے فضل کے نتیجہ میں ہوئی اور پھر جب آپ بڑھے تو آپ کے وابستگانِ دامن بھی ساتھ ہی ترقی کر گئے۔ یہی حکمت ہے جسکی بناء پر اللہ تعالیٰ نے كُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ (توبہ ع ۱۵) کی تاکید فرمائی ہے کیونکہ جب صادقین کے لئے اللہ تعالیٰ کی رحمت کا پھاٹک کھلتا ہے تو ساتھ ہی اُنکی معیت اختیار کرنے والے بھی داخل ہو جاتے ہیں۔

پھر لَوْلَا دُعَآؤُكُمْ کے دوسرے معنے یہ ہیں کہ لولا تضرعكم اليه یعنی اگر تم اس کو نہ پکارو۔ اور اُس کے حضور گریہ و بکا نہ کرو اور عجز اور انکسار کے ساتھ اُس کے آگے جُھک کر یہ نہ کہو کہ الٰہی ہمارا تو کوئی حق نہیں اگر تُو ہم پر احسان کر دے تو تیری ذرّہ نوازی ہے تو اللہ تعالیٰ کو تمہاری کیا پرواہ ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ مذہب کی جان اور اُس کا خلاصہ اور اس کی رُوح اگر کوئی چیز ہے تو وہ صرف دُعا ہی ہے۔ مگر دُعا اس امر کا نام نہیں کہ انسان صرف مُونہہ سے ایک بات کہہ دے اور سمجھ لے کہ دُعا ہو گئی۔ دُعا اللہ تعالیٰ کے حضور پگھل جانیکا نام ہے دُعا ایک موت اختیار کرنیکا نام ہے۔ دُعا تذلّل اور انکسار کا مجسم نمونہ بن جانے کا نام ہے۔ جو شخص صرف رسمی طور پر مونہہ سے چند الفاظ دہراتا چلا جاتا ہے اور تذلّل اور انکسار کی حالت اس کے اندر پیدا نہیں ہوتی۔ جس کا دل اور دماغ اور جس کے جسم کا ہر ذرّہ دُعا کے وقت محبت کی بجلیوں سے تھرتھرا نہیں رہا ہوتا وہ دُعا سے تمسخر کرتا ہے۔ وہ اپنا وقت ضائع کر کے خدا تعالیٰ کا غضب مول لیتا ہے۔ پس ایسی دُعا مت کرو جو تمہارے گلے سے نکل رہی ہو اور تمہارے اندر اس کے مقابل پر کوئی کیفیت پیدا نہ ہو۔ وہ دُعا نہیں بلکہ الٰہی قہر کو بھڑکانے کا ایک شیطانی آلہ ہے۔ جب تم دُعا کرو تو تمہارا ہر ذرّہ خدا تعالیٰ کے جلال کا شاہد ہو تمہارے دماغ کا ہر گوشہ اس کی قدرتوں کو منعکس کر رہا ہو۔ اور تمہارے دل کی ہر کیفیت اس کی عنایتوں کا لطف اٹھا رہی ہو۔ تب اور صرف تب تم دُعا کرنے والے سمجھے جا سکتے ہو۔ یہ کیفیت پیدا ہونی بظاہر مشکل نظر آتی ہے مگر جس شخص کے ایمان کی بنیاد عشقِ الٰہی پر ہو۔ اس کے لئے اس سے زیادہ آسان اور کوئی شئے نہیں بلکہ اُس کی طبیعت کا یہ کیفیت ایک خاصہ بن جاتی ہے۔ اور وہ ہر وقت اس سے لطف اندوز ہو رہا ہوتا ہے۔ ایسے انسان کو یہ ضرورت نہیں ہوتی کہ وہ الگ جا کر اور مصلّی پر بیٹھ کر دُعائیں کرے بلکہ وہ خلوت وجلوت میں دُعا کر رہا ہوتا ہے۔ اور جب اُس کی زبان پر اَور اَور کلام جاری ہوتے ہیں اور اس کی آنکھوں کے آگے اَور اَور نظارے پھر رہے ہوتے ہیں اُسکی رُوح اپنے مالک و خالق کے عتبۂ رحمت پر گری ہوئی اپنے لئے اور ساری دنیا کے لئے طلبگارِ رحمت ہو رہی ہوتی ہے۔ مگر فرماتا ہے فَقَدْ كَذَّبْتُمْ فَسَوْفَ

یَکُوْنُ لِزَامًا۔ چونکہ تم پہلے ہی خدا تعالےٰ کے پیغام کو ردّ کر چکے ہو اس لئے اب اِس تکذیب کا وبال تمہارے سر پر پڑے گا۔ اور اس کا عذاب تمہارے ساتھ چپک جائے گا۔ یعنی وہ لمبا ہوتا چلا جائیگا۔ اور تم خود بھی اس دنیا میں ذلیل ہوگے اور تمہاری آئندہ نسلیں بھی ہر قسم کی برکتوں سے محروم رہیں گی۔ یہ کتنا خطرناک وعید اور انذار ہے۔ کاش دنیا کے لوگ اِس بات کو سمجھیں۔ کاش وہ اپنی عاقبت برباد نہ کریں۔ کاش وہ اپنی اصلاح کریں۔ کاش وہ خدا کی باتوں کی طرف توجہ کریں تاکہ واحد و یگانہ خدا اُن کی پرواہ کرنے لگے اور وہ اُن کے دلوں کو پاک کر کے پھر اپنی محبت کی گود میں بٹھا لے۔

وآخر دعوٰنا ان الحمد للہ رب العٰلمین

کلیدِ مضامین

مرتبہ

سید عبدالحی

اشاریہ

کلیدِ مضامین

جلد ششم

ا

تعلیم

موازنہ

صداقت

غلبہ

اشاعت

تاریخ

پ

پاکیزگی

پردہ

پہاڑ

پیدائش۔ نیز دیکھئے عنوان کائنات

پیشگوئی۔ نیز دیکھئے عنوانات۔ قرآن کریم۔ الہام۔ وحی۔ کشف

ج

٭

خُلق/اخلاق

د

دجال

دُعا

○

ذ

ذکرِ الٰہی

ر

راستبازی

رجم۔ نیز دیکھئے حد

رزق

رسول۔ نیز دیکھئے نبی / نبوت

ز

ش

ع

عورت

عید

عیدالاضحیٰ

عیسائیت

تاریخ

فتنۂ عظیمہ

تعلیم

غ

قراءتِ مختلفہ

نضائل خصائص

فضائل

قمار بازی

قوم

تنظیم کی اہمیت

عروج و زوال

ک

تلقین و نصائح

متفرق

معاشرت

مہدی

ن

نباتات

مقام

و

اسماء

ز

س

غ

فرمودات

محسنِ اعظم

فیض

پیشگوئیاں اور کشوف

واقعات

ن

مقامات

ن

ھ

حل اللغات

(ﮬ)

(و)

(ى)

کتابیات

BIBLIOGRAPHY

تفسیر

تفسیر ابن کثیر از عماد الدین ابن کثیر ۵۵۳

البحر المحیط لابی حیّان

۱۴۴، ۲۹۲، ۴۱۹، ۵۰۲، ۵۰۳، ۵۹۰

جامع البیان فی تفسیر القرآن لابن جریر طبری ۲۴

رُوح المعانی علامہ الوسی ۴۲، ۲۵۴، ۵۱۷

فتح البیان ۶۸، ۱۸۳، ۲۸۱، ۲۹۳، ۲۹۴، ۵۵۱

تفسیرِ قرطبی ۱۱۱، ۲۴۶، ۴۱۳

لباب التاویل فی معانی التنزیل المعروف بہ تفسیرِ خازن ۲۵۶

معالم التنزیل حسین بن مسعود بغدادی ۵۶۷

تفسیر المنار مصنفہ علامہ رشید رضا ۵۱۵، ۵۱۶

ہمیان الزاد ۶۸

دیباچہ تفسیر القرآن مصنفہ حضرت مرزا بشیر الدین محمود احمدؓ ۸۹

کمنٹری آن دی قرآن ریورنڈ وہیری ۴۱۳

حدیث

جامع صحیح بخاری امام محمد بن اسماعیل

۱۸، ۳۳، ۸۸، ۱۲۸، ۱۴۹، ۲۰۲

۲۵۵، ۳۰۰، ۳۰۳، ۴۱۳، ۵۶۳

صحیح مسلم، مسلم بن حجاج ۲۹، ۲۵۶، ۴۱۳

جامع صحیح ترمذی، ابو عیسیٰ ترمذی

۲۰۲، ۴۶۳، ۵۵۱، ۵۷۲

سنن ابو داؤد ۱۳۴، ۱۵۲، ۳۰۲، ۵۳۶

سنن ابن ماجہ ۳۰۰، ۳۰۲

مشکوٰۃ المصابیح ۲۵۳، ۵۲۰

مسند احمد بن حنبل
۸۹، ۲۵۲، ۳۰۰، ۳۰۲، ۳۰۴، ۵۲۷، ۵۹۷

کنز العمال ۲۵۳

دار قطنی ۱۵۱

کشف الغمۃ ۲۵۰

محلّی ابن حزم ۱۳۱، ۲۰۰، ۲۵۱، ۲۵۲، ۲۵۴

نصب الرایہ فی تخریج احادیث الہدایۃ ۵۳۶

نیل الاوطار امام شوکانی ۲۵۴

فقہ

المبسوط لمحمد السرخسی ۲۶۵

فتح القدیر شرح ہدایہ ۲۵۰

کتاب الخراج للامام ابی یوسف ۵۲۶

سیرت و تاریخ

سیرۃ ابن ہشام ۲۰۷، ۵۳۰، ۵۳۷

السیرۃ الحلبیہ
۱۰۷، ۶۹، ۱۳۱، ۱۷۱، ۳۲۴، ۳۲۷، ۴۹۴، ۵۲۹

الاصابۃ فی تمییز الصحابہ لابن حجر العسقلانی ۱۳۹

الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب لابن عبد البر ۳۵۵

تاریخِ طبری ۱۲۲، ۱۳۴، ۲۰۷، ۲۶۵

تاریخ ابن خلدون ۶۹، ۲۰۵

فتوح البلدان بلاذری ۴۲

زاد المعاد ۵۳۰

مواہب اللدنیہ للزرقانی ۶۹، ۲۰۷

مجموعۃ الوثائق السیاسیۃ، ڈاکٹر حمید اللہ ۵۳۴

الفاروق مصنفہ علامہ شبلی نعمانی ۵۳۴

لائف آف محمدؐ مصنفہ ولیم میور ۳۷، ۴۶۴

تاریخ التمدن الاسلامی جرجی زیدان ۵۳۶

محاضرات تاریخ الامم الاسلامیۃ ۲۰۵

تاریخِ عرب مصنفہ پروفیسر ہٹی ۵۲۴، ۵۲۵

العرب قبل الاسلام ۱۶۲

اخبار اندلس ترجمہ تاریخ اندلس از سکاٹس ۵۲۵

A SHORT HISTORY OF THE SARACENS
BY AMIR ALI

PREACHING OF ISLAM
BY SIR THOMAS ARNOLD

ANECDOTES OF AURANG ZEB
BY SIR JADHN AND CIRCAR.

A NEW ACCOUNT OF THE EAST INDIES
VOL. 2

اسباب بغاوتِ ہند مصنفہ سر سید احمد خاں ۵۱۵

اسلامیات

الشفاء قاضی عیاض ۲۰۲

فتوحاتِ مکیہ از محی الدین ابن عربی ۳۸

تعطیر الانام ۱۶۴

○

انڈیکس کی تیاری میں معاونت

۱۔ فضل کریم صاحب تبسم شاہد

۲۔ طاہر محمود احمد صاحب شاہد